جلد اوّل

تصنیف

امامِ اکبر، مجدد ملت، حکیم الاسلام

حضرت مولانا شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی قدس سرہ

(۱۱۱۴ھ-۱۱۷۶ھ — ۱۷۰۳ء-۱۷۶۲ء)

شارح

حضرت مولانا سعید احمد صاحب پالن پوری مدظلہ

استاذ دار العلوم دیوبند

ناشر

زمزم پبلشرز

نزد مقدس مسجد اردو بازار کراچی

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

کتاب کا نام ــــــ رحمۃ اللہ الواسعۃ (جلد اول)
([illegible])

تاریخ اشاعت ــــــ جولائی [illegible]

باہتمام ــــــ اصحاب زمزم پبلشرز

کمپوزنگ ــــــ فاروق اعظم کمپیوٹرز کراچی

سرورق ــــــ [illegible]

مطبع ــــــ

ناشر ــــــ زمزم پبلشرز کراچی
شاہ زیب سینٹر نزد مقدس مسجد اردو بازار کراچی

فون: 021-2760374

فیکس: 021-2725673

ای میل: zamzam01@cyber.net.pk

ویب سائٹ: http://www.zamzampub.com

ملنے کے دیگر پتے

- دار الاشاعت اردو بازار کراچی
- قدیمی کتب خانہ بالمقابل آرام باغ کراچی
- صدیقی ٹرسٹ لسبیلہ چوک کراچی
- مکتبہ [illegible] اردو بازار لاہور
- کتب خانہ رشیدیہ مدینہ مارکیٹ راجہ بازار راولپنڈی
- مکتبہ رشیدیہ سرکی روڈ کوئٹہ
- ادارہ تالیفات اشرفیہ چوک فوارہ ملتان

ــــــ ساؤتھ افریقہ میں ــــــ

Madrasah Arabia Islamia.
P.O Box 9786
Azaad Ville 1750
South Africa
Tel: (011) 413 - 2786

ــــــ انگلینڈ میں ــــــ

Al Farooq International Ltd.
1 Atkinson Street,
Leicester, LE5 3QA
Tel: (0116) 2537640

دیباچہ طبع جدید

رحمۃ اللہ الواسعہ جلد اول صفحہ ۳۲ پر یہ بات عرض کی گئی ہے کہ اس جلد کا اکثر حصہ (تاختم مبحث رابع) درسی تقریر ہے، جس پر نظر ثانی کی گئی ہے۔ باقاعدہ تصنیف نہیں۔ اور نظر ثانی خواہ کتنے ہی اہتمام سے کی جائے، اس میں تصنیف کی شان پیدا نہیں ہو سکتی۔ کچھ نہ کچھ کمی رہ جاتی ہے۔ اتفاق سے کناڈا کے شہر ٹورنٹو کے مضافات میں "مس آگا" نامی بستی میں ایک بڑے عالم ہیں۔ جن کا نام حضرت مولانا وصی مظہر صاحب ندوی ہے۔ علوم ولی اللّٰہی سے اللہ نے آپ کو حظ وافر عطا فرمایا ہے۔ میرے کرم فرما حضرت مولانا عبد اللہ صاحب کاپودروی (سابق مہتمم دار العلوم فلاح دارین ترکیسر، حال مقیم ٹورنٹو) نے رحمۃ اللہ الواسعہ حضرت مولانا کو پہنچائی۔ مولانا نے دیدہ ریزی سے اس کا مطالعہ کیا۔ اور بعض جگہ استدراک اور بعض جگہ تعبیرات بدلیں۔ جب جلد اول دوبارہ طبع ہوئی تو یہ تصویبات کتاب کے آخر میں درج کر دی گئیں۔ پھر حسن اتفاق سے کراچی (پاکستان) کے جناب مولانا محمد رفیق صاحب زید مجدہم مالک زمزم پبلشر نے رحمۃ اللہ الواسعہ کی اشاعت کا بیڑا اٹھایا۔ انھوں نے اس سلسلہ میں بڑی رقم خرچ کی تو میں نے جلد اول پر نظر ثانی کی۔ اور وہ تمام تصویبات وتعدیلات کتاب میں شامل کر دیں۔ اب ان شاء اللہ یہ کام مکمل ہے۔ پاکستان میں اس کی اشاعت کے جملہ حقوق مولانا محمد رفیق صاحب مالک زمزم پبلشر کراچی کے لئے محفوظ ہیں۔ اللہ تعالیٰ موصوف کے کاروبار میں برکت فرمائیں، اور اس کتاب سے اور ان کی دیگر مطبوعات سے امت کو فیضیاب فرمائیں (آمین)

جلد اول کے آخر میں آٹھ صفحات الگ تھے اس لئے آٹھ صفحات کا اضافہ کیا گیا، تاکہ جزء کی پلیٹ بن جائے۔ اور بائنڈنگ مضبوط ہو۔ شارح کے احوال: جناب مولانا مفتی محمد امین صاحب پالن پوری استاذ حدیث دار العلوم دیوبند نے اپنی کتاب "الخیر الکثیر فی شرح الفوز الکبیر" میں تفصیل سے لکھے تھے، اسی سے اختصار کر کے شامل کتاب کئے گئے ہیں۔ ان شاء اللہ قارئین کرام کے لئے وہ مفید ثابت ہونگے۔

علاوہ ازیں: جب یہ شرح مکمل ہوئی، تو دار العلوم دیوبند کے موقر مجلس شوریٰ نے اس کی تحسین کی اور اس سلسلہ میں ایک تجویز پاس کی جس کا عکس آئندہ صفحہ پر دیا گیا ہے۔ شارح کے لئے یہ بہت بڑی قدر افزائی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان اکابر کو اس ذرہ نوازی کا بہترین صلہ عطا فرمائیں (آمین)

کتبہ
سعید احمد عفا اللہ عنہ پالن پوری
خادم دار العلوم دیوبند
۲۵ صفر ۱۴۲۵ ہجری

(ب)

Ph: [illegible]
Fax: [illegible]

Darul-Uloom, Deoband. U. P. India

نمبر   تاریخ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مکرمی ومحترمی حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری زید مجدہم!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مجلس شوریٰ منعقدہ ۱۲،۱۳؍صفر ۱۴۲۵ھ کی منظور شدہ تجویز کا متن ارسال خدمت ہے۔

تجویز نمبر ۵ باجازت صدر:

دارالعلوم دیوبند کے مایۂ ناز استاذ حدیث حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری زید مجدہم نے مسند الہند حجۃ الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی شاہکار تصنیف حجۃ اللہ البالغہ کی شرح و توضیح بنام "رحمۃ اللہ الواسعۃ" کا جو عظیم کارنامہ انجام دیا ہے، مجلس شوریٰ مولانا موصوف کو اس عظیم علمی خدمت پر مبارک باد پیش کرتی ہے۔ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس تحریک کے اصل محمل ہیں جس کے مرکز دار اکابر دیوبند اور متوسلین دارالعلوم دیوبند ہیں۔ حضرت شاہ صاحب کی اس عدیم المثال تصنیف کی عظمت کا اعتراف کرنے کے باوجود اس سے استفادہ علماء کرام کے لئے کچھ سہل نہیں تھا۔

حضرت مفتی صاحب نے پوری جماعت کی طرف سے فرض کفایہ ادا کیا ہے۔ اور پوری جماعت کی طرف سے شکریہ و تحسین کے مستحق ہیں۔

اللہ تعالیٰ مولانا موصوف کی عمر میں برکت عطا فرمائیں اور ان کے ذریعہ دارالعلوم اور پوری امت کو فیض یاب فرمائیں۔ آمین۔

مرغوب الرحمن عفی عنہ

(مرغوب الرحمن عفی عنہ)

مہتمم دارالعلوم دیوبند

۱۶-۲-۱۴۲۵ھ

پیش لفظ

از مولانا مفتی عبد الرؤف غزنوی صاحب

استاذ حدیث و مدیر مجلہ "البینات" (عربی)

جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی، و سابق استاذ دارالعلوم دیوبند

الحمد للہ وکفی وسلام علی عبادہ الذین اصطفی، اما بعد:

پیش نظر کتاب "رحمۃ اللہ الواسعۃ" شرح "حجۃ اللہ البالغۃ" میرے استاذ محترم مدظلہم جامعہ دارالعلوم دیوبند کے استاذ حدیث حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری دامت برکاتہم العالیہ کی مایۂ ناز تصنیف ہے، مصنف کے حالات اسی جلد اول کے آخر میں "شارح کے مختصر حالات" کے عنوان سے بقلم حضرت مولانا مفتی محمد امین صاحب پالن پوری درج کردیے گئے ہیں، قارئین کرام ان مختصر و مفید حالات کا ضرور مطالعہ فرمائیں، مجھے یہاں پر حضرت الاستاذ مدظلہم العالی کی صرف چند ہی خصوصیات کا تذکرہ کرنا ہے۔

حضرت والا نے ۱۳۸۲ھ میں تقریباً بائیس سال کی عمر میں دارالعلوم دیوبند کے سالانہ امتحان میں اول نمبر سے کامیابی حاصل کی، اور پھر دارالافتاء دارالعلوم دیوبند میں تکمیل افتاء کے لئے داخلہ لیا، فتاویٰ میں علمی کامیابی اور فتویٰ نویسی میں اعلیٰ مہارت حاصل کرنے کے بعد دارالعلوم دیوبند کے ایماء پر چند سال تک دارالعلوم اشرفیہ راندیر (سورت) میں حدیث و دیگر فنون پڑھاتے رہے، اور ۱۳۹۳ھ میں نہایت اعزاز کے ساتھ دارالعلوم دیوبند میں آپ کا تقرر ہوا اور آج (۱۴۱۵ھ) تک ایک ہر دلعزیز اور مقبول ترین استاذ کی حیثیت سے حدیث اور علمی فنون پڑھا رہے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کی صحت و عافیت و زندگی میں برکت عطا فرمائے۔

علمی انہماک: حضرت والا کے علمی انہماک اور کام سے جو لوگ واقف ہیں وہ شہادت دیں گے کہ بغیر روحانیت، اعلیٰ خصوصی قلبی بے چینی اور درد مندی کے شوق کے اتنے بڑے کام کوئی انجام نہیں دے سکتا، ایک طرف دارالعلوم دیوبند جیسے عظیم ادارہ میں ایک اعلیٰ اور کامیاب استاذ حدیث کے طور پر تدریس کی ذمہ داری، دوسری طرف مطالعہ اور تصنیف و تالیف کا کامیاب مشغلہ، اور اپنے بچوں کو جو بحمد اللہ ایک درجن سے زائد ہیں خود ہی حفظ کرانا اور بعد ازاں کتابیں پڑھانا اور خوش خطی سکھانا، اور ادھر فتاویٰ نویسی کا تحقیقی علمی کام انجام دینا، مذکورہ تمام علمی مشاغل کے ساتھ ساتھ عام مسلمانوں کی اصلاح کا جذبہ دل میں لئے ہوئے ایام تعطیل میں اندرون ملک و بیرون ملک دعوتی و اصلاحی دورے کرنا۔

ما روانِ منزل راہ نیست　　عشق خود راہ است ہم خود منزل است

یہ اسی علمی عشق و انہماک کی کرامت ہے کہ حضرت والا تھکنے کا نام نہیں جانتے ہیں اور نہ ہارنے کو مانتے ہیں۔

ایک دلچسپ واقعہ: علمی انہماک اور علمی مسائل سے محبت کی مناسبت سے مجھے حضرت والا کا ایک واقعہ یاد آیا، ایک مرتبہ میں ان کی اجازت سے ان کے ذاتی کتب خانہ میں مطالعہ کر رہا تھا، ایک پرانی سی کتاب الاغانی اس کے سرورق پر حضرت والا کے قلم سے ان کے زمانہ طالب علمی کا ایک فقرہ لکھا ہوا تھا جس کا مضمون یہ تھا: "والدہ محترمہ نے گھر سے کسی کے ساتھ میرے لئے گھی بھیجا تھا اسے بیچ کر میں نے یہ کتاب خریدی" سبحان اللہ! آج کل کے طالب علم کے پاس اگر کتاب خریدنے کے لئے گھر والے پیسے بھیجتے ہیں تو وہ اسے کھانے پینے پر خرچ کرتے ہیں لیکن ممدوح مکرم جو خالص کھانے کی چیز ہے اور وہ بھی والدہ محترمہ نے بھیجی ہوئی اسے بیچ کر علمی پیاس بجھانے میں استعمال کرتے ہیں ع

ببیں تفاوت راہ از کجا است تا بکجا

رب العالمین کو حضرت والا کی اسی قسم کی ادائیں شاید بہت ہی زیادہ پسند آگئیں کہ ایک طرف سے مختلف اور نایاب کتابوں پر مشتمل ذاتی لائبریری عطا فرمائی، اور دوسری طرف سے "مکتبہ حجاز دیوبند" کی شکل میں نشر و اشاعت کا ایسا ادارہ عطا فرمایا جس کی مطبوعات ملک و بیرون ملک پھیل رہی ہیں، اور ساتھ ہی ساتھ آپ پر رحمتوں کے ایسے دروازے کھول دیئے کہ ان کے قلم سے "رحمۃ اللہ الواسعۃ" جیسی مایۂ ناز شرح لکھوا کر اہل علم و انصاف کو اس بات کے اعتراف پر مجبور کر دیا کہ "حضرت مفتی صاحب نے پوری جماعت دیوبند کی طرف سے فرض کفایہ ادا کیا ہے، اور پوری جماعت کی طرف سے شکریہ و تحسین کے مستحق ہیں۔" "ذلك فضل الله يؤتيه من يشاء والله ذو الفضل العظيم"

قرآن کریم سے محبت: بندہ نے حضرت والا کی ایک خصوصیت یہ دیکھی ہے کہ قرآن کریم سے بے حد محبت اللہ تعالیٰ نے ان کو عطا کی ہے، جب کوئی شخص حضرت والا کے سامنے تلاوت شروع کرتا یا وہ خود تلاوت میں مصروف ہو جاتے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب ان کا ظاہری اور باطنی تعلق سب سے کٹ کر صرف اللہ تعالیٰ اور اس کی کتاب سے جڑ گیا ہے، آنسو رواں دواں، چہرہ کا رنگ بدلا ہوا نظر آتا تھا، میں حضرت والا کی وہ کیفیت یاد کر کے یہ سوچتا رہتا ہوں کہ کاش زندگی میں صرف ایک ہی بار ہمیں وہ کیفیت نصیب ہو جائے، شاید اس سے بیڑا پار ہو جائے لیکن۔

این سعادت بزور بازو نیست تا نبخشد خدائے بخشندہ

حضرت والا مدظلہم العالی کی مذکورہ کیفیت کو یاد کر کے میں یہ بھی سوچتا رہتا ہوں کہ شاید ان کی ترقیوں اور بے مثال مقبولیت کا راز بھی قرآن کی یہی محبت ہو، کیونکہ یہی قرآن اللہ تعالیٰ کے قرب کا سب سے اہم ذریعہ ہے، امام ترمذی اور امام احمد بن حنبل نے بروایت حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی نقل کیا ہے: "... وما تقرب العباد إلى الله بمثل ما خرج منه (يعني القرآن)"

اسی محبت خالصہ کا نتیجہ ہے کہ حضرت والا نے اپنی اہلیہ محترمہ اور اپنے بچوں کو جو ایک درجن سے ماشاء اللہ زائد ہیں مذکورہ تمام مصروفیات کے باوجود حفظ خود ہی کرایا، راقم الحروف نے جہاں حضرت والا کے پاس بخاری شریف جلد ثانی ترمذی شریف جلد اول،

ابوداؤد شریف اور بعض دوسری کتابیں بھی پڑھی ہیں وہاں دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد جب دارالعلوم دیوبند میں مدرس مقرر ہونے کے بعد حفظ قرآن بھی انہی کے پاس کیا ہے۔ (اللّٰھم إنی أسألك بأسمائك الحسنیٰ أن تبارك في حیاۃ شیخي وصحته، وأن تنفع به الدین، وأن تورثه وأھله النجاح والفلاح في الدنیا والآخرۃ برحمتك الواسعة)

ایک اور واقعہ: حضرت والا کے پوتے حفظ کرتا ہوا جب سورۂ طٰہٰ کی اس آیت "وأمر أھلك بالصلاۃ واصطبر علیھا لا نسألك رزقا نحن نرزقك والعاقبة للتقوی" پر پہنچا تو انہوں نے نمناک آنکھوں کے ساتھ ایک واقعہ سنایا کہ جب سے میں نے اللہ تعالیٰ کی توفیق سے اپنی اہلیہ اور بڑے بیٹے رشید احمد (حضرت والا کے صاحبزادے دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد ایک حادثہ میں شہید ہوئے رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ) کو حفظ کرایا ہے اس وقت سے اللہ تعالیٰ نے روزی میں ایسی برکت عطا فرمائی ہے اور فاقہ کی نوبت کبھی نہیں آئی ہے جب کہ اس سے پہلے بارہا اس کی نوبت آچکی ہے۔

افہام وتفہیم کا منفرد سلیقہ: راقم الحروف کو اپنی بے بضاعتی اور تہی دامنی کا پورا احساس ہے لیکن یہ ایک حقیقی بات ہے کہ اس نے اللہ تعالیٰ کی توفیق سے طلب علم کی غرض سے چار ملکوں (افغانستان، پاکستان، ہندوستان اور سعودی عرب) کے بعض مایہ ناز اہل علم سے استفادہ کیا ہے اور ان کے پاس پڑھا ہے "رحمھم اللہ من توفي منھم وبارك في صحة وحیاۃ من ھو باق منھم" میں اس وسیع واقفیت کی بنا پر (جو کسی کا ذاتی کمال اور سرمایۂ فخر نہیں) شرح صدر کے ساتھ یہ کہنے کی جرأت کرتا ہوں کہ حضرت والا کے افہام وتفہیم کا انداز ان سب سے منفرد اور ممتاز تھا، مشکل سے مشکل بحث ایسی ترتیب اور عمدہ انداز سے بیان فرماتے تھے کہ ادنیٰ سے ادنیٰ طالب علم کے لئے بھی سمجھنا آسان ہو جاتا۔ مجھے یاد ہے کہ کبھی دوسرے اساتذہ کرام کے اسفار کی وجہ سے دو تین گھنٹے مسلسل پڑھاتے اور تمام طلبہ ہمہ تن گوش ہو کر بیٹھتے اور "کأن علی رؤوسھم الطیر" کا مصداق بن کر حضرت والا کی تحقیقات سے مسلسل کئی گھنٹوں تک انہماک کے ساتھ بھرپور استفادہ کرتے رہتے۔

تربیت اور مردم سازی: حضرت والا کی تربیت اور مردم سازی کا انداز بھی نرالا ہے، وہ خود بھی اخلاص کے ساتھ ہمیشہ اپنے علمی، تدریسی اور تصنیفی کاموں میں مصروف اور بلا ضرورت کی ملاقاتوں اور ملنے جلنے سے دور نظر آتے ہیں، اور اپنے شاگردوں اور متعلقین کو بھی اسی بات کی تلقین کرتے رہتے ہیں۔

گرت ہوا است کہ با خضر ہم نشین باشی نہان ز چشم سکندر چو آب حیوان باشی

میں نے دارالعلوم دیوبند کی اپنی تقریباً دس سالہ زندگی میں اس بات کا مشاہدہ کیا ہے کہ جن اساتذہ یا طلبہ کو حضرت والا سے تعلق یا قرب کی سعادت حاصل ہوئی اللہ نے ان کو خوبیوں سے نوازا اور استفادۂ علمی کا انہماک، اعلیٰ ہمتی اور دنیوی زندگی کی پروا نہ کرنے اور ولولوں کو محدود کرنے کی صلاحیت ان کو حاصل ہوئی ہے، یہ اس لئے کہ یہ تمام چیزیں جب خود مربی میں بدرجۂ اتم موجود ہوں اور تربیت کا طریقہ بھی حکیمانہ ہو پھر استفادہ کرنا خود بخود آسان اور تربیت کا سلسلہ مؤثر اور کامیاب ہو جاتا ہے۔

رحمۃ اللہ الواسعۃ کا مقام: حضرت مفتی صاحب نے "رحمۃ اللہ الواسعۃ" کا آغاز ذی قعدہ ۱۴۱۹ھ میں فرمایا اور پانچ سالہ کاوشوں اور عرق ریزی کے بعد ۱۸ ذی الحجہ ۱۴۲۳ھ کو پانچ ضخیم جلدوں پر مشتمل یہ شرح پایۂ تکمیل تک پہنچایا، برصغیر کے ممتاز

اہل علم و بصیرت نے اس شرح کو بہت سراہا ہے، اور تقریباً ڈھائی سو سال سے "حجۃ اللہ البالغۃ" کی شایانِ شان شرح کا جو علمی قرضہ اہل علم و دانش کے ذمہ باقی تھا "رحمۃ اللہ الواسعۃ" کو اس قرضہ کی ادائیگی سے تعبیر کیا ہے، یہاں تک کہ برصغیر کے سب سے بڑی دینی درسگاہ "دار العلوم دیوبند" کی مجلس شوریٰ (جو متعدد اہل علم و بصیرت پر مشتمل مجلس ہے) نے ایک تجویز پاس کی ہے جس میں مفتی صاحب مدظلہم کے اس کارنامہ کو فرض کفایہ ادا کرنے کے مترادف اور آپ کو تشکر و تحسین کے مستحق قرار دیا ہے، تجویز کا عکس صفحہ نمبر (ب) جلد اول پر دے دیا گیا ہے۔

وجہ تسمیہ: "حجۃ اللہ البالغۃ" کا نام سورۃ الانعام آیت نمبر ۱۴۹ "قل فللہ الحجۃ البالغۃ الآیۃ" سے ماخوذ ہے جس کا ذکر خود حضرت شاہ صاحب علیہ الرحمہ نے اختصار کے ساتھ فرمایا ہے اور حضرت شارح مدظلہم نے جلد اول صفحہ ۹۰ پر اس کی خوب تشریح بھی کی ہے، شارح مدظلہم کا کہنا یہ ہے کہ انہوں نے بھی "رحمۃ اللہ الواسعۃ" کا نام اسی جگہ اور اسی وجہ سے اخذ کیا ہے جہاں سے اور جس وجہ سے حضرت شاہ صاحب علیہ الرحمہ نے اخذ کیا ہے، سورۃ الانعام آیت ۱۴۹ سے پہلے ایک آیت چھوڑ کر آیت ۱۴۷ میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد گرامی "فإن كذبوك فقل ربكم ذو رحمة واسعة" شرح کا ماخذ ہے جس کی تفصیل "رحمۃ اللہ الواسعۃ" جلد سوم صفحہ ۲۱ پر موجود ہے۔

رحمۃ اللہ الواسعۃ کی اشاعت: ہندوستان میں "رحمۃ اللہ الواسعۃ" کی اشاعت کا بیڑا تو خود حضرت مؤلف مدظلہم ہی نے اٹھایا اور "مکتبہ حجاز دیوبند" سے شایانِ شان طباعت، بہترین کاغذ اور خوبصورت جلدوں کے ساتھ طبع کرایا اور یہ شرح اس شعر کا صحیح مصداق بن گئی۔

بہار عالم حسنش دل و جان تازہ می دارد　　برنگ اصحاب صورت را ببو ارباب معنی را

اب پاکستان میں برادر محترم فاضل مکرم جناب مولانا محمد رفیق صاحب (تقبل اللہ جهودهم) فاضل جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن و مالک "زمزم پبلشرز کراچی" نے اشاعت کا ارادہ فرمایا ہے، اور حضرت مؤلف مدظلہم سے اجازت بھی حاصل کی ہے، اللہ تعالیٰ ان کی محنتوں کو قبول فرمائیں اور "زمزم پبلشرز" کی اس کتاب اور دیگر مطبوعات سے تمام عالم کو فیضیاب فرمائیں۔

ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

وصلى الله تعالى على سيدنا ونبينا محمد وعلى آله وصحبه اجمعين، والحمد لله رب العالمين.

عبد الرؤف غزنوی عفا اللہ عنہ
خادم تدریس
جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی
۳/۱۲/۱۴۲۳ھ

فہرست مضامین

فہرست مضامین ... ۵-۲۶

سخن ہائے گفتنی ... ۲۷-۳۳

مختصر سوانح حیات حضرت امام شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ ... ۳۵

خود نوشت سوانح حیات ... ۳۷

اصلاحی اور تجدیدی کارنامے۔ مشہور تصانیف کا تعارف ... ۴۰-۴۳

طرز تحریر اور تصنیفی خدمات ... ۴۴

آپ کیا تھے؟ ... ۴۵

حضرت شاہ صاحب کا کلامی اور فقہی مسلک ... ۴۷

ایک عربی رسالہ جس میں ان بارہ مسائل کا بیان ہے جو اشاعرہ اور ماتریدیہ کے درمیان اختلافی ہیں ... ۴۷

شاہ صاحب کلام میں اشعری تھے ... ۵۰

شاہ صاحب فروعات میں حنفی تھے ... ۵۱

حجۃ اللہ البالغہ کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ نسخے ... ۵۲

فن حکمت شرعیہ (علم اسرار الدین) تعریف، موضوع اور غرض وغایت ... ۶۱-۶۲

کتاب کا آغاز ... ۶۳

ہر مکلف دین اسلام پر پیدا ہوتا ہے؟ ... ۶۵

عربی میں مصدر معروف اور مصدر مجہول میں اور مصدر اور حاصل مصدر میں فرق نہیں ہوتا ... ۶۵

شاہ صاحب رحمہ اللہ مترادفات استعمال کرتے ہیں ... ۶۵

نبیوں اور رسولوں کا وجود ... ۶۶

بڑے لوگ ... ۶۷

مادامت السماوات والأرض ابدیت کے لئے کنایہ ہے ... ۶۷

فنون حدیث میں حکمت شرعیہ کا مقام ومرتبہ ... ۶۸

علوم شرعیہ میں سب سے بلند رتبہ حدیث کا ہے یا تفسیر کا؟ ... ۶۹

منکرین حدیث (اہل قرآن) پرویز ... ۷۰

چار فنون حدیث: فن روایت احادیث، فن غریب الحدیث، فقہ حدیث اور علم اسرار الدین ... ۷۱

حکمت اور علت میں کچھ وجوہ فرق ہے ... ۷۴
فن حکمت شرعیہ کے تین فائدے ... ۷۵
فن حکمت شرعیہ مضبوط بنیاد رکھتا ہے مگر یہ چھوٹا فن ہے ... ۷۷
فن حکمت شرعیہ ایک دقیق فن ہے، اس میں تصنیف کے لئے چار چیزیں ضروری ہیں ... ۷۹
تقریب تدوین حکمت شرعیہ ... ۸۰
حضرات حسنین رضی اللہ عنہما کے اسمائے گرامی کے ساتھ لفظ "امام" کا استعمال ... ۸۵
کتاب حجۃ اللہ البالغہ کا امتیاز ... ۸۶
کتاب حجۃ اللہ البالغہ کی وجہ تسمیہ ... ۹۰

مقدمۃ الکتاب کا آغاز

یہ خیال باطل ہے کہ احکام شرعیہ مصلحتوں پر مشتمل نہیں ہیں ... ۹۳
حدیث "إنما الأعمال بالنیات" کی تشریح ... ۹۴
نماز کا مغز اور اصل فائدہ ... ۹۷
آنحضرت ﷺ، صحابہ کرام اور بعد کے حضرات ہمیشہ احکام کی مصلحتیں بیان کرتے رہے ہیں ... ۱۰۰
ایام رضاعت میں ہمبستری کرنے کی ممانعت منسوخ ہے ... ۱۰۳
اعمال کا حسن وقبح نہ محض عقلی ہے نہ شرعی، بلکہ بین بین ہے ... ۱۰۵
اشاعرہ، ماتریدیہ، معتزلہ، امامیہ اور کرامیہ کے مذاہب ... ۱۰۵
احکام پر عمل پیرا ہونا مصلحتوں کے جاننے پر موقوف نہیں ... ۱۰۹
تکلیف شرعی کی صحیح مثال ... ۱۱۱
اہل جنت اور پہاڑوں پر رہنے والوں کا حکم ... ۱۱۳
نقصان اس اندیشہ سے نہیں پیدا ہوا ... ۱۱۶
فن حکمت شرعیہ کی تدوین اور اس کے فوائد ... ۱۱۷
ایک باطل خیال کہ حکمت شرعیہ کی تدوین ناممکن ہے اور اس کے عقلی اور نقلی دلائل ... ۱۱۸
باطل خیال والوں کی دلیل عقلی کا جواب ... ۱۲۰
ان کی دلیل نقلی کی پہلی تقریر کا جواب ... ۱۲۲
بدعت کی حقیقت کیا ہے ... ۱۲۲

متقدمین کو فن حکمتِ شرعیہ کی ضرورت کیوں نہیں تھی؟ ... ۱۲۳

اب فن حکمتِ شرعیہ کی ضرورت کیوں ہے؟ ... ۱۲۴

باطل خیال والوں کی دلیلِ نقلی کی دوسری تقریر کا جواب ... ۱۲۹

فن حکمتِ شرعیہ کے فوائد: ... ۱۲۹

① فن حکمتِ شرعیہ کی مدد سے ایک اہم معجزہ کی وضاحت ہوتی ہے ... ۱۲۹

② فن حکمتِ شرعیہ سے دین میں مزید اطمینانِ قلبی حاصل ہوتا ہے ... ۱۳۲

③ فن حکمتِ شرعیہ سے سالک کو عبادات میں فائدہ پہنچتا ہے ... ۱۳۳

احسان کا مطلب اور صفتِ احسان پیدا کرنے کا طریقہ ... ۱۳۴

احسان، زہد اور تصوف ایک ہی چیز ہیں ... ۱۳۵

④ فن حکمتِ شرعیہ سے فروعی مسائل میں اختلافِ فقہاء میں فیصلہ کیا جاسکتا ہے ... ۱۳۶

⑤ فن حکمتِ شرعیہ سے گمراہ فرقوں کے خیالات کی تردید کرنے میں مدد ملتی ہے ... ۱۳۶

⑥ فن حکمتِ شرعیہ سے بعض فقہاء کی ایک بات کی تردید کی جاسکتی ہے ... ۱۳۹

شاہ صاحب رحمہ اللہ کے تفردات کی وجہ ... ۱۴۰

اہلِ حق (اہل السنۃ والجماعۃ) کون لوگ ہیں اور حق کا معیار کیا ہے؟ (ایک اہم بحث) ... ۱۴۲

منصوص مسائل میں اہلِ حق کا طریقہ ... ۱۴۳

غیر منصوص مسائل میں توسع ہے ... ۱۴۶

انسان افضل ہیں یا ملائکہ؟ ... ۱۴۸

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا افضل ہیں یا حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا؟ ... ۱۴۹

چار مسائل: جن کو علم کلام میں اس لئے چھیڑا گیا ہے کہ ان کو مسائلِ اسلامیہ کا موقوف علیہ سمجھا گیا ہے ... ۱۵۱

صفاتِ باری تعالیٰ کے تعلق سے تین مسائل کا تذکرہ ... ۱۵۲

ہر فن کی ایک خصوصیت اور ہر مقام کا ایک تقاضا ہوتا ہے۔ اور دوسرے فن والوں پر اس فن کی قابل

اعتبارات کی پیروی ضروری ہے ... ۱۵۷

مقدمۃ الکتاب کی آخری بات ... ۱۶۰

کتاب کے مضامین کی اجمالی فہرست ... ۱۶۱

قسم اول: قواعدِ کلیہ کے بیان میں ہے ... ۱۶۷

قسم اول میں سات مبحث اور ستر باب ہیں ... ۱۶۷

امام غزالی رحمہ اللہ کا تائیدی حوالہ: انھوں نے عذاب قبر کی روایات میں یہ تین مرتبے بیان کئے ہیں ۱۹۸
باب (۳) ملأ اعلیٰ (مقرب فرشتوں) کا بیان ۲۰۳
ملأ اعلیٰ کا تذکرہ قرآن و حدیث میں ۲۰۳
چھ حدیثیں جن سے ملأ اعلیٰ کے وجود اور کاموں پر روشنی پڑتی ہے ۲۰۵
ملأ اعلیٰ کے سلسلہ کی سات باتیں: ۲۰۸
(۱) ملأ اعلیٰ نیک لوگوں کے لئے دعائیں کرتے ہیں ۲۰۸
(۲) ملأ اعلیٰ: اللہ اور بندوں کے درمیان سفارت کا فریضہ انجام دیتے ہیں ۲۰۸
(۳) ملأ اعلیٰ بھلائیوں کا الہام کرتے ہیں ۲۰۸
(۴) ملأ اعلیٰ باہم مل کر نظام دنیوی طے کرتے ہیں ۲۰۸
(۵) ملأ اعلیٰ میں اونچے درجے کے انسان بھی شامل ہیں ۲۰۹
(۶) ہر حادثہ دنیوی پہلے ملأ اعلیٰ میں نازل ہوتا ہے ۲۰۹
(۷) شریعتیں پہلے ملأ اعلیٰ میں مقرر ہوتی ہیں ۲۰۹
موتوا قبل ان تموتوا: صوفیا کا کلام ہے، حدیث نہیں ہے ۲۱۲
ملأ اعلیٰ میں تین قسم کے نفوس شامل ہیں: نورانی فرشتے، اعلیٰ درجہ کے عنصری فرشتے اور اعلیٰ درجہ کے انسانی نفوس ۲۱۱
ملأ اعلیٰ کے تین کام ہیں: پوری توجہ سے اللہ کی طرف متوجہ رہنا، پسندیدہ نظام کے لئے دعائیں کرنا اور ان کے انوار کا روح اعظم کے پاس جمع ہونا ۲۱۳
حظیرۃ القدس کی حقیقت کیا ہے؟ ۲۱۵
روح اعظم والی روایت کیسی ہے؟ ۲۱۵
جب حظیرۃ القدس میں طے پاتا ہے کہ لوگوں کو دینی اور دنیوی تباہی سے بچایا جائے تو تین باتیں وجود میں آتی ہیں ۲۱۶
نبوت کی نمود کیا ہے؟ اور روح القدس کی تائید کا مطلب کیا ہے؟ ۲۱۸
ملأ سافل (زمینی فرشتے) اور ان کے کام ۲۱۸
ملأ سافل کی تخلیق کس طرح ہوتی ہے؟ ۲۱۸
ملأ سافل کس طرح اہل زمین پر اثر انداز ہوتے ہیں ۲۱۹
اپوزیشن پارٹی (شیاطین) کا بیان ۲۲۱
باب (۴) سنت الٰہی (قانون قدرت) کا بیان ۲۲۲

خلقیت وجبلیت: دو متضاد قوتیں انسان میں یکجا کیسے ہوتی ہیں؟ دو مثالوں سے وضاحت	۲۵۲
باب (۷) انسان کا مکلف ہونا عالم کی پلاننگ میں داخل ہے	۲۵۶
لفظ تقدیر کے معنی اور مفہوم	۲۵۶
اللہ تعالیٰ نے مخلوقات کو کس انداز پر پیدا کیا ہے؟ نباتات، حیوانات اور انسان کے احوال میں غور کریں	۲۵۷
اللہ تعالیٰ نے کائنات کا نظم و انتظام کس طرح فرمایا ہے	۲۶۳
انسان کی تربیت و تدبیر کا بیان	۲۶۵
انسانوں میں صلاحیتوں کا فرق	۲۶۵
قوتِ ملکیہ کے تعلق سے انسانوں کے احوال	۲۶۶
تمام مخلوقات زبانِ حال سے تضرع کناں ہیں، مگر انسان علم و بصیرت کے ساتھ زبانِ قال سے بھی تضرع کرنا چاہتا ہے	۲۶۶
انسان کی چند اور خصوصیات	۲۶۷
انسانی امتیازات کا خلاصہ: قوتِ عقلیہ کی زیادتی اور قوتِ عملیہ کی برتری	۲۷۱
انسان کو ہر عمل پر جزا یا سزا ملنی چاہئے، بھول چوک اور اکراہ معاف کیوں ہیں؟	۲۷۳
انسان کی تربیت کے لئے شریعت ضروری ہے	۲۷۶
انسان کے مزاج کا اعتدال چار باتوں کا مرہونِ منت ہے	۲۷۶
انسان کی تربیت کے لئے پانچ علوم ضروری ہیں: توحید و صفات کا علم، عبادتوں کا علم، تدبیراتِ نافعہ کا علم، استدلال کا علم اور پند و موعظت کا علم	۲۷۹
پند و موعظت تین قسم کے مضامین سے کی جانی چاہئے	۲۸۰
علم ازلی میں علومِ خمسہ کی تعیین اور یہی اشاعرہ کے نزدیک "کلامِ نفسی" ہے	۲۸۲
علومِ خمسہ کا پہلا ظلّی اور روحانی وجود	۲۸۳
علومِ خمسہ کا دوسرا روحانی وجود	۲۸۳
علومِ خمسہ کا انبیاء پر نزول	۲۸۶
باب کی آخری بات جو باب کا ماحصل ہے	۲۸۷
باب (۸) تکلیفِ شرعی جزا و سزا کو چاہتی ہے اور مجازات کی چار وجوہ ہیں	۲۸۸
پہلی وجہ: مجازات صورتِ نوعیہ کا تقاضا ہے	۲۸۸
دوسری وجہ: مجازات ملأ اعلیٰ کی وجہ سے بھی ہوتی ہے	۲۹۰
تیسری وجہ: مجازات شریعتِ الٰہی کی وجہ سے بھی ہوتی ہے	۲۹۵

چوتھی وجہ: مجازات تعلیماتِ انبیاء کی جہت سے بھی ہوتی ہے ... ۲۹۷

مجازات کی چاروں وجوہ کے احکام ... ۲۹۹

باب (۹) اللہ تعالیٰ نے لوگوں کی فطرت مختلف بنائی ہے ... ۳۰۲

ملکیت اور بہیمیت کے مختلف انداز ... ۳۰۲

ملکیت اور بہیمیت کا اجتماع دو طرح پر ہوتا ہے ... ۳۰۸

ملکیت و بہیمیت دونوں کے اجتماع کی اقسامِ ثمانیہ ... ۳۱۰

اقسامِ ثمانیہ کے ضروری احکام ... ۳۱۱

باب (۱۰) عمل کا باعث بننے والے خیالات کے پانچ اسباب ... ۳۱۵

پہلا سبب: انسان کی جبلت وفطرت ... ۳۱۵

دوسرا سبب: انسان کا مادی مزاج ... ۳۱۷

تیسرا سبب: عادات و مالوفات ... ۳۱۸

چوتھا اور پانچواں سبب: بعض اتفاقات جو اچھے برے خیالات کا سبب بنتے ہیں ... ۳۱۸

خوابوں کا معاملہ خیالات جیسا ہے ... ۳۱۹

باب (۱۱) عمل کا نفس سے وابستہ ہونا اور اس کا ریکارڈ کیا جانا ... ۳۲۲

اعمال و اخلاق کا نفس کی جڑ سے اٹھنا ... ۳۲۳

اعمال و اخلاق کا نفس کی طرف لوٹنا ... ۳۲۶

اعمال و اخلاق کا نفس کے دامن سے چمٹنا ... ۳۲۸

بچے کا نفس شروع میں ہیولانی ہوتا ہے اور ہیولیٰ کے معنی ... ۳۲۸

اعمال و اخلاق مسلسل معدات ہیں اور معد کے معنی ... ۳۲۹

اعمال و اخلاق کا ریکارڈ کیا جانا ... ۳۳۱

ہر شخص خود بخود اپنی جزا مہیا کر دیتا ہے ... ۳۳۲

لوحِ محفوظ ایک مخلوق ہے اس کے دماغ میں ہیچ، کان والوں میں بھرے ہوئے ہیں ... ۳۳۲

عمل کا یاد رہنا بھی اس کے محفوظ ہونے کی ایک دلیل ہے ... ۳۳۳

باب (۱۲) اعمال کا ملکات سے جوڑ ... ۳۳۶

اعمال ہیئاتِ نفسانیہ کے پیکر ہائے محسوس ہیں ... ۳۳۶

اعمال: ملکات و اخلاق کے لئے جال ہیں ... ۳۳۹

کسی کے ملکات زیادہ ریکارڈ کئے جاتے ہیں اور کسی کے اعمال ... ۳۴۱

بہت سے اعمال بذات خود مقصود ہوتے ہیں ... ۳۴۴
باب (۳) مجازات کے اسباب کا بیان ... ۳۴۵
اصل اول: نفس کا احساس سبب مجازات ہے ۳۴۵
اصل دوم: فیصلۂ خداوندی بھی سبب مجازات ہے ... ۳۴۹
مجازات کی کونسی اصل کہاں کارفرما ہے؟ ... ۳۵۰
اسباب مجازات کے لئے موانع ... ۳۵۱

مبحث دوم

دنیا میں اور موت کے بعد جزاؤسزا کی کیفیت کا بیان

باب (۱) دنیا میں جزائے اعمال کا بیان (نقلی دلائل) ... ۳۵۵
دنیا میں جزائے اعمال کا بیان (عقلی دلیل) ... ۳۵۸
خارجی جزاؤسزا کا ضابطہ ... ۳۶۰
مجازات کی پانچ صورتیں: روحانی مجازات، جسمانی مجازات، متعلقات میں مجازات، آفاقی مجازات
اور اعمال میں مجازات ... ۳۶۱
باب (۲) موت کی حقیقت کا بیان ... ۳۶۸
دو قسمیں اور چار عناصر کے مرکبات ... ۳۷۰
ملکیت، کائنات الجو اور موالید ثلاثہ ... ۳۷۱
مختلف اعتبارات سے لوگوں کی مختلف انواع ... ۳۷۵
موت کے بعد اللہ تعالیٰ کا یقین اور اعمال کا احساس ہونے لگتا ہے ... ۳۷۸
ملکیت کے لئے مفید اور مضر چیزیں ... ۳۷۸
باب (۳) برزخی مجازات میں لوگوں کے مختلف احوال کا بیان ... ۳۸۱
قبر: عالم برزخ کا نام ہے، مٹی کے گڑھے ہی کا نام نہیں ہے ... ۳۸۱
بیدار قلب لوگوں کی مجازات کا بیان ... ۳۸۲
خوابیدہ طبیعت لوگوں کی مجازات کا بیان ... ۳۸۴
کمزور قوت ملکیہ اور بہیمیہ والوں کی مجازات کا بیان ... ۳۸۸
ملائکہ اور شیاطین سے ملانے والے فطری اور اکتسابی اسباب ... ۳۸۸
ملائکہ سے ملنے والوں کے بعض احوال ... ۳۸۹

شیاطین سے ملنے والوں کے بعض احوال ۳۹۰
قوی بہیمیت اور ضعیف ملکیت والوں کی مجازات کا بیان ۳۹۳
عالم برزخ اور عالم آخرت میں ایک فرق ۳۹۵
باب (۳) قیامت اور اس کے بعد کے واقعات کے کچھ اسرار و رموز کا بیان ۳۹۹
موت کے بعد انفرادی احکام ختم ہوجاتے ہیں صرف نوعی احکام باقی رہتے ہیں ۳۹۹
انسان کی انفرادی اور اجتماعی خصوصیات ۳۹۹
نوعی چیزیں دو قسم کی ہیں: ظاہری اور باطنی ۴۰۰
نوع کے افراد میں نوعی احکام کا پایا جانا محال ہے ۴۰۳
ارواح کا بارگاہ عالی کی طرف متشا دو طرح پر ہوتا ہے ۴۰۴
قیامت میں واقعات تمثیلی رنگ میں ظاہر ہوں گے ۴۰۶
فوقانی علوم آسانی سے حاصل نہیں ہوسکتے
علوم دو طرح کے ہیں: حسی اور معنوی۔ پھر معنوی علوم دو طرح کے ہیں: وہ جن سے کچھ مناسبت ہے
اور وہ جن سے بالکل مناسبت نہیں اور دونوں قسم کے معنوی علوم نہایت مشکل ہیں ۴۰۸
قیامت اور اس کے بعد پیش آنے والے واقعات کا بیان ۴۰۹

مبحث سوم

ارتفاقات کی بحث

ارتفاقات: شاہ صاحب رحمہ اللہ کی خاص اصطلاح ہے۔ اس اصطلاح کی تشریح ۴۱۷
باب (۱) ارتفاقات کو مستنبط کرنے کا طریقہ ۴۱۷
آسائش سے زندگی بسر کرنے کے لئے ارتفاقات ضروری ہیں ۴۱۸
انسان زندگی گذارنے کے فطری الہامات کے ساتھ تین چیزیں ملاتا ہے: عقلی فائدے کے لئے کام
کرنا، حاجت روائی کے ساتھ نفاست کا خیال رکھنا اور ان عقلمندوں کا پایا جانا، جو بہترین سکیمیں
وجود میں لاتے ہیں ۴۱۸
ارتفاقات مستنبط کرنے کا طریقہ ۴۲۳
تمدن کا معمولی درجہ (دیہی تمدن) ارتفاق اول ہے ۴۲۳
ترقی یافتہ تمدن (شہری تمدن) ارتفاق ثانی ہے ۴۲۳
نظام حکومت ارتفاق ثالث ہے ۴۲۳

نظامِ حکومت تین وجوہ سے ضروری ہے ... ۴۲۴
مرکزی حکومت ارتفاقِ رابع ہے ... ۴۲۵
باب (۲) ارتفاقِ اول میں شامل چیزیں ... ۴۲۹
ارتفاقِ اول میں کم از کم چار چیزیں ضرور پائی جاتی ہیں ... ۴۲۹
زبان یعنی بولی کس طرح وجود میں آتی ہے ... ۴۲۹
باب (۳) فنِ آدابِ معاش کا بیان ... ۴۳۳
فنِ آدابِ معاش کی تعریف ... ۴۳۳
اس فن کا بنیادی نقطہ ... ۴۳۵
دیہی تمدن میں رائج امور کو تین معیاروں پر جانچا جاتا ہے تو شہری تمدن وجود میں آتا ہے ... ۴۳۵
فنِ آدابِ معاش کے بڑے مسائل اٹھ ہیں ... ۴۳۵
آبادشہروں میں بسنے والے اور صحیح مزاج رکھنے والے اقالیم کا حضرات ان باتوں پر متفق ہیں ... ۴۳۶
باب (۴) فنِ تدبیرِ منزل (خانگی انتظام) کا بیان ... ۴۴۱
فنِ تدبیرِ منزل کی تعریف ... ۴۴۱
اس فن کا خلاصہ چار مسائل ہیں: نکاح، ولادت، ملکیت اور تعاون باہمی ... ۴۴۱
پہلا مسئلہ: شادی بیاہ کا بیان ... ۴۴۱
محارم سے نکاح کیوں حرام ہے؟ نکاح کس عمر میں ہونا چاہئے؟ تقریب ولیمہ ... ۴۴۲
شادی میں دف بجانا اور نکاح میں دس باتوں کا لحاظ کرنا چاہئے ... ۴۴۲
طلاق اور عدت کی ضرورت ... ۴۴۳
دوسرا مسئلہ: اولاد کے احوال کا بیان ... ۴۴۹
تیسرا مسئلہ: ملکیت کا بیان ... ۴۴۸
ملکیت بمعنی ملازمت اور ملکیت بمعنی غلامی کس طرح وجود میں آئی ہے؟ ... ۴۴۸
غلامی کا مسئلہ اسلام کا پیدا کیا ہوا نہیں ہے ... ۴۴۹
چوتھا مسئلہ صحبت (رفاقت) کا بیان ... ۴۵۱
انسان کو دو طرح کی حاجتیں پیش آتی ہیں ... ۴۵۱
فنِ تدبیرِ منزل کے بڑے مسائل تین ہیں ... ۴۵۳
باب (۵) فنِ معاملات کا بیان ... ۴۵۵
فنِ معاملات کی تعریف، اس فن میں تین باتوں سے بحث کی جاتی ہے ... ۴۵۵

خلافت کے فوائد ۴۸۹
خلیفہ کو جنگ کی وجہ سے مجبوری پڑتی ہے: دفاع کے لئے اور اقدامی طور پر ۴۹۰
مختلف وجوہ سے خلیفہ کو جنگ سے سابقہ پڑتا ہے، جن میں آٹھ باتیں یادرکھنی چاہئیں ۴۹۲
خلافت کبریٰ کے لئے پانچ باتیں ضروری ہیں ۴۹۵
باب (۱۰) ارتفاقات کی بنیادی باتیں متفق علیہ ہیں ۴۹۶
اصول اور رسوم میں فرق ۴۹۷
ارتفاقات پر لوگوں کا اتفاق کن وجوہ سے ہوا ہے ۴۹۷
باب (۱۱) لوگوں میں رائج طور طریقوں کا بیان ۵۰۲
رسوم کی اہمیت اور ان کے اسباب ۵۰۳
وہ اسباب جن کی وجہ سے رسوم چلتی ہیں ۵۰۴
وہ اسباب جن کی وجہ سے لوگ رسوم کو مضبوط پکڑتے ہیں ۵۰۴
اچھی رسمیں ضروری ہیں، ان سے ارتفاقات صالحہ کی حفاظت ہوتی ہے ۵۰۵
بری رسمیں کیسے وجود میں آتی ہیں؟ ۵۰۵
رسوم و عادات کی اصلاح کرنا بہترین عمل ہے ۵۰۹
رائج صحیح طریقہ چھوڑ کر غلط طریقہ کون اختیار کرتا ہے؟ ۵۰۹
صحیح اور غلط طریقہ اپنانے والوں کا انجام ۵۱۰
حقیقی نصرت کب ملتی ہے؟ ۵۱۰

مبحث چہارم

سعادت کے بیان میں

باب (۱) سعادت کی حقیقت کیا ہے؟ ۵۱۵
انسان کے نوعی اور شخصی کمالات ۵۱۵
انسان کے نوعی کمالات کی تین حالتیں ہیں ۵۱۵
نوعی کمالات کمال اس وقت بنتے ہیں جب نفس ناطقہ (روح ربانی) ان کو سنوارتی ہے ۵۱۶
سعادت حقیقیہ کیا ہے؟ ۵۱۸
نیک بختی حاصل کرنے کا طریقہ ۵۱۹
سعادت حقیقیہ انسان کا فطری تقاضا ہے ۵۲۳

باب (۲) نیک بختی میں اختلافِ درجات ۵۲۵

نیک بختی کے تعلق سے لوگوں کے چار درجے ۵۲۵

باب (۳) تحصیلِ سعادت کے مختلف طریقے ۵۳۰

نیک بختی حاصل کرنے کے دو طریقے: نفس کشی اور نفس کی اصلاح کرنا ۵۳۰

نیک بختی حاصل کرنے کے لئے کونسا طریقہ بہتر ہے؟ ۵۳۳

روحانی علوم کی تحصیل کا سلسلہ موت کے بعد بھی جاری رہے گا ۵۳۸

باب (۴) وہ اصول جو سعادت حاصل کرنے کے طریق ثانی کی تحصیل کا مرجع ہیں ۵۳۹

اصول چار ہیں: طہارت، اخبات، سماحت اور عدالت ۵۴۰

پہلی صفت: طہارت (پاکی) کا بیان ۵۴۰

طہارت کی حقیقت: طہارت وحدث میں فرق، طہارت کا فائدہ، حدث کا نقصان اور طہارت کے آثار ۵۴۰

دوسری صفت: اخبات (اللہ کے حضور میں نیازمندی) ۵۴۴

تیسری صفت: سماحت (فیاضی) ۵۴۶

متعلقات کے اعتبار سے سماحت اور اس کی ضد (بخل) کے مختلف القاب ۵۴۷

چوتھی صفت: عدالت (انصاف) ۵۴۹

عدالت کی تشکیل، اس کا فائدہ، اس کی اعانت ومخالفت کا ثمرہ اور عدالت کی برکت ۵۵۰

مذکورہ صفات اربعہ کی اہمیت ۵۵۲

باب (۵) خصالِ اربعہ کی تحصیل، تکمیل اور تلافیِ مافات کا طریقہ ۵۵۳

خصالِ اربعہ دو تدبیروں سے حاصل کی جاسکتی ہیں: ایک تدبیر علمی، دوسری تدبیر عملی ۵۵۳

تدبیر علمی کا بیان اور حجاب کی ضرورت ۵۵۳

تدبیر عملی کا بیان ۵۵۹

حدث رہا کی، اخبات، فیاضی اور انصاف کے اسباب کا بیان ۵۶۰

باب (۶) ظہورِ فطرت کے حجابات ۵۶۴

ظہورِ فطرت کو تین چیزیں روکتی ہیں: نفس، دنیا اور بد عقیدگی ۵۶۴

(۱) حجابِ نفس کا بیان ۵۶۴

(۲) حجابِ دنیا کا بیان ۵۶۴

(۳) حجابِ سوءِ فہم (بد عقیدگی) کا بیان ۵۶۵

گمراہی کے بڑے اسباب دو ہیں: تشبیہ اور شرک ... ۵۶۵

باب (۷) حجابات مذکورہ کو دور کرنے کا طریقہ ... ۵۶۹

(۱) حجاب نفس کے ازالہ کے دو طریقے ... ۵۷۰

(۲) حجاب دنیا کے ازالہ کی دو تدبیریں ... ۵۷۲

(۳) حجاب بدعقیدگی کو زائل کرنے کا طریقہ ... ۵۷۳

صفات باری تعالیٰ کو سمجھا جاسکتا ہے ... ۵۷۳

اللہ تعالیٰ کے لئے کونسی صفات ثابت کی جائیں؟ ... ۵۷۳

صفت مدح کو جاننے کا طریقہ ... ۵۷۵

مبحث پنجم

نیکی اور گناہ کی بحث

تمہید۔ نیکی اور گناہ کی حقیقت کا بیان ... ۵۸۱

نیکی کے کام چار قسم کے ہیں اور گناہ کے کام بھی چار قسم کے ہیں ... ۵۸۱

سنن بر کی تشکیل کس طرح ہوتی ہے؟ ... ۵۸۲

باب (۱) توحید کا بیان ... ۵۸۹

توحید کی اہمیت چار وجوہ سے ہے ... ۵۸۹

توحید کے چار مرتبے: توحید ذات، توحید خلق، توحید تدبیر اور توحید الوہیت ... ۵۸۹

توحید تدبیر اور توحید الوہیت میں اختلاف ... ۵۹۰

(۱) ستارہ پرستوں کا خیال ... ۵۹۰

(۲) مشرکین کا خیال اور ان کے تین استدلال ... ۵۹۲

(۳) عیسائیوں کا خیال اور عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں ان کے دو نظریات ... ۵۹۶

باب (۲) شرک کی حقیقت کا بیان ... ۵۹۸

صفات کمالیہ کے دو درجے اور مثالوں سے اس کی وضاحت ... ۶۰۰

شرک و تشبیہ متوارث گمراہیاں ہیں ... ۶۰۳

شرک و تشبیہ کی بیماریاں تین وجوہ سے پیدا ہوتی ہیں ... ۶۰۳

صفات واجب کی معرفت میں جہل بسیط معتبر نہیں ... ۶۰۵

انبیاء نے شرک کی حقیقت واشگاف کردی ہے ... ۶۰۷

شرک جلی سے بچاروں کی نوعیت ۲۱۰
مظاہر شرک کا علم اور ایک واقعہ جس سے شرک کی حقیقت واضح ہوئی ۲۱۱
باب (۳) مظاہر شرک یعنی شرک کی صورتوں کا بیان ۲۱۳
شرک کی حقیقت اور شرک کے مظاہر ۲۱۳
نیت اور مظاہر کے اعتبار سے شرک کی تقسیم ۲۱۶
شرک کی صورتوں کا تفصیلی بیان ۲۱۶
(۱) غیر اللہ کو سجدہ کرنا ۲۱۷
توحید عبودیت دین کا بنیادی اور قطعی مسئلہ ہے ۲۱۷
فرشتوں نے آدم علیہ السلام کو کیسا سجدہ کیا تھا؟ ۲۱۷
(۲) حوائج میں غیر اللہ سے مدد طلب کرنا ۲۲۰
(۳) کسی کو اللہ کا بیٹا یا بیٹی کہنا ۲۲۱
(۴) علماء ومشائخ کو تحلیل وتحریم کا اختیار دینا ۲۲۲
غیر اللہ کو تحلیل وتحریم کا اختیار دینا شرک کیوں ہے؟ ۲۲۳
شاہ صاحب قدس سرہ غیر مقلد نہیں تھے ۲۲۴
شریعت کی بعض باتوں سے اباء بھی شرک کے زمرہ میں آتا ہے ۲۲۴
بعض نومسلم گائے کا گوشت کھانے سے باز رہتے ہیں ۲۲۵
(۵) غیر اللہ کے لئے جانور ذبح کرنا ۲۲۷
(۶) غیر اللہ کے نام پر جانور چھوڑنا ۲۲۷
غیر اللہ کے نام پر چھوڑے ہوئے جانور کا حکم ۲۲۷
(۷) غیر اللہ کی قسم کھانا ۲۲۸
(۸) غیر اللہ کے آستانوں کا حج کرنا ۲۲۹
(۹) غیر اللہ کی طرف بندگی کی نسبت کرنا ۲۲۹
دادی حواء نے اپنے بیٹے کا نام عبدالحارث رکھا تھا: یہ روایت باطل ہے ۲۳۰
عبدالنبی، عبدالرسول وغیرہ نام رکھنا نہیں چاہئیں ۲۳۱
باب (۴) صفات الٰہیہ پر ایمان لانے کا بیان ۲۳۳
صفات کے باب میں دشواریاں اور ان کا حل ۲۳۴
ذات وصفات کے معاملہ میں چار باتیں ملحوظ رکھنی ضروری ہیں ۲۳۴

صفات باری تعالیٰ کے بیان میں پانچ قاعدوں کا لحاظ ضروری ہے ۶۳۵
پہلا قاعدہ: بیان صفات کے لئے الفاظ بمعنی وجود غایات استعمال کئے جائیں۔ دو مثالوں سے اس کی وضاحت ۶۳۵
دوسرا قاعدہ بادشاہ اپنی مملکت کو مؤثر کرنے کیلئے جو تعبیرات اختیار کرتے ہیں، وہ مستعار لی جائیں ۶۳۷
تیسرا قاعدہ: بیان صفات میں تشبیہات دو شرطوں کے ساتھ استعمال کی جائیں ۶۳۷
چوتھا قاعدہ: صفات باری کی ترجمانی کے لئے جامع الفاظ استعمال کئے جائیں ۶۳۷
پانچواں قاعدہ: صفات ثبوتیہ کے اثبات کی طرح صفات سلبیہ کی نفی بھی کی جائے ۶۳۷
صفات پر دلالت کرنے والے الفاظ ہو بہو استعمال کئے جائیں اور استعمال سے زیادہ ان کے بارے میں کھود کرید نہ کی جائے ۶۳۹
کبھی صفات از قبیل متشابہات ہیں ۶۴۳
صفات کے بارے میں محدثین (اسلاف) کا موقف صحیح ہے ۶۴۳
صفات کے بارے میں فرق باطلہ کے خیالات اور اہل حق کا موقف ۶۴۴
صفات کے بارے میں اہل حق کے دو موقف ہیں: تنزیہ مع التفویض اور تنزیہ مع التاویل ۶۴۵
صفات کے بارے میں غور طلب دو باتیں ہیں: اللہ تعالیٰ اپنی صفات کے ساتھ کس طرح متصف ہیں؟ اور اللہ تعالیٰ کو کن صفات کے ساتھ متصف کرنا جائز ہے؟ ۶۴۶
صفات تین حکمتوں کی وجہ سے توقیفی ہیں ۶۴۷
صفات الٰہیہ کے معانی کا تفصیلی بیان: ۶۴۹
(۱) صفت حیات کا بیان ۶۵۰
(۲) صفت علم کا بیان ۶۵۰
(۳) صفات سمع و بصر کا بیان ۶۵۰
(۴) صفت ارادہ کا بیان .... ۶۵۱، ۶۸۳
صفت ارادہ قدیم ہے، البتہ اشیاء کے ساتھ اس کا تعلق حادث ہے ۶۵۱
(۵) صفت قدرت کا بیان ۶۵۳
(۶) صفت کلام کا بیان ۶۵۳
صفت ذاتی اور صفت فعلی کی تعریفات ۶۵۳
صفات کو ایک حد تک ہی سمجھا جا سکتا ہے ۶۵۴

فیضانِ علوم (وحی) کی چار صورتیں	۲۵۵
(۷) صفاتِ رضا و شکر، سخط و لعن اور اجابتِ دعا کا بیان	۲۵۸
نظامِ عالم مصلحتِ خداوندی کے مقتضی کے مطابق جاری ہے	۲۵۸
(۸) صفتِ رویت کا بیان	۲۵۹
باب (۵) تقدیر پر ایمان لانے کا بیان	۲۶۱
تقدیر کے معنی اور تقدیر ملزم کا مطلب	۲۶۱
تقدیر معلّق صرف بندوں کے اعتبار سے ہوتی ہے	۲۶۱
تقدیر وجدانی کا مطلب	۲۶۱
بھلی بری تقدیر کا مطلب	۲۶۱
تقدیر کی ضرورت اور اس کا دائرہ	۲۶۲
تقدیر کا مسئلہ آسان ہے	۲۶۳
تقدیر کا مسئلہ دو وجہ سے مشکل بن گیا ہے	۲۶۴
لوگ قضا و قدر کے مسئلہ کو شمولِ علم کے مسئلہ کے ساتھ رلا دیتے ہیں	۲۶۵
تقدیر پر ایمان لانے کی اہمیت اور اس کے فوائد	۲۶۵
تقدیرِ الٰہی کے پانچ مدارج و مظاہر: (۱) ازل میں (۲) عرش کی تخلیق کے بعد (۳) تخلیقِ آدم کے بعد (۴) شکمِ مادر میں (۵) دنیا میں موجود ہونے سے کچھ پہلے	۲۶۸
لوحِ محفوظ میں تقدیر لکھنے کا مطلب	۲۷۱
عہدِ الست کسی کو یاد نہیں، پھر اس کی وجہ سے مؤاخذہ کیسے درست ہے؟	۲۷۳
محو و اثبات عالمِ مثال میں ہوتا ہے، لوحِ محفوظ میں نہیں	۲۷۹
عالمِ مثال کا ثبوت	۱۸۹،۲۷۸
تقدیر اور اسبابِ ظاہری میں تعارض نہیں	۲۸۰
بندوں کا اختیار بھی باذنِ الٰہی ہے	۲۸۱
باب (۶) عبادت اللہ تعالیٰ کا بندوں پر ایک حق ہے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ بالارادہ منعم و مجازی ہیں	۲۸۲
صفتِ ارادہ کا بیان	۱۵۱،۲۸۳
صفتِ ارادہ کے تعلق سے حکماء پر رد	۲۸۹
اسباب سے مسببات کس طرح پیدا ہوتے ہیں؟ اشاعرہ، معتزلہ، فلاسفہ اور ماتریدیہ کی آراء	۲۸۹

حکماء کی کوتاہ بینی کہ وہ صفت ارادہ کے تعلق حادث کے مقام کو نہیں جان سکے ۶۸۷
حکماء کے خلاف انفس سے دلیل ۶۸۷
صفت ارادہ کے تعلق سے فلاسفہ پر رد اور حکماء کے خلاف "آفاق" سے دلیل ہے ۶۸۹
"حق اللہ" کی تفہیم کا طریقہ ۶۹۳
"حق اللہ" فطری میلان کی تعبیر و ترجمانی ہے ۶۹۳
فطری میلان ایک نورانی لطیفہ ہے ۶۹۵
فطری میلان کا بھی احساس نہیں ہوتا ۶۹۶
فطری میلان ضائع کرنے والوں کے احوال ۶۹۸
ہر حق نفس کا نفس پر حق ہوتا ہے: سہولت فہم کے لئے حق اللہ وغیرہ کہا جاتا ہے ۷۰۱
باب (۷) شعائر اللہ کی تعظیم کا بیان ۷۰۳
شعائر اللہ کے معنی اور ان کے مصداق ۷۰۳
شعائر اللہ کی اہمیت ۷۰۴
شعائر اللہ کیا ہیں؟ ۷۰۵
شعائر اللہ کیسے تشکیل پاتے ہیں ۷۰۶
تشریع میں جمہور کا حال ملحوظ رکھا جاتا ہے ۷۰۷
چار بڑے شعائر اللہ: قرآن، کعبہ، نبی اور نماز ۷۰۹
(۱) قرآن کریم شعائر اللہ میں کیسے شامل ہوا؟ ۷۰۹
(۲) کعبہ شریف دین اسلام کی مخصوص علامت کیسے بنا؟ ۷۱۱
(۳) نبی کا شعائر اللہ میں سے ہونا ۷۱۳
(۴) نماز کا شعائر اللہ میں سے ہونا ۷۱۴
باب (۸) وضوء و غسل کے اسرار و رموز کا بیان ۷۱۶
پانی کے معاملہ میں لوگ تین طرح کے ہیں ۷۱۶
حدث کی دو قسمیں: حدث اصغر اور حدث اکبر ۷۱۹
طہارت کی دو قسمیں: عرفی اور شرعی ۷۲۳
طہارت کے آٹھ فائدے ۷۲۸
باب (۹) نماز کے اسرار کا بیان ۷۳۱

نماز کے تعلق سے انسانوں کی تین قسمیں	۷۳۱
نماز کا ایک اہم فائدہ	۷۳۳
نماز کی ہیئت ترکیبی کا بیان	۷۳۳
نماز کیوں ضروری ہے، کیا ذکر وفکر کافی نہیں؟	۷۳۶
نماز کے آٹھ فائدے	۷۳۹
باب (۱۰) زکوۃ کے اسرار کا بیان	۷۴۲
مخلوق کی بخشش لہٰذا حقوق صدقہ ضروری ہوئے	۷۴۲
(۱) ضرورت مندوں کی حاجت روائی کے لئے	۷۴۳
(۲) رحمت خداوندی کے حصول کے لئے	۷۴۳
(۳) مرض بخل کے علاج کے لئے	۷۴۵
(۴) بلاؤں اور آفتوں کو ٹالنے کے لئے	۷۴۶
(۵) گناہوں سے حفاظت کے لئے	۷۴۷
(۶) خاندان کی خبر گیری کے لئے	۷۴۸
زکوۃ کے چار فائدے	۷۴۹
باب (۱۱) روزوں کی حکمتوں کا بیان	۷۵۰
روزوں کے تعلق سے لوگوں کی تین قسمیں	۷۵۰
روزوں میں معاصی ومنکرات سے بچنا بھی ضروری ہے	۷۵۰
روزوں کے تین مقاصد:	۷۵۲
(۱) طبیعت کو عقل کا مطیع بنانا	۷۵۳
(۲) گناہوں سے حفاظت ہونا	۷۵۳
(۳) زور شہوت کا علاج	۷۵۳
روزے کے فوائد	۷۵۴
اعتکاف کا بیان	۷۵۶
اعتکاف کے تعلق سے لوگوں کی تین قسمیں	۷۵۷
اعتکاف کے دو فائدے:	۷۵۸
پہلا فائدہ: زبان کے گناہوں سے بچا رہنا	۷۵۸

دوسرا فائدہ: شب قدر کی تلاش کرنا ۷۵۹
باب (۱۲) حج کی حکمتوں کا بیان ۷۵۹
حج کی حقیقت کیا ہے؟ ۷۵۹
حج ہر ملت میں ہے ۷۶۰
حج بیت اللہ کا حق ہے ۷۶۱
حج کے چار مقاصد: حج سامانِ تصویر ہے، حج یادگار ہے، حج اصل مذہب کی ایک شکل ہے اور حج ملی
شان وشوکت اور باہمی تعارف کا ذریعہ ہے ۷۶۳
حج کے تین اہم فائدے: حج روحانی بیماریوں سے بچاتا ہے، حج اکابر ملت کے احوال یاد دلاتا ہے
اور حج مبرور سے تمام گناہ معاف ہوجاتے ہیں ۷۶۶
باب (۱۳) نیکی کے مختلف کاموں کی حکمتیں ۷۶۸
(۱) ذکر اللہ کی فضیلت اور اس کے چار فائدے ۷۶۸
ذکر اللہ دو شخصوں کے لئے خاص طور پر مفید ہے ۷۶۹
(۲) دعا کی فضیلت اور اس کے تین فائدے ۷۷۰
(۳) تلاوتِ قرآن اور وعظ ونصیحت سننے کی فضیلت اور اس کے دو فائدے ۷۷۱
(۴) حسن صوت کی فضیلت اور اس کے تین فائدے ۷۷۲
(۵) جہاد کی فضیلت ۷۷۳
تین صورتوں میں جہاد ضروری ہوجاتا ہے ۷۷۴
(۶) آفات ومصیبت کی حکمتیں ۷۷۵
آفات وبلیات چار وجوہ سے نیکیاں بنتی ہیں ۷۷۵
باب (۱۴) گناہوں کے مدارج ۷۷۹
گناہ کیا ہیں؟ اور گناہوں کے پانچ مراتب ۷۷۹
پہلا مرتبہ کفر وشرک کا ہے ۷۷۹
دوسرا مرتبہ دین سے اعراض کا ہے ۷۸۳
تیسرا مرتبہ مہلکات کا ہے ۷۸۴
چوتھا مرتبہ شریعت کی خلاف ورزی کا ہے ۷۸۶
پانچواں مرتبہ ارتفاقات کی خلاف ورزی کا ہے ۷۸۸

باب (۱۵) گناہوں کے مفاسد کا بیان	۴۹۱
صغیرہ اور کبیرہ گناہوں کی حد بندی	۴۹۱
توبہ کے بغیر کبیرہ گناہ معاف ہو سکتا ہے؟	۴۹۴
باب (۱۶) وہ گناہ جو آدمی کی ذات سے تعلق رکھتے ہیں	۴۹۷
گناہ دو طرح کے ہیں: لازم اور متعدی، اور لازم گناہ کے تین درجے	۴۹۷
پہلا درجہ: اکبر الکبائر کا ہے یعنی الحاد و انکار کا	۴۹۷
دہریت کیا ہے؟ اور عہد الست کا ذکر	۴۹۸
اللہ تعالیٰ کی غایت درجہ تعظیم کب ممکن ہے؟	۴۹۹
انسان کی شدید ترین بدبختی اشراک ہے	۴۹۹
کُلَّ یومٍ ھو فی شأن میں "شان" کیا چیز ہے؟	۵۰۰
دوسرے درجہ کے کبائر کا بیان	۵۰۲
تیسرے درجہ کے گناہوں کا بیان	۵۰۳
باب (۱۷) وہ گناہ جن کا لوگوں سے تعلق ہوتا ہے یعنی متعدی گناہوں کا بیان	۵۰۷
متعدی گناہ تین قسم کے ہیں: بہیمی، درندگی والے اور وہ گناہ جو بدمعاملگی کے قبیل سے ہیں	۵۰۷
انسان اور دیگر حیوانات میں فرق	۵۰۷
انسان کو اس کی تمام ضروریات فطری طور پر کیوں الہام نہیں کی گئیں؟	۵۰۸
انسان ضروری علم پانچ ذرائع سے حاصل کرتا ہے	۵۰۸
لوگوں کے علوم میں تفاوت، قابلیت کے تفاوت سے ہوتا ہے	۵۰۹
متعدی گناہوں کے اقسام اور ان کی حرمت کا بیان اور زنا اور ہم جنس پرستی کی حرمت	۵۱۱
شراب کے نشہ میں چور رہنے کی حرمت	۵۱۳
ضربِ الیم کی حرمت	۵۱۵
زہر خورانی، جادو سے مارنے اور خودکشی کرنے کی حرمت	۵۱۶
بدمعاملگی سے پیدا ہونے والے گناہوں کی حرمت	۵۱۷
مذکورہ بالا گناہوں کا وبال	۵۱۸
اصطلاحات جن کی کتاب میں تشریح کی گئی ہے	۵۲۰
شارح کے مختصر حالات	۵۲۲

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سخن ہائے گفتنی

زبان قلم میں یہ قدرت کہاں — جو ہو حمد خالق میں گوہر فشاں

بے نہایت حمد و سپاس اس ذات قدسی والا صفات کے لئے ہے جس نے مشت خاک کو جامۂ انسانیت پہنایا۔ پھر اس کے سر پر اشرفیت کا تاج رکھا۔ اور جس طرح اس کی جسمانی ضروریات کا انتظام فرمایا اس کی روحانی ضروریات بھی الہام فرمائیں۔ ایسی ہدایات نازل فرمائیں جن کی پیروی سے کلاہ دہقانی با آفتاب رسید۔ انسان رشک کرّ وبیان بن گیا۔ اور ایسے احکام نازل فرمائے جن کی تعمیل میں سعادت دارین مضمر ہے۔ دنیا کی خوبی اور آخرت کی بھلائی اسی کی رہین منت ہے۔

اور بے پایاں رحمتیں اور سلامتی نازل ہوں ان تمام برگزیدہ ہستیوں پر جنھوں نے انسانوں کو سنوارنے میں اور ان کو احکام الٰہی کے فوائد و برکات سمجھانے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ خاص طور پر اس گروہ کے آقا، سالار دو سید ابرار، غایت کائنات، فخر موجودات، حضرت ختمی مرتبت ﷺ پر، جنھوں نے ہر طرح سے لوگوں پر اتمام حجت کر دیا اور دین الٰہی کا کوئی گوشہ تشنہ باقی نہیں چھوڑا۔

اور آپ کی آل و اصحاب پر، اور آپ کے دین متین کے حاملین: اساطین امت پر، جنھوں نے شریعت مطہرہ کے رموز و اسرار کو طشت از بام کر دیا اور حقائق و دقائق کو پوری طرح واشگاف کر دیا۔ اللہ تعالیٰ امت کی طرف سے ان حضرات کو جزائے خیر عطا فرمائیں۔ اور ہم کو ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائیں (آمین)

حمد و صلوٰۃ کے بعد عرض ہے کہ ''حجۃ اللہ البالغہ'' کو امام اکبر، مجدد اعظم، محدث کبیر، مفکر ملت، حکیم الاسلام، جامع شریعت و طریقت، حضرت اقدس مولانا قطب الدین احمد معروف بہ شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی قدس سرہ کی تصانیف میں واسطۃ العقد (ہار کے بیچ کے عمدہ جوہر) کا مقام حاصل ہے۔ البالغہ کے معنی ہیں: پختہ، مضبوط اور کامل۔ روح المعانی میں ہے: البالغۃ ای التی بلغت غایۃ المتانۃ والقوۃ علی الاثبات۔ پس حجۃ اللہ البالغہ کے معنی ہیں: کامل برہان الٰہی۔ شاہ صاحب رحمہ اللہ نے یہ نام سورۃ الانعام کی آیت ۱۴۹ سے اخذ فرمایا ہے۔ اس آیت میں تکلیف شرعی کے راز، مجازات کی حکمت اور احکام شرعیہ کے مبنی بر حکمت و مصالح ہونے کی طرف اشارہ ہے۔ جس کی تفصیل آگے وجہ

تفہیمہ کے عنوان سے تحت آ رہی ہے۔ شاہ صاحب رحمہ اللہ کی اس کتاب کا موضوع بھی یہی مضامین ہیں۔ اس لئے آپ نے اس کتاب کا نام حجۃ اللہ البالغۃ (کامل برہان الٰہی) تجویز کیا ہے۔ یہ کتاب بجا طور پر آپ کی تصنیفات میں شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے۔ سید محترم حضرت اقدس مولانا ابوالحسن علی میاں صاحب ندوی رحمہ اللہ اس کتاب کے متعلق تحریر فرماتے ہیں کہ:

"شاہ صاحب کی یہ مایۂ ناز تصنیف آنحضرت ﷺ کے ان معجزات میں سے ہے جو آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد آپ کے امتیوں کے ہاتھ پر ظاہر ہوئے، اور جن سے اپنے وقت میں رسول اللہ ﷺ کا اعجاز نمایاں اور اللہ کی حجت تمام ہوئی"

شاہ صاحب رحمہ اللہ کو ادراک ہو گیا تھا، اور کتاب کے مقدمہ میں اس کی طرف اشارہ بھی ہے کہ آگے عقلیت پسندی کا دور شروع ہونے والا ہے جس میں احکام شریعت کے متعلق اوہام و شکوک کی گرم بازاری ہوگی۔ اسی خطرہ کا سد باب کرنے کے لئے آپ نے یہ بے نظیر کتاب لکھی ہے۔ اس میں آپ نے تعلیمات اسلام کو مطابق فطرت اور احکام دینیہ کو مبنی برحکمت ثابت کیا ہے۔ یہ علم اسرار الدین اور اسرار شریعت کے اسرار و مصالح نہایت بلیغ اور مدلل انداز میں بیان فرماتے ہیں، جس سے ایک طرف تو متشککین اور متردّدین کے شکوک و شبہات کا ازالہ ہو جاتا ہے اور دوسری طرف معترضین کے اسلام پر معاندانہ اعتراضات کا منہ توڑ جواب ہو جاتا ہے۔

اس سلسلہ میں حضرت اقدس مولانا محمد منظور نعمانی رحمہ اللہ کی اپنی سرگزشت ملاحظہ فرمائیں۔

"میں اپنی زندگی میں کسی بشری تصنیف سے اتنا مستفید نہیں ہوا، جس قدر کہ اس کتاب سے خدا نے مجھے فائدہ پہنچایا۔ میں نے اسلام کو ایک مکمل اور مربوط الاجزاء نظام حیات کی حیثیت سے اسی کتاب ہی سے جانا ہے۔ دین مقدس کی ایسی بہت سی باتیں جن کو پہلے میں صرف تقلیداً مانتا تھا، اس جلیل القدر کتاب کے مطالعہ کے بعد الحمد للہ میں ان پر تحقیقاً اور پوری بصیرت یقین رکھتا ہوں"

غیر مقلد عالم جناب نواب صدیق حسن خاں صاحب "اتحاف النبلاء" میں تحریر فرماتے ہیں۔

"ایں کتاب اگرچہ در علم حدیث نیست، اما شرح احادیث بسیار دراں کردہ، و حکم و اسرار آں بیان نمودہ، تا آنکہ در فن خود غیر مسبوق علیہ واقع شدہ، و مثل آں دریں دوازدہ صد سال ہجری ہیچ یکے از علمائے عرب و عجم تصنیفے موجود نیست"

اس فارسی عبارت کا ترجمہ یہ ہے:

"یہ کتاب اگرچہ فن حدیث میں نہیں ہے، مگر اس میں بہت سی احادیث کی شرح کی ہے، اور ان کی حکمتیں اور ان کے راز بیان کئے ہیں۔ یہاں تک کہ یہ کتاب اپنے فن میں بے نظیر واقع ہوئی ہے۔ اور اس جیسی کتاب ان

اسلامی بارہ صدیوں میں عرب وعجم کے کسی عالم میں موجود نہیں ہے"

حجۃ اللہ البالغہ کے اردو تراجم:

اس کتاب کے درج ذیل اردو تراجم ہو چکے ہیں:

(۱) — نعمۃ اللہ السابغۃ: یہ ترجمہ کتاب سے پہلا ترجمہ ہے۔ مترجم حضرت مولانا ابو محمد عبد الحق صاحب حقانی رحمہ اللہ (۱۲۶۷-۱۳۳۵ھ) صاحب تفسیر حقانی ہیں۔ ۱۳۰۲ھ میں مولانا نے یہ ترجمہ بہ تحریک جناب مولانا محمد فضل الرحمٰن صاحب رئیس اعظم عظیم آباد (پٹنہ) کیا ہے۔ یہ ترجمہ دو جلدوں میں متن کے ساتھ مطبوعہ ہے اور آج کل بازار میں بھی ترجمہ دستیاب ہے۔

(۲) — آیات اللہ الکاملۃ: از جناب مولانا خلیل احمد بن مولانا سراج احمد اسرائیلی سنبھلی رحمہ اللہ (متوفی ۱۳۲۰ھ) یہ ترجمہ متن کے بغیر ۴۲۰ صفحات میں ۱۳۱۵ھ مطابق ۱۸۹۷ء میں لاہور سے طبع ہوا ہے۔

(۳) — شموس اللہ البازغۃ: از حضرت مولانا عبد الحق صاحب ہزاروی رحمہ اللہ۔ یہ ترجمہ ۱۳۵۱ھ میں شیخ الٰہی بخش نے لاہور سے شائع کیا ہے۔ یہ ترجمہ سراسر آیات اللہ الکاملہ کی نقل ہے۔ صرف شروع کے چند ابواب کا ترجمہ بدلا ہے۔ (یہ تینوں ترجمے میرے پاس ہیں)

(۴) — اس کے علاوہ ایک اور ترجمہ جناب محمد بشیر صاحب نے کیا ہے اور کچھ تشریحی فوائد بھی شامل کیے ہیں۔ لیکن یہ ترجمہ ناقص ہے اور مبحث دوم پر ختم ہو جاتا ہے۔ یہ چھوٹے سائز پر بغیر متن کے شائع ہوا ہے۔ میں نے یہ ترجمہ نہیں دیکھا۔ جناب مولانا معراج محمد بارق صاحب نے حجۃ اللہ مترجم مولانا حقانی کے مقدمہ میں اس کا تذکرہ کیا ہے۔

(۵) — لاہور سے مولانا عبد الرحیم صاحب کا ترجمہ بھی بغیر عربی متن کے شائع ہوا ہے۔ میں نے یہ ترجمہ بھی نہیں دیکھا۔ مولانا بارق صاحب نے اس کا تذکرہ کیا ہے۔

(۶) — برہان الٰہی: از مولانا ابو الحسن محمد اسماعیل صاحب گودھروی (گجراتی) یہ تاحال آخری ترجمہ ہے۔ مترجم غیر مقلد عالم ہیں آپ نے یہ ترجمہ بہ تحریک مولانا ابو الکلام آزاد اور مولانا عبید اللہ سندھی اور مولانا محمد منظور نعمانی رحمہم اللہ کیا ہے۔ اور شیخ غلام علی نے اس کو لاہور سے شائع کیا ہے۔ پھر دوبارہ شائع نہیں ہوا۔ نہایت نایاب ہے۔ میرے پاس یہ ترجمہ ہے اور میں نے اس سے استفادہ کیا ہے۔

اس آخری مترجم نے سابقہ تراجم پر درج ذیل تبصرہ کیا ہے:

"اس کتاب کے اردو تراجم پہلے بھی ہو چکے ہیں۔ لیکن وہ ترجمے کیا ہیں؟ ایک چیستان ہیں۔ جس میں مغلق مقامات کو اور بھی زیادہ مغلق کر دیا گیا ہے۔ اکثر الفاظ مفردہ کا ترجمہ الفاظ مفردہ سے کیا گیا ہے۔ جس سے مطلب

کی وضاحت تو درکنار، الجھاؤ اور بڑھ گیا ہے۔ ایسے مقامات اور الفاظ کو جملوں اور سطروں سے واضح کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ تحت اللفظ در تحت اللفظ جیسا ترجمہ اس کتاب کی شان کے خلاف ہے۔ بلکہ کتاب کے مطالب کو بگاڑتا ہے" (برہان الٰہی صفحہ ۲۳)

مگر یہ آخری ترجمہ بھی سابقہ تراجم سے کچھ بہتر نہیں۔ مترجم نے بیشک جگہ جگہ شاہ صاحب کے مختصر الفاظ کو جملوں اور سطروں سے واضح کیا ہے مگر وہ "من چہ سرایم و طنبورہ من چہ سراید" کا مصداق ہے۔

علاوہ ازیں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ نے المصالح العقلیۃ للأحکام النقلیۃ (جو اب "احکام اسلام عقل کی روشنی میں" کے نام سے شائع ہوتی ہے) مطلق تراجم کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے کہ:

"اس مبحث میں (یعنی مصالح عقلیہ کے بیان میں) ہمارے زمانہ سے کسی قدر پہلے زمانہ میں حضرت مولانا شاہ ولی اللہ صاحب حجۃ اللہ البالغہ لکھ چکے ہیں۔ سنا ہے کہ ترجمہ اس کا بھی ہو چکا ہے۔ مگر عوام کو اس کا مطالعہ مناسب نہیں کہ (اصل کتاب) اغماض زیادہ ہے (یعنی صرف ترجمے سے کتاب سمجھ میں نہیں آسکتی) (احکام دیباچہ مصالح عقلیہ)

شرح کی ضرورت:

غرض حجۃ اللہ البالغہ کے لئے شرح کی ضرورت تھی۔ اور ہر کوئی اس ضرورت کو محسوس بھی کرتا تھا۔ مگر چند دشواریاں ایسی تھیں، جن کی وجہ سے آج تک کسی نے یہ فریضہ انجام نہیں دیا۔ وہ دشواریاں یہ ہیں:

۱۔ مصنف کا البیلا انداز نگارش — شاہ صاحب قدس سرہ عرش پر بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔ شرح میں ان مضامین کو جب تک فرش پر نہ لایا جائے بات نہیں بن سکتی۔ اور یہ کام کتنا دشوار ہے اس کا اندازہ ہر کوئی کر سکتا ہے۔

۲— عبارت میں نہایت درجہ ایجاز — شاہ صاحب مختصر نویس ہیں۔ ایک کلمہ بھی زائد از حاجت نہیں لاتے۔ بلکہ بعض جگہ تو عبارت میں تنگی کارفرما نظر آتی ہے۔ یہ چیز ہوئی کہ شاہ صاحب مترادفات استعمال کرنے کے عادی ہیں۔ مفرد کی مفرد سے، جملہ ناقصہ کی جملہ ناقصہ سے اور جملہ تامہ کی جملہ تامہ سے تعبیر کرتے ہیں، جس سے دال دلیا ہو جاتا ہے۔ اگر شاہ صاحب کی نگارش میں یہ بات نہ ہوتی تو بہت سے مضامین لوگوں کی گرفت سے باہر رہ جاتے۔

۳— مخصوص اصطلاحات — شاہ صاحب کی اپنی کچھ مخصوص اصطلاحات ہیں، جب تک ان کو ملحوظ نہ رکھا جائے مضمون ذہن نشین نہیں ہو سکتا۔ اور نہ شاہ صاحب نے اپنی اصطلاحات کی کسی جگہ تشریح کی ہے، نہ کسی اور نے یہ کام بخوبی انجام دیا ہے۔

۴— فکری بلند پروازی — شاہ صاحب کی فکری بلند پروازی کا یہ حال ہے کہ بعض جگہ تو ان کے پیچھے چلنا بھی

دشوار ہو جاتا ہے اور آپ ہی کی لکھی ہوئی کہاوت آپ پر صادق آتی ہے کہ: "جناب تو شیر پر سوار ہیں، آپ کے پیچھے سواری کرنے کی ہمت کون کر سکتا ہے!"

۵- مضامین کی جدت — شاہ صاحب کی ہر بات انوکھی ہوتی ہے۔ ہر مصنف کی باتوں کو حل کرنے کے لئے کچھ نہ کچھ مصادر و مراجع مل جاتے ہیں، مگر شاہ صاحب کی کوئی بات کسی کتاب میں نہیں ملتی، پھر یہ مضامین کیسے حل کئے جائیں!

غرض مذکورہ بالا وجوہ سے اور ان کے علاوہ دیگر وجوہ سے یہ تردد باقی چلا آ رہا تھا کہ ایک بڑھیا اپنا تکلی بھر کاتا ہوا سوت لے کر بازار مصر میں یوسف کی خریدار بن کر آگئی۔ دیکھئے اس کا نصیب کیسا ہے!

☆ ☆ ☆

میں نے یہ کتاب حکیم الاسلام حضرت اقدس مولانا محمد طیب صاحب قاسمی قدس سرہ (سابق مہتمم دار العلوم دیوبند) سے پڑھی ہے۔ حضرت کو شاہ صاحب کے علوم پر کمال قدرت حاصل تھی۔ مگر افسوس کہ درس میں چند ابواب ہی شامل تھے۔ کاش حضرت سے پوری کتاب یا کتاب کا معتد بہ حصہ پڑھنے کی سعادت حاصل ہوتی۔

پھر جب میں نے العون الکبیر فی حل الفوز الکبیر لکھی تو اس میں یہ التزام کیا تھا کہ شاہ صاحب کے کلام کی خود شاہ صاحب کے کلام سے شرح کی جائے۔ چنانچہ راندیر کے قیام کے زمانہ میں اس مقصد سے پہلی مرتبہ پوری کتاب کا مطالعہ کیا، مگر اس وقت کتاب کما حقہ حل نہیں ہوئی تھی۔

پھر جب ۱۴۰۸ھ میں دار العلوم دیوبند میں اس کتاب کا درس مجھ سے متعلق کیا گیا تو میں نے ازسرنو پوری کتاب کا مطالعہ کیا۔ اور مطبوعہ صدیقی سے پوری کتاب کا مقابلہ بھی کیا۔ اس مقابلہ سے مجھے بہت فائدہ ہوا۔ کتاب کا بڑا حصہ بحمد اللہ حل ہو گیا اور یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ کتاب میں کچھ ایسی طباعتی اغلاط ہیں جن کی تصحیح کے بغیر کتاب کما حقہ حل نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ اسی وقت سے مجھے کتاب کے مخطوطوں کی تلاش رہی۔ بالآخر "جوئندہ یابندہ" مقصد میں کامیابی ہوئی۔

☆ ☆ ☆

میری خواہش یہ بھی تھی کہ شرح لکھنے سے پہلے کم از کم ایک بار پوری کتاب پڑھا لوں۔ کیونکہ پڑھانے سے مضامین کی تسہیل کا طریقہ ہاتھ آجاتا ہے۔ مگر یہ بات مقدر نہ تھی۔ ایک سال دار العلوم دیوبند کے استاذ، برادر عزیز جناب مولانا مفتی محمد امین صاحب پالن پوری زید شرفہ اور مرحوم نورِ چشم مولوی رشید احمد رحمہ اللہ (متوفی ۱۴۱۵ھ) نے اسی مقصد سے حجۃ اللہ البالغہ کے سبق میں شرکت بھی کی تا کہ وہ تقریر ضبط کریں۔ عصر کے بعد بھی قسم دوم سے سبق شروع کیا گیا۔ مگر طلبہ نے اس وقت کے ناظم تعلیمات حضرت مولانا ریاست علی صاحب بجنوری زید مجدہ سے شکایت کی کہ درس املاء

کرانے سے کتاب سمجھ میں نہیں آتی۔ کلام سننے میں تسلسل باقی نہیں رہتا۔ ذہن بات سے ہٹ جاتا ہے، چنانچہ وہ سلسلہ موقوف کرنا پڑا۔ اور عصر کے بعد کا سبق بھی چند روز کے بعد بند ہو گیا۔

پھر اتفاق یہ ہوا کہ ۱۴۱۸ھ میں طلبہ نے پورے سال کی تقریر ٹیپ کی اور صاف کر کے مجھے دی تاکہ میں اس کو مرتب کروں۔ چنانچہ ۱۴۱۹ھ میں جب سبق شروع ہوا تو میں نے اس تقریر کو مرتب کرنا شروع کیا۔ مگر وہ تقریر چوتھے مبحث پر ختم ہوتی، کیونکہ درس میں کتاب اتنی ہی پڑھائی جاتی تھی۔ اس طرح مجبوراً کام آگے بڑھانا پڑا۔ اور بحمد اللہ دو سال کے عرصہ میں کتاب کے ایک معتد بہ حصہ پر کام ہو گیا۔ اس میں سے یہ جلد اول قارئین کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہے۔ اور دوسری جلد کی کتابت چل رہی ہے۔ وہ بھی ان شاء اللہ جلد پیش کی جائے گی۔

شرح کا انداز

شرح میں انداز یہ اختیار کیا گیا ہے کہ پہلے ایک عنوان قائم کر کے مسئلہ کی تقریر کی گئی ہے، جس طرح سبق میں کی جاتی ہے اور بات واضح کرنے کے لئے مثالوں وغیرہ کا اضافہ بھی کیا گیا ہے اور کہیں کتاب کی ترتیب بھی بدل گئی ہے۔ غرض تقریر میں ہر بات شاہ صاحب کی نہیں ہے، اس میں میں نے اپنی باتیں بھی ملائی ہیں۔ البتہ مدعیٰ شاہ صاحب ہی کا ہے۔ اور یہ طریقہ اس لئے اختیار کیا گیا ہے کہ کتاب حل ہو جائے۔

پھر متعلقہ عربی عبارت ضروری اعراب کے ساتھ دی گئی ہے۔ پھر وہی انداز کا ترجمہ کیا گیا ہے۔ تاکہ طلبہ ترجمہ کو عبارت سے ملا کر کتاب حل کر سکیں۔ پھر لغات کے عنوان سے مشکل الفاظ کے معانی اور ضروری ترکیب وغیرہ دی گئی ہے۔ اور کسی بات کی تشریح ضروری معلوم ہوئی تو وہ بھی کی گئی ہے۔ غرض متن اور ترجمہ میں میں نے کوئی بات اپنی طرف سے نہیں ملائی۔ اور متن کو لکیروں کے چوکھٹے میں رکھ دیا ہے۔ بعض جگہ میں نے اصل کتاب میں عناوین بڑھائے ہیں۔ ان کو چوکھٹے سے باہر اس طرح [ ] کی معکوس قوسین میں رکھا گیا ہے۔ اور متن میں جہاں کہیں نمبر ڈالے گئے ہیں ان کو بھی معکوس قوسین میں رکھا ہے۔

شرح کے ماخذ

کتاب حل کرنے کے لئے میرے پاس کوئی ماخذ نہیں تھا۔ کتاب کے چار تراجم ضرور تھے مگر وہ بوقت حاجت غائب ہو جاتے تھے یا الجھن پیدا کر دیتے تھے۔ البتہ اچانک ایک امداد غیبی ہوئی، پاکستان کے شہر چشتیاں کے جناب مولانا عبد القدیر صاحب تشریف لائے۔ میں نے شرح لکھنے کا تذکرہ کیا، تو انھوں نے بتایا کہ ان کے یہاں حضرت استاذ الاساتذہ مولانا عبید اللہ سندھی رحمہ اللہ کی ایک تقریر ہے جو چھپ گئی ہے۔ میں نے اس کی خواہش ظاہر کی، اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائیں مولانا موصوف کو کہ انھوں نے واپس لوٹتے ہی اس تقریر کی دو عدد فوٹو کاپیاں بھیج دیں۔ اس تقریر سے کتاب حل

کرنے میں بڑی مدد ملی۔

مولانا سندھی رحمہ اللہ نے ایک بار مکہ مکرمہ میں حجۃ اللہ پڑھائی تھی۔ تلامذہ نے ان کی تقریر منضبط کرلی تھی۔ یہ تقریر عربی میں قید تحریر میں لائی گئی ہے اور کتاب کے تین ربع تک ہے۔ آخر کا ایک ربع اس میں شامل نہیں ہے۔ اس تقریر میں عام طور پر مفردات کی تشریح، مجاز کے مراجع کی تعیین اور عبارت کی تصحیح اور کہیں کہیں افادات ہیں۔ کسی مسئلہ کو یا عبارت کو نہیں سمجھایا ہے۔ مگر بہرحال اس سے بڑی مدد ملی۔ اللہ تعالیٰ ان تلامذہ کو جنت کے بلند درجات عطا فرمائیں۔ انھوں نے ایک قیمتی ذخیرہ محفوظ کردیا۔ میں نے شرح میں کہیں کہیں وہ افادات نقل بھی کئے ہیں۔ اور آخر میں (سندی) لکھا ہے۔ غرض کتاب حل کرنے کے لئے میرے پاس یہی ایک ماخذ تھا۔ دوسری کوئی چیز دستیاب نہیں تھی۔ اس لئے شرح میں اگر کوئی لغزش ہوگئی ہے تو اس کے لئے وجہ جواز ہے۔

احادیث کی تخریج

شرح میں کتاب کی احادیث کی تخریج کا معروف طریقہ اختیار نہیں کیا گیا۔ کیونکہ اس سے کتاب بہت طویل ہوجاتی اور قاری مقصد سے دور جا پڑتا۔ میں نے تخریج احادیث کا یہ طریقہ اختیار کیا ہے۔

۱ — کتب حدیث کی مراجعت کرکے حدیث کے بارے میں اطمینان کرلیا ہے۔ اور عام طور پر صرف مشکوٰۃ کا حوالہ دیدیا ہے۔ اور اگر حدیث مشکوٰۃ میں نہیں ملی تو اصل مراجع کا حوالہ دیا ہے۔

۲ — اگر کوئی حدیث ضعیف ہے تو اس کی اطلاع دیدی ہے، مزید وضاحت نہیں کی۔

۳ — اور اگر کوئی حدیث نہایت ضعیف، ساقط کے درجہ کی ہے تو اس کی پوری وضاحت کی ہے، مثلاً اسی جلد (مبحث خامس باب سوم) میں یہ حدیث آئی ہے کہ دادی حوا رضی اللہ عنہا نے شیطان کے اغواء سے اپنے بیٹے کا نام عبد الحارث رکھا تھا۔ یہ حدیث ترمذی کی ہے مگر قطعاً باطل ہے، چنانچہ اس پر مفصل کلام کیا ہے۔

۴ — اور اگر کوئی حدیث تلاش بسیار کے باوجود نہیں ملی تو بس یہ لکھدیا ہے کہ یہ حدیث مجھے نہیں ملی جیسے جلد اول مبحث پنجم باب ۱۲ کے آخر میں یہ روایت آئی ہے کہ مؤمن کا حصہ عذاب میں سے دنیا کے مصائب ہیں۔ یہ حدیث مجھے نہیں ملی۔

۵ — علامہ کوثری مصری رحمہ اللہ نے حسن التقاضی فی سیرۃ الإمام أبی یوسف القاضی کے آخر میں حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ پر یہ تنقید کی ہے کہ آپ دربارۂ احکام وفروع صرف متون احادیث کو پیش نظر رکھتے ہیں۔ ان کی اسانید میں نظر نہیں کرتے۔ حالانکہ اہل علم کسی وقت بھی اسانید حدیث سے قطع نظر نہیں کرسکے، اور نہ کرسکتے ہیں۔ حتی کہ صحیحین کی اسانید پر بھی نظر ضروری ہے، چہ جائیکہ دوسری کتب صحاح وکتب سنن وغیرہ۔ اور جب دربارۂ احتجاج فی الفروع

سامنے بھی نظر ضروری ہے تو باب عقائد میں تو بدرجہ اولی اس کی ضرورت واہمیت ہے۔ (کوثری کی بات پوری ہوئی)

اس کی مثالیں اس جلد میں بھی موجود ہیں۔ مروج عقیقہ کی روایت جس کا تذکرہ مبحث اول کے باب سوم میں آیا ہے اور عبدالحارث نام رکھنے کی روایت بے اصل ہے۔ مگر شاہ صاحب قدس سرہ نے ان کو مستند حیثیت سے پیش کیا ہے، بلکہ ان پر استدلال کی بنیاد رکھی ہے۔

قصہ مختصر: کتاب حل کرنے میں میں نے اپنی دانست پوری کوشش صرف کر ڈالی ہے، کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا، رہی یہ بات کہ میں اپنے مقصد میں کس حد تک کامیاب ہوا ہوں، تو اس کا فیصلہ قارئین کرام کریں گے۔ میں تو بس یہ کہہ کر خاموش ہو جاتا ہوں کہ:

نبردہ بجز مایۂ خویش را   تو دانی حساب کم و بیش را

والسلام مع الاحترام

کتبہ

سعید احمد عفا اللہ عنہ پالن پوری
خادم دارالعلوم دیوبند
۱۵ ربیع الاول ۱۴۲۱ھ

مختصر سوانح حیات

حضرت امام شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی رحمہ اللہ

(حجۃ اللہ البالغہ کے مصنف، امام کبیر، محدث اعظم، مفسر قرآن، اصولی، فقیہ اور امام شریعت کے مجدد، مدون، مجتہد وقت، متکلم، مفتی، حکیم الامت، جامع شریعت و طریقت، آیۃ من آیات اللہ، حضرت شاہ ولی اللہ صاحب فاروقی محدث دہلوی ہیں۔ آپ کے مختصر حالات برادر عزیز جناب مولانا مفتی محمد امین صاحب پالن پوری، استاذ دار العلوم دیوبند نے الفوز الکبیر کی شرح "الخیر الکثیر" کے مقدمہ میں لکھے ہیں۔ یہاں ان کو معمولی تبدیلی کے ساتھ نقل کیا جاتا ہے، کیونکہ وہ کافی شافی ہیں)

ولادت باسعادت اور نام ونسب

آپ کی ولادت باسعادت مغل بادشاہ اورنگ زیب عالمگیر رحمہ اللہ کی وفات سے چار سال قبل ۴ شوال ۱۱۱۴ھ بدھ کے دن طلوع آفتاب کے وقت قصبہ "پھلت" ضلع مظفر نگر (یو پی) میں ہوئی —— آپ کی ولادت سے پہلے آپ کے والد ماجد حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب کو شیخ قطب الدین بختیار کاکی اوشی قدس سرہ (متوفی ۶۳۳ھ) نے خواب یا مراقبہ میں ایک نیک صالح لڑکے کے پیدا ہونے کی بشارت دی تھی، اور یہ وصیت کی تھی کہ جب بچہ پیدا ہو تو اس کا نام میرے نام پر "قطب الدین احمد" رکھنا۔ مگر جب آپ پیدا ہوئے تو آپ کے والد صاحب وصیت بھول گئے، اور آپ کا نام "ولی اللہ" رکھ دیا۔ پھر ایک مدت کے بعد جب بختیار کاکی رحمہ اللہ کی وصیت یاد آئی تو دوبارہ آپ کا نام "قطب الدین احمد" رکھا۔ اس لئے آپ کا پورا نام "ولی اللہ قطب الدین احمد" ہے۔ اور تاریخی نام "عظیم الدین"، کنیت "ابو عبد العزیز" اور "ابو الفیاض" ہے —— آپ کے والد ماجد کا نام "عبدالرحیم" اور کنیت "ابو الفیض" اور دادا کا نام "وجیہ الدین" ہے۔ آپ کا سلسلۂ نسب والد ماجد کی طرف سے حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ تک، اور والدہ ماجدہ کی طرف سے حضرت موسیٰ کاظم رحمہ اللہ تک پہنچتا ہے۔

والدین ماجدین کا تعارف

آپ کے والد شاہ عبدالرحیم صاحب اپنے وقت کے جید عالم اور دہلی کے بڑے مشائخ میں سے تھے، معقولات کے ماہر اور علامہ میر زاہد ہروی کے شاگرد تھے، بچپن ہی سے سنتوں کا اہتمام اور دنیا کی دولت و عزت سے نفرت اور آخرت کی فکر

کرنے والے صاحبِ کشف و کرامت بزرگ تھے۔ آپ کی والدہ ماجدہ سیدہ فخر النساء بھی، جو شیخ محمد پھلتی کی صاحبزادی تھیں علومِ دینیہ میں خوب مہارت اور آدابِ طریقت و اسرارِ شریعت سے اچھی واقفیت رکھتی تھیں، صوم و صلوٰۃ کی پابند نیک پارسا خاتون تھیں۔

تعلیم و تربیت

پانچ سال کی عمر میں آپ نے تعلیم شروع کی، اور سات سال کی عمر میں قرآن کریم کی تکمیل فرمائی، ساتویں سال کے آخر میں آپ نے فارسی اور عربی کے ابتدائی رسائل پڑھنا شروع کیے، اور ایک سال میں ان کو مکمل کیا، اس کے بعد آپ نے صرف و نحو کی طرف توجہ مبذول فرمائی، اور دس سال کی عمر میں نحو کی معرکۃ الآراء کتاب شرح جامی تک پہنچ گئے، صرف و نحو سے فراغت کے بعد علوم عقلیہ اور نقلیہ کی طرف متوجہ ہوئے اور پندرہ سال کی عمر میں تمام متداول درسی علوم سے فارغ ہوکر درس و تدریس کا آغاز فرمایا، اس عرصہ میں آپ نے اکثر و بیشتر کتابیں اپنے والد حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب سے پڑھیں۔ اور ان ہی سے بیعت ہوکر سترہ سال کی عمر میں بیعت و ارشاد کی بھی اجازت حاصل کی، اور ۱۱۴۳ھ تک اپنے والد حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب کی مسند درس و ارشاد کو سنبھالا اور خلقِ خدا کو فائدہ پہنچایا۔

زیارتِ حرمین شریفین

پھر ۱۱۴۳ھ میں جبکہ آپ کی عمر تیس سال کے قریب تھی، حرمین شریفین کی زیارت کا شوق آپ پر ایسا غالب ہوا کہ راستہ کی بدامنی کے باوجود حجازِ مقدس کا سفر کیا، ۱۵ ذی قعدہ ۱۱۴۳ھ کو مکہ مکرمہ پہنچے، اور فریضۂ حج ادا کیا، پھر مدینہ منورہ تشریف لے گئے، اور شیخ ابوطاہر محمد بن ابراہیم کردی مدنی سے بخاری شریف کی سماعت فرمائی۔ اور صحاح ستہ (بخاری شریف، مسلم شریف، ترمذی شریف، ابوداؤد شریف، نسائی شریف، ابن ماجہ شریف) موطا امام مالک، مسند دارمی اور امام محمد کی کتاب الآثار کے اطراف ان کے سامنے پڑھے، اور بقیہ کتابوں کی ان سے اجازت حاصل کی، پھر مکہ مکرمہ آئے، دوسرا حج کیا، اور شیخ وفد اللہ مالکی مکی سے موطا امام مالک پڑھی، اور شیخ تاج الدین حنفی قلعی مکی، جو بخاری شریف کا درس دے رہے تھے، ان کے درسوں میں چند دن شریک ہوئے، اور ان سے صحاح ستہ وغیرہ کتابوں کے اطراف سنے، اور مذکورہ کتابوں کے مشکل مقامات حل کیے، اور ان سے تمام کتبِ حدیث کی اجازت حاصل کی۔

الغرض حجازِ مقدس میں چودہ ماہ قیام اور دو حج کرنے اور حرمین شریفین کے محدثین عظام سے خاطر خواہ استفادہ کرنے کے بعد ۱۱۴۵ھ کے اوائل میں ہندوستان کے لیے روانہ ہوئے۔ پورے چھ ماہ سفر میں گذرے۔ اور ۱۴ رجب ۱۱۴۵ھ جمعہ کے دن بصحت و عافیت دہلی پہنچے، چند دن آرام کرنے کے بعد پھر سے درس و تدریس کا سلسلہ شروع فرمایا۔ اور تیس سال تک تصنیف و تدریس کی خدمت انجام دیتے رہے۔

خود نوشت سوانح حیات

شاہ صاحب نے اپنے حالات و سوانح میں ایک مختصر رسالہ الجزء اللطیف فی ترجمۃ العبد الضعیف کے نام سے فارسی زبان میں لکھا ہے، مولانا محمد منظور نعمانی رحمہ اللہ نے الفرقان بریلی کے شاہ ولی اللہ نمبر میں اس کا خلاصہ پیش کیا ہے جو حسب ذیل ہے:

بتاریخ ۱۴ شوال ۱۱۱۴ھ چہارشنبہ کے دن طلوع آفتاب کے وقت یہ فقیر پیدا ہوا۔ تاریخی نام عظیم الدین نکالا گیا، ولادت سے پہلے خود والدین ماجدین اور چند صلحاء نے میرے بارے میں بہت سے بشارتی خواب دیکھے، جن کو بعض دوستوں نے مستقل رسالہ القول الجلی میں بھی جمع کر دیا ہے ــــ عمر کے پانچویں سال مکتب میں بٹھا دیا گیا۔ ساتویں سال والد ماجد نے نماز روزہ شروع کرایا۔ اور اسی سال "رسم ختنہ" عمل میں آئی۔ یہاں تک کہ دسویں سال شرح ملا جامی پڑھ لی۔ اور مطالعہ کتب کی استعداد پیدا ہو گئی ــــ چودھویں سال کی عمر میں شادی کی صورت پیدا ہو گئی اور والد ماجد نے اس معاملہ میں انتہائی عجلت سے کام لیا۔ اور جب سسرال والوں نے والد ماجد کے تقاضوں کے جواب میں سامان شادی تیار نہ ہونے کا عذر کیا تو آپ نے ان کو لکھ بھیجا کہ میری یہ "جلد بازی" بے وجہ نہیں ہے، بلکہ اس میں کوئی راز ہے، لہٰذا یہ مبارک کام بلا تاخیر ہی ہو جانا چاہیے، چنانچہ والد بزرگوار کے اصرار سے اسی سال یعنی عمر کے چودھویں ہی برس میں شادی ہو گئی، اور وہ راز بعد میں اس طرح ظاہر ہوا کہ نکاح سے تھوڑے ہی دن بعد میری خوش دامن کا انتقال ہو گیا۔ اس سے چند ہی روز بعد میری اہلیہ کے نانا نے وفات پائی، پھر چند ہی دنوں میں عم بزرگوار شیخ ابوالرضا محمد قدس سرہ کے صاحبزادے شیخ فخر عالم نے رحلت فرمائی۔ اور یہ صدمہ ابھی تازہ ہی تھا کہ میرے بڑے بھائی شیخ صلاح الدین کی والدہ ماجدہ نے (یعنی آپ کے والد ماجد شیخ عبدالرحیم صاحب کی پہلی بیوی نے) داغ مفارقت دیا۔ ان صدمات کے ساتھ ہی والد ماجد پر ضعف اور مختلف قسم کے امراض کا غلبہ ہوا اور مجھے دیکھتے دیکھتے آپ کی وفات کا سانحہ عظیمہ بھی پیش آ گیا ــــ ان حوادث کے پیہم گذر جانے پر معلوم ہوا کہ شادی کے متعلق والد ماجد کی عجلت فرمانی میں کیا راز تھا؟ در حقیقت اگر اس وقت یہ کام اس طرح عجلت سے انجام نہ پاتا تو ان حوادث کی وجہ سے مدتوں بھی اس کا موقع نہ آ سکتا تھا۔

شادی سے ایک سال بعد پندرہ سال کی عمر میں والد ماجد کے ہاتھ پر میں نے بیعت کی، اور مشائخ صوفیہ بالخصوص حضرات نقشبندیہ کے اشغال میں لگ گیا۔ اور توجہ اور تلقین اور آداب طریقت کی تعلیم اور خرقہ پوشی کی جہت سے میں نے اپنی نسبت کو درست کیا ــــ اسی سال بیضاوی کا ایک حصہ پڑھ کر گویا اس دیار کے مروجہ نصاب تعلیم سے فراغت حاصل کی، والد ماجد نے اس تقریب میں بڑے پیمانے پر خواص و عوام کی دعوت کی، اور مجھے درس کی اجازت دی، جن علوم و فنون کا درس اس ملک میں مروج ہے ان میں ذیل کی کتابیں میں نے سبقاً سبقاً پڑھیں۔

حدیث میں پوری مشکوٰۃ شریف، سوائے کتاب البیوع سے کتاب الآداب تک کے تھوڑے سے حصہ کے، اور صحیح

بخاری کتاب الطہارت تک، اور شمائل ترمذی کامل — اور تفسیر میں تفسیر بیضاوی اور تفسیر مدارک کا ایک حصہ، اور حق تعالیٰ کی نعمتوں میں ایک بہت بڑی نعمت مجھ پر یہ ہوئی کہ کامل غور وفکر اور مختلف تفاسیر کے مطالعہ کے ساتھ والد ماجد کے درس قرآن میں مجھے حاضری کی توفیق ملی، اور اس طرح کئی بار میں نے حضرت سے متن قرآن پڑھا، اور یہی میرے حق میں "فتح عظیم" کا باعث ہوا۔ والحمد لله على ذلك۔

اور علم فقہ میں شرح وقایہ اور ہدایہ پوری پڑھیں، اور اصول فقہ میں حسامی اور توضیح تلویح کا کافی حصہ، اور منطق میں شرح شمسیہ (قطبی) پوری اور شرح مطالع کا کچھ حصہ، اور کلام میں شرح عقائد مع حاشیہ خیالی اور شرح مواقف کا بھی ایک حصہ — اور سلوک وتصوف میں عوارف اور رسائل نقشبندیہ وغیرہ، اور علم الحقائق میں شرح رباعیات مولانا جامی، لوائح، مقدمہ شرح لمعات اور مقدمہ نقد النصوص، اور فن خواص اسماء وآیات میں والد ماجد کا خاص مجموعہ، اور طب میں موجز، اور فلسفہ میں شرح ہدایت الحکمت وغیرہ، اور نحو میں کافیہ اور اس کی شرح از ملا جامی، اور علم معانی میں مطول اور مختصر المعانی اس قدر جتنے پر ملا زادہ کا حاشیہ ہے، اور ہیئت وحساب میں بھی بعض مختصر رسالے پڑھے — اور الحمد للہ کہ اسی تحصیل کے زمانہ میں ہر فن سے خاص مناسبت پیدا ہوگئی، اور اس کے خاص مسائل اور اہم مباحث میرے ذہن کی گرفت میں آگئے۔

میری عمر کے سترہویں سال والد ماجد مریض ہوئے اور اسی مرض میں واصل بہ رحمت حق ہوگئے، اور اسی مرض وفات ہی میں مجھے بیعت وارشاد کی اجازت مرحمت فرمائی، اور اس اجازت میں کلمہ مبارکہ یَدُهٗ کَیَدِیْ (اس کا ہاتھ گویا میرا ہی ہاتھ ہے) مکرر ارشاد فرمایا۔

خدا تعالیٰ کا ایک بڑا احسان یہ ہے کہ حضرت والد ماجد جب تک زندہ رہے اس فقیر سے بے حد راضی رہے، اور اسی رضامندی کی حالت میں اس دنیا سے تشریف لے گئے، حضرت والد کو جتنی توجہ میرے حال پر تھی ایسی ہر باپ کو اپنے بیٹوں کے ساتھ نہیں ہوتی، میں نے کوئی باپ، کوئی استاذ اور کوئی مرشد ایسا نہیں دیکھا جو اپنی اولاد یا اپنے کسی شاگرد یا مرید کی طرف اس قدر توجہ اور شفقت رکھتا ہو، جو حضرت والد ماجد کو میرے ساتھ تھی۔ اللّٰهم اغفر لي ولوالديّ وارحمهما كما ربّياني صغيرًا، وجازهما بكل شفقة ورحمة ونعمة منهما عليّ مائة ألف أضعافها، إنك قريب مجيب۔

پھر حضرت کی وفات کے بعد بارہ سال تک کتب دینیہ اور معقولات کے درس میں اشتغال رہا، اور ہر علم وفن میں غور کرنے کا موقع ملا، اور مذاہب اربعہ کی فقہ اور ان کے اصول فقہ کی کتابوں، اور ان احادیث کے غائر مطالعہ کے بعد جن سے وہ حضرات اپنے مسائل میں استناد فرماتے ہیں، نور غیبی کی مدد سے "فقہائے محدثین" کا طریقہ دلنشین ہوا۔

غرض والد ماجد کی وفات سے ۱۲ برس اس طرح گزارنے کے بعد حرمین شریفین کی زیارت کا شوق پیدا ہوا، اور آخر ۱۱۴۳ھ میں یہ فقیر حج سے مشرف ہوا، اور ۱۱۴۴ھ میں مکہ معظمہ و مدینہ منورہ کی مجاورت، اور شیخ ابو طاہر قدس سرہ ودیگر مشائخ حرمین شریفین سے اخذ روایت حدیث کی سعادت حاصل ہوئی — مدینہ منورہ کے دوران قیام میں روضۂ مقدسہ سرور عالم ﷺ میری توجہ کا خاص مرکز رہا، اور الحمد للہ کہ مجھ فقیر پر اس قدسی دربار سے فیوض وبرکات کی بے پایاں

پذیر ہوئی ——— نیز اس سفر مبارک میں حرمین شریفین اور عالم اسلامی کے بہت سے علمائے کرام کے ساتھ خوب رنگین صحبتوں کا موقع ملا، حضرت شیخ ابوطاہر مدنی قدس سرہ کی طرف سے تمام طرق صوفیہ کا جامع خرقہ بھی اسی بابرکت سفر میں عنایت ہوا ——— پھر ۱۱۴۴ھ کے آخر میں حج سے مشرف ہو کر اوائل ۱۱۴۵ھ میں وطن کی طرف واپسی ہوئی، اور بتاریخ ۱۴ رجب ۱۱۴۵ھ ٹھیک جمعہ کے دن بفضلہ تعالیٰ صحیح سلامت وطن مالوف دہلی پہنچ گیا۔

تعمیل ارشاد و اما بنعمة ربك فحدث پر عمل خاص الخاص انعامات الٰہیہ کا بھی تذکرہ کرتا ہوں، حق تعالیٰ کا عظیم ترین انعام اس ضعیف بندہ پر یہ ہے کہ اس کو "خلعت فاتحیت" بخشا گیا ہے، اور اس آخری دور کا افتتاح اس سے کرایا گیا ہے، اس سلسلہ میں جو کام مجھ سے لئے گئے ہیں وہ یہ ہیں کہ فقہ میں جو "مرضی" ہے اس کو جمع کیا گیا، اور فقہ حدیث کی از سر نو بنیاد رکھ کر اس فن کی پوری عمارت تیار کی گئی، اور آنحضرت ﷺ کے تمام احکام و ترغیبات، بلکہ تمام تعلیمات کے اسرار و مصالح کو اس طرح منضبط کیا گیا کہ اس فقیر سے پہلے کسی نے یہ کام اس طرح نہیں کیا تھا۔ نیز سلوک کا وہ طریقہ جس میں حق تعالیٰ کی مرضی ہے، اور جو اس دور میں کامیاب ہو سکتا ہے مجھے اس کا الہام فرمایا گیا ہے، اور میں نے اس طریق کو اپنے دو رسالوں "لمعات" اور "الطاف القدس" میں قلم بند کر دیا ہے۔

ایک کام مجھ سے یہ لیا گیا کہ متقدمین میں سے اہل سنت کے عقائد کو میں نے دلائل و براہین سے ثابت کیا، اور "معقولیوں" کے شکوک و شبہات کے خس و خاشاک سے ان کو قطعی پاک کر دیا، اور ان کی تقریر اس طرح شاندار کی جس کے بعد کسی بحث کی گنجائش باقی نہیں رہ گئی، علاوہ ازیں کرامات اربعہ (۱) ابداع (۲) خلق (۳) تدبیر (۴) اور تدلّی کی حقیقت اور نفوس انسانیہ کی استعدادات کا علم مجھے عطا فرمایا گیا، اور یہ دونوں ایسے علم ہیں کہ اس فقیر سے پہلے کسی نے ان کے کوچہ میں قدم بھی نہیں رکھا۔

اور حکمت عملی (کہ اس دورہ (زمانہ) کی صلاح و فلاح اسی سے وابستہ ہے یقیناً اسی میں منحصر ہے) مجھے بھرپور دی گئی، اور کتاب و سنت و آثار صحابہ سے اس کی تطبیق اور تفصیل کی توفیق بھی نصیب ہوئی ——— ان سب کے سوا مجھے وہ ملکہ عطا فرمایا گیا، جس کے ذریعے سے میں یہ تمیز کر سکتا ہوں کہ دین کی اصل تعلیم جو فی الحقیقت آنحضرت ﷺ کی لائی ہوئی ہے وہ کیا ہے؟ اور وہ کون کون سی باتیں ہیں جو بعد میں اس میں ملحق کی گئی ہیں، یا جو کسی بدعت پسند فرقہ کی تحریف کا نتیجہ ہیں۔

اپنے یہ حالات اور حق تعالیٰ کے یہ انعامات بیان فرمانے کے بعد حضرت شاہ صاحب اپنی تحریر کو ان الفاظ پر ختم فرماتے ہیں:

ولو ان لی فی کل منبت شعرة   لسانا لما استوفیت واجب حمده

وفات حسرت آیات

حرمین شریفین سے مراجعت کے بعد آخر عمر تک آپ تدریس و تصنیف میں مشغول رہے، اور ۲۹ محرم الحرام ۱۱۷۶ھ مطابق ۲۰ اگست ۱۷۶۲ء ہفتہ کے دن ظہر کے وقت انتقال فرمایا، اور اپنے والد حضرت شاہ عبد الرحیم صاحب

فرمائی، اس زمانہ کے طریقۂ تعلیم اور نصاب کو بدلا، دین میں جو بدعات، خرافات اور بے سروپا باتیں شامل کر دی گئی تھیں، ان کو نمایاں کیا، اور دین کو نکھار کر لوگوں کے سامنے اصل شکل میں پیش کیا، شیعہ عقائد کی تردید کی، عقل و نقل دونوں اعتباروں سے دینِ اسلام کو مطابقِ فطرت ثابت کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی، عجمی تصوف اور اس کی بے سروپا باتوں کا خوب رد کیا، مختلف مکاتبِ فکر کے لوگوں میں ہم آہنگی اور اتفاق پیدا کرنے کی بھرپور کوشش فرمائی۔ قرآن کریم سے لوگوں کو قریب کرنے کے لئے رائج الوقت فارسی زبان میں قرآن کریم کا مطلب خیز ترجمہ کیا، تفسیر کے اصول و ضوابط وضع کئے، اسرارِ شریعت سے لوگوں کو آگاہ فرمایا، اور احادیث نبویہ سے ہندی مسلمانوں کو آشنا کیا، الغرض آپ نے تقریر و تحریر اور تصنیف و تدریس کے ذریعہ جو عظیم خدمات انجام دیں وہ رہتی دنیا تک فراموش نہیں کی جاسکتیں۔

مشہور تصانیف کا تعارف

"حیاتِ ولی اللہ" کے مصنف کی تحقیق کے مطابق شاہ صاحب کی جو تصانیف چھپی ہوئی ہیں، وہ پچاس کے قریب ہیں (مگر یہ بات تحقیق طلب ہے) چند مشہور تصانیف کا تعارف درج ذیل ہے:

① **فتح الرحمن فی ترجمة القرآن**: یہ قرآن کریم کا فارسی زبان میں نہایت عمدہ اور مطلب خیز ترجمہ ہے، ترجمہ کے ساتھ جا بجا فوائد بھی ہیں، جو نہایت مختصر اور جامعیت و افادیت میں بے مثل ہیں ــــ شاہ صاحب کے زمانہ میں اکثر علماء اور بیشتر مشائخ کا یہ خیال تھا کہ قرآن کریم اخص الخواص کے مطالعہ، غور و فکر، درس و تفہیم کی کتاب ہے، اس کو عوام کے سامنے لانا، عوام کو براہ راست اس کے پڑھنے اور سمجھنے کی دعوت دینا سخت خطرناک ہے، عوام کو ذہنی انتشار میں مبتلا کرتا ہے اور خود رائی اور علماء سے بے نیازی بلکہ بغاوت و سرکشی کی دعوت دینا ہے ــــ جبکہ امت میں پھیلے ہوئے الحاد و زندقہ، بدعات و خرافات اور احکام شریعت سے بے اعتنائی کا توڑ، اور دین کی صحیح سمجھ، جذبۂ عمل، خوفِ خدا، فکرِ آخرت، بدعت سے نفرت اور سنت سے محبت پیدا کرنے کا سب سے بڑا موثر ذریعہ قرآن کریم ہی ہے۔ اس لئے شاہ صاحب نے اپنے زمانہ کی عام فہم فارسی زبان میں قرآن کریم کا یہ ترجمہ کیا ہے ـــــ اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ ہندوستان، پاکستان، افغانستان، بنگلہ دیش، اور دیگر بلادِ عجم میں قرآن فہمی کا جو آج چرچا نظر آرہا ہے، یہ اردو، انگریزی، گجراتی، بنگالی اور پنجابی زبانوں میں جو سیکڑوں ترجمے شائع ہو چکے ہیں، یہ سارے چراغ اسی چراغ سے روشن ہیں۔

② **الفوز الکبیر فی أصول التفسیر**: یہ رسالہ بھی فارسی زبان میں ہے، اور اسی مقصد کے پیشِ نظر فارسی زبان میں لکھا ہے، جس مقصد کے پیشِ نظر قرآن کریم کا ترجمہ فارسی زبان میں کیا ہے، اس میں قرآن فہمی اور تفسیر کے نادر اصول و ضوابط اور مفسرین کی تفسیروں کے بارے میں نہایت مفید نکات ہیں، اس کی مختلف حضرات نے تعریب کی ہے، سب سے بہتر تعریب حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری دامت برکاتہم محدث کبیر دارالعلوم دیوبند نے کی ہے، موصوف نے اس کی عربی شرح بھی لکھی ہے، جس کا نام "العون الکبیر" ہے۔ الفوز الکبیر کی پہلی تعریب کی متعدد

حضرات نے اردو شرحیں بھی لکھی ہیں، جیسے العون الکبیر یہ پرانی تعریب کی شرح تھی، اب وہ بھی نئی تعریب کے مطابق کر دی گئی ہے اور طبع ہو گئی ہے اور اس تعریب جدید کو جو دار العلوم دیوبند اور دیگر مدارس عربیہ میں شامل درس کر دی گئی ہے اس کی بھی اردو شرح الخیر الکثیر کے نام سے لکھی گئی ہے۔ جو طبع ہو گئی ہے۔

(۳) فتح الخبیر بما لابد من حفظه في علم التفسیر: یہ درحقیقت الفوز الکبیر کا پانچواں باب ہے، جس کو شاہ صاحب نے مستقل رسالہ کی حیثیت دی ہے، مگر یہ فارسی کے بجائے عربی میں ہے، اس میں اسباب نزول اور قرآن کریم کے غریب الفاظ کی تشریحات اور مشکل آیتوں کی توجیہات بیان کی گئی ہیں، جو بخاری، ترمذی اور حاکم کی تفسیر سے ماخوذ ہیں۔

(۴) تاویل الاحادیث: یہ عربی زبان میں ہے، اس میں انبیائے کرام اور ان کی قوموں کے قصے جو قرآن کریم میں مذکور ہیں، اور جن کو عام طور پر خرق عادت خیال کیا جاتا ہے، ان کی تاویلات و توجیہات کی گئی ہیں، اور ان کے مخفی اسباب بیان کئے گئے ہیں۔

(۵) المصفی شرح موطا: شاہ صاحب نے پہلے موطا امام مالک کی تلخیص کی ہے، پھر اس کی فارسی زبان میں عمدہ شرح لکھی ہے، جو شاہ صاحب کے درس کا نمونہ ہے۔

(۶) مسوی شرح موطا: یہ موطا امام مالک کی عربی زبان میں مختصر شرح ہے، اور شاہ صاحب حدیث کے درس کا جو طریقہ رائج کرنا چاہتے تھے اس کا بہترین نمونہ ہے۔

(۷) حجة الله البالغة: یہ شاہ صاحب کی نہایت معرکۃ الآراء عربی تصنیف ہے، اور دو حصوں میں ہے، اس میں فقہ الحدیث اور اسرار شریعت کا نہایت عمدہ بیان ہے، بہت سے جامعات میں داخل درس ہے۔ اس کی یہ مکمل شرح رحمۃ اللہ الواسعۃ ہے جو آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

(۸) ازالة الخفاء عن خلافة الخلفاء: "حجۃ اللہ" کی طرح یہ بھی شاہ صاحب کی دوسری معرکۃ الآراء فارسی تصنیف ہے، اس میں آپ نے خلفائے راشدین کی خلافت کا برحق ہونا قرآن کریم، احادیث شریفہ، کتب تفسیر اور تاریخ کے حوالوں سے ثابت کیا ہے، شیعوں کے اعتراضات کو نہایت عمدہ دلائل سے حل کیا ہے، جس سے شیعوں کی غلط فہمیاں اور شدت تعصب دور ہو سکتا ہے، اس کتاب میں اثبات خلافت کے ساتھ ساتھ سیرت، تاریخ اور سیاست و خلافت کے بارے میں بیش بہا نکات بھی بیان فرمائے ہیں، انداز بیان نہایت شگفتہ اور سلیس ہے۔ حضرت مولانا عبد الحی صاحب فرنگی محلی فرماتے ہیں کہ: "اس موضوع پر پورے اسلامی لٹریچر میں ایسی کوئی کتاب موجود نہیں"۔ اور مولانا فضل حق خیرآبادی کا تاثر ہے کہ: "جس نے یہ کتاب لکھی ہے وہ ایک بحر ذخار ہے، جس کے ساحل کا پتہ نہیں چلتا"

(۹) قرة العینین في تفضیل الشیخین: یہ بھی فارسی زبان میں ہے، اس میں حضرت صدیق اکبر اور فاروق اعظم رضی اللہ عنہما کی افضلیت کا بڑے حسین انداز میں بیان ہے، اور حضرت عثمان غنی اور حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہما کے فضائل و مناقب کا تذکرہ ہے۔

(۱۰) سرور المحزون: ابن سید الناس نے سیرت نبوی پر ایک مختصر کتاب عیون الاثر فی فنون المغازی والشمائل والسیر لکھی تھی، پھر اس کا جامع خلاصہ نور العیون فی تلخیص سیر الامین والمامون کے نام سے کیا تھا۔ شاہ صاحب نے اپنے استاذ شیخ مرزا مظہر جان جاناں دہلوی کے اصرار پر اس کا فارسی میں خلاصہ کیا ہے۔ یہ سیرت کے موضوع پر نہایت عمدہ رسالہ ہے۔

(۱۱) تفہیمات الٰہیہ: یہ شاہ صاحب کا شاہکار ہے۔ اس میں زیادہ تر تصوف وسلوک کی باتیں ہیں اور بعض مقامات پر اپنے زمانہ کی خرابیوں اور لوگوں کے مختلف طبقات کی نشاندہی کی ہے اور ہر طبقے سے جو چیز مطلوب ہے اس کی اصلاح پر ابھارا ہے۔ اس کے بعض مضامین عربی میں اور بعض فارسی میں ہیں۔

(۱۲) فیوض الحرمین: اس میں قیام حرمین کے دوران جو فیوض وبرکات بصورت خواب یا الہام آپ کو حاصل ہوئے ہیں ان کا تذکرہ ہے۔ بعض عجیب پیشین گوئیاں، علم تصوف کے حقائق اور بعض مسائل بھی ہیں۔ یہ کتاب عربی میں ہے اور اردو ترجمہ کے ساتھ شائع ہو چکی ہے۔

(۱۳) الخیر الکثیر: اس میں شاہ صاحب نے سلوک وتصوف کے معارف وحقائق عربی زبان میں بیان کئے ہیں۔

(۱۴) البدور البازغة: یہ نہایت دقیق کتاب ہے۔ اس میں حجۃ اللہ البالغہ کے بعض ابواب کا خلاصہ اور تصوف کے حقائق ومعارف کا بیان ہے۔

(۱۵) الانصاف فی بیان سبب الاختلاف: یہ رسالہ عربی میں ہے۔ اس میں صحابہ کرام، تابعین عظام اور ان کے بعد ائمہ مجتہدین کے درمیان فقہی مسائل میں جو اختلاف رونما ہوا اس کے اسباب کی مفصل تشریح بیان کی گئی ہے۔ حجۃ اللہ البالغہ کی قسم اول کے آخر میں تتمہ کے عنوان سے یہ پورا رسالہ شامل کردیا گیا ہے۔

(۱۶) عقد الجید فی بیان أحکام الاجتہاد والتقلید: یہ رسالہ بھی عربی میں ہے۔ اس میں تقلید اور عدم تقلید شخصی پر محققانہ کلام کیا گیا ہے اور تقلید شخصی کی ضرورت بیان کی گئی ہے۔

(۱۷) أطیب النغم فی مدح سید العرب والعجم: یہ سرکار دوعالم ﷺ کی مدح میں عربی قصیدہ ہے۔

(۱۸) الدر الثمین فی مبشرات النبی الأمین: یہ رسالہ عربی میں ہے۔ اس میں ان بشارتوں کا تذکرہ ہے جو آپ کو اور آپ کے بزرگوں کو بارگاہ رسالت سے ملی ہیں۔

(۱۹) انفاس العارفین: اس میں شاہ صاحب نے اپنے بزرگوں کے احوال فارسی زبان میں قلم بند فرمائے ہیں۔

(۲۰) الجزء اللطیف: اس میں شاہ صاحب نے خود اپنے احوال فارسی زبان میں تحریر فرمائے ہیں، جس کا خلاصہ پہلے گذر چکا ہے۔

(۲۱) المقالة الوضیة فی الوصیة والنصیحة: یہ شاہ صاحب کا فارسی میں وصیت نامہ ہے۔

طرزِ تحریر اور تصنیفی خدمات

آپ کی تحریروں میں تحقیقی اور علمی نکات کے ساتھ ساتھ سوز واخلاص اور خیر خواہی کے جوہر پائے جاتے ہیں، جس کے باعث وہ تحقیقی تصانیف ہونے کے ساتھ ساتھ دینِ حق کا پیغام اور اخلاقِ معلم کا درس بن گئی ہیں — آپ کی تصانیف نہایت پرفتن اور پرآشوب زمانے کی ہیں، لیکن کثرتِ تصانیف میں کہیں بھی خلطِ فکر نہیں آئی۔ بلکہ سب میں توازن و حقیقت کے ساتھ تسلسل اور روانی رکھا ہے، اور مرکزی نقطۂ خیال سے تجاوز نہیں فرمایا۔ علامہ سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ آپ کی اس خصوصیت کے متعلق فرماتے ہیں:

"شاہ صاحب کی تصنیفات کے ہزاروں صفحے پڑھ جایئے آپ کو یہ معلوم بھی نہ ہوگا کہ یہ بارھویں صدی ہجری کے کسی آشوب زدہ زمانے کی پیداوار ہیں، وہ جب بھی جس کتاب کو دیکھیں گے ہر صفحہ سے یہ معلوم ہوگا کہ فضل و علم کا ایک دریا ہے جو کسی شور و غل کے بغیر سکون و آرام کے ساتھ بہہ رہا ہے، جو زمان و مکان کے تمام رد و قدح کی گندگی سے پاک صاف ہے۔"

اس کے علاوہ آپ ایک نئے اسلوب اور جداگانہ طرز کے بانی موجود ہیں، جو جامعیت، زورِ بیان، تحکم و اختصار و فصاحت و بلاغت میں نبی کریم ﷺ کے طرزِ تکلم سے مشابہ ہے۔ مولانا مناظر احسن گیلانی رحمہ اللہ اسی کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

"عربی زبان میں انھوں نے جتنی کتابیں لکھی ہیں ان میں ایک خاص قسم کی انشاء کی، جو ان کا مخصوص اسلوب ہے، پوری پابندی کی ہے، شاہ صاحب پہلے آدمی ہیں جنھوں نے اپنی عبارتوں میں زیادہ تر جوامع الکلم یعنی آنحضرت ﷺ کے طرزِ گفتگو کی پیروی کی ہے، حتی الوسع وہ اس کی کوشش کرتے ہیں کہ اپنے مدعا کا اظہار ان ہی الفاظ اور ان ہی محاورات سے کریں جو لسانِ نبوت اور زبانِ رسالت سے خاص تعلق رکھتے ہیں۔"

یہی وجہ ہے کہ باوجود ہندوستانی ہونے کے آپ نے عربی فصاحت و بلاغت کا ایسا بے نظیر نمونہ پیش کیا ہے کہ جس کی عظمت کے اہلِ زبان بھی معترف ہیں، مولانا ابوالحسن علی صاحب ندوی نوراللہ مرقدہ فرماتے ہیں کہ:

"شاہ ولی اللہ صاحب پہلے ہندوستانی مصنف ہیں، جن کی عربی تصانیف میں اہلِ زبان کی سی روانی، قدرت اور عرب کی سی عربیت ہے اور وہ ان بے اعتدالیوں سے پاک ہیں، جو عجمی علماء کی عربی تحریر میں پائی جاتی ہیں۔"

منظوم کلام

شاہ صاحب جس طرح نثر نگاری میں یکتائے زمانہ تھے اسی طرح عربی اور فارسی نظم کہنے میں بھی قادر الکلام شاعر تھے۔ عربی نظم میں اطیب النغم کے نام سے نبی کریم ﷺ کی مدح ونعت میں ایک طویل قصیدہ ہے، جس کا پہلا شعر یہ ہے

كأنّ نجوماً أومضت في الغياهب عيونُ الأفاعي أو رؤوسُ العقارب

اس کے علاوہ تین قصیدے اور ہیں، آپ کا عربی دیوان بھی ہے، جس کو حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی رحمہ اللہ نے جمع کیا ہے اور شاہ رفیع الدین صاحب نے مرتب کیا ہے، اور فارسی میں بھی آپ کی چند غزلیں اور رباعیاں ہیں، جو "کلمات طیبات" اور "حیات ولی" میں موجود ہیں، فارسی میں آپ "امین" تخلص فرماتے تھے۔

آپ کیا تھے؟

حضرت مولانا محمد یوسف صاحب بنوری فرماتے ہیں کہ:

"حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی قدس سرہ سرزمین ہند کے ان نوادر میں سے ہیں، جن کی نظیر نہ صرف اپنے عصر میں اور نہ صرف ہندوستان میں، بلکہ بہت سے قرون اور ممالک اسلامیہ میں ڈھونڈھنے سے نہیں ملتی، حضرت موصوف بقول حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی بانی دارالعلوم دیوبند ان افراد میں سے ہیں کہ سرزمین ہند میں اگر صرف شاہ ولی اللہ ہی پیدا ہوتے تو ہندوستان کے لئے یہ فخر کافی تھا (الفرقان کا شاہ ولی اللہ نمبر ص ۳۰۳)

سراج الہند حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب فرماتے ہیں: آیۃ من آیات اللہ و معجزۃ نبیہ الکریم صلی اللہ علیہ وسلم: شاہ صاحب اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی اور اس کے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ ہیں (ظفر المحصلین ص ۱۰)

نواب صدیق حسن خاں صاحب بھوپالی اتحاف النبلاء میں تحریر فرماتے ہیں کہ

اگر وجود او در صدر اول در زمانہ ماضی می بود امام الائمہ و تاج المجتہدین شمردہ می شد (حوالہ بالا)	اگر شاہ صاحب کا وجود گذشتہ زمانہ میں صدر اول میں ہوتا تو۔ سرتاج ائمہ اور تاج المجتہدین شمار ہوتے

علامہ شبلی فرماتے ہیں: ابن تیمیہ اور ابن رشد کے بعد بلکہ انہیں کے زمانہ میں مسلمانوں میں جو عقلی تنزل شروع ہوا تھا اس کے لحاظ سے یہ امید نہ تھی کہ پھر کوئی صاحب دل و دماغ پیدا ہوگا، لیکن قدرت کو اپنی نیرنگیوں کا تماشا دکھانا تھا کہ اخیر زمانہ میں شاہ ولی اللہ صاحب جیسا شخص پیدا ہوا، جس کی نکتہ سنجیوں کے آگے غزالی، رازی اور ابن رشد کے کارنامے ماند پڑ گئے (حوالہ بالا)

مفتی عنایت احمد کاکوروی فرماتے ہیں کہ حضرت شاہ ولی اللہ کا حال اس شجرۂ طوبی کا سا ہے جس کی جڑ شاہ صاحب کے گھر میں ہے اور اس کی شاخیں تمام مسلمانوں کے گھروں میں ہیں، مسلمانوں کا کوئی گھر اور کوئی جگہ ایسی نہیں جہاں اس شجرۂ طوبی کی کوئی شاخ نہ ہو، لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے کہ اس کی جڑ کہاں ہے؟ (العون الکبیر ص ۱۹)

اور آپ کے مدنی استاذ شیخ ابوطاہر محمد بن ابراہیم کردی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ:

إنه يسند عني اللفظ وكنت أصحح منه المعنى (العون الکبیر ص ۱۹)	شاہ ولی اللہ مجھ سے الفاظ حدیث کی سند لیتے تھے اور میں ان سے معنی حدیث کی تصحیح کرتا تھا

یہ تمام احوال اور فضائل الفوز الکبیر کی شرح العون الکبیر، الفوز العظیم، مولانا محمد حنیف صاحب گنگوہی کی

ظفر المحصلین اور الفرقان بریلی کے شاہ ولی اللہ نمبر سے ماخوذ ہیں، اور آخر میں شاہ ولی اللہ نمبر ہی کی ایک نظم پر امام، محدث اعظم، مفسر قرآن، اصول تفسیر و اسرار شریعت کے موجد و مدون، مجدد وقت، مفکر ملت، امام امامت، جامع شریعت و طریقت، قدیم میں آیت اللہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب فاروقی قدس سرہ کے فضائل کا تذکرہ ختم کیا جاتا ہے۔

مجدد وقت

تو مبلغ تھا حدیث فخر موجودات کا — تیرے آتے ہی جنازہ اٹھ گیا بدعت کا
تو مفسر بھی محدث بھی، فقیہ وقت بھی — کون اندازہ لگائے تیرے خصوصیات کا
تیری فطرت بے نیاز ارباب شاہ و وزیر — تجھ کو دنیا میں بھروسہ تھا خدا کی ذات کا
میں سمجھتا ہوں مشیت کا وہی ملہم تھا — تو نے جو مطلب لیا قرآن کی آیات کا
عقل و مذہب کو سمویا تو نے اس انداز سے — آج تک چرچے نمایاں ہیں تری تحقیقات کا
تیرے ارشادات میں ساماں تسکین ضمیر — روح ایماں تھا تقدس تیرے ملفوظات کا
سادگی اسلام کی پھر سے نمایاں ہو گئی — نور جب پھیلا جہاں میں تیری "تفہیمات" کا
تیرے ارشادات ہیں تیرے نور ہدایت کی شبیہ — اب بھی چرچا ہے جہاں میں تیری تفہیمات کا

(ماہر القادری حیدرآبادی)

شاہ صاحب کی ایک قیمتی وصیت

اس تعارف کے آخر میں مجدد وقت حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی کی ایک اہم وصیت ذکر کی جاتی ہے، تاکہ آپ اس پر عمل کر کے نزول قرآن اور بعثت رسول کے مقصد کو تقویت اور شاہ صاحب کی روح کو راحت پہنچائیں، وصیت حسب ذیل ہے:

اول وصیت این فقیر چنگ زدن است بکتاب و سنت در اعتقاد و عمل و پیوستہ بتدبر ہر دو مشغول شدن و ہر روز حصہ از ہر دو خواندن، و اگر طاقت خواندن ندارد ترجمہ ورقے از ہر دو شنیدن

ترجمہ: اس فقیر کی پہلی وصیت یہ ہے کہ اعتقاد اور عمل دونوں میں کتاب و سنت (قرآن و حدیث) کو نہایت مضبوطی سے پکڑے، اور برابر دونوں میں تدبر (غور و فکر) جاری رکھے اور ہر روز دونوں کا کچھ حصہ پڑھے، اور اگر پڑھنے کی طاقت نہ رکھتا ہو تو کسی دوسرے سے کم از کم ایک ورق دونوں کا ترجمہ ہی سن لیا کرے۔

❁ ❁ ❁

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی رحمہ اللہ

کا

کلامی اور فقہی مسلک

مسئلہ مجتہد حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی رحمہ اللہ کے بارے میں اصحاب ظواہر (غیر مقلدین) کا خیال ہے کہ آپ تقلید ائمہ سے عام طور پر، اور حنفیت سے خاص طور پر بیزار تھے۔ ان کے خیال میں شاہ صاحب مسلک اہل حدیث پر تھے یعنی غیر مقلد تھے۔ چنانچہ وہ اپنا انتساب آپ کی طرف کرتے ہیں۔ اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس موضوع پر بھی کچھ گفتگو ہو جائے:

کلامی مسائل میں اہل حق کی تین جماعتیں:

علم کلام میں یعنی عقائد کے باب میں اہل حق کی تین جماعتیں ہیں: اشاعرہ، ماتریدیہ اور حنفیہ (یا حنابلہ)

۱- اشاعرہ: وہ حضرات ہیں جو شیخ ابو الحسن اشعری رحمہ اللہ (۲۶۰-۳۲۴ھ) کی پیروی کرتے ہیں۔ امام ابو الحسن اشعری چونکہ شافعی تھے۔ اس لئے یہ مکتب فکر شوافع میں مقبول ہوا یعنی حضرات شوافع عام طور پر کلامی مسائل میں اشعری ہوتے ہیں۔

۲- ماتریدیہ: وہ حضرات ہیں جو شیخ ابو منصور ماتریدی رحمہ اللہ (متوفی ۳۳۳ھ) کی پیروی کرتے ہیں۔ امام ماتریدی چونکہ حنفی تھے اس لئے یہ مکتب فکر احناف میں مقبول ہوا۔ احناف عام طور پر کلامی مسائل میں ماتریدی ہوتے ہیں۔

اشاعرہ اور ماتریدیہ کے درمیان بارہ مسائل میں اختلاف ہے، جو سب فروعی (غیر اہم) مسائل ہیں۔ بنیادی کسی مسئلہ میں اختلاف نہیں ہے۔[۱]

---

[۱] ان بارہ مسائل کو علامہ احمد بن سلیمان معروف بہ "ابن کمال پاشا" رحمہ اللہ (متوفی ۹۴۰ھ) نے ایک رسالہ میں جمع کر دیا ہے۔ یہ رسالہ مطبوعہ ہے مگر عام طور پر علماء اس سے واقف نہیں ہیں۔ اس لئے وہ رسالہ ذیل میں بعینہٖ دیا جاتا ہے تاکہ وہ علماء تک پہنچ جائے:

رسالۃ الاختلاف بین الأشاعرۃ والماتریدیۃ

فی اثنتی عشر مسئلۃ للمحقق ابن کمال باشا

←

→ بسم الله الرحمن الرحيم

قال الأستاذ: اعلم أن الشيخ أبا الحسن الأشعري إمام أهل السنة، ومقدّمهم، ثم الشيخ أبو المنصور الماتريدي، وأن أصحاب الشافعي وأتباعه تابعون له - أي لأبي الحسن الأشعري - في الأصول، وللشافعي في الفروع، وأن أصحاب أبي حنيفة تابعون للشيخ أبي منصور الماتريدي في الأصول، ولأبي حنيفة في الفروع، كذا أفاد بعضُ مشايخنا رحمه الله تعالى.

ولا نزاع بين الشيخين إلا في اثنتي عشر مسئلة:

الأولى: قال الماتريدي: التكوين صفة أزلية، قائمة بذات الله تعالى، كجميع صفاته، وهو غيرُ المكوّن، ويتعلق بالمكوّن من العالم، وكلِّ جزء فيه، بوقت وجوده، كما أن إرادة الله تعالى أزلية، يتعلق بالمرادات بوقت وجودها، كذا قدرته تعالى الأزليةُ مع مقدوراتها.

وقال الأشعري: إنها صفةٌ حادثة، غيرُ قائمة بذات الله تعالى، وهي من الصفات الفعلية عنده، لا من الصفات الأزلية، والصفاتُ الفعلية كلها حادثة، كالتكوين والإيجاد، ويعلّق وجودُ العالم بخطاب "كن".

المسألة الثانية: قال الماتريدي: كلام الله تعالى ليس بمسموع، وإنما المسموع الدالّ عليه. وقال الأشعري: مسموع، كما هو المشهور من حكاية موسى عليه السلام.

وقال ابن فورك: المسموعُ عند قراءة القاري شيئان: صوت القاري وكلام الله تعالى، وقال القاضي الباقلاني: كلامُ الله غيرُ مسموع على العادة الجارية، ولكن يجوز أن يُسمع اللّهُ تعالى من شاء من خلقه، على خلاف قياس العادة، من غير واسطة الحروف والصوت، وقال أبو إسحاق الإسفرائني ومن تبعه: إن كلام الله تعالى غيرُ مسموع أصلاً، وهو اختيار الشيخ أبي منصور الماتريدي، كذا في البداية.

المسألة الثالثة: قال الماتريدي: صانعُ العالم موصوف بالحكمة، سواء كانت بمعنى العلم، أو بمعنى الإحكام. وقال الأشعري: إن كانت بمعنى العلم فهي صفة أزلية، قائمة بذات الله تعالى، وإن كانت بمعنى الإحكام فهي صفة حادثة، من قبيل التكوين، لا يوصف ذاتُ الباري بها.

المسألة الرابعة: قال الماتريدي: إن الله مريد بجميع الكائنات: جوهرًا أو عرضًا، طاعة أو معصية، إلا أن الطاعة تقع بمشيئة الله، وإرادته، وقضائه، وقدرته، ورضائه، ومحبته، وأمره، وأن المعصية تقع بمشيئة الله تعالى، وإرادته، وقضائه، لا برضائه، ومحبته، وأمره.

وقال الأشعري: إن رضا الله تعالى ومحبته شاملٌ بجميع الكائنات، كإرادته.

المسألة الخامسة: تكليفُ ما لا يُطاق ليس بجائز عند الماتريدي، وتحميلُ ما لا يُطاق عنده جائز، وكلاهما جائزان عند الأشعري.

المسألة السادسة: قال الماتريدي: بعضُ الأحكام المتعلّقة بالتكليف معلوم بالعقل؛ لأن العقل ←

۳- سلفیہ: وہ حضرات ہیں جو صفات خداوندی کی تاویل کے عدم جواز میں حضرت امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ (۱۶۴-۲۴۱ھ) وغیرہ کے مسلک پر ہیں۔ چونکہ صفات کے تعلق سے یہی قول اسلاف کرام کا تھا اس لئے یہ حضرات سلفیہ کہلائے۔ اس جماعت کو کتابوں میں حنابلہ بھی کہا گیا ہے۔ مگر چونکہ فقہی حنبلیت سے التباس ہوتا تھا اس لئے رفتہ رفتہ یہ اصطلاح متروک ہوگئی۔ مسئلہ خلق قرآن میں بھی یہ نام سلفیہ کے لئے استعمال ہوا ہے۔ نیز اس مسلک کو مسلک محدثین بھی کہا جاتا ہے۔ اس لئے کہ امام مالک، سفیان ثوری وغیرہ حضرات محدثین سے صفات متشابہات کے بارے میں یہی نقطۂ نظر مروی ہے۔ اور اس زمانہ میں جو سلفیت نو نکلی ظاہر ہے جس کی عدم تقلید اساس بتایا جاتا ہے وہ تلبیس ہے اور

← آلة يدرك بها حُسْنُ بعض الأشياء وقبحها، وبها يُدرك وجوب الإيمان، وشكرُ المنعم، وإن المعرِّف والموجب هو الله تعالى، لكن بواسطة العقل، كما أن رسول الله صلى الله عليه وسلم معرِّف الوجوب، والموجبُ الحقيقي هو الله تعالى، لكن بواسطة الرسول عليه السلام، حتى قال: لا عذر لأحد في الجهل بخالقه، ألا يرى خلق السماوات والأرض؛ ولو لم يبعث رسولاً لوجب على الخلق معرفته بعقولهم.

وقال الأشعري: لايجب شيئٌ ولا يحرم إلا بالشرع، لا بالعقل، وإن كان للعقل أن يدرك حُسن بعض الأشياء، وعند الأشعري جميعُ الأحكام المتعلقة بالتكليف مُلقاة بالسمع.

المسألة السابعة: قال الماتريدي: قد يسعد الشقي، وقد يشقى السعيد. وقال الأشعري: لا اعتبار بالسعادة والشقاوة إلا عند الخاتمة والعاقبة.

المسألة الثامنة: العفو عن الكفر ليس بجائز، وقال الأشعري: يجوز عقلاً، لاسمعاً.

المسألة التاسعة: قال الماتريدي: تخليد المؤمن في النار، وتخليد الكافر في الجنة لايجوز عقلاً وسمعاً، وعند الأشعري: يجوز.

المسألة العاشرة: قال بعض الماتريدية: الاسم والمسمى واحد، وقال الأشعري: بالتغاير بينهما، وبين التسمية، ومنهم من قسّم الاسم إلى ثلاثة أقسام: قسمٌ عينه، وقسم غيره، وقسم ليس بعينه ولا بغيره. والاتفاق على أن التسمية غيرهما، وهي متعلقة بالمسمى، كذا في بداية الكلام.

المسألة الحادية عشر: قال الماتريدي: الذكورة شرط في النبوة، حتى لا يجوز أن تكون الأنثى نبياً. وقال الأشعري: ليست الذكورة شرطا فيها، والأنوثة لاتنافيها، كذا في بداية الكلام.

المسألة الثانية عشر: قال الماتريدي: فعلُ العبد يسمى كسْباً، لا خلقاً، وفعلُ الحق يسمى خلقاً، لا كسباً. والفعلُ يتناولهما. وقال الأشعري: الفعلُ عبارة عن الإيجاد حقيقة، وكسْبُ العبد يسمى فعلاً بالمجاز، وقد تفرَّد القادر خلقاً، ولا يجوز تفرد القادر به كسباً.

(تمت الرسالة الشريفة لابن كمال باشا رحمه الله تعالى)

(یہ رسالہ کتب خانہ مدرسہ مظاہر علوم سہارن پور، صفحہ ۲۳۳ میں متفرق نمبر ۲ مجموعہ رسائل میں ہے)

لفظ کا غیر معروف معنی میں استعمال ہے۔

اور سلفیوں کا اشاعرہ اور ماتریدیہ سے اختلاف صرف ایک معمولی بات میں ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ صفات متشابہات: استواء علی العرش، ید، وجہ وغیرہ کی تاویل جائز ہے یا نہیں؟ سلفیوں کے نزدیک تاویل ناجائز ہے اور باقی دونوں مکاتب فکر کے نزدیک تاویل جائز ہے۔ چنانچہ حنابلہ قرآن کریم کو جو اللہ کی صفت کلام ہے مطلقاً بلاتاویل قدیم کہتے ہیں۔ اور اشاعرہ اور ماتریدیہ کلام نفسی کی تاویل کرتے ہیں اور اسی کو قدیم کہتے ہیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے مسلک محدثین کے خلاف لفظی بالقرآن حادث کہہ دیا تھا تو حنابلہ نے جن کے سرخیل امام ذہلی تھے، ایک طوفان کھڑا کر دیا تھا۔

غرض علم کلام میں یہی تین جماعتیں برحق ہیں۔ دیگر تمام فرق اسلامیہ جیسے معتزلہ، جہمیہ، کرامیہ وغیرہ گمراہ فرقے ہیں۔ یہی فرقے اہل السنۃ والجماعۃ کے خصم (مد مقابل) ہیں اور در مختار کے مقدمہ میں ہے کہ: إذا سُئلنا عن معتقدنا ومعتقد خصومنا، قلنا وجوباً: الحقُّ ما نحن علیہ، والباطلُ ما علیہ خصومُنا.

شاہ صاحب کلام میں اشعری تھے:

کلامی مسائل میں حضرت شاہ صاحب اشعری تھے۔ بخاری شریف کے ایک قلمی نسخہ پر، جس کا تذکرہ آگے آتا ہے، شاہ صاحب نے بقلم خود اپنے کو "اشعری" لکھا ہے۔ تاہم صفات کی تاویل کے مسئلہ میں آپ محدثین کرام یعنی اسلاف کے مسلک کو بھی برحق سمجھتے تھے۔ اور صفات کی تاویل کو آپ ناپسند کرتے تھے مگر بایں ہمہ آپ نے صفات کی تاویل کی بھی ہے۔ اسی جلد میں مبحث خامس کے باب (۴) میں جو صفات الٰہیہ پر ایمان لانے کے بیان میں ہے، آپ نے پہلے صفات کے بارے میں دشواریوں کا تذکرہ کیا ہے۔ پھر اس کا حل پیش کیا ہے۔ پھر یہ بات بیان کی ہے کہ صفات پر دلالت کرنے والے الفاظ بعینہٖ استعمال کئے جائیں، اور استعمال سے زیادہ کھود کرید نہ کی جائے۔ پھر صراحۃً یہ بات بیان فرمائی ہے کہ صفات کے بارے میں محدثین کا موقف صحیح ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

"صفات کی تاویل میں گھسنے والوں نے محدثین کی جماعت کو بدنام کیا ہے۔ وہ ان کو مُجَسِّمہ اور مُشَبِّہہ کہتے ہیں۔ اور یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ لوگ بلا کیفیۃ کے پردہ میں چھپنے والے ہیں۔ اور مجھ پر یہ بات بالکل واضح ہوگئی ہے کہ ان کی یہ زباں درازی کچھ بھی نہیں۔ اور وہ اپنی باتوں میں نقلاً بھی اور عقلاً بھی غلطی پر ہیں۔ اور انھوں نے جو ہدایت کے پیشواؤں پر اعتراضات کئے ہیں وہ اس میں خطا کار ہیں"

پھر مابعد آپ نے صفات الٰہیہ کے معانی تفصیل سے بیان کئے ہیں یعنی ان کی تاویلات کی ہیں۔ اور بات یہاں سے شروع کی ہے کہ ہمارے لئے جائز ہے کہ ہم صفات کی ایسی معانی سے تشریح کریں، جو اظہار حقیقت میں ان تاویل کرنے والوں کی باتوں سے اقرب اور زیادہ ہم آہنگ ہیں۔ اس سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ آپ اشعری

ضرور ہیں: صفات کی تاویل کو جائز رکھتے ہیں مگر ساتھ ہی اسلاف کے مسلک کو بھی برحق بیان کرتے ہیں۔

شاہ صاحب فروعات میں حنفی تھے:

حضرت شاہ صاحب مقلد اور عملاً حنفی تھے۔ جیسا کہ انھوں نے خود اپنے قلم سے تحریر فرمایا ہے۔ یہ تحریر خدا بخش لائبریری میں صحیح بخاری کے ایک نسخہ پر ہے، جو حضرت شاہ صاحب کے زیر درس رہا ہے۔ اس نسخہ کو آپ کے ایک تلمیذ محمد بن پیر محمد بن شیخ ابی الفتح نے پڑھا ہے۔ تلمیذ مذکور نے درس صحیح بخاری کے ختم کی تاریخ ۲۶ شوال ۱۱۵۹ھ لکھی ہے، جمنا ندی کے قریب جامع فیروزی میں کتاب ختم ہوئی ہے۔ اس کے بعد حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ نے اپنے ہاتھ سے اپنی سند امام بخاری تک لکھ کر تلمیذ مذکور کے لئے سند اجازت تحدیث لکھی ہے اور آخر میں اپنے نام کے ساتھ یہ کلمات لکھے ہیں۔ العمري نسبا، الدهلوي وطنا، الأشعري عقيدة، الصوفي طريقة، الحنفي عملا، والحنفي والشافعي تدريسا، خادم التفسير والحديث والفقه والعربية والكلام ۲۶ شوال ۱۱۵۹ھ

اس تحریر کے نیچے حضرت شاہ رفیع الدین صاحب دہلوی رحمہ اللہ نے یہ عبارت لکھی ہے کہ: ''بیشک یہ تحریر بالا میرے والد محترم کے قلم کی لکھی ہوئی ہے''

علاوہ ازیں تقلید کی ضرورت پر بحث فرماتے ہوئے حضرت شاہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ کی قسم اول کے تتمہ کی آخری فصل میں تصریح فرمائی ہے کہ: ''مذاہب اربعہ کی تقلید کے جواز پر کل امت مرحومہ یا اس کے معتمد حضرات کا اجماع ہو چکا ہے اور تقلید ائمہ میں کئی مصالح شرعیہ موجود ہیں، خصوصاً اس زمانہ میں کہ ہمتیں کوتاہ ہیں، ہوائے نفسانی کا غلبہ ہے اور ہر شخص اپنی رائے کو دوسروں کے مقابلہ میں ترجیح دیتا ہے''

پھر اس پر مفصل بحث کی ہے کہ ابن حزم ظاہری نے جو تقلید کو حرام کہا ہے اور اس پر دلائل قائم کئے ہیں، وہ صرف ان لوگوں کے حق میں صحیح ہو سکتا ہے:

۱- جو خود اجتہادی صلاحیت رکھتے ہوں۔ اور احادیث رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا علم پورا پورا رکھتے ہوں اور ناسخ منسوخ وغیرہ امور سے واقف ہوں۔

۲- یا ان جاہلوں کے حق میں صحیح ہو سکتا ہے جو کسی کی تقلید اس عقیدہ سے کرتے ہوں کہ اس شخص سے کوئی غلطی اور خطا ممکن نہیں۔ اور وہ اس کی تقلید کو کسی مسئلہ میں چھوڑنے کے لئے تیار نہ ہوں، خواہ اس کے خلاف دلیل سے بات واضح کیوں نہ ہو جائے۔

۳- یا اس شخص کے حق میں صحیح ہے جو حنفی ہونے کی وجہ سے کسی شافعی سے مسائل دریافت کرنا جائز نہ سمجھتا ہو یا اس کے برعکس۔ یا حنفی شافعی امام کے پیچھے اقتدا کو جائز نہ سمجھتا ہو یا اس کے برعکس۔

لیکن تقلید اس شخص کے حق میں درست نہیں کہ جسے دینی امور کا ماخذ نبی اکرم ﷺ کے اقوال و کردار، اور حلال و حرام معرفت الٰہی کی چیزوں کو گھٹتے ہوئے ان کو خدا اور رسول خدا ﷺ نے حلال و حرام کیا ہے۔ ایسا شخص کہ جب کسی وجہ سے کسی عالم و امام کی رائے میں سنت کو چھوڑتا پائے اور خلاف کی صورت میں حق بات کو تسلیم کرنے کے لئے ہر وقت تیار رہے، ایسے شخص کی تقلید پر نکیر کرنا کسی طرح بھی صحیح نہیں، کیونکہ افتاء و استفتاء کا طریقہ عہد نبوت سے اب تک برابر چلا آرہا ہے۔ ضرورت صرف اس کی ہے کہ ہم کسی فقیہ کو نبی یا معصوم نہ سمجھیں۔

شاہ صاحب قدس سرہ کی یہ ساری گفتگو جو ان شاء اللہ جلد دوم میں آئے گی تقلید کے ثبوت پر ایک ناطق شہادت ہے علاوہ ازیں اسی جلد میں بھی بحث خامس کے باب دوم میں حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ نے مجتہدین کی طرف سے دفاع کیا ہے کہ ان کی تقلید غیر اللہ کو رب بنانا نہیں۔

تدریساً حنفی شافعی ہونے کا مطلب

اور تدریساً یعنی پڑھانے کے اعتبار سے حنفی شافعی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ پڑھنے میں — اور تصنیف بھی تدریس ہی ہے — شاہ صاحب اس کے پابند نہیں کہ ہر مسئلہ میں حنفیت ہی کو ترجیح دیں۔ آپ کے نزدیک جہاں دوسرے مذہب راجح ہوتے ہیں اس کو ترجیح دیتے ہیں، مگر جب عمل کا وقت آتا ہے تو فقہ حنفی کے مطابق عمل کرتے ہیں۔ دار العلوم دیوبند کے بعض بڑے اساتذہ کا بھی یہی حال تھا، آپ سبق آزادی سے پڑھاتے تھے مگر جب عمل کرتے یا فتوی دیتے تو حنفیت کے دائرہ میں رہتے۔

اور اس کی وجہ خود شاہ صاحب نے اپنی بعض تالیفات میں بیان کی ہے کہ

کسی مذہب کے حق ہونے کے دو معنی ہیں:

ایک یہ کہ وہ مذہب قرآن و حدیث کی نصوص کے ظاہری معنی کے موافق ہے۔

دوم یہ کہ وہ مذہب نصوص کے مقصود و منشا کے موافق ہے۔

چنانچہ آپ نے کسی جگہ مذہب شافعی کو ترجیح دی ہے تو وہ پہلے معنی کے اعتبار سے ہے اور اس مسئلہ میں بھی مذہب حنفی حق ہوتا ہے دوسرے معنی کے اعتبار سے۔ اس کی تفصیل مولانا سندھی رحمہ اللہ کی کتاب إلهام الرحمن في تفسير القرآن (۲۲۱-۲۲۳) میں ہے۔

علاوہ ازیں شاہ صاحب قدس سرہ حنفی تھے، شافعی تھے یا مالکی تھے، جو بھی تھے مگر غیر مقلد ہرگز نہیں تھے۔ یہ ظاہر بات تو ایک بالکل طے شدہ امر ہے کیونکہ ان کی بنیاد انکار اجماع و قیاس پر ہے۔ شاہ صاحب نے عقد الجید میں اور حجۃ اللہ البالغہ قسم اول کے تحت میں اس کی صراحت کی ہے۔ واللہ یهدی السبیل۔

حجۃ اللہ البالغہ

(مطبوعہ اور مخطوطہ نسخے)

مشہور ہے کہ حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ حجۃ اللہ البالغہ کی تبییض نہیں کر پائے تھے کہ آپ کی وفات ہوگئی۔ آپ نے کتاب کا مسودہ چھوڑا تھا۔ حجۃ اللہ البالغہ جلد اول صفحہ ۱۴۰ کے حاشیہ میں ہے: ومن ههنا يعلم أن المصنف رحمه الله لم يتيسر له النظر الثاني في هذا الكتاب، كما هو مشهور عند الناس اهـ من هامش الأصل. محشی نے یہ بات اپنی طرف سے نہیں لکھی، بلکہ کسی مخطوطہ نسخہ کے حاشیہ سے نقل کی ہے۔ مگر یہ بات صحیح نہیں۔ حجۃ اللہ کی تصنیف شاہ صاحب رحمہ اللہ کی وفات سے بہت پہلے مکمل ہوگئی تھی۔ اور طلبہ نے یہ کتاب آپ سے بار بار پڑھی بھی ہے۔ اور تفہیمات میں شاہ صاحب نے متعدد جگہ اس کا حوالہ بھی دیا ہے۔ مثلاً:

تفہیمات جلد اول صفحہ ۱۸ تفہیم نمبر ۱۵ میں، اور جلد دوم صفحہ ۴۰ تفہیم ۲۰۲ میں اور جلد دوم صفحہ ۳۵ تفہیم ۲۲۷ میں اور جلد دوم صفحہ ۲۴۹ تفہیم ۱۳۱ میں شاہ صاحب نے حجۃ اللہ کا حوالہ دیا ہے۔

اور تفہیمات جلد اول صفحہ ۳۰۹ تفہیم ۷۰ میں ہے کہ حافظ عبد الرحمن بن حافظ نظام الدین تتوی نزیل دہلی نے شاہ صاحب سے حجۃ اللہ بھی پڑھی ہے۔

مطبوعہ نسخے

(۱) —— حجۃ اللہ البالغہ: پہلی مرتبہ حضرت مولانا محمد احسن صدیقی نانوتوی رحمہ اللہ (متوفی ۱۳۱۲ھ) کی تصحیح وتعلیق کے ساتھ مولانا محمد منیر کے مطبع صدیقی بریلی میں، بہ تحریک وتعاون افضل العلماء جناب مفتی محمد جلال الدین صاحب رحمہ اللہ (متوفی ۱۲۹۹ھ) مدار المہام ریاست بھوپال طبع ہوئی تھی۔ یہ طبع صحۃ الف السالفۃ مکملۃ ہے جس سے ۱۲۸۹ھ چھپا ہے۔ مولانا نانوتوی نے متعدد قلمی نسخوں سے مقابلہ کرکے کتاب کی تصحیح اور تعلیق کی ہے۔ کتاب کے آخر میں ان نسخوں کا تذکرہ ہے۔ آپ نے لکھا ہے کہ حضرت مولانا احمد حسن مرادآبادی، حضرت مولانا محمد سعد اللہ صاحب مرادآبادی،

حضرت مولانا محمد ریاض الدین کاکوروی اور حضرت مولانا ارشاد حسین صاحب مجددی رامپوری کے مخطوطہ نسخوں سے کتاب اشاعت کے لئے تیار کی ہے۔ یہ پہلا ایڈیشن جہازی سائز کے ۲۹۲ صفحات میں مکمل ہوا ہے اور ایک ہی جلد میں ہے۔ دارالعلوم دیوبند کے کتب خانہ میں یہ نسخہ موجود ہے۔

مولانا نانوتوی نے شاہ صاحب رحمہ اللہ کی وفات سے ایک سو دس سال بعد جب کتاب طبع کرنے کا بیڑا اٹھایا تو اس وقت کتاب کے قلمی نسخے بڑی تعداد میں ملک کے طول وعرض میں موجود تھے۔ آپ نے محنت شاقہ اور بڑی جانکاہی سے کتاب کا صحیح ترین نسخہ تیار کیا۔ چنانچہ مطبوعہ صدیقی تمام مطبوعہ نسخوں میں صحیح ترین نسخہ ہے۔ مگر اس میں بھی بعض غلطیاں رہ گئی ہیں جو کتاب فہمی میں سد راہ ہوتی ہیں۔

مطبوعہ صدیقی میں مختصر تعلیقات کے علاوہ عبارت میں ضروری اعراب بھی لگائے گئے ہیں، جن سے کتاب فہمی میں بڑی مدد ملتی ہے۔ پہلے خیال تھا کہ یہ تعلیقات اور اعراب مولانا نانوتوی نے لگائے ہیں، مگر جب مخطوطہ کراچی کا فوٹو آیا، جو خود شاہ صاحب کے سامنے پڑھا گیا ہے تو یہ حقیقت واضح ہوئی کہ یہ ضروری اعراب یا تو خود مصنف نے لگائے ہیں، یا پڑھتے وقت ان کے تلامذہ نے لگائے ہیں اور بعض حواشی بھی اس میں موجود ہیں۔ اور بین السطور میں ترکیب کے بعض اشارے بھی ہیں۔ اور ضمائر کے مراجع کی تعیین کے لئے نمبر بھی ڈالے گئے ہیں۔ غرض یہ ضروری اعراب کتاب فہمی کے لئے نہایت کارآمد چیز ہیں۔ یہ چھوٹی موٹی شرح کا کام دیتے ہیں۔ میں نے وہ اعراب نہ صرف یہ کہ باقی رکھے ہیں، بلکہ اس میں ضروری اضافہ بھی کیا ہے۔

(۲) — پھر اس مطبوعہ صدیقی سے بعنایت نواب صدیق حسن خاں صاحب بھوپالی (متوفی ۱۳۰۷ھ) اور بمصارف حکومت بھوپال مجدداً مصر کے مطبعہ خیریہ میں ۱۳۲۲ھ میں طبع ہوئی۔ اس طبع میں ناشر نے کتاب کو کئی پاروں (جلدوں) میں تقسیم کیا اور جلد دوم ہے جو دُ جلد سے شروع کی۔ علاوہ ازیں یہ مجدداً مصر میں دو مرتبہ اور بھی شائع ہوئی ہے ان میں سے ایک مرتبہ مطبع امیریہ بولاق میں طبع ہوئی ہے۔ مطبوعہ مصر میں اعراب نہیں ہیں۔ کیونکہ اس زمانہ میں ٹائپ میں اعراب کی سہولت عام نہیں تھی، اور اہل لسان کو اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ مگر یہ واقعہ ہے کہ بغیر ضروری اعراب کے طبع کرنے سے کتاب فہمی کی راہ میں دشواری پیدا ہوگئی۔ اس وقت ہندوپاک میں مطبوعہ مصر کے فوٹو شائع ہورہے ہیں۔ اس لئے کہ وہ کوئی قابل ذکر چیز نہیں ہیں۔

(۳) — ابھی قریب میں مصر ہی سے قاہرہ کے دارالکتب الحدیثہ اور بغداد کے مکتبۃ المثنیٰ کے اشتراک سے سید سابق (مؤلف فقہ السنۃ) کی تحقیق ومراجعت سے مجدداً دو جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔ مگر یہ کوئی اہم نسخہ نہیں ہے۔ محقق کا نام بس برائے بیت ہے۔ انھوں نے کتاب میں مقدمہ کے علاوہ کچھ نہیں کیا۔ بس عبارت کے پیراگراف بنادیئے ہیں۔ غالباً ناشرین نے طباعت کا جواز پیدا کرنے کے لئے موصوف کا نام استعمال کیا ہے۔

کتاب کے مخطوطے

① ——— مخطوطہ کراچی: کراچی (پاکستان) میں جناب خالد اسحاق ایڈوکیٹ صاحب کا ایک نہایت نادر کتب خانہ ہے، اس میں حجۃ اللہ کا ایک ایسا مخطوطہ ہے جو حضرت شاہ صاحب قدس سرہ کے سامنے پڑھا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ دارین میں جزائے خیر عطا فرمائیں میرے دوست، فاضل محترم، دارالعلوم دیوبند کے سابق استاذ، جناب مولانا عبدالرؤف صاحب افغانی دام لطفہ حال استاذ جامعہ اسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی و مدیر ماہنامہ البینات کراچی (عربی) کو کہ انھوں نے اس نسخہ کی کھوج لگائی اور جناب خالد اسحاق صاحب سے ملاقات کی، موصوف نے خندہ پیشانی سے اس کا فوٹو عنایت فرمایا فجزاهما الله تعالى خيراً في الدارين (آمین)

یہ مخطوطہ حضرت شاہ صاحب کی وفات سے سترہ سال پہلے ۱۱۵۹ھ میں لکھا گیا ہے۔ کتاب کے آخر میں اس کی صراحت ہے۔ پھر یہ نسخہ طلبہ نے مصنفؒ سے پڑھا ہے۔ کتاب کے شروع میں یہ تحریر ہے: "پیش حضرت شیخ مصنف بطریق تعلم شروع نمودہ شد، الحمد للہ سبحانہ توفیق اتمام وہادہ و تحقیق بایں نسخہ میسر شد" پھر اس تحریر کے بارے میں اسی قلم سے لکھا ہے: "۱۳ شعبان ۱۱۴۲ھ آخر جمعہ پیش حضرت مرشد خود مدظلہ اللہ تعالیٰ تحقیق میسر گشت" اور کتاب کے آخر میں لکھا ہے: "تم الکتاب: الحجۃ البالغۃ" بید الفقیر الحقیر بندۂ کریم ہر کہ خواند دعا طمع دارم بندۂ گنہگار سہ ۱۱۵۹ الہجری المقدس"

یہ نسخہ ۳۷۲ اوراق میں ہے۔ اور دو تحریروں میں لکھا گیا ہے ۵۷ اوراق خط نسخ میں ہیں اور باقی خط نستعلیق میں ہیں۔ قسموں کے آخر میں جو تتمہ ہے وہ اس نسخہ میں نہیں ہے۔ یہ مضامین شاہ صاحب نے بعد میں بڑھائے ہیں۔ کتاب میں کئی جگہ حک و فک ہے بعض عبارتیں قلم زد کردی گئی ہیں۔ یہ مخطوطات میں صحیح ترین نسخہ ہے اور کتاب کی تصحیح میں اس سے بڑی مدد ملی ہے۔

② ——— مخطوطہ پٹنہ: بانکی پور، عظیم آباد کی خدا بخش لائبریری میں بھی حجۃ اللہ کا ایک مخطوطہ ہے۔ اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائیں میرے دوست جناب مولانا شاہ الہدیٰ ویشالوی زید لطفہ (مؤلف تفہیم السنن) کو کہ انھوں نے نہ صرف اس نسخہ کا پتہ چلایا، بلکہ اس کی فلم بھی حاصل کرلی، جس کو فاضل محترم، صدیق مکرم جناب مولانا افتخار حسین صاحب کیلیاری قاسمی استاذ مدرسہ امینیہ دہلی نے کاغذ پر منتقل کردیا۔ اللہ تعالیٰ دونوں دوستوں کو دارین میں ان کی محنت کی جزائے خیر عطا فرمائیں اور ان کو ترقیات سے نوازیں (آمین)

یہ نسخہ ۲۵۷ اوراق میں نہایت خوشخط ہے۔ ۱۲۴۰ھ میں لکھا گیا ہے۔ کتاب کے آخر میں ہے: "تمت: تمام شد این کتاب بموجب فرمائش جناب منشی محمد حسن صاحب دام اقبالہ بتاریخ دوازدہم ماہ ربیع الثانی سنہ ۲۲ جلوس مطابق ہجری ۱۲۴۰ انتہا" صحت میں اس کا دوسرا مقام ہے۔ جو مضامین مخطوطہ کراچی میں نہیں ہیں ان کی تصحیح اسی نسخہ سے کی گئی ہے۔

(۳) ـــــ مخطوطہ برلین: جرمنی کے مشہور شہر برلین (Berlin) کی لائبریری میں بھی حجۃ اللہ کا ایک مخطوطہ ہے۔ اس کا فوٹو برادر مکرم و محترم جناب مولانا اسماعیل صاحب سپات امام مسجد قبا اسٹامفورڈ ہل لندن کی عنایت سے بواسطہ فاضل گرامی حضرت مولانا محمد فہیم صاحب حال مقیم لندن کی سعی جمیل سے اور محب محترم و برادر مکرم جناب حافظ عبدالرحیم ملا صاحب (تاجر شہر لندن) کے تعاون سے حاصل ہوا۔ اللہ تعالیٰ ان تینوں دوستوں کو دارین میں بہترین بدلہ عطا فرمائیں (آمین)

یہ نسخہ سب سے زیادہ واضح اور صاف ہے۔ ۴۳۹ صفحات میں ہے۔ مگر بے حد غلط ہے۔ کسی طرح بھی قابل اعتماد نہیں، میں نے دیگر نسخوں کی تائید کے بغیر صرف اس نسخہ سے کتاب میں کوئی تصحیح نہیں کی۔

(۴) ـــــ حجۃ اللہ کا ایک نسخہ محدث کبیر رشد اللہ صاحب العلم کے کتب خانہ میں ہے جو ضلع حیدرآباد سندھ کے موضع پیر جھنڈا میں ہے۔ جو ۱۲۸۲ھ کا مکتوبہ ہے۔ کاتب شیخ محمود بن محمد سندھی ہیں۔ یہ نسخہ ۲۴۳ اوراق میں ہے۔ مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی صاحب نے تعلیقات کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ "اس کا فائدہ یہ ہے، نسخہ تصحیح شدہ ہے، حضرت علامہ سندھی رحمہ اللہ کے مطالعہ میں رہ چکا ہے۔" غالباً مولانا سندھی رحمہ اللہ کی تقریر میں جو تصحیحات ہیں وہ اسی نسخہ سے کی گئی ہیں۔ میں نے یہ نسخہ تلاش کیا مگر وسائل کی کمی اور طلب دور دراز ہونے کی وجہ سے مجھے اب تک کامیابی حاصل نہیں ہو سکی۔

علاوہ ازیں حجۃ اللہ البالغہ کے اور بھی متعدد مخطوطے ہیں۔ حضرت مولانا نور الحسن راشد صاحب کاندھلوی زید مجدہ نے بتلایا کہ حجۃ اللہ البالغہ کے آٹھ قلمی نسخے موجود ہیں۔ جن میں سے ایک حرم مکی کے مکتبہ میں ہے جو حضرت مولانا اسحاق صاحب محدث دہلوی کے مطالعہ میں رہا ہے۔ (مولانا کی بات پوری ہوئی) اور مجھے اس مخطوطہ کی تلاش ہے جس میں قسم اول کے آخر کا تتمہ ہے۔ مولانا نانوتوی رحمہ اللہ نے مطبوعہ صدیقی میں تتمہ کے شروع میں لکھا ہے کہ یہ صرف ایک مخطوطہ میں تھا جس کی بنا پر اس کو کتاب میں لیا گیا ہے۔ مجھے جو تین مخطوطے حاصل ہوئے ہیں ان تینوں میں یہ تتمہ نہیں ہے۔ اس لئے مجھے خود اس مخطوطہ کی تلاش ہے جس میں یہ تتمہ ہے۔ اگر کوئی قاری اس سلسلہ میں میرا تعاون اور راہنمائی کرسکتے ہوں تو ضرور مطلع کریں۔

بسم الله الرحمن الرحيم

الحمد لله الذي فطر الأنام على ملة الإسلام والاهتداء، وجبلهم على الملة الحنيفية السمحة السهلة البيضاء، ثم إنهم غشيهم الجهل ووقعوا في أسفل السافلين وأدركتهم الشقاء، فرحمهم ولطف بهم وبعث إليهم الأنبياء، ليخرجهم من الظلمات إلى النور ومن الضيق إلى الفضاء، وجعل طاعته منوطة بطاعتهم في الخفر والملاء، ثم ورّث من أتباعهم لتحمل علومهم وفهم أسرار شرائعهم من شاء، فأصبحوا بحمد الله حائزين لأسرارهم فائزين بأنوارهم وناهيك به من عُلياء، وفضل الرجل منهم على ألف عابد، وسمّوا في الملكوت عظماء، وجعلوا بحيث يستغفر لهم خلق الله حتى الحيتان في جوف الماء، فصلى الله عليهم وسلم عليهم وعلى من تبعهم ما دامت الأرض والسماء، وبخصوص من بينهم سيدنا محمد المؤيد بالآيات الواضحة الغراء بأفضل الصلوات

[illegible]

مخطوطہ پٹنہ (خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ) کے پہلے صفحہ کا عکس، یہ نسخہ ۱۲۴۴ھ میں لکھا گیا ہے

بسم الله الرحمن الرحيم

الحمد لله الذي فطر الأنام على ملة الإسلام والاستسلام، وجبلهم على الملة الحنيفية السمحة السهلة
البيضاء، ثم إنهم غشيهم الجهل، ووقعوا بسبل الشياطين وأدركهم الشقاء، فرحمهم ولطف
بهم وبعث إليهم الأنبياء ليخرجهم من الظلمات إلى النور ومن المضيق إلى الفضاء، وجعل طاعتهم
منوطاً سبباً عنهم فبالفوز والعلاء، ثم وفق من أتباعهم الكمل علماء فهموا أسرار شرائعهم مشايخ
فأصبحوا بنعمة الله حائزين لأسرارهم فائزين بأنوارهم نخبة من علماء وفضلاء أجلاء الذين
منهم على ألف عابد، وسموا في الملكوت عظماء فصاروا وأحبت يدعو لهم خلق الله حتى
الحيتان في جوف الماء، فصلى الله وسلم عليهم وعلى ورثتهم ما دامت الأرض والسماء
وخص من بينهم سيدنا محمداً المؤيد بالآيات الواضحة الغراء بأفضل الصلوات وأكرم التحيات
وأصفى الاصطفاء، وأمطر على آله وأصحابه شآبيب صلواته، وجازاهم أحسن الجزاء. أما بعد
فيقول العبد الفقير إلى رحمة الله الكريم أحمد المدعو بولي الله بن عبد الرحيم عاملهما الله تعالى
بفضله العظيم وجعل مآلهما النعيم المقيم: إن عمدة العلوم اليقينية ورأسها ومبنى الفنون الدينية
وأساسها هو علم الحديث الذي يذكر فيه ما صدر من أفضل المرسلين صلى الله عليه وعلى آله
وأصحابه أجمعين من قول وفعل وتقرير، فهي مصابيح الدجى ومعالم الهدى، وبمنزلة البدر
المنير، من انقاد لها ووعى فقد رشد واهتدى، وأوتي الخير الكثير، ومن أعرض وتولى فقد

مخطوطہ برلن کے پہلے صفحہ کا عکس [illegible]

فنِ حکمتِ شرعیہ (علم اسرار الدین)

(تعریف، موضوع، غرض وغایت)

اگرچہ یہ باتیں آگے مقدمہ میں مختصراً آرہی ہیں، مگر یہاں مستقلاً ان کا تذکرہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ شاہ صاحب رحمہ اللہ کے کلام سے علم اسرار الدین کی جو تعریف مفہوم ہوتی ہے وہ یہ ہے:

حکمتِ شرعیہ کی تعریف: هو علمٌ يُبحث فيه عن حِكَم الأحكام ولِمِّيّاتها، وأسرارِ خواصِّ الأعمال ونكاتها یعنی حکمت شرعیہ وہ فن ہے جس میں احکام شرعیہ کی حکمتوں اور علتوں سے، اور اعمال اسلامیہ کی خصوصیات کے رموز ونکات سے بحث کی جاتی ہے۔ حکمت اور علت میں چند وجوہ سے فرق ہے جیسا کہ آگے آرہا ہے۔ علم اسرار الدین میں احکام کی حکمتوں اور علتوں کے بارے میں گفتگو کی جاتی ہے۔ اور اعمال کی خصوصیات مثلاً نماز تقرب الٰہی کا ذریعہ ہے، روزہ گناہوں سے بچنے کی صلاحیت پیدا کرتا ہے۔ ان خصوصیات کا راز کیا ہے؟ پہلے عمل کی پہلی خصوصیت اور دوسرے عمل کی دوسری خصوصیت کیوں ہے؟ ان امور سے علم اسرار الدین میں بحث کی جاتی ہے۔

اور جناب ابوالاظہر ظہیر احمد صدیقی نے شرح بزبان عربی میں تمہید کے عنوان سے یہ تعریف بیان کی ہے:

وأما حدُّه: فهو علمٌ يُعرف به حكمةُ وضعِ القوانين الدينية، وحفظُ النِّسَب الشرعية بأسرها یعنی حکمت شرعیہ وہ فن ہے جس کے ذریعہ قوانین دینیہ (اصول اسلام) کی وضع کی حکمت معلوم ہوتی ہے اور تمام احکام شرعیہ کی نگہداشت کا طریقہ سمجھ میں آجاتا ہے۔ نسب: نسبت کی جمع ہے۔ علم منطق میں موضوع ومحمول کے درمیان جو نسبت خبریہ ہوتی ہے وہی دراصل حکم ہوتی ہے۔ اور احکام پانچ ہیں: وجوب، ندب، اباحت، کراہت اور حرمت۔ یہ پانچوں نسبتیں ہیں۔ غرض دین اسلام دو باتوں کا مجموعہ ہے: اصول اور فروع۔ جو اصول تجویز کئے گئے ہیں ان کی حکمت کیا ہے؟ اور جو فروع مقرر کئے گئے ہیں ان کے مراتب (وجوب وغیرہ) کی نگہداشت کیسے کی جائے کہ مستحب فرض نہ بن جائے اور فرض استحباب کے درجہ میں نہ اتر آئے؟ انہی امور سے فن حکمت شرعیہ میں بحث کی جاتی ہے۔

حکمت شرعیہ کا موضوع: ہر فن کا موضوع اس کی تعریف سے اخذ کیا جاتا ہے اور اس کو حیثیت کی قید کے ساتھ مقید کیا جاتا ہے۔ شاہ صاحب کے کلام سے جو تعریف مفہوم ہوتی ہے اس سے یہ موضوع اخذ کیا جائے گا:

موضوعه: الأحكام الشرعية من حيث الحِكَم واللِّمِّيّات، والأعمال الإسلامية من حيث الأسرار والخواص یعنی فن حکمت شرعیہ کا موضوع: احکام شرعیہ ہیں، حکمتوں اور علتوں کی رو سے، اور اعمال اسلامیہ ہیں، اسرار وخواص کی جہت سے۔ اس فن میں انہی دو چیزوں کے مذکورہ احوال سے بحث کی جاتی ہے۔

اور مذکورہ دوسری تعریف کی رو سے اس فن کا موضوع درج ذیل ہے۔

وأما موضوعه: فهو النظام التشريعي المحمدي الحنيفي على صاحبه الصلاة والسلام من حيث المصلحة والمفسدة یعنی اس فن کا موضوع نظام تشریعی محمدی ﷺ (شریعت اسلامیہ) ہے مصالح و مفاسد کی رو سے یعنی مامورات میں کیا خوبیاں ہیں اور منہیات میں کیا مفاسد ہیں۔ انہی امور سے اس فن میں بحث کی جاتی ہے۔

فن کی غرض وغایت۔ تمام فنون دینیہ کی دو غرض وغایت ہیں، ایک عام دوسری خاص۔

عام غرض وغایت: جو تمام فنون دینیہ کی مشترک غرض وغایت ہے، وہ سعادت دارین ہے۔ دینی تعلیم خواہ قرآن کی ہو، حدیث کی ہو یا فقہ وغیرہ کی، وہ دونوں جہاں کی نیک بختی کا ذریعہ ہے۔ مومن کو اگر وہ دینی تعلیم سے واقف ہے، دنیا میں بھی حسن کی زندگی نصیب ہوتی ہے، اور آخرت میں بھی سرخروئی حاصل ہوتی ہے۔

خاص غرض وغایت: شریعت مصطفویہ میں بابصیرت ہوتا ہے۔ جو مومن حکمت شرعیہ سے واقف ہوتا ہے وہ اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلوں میں کوئی تنگی محسوس نہیں کرتا۔ اس میں انقیاد تام پیدا ہوتا ہے۔ دین پر کامل وثوق اور اطمینان بھی نصیب ہوتا ہے۔ اور وہ شریعت اسلامیہ کی اس طرح نگہداشت کرتا ہے کہ اس کا نفس بالکلیہ اس کی طرف کھنچ جاتا ہے۔ اور اس راہ کے خلاف کسی اور راہ کی طرف نفس مائل نہیں ہوتا۔ اور کسی متشکک اور بہکانے والے کا اس پر اثر نہیں چلتا۔ حجۃ اللہ مطبوعہ صدیقی کے دیباچہ میں ہے۔

وأما غايته: فهو عدم وجدان الحرج فيما قضى الله ورسوله، والانقياد التام للأحكام الإلهية، وكمال الوثوق والاطمئنان بها، والمحافظة عليها بحيث تنجذب إليها النفس بالكلية، ولا تميل إلى خلاف مسلكها

ترجمہ: اس فن حکمت شرعیہ کی غایت: تو وہ تنگی نہ پانا ہے ان باتوں میں جن کا اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فیصلہ فرمایا ہے اور احکام خداوندی کی مکمل فرمانبرداری کرنا ہے۔ اور ان پر کامل اعتماد اور پورا اطمینان کرنا ہے۔ اور ان کی اس طرح نگہداشت کرنا ہے کہ نفس ان احکام کی طرف بالکلیہ کھنچ جائے اور ان کی راہ کے برخلاف راستہ کی طرف نفس مائل نہ ہو۔

غرض یہ فن نہایت درجہ سودمند ہے، مگر دقیق بھی اسی قدر ہے۔ اس کے مبادی تمام علوم شرعیہ ہیں۔ آدمی جب تک تمام فنون دینیہ سے واقف نہ ہو یہ فن گرفت میں آنا مشکل ہے۔ نیز اس کی دعا بھی ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ سب کو اس فن سے بہرہ ور فرمائیں۔ (آمین)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد لله الذي فطر الأنام على ملة الإسلام والاهتداء، وجبلهم على الملة الحنيفية السمحة السهلة البيضاء؛ ثم إنهم غشيهم الجهل، ووقعوا أسفل السافلين، وأدركهم الشقاء؛ فرحمهم، ولطف بهم، وبعث إليهم الأنبياء، ليخرجهم من الظلمات إلى النور، ومن المضيق إلى الفضاء؛ وجعل طاعته منوطة بطاعتهم، فيا للفخر والعلاء!

ثم وفّق من أتباعهم لتحمّل علومهم، وفهم أسرار شرائعهم من شاء، فأصبحوا — بنعمة الله — حائزين لأسرارهم، فائزين بأنوارهم؛ وما هنيك به من غاية! وفضل الرجل منهم على ألف عابد، وسُمّوا في الملكوت عظماء، وصاروا بحيث يدعو لهم خلق الله، حتى الحيتان في جوف الماء.

فصلّ — اللهم — وسلّم عليهم وعلى ورثتهم مادامت الأرض والسماء؛ وخصّ من بينهم سيدنا محمدا المؤيد بالآيات الواضحة الغرّاء، بأفضل الصلوات وأكرم التحيات، وأصفى الاصطفاء، وأمطر على آله وأصحابه شآبيب رضوانك؛ وجازهم أحسن الجزاء.

ترجمہ: تمام تعریفیں اس اللہ کے لئے ہیں جس نے مکلّف مخلوق (جن وانس) کو مذہب اسلام اور رہنمائی پر پیدا کیا۔ اور سیدھی، ہموار، آسان اور روشن ملت پر ان کی تخلیق فرمائی۔ پھر ان پر جہالت چھا گئی، اور وہ انتہائی پستی میں جا پڑے۔ اور بدبختی نے ان کو دبوچ لیا۔ پس اللہ تعالیٰ نے ان پر مہربانی فرمائی، اور ان کے ساتھ لطف وکرم کا معاملہ فرمایا، اور ان کی طرف حضرات انبیاء کو مبعوث فرمایا، تاکہ اللہ تعالیٰ ان کو تاریکیوں سے روشنی کی طرف، اور تنگی سے کشادگی کی طرف نکالیں۔ اور اللہ تعالیٰ نے اپنی فرماں برداری کو انبیاء کی فرماں برداری کے ساتھ متعلق کردیا۔ پس کیا کہنے (انبیاء کی) بزرگی اور بلندی کے!

پھر اللہ تعالیٰ نے انبیائے کرام کے متبعین میں سے جس کو چاہا ان کے علوم کو اٹھانے کی، اور ان کی شریعتوں کے رموز کو سمجھنے کی توفیق بخشی، چنانچہ وہ بفضلہ تعالیٰ انبیاء کے بھیدوں کو سمجھنے والے، اور ان کے انوار کو حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ اور اس سے بڑی سربلندی اور کیا ہوسکتی ہے؟! اور اللہ تعالیٰ نے وارثین علوم نبوت میں سے ایک کو ہزار

ہزار عابدوں پر برتری بخشی، اور وہ حضرات فرشتوں کی دنیا میں "بڑے لوگ" کہلائے۔ اور وہ حضرات اس قدر بلند رتبہ تک پہنچے کہ تمام مخلوق خدا حتی کہ مچھلیاں پانی میں ان کے لئے دعا گو ہو گئیں۔

پس خدایا! بے پایاں رحمتیں اور سلامتی نازل فرما ان انبیاء پر اور ان کے وارثین پر جب تک کہ آسمان وزمین قائم رہیں، اور ان میں سے مخصوص فرما ہمارے آقا حضرت محمد ﷺ کو جو روشن اور واضح معجزات کے ساتھ قوی کئے گئے ہیں بہترین درودوں کے ساتھ اور عمدہ سلاموں کے ساتھ اور بڑھ چڑھ کر مقبولیت کے ساتھ! اور برسا آپ کے خاندان پر اور آپ کے ساتھیوں پر اپنی خوشنودی کی موسلا دھار بارش اور ان کو بہترین صلہ عطا فرما (آمین)

لغات:

قوله فطر الأنام إلخ فطر (ن) ض الشیء: پیدا کرنا، شروع کرنا۔ الأنام: زمین کی تمام مخلوقات ما ظهر على الأرض من جميع الخلق (لسان العرب) خاص طور پر جن وانس کو بھی انام کہا جاتا ہے أو الجن والإنس، وبه فسر قوله تعالى: ﴿والأرض وضعها للأنام﴾ وعما الثقلان (تاج العروس) کتاب میں یا تو مطلق مخلوقات (جن وانس) مراد ہیں یا صرف انسان مراد ہیں کیونکہ آگے انسانوں ہی کا تذکرہ ہے۔ ملة لغت میں روش اور طریقہ کو کہتے ہیں قال أبو إسحٰق: الملة في اللغة: سنتهم وطريقهم (لسان العرب)۔ اهتداء کا اصل مصدر بمعنی رہنمائی۔ یہ لفظ لازم کا ہم معنی ہے اهتدى اهتداء: راہ راست پانا۔

قوله: جبلهم إلخ الحنيفية میں یا نسبت کی ہے اور حنیف کے معنی ہیں تمام باطل چیزوں سے رخ پھیر کر اور کنارہ کشی اختیار کرکے دین حق کی طرف مائل ہونے والا۔ یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا لقب بھی ہے ان کے بارے میں ارشاد باری تعالیٰ ہے ﴿إِنَّ إِبْرَاهِيمَ كَانَ أُمَّةً قَانِتًا لِلَّهِ حَنِيفًا﴾ (النحل ۱۲۰) بیشک ابراہیمؑ بڑے مقتدا تھے اللہ کے فرماں بردار تھے، بالکل ایک طرف کے ہو رہے تھے (تھانوی) اور الملة الحنيفية: وہ ملت ہے جس میں باطل کی نہ دائیں طرف سے گنجائش ہو نہ بائیں طرف سے، اس کی ہر بات محکم اور مضبوط ہو۔ السمحة مؤنث السمح کا بمعنی نرم اور مہربان، سہلہ: وہ ملت ہے جس میں عمل کے اعتبار سے آسانیاں ہوں اور ملت کہ وہ ملت ہے جس میں فکری سادگی ہو، اس کی تعلیمات میں کوئی پیچیدگی نہ ہو۔ البيضاء مؤنث الأبيض بمعنی سفید، روشن اور ملت بیضاء وہ ملت ہے جس کا ہر معاملہ بھی اور روشن ہو، اس کی تعلیمات قابل فہم ہوں، ان میں سادگی ہو، ہر شخص اس کو بوجھ سکتا ہو۔

تشریح:

ان دو جملوں میں ارشاد نبوی کل مولود يولد على الفطرة کی طرف تلمیح (اشارہ) ہے۔ فطرة کے مشہور معنی اسلام کے ہیں وأشهر الأقوال: أن المراد بالفطرة الإسلام، قال ابن عبد البر: وهو المعروف عند عامة السلف (فتح

(البخاری حدیث ۱۳۵۸) یعنی ہر انسان دین اسلام پر پیدا ہوتا ہے کوئی بچہ کسی باطل دین پر پیدا نہیں ہوتا، پھر ماحول جس کے ہاتھوں میں بچہ پلتا بڑھتا ہے اس کو بگاڑ دیتا ہے۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ ہماری یہ دنیا عالم اجساد ہے، انسان اس دنیا میں نیا پیدا نہیں ہوا، بلکہ تمام انسان پہلے عالم ارواح میں پیدا ہو چکے ہیں، وہاں سے مقررہ وقت پر اس عالم میں منتقل ہوتے ہیں۔ سورۃ الاعراف آیت ۱۷۲ میں اور اس کی تفسیر میں جو احادیث شریفہ وارد ہوئی ہیں ان میں عالم ارواح کے اس واقعہ کا مفصل تذکرہ موجود ہے کہ تخلیق آدم کے بعد ان کی ساری ذریت چھوٹی چھوٹی چیونٹیوں کی شکل میں وجود پذیر کی گئی اور ان کو اللہ تعالیٰ نے اپنی معرفت کا درس دیا پھر امتحان لیا اور پوچھا کہ کیا میں تمہارا رب نہیں؟ سب نے بیک زبان اقرار کیا: کیوں نہیں! یعنی آپ ہی ہمارے رب ہیں۔ غرض عہد الست میں سب انسانوں نے اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا اقرار کیا ہے، وہی صلاحیت لے کر انسان اس دنیا میں پیدا ہوتا ہے مگر دنیا میں آنے کے بعد بہت سے لوگوں کو ماحول بگاڑ دیتا ہے اور وہ اپنی اس فطری صلاحیت کو برباد کر دیتے ہیں اور اللہ کی معرفت سے اس درجہ جاہل ہو جاتے ہیں کہ جانوروں کو جس درجہ کی معرفت حاصل ہے اتنی بھی ان کے پاس باقی نہیں رہتی، اس وقت ان کی بدبختی آ پہنچتی ہے اور وہ أسفل السافلين میں جا پڑتے ہیں۔

غرض ان دونوں جملوں میں اللہ تعالیٰ کے اس عظیم انعام پر ان کی مدح وستائش کی گئی ہے کہ انھوں نے مکلف مخلوقات (جن وانس) پر یہ عظیم احسان فرمایا کہ ان کو دنیا میں بھیجنے سے پہلے اپنی پہچان کرائی اور درس معرفت دے کر ان کی ہدایت کا سامان کیا فلله الحمد والمنة!

فوائد:

(۱) عربی میں جس طرح مصدر معروف اور مصدر مجہول میں امتیاز نہیں ہوتا اسی طرح مصدر اور حاصل مصدر میں بھی امتیاز نہیں ہوتا دونوں کے لئے ایک ہی صیغہ مستعمل ہے اور قرائن سے فیصلہ کیا جاتا ہے کہ مصدر معروف ہے یا مجہول اور مصدر ہے یا حاصل مصدر، مثلاً نصر ینصر معروف کے بعد جو نصرًا آتا ہے وہ مصدر معروف ہے جس کا ترجمہ "مدد کرنا" ہے اور نُصر یُنصر مجہول کے بعد جو نصرًا آتا ہے وہ مصدر مجہول ہے اور اس کا ترجمہ "مدد کیا جانا" ہے اسی طرح اهتداء مصدر کے معنی ہیں راہ پانا اور اهتداء بمعنی حاصل مصدر کے معنی ہیں راہ یابی۔ کتاب میں حاصل مصدر استعمال ہوا ہے کیونکہ وہ اسلام یا ملت اسلام کے ہم معنی استعمال کیا گیا ہے۔

(۲) شاہ صاحب قدس سرہ کی ایک خاص عادت شریفہ ہے اس سے واقف رہنا ضروری ہے اور وہ یہ ہے کہ آپ مترادفات اور ہم معنی الفاظ استعمال کرتے ہیں ایک لفظ کے بدل دوسرا لفظ لاتے ہیں اور جملۂ قصر کے ہم معنی دوسرا جملہ ناقصہ لاتے ہیں اور جملۂ سابقہ کی وضاحت کے لئے دوسرا جملہ مستأنفہ لاتے ہیں جس کے ذریعہ سابقہ مضمون کو بالفاظ دیگر

سمجھاتے ہیں مشتق ملت اسلام اور انعدام عملی ہیں اور جملہ فطر الخ اور جملہ جهل الخ ایک ہی مضمون ادا کرتے ہیں۔

لغات:

قوله غشيهم الخ غشي يغشى غشياً وغشاوة الأمر فلاناً: ڈھانکنا، چھاجانا۔ شقفة (حاصل مصدر) بدبختی خرج به (متعدی بحرف جر) نکالنا، فاعل ضمیر مستتر ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف راجع ہے۔ المتسعفي: تنگ جگہ، گھاٹی۔ الفضاء: وسیع زمین، میدان جمع افضیہ۔ منوطة (اسم مفعول) ناطه بكذا: لٹکانا، معلق کرنا (مادہ ن و ط) بالمعز میں با حرف ندا، لام، لام استغاثہ (برائے تخصیص) الفخر مع معطوف مستغاث، نفسی ترجمہ: کہاں ہے بزرگی اور بلندی؟

مطلب:

جب لوگ دنیا میں پہنچ کر اپنی فطری صلاحیت کھو بیٹھے اور گمراہی کے دلدل میں پھنس گئے اور پستی کی نہایت کو پہنچ گئے تو اللہ تعالیٰ نے کرم بالائے کرم یہ فرمایا کہ نبوت و رسالت کا سلسلہ شروع فرمایا، وحی بھیجی، کتابیں نازل فرمائیں اور لوگوں کو دوبارہ اپنی معرفت کا درس دیا اور ان کو اپنی مرضیات سے واقف کیا۔

اور اللہ تعالیٰ نے نبیوں اور رسولوں کا درجہ اس قدر بلند فرمایا کہ خود ہی اعلان فرمایا ﴿مَنْ يُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللّٰهَ﴾ (النساء ۸۰) یعنی جس شخص نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی اور جس نے رسول کی نافرمانی کی اس نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی۔ حالانکہ بات کا فطری رخ یہ تھا کہ کہا جاتا: جو اللہ تعالیٰ کے اطاعت شعار بندے ہیں وہ اللہ کے فرستادوں کی بھی اطاعت کرتے ہیں اور جو نافرمان ہیں وہ روگردانی کرتے ہیں۔ مگر تاکید و مبالغہ کے لئے اور رسولوں کی قدر افزائی کے لئے تعبیر وہ اختیار فرمائی جو اوپر گذری یعنی اللہ کے اطاعت شعار بندے وہی ہیں جو رسولوں کی اطاعت کرتے ہیں اور رسولوں کی اطاعت کے بغیر اطاعت خداوندی کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا ہے۔ کیا ٹھکانا ہے انبیاء کی بزرگی، شرف اور سربلندی کا!

لغات:

قوله ثم رفق الخ تحمّله: اٹھانا۔ حاز (ن) حوزاً الشيء: اکٹھا کرنا، جمع کرنا۔ ناهي (اسم فاعل) روکنے والا۔ علياء ملوكت الأعلى کا معنی بہت بلند، لفظی ترجمہ: روکنے والا ہوں میں آپ کو اس نعت کے ذریعہ کہ سر بلندیوں سے مجھے میرے لئے یہ نعت کافی ہے تو کسی دوسری سربلندی کے چکر میں مت پڑ۔ یا ... اسم فعل بمعنی بس کفایت ہے۔ سموا (فعل ماضی مجہول) نام رکھے گئے وہ۔ ملكوت: ملك (فرشتہ) سے بنا ہے، فرشتوں سے تعلق رکھنے والے تمام معاملات کو ملکوت کہتے ہیں۔ الملكوت: فرشتوں کی دنیا۔ عظماء جمع ہے عظیم کی اور یہ مفعول ثانی ہے۔

قوله: فضل الرجل الخ میں تلمیح (اشارہ) ہے مشہور حدیث کی طرف کہ ایک فقیہ (دین کا ماہر) شیطان پر ہزار عابدوں سے زیادہ بھاری ہے (مشکوٰۃ حدیث ۲۱۷) یعنی فقیہ کو گمراہ کرنا شیطان کے لئے آسان نہیں، اسے ہزار گنا سے زیادہ محنت کرنی پڑتی ہے نیز فساد کی اشاعت سے وہ اتنا خوش نہیں ہوتا جتنا فقیہ کا وجود اس کے لئے سوہان روح ہوتا ہے۔

قوله: سموا الخ میں تلمیح ہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اس ارشاد کی طرف جس کو علامہ ابن عبد البر قرطبی رحمہ اللہ نے جامع بیان العلم وفضلہ (ص ۹ ج ۲) میں نقل کیا ہے کہ من علم وعمل وعلم فذلك يدعى عظيماً في ملكوت السماوات یعنی جس نے علم دین حاصل کیا اور اس پر عمل کیا اور دوسروں کو سکھلایا تو وہ شخص فرشتوں کی دنیا میں "بڑا آدمی" کہلاتا ہے۔

قوله: يدعو لهم الخ میں تلمیح ہے مشہور حدیث شریف کی طرف کہ عالم کے لئے وہ تمام مخلوقات دعائے مغفرت کرتی ہیں جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں اور مچھلیاں بھی پانی کے اندر (مشکوٰۃ حدیث ۲۱۲ کتاب العلم فصل ۲)

مطلب:

دنیا سے انبیاء کی تشریف بری کے بعد ان کے وارثین (علمائے امت) ان کے جانشین ہوتے ہیں وہ نبیوں کے علوم کو حاصل کرتے ہیں، ان کی لائی ہوئی شریعتوں کے اسرار و رموز سمجھتے ہیں اور وہ اس مقصد میں پوری کامیابی حاصل کرتے ہیں۔ علمائے امت کے لئے یہی سربلندی سب سے بڑی چیز ہے ان کا مرتبہ ہزار عابدوں سے بھی برتر ہے۔ وہ حضرات فرشتوں کی دنیا میں "بڑے لوگ" کہلاتے ہیں دنیا میں گو ان کی قدر نہ پہچانی جائے مگر قدرشناس ان کی قدر پہچانتے ہیں اور ساری مخلوقات تا آنکہ سمندر کی مچھلیاں بھی ان کے حق میں دعا گو ہیں۔

قوله: فضل الخ خصّ فعل امر ہے خصّ (ن) خصّا فلانا بالشيء: خاص کرنا ..... المزيد (اسم مفعول) قوی کیا ہوا المزيد صفت ہے محمدی اور بالآيات متعلق ہے المؤيدات اور بالفضل الخ متعلق ہے خصّ سے شآبیب جمع ہے شؤبوب کی جس کے معنی ہیں موسلا دھار بارش اور خصّ کا مفعول ثانی مقدم ہے۔

قوله: مادامت الخ یہ ابدیت کے لئے کنایہ ہے کیونکہ جب ہم طویل سے طویل مدت کا تصور کرتے ہیں تو اپنے ماحول کے لحاظ سے بڑی سے بڑی مدت یہی خیال میں آتی ہے چنانچہ ﴿ما دامت السموت والارض﴾ (جب تک آسمان و زمین قائم رہیں) وغیرہ الفاظ محاورات عرب میں دوام کے مفہوم کو ادا کرنے کے لئے بولے جاتے ہیں (فوائد عثمانی سورۂ ہود آیت ۱۰۷) پس طلبہ کو یہ قاعدہ یاد رکھنا چاہئے کہ کسی بھی زبان کے محاورات کا لفظی ترجمہ کرنا اور اسی پر ٹک کر رہ جانا اور اسی کو مطلب قرار دینا بڑی غلطی ہے محاورات کا ہمیشہ مفہوم اور محل استعمال سمجھا جاتا ہے ان کا لفظی ترجمہ مراد نہیں ہوتا ﴿ما دامت السماوات والارض﴾ بھی زمانۂ جاہلیت سے ایک محاورہ چلا آرہا تھا اس کا مفہوم

دوام اور ابدیت تھا وہ ایسا ہی محاورہ ہے جیسا اردو میں کہا جاتا ہے کہ: "جب تک شب و روز کا چکر چلتا رہے گا یہی ہوتا رہے گا" یہاں یہ احتمال کہ شب و روز کا چکر تو بہر حال ایک دن ختم ہونے والا ہے کسی طرح معترض نہیں، اسی طرح ما دامت السماوات والأرض کو بھی محاورہ سمجھنا چاہئے۔

☆ ☆ ☆

[علومُ الحديث ومكانةُ علم أسرار الدين منها]

أما بعد: فيقول العبد الفقير إلى رحمة الله الكريم، أحمدُ المدعوُّ بولي الله بن عبد الرحيم — عاملهما الله تعالى بفضله العظيم، وجعل مآلهما النعيم المقيم —: إن عمدة العلوم اليقينية ورأسها، ومبنى الفنون الدينية وأساسها: هو علم الحديث، الذي يذكر فيه ما صدر من أفضل المرسلين — صلى الله عليه وعلى آله وأصحابه أجمعين — من قول، أو فعل، أو تقرير؛ فهي مصابيح الدجى، ومعالم الهدى، وبمنزلة البدر المنير: من انقاد لها ووعى فقد رشد واهتدى، وأوتي الخير الكثير؛ ومن أعرض وتولى فقد غوى وهوى، وما زاد نفسه إلا التخسير؛ فإنه صلى الله عليه وسلم نهى وأمر، وأنذر وبشر، وضرب الأمثال، وذكّر، وإنها لمثل القرآن أو أكثر.

فنونِ حدیث میں حکمتِ شرعیہ کا مقام ومرتبہ

ترجمہ: حمد وصلوۃ کے بعد، خداوند کریم کی رحمت کا محتاج بندہ احمد جو ولی اللہ کے نام سے پکارا جاتا ہے، ولد عبدالرحیم، اللہ تعالیٰ دونوں کے ساتھ اپنے بڑے فضل کا معاملہ فرمائیں اور ان کا ٹھکانہ دائمی نعمتوں کو بنائیں — کہتا ہے کہ علومِ یقینیہ (دینیہ) میں قابل اعتماد اور ان کا سردار اور فنونِ دینیہ کا پایہ اور ان کی بنیاد علمِ حدیث ہی ہے، جس میں افضل المرسلین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلی آلہ واصحابہ اجمعین کے ارشادات، آپ کے کئے ہوئے کام اور تائیدات بیان کی جاتی ہیں۔ پس احادیث شریفہ تاریکی میں روشن چراغ، اور ہدایت کی واضح علامات اور (تمام علوم میں) بمنزلہ چودھویں کے چاند کے ہیں۔ جس نے ان کا اتباع کیا اور انھیں محفوظ کیا اس نے رشد وہدایت کی راہ پائی۔ اور وہ بے حساب بھلائی سے سرفراز کیا گیا۔ اور جس نے اعراض کیا اور روگردانی کی وہ گمراہ ہوا اور گڑھے میں جا گرا اور خسران ونقصان کے سوا اس کے ہاتھ کچھ نہ آیا۔ کیونکہ آنحضور ﷺ نے ممانعت فرمائی ہے اور امر فرمایا ہے اور ڈرایا ہے اور خوش خبریاں سنائی ہیں اور (مضمون فہمی کے لئے) مثالیں بیان فرمائی ہیں اور نصیحتیں کی ہیں اور ان کی مقدار قرآن کریم کے بقدر ہے یا اس سے بھی فزوں تر!

(۴) قدیم زمانہ سے ایک گمراہی یہ چلی آرہی ہے کہ کچھ لوگ صرف قرآن کریم کو حجت مانتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ رسول کا کام بس قرآن کو پہنچانا ہے اور قرآنی احکام ہی کی تعمیل ضروری ہے، اس کے علاوہ کوئی چیز حجت نہیں حتیٰ کہ رسول کا قول وفعل بھی کچھ حجت اور واجب الاتباع نہیں۔

یہ فرقہ اپنے آپ کو "اہل قرآن" کہتا ہے مگر حقیقت میں یہ "منکرین حدیث" ہیں۔ یہ لوگ حدیث شریف کی تاریخی حیثیت کا انکار نہیں کرتے بلکہ اس کی حجیت کا انکار کرتے ہیں۔ آنحضرت ﷺ نے اس گمراہ فرقہ کے وجود کی پیشین گوئی فرمائی ہے۔ حضرت ابو رافع رضی اللہ عنہ یہ ارشاد پاک نقل کرتے ہیں:

"ہرگز میں تم میں سے کسی کو اپنے چھپر کھٹ پر ٹیک لگائے ہوئے نہ پاؤں، جسے میرے اوامر میں سے کوئی امر پہنچے، یا نواہی میں سے کوئی نہی پہنچے، پس وہ کہہ دے کہ میں نہیں جانتا، ہم جو احکام قرآن میں پاتے ہیں اس کی پیروی کرتے ہیں" (مشکوٰۃ شریف حدیث ۱۶۲ باب الاعتصام فصل ۲)

اور حضرت مقدام بن معدی کرب رضی اللہ عنہ سے یہ ارشاد پاک مروی ہے کہ:

ألا إني أوتيت القرآن ومثله معه، ألا يوشك رجل شبعان على أريكته يقول: عليكم بهذا القرآن، فما وجدتم فيه من حلال فأحلوه، وما وجدتم فيه من حرام فحرموه، وإن ما حرم رسول الله صلى الله عليه وسلم كما حرم الله (مشکوۃ حدیث ۱۶۳)	سنو! میں قرآن کریم دیا گیا ہوں اور اس کے مانند اس کے ساتھ (دیا گیا ہوں) سنو! ایک شکم سیر آدمی اپنے چھپر کھٹ پر بیٹھا کہے گا کہ تم یہ قرآن مضبوط پکڑو، جو اس میں حلال ہے اس کو حلال سمجھو اور جو اس میں حرام ہے اس کو حرام سمجھو، حالانکہ جو چیزیں اللہ کے رسول نے حرام کی ہیں وہ بھی ویسی ہی حرام ہیں جیسی اللہ تعالیٰ نے حرام کی ہیں۔

اور حضرت عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ کی حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

أيحسب أحدكم متكئا على أريكته، يظن أن الله لم يحرم شيئا إلا ما في هذا القرآن؟ ألا إني والله! قد أمرت ووعظت، ونهيت عن أشياء، إنها لمثل القرآن أو أكثر (مشکوۃ حدیث ۱۶۴)	کیا تم میں سے ایک شخص اپنے چھپر کھٹ پر ٹیک لگائے گمان کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بس وہی چیزیں حرام کی ہیں جو اس قرآن میں حرام ہیں؟! سنو! بخدا! میں نے بھی احکامات دیے ہیں، اور نصیحتیں کی ہیں اور بہت سی باتوں سے روکا ہے بیشک وہ قرآن کے بقدر ہیں یا اس سے بھی زیادہ

در اصل حجیت حدیث کا انکار وہی لوگ کرتے ہیں جو رسول کی حیثیت سے واقف نہیں اور اس کا صحیح مقام نہیں پہچانتے۔ قرآن کریم میں غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اللہ کے رسول ﷺ کی حیثیت صرف ایک پیغامبر اور ڈاکیہ کی نہیں ہے بلکہ وہ مطاع، متبوع، امام، ہادی، معلم، حاکم اور حکم وغیرہ بہت سی صفات کے حامل ہیں اس لئے ماننا پڑے گا کہ دین کے سلسلہ

میں رسول اللہ ﷺ کا ہر امر و نہی، ہر حکم و فیصلہ اور ہر قول و عمل ناطق، واجب التسلیم اور لازم ہے۔ شاہ صاحبؒ نے زیر تشریح عبارت میں حجیت حدیث کی طرف اشارہ کیا ہے۔

☆ ☆ ☆

چار فنونِ حدیث

اس کے بعد جاننا چاہئے کہ عرف عام میں فن حدیث روایت حدیث کا نام ہے، مگر فن اصول حدیث میں اس کی بہت سی انواع کی گئی ہیں۔ مگر شاہ صاحب رحمہ اللہ عرف عام سے ہٹ کر فن حدیث کی چار قسمیں کرتے ہیں:

پہلی قسم: فن روایت حدیث ہے جس میں احادیث مع سند روایت کر کے ہر حدیث کا درجہ متعین کیا جاتا ہے کہ حدیث صحیح ہے یا ضعیف، مشہور ہے یا غریب، مسند ہے یا مرسل، مرفوع ہے یا موقوف وغیرہ۔ اس فن میں بے شمار کتابیں لکھی گئی ہیں، تفصیل کے لئے محمد بن جعفر کتانی رحمہ اللہ (۱۲۷۴-۱۳۴۵ھ) کی کتاب الرسالۃ المستطرفۃ دیکھیں۔

دوسری قسم: فن غریب الحدیث ہے جس میں احادیث کے نامانوس الفاظ کے معانی اور مشتبہ کلمات کا اعراب بیان کیا جاتا ہے۔ اس فن کی مشہور کتابیں یہ ہیں:

(۱) ابو عبید قاسم بن سلام ہروی (۱۵۷-۲۲۴ھ) کی غریب الحدیث۔

(۲) علامہ محمود بن عمر زمخشری (۴۶۷-۵۳۸ھ) کی الفائق فی غریب الحدیث۔

(۳) ابن الاثیر مجد الدین مبارک جزری (۵۴۴-۶۰۶ھ) کی النہایۃ فی غریب الحدیث والأثر۔

(۴) شیخ محمد بن طاہر پٹنی گجراتی (م ۹۸۶ھ) کی مجمع بحار الأنوار فی غرائب التنزیل ولطائف الأخبار۔

تیسری قسم: فقہ السنہ ہے جس میں احادیث شریفہ سے مستنبط ہونے والے مسائل شرعیہ بیان کئے جاتے ہیں۔ قرآن کریم کی تقریباً تین سو آیات سے جو مسائل شرعیہ مستنبط ہوتے ہیں اس فن کا نام احکام القرآن ہے اور تقریباً تین ہزار احادیث شریفہ سے جو احکام دینیہ مستنبط ہوتے ہیں اس فن کا نام فقہ السنہ ہے اور ان دو کے علاوہ جو احکام فقہیہ قرآن و حدیث اور اجماع امت سے بذریعہ قیاس مستنبط کئے جاتے ہیں اس کا نام علم الفقہ ہے۔

بعد میں یہ تینوں فن یکجا کر دیئے گئے اور اب اسی مجموعہ کا نام علم الفقہ ہے، کیونکہ بڑا حصہ اسی میں تیسرے علم کا ہے۔

چوتھی قسم: علم اسرار الدین ہے جس میں اعمال اسلامیہ اور احکام دینیہ کے رموز و اسرار بیان کئے جاتے ہیں، جسے عرف عام میں فن حکمت شرعیہ کہتے ہیں۔

۱؎ یہ عنوان اور معنون دونوں آئندہ عبارت کا خلاصہ ہیں اسی طرح آئندہ عربی عبارت سے پہلے اس کی تشریح دی جائے گی ۱۲

اور اس فن کی طرف ناقدین حدیث نے اور متقدمین میں سے حفاظ حدیث نے توجہ فرمائی ہے۔

اور اس کے بعد درجہ ہے احادیث کے مشکل الفاظ کے معانی کو پہچاننے کا اور مشتبہ کلمات کی حرکات وسکنات اور اعراب کو ضبط کرنے کا اور اس فن کی طرف ائمہ فنون ادبیہ نے اور علوم عربیہ میں راسخ قدم رکھنے والے علماء نے توجہ دی ہے۔

پھر اس کے بعد درجہ ہے حدیث کے معانی شرعیہ کو پہچاننے، اور احکام فقہیہ کو مستنبط کرنے، اور عبارت النص میں معروف حکم پر قیاس کرنے، اور نصوص کے اشارات وایماءات (مفہوم مخالف) سے استدلال کرنے، اور محکم ومنسوخ اور مرجوح اور مبرم کے پہچاننے کا، اور اکثر علماء کے نزدیک یہ فن بہت زیادہ عمیق ودقیق ہے۔ اور محققین فقہاء نے اس کی طرف توجہ مبذول فرمائی ہے۔

یہ بات (تو آپ نے جان لی) اور میرے نزدیک تمام فنون حدیث میں دقیق ترین اور گہری جڑیں رکھنے والا اور سب سے زیادہ بلند مرتبہ ہونے کے اعتبار سے، اور میری رائے میں تمام علوم شرعیہ میں سب سے بڑا اور سب سے بلند درجہ اور عظیم المرتبت علم، علم اسرار الدین ہی ہے جو احکام شرعیہ کی حکمتوں اور علتوں سے اور اعمال اسلامیہ کی خصوصیات کے رموز ونکات سے بحث کرتا ہے۔

لغات:

اصداف، صدف کی جمع ہے یعنی سیپ کا خول، سیپ ایک قسم کی دریائی چیز ہے جس کے اندر سے موتی نکلتے ہیں ... وسط کے بارے میں یہ قاعدہ یاد رکھیں کہ جہاں لفظ وسط کی جگہ لفظ بین رکھ سکتے ہوں تو وہ ساکن الاوسط ہوتا ہے ورنہ متحرک الاوسط (مصباح) اور ساکن الاوسط کا ترجمہ ہے درمیان اور متحرک الاوسط کا ترجمہ ہے معتدل جیسے وکذلک جعلناکم امۃ وسطا ... داخلها اور وسطها منصوب بنزع الخافض ہیں ای فی داخلها وفی وسطها۔ اقتنص الطیر: پرندہ کو شکار کرنا۔ الاوابد جمع آبدۃ کی، وحشی جانور (الوحشی النفور) أبد ابدا: جنگلی ہونا۔ الصعاب جمع صعب، سرکش سواری۔ استفاض الخبر: خبر کا پھیلنا، بعض حضرات کے نزدیک حدیث مشہور اور مستفیض ایک ہی ہیں اور بعض نے مستفیض میں اتنی قید زائد کی ہے کہ ہر طبقہ میں راویوں کی تعداد یکساں ہو (تدریب الراوی) تصدی لہ: درپے ہونا، کسی چیز کے پیچھے پڑنا، متوجہ ہونا۔ جهابذۃ جمع جهبذ کی، پرکھنے والا النقاد (اسم فاعل) أتقن الامر: مضبوط کرنا۔ فی العبارۃ متعلق ہے المصوص سے۔ مبرم مترادف ہے محکم کا، ابرم الحبل اور ابرم الحبل کے معنی ہیں رسی کو بٹنا ... هذا مستقل جملہ ہے ای الامر هذا یا مضی هذا یا علمت هذا اور یہ اما بعد کی طرح کلام کا رخ بدلنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ سورۃ ص آیت ۵۵ میں اسی مقصد کے لئے هذا آیا ہے وقال ابن الأثیر: هذا فی هذا المقام من الفصل الذی هو خیر من الوصل وهی علاقۃ وکیدۃ بین الخروج من الکلام إلی کلام آخر (جمل ج ۳ ص ۵۸۱)

فائدہ:

نکات جمع ہے نکتہ کی جس کے معنی ہیں: مزےدار اور دلچسپ بات اور نقاط جمع ہے نقطہ کی جس کے معنی ہیں بنیادی بات، کسی بحث کا مرکزی مضمون۔

حکمت شرعیہ کا موضوع: ہر فن کا موضوع تعریف سے اخذ کیا جاتا ہے، جیسے علم نحو کی تعریف ہے: علم بأصول یُعرف بها أحوال أواخر الکلم الثلاث، من حیث الإعراب والبناء، وکیفیة ترکیب بعضها مع بعض (ہدایۃ النحو) اس تعریف سے نحو کا موضوع کلمہ اور کلام متعین کیا گیا ہے۔ پس حکمت شرعیہ کا موضوع احکام شرعیہ اور اعمال اسلامیہ ہیں، انہی دو چیزوں کے احوال سے اس فن میں بحث کی جاتی ہے۔

بالفاظ دیگر یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ فن حکمت شرعیہ کا موضوع شریعت مطہرہ ہے یعنی آنحضرت ﷺ کا لایا ہوا پورا دین، جو آج ہمارے پاس قرآن وحدیث کی شکل میں موجود ہے، وہی اس فن کا موضوع ہے اور اسی کے احوال سے اس فن میں بحث کی جاتی ہے۔

غرض وغایت: تمام علوم شرعیہ اور فنون دینیہ کی غرض وغایت ایک ہے یعنی سعادت دارین حاصل کرنا۔ دنیا کی سعادت نیک نامی ہے اور آخرت کی سعادت حصول جنت اور رضائے خداوندی ہے۔ اور خصوصی غرض وغایت: دین میں بصیرت حاصل کرنا ہے۔

☆ ☆ ☆

فن حکمت شرعیہ کے تین فائدے

آگے شاہ صاحب نے فن حکمت شرعیہ کے تین اہم فوائد بیان فرمائے ہیں۔

① یہ فن قاری کو دین وشریعت میں بابصیرت بناتا ہے، جس طرح فن عروض کا ماہر شعراء کے کلام کو، علم منطق کا ماہر حکماء کے دلائل وبراہین کو، علم نحو کا ماہر فصحائے عرب کے کلام کو اور اصول فقہ کا ماہر جزئیات فقہیہ کو بصیرت کے ساتھ سمجھ سکتا ہے، اسی طرح حکمت شرعیہ کا ماہر پورے دین کو علی وجہ البصیرت سمجھ سکتا ہے۔

② علم اسرار الدین سے واقف شخص علمی لغزشوں سے اور اندھا دھند قیاس آرائیوں سے محفوظ رہتا ہے، وہ رات میں سوختہ چننے والے کی طرح نہیں ہوتا کہ بھلے برے کی تمیز نہ کرسکے، وہ نالے کے پانی میں موتیوں کی تلاش میں غوطہ لگانے والے کی طرح بھی نہیں ہوتا کہ کوڑا کرکٹ کے سوا کچھ ہاتھ نہ آئے اور ساری محنت رائیگاں جائے، نالے میں موتی کہاں رکھے ہیں۔ وہ رتوندی اونٹنی کی طرح ٹامک ٹوئیاں بھی نہیں مارتا، نہ وہ اندھی اونٹنی کی پیٹھ پر سواری کرنے

جیسا فنِ عروض جاننے والے کا شعراء کے دواوین سے، یا منطقی کا فلاسفہ کے دلائل و براہین سے، یا نحوی کا فصحائے عرب کے کلام سے، یا اصولِ فقہ کے ماہر کا فقہی جزئیات سے۔

(۲) اور جس علم سے انسان محظوظ ہو جاتا ہے رات میں لکڑیاں چننے والے کی طرح ہونے سے، یا سیلاب میں غوطہ لگانے والے کی طرح ہونے سے، یا ناک ٹوئیاں مارے، دور تو ندی اونٹنی کی طرح، یا اندھی اونٹنی پر سواری کرے، جیسے کسی نے دیکھا کہ حکیم نے کسی کو سیب کھانے کا مشورہ دیا، پس اس نے ہم شکل ہونے کی وجہ سے اندرائن کو سیب پر قیاس کیا (اور اس نہایت کڑوی چیز کو کھانا شروع کر دیا)

(۳) اور اس علم سے انسان پکا مؤمن اور اپنے رب کی طرف سے واضح دلیل پر ہوتا ہے، جیسے کسی کو کسی سچے آدمی نے بتایا کہ زہر جاں ستاں ہے، پس اس نے اس مخبر صادق کی بات کی تصدیق کی، پھر قرائن و شواہد سے جانا کہ زہر میں حرارت اور یبوست حد درجہ ہوتی ہے اور یہ دونوں چیزیں مزاجِ انسانی کے برخلاف ہیں، پس اس کا یقین بالائے یقین ہو گیا۔

حلِ لغات:

قولہ: بعد ما فرض الخ ای بعد اداء ما فرض الخ ۔ بأن یصرف الخ أحوط سے متعلق ہے اور من اطاقہ فاعل ہے یصرف کا اور نفائس الخ مفعول ہے ۔ العُدّة: تیاری، ساز و سامان کہا جاتا ہے کونوا علی عدة: تیار رہو، یہاں آخرت کے سفر کا سامان اور زادِ راہ مراد ہے۔

علم العروض: وہ علم ہے جس میں اشعار کے اوزان بیان کیے جاتے ہیں ۔ العرباء: خالص عرب مراد فصحائے عرب ۔ یخبط اور یرکب کا عطف یکون پر ہے ۔ عشواء: رتوندی اونٹنی، شب کور، وہ اونٹنی جس کو رات میں نظر نہ آئے ۔ متن جمع متون: جیسے فن میں جو کتابیں ریڑھ کی ہڈی کا مقام رکھتی ہیں وہ بھی متون کہلاتی ہیں ۔ الحنظلة: اندرائن، ایک جنگلی پھل جو کڑوا ہونے میں ضرب المثل ہے ۔ أشباح مفرد شبح: نظر آنے والی صورت ۔ وبه یصیر مؤمنا الخ یصیر فعل ناقص، ضمیر مستتر اس کا اسم جو انسان کی طرف راجع ہے اور مؤمنا خبر اول اور علی بینة خبر ثانی ہے۔

☆ ☆ ☆

فنِ حکمتِ شرعیہ کی مضبوط بنیاد ہے، مگر اچھوتا فن ہے

فنِ حکمتِ شرعیہ ایک اچھوتا فن ہے۔ شاہ صاحب قدس سرہ سے پہلے کسی نے اس فن میں کوئی قابلِ ذکر کارنامہ انجام نہیں دیا، مگر بایں ہمہ یہ فن بے اصل نہیں ہے، نہ اس کی تدوین بدعت و خرقِ اجماع ہے، کیونکہ اس کی اصل موجود ہے: احادیثِ نبویہ میں اس فن کی اصولی باتوں کا تذکرہ بھی آیا ہے اور فروعی باتوں کا بھی۔ نیز صحابہ کرام اور تابعین عظام نے

بھی احکام شرعیہ کی حکمتیں بھی مفصل، بھی مجمل بیان فرمائی ہیں۔ پھر مجتہدین عالی مقام نے ہر ہر باب میں مصالح وحکم کی تخریج کی ہے اور ان کے نقش قدم پر چل کر ان کے متبعین نے اس فن کے اہم نکات بیان کئے ہیں۔

مگر یہ سب مواد منتشر تھا، کسی ایک کتاب میں مجتمع نہ تھا۔ نہ کسی نے اس کو فنی شکل دی تھی مگر چونکہ مواد سارا موجود تھا اس لئے اگر آج کوئی شخص اس کو مدون کرتا ہے تو وہ خرقِ اجماع نہیں کرتا۔ اس کو نہ تو بدعت کہا جا سکتا ہے نہ بے بصیرتی والا اقدام، اور نہ حیران کن معاملہ میں کودنا بھی نہیں، بلکہ ایک ممکن الحصول بات کی کوشش کرنا اور واضح نشانات والے راستہ کو طے کرنا ہے۔

اور اب تک یہ فن اس لئے مدون نہیں کیا گیا کہ متقدمین کو تو اس کی حاجت نہیں تھی اور متاخرین میں ہر کوئی اس کو مدون کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا تھا۔ جو شخص شیر پر سوار ہو اس کے پیچھے بیٹھنے کی ہمت کون کر سکتا ہے؟! اس فن کو مدون کرنا نہایت دشوار کام تھا، ہر ایک کے بس کا کام نہیں تھا۔ مزید تفصیل آگے آرہی ہے۔

[علمُ أسرارِ الدين ذُو أصلٍ أصيلٍ ولكنّهُ أُنُفٌ]

وهو وإن أثبتت أحاديثُ النبي صلى الله عليه وسلم فروعه وأصوله، وبيّن آثارُ الصحابة والتابعين إجماله وتفصيله، وانتهى إمعانُ المجتهدين إلى تمييز المصالح المرعية في كل باب من الأبواب الشرعية، وأبرز المحققون من أتباعهم نكتا جليلة، وأظهر المدققون من أشياعهم جُملاً جزيلة، وخرج — بحمد الله — من أن يكون التكلّم فيه خرقاً لإجماع الأمة، أو اقتحاماً في غمة وغمّية، ولكن قلَّ من صنف فيه، أو خاض في تأسيس مبانيه، أو رتب منه الأصول والفروع، أو أتى بما يُسمن أو يُغني من جوع؛ وحُقّ له ذلك، ومن المثل السائر في الورى: ومن الرديف وقد ركب غضنفراً!؟

ترجمہ: فن حکمتِ شرعیہ مضبوط بنیاد رکھتا ہے مگر یہ اچھوتا فن ہے: اور علم اسرار دین: اگرچہ احادیث شریفہ نے اس کے اصول وفروع واضح کردئے ہیں اور صحابہ وتابعین کے ارشادات نے اس کے اجمال وتفصیل کو بیان کردیا ہے اور مجتہدین کا غور وفکر ان مصالح کی وضاحت تک پہنچ گیا ہے جو ابواب شرعیہ کے ہر ہر باب میں ملحوظ ہیں۔ اور ان کے متبعین میں محققین نے اہم نکتے ظاہر کردئے ہیں اور ان کے پیرووں میں سے مدققین نے اچھی خاصی مقدار میں شہ پارے جلوہ گر کردی ہے۔ اور یہ علم بحمد اللہ اس بات سے نکل گیا ہے کہ اس کے سلسلہ میں گفتگو کرنا خرقِ اجماع ہو یا بے بصیرتی اور حیرانی کے کام میں چھلانگ لگانا ہو۔ لیکن بہت کم لوگ ہیں جنھوں نے اس علم میں تصنیف کی ہے یا اس کی بنیادیں قائم کرنے کے لئے میدان میں اترے ہیں یا اس فن کے اصول وفروع مرتب کئے ہیں یا کوئی ایسی چیز پیش کی ہے جو فربہ کرے یا کم از کم بھوک

مٹائے۔ اور اس فن کے لئے میں سزاوار ہے اور مخلوق میں جلی ہوئی کہاوتوں میں سے تھے: تو یا میں شیر پر سوار ہوں، تیرے یا میرے پیچھے بیٹھنے کی ہمت کون کرسکتا ہے؟!

لغات:

الأنف من الرياض: وہ سرسبز و شاداب کیاری جس کو کسی جانور نے چرا نہ ہو، کاس آنف: وہ پیالہ جس سے کسی نے پیا نہ ہو وهو كامرتع علم اسرار الدین ہے حاشیہ میں جو مرتع بتایا ہے وہ صحیح نہیں انتهى السير كذا توضيح محقق (اسم فاعل) مسئلہ کو دلیل سے ثابت کرنے والا، حقق الامر: ثابت کرنا مدقق (اسم فاعل) دلیل کو دلیل سے ثابت کرنے والا یعنی دلیل کی بھی دلیل پیش کرنے والا، دقق الشئ: باریک کرنا مدقق کا مرتبہ محقق سے اوپر ہے ... نکت جمع ہے نکتۃ کی: عمدہ بات، دلچسپ بات اشیاع جمع شیعۃ کی پیرو جمل جمع جملۃ کی ای مقدارًا كافيًا حزيلة اى كثيرة اقتحم الامر کسی معاملے میں زبردستی گھسنا، بے سوچے سمجھے کسی معاملہ میں داخل ہوجانا عمۃ بصیرت کا فقدان الغمۃ حیرت، یقال: هو في غمة من امره وہ حیرت میں ہے خاض (ن) خوضاً الماء: پانی میں داخل ہونا أنس الشيء: تیار رکھنا مبنی مجہول ہے معنی کی بنیاد حق کو معروف و مجہول دونوں طرح پڑھ سکتے ہیں، حق (ض) حقا عليه كذا: واجب ہونا کہا جاتا ہے حق لك ان تفعل كذا اس کا کرنا آپ کے لائق ہے۔ ہرکبت کو واحد متکلم بھی پڑھ سکتے ہیں، اس صورت میں ترجمہ ہوگا "میں شیر پر سوار ہوں، میرے پیچھے بیٹھنے کی ہمت کون کرسکتا ہے؟!" اور واحد مذکر حاضر بھی پڑھ سکتے ہیں۔ اس صورت میں ترجمہ ہوگا "تو شیر پر سوار ہے، تیرے پیچھے بیٹھنے کی ہمت کون کرسکتا ہے"۔

وقتِ فن کی مزید وضاحت

مذکورہ عبارت میں وقتِ فن کی مزید وضاحت ہے کہ یہ ایک نہایت مشکل فن ہے، ہر شخص کے بس کی بات نہیں کہ وہ اس کو مدوّن کرے۔ اس فن کی تدوین کے لئے گوناگوں صلاحیتوں اور اعلیٰ قابلیت کی ضرورت ہے، جو مشکل ہی سے کسی میں جمع ہوتی ہیں۔ اس فن میں تصنیف کے لئے چار چیزیں ضروری ہیں:

(۱) تمام علوم شرعیہ میں اعلیٰ درجہ کی مجتہدانہ صلاحیت۔

(۲) علم لدنی کا وافر حصہ۔

(۳) اعلیٰ درجہ کی ذہانت اور سادہ ذہن، تقریر و تحریر میں مہارت اور بات کہنے کا سلیقہ۔

(۴) اصول و فروع کی تنقیح کا سلیقہ اور قواعد کو مدلل کرنے کا ڈھنگ۔

ظاہر ہے کہ یہ تمام صلاحیتیں صدیوں میں کسی میں جمع ہوتی ہیں، اور اسی یگانۂ روزگار ہستی سے کسی محیر العقول کارنامہ کی

امید باندھی جا سکتی ہے۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے　　بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

كيف؟ ولا تتبين أسراره إلا لمن تمكّن في العلوم الشرعية بأسرها، واستبدّ في الفنون الإلهية عن آخرها، ولا يصفو مشربه إلا لمن شرح الله صدره لعلمٍ لَدُنّي، وملأ قلبه بسرٍّ وهبي؛ وكان مع ذلك وقّاد الطبيعة، سيّال القريحة، حاذقًا في التقرير والتحرير، بارعًا في التوجيه والتحبير؛ قد عرف كيف يؤصِّلُ الأصول، ويبني عليها الفروع، وكيف يمهّد القواعد، ويأتي لها بشواهد المعقول والمسموع.

ترجمہ: کیسے (ہر کس و ناکس اس فن میں گفتگو کر سکتا ہے؟) اور حالانکہ اس علم کے اسرار انہی پر کھلتے ہیں جو تمام علوم شرعیہ میں قدم راسخ اور تمام فنون دینیہ میں مہارت تامہ رکھتے ہوں، اور اس علم کی گھاٹ اس شخص کے لئے ستھری ہوتی ہے جس کے سینہ کو اللہ تعالیٰ نے علم لدنی کے لئے کھول دیا ہو۔ اور اسرار وہبی سے اس کے قلب کو بھر دیا ہو۔ علاوہ ازیں وہ تیز ذہن، رواں طبیعت، تقریر و تحریر کا ماہر اور توجیہ و تحسین کلام میں یگانۂ روزگار ہو۔ اور اچھی طرح جانتا ہو کہ اصول کس طرح بنائے جاتے ہیں اور کس طرح ان پر فروع تعمیر کی جاتی ہیں۔ اور ضوابط کیسے تیار کئے جاتے ہیں اور کس طرح ان کے لئے عقلی اور نقلی دلائل و شواہد پیش کئے جاتے ہیں۔

لغات:

تمکّن من الامر: قادر ہونا　استبدّ بالامر: خود مختار ہونا، قادر مطلق ہونا (باب ض)　صفا (ن) صفوًا: صاف ہونا، گدلا نہ ہونا　مشرب: پانی پینے کی جگہ، گھاٹ، جمع مشارب　لَدُنّی کے آخر میں یا نسبتی ہے، لدنّا کی طرف منسوب ہے، مراد: الہامی علوم ہیں اور یہ محاورہ وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا (الکہف ۶۵) سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں: ہم نے خضر کو اپنے پاس سے خاص طور کا علم سکھایا تھا　وقّاد (اسم مبالغہ) بہت روشن۔ وقد (ض) وقدًا: روشن ہونا　سیّال (صیغہ مبالغہ) بہت بہنے والا　القریحۃ: طبیعت　بارع: فائق، برع: علم یا فضیلت یا جمال میں غالب ہونا　توجیہ: بات کو قریب الفہم بنا کر پیش کرنا اور ایسے انداز سے پیش کرنا کہ کوئی اشکال باقی نہ رہے (تفصیل کے لئے دیکھئے اصول الکبیر) حبّر الکلام: عمدہ بنانا　اصّل: جڑ والا بنانا، اصل بیان کرنا، اصول وضع کرنا

مهد الفراش: بستر بچھانا، مهّد الامر: درست و ہموار کرنا۔

شرح:

گھاٹ کا ستھرا ہونا کنایہ ہے پسندیدہ کام سے، اگر تالاب یا ندی کا گھاٹ گدلا نہ ہو تو وہاں سے صاف پانی ملے گا۔

اور جس گھاٹ کو پانی لینے والوں نے پاپیٹ دالوں نے گدلا کر رکھا ہو وہاں سے گدلا پانی ملے گا۔ علم اسرار الدین کا گھاٹ اسی کے لئے ستھرا ہوتا ہے جس کو قدرت نے علوم وہبی سے وافر حصہ عنایت فرمایا ہو، اور اس کے جسم کا روآں روآں اس علم سے سرشار ہو۔ اور وہبی علوم حاصل کرنا کسی کی مقدرت میں نہیں۔ قسام ازل جسے بخش دے وہی خوش نصیب ہے۔ تقریر کے معنی ہیں مافی الضمیر کو زبان سے یا قلم سے ظاہر کرنا اور تحریر کے معنی ہیں بات کو حشو وزوائد سے پاک کر کے خوبصورت طریقہ پر پیش کرنا۔

☆ ☆ ☆

تقریب تدوین حکمت شرعیہ

آگے شاہ صاحب قدس سرہ دو امور ذکر فرماتے ہیں جو تدوین فن اور تصنیف کتاب کا باعث بنے۔ طویل عبارت کا خلاصہ چند امور ہیں جو درج ذیل ہیں۔

(۱) اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے حضرت شاہ صاحب کو اس فن کی وافر صلاحیت عطا فرمائی تھی، پس اس کی نعمت کا شکر یہ ہے کہ ان علوم کو ظاہر کیا جائے، ارشاد باری تعالیٰ ہے ﴿وَأَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ﴾ (اپنے رب کے انعامات کا تذکرہ کرتے رہئے)

(۲) ایک مکاشفہ ذکر فرمایا ہے کہ آپ ایک دن عصر کی نماز کے بعد اللہ کی طرف متوجہ ہو کر بیٹھے تھے کہ یکایک آنحضرت ﷺ کی روح پر فتوح ظاہر ہوئی اور اس نے شاہ صاحب کو کسی چیز سے ڈھانک دیا جیسے کوئی کپڑا اوڑھا دیا جاتا ہے اور اس مکاشفہ کے دوران ہی شاہ صاحب کے دل میں یہ بات آئی کہ یہ دین کی خاص قسم کی تشریح کی طرف اشارہ ہے۔

(۳) ایک الہام ذکر فرمایا ہے کہ قلم تقدیر نے شاہ صاحب کے لئے یہ بات لکھ دی ہے کہ آپ اپنی حیات میں کسی وقت کوئی ایسا کارنامہ ضرور انجام دیں گے کہ اس کے ذریعہ اللہ کی زمین نور حق سے منور ہو جائے اور دور آخر میں دین پر شباب چھا جائے اور شریعت مصطفوی استدلال کے پیکر میں رونما ہو۔

(۴) ایک خواب ذکر فرمایا ہے کہ حضرات حسنین رضی اللہ عنہما نے شاہ صاحب کو ایک قلم یہ کہہ کر عنایت فرمایا کہ ”یہ ہمارے نانا جان کا قلم ہے“ اس خواب کی تعبیر واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ سے دین کی کوئی علمی خدمت لیں گے۔

(۵) بار بار دل میں یہ خیال انگڑائیاں لیتا تھا کہ علم اسرار الدین میں کوئی ایسی کتاب لکھنی چاہئے جو خاص وعام کیلئے مفید ہو، مگر کچھ اندیشے مانع بنے تھے، وقت بضاعت کا خیال اور معاونین کی کی ارادہ کو تکمیل کا جامہ پہنانے میں سد راہ بنی تھی۔

(۶) آپ کے ماموں زاد بھائی اور تلمیذ رشید شیخ محمد عاشق پھلتی رحمہ اللہ میں اس فن کو حاصل کرنے کا شوق پیدا ہوا اور

وہ قابل استاذ کی تلاش میں نکلے اور ناکام ہو کر اور تھک ہار کر شاہ صاحب پر ان کی نظر ٹھہری۔ انھوں نے بے حد اصرار کیا کہ شاہ صاحب اس فن میں کتاب لکھیں، کیونکہ عاشق کی نظر میں شاہ صاحب کے علاوہ کوئی ایسی شخصیت نہیں تھی جو یہ کارنامہ انجام دے سکے۔

(۷) مولانا محمد عاشق صاحب نے شاہ صاحب کو حدیث الجام یاد دلائی، وہ حدیث شریف یہ ہے:

مَنْ سُئِلَ عَنْ عِلْمٍ عَلِمَهُ ثُمَّ كَتَمَهُ، أُلْجِمَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ بِلِجَامٍ مِنْ نَارٍ (مشکوٰۃ ح ۲۲۳)	جس شخص سے کسی ایسے علم کے بارے میں دریافت کیا گیا جسے وہ جانتا تھا پھر اس نے اس کو چھپایا تو وہ بروز قیامت آگ کی لگام دیا جائے گا۔

(۸) مذکورہ حدیث شریف سننے کے بعد شاہ صاحب مجبور ہو گئے۔ آپ کے پاس کوئی بہانہ اور راہ فرار باقی نہ رہی تو استخارہ مسنونہ کر کے کام کا آغاز کر دیا۔

[أسباب تصنيف الكتاب وتدوين الفن]

وإن من أعظم نعم الله عليَّ: أن آتاني منه حظا، وجعل لي منه نصيبا، وما أنفكُّ أعترف بتقصيري وأبوءُ به، وما أُبَرِّئُ نفسي، إن النفس لأمارة بالسوء!

وبينما أنا جالس ذات يوم بعد صلاة العصر متوجها إلى الله، إذ ظهرت روحُ النبي صلى الله عليه وسلم، وغشيتني من فوقي بشيء خُيِّل إليّ أنه ثوب أُلقي عليّ، ونُفث في رُوعي في تلك الحالة: أنه إشارة إلى نوع بيانٍ للدين؛ ووجدت عند ذلك في صدري نورًا، لم يزل ينفسح كلَّ حين.

ثم ألهمني ربي بعد زمان: أنه مما كُتب عليَّ بالقلم الأعلى: أن أنهض يومًا لهذا الأمر الجَلِيّ؛ وأنه أشرقت الأرض بنور ربها، وانعكست الأضواءُ عند مغربها، وأن الشريعة المصطفوية أشرقت في هذا الزمان، على أن تبرز في قُمُصٍ سابغةٍ من البرهان.

ثم رأيت الإمامين الحسن والحسين في منام — رضي الله عنهما — وأنا يومئذ بمكة، كأنهما أعطياني قلمًا، وقالا: هذا قلم جدِّنا رسولِ الله صلى الله عليه وسلم.

ولطالما أحدثت نفسي: أن أدوِّن فيه رسالةً، تكون تبصرةً للمبتدي، وتذكرةً للمنتهي، يستوي فيه الحاضرُ والباد، ويتعاوره المجلِّي والناد؛ ثم يثبطني أني لا أجد عندي ولديَّ، ولا أرى من خلفي وبين يديَّ، من أراجعه في المشتبهات: من العلماء المنصفين الثقات، ويثبطني قصورُ باعي في العلوم المنقولة مما كان عليه القرونُ المقبولة، ويُفشِّلني أني في زمان الجهل والعصبية واتباع الهوى، وإعجاب كل امرئ بآرائه الرديئة، وأن المعاصرة أصلُ المنافرة، وأن

من صنف فقد استهدف.

فبينا أنا في ذلك، أقدم رجلاً وأؤخر أخرى، وأجري شوطاً ثم أرجع قهقرى، إذ تفطن أجل إخواني لدي، وأكرم خلاني علي، محمد المعروف بعاشق، لا زال محفوظاً من كل طارق وغاسق، بمنزلة هذا العلم وفضائله، وألهم أن السعادة لا تتم إلا بتتبع دقائقه وجلائله، وعرف: أنه لا يتيسر له الوصول إليه إلا بعد مجاهدة الشكوك والشبهات، ومكابدة الاختلاف والمناقضات؛ ولا يستتب له الخوض إلا بسعي رجل يكون أول من قرع الباب، وكلما دعا أتاه الأوابد الصعاب؛ فطاف ما قدر عليه من البلاد، وبحث عن من توسم فيه الخير من العباد، وتفحص سمينهم وغثهم، وسبر غثهم وسمينهم، فلم يجد من يتكلم منه ببالغة، أو يأتي منه بجذوة ساطعة.

فلما رأى ذلك ألح علي ورزأني، ولببني وأمسكني، وصار كلما اعتذرت ذكرني حديث الإلجام، فأفحمني أشد الإفحام، حتى أعيت بي المذاهب، وضاقت بمعاذيري المذاهب. وأيقنت أنها إحدى الكبر، وأنها لما كتبت ألهمت صورة من الصور، وأنه قد سبق على الكتاب، وأنه أمر قد توجه من كل باب.

فتوجهت إلى الله واستخرته، ورغبت إليه واستعنته، وخرجت من الحول والقوة بالكلية، وصرت كالميت في يد الغسال في حركاته القسرية، وشرعت فيما ندبني إليه، وعطفني عليه، وتضرعت إلى الله: أن يصرف قلبي عن الملاهي، وأن يريني حقائق الأشياء كما هي، ويسدد جناني، ويفصح لساني، ويعصمني فيما أنتحيه من المقال، ويوفقني لصدق اللهجة في كل حال، ويعينني في إبراز ما يختلج في صدري، ويعالجه فكري، إنه قريب مجيب.

ترجمہ: اور مجھ پر اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمتوں میں سے ایک یہ ہے کہ اس نے مجھے اس فن میں سے کچھ حصہ یا بڑا حصہ عطا فرمایا اور میرے لئے اس علم میں سے کچھ حصہ یا بڑا حصہ کر دیا، اور میں بھی اپنی کوتاہی کا اعتراف کرتا ہوں اور اقرار کرتا ہوں اور اپنے نفس کو پاک نہیں گردانتا کیونکہ نفس برائیوں کا بہت زیادہ حکم دینے والا ہے۔ (باقی ترجمہ آگے آرہا ہے)

لغات:

نعم جمع ہے نعمۃ کی ..... منہ کی ضمیر کا مرجع علم اسرار الدین ہے ..... حظا اور نصیبا کی تنوین تقلیل کے لئے بھی ہو سکتی ہیں اور تعظیم کے لئے بھی..... باء (ن) ابوءً بالحق او بالذنب: اقرار کرنا۔

دین اسلام کو زمانہ کے تقاضوں کے مطابق پیش کیا جائے اس وقت شاہ صاحب قدس سرہ کو یہ بشارت الہام کی گئی کہ اب زمین اللہ کے نور سے روشن ہونے والی ہے، دین کا بول بالا ہونے والا ہے۔ شریعت محمدیہ علی صاحبہا الصلوۃ والسلام کی شان سے جلوہ گر ہوگی اور مسائل شرعیہ دلائل و براہین کا کامل لباس پہن کر لوگوں کے سامنے آئیں گے اور جس طرح سورج کے غروب ہونے کے بعد روشنی تیز ہوجاتی ہے اسی طرح اس آخری دور میں بھی سورج شان سے ابھرے گا اور قلم تقدیر میں یہ بات لکھی گئی ہے کہ یہ کام بہرحال شاہ صاحب قدس سرہ سے لیا جائے گا۔ اسی الہام کی تعبیر یہ کتاب حجۃ اللہ البالغہ ہے۔

باقی ترجمہ: نیز میں نے حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما کو خواب میں دیکھا۔ اور یہ اس زمانہ کا قصہ ہے جب میں مکہ مکرمہ میں مقیم تھا۔ گویا ان دونوں حضرات نے مجھے کوئی قلم عطا فرمایا اور ان دونوں نے فرمایا: "یہ ہمارے نانا جان حضرت رسول خدا ﷺ کا قلم ہے"

تنبیہ: حضرات حسنین رضی اللہ عنہما کے اسمائے گرامی کے ساتھ لفظ "امام" کا استعمال حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ نے خطبات جمعہ کے خطبہ ثانیہ میں بھی فرمایا ہے جبکہ ان کی امامت کا عقیدہ شیعوں کا ہے اور یہ عذر کہ لغوی معنی میں استعمال کیا ہے اس لئے درست نہیں کہ خلفائے راشدین کے ناموں کے ساتھ یہ لفظ استعمال نہیں فرمایا جبکہ وہ زیادہ مقتدا تھے۔ اسی طرح بہت سے مصنفین کے قلم سے ان بزرگوں کے نام کے ساتھ "علیہ السلام" نکل جاتا ہے جو اہل سنت کے نزدیک کسی طرح بھی درست نہیں کیونکہ بارہ اماموں کی امامت اور عصمت کا عقیدہ شیعوں کا ہے۔

ریاض سے غیر مقلدین کے اہتمام سے بخاری شریف کا جو نسخہ دار السلام نے طبع کیا ہے اس میں ص ۲۳۳ پر باب میں حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے نام کے ساتھ علیہا السلام لکھ دیا ہے جو قطعاً غلط ہے اور بخاری کے ہندی نسخوں میں یہ اضافہ نہیں ہے۔

اسی طرح ابوداؤد شریف کا جو نسخہ شیخ محمد محیی الدین عبد الحمید کی مراجعت اور ضبط و تعلیق سے شائع ہوا ہے اس میں جلد ۳ صفحہ ۳ کتاب النصب کے دوسرے باب میں حدیث شریف میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے نام کے ساتھ علیہ السلام طبع ہوا ہے جبکہ ابوداؤد کے ہندی نسخہ میں یہ لفظ نہیں۔

غرض اس قسم کی چیزیں یا تو اتفاقی ہوتی ہیں یا شیعی اثرات کا نتیجہ ہوتی ہیں یا بہت محبت میں بے خبری میں ایسی باتیں قلم سے نکل جاتی ہیں، اس لئے اس موقعہ میں احتیاط ضروری ہے۔

باقی ترجمہ: اور میں عرصہ دراز سے سوچتا تھا کہ اس فن میں کوئی ایسا رسالہ لکھوں جو مبتدیوں کے لئے رہنما اور منتہیوں کے لئے یادداشت ہو، جس سے شہری اور دیہاتی یکساں طور پر مستفید ہوں اور اہل مجالس و محافل کی دست رس میں ہو، پھر مجھے یہ چیز روکتی تھی کہ میں اپنے پاس اور اپنے قریب نہیں پاتا تھا اور اپنے پیچھے اور اپنے سامنے نہیں دیکھتا تھا ایسے انصاف پسند شخص کو جس کی طرف میں الجھے ہوئے مسائل میں رجوع کروں اور قرون مشہود کے لوگوں کو صوم

لغت: عالجه معالجة: تدبیر کرنا، چارہ سازی کرنا، علاج معالجہ کرنا۔

تشریحات۔

(۱) لاش کی غیر اختیاری حرکات میں یعنی جس طرح نہلانے والے چاہتے ہیں لاش کو الٹتے پلٹتے ہیں لاش کا اپنا کوئی اختیار نہیں ہوتا اسی طرح میں دستِ قدرت کے سامنے بے بس ہو کر رہ گیا کہ وہ جو چاہیں مجھ سے کام لیں۔

(۲) لہو ولعب سے بچیو رہے یعنی اوقات ضائع کرنے سے میری حفاظت فرمائے کیونکہ انسان زندگی کا بہت بڑا حصہ بے خبری میں ضائع کر رہا ہے جس شخص نے وقت کی قدر پہچان لی وہ ضرور کوئی اہم کارنامہ انجام دے گا اور جس کی زندگی کی گھڑیاں یونہی برباد ہوتی رہیں وہ عمر نوح پا کر بھی کچھ نہیں کر سکتا۔

(۳) كما هي (جیسی کہ وہ ہیں) یعنی انسان بہت سی مرتبہ چیزوں کی حقیقتیں صحیح طور پر نہیں سمجھتا وہ غلط فہمی کا شکار رہتا ہے، ایک چیز ہوتی کچھ ہے اور وہ اس کو سمجھتا کچھ ہے۔ قال: إنه صرح ممرد من قوارير (النمل) والے واقعہ میں حضرت سلیمان علیہ السلام نے ملکہ سبا کو اس حقیقت سے آشنا کیا تھا چنانچہ وہ فوراً مظاہر پرستی سے دست بردار ہو کر اللہ رب العالمین پر ایمان لے آئی اور اپنی سابقہ غفلت والی زندگی پر پشیمان ہوئی۔ غرض حق کا واشگاف ہونا بہت بڑا علم ہے۔

(۴) گویا کرے یعنی وقت گفتار دے، میں جو بات سمجھانا چاہوں اس کو دلنشین طریقہ پر سمجھا سکوں۔

(۵) میرے سینہ میں گنجینے ہیں یعنی جو میرے خدا داد علوم ہیں۔

(۶) جن کی میرا سوچ چارہ سازی کرتا ہے یعنی جو باتیں میں نے غور و فکر سے کہی ہیں۔

☆ ☆ ☆

کتاب کا انداز

آگے شاہ صاحب قدس سرہ فروتنی سے فرماتے ہیں کہ میں زور بیان سے محروم ہوں، مقابلہ کے میدان میں سبقت غایات ہونے کی مجھ سے امید نہ رکھی جائے۔ میرے پاس مواد بھی کچھ نہیں۔ اور حوالوں کی بھرمار بھی میرے بس کی بات نہیں کیونکہ آپ کا دل تصوف کے مشاغل میں اس درجہ منہمک تھا کہ کتابوں کی بہت زیادہ ورق گردانی کرنے کی آپ کو فرصت نہ تھی۔

نیز فرماتے ہیں کہ اساتذہ سے سنی ہوئی ساری باتیں یاد کرنا، پھر ان کو بیان کرکے لوگوں کا دل لبھانا میرے بس کی بات نہیں۔ شاہ صاحب کے نزدیک یہ چیز ایک طرح کی عادت اور ناپسندیدہ بات تھی اس لئے اس قسم کی باتوں کی بھی تلاش نہیں

اللہ پاک جواباً ارشاد فرماتے ہیں: ﴿كَذَٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ حَتَّىٰ ذَاقُوا بَأْسَنَا﴾ یعنی رسولوں کی تکذیب آج کوئی نئی بات نہیں، گذشتہ کفار نے بھی اسی طرح تکذیب کی تھی مگر ان کا انجام کیا ہوا؟ عذاب خداوندی کا کوڑا ان پر برسا اور وہ صفحۂ ہستی سے مٹا دیئے گئے، پس آج کے مکذبین گذشتہ لوگوں کے انجام سے سبق کیوں نہیں لیتے!

آگے ارشاد ہے: ﴿قُلْ هَلْ عِندَكُم مِّنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوهُ لَنَا﴾ یعنی اگر تمہارے پاس اپنی بات کی کوئی ٹھوس دلیل ہو تو پیش کرو تاکہ دیکھا جائے کہ وہ کہاں تک مدعیٰ ثابت کرتی ہے؟ مگر کہاں سے پیش کریں وہ تو محض خیالی، قولی پر چلتے ہیں اور بالکل اٹکل کے تیر چلاتے ہیں: ﴿إِن تَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَإِنْ أَنتُمْ إِلَّا تَخْرُصُونَ﴾

اس کے بعد ارشاد ہے: ﴿قُلْ فَلِلَّهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ﴾ (آپ کہئے کہ حجت پوری پس اللہ ہی کی ہے) یعنی مشرکین کے پاس تو کوئی دلیل نہیں مگر اللہ تعالیٰ کے پاس نہایت قوی، مضبوط اور ٹھوس دلیل ہے۔ اس آیت میں جس برہان الٰہی کی طرف اشارہ ہے اس کی تفصیل یہ ہے کہ اگرچہ یہ بات صحیح ہے کہ کائنات میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ مشیت ایزدی سے ہو رہا ہے مگر ساتھ ہی یہ بھی واقعہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو دوسری مخلوقات سے زیادہ صلاحیتیں دی ہیں، اس کو کامل عقل اور فہم دیا، آنکھیں اور شنوا کان دیئے ہیں، اس کو خیر وشر میں انتخاب کرنے کی قدرت بخشی ہے اور اس کو ایک جزوی اور ظلی اختیار دیا ہے، وہ اپنی مرضی سے ایک وقت میں ایک چیز کو اختیار کرنے کا فیصلہ کرتے ہیں تو دوسرے وقت میں اس کو چھوڑ دینے کا تہیہ بھی کرتے ہیں۔ انسان کو اللہ تعالیٰ نے اینٹ پتھر کی طرح بالکل بے اختیار، بے بس اور مجبور پیدا نہیں کیا۔

غرض انسان کو اسی جزوی اختیار کی بنیاد پر مکلف بنایا گیا ہے اور اسی بنیاد پر اس کو اعمال کا بدلہ دیا جاتا ہے اور اس کی رہنمائی کے لئے رسولوں کو مبعوث فرمایا گیا ہے اور اس کو شریعت دی گئی ہے جس کے ذریعہ اپنے مفید کاموں کا اس کو حکم دیا گیا ہے جو دنیا و آخرت میں اس کے لئے مفید ہیں اور ان بری باتوں سے اس کو روکا گیا ہے جو دارین میں اس کے لئے ضرر رساں ہیں۔ امام رازی تفسیر کبیر (ص ۲۲۹ ج ۱۳) میں تحریر فرماتے ہیں:

قال تعالى: ﴿قُلْ فَلِلَّهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ﴾ وذلك من وجهين: (الوجه الأول) أنه تعالى أعطاكم عقولاً كاملة، وأفهاماً وافية، وآذاناً سامعة، وعيوناً باصرة، وأقدركم على الخير والشر، وأزال الأعذار والموانع بالكلية، فإن شئتم ذهبتم إلى عمل الخيرات، وإن شئتم إلى عمل المعاصي والمنكرات، وهذه القدرة والمكنة معلومة الثبوت بالضرورة، وزوال الموانع والعوائق معلوم الثبوت أيضاً بالضرورة، وإذا كان الأمر كذلك كان ادعاؤكم أنكم عاجزون عن الإيمان والطاعة دعوى باطلة، فثبت بما ذكرنا أنه ليس لكم على الله حجة بالغة، بل لله الحجة البالغة عليكم.

اور اگر اللہ تعالیٰ چاہتے تو انسان کو مجبور بھی پیدا کر سکتے تھے کیونکہ وہ بااختیار ہیں، اس صورت میں سب انسان راہ یاب ہوتے، کوئی گمراہ نہ ہوتا ﴿فَلَوْ شَاءَ لَهَدَاكُمْ أَجْمَعِينَ﴾ مگر ان کی حکمت کا تقاضا یہ ہوا کہ انسان کو اشرف کائنات بنایا

جائے جس کے لئے حق تعالیٰ سے گذرنا ضروری تھا تا کہ اس کا استحقاق علی رؤس الاشہاد ثابت ہو جائے۔

غرض ارشاد باری ﴿فللّٰہ الحجۃ البالغۃ﴾ میں تکلیف کے راز مجازات کی حکمت اور احکام شرعیہ کے حق بر حکمت ومصالح ہونے کی طرف اشارہ ہے، اور شاہ صاحب رحمہ اللہ کی اس کتاب میں بھی اسی قسم کے مضامین ہیں اس لئے اس کا نام حجۃ اللہ البالغۃ (کامل برہان الٰہی) رکھا گیا ہے۔ اور شرح کا نام بھی آیت ۱۴۷ ﴿فَإِنْ كَذَّبُوكَ فَقُلْ رَّبُّكُمْ ذُو رَحْمَةٍ وَاسِعَةٍ﴾ سے ماخوذ ہے (تفصیل کے لئے دیکھیں رحمۃ اللہ ۲۰-۲۹)

[وجہ تسمیۃ الکتاب]

> ولما كانت وقعت الإشارة إلى سر التكليف والمجازاة، وأسرار الشرائع المنزلة إلى الرحمة المهداة، بقوله تعالى: ﴿فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ﴾ وهذه الرسالة شعبة منها نابعة، وبدور من أفقها بازغة، حسن أن تسمى ﴿حجة الله البالغة﴾ حسبي الله، ونعم الوكيل، ولا حول ولا قوة إلا بالله العلي العظيم.

ترجمہ: کتاب کی وجہ تسمیہ: اور چونکہ ارشاد باری ﴿فللّٰہ الحجۃ البالغۃ﴾ (پس حجت پوری اللہ تعالیٰ ہی کی رہی) میں اشارہ آیا ہے مکلف ہونے کے راز کی طرف اور اعمال کے نتائج برے بھلے کی حکمت کی طرف اور ہدیہ کی ہوئی مہربانی (یعنی ذات نبوی) کی طرف نازل کردہ شریعت کے رموز کی طرف اور یہ کتاب اسی سے پھوٹنے والی ایک شاخ ہے اور اسی کے افق سے طلوع ہونے والے چاند ہیں تو اس کتاب کا نام حجۃ اللہ البالغۃ (کامل برہان الٰہی) رکھنا مناسب معلوم ہوا۔ اللہ تعالیٰ میرے لئے کافی ہیں۔ اور وہ بہترین کارساز ہیں اور اللہ تعالیٰ برتر وبالا کے سوا کوئی طاقت وقوت نہیں ہے!

لغات:

بقولہ تعالیٰ متعلق ہے وقعت سے۔ شُعبۃ بمعنی شاخ جمع شُعَب۔ نابعۃ از نبع (ف،ض،ن) نَبْعًا ونُبوعًا الشیئ: نکلنا، ظاہر ہونا۔ بازغۃ از بزغت الشمس: طلوع ہونا۔ حسن (ک) حُسْنًا: خوبصورت ہونا، اچھا ہونا۔ حجۃ اللہ البالغۃ مفعول ثانی ہے تسمی کا۔ البالغۃ ای البینۃ الواضحۃ التی بلغت غایۃ المتانۃ والقوۃ علی الإثبات (روح المعانی) یعنی صاف اور واضح دلیل جو نہایت درجہ قوی اور اعلیٰ درجہ کی ثبت مدعی ہو۔ الرحمۃ المھداۃ سے مراد ذات نبوی ہے آپ حسب ارشاد باری تعالیٰ ﴿وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ﴾ رحمت کائنات ہیں۔ مھداۃ اسم مفعول ہدیہ کی ہوئی چیز، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات آپ کی امت کے لئے ایک قیمتی ہدیہ ہے جو بلا استحقاق دیا گیا ہے پس امت کو اس نعمت کی قدر کرنی چاہئے اور آپ کی تعظیم اور پیروی میں ذرا کوتاہی نہیں کرنی چاہئے۔

[من قال: إن الأحكام الشرعية غير متضمنة لشيء من المصالح، فقوله باطل]

قد يظن أن الأحكام الشرعية غير متضمنة لشيء من المصالح، وأنه ليس بين الأعمال وبين ما جعل الله جزاءً لها مناسبة، وأن مثل التكليف بالشرائع كمثل سيد أراد أن يختبر طاعة عبده، فأمره برفع حجر، أو لمس شجرة، مما لا فائدة فيه غير الاختبار، فلما أطاع أو عصى جوزي بعمله، وهذا ظن فاسد، تكذبه السنة وإجماع القرون المشهود لها بالخير.

ومن عجز أن يعرف:

[١] أن الأعمال معتبرة بالنيات والهيئات النفسانية التي صدرت منها، كما قال النبي صلى الله عليه وسلم: «إنما الأعمال بالنيات» وقال الله تعالى: ﴿لن ينال الله لحومها ولا دماؤها ولكن يناله التقوى منكم﴾

[٢] وأن الصلوة شرعت لذكر الله ومناجاته، كما قال الله تعالى: ﴿أقم الصلوة لذكري﴾ ولتكون معدة لرؤية الله تعالى ومشاهدته في الآخرة، كما قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: «سترون ربكم كما ترون هذا القمر، لا تضامون في رؤيته، فإن استطعتم أن لا تغلبوا على صلوة قبل طلوع الشمس، وصلوة قبل غروبها فافعلوا»

[٣] وأن الزكوة شرعت دفعًا لرذيلة البخل، وكفاية لحاجة الفقراء، كما قال الله تعالى في مانعي الزكوة: ﴿ولا يحسبن الذين يبخلون بما آتاهم الله من فضله هو خيرًا لهم بل هو شر لهم سيطوقون ما بخلوا به يوم القيامة﴾ وكما قال النبي صلى الله عليه وسلم: «فأخبرهم أن الله تعالى قد فرض عليهم صدقة، تؤخذ من أغنيائهم، فترد على فقرائهم»

[٤] وأن الصوم شرع لقهر النفس، كما قال الله تعالى: ﴿لعلكم تتقون﴾ وكما قال النبي صلى الله عليه وسلم: «فإن الصوم له وجاء»

[٥] وأن الحج شرع لتعظيم شعائر الله، كما قال الله تعالى: ﴿إن أول بيت وضع للناس

مشاہدۂ حق کی آدمی میں استعداد پیدا ہو، جیسا کہ ارشاد نبوی ہے: "تم عنقریب اپنے پروردگار کو اسی طرح دیکھو گے جس طرح چاند کو دیکھ رہے ہو کہ اس کے دیکھنے میں دھکا مکی نہیں کرتے ہو، اگر تم سے بن سکے یہ بات ہو کہ طلوع آفتاب سے پہلے اور غروب آفتاب سے پہلے والی نمازوں میں مغلوب نہ ہو جاؤ تو ایسا کرو" (متفق علیہ، مشکوۃ شریف حدیث ۵۶۵۵ باب رؤیۃ اللہ تعالیٰ)

(۳) اور زکوۃ رذیلۂ بخل کے ازالہ کے لئے اور غرباء کی حاجت روائی کے لئے مشروع کی گئی ہے، جیسا کہ زکوۃ نہ دینے والوں کے حق میں ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ: "ہرگز خیال نہ کریں وہ لوگ جو ایسی چیز میں بخل کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے فضل سے دی ہے کہ یہ بات کچھ ان کے لئے اچھی ہوگی، بلکہ یہ بات ان کے لئے بہت ہی بری ہے، وہ لوگ قیامت میں اس کا طوق پہنائے جائیں گے جس میں انھوں نے بخل کیا ہے" (آل عمران ۱۸۰) اور جیسا کہ ارشاد نبوی ہے کہ: "پھر آپ (یعنی حضرت معاذ رضی اللہ عنہ) لوگوں کو بتائیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر زکوۃ فرض کی ہے جو مالداروں سے وصول کی جائے گی اور غرباء پر خرچ کی جائے گی" (مسلم شریف مصری ص ۲۰۰ ج۱ مشکوۃ ۱۷۷۲)

(۴) اور روزہ نفس کو مغلوب کرنے کے لئے مشروع کیا گیا ہے، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: "تاکہ تم پرہیزگار بنو" (البقرۃ ۱۸۳) اور جیسا کہ ارشاد نبوی ہے کہ: "روزہ جوان آدمی کے لئے خصی (خصی ہونا) ہے" (مشکوۃ ۳۰۸۰)

(۵) اور حج شعائر خداوندی کی تعظیم کے لئے مشروع کیا گیا ہے، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ: "یقیناً وہ گھر جو سب سے پہلے لوگوں کے واسطے مقرر کیا گیا ہے البتہ وہ مکان ہے" آخر آیت تک پڑھیے۔ (آل عمران ۹۶) اور ارشاد فرمایا کہ: "بیشک صفا اور مروہ منجملہ یادگار (دین) خداوندی ہیں" (البقرۃ ۱۵۸)

(۶) اور قصاص لوگوں کو قتل سے روکنے کے لئے مشروع کیا گیا ہے، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ: "اے فہیم لوگو! قصاص میں تمہاری جانوں کا بڑا بچاؤ ہے" (البقرۃ ۱۷۹)

(۷) اور حدود و کفارات لوگوں کو گناہوں سے زجر کے لئے مشروع کئے گئے ہیں، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: "تاکہ وہ اپنی حرکت کا وبال چکھے" (المائدہ ۹۵)

(۸) اور جہاد اللہ تعالیٰ کا بول بالا کرنے کے لئے اور فتنہ کا سد باب کرنے کے لئے مشروع کیا گیا ہے، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: "اور تم ان (کفار عرب) سے اس حد تک لڑو کہ ان میں فساد عقیدہ (شرک) نہ رہے اور دین (خالص) اللہ ہی کا ہو جائے" (انفال ۳۹)

(۹) اور معاملات یعنی لین دین کے احکام اور شادی بیاہ کے مسائل لوگوں میں عدل و انصاف قائم کرنے کے لئے مشروع کئے گئے ہیں۔

اور دیگر بہت سے امور (یعنی مذکورہ بالا احکام کے علاوہ اور بھی بہت سے احکام ہیں) جن (کی حکمتوں اور مصلحتوں) پر

مشتمل ہونے) پر قرآنی آیات اور احادیث نبویہ دلالت کرتی ہیں۔ اور ہر زمانہ میں متعدد علماء کرام نے ان معانی کو بیان کرنے میں دلچسپی لی ہے۔

پس (جو شخص ایسی موٹی باتیں بھی نہیں سمجھ سکتا) اسے ہم نے بس اتنا ہی چھوڑا ہے جتنا سوئی کو پانی چھوتا ہے، جب وہ سمندر میں ڈبو کر نکالی جاتی ہے اور ایسا شخص اس بات کا زیادہ حقدار ہے کہ اس کے علم کا ماتم کیا جائے نہ کہ اس کی بات پر کان دھرا جائے۔

لغات:

تضمن الشيء مشتمل ہونا ماجعل الخ میں عائد محذوف ہے ای ماجعله الله اور لها کی ضمیر الاعمال کی طرف لوٹتی ہے مناسبة اسم موخر ہے لیس کا۔ كَذَّبَهُ جھوٹا بتانا، جھوٹ کی طرف نسبت کرنا مُعتبَر (اسم مفعول) موازنہ کیا ہوا اعتبر الشيء بالشيء ای استدل به عليه هيئات جمع هيئة کی بمعنی کیفیت۔ نفسانية ای قلبية، الهيئات النفسانية عام ہے النیات سے کیونکہ تقویٰ کیفیات قلبیہ میں سے ہے جو نیت سے مختلف چیز ہے مُعِدَّة (اسم فاعل) از اَعَدَّه تیار کرنا۔ لاتصافون از تصافن القوم ای انصب بعضهم الی بعض یعنی بچا کر، رعایتی کرنا۔ غلب عليه (معروف) جیتنا اور غلب عنه (مجہول) ہارنا۔ زجره عن كذا: روکنا، اٹھانا، چلا کر دھتکارنا۔ زواجر جمع زاجرة کی بمعنی ڈانٹنے والی۔ لهج (س) لهجا بالشيء شیفتہ ہونا، دلدادہ ہونا مسّ (س ن) مسّ الشيء چھونا، پہنچنا اعتداد شمار کرنا کہا جاتا ہے هذا شيء لايعتد به: یہ ایسی چیز ہے جس کا شمار نہیں کیا جاتا یعنی اس کی طرف التفات نہیں کیا جاتا۔

تشریح:

مذکورہ متن کا مدعیٰ واضح ہے، کسی تشریح کی حاجت نہیں، اس لئے ذیل میں چند متفرق باتیں ذکر کی جاتی ہیں۔

(۱) اعمال خواہ نیک ہوں یا بد، ان کی جو جزا مقرر کی گئی ہے وہ اٹکل پچو مقرر نہیں کی گئی بلکہ گہری حکمتوں پر مبنی ہے، جس کی تفصیل کتاب میں جابجا آپ پڑھیں گے، لہٰذا یہ خیال غلط ہے کہ اعمال اور ان کے بدلے کے درمیان کوئی مناسبت نہیں۔

(۲) عمل کا مدار نیت پر ہے، یعنی جیسی نیت ویسا عمل، نیت نیک تو عمل نیک، نیت بد تو عمل بد، نیت دینی تو عمل دینی اور نیت دنیوی تو عمل بھی دنیوی — پھر نیک عمل میں جس درجہ اخلاص ہوگا عمل اسی کے بقدر قیمتی ہوگا۔ یہ بات حدیث شریف کے اگلے جملے میں سمجھائی گئی ہے، فرمایا: وإنما لكل امرئ مانوى (ہر شخص کو اس کی نیت کے مطابق بدلہ ملے گا) مثلاً ہجرت ایک عمل ہے، یہ عمل تین شخص کرتے ہیں اور ان کی نیتیں مختلف ہیں تو ان کا عمل بھی مختلف ہوگا: ایک شخص اس لئے ہجرت کرتا ہے کہ اسلام ابھی ابتدائی مراحل سے گذر رہا ہے، ابھی اس کو مسلمانوں کی مدد کی ضرورت ہے، اس لئے وہ وطن ترک

کر کے مدینہ کی طرف ہجرت کرتا ہے تا کہ اسلام کا تعاون کرے۔ دوسرا اس لئے ہجرت کرتا ہے کہ مدینہ میں آبادی کے بڑھنے سے کاروبار کا اچھا موقعہ نکل آیا ہے اور تیسرا کسی خاتون سے نکاح کرنے کے لئے مدینہ منورہ ہجرت کر کے آیا ہے۔ دیکھئے تینوں نے ایک ہی عمل کیا ہے مگر صرف اول شخص کی ہجرت دینی عمل ہے باقی دو کی ہجرت محض دنیوی عمل ہے۔

غرض یہ حدیث اعمال صالحہ یا اعمال مباحہ کے بارے میں ہے معاصی کے بارے میں نہیں کیونکہ زنا چوری وغیرہ معاصی ہمیشہ معاصی ہی رہتے ہیں، گو وہ اچھی نیت سے کئے جائیں۔ اچھی نیت سے وہ نیک عمل نہیں بنتے۔

(۳) تقویٰ دل کی کیفیت کا نام ہے اور قربانیاں ظاہری اعمال ہیں اور آیت کریمہ اس پر دلالت کرتی ہے کہ سب لوگوں کی قربانیاں یکساں نہیں ہیں اور تفاوت کا مدار گوشت پوست اور خون پر نہیں بلکہ تقویٰ پر ہے یعنی کیفیات نفسانیہ کے تفاوت سے قربانیوں کے درجات متفاوت ہوتے ہیں۔ یہی اعمال کا ہیئات نفسانیہ کے ساتھ موازنہ کرنا ہے۔

(۴) نماز کی مشروعیت اللہ کو یاد کرنے کے لئے ہے سورۃ العنکبوت آیت ۴۵ میں بھی اس کا تذکرہ ہے، ارشاد ہے: ﴿أَقِمِ الصَّلٰوةَ، إِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ، وَلَذِكْرُ اللّٰهِ أَكْبَرُ﴾ (نماز کی پابندی کیجئے بے شک نماز بے حیائی اور ناجائز کاموں سے روکتی ہے، اور اللہ کی یاد بہت بڑی چیز ہے) یعنی نماز کا ضمنی اور چھوٹا فائدہ یہ ہے کہ وہ فحشاء اور منکر سے روکتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ کوئی نمازی نصیحت نہ لے جیسے ناہنجار بیٹا باپ کی نصیحت نہیں سنتا۔ اور نماز کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ وہ اللہ کی یاد کا ذریعہ ہے۔ أکبرُ اسمِ تفضیل منہ اور ماعلیہ محذوف ہے أی أکبر من الفائدۃ الأولٰی یا أکبر من کل شیئ أی من الفوائد الأخر أیضا.

(۵) حدیث سترون ربکم الخ میں رویت باری تعالیٰ کی خبر دیتے ہوئے دو نمازوں کے اہتمام کا امر فرمایا ہے۔ اس خاص موقعہ پر اس عمل کی تاکید کرنا صاف دلالت کرتا ہے کہ نماز کا رویت باری میں خاص دخل ہے اور وہ یہ ہے کہ نماز انسان میں دیدار خداوندی کی صلاحیت پیدا کرتی ہے اور فجر اور عصر کی تخصیص اس لئے فرمائی گئی ہے کہ فجر غفلت کا وقت ہے اور عصر مشاغل کا، پس جو شخص ان دو نمازوں کا اہتمام کرے گا وہ باقی تین نمازوں کا ضرور اہتمام کرے گا۔ غرض پانچوں نمازیں آدمی میں دیدار خداوندی کی قابلیت پیدا کرتی ہے۔

(۶) بل ھو شر لھم سے بخل کا رذیلہ (بری صفت) ہونا ثابت ہوتا ہے اور ما بخلوا بہ سے مستفاد ہوا کہ زکوٰۃ رذیلہ بخل کا علاج ہے۔

(۷) لعلکم تتقون اس پر دلالت کرتا ہے کہ روزہ آدمی میں گناہوں سے بچنے کی قوت پیدا کرتا ہے کیونکہ پرہیز گاری کا حاصل یہی ہے کہ آدمی کے ہاتھ میں نفس کی لگام رہے۔

(۸) شعائر اللہ میں مجاز بالحذف ہے أی شعائر دین اللہ (دین کی امتیازی نشانیاں) یعنی وہ تمام چیزیں جن کو دیکھتے ہی لوگ سمجھ جاتے ہیں کہ یہ چیزیں دین اسلام سے تعلق رکھنے والی ہیں جیسے مسجدیں، اذان، قرآن، کعبہ، رسول اللہ

تعظیم وغیرہ (شعائر اللہ کا بیان رحمۃ اللہ ۱:۲۰۳ میں ہے)

(۹) قصاص میں جانوں کا بچاؤ ہے کیونکہ جب قاتل قصداً قتل کیا جائے گا تو مقتول کے ورثاء کا دل ٹھنڈا ہوگا اور آگے قتل کا سلسلہ رک جائے گا۔ ورنہ عرصہ دراز تک باہم قتل کا تبادلہ ہوتا رہے گا اور سینکڑوں آدمی لقمۂ اجل بن جائیں گے۔

(۱۰) احکام معاملات کی مشروعیت عدل وانصاف کو بروئے کار لانے کے لئے ہے۔ اس سلسلہ میں کوئی معین آیت یا حدیث نہیں، متعدد نصوص سے یہ بات اخذ کی گئی ہے اور ان سب کا یہاں حوالہ موجب طوالت تھا اس لئے یہ مضمون مدلل نہیں کیا گیا، آگے کتاب میں یہ ابحاث آرہی ہیں۔

(۱۱) نیز ہر زمانہ میں متعدد علمائے کرام کا احکام کے مصالح وحکم کو بیان کرنے میں لگے رہنا اس بات کی واضح دلیل ہے کہ احکام شرعیہ مصلحتوں پر مشتمل ہیں۔

☆ ☆ ☆

[لم يزل النبي صلى الله عليه وسلم، والصحابة، ومن بعدهم يُعلّلون الأحكام بالمصالح]

ثم إن النبي صلى الله عليه وسلم بيّن أسرار تعيين الأوقات في بعض المواضع، كما:

[۱] قال في أربع قبل الظهر: ﴿إنها ساعة تُفتح فيها أبواب السماء، فأُحبّ أن يصعد لي فيها عمل صالح﴾

[۲] ورُوي عنه صلى الله عليه وسلم في صوم يوم عاشوراء: أن سبب مشروعيته نجاة موسى وقومه من فرعون في هذا اليوم، وأن سبب مشروعيته فينا اتباع سنة موسى عليه السلام.

وبيّن أسباب بعض الأحكام:

[۱] فقال في المستيقظ: ﴿فإنه لا يدري أين باتت يده﴾

[۲] وفي الاستنثار: ﴿فإن الشيطان يبيت على خيشومه﴾

[۳] وقال في النوم: ﴿فإنه إذا اضطجع استرخت مفاصله﴾

[۴] وقال في رمي الجمار: ﴿إنه لإقامة ذكر الله﴾

[۵] وقال: ﴿إنما جعل الاستئذان من أجل البصر﴾

[۶] وفي الهرة: ﴿إنها ليست بنجس، إنما هي من الطوافين عليكم أو الطوافات﴾

وبيّن في مواضع:

[۱] أن الحكمة فيها دفع مفسدة، كالنهي عن الغِيلة، إنما هو مخافة ضرر الولد.

[۲] أو مخالفةُ فرقةٍ من الكفار، كقوله صلى الله عليه وسلم: ﴿فإنها تطلع بين قرني الشيطان، وحينئذ يسجد لها الكفار﴾

[۳] أو سَدُّ باب التحريف، كقولِ عمر رضي الله عنه لمن أراد أن يَّصِل النافلة بالفريضة: بهذا هلك من قبلكم: فقال النبيُّ صلى الله عليه وسلم: ﴿أصاب اللهُ بك يا ابن الخطاب﴾

[٤] أو وجودُ حرجٍ، كقوله صلى الله عليه وسلم: ﴿أوَ لِكُلِّكُمْ ثوبان؟!﴾ وكقوله تعالى: ﴿عَلِمَ اللهُ أَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ أَنْفُسَكُمْ، فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ﴾

وبيّن في بعض المواضع أسرار الترهيب والترغيب، وراجعةُ الصحابةِ في المواضع المشتبهة، فكشف شُبهتهم، وردّ الأمر إلى أصله:

[۱] قال: ﴿صلوةُ الرجل في جماعةٍ تزيدُ على صلوته في بيته وصلوته في سوقه، خمسا وعشرين درجةً، وذلك: أن أحدكم إذا توضأ، فأحسن الوضوءَ، ثم أتى المسجدَ، لايريد إلا الصلوة﴾ الحديث.

[۲] وقال: ﴿في بُضع أحدكم صدقةٌ﴾ قالوا: يارسول الله! أيأتي أحدُنا شهوته، ويكون له فيها أجرٌ؟ قال: ﴿أرأيتم لو وَضَعَهَا في حرام، لكان عليه فيه وزرٌ؟ فكذلك إذا وضعها في حلال، كان له أجر﴾

[۳] وقال: ﴿إذا التقى المسلمان بسيفيهما، فالقاتلُ والمقتول كلاهما في النار﴾ قالوا: هذا القاتلُ، فما بال المقتول؟ قال: ﴿إنه كان حريصًا على قتل صاحبه﴾

إلى غير ذلك من المواضع التي يَعْسُرُ إحصاؤها.

وبيّن ابن عباس رضي الله عنهما سِرَّ مشروعية غسل الجمعة، وزيدُ بن ثابت سببَ النهي عن بيع الثمار قبل أن يبدُوَ صلاحُها، وبيّن ابن عمر سِرَّ الاقتصار على استلام ركنين من أركان البيت.

ثم لم يزل التابعون، ثم من بعدهم العلماءُ المجتهدون يعلّلون الأحكام بالمصالح، ويَفهمون معانيَها، ويُخرِّجُوْنَ للحكم المنصوص مناطًا مناسبًا، لِدَفْعِ ضررٍ، أو جلبِ نفعٍ، كما هو مبسوطٌ في كُتُبِهِم ومذاهبهم.

ثم أتى الغزاليُّ والخطابي وابنُ عبدالسلام وأمثالهم —— شكر الله مساعيَهم —— بِنُكَتٍ لطيفةٍ، وتحقيقاتٍ شريفةٍ.

آنحضرت ﷺ، صحابۂ کرام اور بعد کے حضرات ہمیشہ احکام کی مصلحتیں بیان کرتے رہے ہیں

ترجمہ: پھر آنحضرت ﷺ نے بعض مواقع میں تعیینِ اوقات کے رموز بیان فرمائے، مثلاً:

(۱) ظہر کے فرضوں سے پہلے چار سنتوں کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ: "یہ وہ گھڑی ہے جس میں آسمان کے دروازے کھولے جاتے ہیں۔ اس لئے مجھے یہ بات پسند ہے کہ اس گھڑی میں میرا کوئی نیک عمل اوپر جائے" (رواہ الترمذی مشکوٰۃ ۱۱۶۹)

(۲) اور آنحضرت ﷺ سے محرم کی دسویں تاریخ کے روزے کے بارے میں مروی ہے کہ اس کی مشروعیت کی وجہ یہ ہے کہ اس دن حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم کو فرعون سے نجات ملی تھی۔ اور ہمارے لئے اس کی مشروعیت کی وجہ سنتِ موسوی کی پیروی ہے۔ (متفق علیہ مشکوٰۃ حدیث ۲۰۶۷ باب صیام التطوع)

اور آنحضرت ﷺ نے بعض احکام کے اسباب بیان فرمائے (مثلاً)

(۱) نیند سے بیدار ہونے والے کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ: "وہ نہیں جانتا کہ اس کے ہاتھ نے کہاں رات گذاری ہے" (متفق علیہ مشکوٰۃ ۳۹۱ باب سنن الوضوء) یعنی نیند کی حالت میں اس کا ہاتھ کہاں کہاں پڑا یہ بات اسے معلوم نہیں لہٰذا تین بار ہاتھ دھوئے بغیر برتن میں نہ ڈالے۔

(۲) اور (سوکر اٹھنے کے بعد وضو کرتے وقت) ناک جھاڑنے کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ: "بیشک شیطان اس کے نتھنوں پر شب باشی کرتا ہے (متفق علیہ مشکوٰۃ ۳۹۲ باب سابق)

(۳) اور نیند کے (ناقضِ وضوء ہونے کے) بارے میں ارشاد فرمایا کہ: "جب آدمی پہلو کے بل لیٹتا ہے تو اس کے جوڑ ڈھیلے پڑ جاتے ہیں" (رواہ الترمذی و ابوداؤد مشکوٰۃ ۳۱۸ باب ما یوجب الوضوء)

(۴) اور (منیٰ میں حج کے موقعہ پر) رمی جمار کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ: "یہ عمل اللہ تعالیٰ کا ذکر برپا کرنے کے لئے ہے" (رواہ الترمذی والدارمی مشکوٰۃ ۲۶۲۴ باب رمی الجمار)

(۵) اور ارشاد فرمایا کہ: "کسی کے گھر میں داخل ہوتے وقت اجازت طلب کرنا نگاہ کی وجہ سے ہے (یعنی اجازت ملنے سے پہلے گھر میں نہیں جھانکنا چاہئے) (متفق علیہ بخاری شریف حدیث ۶۲۴۱ کتاب الاستئذان باب ۱۱ مسلم شریف ج ۱۴ ص ۱۳۷ مصری کتاب الآداب باب تحریم النظر فی بیت غیرہ)

(۶) اور بلی کے (جھوٹے کے) بارے میں ارشاد فرمایا کہ: "وہ ناپاک نہیں کیونکہ بلی ہر وقت گھر میں آنے جانے والے لوگوں میں سے یا جانوروں میں سے ہے" (رواہ مالک والترمذی وابوداؤد وغیرہم مشکوٰۃ ح ۴۸۲ باب المیاہ)

اور متعدد مواقع میں آنحضرت ﷺ نے بیان فرمایا کہ:

(۱) تعیین اوقات کے رموز یعنی یہ بات کہ فلاں وقت میں فلاں عمل کیوں تجویز کیا گیا ہے؟ اس میں کیا حکمت اور کیا راز ہے؟ مثلاً ظہر سے پہلے چار سنتیں کیوں ہیں؟ اور نبی آنحضور ﷺ زوال کے ساتھ ہی کیوں پڑھا کرتے تھے؟ محرم کی دس تاریخ کو روزہ کیوں رکھا جاتا ہے؟ وغیرہ۔

(۲) رمی جمار کا عمل اللہ کا ذکر برپا کرنے کے لئے ہے اس کا مشاہدہ موقعہ پر ہی کیا جا سکتا ہے۔ تین دن تک منی میں جمرات کے پاس ذکر الٰہی کا وہ زمزمہ بلند ہوتا ہے کہ بس دیکھنے ہی سے تعلق رکھتا ہے۔

(۳) من الطوافین علیکم او الطوافات کی روایت نسائی شریف (ج ۱ ص ۵۵ مصری) میں او کے بجائے واو کے ساتھ ہے اس لئے یہ او تنویع کا بھی ہو سکتا ہے اور ہر وقت گھر میں آنے جانے والے لوگوں سے مراد خدام نوکر چاکر اور غلام باندی ہیں۔ اور جانوروں سے مراد سواکن البیوت (گھر میں رہنے والے جانور وغیرہ) ہیں۔

(۴) ایام رضاعت میں ہمبستری کرنے کی ممانعت منسوخ ہے ورنہ حضرت جذامہ بنت وہب رضی اللہ عنہا کی روایت ہے کہ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی اناس، وھو یقول، لقد ھممت ان انھی عن الغیلۃ، فنظرت فی الروم والفارس، فاذاھم یغیلون اولادھم، فلایضر اولادھم ذلک شیئا (رواہ مسلم مشکوۃ ح ۳۱۸۹ باب المباشرۃ) حضرت جذامہ کہتی ہیں کہ میں چند لوگوں کے ساتھ بارگاہ رسالت میں حاضر ہوئی درانحالیکہ آپ فرما رہے تھے: "بخدا! میں نے ایام رضاعت میں شوہر سے ہمبستری کرنے سے منع کرنے کا ارادہ کیا تھا، پھر میں نے روم اور فارس کے احوال پر نظر ڈالی تو وہ ایام رضاعت میں ہمبستری کرتے ہیں اور یہ چیز ان کی اولاد کو ذرہ بھر نقصان نہیں پہنچاتی" — البتہ یہ ہمبستری علوق کا باعث ہو سکتی ہے اور بحالت حمل بچے کو دودھ پلانا مضر ہے مگر حمل کے بالکل ابتدائی دنوں میں مضر نہیں البتہ جب عورت کے دودھ میں تغیر آ جائے تو رضاعت موقوف کر دینی چاہئے۔

(۵) نماز باجماعت کی فضیلت والی روایت کا باقی حصہ یہ ہے: "تو وہ جو بھی قدم اٹھاتا ہے اس کی وجہ سے ایک درجہ بڑھتا ہے اور ایک گناہ معاف ہوتا ہے اور جب وہ نماز سے فارغ ہو جاتا ہے تو جب تک مسجد میں رہتا ہے برابر فرشتے اس کے لئے دعائیں کرتے رہتے ہیں: اے اللہ! اس پر بے پایاں رحمتیں نازل فرما! اے اللہ! اس پر مہربانی فرما! اور (اگر جلدی مسجد میں پہنچ جاتا ہے تو) جب تک وہ نماز کا انتظار کرتا ہے برابر نماز میں رہتا ہے" — غرض مسجد میں باجماعت نماز پڑھنے والے کو نماز کے علاوہ بھی متعدد فضیلتیں حاصل ہوتی ہیں۔ اس لئے یہ نماز تنہا پڑھی جانے والی نماز سے بڑھی ہوئی ہو جاتی ہے۔

(۶) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے غسل جمعہ کی مشروعیت کی وجہ یہ بیان فرمائی ہے کہ ابتدا میں لوگ اپنے کام خود کرتے تھے، اون کا لباس پہنتے تھے، پیٹھ پر بوجھ ڈھوتے تھے، مسجد تنگ تھی، چھت نیچی تھی گویا چھپر نما تھا۔ گرمی کے ایک دن میں آنحضرت ﷺ نماز جمعہ پڑھانے تشریف لائے تو دیکھا کہ پسینہ کی بدبو پھیل رہی ہے اور لوگ اذیت

میں ہیں تو آپ نے فرمایا کہ: ''جب یہ دن آئے تو نہاؤ اور گھر میں جو عمدہ تیل خوشبو ہو وہ لگاؤ (پھر نماز کے لئے آؤ) — ابن عباسؓ فرماتے ہیں: پھر اللہ تعالیٰ نے فضل فرمایا، لباس بدل گیا، کام کاج نوکر چاکر کرنے لگے اور مسجد بھی کشادہ ہوگئی اور وہ حالت ختم ہوگئی جس سے لوگوں کو تکلیف پہنچتی تھی (لہٰذا اب جمعہ کے دن غسل لازم نہیں)

(۷) حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے بُدُوِّ صلاح سے پہلے پھلوں کی فروختگی کی ممانعت کی وجہ یہ بیان فرمائی ہے کہ دورِ نبوی میں لوگ کھجور کے باغوں کے سودے کرتے تھے پھر جب کھجوریں اترتیں تو باغ کا مالک رقم طلب کرتا۔ خریدار عذر کرتا کہ پھلوں میں فلاں فلاں بیماریاں آگئی تھیں، باغ والا کہتا کہ میں کیا جانوں؟ پھر فریقین جھگڑا لیکر دربارِ نبوی میں فیصلہ کے لئے آتے تھے۔ جب اس قسم کے جھگڑے بہت ہونے لگے تو آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ: ''جب تم جھگڑوں سے باز نہیں آتے تو پھل کار آمد ہونے سے پہلے مت بیچو'' یہ رشد (ایک مشورہ) تھا جو آپؐ نے لوگوں کو دیا تھا (کوئی حکم شرعی نہیں تھا)

(۸) حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے کعبہ کے دو کونوں (رکن اسود اور رکن یمانی) کے استلام پر اکتفا کرنے کی وجہ یہ بیان فرمائی ہے کہ یہی دو کونے ابراہیمی اصل بنیادوں پر ہیں۔ شامی طرف کے دو کونے اپنی اصل بنیادوں پر نہیں ہیں کیونکہ حطیم کی جانب سے کعبہ شریف کا کچھ حصہ قریش نے باہر کر دیا ہے۔

(۹) قولہ: لنفع ضرّ الخ یہ عبارت تمام مطبوعہ اور مخطوطہ نسخوں میں اسی طرح ہے اور جار مجرور بتاویل مصدر متعلق ہیں۔ اور عبارت کا مطلب یہ ہے کہ مجتہدین کرام اور علمائے عظام قرآن وحدیث میں جو مصرّح احکام ہیں ان کی دفعِ مضرت کی غرض سے یا جلبِ منفعت کے مقصد سے ایسی علتیں نکالتے ہیں، جو نص میں مذکور حکم کے مناسب حال ہوتی ہیں۔

(۱۰) حجۃ الاسلام محمد بن محمد غزالی رحمہ اللہ (ولادت ۴۵۰ھ وفات ۵۰۵ھ) پانچویں صدی کے مشہور عالم ہیں، تقریباً دوسو کتابوں کے مصنف ہیں۔ مشہور کتابیں یہ ہیں (۱) إحیاء علوم الدین (۲) المستصفی من علم الأصول (۳) المنخول من علم الأصول (۴) تھافۃ الفلاسفۃ (۵) مقاصد الفلاسفۃ. اور غزالی زاء کی تشدید کے ساتھ اور تخفیف کے ساتھ دونوں طرح درست ہے۔ اول صناعۃ الغزل (اون کی کتائی) کی طرف نسبت ہے اور ثانی غزالۃ بستی کی طرف نسبت ہے جو طوس کے مضافات میں ہے۔

(۱۱) ابوسلیمان حمد بن محمد خطابی بُستی (ولادت ۳۱۹ھ وفات ۳۸۸ھ) چوتھی صدی کے مشہور محقق محدث ہیں، بُست علاقہ کابل میں ہے۔ آپ کے جد امجد زید بن خطاب (برادر عمر بن خطاب) ہیں۔ آپ کی مشہور تصنیف معالم السنن شرح ابو داؤد ہے۔ علاوہ ازیں بیان اعجاز القرآن اور اصلاح غلط المحدثین وغیرہ متعدد کتابوں کے مصنف ہیں۔ آپ امام ابو داؤد رحمہ اللہ کے ایک واسطہ سے شاگرد ہیں۔

(۱۲) علامہ عز الدین عبد العزیز بن عبد السلام (ولادت ۵۷۷ھ وفات ۶۶۰ھ) ساتویں صدی کے بڑے محقق عالم

ہیں، سلطان العلماء کے لقب سے ملقب تھے، دمشق (شام) کے باشندے تھے آپ کی مشہور کتابیں یہ ہیں (۱) الامام فی ادلۃ الاحکام (۲) قواعد الشریعۃ (۳) قواعد الاحکام فی اصلاح الانام۔

☆ ☆ ☆

اعمال کا حُسن وقُبح نہ محض عقلی ہے نہ شرعی بلکہ بین بین ہے

لغت میں حُسن کے معنی ہیں: خوبی، اچھائی اور عمدگی ——— اور قُبح کے معنی ہیں برائی اور خرابی ——— اور اصطلاح میں تین معنی ہیں:

(۱) صفت کمال اور صفت نقصان ——— یعنی جن امور میں کمال اور خوبی ہے وہ حسن ہیں اور جن میں نقصان اور خرابی ہے وہ قبیح ہیں۔ مثلاً "سچ" حسن ہے کیونکہ اس میں خوبی ہے اور "جھوٹ" قبیح ہے کیونکہ اس میں خرابی ہے۔ جیسی مثال شکر اور زہر ہے۔

(۲) دنیوی مقاصد سے ہم آہنگ ہونا نہ ہونا یا کسی چیز کا نفع بخش یا ضرر رساں ہونا ——— یعنی جو کام دنیوی اغراض سے میل کھاتے ہیں وہ حسن ہیں اور جو ضرر رساں ہیں وہ قبیح ہیں مثلاً ظالم حاکم کی موافقت یعنی اس کی ہاں میں ہاں ملانا دنیوی فوائد کے لحاظ سے اچھا سمجھا جاتا ہے اور اس کی مخالفت کو ضرر رساں خیال کیا جاتا ہے اس لئے مفاد پرست اول کو اختیار کرتے ہیں اور ثانی سے بچتے ہیں۔

(۳) ثواب وعقاب کا حقدار بنانا ——— یعنی جن اعمال سے اللہ تعالیٰ خوش ہوتے ہیں اور آخرت میں ان اعمال پر ثواب کا استحقاق پیدا ہوتا ہے وہ اعمال حسنہ ہیں اور جن کاموں سے اللہ تعالیٰ ناخوش ہوتے ہیں اور آخرت میں ان پر سزا ملتی ہے وہ اعمال قبیحہ ہیں۔ مثلاً نماز اللہ کے نزدیک پسندیدہ عمل ہے اور باعث اجر ہے اس لئے عمل حسن ہے اور زنا چوری وغیرہ اللہ کے نزدیک مبغوض اعمال ہیں اور آخرت میں ان پر سزا دی جائے گی اس لئے یہ اعمال قبیحہ ہیں۔ اسی طرح بکری اور خنزیر کھانے میں فرق ہے۔

اس کے بعد جاننا چاہئے کہ تمام اسلامی فرقے متفق ہیں کہ پہلے دو معنی کے اعتبار سے اعمال کا حسن وقبح عقلی ہے یعنی عقل بذات خود ان اعمال کی خوبی اور خرابی کا ادراک کرسکتی ہے نزول شرع پر یہ چیز موقوف نہیں۔ البتہ تیسرے معنی کے اعتبار سے فرق اسلامیہ میں اختلاف ہے۔

اشاعرہ کہتے ہیں کہ اعمال کا حسن وقبح محض شرعی ہے یعنی شریعت نے جن کاموں کے کرنے کا حکم دیا ہے وہ اعمال حسنہ ہیں اور جن کاموں سے روکا ہے وہ اعمال قبیحہ ہیں اور یہ حسن وقبح شریعت کے امر ونہی سے پیدا ہوا ہے، ورنہ اعمال

فی نفسہ نہ حسن ہیں نہ قبیح۔ مثلاً شارع نے نماز کا امر فرمایا تو نماز حسن ہوگئی اور زنا سے روکا تو وہ فعل قبیح ہوگیا۔ ورنہ ایجاب وتحریم سے پہلے نماز اور زنا یکساں تھے یعنی نہ ان میں حسن تھا نہ قبح، نہ ان کی وجہ سے ثواب کا استحقاق پیدا ہوتا تھا نہ عقاب کا۔ اگر بالفرض شریعت بالعکس معاملہ کرتی تو زنا فعل حسن ہوتا اور نماز امر قبیح۔

ماتریدیہ: کہتے ہیں کہ اعمال میں حسن وقبح من وجہ عقلی ہے اور من وجہ شرعی یعنی ورود شرع سے پہلے اعمال میں اپنی وضع کے اعتبار سے حسن وقبح موجود ہوتا ہے مگر وہ فطری حسن وقبح ثواب وعقاب کا حقدار نہیں بناتا، بلکہ نزول شرع کی وجہ سے اعمال موجب ثواب وعقاب بنتے ہیں۔ نزول شرع سے پہلے اگر کوئی ان کاموں کو کرے گا تو نہ ثواب کا حقدار ہوگا نہ عقاب کا، امر ونہی کے ذریعہ ہی استحقاق ثواب وعقاب پیدا ہوتا ہے۔ مگر امر ونہی ان اعمال میں کوئی حسن وقبح پیدا نہیں کرتے بلکہ شریعت نازل ہوکر فطری خوبی وخرابی کو ظاہر کرتی ہے غرض شریعت فطری اور عقلی حسن پر مدار رکھ کر بعض اعمال کا حکم دیتی ہے تو وہ اعمال ثواب اور رضائے خداوندی کا استحقاق پیدا کرتے ہیں، اسی طرح فطری اور عقلی خرابی پر مدار رکھ کر شریعت بعض اعمال سے روکتی ہے تو وہ سزا اور غضب خداوندی کا سزاوار بناتے ہیں اور اس اعتبار سے اعمال کا حسن وقبح شرعی ہے۔

اور یہ ضروری نہیں کہ شریعت تمام اعمال حسنہ کا امر فرمائے اور تمام اعمال قبیحہ کی نہی فرمائے، اللہ تعالیٰ قادر مطلق ہیں، وہ کسی چیز کے پابند نہیں، جس چیز کے بارے میں چاہتے ہیں امر فرماتے ہیں، اور جس کے بارے میں چاہتے ہیں اس سے روک دیتے ہیں مگر اللہ تعالیٰ حکم بہر حال انہی کاموں کا دیتے ہیں جو فطری طور پر حسن ہیں اور ممانعت انہی اعمال کی فرماتے ہیں جو اپنی وضع میں قبیح ہیں۔ یہ ہرگز نہیں ہوسکتا کہ اللہ تعالیٰ اعمال قبیحہ کا حکم دیدیں یا اعمال حسنہ سے روک دیں جن کاموں کا وہ حکم دیں گے وہ لامحالہ حسن ہوں گے، اور جن باتوں سے وہ روکیں گے وہ قبیح ہوں گی۔

معتزلہ، امامیہ اور کرامیہ: کہتے ہیں کہ اعمال میں حسن وقبح محض عقلی ہے، یعنی ورود شرع سے پہلے ہی سے اعمال میں حسن وقبح موجود ہوتا ہے اور حاکم بد ہی! اللہ تعالیٰ پر لازم ہے کہ ہر اچھے کام کا حکم دیں اور ہر قبیح امر سے روکیں۔ اور شریعت خواہ نازل ہو یا نہ ہو ایمان، نماز وغیرہ اعمال صالحہ موجب اجر وثواب ہیں اور کفر، زنا وغیرہ اعمال قبیحہ سبب عقاب وموجب دخول نار ہیں، شریعت کا کام عقلی حسن وقبح سے پردہ اٹھانا ہے جیسے حکیم طب کی کتاب میں جو خواص ادویہ بیان کرتا ہے وہ اپنے بیان کے ذریعہ اشیاء میں خواص پیدا نہیں کرتا بلکہ فطری خواص کو ظاہر کرتا ہے یہی حال شریعت کا ہے۔ شریعت نازل ہوکر نہ اشیاء میں حسن وقبح پیدا کرتی ہے نہ ثواب وعقاب کا حقدار بناتی ہے۔ بلکہ اگر شریعت نازل نہ بھی ہو تب بھی عقل احکام ثابت کرنے کے لئے کافی ہے۔

علامہ محب اللہ بہاری (متوفی ۱۱۱۹ھ) نے مسلم الثبوت، مقالہ ثانیہ کے شروع میں ص ۱۴ میں یہ مذاہب قدرے بہت اختصار کے ساتھ بیان کئے ہیں شائقین وہاں ملاحظہ فرماسکتے ہیں۔

حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ معتزلہ کے خیال کی تردید کرتے ہیں کہ ان کا قول قطعاً باطل ہے، شریعت کا نزول ہوا

جب ہے ثواب وعقاب کا استحقاق پیدا کرنے کے لئے، مدار احکام فطری حسن وقبح پر نہیں۔ اور ان کے قول کے بطلان کی دلیل نقلی دو حدیثیں ہیں۔

پہلی حدیث: تراویح کے معاملہ میں دو دن با جماعت نماز پڑھانے کے بعد، جب آپ ﷺ نے لوگوں کی بڑھتی ہوئی رغبت دیکھی تو تیسرے دن تشریف نہیں لائے اور ارشاد فرمایا کہ "مجھے اندیشہ ہوا کہ کہیں یہ نماز تم پر فرض نہ کردی جائے" غور کیجئے! اگر تراویح میں حسن ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس کو فرض کیا جانا چاہئے تو بقول معتزلہ اللہ تعالیٰ پر لازم ہے کہ اس کی فرضیت نازل فرمائیں، خواہ لوگوں میں دلچسپی پائی جائے یا نہ پائی جائے۔ اس صورت میں شریعت اس کو فرض نہ کرے ایسا نہیں ہوسکتا۔ اور اگر تراویح میں اس درجہ کی خوبی نہیں تو شریعت اس کو فرض کرہی نہیں سکتی، خواہ لوگوں میں کتنی ہی رغبت پائی جائے۔ حالانکہ حدیث شریف سے یہ بات صاف معلوم ہوتی ہے کہ شریعت تراویح کی فرضیت نازل کربھی سکتی ہے اور نہیں بھی کرسکتی۔ تراویح کا فطری حسن کسی ایک بات کا لازمی تقاضا نہیں کرتا۔

دوسری حدیث: یہ ہے کہ "مسلمانوں کے حق میں سب سے بڑا مجرم وہ مسلمان ہے جو کسی ایسی چیز کے بارے میں دریافت کرے جو حرام نہیں کی گئی، پھر وہ اس کے سوال کرنے کی وجہ سے حرام کردی گئی" سوچیں! معتزلہ کے مذہب پر یہ بات کیوں کر درست ہوسکتی ہے؟ اگر اس چیز میں اس درجہ خرابی ہے کہ اس کو حرام ہونا چاہئے تو اللہ تعالیٰ پر لازم ہے کہ وہ اس کو حرام کریں، خواہ کوئی دریافت کرے یا نہ کرے۔ اور اگر وہ چیز اس درجہ قبیح نہیں تو سوال سے کیا ہوتا ہے؟ شریعت اس کو حرام نہیں کرسکتی۔ حالانکہ حدیث شریف سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ سوال کا نزول تحریم میں دخل ہے، معلوم ہوا کہ مدار احکام عقلی حسن وقبح پر نہیں۔

اور معتزلہ کے قول کے بطلان کی دلیل عقلی میں بھی دو باتیں بیان فرمائی ہیں۔

پہلی بات: شدید گرم موسم میں، ماہِ رمضان المبارک میں ایک شخص A.C. میں سفر کرتا ہے اور دوسرا چلچلاتی دھوپ میں کھیت میں ہل چلاتا ہے یا اور کوئی پر مشقت کام کرتا ہے تو عقل کا فیصلہ یہ ہے کہ اول کو روزہ نہ رکھنے کی سہولت نہ ملنی چاہئے کیونکہ سفر میں اسے کوئی پریشانی نہیں اور ثانی کو رخصت ملنی چاہئے، کیونکہ اس کے لئے اس مشقت کے ساتھ روزہ رکھنا سخت دشوار ہے۔ حالانکہ مسئلہ اس کے برعکس ہے مسافر کے لئے رخصت ہے اور مقیم کے لئے نہیں، خواہ اسے کیسی ہی مشقت لاحق ہو معلوم ہوا کہ احکام کا مدار محض عقلی حسن وقبح پر نہیں۔

دوسری بات: حدود کو لیجئے، ایک شخص صرف پانچ سو روپے کی چوری کرتا ہے اس کا معاملہ قاضی کے سامنے پہنچ جاتا ہے اور چوری ثابت ہوجاتی ہے تو اس کا ہاتھ ضرور کاٹا جائے گا، صاحب مال بھی اس کو معاف نہیں کرسکتے کیونکہ یہ حد کا معاملہ ہے اور دوسرا شخص کسی کو عمداً قتل کرتا ہے اور قاضی کے پاس اس کا قتل ثابت ہوجاتا ہے تو بھی مقتول کے ورثاء قصاص معاف کرسکتے ہیں۔ کیونکہ وہ حد نہیں، جبکہ پانچ سو روپے کی چوری کا معاملہ اتنا سنگین نہیں، جتنا قتل عمد کا معاملہ

اور نافرمان کے عذاب کے لئے اور یہ (بھی ثابت کیا ہے) کہ صورت حال وہ نہیں ہے جو سمجھی گئی ہے کہ اعمال کی خوبی اور خرابی محض عمل کرنے والے کو ثواب یا عذاب کا حقدار بناتی ہو بہر حال عقلی ہے اور شریعت کا کام اعمال کی خصوصیات کے بارے میں، جیسی کہ وہ نفس الامر میں ہیں، خبر دینا ہے۔ ایجاب و تحریم کو پیدا کرنا اس کا کام نہیں، مثلاً حکیم دواؤں کی خصوصیت اور بیماریوں کی انواع بیان کرتا ہے (پیدا نہیں کرتا) غرض یہ خیال قطعاً باطل ہے، احادیث شریفہ اس کو ابتدا ہی میں بالکل مسترد کر دیتی ہیں۔

کیونکر (یہ گمان درست ہو سکتا ہے؟) جبکہ آنحضرت ﷺ نے تراویح کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے کہ: "یہاں تک کہ مجھے اندیشہ ہوا کہ یہ نماز تم پر فرض کی جائے گی" (متفق علیہ مشکوٰۃ ۱۲۹۵ باب قیام شہر رمضان) اور ارشاد فرمایا کہ: "مسلمانوں میں مسلمانوں کے حق میں سب سے بڑا مجرم وہ شخص ہے جس نے کسی ایسی چیز کے بارے میں سوال کیا جو لوگوں پر حرام نہیں کی گئی تھی پھر اس کے سوال کی وجہ سے وہ حرام کر دی گئی" (متفق علیہ مشکوٰۃ ۱۵۴ باب الاعتصام) اور دیگر بہت سی احادیث۔

کیونکر (یہ گمان درست ہو سکتا ہے؟) اگر معاملہ ایسا ہوتا جیسا گمان کیا گیا ہے تو اس حکیم کے لئے رمضان میں روزہ نہ رکھنا جائز ہوتا جو مسافر کی طرح مشقت برداشت کرتا ہے اس تنگی کی بنا پر جس پر رخصتوں کا مدار ہے اور تجارت سے سفر کرنے والے مسافر کے لئے افطار جائز نہ ہوتا اور اسی طرح تمام حدود شرعیہ (کا حال ہوتا) جو شارع نے مقرر کی ہیں۔

لغات:

أوجب الشيئ: واجب کرنا، ثابت کرنا　　وظيفة: مقرر کام، متعین عمل　　مجّ الشيئ: تھوکنا، منہ سے پھینک دینا، الگ کر دینا اور بطور استعارہ کہا جاتا ہے: هذا كلام تمجّه الأسماع: یہ ایسا کلام ہے جس کو کان سننا نہیں چاہتے　　بادي الرأي: سرسری رائے، جس میں زیادہ غور و فکر نہ کیا گیا ہو　　مسئلة حاصل مصدر بمعنی سوال و درخواست ہے۔

☆　☆　☆

احکام پر عمل پیرا ہونا حکمتوں کے جاننے پر موقوف نہیں

یہاں یہ بات بھی جان لینی چاہئے کہ احکام شرعیہ پر عمل کرنا حکمتیں اور مصلحتیں جاننے پر موقوف نہیں، اگرچہ احکام میں حِکَم، علل اور حسن و قبح ملحوظ ہوتا ہے مگر امتثال ان حسن و قبح کے جاننے پر موقوف نہیں، البتہ اس کی تحقیق ضروری ہے کہ وہ حکم قرآن و حدیث سے صراحۃً یا استنباطاً ثابت ہے یا نہیں؟ سورۃ الفرقان آیت ۵۹ میں ﴿ ... الرحمٰن ﴾ (اللہ

کے مخصوص بندوں) کی ایک صفت یہ بیان کی گئی ہے کہ جب ان کو ان کے رب کی باتیں سمجھائی جاتی ہیں تو وہ ان پر بہرے اندھے ہو کر نہیں گرتے۔ اس لئے احکام دین کا صرف مطالعہ یا غیر معتبر لوگوں سے سن لینا کافی نہیں، بلکہ پوری تحقیق کر کے اس پر عمل کرنا ضروری ہے۔ مگر جب حکم کی تحقیق ہو جائے تو اس پر عمل درآمد میں دیر بھی نہیں ہونی چاہئے۔
آج کل یورپ وامریکہ میں عام طور پر اور ہمارے ملک میں انگریزی تعلیم یافتہ حضرات میں خاص طور پر جو ذہنیت پائی جارہی ہے کہ حکم کی حکمت معلوم ہوگی، وہ اس پر ذہن مطمئن ہوگا تب عمل کرنے کے لئے سوچیں گے، یہ غیر دینی مزاج ہے۔ کیونکہ احکام شرعیہ کے کل مصالح اور ذاتی حسن وقبح ہر انسان نہیں سمجھ سکتا۔ اسی وجہ سے ہمیشہ یہ علم (اسرار الدین) نا اہلوں کو دینے میں ہچکچاہٹ محسوس کی گئی ہے اور ہر کس وناکس کے سامنے احکام کی حکمتیں اور علتیں بیان کرنے میں تذبذب ہوتا ہے کہ معلوم نہیں وہ بات سمجھ سکے گا یا نہیں۔
بلکہ یہ علم اتنا دقیق ہے کہ اس کو پڑھانے کے لئے اور اس موضوع پر کتاب لکھنے کے لئے وہ تمام شرائط ہیں جو علم تفسیر کے لئے ہیں اور وہ علوم ضروری ہیں جو علم تفسیر کے لئے ضروری ہیں۔ اور جس طرح تفسیر بالرائے حرام ہے اسی طرح اس علم میں دلائل قرآنی کے بغیر اور آثار صحابہ وتابعین کے بغیر غور وفکر کرنا بھی حرام ہے۔
علاوہ ازیں مصالح وحکم کو جان کر عمل کرنا کوئی مضبوط بات نہیں، جبکہ اللہ ورسول کا حکم سمجھ کر عمل کرنا ہے۔ مومن کا اعتماد عقل پر نہیں ہوتا، اللہ ورسول کے حکم پر ہوتا ہے۔ عقل تو قدم قدم پر ٹھوکریں کھاتی ہے اور اللہ کے رسول اللہ کے رسول ہیں، پس جب کوئی حکم رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہوگیا تو اب مومن کو کسی اور دلیل کی حاجت نہیں۔

[الامتثالُ لایتوقّفُ علی معرفۃ المصالح]

وأوجبتْ أيضًا: أنه لا يجوزُ أن يتوقّفَ في امتثالِ أحكامِ الشرعِ — إذا صحّتْ بها الروايةُ — على معرفةِ تلك المصالحِ، لعدمِ استقلالِ عقولِ كثيرٍ من الناسِ في معرفةِ كثيرٍ من المصالحِ، ولكونِ النبيِّ صلى الله عليه وسلم أوثقَ عندنا من عقولِنا، ولذلك لم يزلْ هذا العلمُ مضنونًا به على غيرِ أهلِه، ويشترطُ له ما يشترطُ في تفسيرِ كتابِ الله، ويحرُمُ الخوضُ فيه بالرأيِ الخالصِ، غيرِ المستندِ إلى السننِ والآثارِ.

ترجمہ: احکام پر عمل حکمتوں کے جاننے پر موقوف نہیں: اور احادیث نے یہ بات بھی ثابت کی ہے کہ احکام شرعیہ پر عمل کرنے میں — جبکہ وہ صحیح روایت سے ثابت ہو جائیں — ان کی مصلحتوں کے جاننے تک توقف کرنا جائز نہیں، کیونکہ بہت سے انسانوں کی عقلیں بہت سی حکمتوں کو بطور خود نہیں سمجھ سکتیں اور نبی کریم ﷺ کی ذات ہمارے

نزدیک ہماری عقلوں سے کہیں زیادہ قابل اعتماد ہے اور اسی وجہ سے ہمیشہ یہ علم (اسرار الدین) لااہلوں کو دینے میں بخیلی کی گئی اور اس کے لئے وہ شرائط ہیں جو کتاب اللہ کی تفسیر کے لئے ہیں اور اس علم میں محض اپنی رائے سے جو احادیث اور صحابہ وتابعین کے ارشادات سے مؤید نہ ہو، غور وخوض کرنا حرام ہے۔

لغات: استقلّ برأیہ: رائے میں منفرد ہونا، اکیلا ہونا، کسی کو شریک نہ کرنا۔ ضنّ بالشیئ: بخل کرنا۔ مضنون بہ (اسم مفعول) وہ چیز جس کے دینے میں بخیلی کی جائے۔

نوٹ: تفسیر کے لئے پندرہ علوم ضروری ہیں۔ جن کا بیان سیوطی رحمہ اللہ کی الاتقان فی علوم القرآن میں ہے۔ اور روح المعانی کے مقدمہ میں بھی ہے اور اس میں بعض چیزوں کے ضروری ہونے پر نقد بھی ہے۔

☆ ☆ ☆

تکلیف شرعی کی صحیح مثال

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو جو احکام شرعیہ کا مکلف بنایا ہے معتزلہ نے پہلے اس کی یہ مثال دی ہے کہ "ایک آقا نے اپنے غلام کی فرماں برداری کا امتحان کرنے کے لئے، اس کو کسی پتھر کے اٹھانے کا حکم دیا، جس میں امتحان کے علاوہ کوئی فائدہ نہیں، پھر جب غلام نے فرماں برداری کی یا نافرمانی کی تو آقا نے اس کو اس کے عمل کے مطابق بدلہ دیا"

یہ مثال معتزلہ نے اپنے اس دعوے کی دی ہے کہ (۱) احکام شرعیہ میں مصالح ملحوظ نہیں (۲) اور اعمال اور ان کی جزا کے درمیان کچھ بھی مناسبت نہیں —— معتزلہ کی یہ مثال صحیح نہیں، بلکہ تکلیف شرعی کی صحیح مثال یہ ہے کہ ایک آقا کے غلام بیمار پڑے، کسی وبا کا شکار ہوگئے تو آقا نے ایک ڈاکٹر مقرر کیا جو ان کی دوا دارو کرے، پس جو غلام ڈاکٹر کی بات مانے گا اور دوا پئے گا وہ درحقیقت آقا کی بات مانے گا اور شفایاب ہوگا اور آقا اس سے خوش ہوگا اور جو غلام ڈاکٹر کی بات نہیں مانے گا اور دوا پینے سے انکار کرے گا وہ درحقیقت آقا کی نافرمانی کرے گا اور بیماری میں سڑے گا، اور آقا کی ناراضگی مول لے گا۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے بیمار انسانوں کے معالجے کے لئے انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کو مبعوث فرمایا اور ان کے ذریعہ نسخۂ شفا بھیجا۔ اب جو لوگ انبیاء کی اطاعت کریں گے اور نسخۂ شفا استعمال کریں گے وہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کی اطاعت کریں گے اور شفایاب ہوں گے اور ان کا مولیٰ ان سے راضی ہوگا اور دارین میں ان کو بہترین صلہ عطا فرمائے گا، اور جو انبیاء کی نہیں سنے گا وہ دنیا میں بھی تباہ ہوگا اور اس کا مولیٰ اس سے ناخوش ہوگا اور وہ آخرت میں جہنم کا ایندھن بنے گا۔

غرض اللہ تعالیٰ نے نبیوں کے ذریعہ جو احکام بھیجے ہیں وہ بے فائدہ نہیں، بلکہ لوگوں کے لئے ان میں عظیم فوائد ہیں اور معتزلہ کی مثال غلط اس لئے ہے کہ وہ بے دلیل ہے، وہ محض ان کی ذہنی اُپَج ہے اور شاہ صاحب نے جو مثال دی ہے

وہ درج ذیل روایات سے مستفاد ہے۔

پہلی روایت: فرشتوں نے آنحضور ﷺ کی ایک مثال بیان فرمائی ہے کہ ایک شخص نے ایک شاندار حویلی بنائی اور اس کے افتتاح میں ایک پرتکلف دعوت کا انتظام کیا، پھر لوگوں کو دعوت دینے کے لئے ایک شخص کو بھیجا، پس جو شخص داعی کی بات مان کر دعوت میں آئے گا وہ مزے دار کھانا کھائے گا اور مالک اس سے خوش ہوگا کہ اس نے اس کی خوشی میں شرکت کی۔ اور جو داعی کی بات قبول نہیں کرے گا اور دعوت میں حاضر نہ ہوگا وہ محروم رہے گا اور جب صاحب خانہ کو پتہ چلے گا کہ فلاں شخص نے افتتاح میں شرکت کی دعوت قبول نہیں کی تو اس کی طرف سے اس کا دل میلا ہوگا۔

اسی طرح اللہ پاک نے ایک حویلی بنائی ہے اور وہ جنت ہے اور اس کی نعمتیں خوان یغما ہیں اور داعی رسول اللہ ﷺ ہیں، پس جو آپ کی دعوت قبول کرے گا اور جنت میں پہنچے گا وہ اس کی سدا بہار نعمتوں سے لطف اندوز ہوگا اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی مزید برآں ہوگی۔ اور جو داعی کی بات رد کرے گا اور حویلی تک نہیں پہنچے گا، وہ نہ صرف یہ کہ جنت کی نعمتوں سے محروم رہے گا بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کی ناراضگی بھی مول لے گا اور اس کی پاداش بھگتے گا۔

اس حدیث میں غور کیا جائے تو صاف معلوم ہوگا کہ معتزلہ کی دی ہوئی مثال قطعاً درست نہیں، تکلیف شرعی بے فائدہ ہرگز نہیں، بلکہ اس میں انسانوں کے لئے بے شمار فوائد ہیں۔

دوسری روایت: خود آنحضور ﷺ نے اپنی اور اپنے لائے ہوئے دین کی یہ مثال بیان فرمائی ہے کہ ایک شخص تمام کو دشمن کے خطرہ کی وارننگ دیتا ہے، پس جو لوگ یہ خبر سن کر اپنی جگہ سے ہٹ جائیں گے وہ بال بال بچ جائیں گے اور جو لوگ اس خبر پر کان نہیں دھریں گے وہ تباہ ہو جائیں گے۔ اسی طرح جو لوگ نبیوں کی بات سنیں گے وہ نجات پائیں گے اور جو جھٹلائیں گے وہ جہنم رسید ہوں گے۔ اس حدیث سے بھی صاف معلوم ہوا کہ شاہ صاحب کی مثال صحیح ہے اور معتزلہ کا خیال اور ان کی مثال غلط ہے۔

تیسری روایت: آگے باب کی روشنی تفصیل سے آرہی ہے کہ لوگوں پر دنیا میں جو آلام، بلائیں، نعمتیں اور مصیبتیں آتی ہیں ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ”وہ تمہارے اعمال ہیں جو تمہاری طرف پھیرے جاتے ہیں“ اس حدیث سے بھی یہ بات صاف معلوم ہوتی ہے کہ اعمال اور ان کے بدلے کے درمیان گہرا ربط ہے، کیونکہ اعمال سیئہ پر جو سزائیں ملتی ہیں وہ یونہی الل ٹپ نہیں ملتیں بلکہ ان میں گہری مناسبت ہوتی ہے۔ یہی حال اعمال صالحہ اور ان کی برکات کا ہے۔

[المثال الصحيح للتكليف الشرعي]

وظهر مما ذكرنا أن الحقّ في التكليف بالشرائع: أن مَثَلَهُ كمثل سيّدٍ مَرِضَ عبيدُه، فسلّط

عليهم رجلا من خاصته، ليسقيهم دواءً، فإن أطاعوا له أطاعوا السيّد، ورضي عنهم سيدهم، وأثابهم خيرا، ونجوا من المرض؛ وإن عصوه عصوا السيد، وأحاط بهم غضبه، وجازاهم أسوأ الجزاء، وهلكوا من المرض؛ وإلى ذلك أشار النبي صلى الله عليه وسلم حيث قال راويا عن الملائكة: ﴿إن مثله كمثل رجل بنى دارا، وجعل فيها مأدبة، وبعث داعيا، فمن أجاب الداعي دخل الدار، وأكل من المأدبة؛ ومن لم يُجب الداعي لم يدخل الدار، ولم يأكل من المأدبة﴾

وحيث قال: ﴿إنما مثلي ومثلُ ما بعثني الله به، كمثل رجلٍ أتى قوما، فقال: ياقوم! إني رأيت الجيش بعينيّ، وإني أنا النذير العُريان، فالنجاءَ! النجاءَ! فأطاعه طائفة من قومه، فأدلجوا، فانطلقوا على مهلهم، فنجوا؛ وكذّبت طائفة منهم، فأصبحوا مكانهم، فصبّحهم الجيش، فأهلكهم، واجتاحهم﴾ وقال راويا عن ربه: ﴿إنما هي أعمالكم تُرَدُّ عليكم﴾

ترجمہ: تکلیف شرعی کی صحیح مثال: مذکورہ بالا کلام سے یہ امر واضح ہو کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو جو احکام شرعیہ کا مکلف بنایا ہے تو اس کی مثال بالکل اس آقا جیسی ہے جس کے بہت سے غلام بیمار پڑے ہوں پس آقا نے ان پر اپنے مخصوص لوگوں میں سے ایک آدمی کو مقرر کیا تاکہ وہ ان کو دوا پلائے، اب اگر غلام اس شخص کی بات مانیں گے تو وہ آقا کے فرماں بردار شمار ہوں گے اور آقا ان سے خوش ہوگا، اور ان کو اچھا بدلہ دے گا اور وہ بیماری سے نجات پائیں گے۔ اور اگر غلام اس آدمی کی بات نہیں مانیں گے تو وہ آقا کے نافرمان شمار ہوں گے اور آقا کی ناراضگی ان کو گھیر لے گی اور وہ ان کو نہایت سخت سزا دے گا اور وہ بیماری سے ہلاک ہو جائیں گے اور اس مثال کی طرف آنحضور ﷺ نے اشارہ فرمایا ہے، چنانچہ آپؐ نے فرشتوں کی بات نقل کرتے ہوئے فرمایا کہ: "آپ ﷺ کی مثال اس آدمی جیسی ہے جس نے کوئی مکان تعمیر کیا اور اس میں ضیافت کا انتظام کیا اور دعوت دینے والے کو بھیجا، پس جس نے داعی کی بات پر لبیک کہا وہ گھر میں آیا اور دسترخوان سے کھایا اور جس نے داعی کی بات پر لبیک نہ کہا وہ نہ گھر میں آیا نہ دسترخوان سے کھایا" (متفق علیہ، مشکوۃ ج ۱/۲۴۴ باب الاعتصام الخ)

(اور ایک اور ارشاد میں بھی آپؐ نے اس مثال کی طرف اشارہ فرمایا ہے) چنانچہ آپؐ نے فرمایا کہ: "میری اور اس دین کی مثال جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے مجھے مبعوث فرمایا ہے اس شخص جیسی ہے جو کسی قوم کے پاس آیا اور کہا: اے میری قوم! میں نے دشمن کا ایک لشکر اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور میں ننگا ڈرانے والا (یعنی بڑے خطرے سے صاف آگاہ کرنے والا) ہوں، بچو، بچو! پس قوم میں سے ایک گروہ نے اس کی بات مانی چنانچہ وہ شروع رات ہی میں نکل پڑے اور آہستہ آہستہ رات بھر چلتے رہے پس وہ بچ گئے اور ایک گروہ نے اس شخص کی تکذیب کی اور وہ اسی جگہ ٹھہرے رہے پس ان پر دشمن نے شب خون مارا اور ان کو ہلاک کر دیا اور صفحۂ ہستی سے مٹا دیا" (متفق علیہ، مشکوۃ ج ۱/۲۸

آخرت میں بھی فیصلہ کرنے کے لئے نازل ہوتا ہے، آخرت کے عذاب سے اس آیت کا کوئی تعلق نہیں۔

(۲) اور ابن ماجہ میں سند صحیح سے حدیث (نمبر ۱۵۷۳) ہے کہ ایک دیہاتی نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ! میرے والد صلہ رحمی کرتے تھے اور فلاں فلاں اعمال صالحہ کرتے تھے، اب مرنے کے بعد وہ کہاں ہیں؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ: ”وہ دوزخ میں ہے“ —— اس روایت میں یہ بھی ہے کہ آپ ﷺ نے اس دیہاتی کو یہ بھی حکم دیا کہ: حیثما مررت بقبر مشرك فبشره بالنار (تم جس کافر کی بھی قبر پر گزرو، اس کو جہنم کی خوش خبری دو) اس سائل کا باپ اصحاب فترت میں سے تھا، اور وہ اصحاب خود بھی اہل فترت میں سے تھے، پس اس روایت سے ان کا معذب ہونا ثابت ہوتا ہے۔

الغرض: یہ بڑا پیچیدہ مسئلہ ہے، اس مسئلہ میں درج ذیل آراء پائی جاتی ہیں:

(۱) شیخ محی الدین ابن عربی (۵۶۰-۶۳۸ھ) جو ساتویں صدی کے مشہور بزرگ اور صوفی ہیں: فتوحات مکیہ میں فرماتے ہیں کہ قیامت کے دن ان لوگوں کی طرف میدان محشر میں نبی مبعوث کئے جائیں گے، جو لوگ ان کی اتباع کریں گے وہ ناجی ہوں گے اور جو ان کا انکار کریں گے وہ ناری ہوں گے —— مگر یہ بات بے دلیل ہے اور یہ قیامت دار عمل نہیں، بلکہ دار جزاء ہے۔

(۲) حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد بن عبد الاحد سرہندی (۹۷۱-۱۰۳۴ھ) جو حضرت شاہ صاحب سے تقریباً ایک صدی پہلے گزرے ہیں: مکتوبات جلد اول مکتوب نمبر ۲۵۹ میں فرماتے ہیں کہ ان لوگوں کو ان کے برے اعمال کی جو سزا ملنی ہے وہ میدان محشر میں دیدی جائے گی، پھر ان کو مثل حیوانات کی طرح مٹی بنادیا جائے گا اور مجدد صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ میں نے یہ رائے تمام انبیاء کی مجلس میں پیش کی تو سب نے میری رائے پسند کی اور اس کو صحیح قرار دیا —— یہ گویا مکاشفہ ہے، اور انبیاء کے علاوہ کسی کا بھی کشف حجت شرعیہ نہیں، وہ محض ظن پیدا کرتا ہے، حکم شرعی ثابت کرنے کے لئے دلیل قطعی کی ضرورت ہے۔

(۳) مفسرین کی ایک رائے یہ ہے کہ وہ لوگ اعراف میں رہیں گے، جو جنت اور جہنم کے بیچ میں ایک مقام ہے —— مگر یہ رائے بھی درست نہیں، کیونکہ اعراف ہمیشہ رہنے کی جگہ نہیں، تمام اہل اعراف آخر میں جنت میں منتقل کردیئے جائیں گے۔

(۴) اصولیین کی عام رائے یہ ہے کہ اعمال کا حسن وقبح من وجہ عقلی ہے یعنی اعمال کی وضع ہی میں خوبیاں اور خرابیاں رکھی گئی ہیں، مگر یہ فطری حسن وقبح انسان سمجھ نہیں سکتا، اس لئے نزول شرع ضروری ہے۔ البتہ اللہ کی معرفت کا حسن اور اس کے ساتھ شریک ٹھہرانے کی برائی انسان نزول شرع کے بغیر بھی اپنی خداداد عقل سے سمجھ سکتا ہے، باقی اعمال کے حسن وقبح کا عقل ادراک نہیں کرسکتی، شریعت نازل ہوکر جب احکام دیتی ہے تبھی اعمال کا حسن وقبح معلوم ہوتا ہے۔

پس وہ اعمال جن کا حسن وقبح انسان عقل سے نہیں سمجھ سکتا، ان پر نزول شرع سے پہلے مؤاخذہ نہ ہوگا، اور توحید وشرک پر

جزا و سزا مرتب ہوگی۔ علامہ محب اللہ بہاری رحمہ اللہ نے مسلم الثبوت (ص ۱۶) میں امام اعظم رحمہ اللہ سے یہی روایت نقل کی ہے۔ انھوں نے لکھا ہے: روی عن أبي حنيفة رحمه الله تعالى: لا عذر لأحد في الجهل بخالقه لما يرى من الخلق۔ پھر علامہ نے اس روایت میں ایک قید بڑھائی ہے، اور مذکورہ مسئلہ اس روایت پر متفرع کیا ہے، لکھتے ہیں:

أقول: لعل المراد بعد مضي مدة التأمل، فإنه بمنزلة دعوة الرسل في تنبيه القلب بغفلته؛ وتلك المدة مختلفة ... ولا حد لها، وربما عرفت من المذاهب يتفرع عليه مسألة البالغ في شاهق الجبل إلخ

اور اللہ تعالیٰ کی معرفت اور احسانِ منعم کا حسن اور شرک اور احسان فراموشی کی برائی عقل سے اس لئے بھی جانی جا سکتی ہے کہ یہ باتیں اللہ تعالیٰ نے پچھلی زندگی میں سکھا کر انسان کو اس دنیا میں بھیجا ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ کل مولود یولد علی الفطرۃ: ہر بچہ فطرتِ اسلام پر پیدا ہوتا ہے۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ انسان اس دنیا میں نیا نہیں پیدا ہوتا، اس دنیا میں صرف انسان کا جسم بنایا جاتا ہے کیونکہ یہ عالم اجساد ہے اور اس کی روح اس سے بہت پہلے پیدا کی جا چکی ہے اور تمام روحیں عالم ارواح میں موجود ہیں، وہاں سے وہ روح شکم مادر میں بننے والے جسد خاکی میں منتقل کی جاتی ہے۔ سورۃ الاعراف کی آیت ۱۷۲ ہے:

وَإِذْ أَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِي آدَمَ مِنْ ظُهُورِهِمْ	اور جب آپ کے رب نے اولادِ آدم کی پشت سے ان کی
ذُرِّيَّتَهُمْ وَأَشْهَدَهُمْ عَلَى أَنْفُسِهِمْ	اولاد کو نکالا اور ان سے ان ہی کے متعلق اقرار لیا کہ کیا میں
أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوا بَلَى شَهِدْنَا أَنْ	تمہارا رب نہیں ہوں؟ سب نے جواب دیا: کیوں نہیں! ہم
تَقُولُوا يَوْمَ الْقِيَامَةِ إِنَّا كُنَّا عَنْ هَذَا	سب گواہ بنتے ہیں، تاکہ تم لوگ قیامت کے روز یوں نہ کہو کہ
غَافِلِينَ	ہم تو اس سے محض بے خبر تھے۔

یہ عہد الست اور یوم المیثاق کا واقعہ ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق کے بعد ان کی پشت سے ان کی صلبی اولاد پیدا کی گئی جیسا کہ حدیث میں تفصیل ہے، پھر اولاد کی پشت در پشت سے ان کی اولاد نکالی گئی اور اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کو اپنے سامنے پھیلا دیا یعنی ان پر اپنی تجلی فرمائی، اپنا معبود دکھایا، اس طرح دیدار کرا کر اپنی معرفت اور پہچان کرائی، پھر ان سے پوچھا: "کیا میں تمہارا رب نہیں؟" سب نے کہا: کیوں نہیں! ہم سب گواہی دیتے ہیں یعنی اقرار کرتے ہیں۔ یہ مضمون مسند احمد ۱: ۲۷۲ اور مستدرک حاکم ۲: ۵۴۴ کی روایت میں ہے جس کی سند صحیح ہے۔

پھر وہ روحیں اصلاب میں واپس نہیں کی گئیں بلکہ عالم ارواح میں ان کو خاص ترتیب سے رکھ دیا گیا۔ بخاری شریف میں روایت ہے: الأرواح جنود مجندة: عالم ارواح میں روحیں خاص ترتیب سے جیسے کہ فوج کی پلٹنیں ہوتی ہیں رکھی ہوئی ہیں، پھر شکم مادر میں تیار ہونے والے جسم میں وہیں سے روح لا کر فرشتہ پھونکتا ہے۔

الغرض معرفت خداوندی اور ربوبیت کی گواہی ہر انسان کی فطرت میں ودیعت کی گئی ہے، اور اس دنیا میں آنے کے بعد انسان گو اس عہد کی تفصیلات بھول گیا ہے مگر اصل استعداد موجود ہے اس لئے ایمان و توحید اور اس کی ضد شرک و کفر بالکل عقلی مسئلہ ہے ان کا حسن و قبح انسان اپنی عقل و فطرت سے سمجھ سکتا ہے باقی اعمال حسنہ نماز روزہ زکوٰۃ وغیرہ کا حسن اور اعمال سیئہ زنا چوری شراب نوشی وغیرہ کا قبح انسان اپنی عقل سے نہیں سمجھ سکتا نزول شرع کے بعد ہی سمجھ سکتا ہے۔ اس وجہ سے ایمان و کفر کی وجہ سے اہل فترت اور سکان شواہق جبال کو جزا و سزا ہوگی باقی اعمال کی وجہ سے مؤاخذہ نہیں ہوگا۔

شاہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اگر آپ نے گذشتہ بحث اچھی طرح سمجھ لی ہے تو اہل جاہلیت کے بارے میں جو متعارض دلائل ہیں ان میں آپ تطبیق دے سکتے ہیں تطبیق کس طرح ہوگی؟ یہ بات حضرت نے تشنہ چھوڑ دی ہے، بظاہر تطبیق یہ ہے کہ جن اعمال کا حسن و قبح عقل و فطرت سے سمجھا جا سکتا ہے ان پر مؤاخذہ ہوگا، باقی اعمال جن کا حسن یا قبح انسانی عقل ادراک نہیں کر سکتی نزول شرع کے بعد ہی ان تک رسائی ہو سکتی ہے ان پر مؤاخذہ نہیں ہوگا، کیونکہ اعمال کا حسن و قبح من کل الوجوہ نہ عقلی ہے نہ شرعی، بلکہ من وجہ عقلی ہے اور من وجہ شرعی۔ پس ایمان و کفر میں عقلی پہلو کا اعتبار ہوگا اور باقی اعمال میں شرعی پہلو ملحوظ رکھا جائے گا۔

> وبما ذكرنا من أن مذهبنا أمر بين الأمرين، وأن لكل من الأعمال وترتب القضاء بالإيجاب والتحريم أثرا في استحقاق الثواب والعقاب يُجمع بين الدلائل المتعارضة في أهل الجاهلية، يعذَّبون بما عملوا في الجاهلية أم لا؟

ترجمہ: اور ان باتوں سے جو ہم نے ذکر کی ہیں کہ "ہمارا معاملہ دو امروں کے درمیان ہے اور یہ کہ اعمال اور ایجاب و تحریم کے فیصلے کے نزول میں سے ہر ایک کا اثر ہے ثواب و عقاب کا حقدار بنانے میں" تطبیق دی جا سکتی ہے اہل جاہلیت کے بارے میں متعارض دلائل میں کہ وہ ان اعمال کی وجہ سے جن کو انھوں نے ایام جاہلیت میں کیا ہے عذاب دیے جائیں گے یا نہیں؟

☆ ☆ ☆

فن حکمت شرعیہ کی تدوین اور اس کے فوائد

بعض حضرات درج ذیل دو باتیں تسلیم کرتے ہیں:

(۱) احکام معلل بالمصالح ہیں یعنی احکام میں علتیں اور حکمتیں ملحوظ ہیں، پس ان کو سمجھ کر نکالا جا سکتا ہے۔

(۲) اور اعمال پر جزا کا ترتب بایں وجہ ہوتا ہے کہ وہ ان نفوس سے صادر ہوتے ہیں جو نفس کو طاری بھی ہیں اور

بگاڑتی بھی ہیں۔ ایک حدیث میں اس کا اشارہ موجود ہے۔ ارشاد ہے:

"بدن میں ایک بوٹی ہے، جب وہ سنور جاتی ہے تو سارا جسم سنور جاتا ہے (اور اس سے اعمال صالحہ صادر ہونے لگتے ہیں) اور جب وہ بگڑ جاتی ہے تو سارا جسم بگڑ جاتا ہے (اور ہر عضو سے برے اعمال صادر ہونے لگتے ہیں) سنو! وہ بوٹی دل ہے"

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اعمال کا صدور اچھی بری کیفیت کے مطابق ہوتا ہے یعنی جیسی نیت ہوگی ویسا عمل صادر ہوگا۔ اور جب اعمال اچھے برے ہوتے ہیں تو ان کے مطابق جزاء وسزا کا ہونا ایک معقول امر ہے، پس اعمال اور ان کی جزاء کے درمیان مناسبت ہے۔

مگر بایں ہمہ وہ لوگ کہتے ہیں کہ فن حکمت شرعیہ کی تدوین یعنی اصول طے کرکے اس پر جزئیات متفرع کرنا ناممکن ہے اور وہ لوگ:

دلیل عقلی یہ پیش کرتے ہیں کہ یہ بہت دقیق فن ہے، اس کے مسائل نہایت باریک ہیں، پس اس فن کی تدوین جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔

اور دلیل نقلی کی دو طرح تقریر کرتے ہیں:

(۱) یہ فن سلف نے مدون نہیں کیا، حالانکہ ان کا زمانہ آنحضرت ﷺ کے زمانہ سے قریب تھا، وہ خیر القرون کے لوگ تھے اور ان کے پاس شریعت کا علم بھی ہم سے زیادہ تھا، پھر بھی انھوں نے یہ فن مدون نہیں کیا تو گویا قرون مشہود لہا بالخیر کا اس فن کی عدم تدوین پر اجماع ہوگیا، پس اگر آج کوئی شخص اس فن کی تدوین کا بیڑا اٹھاتا ہے تو وہ خرق اجماع کرتا ہے۔

(۲) اس فن کی تدوین میں کوئی قابل لحاظ فائدہ نہیں، کیونکہ احکام شرعیہ پر عمل کرنا مصلحتیں اور حکمتیں جاننے پر موقوف نہیں، پس اس فن کی تدوین کرنا اور احکام شرعیہ کے اسرار جاننے کے لئے محنت کرنا بے فائدہ کام ہے! اور حدیث شریف میں ہے کہ:

من حسن إسلام المرء تركه ما لا يعنيه (مشکوٰۃ ۴۸۳۹) آدمی کے دین کی خوبی یہ ہے کہ وہ لایعنی کام چھوڑ دے

غرض دلائل نقلیہ اور عقلیہ سے یہ بات ثابت ہے کہ یا تو یہ فن مدون ہی نہیں کیا جاسکتا یا نہیں کرنا چاہئے۔ حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ یہ گمان فاسد ہے، یہ فن مدون کیا جاسکتا ہے اور اس میں بے شمار فوائد ہیں، اس لئے مدون کرنا چاہئے، تفصیل آگے آرہی ہے۔

[تدوين علم أسرار الدين ممكن، وفيه فوائد جمّة]

ومن الناس من يظن في الجملة: أن الأحكام معلّلة بالمصالح وأن الأعمال يترتب عليها

المجزاة من جهة كونها صادرة من هيئات نفسانية، تصلح بها النفس وتفسد، كما أشار إليه النبيُّ صلى الله عليه وسلم حيث قال: ﴿ألا وإن في الجسد مُضغة، إذا صلَحتْ صلح الجسد كلُّه، وإذا فسدت فسد الجسد كلُّه، ألا وهي القلب﴾

لكنه يَظُنُّ أن تدوين هذا الفنّ، وترتيبَ أصوله وفروعه، ممتنعٌ، إما:

[۱] عقلاً: لِخفاءِ مسائله، وغموضها.

[۲] أو شرعاً، لأن السلف لم يُدوِّنوه مع قُرب عهدهم من النبي صلى الله عليه وسلم وغَزارة علمهم، فكان كالاتفاق على تركه.

[۳] أو يقولُ: ليس في تدوينه فائدةٌ مُعتدٌّ بها؛ إذ لا يتوقف العملُ بالشرع على معرفة المصالح. وهذه ظنونٌ فاسدةٌ أيضًا.

ترجمہ: فن حکمت شرعیہ کی تدوین ممکن ہے اور اس میں بڑے بڑے فوائد ہیں بعض لوگ کسی درجہ میں یہ بات جانتے ہیں کہ احکام معلل بالمصالح ہیں (یعنی ان میں سے حکمتیں نکالی جا سکتی ہیں) اور اعمال پر جزاء اس اعتبار سے مرتب ہوتی ہے کہ وہ ان کیفیات قلبیہ سے صادر ہوتے ہیں، جن سے نفس سنورتا ہے یا بگڑتا ہے، جیسا کہ آنحضرت ﷺ نے اس کی طرف اشارہ فرمایا ہے، چنانچہ آپؐ نے فرمایا کہ:

"سنو! جسم کے اندر ایک ایسا گوشت کا ٹکڑا ہے کہ جب وہ سنور جاتا ہے تو سارا جسم سنور جاتا ہے، اور جب وہ بگڑ جاتا ہے تو سارا جسم بگڑ جاتا ہے، سنو! وہ ٹکڑا دل ہے"

مگر وہ لوگ گمان کرتے ہیں کہ اس فن کی تدوین اور اس کے اصول وفروع کو مرتب کرنا ناممکن ہے، یا تو

(۱) عقلاً ناممکن ہے، کیونکہ اس فن کے مسائل نہایت باریک اور دقیق ہیں۔

(۲) یا شرعاً ناممکن ہے، کیونکہ سلف صالحین نے یہ فن مدون نہیں کیا، حالانکہ ان کا زمانہ دور نبوی سے قریب تھا اور ان کا علم بھی زیادہ تھا، پس ان کا مدون نہ کرنا گویا اس فن کو مدون نہ کرنے پر اجماع ہے۔

(۳) یا وہ یہ کہتا ہے کہ اس فن کی تدوین میں کوئی قابل لحاظ فائدہ نہیں ہے، کیونکہ شریعت پر عمل کرنا حکمتوں کے جاننے پر موقوف نہیں۔

اور یہ خیالات بھی (مذکورہ باتوں کی طرح) غلط ہیں۔

لغات:

الجملة: مجموعہ، فی الجملة: مجموعی شان، اور محاورہ میں ترجمہ ہے: کسی درجہ میں، تھوڑا بہت ... صلح (ک ف

ن) صلاحاً: درست ہونا۔ فسد (ن،ک،ض) فساداً: خراب ہونا، بگڑ جانا۔ مُضغۃ: گوشت وغیرہ کا ٹکڑا، جمع مُضَغ
خفی خفاءً: پوشیدہ ہونا۔ غمض (ن،ک،س) غموضاً: کلام کا دقیق ہونا۔ غزر (ک) غزارۃ الماءُ وغیرہ: پانی وغیرہ کا کثیر ہونا۔

☆ ☆ ☆

مذکورہ خیالِ باطل کی تردید

دلیلِ عقلی کا جواب: یہ ہے کہ فنِ حکمتِ شرعیہ کے مسائل میں بیشک خفا اور دقت ہے، لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ اس فن کی تدوین ممکن نہیں، درست نہیں۔ مسائلِ فن کی پوشیدگی اور باریکی سے یہ نتیجہ ہرگز نہیں نکالا جاسکتا، کیونکہ یہ بات درست نہیں ہے کہ جس فن کے بھی مسائل دقیق اور دقیق ہوں اس کا کوئی بھی کام تمام نہیں ہوسکتا۔ دیکھئے! ایک فن علم اسرار الدین سے بھی زیادہ دقیق ہے اور وہ علمِ کلام ہے، جس کو علم الذات والصفات اور علم التوحید بھی کہتے ہیں۔ اس فن میں اللہ کی ذات وصفات سے بحث کی جاتی ہے (اور عذابِ قبر سے آخر تک جو مسائل ہیں، وہ علمِ کلام کے اصلی مسائل نہیں، بلکہ اس کے متعلقات ہیں یعنی وہ اصولِ اسلام ہیں)

اور علمِ کلام کے مسائل ادق اس لئے ہیں کہ اس میں ذاتِ باری اور اس کی صفات سے بحث کی جاتی ہے، جو وراء الوراء ہے، عقل اپنی کمند وہاں تک نہیں پھینک سکتی، نہ اس کی تفصیلات کا احاطہ کرسکتی ہے کیونکہ وہ غیر متناہی ذات ہے۔ مگر جب ضرورت پیش آئی تو اللہ تعالیٰ نے ایسے متکلمین پیدا کئے جنھوں نے اس علم کو پوری طرح مدون کردیا اور اس کی تفصیلات اس درجہ بیان کردیں کہ اب اس پر کوئی اضافہ ممکن نہیں، پس جب اتنا دقیق علم مرتب کیا جاسکتا ہے تو فنِ حکمتِ شرعیہ جو نسبتاً آسان ہے اس کو کیوں مرتب نہیں کیا جاسکتا؟!

اصل بات یہ ہے کہ ہر فن شروع میں مشکل نظر آتا ہے، اور ایسا خیال گذرتا ہے کہ اس سے بحث کرنا ناممکن ہے اور اس کی تفصیلات کو احاطۂ تحریر میں لانا محال ہے۔ مگر جس طرح اَلْہَڑ بچھڑے کو ہل میں جوتنے کے لئے لکڑی لاٹھی اور دھونس کے ذریعہ سدھایا جاتا ہے یا جیسے شیر یا ہاتھی کو سرکس میں کرتب دکھانے کے لئے اذیت رساں آلات کے ذریعہ سدھایا جاتا ہے، اسی طرح فن کے مقدمات وآلات کے ذریعہ جب کسی علم کو سدھایا جائے اور اس فن کی باتوں کو آہستہ آہستہ سمجھنے کی کوشش کی جائے تو وہ قابو میں آجاتا ہے اور اس کے اصول وضع کرنا اور اس کی جزئیات ومتعلقات کو طے کرنا آسان ہوجاتا ہے۔

ہاں یہ بات درست ہے کہ یہ علم کسی درجہ میں مشکل ضرور ہے مگر دشوار سے دشوار کام کو بھی کوئی نہ کوئی انجام دینے والا

ضرور پیدا ہوتا ہے اور اسی کارنامے سے معاصرین پر اس کی برتری ثابت ہوتی ہے، جو شخص خطروں میں بے خطر کود پڑتا ہے وہی مقصد حاصل کرتا ہے، موتیوں کے متلاشی کو سمندر کی غوطہ زنی کرنی ہی پڑتی ہے اور عقل کو مشقت میں ڈال کر اور فہم کو انتہائی درجہ استعمال کر کے ہی علوم وفنون کے کندھوں پر سواری کی جاسکتی ہے۔ غرض ہمت مرداں مدد خدا! اگر حوصلہ اور ذوق عمل ہو تو بڑے سے بڑا کارنامہ انجام دیا جاسکتا ہے۔ الحاصل مسائل کی باریکی فن کی تدوین کے لئے مانع نہیں۔

[الرّدّ علی الظن الفاسد]

[۱] قوله: لخفاء مسائله وغموضها.

[قلت:] إن أراد به أنه لا يمكن التدوين أصلاً، فخفاء المسائل لا يفيد ذلك، كيف؟ ومسائل علم التوحيد والصفات أعمق مدركاً وأبعد إحاطةً، وقد يسّره الله لمن شاء؛ وكذلك كلُّ علمٍ يتراءى بادي الرأي: أن البحث عنه مستحيلٌ، والإحاطة به ممتنعةٌ، ثم إذا ارتيض بأخواته، وتدرّج في فهم مقدماته حصل التمكّن فيه، وتيسّر تأسيسُ مبانيه، وتفريعُ فروعه وشعوبه؛ وإن أراد العسر في الجملة، فمسلَّم، لكنه بالعسر يظهر فضلُ بعض العلماء على بعض، وإنّ بلوغ الآمال في ركوب المشاقّ والأهوال، وإنّ اقتناص غرائب العلوم بتجشّم العقول وإمعان الفهوم.

ترجمہ: خیال باطل کی تردید: (۱) قائل کا قول: فن کے مسائل کے پوشیدہ اور غامض ہونے کی وجہ سے۔

ہم کہتے ہیں کہ اگر اس شخص نے مسائل کے خفا اور غموض سے یہ مراد لی ہے کہ اس فن کی تدوین قطعاً ممکن نہیں تو مسائل کی پوشیدگی کا یہ مفاد نہیں ہے، کیسے (یہ مفاد ہو سکتا ہے؟) جبکہ علم التوحید والصفات کے مسائل ماخذ کے اعتبار سے اس سے بھی زیادہ گہرے ہیں، اور احاطہ کے اعتبار سے بعید تر ہیں، باوجود اس کے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں میں سے جس کے لئے چاہا اس کو آسان کر دیا، اسی طرح ہر فن سرسری نظر میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس سے بحث کرنا ناممکن ہے اور اس کا احاطہ کرنا محال ہے، مگر جب اس کے اوزاروں کے ذریعہ اس کو سدھا لیا جاتا ہے اور آہستہ آہستہ اس کی تمہیدی باتوں کو سمجھنے کی کوشش کی جاتی ہے تو اس میں جماؤ حاصل ہو جاتا ہے اور اس کی بنیادوں کو قائم کرنا اور اس کی جزئیات ومتعلقات کی تفریع کرنا آسان ہو جاتا ہے۔

اور اگر اس شخص کی مراد فی الجملہ (کسی درجہ میں) دشواری ہے تو یہ بات بجا ہے، مگر بعض علماء کی بعض پر برتری کام کے مشکل ہونے ہی سے ظاہر ہوتی ہے، اور مشقتوں اور خطروں پر سوار ہو کر ہی آرزوؤں تک پہنچا جاسکتا ہے، اور عقل کو مشقت میں ڈال کر اور فہم کو گہرائی میں اتار کر ہی علوم وفنون کے کندھوں پر سواری کی جاسکتی ہے۔

الغرض غیر دین کو دین میں داخل کرنا بدعت ہے، دین کے کسی امر کی تفصیل وتکمیل کرنا بدعت نہیں۔ مثلاً میلاد مروجہ بدعت ہے، کیونکہ اس کا رواج چھٹی صدی میں ملک اربل کے زمانہ سے ہوا ہے، پانچ سو سال تک نہ کسی کا یوم پیدائش منایا جاتا تھا نہ یوم وفات۔ اسی طرح اب جو برتھ ڈے، برسی اور عرس کا رواج چل پڑا ہے یہ بھی بدعات ورسوم ہیں۔

اور جس چیز کی اصل قرون ثلاثہ میں موجود ہو اور اس کی تفصیلات بعد میں طے کی جائیں، یا زمانہ کے تقاضے سے اس کی شکل بدل جائے تو وہ امور بدعت نہیں۔ مثلاً نزول قرآن کے زمانہ سے دین کی تعلیم وتعلم کا سلسلہ جاری ہے، خود رسول اللہ ﷺ کے فرائض منصبی میں تعلیم قرآن داخل ہے، اور جو کچھ رسول اللہ ﷺ نے قرآن کے تعلق سے فرمایا ہے وہ "تفسیر" ہے، اسی طرح صحابہ کرام نے بھی قرآن پاک کی بہت سی آیتوں کی وضاحت کی ہے، وہ بھی "تفسیر" ہے۔ بعد میں "علم تفسیر" مدون ہوا، پس یہ بدعت اور خرق اجماع نہیں۔

اسی طرح آج کے رائج مدارس کی اصل اصحاب صفہ کا مدرسہ ہے، گو اب اس کی شکل وہیئت بالکل بدل گئی ہے مگر چونکہ اس سلسلہ کی اصل ہے اس لئے مدارس اسلامیہ، ان کے نصاب اور نظام الاوقات وغیرہ کو بدعت کے زمرہ میں نہیں لایا جاسکتا۔ اسی طرح علم اسرار الدین کا معاملہ ہے، چونکہ اس کی جڑ بنیاد قرون مشہود لہا بالخیر میں موجود تھی، اس لئے بارہویں صدی میں اس کی تدوین نہ بدعت ہے نہ خرق اجماع۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ خود رسول اللہ ﷺ نے اس فن کے اصولوں کی طرف اشارے فرمائے ہیں اور بہت سی جزئیات کو صراحۃً بیان فرمایا ہے۔ آپ کے بعد فقہائے صحابہ جیسے امیر المؤمنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ، امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے آپ کے نقش قدم پر چل کر شریعت کے حِکم واسرار سے بحث کی ہے اور اس کے متعدد پہلو ظاہر فرمائے ہیں۔ پھر مابعد زمانہ میں جب کسی حکم شرعی کی حکمت ومصلحت بیان کرنے کی ضرورت پیش آئی تو علمائے دین اپنی خداداد صلاحیتوں سے اس کی حکمت ومصلحت ظاہر فرماتے رہے۔ متکلمین کے ساتھ مختلف مباحثوں میں اس کی نوبت آتی رہتی تھی، مگر یہ مواد منتشر تھا۔ اب اس کو کسی ایک کتاب میں مدون کردینا بدعت نہیں، بلکہ بے حد مفید کام ہے۔

سوال: ٹھیک ہے، آج اس علم کی تدوین بدعت نہیں، مگر جب گیارہ سو سال تک اس فن کی ضرورت نہیں تھی تو اب بارہویں صدی میں اس کی تدوین کیوں ضروری ہوئی؟! اب تک جس طرح امت کی گاڑی بغیر اس فن کے چل رہی تھی آگے بھی چلتی رہے گی، اس فن کے بغیر گاڑی رکنے والی نہیں، پھر اس محنت کا کیا حاصل؟

جواب: ضرورت ایجاد کی ماں ہے، جب کسی چیز کی ضرورت پیش آتی ہے تو لوگ اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور سوچتے ہیں کہ یہ ضرورت کیسے پوری کی جائے؟! اس وقت سمجھدار لوگ مختلف راہیں نکالتے ہیں اور جو مناسب ترین صورت سامنے آتی ہے اس کو قبول کرلیتے ہیں۔ تمام ایجادات اور تمام علوم وفنون کا یہی حال ہے۔ علم اسرار الدین کی بھی

سے بچتا ہے اور ائمہ ثلاثہ کے نزدیک ضرر قسمت (بٹوارے کے مصارف) سے بچتا ہے ـــــ اور جب علتوں میں اختلاف ہوا تو تفریعات میں اختلاف ناگزیر ہے۔ جو بھی شخص فقہائے اربعہ کی فقہی کتابوں میں باب الربوا کا مطالعہ کرے گا اس کے سامنے کثرت اختلاف کی حقیقت واشگاف ہوجائے گی۔

پھر علتوں میں اختلاف کے بعد یہ بحث چل پڑی کہ کس کی نکالی ہوئی علت ان مصلحتوں اور حکمتوں کے مطابق ہے جن کا شریعت میں اعتبار کیا گیا ہے؟ ہر جماعت اپنی بات کو موجّہ کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ اس لئے ضروری ہوگیا کہ حکمتوں اور علتوں پر مستقل کلام کیا جائے۔

۲- بہت سے دینی مسائل میں عقلی دلائل سے استدلال شروع ہوگیا، مثلاً صاحب ہدایہ علی بن ابی بکر مرغینانی رحمہ اللہ (۵۳۰-۵۹۳ھ) جو چھٹی صدی کے مایہ ناز فقیہ ہیں، معاملات کے بیشتر مسائل میں نقلی دلائل کے ساتھ عقلی دلائل بھی پیش کرتے ہیں، اس لئے ضروری ہوگیا کہ نصوص پر دلائل عقلیہ قائم کئے جائیں، اور منقول کی معقول کے ساتھ تطبیق دکھائی جائے، نیز اسلاف سے مروی باتوں کو عقلی باتوں کے ساتھ ہم آہنگ کیا جائے۔

۳- اصول اعتقادیہ اور عملیہ میں شکوک وشبہات کا سلسلہ چل پڑا تو ضروری ہوا کہ تمام اصول کو موجّہ کردیا جائے اور ان کی مضبوط بنیادوں کو نکھار دیا جائے۔

غرض مذکورہ بالا وجوہ کی بنا پر ضروری ہوا کہ فن حکمت شرعیہ مدون کرلیا جائے، اس سے دین کو بڑی مدد ملے گی اور یہ فن مسلمانوں کے انتشار کو ختم کرنے میں بڑا ممد ومعاون ثابت ہوگا۔ اب یہ فن اہم عبادات اور اعلیٰ درجہ کی طاعت ہے۔

[۲] قوله: لأن السلف لم يدونوه.

قلنا: لا يضرُّ عدمُ تدوين السلف إياه، بعدما مَهَّدَ النبيُّ صلى الله عليه وسلم أصولَه، وفرَّع فروعَه، واقتفى أثرَه فقهاءُ الصحابة، كَكَبِيْرَيِ المؤمنين: عمرَ وعليٍّ، وكزيدٍ، وابن عباس، وعائشةَ، وغيرِهم رضي الله عنهم: بحثوا عنه، وأبرزوا وجوهًا منه؛

ثم لم يزل علماءُ الدين، وسُلَّاكُ سبيل اليقين، يُظهرون ما يحتاجون إليه، مما جمع الله في صدورهم؛ كان الرجلُ منهم إذا ابتُلي بمناظرة من يَقْرَعُ صَفاةَ التشكيك، يُجَرِّدُ سيفَ البحث وينهض، ويُصَمِّمُ العزمَ ويَمْتَضِي، ويُشَمِّرُ عن ساق الجِدِّ ويتصبّر، ويَهْزِمُ جيوشَ المبتدعين ويَكْسِرُ.

ثم رأينا بعدُ: أن تدوين كتاب، يحتوي على جُمَلٍ صالحةٍ من أصول هذا الفن أجدى من تقارب العصا، وكلُّ الصيد في جوف الفَرَا.

وكان الأوائلُ لصفاء عقائدهم، ببركة صحبة النبي صلى الله عليه وسلم، وقُرْبِ عهده، وقلةِ وقوع الاختلاف فيهم، واطمئنان قلوبهم، بترك التفتيش عما ثبت عنه صلى الله عليه

وسلم، وعدم التفاتهم إلى تطبيق المنقول بالمعقول، وتمكنهم من مراجعة الصحابة في كثير من العلوم الغامضة، مستغنين عن تدوين هذا الفن؛

كما أنهم كانوا بسبب قرب عهدهم من العرب الأول، واتصال زمانهم برجال الحديث، وكونهم منهم بمرأى ومسمع، وتمكنهم من مراجعة الثقات، وقلة وقوع الاختلاف والوضع، مستغنين عن تدوين سائر الفنون الحديثية، كشرح غريب الحديث وأسماء الرجال، ومراتب عدالتهم، ومشكل الحديث، وأصول الحديث، ومختلف الحديث، وفقه الحديث، وتمييز الضعيف من الصحيح، والموضوع من الثابت.

وكلُّ فنٍّ من هذه لم يُفرَد بالتدوين، ولم تُرتَّب أصوله وفروعه، إلا بعد قرون كثيرة، ومُدَد متطاولة، لمَّا مسَّت الحاجةُ إليه، وتوقَّف نُصْحُ المسلمين عليه.

ثم إنه كثُر اختلافُ الفقهاء، بناءً على اختلافهم في علل الأحكام، وأفضى ذلك إلى أن تباحثوا عن تلك العلل من جهة التفاتها إلى المصالح المعتبرة في الشرع، ونشأ التمسك بالمعقول في كثير من المباحث الدينية، وظهرت تشكيكات في الأصول الاعتقادية والعملية، فآل الأمرُ إلى أن صار الانتهاض لإقامة الدلائل العقلية، حسب النصوص النقلية، وتطبيق المنقول بالمعقول، والمسموع بالمفهوم، نصرًا مؤزَّرًا للدين، وسعيًا جميلًا في جمع شمل المسلمين، ومعدودًا من أعظم القُربات وراءها لزوم الطاعات.

ترجمہ: (۲) قائل کا قول: اسی لئے کہ سلف نے اس کو مدون نہیں کیا۔

ہم کہتے ہیں: سلف کا اس فن کو مدون نہ کرنا کچھ مضر نہیں، جبکہ آنحضور ﷺ نے اس فن کے اصولوں کی راہ ہموار کردی ہے اور اس کی جزئیات کو مستنبط فرمایا ہے۔ اور فقہائے صحابہ نے، جیسے امیر المؤمنین حضرت عمر، امیر المؤمنین حضرت علی، حضرت زید بن ثابت، حضرت ابن عباس اور حضرت عائشہ وغیرہم رضی اللہ عنہم نے آپ ﷺ کے نقش قدم کی پیروی کی ہے۔ ان سب حضرات نے اس علم کے بارے میں کھود کرید کی ہے اور اس کے متعدد پہلو ظاہر کئے ہیں۔

پھر علمائے دین اور سالکین راہ یقین ہر زمانہ میں لوگوں کو جن باتوں کی ضرورت پیش آتی تھی ان کو ظاہر کرتے تھے، ان علوم کے ذریعہ جو اللہ تعالیٰ نے ان کے سینوں میں جمع کئے تھے۔ جب ان میں سے کوئی شخص کسی ایسے شخص کے ساتھ مناظرہ میں پھنس جاتا، جو تشکیک کے فتنہ کو ہوا دے رہا ہوتا تھا، تو وہ بحث کی تلوار تان لیتا، اور اٹھ کھڑا ہوتا، اور (مقابل کا) ہوش گم کر دیتا، اور خالص خیر خواہی کرتا، اور کوشش کی پنڈلی سے پائنچے چڑھا لیتا اور اس کو کھول لیتا (یعنی محنت تیز کر دیتا) اور گمراہوں کے لشکر کو شکست دیتا، اور ان کو تتر بتر کر دیتا۔

پھر بعد ازیں ہماری سمجھ میں آیا کہ ایک ایسی کتاب مدون کرنا جو اس فن کے اصول کی اچھی خاصی مقدار پر مشتمل ہو، لائق ہے کہ نظروں سے بھی زیادہ مفید ہے اور مناسب شکار نگاہ کے سامنے پیش ہیں ہیں۔

اور اگلے لوگ اس فن کی تدوین سے مستغنی تھے، کیونکہ آنحضور ﷺ کی صحبت کی برکت سے ان کے قلوب صاف تھے، حضرت تھے اور وہ عہد رسالت سے قریب تھے، اور ان میں اختلاف بھی بہت کم واقع ہوتے تھے، اور ان کے دل مطمئن تھے، کیونکہ وہ آنحضور ﷺ سے ثابت چیز کے بارے میں تفتیش نہیں کرتے تھے، اور وہ منقول کو معقول کے ساتھ منطبق کرنے کے چکر میں بھی نہیں پڑتے تھے، اور وہ بہت سے دینی مسائل میں نقلی احادیث کی طرف رجوع کرنے پر قادر تھے۔

جس طرح وہ اگلے عربوں کے زمانہ سے قریب ہونے کی وجہ سے، اور روات حدیث کے زمانہ کے ساتھ ان کے زمانہ کے متصل ہونے کی وجہ سے، اور ان روات کے ان کی آنکھوں اور کانوں کے سامنے ہونے کی وجہ سے، اور قلت احادیث روات حدیث کی طرف مراجعت پر قدرت ہونے کی وجہ سے، اور حدیثوں میں اختلاف اور وضع کا سلسلہ کم واقع ہونے کی وجہ سے، تمام علوم حدیث کی تدوین سے بے نیاز تھے، مثلاً فن غریب الحدیث، فن اسماء الرجال، روات کی عدالت کے مراتب کی تعیین کا فن، فن مشکل احادیث، اصول الحدیث، فن مختلف الحدیث، نقد الحدیث اور ضعیف حدیثوں کو صحیح حدیثوں سے، اور موضوع روایات کو ثابت روایات سے جدا کرنے کا فن۔ اور ان فنون میں سے ہر فن صدیوں کے بعد اور مدتہائے مدید گذر جانے کے بعد مدون و مرتب کیا گیا ہے، اور اس کے اصول وفروع تجویز کیے گئے ہیں، جب اس کی ضرورت پیش آئی اور مسلمانوں کی خیرخواہی اس پر موقوف ہوئی۔

پھر فقہاء میں اختلاف کی کثرت ہوئی، اور یہ اختلاف احکام کی علتوں میں اختلاف پر مبنی تھا، اور یہ بات یہاں تک پہنچ گئی کہ وہ حضرات ان علتوں کے بارے میں اس حیثیت سے بحث کرنے لگے کہ کیا وہ ان مصالح تک پہنچاتی ہیں جن کا شریعت میں اعتبار کیا گیا ہے؟ اور بہت سے دینی مسائل میں دلائل عقلیہ سے استدلال شروع ہوگیا، اور اصول اعتقادیہ اور عملیہ میں شکوک وشبہات کا سلسلہ چل پڑا، تو نصوص پر دلائل عقلیہ قائم کرنے کے لئے، اور منقولات کو معقولات کے ساتھ تطبیق دینے کے لئے، اور اسلاف سے مروی باتوں کو عقلی باتوں کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کے لئے اٹھ کھڑا ہونا، دین کی بڑی مدد اور مسلمانوں کے انتشار کو ختم کرنے کی زبردست محنت، اور بڑی عبادتوں میں سے ایک عبادت اور اہم طاعات میں سے اعلیٰ درجہ کی طاعت شمار ہونے لگا۔

لغات:

مسالک جمع ہے مسلک کی: راہیں ... محض (ف) الوُدّ او النُّصح: دوستی یا خیرخواہی خالص کرنا ... اجدی (اسم تفضیل) زیادہ مفید اَجْدَی اِجْدَاءً الامرُ: نفع دینا، کہا جاتا ہے ما یُجدی عنک هذا: یہ چیز تم کو فائدہ نہیں دے گی

... التفاریق: ٹکڑے تھوڑا کہا جاتا ہے: ضم تفاریق متاعه: اس نے متفرق سامان کو اکٹھا کیا اخذ حقه بالتفاریق: اس نے اپنا حق تھوڑا تھوڑا کر کے لیا تفاریق العصا: لاٹھی کے ٹکڑے ... الفرا: جنگلی گدھا، گورخر جمع افراء، اور کہاوت کل الصید الخ بغیر ہمزہ کے ہے یہ کہاوت وہ شخص بولتا ہے جس کی بہت سی حاجتیں ہوں اور ان میں سے بڑی حاجت پوری ہو جائے تو وہ شخص یہ کہاوت بولتا ہے یعنی باقی حاجتوں کے فوت ہونے کی پرواہ نہیں (تاج العروس ۱:۹۶) ... مستغنین خبر ہے کان الاوائل کی ... عنَّ (ن ض) عنًّا له الشيءُ: سامنے ظاہر ہونا، پیش آنا ... الإزراء: حقیر کرنا ... الشمل: امر مجتمع اور امر متفرق (ضد) کہا جاتا ہے جمع الله شملهم: الله ان کے متفرق امور کو جمع کر دے فرق الله شملهم: الله ان کے اجتماع کو توڑ دے۔

تشریح:

۱- أجدى من تفاريق العصا (لاٹھی کے ٹکڑوں سے بھی زیادہ کارآمد) ایک کہاوت ہے، کسی چیز کا بے حد نافع ہونا ظاہر کرنے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ عرب کی ایک دیہاتن عورت نے سب سے پہلے اپنے بیٹے کے حق میں یہ جملہ استعمال کیا تھا، اس کا لڑکا بداخلاق، لوگوں کے ساتھ بدمعاملہ، کمزور بدن اور باریک ہڈیوں کا ڈھانچا تھا، قبیلے کے ایک جوان نے اس پر حملہ کیا اور اس کی ناک کاٹ دی، اس کی ماں نے ناک کی دیت وصول کی جس سے اس کی غریبی دور ہوگئی، پھر کسی اور جوان نے اس پر حملہ کیا اور کان کاٹ دیا، پھر تیسرے نے حملہ کیا اور اس کا ہونٹ کاٹ دیا، ماں ہر جنایت کی دیت لیتی رہی اور خوب ٹھاٹھ کرتی رہی، اس نے بیٹے کے حق میں چند اشعار کہے ہیں ان میں سے ایک شعر یہ ہے

أحلفُ بالمروة حقًّا والصفا　　　إنك خير من تفاريق العصا

ترجمہ: میں صفا و مروہ کی قسم کھاتی ہوں کہ تو لاٹھی کے ٹکڑوں سے بھی زیادہ نفع بخش ہے۔

لاٹھی کے کیا کیا ٹکڑے ہو سکتے ہیں اور وہ کیا کیا کام آ سکتے ہیں، اس کی وضاحت ایک عرب دیہاتی نے کی ہے، قاموس میں اس کا قول نقل کیا گیا ہے، خواہش مند حضرات مراجعت کر لیں (تاج العروس ۷:۴۷ مادہ ف ر ق)

۲- كل الصيد في جوف الفرا (تمام شکار گورخر کے پیٹ میں ہیں) یہ بھی ایک کہاوت ہے، اس کی صورت یوں سمجھنی چاہئے کہ دو شکاری شکار کے لئے نکلے، ایک نے دن بھر میں پانچ کبوتر، دس گوریا، دس فاختہ اور خرگوش شکار کئے اور دوسرے نے صرف ایک گورخر مارا، جب دونوں شکاری ملے تو پہلے نے کہا کہ میں نے دن بھر میں ستائیس شکار کئے، تو نے ایک ہی کیا؟! دوسرے نے جواب دیا کہ تیرے سارے شکار میرے گورخر کے پیٹ میں سما جائیں گے، میں نے اتنا بڑا شکار کیا ہے، اس لئے میرے لئے شرم کی کوئی بات نہیں۔

۳- فن حدیث کی اسی (۸۰) سے زائد انواع کی گئی ہیں، اور ہر نوع میں مصنفین نے تصنیفات کی ہیں مگر بعد میں

بعض کو بعض میں ضم کر دیا گیا مثلاً فقہ الحدیث، مشکل الحدیث اور مختلف الحدیث کو شروح حدیث میں لے لیا گیا اور رواۃ کی عدالت کے مراتب کی تعیین کا بیان اسی طرح جرح کے مراتب کی تعیین کا بیان اسماء رجال میں شامل کر لیا گیا اور صحیح وضعیف اور موضوع و ثابت روایات میں امتیاز کرنے کا فن روایت حدیث کی کتابوں میں سے لے لیا گیا اور غریب الحدیث اور اصول الحدیث مستقل فن ہیں۔

☆ ☆ ☆

دلیل نقلی کی دوسری تقریر کا جواب اور فن حکمت شرعیہ کا پہلا فائدہ

معترض نے دلیل نقلی کی دوسری تقریر یہ کی تھی کہ چونکہ احکام شرعیہ پر عمل کرنا مصالح و حکم کے جاننے پر موقوف نہیں، اس لئے فن حکمت شرعیہ کی تدوین بے فائدہ ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ خیال بھی واقعہ کے خلاف ہے چونکہ اس فن میں بڑے بڑے فائدے ہیں، مثال کے طور پر چند فوائد ذیل میں بیان کئے جاتے ہیں۔

پہلا فائدہ: فن حکمت شرعیہ کی مدد سے رسول اللہ ﷺ کے معجزات میں سے ایک اہم معجزہ کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے اور وہ معجزہ آپ کی لائی ہوئی شریعت مطہرہ ہے۔ اگر آپ کی لائی ہوئی شریعت (مجموعہ قوانین) میں غور کیا جائے تو آپ کا نبی برحق ہونا سمجھ میں آ جائے گا کیونکہ کوئی بھی انسان قوانین کا کوئی ایسا مجموعہ پیش نہیں کر سکتا جس میں اس درجہ حکمتوں اور مصلحتوں کی رعایت کی گئی ہو، جتنی شریعت اسلامیہ میں ملحوظ رکھی گئی ہے۔ یہ بات انسانوں کی مقدرت سے باہر ہے، یہ خالق کائنات کا کام ہے یعنی اللہ ہی کی طرف سے یہ مجموعہ قوانین آنحضور ﷺ پر نازل کیا گیا ہے جس کو آپ نے لوگوں کے سامنے پیش کیا ہے مگر اس کے ادراک کے لئے فن حکمت شرعیہ سے واقفیت ضروری ہے، اس فن کے بغیر ان تمام مصالح کو نہیں سمجھا جا سکتا جن پر شریعت مشتمل ہے۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ مُعْجِزَۃ صفت ہے آیۃ کی، پھر صفت کو موصوف کے قائم مقام کر دیا گیا ہے یعنی موصوف کے معنی بھی صفت میں لے لئے گئے ہیں نیز لفظ مُعجِزَۃ (جیم کے زیر کے ساتھ) اسم فاعل واحد مؤنث ہے اَعْجَزَ سے جس کے معنی ہیں عاجز کرنا، روک دینا۔ پس معجزہ کے معنی ہیں "عاجز کرنے والی نشانی" یعنی وہ نشانی جس کے مانند کو پیش کرنے سے لوگ عاجز ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے خاتم النبیین ﷺ کو سند نبوت کے طور پر بے شمار نشانیاں عطا فرمائی ہیں، ان میں سب سے بڑی نشانی قرآن عظیم ہے۔ قرآن میں لوگوں کو بار بار چیلنج دیا گیا ہے کہ اگر کسی کو قرآن کے منزل من اللہ ہونے میں شبہ ہو تو وہ اپنے حمایتیوں کو ساتھ لے کر قرآن جیسی ایک سورت بنا کر دکھاوے اور اگر وہ ایسا نہ کر سکے اور ہرگز نہیں کر سکے گا تو اس کو

سمجھنا چاہئے کہ قرآن جیسا کلام کسی انسان کی کاوش نہیں، بلکہ کلام الٰہی ہے، پس اس کا انکار کر کے جہنم کا ایندھن نہیں بنا چاہئے۔ سورۃ البقرہ آیات ۲۳ و ۲۴ میں یہ مضمون آیا ہے۔

رہا یہ سوال کہ قرآن معجزہ (عاجز کرنے والا) کیوں ہے؟ اس میں وہ کیا سرخاب کا پر لگا ہوا ہے کہ تمام فصحاء مل کر بھی ایسا کلام نہیں بنا سکتے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اگلے عرب یعنی نزول قرآن کے وقت جو لوگ موجود تھے وہ تو اپنی فطرت اور زبان کی مہارت کی وجہ سے جانتے تھے کہ قرآن میں کیا خوبیاں ہیں، مگر بعد میں جب عربی کی استعداد کمزور ہوگئی نیز علم عربوں سے بڑھ کر عجمیوں میں پہنچا تو ضروری ہوا کہ وجوہ اعجاز کی وضاحت کی جائے، چنانچہ سب سے پہلے تیسری صدی میں ابو عبداللہ محمد بن یزید واسطی (متوفی ۳۰۶ھ) نے اعجاز القرآن نامی کتاب لکھی جس کی شرح شیخ عبد القاہر جرجانی (متوفی ۴۷۱ھ) نے لکھی، پھر چوتھی صدی میں اس موضوع پر متعدد کتابیں لکھی گئیں۔ علامہ حمد بن محمد خطابی رحمہ اللہ (۳۱۹-۳۸۸ھ) نے بیان اعجاز القرآن لکھی جو چھپ گئی ہے۔ علی بن عیسیٰ ابوالحسن رمانی (۲۹۶-۳۸۶ھ) نے النکت فی اعجاز القرآن لکھی ہے یہ بھی مطبوعہ ہے۔ قاضی ابوبکر محمد بن طیب باقلانی رحمہ اللہ (۳۳۸-۴۰۳ھ) نے اعجاز القرآن لکھی، یہ بھی طبع ہو چکی ہے پھر چھٹی صدی میں امام فخر الدین محمد بن عمر رازی (۵۴۳-۶۰۶ھ) نے نہایۃ الایجاز فی درایۃ الاعجاز لکھی، یہ بھی مطبوعہ ہے۔ اور بھی متعدد حضرات نے اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔

ان سب حضرات نے وجوہ اعجاز بیان کئے ہیں، اور لوگوں کو سمجھایا ہے کہ قرآن کے مثل انسان کیوں نہیں لا سکتا! اسی طرح آنحضور ﷺ نے جو شریعت لوگوں کے سامنے پیش کی ہے وہ سابقہ تمام شرائع سے کامل تر ہے اور آپ کا ایک بہت بڑا معجزہ ہے، کیونکہ اس میں ایسی باتوں کا لحاظ رکھا گیا ہے کہ عموماً طور پر ان سب باتوں کا لحاظ وضع قوانین میں رکھا ہی نہیں جا سکتا۔ اور یہ بات دورِ اول کے لوگ اپنی فطرت سلیم، صحبت نبوی کی برکت، استعداد کی پختگی اور علم کی فراوانی سے خود بخود سمجھتے تھے، اس کو سمجھانے کی ضرورت نہیں تھی۔ ان کی تقریروں میں اور باہمی گفتگوؤں میں اس کی صاف جھلک ملتی ہے۔ مگر بعد میں یہ صورت حال باقی نہیں رہی، اس لئے ضروری ہوا کہ آپ کی لائی ہوئی شریعت میں جو وجوہ اعجاز ہیں ان کی وضاحت کی جائے۔ اسی مقصد کے لئے فن حکمت شرعیہ کی تدوین ضروری ہوئی۔

رہی یہ بات کہ ”شریعت محمدیہ تمام شرائع سابقہ سے کامل تر ہے“ یہ مضمون بہت سی روایات سے ثابت ہے۔ مثلاً امام بیہقی رحمہ اللہ نے دلائل النبوۃ میں حضرت عقبہ رضی اللہ عنہ کی روایت ذکر کی ہے کہ آپ ﷺ نے غزوۂ تبوک کے موقعہ پر جو طویل خطاب فرمایا تھا اس میں یہ جملہ معروف ہے کہ: خَيْرُ الْمِلَلِ مِلَّةُ إبراهيم: تمام ملتوں میں بہترین ابراہیم علیہ السلام کی شریعت ہے۔ اور سورۃ النحل آیت ۱۲۳ میں ہے کہ:

ثُمَّ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ أَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا — پھر ہم نے آپ کے پاس وحی بھیجی کہ آپ ابراہیم کے طریقہ پر چلئے، جو کہ بالکل ایک طرف کے ہو رہے تھے

غرض آپ کی ملت، ملت ابراہیمی کا کامل و مکمل ایڈیشن ہے۔ اور ملت ابراہیمی تمام ملتوں میں بہترین ہے، پس ثابت ہوا کہ آپ کی شریعت تمام شرائع سے کامل تر ہے۔

اور آپ ﷺ جیسے امی یعنی لوگوں سے نہ پڑھے ہوئے شخص کا ایسی کامل و مکمل شریعت پیش کرنا اس بات کی واضح دلیل ہے کہ یہ شریعت آپ کی کاوش کا نتیجہ ہرگز نہیں۔ جب دنیا کے تمام پڑھے لکھے انسان مل کر بھی ایسا مجموعہ قوانین تیار نہیں کر سکتے تو ایک امی سے یہ بات کیوں کر متصور ہے؟ یقیناً یہ رب العالمین کا نازل کردہ قانون ہے۔

غرض آپ کی شریعت آپ کی صداقت کی بہت بڑی دلیل ہے، مگر اس کا مکمل ہونا اس وقت سمجھ میں آسکتا ہے جب آدمی یہ جانے کہ اس شریعت میں کن کن مصلحتوں کی رعایت کی گئی ہے؟ اور یہ بات فن حکمت شرعیہ کے ذریعہ ہی جانی جاسکتی ہے، اس لئے اس فن کی تدوین بے فائدہ نہیں، بلکہ اس میں یہ ایک عظیم فائدہ ہے۔

[٢] قوله: ليس في تدوينه فائدة.

قلنا: ليس الأمر كما زعم، بل في ذلك فوائدُ جليلة.

منها: إيضاح معجزة من معجزات نبينا صلى الله عليه وسلم، فإنه صلى الله عليه وسلم كما أتى بالقرآن العظيم، فأعجز بلغاء زمانه، ولم يستطع أحدٌ منهم أن يأتي بسورة من مثله، ثم لما انقرض زمانُ العرب الأوَلِ، وخفي على الناس وجوهُ الإعجاز، قام علماء الأمة، فأوضحوها، ليُدركه من لم يبلغ مبلغهم، كذلك أتى من الله تعالى بشريعة هي أكملُ الشرائع، متضمِّنةٌ لمصالحَ يَعجِزُ عن مراعاة مثلها البشرُ، وعرَفَ أهلُ زمانه شرفَ ماجاء به، بنحوٍ من أنحاء المعرفة، حتى نطقت به ألسنتهم، وتبيّن في خُطبهم ومُحاوراتهم، فلما انقضى عصرهم، وجب أن يكون في الأمة من يوضِّحُ وجوه هذا النوع من الإعجاز.

والآثارُ الدالةُ على أن شريعته صلى الله عليه وسلم أكملُ الشرائع، وأن إتيانَ مثله بمثلها معجزةٌ عظيمة، كثيرةٌ مشهورةٌ لا حاجة إلى ذكرها.

ترجمہ: قائل کا قول: اس فن کی تدوین میں کوئی فائدہ نہیں۔

ہم کہتے ہیں: واقعہ ایسا نہیں ہے جیسا قائل نے خیال کیا ہے بلکہ اس فن کی تدوین میں بہت سے بڑے بڑے فائدے ہیں۔

ان میں سے ایک فائدہ آنحضور ﷺ کے معجزات میں سے ایک بڑے معجزہ کی وضاحت کرنا ہے، کیونکہ آنحضور ﷺ جس طرح قرآن عظیم لائے اور اس نے آپ کے زمانے کے ارباب بلاغت کو عاجز کر دیا، اور ان میں سے کسی

میں جب تحدی ہوئی کہ قرآن جیسی کوئی سورت بنا لائے۔ پھر جب اگلے عربوں کا زمانہ بیت گیا اور لوگوں پر اعجاز کی وجوہ مخفی ہو گئیں تو علمائے امت اٹھے، اور انھوں نے وجوہ اعجاز کی وضاحت کی تاکہ وہ لوگ بھی جو اگلے عربوں جیسی استعداد کے مالک نہیں ہیں، قرآن کے اعجاز کو سمجھ سکیں۔ اسی طرح آنحضور ﷺ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک شریعت (مجموعہ قوانین) لائے ہیں، جو تمام شریعتوں میں کامل تر ہے، جو ایسی مصلحتوں پر مشتمل ہے کہ اس جیسی حکمتوں کی رعایت کرنے سے انسان قاصر ہیں، اور آپ کے زمانہ کے لوگ آپ کی لائی ہوئی شریعت کی برتری کو سمجھتے تھے، سمجھنے کی مختلف صورتوں میں سے کسی صورت کے ذریعہ، چنانچہ ان کی زبانوں سے وہ حکمتیں ظاہر ہوئی ہیں، اور ان کی تقریروں اور باہمی گفتگوؤں میں وہ واضح ہوئی ہیں۔ پھر جب ان کا زمانہ گذر گیا تو ضروری ہوا کہ امت میں ایسے لوگ پیدا ہوں جو اعجاز کی اس خاص قسم کی وضاحت کریں۔

اور وہ روایات جو اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ آپ کی شریعت تمام شریعتوں سے کامل تر ہے اور یہ بات کہ آپ جیسے (امی شخص) کا اس جیسی (کامل ترین) شریعت کو پیش کرنا ایک بہت بڑا معجزہ ہے، ایسی روایات بہت ہیں اور مشہور ہیں، ان کو ذکر کرنے کی حاجت نہیں۔

لغات:

أُولٰی جمع أُوْلیٰ مؤنث أوَّل، العرب بتاویل قبیلہ مؤنث، اور معنی جمع ہے اس لئے صفت اُولیٰ لائی گئی ہے
حاور محاورۃً وحواراً: گفتگو کرنا، جواب دینا ۔ کثیرۃ خبر ہے الآثار مبتدا کی۔

تشریح:

معرفت یعنی بات سمجھنے کی بہت سی صورتیں ہو سکتی ہیں مثلاً پڑھنے کے ذریعہ، مطالعہ اور غور وفکر کے ذریعہ، صحبت کے ذریعہ، تجربہ کے ذریعہ وغیرہ، دور اول کے حضرات شریعت میں ملحوظ حکمتوں اور مصلحتوں کو خوب سمجھتے تھے اس بات کا اندازہ ہمیں ان کی تقریروں اور باہمی گفتگوؤں سے ہوتا ہے، رہی یہ بات کہ انھوں نے یہ باتیں کیسے سمجھیں؟ تو یہ بات ہم نہیں جان سکتے، بس اتنا ہم جانتے ہیں کہ وہ حضرات یہ باتیں سمجھے ہوئے تھے۔

نوٹ: جلیلۃ مطبوعہ نسخہ میں جلیۃ ہے، جس کے معنی ہیں واضح۔ تصحیح مخطوطہ کراچی سے کی ہے۔

☆ ☆ ☆

فن حکمت شرعیہ کا دوسرا فائدہ

ہر مسلمان کا ایمان ہے کہ آنحضور ﷺ جو دین و شریعت لائے ہیں وہ سچا دین اور سچی شریعت ہے، اگر اس

ایمان لانے کے ساتھ مؤمن شریعت کی حکمتیں اور مصلحتیں بھی جان لے تو اس کو مزید اطمینان قلبی حاصل ہوگا، اور یہ چیز شرعاً مطلوب ہے۔ اللہ کے خلیل حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بارگاہ خداوندی میں یہ درخواست کی تھی کہ ان کو احیائے موتی کا مشاہدہ کرایا جائے۔ دریافت کیا گیا کہ: "کیا تمہارا اس پر ایمان نہیں؟" آپ نے جواب دیا: "کیوں نہیں؟ مگر میں آنکھوں سے مشاہدہ کرنا چاہتا ہوں تاکہ مزید اطمینان قلبی حاصل ہو" چنانچہ اللہ پاک نے ان کو احیائے موتی کا مشاہدہ کرایا۔ سورۃ البقرۃ آیت ۲۶۰ میں اس کی تفصیل ہے۔ اسی طرح شریعت کی حقانیت پر یقین کے ساتھ اگر احکام شرعیہ کے رموز واسرار بھی جان لئے جائیں تو اس سے مزید اطمینان قلبی حاصل ہوگا، اور یہ اس فن کا نہایت اہم فائدہ ہے۔

اور اسرار ورموز جاننے سے ایمان میں اضافہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ جس طرح مسئلہ کے ثبوت کے لئے ایک دلیل کافی ہوتی ہے، لیکن اگر کسی مسئلہ میں دلائل کا انبار لگ جائے اور مختلف راہوں سے مسئلہ کا علم حاصل ہو جائے تو شرح صدر ہوتا ہے اور دل کا اضطراب دور ہوتا ہے۔ اسی طرح اگر شریعت کی حکمت اور اس کا دنیوی یا اخروی فائدہ معلوم ہو جائے تو یہ بات مزید طمانینت کا باعث ہوتی ہے۔

ومنها: أنه يحصل به الاطمئنان الزائد على الإيمان، كما قال إبراهيم الخليل عليه الصلوة والسلام: ﴿بَلَى وَلٰكِنْ لِيَطْمَئِنَّ قَلْبِي﴾ وذلك: أن تظافر الدلائل، وكثرة طرق العلم، يُثلجان الصدر، ويزيلان اضطراب القلب.

ترجمہ: اور ان (فوائد) میں سے ایک یہ ہے کہ اس علم کی بدولت ایمان سے زائد اطمینان قلب حاصل ہوتا ہے۔ جیسا کہ ابراہیم خلیل اللہ علیہ الصلوۃ والسلام نے فرمایا: "کیوں نہیں؟ مگر اس لئے درخواست کرتا ہوں کہ میرا دل مطمئن ہو جائے" اور اس کی وجہ یہ ہے کہ (کسی مسئلہ پر) دلائل کا باہم جمع ہونا اور علم کی راہوں کا زیادہ ہونا سینہ کو ٹھنڈا کرتا ہے، اور دل کی بےچینی کو دور کرتا ہے۔

لغت: اِطْمَأَنَّ: مطمئن ہونا، خوش ہونا۔

☆ ☆ ☆

فن حکمت شرعیہ کا تیسرا فائدہ

سالک یعنی درجہ احسان کا طالب نوافل عبادات میں محنت کرکے مطلوب تک پہنچتا ہے، اگر وہ عبادات کے اسرار و رموز جان کر محنت کرے اور عبادتوں کی روح اور ان کے انوار کی نگہداشت کرے، مثلاً سالک جو اذکار کرتا ہے ان کی

خصوصیات بھی جان لے اور پوری توجہ سے ذکر کرے اور اس کی خصوصیت کی تحصیل کی کوشش کرے تو تھوڑی عبادت بھی بہت زیادہ نفع بخش ثابت ہوگی اور وہ اندھا دھند عمل جاری رکھنے سے محفوظ رہے گا۔ اسی وجہ سے امام غزالی رحمہ اللہ نے سلوک کی کتابوں میں عبادتوں کے اسرار و رموز بیان کرنے کا اہتمام کیا ہے۔

ومنها: أن طالب الإحسان إذا اجتهد في الطاعات، وهو يعرف وجه مشروعيتها، ويقيّد نفسه بالمحافظة على أرواحها وأنوارها، نفعه قليلها، وكان أبعد من أن يخبط خبط عشواء، ولهذا المعنى: اعتنى الإمام الغزالي في كتب السلوك بتعريف أسرار العبادات.

ترجمہ: اور ان (فائدوں) میں سے ایک یہ ہے کہ احسان (تصوف) کا طالب جب عبادتوں میں محنت کرتا ہے درانحالیکہ وہ ان کی مشروعیت کی وجہ جانتا ہے اور اپنے آپ کو پابند بناتا ہے عبادتوں کی ارواح اور ان کے انوار کی نگہداشت کا، تو تھوڑا عمل بھی اس کو نفع پہنچاتا ہے اور وہ رتوندی اونٹنی کی طرح ناک ٹوئیاں مارنے سے بالکل بچ جاتا ہے۔ اور اسی وجہ سے امام غزالی رحمہ اللہ نے تصوف کی کتابوں میں عبادتوں کے رموز بیان کرنے کا اہتمام کیا ہے۔

فائدہ: (۱) إحسان باب افعال کا مصدر ہے، اس کے معنی ہیں نکو کردن (عمدہ بنانا) اور ہر چیز کو عمدہ کرنا لازم ہے مسلم شریف میں حدیث ہے:

إن الله تبارك وتعالى كتب الإحسان على كل شيء، فإذا قتلتم فأحسنوا القِتلة، وإذا ذبحتم فأحسنوا الذبح، وليُحِدَّ أحدكم شفرته، وليُرِح ذبيحته (مشکوٰۃ حدیث نمبر ۴۰۷۳)

اللہ تعالیٰ نے ہر چیز میں عمدہ کرنے کو لازم کیا ہے، لہٰذا جب تم (دشمن کو جہاد میں) قتل کرو تو اچھے انداز پر قتل کرو (یعنی مثلہ نہ کرو) اور جب تم جانور ذبح کرو تو عمدہ طریقہ پر ذبح کرو، اور (اس کی صورت یہ ہے کہ) تم اپنی چھری خوب تیز کر لو اور ذبیحہ کو آرام پہنچاؤ۔

اور جب ہر چیز میں احسان (نکو کردن) فرض ہے تو عبادات جو کہ اہم امور میں سے ہیں ان میں تو احسان بدرجۂ اولیٰ مطلوب ہوگا۔ عبادات کو عمدہ بنانے کا طریقہ حدیث جبرئیل میں بیان آیا ہے:

أن تعبد الله كأنك تراه، فإن لم تكن تراه فإنه يراك (مشکوٰۃ ج ۲)

اس طرح عبادت کرو کہ گویا تم اللہ کو دیکھ رہے ہو، پس اگر تم اس کو نہیں دیکھ رہے ہو تو وہ تمہیں دیکھ رہے ہیں۔

احسانِ عمل کا پہلا درجہ جو اعلیٰ درجہ ہے وہ تصحیح نیت، استحضار و نسبت یادداشت کو قوی کر کے ہی حاصل کیا جا سکتا ہے اور یہ درجہ حاصل کرنے میں سب سے زیادہ مؤثر فرائض ہیں، پھر نوافل اعمال کا درجہ ہے، مسند احمد (۲۵۰۲۰) میں حدیث ہے:

ما تقرب إلي عبدي بمثل أداء	بندہ فرائض کی ادائیگی کے ذریعہ جتنا قرب حاصل کرتا ہے وہ اور طریقہ
ما افترضت وما يزال العبد يتقرب	سے حاصل نہیں ہوتا۔ اور بندہ نوافل عبادات کے ذریعہ برابر قرب حاصل
إلي بالنوافل حتى أحبه	کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں

پس جو شخص درجۂ احسان حاصل کرنا چاہتا ہے — اور اللہ تعالیٰ ہم سب کو یہ درجہ حاصل کرنے کی توفیق عطا فرمائیں — اس کو فرائض کے بعد نوافل عبادات میں محنت کرنی چاہئے۔ یہی شخص سالک (راہ رو) کہلاتا ہے اور اسی محنت کا نام تصوف ہے۔

فائدہ (۲): تصوف کے لئے احادیث میں دو لفظ استعمال کئے گئے ہیں: ایک احسان، دوسرا زہد۔ پہلا لفظ تو صرف حدیث جبرئیل میں آیا ہے اور دوسرا لفظ متعدد احادیث میں آیا ہے۔ المعجم المفهرس لألفاظ الحديث الشريف میں زهد، وزهد، زهدا اور زهادة کی مراجعت کی جائے تو بہت سی حدیثوں کے حوالے مل جائیں گے۔ غرض پہلے لفظ کو رواج عام حاصل نہیں ہوا اور دوسرا لفظ ہی اسلامی لٹریچر میں عام طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ حدیث کی بنیادی کتابوں میں بھی أبواب الزهد کا عنوان آتا ہے اور الزهد والرقائق کے عنوان سے مستقل کتابیں بھی لکھی گئی ہیں۔ حضرت عبد اللہ بن المبارک رحمہ اللہ کی کتاب الزهد والرقائق طبع بھی ہوگئی ہے۔

اور زہد کے معنی ہیں دنیا سے بے رغبتی۔ اور زاہد چونکہ دنیوی رعنائیوں سے دور رہتے تھے اور صوف (اونی کپڑے) پہنتے تھے اس لئے ان کے لئے لفظ صوفی (اونی کپڑا پہننے والا) اور ان کے لئے لفظ تصوف چل پڑا اور اب یہی لفظ زبان زد ہے۔ غرض احسان، زہد اور تصوف ایک ہی چیز ہیں اور یہ چیز بے اصل نہیں بلکہ نصوص سے ثابت ہے اور جو لوگ اس کا انکار کرتے ہیں وہ غلطی پر ہیں۔

پھر بعد میں تصوف میں عجمی اثرات کی آمیزش ہوئی اور عبادات کے غیر شرعی طریقے رواج پا گئے تو اکابرین نے جیسے علامہ ابن تیمیہ اور علامہ ابن القیم رحمہما اللہ نے عجمی تصوف پر سخت تنقید کی۔ یہ حضرات نفس تصوف کے منکر نہیں تھے، اس کی بگڑی ہوئی صورت پر انکار کرتے تھے۔ جناب محترم مولانا ملک عبدالحفیظ مکی صاحب نے علامہ ابن تیمیہ وغیرہ سلف اکابرین علمائے سلفیہ کی کتابوں سے تصوف کے مضامین جمع کر کے ایک کتاب بنام موقف أئمة الحركة السلفية من التصوف والصوفية مرتب کی ہے اور وہ طبع بھی ہوچکی ہے۔ اسی طرح ابن تیمیہ کے تلمیذ علامہ ابن القیم رحمہ اللہ نے شیخ الاسلام ہروی رحمہ اللہ کی منازل السائرين إلى رب العالمين کی دو جلدوں میں مدارج السالكين کے نام سے شرح لکھی ہے جو مطبوعہ ہے۔

علمائے دیوبند نے تصوف میں سے عجمی تصورات اور غیر شرعی چیزوں کو حتی الامکان نکال دیا ہے۔ یہ حضرات فن تصوف کو شریعت کے دائرہ میں لاکر اس پر عمل کرتے ہیں۔

غرض حضرت شاہ صاحب قدس سرہ اپنی تصانیف میں عام طور پر اور حجۃ اللہ میں خاص طور پر لفظ تصوف استعمال

نہیں کرتے بلکہ اصل اصطلاح احسان استعمال کرتے ہیں۔ حجۃ ثانی میں بھی ابواب الاحسان کا عنوان قائم کیا ہے۔

☆ ☆ ☆

فنِ حکمت شرعیہ کا چوتھا فائدہ

فقہائے کرام میں فروعی مسائل میں اختلافات ہوئے ہیں۔ اور یہ اختلافات علتوں کے اختلاف پر مبنی ہیں، یعنی نص میں مذکور حکم کی علت سمجھنے میں اختلاف ہوا ہے، اس لئے فروعی مسائل میں اختلاف ہو گیا ہے۔

مثلاً اشیائے ستہ کی حدیث میں ربوا کی علت کے استخراج میں اختلاف ہوا ہے تو باب کی جزئیات میں بھی اختلاف ہو گیا ہے۔ اب یہ فیصلہ کرنا کہ کس کی سمجھی ہوئی علت درست ہے، اس کے لئے فنِ حکمت شرعیہ کی ضرورت ہے۔ اب اس فن میں مذکور حکمتوں اور مصلحتوں کے ساتھ فقہاء کی نکالی ہوئی علتوں کا موازنہ کر کے دیکھا جائے گا۔ اور جو علت مصالح وحکم سے ہم آہنگ ہوگی اس کو ترجیح دی جائے گی۔

ومنها: أنه اختلف الفقهاءُ في كثير من الفروع الفقهية، بناءً على اختلافهم في العلل المخرَّجة المناسبة؛ وتحقيقُ ما هو الحقُّ هنالك لايتمُّ إلا بكلامٍ مستقلٍ في المصالح.

ترجمہ: اور ان میں سے ایک (فائدہ) یہ ہے کہ بہت سی جزئیات فقہیہ میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہوا ہے اور یہ اختلاف علتوں میں اختلاف پر مبنی ہے۔ جو احکام کے مناسب نکالی گئی ہیں۔ اب اس اختلاف میں صحیح بات کی تحقیق مصالح پر مستقل گفتگو کئے بغیر ممکن نہیں۔

ترکیب: تحقیق: مبتدا ہے اور لایتم إلخ خبر ہے۔

☆ ☆ ☆

فنِ حکمت شرعیہ کا پانچواں فائدہ

گمراہ فرقوں کو شریعت کے بہت سے مسائل میں شک ہے۔ ان کے خیال میں وہ سب مسائل خلافِ عقل ہیں۔ اور جو چیز خلافِ عقل ہو اس کو رد کر دینا یا تاویل کرنا ضروری ہے۔ مثلاً معتزلہ کو عذابِ قبر میں شک ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ عذابِ قبر مشاہدہ اور عقل کے خلاف ہے۔ ہم میت کو سالوں سردخانہ میں رکھے رہتے ہیں، اس پر کوئی عذاب مشاہدہ میں نہیں آتا۔ دفن کے بعد قبر کھود کر دیکھئے وہاں نہ کوئی بچھو ہے نہ سانپ۔ وہ کہتے ہیں کہ جو مرگیا: مرگیا، اب میت کو تکلیف کیسی؟! ہم بکری ذبح کر کے گوشت پکا کر کھاتے ہیں تو کیا بکری کو تکلیف ہوتی ہے؟

ومنها: أن المبتدعين شككوا في كثير من المسائل الإسلامية: بأنها مخالفة للعقل، وكل ما هو مخالف له يجب ردُّه أو تأويله، كقولهم في عذاب القبر: إنه يكذبه الحس والعقل، وقالوا في الحساب والصراط والميزان نحواً من ذلك، فطفقوا يؤولون بتأويلات بعيدة.

وأثارت طائفة فتنة الشك، فقالوا: لم كان صومُ آخر يوم من رمضان واجبا، وصومُ أول يوم من شوال ممنوعا عنه؟ ونحوَ ذلك من الكلام.

واستهزأت طائفة بالترغيبات والترهيبات، ظانين أنها لمجرد الحث والتحريض، لاترجع إلى أصل أصيل، حتى قام أشقى القوم، فوضع حديث "باذنجانُ لما أكل له" يُعرِّض بأن أمر الأشياء لايتميز عند المسلمين من النافع [?].

ولا سبيل إلى دفع هذه المفسدة إلا بأن تبين المصالح، وتؤسس لها القواعد، كما فعل نحوٌ من ذلك في مخاصمات اليهود والنصارى والدهرية وأمثالهم.

ترجمہ: اور ان میں سے ایک (فائدہ) یہ ہے کہ بدعتیوں نے بہت سے اسلامی مسائل میں یہ کہہ کر شکوک و شبہات ابھارے ہیں کہ وہ خلاف عقل ہیں، اور جو بھی چیز خلاف عقل ہو اس کو رد کرنا یا اس کی تاویل کرنا ضروری ہے۔ مثلاً عذاب قبر کے بارے میں وہ کہتے ہیں کہ مشاہدہ اور عقل عذاب قبر کی تکذیب کرتے ہیں اور ان لوگوں نے حساب، پل صراط اور میزان عمل کے بارے میں بھی اسی قسم کی باتیں کہی ہیں، اور وہ نصوص میں دور دراز کی تاویلیں کرنے لگے ہیں۔

اور ایک فرقے نے تو تشکیک کے فتنہ کو اس طرح ہوا دی ہے کہ اعتراض کیا ہے کہ رمضان کی آخری تاریخ کا روزہ تو فرض ہو اور شوال کی پہلی تاریخ کا روزہ حرام ہو؟ اور اسی قسم کی دیگر بڑبڑاہٹیں!

اور ایک جماعت نے ترغیبات اور ترہیبات (کی نصوص) کا مذاق اڑایا ہے، یہ خیال کرتے ہوئے کہ یہ چیزیں محض ابھارنے اور جوش دلانے کے لئے ہیں، کسی محکم اصول پر ان کی بنیاد نہیں ہے۔ اور یہ سلسلہ یہاں تک بڑھا کہ گروہ میں سے بدبخت ترین شخص (ابن الراوندی) کھڑا ہوا اور اس نے حدیث گھڑ ڈالی کہ "بینگن جس مقصد کے لئے کھایا جائے وہ پورا ہوگا" وہ چوٹ کر رہا ہے کہ مسلمان مضرت رساں اور نفع بخش چیزوں میں تمیز نہیں کرسکتے۔

اور اس قسم کے مفاسد کو دفع کرنے کے لئے سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں کہ مصالح کی وضاحت کی جائے اور ان کے لئے ضوابط مقرر کئے جائیں، جیسا کہ یہود و نصاریٰ اور دہریوں وغیرہ باطل فرقوں کے مقابلے کے لئے ایسا کیا گیا۔

☆ ☆ ☆

فن حکمت شرعیہ کا چھٹا فائدہ

فقہاء نے ایک قاعدہ بنایا ہے کہ ”جو حدیث ہر طرح سے خلاف قیاس ہو اس کو رد کر دیا جائے“ یہ قاعدہ اپنی جگہ صحیح ہے، کیونکہ صریح نقل اور صحیح عقل کے درمیان تعارض نہیں ہو سکتا۔ اگر کسی جگہ نقل اور عقل میں تعارض نظر آئے تو یا تو روایت موضوع یا ضعیف ہوگی یا عقل فاسد ہوگی۔ علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اس موضوع پر ایک عمدہ کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے موافقة صريح المعقول بصحيح المنقول یہ کتاب منہاج السنۃ کے حاشیہ پر بھی طبع ہوئی ہے اور مستقل بھی چھپ گئی ہے۔

غرض قاعدہ صحیح ہے مگر تمام قواعد کلیہ کی طرح (الفقہ قواعد کلیۃ اکثریۃ لا کلیۃ) ہوتے ہیں اس لئے قاعدہ صحیح جگہ بھی لگ سکتا ہے اور غلط جگہ بھی لگ سکتا ہے اسی طرح قواعد کلیہ کے اجراء میں غلطی بھی ہو جاتی ہے چنانچہ بعض حضرات نے یہ قاعدہ حدیث مصرات کے ساتھ جوڑ دیا کہ یہ روایت ہر طرح سے قیاس کے خلاف ہے اس لئے مردود ہے۔ اسی طرح بعض نے یہ قاعدہ قلتین کی حدیث سے جوڑ دیا، حالانکہ یہ دونوں حدیثیں مطابق قیاس ہیں، اسی طرح اور حدیثوں کو بھی خواہ مخواہ اس قاعدہ کی لپیٹ میں لایا گیا ہے۔ اس لئے ضروری ہوا کہ تمام نصوص کی تفسیر بیان کی جائیں تاکہ اگر کوئی شخص مذکورہ قاعدہ کو کسی نص کے ساتھ غلط طور پر جوڑ دے تو اس کو سمجھایا جا سکے کہ یہ قاعدہ اس نص میں جاری نہیں ہوتا۔ اس نص میں مذکور حکم کی حکمت اور مصلحت یہ ہے۔

علاوہ ازیں اس فن کی تدوین میں اور بھی فوائد ہیں، جن کا احاطہ تحریر میں نہیں لایا جا سکتا۔ اور حدیث مصرات یہ ہے ﴿من اشترى شاة مصراة فهو بالخيار ثلاثة أيام، فإن ردها رد معها صاعا من طعام، لا سمراء﴾ (مشکوٰۃ ح ۲۸۴۷) جس نے کوئی ایسی بکری خریدی جس کے تھن میں دودھ روک کر مشتری کو دھوکہ دیا گیا ہو تو اس کو تین دن تک اختیار ہے، پھر اگر وہ بکری واپس کردے تو اس کے ساتھ ایک صاع (تین کلو ایک سو اڑتالیس گرام چھ سو پوائنٹ) غلہ بھی دے، گیہوں دینا ضروری نہیں۔

اور حدیث قلتین یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے اس پانی کے بارے میں دریافت کیا گیا جو جنگل زمین میں ہوتا ہے اور جس پر چوپائے اور درندے باری باری آ کر پانی پیتے ہیں؟ آپ نے فرمایا: ﴿إذا كان الماء قلتين لم يحمل الخبث﴾ (مشکوٰۃ ح ۴۷۷) جب پانی دو مٹکے ہو جائے تو وہ گندگی کو (سر پر) نہیں اٹھاتا یعنی پانی پر کر چلی جاتی ہے۔

نوٹ: حدیث مصرات پر تفصیلی کلام کتاب کی قسم دوم میں باب البیوع المنہی عنہا (رحمۃ اللہ ۴: ۵۷۶) میں آئے گا۔ اور حدیث قلتین پر کلام ابواب الطہارۃ، باب احکام المیاہ (رحمۃ اللہ ۳: ۱۵۷) میں آئے گا۔

ومنها: أن جماعة من الفقهاء زعموا أنه يجوز رد حديث يخالف القياس من كل وجه فتطرق

شاہ صاحب قدس سرہ نے اس قسم کے تفردات بس یونہی سرسری طور پر اختیار نہیں فرمائے، بلکہ گہرے غور وفکر کے بعد جب دیکھا کہ بہت سی آیات واحادیث اور صحابہ وتابعین کے ارشادات اس کی پشت پر ہیں، اور گو عام علماء اس کے قائل نہیں ہیں مگر محققین اور وہ بڑے علماء، جن کو اللہ تعالیٰ نے خصوصی علم عطا فرمایا ہے اس کے قائل رہے ہیں تو شاہ صاحبؒ ان باتوں کے قائل ہوئے ہیں۔

[وجه تفرُّدات المصنف]

وستجدُني إذا غلب عليَّ شِقْشِقَةُ البيان، وأمعنتُ في تمهيد القواعد غايةَ الإمعان، ربما أوجب المقامُ أن أقول بما لم يقل به جُمهور المناظرين من أهل الكلام: كتجلّي الله تعالىٰ في مواطن المعاد بالصُّوَر والأشكال، وكإثبات عالم ليس عنصريا، يكون فيه تجسُّد المعاني والأعمال بأشْباحٍ مناسبةٍ لها في الصفة، وتُخلق فيه الحوادث قبل أن تُخلق في الأرض؛ وارْتباطُ الأعمال بهيئات نفسانية، وكونُ تلك الهيئات في الحقيقة سببا للمجازاة في الحيوة الدنيا وبعد الممات، والقولُ بالقدر المُلْزِم، ونحو ذلك.

فاعْلَمْ أني لم أجْترئْ عليه إلا بعد أن رأيتُ الآياتِ والأحاديثَ وآثارَ الصحابة والتابعين متظاهرةً فيه، ورأيت جماعاتٍ من خواصّ أهل السنة، المتميِّزين منهم بالعلم اللَّدُنّي يقولون به، ويَبْنُوْنَ قواعدَهم عليه.

ترجمہ: اور عنقریب آپ مجھے پائیں گے جب مجھ پر زور بیان غالب آئے گا اور میں قواعد تیار کرنے میں بہت زیادہ گہرائی میں اتروں گا، تو کبھی مقام متقتضی ہوگا کہ میں وہ بات کہوں جو علمائے علم کلام میں سے جمہور مناظرین نے نہیں کہی ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا شکل وصورت کے ساتھ تجلی فرمانا، آخرت کے مواقع میں، اور جیسے ایک ایسے عالم کو ثابت کرنا جو مادی نہیں ہے، جس میں معنویات اور اعمال جسم اختیار کرتے ہیں، ایسی اشکال کے ساتھ، جو ان معانی اور اعمال سے حالت میں مشابہت رکھتے ہیں، اور اس میں واقعات پیدا کئے جاتے ہیں، زمین میں پیدا کئے جانے سے پہلے، اور اعمال کا کیفیات قلبیہ (نیتوں) کے ساتھ جڑا ہوا ہونا اور ان ہیئات کا درحقیقت جزاء وسزا کا سبب ہونا، دنیا کی زندگی میں بھی اور مرنے کے بعد بھی، اور تقدیر مُبْرَم کا قائل ہونا اور اس طرح کے دیگر مسائل۔ پس یہ بات جان لیں کہ میں نے دلیری نہیں کی ہے ان باتوں پر مگر یہ دیکھنے کے بعد کہ آیات واحادیث اور صحابہ وتابعین کے ارشادات اس مسئلہ میں ایک دوسرے کی مدد کرنے والے ہیں، اور میں نے اہل السنہ کے مخصوص لوگوں میں سے متعدد حضرات کو دیکھا جو ان میں

سے علم لدنی کے ساتھ ممتاز ہیں وہ ان باتوں کے قائل رہے ہیں اور وہ ان باتوں پر اپنے قواعد کی بنیاد رکھتے ہیں۔

لغات

الشَّقْشِقَة: جوش مستی میں اونٹ کے منہ کا جھاگ ج شقاشق ورفصیح کے لئے بولا کرتے ہیں حضرت شقشقہ اس کا نقل ہے شَقْشَقَ الجملُ شَقْشَقَة: اونٹ کا جھاگ لانا۔ امعن فی الامر: معاملہ کی گہرائی میں پہنچنا امعن فی الطلب ڈھونڈنے میں بہت مبالغہ کرنا۔ اوجب: واجب کرنا۔ مُناظِر (اسم فاعل) مناظرہ مُناظَرة: بحث کرنا، ماضی میں علم کلام کے بڑے علماء کو "مناظر" کہا جاتا تھا۔ مواطن کا مفرد مَوْطِن: وطن، مقام جنگ۔ المعاد: لوٹنے کی جگہ، آخرت، جنت۔ تجسد: جسم والا ہونا، نمودار ہونا۔۔۔ اشباح کا مفرد الشَّبَح والشَّبْح: شخص، صورت، اشکال، اشباح الاعمال: نظر آنے والا اعمال جیسے اونٹ کا نے بکری وغیرہ۔ مُلْزِم (اسم فاعل) الزم الشیئ: لازم کرنا۔ اجترأ: دلیر ہو جانا۔ جَرُؤ (ک) جراءۃ: دلیری کرنا صفت جری۔۔۔ مظاهرة (اسم فاعل) تظاهر القوم: ایک دوسرے کی مدد کرنا۔

☆　　☆　　☆

اہل حق کون لوگ ہیں اور حق کا معیار کیا ہے؟

یہ بحث یہاں دفع دخل مقدر کے طور پر چھیڑی گئی ہے، یہ بحث بہت اہم اور نہایت مفید ہے، طلبہ اس کو غور سے پڑھیں۔ پیچھے بعض مسائل میں شاہ صاحب کے تفردات کا ذکر آیا تھا، اس پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب شاہ صاحب بعض کلامی مسائل میں اہل السنہ والجماعہ سے متفرد ہیں تو آپ اہل حق میں داخل کہاں رہے؟ اس تفرد سے تو آپ دائرۂ حق سے نکل کر گمراہ لوگوں میں شامل ہو گئے! درج ذیل عبارت میں اس کا جواب ہے کہ علم کلام میں جو مکاتب فکر ہیں ان میں سے کسی معین مکتب فکر کا نام اہل السنہ والجماعہ نہیں ہے کہ جو اس کے عقائد مانے وہ اہل السنہ میں شمار ہو، اور جو کسی بات میں اختلاف کرے وہ اہل حق سے خارج ہو جائے، بلکہ اس کا مدار مسائل پر ہے، بعض منصوص مسائل ہیں جن کو بلا تاویل ماننا ضروری ہے، ان کا جو انکار کرے گا یا تاویل کرے گا وہ اہل حق میں شامل نہ ہوگا، شاہ صاحب قدس سرہ نے ایسے کسی بھی مسئلہ میں تفرد اختیار نہیں کیا۔

اور بعض مسائل غیر اہم اور غیر منصوص ہیں، وہ اہل حق ہونے کا معیار نہیں ہیں، ان کو ماننے والے اور نہ ماننے والے سب اہل السنہ والجماعہ میں شامل ہیں، شاہ صاحب قدس سرہ نے اس دوسری قسم کے بعض مسائل میں متقدمین سے اختلاف کیا ہے، جو کسی طرح بھی مضر نہیں، کیونکہ ایسا کرنے کا ہر ایک کو حق ہے۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ اہل قبلہ یعنی مسلمان ہونے کے لئے ضروری ہے کہ تمام ضروریات دین کو بلا تاویل تسلیم کرے۔ جو شخص ان میں سے کسی بھی بات کو نہیں مانتا یا تاویل کرتا ہے وہ اہل قبلہ میں شامل نہیں ہے، مثلاً کوئی شخص نماز کی ہیئت کذائی فرض نہیں مانتا یا یہ کہتا ہے کہ صلوٰۃ کے معنی دعا کے ہیں، بس دعا کرنا فرض ہے تو وہ شخص دائرۂ اسلام سے خارج ہے۔

اسی طرح عقیدۂ ختم نبوت ضروریات دین میں سے ہے، پس جو شخص اس عقیدہ کا قائل نہیں ہے یعنی حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو آخری پیغمبر نہیں مانتا یعنی آپ کے بعد ہر قسم کی نبوت کے بند ہونے کا قائل نہیں ہے بلکہ آپ کے بعد بھی نبوت کے جاری رہنے کا قائل ہے یا یہ کہتا ہے کہ ختم کے معنی مہر کرنے کے ہیں اور آپ ﷺ کے خاتم النبیین ہونے کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی مہر یعنی تصدیق سے آپ کے بعد بھی نیا نبی آسکتا ہے تو ایسے شخص کا قدم دائرۂ اسلام سے خارج ہے۔

اور ضروریات دین کے معنی ہیں "دین کی بدیہی باتیں" یعنی دین اسلام کی وہ موٹی موٹی باتیں جن کو دین سے واقف ایک عام مسلمان بھی جانتا ہے، جیسے نماز کی ہیئت کذائی، پانچ نمازیں، نمازوں کا فرض ہونا، زکوٰۃ، روزے اور حج کی فرضیت، قرآن کا کتاب اللہ ہونا، رسول اللہ ﷺ کا آخری نبی ہونا وغیرہ دین کی بدیہی باتیں ہیں۔ یہ ضروریات دین کہلاتی ہیں۔

غرض جو لوگ تمام ضروریات دین کو مانتے ہیں وہی اہل قبلہ یعنی مسلمان ہیں، پھر اہل قبلہ میں اختلافات ہوئے اور علیحدہ علیحدہ فرقے اور مختلف جماعتیں بن گئیں۔ ان میں جن مسائل میں اختلافات ہوئے ہیں وہ دو قسم کے مسائل ہیں۔

پہلی قسم: وہ مسائل ہیں جو قرآن وحدیث سے صراحۃً ثابت ہیں اور سلف صالحین یعنی صحابہ وتابعین ان کے قائل رہے ہیں، مثلاً قبر میں سوال وجواب کا ہونا، قیامت کے دن اعمال کا تلنا، پل صراط پر گذرنا، جنت میں اللہ کا دیدار ہونا، اور اولیائے کرام سے کرامتوں کا ظاہر ہونا۔ یہ سب باتیں قرآن وحدیث سے واضح طور پر ثابت ہیں اور سلف صالحین ان سب باتوں کے قائل رہے ہیں، پھر جب خرد وائی کا زمانہ آیا اور کچھ لوگوں کے گمان میں مذکورہ مسائل خلاف عقل ثابت ہوئے تو انھوں نے یا تو ان مسائل کا انکار کردیا یا ان میں تاویل شروع کردی۔

اور امت کے سواد اعظم نے قرآن وحدیث کے ظاہر سے جو کچھ سمجھ میں آتا تھا اس کو لے لیا، اور انھوں نے اس کی قطعاً پرواہ نہیں کی کہ وہ عقل کے موافق ہیں یا مخالف، اگر انھوں نے کسی مسئلہ میں دلائل عقلیہ سے بحث کی بھی تو وہ یا تو مخالفین پر الزام قائم کرنے کے لئے کی یا ان کو جواب دینے کے لئے یا مزید اطمینان قلبی کے لئے کی، ان سے عقائد کو ثابت کرنے کے لئے گفتگو نہیں کی، بلکہ دلائل نقلیہ پر اعتماد کیا اور سلف کے عقائد کو دانتوں سے مضبوط پکڑا، یہی حضرات اہل السنہ یعنی اہل حق ہیں۔

غرض معتزلہ وغیرہ نے جب ان عقائد کو اصول عقلیہ کے خلاف گمان کیا تو تاویل شروع کردی اور نصوص کو ظاہر سے پھیر دیا، اور ان لوگوں نے عقائد کو ثابت کرنے کے لئے اور ان کی نفس الامری حالت کو واضح کرنے کے لئے دلائل

عقلیہ سے بحث شروع کردی، اور سارا مدار عقل پر کردیا۔

اور کچھ بے بصیرت لوگ اس کے قائل ہوئے کہ یہ باتیں اگرچہ سمجھ میں تو نہیں آتیں، نہ عقل ان کی شہادت دیتی ہے پھر بھی ہم بغیر سمجھے ان کو مانتے ہیں۔

شاہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ہم ان سب باتوں پر علی وجہ البصیرت ایمان رکھتے ہیں، وہ سب باتیں ہمارے نزدیک عین عقل کے مطابق ہیں (باقی آگے)

[من هم أهل السنة؟]

وليست "السنة" اسماً في الحقيقة لمذهب خاص من الكلام، ولكن المسائل التي اختلف فيها أهل القبلة، وصاروا لأجلها فِرَقاً متفرقة، وأحزاباً مُتَحَزِّبة، بعد اتفاقهم لضروريات الدين، على قسمين:

[۱] قسمٌ نطقت به الآيات، وصحّت به السنة، وجرى عليه السلف من الصحابة والتابعين؛ فلما ظهر إعجاب كلِّ ذي رأيٍ برأيه، وتشعّبت بهم السُّبُلُ، اختار قومٌ ظاهر الكتاب والسنة، وعضّوا بنواجذهم على عقائد السلف، ولم يُبالوا بموافقتها للأصول العقلية، ولا لمخالفتها لها؛ فإن تكلموا بالمعقول فلإلزام الخصوم والردّ عليهم، أو لزيادة الطمأنينة، لا لاستفادة العقائد منها، وهم أهل السنة.

وذهب قومٌ إلى التأويل والصرف عن الظاهر، حيث خالفت الأصول العقلية بزعمهم، فتكلموا بالمعقول لتحقُّق الأمر وتنبُّه على ما هو عليه.

فمن هذا القسم: سؤال القبر، ووزنُ الأعمال، والمرورُ على الصراط، والرؤيةُ، وكراماتُ الأولياء؛ فهذا كلُّه ظهر به الكتابُ والسنة، وجرى عليه السلف، ولكن ضاق نطاق المعقول عنها بزعم قوم، فأنكروها أو أوَّلوها.

وقال قومٌ منهم: آمنا بذلك وإن لم ندرِ حقيقته، ولم يشهد له المعقولُ عندنا.

ونحن نقول: آمنا بذلك كلِّه على بينة من ربنا، ويشهد له المعقولُ عندنا.

ترجمہ: اور "السنۃ" درحقیقت علم کلام کے کسی خاص مکتب فکر کا نام نہیں ہے، بلکہ جن مسائل میں اہل قبلہ نے اختلاف کیا ہے، اور وہ ان مسائل کی وجہ سے متفرق جماعتیں اور علحدہ علحدہ گروہ بن گئے ہیں، دین کی بدیہی باتوں کی تابعداری کرنے کے بعد، وہ دو قسم کے مسائل ہیں:

(۱) کچھ مسائل وہ ہیں جن کی آیات کریمہ نے صراحت کی ہے اور ان کے ساتھ احادیث ثابت ہوئی ہیں (یعنی وہ

مسائل صحیح احادیث سے ثابت ہیں) اور ان پر سلف یعنی صحابہ و تابعین چلے ہیں (یعنی وہ ان باتوں کے قائل رہے ہیں) پھر جب ہر صاحب رائے کا اپنی رائے پر اترانا ظاہر ہوا (یعنی خود رائی کا زمانہ آیا) اور راستے لوگوں کو الگ الگ گھاٹیوں میں لے گئے (یعنی وہ مختلف راستوں پر پڑ گئے) تو کچھ لوگوں نے کتاب و سنت کے ظاہر کو اختیار کیا، اور انھوں نے سلف کے عقائد کو داڑھوں سے مضبوط پکڑا۔ اور انھوں نے کچھ پرواہ نہ کی ان مسائل کے اصول عقلیہ کے موافق ہونے کی، اور نہ ان کے ان اصول کے خلاف ہونے کی، پھر اگر ان لوگوں نے دلائل عقلیہ سے گفتگو کی تو وہ مقابل پر الزام قائم کرنے کے لئے کی اور ان کو جواب دینے کے لئے کی یا مزید اطمینان قلبی حاصل کرنے کے لئے کی، ان دلائل عقلیہ سے عقائد کو حاصل کرنے کے لئے نہیں کی۔ اور یہی حضرات اہل السنۃ ہیں۔

اور ایک قوم تاویل کی طرف اور (نصوص کو) ظاہر سے پھیرنے کی طرف گئی، جہاں بھی وہ عقائد ان کے گمان میں اصول عقلیہ کی خلاف نظر آئے، چنانچہ ان لوگوں نے دلائل عقلیہ سے گفتگو کی معاملہ (عقائد) کا یقین کرنے کے لئے اور ان کی وضاحت کرنے کے لئے اس طور پر جس طور پر وہ عقائد ہیں (یعنی ان لوگوں نے عقائد کے اثبات کے لئے دلائل عقلیہ سے گفتگو کی)

پس اس قسم کے مسائل میں سے ہیں: قبر کا سوال، اعمال کا تلنا، پل صراط پر گذرنا، رویت باری تعالیٰ اور اولیاء کی کرامتیں: پس یہ تمام باتیں کتاب و سنت نے واضح طور پر ثابت ہیں اور ان پر سلف چلتے رہے ہیں، مگر ایک قوم کے گمان میں عقل کا پیالہ ان عقائد سے تنگ ہو گیا (یعنی وہ مسائل ان کی عقل کی سمائی میں نہیں آئے) پس ان لوگوں نے ان عقائد کا انکار کیا یا ان کی تاویل کی۔

اور ان میں سے ایک قوم نے کہا کہ ہم ان باتوں کو مانتے ہیں، اگرچہ ہم ان کی حقیقت نہیں سمجھے، اور نہ ان کے لئے ہمارے نزدیک عقل گواہی دیتی ہے۔

اور ہم کہتے ہیں کہ ہم ان سب باتوں پر ہمارے رب کی طرف سے ایک بڑی دلیل کے ساتھ ایمان لاتے ہیں اور ان کے لئے ہمارے نزدیک عقل گواہی دیتی ہے (یعنی وہ مسائل دلائل عقلیہ سے بھی ثابت ہیں)۔

تشریح:

١- مرنے اور دفن ہونے کے بعد قبر میں انسان کا دوبارہ زندہ ہو کر فرشتوں کے سوالات کا جواب دینا، پھر اس امتحان میں کامیابی اور ناکامی پر ثواب یا عذاب کا ہونا قرآن مجید کی تقریباً دس آیات میں اشارۃً اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ستر احادیث متواترہ میں بڑی صراحت و وضاحت کے ساتھ مذکور ہے، جس میں مسلمان کو شک و شبہ کی گنجائش نہیں (معارف القرآن مفتی شفیع ج۵ ص١٣٩ کراچی)

۲- پل صراط پر گذرنے کا تذکرہ سورہ مریم آیت ۷۱ میں اشارۃً اور بے شمار احادیث میں صراحت اور وضاحت کے ساتھ آیا ہے۔

۳- رؤیت باری کا تذکرہ جنت کی آیات میں صراحۃً اور اشارۃً آیا ہے مثلاً سورۃ القیامۃ آیت ۲۳ اور احادیث میں بھی یہ مضمون بکثرت وارد ہوا ہے۔

۴- متعدد کرامات اولیاء کا تذکرہ قرآن کریم میں ہے مثلاً پلک جھپکنے سے پہلے تخت بلقیس کو لانے کا تذکرہ سورۃ النمل آیات ۳۸-۴۰ میں ہے اور کھجور کے تنے کو حرکت دینے سے تر کھجوروں کا جھڑنا سورۂ مریم آیت ۲۵ میں مذکور ہے اور احادیث میں صحابہ کرام کی بے شمار کرامتوں کا تذکرہ آیا ہے۔

لغات: تحقق الرجل الامر: یقین کرنا - تبین الشیء: واضح کرنا۔

☆ ☆ ☆

دوسری قسم کے مسائل وہ ہیں جو نہ تو قرآن کریم میں صراحۃً مذکور ہیں، نہ احادیث مشہورہ سے ثابت ہیں، نہ ان کے سلسلہ میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین نے لب کشائی کی ہے، بلکہ وہ مسائل ان کے پیچھوں پر لپٹے رکھے تھے، تا آنکہ بعد اہل علم آئے جنہوں نے ان مسائل کو چھیڑا، اور ان میں اختلاف ہوا۔ اسی قسم کے اجتہادی مسائل کسی کو بھی اہل السنہ سے خارج نہیں کرتے۔ شاہ صاحب قدس سرہ کا تفرد اسی قسم کے مسائل میں ہے۔

رہی یہ بات کہ جب ان مسائل کو سلف نے نہیں چھیڑا تھا تو متاخرین نے ان کو کیوں چھیڑا؟ تو اس سلسلہ میں جاننا چاہئے کہ متاخرین نے وہ مسائل تین وجوہ سے چھیڑے ہیں۔

پہلی وجہ: متاخرین نے وہ مسائل دلائل نقلیہ سے یعنی قرآن و حدیث سے مستنبط کئے ہیں۔ یعنی جب بعد کے علماء نے آیات و احادیث کی تفسیر کی اور تمام ممکن مسائل مستنبط کئے تو وہ مسائل زیر بحث آئے اور ان میں اختلاف ہو گیا، جیسے انبیاء کا ملائکہ سے افضل ہونا اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے افضل ہونا۔

دوسری وجہ: علم کلام میں بعض مسائل اہل علم نے اس لئے چھیڑے ہیں کہ ان کو اسلامی مسائل کا موقوف علیہ سمجھ لیا گیا ہے یعنی یہ خیال کیا گیا ہے کہ جب تک وہ مسائل طے نہیں ہوں گے اسلامی مسائل ثابت نہیں ہوں گے، جیسے امور عامہ کے تمام مسائل اور جوہر و عرض کے بعض مسائل۔ پھر شاہ صاحب نے اس قسم کے مسائل کی چند مثالیں دی ہیں۔

تیسری وجہ: جو کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ امت کو پہنچی ہے اس پر تو سب کا اتفاق ہے مگر اس کی تفصیل و تفسیر میں اختلاف ہوا ہے۔ شاہ صاحب نے اسی سلسلہ میں صفات باری تعالیٰ سے تعلق رکھنے والے تین مسائل کا تذکرہ کیا ہے۔ جن کی تفصیل بعد میں آئے گی۔

[۲] وقسم لم ينطق به الكتابُ، ولم تستفِض به السنةُ،ولم يتكلم فيه الصحابةُ، فهو مطوِيٌّ على غِرّه، فجاء ناس من أهل العلم فتكلموا فيه، واختلفوا، وكان خوضُهم فيه:

[الف] إما استنباطا من الدلائل النقلية، كفضل الأنبياء على الملائكة، وفضل عائشة على فاطمة رضي الله عنهما.

[ب] وإما لتوقُّف الأصولِ الموافقة للسنَّة عليه،وتعلُّقِها به بزعمهم: كمسائل الأمور العامة، وشيئ من مباحث الجواهر والأعراض؛ فإن القولَ بحدوث العالَم يتوقف على إبطال الْهَيُوْلَى وإثباتِ الجزء الذي لايتجزّى، والقول بخلق الله تعالى العالَم بلا واسطة يتوقف على إبطال القضية القائلة بأن الواحد لايصدُر عنه إلا الواحدُ، والقولُ بالمعجزات يتوقف على إنكار اللزوم العقلي بين الأسباب ومُسَبَّباتها، والقولُ بالمعاد الجسماني يتوقف على إمكان إعادة المعدوم؛ إلى غير ذلك مما شَحَنُوا به كُتُبَهُمْ.

[ج] وإما تفصيلا وتفسيرًا لما تلقَّوه من الكتاب والسنة، فاختلفوا في التفصيل والتفسير بعد الاتفاق على الأصل.

كما اتفقوا على إثبات صفتَي السمع والبصر، ثم اختلفوا: فقال قوم: هماصفتان راجعتان إلى العلم بالمسموعات والمبصَرات؛ وقال آخرون: هما صفتان على حدَتِهما؛

وكما اتفقوا على أن الله تعالى حيٌّ، عليم، مُرِيْدٌ، قدير، متكلم، ثم اختلفوا: فقال قوم إنما المقصودُ إثباتُ غاياتِ هذه المعاني من الآثار والأفعال، وأنْ لا فرق بين هذه السبع وبين الرحمة والغضب والجود في هذا وأن الفرق لم تُثْبِته السنةُ؛ وقال قوم: هي أمور موجودة قائمة بذات الواجب.

واتفقوا على إثبات الاستواء على العرش، والوجه، والضَّحك، على الجملة، ثم اختلفوا: فقال قوم: إنما المرادُ معانٍ مناسِبةٌ: فالاستواء، هوالاستيلاء، والوجهُ الذاتُ؛ وطَوَاها قوم على غِرّها، وقالوا: لا ندري ماذا أريد بهذه الكلمات؟

ترجمہ: اور دوسری قسم: وہ مسائل ہیں جن کی قرآن کریم نے صراحت نہیں کی، نہ ان کے ساتھ حدیثیں مشہور ہوئیں یعنی احادیث مشہورہ میں بھی وہ باتیں نہیں آئیں ہیں اور نہ ان کے سلسلہ میں صحابہ نے گفتگو کی ہے، پس وہ باتیں لپٹی رکھی تھیں ان کے پیچ پر، پھر آئے کچھ اہل علم پس انھوں نے ان مسائل میں گفتگو کی، اور ان میں اختلاف ہوا، اور ان کا ان مسائل میں گھسنا تھا:

(الف) یا تو دلائل نقلیہ سے استنباط کرتے ہوئے، جیسے انبیاء کی برتری ملائکہ پر، اور حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی برتری حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا پر۔

(ب) اور یا اہل حق کے موافق اصول کے موقوف ہونے کی وجہ سے ان مسائل پر، اور ان اصول اسلامیہ کے جڑے ہوئے ہونے کی وجہ سے ان مسائل کے ساتھ، ان حضرات کے گمان میں، جیسے امور عامہ کے مسائل اور جوہر وعرض کے کچھ مباحث، پس بیشک عالم کے حادث ہونے کا قول موقوف ہے ہیولیٰ کے ابطال پر اور جزء لا یتجزیٰ کے اثبات پر، اور اللہ تعالیٰ کے عالم کو بلا واسطہ پیدا کرنے کا قول موقوف ہے اس ضابطہ کے توڑنے پر کہ "واحد سے واحد ہی صادر ہو سکتا ہے" اور معجزات کا عقیدہ موقوف ہے اسباب اور ان کے مسببات کے درمیان لزوم عقلی نہ ہونے پر، اور معاد جسمانی کا عقیدہ موقوف ہے معدوم کے اعادہ کے ممکن ہونے پر، وغیرہ وغیرہ مسائل، جن سے علماء نے اپنی کتابیں بھر دی ہیں۔

(ج) اور یا چھیڑے گئے ہیں وہ مسائل تفصیل وتفسیر کرتے ہوئے، اس کتاب وسنت کی جس کو لوگوں نے حاصل کیا ہے، پس علماء نے اصل باتوں پر اتفاق کرنے کے بعد ان کی تفصیل وتفسیر میں اختلاف کیا ہے۔ جیسے تمام علماء اللہ تعالیٰ کے لئے صفت سمع اور صفت بصر ثابت کرنے پر متفق ہیں، پھر ان میں اختلاف ہوا، پس کچھ لوگوں نے کہا کہ وہ دو صفتیں ہیں لوٹنے والی ہیں مسموعات اور مبصرات کو جاننے کی طرف، اور دوسروں نے کہا کہ وہ دو علحدہ صفتیں ہیں۔

اور جیسے تمام علماء متفق ہیں کہ اللہ تعالیٰ زندہ ہیں، جاننے والے ہیں، ارادہ کرنے والے ہیں، پوری قدرت رکھنے والے ہیں اور کلام فرمانے والے ہیں، پھر ان میں اختلاف ہوا، پس کچھ لوگوں نے کہا کہ مقصود ان صفات کے معانی کے نتائج کو یعنی ان کے آثار وافعال کو ثابت کرنا ہے (یعنی بذات خود یہ صفات ثابت کرنا مقصود نہیں) اور (انھوں نے) یہ بھی کہا کہ ان سات میں اور صفت رحمت وغضب وجود (وغیرہ صفات فعلیہ) میں اس بارے میں کوئی فرق نہیں (یعنی سب سے مقصود غایات کا اثبات ہے) اور یہ بھی کہا کہ ان کے درمیان احادیث نے کوئی فرق ثابت نہیں کیا۔ اور کچھ لوگوں نے کہا کہ یہ ساتوں صفات امور موجودہ ہیں، واجب تعالیٰ کی ذات کے ساتھ قائم ہیں۔

اور جیسے تمام علماء اللہ تعالیٰ کے لئے بالاجمال یعنی بلا تفصیل عرش پر استواء (قرار پکڑنا) اور چہرہ اور ہنسنا ثابت کرنے پر متفق ہیں، پھر ان میں اختلاف ہوا، پس کچھ لوگوں نے کہا کہ مراد اللہ کے شایان شان معانی ہیں، پس استواء بمعنی غلبہ ہے اور چہرہ سے مراد ذات ہے اور کچھ لوگوں نے ان صفات متشابہات کو ان کے پیچ پر لپیٹ دیا، اور کہا کہ ہم نہیں جانتے کہ ان کلمات سے کیا مراد ہے؟

(۱) انسان افضل ہیں یا ملائکہ؟ سورۃ البقرۃ آیات ۳۰-۳۴ میں انسان کی خلافت ارضی کا ذکر آیا ہے، اس موقعہ پر ملائکہ نے خود کو خلافت ارضی کے لئے پیش کیا تھا مگر اللہ تعالیٰ نے فرمادیا تھا کہ: "میں اس بات کو جانتا ہوں جس کو تم نہیں جانتے" پھر اللہ تعالیٰ نے سب کو معرض امتحان میں کھڑا کیا تھا، ملائکہ اشیائے عالم کی حقیقت نہیں بتا سکے تھے اور حضرت

آدم علیہ السلام نے سب باتیں فرفر بتاری تھیں، پھر حضرت آدم علیہ السلام کو گویا ملائکہ کا قبلہ بنایا گیا اور سجود و مساجد سے افضل ہوتے ہیں پس اس واقعہ سے انسان کی یا کم از کم انبیاء کی ملائکہ پر فضیلت ثابت ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں ﴿أُولَٰئِكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ﴾ سے بھی انسان کی فضیلت پر استدلال کیا گیا ہے۔ اسی طرح سورۂ بنی اسرائیل آیت ۷۰ میں ارشاد ہے ﴿وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ﴾ (ہم نے اولادِ آدم کو عزت بخشی) اس سے بھی انسان کے اشرف المخلوقات ہونے پر استدلال کیا گیا ہے اور چونکہ انبیاء تمام انسانوں سے افضل ہیں اس لئے وہ تمام فرشتوں سے بھی افضل ہوئے۔

مگر پہلی دلیل پر یہ اشکال کیا گیا ہے کہ مسجود ہونے سے فضیلت ثابت نہیں ہوتی، ہاں معبود ہونا فضیلت پر دلالت کرتا ہے مگر حضرت آدم علیہ السلام کو معبود نہیں بنایا گیا تھا، کیونکہ غیر اللہ کی عبادت جائز نہیں، ان کو صرف قبلۂ سجدہ بنایا گیا تھا اور سجدہ یعنی عبادت درحقیقت اللہ تعالیٰ کے لئے تھی، پس جس طرح کعبہ شریف کو قبلۂ توجہ بنا کر دنیا کے لوگ سب نماز پڑھتے ہیں مگر کعبہ شریف (عمارت) انبیاء سے افضل نہیں۔ اسی طرح حضرت آدم علیہ السلام کو مسجودِ ملائکہ ہونے سے ان کا ملائکہ سے افضل ہونا لازم نہیں آتا۔

اور دوسری دلیل کے بارے میں کہا گیا ہے کہ البریۃ سے مراد صرف زمینی مخلوقات ہیں، ملائکہ اس میں شامل نہیں اور لَقَدْ كَرَّمْنَا سے استدلال آخر آیت سے متعارض ہے، کیونکہ عَلَىٰ كَثِيرٍ کی قید ملائکہ کو نکالنے کے لئے ہے۔ اور ارشاد باری تعالیٰ ﴿بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُونَ﴾ (انبیاء ۲۶) وغیرہ آیات ملائکہ کی فضیلت پر دلالت کرتی ہیں، جس کی تفصیل کتب تفاسیر میں مذکورہ بالا آیات کے تحت ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔

غرض کسی نے انسان کی اور کسی نے انبیاء کی ملائکہ پر فضیلت آیات سے مستنبط کی ہے اور کسی نے اس کے برعکس ملائکہ کی فضیلت ثابت کی ہے اور ہر فریق کے استدلال میں گونہ قوت ہے اور اس مسئلہ میں تحقیقی بات یہ ہے کہ

"عام مؤمنین صالحین جیسے اولیاء اللہ، عام فرشتوں سے افضل ہیں۔ اور خواص ملائکہ جیسے حضرت جبرئیل، حضرت میکائیل وغیرہ عام مؤمنین صالحین سے افضل ہیں۔ اور خواص مؤمنین جیسے انبیائے کرام، وہ خواص ملائکہ سے بھی افضل ہیں اور کفار و فجار فرشتوں سے تو کیا افضل ہوتے، وہ تو جانوروں سے بھی اصل مقصد تخلیق میں افضل نہیں، بلکہ کفار تو چوپایوں سے بھی زیادہ گمراہ ہیں" (مظہری)

(۲) حضرت عائشہؓ افضل ہیں یا حضرت فاطمہؓ؟ یہ کافی الجھا مسئلہ ہے، کیونکہ روایات مختلف وارد ہوئی ہیں، بعض سے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی فضیلت ثابت ہوتی ہے، بعض سے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی، بعض سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی اور بعض سے حضرت مریم رضی اللہ عنہا کی، جس کی تفصیل درج ذیل ہے۔

(۱) بخاری شریف میں روایت ہے کہ خیر نسائها مریم، وخیر نسائها خدیجۃ (حضرت مریمؑ اپنے زمانہ کی عورتوں سے افضل ہیں، اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا اپنے زمانہ کی عورتوں سے افضل ہیں) اس حدیث سے حضرت

خدیجہؓ نیز حضرت عائشہؓ اور حضرت زینب رضی اللہ عنہم پر برتری ثابت کی گئی ہے۔

(۲) بخاری شریف میں روایت ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا: فاطمة بضعة منی (فاطمہ میرا ٹکڑا ہے) اور آپ افضل کائنات ہیں پس آپ کے جسم کا ٹکڑا بھی یقیناً افضل ہوگا، پس حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا تمام خواتین سے افضل ہوئیں۔

اور بخاری شریف میں یہ روایت بھی ہے کہ فاطمة سیدة نساء أهل الجنة (حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا تمام جنتی عورتوں کی سردار ہیں) اس سے بھی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی فضیلت ثابت ہوتی ہے۔

اور بعض حضرات پہلی حدیث سے صرف آپ کی صاحبزادیوں پر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی فضیلت ثابت کرتے ہیں حضرت خدیجہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہما پر نہیں، وہ کہتے ہیں مگر دوسری حدیث فضیلت کلی میں صریح ہے۔

(۳) بخاری ومسلم کی روایت ہے کہ فضل عائشة علی النساء كفضل الثريد علی سائر الطعام (عائشہؓ کی برتری دوسری عورتوں پر ایسی ہے جیسی ثرید کی برتری دوسرے تمام کھانوں پر) اس حدیث میں لفظ النساء عام ہے پس حضرت خدیجہ اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہما پر بھی حضرت عائشہؓ کی برتری ثابت ہوئی۔

مگر یہ بھی احتمال ہے کہ الف لام عہد کا ہو، اور معہود بوقت ارشاد موجودہ ازواج مطہرات ہوں، پس اس حدیث سے حضرت خدیجہ اور حضرت فاطمہ پر برتری ثابت نہ ہوگی۔

(۴) نسائی شریف میں بسند صحیح حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ افضل نساء أهل الجنة خديجة وفاطمة ومريم وآسية اس روایت میں حضرت عائشہؓ کا سرے سے تذکرہ ہی نہیں۔

اور علامہ ابن عبدالبر کی روایت کے الفاظ یہ ہیں سيدة نساء العالمين مريم، ثم فاطمة، ثم خديجة ثم آسية مگر حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ الحديث الثاني الدال على الترتيب ليس بثابت وأصله عند أبي داود والحاكم بغير صيغة ترتيب (فتح ۷: ۱۳۵)

غرض یہ بہت الجھا ہوا مسئلہ ہے، اس میں کوئی قطعی فیصلہ یا ترجیح ممکن نہیں، اور اس کی ضرورت بھی نہیں اس لئے توقف بہتر ہے والعلم عند الله، وهو أعلم بعباده۔

(۶) امور عامہ: وہ مفاہیم ہیں جو موجودات ثلاثہ (واجب، جوہر اور عرض) میں سے کسی ایک کے ساتھ خاص نہیں ہیں، خواہ وہ تینوں اقسام کو شامل ہوں جیسے وجود (پایا جانا) وحدت (اکائی) کیونکہ ہر موجود خواہ وہ کتنا ہی کثیر ہو اس کے لئے کسی نہ کسی اعتبار سے اکائی ہوتی ہے جیسے انسان باوجود کثرت افراد کے سب انسان ہیں۔ یا ان میں سے دو قسموں کو شامل ہوں، جیسے امکان خاص، حدوث، وجوب بالغیر، کثرت، معلولیت، یہ سب مفاہیم جوہر وعرض میں مشترک ہیں۔

جوہر: حکماء کے نزدیک وہ ممکن ہے جو بغیر محل کے پایا جاسکے یعنی وہ اپنے وجود میں کسی محل کا محتاج نہ ہو، جیسے تمام

جسم ہو۔ اور متکلمین کے نزدیک جوہر وہ حادث (نوپید) ہے جو بذات خود متحیز ہو اور تحیز کے معنی ہیں کسی مکان میں ہونا۔ پس واجب تعالیٰ جوہر نہیں، کیونکہ وہ متمکن ہیں نہ حادث۔

عرض: جوہر کا متقابل ہے۔ حکماء اس کی تعریف کرتے ہیں: وہ شی جو بغیر محل کے نہ پایا جاسکے، یعنی وہ اپنے وجود اور قیام میں کسی محل کا محتاج ہو جیسے تمام صفات اور کیفیات وغیرہ۔ اور متکلمین کے نزدیک عرض وہ حادث ہے جو بذات خود متحیز نہ ہوسکے، پس اللہ تعالیٰ عرض بھی نہیں۔

فائدہ: یہ علم کلام کی ابحاث کی طرف اشارہ ہے۔ قاضی عضد الدین ایجی رحمہ اللہ (متوفی ۷۵۶ھ) نے جو آٹھویں صدی کے علم کلام کے ماہر عالم ہیں، اپنی کتاب المواقف کے مواقف ستہ میں سے دوسرا موقف امور عامہ میں اور تیسرا موقف عرض کے بیان میں اور چوتھا موقف جوہر کے بیان میں لکھا ہے۔ علامہ سید شریف جرجانی رحمہ اللہ (متوفی ۸۱۶ھ) نے اس کی عمدہ شرح لکھی ہے، جو شرح المواقف کے نام سے مشہور ہے اور مطبوعہ ہے، اور علم کلام کی بنیادی کتاب سمجھی جاتی ہے۔

شاہ صاحب قدس سرہ فرماتے ہیں کہ امور عامہ کی یہ تمام ابحاث وجوہر وعرض کے بعض مسائل علم کلام کی کتابوں میں اس لئے چھیڑے گئے ہیں کہ ان کو مسائل اسلامیہ کا موقوف علیہ سمجھا گیا ہے اور اس سلسلہ میں شاہ صاحب رحمہ اللہ نے چار مثالیں دی ہیں، ان کی وضاحت درج ذیل ہے:

پہلی مثال: فلاسفہ کے نزدیک جزء لایتجزی باطل ہے اور ہیولیٰ ثابت ہے اس لئے عالم قدیم ہے اور متکلمین کے نزدیک جزء ثابت ہے اور ہیولیٰ باطل ہے، اس لئے عالم حادث (نوپید) ہے۔ غرض ہیولیٰ کا ابطال اور جزء لایتجزی کا اثبات علم کلام میں اس لئے کیا جاتا ہے کہ حدوث عالم کا ثبوت اس پر موقوف سمجھا گیا ہے، تفصیل کے لئے معین الفلسفہ دیکھیں۔

دوسری مثال: متکلمین کے نزدیک اللہ تعالیٰ نے تمام عالم کو بذات خود بلا واسطہ پیدا کیا ہے اور حکماء کا خیال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بلا واسطہ صرف عقل اول کو پیدا کیا ہے اور باقی عالم کو عقول عشرہ کے توسط سے پیدا کیا ہے، ان کے نزدیک عقول عشرہ بھی اللہ تعالیٰ کی طرح خالق ہیں، اس کی تفصیل بھی معین الفلسفہ میں دیکھیں۔

اور فلاسفہ نے وسائط کا سہارا اس لئے لیا ہے کہ ان کے خیال میں واحد حقیقی سے یعنی اس ذات سے جو ہمہ وجوہ واحد یگانہ ہے، جس میں کسی بھی اعتبار سے کثرت اور دوئی نہیں ہے، اس سے صرف ایک ہی چیز صادر ہوسکتی ہے، اگر اس سے متعدد چیزیں صادر ہونگی تو نسبتوں میں تعدد پیدا ہوجائے گا، جو وحدت پر اثر انداز ہوگا اور ذات واحد حقیقی نہ رہے گی، واحد اعتباری ہوکر رہ جائے گی، جو توحید کی منافی ہے۔

اور اسلامی نقطۂ نظر سے خالق صرف اللہ تعالیٰ ہیں، صفت خلق میں ان کا کوئی شریک وسہیم نہیں، سارا عالم اللہ تعالیٰ نے بذات خود بلا واسطہ پیدا کیا ہے۔ اور متکلمین کے نزدیک فلاسفہ کا مذکورہ قاعدہ سرے سے باطل ہے، ان کے نزدیک جہتوں اور نسبتوں کا تعدد توحید کے منافی نہیں، جس طرح صفات الٰہیہ کا ثبوت اور تعدد توحید کے منافی نہیں، کیونکہ صفت نہ عین

ذات ہیں نہ غیر ذات۔ اگر وہ بھی وجود متغائرہ ہوتیں تو توحید کے منافی ہوتیں، اسی طرح صفت خلق کی نسبتوں کا تعدد یعنی اللہ تعالیٰ کا آسمانوں کو پیدا کرنا، زمین کو پیدا کرنا، انسان کو پیدا کرنا وغیرہ یہ نسبتوں کا تعدد بھی توحید پر اثر انداز نہیں ہوتا۔ اس لئے متکلمین فلاسفہ کے مذکورہ قاعدہ الواحد لایصدر عنہ الا الواحد کو باطل کرتے ہیں، تاکہ اللہ تعالیٰ کا بلاواسطہ خالق عالم ہونا ثابت کیا جاسکے۔

تیسری مثال: یہ دنیا دارالاسباب ہے یعنی یہاں ہر چیز سبب ومسبب کی زنجیر میں جکڑی ہوئی ہے، کوئی چیز اس کے دائرہ سے باہر نہیں۔ اور معجزہ اس خرق عادت معاملہ کا نام ہے جس میں بظاہر سبب ومسبب کا سلسلہ نظر نہیں آتا، پس معجزات کا ثبوت اس امر پر موقوف ہے کہ پہلے یہ ثابت کیا جائے کہ اسباب ومسببات کے درمیان عقلاً لزوم نہیں، صرف عادۃً ہے یعنی عام طور پر مسببات، اسباب کے نتائج ہوتے ہیں اور اسباب کے بعد مسببات وجود پذیر ہوتے ہیں مگر عقلاً ایسا ہونا ضروری نہیں، اسباب کے بغیر بھی مسببات وجود پذیر ہوسکتے ہیں، کیونکہ اسباب صرف اسباب ہیں، خدا نہیں جن کے مسببات محتاج ہوں، مسبب الاسباب اللہ تعالیٰ ہیں، اسی طرح اسباب سے مسببات مختلف بھی ہوسکتے ہیں، جیسے ابراہیم علیہ السلام کو آگ کا نہ جلانا بلکہ برد وسلام بن جانا۔

چوتھی مثال: قیامت کے دن جو حشر قائم ہوگا وہ صرف روحانی نہیں ہوگا، بلکہ جسمانی ہوگا یعنی وہی جسم جو پہلی زندگی میں تھا، اس کو دوبارہ پیدا کیا جائے گا، مشرکانہ، ملحدانہ اور فلسفیانہ ذہن اس کو قبول نہیں کرتا، وہ کہتے ہیں کہ جو چیز معدوم ہوگئی وہ دوبارہ سابق حالت کی طرف کیسے لوٹائی جاسکتی ہے؟ ان کے خیال میں معدوم کا اعادہ محال ہے، پس معاد جسمانی کا اثبات اس پر موقوف ہے کہ اعادۂ معدوم کے استحالہ کو باطل کیا جائے تاکہ معاد جسمانی کا امکان ثابت ہوسکے۔

اور صفات باری تعالیٰ کے تعلق سے شاہ صاحب رحمہ اللہ نے تین مسائل ذکر کئے ہیں، جن کی تفصیل درج ذیل ہے:

صفت وہ لفظ ہے جو کسی ذات کے بعض احوال پر دلالت کرے، جیسے سرخ، سیاہ، نیک، بد وغیرہ صفات ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کی صفات کو اسمائے حسنیٰ (اچھے نام) بھی کہا جاتا ہے۔ قرآن کریم میں اور احادیث شریفہ میں اللہ تعالیٰ کی بہت سی صفات کا تذکرہ آیا ہے، ان میں سے سات متفق علیہ صفات ازلیہ اور صفات حقیقیہ ہیں۔ اور وہ یہ ہیں (۱) حیات (۲) علم (۳) قدرت (۴) ارادہ (۵) سمع (۶) بصر (۷) کلام۔ ان کو صفات ذاتیہ بھی کہتے ہیں یعنی وہ صفات جن کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو متصف کیا جاتا ہے اور ان کی اضداد کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو متصف نہیں کیا جاسکتا۔ باقی مختلف فیہ صفات فعلیہ ہیں یعنی ان کے ساتھ بھی اور ان کی اضداد کے ساتھ بھی اللہ تعالیٰ کو متصف کیا جاتا ہے، جیسے رضا (خوش ہونا) اور سخط (ناخوش ہونا) رحمت اور غضب وغیرہ۔ صفات فعلیہ کو صفات اضافیہ بھی کہتے ہیں۔

اور اللہ تعالیٰ کی کچھ صفات ایسی بھی ہیں جن سے اللہ تعالیٰ کے مخلوق کے مشابہ ہونے کا وہم پیدا ہوتا ہے۔ یہ صفات متشابہات یعنی مخلوق سے ملتی جلتی صفات کہلاتی ہیں، جیسے اللہ تعالیٰ کا عرش (تخت) پر استواء یعنی جم کر بیٹھنا، جو قرآن

پاک کی سات سورتوں میں مذکور ہے اور اللہ تعالیٰ کا آسمان دنیا پر نزول (اترنا) جس کا صحیح حدیث میں ذکر ہے اور اللہ کا چہرہ اور ہاتھ وغیرہ ہونا جن کا تذکرہ قرآن میں بھی ہے اور بے شمار احادیث میں بھی۔ یہ سب صفات متشابہات کہلاتی ہیں۔

اس تمہید کے بعد جاننا چاہئے کہ شاہ صاحب رحمہ اللہ نے صفات کے تعلق سے جو تین مسائل بیان کئے ہیں وہ یہ ہیں:

پہلا مسئلہ: صفت سمع (سننا) اور صفت بصر (دیکھنا) بے شمار آیات واحادیث سے اللہ تعالیٰ کے لئے ثابت ہیں اور تمام مسلمان ان کو مانتے ہیں، پھر ان میں اختلاف ہے کہ یہ دونوں صفات حقیقیہ ہیں یا اعتباریہ؟ یعنی دونوں مستقل صفتیں ہیں یا صفت علم کی طرف راجع ہیں؟ ابوالحسین بصری، فلاسفہ اور کعبی کی رائے یہ ہے کہ یہ دونوں صفات اعتباریہ ہیں، مسموعات یعنی قابل سماعت چیزوں کے جاننے کا نام صفت سمع ہے اور مبصرات یعنی قابل رویت چیزوں کے جاننے کا نام صفت بصر ہے۔ غرض حقیقی صفت علم ہے اور مخصوص چیزوں کے جاننے کا نام سمع وبصر ہے پس یہ دونوں صفتیں حقیقی نہیں ہیں بلکہ اعتباری ہیں اور جمہور کہتے ہیں کہ یہ دونوں بھی صفت علم کی طرح مستقل اور حقیقی صفتیں ہیں۔

دوسرا مسئلہ: بعض صفاتِ اضافیہ کا ان کے حقیقی معنی کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ پر اطلاق درست نہیں، جیسے صفت رحمان اور رحیم، رحمت سے مشتق ہیں اور رحمت کے معنی رقتِ قلب (دل کا پسیجنا) اور انعطاف (مائل ہونا) ہیں اور یہ دونوں باتیں اللہ تعالیٰ کے شایانِ شان نہیں۔ اس لئے ایسی صفات کا ذات باری پر اطلاق ان کے حقیقی معنی کے اعتبار سے نہیں کیا جا سکتا بلکہ ان کے معانی کی غایات یعنی نتائج وآثار کے اعتبار سے اطلاق کیا جاتا ہے۔ رقت قلب اور انعطاف کا نتیجہ اور اثر انعام واحسان ہے پس اللہ کے رحمان ورحیم ہونے کا مطلب ہے انعام واحسان فرمانے والا۔

اس تمہید کے بعد جاننا چاہئے کہ تمام مسلمان اللہ تعالیٰ کے لئے صفت حیات، علم، ارادہ، قدرت اور کلام (اور سمع وبصر) مانتے ہیں، پھر ان میں اختلاف ہوا ہے کہ کیا ان صفات کے حقیقی معنی مراد ہیں یا ان کے معانی کی غایات یعنی نتائج وآثار مراد ہیں؟ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ صفات اضافیہ رحمت وغضب اور جود وسخا کی طرح مذکورہ بالا ساتوں صفات حقیقیہ کے بھی حقیقی معنی مراد نہیں، بلکہ ان کی غایات یعنی آثار وافعال مراد ہیں مگر صحیح بات یہ ہے کہ ان ساتوں صفات کے حقیقی معنی مراد ہیں اور وہ معانی اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ قائم ہیں، اگر غایات مراد لی جائیں گی تو وہ صفات حقیقیہ نہیں رہیں گی اضافیہ ہو جائیں گی یعنی مخلوق کے ساتھ ان کا تعلق ہو جائے گا جیسے انعام واحسان کا تعلق مخلوق کے ساتھ ہے۔

تیسرا مسئلہ: استواء علی العرش یعنی تخت شاہی پر جم کر بیٹھنا اور چہرہ اور ہنسنا وغیرہ صفات متشابہات کو تمام مسلمان اللہ تعالیٰ کے لئے ثابت کرتے ہیں، کیونکہ بے شمار نصوص سے یہ صفات اللہ تعالیٰ کے لئے ثابت ہیں، پھر علماء میں اختلاف ہوا ہے، بعض لوگوں نے سلف کا طریقہ اختیار کیا اور وہ طریقہ تنزیہ مع التفویض ہے یعنی یہ کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ کا استواء، چہرہ اور ہنسنا مخلوق کی صفات کی طرح نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ مخلوق کے مانند ہونے سے پاک ہیں، پھر ان صفات کا کیا مطلب ہے؟ تو یہ بات اللہ تعالیٰ کے حوالہ کر دی جائے کہ ہم ان کلمات کی حقیقت نہیں جانتے، اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتے ہیں کہ ان کی

یہ صفات کیسی ہیں اور ان کلمات کا کیا مراد ہے۔

اور بعض لوگوں نے خلف کا طریقہ اپنایا وہ طریقہ تنزیہ مع التاویل ہے یعنی یہ کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ کی یہ صفات مخلوق کی صفت کی طرح نہیں اور استواء بمعنی استیلاء اور غلبہ ہے یعنی چھ دنوں میں آسمانوں اور زمین کو پیدا کر کے اللہ تعالیٰ نے بذات خود ان کا کنٹرول سنبھالا اور چہرے سے مراد ذات، اور ہاتھ سے مراد قوت و نصرت اور ہنسی سے مراد خوشی اور نزول سے مراد عنایات کا متوجہ ہونا ہے۔

لغات:

استفاض استفاضة الخبر: پھیلنا، حدیث مستفیض حدیث مشہور کو کہتے ہیں۔ البز (مصدر) کپڑے یا کھال کی شکن کو کہا جاتا ہے طویت الثوب علی غرہ یعنی میں نے کپڑے کو اس کی پہلی سلوٹ پر لپیٹا... علی حذه اور علی حدته کے معنی ہیں علیحدہ و جدا کے معنی ہیں دو چیزوں کے درمیان روک۔

☆ ☆ ☆

خلاصۂ کلام: یہ ہے کہ اس دوسری قسم کے مسائل میں اگر کوئی شخص اختلاف کرتا ہے اور تفرد اختیار کرتا ہے تو وہ اہل السنۃ سے خارج نہیں، اس لئے اگر صحیح بات پوچھتے ہو تو وہ یہ ہے کہ ان مسائل میں سرے سے گفتگو ہی نہ کی جائے۔ جب صحابہ کرام کا ایمان ان مسائل کو چھیڑے بغیر کامل بلکہ اکمل تھا تو آج ان مسائل میں گفتگو کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ اور اگر حالات متقاضی ہیں کہ ان مسائل کو چھیڑا جائے تو پانچ باتیں ذہن میں رکھی جائیں:

(۱) یہ ضروری نہیں کہ اگلوں نے جو کچھ قرآن و حدیث سے مستنبط کیا ہے وہ صحیح یا راجح ہو، بلکہ بعد کے علماء کے استنباطات بھی صحیح یا راجح ہو سکتے ہیں۔

(۲) متکلمین نے جس مسئلہ کو کسی چیز پر موقوف سمجھا ہو ضروری نہیں کہ وہ حقیقت میں بھی اس پر موقوف ہو، یہ صرف ان کا خیال بھی ہو سکتا ہے۔

(۳) اسی طرح جو بات متکلمین کے نزدیک مردود ہے، ضروری نہیں کہ وہ حقیقت میں بھی مردود ہو، یہ صرف ان کی رائے بھی ہو سکتی ہے۔

(۴) اسی طرح ہر وہ مسئلہ جس میں علماء نے یہ سمجھ کر غور و فکر نہیں کیا کہ وہ بہت مشکل اور لاینحل ہے، ضروری نہیں کہ وہ حقیقت میں بھی مشکل ہو۔ دوسرے حضرات غور و فکر کر کے وہ مسئلہ حل کر سکتے ہیں۔

(۵) اسی طرح بعض علماء نے آیات و احادیث کی جو تفصیل و تفسیر کی ہے، ضروری نہیں کہ وہ دوسروں کی تفصیل و تفسیر سے زیادہ قابل قبول ہو، علم پر کسی کی اجارہ داری نہیں اور فوق کل ذی علم علیم ایک مسلمہ حقیقت ہے۔

فائدہ: چونکہ اہل حق ہونے نہ ہونے کا مدار پہلی قسم کے مسائل پر ہے، دوسری قسم کے مسائل پر نہیں، اس وجہ سے علمائے اہل سنت یعنی اشاعرہ اور ماتریدیہ قسم ثانی کے بہت سے مسائل میں باہم مختلف ہوئے ہیں۔ اور ماہر علماء ہر زمانہ میں ایسے حقائق ودقائق بیان کرتے رہے ہیں جو سنت کے یعنی اہل حق کے عقائد کے خلاف نہیں، چاہے متقدمین ان کے قائل نہ رہے ہوں۔

فائدہ: شاہ صاحبؒ نے دوسری قسم کے مسائل میں، اگر وہ مختلف فیہ ہیں، تو کسی کی تقلید نہیں کی، بلکہ جادۂ اعتدال اپنایا ہے اور میانہ راستہ اختیار کیا ہے۔ غرض آپ نے خود اپنی راہ بنائی ہے، کسی کی راہ نہیں لی۔

وهذا القسمُ لستُ أَسْتصحُ تَرفُعَ إحدى الفرقتين على صاحبتها بأنها على السنة؛ كيف؟ وإن أريد مَحْضُ السنة فهو تركُ الخوض في هذه المسائل رَأْسًا، كما لم يَخُض فيها السلفُ.

ولَمَّا أن مَسَّتِ الحاجةُ إلى زيادة البيان، فليس كلُّ ما استنبطوه من الكتاب والسنة صحيحًا أو راجحًا، ولا كلُّ ما حسِبَه هؤلاء متوقِّفًا على شيئ مسلَّمَ التوقف، ولا كلُّ ما أوجبوا ردَّه مسلَّمَ الردِّ، ولا كلُّ ما امتنعوا من الخوض فيه استضعافًا له ضَعْفًا في الحقيقة، ولا كلُّ ما جاؤا به من التفصيل والتفسير أحَقُّ مما جاء به غيرُهم.

ولَمَّا ذكرنا من أن كونَ الإنسان سُنِّيًّا معتبرٌ بالقسم الأول، دون الثاني، ترى علماءَ السنة يختلفون فيما بينهم في كثير من الثاني، كالأشاعرة والماتريدية؛ وترى الحُذَّاق من العلماء في كل قَرْن لايَتَحَرَّجُوْنَ من كل دقيقة لاتُخالفها السنةُ، وإن لم يقل بها المتقدمون.

وسَتَجِدُني إذا تَشَعَّبَتْ بهم السُّبُلُ في الفروع والمذاهب، وتفرَّقتْ بهم الموارِدُ فيها والمشارِبُ، لَحِجْتُ بالجادةِ الْجَلِيَّةِ، وَحَقَّقْتُ القارعةَ القويةَ، وصِرْتُ لا آلُوى على الأطراف والحافات، وكنتُ في صَمَمٍ من التفاريع والتخريجات.

ترجمہ: اور یہ (دوسری) قسم: نہیں درست سمجھتا میں کہ برتر بنادے دو جماعتوں میں سے ایک کو اس کی ہمجولی پر بایں طور کہ وہ سنت پر یعنی حق پر ہے، یہ بات کیسے ہوسکتی ہے؟ اور اگر آپ خالص سنت یعنی بالکل حق بات چاہتے ہیں تو وہ سرے سے ان مسائل میں نہ گھسنا ہے، جیسا کہ سلف ان مسائل میں نہیں گھسے ہیں۔

اور جب مزید وضاحت کی ضرورت پیش آئی (اور یہ مسائل چھیڑے گئے) تو (۱) نہیں ہے ہر وہ بات جو ان لوگوں نے قرآن وحدیث سے مستنبط کی ہے صحیح یا راجح ہو (۲) اور نہ ہر وہ بات جس کو ان لوگوں نے کسی چیز پر موقوف سمجھا اس کا موقوف ہونا مسلَّم ہو (۳) اور نہ ہر وہ بات جس کو رد کرنا ان لوگوں کے نزدیک ضروری ہے اس کا مردود ہونا مسلَّم ہو (۴)

یعنی تمازہ اور ، المعاقات جمع ہے المعلقۃ کی ، ان کے معنی بھی کنارے کے ہیں ماف للسان: طرفہ (لسان عرب)
ضم (ای الشفتان): بھیرہوا   تفاریع جمع ہے التفریع کی جس کے معنی ہیں اصول سے متفرع ہونے والا جزئیے
یعنی حق التفریع کے ہیں۔

☆ ☆ ☆

ہر فن کی ایک خصوصیت اور ہر مقام کا ایک تقاضا ہوتا ہے

اور

دوسرے فن والوں پر اس فن کی قابل اعتماد باتوں کی پیروی ضروری ہے۔

جاننا چاہئے کہ ہر فن کی کوئی خصوصیت ہوتی ہے، جس کا فن میں لحاظ رہنا چاہئے یعنی ہر فن میں وہی باتیں مناسب ہوتی ہیں جو اس فن سے تعلق رکھتی ہیں۔ ایک فن میں دوسرے فن کی غیر متعلق بحثیں چھیڑنا مناسب نہیں۔ کیونکہ ہر بات کا ایک موقعہ ہوتا ہے اور موقعہ ہی پر بات مناسب ہوتی ہے۔ مثلاً فن غریب الحدیث میں جو شخص کتاب لکھ رہا ہے اس کو حدیث کے مشکل الفاظ کے معانی ہی بیان کرنے چاہئیں، حدیث کی صحت وضعف سے بحث نہیں کرنی چاہئے۔ اور ایک محدث جو فن حدیث میں کتاب لکھ رہا ہے اس کو حدیث کی اسانید اور ان کی صحت وضعف ہی سے بحث کرنی چاہئے۔ اس کو مسائل فقہیہ اور ان کی ترجیحات سے بحث نہیں کرنی چاہئے۔

اسی طرح جو شخص فن حکمت شرعیہ میں کتاب لکھ رہا ہے اس کو مذکورہ امور میں سے کسی چیز سے بحث نہیں کرنی چاہئے اس کی پوری توجہ ان اسرار ورموز کی طرف رہنی چاہئے جو احادیث میں مذکور احکام میں ملحوظ ہیں، خواہ حدیث میں مذکور حکم معمول بہ ہو یا منسوخ ہو گیا ہو یا اس حکم کے معارض کوئی دوسری دلیل آگئی ہو جس کی وجہ سے فقیہ کی نظر میں وہ حکم مرجوح قرار پایا ہو۔ مثلاً مامسّت النار سے وضو کی روایت منسوخ ہے مگر منسوخ حکم بھی کسی زمانہ میں معمول بہ رہا ہے، اس لئے علم اسرار الدین میں اس حکم کی حکمت بھی بیان کی جائے گی۔

البتہ جب ایک فن والا دوسرے فن سے استفادہ کرے تو ضروری ہے کہ اس فن میں جو بات راجح ہو اسی کی پیروی کرے مثلاً ایک مفسر یا فقیہ اپنی کتاب میں کوئی حدیث نقل کرے تو وہی حدیث نقل کرے جو محدثین کے نزدیک قابل استدلال ہے، موضوع یا نہایت ضعیف روایت سے تمسک نہ کرے۔ اسی طرح فن حکمت شرعیہ کے مصنف کو اپنی کتاب میں وہی حدیثیں لانی چاہئیں، اور انہی حدیثوں کے اسرار ورموز بیان کرنے چاہئیں جو محدثین کے نزدیک صحیح یعنی قابل استدلال ہیں، موضوع روایات اور نہایت ضعیف روایات کو نہیں لینا چاہئے۔

ترجمہ: ہر فن کی ایک خصوصیت اور ہر موقعہ کے مناسب ایک بات ہوتی ہے اور دو امروں پر اس فن میں جو سب سے زیادہ قابل اعتماد بات ہے اس کی پیروی ضروری ہے: پھر جان لیجئے کہ ہر فن کی کوئی خصوصیت ہوتی ہے اور ہر جگہ کا کوئی تقاضا ہوتا ہے، پس جس طرح یہ بات ہے کہ فن غریب الحدیث کے مصنف کے لئے مناسب نہیں کہ وہ حدیث کی صحت یا ضعف سے بحث کرے۔ اور نہ ایک محدث کے لئے مناسب ہے کہ وہ مسائل فقہیہ کے بارے میں، اور مختلف روایات کو کسی پر ترجیح دینے کے لئے گفتگو کرے، پس اسی طرح حدیث کے اسرار و رموز سے بحث کرنے والے کے لئے مناسب نہیں ہے کہ وہ ان میں سے کسی بھی چیز کے بارے میں گفتگو کرے، اس کی پوری توجہ اور اس کے پیش نظر اس راز کو کھولنا ہی ہونا چاہئے جس کا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ارشاد میں قصد فرمایا ہے، خواہ وہ حکم محکم (معمول بہ) باقی ہو یا منسوخ ہو گیا ہو، یا اس کے معارض کوئی اور دلیل قوی ہو جس کی وجہ سے مجتہد کی نظر میں وہ روایت مرجوح قرار پائی ہو۔

ہاں کوئی مضر نہیں کسی بھی فن میں لکھنے والے کے لئے اس بات سے کہ وہ اس چیز کو مضبوط پکڑے جو اس فن میں سب سے زیادہ قابل اعتماد ہے، اس فن کی بہ نسبت، اور سب سے زیادہ قابل اعتماد فن حدیث کے اعتبار سے وہ روایات ہیں جو چھپ گئی ہیں علاقوں کی حدیثیں اور ان کے فقہاء کے فتاویٰ مرتب کرنے کے بعد، اور یہ جاننے کے بعد کہ کس روایت کی متابعت موجود ہے اور کونسی روایت متفرد ہے، اور کس کے رُوات زیادہ ہیں اور کونسی روایت کے رُوات زیادہ قوی ہیں ان سے جو اس سے فروتر ہیں (یعنی کس حدیث کے رُوات کم ہیں اور کس کے رُوات ضعیف ہیں)

علاوہ ازیں اگر اس نوع کی کوئی بات ضمناً چھڑ جائے تو مسائل اجتہادیہ سے بحث کرنا اور ان میں حق سے زیادہ قریب کی تحقیق کرنا اہل علم کے لئے کوئی انوکھی بات نہیں ہے، اور نہ وہ ان علوم میں سے کسی پر اعتراض کرتا ہے، میرا ارادہ اصلاح ہی کا ہے، جہاں تک میرے بس میں ہے اور مجھے اس کی توفیق اللہ کی مدد ہی سے حاصل ہے، انہی پر میں بھروسہ کرتا ہوں، اور انہی کی طرف رجوع کرتا ہوں۔

لغات:

الموطن: جگہ جمع المواطن ۔ الھمۃ قصد، ارادہ، خواہش ۔ الغایۃ: آخری حد ۔ المطمح نگاہ پڑنے کی جگہ ۔ المحیص: ہٹنے کی جگہ، مخلص ۔ ۔ ۔ ۔ کی جگہ حاص (ن) عن کذا: الگ ہونا، ہٹ جانا ۔ اعتصم بہ: ہاتھ سے پکڑنا ۔ خلص (ن) خلوصاً خالص ہونا ۔ ۔ ۔ استطرد: کلام کو اس طرح بیان کرنا کہ اس سے دوسرا کلام لازم آئے ۔ البِدع: انوکھا۔

تشریح:

(۱) کوئی انوکھی بات نہیں یعنی علماء ضمناً دوسری بحثیں کرتے ہی رہتے ہیں، یہ کوئی نئی بات نہیں۔

(۲) خود کسی پر اعتراض کرنا ہے مثلاً تسمیہ علی الوضوء کی روایت کے بارے میں شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ اس باب میں محدثین کے نزدیک کوئی روایت صحیح نہیں تو یہ بات وجوبِ تسمیہ کے قائلین پر اعتراض کرنے کے لئے نہیں لکھی بلکہ اپنی تحقیق پیش کرنا مقصود ہے۔ اسی طرح کسی روایت کے تحت کوئی فقہی بحث چھڑ جائے اور فقہاء کی آراء میں سے کسی رائے کو شاہ صاحب ترجیح دیں تو وہاں بھی محض اپنی تحقیق پیش کرنا مقصود ہوتا ہے، کسی پر طعن مقصود نہیں ہوتا۔

(۳) علاقوں کی حدیثیں اور ان کے فقہاء کے فتاوی مرتب کرنے کے بعد بھی پہلے علاقہ وار روایتیں مرتب کی گئیں اور ہر علاقہ کے فقہاء کے فتاوی بھی ان کے ساتھ شامل کر لئے گئے تھے، بعد میں پھر ان چیزوں کے حدیث شریف کے موجودہ مجموعے مرتب کئے گئے ہیں۔

☆ ☆ ☆

مقدمۃ الکتاب کی آخری بات

دور سے یہ بحث چل رہی ہے کہ حضرت شاہ صاحب نے اس کتاب میں جو تفردات اختیار کئے ہیں وہ پہلی قسم کے مسائل میں نہیں ہیں، دوسری قسم کے مسائل میں ہیں۔ اب فرماتے ہیں کہ اگر خدانخواستہ پہلی قسم کے مسائل میں کسی آیت کے خلاف، یا معمول بہ حدیث کے خلاف، یا قرونِ ثلاثہ کے اجماع کے خلاف، یا اہل السنۃ والجماعۃ کے مسلک کے خلاف کوئی بات قلم سے نکل گئی ہو تو میں اس بات سے براءت ظاہر کرتا ہوں، اور جو مجھے خوابِ غفلت سے بیدار کرے اس کے لئے دعا گو ہوں۔

البتہ متأخرین میں جو آپس میں کشتی ہوئی ہے اور ان میں اختلافات ہوئے ہیں تو ہم اس کے پابند نہیں کہ انہی کی لکیر پیٹیں، اور کیوں پیٹیں؟ وہ بھی تو انسان ہیں اور ہم بھی انسان ہیں، ان میں کوئی صاحب کا پیغمبر نہیں، لہٰذا دوسری قسم کے مسائل میں ان کی رائے بھی صحیح ہو سکتی ہے اور ہماری رائے بھی۔ کیونکہ معاملہ ہمارے اور ان کے درمیان کنویں کے ڈول کی طرح ہے، کبھی انہوں نے پہلے پانی بھر لیا تو کبھی ہم نے۔ کسی مسئلہ میں ان کی رائے صحیح ہو سکتی ہے تو کسی میں ہماری۔ اس لئے دوسری قسم کے مسائل میں ہمارے لئے ضروری نہیں کہ ہم ہر بات میں ان کی موافقت کریں۔

وهأنا بريءٌ من كل مقالة صدرت مخالفةً لآية من كتاب الله، أو سنة قائمة عن رسول الله صلى الله عليه وسلم، أو إجماع القرون المشهود لها بالخير، أو ما اختاره جمهور المجتهدين ومُعظم سواد المسلمين؛ فإن وقع شيء من ذلك فإنه خطأ، رحم الله تعالى من أيقظنا من سِنَتنا أو نبّهنا من غفلتنا.

أما هؤلاء الباحثون بالتخريج والاستنباط من كلام الأوائل، المتحلون مذهب المناظرة

مقدمۃ الکتاب لکھتے تھے، جس میں علاوہ دیگر باتوں کے مختصر فہرست مضامین بھی ہوتی تھی، جس سے گونہ سہولت ہوگئی اور مطلوب مسئلہ نکالنا آسان ہوگیا۔ حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ نے بھی مقدمۃ الکتاب کے آخر میں کتاب کے مشمولات کی اجمالی فہرست دے رہے ہیں۔

پھر اور ترقی ہوئی اور اردو کتابوں کے شروع میں اور عربی کتابوں کے آخر میں مصنفین یا ناشرین مستقل تفصیلی فہرست مضامین شاملِ کتاب کرنے لگے۔ جس سے بہت سہولت ہوگئی، پھر مزید ترقی ہوئی اور متنوع فہارس مرتب ہونے لگیں جیسے فہرست آیات، فہرست احادیث، فہرست اشعار، فہرست اشخاص، فہرست اماکن اور فہرست مضامین وغیرہ، تا آنکہ فہرستوں کی بھی فہرست ضروری ہوگئی اور بعض عربی کتابوں میں تو صورت زم بڑھ گئی، یہ سب انڈکس غیر ضروری ہیں، ان سے خواہ مخواہ کتاب کی قیمت بڑھ جاتی ہے، انکو ڈسک میں رکھ دیا جانا چاہئے، یہاں ضروری فہرستیں ناگزیر ہیں، جیسے تفصیلی فہرست مضامین جو پوری کتاب کا آئینہ ہو، اسی طرح متنوع اور متفرق مضامین والی کتاب میں حروف ابجد سے فہرست مضامین وغیرہ۔

اس کے بعد جاننا چاہئے کہ عام طور پر مقدمۃ الکتاب میں سادہ انداز میں مکمل فہرست مضامین دی جاتی ہے کہ اس کتاب میں اتنے ابواب، اتنی فصول اور یہ یہ مضامین ہیں، مگر بڑوں کی بات اور ہے، شاہ صاحب فہرست ابواب بھی مدلل بیان کر رہے ہیں، اس لئے پہلے سادہ طریقہ پر فہرست مضامین دی جاتی ہیں، پھر شاہ صاحب کی بات پیش کی جائے گی۔

حجۃ اللہ البالغہ مقدمۃ الکتاب کے علاوہ دو قسموں پر مشتمل ہے قسم اول میں قواعد کلیہ ہیں اور قسم ثانی میں احادیث کے اسرار و رموز کا بیان ہے اور قسم اول میں سات مباحث اور ایک تتمہ ہے، جن میں چوراسی ابواب اور مبحث خامس کے شروع میں ایک مقدمہ ہے۔ تفصیل درج ذیل ہے۔

مبحث اول: تکلیف و مجازات کے اسباب کے بیان میں ہے یعنی اللہ نے اپنی بے شمار مخلوقات میں سے انسان ہی کو احکام شرعیہ کا مکلف کیوں بنایا ہے؟ اور انسان ہی کے لئے جزاء و سزا کیوں ہے؟ اس مبحث میں تیرہ ابواب ہیں۔

مبحث ثانی: دنیا اور آخرت میں مجازات کی کیفیت کے بیان میں ہے یعنی دنیا میں، قبر میں، میدان حشر میں اور آخرت میں جزاء و سزا کی کیا کیا شکلیں ہوں گی؟ اس مبحث میں چار ابواب ہیں۔

مبحث ثالث: ارتفاقات کے بیان میں ہے یعنی دنیا میں آسائش کے ساتھ رہنے کے لئے کیا کیا تدبیرات نافعہ اور مفیدا سکیمیں ہوسکتی ہیں، اس مبحث میں گیارہ ابواب ہیں۔

مبحث رابع: سعادت (نیک بختی) کے بیان میں ہے یعنی نوع انسانی کی نیک بختی کیا ہے؟ اور اس کے لئے کیا کیا اعمال ضروری ہیں؟ اور شقاوت (بدبختی) کیا ہے؟ اور وہ کن باتوں کا نتیجہ ہوتی ہے؟ اس مبحث میں سات ابواب ہیں۔

مبحث خامس: نیکی اور گناہ کی حقیقت کے بیان میں ہے۔ اس مبحث کے شروع میں ایک مقدمہ ہے اور اس میں

سترہ ابواب ہیں۔ (رحمۃ اللہ الواسعہ جلد اول میں انہی پانچ مباحث کی شرح آئی ہے)

مبحث سادس: ملی سیاست کے بیان میں ہے یعنی مذہبی حکومت کے لئے کیا کیا چیزیں ضروری ہیں؟ وہ ذکوں کو کس کس طرح سنوارے گی؟ اس مبحث میں اکیس ابواب ہیں۔

مبحث سابع: احادیث سے قوانین شرعیہ مستنبط کرنے کے بیان میں ہے یعنی قانون اسلامی قرآن وحدیث سے کیسے مستنبط کیا جاتا ہے؟ اس کے لئے اصول وضوابط کیا ہیں؟ اور طریقۂ کار کیا ہے؟ اس مبحث میں سات ابواب ہیں۔ آخر میں تتمہ ہے، جس میں شاہ صاحبؒ نے اپنا رسالہ الإنصاف في سبب الاختلاف پورا درج کردیا ہے۔ یہ رسالہ علحدہ بھی طبع ہوچکا ہے اور بعض مضامین اپنے ایک اور رسالے عقد الجيد في الاجتهاد والتقليد سے لئے ہیں اور بعض مضامین نئے ہیں۔ اس تتمہ میں چار ابواب ہیں۔ (رحمۃ اللہ الواسعہ کی جلد دوم میں ان شاء اللہ ان دو مباحث کی شرح آئے گی)

اور قسم دوم میں احادیث کی شرح کی ہے، مگر یہ شرح رموز واسرار کی حد تک محدود ہے۔ سب سے پہلے ابواب الایمان کی حدیثوں کی شرح کی ہے، پھر ابواب الاعتصام بالکتاب والسنۃ کی، پھر ابواب الطہارۃ کی، پھر ابواب الصلاۃ کی، پھر ابواب الزکاۃ کی، پھر ابواب الصوم کی، پھر ابواب الحج کی، پھر ابواب الاحسان یعنی ابواب الزہد (تصوف) کی، پھر ابواب ابتغاء الرزق (ابواب المعاملات) کی، پھر ابواب تدبیر المنزل کی، پھر ابواب سیاسۃ المدن کی، پھر ابواب المعیشۃ کی اور آخر میں سیرت نبوی ﷺ اور مناقب کی روایات کی شرح کی ہے۔

اب شاہ صاحب رحمہ اللہ کی بات شروع کی جاتی ہے: فرماتے ہیں کہ میں نے یہ کتاب دو قسموں پر تقسیم کی ہے، پہلی قسم میں قواعد کلیہ اور ضوابط عامہ کا بیان ہے۔ قاعدہ: اس اصل کو کہتے ہیں جو ایک باب کے مضامین اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہو اور قاعدہ کلیہ اس اصل کو کہتے ہیں جو مختلف ابواب کے مسائل کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہو۔ بالفاظ دیگر: قاعدہ دو چار جزئیات پر مشتمل ہوتا ہے اور قاعدہ کلیہ کے تحت بہت سی جزئیات آتی ہیں۔

غرض قسم اول میں قواعد کلیہ کا بیان ہیں، اگر ان کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے تو شرائع یعنی قوانین خداوندی میں جو مصلحتیں ملحوظ ہیں وہ مرتب شکل میں ذہن نشین ہوجائیں گی اور ان کے اسرار ورموز کو بہت آسانی سے سمجھا جاسکے گا۔

رہی یہ بات کہ ان قواعد کلیہ کا ماخذ کیا ہے؟ تو جاننا چاہئے کہ ان میں سے بیشتر قواعد تو نزول قرآن کے وقت موجود مذاہب وملل والوں کے درمیان مسلّم تھے، ان کے بارے میں اہل ملل میں کوئی اختلاف نہیں تھا۔ یعنی یہ سب اجماعی قاعدے ہیں اور اجماع بذات خود ایک ماخذ ہے، اور یہ ضوابط اتنے مشہور تھے کہ صحابہ کو ان کے پوچھنے کی ضرورت نہ تھی، اس لئے آپ ﷺ نے وہ ضابطے بیان نہیں فرمائے، بلکہ ان ضابطوں کو بنیاد بنا کر ان پر مسائل متفرع فرمائے ہیں۔ البتہ جزئیات بیان کرتے وقت ان اصولوں کی طرف اشارہ فرمایا ہے، جیسے بلی کے جھوٹے کا حکم بیان کرتے ہوئے

ارشاد فرمایا: ﴿إِنَّهَا مِنَ الطَّوَّافِينَ عَلَيْكُمْ أَوِ الطَّوَّافَاتِ﴾ (بلی ہر وقت گھر میں آنے جانے والے لوگوں میں سے ہے یا فرمایا کہ وہ ہر وقت گھر میں آنے جانے والے جانوروں میں سے ہے)

اس ارشاد میں اس ضابطہ کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ "حرج اور تنگی سے احکام میں سہولت پیدا ہوتی ہے" (المشقة تجلب التيسير) غرض جزئیات بیان کرتے ہوئے جس طرح طے شدہ ضوابط کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے اسی طرح آپ ﷺ بھی اصول کی طرف اشارہ فرماتے تھے اور صحابہ دوسری جزئیات کو اس ضابطہ کی طرف لوٹا دیتے تھے کیونکہ عربوں میں، جو ملت اسماعیلیہ کی طرف منسوب تھے، اور یہود و نصاری اور مجوس میں ان کی نظائر رائج تھیں اور صحابہ ان سے واقف تھے اور ان کو اس کی خوب مشق تھی، اس لئے ان اصول کو بیان کرنے کی ضرورت نہیں تھی، بس آنحضور ﷺ کا اشارہ کافی تھا۔

آگے فرماتے ہیں کہ جب میں نے غور کیا تو یہ بات سمجھ میں آئی کہ تو انین شرعیہ کی حکمتیں سمجھنے کے لئے پہلے دو بنیادی باتیں سمجھنی ضروری ہیں:

ایک: نیکی کیا ہے اور گناہ کیا ہے؟ جب تک ان دو باتوں کی حقیقت سمجھ میں نہیں آئے گی احکام کے اسرار و رموز نہیں سمجھے جا سکتے۔

دوسری: مذہبی حکومت کے لئے کیا کیا چیزیں ضروری ہیں؟ کیونکہ قوانین شرع کا بڑا حصہ اسی سے متعلق ہے۔

اس لئے قسم اول میں یہ دو بحثیں ضروری ہوئیں: ایک: مبحث البر والاثم، دوم: مبحث سیاست ملیہ۔

پھر میں نے غور کیا تو یہ بات سمجھ میں آئی کہ نیکی اور گناہ کی حقیقت سمجھنے کے لئے پہلے تین چیزیں سمجھنی ضروری ہیں۔

اول: مجازات کی بحث یعنی انسانوں ہی کے لئے جزاء و سزا کیوں ہے؟ کیونکہ جب مجازات کی وجہ سمجھ میں آئے گی تبھی نیکی اور گناہ کا سوال پیدا ہوگا، اگر مجازات نہ ہو تو تمام اعمال یکساں ہوں گے، جیسے جانوروں کے لئے نہ کوئی نیکی ہے نہ کوئی گناہ۔

دوم: ارتفاقات کی بحث یعنی آسائش سے زندگی گذارنے کے لئے مفید تدبیریں کیا ہیں اور مضر باتیں کیا ہیں؟ جو مفید باتیں ہیں وہ نیکی کے دائرہ میں آتی ہیں اور مضرت رساں امور گناہ ٹھہرتے ہیں۔

سوم: سعادت نوعیہ کی بحث یعنی نوع انسانی کی نیک بختی کیا ہے اور بدبختی کیا ہے؟ نیک بختی کن باتوں سے حاصل ہوتی ہے اور بدبختی تک کونسی باتیں پہنچاتی ہیں؟ دارین کی فلاح و نجاح کیسے حاصل کی جائے اور خسران سے کیسے بچا جائے؟ جو باتیں سعادت کا سبب ہیں وہی نیک کام ہیں اور اسباب شقاوت گناہ ہیں۔

پھر میں نے غور کیا تو یہ بات سمجھ میں آئی کہ یہ پانچوں مباحث چند ایسے مسائل پر موقوف ہیں جن کو اس فن میں آنکھ بند کر کے مان لینا چاہئے، ان کی علتوں سے بحث نہیں کرنی چاہئے، ورنہ بات بہت دور جا پڑے گی۔ اور ان کو چند وجوہ

مانا جاسکتا ہے۔ جو درج ذیل ہیں۔

(۱) یا تو وہ باتیں اس لئے مان لی جائیں کہ تمام ملل و مذاہب والے ان پر متفق ہیں، اور اس وجہ سے متفق ہیں کہ وہ باتیں "مسلمات مشہورہ" میں داخل ہوگئی ہیں، پھر ان کے دلائل عقل اور نقل سے بحث کرنے کی کیا ضرورت ہے؟

(۲) یا وہ باتیں اس لئے مان لی جائیں کہ جس معلم نے وہ باتیں ہمیں سکھائی ہیں اس کے ساتھ حسن ظن ہے کہ وہ بچا بے وہ غلط باتیں بیان نہیں کر سکتا یعنی وہ باتیں قرآن کریم اور احادیث شریفہ میں آئی ہیں، جن کے صدق پر ہمارا ایمان ہے۔

(۳) یا وہ باتیں اس لئے مان لی جائیں کہ وہ ایک دوسرے فن میں، جو اس فن سے اعلیٰ ہے، مدلل ہو چکی ہیں یعنی وہ مسائل فلسفہ تصوف میں زیر بحث آ چکے ہیں اور وہاں وہ مدلل کئے جا چکے ہیں، پس جسے دلائل دیکھنے ہوں وہاں دیکھے، یہاں تو ان کو مسلم باتوں کی طرح ذکر کیا جائے گا۔

غرض اس قسم کے تمام مسائل بحث اول میں ذکر کئے جائیں گے مگر نفس اور اس کے احوال سے تفصیلی بحث نہیں کی جائے گی، کیونکہ فلسفہ تصوف میں اس پر سیر حاصل بحث ہو چکی ہے اور دیگر مسائل بھی تفصیل سے ذکر نہیں کئے جائیں گے، صرف وہ باتیں بیان کی جائیں گی جو دوسرے علماء کی کتابوں میں یا تو سرے سے نہیں ہیں یا اس ترتیب سے نہیں ہیں اور وہ تفریعات نہیں ہیں جو شاہ صاحب نے ذکر کی ہیں، اسی طرح مسلم باتوں میں سے بھی صرف وہ باتیں بیان کی جائیں گی جن سے دوسرے علماء نے تعرض نہیں کیا، اسی طرح ان مسائل کے دلائل نقلیہ بیان کرنے کا بھی بہت زیادہ اہتمام نہیں کیا۔

الغرض یہ بحث اول کے مسائل ہیں، پھر بحث دوم میں مجازات کی کیفیت کا بیان ہے اور بحث سوم میں ارتفاقات کی بحث ہے اور چہارم میں انسان کی ازلی سعادت و شقاوت کا بیان ہے اور پنجم میں نیکی اور گناہ کے اصول ذکر کئے گئے ہیں اور ششم میں سیاست ملی کا بیان ہے اور بحث ہفتم میں نصوص سے قوانین مستنبط کرنے کا طریقہ ذکر کیا گیا ہے۔

اور قسم دوم میں احادیث کے اسرار و رموز ذکر کئے گئے ہیں، پہلے باب الایمان کی احادیث کی شرح کی گئی ہے، پھر ابواب العلم کی (غالباً یہ سبقت قلم ہے کیونکہ کتاب میں ابواب العلم کی احادیث کی شرح نہیں ہے بلکہ ابواب الاعتصام کی احادیث کی شرح ہے) پھر ابواب الطہارۃ کی الخ۔

اب مقدمۃ الکتاب کے مضامین پورے ہوئے، آگے کتاب شروع ہوگی۔

ثم إني جعلتُ الكتاب على قسمين:

أحدهما: قسم القواعد الكلّية، التي تنتظم بها المصالحُ المرعيةُ في الشرائع؛ وأكثرُها كانت مسلَّمةً بين الملل الموجودة في عهد النبي صلى الله عليه وسلم، ولم يكن فيها اختلاف بينهم، وكان الحاضرون مستغنين عن سؤالها، فنبَّهَ النبيُّ صلى الله عليه وسلم عليها، كما نبَّهَ على الأصول المفروغ عنها عند إفادة الفروع، ليتمكن السامعون من إرجاع الفروع إليها، لمّا مارسوا

من نظائرها في العرب المنتسبين إلى الملة الإسماعيلية، واليهود والنصارى والمجوس.

ورأيتُ أن تفاصيل أسرار الشرائع ترجع إلى أصلين: مبحث البِرّ والإثم، ومبحث السياسات الملية.

ثم رأيت البِرّ والإثمَ لاتُكْتَنَهُ حقيقتُهما إلا بأن يُعرف قبلهما مباحث المجازاة والارتفاقات والسعادة النوعية.

ثم رأيت هذه المباحث تتوقف على مسائل، تُسلَّم في هذا العلم، ولا يُبحث عن لِمِّيَّتِها: فإما أن تُصدَّق بها لاتفاق الملل عليها، حتى صارت من المشهورات، أو لحسن الظن بالمعلِّم، أو لدلائلَ تُذكر في علم أعلى من هذا العلم.

وأعرضتُ عن الإطالة في إثبات النفس وبقائها، وتنعُّمها وتألُّمها بعد مفارقة الجسد، لأنه مبحثٌ مفروغٌ عنه في كتب القوم.

وماذكرتُ من هذه المباحث إلا مارأيتُ الكتب التي وقعت إليَّ خاليةً عن الكلام فيه أصلاً، أو عن التفريع والترتيب اللذين وُفِّقتُ لاستخراجهما؛ ولا من المسلَّمات إلا مارأيتُ القوم لم يتعرضوا له، ولا لإيراد الدلائل السمعية عليه كثيرَ تعرُّضٍ.

فلا جَرَمَ أني أذكر في هذا القسم مسائلَ، يجب أن تُصدَّق بها في هذا الفن من غير تعرُّضٍ لِلِمِّيَّتِها، ثم كيفية المجازاة في الحيوة وبعد الممات، ثم الارتفاقات التي جُبل عليها بنو آدم، ولم يَنفكَّ قط عربُهم ولا عجمُهم، من جهة ما أوجبه عقولُهم، ثم بيانُ سعادة الإنسان وشقاوته بحسب النوع، وبحسب ما يظهر في الآخرة، ثم أصولُ البر والإثم التي تَوارد عليها أهلُ الملل، ثم ما يجب عند سياسة الأمة من ضروب الحدود والشرائع، ثم كيفيةُ استنباط الشرائع من كلام النبي صلى الله عليه وسلم، وتَلَقِّيها عنه.

والقسم الثاني في شرح أسرار الأحاديث من أبواب الإيمان، ثم من أبواب العلم، ثم من أبواب الطهارة، ثم من أبواب الصلاة، ثم من أبواب الزكاة، ثم من أبواب الصوم، ثم من أبواب الحج، ثم من أبواب الإحسان، ثم من أبواب المعاملات، ثم من أبواب تدبير المنازل ثم من أبواب سياسة المُدُن، ثم من أبواب آداب المعيشة، ثم من أبواب شتَّى؛ وهذا أوانُ الشروع في المقصود، والحمد لله أولاً وآخراً.

ترجمہ: پھر چنانچہ میں نے کتاب کو دو قسموں پر تقسیم کیا ہے:

ان میں سے ایک ان قواعد کلیہ کی قسم ہے جن کے ذریعہ مرتب ہو جاتی ہیں وہ مصلحتیں جو احکام خداوندی میں ملحوظ ہیں، اور ان میں سے بیشتر تسلیم شدہ تھیں ان مذاہب کے درمیان جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں موجود تھے۔ اور ان میں ان قواعد کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں تھا، اور موجودین بے نیاز تھے ان کے بارے میں سوال کرنے سے، پس تنبیہ کی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان قواعد پر جس طرح تنبیہ کی جاتی ہے جزئیات بیان کرتے وقت ان اصول پر جن سے بحث ہو چکی ہو۔ پس سننے والے قادر ہو گئے جزئیات کو ان قواعد کی طرف لوٹانے پر، ان میں مہارت پیدا ہو جانے کی وجہ سے ان کے تذکار سے جو ان عربوں میں رائج تھیں جو ملت اسماعیلیہ کی طرف منسوب تھے اور یہود و نصاریٰ اور مجوس میں رائج تھیں۔

اور دیکھا میں نے کہ قوانین شرعیہ کے رموز کی تفصیلات دو بنیادوں کی طرف لوٹتی ہیں ایک نیکی اور گناہ کی بحث دوسری تدابیر سیاست کی بحث۔

پھر دیکھا میں نے کہ نیکی اور گناہ کی حقیقت نہیں سمجھی جا سکتی مگر اس طرح کہ ان دونوں بحثوں سے پہلے پہچان لی جائے مجازات کی بحث اور ارتفاقات کی بحث اور سعادت نوعیہ کی بحث۔

پھر دیکھا میں نے کہ یہ مباحث موقوف ہیں چند ایسے مسائل پر جو مان لئے جا ئیں اس علم میں، اور نہ بحث کی جائے ان کی علت سے، یعنی یا تو یہ کہ ان کو مان لیا جائے مذاہب کے ان پر اتفاق کرنے کی وجہ سے، یہاں تک کہ ہو گئے ہیں وہ مشہور باتوں میں سے، یا متکلم کے ساتھ حسن ظن کی بنا پر، یا ایسے دلائل کی وجہ سے جو ذکر کئے گئے ہیں ایک ایسے علم میں جو اس علم سے برتر ہے۔

اور میں نے اعراض کیا ہے کسی گفتگو کرنے سے نفس کے اثبات میں، اور جسم سے جدا ہونے کے بعد اس کے باقی رہنے میں اور راحتیں پانے میں اور تکلیفیں اٹھانے میں، اس لئے کہ اس بحث سے نمٹا جا چکا ہے علماء کی کتابوں میں۔

اور نہیں ذکر کیا ہے میں نے ان مباحث میں سے مگر ان باتوں کو کہ دیکھا میں نے ان کتابوں کو جو مجھ تک پہنچی ہیں بالکل خالی ان مسائل میں گفتگو سے، یا اس تفریع و ترتیب سے خالی جن کو نکالنے کی مجھے توفیق دی گئی ہے، اور مسلمہ باتوں میں سے نہیں ذکر کیا ہے میں نے مگر ان باتوں کو کہ دیکھا میں نے علماء کو کہ نہیں تعرض کیا ہے انہوں نے ان باتوں سے، اور ان مسائل پر دلائل قطعیہ پیش کرنے سے بھی میں نے بہت زیادہ تعرض نہیں کیا۔

پس البتہ ذکر کروں گا میں اس قسم میں (یعنی مبحث اول میں) ایسے مسائل کو جن کو مان لینا ضروری ہے اس فن میں، ان کی وجہ سے تعرض کئے بغیر، پھر ذکر کروں گا میں دنیوی زندگی میں اور مرنے کے بعد جزاء و سزا کی کیفیت کو، پھر ان ارتفاقات کو جن پر انسانوں کی تخلیق ہوئی ہے (یعنی وہ انسان کی فطرت میں داخل ہیں) اور کبھی بھی ان مفید ایکسوں کو بے کار نہیں چھوڑا عربوں نے اور نہ عجمیوں نے، اس وجہ سے کہ ان مفید ایکسوں کو ان کی عقلوں نے ثابت کیا ہے، پھر ذکر کروں گا میں انسان کی سعادت وشقاوت کی تفصیل کو نوع کے اعتبار سے، اور آخرت میں ظاہر ہونے کے اعتبار

سے، پھر نیکی اور گناہ کے وہ اصول بیان کروں گا جن پر تمام مذاہب متفق ہیں، پھر وہ باتیں بیان کروں گا جو ملک کے نظم وانتظام کے لئے ضروری ہیں یعنی سزائیں اور قوانین مقرر کرنا، پھر حضور اکرم ﷺ کے کلام سے قوانین شریعہ کو مستنبط کرنے کا طریقہ ذکر کروں گا اور ان قوانین کو حضور ت حاصل کرنے کا طریقہ سمجھاؤں گا۔

اور دوسری قسم ان احادیث کے رموز کی وضاحت میں ہے جو ایمان سے تعلق رکھتی ہیں، پھر ان حدیثوں کی وضاحت ہے جو علم سے تعلق رکھتی ہیں، پھر پاکی سے تعلق رکھنے والی، پھر نماز، پھر زکوۃ، پھر روزہ، پھر حج، پھر تصوف، پھر معاملات، پھر گھریلو زندگی، پھر شہری سیاست، پھر معیشت، پھر متفرق مضامین سے تعلق رکھنے والی روایات کی شرح ہے۔

اور یہ مقصود کو شروع کرنے کا وقت آ گیا اور سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں ابتداء میں بھی اور انتہاء میں بھی۔

لغات:

اِنْتَظَمَ اللؤلؤ: ترتیب وار ہونا　تنظم الامر: منظم ہونا　المرعیۃ اسم مفعول ہے جو ظاہر کی ہوئی، رعایت کی ہوئی...... مارس مراسًا وممارسۃ الامر: مشق کرنا، مہارت پیدا کرنا۔　اتحف الشیٔ: حقیقت کو پہنچنا　لا جرم اور لا جرم تحقیق کے لئے آتے ہیں بمعنی البتہ، یقیناً، اور کبھی قسم کیلئے ہوتے ہیں۔　ساس یسوس سیاسۃ الدواب: دیکھ بھال رکھنا، سدھانا، ساس القوم: امور کی تدبیر وانتظام کرنا　السیاسات الملیۃ: مذہبی حکومت، حکومت الٰہیہ۔

پہلی قسم

قواعد کلیہ کے بیان میں

مبحث اول

تکلیف شرعی اور جزا و سزا کے بیان میں

مبحث اول

تکلیف شرعی اور جزاء وسزا کے بیان میں

باب (۱) صفت ابداع، خلق اور تدبیر کا بیان

باب (۲) عالم مثال کا بیان

باب (۳) ملأ اعلیٰ (مقرب فرشتوں) کا بیان

باب (۴) سنت الٰہی کا بیان

باب (۵) روح کی حقیقت وماہیت کا بیان

باب (۶) انسان کے مکلف ہونے کا بیان

باب (۷) انسان کا مکلف ہونا عالم کی پلاننگ میں داخل ہے

باب (۸) تکلیف شرعی جزا وسزا کو چاہتی ہے

باب (۹) اللہ تعالیٰ نے لوگوں کی فطرت مختلف بنائی ہے

باب (۱۰) عمل کا باعث بننے والے خیالات کے اسباب

باب (۱۱) عمل کا نفس سے وابستہ ہونا اور اس کا ریکارڈ کیا جانا

باب (۱۲) اعمال کا ملکات سے جوڑ

باب (۱۳) مجازات کے اسباب کا بیان

پہلی قسم

قواعد کلیہ کا بیان

پہلے تمہید اور قاعدہ کلیہ کا مطالب بیان کیا جا چکا ہے اور یہ بھی بتایا جا چکا ہے کہ کتاب اصولی دو قسمیں ہیں۔ پہلی قسم میں وہ قواعد کلیہ بیان کئے گئے ہیں جن کو پیش نظر رکھ کر احکام شرعیہ میں ملحوظ مصلحتوں کو سمجھا جا سکتا ہے اس قسم میں سات مباحث اور ستر ابواب ہیں۔

سوال: یہ بات کیسے درست ہو سکتی ہے؟ قسم اول میں تو چوراسی ابواب ہیں اور مبحث خامس کے شروع میں ایک مقدمہ اور تتمہ کے آخر میں ایک طویل فصل بھی ہے، پس کل چھیاسی ابواب ہوئے؟

جواب: شروع میں شاہ صاحب کا ارادہ ستر ہی ابواب لکھنے کا ہوگا، بعد میں ابواب بڑھ گئے، علاوہ ازیں تتمہ بعد میں بڑھایا ہے، پس اس کے چودہ ابواب اور ایک فصل اس میں شامل نہیں، مگر پھر بھی اکہتر ابواب ہوتے ہیں۔ پس اس سوال کا صحیح جواب یہ ہے کہ بعض فصلوں کو اور بعض ذیلی مضامین کو باب بنا دیا گیا ہے اس لئے یہ تعداد بڑھ گئی ہے جیسا کہ آگے معلوم ہوگا۔

سوال: ٹھیک ہے بعد میں ابواب بڑھ گئے، مگر پہلے لکھا ہوا مصنف نے کاٹ کر ٹھیک کیوں نہیں کیا؟

جواب: کہتے ہیں کہ شاہ صاحب قدس سرہ نے کتاب کا مسودہ چھوڑا تھا، مبیضہ تیار کرنے کا آپ کو موقع نہیں ملا تھا، اگر تبییض کرتے تو ضرور اصلاح کرتے، مگر اس کا موقع نہیں ملا، اس لئے پہلے جو لکھ دیا وہی رہ گیا۔

مگر یہ جواب کمزور ہے، کیونکہ یہ بات صحیح نہیں کہ شاہ صاحب رحمہ اللہ نے کتاب کا مسودہ چھوڑا تھا اور کتاب کی تبییض کا موقع آپ کو نہیں ملا تھا۔ وجہ یہ ہے کہ کراچی کا مخطوطہ ۱۱۵۹ھ کا مرقومہ ہے، اور طلبہ نے یہ کتاب شاہ صاحب رحمہ اللہ سے پڑھی ہے اور ۱۱۶۲ھ میں درس پایۂ تکمیل کو پہنچا ہے۔ نیز قسم اول کے آخر میں تتمہ اور کتاب کے آخر میں ابواب شتّی آپ نے بعد میں بڑھائے ہیں۔ یہ سب باتیں اس بات کی صریح دلیل ہیں کہ شاہ صاحب نے کتاب کا مسودہ نہیں چھوڑا تھا۔ اس لئے اس سوال کا صحیح جواب یہ ہے کہ تتمہ کے ابواب تو اس میں شامل نہیں اور کاتب نے یا شارح نے بعض ذیلی مضامین کو مستقل باب بنا دیا اس لئے تعداد بڑھ گئی، مثلاً مبحث خامس کا باب (۱۵) مخطوطہ برلین اور پٹنہ میں باب (۱۴) میں داخل ہے اور مطبوعہ نسخہ میں اس کو مستقل باب بنایا گیا ہے۔

مبحث اول

تکلیف شرعی اور جزا و سزا کے اسباب کا بیان

اس مبحث میں تیرہ ابواب ہیں اور اس پورے مبحث میں دو باتیں بیان کی گئی ہیں۔

ایک: انسان کو مکلف کیوں بنایا گیا ہے؟ اس کے اسباب اور وجوہ کیا ہیں؟ اللہ کی بے شمار مخلوقات زمین میں پھیلی ہوئی ہیں، کسی کو مکلف نہیں بنایا، صرف انسانوں کو کیوں مکلف بنایا؟

دوسری: انسان جو بھی کام کرے گا، اچھا یا برا اس کا بدلہ ضرور ملے گا، اچھا کرے گا انعام پائے گا، برا کرے گا سزا پائے گا، یہ مجازات انسان ہی کے لئے کیوں ہے؟ اس کے اسباب و وجوہ کیا ہیں؟

مذکورہ دو باتیں بظاہر دو باتیں ہیں، مگر وہ درحقیقت ایک ہی مسئلہ ہیں، انسان کو کچھ کاموں کے کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور کچھ کاموں سے روکا گیا ہے، دیگر مخلوقات کو اس طرح کے احکام نہیں دئے گئے، پھر انسان کو بعض کاموں کے کرنے نہ کرنے پر انعام سے نوازا جاتا ہے اور دوسرے بعض کاموں کے کرنے نہ کرنے پر سزا دی جاتی ہے، کیونکہ اس کو مکلف بنایا گیا ہے، دیگر مخلوقات کے لئے جزا و سزا نہیں، کیونکہ وہ مکلف نہیں، آخر یہ فرق کیوں ہے؟ اس کے اسباب و وجوہ کیا ہیں؟ اسی کا اس مبحث میں ذکر ہے، جب اس مبحث کے تمام ابواب مکمل ہو جائیں گے تب یہ بات واضح ہو جائے گی، ایک دو باب پڑھ کر یہ مضمون سمجھ میں نہیں آئے گا۔

باب — ۱

صفت ابداع، خلق اور تدبیر کا بیان

اللہ تعالیٰ کی بہت سی صفتیں اور بے شمار اسمائے حسنیٰ ہیں، اور ہر صفت کا دائرہ کار الگ ہے، مثلاً صفت غفور کا تعلق مؤمن کے ساتھ ہے، مشرک کے ساتھ نہیں اور صفت منتقم کا تعلق کافر کے ساتھ ہے مؤمن کے ساتھ نہیں، اسی طرح اس عالم کے ساتھ تین صفات کا تعلق ہے یعنی یہ عالم انہی تین صفات کی کرشمہ سازی ہے اور ان تین صفات کا کام ترتیب وار ہے۔

پہلی صفت: ابداع ہے، ابداع باب افعال کا مصدر ہے، اس کا مجرد بدع (ف) بدعا ہے جس کے معنی ہیں عدم نا

بغیر نمونہ کے کوئی چیز بنانا، ابتداء کرنا، ایجاد کرنا اور باب کرم سے بَدُعَ کے معنی ہیں بے مثال ہونا، انوکھا ہونا پس ابداع کے معنی ہیں عدم محض سے یعنی سابق مادہ کے بغیر کسی چیز کو وجود پذیر کرنا اور یہ اللہ ہی کا کام ہے وہ نیست سے ہست کرتے ہیں، مادہ اور مثال کے بغیر انوکھے طریقے پر پیدا کرتے ہیں۔ ارشاد ہے ﴿بَدِيعُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ﴾ (البقرہ ۱۱۷) اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمین کے موجد ہیں، انوکھے طریقے پر پیدا کرنے والے ہیں۔

اور بخاری شریف میں حضرت عمران بن حُصین رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ اہل یمن خدمت نبوی میں حاضر ہوئے اور عرض کیا:

جئناك لنتفقه في الدين، ولنسألك عن أول هذا الأمر، ما كان؟ قال: كان الله ولم يكن شيئ قبله (۱۰۳:۲)	ہم آپ کی خدمت میں دین سیکھنے کے لئے حاضر ہوئے ہیں اور اس لئے آئے ہیں کہ اس کائنات کے آغاز کے بارے میں دریافت کریں کہ کس طرح ہوا؟ آپ نے فرمایا: اللہ تھے اور ان سے پہلے کوئی چیز نہیں تھی۔

یہی روایت کتاب بدء الخلق کے شروع میں ص ۴۵۳ پر بھی ہے اس کے الفاظ ہیں کان اللہ ولم یکن شیئ غیرہ (اللہ پاک تھے اور ان کے علاوہ کوئی چیز نہیں تھی) حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس کی شرح میں لکھا ہے: فیہ دلالۃ علی انہ لم یکن شیئ غیرہ، لا الماء ولا العرش ولا غیرھما، لأن کل ذلک غیر اللہ تعالی.

اس روایت سے ثابت ہوا کہ کائنات کی ابتداء میں کچھ نہیں تھا، اللہ تعالیٰ نے یہ عالم بغیر مادہ اور مثال کے پیدا کیا ہے اور اس کائنات کی ابتدا صفت ابداع سے ہوئی ہے۔

دوسری صفت خلق ہے۔ خلق (ن) خلقاً کے معنی ہیں پیدا کرنا، عدم سے وجود میں لانا یعنی مادہ سے کوئی چیز بنانا، سابق نمونہ کے مطابق کوئی چیز بنانا، جیسے آدم علیہ السلام کو مٹی سے بنایا اور جنات کے جد امجد جانّ کو آگ کے آمیزہ سے بنایا۔

سوال: قرآن کریم میں آسمانوں اور زمین کے تعلق سے جہاں لفظ بدیع استعمال کیا گیا ہے، وہیں خلق السماوات والأرض بھی بار بار آیا ہے اور ان دونوں لفظوں کے معنی الگ الگ ہیں، پس صحیح صورت حال کیا ہے؟ آسمان وزمین بغیر مادہ کے پیدا کئے گئے ہیں یا مادۂ سابق سے پیدا کئے گئے ہیں؟

جواب: (۱) خلق بمعنی ابداع ہے اور جس طرح ایمان واسلام کی حقیقتیں الگ الگ ہیں مگر نصوص میں ایک کی جگہ دوسرا لفظ استعمال ہوتا ہے اور ارادہ اور قضاء کے معنی الگ الگ ہیں اور ایک کی جگہ دوسرا لفظ استعمال ہوتا ہے اسی طرح خلق کا لفظ بمعنی ابداع استعمال کیا گیا ہے اور آسمان وزمین بغیر مادہ اور مثال سابق کے انوکھے طور پر پیدا کئے گئے ہیں۔

(۲) یا یہ کہا جائے کہ آسمان وزمین کا مادہ جو دخان کی صورت میں تھا وہ صفت ابداع کی کرشمہ سازی ہے، پھر اس مادہ سے آسمانوں اور زمین کی ہیئت کذائی بنائی گئی یہ صفت خلق کی مہربانی ہے۔

القسم الأول

في القواعد الكلية التي تستنبط منها المصالح المرعية في الأحكام الشرعية

سبعة مباحث في سبعين بابا

المبحث الأول: في أسباب التكليف والمجازاة

باب الإبداع والخلق والتدبير

اعلم أن لله تعالى بالنسبة إلى إيجاد العالم ثلاث صفات مترتبة:

أحدها: الإبداع، وهو إيجاد شيء لا من شيء، فيخرج الشيء من كتم العدم بغير مادة، وسئل رسول الله صلى الله عليه وسلم عن أول هذا الأمر؟ فقال: "كان الله ولم يكن شيء قبله"

والثانية: الخلق، وهو إيجاد الشيء من شيء، كما خلق آدم من التراب، وخلق الجان من مارج من نار

ترجمہ: پہلی قسم ان قواعد کلیہ کے بیان میں ہے جن کے ذریعہ وہ مصلحتیں نکالی جاتی ہیں جو احکام شرعیہ میں ملحوظ رکھی گئی ہیں۔

قسم اول میں سات مباحث ہیں ستر ابواب میں۔

پہلا مبحث: تکلیف شرعی اور جزاؤ سزا کے اسباب کے بیان میں ہے۔

باب (۱) صفت ابداع، خلق اور تدبیر کے بیان میں ہے۔

جان لیجئے کہ اللہ تعالیٰ کے لئے عالم کی ایجاد سے تعلق سے تین صفتیں ہیں ترتیب وار۔

ان میں سے ایک ابداع ہے، اور وہ کسی چیز کو بغیر کسی چیز کے یعنی بغیر مادہ کے پیدا کرنا ہے، پس اللہ تعالیٰ بغیر مادہ کے پردۂ عدم سے چیزوں کو نکالتے ہیں۔ اور رسول اللہ ﷺ سے اس کائنات کے آغاز کے بارے میں دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ تھے اور ان سے پہلے کوئی چیز نہیں تھی"

اور دوسری صفت خلق ہے، اور وہ کسی چیز سے یعنی مادہ سے کوئی چیز بنانا ہے، جس طرح آدم علیہ السلام کو مٹی سے بنایا اور جنات کو آگ کے شعلے سے بنایا۔

☆ ☆ ☆

اللہ تعالیٰ نے عالم کی تشکیل کس طرح فرمائی ہے؟

منطق میں آپ نے پڑھا ہے کہ جنس وہ کلی ہے جو بہت سی ایسی چیزوں پر بولی جائے جن کی حقیقتیں جدا جدا ہوں، جیسے حیوان، جسم نامی وغیرہ۔ اور نوع وہ کلی ہے جو ایسی بہت سی چیزوں پر بولی جائے جن کی حقیقت ایک ہو، جیسے انسان، زید، عمر، بکر وغیرہ بہت سے ایسے افراد پر بولا جاتا ہے جن کی حقیقت ایک ہے۔

نیز منطق میں آپ نے یہ بھی پڑھا ہے کہ اجناس کی ترتیب نیچے سے اوپر کی طرف ہے یعنی خصوص سے عموم کی طرف، اور انواع کی ترتیب اوپر سے نیچے کی طرف ہے یعنی عموم سے خصوص کی طرف۔ کیونکہ نوع اور جنس میں عموم خصوص مطلق کی نسبت ہے، نوع خاص ہے اور جنس عام ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ نوع کے عروج میں خصوصیت ہے اور جنس کے عروج میں عمومیت، یعنی اعلیٰ درجہ کی نوع وہ ہے جو اخص ترین ہو، اور اعلیٰ درجہ کی جنس وہ ہے جو اعم ترین ہو۔ سب سے اونچی نوع کو نوع الانواع کہتے ہیں اور سب سے اعلیٰ جنس کو جنس الاجناس۔ مثلاً سب سے نیچے کی جنس ہے حیوان، اس کے اوپر جسم نامی، اس کے اوپر جسم مطلق، اس کے اوپر جوہر اور آخری جنس موجود ہے، پس موجود جنس الاجناس ہے اور انواع میں سب سے نیچے انسان ہے، اس کے اوپر حیوان ہے، اس کے اوپر جسم نامی ہے، اس کے اوپر جسم مطلق ہے، اس کے اوپر آخری اضافی نوع جوہر ہے، پس انسان نوع الانواع ہے، اور نوع الانواع اور جنس الاجناس کے درمیان جو انواع و اجناس ہیں ان کو متوسطات یعنی بیچ بیچ کی کہتے ہیں۔ وہ من وجہ جنس ہیں اور من وجہ نوع۔

نوٹ: متقدمین نے وجود کو جنس نہیں مانا، انھوں نے آخری جنس جوہر کو قرار دیا ہے، وجود کو حضرت نانوتوی قدس سرہ نے جنس بنایا ہے۔ (نوٹ ختم ہوا)

شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ دلائل عقلیہ اور نقلیہ سے یہ بات ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس جہاں کو انواع و اجناس کی شکل میں پیدا کیا ہے، کچھ چیزوں کو جنس بنایا ہے اور کچھ چیزوں کو نوع، جو عام ہے وہ جنس ہے اور جو خاص ہے وہ نوع ہے، جیسے حیوان، انسان سے عام ہے پس وہ جنس ہے اور انسان حیوان سے خاص ہے پس وہ نوع ہے۔

رہی یہ بات کہ اللہ تعالیٰ نے انواع و اجناس کی تشکیل کس طرح فرمائی ہے؟ تو جاننا چاہئے کہ خصوصیات کے ذریعہ انواع و اجناس متعین کی گئی ہیں، نوع کی الگ خصوصیت رکھی ہے اور جنس کی الگ، مثلاً حیوان (جاندار، جانور) کی خصوصیات ہیں: حساس ہونا، متحرک بالارادہ ہونا۔ جس مخلوق میں یہ خصوصیات پائی جائیں گی وہ حیوان کہلائے گی۔ پھر حیوان کی انواع بنائیں، اس طرح کہ ان میں خصوصیات در خصوصیات پیدا کیں، مثلاً انسان ایک جانور ہے، اس میں حیوان کی تمام خصوصیات موجود ہیں پھر اس میں مزید خصوصیت پیدا کیں کہ وہ عقل و فہم کی بنیاد پر بولتا ہے، سوچ سمجھ کر بات چیت کرتا ہے، اس کی کھال بالوں سے ڈھکی ہوئی نہیں ہوتی، بعض حصے جیسے سر وغیرہ اگرچہ بالوں سے ڈھکے ہوئے ہوتے ہیں، مگر سارا جسم

بالوں سے ڈھکا ہوا نہیں ہوتا، اس کا قد سیدھا ہوتا ہے، دوسرے حیوانات کی طرح چار پیروں پر ٹیک کی طرح چلتا نہیں، وہ خود بولتا اور دوسروں کی باتوں کو سمجھتا ہے۔ یہ سب انسان کی خصوصیات ہیں۔ یہ خصوصیات جس حیوان میں پائی جائیں گی وہ انسان کہلائے گا۔

اسی طرح گھوڑا بھی ایک جاندار ہے، اس میں حیوان کی سبھی خصوصیات موجود ہیں، مزید خصوصیات اس میں یہ ہیں کہ وہ ہنہناتا ہے، اس کی کھال بالوں سے ڈھکی ہوئی ہے، اس کا جسم چار پیروں پر میز کی طرح بچھا ہوا ہے اور وہ باوجود زیرکی کے دوسروں کا مافی الضمیر سمجھانے سے بھی نہیں سمجھ سکتا، نہ وہ اپنا مافی الضمیر دوسروں کو سمجھا سکتا ہے، ان خصوصیات زائدہ کی وجہ سے فرس حیوان کی ایک الگ نوع بن گیا۔

اسی طرح زہر کی خصوصیت ہے کہ جو اسے کھائے اس کو وہ ہلاک کردے، سونف کی خاصیت تری اور خشکی ہے اور کافور کی خاصیت برودت ہے، یہی حال تمام معدنیات، نباتات اور حیوانات کا ہے، بعض خصوصیت کی وجہ سے وہ اجناس بعض صفات دکھاتی اور جانور ہیں، پھر ذیلی خواص کی وجہ سے وہ مختلف انواع بن جاتے ہیں۔

اب خلاصہ کے طور پر تین باتیں سمجھ لی جائیں:

(۱) اللہ تعالیٰ کی عادت شریفہ یہ چلی رہی ہے کہ اللہ نے جس چیز کی جو خصوصیت پیدا کی ہے وہ کبھی اس چیز سے جدا نہیں ہوتی، آگ کی خصوصیت جلانا ہے، پانی کی خاصیت بجھانا اور سیراب کرنا ہے، یہ آگ اور پانی سے کبھی جدا نہیں ہوتی، انسان کی خصوصیات انسان سے اور گھوڑے کی خصوصیات گھوڑے سے کبھی جدا نہیں ہوتیں، ہو ہی نہیں سکتیں، مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ اللہ پاک ان خصوصیات کو جدا نہیں کرسکتے، اللہ پاک سب کچھ کرسکتے ہیں، مطلب یہ ہے کہ سنت اللہ یونہی جاری ہے۔

(۲) جس طرح اجناس میں خصوصیت در خصوصیت پیدا کرنے سے انواع بنتی ہیں، اسی طرح انواع میں خصوصیت در خصوصیت پیدا کرنے سے انواع کے افراد بنتے ہیں، مثلاً زید میں حیوان کی بھی خصوصیات پائی جاتی ہیں نیز انسان کی بھی خصوصیات موجود ہیں اور مزید باتیں یہ ہیں کہ اس کا رنگ سیاہ ہے، ناک نقشہ ایسا ہے، بولنے کا انداز ایسا ہے وغیرہ وغیرہ مشخصات کی وجہ سے وہ انسان کا ایک فرد بن گیا ہے۔

(۳) اوپر سے لے کر نیچے تک مرتب انواع واجناس کی خصوصیات بظاہر گڈمڈ ہوتی ہیں، پھر عقل کے ذریعہ ان کا فرق پہچانا جاتا ہے اور ہر خاصہ کو اس کی خاصیت کی طرف منسوب کیا جاتا ہے، مثلاً زید میں جوہر کی، جسم مطلق کی، جسم نامی کی، حیوان کی اور انسان کی سبھی خصوصیات مجتمع ہیں اور ساتھ ہی فردی خصوصیات بھی، پھر عقل تعیین کرتی ہے کہ زید بذات خود قیام میں کسی محل کا محتاج نہیں، یہ جوہر کا خاصہ ہے اور اس میں جو ابعاد ثلاثہ (طول عرض اور عمق) پائے جاتے ہیں وہ جسم مطلق کا خاصہ ہیں اور نشو ونما جسم نامی کا خاصہ ہے اور زید کی حساسیت حیوان کا خاصہ ہے اور اس کا ناطق ہونا انسان کا

خاصہ ہے، اور اس کا تشخص جو اس کو ہر فرد سے ممتاز کرتا ہے فرد کا خاصہ ہے۔

اوپر جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس کے دلائل عقلیہ ہی کے ساتھ ہیں یعنی وہ سب باتیں عقل کی روشنی میں بیان کی گئی ہیں، اور اس کے دلائل نقلیہ درج ذیل احادیث ہیں۔

(۱) متفق علیہ حدیث ہے کہ تلبینہ (بھوسی، دودھ اور شہد کا حریرہ) بیمار کے دل کو راحت پہنچاتا ہے اور کچھ حزن وملال دور کرتا ہے (مشکوٰۃ کتاب الاطعمہ حدیث ۴۲۷۹)

(۲) متفق علیہ حدیث ہے کہ "کلونجی میں موت کے علاوہ ہر بیماری کی شفا ہے" (مشکوٰۃ کتاب الطب حدیث ۴۵۲۰) کلونجی ایک کالا دانہ ہے، جو اچار میں بھی ڈالا جاتا ہے۔

(۳) مسند احمد (۲۹۳:۱) میں روایت ہے کہ اونٹوں کے پیشاب اور دودھ میں ان (عُرنیین) کے فساد معدہ کا علاج ہے۔

(۴) ترمذی اور ابن ماجہ میں روایت ہے کہ حضرت اسماء بنت عُمیسؓ نے شُبرُم سے مسہل لیا (شُبرُم ایک دانہ ہے چنے کی طرح، بہت گرم، اس کا پانی دوا کے طور پر پیتے ہیں) تو آپ نے فرمایا کہ "وہ گرم اثر کا ہے" پھر انھوں نے سنا سے مسہل لیا تو آپ نے فرمایا کہ "اگر کسی چیز میں موت کا علاج ہے تو سنا میں ہے" (مشکوٰۃ کتاب الطب حدیث ۴۵۳۷)

مذکورہ بالا روایات میں اور ان کے علاوہ بہت سی روایات میں نبی کریم ﷺ نے بہت سی چیزوں کی خصوصیات بیان فرمائی ہیں اور آثار کو اشیاء کی طرف منسوب کیا ہے، پس ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے چیزوں میں خصوصیات رکھی ہیں۔ یہی خصوصیات ان کو دوسری چیزوں سے ممتاز کرتی ہیں۔

وقد دلّ العقلُ والنقلُ على أن الله تعالى خلق العالم أنواعا وأجناسا، وجعل لكل نوع وجنس خواصَّ: فنوع الإنسان -مثلاً- خاصتُه: النُّطق، وظهورُ البَشَرة، واستواءُ القامة، وفهم الخطاب؛ ونوعُ الفرس خاصتُه: الصَّهِيْل، وكونُ بشرته شعرا، وقامته عوجاء، وأن لا يفهم الخطاب؛ وخاصة السُّم: إهلاكُ الإنسان الذي يتناوله، وخاصة الزنجبيل: الحرارة واليبوسة، وخاصة الكافور: البرودة؛ وعلى هذا القياس جميعُ الأنواع من المعدن والنبات والحيوان.

وجرت عادةُ الله تعالى أن لا تنفكَّ الخواصُّ عما جُعلت خواصَّ لها؛ وأن تكون مُشخِّصاتُ الأفراد خصوصياتٍ في تلك الخواص، ونعتًا لبعض مختلفا بها؛ فكذلك مميِّزاتُ الأنواع خصوصا في خواص أجناسها؛ وأن تكون معاني هذه الأسامي المترتبة في العموم والخصوص -كالجسم، والنامي، والحيوان، والإنسان، وهذا الشخص- متمازجةً متشابكةً في الظاهر، ثم يُدرك العقلُ الفرقَ بينها، ويُضيف كلَّ خاصة إلى ما هي خاصةٌ له.

وقد بيّن النبي صلى الله عليه وسلم خواصَّ كثير من الأشياء، وأضاف الآثار إليها، كقوله

صلى الله عليه وسلم: ﴿التَّلْبِينَةُ مُجِمَّةٌ لِفُؤَادِ المَرِيضِ﴾ وقوله: ﴿في الحبة السوداء شفاءٌ من كل داء إلا السَّام﴾ وقوله: ﴿في أبوال الإبل وألبانها شفاء للذَّرِبَةِ بطونُهم﴾ وقوله في الشُّبْرُم: ﴿حارٌّ جارٌّ﴾

ترجمہ: اور عقل ونقل اس پر دلالت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جہان کو انواع واجناس کی شکل میں پیدا کیا ہے۔ اور ہر نوع اور ہر جنس کے لئے خصوصیتیں گردانی ہیں۔ پس نوعِ انسانی کی خصوصیت ـ بطور مثال ـ بامعنی بات بولنا، کھال کا کھلا ہوا ہونا، قد کا سیدھا ہونا اور بات کو سمجھنا ہے۔ اور نوعِ فرس کی خصوصیت ہنہنانا، اس کی کھال کا بالوں سے ڈھکا ہوا ہونا، اس کے قد کا ٹیڑھا ہونا ہے اور یہ بات ہے کہ وہ بات کو نہ سمجھے۔ اور زہر کا خاصہ اس شخص کو ہلاک کرنا ہے جو اس کو استعمال کرے۔ اور سونٹھ کا خاصہ گرمی اور خشکی ہے اور کافور ٹھنڈا ہوتا ہے۔ اور اسی انداز پر معدنیات، نباتات اور حیوانات کی تمام انواع ہیں۔

اور اللہ کی عادت یہ چل رہی ہے کہ:

(۱) خواص جدا نہ ہوں اس چیز سے جس کے لئے ان کو خواص گردانا گیا ہے۔

(۲) اور یہ کہ افراد کو متعین کرنے والی چیز ان خصوصیات میں تخصیص ہو (اجناس کے افراد انواع ہوں اور انواع کے افراد ان کی جزئیات۔ پس اجناس وانواع کی خصوصیات میں مزید تخصیص کر کے ان کے افراد متعین کئے جاتے ہیں) اور ان افراد کے بعض محتملات کی تعیین ہو (مثلاً انسان کے ہر فرد میں متعدد احتمال ہیں، وہ زید جیسا بھی ہو سکتا ہے، عمرو جیسا بھی اور بکر وغیرہ جیسا بھی۔ ان احتمالات میں سے بعض کی تعیین کرنے سے زید بن جاتا ہے) پس اسی طرح انواع کو جدا کرنے والی چیز ان کی اجناس کی خصوصیات میں مزید تخصیص ہوتی ہے۔

(۳) اور یہ کہ ان ناموں کے معانی (یعنی خصوصیات) جو عموم وخصوص میں ترتیب وار ہیں ـــــ جیسے جسم مطلق، جسم نامی، حیوان، انسان اور یہ فرد ـــــ (ان الفاظ کے معانی) ایک پر تہ بہ تہ ہوئے اور گندھے ہوں، پھر عقل ان کے درمیان فرق پہچانے اور ہر خاصہ کو اس چیز کی طرف منسوب کرے جس کا وہ خاصہ ہے۔

اور نبی کریم ﷺ نے بہت سی چیزوں کی خصوصیت بیان فرمائی ہیں، اور آثار کو ان چیزوں کی طرف منسوب کیا ہے، جیسے آپ کا ارشاد ہے کہ: "دودھ کا حریرہ بیمار کے دل کو سکون پہنچاتا ہے" اور آپ کا ارشاد ہے کہ: "کلونجی میں موت کے علاوہ ہر بیماری کی دوا ہے" اور آپ کا ارشاد ہے کہ: "اونٹوں کے پیشاب اور دودھ میں ان لوگوں کے معدے کی خرابی کا علاج ہے" اور شُبْرُم کے بارے میں آپ کا ارشاد ہے کہ "وہ گرم انگارہ ہے"

لغات:

شخص الشيئ: متعین کرنا، تمیز کرنا، اور اسی سے اطباء کی اصطلاح تشخیص امراض ہے اور اسی سے مناطقہ کی اصطلاح

تشخص ہے۔ تشخصات: وہ چیزیں ہیں جو کسی چیز کو دوسری ہم جنس چیزوں سے جدا اور ممتاز کرتی ہیں مثلاً زید کو دیگر افرادِ انسانی سے جو چیزیں جدا کرتی ہیں وہ زید کا تشخص ہیں ... متشخص اسم فاعل ہے خصوصاً مصدر ہے کسی خاص کرنا اور یہ تکون کی خبر ہے ... نعتاً کا عطف خصوصاً پر ہے اور یہ عطف تفسیری ہے، اس کا اور معطوف علیہ کا مطلب ایک ہے ... خصوصاً فی خواص اجناسھا سے پہلے تکون مقدر ہے۔ خصوصاً اس کی خبر ہے اور اسم ضمیر ہے جو معجزات کی طرف راجع ہے ... تمازج: باہم ایک دوسرے کا ملنا ..... تشابکت الامور: باہم خلط ملط ہونا۔ نجفۃ: راحت بخش جمۃ القوم جموما: اکٹھا ہونا المؤب (مصدر) ذوب (ن) ذوبًا المعدۃ: معدے کا بگڑنا ... خاز کے بعد دوسرا لفظ روایات میں دو طرح آیا ہے ح حطی کے ساتھ اس صورت میں تکرار برائے تاکید ہے جیسے جداً زہد ریہا اور پہ ترجمہ اسی کا کیا گیا ہے اور جیم کے ساتھ اس صورت میں ترجمہ ہوگا پیٹ کھول دینے والا۔

صفت تدبیر کا بیان

اللہ تعالیٰ کی تیسری صفت، صفت تدبیر ہے۔ دَبَّرَ تدبیرا کے معنی ہیں: انتظام کرنا۔ اللہ تعالیٰ کائنات پیدا کرنے کے بعد اس کا نظم و انتظام خود ہی فرما رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہی نے اسباب میں تاثیر رکھی ہے اس لئے اسباب کی کارفرمائی بھی حقیقت میں اللہ ہی کا کارنامہ ہے۔ سورۃ الرحمان میں ہے ﴿کُلَّ یَوْمٍ هُوَ فِی شَأْنٍ﴾ (وہ ہر وقت کسی اہم کام میں ہوتے ہیں) یعنی ہر لمحہ ان کا الگ کام اور ہر روز ان کی نئی شان ہے۔ کسی کو مارنا، کسی کو جلانا، کسی کو بیمار کرنا، کسی کو تندرست کرنا، کسی کو بڑھانا، کسی کو گھٹانا، کسی کو دینا، کسی سے لینا، ان کے عنوان میں داخل ہے۔

اور صفت تدبیر کی کرشمہ سازیوں کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کائنات میں جو نظام چلا رہے ہیں، پیش آنے والے واقعات کو اسی سے ہم آہنگ کرتے ہیں۔ موالید ثلاثہ (جمادات، نباتات اور حیوانات) کا نظم و انتظام انہی کے دستِ قدرت میں ہے۔ شاہ صاحب نے اس کی چار مثالیں دی ہیں:

(۱) اللہ تعالیٰ بادلوں سے بارش برساتے ہیں، پھر بارش سے سبزہ اگاتے ہیں تاکہ زمین کی پیداوار لوگ کھائیں اور جانور بھی کھائیں اور مقررہ وقت تک یہ کارخانۂ حیات چلتا رہے۔ یہ بارشیں برسانا اللہ کی صفت تدبیر کا کام ہے، اگر وہ بارش نہ برسائیں تو انسان اور دیگر حیوانات کیسے زندہ رہیں؟

(۲) حضرت ابراہیم خلیل اللہ کے بارے میں یہ مقدر تھا کہ وہ لمبے عرصے تک حیات رہیں، ان کی اولاد ہو اور ان کی اولاد میں نبوت کا سلسلہ چلے، مگر دشمن نے ان کو آگ میں جھونک دیا، تو اللہ نے آگ کو ٹھنڈا کر دیا۔ یہ اللہ کی صفت تدبیر

کا کام ہے۔ اور یہ کوئی انوکھا واقعہ نہیں، روز حوادث میں کسی کو بچا لیا جاتا ہے تاکہ امرِ مقدر بروئے کار آئے۔

(۳) حضرت ایوب علیہ السلام بیمار پڑ گئے۔ ان کے جسم میں فاسد مادہ پیدا ہو گیا، علاج کی کوئی صورت نہ تھی اور ان کے حق میں مقدر یہ تھا کہ وہ شفایاب ہوں، تو اللہ تعالیٰ نے زمین سے ایک چشمہ نکالا، جس میں نہا کر اور پانی پی کر آپ صحت مند ہو گئے۔ یہ سب انتظام بابِ تدبیر سے تھا۔

(۴) بعثتِ نبوی کے وقت عالم کی صورتِ حال وہ تھی جس کا نقشہ سورۃ البینہ کے شروع میں کھینچا گیا ہے۔ سارا عالم گمراہی کی دلدل میں پھنس چکا تھا، چاروں طرف گھٹا ٹوپ تاریکی چھائی تھی، جو معمولی چراغوں سے چھٹنے والی نہیں تھی، جب تک آفتابِ نبوت طلوع نہ ہو کام بننے والا نہیں تھا، اس وقت اللہ تعالیٰ نے سید الاولین والآخرین محبوب رب العالمین خاتم النبیین ﷺ کو مبعوث فرمایا اور آپ کی تعلیمات کے ذریعہ عالم کی اصلاح فرمائی۔ یہ سب اللہ کی صفتِ تدبیر کی کرشمہ سازی ہے۔

مذکورہ بالا مثالوں سے اللہ کی صفتِ تدبیر کے شئون سمجھے جا سکتے ہیں۔ غرض اللہ تعالیٰ نے صفتِ ابداع سے عالم کا مادہ بنایا، پھر صفتِ خلق سے اس مادہ سے موالید ثلاثہ کو وجود بخشا، پھر صفتِ تدبیر نے اس کا نظم و انتظام سنبھالا۔

والثالثة: تدبير عالم المواليد؛ ومرجعه إلى تصيير حوادثها موافقة للنظام الذي ترتضيه حكمته، مفضية إلى المصلحة التي اقتضاها جوده؛ كما أنزل من السحاب مطرا، وأخرج به نبات الأرض، ليأكل منه الناس والأنعام، فيكون سببا لحياتهم إلى أجل معلوم؛ وكما أن إبراهيم — صلوات الله عليه — ألقي في النار، فجعلها بردا وسلاما، ليبقى حيا؛ وكما أن أيوب — عليه السلام — كان اجتمع في بدنه مادة المرض، فأنبع الله تعالى عينا، فيها شفاء مرضه؛ وكما أن الله تعالى نظر إلى أهل الأرض، فمقتهم: عربهم وعجمهم، فأوحى إلى نبيه صلى الله عليه وسلم أن ينذرهم، ويجاهدهم ليخرج من شاء من الظلمات إلى النور.

ترجمہ: اور تیسری صفت عالمِ موالید کا انتظام کرنا ہے۔ اور اس کا خلاصہ: عالمِ موالید میں رونما ہونے والے واقعات کو اس نظام سے ہم آہنگ بنانا ہے جس کو اللہ کی حکمت پسند کرتی ہے۔ اور اس مصلحت تک پہنچانے والا بنانا ہے جس کو اس کا کرم چاہتا ہے، جیسے اللہ نے بادل سے بارش برسائی، اور اس کے ذریعہ زمین کا سبزہ اگایا، تاکہ اس کو لوگ اور چوپائے کھائیں، پس وہ مقررہ وقت تک ان کے زندہ رہنے کا سبب بنے؛ اور جیسے یہ بات ہے کہ حضرت ابراہیم — ان پر اللہ کی بے پایاں مہربانیاں ہوں — آگ میں ڈالے گئے، پس اللہ نے اس آگ کو ٹھنڈی بے گزند بنا دیا تاکہ وہ زندہ رہیں؛ اور جیسے یہ بات ہے کہ حضرت ایوب — ان پر سلامتی ہو — کے بدن میں بیماری کا مادہ اکٹھا ہو گیا، پس اللہ نے ایک

ایسا چشمہ پیدا کیا جس میں ان کی بیماری کی شفا تھی: اور جیسے یہ بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین والوں پر نظر ڈالی، پس ان سے سخت ناراض ہوئے، عربوں سے بھی اور عجمیوں سے بھی، پس وحی بھیجی اپنے پیغمبر ﷺ کی طرف کہ وہ ان کو ڈرائیں اور ان پر تن تو رحمت کریں تاکہ اللہ تعالیٰ جس کو چاہیں تاریکیوں سے روشنی کی طرف نکالیں۔

تشریح:

موالید مولود کی جمع ہے اور موالید ثلاثہ معدنیات، نباتات اور حیوانات ہیں، چونکہ یہ تینوں چیزیں عناصر اربعہ سے پیدا ہوتی ہیں اس لئے ان کو موالید کہا جاتا ہے۔

معدنیات: وہ مرکبات ہیں جن میں حس، ارادہ اور نشوونما نہیں ہوتا۔ معدنیات، معدن کی جمع ہے جس کے معنی ہیں کان، جس سے دھاتیں نکلتی ہیں۔

نباتات: وہ مرکبات ہیں جن میں نشوونما ہوتا ہے، مگر احساس اور ارادہ نہیں ہوتا، نباتات، نبات کی جمع ہے، جس کے معنی ہیں سبزی۔

حیوانات: وہ اجسام ہیں جو بڑھنے والے، احساس کرنے والے اور بالارادہ حرکت کرنے والے ہیں۔

لغات: المرجع: لوٹنے کی جگہ یہاں بمعنی خلاصہ ہے مقت (ن) مقتا: بہت بغض رکھنا۔

☆ ☆ ☆

صفت تدبیر کی مزید وضاحت

صفت تدبیر کا خلاصہ یہ بیان کیا گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ عالم موالید میں رونما ہونے والے واقعات کو اس نظام سے ہم آہنگ کرتے ہیں جس کو ان کی حکمت پسند کرتی ہے اور واقعات کو اس انداز پر ڈھالتے ہیں کہ وہ اس مصلحت تک پہنچا دیتے ہیں جس کو ان کا کرم چاہتا ہے۔ اب اس کی تفصیل کر رہے ہیں تفصیل میں جانے سے پہلے دو باتیں سمجھ لی جائیں۔

① یہ عالم موالید جواہر و اعراض کا مجموعہ ہے، کیونکہ فلاسفہ کے نزدیک یہی اجناس عالیہ ہیں، ان سے اوپر کوئی ایسا عام مفہوم نہیں جو دونوں کو شامل ہو۔ اور جوہر: وہ ممکن ہے جو محل کے بغیر موجود ہو سکے، جیسے کپڑا، کتاب، قلم وغیرہ۔ یہ سب چیزیں جوہری وجود رکھتی ہیں۔ اور عرض: وہ ممکن ہے جو کسی محل میں پایا جائے یعنی وہ پائے جانے میں، باقی رہنے میں، اور متشکل ہونے میں کسی ایسے محل کا محتاج ہو جو اس کو سہارا دے، جیسے کپڑے کی سیاہی سفیدی وغیرہ عرضی وجود رکھتے ہیں۔ پھر جواہر کی تو کچھ خاص اقسام نہیں مگر اعراض کی نو قسمیں ہیں: کم، کیف، این، متی، اضافت، ملک، وضع، فعل اور انفعال۔ ان کی تفصیلات معین الفلسفہ میں دیکھیں۔

یہ جواہر و اعراض مواد کے عناصر میں رکھی ہوئی قدرتی صلاحیتوں سے پیدا ہوتے ہیں اور یہ صلاحیتیں مواد سے کبھی جدا نہیں ہوتیں۔ جب ان صلاحیتوں میں باہم کشاکش اور ٹکراؤ پیدا ہوتا ہے تو حکمت خداوندی مختلف انداز و اطوار کو پیدا کرتی ہے۔ ان میں سے بعض جواہر ہوتے ہیں اور بعض اعراض، پھر اعراض کی متعدد اقسام ہیں جیسے جانداروں کے افعال، اخلاق اور ان کے ارادے اور ان کے علاوہ دیگر چیزیں جیسے کسی جگہ میں ہونا (اَین) اور کسی زمانہ میں ہونا (متی) ہے۔

(۲) اس عالم میں اللہ تعالیٰ نے جو کچھ پیدا فرمایا ہے وہ حکمت اور مصالح عالم کے اقتضاء سے بنایا ہے، اس لئے ہر چیز اپنی ذات میں ایک حسن رکھتی ہے، کوئی چیز فی نفسہ بری نہیں، سورۂ سجدہ آیت ۷ میں ہے: ﴿الَّذِیْ اَحْسَنَ کُلَّ شَیْءٍ خَلَقَهٗ﴾ (اللہ نے جو بھی چیز بنائی خوب بنائی) اس ارشاد میں تمام جواہر و اعراض داخل ہیں، حتیٰ کہ اخلاق سیئہ غصہ، حرص، شہوت، بخل وغیرہ بھی اپنی ذات سے برے نہیں، برائی ان کو بے اندازہ اور بے محل استعمال کرنے میں ہے۔

غرض جب ہر چیز کو اس کے مقصد تخلیق کے ساتھ موازنہ کرکے دیکھا جائے تو وہ حسن ہوگی، کسی بھی چیز میں دو معنی کے اعتبار سے کوئی شر نہیں: ایک: اس اعتبار سے کہ سبب جو کچھ چاہے وہ صادر ہو۔ دوسرے: اس اعتبار سے کہ سبب جو کچھ چاہے اس کی ضد صادر ہو، جیسے چاقو کا کام کاٹنا اور زہر کا کام مارنا ہے، پس بہترین چاقو وہ ہے جو خوب چلے اور عمدہ زہر وہ ہے جو فوراً کام تمام کردے۔ اگرچہ اس اعتبار سے کہ ایک انسان مر گیا یہ کارِ شر ہے۔

البتہ دوسرے دو اعتباروں سے شر پایا جاتا ہے ایک: اس اعتبار سے کہ کسی سبب سے وہ چیز پیدا ہو کہ اگر وہ پیدا نہ ہوتی تو بہتر ہوتا۔ دوسرے: کسی سبب سے وہ چیز پیدا نہ ہو جس کے آثار و نتائج اچھے ہیں۔ ان دو اعتباروں سے عالم میں شر پایا جاتا ہے، جیسے ابراہیم خلیل اللہ کو آگ جلا دیتی تو وہ آگ کی خوبی ہوتی، کیونکہ آگ کا کام ہی جلانا ہے، وہ اسی مقصد کے لئے پیدا کی گئی ہے، مگر یہ بات مقصد عالم اور مفاد کلی سے ہم آہنگ نہ ہوتی اور اس کے آثار و نتائج بھی اچھے نہ ہوتے اس اعتبار سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ کا جلانا شر ہے۔

اب صفت تدبیر کی کارفرمائی ملاحظہ فرمائیے: جب کسی ایسے واقعہ کے رونما ہونے کے تمام اسباب مہیا ہو جاتے ہیں جس میں آخری دو معنی کے اعتبار سے شر ہوتا ہے یعنی وہ واقعہ نظام کلی کے منافی ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی صفت تدبیر اپنا کام کرتی ہے۔ اور چار طرح سے تصرف کرکے اس واقعہ کو ہونے سے روک دیتی ہے تاکہ نظام عالم متأثر نہ ہو۔ اور وہ چار صورتیں یہ ہیں:

پہلی صورت: اسباب میں رکھی ہوئی تاثیر کو معطل کر دیا جاتا ہے اور چیزوں کی صلاحیتوں کو سمیٹ لیا جاتا ہے، جیسے دجال ایک مؤمن بندے کو قتل کرے گا، پھر سب لوگوں کے سامنے اس کو زندہ کرے گا اور اس سے اپنی الوہیت کا اقرار لے گا، وہ بندہ اقرار نہیں کرے گا تو پھر دوبارہ دجال اس کو قتل کرنا چاہے گا مگر اب قتل نہیں کر سکے گا، اللہ تعالیٰ اس کو قتل پر قدرت نہیں دیں گے، حالانکہ اس کا قتل کرنے کا ارادہ بالکل سچا ہوگا، آلاتِ قتل بھی صحیح سلامت ہوں گے مگر قتل نہیں

کر سکے گا، کیونکہ اللہ تعالیٰ دجال کی قتل کرنے کی صلاحیت قبض کر لیں گے۔ یہ واقعہ مسلم شریف میں ہے (مشکوۃ باب ذکر الدجال ح ۵۴۷۶)

دوسری صورت: چیزوں کی صلاحیتوں کو بڑھا دینا تھوڑی میں اضافہ کر دینا۔

پہلی مثال: جیسے ایوب علیہ السلام کے ٹھوکر مارنے سے زمین کے سوتوں کا ٹوٹ جانا اور چشمہ کا پھوٹ نکلنا، حالانکہ ایک بیمار ضعیف ونزار آدمی کے ایڑی مارنے سے چشمہ نہیں پھوٹتا، درحقیقت اللہ تعالیٰ نے ایوب علیہ السلام کی ٹھوکر میں بسط کر دیا، اس میں اتنی طاقت پیدا کر دی کہ اس نے زمین کا جگر چاک کر دیا اور چشمہ بہ پڑا۔

فائدہ: اور یہ جو مشہور ہے کہ زمزم حضرت اسماعیل علیہ السلام کے ایڑیاں رگڑنے سے نمودار ہوا ہے، یہ بے اصل بات ہے۔ بخاری شریف کتاب احادیث الانبیاء باب ۹ حدیث ۳۳۶۴ میں صراحت ہے کہ فاذا ھی بالملک عند موضع زمزم فبحث بعقبہ او قال: بجناحہ حتی ظھر الماء (جس اچانک زمزم کی جگہ کے پاس حضرت ہاجرہؓ نے فرشتہ کو دیکھا، پس اس نے اپنی ایڑی سے کریدا یا فرمایا کہ اپنا پر مارا یہاں تک کہ پانی ظاہر ہوا) جس وقت زمزم ظاہر ہوا اس وقت حضرت اسماعیل علیہ السلام کئی گز کے فاصلہ پر ایک بڑے درخت کے نیچے لیٹے ہوئے تھے، جیسا کہ مذکورہ حدیث میں صراحت ہے۔

سوال: کیا حضرت اسماعیل علیہ السلام کے ایڑیاں رگڑنے سے زمزم ظاہر نہیں ہو سکتا؟

جواب: ہو سکتا ہے اور ہزار بار ہو سکتا ہے، جب ایوب علیہ السلام کے ٹھوکر مارنے سے چشمہ نمودار ہو سکتا ہے تو اسمٰعیل علیہ السلام کے ایڑیاں رگڑنے سے زمزم کیوں نمودار نہیں ہو سکتا؟ مگر بات امکان کی نہیں، وقوع کی ہے کہ کیا ایسا ہوا؟ جواب یہ ہے کہ اس کا ثبوت نہیں اور ایوب علیہ السلام کے واقعہ کا قرآن کریم میں ذکر ہے (فائدہ تمام ہوا)

دوسری مثال: اللہ کے بعض بندوں نے بعض جنگوں میں وہ کارنامے انجام دیئے ہیں کہ عقل باور نہیں کرتی کہ ایک شخص تو کیا، کئی شخص مل کر بھی وہ کام انجام نہیں دے سکتے، پھر یہ کیسے ممکن ہوا؟ اس طرح کہ اللہ نے اس بندے کی صلاحیتوں کو بڑھا دیا۔

حاشیہ میں لکھا ہے کہ یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔ آپ نے جنگ خیبر میں تن تنہا قلعہ کا دروازہ اکھاڑ دیا تھا، مگر یہ واقعہ چونکہ پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچا، اس لئے شاہ صاحب نے نام نہیں لیا۔

تیسری صورت: چیزوں کی صلاحیتوں میں تبدیلی کر دینا، جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جس آگ میں جھونکا گیا تھا اللہ نے اس آگ کی تاثیر بدل دی اور اس کو بجائے گرم کے ٹھنڈا کر دیا اور آگ نے وہ کام کیا جو برف کرتا ہے۔

چوتھی صورت: دل میں خیر کی بات ڈالنا۔ حضرت خضر علیہ السلام نے جو تین کام کئے ہیں وہ الہام خداوندی سے کئے ہیں، اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ان کی والدہ نے دریائے نیل میں الہام خداوندی سے ڈالا تھا، اسی طرح

والشرائع على الأنبياء عليهم السلام.

والإلهام: تارة يكون للمبتلى، وتارة يكون لغيره لأجله، والقرآن العظيم بيّن أنواع التدبير بما لامزيد عليه.

ترجمہ: اور اس کی تفصیل یہ ہے کہ مولالید میں جو صلاحیتیں امانت رکھی ہوئی ہیں، جو ان سے جدا نہیں ہوتیں، جب ان میں کشاکش ہوئی اور وہ باہم ٹکرائیں تو اللہ کی حکمت نے مختلف انداز کے پیدا کرنے کو واجب کیا، ان میں سے بعض جواہر ہیں اور بعض اعراض۔ اور اعراض یا تو جانداروں کے افعال ہیں یا ارادے ہیں یا ان دونوں کے علاوہ ہیں۔

اور ان اندازوں میں کوئی برائی نہیں ہے بایں معنی کہ وہ چیز صادر نہ ہو جس کو اس کا سبب چاہتا ہے، یا اس چیز کی ضد صادر ہو جس کو وہ سبب چاہتا ہے اور کوئی بھی چیز جب موازنہ کی جائے اس کے اس سبب کے ساتھ جو اس کے وجود کو چاہتی ہے تو وہ چیز لامحالہ اچھی ہوگی، جیسے (چاقو تلوار کا) کاٹنا اچھا ہے اس اعتبار سے کہ وہ لوہے کی دھات کا مقتضی ہے، اگرچہ یہ چیز بری ہے انسان کے جسم کے برباد ہوجانے کے اعتبار سے، البتہ ان اطوار میں شر ہے بایں معنی کہ ایسی چیز پیدا ہو، جس کا غیر مصلحت سے زیادہ ہم آہنگ ہو اس چیز سے آثار کے اعتبار سے، یا کسی ایسی چیز کا نہ پیدا ہونا جس کے نتائج محمود ہوں۔

اور جب اس شر کے اسباب مہیا ہوجاتے ہیں تو بندوں پر اللہ کی مہربانی، اور بندوں پر اللہ کا لطف، اور اللہ کی قدرت کا ہر چیز کو عام ہونا، اور اللہ کے علم کا ہر چیز کو شامل ہونا چاہتا ہے کہ اللہ ان صلاحیتوں میں اور ان اعضاء میں جو ان صلاحیتوں کو اپنے اندر لئے ہوئے ہیں تصرف کریں، قبض وبسط اور احالہ والہام کے ذریعہ، تاکہ یہ سب (یعنی چاروں صورتیں) امر مطلوب تک پہنچادیں۔

رہا قبض: تو اس کی مثال وہ ہے جو حدیث میں آئی ہے کہ دجال ایک مؤمن بندے کو دوسری مرتبہ قتل کرنا چاہے گا پس اللہ تعالیٰ اس کو اس کی قدرت نہیں دیں گے قتل کے ارادے کے پکے ہونے اور آلاتِ قتل کے درست ہونے کے باوجود۔

اور رہا بسط: تو اس کی مثال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک چشمہ نکالا حضرت ایوب علیہ السلام کے لئے ــــ اللہ کی بے پایاں رحمتیں ہوں ان پر ــــ ان کے زمین پر ٹھوکر مارنے کے ذریعہ، حالانکہ عام طور پر ٹھوکر مارنا پانی پھوٹنے تک نہیں پہنچاتا اور اللہ نے اپنے بعض مخلص بندوں کو جنگ میں ایسے کام کی قدرت دی جو عقل میں نہیں آتی، اس جیسے بدنوں سے، اور نہ اس کے دو چند بدنوں سے۔

اور رہا احالہ: تو اس کی مثال: آگ کو معدوم ہوجانا ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لئے۔

اور رہا الہام: تو اس کی مثال: کشتی کو پھاڑنے، دیوار کو سیدھا کرنے اور لڑکے کو قتل کرنے کے واقعات ہیں۔ اور کتابوں اور قوانین کو انبیائے کرام پر اتارنا ہے۔

اور ابہام بھی بتلانا کو ہوتا ہے اور کبھی اس کے فائدے کے لئے اس کے علاوہ کو ہوتا ہے۔ اور قرآن عظیم نے تدبیر خداوندی کی انواع بیان کی ہیں جن کی تفصیل سے کر ان پر اضافہ ممکن نہیں۔

لغات:

الطَوْرُ جمع ہے الطَوْر کی بمعنی طاقت، صلاحیت ... طَوْر (مصدر) بمعنی حال، انداز، جمع اطوار کہا جاتا ہے الناس اطوار یعنی لوگ مختلف قسم کے اور مختلف حالات کے ہیں۔ ... لامحالۃ من الامر ضروری، بیشک ... البِنْیَۃ: ڈھانچہ بنیۃ الکلمۃ: صیغہ، مادہ ... قبض (ن) قبضًا الشیئَ: سمیٹنا ... بسط (ن) بسطًا: پھیلانا، بڑھانا، کشادہ کرنا ... احال اِحالۃً ایک حالت سے دوسری حالت میں بدلنا۔ ... اَلْهَمَ اِلْهَامًا: وحی کرنا، سکھانا، توفیق دینا، دل میں ڈالنا۔

باب ـــــ ٢

عالم مثال کا بیان

عالَم کے لغوی معنی ہیں: وہ چیز جس سے کوئی چیز جانی جائے، جیسے خاتَم: وہ چیز جس سے مہر لگائی جائے اور عرف میں عالَم کہتے ہیں اس چیز کو جس سے اللہ تعالیٰ کو جانا جائے اور ساری مخلوقات کی یہی شان ہے یعنی کائنات کے ذرہ ذرہ سے خالق کو پہچانا جاسکتا ہے۔ اس لئے عالَم کا اطلاق مجموعۂ کائنات پر بھی ہوتا ہے اور اس کے اجزاء پر بھی بلکہ کائنات کے ہر ہر فرد پر بھی اس کا اطلاق کیا جاسکتا ہے، جیسے عالَم زید، عالَم عمرو وغیرہ۔ تفسیر روح المعانی میں ہے والعالَم کالخاتم، اسم لما یُعلم بہ، وغلب فیما یُعلم بہ الخالق تعالیٰ شانہ، وھو کل ما سواہ من الجواھر والأعراض، ویطلق علی مجموع الأجناس، وھو الشائع، کما یُطلق علی واحد منھا فصاعدًا (٧٨:١)

اور اجزائے عالَم پر عالَم کا اطلاق مختلف اعتبارات سے کیا جاتا ہے مثلاً:

(۱) کوئی عالَم کی دو قسمیں کرتا ہے روحانی اور جسمانی۔

(۲) کوئی عناصری دنیا کو عالَم سفلی اور عالَم کون وفساد کہتا ہے اور افلاک اور ان کے اندر کی چیزوں کو عالَم علوی کہتا ہے۔

(۳) کوئی حواس سے محسوس ہونے والی چیزوں کو عالَم شہادت اور محسوس نہ ہونے والی چیزوں کو عالَم غیب کہتا ہے۔

(۴) کوئی ان چیزوں کو جو غیر متعین مدت کے لئے مادے کے بغیر پیدا کی گئی ہیں، جیسے عقول مجردہ اور نفوس، ان کو عالَم امر، عالَم ملکوت اور عالَم غیب کہتا ہے اور جو چیزیں مادہ سے اجل مقرر کے لئے پیدا کی گئی ہیں، جیسے موالید ثلاثہ ان کو عالَم خلق اور عالَم شہادت کہتا ہے۔

(۵) کوئی عالم کی دو قسمیں کرتا ہے: عالم ارواح اور عالم اجسام۔

(۶) کوئی عالم کو ظاہر و باطن میں تقسیم کرتا ہے۔

(۷) اور رب العالمین کی تفسیر میں مفسرین ہر جنس کو علحدہ عالم قرار دیتے ہیں، جیسے عالم انس، عالم جن، عالم ملائکہ، عالم طیور، عالم بہائم، وحوش وغیرہ اور اگر تمام انواع کے اعتبار سے عالم کی تقسیم کی جائے تو بے شمار عالم ہو جائیں گے۔

(۸) اور عرف عام میں عالم کی دو قسمیں کی جاتی ہیں: دنیا اور آخرت۔ اور برزخ جس کا دوسرا نام عالم قبر ہے وہ بھی دنیا کا حصہ ہے، جس میں آخرت کے احکام مترتب ہوتے ہیں۔

حضرت شاہ صاحب قدس سرہ ایک نیا عالم ثابت کرتے ہیں اور اس کا نام عالم مثال رکھتے ہیں۔ مثال کے معنی ہیں مانند، ایک جیسی چیز، یہی معنی مثل کے بھی ہیں جیسے لیس کمثلہ شیء حضرت فرماتے ہیں: بہت سی احادیث سے یہ بات ثابت ہے کہ کائنات میں ایک ایسا عالم بھی پایا جاتا ہے جو:

(۱) غیر مادی ہے یعنی عناصر اربعہ سے نہیں بنا۔

(۲) اس عالم میں معانی یعنی حقائق کے لئے بھی جسم ہیں اور یہ اجسام مناسب ہیں، ہر معنی کو اس کی ذات کا لحاظ کر کے جسم دیا جاتا ہے جیسے بزدلی کو خرگوش کا اور دنیا کو ایک بوڑھی عورت کا جس کے سر کے بال کھچڑی ہو رہے ہوں۔

(۳) اس دنیا کی چیزیں پائے جانے سے پہلے عالم مثال میں پائی جاتی ہیں، وہاں ان کا تحقق مخصوص نوعیت کا ہے۔

(۴) پھر جب وہ چیزیں اس دنیا میں یعنی خارج میں پائی جاتی ہیں تو یہاں اور وہاں ایک ہوتی ہیں، رہی یہ بات کہ اتحاد کی کیا نوعیت ہے؟ تو اس کی تعیین مشکل ہے، اتحاد کی مختلف صورتوں میں سے کوئی صورت ہوتی ہے۔

(۵) اور بہت سی چیزیں وہ ہیں جن کے لئے عوام کے نزدیک جسم نہیں اور وہ عالم مثال میں ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتی ہیں اور اترتی چڑھتی ہیں اگرچہ لوگ ان کو نہیں دیکھتے۔

سوال: یہ عالم کہاں ہے؟

جواب: یہ عالم جس طرح مادی نہیں، مکانی اور زمانی بھی نہیں، اس لئے اس کی جگہ متعین نہیں کی جا سکتی، بس اتنا کہا جائے گا کہ یہ عالم موجود ہے۔

سوال: اس عالم کا نام عالم مثال کیوں تجویز کیا گیا ہے؟

جواب: چونکہ عالم مثال میں دنیا و آخرت کی تمام چیزیں مثالی صورت میں پائی جاتی ہیں اس لئے اس کو عالم مثال نام دیا گیا ہے۔ مثال کے لئے دوسرا لفظ ظل (سایہ) بھی استعمال کرتے ہیں یعنی عالم مثال میں تمام دنیوی اور اخروی چیزوں کے اظلال پائے جاتے ہیں نمونے پائے جاتے ہیں اور صوفیہ کی اصطلاح میں مثال کے معنی صورت کے ہیں (کشاف اصطلاحات الفنون ۲: ۱۳۳۱) یعنی عالم مثال کو اس وجہ سے بھی عالم مثال کہا جاتا ہے کہ اس عالم کی چیزیں اور اس

دنیا کی چیزیں بیشتر ایسی ہیں۔

﴿باب ذكر عالم المثال﴾

اعلم أنه دلت أحاديث كثيرة على أن في الوجود عالمًا غير عنصري، تتمثل فيه المعاني بأجسام مناسبة لها في الصفة، وتتحقق هنالك الأشياء قبل وجودها في الأرض، نحوًا من التحقق، فإذا وُجدت كانت هي هي، بمعنى من معاني هو هو؛ وأن كثيرًا من الأشياء، مما لا جسم لها عند العامة، تنتقل وتنزل، ولا يراها جميع الناس.

ترجمہ: عالم مثال کا تذکرہ: یہ بات جان لیجئے کہ بہت سی حدیثیں اس پر دلالت کرتی ہیں کہ ایک ایسا عالم بھی موجود ہے جو مادی نہیں ہے۔ معانی اس عالم میں پائے جاتے ہیں ایسے جسموں کے ساتھ جو ان معانی کے ساتھ صفت میں مناسبت رکھنے والے ہیں۔ اور چیزیں وہاں پائی جاتی ہیں ان کے زمین میں پائے جانے سے پہلے، پائے جانے کی کسی نوعیت سے۔ پھر جب وہ چیزیں اس دنیا میں پائی جاتی ہیں تو وہ وہی ہوتی ہیں، اتحاد کے معانی میں سے کسی معنی کے اعتبار سے۔ اور (احادیث اس پر بھی دلالت کرتی ہیں) کہ بہت سی چیزیں، ان چیزوں میں سے جن کے لئے عوام کے نزدیک جسم نہیں ہے، منتقل ہوتی ہیں اور اترتی ہیں، درانحالیکہ ان کو سب لوگ نہیں دیکھتے۔

تشریح:

(۱) عنصر عربی زبان کا لفظ ہے، اس کے لغوی معنی ہیں اصل۔ اور اصطلاح میں عنصر اس بسیط (غیر مرکب) اصل کو کہتے ہیں جس سے تمام مرکبات ترکیب پاتے ہیں۔ قدیم فلاسفہ کے نزدیک عناصر چار تھے یعنی آگ، پانی، ہوا اور مٹی۔ انہی کو ارکان اور اصول کون وفساد بھی کہتے ہیں۔ قدیم فلاسفہ نے استقراء سے یہی چار عناصر دریافت کئے تھے۔ ان کے نزدیک موالید ثلاثہ انہی عناصر اربعہ سے مرکب ہیں۔ جدید نظریہ کے لئے میری کتاب معین الفلسفہ دیکھیں۔ شاہ صاحب رحمہ اللہ صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ عالم مثال مادی عالم نہیں، یعنی وہ عناصر اربعہ سے مرکب نہیں۔

(۲) وجود کی دو قسمیں ہیں: خارجی اور نفس الامری۔ پس موجود کی بھی دو قسمیں ہیں:

(الف) موجود خارجی: یعنی وہ موجود جس کا ذہن سے باہر خارج میں وجود ہے، جیسے زید، عمر، بکر کا وجود۔

(ب) موجود نفس الامری: یعنی وہ موجود جس کا واقعی وجود ہے، یعنی کسی کے ماننے پر موقوف نہیں، جیسے چار کا جفت ہونا اور پانچ کا طاق ہونا اور طلوع شمس اور وجود نہار کے درمیان تلازم۔ یہ سب واقعی چیزیں ہیں، خواہ ان کو جاننے والا کوئی ہو یا نہ ہو، اور خواہ کوئی ان کو مانے یا نہ مانے، وہ ایک حقیقت ہیں، اعتبار معتبر پر موقوف نہیں۔

شاہ صاحب قدس سرہ وجود خارجی کے لئے "وجود" کا لفظ استعمال کرتے ہیں، اور وجود نفس الامری کے لئے

تحقق اور تمثل کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔

(۳) معانی معنی کی جمع ہے۔ معنی کے لغوی معنی ہیں: مقصود اور مراد۔ اور اصطلاح میں حقیقت و ماہیت اور عقلی مفہوم کو بھی معنی کہتے ہیں۔ اور حقیقت و ماہیت ما بہ الشیء ھو ھو کو کہتے ہیں جیسے انسان کی ماہیت ہے حیوان ناطق کیونکہ اس سے انسان کا قوام ہے اور حیوان ناطق ایک عقلی مفہوم ہے، خارج میں مستقلاً اس کا وجود نہیں۔ عرف عام میں حقائق ومعانی کو "معنویات" سے تعبیر کرتے ہیں۔

غرض عالم مثال میں جس طرح اس دنیا کی مادیات (موجودات خارجیہ) کا مثالی وجود ہے، حقائق و معانی کا بھی وہاں مثالی وجود ہے ہر حقیقت و معنی کو اس کی صفت اور حالت کا لحاظ کرکے وہاں مثالی جسم دیا جاتا ہے جیسے موت کو مینڈھے کا جسم اور دنیا کو بوڑھی عورت کی شکل دی گئی ہے۔

(۴) تحقق من التحقق کا مطلب یہ ہے کہ عالم مثال میں اشیاء کا پایا جانا بالکل اس دنیا میں پائے جانے کی طرح نہیں ہے، البتہ اس کی پوری تفصیل ہم نہیں جانتے، بس اجمالاً اتنا کہیں گے کہ وہاں تحقق ہوتا ہے۔

(۶) مذکر کے لئے ھو اور مؤنث کے لئے ھی ہی دو چیزوں میں اتحاد ہونے کے لئے محاورہ ہے بلکہ سہارنے یہ محاورہ استعمال کیا ہے جو قالت: کاَنَّہٗ ھُوَ﴾ (نمل ۴۲) اور جنت میں اہل جنت یہی محاورہ استعمال کریں گے وقالوا: ھٰذا الَّذِیْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ﴾ (البقرۃ ۲۵) اور دو چیزوں میں اتحاد من کل الوجوہ نہیں ہو سکتا، ورنہ وہ دو کہاں رہیں گی؟ کسی وجہ ہی اتحاد ہو سکتا ہے۔ شیخ محمد علی تھانوی نے کشاف اصطلاحات الفنون میں اس اتحاد کی متعدد صورتیں بیان کی ہیں، مثلاً:

(۱) ذاتی اتحاد یعنی حمل ایجابی ہو سکے جیسے زید انسانٌ یعنی زید اور انسان ایک ہی چیز ہیں۔

(۲) اتحاد فی المفہوم، جیسے اسد اور غضنفر کا ایک ہی مفہوم ہے، پس یہ دونوں متحد ہیں۔

(۳) متعدد چیزیں کسی خاص اعتبار سے متحد ہوں، جیسے افراد انسانی انسان ہونے کے اعتبار سے متحد ہیں۔

غرض اس عالم کی چیزیں اور عالم مثال کی چیزیں وجود میں تو متحد نہیں، ورنہ وہ متعدد کیسے ہوں گی؟ پھر اتحاد کی کیا صورت ہے؟ شاہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اتحاد کی مذکورہ صورتوں میں سے کوئی صورت ہوتی ہے، اس کی تعیین مشکل ہے۔

عالم مثال پر دلالت کرنے والی روایات

اب ذیل میں شاہ صاحب رحمہ اللہ انیس (۱۹) نصوص پیش کرتے ہیں، جو عالم مثال کے ثبوت پر دلالت کرتی ہیں، ان کی شرح ترجمہ کے ساتھ کردی جائے گی، اور طریق استدلال شاہ صاحب بعد میں خود ہی ذکر فرمائیں گے۔ یہ تمام

روایات بلفظہ تشبیہ ہیں، بلکہ روایات کا مفاد ہیں۔

[الأحاديث الدالة على عالم المثال]

[١] قال النبي صلى الله عليه وسلم: ﴿لما خلق الله الرحم قامت، فقالت: هذا مقام العائذ بك من القطيعة﴾

[٢] وقال: ﴿إن البقرة وآل عمران تأتيان يوم القيامة، كأنهما غمامتان، أو غيايتان، أو فِرقان من طير صواف تحاجان عن أهلهما﴾

[٣] وقال: ﴿تجيئ الأعمال يوم القيامة: فتجيئ الصلاة، ثم تجيئ الصدقة، ثم يجيئ الصيام﴾ الحديث

[٤] وقال: ﴿إن المعروف والمنكر لخليقتان، تنصبان للناس يوم القيامة: فأما المعروف فيبشر أهله، وأما المنكر فيقول: إليكم! إليكم!، ولا يستطيعون له إلا لزوما﴾

[٥] وقال: ﴿إن الله يبعث الأيام يوم القيامة كهيئتها، ويبعث الجمعة زهراء منيرة﴾

[٦] وقال: ﴿يؤتى بالدنيا يوم القيامة في صورة عجوز شمطاء، زرقاء، أنيابها بادية مُشَوَّه خلقها﴾

[٧] وقال: ﴿هل ترون ما أرى؟ فإني لأرى مواقع الفتن خلال بيوتكم كمواقع القطر﴾

[٨] وقال في حديث الإسراء: ﴿فإذا أربعة أنهار: نهران باطنان، ونهران ظاهران، فقلت: ما هذا يا جبريل؟ قال: أما الباطنان ففي الجنة، وأما الظاهران فالنيل والفرات﴾

[٩] وقال في حديث صلاة الكسوف: ﴿صُوِّرت لي الجنة والنار﴾ وفي لفظ: ﴿بيني وبين جدار القبلة﴾ وفيه: ﴿أنه بسط يده ليتناول عنقودا من الجنة، وأنه تكعكع من النار، ونفخ من حرّها، ورأى فيها سارق الحجيج، والمرأة التي ربطت الهرة حتى ماتت، ورأى في الجنة امرأة مومسة، سقت الكلب﴾ ومعلوم أن تلك المسافة لا تتسع للجنة والنار، بأجسادهما المعلومة عند العامة

[١٠] وقال: ﴿حُفّت الجنة بالمكاره، وحفت النار بالشهوات، ثم أمر جبريل أن ينظر إليهما﴾

[١١] وقال: ﴿ينزل البلاء فيعالجه الدعاء﴾

[١٢] وقال: ﴿خلق الله العقل، فقال: أقبل، فأقبل، وقال له: أدبر فأدبر﴾

[١٣] وقال: ﴿هذان كتابان من رب العالمين﴾ الحديث

[١٤] وقال: ﴿يؤتى بالموت كأنه كبش، فيذبح بين الجنة والنار﴾

[۱۵] وقال تعالى: ﴿فأرسلنا إليها روحنا فتمثل لها بشرا سويا﴾

[۱۶] واستفاض في الحديث:

[الف] أن جبريل كان يظهر للنبي صلى الله عليه وسلم ويتراءى له، فيكلمه، ولا يراه سائر الناس.

[ب] وأن القبر يفسح سبعين ذراعا في سبعين، أو يضم حتى تختلف أضلاع المقبور؛

[ج] وأن الملائكة تنزل على المقبور فتسأله.

[د] وأن عمله يتمثل له

[ه] وأن الملائكة تنزل إلى المحتضر بأيديهم الحرير أو المسح؛

[و] وأن الملائكة تضرب المقبور بمطرقة من حديد، فيصيح صيحة يسمعها ما بين المشرق والمغرب.

[۱۷] وقال النبي صلى الله عليه وسلم: ﴿يسلط على الكافر في قبره تسعة وتسعون تنينا، تنهشه وتلدغه حتى تقوم الساعة﴾

[۱۸] وقال: ﴿إذا أدخل الميت القبر مثلت له الشمس عند غروبها، فيجلس يمسح عينيه، ويقول: دعوني أصلي﴾

[۱۹] واستفاض في الحديث:

[الف] أن الله تعالى يتجلى بصور كثيرة لأهل الموقف.

[ب] وأن النبي صلى الله عليه وسلم يدخل على ربه، وهو على كرسيه؛

[ج] وأن الله تعالى يكلم ابن آدم شفاها — إلى غير ذلك مما لا يحصى كثرة

حدیث (۱) نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: "جب اللہ تعالیٰ نے "ناتے" کو پیدا کیا تو وہ کھڑا ہوا، اور اس نے کہا: یہ قطع رحمی سے آپ کی پناہ چاہنے والے کی جگہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: کیا تو اس پر راضی ہے کہ جو تجھے کاٹے، میں اس کو اپنے سے کاٹوں، اور جو تجھے جوڑے میں اس کو اپنے سے جوڑوں؟ ناتے نے جواب دیا: "میں اس پر راضی ہوں" اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "جا، تیرے لئے یہ ہے" یعنی میں اس کی کارروائی کرتا ہوں (مشکوٰۃ، باب البر والصلۃ حدیث ۴۹۱۹)

تشریح: یہ بخاری و مسلم کی روایت ہے۔ رحم (بچہ دانی) یعنی رشتہ داریاں اور قریبی رشتہ داری۔ رحم نے کھڑے ہوکر رحمان کی کمر میں کوئی بھری تھی، رحمان نے پوچھا: کیا بات ہے؟ تب اس نے مذکورہ جملہ کہا تھا، جس کا مطلب یہ ہے کہ بچہ جس طرح پناہ لینے کے لئے ماں کی کمر میں کوئی بھرتا ہے، رحم نے بھی کوئی بھری اور قطع رحمی سے پناہ چاہی، جس پر اس

سے مذکور ہو وہ کیا گیا۔ غور کیجئے! اعمال ایک معنوی چیز ہے اس کا جسم نہیں ہے مگر حدیث اس کے جسم دار ہونے پر دلالت کرتی ہے۔ یہ جسم مثالی جسم ہے جو اس کو عالم مثال میں ملا ہے۔

حدیث (۲) اور فرمایا کہ زہراوین (دو روشن سورتیں) البقرہ و آل عمران پڑھا کرو وہ دونوں قیامت کے دن سفارشی بن کر حاضر ہوں گی گویا وہ دو بادل ہیں یا دو سائبان ہیں یا صف بستہ اڑنے والے پرندوں کی دو قطاریں ہیں، وہ اپنے پڑھنے والوں کی طرف سے جھگڑا کریں گی (یہ روایت مسلم و ترمذی وغیرہ بہت سی کتابوں میں مختلف الفاظ سے مروی ہے، دیکھئے الدر المنثور ۱/۱۸ مشکوۃ شریف فضائل القرآن حدیث ۲۱۲۰)

لغات: الغمامۃ: بادل، اور ایک ٹکڑے کو غمامۃ کہتے ہیں جمع غمام　　الغیایۃ: ہر وہ چیز جو انسان پر سایہ کرے جیسے سائبان، چھتری، بادل وغیرہ　　الفرق: ہر چیز کا ٹکڑا　　صواف جمع ہے صافۃ (اسم فاعل) کی یعنی صف بستہ۔

حدیث (۳) اور ارشاد فرمایا کہ قیامت کے دن اعمال حاضر ہوں گے۔ پس (سب سے پہلے) نماز آئے گی، پھر خیرات آئے گی، پھر روزہ آئے گا (آخر تک حدیث پڑھیے) یہ لمبی حدیث ہے، مسند احمد ۲/۳۶۲ مشکوۃ کتاب الرقاق حدیث ۵۲۲۳ دیکھیں۔ یہاں تو صرف اتنی بات سے غرض ہے کہ یہ اعمال جو عرض ہیں، قیامت کے دن اپنے مثالی اجسام کے ساتھ حاضر ہوں گے۔

حدیث (۴) اور ارشاد فرمایا کہ معروف (اللہ کی مرضی کے موافق قول و فعل) اور منکر (اللہ کی مرضی کے خلاف قول و فعل) دو مخلوق ہیں، قیامت کے دن دونوں لوگوں کے لئے کھڑی کی جائیں گی۔ پس معروف اپنے لوگوں کو خوشخبری دے گا اور رہا منکر تو وہ کہے گا: "دور ہو! دور ہو!" مگر لوگ اس سے چپکتے ہی چلے جائیں گے (کنز العمال حدیث ۲۳۰۳۰)

حدیث (۵) اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن تمام دنوں کو اٹھائیں گے، جیسے وہ ہیں، اور جمعہ کو اٹھائیں گے روشن چمکتا (مستدرک حاکم ۱/۲۷۷ کنز العمال حدیث ۲۱۰۵۰)

حدیث (۶) حضرت فضیل بن عیاض فرماتے ہیں کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: "دنیا قیامت کے دن لائی جائے گی، ایسی بڑھیا کی شکل میں جس کے سر کے بال کھچڑی ہو رہے ہوں گے، جس کی آنکھیں نیلگوں ہوں گی، جو دانت باہر نکلی ہوئی ہوگی، جو نہایت بدشکل ہوگی۔ وہ مخلوقات کو جھانک کر دیکھے گی۔ لوگوں سے دریافت کیا جائے گا: اسے جانتے ہو؟ لوگ جواب دیں گے: پناہ بخدا! جو ہم اسے جانیں! انہیں جتلایا جائے گا: یہ وہ دنیا ہے جس کی خاطر تم باہم جھگڑتے تھے، رشتوں کو توڑتے تھے، ایک دوسرے پر جلتے تھے اور باہم بغض و نفرت رکھتے تھے اور دھوکے میں رہتے تھے! پھر اس کو جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔ وہ پکارے گی: "میرے رب! میرے پیروکار اور میرے چیلے کہاں ہیں؟" اللہ عز و جل حکم دیں گے کہ اس کے مریدوں اور چیلوں کو اس کے ساتھ ملا دو!" (احیاء العلوم ۳:۱۸۸)

تشریح: دنیا کوئی حسی اور مجسم چیز نہیں، وہ اس عالم کی حقیقت ہے مگر قیامت کے دن وہ بڑھیا کی شکل میں آئے

کی، یہ عالم مثال میں اس کی عملی ہوئی شکل ہے۔

لغات: شَمطاء مؤنث اَشمط کا، شَمِطَ (س) شَمَطًا سر میں کھچڑی بال والا ہونا　　زرقاء مؤنث اَزرق کا، جس کے معنی ہیں نیلی آنکھوں والا، آسمانی رنگ جیسا۔۔ انیاب جمع ناب کی: کچلی دانت۔۔۔ مشوّہ بدشکل شوہ یشوہ شوھۃً: بدشکل ہونا　۔ خلق: بناوٹ۔

حدیث (۷) حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ مدینہ کے قلعوں میں سے کسی قلعہ پر چڑھے اور فرمایا کہ کیا تم وہ چیز دیکھ رہے ہو جو میں دیکھ رہا ہوں؟ لوگوں نے جواب دیا کہ نہیں! آپ نے فرمایا کہ میں تمہارے گھروں میں بارش کی طرح فتنوں کو گرتے دیکھ رہا ہوں (متفق علیہ مشکوۃ کتاب الفتن حدیث ۵۳۸۷) فتنے بھی معنوی چیز ہیں اور ان کا بارش کی طرح برسنا مثالی جسم کے ساتھ تھا۔

حدیث (۸) اور معراج کی روایت میں فرمایا ہے کہ اچانک چار نہریں سامنے آئیں، دو باطنی یعنی پوشیدہ جو جنت میں جاری تھیں اور دو ظاہری یعنی کھلی ہوئی جاری تھیں آنحضور ﷺ نے حضرت جبرئیل علیہ السلام سے دریافت کیا: یہ کیا ہے؟ انھوں نے بتایا کہ باطنی دو نہریں جنت کی نہریں ہیں اور ظاہری دو نہریں نیل اور فرات ہیں (متفق علیہ مشکوۃ باب فی المعراج حدیث ۵۸۶۲)

تشریح: دریائے نیل وسطی افریقہ سے نکلتا ہے، وہ مصر میں داخل ہوکر بحر ابیض متوسط میں گرتا ہے اور فرات عراق میں ہے جو دجلہ میں شامل ہوکر خلیج فارس میں گرتا ہے۔ غرض یہ دونوں زمین کے دریا ہیں مگر حضور نے ان کو عالم بالا میں دیکھا ہے، یہ ان کی مثالی صورتیں تھیں۔

حدیث (۹) اور سورج گہن کی نماز کی روایت میں ارشاد فرمایا ہے کہ جنت و جہنم میرے لئے مصوَّر کی گئیں اور ایک روایت میں ہے کہ میرے اور جدارِ قبلہ کے درمیان میں اور اس روایت میں یہ بھی ہے کہ آپ نے ہاتھ بڑھایا تاکہ جنت سے انگور کا خوشہ لے لیں اور یہ بھی ہے کہ آپ دوزخ کی وجہ سے رک گئے اور گرمی سے پھونک ماری اور آپ نے جہنم میں حاجیوں کا سامان چرانے والے کو دیکھا، اور اس عورت کو دیکھا جس نے بلی کو باندھ کر بھوکے مار دیا تھا۔ اور آپ نے جنت میں ایک بدکار عورت کو دیکھا جس نے پیاسے کتے کو پانی پلایا تھا —— اور یہ بات بدیہی ہے کہ اس مسافت میں (یعنی آپ کے اور جدار قبلہ کے درمیان میں) جنت و جہنم کی اس مقدار (طول و عرض) کے ساتھ جو معلوم بھی جانتے ہیں سمائی کہاں؟! (یہ مضمون مختلف حدیثوں کا خلاصہ ہے، جو صحاح میں وارد ہوئی ہیں)

حدیث (۱۰) اور ارشاد فرمایا کہ جنت ناگواریوں سے گھیری گئی ہے، اور جہنم خواہشات کے ساتھ گھیری گئی ہے، پھر جبرئیل کو حکم دیا کہ وہ دونوں کو دیکھیں (مشکوۃ کتاب الرقاق حدیث ۵۱۶۰) مکاره اور خواہشات بھی معنویات ہیں مگر ان کی باڑ باندھی گئی ہے اور حضرت جبرئیل نے ان کو دیکھا بھی ہے، یہ سب کچھ مثالی اجسام کے ذریعہ ہوا ہے۔

حدیث (۱۱) اور فرمایا کہ بلا اترتی ہے تو اس سے دعا کشتی لڑتی ہے یعنی دونوں میں کشاکشی ہوتی ہے (رواہ علو او والطبرانی

والحاکم وقال صحیح الاسناد (الترغیب والترہیب ۳۹۲۲)

حدیث (۱۲) اور ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ نے عقل کو پیدا کیا، پھر اس سے کہا: ''سامنے آ'' تو وہ سامنے آ گئی، اور اس سے فرمایا کہ پیٹھ پھیر تو اس نے پیٹھ پھیر لی، پھر اللہ نے فرمایا: میری عزت کی قسم! میں نے تجھ سے زیادہ پسندیدہ مخلوق پیدا نہیں کی، تیری وجہ سے میں لوں گا اور دوں گا اور تیری وجہ سے ثواب ہے اور تجھ پر سزا ہے رواہ الطبرانی فی الکبیر والاوسط، وفیہ عمر بن ابی صالح، قال الذھبی: لا یعرف (مجمع الزوائد ۸:۲۸)

حدیث (۱۳) اور فرمایا: یہ دو کتابیں (رجسٹر) ہیں رب العالمین کی جانب سے (حدیث آخر تک پڑھیے) امام احمد، نسائی اور ترمذی نے یہ حدیث روایت کی ہے (فتح الباری ۱۱:۴۸۸) ایک رجسٹر میں تمام جنتیوں کے نام تھے اور دوسرے میں دوزخیوں کے، اور آخر میں ٹوٹل تھا، جس میں کمی بیشی کا امکان نہیں۔

حدیث (۱۴) اور ارشاد فرمایا کہ قیامت کے دن موت کو مینڈھے کی شکل میں لایا جائے گا اور جنت و دوزخ کے درمیان اس کو ذبح کر دیا جائے گا (متفق علیہ مسلم شریف کتاب الجنۃ ۱۸۹ مصری)

آیت (۵) اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: پس ہم نے مریم کے پاس اپنی روح بھیجی، پس وہ ایک درست انسان کی طرح اس کے سامنے ظاہر ہوئی (سورۂ مریم آیت ۱۷) عام مفسرین کی رائے یہ ہے کہ اس آیت میں روح سے مراد حضرت جبرئیل علیہ السلام ہیں، مگر شاہ صاحب رحمہ اللہ روح سے جان مراد لیتے ہیں جو کہ امر رب اور معنوی چیز ہے، جس نے درست انسان کی شکل اختیار کی، یہی مثالی جسم ہے۔

حدیث: (۱۶) اور بکثرت احادیث میں یہ مضمون آیا ہے کہ:

(الف) حضرت جبرئیل علیہ السلام آنحضرت ﷺ کے سامنے ظاہر ہوتے تھے، اور وہ آپ کو نظر آتے تھے، پس آپ ان سے باتیں کرتے تھے، اور ان کو دیگر لوگ نہیں دیکھتے تھے۔

(ب) اور یہ کہ قبر کشادہ کی جاتی ہے ستر در ستر ہاتھ (یعنی طول بھی ستر ہاتھ اور عرض بھی اتنا ہی، اور ایک ہاتھ ڈیڑھ فٹ کا ہوتا ہے، پس مربع گیارہ ہزار پچیس فٹ ہوگا، اور یہ کشادگی نیک آدمی کے لئے ہوگی) یا قبر ملائی جاتی ہے یہاں تک کہ میت کی پسلیاں ادھر ادھر ہو جاتی ہیں (قبر کا یہ بھینچنا برے شخص کے لئے ہوگا)

(ج) اور یہ کہ فرشتے میت کے پاس آتے ہیں، پس اس سے سوالات کرتے ہیں۔

(د) اور یہ کہ میت کا عمل متشکل ہو کر اس کے سامنے آتا ہے۔

(ہ) اور یہ کہ فرشتے آتے ہیں قریب المرگ کے پاس، ان کے ہاتھوں میں ریشم ہوتا ہے یا ٹاٹ ہوتا ہے۔

(و) اور یہ کہ فرشتے میت کو لوہے کے گرز سے مارتے ہیں، پس وہ ایسی چیخ مارتا ہے جس کو ساری مخلوق سنتی ہے۔

حدیث: (۱۷) اور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ کافر پر اس کی قبر میں ننانوے اژدہے مسلط کئے جاتے ہیں،

جو قیامت تک ان کو پچھاڑتے رہتے ہیں۔

حدیث (۱۸) اور فرمایا: جب میت قبر میں اتاری جاتی ہے تو سورج اس کے لئے غروب کے وقت کی طرح متمثل ہوتا ہے، پس وہ اٹھ بیٹھتا ہے اور آنکھیں ملتا ہوا کہتا ہے: "مجھے چھوڑو، میں نماز پڑھ لوں" (حدیث نمبر ۱۶ سے یہاں تک بعض روایات ہیں ان کو علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے شرح الصدور بشرح حال الموتی والقبور اور اس کی تلخیص بشری الکئیب بلقاء الحبیب میں ذکر کیا ہے)

حدیث (۱۹) اور احادیث میں یہ مضمون بکثرت آیا ہے کہ:

(الف) قیامت کے دن اللہ تعالیٰ میدان حشر میں مختلف صورتوں میں تجلی فرمائیں گے۔

(ب) اور یہ کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم بارگاہ رب العالمین میں تشریف لے جائیں گے، درانحالیکہ اللہ تعالیٰ اپنی کرسی پر جلوہ افروز ہوں گے۔

(ج) اور یہ کہ اللہ تعالیٰ انسانوں سے روبرو کلام فرمائیں گے —— وغیرہ وغیرہ ان روایات میں سے جن کا شمار بوجہ کثرت ممکن نہیں۔

لغات: صرع: پچھاڑنا — تکعکع: رک جانا — المومسۃ: بدکار فاحشہ عورت — اومست المرأۃ: بدکار ہونا — حف الشیء: گھیرنا — سکرات: سکرۃ کی جمع، کالغمرات — عالجہ: مشق کرنا، علاج کرنا — قابل: سامنے سے آنا — ادبر: پیٹھ پھیرنا — تراءی: دکھنا — تختلف: دائیں طرف کی پسلیوں کا ٹوٹ کر بائیں طرف کی پسلیوں میں گھس جانا اور اس کے برعکس — منبوذ: پھینکی ہوئی چیز — المسح: ٹاٹ — المفصلۃ: جوڑ اور ہڈی کے سرے کا جوڑ — ابقین: زندہ باقی رہنا — نہس اللحم: گوشت کو آگے کے دانتوں سے نوچنا۔

☆ ☆ ☆

مذکورہ روایات میں غور کرنے کے تین طریقے

مذکورہ بالا روایات میں غور کرنے کے تین طریقے ہیں:

اول: ان روایات کو ظاہر پر محمول کیا جائے یعنی ان کا جو کچھ مفہوم ہے اس کو مان لیا جائے۔ اس صورت میں عالم مثال کو ماننا پڑے گا، کیونکہ ان روایات کی توجیہ عالم مثال کو مانے بغیر ممکن نہیں۔ عالم مثال کو مان کر یہ کہا جائے گا کہ مذکورہ بالا روایات میں بیان فرمودہ تمام امور خارج میں واقعی امور ہیں اور ان کے اجسام ان کے مناسب حال ہیں۔ محدثین کرام کا اصول یہی ہے، ان کا خیال یہ ہے کہ ان روایات کو ان کے ظاہر پر محمول کیا جائے، ان کی کوئی تاویل نہ کی جائے۔

علامہ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ (متوفی ۹۱۱ھ) نے اس قاعدہ پر تنبیہ کی ہے اور شاہ صاحب کا مزاج بھی یہی ہے۔ چنانچہ آپ نے انہی روایات کی بنیاد پر عالم مثال کو ثابت کیا ہے۔

④ ان روایات کی یہ توجیہ کی جائے کہ وہ صرف آدمی کا احساس ہے، خارج میں ان میں سے کوئی چیز موجود نہیں، جیسے خواب دیکھنے والا جو امور خواب میں دیکھتا ہے وہ صرف اس کا احساس ہوتا ہے، ان میں سے کوئی چیز خارج میں موجود نہیں ہوتی۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اسی قسم کی توجیہ درج ذیل آیت میں کی ہے۔ سورۃ الدخان آیت ۱۰ و ۱۱ میں ارشاد ہے۔

فَارْتَقِبْ يَوْمَ تَأْتِي السَّمَاءُ بِدُخَانٍ مُّبِينٍ، يَغْشَى النَّاسَ، هٰذَا عَذَابٌ أَلِيمٌ	سو آپ (کفار مکہ کے لئے) اس دن کا انتظار کیجئے جبکہ آسمان ایک واضح دھواں لے آئے، جو ان سب لوگوں پر عام ہو جائے۔ یہ دردناک سزا ہے۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ: یہ نشانی پائی جا چکی ہے کہ مکہ میں سخت قحط پڑا، لوگوں نے مردار، چمڑے اور ہڈیاں تک کھائیں، اور صورت حال یہ ہوئی کہ جب وہ آسمان کی طرف دیکھتے تھے تو بھوک کی وجہ سے ان کو دھواں ہی دھواں نظر آتا تھا، آسمان نظر ہی نہیں آتا تھا۔ حالانکہ خارج میں کوئی دھواں نہیں تھا، یہ صرف ان بھوکوں کا احساس تھا۔ یہ روایت الدر المنثور ج ۶ ص ۲۸ میں ہے[1]

اور محدث کبیر ابن الماجشون[2] رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ جن احادیث میں اللہ تعالیٰ کا میدان حشر میں اترنا اور قیامت کے روز بندوں کا اللہ تعالیٰ کو دیکھنا مروی ہے، ان کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مخلوق کی نگاہوں میں تغیر کر دیں گے، چنانچہ وہ اللہ تعالیٰ کو اترتا، تجلی فرماتا، مخلوق سے سرگوشی کرتا اور باتیں کرتا دیکھیں گے، مگر اللہ تعالیٰ کی عظمت و کبریائی میں کوئی تبدیلی نہ ہوگی، نہ وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوں گے۔ اور اللہ تعالیٰ ایسا اس لئے کریں گے تاکہ بندے جان لیں کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر پوری قدرت رکھنے والے ہیں۔ امام بغوی رحمہ اللہ نے شرح السنہ (۸: ۱۹۵ باب آخر من يخرج من النار) میں عبدالعزیز بن ابی سلمہ الماجشون کا یہ قول ذکر کیا ہے، ان کے الفاظ ہیں: إن الله ليس يتغير عن عظمته، ولكن عيناك يُغَيَّرُ هما حتى تراه كيف شاء اھ

⑤ یا ان روایات کو مضمون فہمی کے لئے پیرایۂ بیان قرار دیا جائے، مثلاً قبر میں پہنچنے والی تکلیف اور راحت کو مختلف

---

[1] اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی رائے یہ ہے کہ نشانی ابھی ظاہر نہیں ہوئی، قیامت کے قریب ظاہر ہوگی، وہ آتشی دھواں آسمان کو ڈھک لے گا اور چالیس دن تک یہ کیفیت رہے گی۔ دیکھئے الدر المنثور آیت مذکورہ کی تفسیر ۱۲

[2] ماجشون: ماہ گون کا معرب ہے۔ محدث عبدالعزیز بن عبدالملک بن ابی سلمہ کے دادا ابو سلمہ بہت سرخ تھے، اس لئے ان کا یہ لقب ہو گیا تھا، پھر یہ پورے خاندان کا لقب ہو گیا ۱۲

انداز سے سمجھایا گیا ہے کہ سوال و جواب ہوں گے، کوئی صحیح جواب دے گا اور کوئی ہار کے رہ جائے گا، کسی کی قبر بھینچے گی تو کسی کے لئے ۷۰، ۷۰ ہاتھ کشادہ کی جائے گی، کسی کے لئے جنت کی طرف دریچہ کھولا جائے گا تو کسی پر فرشتے گرز برسائیں گے اور اس کو سانپ بچھو ڈسیں گے اور نوچیں گے۔ یہ سب قبر میں پیش آنے والے رنج و راحت کو سمجھانے کے لئے پیرایۂ بیان ہے اور بس۔

مگر شاہ صاحب کے نزدیک جو شخص صرف یہ تیسری توجیہ کرتا ہے وہ اہل حق میں سے نہیں، گمراہ ہے۔ باطل فرقے نصوص کی اسی طرح تاویل کیا کرتے ہیں۔

والناظر في هذه الأحاديث بين إحدى ثلاث:

[١] إما أن يُقِرَّ بظاهرها، فيضطرُّ إلى إثبات عالَمٍ ذكرنا شأنه؛ وهذه هي التي تقتضيها قاعدة أهل الحديث، نبّه على ذلك السيوطي رحمه الله تعالى، وبها أقول، وإليها أذهب.

[٢] أو يقول: إن هذه الوقائع تتراءى لحسِّ الرائي، وتتمثل له في بصره، وإن لم تكن خارج حسِّه؛ وقال بنظير ذلك عبد الله بن مسعود في قوله تعالى: ﴿يَوْمَ تَأْتِي السَّمَاءُ بِدُخَانٍ مُّبِينٍ﴾: إنهم أصابهم جدب، فكان أحدهم ينظر إلى السماء، فيرى كهيئة الدخان من الجوع؛ ويُذكر عن ابن الماجشون: أن كل حديث جاء في التنقل والرؤية في المحشر، فمعناه: أنه يغيِّر أبصار خلقه، فيرونه نازلاً متجلّياً، ويناجي خلقه ويخاطبهم، وهو غير متغير عن عظمته، ولا متنقل، ليعلموا أن الله على كل شيء قدير.

[٣] أو يجعلها تمثيلاً لتفهيم معانٍ أخرى؛ ولستُ أرى المقتصر على الثالثة من أهل الحق.

ترجمہ: اور ان حدیثوں میں غور کرنے والا تین صورتوں میں سے کسی ایک کے درمیان ہے:

(۱) یا تو یہ کہ وہ ان احادیث کے ظاہر کا اقرار کرے، تو وہ مجبور ہوگا ایک ایسے عالم کو ثابت کرنے کی طرف جس کا حال ہم نے (باب کے شروع میں) ذکر کیا ہے۔ اور یہی وہ طریقہ ہے جس کو محدثین کا قاعدہ چاہتا ہے۔ سیوطی رحمہ اللہ نے اس پر تنبیہ کی ہے، اور اسی کا میں قائل ہوں اور اسی کی طرف میں جاتا ہوں۔

(۲) یا وہ یہ کہے کہ یہ واقعات دیکھنے والے کے حواس کو دکھتے ہیں، اور وہ دیکھنے والے کی نگاہ میں متشکل ہوتے ہیں، اگرچہ اس کے حواس سے باہر وہ واقعات موجود نہیں ہیں۔ اور اسی قسم کی بات حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمائی ہے ارشاد باری تعالیٰ: ﴿يَوْمَ تَأْتِي السَّمَاءُ بِدُخَانٍ مُّبِينٍ﴾ کی تفسیر میں کہ ان کو قحط سالی پہنچی، پس ان میں سے ایک شخص آسمان کی طرف دیکھتا تھا، پس وہ بھوک کی وجہ سے دھوئیں جیسا دیکھتا تھا۔ اور ابن الماجشون (تابعی) سے نقل

عالمِ مشاہدہ کی چیزوں کو دیکھنے کے لئے ہیں، دوسرے عالم کی چیزوں کا یہ آنکھیں مشاہدہ نہیں کرسکتیں، جیسے مجلس ذکر میں فرشتے موجود ہوتے ہیں اور ذاکرین کو گھیر لیتے ہیں، مگر وہ ہمیں نظر نہیں آتے، کیونکہ فرشتے دوسرے عالم کی مخلوق ہیں، اسی طرح حضرت جبرئیل علیہ السلام آنحضور ﷺ کے پاس تشریف لاتے تھے اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اس کو مانتے تھے، اگرچہ وہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کو نہیں دیکھتے تھے، اور وہ یہ بھی مانتے تھے کہ آنحضور ﷺ حضرت جبرئیل علیہ السلام کو دیکھ رہے ہیں۔

اور اگر کوئی اس وقت موجود صحابہ سے کہتا کہ میں نہیں مانتا تو اس کو اپنے ایمان کی خیر منانی چاہئے، اس کا تو فرشتوں پر ایمان ہی نہیں، وہ شک کرسکتا ہے، وہ یہ بات کہہ سکتا ہے کہ آنحضور ﷺ کو جو چیز نظر آتی ہے وہ ہم عوام کو نظر کیوں نہیں آتی؟ تو پھر عذاب قبر میں وہ یہ بات کیوں نہیں مانتا! غرض قبر میں جو عذاب ہوتا ہے اور جو نعمتیں ملتی ہیں وہ واقعی چیزیں ہیں، مگر وہ دوسرے عالم کی چیزیں ہیں اس لئے وہ ہمیں نظر نہیں آتیں۔

دوسری صورت: قبر میں پیش آنے والے معاملات اگرچہ خارج میں موجود نہیں ہوتے مگر میت کو وہ محسوس ہوتے ہیں، جیسے خواب کا معاملہ ہے، کوئی خواب میں بادشاہ بن جاتا ہے، ٹھاٹھ سے حکومت کرتا ہے اور کوئی جیل میں بند کیا جاتا ہے، پولیس والے اس پر ڈنڈے برساتے ہیں، اور وہ بری طرح چلاتا ہے، مگر جب آنکھ کھلتی ہے تو پتہ چلتا ہے کہ یہ خواب تھا حقیقت کچھ بھی نہیں تھی۔

مگر خواب کا خواب ہونا آنکھ کھلنے کے بعد ہی معلوم ہوتا ہے، خواب کے دوران تو ہر پیش آنے والا واقعہ حقیقت لگتا ہے، اسی طرح قبر کا معاملہ ہے مگر قبر میں قیامت تک آنکھ نہیں کھلے گی، اس لئے وہ واقعات حقیقت ہی رہیں گے۔

غرض خواب میں جس طرح خواب دیکھنے والے کے دل ودماغ پر کیفیت پیدا ہوتی ہے اور خارج میں ان چیزوں کا وجود نہیں ہوتا، اسی طرح عذاب قبر کا معاملہ ہے، اور جس طرح خواب دیکھنے والے کے پاس بیٹھے ہوئے لوگوں کو کچھ نظر نہیں آتا، اسی طرح زندوں کو میت کے پاس کچھ نظر نہیں آتا، مگر میت کے احساس میں سب کچھ ہوتا ہے۔

تیسری صورت: عذاب قبر کی روایات کو ایک پیرایۂ بیان قرار دیا جائے، ان روایات سے مقصود یہ سمجھانا ہے کہ مرنے کے بعد قبر میں میت کس قسم کی تکلیف سے دوچار ہوتی ہے اور مقصود صرف پیرایۂ بیان نہیں، بلکہ وہ حقیقت مقصود ہے جس کو سمجھانے کے لئے پیرایۂ بیان اختیار کیا گیا ہے۔ جیسے سانپ کا کاٹنا اصل مقصود نہیں، بلکہ اس کے کاٹنے سے جو زہر بدن میں سرایت کرتا ہے وہ مقصود ہے۔ بلکہ زہر بھی اصل مقصود نہیں، مقصود وہ تکلیف ہے جو زہر کی وجہ سے محسوس ہوتی ہے، بعض لوگ اپنے بدن کو مختلف تدبیروں سے ''زہر پروف'' بنالیتے ہیں، وہ سانپ پالتے ہیں، ان لوگوں کو سانپ کاٹتے نہیں، اور کاٹیں تو ان کو کوئی تکلیف نہیں ہوتی، ان کے حق میں سانپ کا کاٹنا کچھ بے اثر ہوتا ہے۔

وجوَّزت أن يشاهد النبيُّ صلى الله عليه وسلم مالا تُشاهدُه الأمة، فكيف لاتجوِّز هذا في الميت؟ وكما أن الملك لايُشبه الآدميين والحيوانات، فالحيّاتُ والعقارب التي تلدغ في القبر ليست من جنس حيّات عالَمنا، بل هي جنس آخر، وتُدرك بحاسة أخرى.

المقام الثاني: أن تتذكر أمر النائم، وأنه قد يرى في نومه حيةً تلدغه، وهو يتألم بذلك، حتى تراه ربما يصيح ويعرق جبينُه، وقد ينزعج من مكانه: كلُّ ذلك يُدركه من نفسه، ويتأذى به كما يتأذى اليقظان، وهو يشاهده، وأنت ترى ظاهره ساكنا، ولا ترى حواليه حيةً ولا عقربا؛ والحيةُ موجودة في حقه، والعذاب حاصل، ولكنه في حقك غير مشاهَد؛ وإذا كان العذاب في ألم اللدغ، فلا فرق بين حية تتخيل أو تُشاهَد.

المقام الثالث: إنك تعلم أن الحية بنفسها لا تُؤلم، بل الذي يلقاك منها هو ألم السُّم؛ ثم السم ليس هو الألم، بل عذابُك في الأثر الذي يحصل فيك من السم، فلو حصل مثلُ ذلك الأثر من غير سُمٍّ، لكان العذاب قد توفّر؛ وكان لايمكن تعريف ذلك النوع من العذاب إلا بأن يُضاف إلى السبب الذي يُفضي إليه في العادة؛ فإنه لو خُلق في الإنسان لذةُ الوقاع — مثلاً — من غير مباشرة صورة الوقاع، لم يمكن تعريفها إلا بالإضافة إليه، لتكون الإضافة للتعريف بالسبب؛ وتكون ثمرةُ السبب حاصلةً، وإن لم تحصل صورةُ السبب، والسببُ يُراد لثمرته، لا لذاته، وهذه الصفات المهلكات تنقلب مؤذيات ومؤلمات في النفس عند الموت، فيكون آلامها كآلام لدغ الحيات من غير وجودها (انتهى)

ترجمہ: اور امام غزالی رحمہ اللہ نے عذاب قبر کے بیان میں ان تینوں مواقف کو خوب کھول کر سمجھایا ہے، جہاں وہ فرماتے ہیں:

اس قسم کی روایتوں کے ظاہری صحیح معنی ہیں، اور مخفی راز ہیں مگر وہ ارباب بصیرت پر واضح ہیں، پس جس پر ان روایات کی حقیقت منکشف نہ ہو، اس کے لئے زیبا نہیں کہ وہ ان روایات کے ظاہری معنی کا انکار کرے، بلکہ ایمان کا کم سے کم درجہ تسلیم کرنا اور مان لینا ہے۔

پس اگر آپ پوچھیں کہ ہم ایک کافر کو مدت تک اس کی قبر میں دیکھتے ہیں، اور ہم اس کی نگرانی کرتے ہیں، اور ہم اُن چیزوں میں سے (جن کا روایات میں تذکرہ آیا ہے) کچھ بھی نہیں دیکھتے، پھر مشاہدہ کے خلاف ماننے کی کیا صورت ہے؟

تو آپ جان لیں کہ آپ کے لئے اس قسم کی روایتوں کے ماننے کی تین طریقے ہیں:

ان میں سے ایک — اور وہی واضح تر، صحیح تر، اور محفوظ تر ہے — یہ ہے کہ آپ مان لیں کہ وہ چیزیں موجود ہیں،

اور وہ میت کو ڈس رہی ہیں، مگر آپ کو وہ چیزیں نظر نہیں آ رہی ہیں، کیونکہ یہ آنکھیں "صُوَرِ اسود" کا مشاہدہ کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتیں۔ اور ہر وہ چیز جو دارِ آخرت[۱] سے تعلق رکھتی ہے وہ عالمِ ملکوت کی چیز ہے[۲]۔ کیا آپ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کو نہیں دیکھتے کہ وہ کس طرح ایمان رکھتے تھے حضرت جبرئیل علیہ السلام کے اترنے پر، حالانکہ وہ ان کو نہیں دیکھتے تھے، اور صحابہ یہ بھی مانتے تھے کہ آنحضور ﷺ حضرت جبرئیل علیہ السلام کو دیکھتے ہیں۔ پس اگر تیرا اس پر ایمان نہیں ہے تو ملائکہ اور وحی پر ایمان کی بنیاد کو صحیح کرنا تیرے لئے زیادہ اہم ہے (عذابِ قبر کی بحث میں الجھنے سے) اور اگر تو اس پر ایمان رکھتا ہے اور اس بات کو جائز قرار دیتا ہے کہ نبی کریم ﷺ ان باتوں کو دیکھیں، جن کو امت نہیں دیکھتی، تو پھر یہ بات میت کے حق میں کیوں جائز نہیں سمجھتا؟! اور جس طرح یہ بات ہے کہ فرشتہ انسان اور حیوان کے مشابہ نہیں، اسی طرح قبر میں جو سانپ اور بچھو ڈستے ہیں وہ بھی ہماری دنیا کے سانپوں کی جنس سے نہیں ہیں، بلکہ وہ دوسری جنس ہیں، اور ان کا ادراک اور حاسہ سے کیا جاتا ہے (حواسِ خمسہ سے ان کا ادراک نہیں کیا جاتا)

دوسرا مقام: یہ ہے کہ آپ سونے والے کا معاملہ سوچیں، اور یاد کریں کہ وہ خواب میں کبھی ایسے سانپ دیکھتا ہے جو اس کو ڈستے ہیں، اور وہ اس ڈسنے سے تکلیف اٹھاتا ہے حتی کہ آپ دیکھیں گے کہ وہ کبھی چیختا ہے، اس کی پیشانی پسینہ آلود ہو جاتی ہے اور کبھی وہ اپنی جگہ سے گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ یہ سب باتیں سونے والا بذاتِ خود محسوس کرتا ہے، اور اس سے ویسی ہی تکلیف اٹھاتا ہے جیسی بیدار آدمی اٹھاتا ہے، اور وہ اس کا مشاہدہ کرتا ہے، اور آپ اس کے ظاہر کو پُرسکون دیکھتے ہیں اور آپ کو اس کے ارد گرد نہ کوئی سانپ نظر آتا ہے، نہ کوئی بچھو، حالانکہ سانپ اس کے حق میں موجود ہیں، اور اس کو عذاب ہو رہا ہے، مگر وہ آپ کے حق میں مُشاہَد (نظر آنے والا) نہیں ہے۔ اور جب سزا سانپ کے کاٹنے کی تکلیف میں ہے تو پھر خیالی سانپ میں اور نظر آنے والے میں کیا فرق ہے؟!

تیسرا مقام: یہ ہے کہ آپ جانتے ہیں کہ سانپ بذاتِ خود تکلیف دہ نہیں، بلکہ تکلیف دہ وہ زہر ہے جو سانپ میں سے آپ سے ملاقات کرتا ہے، پھر زہر بھی تکلیف دہ نہیں، بلکہ تیری سزا اس اثر میں ہے جو زہر کی وجہ سے تیرے اندر پیدا ہوتا ہے۔ پس اگر اس قسم کا اثر زہر کے بغیر پیدا ہو جائے تو سزا یقیناً کامل و اکمل ہوگی۔

مگر اس قسم کی سزا کو سمجھانا ممکن نہیں، مگر اس سبب کی طرف منسوب کر کے جو عادۃً اس سزا تک پہنچاتا ہے، مثلاً انسان میں جماع کی صورت اختیار کئے بغیر جماع کی لذت پیدا کی جائے تو اس کو سمجھانا ممکن نہیں، مگر جماع کی طرف منسوب

۱؎ آخرت فی الحال موجود ہے، وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ آخرت دنیا ختم ہونے کے بعد قائم ہوگی، یہ خیال صحیح نہیں، فی الحال وہ موجود ہیں، مگر جس دنیا میں رہتے ہیں وہ دارِ دنیا ہے اور فرشتے اور جنت وجہنم جس عالم میں ہیں وہ دارِ آخرت ہے

۲؎ ملکوت: فرشتوں سے تعلق رکھنے والے معاملات کو کہا جاتا ہے اور چونکہ فرشتوں کا تعلق دارِ آخرت سے ہے، اس لئے آخرت سے تعلق رکھنے والی تمام چیزیں ملکوتی کہلاتی ہیں ۱۲

ان کے تحت کئی ہیں: آسمانوں اور زمین کے چھوٹے مرتبے کے فرشتے، عالمِ زیریں کے فرشتے۔ شاہ صاحب آگے بتائیں گے کہ ملائکہ مقربین کے لئے یہ لفظ باہمی اجتماع کی وجہ سے استعمال کیا جاتا ہے جیسے مجلس شوریٰ، اور ایوانِ بالا وغیرہ۔

ملائکہ کا انسان سے خاص تعلق ہے: فرشتے انسان کی مصلحت سے پیدا کئے گئے ہیں، آگے کتاب میں یہ مضمون تفصیل سے آرہا ہے، یہ دنیا انسان کے فائدہ کے لئے انسان کے وجود سے بہت پہلے پیدا کردی گئی تھی تاکہ جب انسان وجود میں آئے تو اس دنیا سے فائدہ اٹھائے۔ غرض دین کے اسرار ورموز جاننے کے لئے فرشتوں کے احوال سے اور ان کی ذمہ داریوں سے واقفیت ضروری ہے۔ حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ پہلے ایک آیت اور چند احادیث ذکر فرماتے ہیں، جن میں ملائکہ مقربین کے کاموں کا تذکرہ ہے، پھر ان نصوص کی روشنی میں بات آگے بڑھائی گئی ہے۔

﴿باب: ذکر الملأ الأعلىٰ﴾

قال الله تعالىٰ: ﴿الَّذِينَ يَحْمِلُونَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهُ يُسَبِّحُونَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَيُؤْمِنُونَ بِهِ وَيَسْتَغْفِرُونَ لِلَّذِينَ آمَنُوا، رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَيْءٍ رَّحْمَةً وَعِلْمًا فَاغْفِرْ لِلَّذِينَ تَابُوا وَاتَّبَعُوا سَبِيلَكَ وَقِهِمْ عَذَابَ الْجَحِيمِ، رَبَّنَا وَأَدْخِلْهُمْ جَنَّاتِ عَدْنٍ الَّتِي وَعَدتَّهُمْ وَمَن صَلَحَ مِنْ آبَائِهِمْ وَأَزْوَاجِهِمْ وَذُرِّيَّاتِهِمْ، إِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ، وَقِهِمُ السَّيِّئَاتِ، وَمَن تَقِ السَّيِّئَاتِ يَوْمَئِذٍ فَقَدْ رَحِمْتَهُ، وَذَٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ﴾

ترجمہ: ملأ اعلیٰ کا تذکرہ۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: جو فرشتے عرشِ الٰہی اٹھائے ہوئے ہیں، اور جو فرشتے اس کے گرداگرد ہیں (یہی ملأ اعلیٰ ہیں) وہ اپنے رب کی تسبیح وتحمید کرتے رہتے ہیں، اور اس پر ایمان رکھتے ہیں، اور ایمان والوں کے لئے استغفار کیا کرتے ہیں (کہتے ہیں) اے ہمارے پروردگار! آپ کی رحمت اور علم ہر چیز کو شامل ہے (یعنی اہل ایمان پر بدرجہ اولیٰ رحمت ہوگی) سو ان لوگوں کو بخش دیجئے جنھوں نے توبہ کرلی ہے اور آپ کے راستہ پر چلتے ہیں اور ان کو جہنم کے عذاب سے بچا لیجئے۔ اے ہمارے پروردگار! اور ان کو ہمیشہ رہنے کے باغات میں داخل کیجئے، جن کا آپ نے ان سے وعدہ فرمایا ہے۔ اور ان کو بھی جو ان کے ماں باپ، بیویوں اور اولاد میں سے اس کے لائق ہوں، بیشک آپ زبردست حکمت والے ہیں۔ اور (قیامت کے دن) ان کو تکالیف سے بچائیے، اور جس کو آپ اس دن تکالیف سے بچالیں تو یقیناً آپ نے اس پر مہربانی فرمائی اور یہی بڑی کامیابی ہے (سورۃ المؤمن ۷-۹)

تفسیر: حاملینِ عرش فرشتے اب چار ہیں، اور قیامت کے دن آٹھ ہوں گے (الحاقۃ آیت ۱۷) اور عرش کے گرد کتنے فرشتے ہیں، ان کی تعداد اللہ ہی جانتا ہے۔ یہ ملائکہ اصطلاح میں "کرّوبی" کہے جاتے ہیں۔ یہ سب عالمِ بالا کے مقرب فرشتے ہیں۔ اس آیت میں ان کا کام یہ ذکر کیا ہے کہ وہ ہر وقت تسبیح وتحمید میں مشغول رہتے ہیں۔ نیز وہ مؤمنین

کے لئے دعائیں کرتے رہتے ہیں اور جب ملائکہ کی شان میں یفعلون ما یؤمرون فرمایا گیا ہے تو ثابت ہوا کہ وہ حق تعالیٰ کی طرف سے اس کام پر مامور ہیں۔ مطرف بن عبداللہ بن الشخیر کہتے ہیں کہ اللہ کے بندوں میں سے مؤمنین کے حق میں سب سے زیادہ خیر خواہ فرشتے ہیں (معارف القرآن)

☆ ☆ ☆

آگے شاہ صاحب رحمہ اللہ نے چھ حدیثیں ذکر فرمائی ہیں جن سے ملأ اعلیٰ کے وجود اور ان کے کاموں پر روشنی پڑتی ہے پہلے وہ حدیثیں دی جاتی ہیں پھر ترجمہ کے ساتھ ضروری تشریح کردی جائے گی۔

[۱] وقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: ﴿إذا قضى الله الأمر في السماء، ضربت الملائكة بأجنحتها خضعانا لقوله، كأنه سلسلة على صفوان، فإذا فُزِّع عن قلوبهم، قالوا: ماذا قال ربكم؟ قالوا —— للذي قال —— الحق وهو العلي الكبير﴾

[۲] وفي رواية: ﴿إذا قضى أمرا سبّح حملةُ العرش، ثم سبّح أهل السماء الذين يلونهم، حتى يبلُغ التسبيحُ أهلَ هذه السماء الدنيا، ثم قال الذين يلون حملة العرش لحملة العرش: ماذا قال ربكم؟ فيخبرونهم ماذا قال، قال: فيستخبر بعضُ أهل السماوات بعضا، حتى يبلغ الخبرُ أهلَ هذه السماء﴾

[۳] وقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: ﴿إني قمت من الليل، فتوضأت وصليتُ ما قُدِّر لي، فنعستُ في صلاتي حتى استثقلتُ، فإذا أنا بربي تبارك وتعالى في أحسن صورة، فقال: يا محمد! قلتُ: لبيك ربِّ! قال: فيم يختصم الملأُ الأعلى؟ قلتُ: لا أدري، قالها ثلاثا، قال: فرأيته وضع كفّه بين كتفيّ، حتى وجدت بَرْدَ أنامله بين ثدييّ، فتجلّى لي كلُّ شيئ، وعرفتُ، فقال: يا محمد، قلتُ: لبيك ربُّ! قال: فيم يختصم الملأ الأعلى؟ قلتُ: في الكفارات، قال: وما هن؟ قلتُ: مَشْيُ الأقدام إلى الجماعات، والجلوسُ في المساجد بعد الصلوات، وإسباغُ الوضوء حين الكَرِيْهات، قال: ثم فيم؟ قلتُ: في الدرجات، قال: وما هن؟ قلتُ: إطعامُ الطعام، ولِيْنُ الكلام، والصلاة بالليل والناس نيام﴾

[۴] وقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: ﴿إن الله إذا أحب عبدًا دعا جبرئيل فقال: إني أُحِبُّ فلانا فأحبه، قال: فيحبه جبرئيلُ، ثم ينادي في السماء، فيقول: إن الله يحب فلانا فأحِبُّوه، فيحبه أهل السماء، ثم يوضع له القُبول في الأرض؛ وإذا أبغض عبدًا دعا جبرئيل،

فيقول: إني أبغض فلاناً فأبغضه، قال: فيبغضه جبريل، ثم ينادي في أهل السماء: إن الله يبغض فلاناً فأبغضوه، قال: فيبغضونه، ثم يوضع له البغضاء في الأرض﴾

[۵] وقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: ﴿الملائكة يصلون على أحدكم ما دام في مجلسه الذي صلى فيه، يقولون: اللهم ارحمه! اللهم اغفر له! اللهم تب عليه! ما لم يؤذ فيه، ما لم يحدث فيه﴾

[۶] وقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: ﴿ما من يوم يصبح العباد فيه إلا وملكان ينزلان، فيقول أحدهما: اللهم أعط منفقاً خلفاً، ويقول الآخر: اللهم أعط ممسكاً تلفاً﴾

ترجمہ: حدیث (۱) رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جب اللہ تعالیٰ آسمان میں کسی کام کا حکم فرماتے ہیں تو فرشتے اپنے پر مارتے ہیں (یعنی ڈرتے اور کانپتے ہیں) حکمِ الٰہی کی ہیبت سے، اور اللہ کا وہ حکم گویا زنجیر ہے صاف پتھر پر (یعنی) صاف چکنے پتھر پر کوئی زنجیر کھینچی جائے تو اس کی مسلسل آواز ہوتی ہے، اسی طرح اس حکمِ الٰہی کی آواز سنائی دیتی ہے) پھر جب ان فرشتوں کے دلوں سے گھبراہٹ دور ہوتی ہے تو وہ (بڑے فرشتوں سے) پوچھتے ہیں: تمہارے پروردگار نے کیا حکم فرمایا؟ وہ جواب دیتے ہیں ـــــ اس حکم کے بارے میں جو اللہ نے دیا: ـــــ برحق فرمایا، اور وہ برتر وبالا ہیں! (یعنی حکمِ الٰہی بتانے کے ساتھ یہ بھی کہتے ہیں کہ اللہ کا حکم برحق ہے اور وہ برتر وبالا ہیں، پس وہ جو چاہیں حکم دیں) (یہ حدیث بخاری، ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ وغیرہ میں ہے۔ دیکھئے مشکوٰۃ باب الکہانۃ حدیث ۴۶۰۰)

حدیث (۲) اور ایک روایت میں ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کوئی حکم فرماتے ہیں تو عرش بردار فرشتے تسبیح پڑھتے ہیں پھر اس آسمان والے فرشتے تسبیح پڑھتے ہیں جو عرش بردار فرشتوں سے متصل ہیں۔ یہاں تک کہ تسبیح کا یہ سلسلہ اس نچلے دنیا تک پہنچتا ہے۔ پھر عرش بردار فرشتوں سے متصل فرشتے عرش بردار فرشتوں سے پوچھتے ہیں: تمہارے پروردگار نے کیا حکم فرمایا؟ پس وہ ان کو بتاتے ہیں جو اللہ نے فرمایا۔ آنحضور ﷺ نے فرمایا: پھر بعض آسمانوں والے بعض سے دریافت کرتے ہیں یہاں تک کہ اطلاع اس آسمانِ دنیا تک پہنچ جاتی ہے (یہ حدیث ترمذی ۳۲۲۴ وغیرہ میں ہے)

حدیث (۳) اور رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: میں رات میں اٹھا، وضو کیا، اور جتنا میرے نصیب میں تھا نماز پڑھی، پھر میں نماز میں اونگھنے لگا حتیٰ کہ میں بوجھل ہوگیا (یعنی اونگھ گہری ہوگئی) پس اچانک میں نے اپنے پروردگار کو بہترین صورت میں دیکھا۔ اللہ نے فرمایا: اے محمد! میں نے عرض کیا: حاضر ہوں اے میرے رب! اللہ نے دریافت کیا: ملأ اعلیٰ کس معاملہ میں گفتگو کررہے ہیں؟ میں نے عرض کیا: مجھے معلوم نہیں! ـــــ اللہ تعالیٰ نے یہ بات تین بار دریافت کی ـــــ آنحضور ﷺ نے فرمایا: پھر میں نے اللہ پاک کو دیکھا، اللہ نے اپنی ہتھیلی میرے دونوں شانوں کے درمیان (پیٹھ پر) رکھی، یہاں تک کہ میں نے اللہ کے پوروں کی ٹھنڈک اپنی دونوں چھاتیوں کے درمیان محسوس کی، پس میرے لئے ہر چیز واضح ہوگئی (یعنی ملأ اعلیٰ کی پوری گفتگو واضح ہوگئی) اور میں نے جان لیا (کہ ملأ اعلیٰ کس مسئلہ میں گفتگو

کررہے ہیں) پھر اللہ نے فرمایا: اے محمد! میں نے عرض کیا: حاضر ہوں اے میرے رب! اللہ نے دریافت کیا: کس بارے میں ملأ اعلیٰ گفتگو کررہے ہیں؟ میں نے عرض کیا: گناہ مٹانے والے کاموں کے بارے میں۔ اللہ نے دریافت کیا: وہ کام کیا ہیں؟ میں نے عرض کیا: (۱) پیروں سے چل کر جماعت میں شریک ہونا (۲) نمازوں کے بعد مسجد میں ٹھہرنا (۳) ناگواریوں کے وقت میں وضوء کامل کرنا۔ اللہ تعالیٰ نے دریافت کیا: پھر کن باتوں میں؟ حضور نے فرمایا: میں نے عرض کیا: درجے بلند کرنے والے کاموں میں۔ اللہ تعالیٰ نے پوچھا: وہ کیا ہیں؟ میں نے عرض کیا: (۱) (محتاجوں کو) کھانا کھلانا (۲) (لوگوں سے) نرم بات کرنا (۳) اور رات میں (تہجد کی) نماز پڑھنا جبکہ لوگ سوئے ہوئے ہوں (یہ حدیث امام احمد، ترمذی، طبرانی، حاکم وغیرہ کی کتابوں میں ہے جلد راشدہ ۱۳۹)

حدیث (۴) اور رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ کسی بندے سے محبت فرماتے ہیں تو حضرت جبرئیل علیہ السلام کو آواز دیتے ہیں اور فرماتے ہیں: میں فلاں بندے سے محبت کرتا ہوں پس آپ بھی اس سے محبت کریں۔ آنحضور ﷺ نے فرمایا: پس جبرئیل اس سے محبت کرنے لگتے ہیں پھر وہ آسمان میں صدا دیتے ہیں، کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فلاں بندے سے محبت کرتے ہیں، پس تم بھی اس سے محبت کرو، پس اس سے آسمان والے محبت کرنے لگتے ہیں، پھر رکھی جاتی ہے اس کے لئے قبولیت (محبت) زمین میں (یعنی جن وانس اس سے محبت کرنے لگتے ہیں) اور جب بغض رکھتے ہیں اللہ تعالیٰ کسی بندے سے تو جبرئیل کو پکارتے ہیں، پس فرماتے ہیں کہ میں فلاں بندے سے بغض رکھتا ہوں پس آپ بھی اس سے بغض رکھیں۔ حضور نے فرمایا: پس جبرئیل اس سے نفرت کرنے لگتے ہیں، پھر وہ آسمان والوں میں پکارتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فلاں بندے سے بغض رکھتے ہیں پس تم بھی بغض رکھو۔ حضور نے فرمایا: پس آسمان والے اس سے نفرت کرنے لگتے ہیں، پھر اس کے لئے عداوت زمین میں رکھی جاتی ہے (یعنی جن وانس اس سے نفرت کرنے لگتے ہیں رواہ مسلم مشکوٰۃ باب الحب فی اللہ الخ حدیث ۵۰۰۵)

حدیث (۵) اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: فرشتے تم میں سے ایک کے لئے دعا کرتے رہتے ہیں، جب تک کہ وہ اپنی اس جگہ میں رہتا ہے، جس میں اس نے نماز پڑھی ہے۔ وہ کہتے ہیں: اے اللہ! اس پر مہربانی فرما! اے اللہ! اس کی بخشش فرما! اے اللہ! اس کی طرف نظر عنایت فرما! جب تک وہ اس مجلس میں کسی کو ستاتا نہیں، جب تک وہ اس میں کوئی نئی بات پیدا نہیں کرتا (یعنی ریح خارج نہیں کرتا مشکوٰۃ باب المساجد حدیث ۷۰۲)

حدیث (۶) اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ کوئی بھی ایسا دن نہیں آتا جس میں بندے صبح کرتے ہیں مگر (یعنی ہر صبح کو) دو فرشتے اترتے ہیں، ان میں سے ایک کہتا ہے: اے اللہ! (تیری راہ میں) خرچ کرنے والے کو بدل عطا فرما اور دوسرا کہتا ہے: اے اللہ! روکنے والے کے مال کو تباہ فرما (متفق علیہ مشکوٰۃ باب الانفاق الخ حدیث ۱۸۶۰)

☆ ☆ ☆

ملأ اعلیٰ کے سلسلہ میں سات باتیں

مذکورہ آیات اور احادیث کی روشنی میں جاننا چاہئے کہ اسلامی تعلیمات میں درج ذیل سات باتیں درجۂ شہرت کو پہنچی ہوئی ہیں:

(۱) اللہ کے نیک بندے — جو بڑے درجہ کے مقرب فرشتے ہیں — برابر بھلے لوگوں کے لئے دعائیں کرتے رہتے ہیں، اور بُرے لوگوں پر لعنتیں بھیجتے رہتے ہیں۔ اور بھلے لوگ وہ ہیں جو خود کو بھی سنوارتے ہیں، اور دوسروں کو بھی سنوارنے کی محنت کرتے ہیں، اور بُرے لوگ وہ ہیں جو اللہ کی نافرمانی کرتے ہیں، اور دنیا میں بگاڑ پھیلانے کی کوشش کرتے ہیں۔

ملائکہ کی دعاؤں سے بھلے لوگوں پر رحمتیں اور برکتیں نازل ہوتی ہیں، اور ان کی بددعاؤں کے نتیجہ میں ایک طرف تو ان کے دلوں میں حسرت وندامت پیدا ہوتی ہے، جس سے وہ تنگ گزراں جیتے ہیں اور پریشان رہتے ہیں، دوسری طرف ملأ سافل کے دلوں میں خیالات پیدا ہونے لگتے ہیں کہ وہ اس شخص سے شدید نفرت کریں اور اس کے ساتھ بدسلوکی کریں، یا تو دنیا کی زندگی میں یا موت کے بعد۔

جتنے بُرے لوگ ہیں: زانی، شرابی، چور، ڈاکو، اگر ان کے دل چیر کر دیکھے جائیں تو ان میں پریشانی اور خود سے شدید نفرت کا لاوا اُبھرتا ہوا ملے گا، وہ ہمیشہ اس الجھن میں رہتے ہیں کہ وہ کس مصیبت میں پھنس گئے، مگر چارۂ کار بھی نہیں ہوتا، وہ ان برائیوں سے نکل نہیں سکتے، یہ سب ملأ اعلیٰ کی پھٹکار کا اثر ہے۔

ملأ اعلیٰ کی لعنتوں کا دوسرا اثر ملأ سافل پر پڑتا ہے، وہ اس شخص سے شدید نفرت کرنے لگتے ہیں، وہ چاہتے ہیں کہ اس کے ساتھ بدسلوکی کریں، پھر اگر اسباب مانع نہیں ہوتے تو وہ شخص دنیا کی زندگی ہی میں بلاؤں اور آفتوں میں پھنسا دیا جاتا ہے، اور اگر اسباب مانع ہوتے ہیں تو موت کے بعد وہ ملأ سافل کی نفرتوں کا مزہ چکھتا ہے۔

(۲) مقرب فرشتے اللہ اور بندوں کے درمیان وساطت کا فریضہ انجام دیتے ہیں، اللہ کے پیغامات بندوں تک پہنچاتے ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ بندوں سے براہِ راست کلام کریں یہ بات بندوں کی طاقت سے باہر ہے، وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُكَلِّمَهُ اللَّهُ اور کسی بشر کی یہ شان نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس سے کلام فرمائیں (شوریٰ ۵۱) اس لئے اللہ تعالیٰ جب کوئی بات بندوں تک پہنچانا چاہتے ہیں تو ملائکہ مقربین کو سفیر بنا کر بھیجتے ہیں۔

(۳) ملأ اعلیٰ لوگوں کے دلوں میں بھلائیاں ڈالتے ہیں، جیسے شیاطین لوگوں کے دلوں میں برائیاں ڈالتے ہیں یعنی ملأ اعلیٰ لوگوں کے دلوں میں اچھائیاں پیدا ہونے کا سبب بنتے ہیں، رہی یہ بات کہ وہ کیسے سبب بنتے ہیں؟ تو اس کی بہت سی شکلیں ہو سکتی ہیں کوئی ایک شکل متعین نہیں۔

(۴) مقرب فرشتوں کے باہمی اجتماعات ہوتے ہیں، وہ ان میں باہم مشورہ کرتے ہیں اور اہم امور طے کرتے ہیں، اور یہ

فیم یختصم الملأ الاعلیٰ والی روایت میں ایسے ہی ایک اجتماع کا ذکر ہے، جس میں کفارات ودرجات طے کئے گئے ہیں۔ اور اسی اجتماع کے اعتبار سے ان کو ملأ اعلیٰ (بڑے لوگوں کی جماعت، اکابر کا اجتماع) الرفیق الاعلیٰ (اونچے درجے کے ساتھی ہونے کا) اور الندی الاعلیٰ (اونچے درجہ کی انجمن) کہا جاتا ہے۔ جیسے مجلس شوریٰ نام ہے مشورہ کے لئے اکٹھا ہونے کے اعتبار سے اور اسمبلی نام ہے پارلیمنٹ میں شرکت کے اعتبار سے۔ رہی یہ بات کہ یہ اجتماع کہاں ہوتا ہے؟ اور کب ہوتا ہے؟ اس کو اللہ پاک ہی بہتر جانتے ہیں، جب اور جہاں وہ چاہتے ہیں مقربین بارگاہ اکٹھا ہوتے ہیں۔

(۵) ملأ اعلیٰ (اکابر کی جماعت) میں صرف فرشتے ہی نہیں، اونچے درجہ کے انسان بھی ہیں جیسے انبیاء اور اولیاء: دنیا سے گذرنے کے بعد اس کے ممبر بن جاتے ہیں ﴿فَادْخُلِي فِي عِبَادِي﴾ (پس میرے خاص بندوں میں شامل ہو جا) میں اسی شمولیت کی طرف اشارہ ہے، اور آنحضور ﷺ نے حضرت جعفر طیار رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو فرشتوں کے ساتھ اڑتے دیکھا ہے، یہ ملأ اعلیٰ کے ساتھ پرواز ہے۔

(۶) اللہ کا جو فیصلہ زمین میں نازل ہوتا ہے وہ پہلے ملأ اعلیٰ کے پاس پہنچتا ہے، وہاں اس کی تفصیلات طے ہوتی ہیں پھر وہ کام متعلقہ کارکنوں کو سپرد کیا جاتا ہے۔ سورۃ الدخان آیت ۴ میں ہے کہ ایک برکت والی رات میں ہر حکمت بھرا معاملہ اللہ کے حکم سے طے ہوتا ہے۔ یہ حکمت بھرا معاملہ شب قدر میں ملأ اعلیٰ کے اجتماع میں طے ہوتا ہے۔

(۷) مختلف زمانوں میں جو شریعتیں نازل ہوئی ہیں، وہ بھی پہلے ملأ اعلیٰ میں آکر ٹھہرتی ہیں، پھر وہاں سے انبیاء پر نازل ہوتی ہیں، جیسے بجلی گھر سے بجلی آکر پہلے پاور ہاؤس میں جمع ہوتی ہے، پھر وہاں سے سپلائی ہوتی ہے۔ روایات میں ہے کہ پورا قرآن یکبارگی شب قدر میں سمائے دنیا پر اتارا گیا، پھر وہاں سے تھوڑا تھوڑا کرکے ۲۳ سال میں زمین پر اترا۔

اعلم أنه قد استفاض من الشرع:

[۱] أن لله تعالى عبادا هم أفاضل الملائكة، ومقربو الحضرة، لايزالون يدعون لمن أصلح نفسه وهذبها، وسعى في إصلاح الناس، فيكون دعاؤهم ذلك سبب نزول البركات عليهم، ويلعنون من عصى الله، وسعى في الفساد، فيكون لعنهم سببا لوجود حسرة وندامة في نفس العامل، وإلهامات في صدور الملأ السافل: أن يُبغضوا هذا المسيء، ويُسيئوا إليه: إما في الدنيا، أو حين ينخلع عنه جلباب بدنه بالموت الطبيعي

[۲] وأنهم يكونون سفراء بين الله وبين عباده.

[۳] وأنهم يُلهِمون في قلوب بني آدم خيرا، أي يكونون أسبابا لحدوث خواطر الخير فيهم، بوجه من وجوه السببية

[۴] وأن لهم اجتماعات، كيف شاء الله، وحين شاء الله، يُعبَّر عنهم باعتبار ذلك بالرفيق

الأعلى، والندى الأعلى، والملأ الأعلى.

[٥] وأن لأرواح أفاضل الآدميين دخولا فيهم، ولحوقا بهم، كما قال الله تعالى: ﴿يَا أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِي إِلَى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَرْضِيَّةً، فَادْخُلِي فِي عِبَادِي، وَادْخُلِي جَنَّتِي﴾ وقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: ﴿رأيت جعفر بن أبي طالب ملكا يطير في الجنة مع الملائكة بجناحين﴾

[٦] وأن هنالك ينزل القضاء، ويعين الأمر المشار إليه بقوله تعالى: ﴿فِيهَا يُفْرَقُ كُلُّ أَمْرٍ حَكِيمٍ﴾

[٧] وأن هنالك تتقرر الشرائع بوجه من الوجوه.

ترجمہ: جان لیجئے کہ شریعت میں بہ تواتر یہ بات پہنچی ہوئی ہے یہ بات کہ:

(١) اللہ تعالیٰ کے کچھ مخصوص بندے ہیں — وہ اونچے درجے کے بارگاہ خداوندی میں مقرب فرشتے ہیں — وہ برابر اس شخص کے لئے دعائیں کرتے رہتے ہیں جس نے اپنی اصلاح کرلی اور خود کو سنوار لیا اور وہ لوگوں کو سنوارنے کی بھی محنت کرتا ہے، پس ان کی وہ دعائیں اس پر نزول برکات کا سبب ہوتی ہیں۔ اور لعنت بھیجتے رہتے ہیں اس پر جو اللہ کی نافرمانی کرتا ہے اور بگاڑ پھیلانے کی کوشش کرتا ہے۔ پس ان کی بددعائیں بدکار کے دل میں حسرت وندامت پیدا ہونے کا سبب بنتی ہیں، اور ملأ سافل کے سینوں میں الہام کا سبب بنتی ہیں کہ وہ اس بدکار سے شدید نفرت کریں اور اس کے ساتھ برا برتاؤ کریں، خواہ دنیا میں یا جب طبعی موت سے اس سے اس کے بدن کی چادر ڈھیلی پڑ جائے۔

(٢) اور یہ بات کہ وہ حضرات اللہ اور اس کے بندوں کے درمیان سفیر (واسطہ) ہوتے ہیں۔

(٣) اور یہ بات کہ وہ حضرات انسانوں کے دل میں خیر کی بات ڈالتے ہیں، یعنی وہ حضرات لوگوں میں اچھے خیالات کے پیدا ہونے کا سبب بنتے ہیں۔ سینہ کی مختلف شکلوں میں سے کسی شکل کے ذریعہ۔

(٤) اور یہ بات کہ ان حضرات کے اجتماعات ہوتے ہیں، جس طرح اللہ چاہتے ہیں اور جہاں اللہ چاہتے ہیں، ان حضرات کو اس اجتماع کے اعتبار سے الرفیق الأعلى (اونچے درجے کے ساتھی بھائی) الندی الأعلى (مجلس بالا) اور الملأ الأعلى (اکابرین کی جماعت) کہا جاتا ہے۔

(٥) اور یہ بات کہ بڑے درجے کے انسانوں کی ارواح کے لئے ان میں شمولیت ہے، اور ان کے ساتھ ملنا ہے، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ”اے اطمینان والی روح! تو اپنے پروردگار کی طرف چل، خوش خوش، اور وہ بھی تجھ سے خوش خوش، پھر تو میرے خاص بندوں میں شامل ہو جا اور میری جنت میں داخل ہو جا“ (الفجر ٢٧-٣٠) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میں نے جعفر طیار کو فرشتہ کی شکل میں جنت میں فرشتوں کے ساتھ دو پروں سے اڑتے دیکھا (ترمذی وحاکم وقال صحیح، فیض القدیر ٤: ٨)

یہ ملائکہ دو قسم کے ہیں: نوری اور عنصری یا عرشی اور فرشی:

نوری فرشتے: وہ ہیں جن کے اجسام نور سے بنا کر ان میں اعلیٰ درجہ کی ارواح پھونکی گئی ہیں، یہ نورانی نفوس ملأ اعلیٰ ہی کے لئے پیدا کئے گئے ہیں اور کا ہے وہ زمین پر بھی اترتے ہیں۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ جس طرح کوئی بڑا مہمان آنے والا ہوتا ہے تو پہلے سے ساز وسامان اور تیاری کی جاتی ہے، اسی طرح قدرت الٰہی نے انسان کی ضرورت اور حاجت کے لئے ملائکہ کو ہزاروں سال پہلے پیدا کیا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے علم میں یہ بات تھی کہ زمین میں نظام خیر کے لئے ان فرشتوں کا وجود ضروری ہے اور نورانی اجسام کو شاہ صاحب نے ایک مثال سے سمجھایا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کو طور پر جو آگ نظر آئی تھی وہ آگ نہیں تھی، بلکہ تجلی تھی، نور تھا، جو آگ کی صورت میں نظر آیا تھا، یعنی اس نور نے جسم کی شکل اختیار کی تھی جس کی وجہ سے وہ نظر آنے لگا تھا۔

۲- ادنیٰ درجے کے عنصری فرشتے: جن کے اجسام نور سے نہیں، بلکہ عناصر اربعہ کے بخور (بھاپ) سے بنائے گئے ہیں پھر جب عناصر کے لطیف بخار سے وہ اجسام تیار ہو گئے تو ان میں بہترین ارواح پھونکی گئیں۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ جس طرح عناصر اربعہ سے مادر شکم میں ہمارے اجسام تیار ہوتے ہیں اور ان میں روح پھونکی جاتی ہے، جس سے انسان موجود ہو جاتا ہے، اسی طرح نوری فرشتوں کے اجسام جب نور سے تیار ہوتے ہیں تو ان میں ارواح پھونکی جاتی ہیں، پس وہ ملائکہ وجود پذیر ہو جاتے ہیں، اسی طرح عناصر اربعہ سے جو بخارات اٹھتے ہیں، جب ان کا آمیزہ تیار ہوتا ہے یعنی ان عناصر کا باہمی تضاد اور تخالف ختم ہو جاتا ہے اور ان میں ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے، جس کا نام "مزاج"[1] ہے، تو اللہ اس مزاج میں اعلیٰ درجہ کی روح پھونکتے ہیں، یہی مزاج ان کے اجسام ہوتے ہیں اور یہ عنصری فرشتے کہلاتے ہیں۔ یہ فرشتے بہیمی گندگیوں سے کوسوں دور ہوتے ہیں۔ فرشتوں کی قسم اول میں تو گندگی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کیونکہ وہ نورانی نفوس ہیں مگر اس دوسری قسم کے فرشتوں میں اس کا احتمال تھا اس لئے وضاحت کی کہ عناصر کے لطیف بخارات سے پیدا ہونے کے باوجود وہ بہیمی گندگیوں سے پاک ہوتے ہیں۔

اس کی مزید تفصیل یہ ہے کہ انسان عناصر اربعہ سے پیدا ہوا ہے مگر اس میں خاک کا غلبہ ہے، اس لئے وہ خاکی مخلوق کہلاتا ہے۔ سورۃ المؤمنون آیت ۱۲ میں ہے کہ:

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ سُلَالَةٍ مِنْ طِينٍ — ہم نے انسان کو مٹی کے خلاصہ سے بنایا ہے

اور جنات بھی عناصر اربعہ سے پیدا کئے گئے ہیں مگر ان میں آگ کا غلبہ ہے اس لئے وہ ناری مخلوق کہلاتے ہیں، سورۃ الرحمٰن آیت ۱۵ میں ہے کہ جان (جنات کے جد امجد) کو اللہ نے ایک آمیزے سے آگ سے پیدا کیا ہے۔[2]

---

[1] مزج کے معنی میں اختلاط کا مفہوم ہے۔ آگے آیت ہے مرج البحرین اور مرج الشیٔ بالشیٔ کے معنی ہیں ملانا، پس من مارج کے معنی ہیں آمیزہ سے یہ آمیزہ عناصر اربعہ کا ہے اور من نار کا مطلب یہ ہے کہ اس میں غالب عنصر آگ کا ہے ۱۲

اور فرشی ملائکہ بھی عناصر اربعہ سے پیدا کئے گئے ہیں، مگر وہ براہ راست عناصر اربعہ سے نہیں پیدا کئے گئے، نہ ان میں کسی خاص عنصر کا غلبہ ہے، بلکہ چاروں عناصر سے جو لطیف بخارات اٹھتا ہے، باہم ملنے کے بعد جب اتفاقاً ان میں مزاج پیدا ہو جاتا ہے تو ان میں اعلیٰ درجہ کی روح پھونک دی جاتی ہے، جو فرشی ملائکہ ملأ سافل اور رجال الغیب کہلاتے ہیں۔ ان کو رجال اس لئے کہا جاتا ہے کہ ان کے اجسام عناصر اربعہ کے لطیف بخارات سے بنے ہیں، جس طرح انسان کے اجسام براہ راست عناصر اربعہ سے بنتے ہیں، اور غیب اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ عام طور پر نظر نہیں آتے، کیونکہ عناصر اربعہ تو نظر آتے ہیں مگر ان کی بھاپ نظر نہیں آتی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی جس عبد صالح (خضر) سے ملاقات اور ہمرکابی ہوئی تھی وہ فرشتوں کی اسی قسم سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ کوئی انسان نہیں تھے، تفصیل کے لئے میری تفسیر ہدایت القرآن ملاحظہ فرمائیں۔

۳- اعلیٰ درجہ کے انسانی نفوس: یعنی اونچے درجہ کے انسان، جیسے انبیاء اور اولیاء جو دنیا میں صلاحیتوں کے لحاظ سے ملأ اعلیٰ کے لگ بھگ ہوتے ہیں، اور وہ دنیا میں ایسے کام کرتے رہتے ہیں جو آخرت میں نجات بخش اور ملأ اعلیٰ سے ملانے والے ہوتے ہیں، جب وہ اس دنیا سے گذر جاتے ہیں تو ان کی ارواح کو ملأ اعلیٰ میں شامل کر لیا جاتا ہے۔ میں نے طالب علمی کے زمانہ میں اساتذہ سے ایک خواب سنا ہے۔ کسی نے حضرت شیخ الہند قدس سرہ کو وفات کے بعد خواب میں دیکھا کہ وہ عرش الٰہی کا پایہ پکڑ کر دعا کر رہے ہیں: ''الٰہی! ہندوستان سے انگریز کو نکال دے'' یہ گو خواب ہے مگر از قبیل مبشرات ہے، اس لئے اس سے مسئلہ سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

واعلم أن الملأ الأعلى ثلاثة أقسام:

[١] قسمٌ علم الحق أن نظام الخير يتوقف عليهم، فخلق أجسامًا نورية، بمنزلة نار موسى، فنفخ فيها نفوسا كريمة.

[٢] وقسمٌ اتفق حدوث مزاج في البخارات اللطيفة من العناصر، استوجب فيضانَ نفوسٍ شاهقة، شديدة الرفض للألواث البهيمية.

[٣] وقسم هم نفوس إنسانية، قريبةُ المأخذ من الملأ الأعلى، ما زالت تعمل أعمالاً مُنْجِيَةً، تفيد اللحوق بهم، حتى طرحت عنها جلابيب أبدانها، فانسلكت في سلكهم، وعُدَّت منهم.

ترجمہ: اور جان لیجئے کہ ملأ اعلیٰ تین قسموں پر ہیں:

پہلی قسم حق تعالیٰ نے جانا کہ خیر کا نظام ان (ملأ اعلیٰ) پر موقوف ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے نورانی اجسام پیدا کئے جیسے طور پر موسیٰ علیہ السلام کو نظر آنے والی آگ، پھر اللہ نے ان نورانی اجسام میں اعلیٰ درجہ کی ارواح پھونکیں۔

اور دوسری قسم: عناصر اربعہ کے لطیف بخارات میں اتفاقاً مزاج پیدا ہوگیا، جس نے اونچے درجے کی ارواح کے فیضان کو واجب جانا (یعنی ضروری قرار دیا، لازم سمجھا) جو بہت زیادہ چھوڑنے والی ہیں بہیمی گندگیوں کو۔

اور تیسری قسم: وہ انسانی ارواح ہیں، جو صلاحیتوں کے اعتبار سے ملأ اعلیٰ کے لگ بھگ ہوتی ہیں۔ وہ لوگ برابر ایسے کام کرتے رہتے ہیں کہ جو آخرت میں نجات بخشنے والے اور ملأ اعلیٰ کے ساتھ ملنے کا فائدہ دینے والے ہیں، یہاں تک کہ جب ان نفوس سے ان کے اجسام کی چادریں پھینک دی جاتی ہیں تو وہ ملأ اعلیٰ کی لڑی میں منسلک ہوجاتے ہیں اور ان میں شمار ہونے لگتے ہیں۔

لغات: استوجب الشیئَ: مستحق ہونا، واجب و لازم جاننا۔ شهق (ف ض) شهوقا الجبلُ: بلند ہونا۔ المآخذ: لینے کا راستہ یا طریقہ یا وقت یا وہ جگہ جہاں سے کوئی چیز لی جائے۔ محاورہ میں بمعنی صلاحیت جمع مآخذ۔ سلک: ہار کا دھاگا۔

تشریح: (۱) شاید عبارت میں علیٰ رہ گیا ہے اصل عبارت ان الملأ الأعلیٰ علی ثلاثۃ أقسام ہونی چاہئے، مگر علیٰ کے بغیر بھی عبارت صحیح ہے۔

(۲) تفید الخ أعمالا کی صفت ثانیہ ہے۔

(۳) استوجب کا مطلب یہ ہے کہ جب عناصر کے لطیف بخارات میں ایک خاص قسم کا مزاج پیدا ہوجاتا ہے تو وہ ایسے نفوس کے فیضان کو واجب کرلیتا ہے یعنی ان کا فیضان ضروری ہوجاتا ہے، جو بلند رتبہ اور حیوانی گندگیوں سے نہایت بیزار ہوں۔

☆ ☆ ☆

ملأ اعلیٰ کے تین کارنامے

ملأ اعلیٰ کے درج ذیل تین کام ہیں:

اول: وہ پوری توجہ سے اللہ پاک کی طرف متوجہ رہتے ہیں۔ اور وہ توجہ اتنی گہری ہوتی ہے کہ کسی بھی چیز کی طرف التفات اس توجہ میں خلل نہیں ڈالتا۔ باب کے شروع میں جو آیت ذکر کی گئی ہے اس میں ارشاد ہے کہ حاملین عرش اور جو فرشتے ان کے ارد گرد ہیں وہ ہمہ وقت اللہ کی تسبیح و تقدیس میں لگے رہتے ہیں اور اللہ کے یقین میں مشغول رہتے ہیں۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ وہ زبان سے بالفعل خواہ تسبیح میں مشغول ہوں یا کسی اور کام میں، ان کی توجہ ہمہ وقت اللہ تعالیٰ کی طرف رہتی ہے وہ ایک لمحہ بھی اللہ کی یاد سے غافل نہیں ہوتے۔

دوم: زمین میں جو نظام چل رہے ہیں ان میں سے کونسا نظام اللہ کو پسند ہے اور کونسا ناپسند، اس کا علم ملا اعلیٰ کو اللہ کی طرف سے دیا جاتا ہے جیسے ایمان اور اعمال صالحہ کا نظام اللہ کو پسند ہے ﴿وَإِنْ تَشْكُرُوْا يَرْضَهُ لَكُمْ﴾ اور کفر اور کفار کا طریقہ اللہ کو ناپسند ہے ﴿وَلَا يَرْضٰى لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ﴾ اور جب ملا اعلیٰ کو یہ علم حاصل ہوتا ہے تو وہ نظام صالح کے لئے دعائیں کرتے ہیں، جس کی وجہ سے دنیا میں خیرات و برکات اور آخرت میں بخشش کا استحقاق پیدا ہوتا ہے۔ یہ نیک دعائیں اللہ کے بندوں کے دلوں کو موجزن کرتی ہیں اور نظام صالح والے نہال ہو جاتے ہیں۔ مذکورہ آیت میں ﴿يَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِيْنَ آمَنُوْا﴾ میں اسی کا بیان ہے۔

اسی طرح ملا اعلیٰ نظام طالح کے لئے بددعائیں کرتے ہیں، ان پر لعنتیں بھیجتے ہیں، جس کے نتیجہ میں وہ دنیا میں یا آخرت میں مصائب و آلام سے دوچار ہوتے ہیں اور ان پر غضب الٰہی نازل ہوتا ہے۔

سوم: ملائکہ میں جو اونچے درجے کے فرشتے ہیں، ان کے انوار اس روح اعظم کے پاس جمع ہوتے ہیں، جس کے بے شمار منہ ہیں اور وہ بہت سی زبانیں بولتی ہے۔ ملائکہ کے انوار وہاں جمع ہو کر شیٔ واحد بن جاتے ہیں جس کا نام حظیرۃ القدس (بارگاہ مقدس) ہے۔

حظیرہ کے معنی ہیں باڑہ، گھر کا صحن، مکان کے آگے کی وہ جگہ جہاں مسافر آتے وقت سامان رکھتا ہے اور قدس کے معنی ہیں پاکیزہ، پس حظیرۃ القدس کے معنی ہیں پاکیزہ باڑہ، اردو میں اس کو دربار اور بارگاہ عالی کہتے ہیں اور کبھی دربار اور بارگاہ عالی بول کر اللہ کی ذات کو بھی مراد لیتے ہیں۔

مسند احمد (۵: ۲۵۸) میں حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ کی ایک طویل روایت ہے، اس کا ایک جزء یہ ہے کہ جو لوگ اللہ کے خوف سے شراب چھوڑ دیتے ہیں، اللہ تعالیٰ اپنی عزت کی قسم کھا کر فرماتے ہیں کہ وہ ان کو حظیرۃ القدس سے سیراب کریں گے۔

حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ حظیرۃ القدس کی حقیقت بیان کرتے ہیں کہ روح اعظم کے پاس جس کے بہت سے منہ اور بہت سی زبانیں ہیں، جب افاضل ملائکہ کے انوار وہاں جمع ہو کر اکٹھا ہوتے ہیں اور شیٔ واحد بن جاتے ہیں تو اس کو حظیرۃ القدس کہتے ہیں۔ مگر یہ روح اعظم والی مرفوع روایت تو مجھے ملی نہیں۔ البتہ الدر المنثور (۱: ۲۰۰) میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول مروی ہے کہ روح ایک فرشتہ ہے، جس کے ستر ہزار (یعنی بہت سے) منہ ہیں، اور ہر منہ میں ستر ہزار زبانیں ہیں، اور ہر زبان ستر ہزار بھاشائیں بولتی ہیں وہ فرشتہ ان تمام زبانوں سے خدا کی تسبیح کرتا ہے، اللہ تعالیٰ ہر تسبیح سے ایک فرشتہ پیدا کرتے ہیں جو قیامت تک ان فرشتوں کے ساتھ اڑتا رہتا ہے۔

مگر روح المعانی (۱۵: ۱۵۲) میں ہے وتعقب هذا بأنه لا يصح عن علي كرم الله وجهه، وطعن الإمام في ذلك بما طعن (اور اس روایت پر اعتراض کیا گیا ہے کہ یہ روایت حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ثابت نہیں اور امام رازی رحمہ اللہ نے اس پر جو اعتراض کئے ہیں وہ کئے ہیں) امام رازی رحمہ اللہ نے تفسیر کبیر (۲۱: ۳۹) میں اس پر تین اعتراض

گئے ہیں۔ اس حدیث کی سند کیسی ہے؟ یہ بھی معلوم نہیں، کیونکہ یہ روایت غیر معروف کتابوں میں ہے۔ اور یہ واقعہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ مرنکات بیان نہیں کرتے تھے، اس لئے اس روایت کو شاہ صاحب نے غالباً مرفوع مانا ہے مگر یہ بھی واقعہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے علوم کو شیعوں نے برباد کر دیا ہے، خود ساختہ روایتیں ان کے نام سے چلاتی ہیں، اس لئے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ہر روایت کی اسنادی تحقیق ضروری ہے۔

غرض حظیرۃ القدس کی حقیقت جو کچھ بھی ہو، اس بارگاہ عالی میں یہ طے پاتا ہے کہ دنیا میں لوگوں کو ذلیل اور خوار ہونے سے بچانے کے لئے کوئی تدبیر کرنی چاہئے، چنانچہ اس وقت زمین میں جو لوگ موجود ہوتے ہیں ان میں سے بہترین شخص کو اس کام کے لئے تیار کیا جاتا ہے اور اس کا آوازہ پھیلایا جاتا ہے اور اس کا معاملہ لوگوں میں چلایا جاتا ہے۔

اور اس تجویز کے نتیجے میں تین چیزیں وجود میں آتی ہیں:

(۱) جن لوگوں میں صلاحیت ہوتی ہے ان کے دلوں میں الہام کیا جاتا ہے کہ وہ اس شخصیت کی پیروی کریں اور اس کے ساتھ مل کر ایک ایسی جماعت بنائیں جو لوگوں کے فائدے کے لئے کام کرے۔

(۲) اس شخصیت کے دل میں وحی سے یا خواب سے یا غیبی آواز سے ایسے علوم منتقل ہوتے ہیں جن میں تمام آدمیوں کی بھلائی اور راہنمائی ہوتی ہے اور کبھی ملائکہ اس شخصیت کو نظر بھی آتے ہیں اور اس سے زبانی بات کرتے ہیں۔

(۳) اس شخصیت کے محبین کی مدد کی جاتی ہے اور ان کو ہر خیر سے قریب کیا جاتا ہے اور جو لوگ اس کے دشمن ہوتے ہیں ان پر لعنت کی جاتی ہے اور ان کو ہر تکلیف سے قریب کیا جاتا ہے۔

اور یہ نبوت کی بنیادوں میں سے ایک بنیاد ہے۔ کبھی نبوت کا آغاز اسی طرح ہوتا ہے، پھر اس کا معاملہ بڑھتا جاتا ہے اور حظیرۃ القدس کا اجتماع منتشر (مستقل اتفاق) روح القدس کی تائید بن جاتا ہے، اور اس اجتماع کی وجہ سے ایسی ایسی برکات وجود میں آتی ہیں جو عام طور پر نہیں پائی جاتیں، ایسی برکات معجزات کہلاتی ہیں۔

والملأ الأعلى: شأنها:

[۱] أنها تتوجه إلى بارئها توجهاً مُمْعِناً، لا يصدُّها عن ذلك التفاتٌ إلى شيءٍ، وهو معنى قوله تعالى: ﴿يُسَبِّحُونَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَيُؤْمِنُونَ بِهِ﴾

[۲] وتتلقى من ربها استحسان نظام العالم، واستهجان خلافه، فيترشح ذلك باباً من أبواب الجود الإلهي، وهو معنى قوله تعالى: ﴿وَيَسْتَغْفِرُونَ لِلَّذِينَ آمَنُوا﴾

[۳] وأما أفاضلهم فتجتمع أنوارهم، وتتداخل فيما بينها، عند الروح الذي وصفه النبي صلى الله عليه وسلم بكثرة الوجوه والألسنة، فتصير هنالك كشيء واحد، وتسمى حظيرة القدس؛

وربما حصل في حظيرة القدس إجماعٌ على إقامة حيلة لصلاح بني آدم من النواحي المعاشية

والمساعدة بتكميل أزكى خلق الله يومئذ، وتمشية أمره في الناس، فيوجب ذلك إلهامات في قلوب المستعدين من الناس: أن يتبعوه، ويكونوا أمة أُخرجت للناس؛ ويوجب تمثُّل علوم — فيها صلاح القوم وهداهم — في قلبه وحيا، ورؤيا، وهتفا. وأن تتراءى له، فتكلِّمه شفاها، ويوجب نصر أحبائه، وتقريبهم من كل خير، ولعن من صد عن سبيل الله، وتقريبهم من كل ألم.
وهذا أصلٌ من أصول النبوة، ويسمى إجماعهم المستمرُّ بتأييده روح القدس، وتظهر هنالك بركاتٌ لم تُعهد في العادة، فتسمى بالمعجزات.

ترجمہ: اور ملأ اعلیٰ کا کام:

(۱) یہ ہے کہ وہ اپنے پیدا کرنے والے کی طرف متوجہ رہتے ہیں، اُن کی گہری توجہ کے ساتھ کسی بھی چیز کی طرف التفات ملأ اعلیٰ کو اس توجہ سے نہیں روکتا، یہی مطلب ہے ارشاد باری تعالیٰ ﴿یُسَبِّحُوْنَهٗ﴾ الآیۃ کا۔

(۲) اور وہ اپنے رب کی طرف سے نظام صالح کی پسندیدگی حاصل کرتے ہیں، اور اس کے برخلاف کی ناپسندیدگی (یعنی یہ علم ان کو القاء کیا جاتا ہے) پس یہ القاء جود الٰہی کے دروازوں میں سے کوئی دروازہ کھلتا ہے، اور یہی مطلب ہے ارشاد باری تعالیٰ ﴿وَیَسْتَغْفِرُوْنَ﴾ کا۔

(۳) اور افاضل ملائکہ کے انوار اکٹھا ہوتے ہیں، اور وہ آپس میں گھل مل جاتے ہیں، اس روح کے پاس جس کو متصف کیا ہے نبی کریم ﷺ نے بہت سے سوچوں اور رازدانوں کے ساتھ، پس وہ انوار وہاں شیٔ واحد بن جاتے ہیں، اور وہ انوار حظیرۃ القدس کہلاتے ہیں۔

اور کبھی حظیرۃ القدس میں اجماع (اتفاق) ہوتا ہے انسانوں کو اخروی اور دنیوی تباہیوں سے بچانے کے لئے کسی تدبیر کرنے کے ذریعہ: اس زمانہ میں مخلوق میں جو سب سے زیادہ ستھرا شخص ہوتا ہے اس کی تکمیل کرنے، اور لوگوں میں اس کا معاملہ چلانے کے ذریعہ، پس یہ اجماع باصلاحیت لوگوں کے دلوں میں الہام کو واجب کرتا ہے کہ وہ اس شخصیت کی پیروی کریں اور وہ ایک ایسی جماعت بنیں جو لوگوں کے مفاد کے لئے کام کرے۔

اور وہ اجماع واجب کرتا ہے ایسے علوم کے متمثل ہونے کو — جس میں قوم کی صلاح وفلاح اور ہدایت ہوتی ہے — اس شخصیت کے دل میں: وحی کے ذریعہ یا خواب کی صورت میں یا غیبی آواز کی شکل میں، اور اس بات کو (بھی) کہ وہ فرشتے اس شخصیت کو نظر آتے ہیں، پس وہ اس سے رودررو بات کرتے ہیں۔

اور وہ اجماع واجب کرتا ہے اس شخصیت سے محبت کرنے والوں کی مدد کو، اور ان کو ہر خیر سے قریب کرنے کو، اور ان لوگوں پر لعنت کو جو اللہ کی راہ سے روکتے ہیں، اور ان کو ہر تکلیف سے نزدیک کرنے کو۔

اور یہ ملأ اعلیٰ کا اجماع نبوت کی بنیادوں میں سے ایک بنیاد ہے یعنی نبوتوں کا آغاز اسی طرح ہوتا تھا، اور ملأ اعلیٰ کا

اجماعِ مستمر (مسلسل اتفاق اور عزم) روح القدس کی تائید وتقویت کہلاتا ہے۔ اور وہاں (یعنی اجماع ہونے پر) ایسے بابرکات ثمرات پیدا ہوتے ہیں جو عادۃً ہونے پہنچنے والے نہیں، یہی وہ ثمرات معجزات کہلاتے ہیں۔

لغات:

الشأن: بڑے بڑے امور، احوال، معاملہ، حالت، جمع شُئُون ..... شأنها میں ملأ علی کی طرف مؤنث ضمیر لوٹائی ہے بتاویل جماعت اور ملأ کے اندر آگے الا نصیھم میں مذکر ضمیر استعمال کی ہے ذوی العقول ہونے کی وجہ سے ..... الممعن (اسم فاعل) أمعن في الأمر: معاملہ کی گہرائی میں پہنچنا ..... تلقى الشيء: ملنا، استقبال کرنا ..... استهجن فعله: قبیح سمجھنا ..... تداعلہ: مل جل جانا ..... وصف يصف وصفا وصفة: حالت بیان کرنا ..... الداهية: مصیبت جمع دواہ، داهية دهياء: سخت مصیبت دواهي الدهر: زمانے کے حوادث ..... المعاش: زندگی کا ذریعہ مراد دنیا ..... المعاد: لوٹنا، دوبارہ پیدا ہونا، مراد آخرت ..... تمثّل: پایا جانا۔

تشریح:

"نبوت کی بنیادوں میں سے ایک بنیاد ہے" یعنی نبوت کا سلسلہ اسی طرح شروع ہوتا ہے اور ملأ اعلیٰ کی جو نصرت نبی کے ساتھ مسلسل رہتی ہے اس کو قرآن میں روح القدس کی تائید کہا گیا ہے، اور اجماع اور تائید کی وجہ سے نبی کے ہاتھ سے ایسے ایسے کام ظاہر ہوتے ہیں جو عام طور پر جانے پہچانے ہوئے نہیں، وہ نبی کے معجزات کہلاتے ہیں۔

☆ ☆ ☆

ملأ سافل اور ان کے کام

ملأ اعلیٰ سے کم رتبہ ملأ سافل ہیں۔ جب عناصر اربعہ کے لطیف بخارات میں معتدل مزاج پیدا ہوتا ہے تو وہ روح کے فیضان کو چاہتا ہے، جس کی تفصیل ابھی گذر چکی ہے۔ اور جب اس مزاج میں ارواح کریمہ کا فیضان کر دیا جاتا ہے تو ملأ سافل وجود پذیر ہو جاتے ہیں۔ یہ فرشتے آسمانی فرشتوں سے کم رتبہ ہیں۔ ان کا کمال اور خوبی یہ ہے کہ وہ ہر وقت عالم بالا سے اترنے والے احکامات کا انتظار کرتے ہیں، جونہی قابل کی استعداد اور فاعل کی تاثیر کے مطابق ان پر کوئی حکم مترشح ہوتا ہے تو وہ اس کی تعمیل کے لئے اس طرح اٹھ کھڑے ہوتے ہیں جس طرح پرندے اور چوپائے فطری جذبات اور طبعی تقاضوں سے کام کرتے ہیں۔ ان ملائکہ کو تعمیل حکم کے علاوہ کوئی فکر دامن گیر نہیں ہوتی، وہ کھانے پینے کے جھمیلے نہیں رکھتے، وہ ذاتی تقاضوں سے بالکل بے نیاز ہوتے ہیں، ان کا مطمح نظر بس ان احکام کی تعمیل ہوتا ہے جو ان کو الہام کئے جاتے ہیں۔

یہ فرشتے انسانوں اور چوپایوں کے دلوں میں اثر ڈالتے ہیں جس سے ان کے ارادے اور خیالات امر مطلوب کے مطابق ہوجاتے ہیں اور جو کچھ عنقریب خداوندی ہوتا ہے وہ بروئے کار آتا ہے۔ اور یہ اثر ڈالنا کئی طرح سے ہوتا ہے مثلاً:

۱- بعض قدرتی چیزوں میں ملائکہ اثر ڈالتے ہیں: ان کی حرکات وتغیرات کو جائز کرتے ہیں، جیسے کوئی پتھر لڑھکایا گیا، ملائکہ نے اس میں ایسا اثر پیدا کردیا جس کی وجہ سے وہ اپنی طبعی رفتار سے کہیں زیادہ تیز ہوگیا۔ ہجرت کے موقعہ پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا شاھت الوجوہ فرما کر مٹھی بھر مٹی پھینکنا اور اس کا ہر ہر کافر کی آنکھ میں پہنچ جانا، اور خطبۂ جمعہ کے دوران حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یاساریۃ الجبل فرمانا اور اس آواز کا نہاوند تک پہنچ جانا، اور حضرت مریم کا کھجور کے تنے کو ہلانا اور کھجوروں کا گرنا اسی قبیل سے ہے۔

۲- ایک شکاری ندی نہر میں جال کا تانا پھینکتا ہے، فرشتوں کی توجہیں آتی ہیں، وہ مچھلیوں کے دلوں میں الہام کرتی ہیں: کچھ مچھلیاں جال میں گھس جاتی ہیں اور کانٹا پکڑ لیتی ہیں وہ کھو بھاگ نکلتی ہیں اور وہ نہیں جانتی کہ وہ یہ کام کیوں کرتی ہیں۔ بس فرشتوں کے الہام کی اتباع کرتی ہیں۔ چنانچہ دو شکاری ایک ہی ندی نہر میں ایک ہی قسم کا جال کا تانا ڈالتے ہیں، ایک کا جال بھرا ہوا نکلتا ہے اور دوسرے کا خالی۔ یہ اسی الہام کا نتیجہ ہے۔

۳- دو گروہ باہم بھڑتے ہیں، فرشتے آتے ہیں، ایک گروہ کے دل میں شجاعت اور جوانمردی کے خیالات پیدا کرتے ہیں اور موقعہ کے مناسب ایسی باتیں اور ایسے خیالات دل میں پیدا کرتے ہیں کہ ان میں بہادری کی روح دوڑ جاتی ہے اور یہ فرشتے فتح وظفر کے وسائل اور تدبیریں بھی الہام کرتے ہیں، ان کے تیر وتفنگ اور اسلحہ جات میں قوت بھی پیدا کرتے ہیں جس سے ان کی کامیابی یقینی ہوجاتی ہے اور دوسرے گروہ کے دل میں اس کے برخلاف جذبات ابھارتے ہیں: کہ جو کچھ عنقریب خداوندی ہوتا ہے وہ پورا ہو۔ جنگ بدر کی پوری تاریخ اس کی واضح مثال ہے۔ سورۃ الانفال کی آیات ۴۱-۴۴ پڑھیں۔

۴- کبھی عالم بالا سے ملاءِ سافل پر یہ مترشح ہوتا ہے کہ کسی شخص کو تکلیفیں یا راحتیں پہنچائی جائیں، ملاءِ سافل اس سلسلہ میں بھی اپنی والی پوری کوشش کرتے ہیں اور ہر ممکن زور لگاتے ہیں تاکہ عالم بالا کی مراد پوری ہو۔

> ودون هؤلاء نفوسٌ استوجب فيضانها حدوث مزاج معتدل في بخارات لطيفة، لم تبلغ بهم السعادةُ مبلغ الأولين، فصار كمالهم أن تكون فارغةً لانتظار ما يترشح من فوقها؛ فإذا ترشح شيئ بحسب استعداد القابل، وتأثير الفاعل، انبعثوا إلى تلك الأمور، كما تنبعث الطيورُ والبهائم بالدواعي الطبيعية؛ وهم في ذلك فانون عما يرجع إلى أنفسهم، يأتون بما ألهموا من فوقهم، فيؤثرون في قلوب البشر والبهائم، فتنقلب إراداتها وأحاديث نفوسها إلى ما يناسب الأمر المراد.

ويؤثرون في بعض الأشياء الطبيعية في تضاعيف حركاتها وتحولاتها، كما يُدحرج حجرٌ، فأثّر فيه مَلَك كريم عند ذلك، فمشى في الأرض أكثر مما يُتصوّر في العادة؛

وربما ألقى الصيادُ شبكةً في النهر، فجاءت أفواجٌ من الملائكة، تُلهم في قلب هذه السمكة أن تقتحم، وهذه أن تهرب، وتقبض خيلا، وتبسط أخرى، وهي لاتعلم لِمَ تفعل ذلك؟ ولكن تتبع ما أُلهمت.

وربما تقاتلت فئتان، فجاءت الملائكة تزيّن في قلوب هذه الشجاعة والثبات بأحاديث وخيالاتٍ يقتضيها المقام، وتُلهم جهة الغلبة، وتزيد في الرمي وأشباهه، وفي قلوب تلك أضدادَ هذه الخصال، ليقضي الله أمرا كان مفعولا.

وربما كان المترشحُ إلهامَ نفسٍ إنسانيةٍ أو تعميمها، فتسعى الملائكة كُلَّ سعي، وتذهب كُلَّ مذهبٍ ممكن.

ترجمہ: اور ان حضرات سے کم درجہ کچھ ایسے نفوس ہیں، جن کے فیضان کو لطیف بخارات میں معتدل مزاج کے پیدا ہونے نے واجب جانا ہے، ان کو نیک بختی نے پہلے حضرات کے درجہ تک نہیں پہنچایا، پس ان کا کمال یہ ہے کہ وہ اس چیز کے انتظار کے لئے فارغ رہتے ہیں جو ان پر ان کے اوپر سے ٹپکتی ہے، پس جب کوئی چیز قابل کی استعداد اور فاعل کی تاثیر کے مطابق ٹپکتی ہے تو وہ فرشتے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں ان کاموں کی تکمیل کے لئے جیسے پرندے اور چوپایے فطری تقاضوں سے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور وہ ان کاموں میں (ایسے منہمک ہو جاتے ہیں کہ وہ) فنا ہونے والے ہیں (یعنی بے خبر ہیں) ان باتوں سے جو ان کی ذات کی طرف لوٹتی ہیں۔ باقی رہنے والے ہیں ان باتوں کے ساتھ جو وہ عالم بالا سے الہام کی گئی ہیں، پس وہ انسانوں اور چوپایوں کے دلوں پر اثر انداز ہوتے ہیں، پس ان کے ارادے اور ان کے دلوں کی باتیں (یعنی خیالات) اس چیز کی طرف پلٹ جاتے ہیں جو امر مطلوب کے مناسب ہوتی ہے۔

اور وہ بعض قدرتی اشیاء میں اثر ڈالتے ہیں، ان کی حرکات وتغیرات کے ضمن میں، جیسے کوئی پتھر لڑھکایا جاتا ہے۔ پس اس کے لڑھکنے میں معزز فرشتہ اثر ڈالتا ہے، پس وہ زمین میں اس سے زیادہ چلتا ہے جو عادۃً متصور ہوتا ہے۔

اور کبھی شکاری نہر میں جال ڈالتا ہے، پس فرشتوں کی فوجیں آتی ہیں، وہ اس مچھلی کے دل میں ڈالتے ہیں کہ وہ جال میں گھسے، اور اُس کے دل میں ڈالتے ہیں کہ وہ بھاگے۔ اور ایک کے دل میں ڈالتے ہیں کہ کانٹا پکڑے اور دوسری کے دل میں ڈالتے ہیں کہ وہ کانٹا چھوڑ دے، اور وہ مچھلیاں نہیں جانتیں کہ وہ یہ کام کیوں کر رہی ہیں؟ لیکن وہ پیروی کر رہی ہیں اس بات کی جو وہ الہام کی گئی ہیں۔

اور کبھی دو گروہ باہم لڑتے ہیں، پس فرشتے آتے ہیں، اس جماعت کے دل میں بہادری اور ثابت قدمی کو مزین

کرتے ہیں اسی طرح وہ نیک خیالات کے ذریعے جن کا موقع مقتضی ہوتا ہے اور غیبی تدبیریں الہام کرتے ہیں اور تیر پھینکنے میں اور ان جیسی چیزوں میں تقویت پہنچاتے ہیں۔ اور ان کے گروہ کے دلوں میں ان لوگوں کے برخلاف پختہ عزائم کرتے ہیں تاکہ اللہ تعالیٰ طے کر دیں اس بات کو جو ہونے والی ہے۔

اور کبھی پہنچنے والی بات کی انسان کو تکلیف پہنچاتی ہے تو واسطہ بنتا ہے جس طرح کہ آپس وہ کوشش کرتے ہیں اور وہ بر محسن راہ پر چلتے ہیں (تا کہ عالم بالا کا مقصود پورا ہو)

تشریح:

قابل کی استعداد اور فاعل کی تاثیر: جیسے پڑھانے والے اساتذہ فاعل ہیں اور پڑھنے والے طلبہ قابل ہیں اور ہر استاذ کا فیض یکساں نہیں ہوتا بلکہ قوت تاثیر کے اعتبار سے مختلف ہوتا ہے۔ ایک استاذ سے پڑھتے ہوئے طلبہ جوہر ہوتے ہیں اور دوسرے استاذ کے پڑھائے ہوئے [illegible] نہیں ہوتے یہ فاعل کی تاثیر کا فرق ہے۔ اسی طرح ایک استاذ کے طلبہ بھی یکساں نہیں ہوتے یہ ان کی استعداد کا فرق ہے اسی طرح ملائکہ فاعل ہیں اور انسان قابل اور فاعل کی تاثیری قوت کا اختلاف اور قابل کی استعداد کی قوت و ضعف احکام کے نتائج میں دوران کے نتائج میں تفاوت پیدا کرتے ہیں۔

☆ ☆ ☆

حزبِ مخالف کا بیان

فرشتوں کے مقابلہ میں ایک اور جماعت ہے یہ شیاطین کی جماعت ہے۔ شیاطین تنگ اور [illegible] کے پتلے اور برے خیالات کا سرچشمہ ہوتے ہیں۔ خیر اور نیکی سے کوسوں دور ہوتے ہیں۔ جب عناصر اربعہ کے ظلمانی (تاریک) بخارات میں سڑاند و تعفن پیدا ہوتا ہے تو وہ نفوس کا تقاضا کرتا ہے۔ چنانچہ اس میں ارواح ڈالی جاتی ہے جس سے شیاطین وجود میں آتے ہیں۔ جیسے گندی نالی کی مٹی میں جب سڑاند پیدا ہوتی ہے تو اس میں ارواح ڈالی جاتی ہیں اور اس کے کیڑے اور مکھی مچھر پیدا ہو جاتے ہیں۔ شیاطین کی کوششیں ہمیشہ فرشتوں کی کوششوں کے برخلاف ہوتی ہیں۔ وہ لوگوں کے دلوں میں نافرمانی کے خیالات ابھارتے ہیں اور دنیا و آخرت میں انسان کی تباہی کا سامان کرتے ہیں۔

> وبإزاء أولئك آخرون أولو خلقة وطيئة وأفكار مضادة للخير، أوجب حدوثهم تعفنُ بخارات ظلمانية، هم الشياطين، لا يزالون يسعون في أضداد ما سعت الملائكة فيه، والله أعلم.

ترجمہ: اور ان لوگوں کے مقابلہ میں دوسرے لوگ ہیں جو گھٹیا پن والے اور برے خیالات والے اور خیر کے برخلاف

سوچ وچار والے: ان کے پیدا ہونے کو واجب جانا ہے تاریک تقاضوں کی سزا اللہ نے بھی شیاطین ہیں، برابر کوشش کرتے ہیں دونوں کاموں کے برخلاف کاموں میں جن میں فرشتے کوشش کرتے ہیں واللہ اعلم۔

لغات: لَطُفَ: باریک ہونا، خود نقش میں ہو یا جسم میں یا عمل میں، یہاں اول مراد ہے۔ طَیش: ہلکا پن، اوچھا پن۔

نوٹ: اس باب میں شاہ صاحب قدس سرہ نے بعض باتیں وجدانی بیان کی ہیں، یعنی شاہ صاحب کیا سمجھتے ہیں، نصوص سے ان کے دلائل ملنا مشکل ہیں۔

باب — ۴

سنت الٰہی کا بیان

سورۃ الاحزاب آیت ۶۲ میں، سورۃ فاطر آیت ۴۳ میں اور سورۃ الفتح آیت ۲۳ میں ارشاد پاک ہے: وَلَن تَجِدَ لِسُنَّةِ اللَّهِ تَبْدِيلًا (اور آپ دستورِ خداوندی میں ردوبدل نہ پائیں گے) ان آیات میں جس سنت الٰہیہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے[1] اس باب میں اس کی وضاحت کی جارہی ہے۔ پیش نظر رہے کہ اس باب میں صرف "سنت الٰہیہ" کا بیان ہے، اس کے غیر متبدل ہونے کا بیان نہیں۔

جاننا چاہئے کہ جہان میں جو کچھ ہورہا ہے، وہ سب اللہ تعالیٰ کے کام ہیں، مگر سب کام اللہ تعالیٰ براہ راست نہیں کرتے۔ اللہ کے کچھ کام اشیائے عالم میں رکھی ہوئی صلاحیتوں پر متفرع ہوتے ہیں۔ یعنی سبب میں اللہ تعالیٰ نے تاثیرات رکھ دی ہیں، اور انہی تاثیرات سے مسببات وجود میں آتے ہیں۔ جیسے ہم کھاتے ہیں تو شکم سیر ہوتے ہیں، پیتے ہیں تو سیراب ہوتے ہیں۔ یہ کھانے پانی میں اللہ کی رکھی ہوئی صلاحیت کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ رہی یہ بات کہ اشیاء میں رکھی ہوئی صلاحیتوں پر اللہ کے کام کیسے مرتب ہوتے ہیں؟ تو اس کی تفصیل ضروری نہیں، اس کی جو بھی شکل ہو، بہر حال ترتب ان پر ہوتا ہے۔

یہ اسباب پر متفرع ہونے والے کام بھی حقیقت میں اللہ ہی کے کام ہیں، کھانے کے بعد وہی شکم سیر کرتے ہیں، پینے کے بعد وہی سیراب کرتے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے قوم کے سامنے اللہ رب العالمین کا تعارف اس

---

[1] نص کا جو مقصودی مضمون یا مرکزی نقطہ ہوتا ہے وہ عبارۃ النص کہلاتا ہے۔ ان آیات کا مقصودی مضمون یہ ہے کہ قانونِ قدرت ہمیشہ یکساں رہتا ہے، اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی اور نص کے کسی لفظ کے لغوی معنی سے یا عرفی معنی سے یا لازمی معنی کے طور پر جو بات سمجھی جائے وہ اشارۃ النص کہلاتی ہے۔ چنانچہ ان آیات میں جو "سنت اللہ" کا لفظ آیا ہے اس سے یہ مضمون سمجھایا گیا ہے کہ کوئی قانونِ قدرت بھی ہے، اس کا اس باب میں ذکر ہے۔

طرح کرایا ہے ﴿وَالَّذِي هُوَ يُطْعِمُنِي وَيَسْقِينِ﴾ (اور وہ جو مجھ کو کھلاتا ہے اور پلاتا ہے) ﴿وَإِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِينِ﴾ (اور جب میں بیمار پڑتا ہوں تو وہ مجھ کو شفا دیتا ہے) (سورۃ الشعراء آیات ۸۰، ۷۹)

اور مذکورہ بات دلائل عقلیہ اور نقلیہ دونوں سے ثابت ہے:

دلائل نقلیہ: (۱) رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو مٹی کی ایک ایسی مٹھی سے پیدا کیا ہے جس کو اللہ نے پوری زمین سے بھرا ہے، پس اولاد آدم مٹی کے مطابق وجود میں آئی ہے، کوئی ان میں سرخ ہے، کوئی سفید، کوئی سیاہ اور کوئی بیچ بیچ اور کوئی ان میں سے نرم خو ہے اور کوئی سخت خو اور کوئی ناپاک (گندہ) ہے اور کوئی ستھرا (احمد، ترمذی، ابوداؤد، مشکوۃ باب الایمان بالقدر، حدیث ۱۰۰)

اس حدیث میں یہ بیان ہے کہ انسانوں میں رنگ کا ظاہری تفاوت اور اخلاق کا باطنی تفاوت ان کے خمیر میں رکھی ہوئی صلاحیتوں کے تفاوت کی بنیاد پر ہے۔ اللہ نے مٹی میں مختلف صلاحیتیں رکھی ہیں، جن کی بنیاد پر انسانوں میں ظاہری اور باطنی تفاوت رونما ہوتا ہے۔

(۲) حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے دریافت کیا کہ بچہ کبھی باپ کے مشابہ ہوتا ہے کبھی ماں کے، ایسا کیوں ہوتا ہے؟ آپ نے فرمایا: جب مرد کا پانی عورت کے پانی پر سبقت کرتا ہے تو مرد مشابہت کھینچ لیتا ہے اور جب عورت کا پانی مرد کے پانی پر سبقت کرتا ہے تو عورت مشابہت کھینچ لیتی ہے (بخاری شریف، فضائل الانصار، باب ۵۱ فتح الباری ۷: ۲۷۲ مشکوۃ باب المعجزات فصل اول حدیث ۵۸۷۰)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ددھیالی اور ننھیالی مشابہت کا مدار مرد وزن کے مادوں کی کیفیت کے غلبہ پر ہے، جس کا مادہ قوی ہوتا ہے اس کی طرف مشابہت کھنچ جاتی ہے پس یہ مشابہت بھی مادہ میں رکھی ہوئی صلاحیت پر متفرع ہوتی ہے۔

اور دلیل عقلی یہ ہے کہ مقتول کی موت کو ہر کوئی تلوار کی مار اور بندوق کی گولی کی طرف اور خودکشی کرنے والے کی موت کو زہر کھانے کی طرف منسوب کرتا ہے حالانکہ مارنے والے اللہ تعالیٰ ہیں، لوگ یہ نسبت محض سبب پر مسبب کے ترتب کی وجہ سے کرتے ہیں سب جانتے ہیں کہ اللہ نے تلوار، گولی اور زہر میں مار ڈالنے کی صلاحیت رکھی ہے پس تلوار وغیرہ کا مارنا بھی درحقیقت اللہ کا مارنا ہے۔

اسی طرح یہ بات بھی ہر شخص جانتا ہے کہ مادہ شکم میں مادہ پہنچنے کے بعد ہی بچہ پیدا ہوتا ہے اور بوائی، بیج جمائی اور سینچائی کے بعد ہی غلہ اور درخت پیدا ہوتے ہیں، حالانکہ یہ سب کام اللہ کے ہیں، اور اللہ تعالیٰ اسباب کے محتاج نہیں، مگر اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت بالغہ سے اشیائے عالم میں تاثیرات رکھدی ہیں اور کچھ چیزوں کو اسباب ومسببات کی زنجیر میں جکڑ دیا ہے، اس لئے وہ چیزیں اشیائے عالم میں رکھی ہوئی صلاحیتوں پر متفرع ہوتی ہیں اور اسباب ومسببات کے دائرہ میں وجود پذیر ہوتی ہیں۔

اور کسی کو نہیں پاتا جس کو اس امر میں تردد ہو کہ قتل کی نسبت تلوار کی مار کی طرف ہوتی ہے، نہ پیٹ بھرنے کی طرف ہوتی ہے اور نہ اس بات میں کسی کو تردد ہے کہ رحم کے اندر بچے کی تخلیق منی پڑنے کے بعد ہوتی ہے اور نہ اس بات میں کسی کو شک ہے کہ غلہ اور درختوں کی پیداوار بوائی، بیج پاشی اور سینچائی سے ہوتی ہے۔

اور اسی استطاعت (صلاحیت) کی بناء پر تکلیف شرعی آتی ہے اور اسی پر حکم دیئے گئے ہیں اور روکے گئے ہیں اور نیک و بد کی جزاء و سزا دیئے جائیں گے۔

☆ ☆ ☆

کائنات میں چھ مکنون صلاحیتوں کا بیان

قدرت نے کائنات میں جو قوتیں اور صلاحیتیں ودیعت فرمائی ہیں، جن پر افعال الٰہی مرتب ہوتے ہیں، ان میں سے چند یہ ہیں:

اول: عناصر اربعہ میں سے ہر عنصر کی الگ ہیئت اور جدا خاصیت ہے، پس جس مرکب میں جو عناصر ہوں گے، اس میں ان عناصر کے خواص ضرور پائے جائیں گے۔ جیسے مفرد دوائیں الگ الگ خواص رکھتی ہیں، پس معجون مرکب میں مفردات کے خواص جمع ہوں گے۔

ہیئت اور ماہیت ما بہ الشیء ھو ھو کو کہتے ہیں یعنی جو چیز آگ کو آگ، پانی کو پانی، انسان کو انسان، اور گھوڑے کو گھوڑا بناتی ہے وہی اس کی ماہیت اور طبیعت ہے اور خاصہ وہ چیز ہے جو ماہیت سے خارج ہو اور ما بہ الامتیاز ہے، جیسے ضاحک انسان کا خاصہ ہے۔

آگ کی خصوصیت حرارت و احتراق ہے جب بھی آگ جلائی جائے گی وہ بلندی کی طرف جائے گی الا یہ کہ قسر قاسر سے اسے نیچے موڑ دیا جائے۔ اور پانی کی خصوصیت برودت اور بہنا ہے، پانی تا بحد امکان پھیلتا ہی چلا جاتا ہے الا یہ کہ آڑ بنا کر روک دیا جائے۔ اور ہوا کا خاصہ برودت و لطافت ہے، ہوا ہر خالی جگہ کو بھر دیتی ہے۔ حکماء خلا محال مانتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ ہر مکان بھرا ہوا ہے، اگر کسی چیز نے نہیں بھرا تو ہوا نے اس کو بھر رکھا ہے۔ اور مٹی کا خاصہ ثقل و امساک ہے، زمین میں جو بھی چیز دبادی جاتی ہے زمین اس کو روک رکھتی ہے، پس قیامت کے دن ہی وہ پیٹ کو جھٹک دے گی۔ غرض عناصر کی یہ ہیئات و خواص کائنات میں رکھی ہوئی مکنون صلاحیتیں ہیں، مرکبات میں ان کا پایا جانا ضروری ہے۔

دوم: جسم طبعی میں ہیولیٰ اور صورت جسمیہ کے علاوہ ایک جوہری جز اور بھی ہوتا ہے، جس کی وجہ سے اجسام طبعیہ نوع

بہ انواع تقسیم ہوتے ہیں، یعنی جو ہری جز «صورت نوعیہ» کہلاتا ہے، جیسے جسم کی انواع حیوانات، نباتات اور جمادات ہیں پھر ہر ایک کی انواع ہیں، یہ سب تقسیم صورت نوعیہ کا کرشمہ ہے، مثلاً آسمان، زمین اور انسان اور فرس وبقر جس چیز کی وجہ سے ایک دوسرے سے ممتاز ہوتے ہیں وہ ان کی صور نوعیہ ہیں، اور ہر صورت نوعیہ کے الگ احکام ہیں، جس کی تفصیل آگے باب ذکر شیئ من اسرار الوقائع العشریہ (رحمۃ اللہ ۳۹۹) میں آرہی ہے۔ یہ صور نوعیہ اور ان کے احکام بھی کائنات میں رکھی ہوئی مکنون صلاحیتیں ہیں۔ ہر نوع میں اس کے نوعی احکام ضرور پائے جاتے ہیں، وہ اس سے منفک نہیں ہوسکتے۔

سوم: عالم مثال کا تذکرہ پہلے آچکا ہے، زمینی وجود سے پہلے اشیا کا عالم مثال میں وجود ہوتا ہے، پھر وہ چیزیں زمین میں موجود ہوتی ہیں۔ اس لئے اُس عالم کے احوال اور وہاں کے وجود کے خواص بھی قوی (صلاحیتوں) میں داخل ہیں مثلاً یورپ کا کوئی شخص ایشیا میں آئے، یا اس کا برعکس ہو تو سابقہ بر اعظم کے خصوص احوال فوراً بدلنے سے ختم نہیں ہوتے، بلکہ کچھ نہ کچھ باقی رہتے ہیں۔

چہارم: ملأ اعلیٰ کی دعائیں بھی مکنون صلاحیتیں ہیں۔ ملأ اعلیٰ نفوس قدسیہ سے تمام مصلحین قوم وملت کے لئے نیک دعائیں کرتے ہیں اور جو لوگ قوم وملت کی اصلاح کی راہ میں روڑا بنتے ہیں اور دنیا میں شر وفساد پھیلاتے ہیں ان کے لئے بددعائیں کرتے ہیں۔ یہ بھلی بری دعائیں بھی مکنون صلاحیتیں ہیں، جیسے کوئی شخص خوش حال ہوتا ہے یا بڑا مرتبہ پاتا ہے تو لوگ کہتے ہیں کہ اس کے ماں باپ کی یا استاذ کی دعائیں اس کے شامل حال ہیں، اسی طرح ملأ اعلیٰ کی دعائیں بھی اشیائے عالم پر اثر انداز ہوتی ہیں۔

پنجم: مختلف زمانوں میں جو مختلف شریعتیں نازل ہوئی ہیں، جن میں کچھ چیزیں ضروری اور کچھ چیزیں حرام قرار دی گئی ہیں ان کا بھی جزاو سزا میں دخل ہے، مثلاً آدم علیہ السلام کی شریعت میں بہن سے نکاح جائز تھا اور یوسف علیہ السلام کی شریعت میں سجدۂ تحیہ درست تھا اس لئے ان پر کوئی مؤاخذہ نہیں تھا۔ اب یہ دونوں کام حرام ہیں، پس وہ باعث عقاب ہیں۔ غرض یہ بھی اعمال میں ودیعت کی ہوئی صلاحیتیں ہیں، پہلے مباح ہونے کی وجہ سے ان اعمال میں سزا کی صلاحیت نہیں تھی اور اب حرام قرار دینے کے بعد ان میں عقاب کی صلاحیت پیدا ہوگئی۔

ششم: دو چیزوں میں تلازم بھی قوی (صلاحیتوں) میں شمار ہوتا ہے۔ مثلاً طلوع شمس اور وجود نہار میں تلازم ہے، پس جب بھی ملزوم (طلوع شمس) پایا جائے گا تو لازم (نہار) ضرور پایا جائے گا، کیونکہ جب قدرت نے ان دو چیزوں میں لزوم کا تعلق رکھا ہے تو اب اس نظام کو درہم برہم کرنا قرین مصلحت نہیں۔

حدیث میں ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کے لئے کسی سرزمین میں موت کا فیصلہ کرتے ہیں تو وہاں پہنچنے کی کوئی نہ کوئی صورت پیدا کردیتے ہیں (رواہ احمد والترمذی، مشکوٰۃ باب الایمان بالقدر حدیث ۱۱۰) کیونکہ وہاں مرنے اور وہاں پہنچنے کے درمیان تلازم ہے، پس اس کے تحقق کی کوئی نہ کوئی صورت ضرور پیدا کردی جاتی ہے۔

اور ان میں سے ایک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی بات کا فیصلہ فرماتے ہیں، جس کا مقتضی یہ ہے کہ دو چیزیں دوسری چیز کا سبب بنے کہ وہ دوسری چیز پہلی چیز کے لئے دستورِ خداوندی میں لازم ہے، اور لزوم کے تقاضے میں سے رخ کرنا یعنی وہم پر جزم کرنا پیدا کیں۔ اور اس کی دلیل آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے کہ: ”جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کے لئے کسی سرزمین میں موت کا فیصلہ کرتے ہیں تو اس کے لئے اس زمین کی طرف کوئی ضرورت پیدا کر دیتے ہیں“۔

غرض یہ سب باتیں روایات میں وارد ہوئی ہیں اور بداہتِ عقل نے ان کو ثابت کیا ہے۔

☆ ☆ ☆

تعارضِ اسباب اور وجہِ ترجیح

جب ان اسباب میں تعارض ہوتا ہے، جن پر حسبِ عادت فیضِ خداوندی مرتب ہوتا ہے یعنی مسببات وجود میں آتے ہیں، اور تمام اسباب کے تقاضوں کا یعنی مسببات کا پایا جانا ممکن نہیں ہوتا تو حکمتِ خداوندی اس سبب کو ترجیح دیتی ہے جو خیرِ کلی یعنی مفادِ عامہ سے زیادہ ہم آہنگ ہوتا ہے یعنی جس سبب کا پایا جانا قرینِ مصلحت ہوتا ہے اس کو وجود بخشا جاتا ہے۔

متفق علیہ حدیث ہے کہ اللہ کے ہاتھ میں ترازو ہے، وہ پلڑے کو بلند بھی کرتے ہیں اور جھکاتے بھی ہیں (ترغیب وترہیب ۲:۴۰، فتح ۱۳:۲۸۳) اس میں لفظ میزان سے یہی بات مراد ہے کہ بوقتِ تعارضِ اسباب اللہ تعالیٰ نافع تر سبب کو بروئے کار لاتے ہیں اور دیگر اسباب کا عمل موقوف کرتے ہیں۔ سورۃ الرحمٰن میں جو آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر وقت کسی نہ کسی کام میں رہتے ہیں اس کلام سے بھی مراد یہ ہے کہ بوقتِ تعارضِ اسباب اللہ تعالیٰ بعض اسباب کو بعض پر ترجیح دیتے ہیں۔

پھر ترجیح مختلف وجوہ سے دی جاتی ہے: کبھی قوتِ سبب کی بنا پر ترجیح دی جاتی ہے، یعنی متعارض اسباب میں سے جو سبب قوی ہوتا ہے اس کو کام کرنے کا موقع دیا جاتا ہے۔ اور کبھی آثار کو ملحوظ رکھ کر ترجیح دی جاتی ہے یعنی جس سبب کے آثار و نتائج مفید ہوتے ہیں اس کو بروئے کار لایا جاتا ہے۔ اور کبھی صفتِ تدبیر کا عمل موقوف کر کے صفتِ خلق کام کرتی ہے جیسے ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈال دیا گیا، آگ کا کام جلانا ہے، اللہ کی صفتِ تدبیر نے اس شان پر تدبیر کی ہے مگر ملائکہ کی دعائیں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے شاملِ حال تھیں، ان دعاؤں کا تقاضا تھا کہ آگ نہ جلائے، چنانچہ صفتِ تدبیر کا عمل موقوف کر کے صفتِ خلق نے آگ کو خلیل کے لئے بے ضرر بنا دیا۔

اس قسم کی اور بھی وجوہِ ترجیح ہیں، ہم تمام اسباب کا احاطہ نہیں کر سکتے، نہ ہم بوقتِ تعارض اولیٰ (زیادہ حقدار سبب) کو پہچان سکتے ہیں، البتہ اتنی بات ہم یقین سے جانتے ہیں کہ جو چیز موجود ہوتی ہے وہ موجود ہونے ہی کے لائق ہوتی ہے۔ جو ان باتوں کا پتہ یقین کرے گا اس کا بہت سے اشکالات سے پیچھا چھوٹ جائے گا۔

واعلم أنه إذا تعارضت الأسباب التي يترتب عليها القضاء بحسب جري العادة، ولم يمكن وجود مقتضياتها أجمع، كانت الحكمة حينئذ مراعاة أقرب الأشياء إلى الخير المطلق، وهذا هو المعبَّر عنه بالميزان في قوله صلى الله عليه وسلم: «بيده الميزان، يرفع القسط ويخفضه» وبالشأن في قوله تعالى: ﴿كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ﴾

ثم الترجيح يكون تارةً بحال الأسباب، أيُّها أقوى؟ وتارة بحال الآثار المترتبة، أيها أنفع؟ وبتقديم باب الخلق على باب التدبير، ونحو ذلك من الوجوه؛ فنحن وإن قصر علمنا عن إحاطة الأسباب، ومعرفة الأحق عند تعارضها، نعلم قطعًا: أنه لا يوجد شيء إلا وهو أحق بأن يوجد، ومن أيقن بما ذكرنا استراح عن إشكالات كثيرة.

ترجمہ: اور جان لیجئے کہ جب ان اسباب میں تعارض ہوجاتا ہے جن پر فیصلہ خداوندی مرتب ہوتا ہے، عادت جاری ہونے کے اعتبار سے، اور تمام اسباب کے تقاضوں کا پایا جانا ممکن نہیں ہوتا، تو حکمت اس وقت خیر کامل (یعنی مفاد عالم) سے نزدیک تر چیز کی رعایت کرنا ہے۔ اور یہی وہ حقیقت ہے جس کو میزان سے تعبیر کیا گیا ہے آنحضور ﷺ کے اس ارشاد میں کہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ترازو ہے، کبھی پلڑا اٹھاتے ہیں اور کبھی جھکاتے ہیں، اور اسی کو "اہم کام" سے تعبیر کیا ہے ارشاد باری ﴿كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ﴾ (الرحمٰن آیت ۲۹) میں۔

پھر ترجیح کبھی ہوتی ہے اسباب کی حالت دیکھ کر کہ ان میں سے کون قوی تر ہے؟ اور کبھی سبب پر مرتب ہونے والے آثار (مسببات) کی حالت دیکھ کر کہ ان میں سے کون مفید تر ہے؟ اور (کبھی) صفت خلق کی کارفرمائی کو صفت تدبیر کی کارفرمائی پر مقدم کرکے۔ اور اسی قسم کے دیگر وجوہ ترجیح سے۔ پس اگرچہ ہمارا علم کوتاہ ہے اسباب کا احاطہ کرنے سے، اور اسباب کے تعارض کے وقت احق (زیادہ حقدار) کو پہچاننے سے، (مگر ہم) یقینی طور پر ہم جانتے ہیں کہ نہیں پائی جاتی کوئی چیز مگر وہ پائے جانے کی زیادہ حقدار ہوتی ہے۔ اور جو شخص مذکورہ باتوں کا یقین کرلے وہ بہت سے اشکالات سے آرام پاجائے گا۔

☆ ☆ ☆

علویات کے سفلیات پر اثرات

(کواکب کی تاثیر کا بیان)

اوپر یہ بات آئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اشیائے کائنات میں صلاحیتیں ودیعت فرمائی ہیں اور سبب میں تاثیرات

رکھی ہیں۔ اب اسی سلسلہ میں پیدا ہونے والے ایک سوال کا جواب دیا جاتا ہے۔

سوال: کیا کواکب کی شکلوں (عقرب، جدی، دلو، حوت، میزان، ثریا، حمل وغیرہ) میں اللہ تعالیٰ نے سفلیات پر اثر انداز ہونے کی صلاحیتیں رکھی ہیں؟ علم نجوم والے اس کے قائل ہیں، شریعت اس سلسلہ میں کیا کہتی ہے؟

جواب: کواکب کی بعض تاثیرات ہو سکتی ہیں، مثلاً سورج کے احوال کے اختلاف سے سردی گرمی کے موسموں کا بدلنا اور دن کا چھوٹا بڑا ہونا اور چاند کی کشش کی وجہ سے سمندر میں جوار بھاٹا اٹھنا وغیرہ۔ اور حدیث میں آیا ہے کہ (حقیقت کیا یہ ہے کہ) جب ثریا ستارہ طلوع ہوتا ہے تو کھجوروں کی بیماریاں ختم ہو جاتی ہیں (رواہ احمد، کنز العمال حدیث نمبر ۲۱۰۱۴ منتخب کنز ۱۰۰) اس حدیث سے ثابت ہوا کہ ثریا ستارے کے سفلیات پر اثرات پڑتے ہیں۔

رہی یہ بات کہ مالداری اور غریبی، خوش حالی اور خشک سالی اور دیگر انسانی واقعات پر کواکب کی حرکتوں کے اثرات پڑتے ہیں یا نہیں؟ تو یہ بات نہ ثابت ہو سکی ہے، نہ عقل ونقل سے ثابت ہے اور ہمیں اس میں غور کرنے سے منع بھی کیا گیا ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ ”جس نے علم نجوم کا کوئی حصہ حاصل کیا اس نے جادو کا حصہ حاصل کیا، اور جس نے زیادہ حاصل کیا اس نے اتنا ہی زیادہ جادو سیکھا“ (احمد، ابوداؤد، ابن ماجہ، مشکوٰۃ باب الکہانۃ حدیث ۴۵۹۸) یعنی جس طرح سحر سیکھنا حرام ہے، علم نجوم سیکھنا بھی حرام ہے۔ اور جو لوگ بارش ہونے کو ستاروں کی طرف منسوب کرتے ہیں حدیث متفق علیہ میں ان پر سخت نکیر آئی ہے (مشکوٰۃ باب الکہانۃ حدیث ۴۵۹۶)

سوال: تو کیا ہم یہ بات سمجھنے میں حق بجانب ہیں کہ علویات کے اس قسم کے اثرات سفلیات پر نہیں پڑتے؟ اس لئے علم نجوم کی تحصیل سے روکا گیا ہے اور [illegible] والوں پر نکیر آئی ہے۔

جواب: نہیں، میں یہ بھی نہیں کہتا کہ شریعت میں کواکب کی اس قسم کی تاثیرات کی صراحۃً نفی آئی ہے۔ ممکن ہے اللہ تعالیٰ نے ستاروں میں ایسی خصوصیت رکھی ہو کہ وہ زمینی واقعات کو متاثر کرتے ہوں اور اس کی شکل یہ ہوتی ہو کہ ستاروں کے اثرات اولاً ان کے ماحول (اردگرد) پر پڑتے ہوں، پھر رفتہ رفتہ ہوا کے توسط سے یہ اثرات سفلیات تک پہنچتے ہوں اور زمینی واقعات کو متاثر کرتے ہوں، جیسے عطریات اور گندگیاں پہلے اپنے اردگرد کی ہوا کو متاثر کرتی ہیں، پھر وہ اثرات رفتہ رفتہ دور تک پھیل جاتے ہیں۔

سوال: اگر کواکب میں اس قسم کے اثرات ہیں یا ہو سکتے ہیں تو پھر شریعت نے علم نجوم کی تحصیل سے کیوں روکا ہے؟ اس صورت میں تو علم نجوم کی تحصیل جائز ہونی چاہئے تاکہ اس کے ذریعہ جلب منفعت یا دفع مضرت کیا جا سکے، نیز حدیث تو اس پر صاف دلالت کرتی ہے کہ علویات میں اس قسم کے اثرات نہیں ہیں۔

جواب: ممانعت کی وجوہ تو اور بھی ہو سکتی ہیں، مثلاً:

① شریعت نے کہانت (جنات سے خبریں لے کر بتانے) سے سختی سے روکا ہے۔ مسلم شریف میں حدیث ہے کہ

حضرت معاویہ بن الحکم رضی اللہ عنہ نے دریافت کیا کہ ہم زمانۂ جاہلیت میں چند کام کرتے تھے، ہم کاہنوں کے پاس جاتے تھے؟ آپ نے فرمایا کہ: فلا تأتوا الکہان (اب کاہنوں کے پاس مت جایا کرو) (مشکوۃ باب الکہانۃ حدیث ۴۵۹۲)

اور جو کاہن کے پاس جاتا ہے اور اس سے غیب کی باتیں پوچھتا ہے، پھر وہ جو بتاتا ہے اس کو سچا مانتا ہے تو آپ نے اس شخص سے بے تعلقی کا اعلان فرمایا ہے (احمد، ابوداؤد، ترمذی، مشکوۃ باب الکہانۃ حدیث ۴۵۹۹)

مگر جب آپ سے کاہنوں کے بارے میں دریافت کیا گیا تو آپ نے بتلایا کہ فرشتے بادلوں میں اترتے ہیں اور وہ آسمانوں میں جو معاملہ طے پاتا ہے اس کو چرچا کرتے ہیں، شیاطین وہاں سے کوئی بات چرا لاتے ہیں اور جس کاہن کے کان ہوتے ہیں اس کو وہ ادھوری بات پہنچا دیتے ہیں۔ کاہن اس میں سو جھوٹ ملا کر بات مکمل کرتا ہے اور پیشین گوئی کرتا ہے، جب وہ ایک بات صحیح نکلتی ہے تو لوگ اس کے گرویدہ ہو جاتے ہیں، مگر نہیں سوچتے کہ اس کی بتائی ہوئی ننانوے باتیں تو جھوٹی نکلیں (رواہ البخاری، مشکوۃ باب الکہانۃ حدیث ۴۵۹۳ و ۴۶۰۰)

اس روایت سے معلوم ہوا کہ کاہنوں کی بعض باتیں صحیح ہوتی ہیں، تاہم کہانت سیکھنے سے، اس پر عمل کرنے سے اور اس سے فائدہ اٹھانے سے منع کیا گیا۔ حدیث میں ہے کہ جو عراف کے پاس گیا اور اس سے کوئی بات معلوم کی تو اس کی چالیس دن کی نماز قبول نہیں کی جائے گی (رواہ مسلم، مشکوۃ حدیث ۴۵۹۵) یہی ممکن ہے کہ کواکب میں بھی تاثیرات ہوں مگر کسی مصلحت سے شریعت نے علم نجوم پڑھنے سے اور کواکب کی طرف نسبت کرنے سے منع کیا ہو۔

(۲) سورۂ آل عمران آیت ۱۵۶ میں مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ منافقین جیسی باتیں نہ کریں۔ منافقین اپنے بھائی بندوں سے کہتے تھے، جبکہ وہ کسی سرزمین میں سفر کرتے تھے، یا جہاد کے لئے نکلتے تھے کہ: "اگر وہ ہمارے پاس رہتے تو نہ مرتے اور نہ مارے جاتے" حالانکہ یہ بات بذاتِ خود ممنوع نہیں، لوگ اس قسم کی بات کہا ہی کرتے ہیں، جب کوئی شخص خطرے کے کام میں پیش قدمی کرتا ہے تو اس کے متعلقین اس کو سمجھاتے ہیں کہ بھئی! احتیاط کرو، یہ خطرے کا کام مت کرو، مگر جب وہ نہیں مانتا اور نقصان میں پڑ جاتا ہے تو لوگ کہا کرتے ہیں کہ ہماری نہیں مانی، اسی لئے یہ نوبت آئی۔

غرض اس قسم کی باتیں ممنوع نہیں، مگر منافقین اس قسم کی باتیں اہل ایمان کو جہاد سے روکنے کے لئے اور ان میں بزدلی پیدا کرنے کے لئے کہا کرتے تھے، اس لئے اہل ایمان کو اس قسم کی باتیں کہنے سے منع کیا گیا۔

(۳) اور متفق علیہ حدیث میں ہے کہ کسی کو بھی عمل اس کو جنت میں نہیں لے جائے گا، جو بھی جنت میں جائے گا فضلِ باری سے جائے گا (فتح ۱۰: ۱۲۱، مسلم کتاب صفات المنافقین ۱۷: ۱۶۱) حالانکہ آدمی اعمال صالحہ حصول جنت ہی کے لئے کرتا ہے اور قرآن کریم بار بار کہتا ہے کہ اعمالِ صالحہ کی جزاء جنت ہے، پس اس حدیث کا مقصد صرف یہ بتانا ہے کہ دخول جنت کا حقیقی سبب فضل الٰہی ہے اور اعمال محض ظاہری سبب ہیں۔

(۴) حضرت ابو رمثہ رضی اللہ عنہ کے والد نے مہر نبوت دیکھ کر عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میں حکیم ہوں، آپ کے اس

چھوڑنے کا علاج کر سکتا ہوں، آپ نے فرمایا: "تم ہمدرد ہو، اور اللہ حکیم ہیں" (مشکوٰۃ کتاب القصاص، حدیث ۳۴۷۱ مسند احمد ۴:
۱۶۳) یعنی دوا دینا یا علاج کرنے والے کو حکیم (ڈاکٹر) کہہ سکتے ہیں، اس حدیث میں جو نفی ہے وہ کمالِ ذات سے ہے۔

خلاصہ یہ کہ کسی ایک امر اتفاقی سے بربنائے مصلحت روکا جاتا ہے، پس ممکن ہے علم نجوم حاصل کرنے کی ممانعت بھی اسی قبیل سے ہو، اس ممانعت سے کواکب کی تاثیر کی نفی نہیں ہوتی، واللہ اعلم بالصواب (تفصیل کے لئے رحمۃ اللہ ۱: ۳۲۲ دیکھیں)

أما هيئات الكواكب: فمن تأثيرها ما يكون ضروريا، كاختلاف الصيف والشتاء، وطول النهار وقصره باختلاف أحوال الشمس، وكاختلاف الجزر والمد باختلاف أحوال القمر. وجاء في الحديث: ﴿إذا طلع النجم رُفعت العاهة﴾ يعني بحسب جري العادة.

لكن كون الفقر والغنى، والجدب والخصب، وسائر حوادث البشر بسبب حركات الكواكب: فمما لم يثبت في الشرع؛ وقد نهى النبي صلى الله عليه وسلم عن الخوض في ذلك، فقال: ﴿من اقتبس شعبة من النجوم اقتبس شعبة من السحر﴾ وشدَّد في قول: "مُطِرنا بنوء كذا"

ولا أقول: نفت الشريعة عني أن الله تعالى لم يجعل في النجوم خواص تتولد منها الحوادث، بواسطة تغيُّر الهواء المُكْتَنِفِ بالناس، ونحو ذلك.

وأنت خبير بأن النبي صلى الله عليه وسلم نهى عن الكهانة، وهي الإخبار عن الجن، ونهى عمن أتى كاهنا وصدَّقه، ثم لما سُئل عن حال الكهان، أخبر بأن الملائكة تنزل في العنان، فتذكر الأمر الذي قُضي في السماء، فتسترق الشياطين السمع، فتوحيه إلى الكهان، فيكذبون معها مائة كذبة؛ وأن الله تعالى قال: ﴿يا أيها الذين آمنوا لا تكونوا كالذين كفروا، وقالوا لإخوانهم إذا ضربوا في الأرض، أو كانوا غُزًّا: لو كانوا عندنا ما ماتوا وما قُتلوا﴾ وقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: ﴿لن يُدخل أحدكم الجنة عمله﴾؛ وقال: ﴿إنما أنت رفيق، والطبيبُ الله﴾ وبالجملة فالنهي يدور على مصالح كثيرة، والله أعلم.

ترجمہ: رہی ستاروں کی شکلیں: تو ان کی تاثیرات میں سے بعض وہ ہیں جو بدیہی ہیں۔ جیسے جاڑے گرمی کا اختلاف، اور دن کا لمبا مختصر ہونا سورج کے احوال کے اختلاف سے۔ اور جیسے سمندر کے مد و جزر کا اختلاف چاند کے احوال کے اختلاف سے۔ اور حدیث میں آیا ہے کہ: "جب ثریا ستارہ طلوع ہوتا ہے (یعنی صبح صادق کے وقت نظر آتا ہے) تو (پھلوں کی) بیماریاں ختم ہو جاتی ہیں" یعنی سنت الٰہی اسی طرح چل رہی ہے۔

البتہ غریبی اور مالداری اور قحط سالی اور خوش حالی اور دیگر انسانی واقعات کا ستاروں کی حرکت کی وجہ سے ہونا بھی

بیان باتوں میں سے ہے جو شریعت میں ثابت تھیں، اور نبی کریم ﷺ نے اس میں گھسنے سے منع کیا ہے، چنانچہ فرمایا ہے کہ: ''جس نے علم نجوم کا کوئی حصہ حاصل کیا، اس نے علم سحر کا ایک حصہ حاصل کیا'' اور یہ کہنے پر سخت نکیری کی ہے کہ: ''ہم فلاں پچھتر کی وجہ سے بارش دیئے گئے''

اور میں یہ نہیں کہتا کہ شریعت نے اس کی صراحت کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ستاروں میں ایسی تاثیرات نہیں رکھیں جن سے زمینی واقعات پیدا ہوں، اس ہوا میں تغیر واقع ہونے کے ذریعہ جو لوگوں کو گھیرے ہوئے ہے اور اس قسم کی کسی اور صورت سے۔

اور آپ خوب واقف ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے کہانت سے روکا ہے اور کاہنات بننے سے، یعنی ان کے پاس جانے سے ۔۔۔۔۔ اور بے تعلقی ظاہر فرمائی ہے اس شخص سے جو کاہن کے پاس جاتا ہے اور اس کی بات مانتا ہے، پھر جب آپ سے کاہنوں کے حوال دریافت کئے گئے تو بتلایا کہ فرشتے بادلوں میں اترتے ہیں، پس اس بات کا چرچا کرتے ہیں جو آسمان میں طے پائی ہے، پس شیطین بات چرا لیتے ہیں، پھر وہ بات کاہنوں کو پہنچا دیتے ہیں، پس وہ اس کے ساتھ سو جھوٹ ملاتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ ''اے ایمان والو! تم ان لوگوں کی طرح مت ہو جانا جو کہ کافر ہیں (یعنی دل میں) اور کہتے ہیں اپنے بھائیوں کی نسبت، جبکہ وہ لوگ کسی سرزمین میں سفر کرتے ہیں یا وہ لوگ کہیں غازی بنتے ہیں کہ اگر یہ لوگ ہمارے پاس رہتے تو نہ مرتے اور نہ مارے جاتے'' اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: ''ہرگز نہیں داخل کرے گا تم میں سے کسی کو بھی اس کا عمل جنت میں'' اور آپ نے فرمایا ہے: ''تم زمرہ بنا کر کرنے والے (یعنی ہمدرد) ہی ہو، اور حکیم تو اللہ پاک ہیں'' اور خلاصہ یہ ہے کہ مناسبت بہت کی مصلحتوں پر کھوئی گئی ہے۔ واللہ اعلم۔

فوائد

① جہاں اسباب و مسببات کے درمیان تعلق واضح ہو وہاں سبب کی طرف نسبت درست ہے، جیسے یہ کہنا درست ہے کہ فلاں طبیب سے علاج کرایا، اس سے مریض کو شفا ہوئی۔ اور جہاں تعلق مخفی ہو، عام لوگ اس کا ادراک نہ کر سکتے ہوں وہاں شریعت نسبت کی اجازت نہیں دیتی۔ کیونکہ اس سے شرک کا راستہ کھلتا ہے، پس یہ کہنا درست نہیں کہ فلاں ستارہ طلوع ہوا اس لئے ایسا ہوا، فلاں نچھتر نکلا اس لئے بارش ہوئی البتہ اگر کسی ستارہ کا اثر عام و خاص جانتے ہوں تو نسبت درست ہے جیسے یہ کہنا کہ سورج نکلا اس لئے گرمی شروع ہوئی، حدیث میں ثریا کے طلوع کی جو بات کہی گئی ہے وہ اسی قبیل سے ہے۔

اور اس کی نظیر یہ مسئلہ ہے کہ مامور عادیہ میں غیر اللہ سے استعانت درست ہے، کسی سے بھی کہہ سکتے ہیں کہ ذرا میرا یہ بوجھ میرے سر پر رکھ دو، کیونکہ اس سے کوئی خرابی پیدا نہیں ہوتی۔ مگر امور غیر عادیہ میں غیر اللہ سے استعانت حرام ہے۔ جیسے کسی پیر و لی سے اولاد مانگنا حرام ہے، کیونکہ اس سے شرک کا دروازہ کھلتا ہے۔

② حضرت ابو رزین رضی اللہ عنہ کے والد پہلی بار حاضر خدمت ہوئے تھے، اور ابھی انھوں نے ایمان قبول کیا تھا،

جب انھوں نے رسول اللہ ﷺ کی پشت پر مہر نبوت دیکھی تو انھوں نے اس کو پھوڑا سمجھا اور اس کا علاج کرنے کی اجازت چاہی، آنحضور ﷺ نے ان کی ہمدردی کی قدر کی اور یہ فرما کر بات ٹال دی کہ حقیقی معالج اللہ تعالیٰ ہیں۔

باب — ۵

روح کی حقیقت وماہیت کا بیان

روح کی حقیقت بیان کرنے سے پہلے رفع دخل مقدر کے طور پر دو باتوں کی وضاحت ضروری ہے:

① آیت کریمہ ﴿وَمَا أُوتِيتُمْ مِنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا﴾ سے معلوم ہوتا ہے کہ روح کی حقیقت نہیں سمجھی جاسکتی، کیونکہ ہر مسئلہ کو سمجھنے کے لئے ذہن کی ایک سطح اور علم کی ایک مقدار ضروری ہے، روح کا مسئلہ نہایت دقیق ہے، اس کو سمجھنے کے لئے جو علمی مستوی چاہئے وہ انسان کو حاصل نہیں، آیت کریمہ میں اسی کی نفی ہے، پھر یہ بحث کیوں چھیڑی جارہی ہے؟!

جواب یہ ہے کہ آیت میں خطاب یہود سے ہے، جنھوں نے روح کے متعلق سوال کیا تھا، ان کا علمی مستوی اتنا بلند نہیں تھا کہ وہ روح کی حقیقت سمجھ سکتے، اور اس کی دلیل امام سلیمان اعمش رحمہ اللہ کی قراءت ہے، جو وہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے نقل کرتے ہیں، ان کی قراءت میں ﴿وَمَا أُوتُوا﴾ ہے، اور مختلف قراءتیں بمنزلہ مختلف آیات کے ہوتی ہیں، اور قرآن، قرآن کی تفسیر کرتا ہے، پس ثابت ہوا کہ ﴿وَمَا أُوتِيتُمْ﴾ میں بھی خطاب یہود سے ہے، پس اس آیت سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ آنحضرت ﷺ کی امت کے پاس بھی وہ علمی سطح نہیں کہ وہ روح کی حقیقت سمجھ سکیں۔

فائدہ: مذکورہ قراءت بخاری شریف کتاب العلم باب (۴۷) حدیث ۱۲۵ میں ہے۔ مگر حافظ رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ یہ قراءت نہ تو سات قراءتوں میں سے ہے نہ اس کے علاوہ مشہور قراءتوں میں سے ہے (فتح ۱: ۲۲۴) یعنی یہ قراءت شاذہ ہے جس کا اعتبار نہیں، اور جمہور مفسرین خطاب کو عام رکھتے ہیں اور قرطبی رحمہ اللہ نے ایک مرفوع روایت بیان کی ہے جس میں صراحت ہے کہ آیت میں خطاب عام ہے (تفسیر قرطبی ۱۰: ۳۲۴)

(۲) دوسرا سوال یہ ہے کہ اگر روح کی حقیقت سمجھی جاسکتی ہے تو قرآن نے سکوت کیوں کیا؟ قرآن کریم کو روح کی حقیقت بیان کرنی چاہئے تھی، یہود نہ سمجھتے، امت محمدیہ تو سمجھتی!

اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن کریم جمہور (عام لوگوں) کی استعداد پیش نظر رکھ کر نازل کیا گیا ہے، قرآن کریم میں ایسے دقیق مضامین نہیں لئے گئے، جو عام لوگوں کے لئے معمہ بن جائیں، اور عام لوگ چونکہ روح کی حقیقت نہیں سمجھ سکتے اس لئے قرآن نے سکوت اختیار کیا، مگر یہ سکوت اس پر دلالت نہیں کرتا کہ روح کی حقیقت کوئی نہیں سمجھ سکتا۔

فائدہ: روح کے بارے میں جتنی بات بتلانی ضروری تھی، اور جو عام لوگوں کی سمجھ میں آسکتی تھی وہ قرآن کریم نے بتلادی ہے، اور روح کی تمام حقیقت اس لئے بیان نہیں کی گئی کہ وہ عوام کی سمجھ سے بالاتر ہے، اور اس کی ضرورت بھی نہیں،

کوئی دینی کام یا دنیوی معاملہ اس کی حقیقت سمجھنے پر موقوف نہیں۔

روح کے بارے میں آیت کریمہ میں بس اتنا بتلایا گیا ہے کہ وہ ایک چیز ہے، جو اللہ کے حکم سے بدن میں پیدا ہوتی ہے جس کی وجہ سے حیوان جی اٹھتا ہے۔ اور جب وہ چیز بدن سے نکل جاتی ہے تو جاندار مر جاتا ہے۔

اس کی مزید وضاحت یہ ہے کہ سورۃ الاعراف آیت ۵۴ میں فرمایا گیا ہے کہ ﴿أَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْأَمْرُ﴾ (سنو! خلق (پیدا کرنا) اور امر (حکم دینا) دونوں ہی اللہ کے لئے ہیں) اس آیت میں خلق کو امر کے مقابل رکھا گیا ہے۔ خلق: پیدا کرنے یعنی ڈھانچہ بنانے کا نام ہے۔ پھر حکم ہوتا ہے کہ ’’ہو جا‘‘ ﴿کُنْ﴾ پس وہ چیز ہو جاتی ہے۔

اب روح کی حقیقت یہ واضح ہوئی کہ وہ ایک غیر مادی چیز ہے، جس کو ’’وجود‘‘ سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔ جب کسی جاندار کا ڈھانچہ بن کر تیار ہو جاتا ہے ’’یعنی تخلیق کا کام مکمل ہو جاتا ہے تو اللہ کا حکم ہوتا ہے، جس سے اس ڈھانچہ میں ایک وجود پیدا ہو جاتا ہے۔ وہی روح ہے۔ اور جب وہ ’’وجود‘‘ اس ڈھانچے سے نکال لیا جاتا ہے تو اسی کا نام موت ہے۔

آیت کریمہ میں ﴿الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي﴾ کہہ کر یہی بات مختصر اور واضح انداز میں بیان کی گئی ہے۔ باقی تفصیلی گفتگو آگے آرہی ہے۔

﴿باب حقيقة الروح﴾

قال الله تعالى: ﴿وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الرُّوحِ قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي وَمَا أُوتِيتُمْ مِنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا﴾ وقرأ الأعمش من رواية ابن مسعود: ﴿وَمَا أُوتُوا مِنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا﴾ ويُعلم من هنالك: أن الخطاب لليهود السائلين عن الروح؛ وليست الآية نصًّا في أنه لا يَعلم أحد من الأمة المرحومة حقيقة الروح، كما يُظن؛ وليس كلُّ ما سكت عنه الشرع لا يمكن معرفته البتة، بل كثيرًا ما يسكت عنه لأجل أنه معرفة دقيقة، لا يصلح لتعاطيها جمهورُ الأمة، وإن أمكن لبعضهم.

ترجمہ: روح کی ماہیت کا بیان: اللہ پاک نے ارشاد فرمایا: ’’اور لوگ آپ سے روح کے متعلق پوچھتے ہیں؟ آپ جواب دیجئے کہ روح میرے رب کے حکم سے (ایک چیز) ہے اور تم کو بہت تھوڑا علم دیا گیا ہے‘‘ اور اعمش رحمہ اللہ نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت سے پڑھا ہے: ’’اور نہیں دئے گئے وہ (یعنی یہود) علم میں سے مگر تھوڑا‘‘ اور یہاں سے جانا گیا کہ خطاب اُن یہود سے ہے جنھوں نے روح کے بارے میں سوال کیا تھا۔ اور آیت صریح نہیں ہے اس بارے میں کہ امت مرحومہ میں سے کوئی بھی روح کی حقیقت نہیں سمجھ سکتا، جیسا کہ گمان کیا گیا ہے۔ اور یہ بات درست نہیں ہے کہ ’’جس بات سے بھی شریعت خاموشی اختیار کرے اس کا سمجھنا قطعاً ممکن نہیں‘‘ بلکہ بسا اوقات شریعت کسی بات سے خاموشی اس لئے اختیار کرتی ہے کہ وہ ایک باریک علم ہوتا ہے جس کی سمجھ عام امت کے بس کی بات نہیں

افعال درست ہوں گے۔

(۲) اگر بھاپ کے سرچشمہ پر کوئی آفت طاری ہوتی ہے اور بھاپ بننا بند ہوجاتی ہے یا کسی عضو پر کوئی آفت نازل ہوتی ہے اور اس عضو کی طرف بھاپ کی سپلائی بند ہوجاتی ہے تو انسان یا تو مرجاتا ہے یا وہ عضو بیکار ہوکر رہ جاتا ہے۔

(۳) اس اسٹیم کا بننا زندگی ہے اور اس کا تحلیل ہوجانا موت کہلاتا ہے۔

غرض سرسری نظر میں یہی بھاپ روح ہے، اور گہری نظر میں یہ روح کا نچلا درجہ ہے، اصل روح اس سے اوپر ہے جیسا کہ آگے آرہا ہے اور اسی روح کو نفس، روح ہوائی اور روح حیوانی بھی کہتے ہیں۔

واعلم أن الروح أولُ ما يُدرَك من حقيقتها: أنها مبدأ الحياة في الحيوان، وأنه يكون حيًّا بنفخ الروح فيه، ويكون ميّتًا بمفارقتها منه

ثم إذا أُمعن في التأمل يتجلى: أن في البدن بخارًا لطيفًا، متولّدًا في القلب من خلاصة الأخلاط، يحمل القُوى الحسّاسة، والمحرّكة، والمدبِّرة للغذاء، يجري فيه حكمُ الطب.

وتُكشف التجربة: أن لكيفيات هذا البخار: من رقته، وغلظه، وصفائه، وكدرته أثرًا خاصًّا في القُوى والأفاعيل المُنْبعثة من تلك القوى؛ وأن الآفة الطارئة على كل عضو، وعلى توليد البخار المناسب له، تُفسد هذا البخار، وتُشوِّش أفاعيله، ويستلزم تكوُّنه الحياة، وتحلّلُه الموت؛

فهو الروح في أول النظر، والطبقةُ السفلى من الروح في النظر المُمْعن؛ ومثله في البدن كمثل ماء الورد في الورد، وكمثل النار في الفحم

ترجمہ: اور جان لیجئے کہ روح کی حقیقت کے بارے میں سب سے پہلے جس چیز کا ادراک ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ روح جاندار میں سرچشمہ حیات ہے۔ اور یہ کہ جاندار زندہ ہوجاتا ہے اس میں روح پھونکنے سے، اور مردہ ہوجاتا ہے روح کے اس سے جدا ہونے سے۔

پھر جب مزید غور وفکر کیا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ بدن میں ایک لطیف بھاپ ہے، جو اخلاط کے خلاصہ سے دل میں پیدا ہوتی ہے، جو احساس کرنے والے، حرکت دینے والے اور غذا کا نظم وانتظام کرنے والے قویٰ (صلاحیتوں) کی حامل ہے، علم طب کے احکام اسی میں جاری ہوتے ہیں۔

اور تجربہ کھولتا ہے کہ اس بھاپ کے احوال یعنی پتلا ہونے اور گاڑھا ہونے اور صاف ہونے اور گدلا ہونے میں سے ہر ایک کے لئے مخصوص اثر ہے قویٰ میں، اور ان قویٰ سے پھوٹنے والے افعال میں، اور یہ کہ کسی بھی عضو پر اور اس کے مناسب بھاپ کی تولید پر پڑنے والی آفت اس بھاپ کو بگاڑ دیتی ہے اور اس کے افعال کو پراگندہ کردیتی ہے اور

اس کا پیدا ہونا زندگی کو اور اس کا تحلیل ہوجانا موت کو چاہتا ہے۔

پس وہ بھاپ اس سرسری نظر میں روح ہے اور گہری نظر میں روح کا نچلا درجہ ہے، اور بدن میں اس کا حلول عرق گلاب کی طرح ہے گلاب کے پھولوں میں، اور آگ کی طرح ہے انگاروں میں۔

لغات

تَعَمَّقَ فی کے ساتھ بھی مستعمل ہے اور بغیر فی کے بھی یعنی گہرا غور و فکر کیا۔ اسی معنی میں ہے: اَنْعَمَ النظرَ: اچھی طرح غور کیا   اِنْجَلٰی: ظاہر ہوا   خلاصۃ: ہر وہ چیز جو دوسری چیز میں سے خالص کر لی جائے۔ خلاصۃ الکلام: بات کا نچوڑ   الافاعیل جمع الجمع فعل کی   انبجس الماءُ: پانی جاری ہونا، بہنا   یستلزم الشیءُ: لازم سمجھا جانا۔

☆ ☆ ☆

اصل روح، روحِ ربانی ہے

مزید غور کرنے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اصل روح یہ نور لطیف یعنی نسمہ نہیں ہے، یہ تو اصل روح کی سواری ہے اور اس کا بدن سے تعلق جوڑتی ہے، جیسے گوند دو چیزوں کو جوڑتا ہے، اسی طرح نسمہ اصل روح کا جسم سے تعلق جوڑتی ہے۔ اصل روح، روحِ ربانی ہے، جو روحِ الٰہی، روحِ قدسی، روحِ فوقانی اور نفسِ ناطقہ بھی کہلاتی ہے، اور یہی روح کا اعلیٰ درجہ ہے۔

اور دلیل یہ ہے کہ جس طرح انسان بدن کا نام نہیں، اسی طرح نسمہ کا نام بھی نہیں، کیونکہ جس طرح بدن میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں اسی طرح نسمہ بھی بدلتا رہتا ہے، اور بدلنے والی چیز عین انسان نہیں ہوسکتی، کیونکہ وہ تو غیر متبدل حقیقت ہے۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ پہلے بیان کیا جاچکا ہے کہ زید بدن کا نام نہیں، بدن تو ایک لبادہ ہے جو روح نے اس عالمِ اجساد میں اوڑھ لیا ہے، کیونکہ بدن ہو یا نہ ہو زید بہرحال موجود رہتا ہے۔ اسی طرح اس عالمِ اجساد میں بھی بعض مرتبہ جسم کا بڑا حصہ ضائع ہوجاتا ہے پھر بھی زید بتمامہ موجود رہتا ہے۔ اسی طرح بچپن سے بڑھاپے تک بدن میں بے شمار تغیرات ہوتے ہیں پھر بھی زید بحالہ رہتا ہے۔

اسی طرح نسمہ میں بھی بار بار تبدیلیاں آتی ہیں مگر زید بحالہ رہتا ہے، اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی، وہ خواہ بچہ ہو یا جوان، دبلا ہو یا موٹا، چھوٹا ہو یا بڑا، سیاہ ہو یا سفید، عالم ہو یا جاہل، وہ زید ہی رہتا ہے، اور یہ تمام تبدیلیاں بدن اور نسمہ میں آتی ہیں۔ زید میں کوئی تبدیلی نہیں آتی۔

اور اگر مختلف ادوار کی تبدیلیوں میں کوئی اشکال ہو تو ہم ایک ہی حال میں مثلاً بچپن میں یہ تبدیلیاں فرض کر سکتے ہیں یا ہم یہ کہیں گے کہ زید کے اوصاف کا ایک حال پر برقرار رہنا ضروری نہیں، اور زید کا ایک حال پر باقی رہنا ضروری ہے، اس لئے زید کے اندر ایک ایسی حقیقت ماننی پڑے گی، جس میں کوئی تبدیلی نہ آئے، اور وہی در حقیقت زید ہو، اسی حقیقت کا نام روح ربانی ہے۔

غرض زید کی ماہیت نسمہ نہیں، نہ بدن اس کی حقیقت ہے، نہ اس کے تشخصات اس کی ماہیت ہیں جو ہمیں نظر آتے ہیں، اور جو اس کو بکر وعمر وغیرہ سے ممتاز کرتے ہیں، بلکہ اس کی ماہیت یعنی ما به الشیٔ هو هو روح ربانی ہے۔

روح ربانی کیا چیز ہے؟: روح ربانی درحقیقت ایک مجرد چیز ہے اور نورانی نقطہ ہے، اس کا انداز نسمہ کے انداز سے بالکل مختلف ہے، نسمہ کے انداز تو باہم متضاد بھی ہیں اور بدلتے بھی رہتے ہیں، ان میں سے بعض جواہر ہیں، بعض اعراض، مگر روح ربانی کی صورت حال یہ نہیں، وہ ہمیشہ یکساں اور ایک حال پر رہتی ہے، انسان خواہ بچہ ہو یا بوڑھا، کالا ہو یا سفید، عالم ہو یا جاہل، روح ربانی ایک ہی حال پر رہتی ہے اور اس کا براہ راست تعلق نسمہ کے ساتھ ہوتا ہے، بدن کے ساتھ نہیں ہوتا، بدن کے ساتھ اس کا تعلق بالواسطہ ہوتا ہے یعنی بدن چونکہ نسمہ کی سواری ہے اور نسمہ روح ربانی کی، اور سواری کی سواری سواری ہوتی ہے اس طرح بدن بھی روح ربانی کی سواری بن جاتا ہے۔

بالفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ روح ربانی عالم بالا کی طرف سے کھلنے والا ایک روزن (دریچہ، کھڑکی) ہے، اس روزن سے انسان پر ہر وہ چیز اترتی ہے جس کی نسمہ میں استعداد ہوتی ہے، جیسے دھوپ، دھوبی کے دھلے ہوئے کپڑوں کو سفید کرتی ہے مگر دھوبی دھوپ میں کھڑے کھڑے کالا ہو جاتا ہے، گھر کے صحن میں پڑا ہوا کالا توا دھوپ سے نہیں چمکتا مگر آئینہ چمک اٹھتا ہے، اور میں جو یہ سبق پڑھا رہا ہوں اس کو بعض طلبہ پوری طرح سمجھ رہے ہیں بعض کچھ کچھ سمجھ رہے ہیں اور بعض کچھ بھی نہیں سمجھ رہے۔ یہ سب استعداد کا فرق ہے، اسی طرح جس نسمہ میں جیسی استعداد ہوتی ہے ویسا عالم بالا سے اس پر فیض اترتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ زید میں جو تبدیلیاں آتی ہیں وہ استعداد ارضی کا نتیجہ ہوتی ہیں، چونکہ اس کا بدن اور نسمہ مٹی سے تیار ہوا ہے، اس لئے اس میں تغیرات ہوتے ہیں اور روح ربانی چونکہ عالم بالا کی چیز ہے، اس لئے اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔

اشکال: روح کی اس بحث پر اشکال یہ ہے کہ نسمہ کے وجود میں آنے سے پہلے بدن میں اخلاط کون تیار کرتا ہے؟ ان کا خلاصہ کون نکالتا ہے؟ دل کو متحرک کون کرتا ہے جس سے بھاپ تیار ہوتی ہے؟ یہ کام تو طبیعت مدبرہ کے ہیں اور وہ ابھی وجود پذیر نہیں ہوئی۔ اسی طرح شاہ صاحب نے روح ربانی صرف انسان میں مانی ہے، جیسا کہ آگے آئے گا، دیگر حیوانات میں شاہ صاحب صرف نسمہ مانتے ہیں، حالانکہ دلیل دیگر حیوانات میں بھی جاری ہو سکتی ہے، اور حیوان حیوان میں فرق کسی نے نہیں کیا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

ثم إذا أمعن في النظر أيضاً انجلى أن هذا الروح مطيةٌ للروح الحقيقية، ومادة لتعلقها، وذلك أنا نرى الطفل يَشِبُّ ويشيب، وتتبدل أخلاط بدنه، والروحُ المتولدة من تلك الأخلاط، أكثر من ألف مرة، ويصغر تارة ويكبر أخرى، ويسود تارة ويبيض أخرى، ويكون جاهلاً مرة وعالماً أخرى، إلى غير ذلك من الأوصاف المتبدلة والشخص هو هو.

وإن نوقش في بعض ذلك فلنا أن نفرض تلك التغيرات، والطفل هو هو، أو نقول: لانجزم ببقاء تلك الأوصاف بحالها، ونجزم ببقائه؛ فهو غيرها.

فالشيئ الذي هو به هو: ليس هذا الروح، ولا هذا البدن، ولا هذه المشخصات التي تُعرف وتُرى بادئ الرأي؛ بل الروح في الحقيقة: حقيقة فردانية، ونقطة نورانية، يجلّ طورُها عن طور هذه الأطوار المتغيرة المتغايرة، التي بعضها جواهر وبعضها أعراض؛ وهي مع الصغير كما هي مع الكبير، ومع الأسود كما هي مع الأبيض، إلى غير ذلك من المتقابلات، ولها تعلق خاص بالروح الهوائي أولاً، وبالبدن ثانيا، من حيث أن البدن مطية النسمة؛ وهي كُوّة من عالم القدس ينزل منها على النسمة كلُّ ما استعدت له؛ فالأمور المتغيرة إنما جاء تغيرُها من قبل الاستعدادات الأرضية، بمنزلة حر الشمس: يبيّض الثوب، ويسوّد القصّار.

ترجمہ: پھر جب مزید گہرا غور وفکر کیا گیا تو واضح ہوا کہ یہ روح (یعنی نسمہ) روحِ حقیقی کی سواری ہے اور اس کے (بدن کے ساتھ) جڑنے کا مادہ ہے۔ اور اس کی دلیل یہ ہے کہ ہم بچے کو دیکھتے ہیں کہ جوان ہوتا ہے اور بوڑھا ہوتا ہے، اور اس کے بدن کے اخلاط اور ان اخلاط سے جو روح پیدا ہوتی ہے اس میں تبدیلی آتی ہے، ہزار بار سے زیادہ، اور وہ کبھی چھوٹی ہوتی ہے اور کبھی بڑی، کبھی سیاہ ہوتی ہے اور کبھی سفید، کبھی جاہل ہوتی ہے اور کبھی عالم، وغیرہ وغیرہ بار بار بدلنے والے اوصاف میں سے، درانحالیکہ وہ آدمی وہی رہتا ہے۔

اور اگر جھگڑا کیا جائے اس کے بعض میں تو ہم ان تغیرات کو فرض کر سکتے ہیں درانحالیکہ بچہ بچہ ہو، یا ہم کہیں گے کہ ہمیں ان اوصاف کے ایک حال پر باقی رہنے کا یقین نہیں ہے اور ہمیں اس شخص کے ایک حال پر باقی رہنے کا یقین ہے، پس وہ شخص ان اوصاف کا غیر ہے۔

پس وہ چیز جس کی وجہ سے وہ چیز وہ چیز ہے، وہ روح (نسمہ) نہیں ہے، اور نہ یہ بدن ہے، اور نہ یہ تشخصات ہیں، جو جانے جاتے ہیں اور اول وہلہ میں دیکھے جاتے ہیں، بلکہ روح حقیقت میں ایک بسیط ماہیت ہے اور نورانی نقطہ ہے، برتر ہے اس کا انداز ان بدلنے والے باہم متضاد اوصاف کے انداز سے، جن میں سے بعض جوہر ہیں اور بعض عرض؛ اور وہ نورانی نقطہ ہے چھوٹے کے ساتھ ویسا ہی ہے جیسا بڑے کے ساتھ، اور کالے کے ساتھ ویسا ہی ہے جیسے کہ سفید

کے ساتھ، وغیرہ وغیرہ مستقل باتوں میں سے، اور اس نورانی نقطہ کا اولاً (یعنی بالذات) ایک خاص تعلق ہے روح ہوائی کے ساتھ اور بدن کے ساتھ تعلق ہے ثانیاً (یعنی بالواسطہ) اس اعتبار سے کہ بدن نسمہ کی سواری ہے اور وہ نورانی نقطہ عالم بالا کا ایک روزن ہے، اس روزن سے نسمہ پر نازل ہوتی ہیں وہ چیزیں جن کی نسمہ میں استعداد ہوتی ہے۔ پس بدلنے والی چیزیں: ان میں تبدیلی استعداد ہی کی جانب سے آتی ہے، جیسے سورج کی گرمی کپڑے کو سفید کرتی ہے اور دھوبی کو سیاہ کرتی ہے۔

لغات

مَطِیَّۃ: سواری جمع مَطَایا و مَطِیّ ... شَبَّ (ض) الغلامُ: جوان ہونا ... شَابَ یَشِیْبُ: بوڑھا ہونا ... جَلَّ (ض) جلالۃً: بڑے مرتبہ والا ہونا ... الطَّوْر: مدار جمع أطوار ... الکُوَّۃ: روشندان جمع کُویٰ، کِوَاء ... بَیَّضَہ: سفید کرنا۔

☆ ☆ ☆

چند فوائد

روح کی حقیقت کا بیان تمام ہوا، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ روح سرسری نظر میں نسمہ کا نام ہے، اور حقیقت میں روح ربانی کا نام ہے، جو نسمہ پر سوار ہوتی ہے، اور جو عالم بالا کی ایک چیز ہے —— اب باب کے آخر پر شاہ صاحب رحمہ اللہ چند فوائد ذکر فرماتے ہیں، جو درج ذیل ہیں:

پہلا فائدہ: موت سے نسمہ کا تعلق بدن سے منقطع ہوتا ہے:

حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں: وجدان صحیح سے میرے نزدیک یہ بات ثابت ہوئی ہے کہ موت وحیات کا تعلق نسمہ سے ہے، روح ربانی سے نہیں یعنی جب تک نسمہ کا تعلق بدن سے جڑا رہتا ہے جاندار زندہ رہتا ہے اور جب لاغر کرنے والے امراض کی وجہ سے بدن میں نسمہ پیدا کرنے کی استعداد باقی نہیں رہتی تو نسمہ ختم ہو جاتا ہے اور اس کا بدن سے تعلق منقطع ہو جاتا ہے، اس وقت جاندار مر جاتا ہے۔ مگر دونوں حالتوں میں روح ربانی کا تعلق نسمہ سے برقرار رہتا ہے، منقطع نہیں ہوتا۔

سوال: جب نسمہ پیدا کرنے والا کارخانہ ہی درہم برہم ہو گیا تو نسمہ بھی ختم ہو گیا، پھر روح ربانی کا اس کے ساتھ تعلق کیسے برقرار رہتا ہے؟

جواب: مرنے سے نسمہ بالکلیہ ختم نہیں ہوتا، بلکہ اس کی اتنی مقدار باقی رہ جاتی ہے جس کے ساتھ روح ربانی کا تعلق قائم رہ سکے، اس کو ایک مثال سے سمجھئے:

ایک بوتل لیجئے اس میں سے منہ سے ہوا چوسیے، جوں جوں ہوا نکلتی رہے گی، بوتل میں باقی ہوا متخلخل ہوکر بوتل کو بھردے گی، یہاں تک کہ ایک مرحلہ ایسا آئے گا جس کے بعد ہوا نہیں چوس سکتے۔ ورنہ بوتل اتنی زور سے ٹوٹے گی جیسے بم پھٹتا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر بوتل ہوا سے خالی ہوجائے اور اندر خلا ہوجائے تو باہر سے جو فضائی ہوا کا دباؤ پڑتا ہے وہ بوتل کو توڑ دے گا۔ یہ تو اندر کا مادہ ہے جو باہر کے دباؤ کی مقاومت کرتا ہے۔ جیسے گیہوں سے بھری ہوئی بوری پر دس بوریں رکھ دیجئے، کچھ اثر نہیں پڑے گا، کیونکہ اندر کا مالا باہر کے دباؤ کی مقاومت کر رہا ہے، لیکن اگر بوری میں سے کچھ گیہوں نکال دیے جائیں تو بوری پچک جائے گی، یہی حال بوتل کا ہے۔

بہرحال بوتل میں ہوا کی جو تھوڑی مقدار باقی رہ گئی ہے وہ متخلخل ہوکر ساری بوتل کو بھر دیتی ہے، اسی طرح جب انسان مرجاتا ہے تو اس کا نسمہ تحلیل ہوجاتا ہے مگر اس کی تھوڑی مقدار باقی رہ جاتی ہے جس میں تخلخل ہوتا ہے اور وہ حسب سابق مکمل نسمہ بن جاتا ہے، وہ اسی کے ساتھ روح ربانی کا تعلق برقرار رہتا ہے۔

وقد تحقق عندنا بالوجدان الصحيح: أن الموت انفكاك النسمة عن البدن، لفقد استعداد البدن لتوليدها، لا انفكاك الروح القدسي عن النسمة، وإذا تحللت النسمة في الأمراض المدنفة، وجب في حكمة الله: أن يبقى الشيء من النسمة، بقدر ما يصح ارتباط الروح الإلهي بها؛ كما أنك إذا مصصت الهواء من القارورة تخلخل الهواء، حتى تبلغ إلى حد لا تخلخل بعده، فلا تستطيع المص، أو تنفقئ القارورة؛ وما ذلك إلا لسر ناشئ من طبيعة الهواء؛ فكذلك سر في النسمة وحد لها، لا يجاوز هذا الأمر.

ترجمہ: اور ہمارے نزدیک وجدان صحیح سے یہ بات متحقق ہوگئی ہے کہ موت نسمہ کا بدن سے جدا ہونا ہے، بدن میں نسمہ کو پیدا کرنے کی استعداد کے مفقود ہوجانے کی وجہ سے۔ موت روح قدسی کا نسمہ سے جدا ہونا نہیں ہے۔ اور جب لاغر کرنے والی بیماریوں کی وجہ سے نسمہ تحلیل ہوجاتا ہے تو حکمت خداوندی میں ضروری ہوتا ہے کہ نسمہ کی اتنی مقدار باقی رہ جائے کہ اس کے ساتھ روح الٰہی کا جڑنا درست ہو۔ جیسے جب آپ بوتل سے ہوا چوسیں تو باقی ہوا پھیل جائے گی یہاں تک کہ ایسی حد آجائے کہ اس کے بعد متخلخل نہ ہوسکے، پس آپ چوس نہیں سکیں گے یا بوتل ٹوٹ جائے گی۔ اور نہیں ہے یہ بات مگر ایک راز کی وجہ سے، جو ہوا کی ماہیت سے پیدا ہوتا ہے، پس اسی طرح نسمہ میں بھی ایک راز ہے اور اس کی تحلیل کے لئے ایک حد ہے، معاملہ ان دونوں سے آگے نہیں بڑھتا۔

لغات:

وِجدان: (مصدر) پانا اور اصطلاح میں حس اور باطنی قوت کو کہتے ہیں وجدانی: ہر وہ چیز جس کو انسان اپنے نفس

سے محسوس کرے، جو چیزیں باطنی قوتوں سے محسوس ہوں جیسے وجدانیات، پھر اگر یہ دلیل مفروضہ ہے تو وہ وجدان فاسد ہے اور اگر کبھی ہوئی بات کی دلیل پائی جاتی ہے تو وہ وجدان صحیح ہے۔ الاذن العریض قریب لطرف کردیا۔

دوسرا فائدہ: موت کے بعد نسمہ کی زندگی:

موت کے بعد نسمہ کو نئی زندگی ملتی ہے اور اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ مرنے کے بعد روح ربانی نسمہ کی تربیت کرتی ہے اور اس میں حس مشترک باقی رہتی ہے اس کو عالم مثال سے کمک پہنچتی ہے جس سے اس کو نشأت ثانیہ ملتی ہے اور اس میں یہ قوت پیدا ہوتی ہے کہ وہ سنے، دیکھے اور بات کرنے کے قابل ہو جاتی ہے اور عالم مثال کی کمک سے مراد وہ قوت ہے جو مجرد اور محسوس کے بین بین افلاک میں شیٔ واحد کی طرح پھیلی ہوئی ہے (یعنی وہ قوت نہ بالکلیہ مجرد ہے نہ مادی، بلکہ بین بین ہے)

اور جب نسمہ کو نئی زندگی مل جاتی ہے تو کبھی اس میں جسم دار ہونے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے، اس وقت نسمہ کو عالم مثال کی مدد سے نورانی یا ظلمانی مثالی جسم دے دیا جاتا ہے پھر عالم برزخ کے حیرت زا واقعات شروع ہو جاتے ہیں، قبر میں بٹھا دیا جاتا ہے، سوال وجواب ہوتے ہیں، عذاب قبر کی مختلف شکلیں رونما ہوتی ہیں اور قبر میں راحتوں کا سامان شروع ہو جاتا ہے۔

تیسرا فائدہ: صور پھونکنے کے بعد کے احوال:

جب پہلی بار صور پھونکا جائے گا تو ہر چیز ختم ہو جائے گی، پھر جب فیصلہ خداوندی ہوگا تو دوبارہ صور پھونکا جائے گا، اس وقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک فیضان عام ہوگا جیسے ابتدائے آفرینش کے وقت ہوا تھا، جب اجسام میں روحیں پھونکی گئی تھیں اور عموماً اس کی بنیاد قوم کی نوکی تھی اور یہی فیضان قیامت کے دن بھی ہوگا جس سے سب لوگوں کو نئی زندگی مل جائے گی، اور اس کی صورت یہ ہوگی کہ روح ربانی کے فیضان سے نسمہ کو قوت ملے گی، وہی مادہ اور مثال کے بین بین جسم مل جائے گا اور میدان قیامت کے واقعات شروع ہو جائیں گے جس کی صادق ومصدوق ﷺ نے خبر دی ہے۔

چوتھا فائدہ: ملکیت وبہیمیت

انسان میں تین چیزیں ہیں، سب سے نیچے جسم ہے، درمیان میں نسمہ اور اوپر روح ربانی ہے، پس نسمہ کا جو رخ جسم کی طرف ہے اس کا نام بہیمیت ہے اور اس کا جو رخ روح ربانی کی طرف ہے اس کا نام ملکیت ہے یعنی جسم کے ساتھ تعلق کی وجہ سے جو برے اثرات نسمہ میں پیدا ہوتے ہیں ان کا نام بہیمیت (وحشی پن) ہے اور روح ربانی کے

ساتھ تعلق کی وجہ سے جو اچھے اثرات نسمہ میں پیدا ہوتے ہیں اس کا نام ملکیت (فرشتہ پن) ہے۔

پانچواں فائدہ: روح کی پوری حقیقت بیان نہیں کی گئی:

اس باب میں روح کے تعلق سے جو باتیں بیان کی گئی ہیں وہ صرف تمہیدی باتیں ہیں، اور اس لئے بیان کی گئی ہیں کہ آپ کتاب علی وجہ البصیرت پڑھیں اور اس پر مسائل کو متفرع کریں، روح کی پوری حقیقت سے پردہ ایک دوسرے علم میں اٹھایا جاسکتا ہے، جو اس علم سے برتر ہے۔ یعنی وہاں اس مسئلہ پر سیر حاصل گفتگو کی جاسکتی ہے، یہاں جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس سے زیادہ مناسب نہیں۔ ورنہ بات دور جا پڑے گی، اور وہ دوسرا علم فلسفۂ تصوف ہے، وہاں زیادہ بحث مناسب ہے۔

وإذا مات الإنسان كان للنسمة نشأة أخرى، فَيَنْبَجِسُ فيضُ الروح الإلٰهي فيها قوةً فيما بقي من الحسِّ المشترك، تكفي كفايةَ السمع والبصر والكلام بمدد من عالم المثال، أعني القوةَ المتوسطةَ بين المجرد والمحسوس، المنبثةَ في الأفلاك كشيء واحد،

وربما تستعد النسمةُ حينئذ بلباس نوراني أو ظلماني بمدد من عالم المثال، ومن هنالك تتولد عجائب عالم البرزخ.

ثم إذا نُفِخَ في الصور، أي جاء فيضٌ عامٌّ من باري الصُّوَر، بمنزلة الفيض الذي كان منه في بدء الخلق، حين نُفخت الأرواحُ في الأجساد، وأُسِّس عالَمُ المواليد، أوجب فيضُ الروح الإلٰهي: أن يكتسي لباسا جسمانيا، أو لباسا بين المثال والجسم، فيتحقق جميعُ ما أخبر به الصادقُ المصدوقُ، عليه أفضلُ الصلوات وأيمنُ التحيات.

ولما كانت النسمةُ متوسطا بين الروح الإلٰهي والبدن الأرضي، وجب أن يكون لها وجهةٌ إلى هذا، ووجهةٌ إلى ذلك، والوجهُ المائل إلى القدس هو الملكية، والوجهُ المائل إلى الأرض هو البهيمية.

ولنقتصرْ من حقيقة الروح على هذه المقدمات، ليُتكلَّم في هذا العلم، وتُفرَّعَ عليها الفروعُ، قبل أن ينكشفَ الحجابُ في علم أعلى من هذا العلم، والله أعلم.

ترجمہ: اور جب انسان مرجاتا ہے تو نسمہ کو نشأۃ ثانیہ ملتی ہے، پس روح ربانی کا فیضان اس میں ایک قوت پیدا کرتا ہے حس مشترک کے باقی ماندہ میں، (پس) وہ (حس مشترک) سننے، دیکھنے اور بات چیت کرنے کا کام کرنے لگتی ہے، عالم مثال کی کمک سے، مراد لیتا ہوں میں اس قوت کو جو مجرد و محسوس کے بین بین ہے، جو افلاک میں شیئ واحد کی

طرف بکھری پڑی ہے۔

اور اس وقت کسی نسمہ میں نورانی یا ظلمانی لباس کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے، عالم مثال کے تعاون سے، اور اس جگہ سے عالم برزخ کے عجائبات شروع ہو جاتے ہیں۔

پھر جب صور پھونکا جائے گا تو مخلوق صورتیں پیدا کرنے والے کی طرف سے فیضانِ عام ہوگا، اس فیضان جیسا جو شروع کی طرف سے ابتدائے آفرینش میں ہوا تھا، جب اجسام میں روحیں پھونکی گئی تھیں، اور عالم موالید کی بنیاد رکھی گئی تھی، تو واجب کیا روحِ ربانی کے فیضان نے کہ نسمہ جسمانی یا مثالی جسم کے بین بین نہایت ممکن لے، پس پائی جائیں گی وہ تمام باتیں جن کی اطلاع دی ہے صادق ومصدوق نے، ان پر بہترین درود نازل ہو اور بابرکت سلام!

اور جب نسمہ روحِ ربانی اور بدنِ خاکی کے بین بین ہے تو ضروری ہے کہ اس کا ایک رخ اس کی طرف ہو اور ایک رخ اُس کی طرف ہو۔ اور جو رخ عالم بالا کی طرف مائل ہے وہ ملکیت ہے، اور جو رخ زمین کی طرف ہے وہ بہیمیت ہے۔

اور ہمیں روح کی حقیقت کے سلسلہ میں ان تمہیدی باتوں پر اکتفا کرنی چاہئے تا کہ یہ باتیں اس علم میں مان لی جائیں، اور ان پر مسائل متفرع کئے جائیں۔ اس سے پہلے کہ پردہ اٹھائے ایسے علم میں جو اس سے برتر ہے۔ واللہ اعلم۔

لغات:

نَشَأَ وَ يُنْشِئُ: پرورش کرنا، نیا پیدا کرنا۔۔۔ کَفَى يَكْفِي كِفَايَةً الشيئُ: کافی ہونا، تَكَفَّى كِفَايَةً كذا: اس جیسا کام کرنے لگنا۔۔۔ اِكْتَسَى: لباس پہننا۔۔۔ صادق: سچا۔۔۔ مَصْدُوْق: سچا کیا گیا یعنی جس کی صداقت کو لوگ تسلیم کریں۔۔۔ قوله بمدد متعلق ہے بنشیٔ سے اور دوسرا بمدد متعلق ہے تستعد سے۔

تشریح:

(۱) حسِ مشترک: وہ باطنی قوت ہے جو حواسِ ظاہرہ کی حاصل کی ہوئی صورتوں کو قبول کرتی ہے (دیکھئے معین الفلسفہ ص۱۳۳)

(۲) فلسفہ تصوف کو علم الحقائق بھی کہتے ہیں، یہ علم تصوف کا نظری حصہ ہے، جس میں ذات وصفات، وحی، واردات وتجلیات، ربط الحادث بالقدیم، وجود اعیان ثابتہ، تنزلاتِ ستہ، روح، عالم مثال، ظاہر الوجود، باطن الوجود اور دیگر حقائق سے بحث کی جاتی ہے۔ اور تصوف کا عملی پہلو جس میں قربِ خداوندی حاصل کرنے کا طریقہ اور عبادات وریاضت کی مختلف شکلیں اور واردات کو جذب کرنے کی صورتیں بیان کی جاتی ہیں، وہ علم سلوک کہلاتا ہے (الطاف القدس مترجم کا حاشیہ ص۴۳)

☆ ☆ ☆

باب — ۱

انسان مکلف کیوں بنایا گیا ہے؟

(دلیل نقلی)

اللہ تعالیٰ نے صرف انسان کو مکلف کیوں بنایا ہے؟ دیگر مخلوقات مکلف کیوں نہیں بنائی گئیں؟ انسان کی تکلیف کا راز، حکمت اور وجہ کیا ہے؟ یہ سوال بہت سے لوگوں کے ذہن میں انگڑائی لیتا ہے۔ اس باب میں اسی کا بیان ہے۔

مکلف ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو احکامات دیئے ہیں اور ان کی تعمیل یا عدم تعمیل پر جزاء وسزا رکھی ہے، ورنہ صرف احکام تو اللہ نے تمام مخلوقات کو دیئے ہیں اور ہر مخلوق تعمیل حکم میں لگی ہوئی ہے، سورج کو طلوع وغروب ہونے کا حکم ملا ہے، ہواؤں کو چلنے کا، بادلوں کو برسنے کا، چڑیوں کو چہچہانے کا کام سونپا گیا ہے۔ وغیرہ۔ مگر کسی مخلوق میں حکم خداوندی کی خلاف ورزی کرنے کی طاقت نہیں، مگر ان کے لئے تعمیل حکم پر کوئی ثواب نہیں رکھا گیا، اس کے برخلاف انسان کی صورت حال یہ ہے کہ وہ مامور بھی ہے اور حکم کی تعمیل یا عدم تعمیل کا اختیار بھی رکھتا ہے اور اس کے لئے جزاء وسزا بھی مقرر کی گئی ہے، اسی کا نام تکلیف شرعی ہے۔

شاہ صاحب رحمہ اللہ پہلے یہ مسئلہ دلیل نقلی سے سمجھاتے ہیں، پھر دلیل عقلی بیان کریں گے، سورۃ الاحزاب کی بالکل آخری آیات (۷۲، ۷۳) میں ہے کہ ﴿إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ (إلى قوله تعالى:) وَكَانَ اللهُ غَفُورًا رَّحِيمًا﴾ یعنی اللہ تعالیٰ نے تمام مخلوقات کے سامنے "امانت" پیش فرمائی۔ امانت کے معنی ہیں ذمہ داری جیسے مدرس اور ملازم کی ایک ذمہ داری ہوتی ہے، جس کے پاس کوئی چیز برائے حفاظت رکھی جاتی ہے اس کی ایک ذمہ داری ہوتی ہے، ملک کے سربراہ کی ایک ذمہ داری ہے، اسی طرح تکلیف بھی ایک ذمہ داری ہے، جو احکام بجالاتا ہے وہ ذمہ داری پوری کرتا ہے، اور جو تعمیل حکم نہیں کرتا وہ ذمہ داری میں خلل ڈالتا ہے۔

یہ ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے تمام مخلوقات کے سامنے پیش کی ہے، مگر آیت میں بڑی بڑی تین مخلوقات کا تذکرہ کیا گیا ہے یعنی آسمان، زمین اور پہاڑوں کا، کیونکہ جب آدمی سر اوپر اٹھاتا ہے تو آسمان نظر آتا ہے، ذرا جھکاتا ہے تو پہاڑ سامنے ہوتے ہیں، اور بالکل نگاہ نیچی کرلیتا ہے تو زمین کو دیکھتا ہے، اس لئے انہی تین مخلوقات کا تذکرہ فرمایا ہے، ورنہ ذمہ داری تمام مخلوقات کے سامنے پیش کی گئی تھی، کیونکہ جب وہ بڑی مخلوقات کے سامنے پیش کی گئی تو چھوٹی مخلوقات کے سامنے تو بدرجہ اولیٰ پیش کی گئی۔

اس کی نظیر یہ ہے کہ آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے کا حکم ہر مخلوق کو دیا گیا تھا، مگر صرف فرشتوں کا ذکر اس لئے

کیا گیا ہے کہ اس وقت میں وہی سب سے اشرف مخلوق تھے اور جب اشرف مخلوق مامور ہوئی تو دیگر مخلوقات بدرجہ اولیٰ مامور ہونگی، جب کسی کی تعظیم کا حکم وزیر کو دیا جاتا ہے تو خود بخود دیگر درباریوں کے لئے بلکہ پورے ملک کے باشندوں کے لئے ہو جاتا ہے۔ اور اس کی دلیل شیطان کا اِباء اور اس کا مردود ہونا ہے، یہ بات اسی وقت معقول ہو سکتی ہے جبکہ وہ بھی سجدے کا مامور ہو (جیسا کہ سورۃ الکہف میں آیا ہے) حالانکہ مامورین میں صراحۃً جنات کا ذکر نہیں ہے۔ غرض جس طرح تمام مخلوقات سجدہ کرنے کی مامور تھیں، بارِ امانت بھی تمام مخلوقات کے سامنے پیش کیا گیا تھا۔

تمام مخلوقات نے بارِ امانت اٹھانے سے انکار کر دیا، وہ بارِ امانت دیکھ کر گھبرا گئے، یہ پیش کش اور انکار فطری تھا، حسی اور قولی نہیں تھا یعنی جس طرح جانور کے سامنے گھاس چارہ پیش کرتے ہیں اس قبیل سے نہیں تھا، ورنہ مخلوقات نے زبان سے انکار کیا تھا، سورۃ الحج آیت ۱۸ میں صراحت ہے کہ انسان کے علاوہ دیگر تمام مخلوقات اللہ کے سامنے منقاد ہیں بلکہ پیش کرنے کا مطلب ان مخلوقات کی صلاحیتوں کے ساتھ موازنہ (Comparison) کرنا ہے یعنی ان کی صلاحیتوں کے ساتھ برابر کر کے دیکھنا ہے، جیسے مشین کا اسکرو (Screw) ٹوٹ جاتا ہے تو دکان پر لیجاتے ہیں، دوکاندار دوسرے اسکروں سے موازنہ کر کے دیکھتا ہے، کوئی چھوٹا ہوتا ہے، کوئی بڑا، اور کوئی بالکل برابر، دوکاندار وہ ٹھیک کر دیتا ہے، اسی طرح مخلوقات کی صلاحیتوں سے امانت کا موازنہ کر کے دیکھا گیا تو مطابقت نظر نہ آئی، یہی عدم مطابقت ان کا انکار ہے اور سہم جانے کا مطلب یہ ہے کہ قطعاً مطابقت نہیں پائی گئی، ان میں بالکل ہی صلاحیت نظر نہ آئی، مخلوق کی استعدادوں میں اور امانت میں کوئی جوڑ ہی نظر نہ آیا۔

اور جب امانت کا انسان کی صلاحیت اور استعداد کے ساتھ موازنہ کیا گیا تو پوری پوری مطابقت نظر آئی، یہی مطلب ہے انسان کے امانت کو اٹھانے کا، اور انسان میں وافر صلاحیت کے موجود ہونے کی دلیل اس کا ظلوم وجہول ہونا ہے۔ ظلوم وجہول مبالغے کے صیغے ہیں اور ظالم وجاہل وہ ہوتا ہے جس میں جاننے اور انصاف کرنے کی صلاحیت ہو مگر نہ جانے یا انصاف نہ کرے، چنانچہ دیوار اور بینٹ، پتھر کو ہم نہ ظالم کہہ سکتے ہیں نہ جاہل، کیونکہ ان میں انصاف کرنے کی اور جاننے کی صلاحیت نہیں۔ اور انسان نہ صرف یہ کہ عالم وعادل ہو سکتا ہے، بلکہ وہ علیم وعدول بھی ہو سکتا ہے، اسی طرح وہ نہ صرف ظالم وجاہل ہو سکتا ہے بلکہ ظلوم وجہول بھی ہو سکتا ہے۔

غرض انسان میں دونوں طرح کی وافر صلاحیتیں موجود ہیں اور انسان کے علاوہ فرشتے ہیں ان میں صرف یک طرفہ صلاحیت ہے، وہ ظلوم وجہول نہیں ہو سکتے، اور بہائم میں عالم وعادل ہونے کی صلاحیت نہیں۔

یہاں سے یہ سوال بھی حل ہو گیا کہ انسان نے کام وہ کیا جو کوئی نہیں کر سکا، اور صلہ یہ ملا کہ وہ ظلوم وجہول ہے! اس کا جواب یہ ہے کہ ظلوم وجہول صرف صفاتِ ذم نہیں، ان میں صفاتِ مدح بھی مضمر ہیں، یعنی اگر وہ چاہے تو علیم وعدول بھی ہو سکتا ہے، اس میں اس کی بھی وافر صلاحیت موجود ہے اور نہ چاہے تو ظلوم وجہول ہوگا۔

اس کے بعد جاننا چاہئے کہ انسان نے جو یہ بار امانت اٹھایا ہے اس کا نتیجہ کیا نکلے گا؟ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مشرک مرد وزن اور منافق مرد وزن سزا پائیں گے اور مومنین مغفور ہوں گے اور ان کی معمولی کوتاہیوں سے درگزر کیا جائے گا۔ لیعذب میں لام، لام عاقبت ہے یعنی انجام یہ ہوگا جیسے سورۃ قصص آیت ۸ میں لام عاقبت ہے کہ فرعون کے لوگوں نے موسیٰ علیہ السلام کو اٹھالیا تاکہ وہ ان لوگوں کے لئے دشمن اور غم کا باعث بنیں یعنی ان لوگوں نے اس غرض کے لئے نہیں اٹھایا تھا بلکہ ہونے کا نتیجہ یہ نکلا تھا۔

یہ لام، لام علت نہیں یعنی اللہ تعالیٰ نے ثواب و عقاب کی غرض سے انسان کو پیدا نہیں کیا، کیونکہ اللہ تعالیٰ حکیم ہیں ان کے کاموں میں حکمت تو ضرور موجود ہوتی ہے مگر ان کے کام معلل بالاغراض نہیں ہوتے یعنی وہ کوئی بھی کام کسی غرض سے نہیں کرتے کیونکہ کسی غرض کے لئے کام کرنا خود غرضی ہے جس سے حق تعالیٰ پاک ہیں۔

یہاں سے یہ سوال بھی حل ہوگیا کہ جب اللہ تعالیٰ نے ثواب و عقاب کے لئے انسان کو بار امانت اٹھوایا ہے تو منشا خداوندی ضرور پورا ہوگا، پھر بے چارے انسان کا کیا قصور؟ جواب یہ ہے کہ یہ سوال لام علت ہونے کی صورت میں متوجہ ہوگا، لام عاقبت ہونے کی صورت میں سرے سے یہ سوال پیدا ہی نہیں ہوگا۔

اور لام عاقبت کی مثال یہ ہے کہ دنیا کے تمام تعلیمی ادارے تعلیم دینے کے لئے قائم کئے جاتے ہیں، طلبہ کو فیل کرنے کے لئے کوئی ادارہ قائم نہیں کیا جاتا، مگر نتیجہ بہر حال دونوں طرح کا سامنے آتا ہے، بہت سے طلبہ فیل ہو جاتے ہیں مگر ادارہ ان کو فیل کرنے کے لئے قائم نہیں کیا گیا۔ اسی طرح سورۃ الملک آیت ۲ میں اور سورۃ الکہف آیت ۷ میں صراحت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ کارخانہ حیات ان لوگوں کو الگ کرنے کے لئے قائم کیا ہے جو بہترین کام کرتے ہیں، تو نتیجہ یہ نکلے گا کہ کچھ لوگوں سے جہنم بھر دی جائے گی۔

خلاصہ یہ ہے کہ آیت کریمہ میں:

(۱) امانت سے مراد تکلیف کی ذمہ داری سنبھالنا، تکلیف کا پٹہ گلے میں ڈالنا اور ثواب و عقاب کے خطرہ کے درپے ہونا ہے۔

(۲) اور عرض (پیش کرنے) سے مراد مخلوقات کی استعدادوں سے موازنہ کرنا ہے۔

(۳) اور اباء (انکار کرنے) سے مراد لیاقت و استعداد کا فقدان ہے۔

(۴) اور حمل (اٹھانے) سے مراد انسان میں لیاقت کا ہونا ہے۔

(۵) اور ظلوم و جہول ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ انسان میں مکلف ہونے کی وافر صلاحیت موجود ہے۔

(۶) اور لیعذب میں لام، لام عاقبت ہے، لام علت و غایت نہیں۔

اور سب باتوں کا نچوڑ یہ ہے کہ مکلف ہونے کی صلاحیت صرف انسان میں ہے اس لئے اسی کو مکلف بنایا گیا ہے اور

مخلوقات کو مکلف اس لئے نہیں بنایا گیا کہ ان میں تکلیف کی سرے سے صلاحیت ہی نہیں اور انسان بھی اس وقت مکلف ہوتا ہے جب کہ اس میں کامل صلاحیت پائی جائے بچہ بلوغ سے پہلے مکلف نہیں ہوتا کیونکہ صلاحیت کامل نہیں ہوتی اسی طرح مجنون اور جس کی بے ہوشی طویل ہو جائے، مکلف نہیں رہتا کیونکہ ان دونوں حالتوں میں صلاحیت مفقود ہو جاتی ہے۔

﴿باب سِرّ التكليف﴾

قال الله تعالى: ﴿إِنَّا عَرَضْنَا الأَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوَاتِ وَالأَرْضِ وَالْجِبَالِ، فَأَبَيْنَ أَنْ يَحْمِلْنَهَا، وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا، وَحَمَلَهَا الإِنْسَانُ، إِنَّهُ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلاً. لِيُعَذِّبَ اللهُ الْمُنَافِقِيْنَ وَالْمُنَافِقَاتِ، وَالْمُشْرِكِيْنَ وَالْمُشْرِكَاتِ، وَيَتُوْبَ اللهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ، وَكَانَ اللهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا﴾

نبّه الغزالي والبيضاوي وغيرهما على أن المراد بالأمانة تقلُّدُ عهدة التكليف، بأن تتعرض لخطر الثواب والعقاب، بالطاعة والمعصية؛ وبِعَرْضِها عليهن اعتبارُها بالإضافة إلى استعداد هن؛ وبإبائهن الإباءُ الطبيعي، الذي هو عدم اللياقة والاستعداد؛ وبحمل الإنسان قابليتُه واستعداده لها.

أقول: وعلى هذا فقوله تعالى: ﴿إِنَّهُ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلاً﴾ خرج مخرج التعليل، فإن الظلوم: من لايكون عادلاً، ومن شأنه أن يعدل، و الجهول: من لايكون عالمًا، ومن شأنه أن يعلم؛ وغيرُ الآدمي: إما عالم عادل، لايتطرّق إليه الظلم والجهل، كالملائكة؛ وإما ليس بعادل ولا عالم، ولا من شأنه أن يكتسبهما، كالبهائم؛ وإنما يليق بالتكليف، ويستعدُّله: من كان له كمال بالقوة، لابالفعل؛ واللام في قوله تعالى: ﴿لِيُعَذِّبَ﴾ لام العاقبة، كأنه قال: عاقبةُ حمل الأمانة التعذيبُ والتنعيم.

ترجمہ: باب: مکلف بنانے کا راز: اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ''بیشک ہم نے یہ امانت آسمان وزمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کی، سوانھوں نے اس کو اٹھانے سے انکار کر دیا، اور وہ اس سے ڈر گئے، اور انسان نے اس کو اٹھا لیا، بیشک وہ بڑا ظالم، بڑا نادان ہے، تاکہ (یعنی انجام یہ ہوگا کہ) اللہ تعالیٰ منافقین اور منافقات کو اور مشرکین اور مشرکات کو سزا دے، اور مؤمنین اور مؤمنات پر توجہ فرمائے اور اللہ تعالیٰ بے حد مغفرت فرمانے والے، نہایت مہربان ہیں''۔

امام غزالی، قاضی بیضاوی اور ان دونوں کے علاوہ نے اس بات پر تنبیہ فرمائی ہے کہ امانت سے مراد تکلیف کی ذمہ داری سنبھالنا ہے (تکلیف کا پٹہ گلے میں ڈالنا ہے) بایں طور کہ مخلوقات فرماں برداری کر کے، یا نافرمانی کر کے ثواب وعقاب کے خطرہ کے سامنے آئے (یعنی خطرہ مول لے) اور مخلوقات کے سامنے امانت کو پیش کرنے کا مطلب: امانت کا موازنہ کرنا ہے مخلوقات کی استعداد کی نسبت سے، اور مخلوقات کے انکار کرنے سے مراد: ان کا فطری انکار ہے، جو لیاقت اور استعداد نہ ہونے کا نام ہے اور انسان کے اٹھانے کا مطلب: اس کا قابل ہونا اور اس میں اس امانت کی استعداد کا ہونا ہے۔

میں کہتا ہوں: اور اس تفسیر میں ارشاد باری تعالیٰ ﴿إِنَّهُ كَانَ ظَلُومًا جَهُولًا﴾ کا حکم سابق کی علت (دلیل) کے طور پر بیان ہوا ہے اس لئے کہ "ظلوم" وہ شخص ہے جو عدل نہ کرتا ہو، درانحالیکہ اس کی شان میں سے یہ ہو کہ وہ انصاف کرے۔ اور "جہول" وہ شخص ہے جو عالم نہ ہو، اور اس کی شان میں سے یہ ہو کہ علم جانے۔ اور انسان کے علاوہ یا تو عالم و عادل ہیں: ظلم وجہالت کا ان تک گزر ہی نہیں، جیسے فرشتے، یا ایسے ہیں نہ عالم وعادل ہیں نہ ان کی شان ہے کہ وہ ان دونوں کو حاصل کرسکیں، جیسے چوپائے۔

اور تکلیف کے لئے سزاوار اور مکلف ہونے کی استعداد انہی میں ہوتی ہے جس کو کمال بالقوہ حاصل ہو، بالفعل حاصل نہ ہو۔ اور ارشاد باری تعالیٰ: ﴿لِيُعَذِّبَ﴾ میں لام عاقبت ہے، گویا اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ امانت اٹھانے کا انجام تعذیب و تنعیم (سزا دینا اور راحت پہنچانا) ہوگا۔

تشریح:

(۱) قوت کے معنی ہیں کسی چیز کا حاصل ہوسکنا اور فعل کے معنی ہیں حاصل ہونا۔ کسی چیز میں کسی وصف کا موجود ہونا بالفعل ہے اور محض استعداد اور صلاحیت کا ہونا اور وصف کا متوقع الوجود ہونا قوت ہے، جیسے پیدا ہوتے ہی انسان میں "لکھنے" کی صلاحیت ہوتی ہے، اس کو بالقوہ سے تعبیر کرتے ہیں، کہتے ہیں: انسان کاتب بالقوہ ہے، پھر جب بڑا ہوکر مشق کرکے کاتب بن جاتا ہے تو اس کو بالفعل سے تعبیر کرتے ہیں، کہتے ہیں کہ وہ کاتب بالفعل ہے۔

(۲) "میں کہتا ہوں" کا مطلب یہ ہے کہ اوپر کی باتیں تو دوسرے حضرات نے بیان کی ہیں، اب آگے مزید دو باتیں شاہ صاحب بڑھاتے ہیں۔

(۳) کتاب کے نسخوں میں أن يكتسبها ہے یعنی واحد مؤنث کی ضمیر ہے، مگر یہ تصحیف ہے، صحیح تثنیہ کی ضمیر ہے۔ مخطوطہ کراچی اور مخطوطہ برلن میں تثنیہ کی ضمیر ہے۔

لغات: تَقَلَّدَ تَقَلُّدًا: ہار پہننا تَعَرَّضَ للأمر: درپے ہونا۔

☆ ☆ ☆

انسان مکلف کیوں بنایا گیا ہے؟

(دلیل عقلی)

پہلے آیت کی دلیل نقلی بیان کی گئی ہے کہ انسان ہی مکلف کیوں ہے؟ اب دلیل عقلی بیان کرتے ہیں، مگر پہلے

ملائکہ، بہائم اور انسان کے احوال پر نظر ڈال لینی چاہئے۔

(۱) ملائکہ غیر مادی مخلوق ہیں، وہ عناصر اربعہ سے نہیں بنے یعنی وہ یا تو نور سے بنے ہیں یا عناصر اربعہ کی بھاپ سے بنے ہیں، بلاواسطہ عناصر اربعہ سے ان کی تخلیق نہیں ہوئی، اس لئے ان میں نہ نسمہ (روح حیوانی) ہے نہ بہیمیت، ان میں صرف ملکیت ہے، اور قوت بہیمی کی کمی سے جو احوال پیدا ہوتے ہیں مثلاً بھوک، پیاس، حزن اور الم، ان سے ملائکہ پاک ہیں، اسی طرح قوت بہیمی کی زیادتی سے جو احوال پیدا ہوتے ہیں مثلاً جماع کی خواہش، غصہ اور عجب (تکبر) ان سے بھی ملائکہ پاک ہیں۔ ان کو نہ تو جسم کی اور ان کے متعلقات کی کوئی فکر نہیں ہوتی کیونکہ وہ کھانے پینے کے جھمیلوں سے اور نشو ونما کی فکر سے آزاد ہیں۔ وہ ہر وقت عالم بالا کی طرف متوجہ رہتے ہیں اور حکم کا انتظار کرتے ہیں، جونہی اوپر سے کوئی حکم ملتا ہے، اس کی تعمیل کے لئے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں، اور اس میں ان کی اپنی کوئی غرض نہیں ہوتی، بس عالم بالا کا مقصود ان کا مقصود ہوتا ہے۔

(۲) اور چوپائے عناصر سے بنے ہیں اس لئے ان میں نسمہ (روح حیوانی) اور بہیمیت ہوتی ہے، روح ربانی ان میں نہیں ہوتی، چنانچہ وہ ہر وقت بہیمی حالت میں، اور گندگیوں میں لت پت رہتے ہیں، اور وہ بس اپنی طبیعت کے تقاضوں پر چلتے اور اسی میں لگے رہتے ہیں، وہ ہمیشہ وہی کام کرتے ہیں جس میں ان کا اپنا نفع ہوتا ہے، یا وہ ان کا فطری تقاضا ہوتا ہے۔

(۳) اور انسان بھی عناصر اربعہ سے بنا ہے، مگر اس میں روح ربانی بھی ہے، اس لئے وہ قوت ملکی اور قوت بہیمی کا مجموعہ ہے۔ قوت ملکی روح ربانی کا فیض ہے، اور قوت بہیمی روح حیوانی (نسمہ) کا اثر ہے، دونوں قوتوں کی قدرے تفصیل درج ذیل ہے:

قوت ملکی: یہ قوت اس روح کا فیضان ہے جو انسان کے ساتھ مخصوص ہے، دیگر حیوانات میں وہ روح نہیں ہوتی یعنی جب روح ربانی کا فیضان اس نسمہ پر ہوتا ہے جو سارے بدن میں سرایت کرنے والا ہے، اور نسمہ اس فیضان کو قبول بھی کر لیتا ہے اور اس کی تابعداری کرتا ہے تو انسان میں ملکیت پیدا ہو جاتی ہے۔

قوت بہیمی: یہ قوت نسمہ کا اثر ہے، نسمہ تمام حیوانات میں بشمول انسان ہوتا ہے، یہ قوت نسمہ کے تمام قوی کے ساتھ وابستہ ہوتی ہے مگر مستقل بالذات ہوتی ہے جب اس کا حکم روح ربانی مان لیتی ہے اور اس کی تابعداری کرتی ہے تو انسان میں قوت بہیمیہ پیدا ہو جاتی ہے۔

اس کے بعد تین باتیں جان لینی چاہئیں:

(۱) ملکیت اور بہیمیت میں ہمیشہ کشمکش رہتی ہے، ملکیت انسان کو بلندی کی طرف کھینچتی ہے، اور بہیمیت پستی کی طرف، اور جب بہیمیت غالب آتی ہے تو ملکیت دب جاتی ہے اور بہیمیت کا راج ہوتا ہے، اور جب ملکیت غالب آجاتی ہے تو بہیمیت نرم پڑ جاتی ہے اور ملکیت کا حکم چلتا ہے۔

قوت ملکیہ کے مناسب حال جو چیزیں ہیں وہ ان پر واجب کی جائیں اور ان کی بجا آوری پر مدد دی جائے، اور قوت بہیمیہ میں منہمک ہونے کو ان پر حرام کیا جائے اور اس کی خلاف ورزی پر ان کو سزا دی جائے۔ یہی تکلیف شرعی ہے۔ اس کی مزید تفصیل اگلے باب میں آرہی ہے۔

وإن شئت أن تستجلي حقيقة الحال فعليك:

[١] أن تتصور حال الملائكة في تجرُّدهم، لا يُزعجهم حالةٌ ناشئة من تفريط القوة البهيمية، كالجوع والعطش والخوف والحزن، أو إفراطها، كالشبق والغضب والتيه، ولا يُهمّهما الشهوية والسبعية ولواحقهما، وإنما هي فارغة لانتظار ما يرد عليها من فوقها، فإذا ترشّح عليها أمر من فوقها: من إجماع على إقامة نظام مطلوب، أو رضًا من شيء، أو بغض شيء، امتلأت به، واندفعت له، وانبعثت إلى مقتضاه، وهي في ذلك فانيةٌ عن مراد نفسها، باقيةٌ بمراد ما فوقها.

[٢] ثم تتصور حال البهائم في تلطُّخها بالهيآت الخسيسة، لا تراها مشغوفةً بمقتضيات الطبيعة، فانيةً فيها، لا تنبعث إلى شيء إلا انبعاثًا بهيميًا يرجع إلى نفع جسداني، وتندفع إلى ما تعطيه الطبيعة فقط.

[٣] ثم تعلم أن الله تعالى قد أودع الإنسان بحكمته الباهرة قوتين:

[الف] قوةً ملكيةً: تنشعب من فيض الروح المخصوص بالإنسان، على الروح الطبيعية السارية في البدن، وقبولها ذلك الفيض، وانقيادها له.

[ب] وقوةً بهيميةً: تنشعب من النفس الحيوانية، المشترك فيها كلُّ حيوان، المتشبّحة بالقُوى القائمة بالروح الطبيعية، واستقلالها بنفسها، وإذعان الروح الإنسانية لها، وقبولها الحكم منها.

ثم تعلم:

[١] أن بين القوتين تزاحمًا وتجاذبًا، فهذه تجذب إلى العُلُوّ، وتلك إلى السفل، فإذا برزت البهيمية، وغلبت آثارُها، كمنت الملكية، وكذلك العكس.

[٢] وأن للباري جلّ شأنه عنايةً بكل مقام، وجُودًا بكل ما يسأله الاستعداد الأصلي والكسبيُّ، فإن كسب هيئات بهيمية أمدّ فيها، ويسّر له ما يناسبها، وإن كسب هيئات ملكية أمدّ فيها، ويسّر له ما يناسبها، كما قال الله تعالى: ﴿فَأَمَّا مَنْ أَعْطَى وَاتَّقَى وَصَدَّقَ بِالْحُسْنَى﴾

لغات:

استعلی الشیئ: ظاہر کرکے کہنا أزعجه: بے قرار کرنا أزعجه إلی المعصیة: گناہ پر ابھارنا شبق (س) شبقا: بہت شہوت والا ہونا، صفت شبق مؤنث شبقة الفیه: ڈینگ، فخر، جمع أفیاه هَشَّ (ن) هَشًّا: ظاہر مند ہونا، رنجیدہ کرنا لفظ کے بھی یہی معنی ہیں، یہ مجرد اور مزید دونوں سے پڑھ سکتے ہیں اندفع السیل: زور سے بہنا تشعب أغصان الشجرة: درخت سے شاخیں نکلنا الانقهار: منقطع ہونا .. تشبح الحرباء علی الشجرة: گرگٹ کا دراز ہونا۔

تشریح:

تغذیہ: جب بدن کے بعض اجزاء تحلیل ہوکر زائل ہوجاتے ہیں تو ان کی خالی جگہ کو پر کرنے کے لئے تغذیہ کی ضرورت پیش آتی ہے علمی تغذیہ کے معنی ہیں غذا دینا، پرورش کرنا اور قوت غاذیہ چار آلات کے ذریعہ کام کرتی ہے یعنی قوت جاذبہ، قوت ماسکہ، قوت ہاضمہ اور قوت دافعہ کے ذریعہ یہ افعال انجام دیتی ہے تفصیل میری کتاب معین الفلسفہ ص ۴۹ میں ہے

تنمیہ: حصول کمال کے لئے نباتات کی طرح حیوانات میں بھی تنمیہ (بڑھوتری) کی قوت ودیعت کی گئی ہے، یہ قوت ہضم کے طاقت ور ہونے کا دوسرا نام ہے، اس کی تفصیل بھی معین الفلسفہ ص ۴۹ اور ۱۲۰ میں ہے۔

تصحیح: فهذه تنجذب إلی العلو، وتلك إلی السفل مطبوعہ نسخہ میں فهذه تنجذب إلی العلو دون تلك إلی السفل ہے۔ تصحیح مطبوعہ صدیقی اور مخطوطہ کراچی سے کی گئی ہے۔

☆ ☆ ☆

باب — ۷

انسان کا مکلّف ہونا عالَم کی پلاننگ میں داخل ہے

تقدیر اور قدر کے معنی ہیں اندازہ کرنا، تصمیم بنانا، پلاننگ کرنا، جس طرح آدمی حویلی بناتا ہے تو پہلے نقشہ بناتا ہے پھر اس کے مطابق تعمیر کرتا ہے، یہی تقدیر کے معنی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے بھی علم ازلی میں اس عالم کی پلاننگ کی ہے، جس میں انسان کا مکلّف ہونا شامل ہے، پس انسان مکلّف نہ ہو یہ نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح دیگر مخلوقات کا مکلّف نہ ہونا بھی پلاننگ میں داخل ہے، پس دیگر مخلوقات مکلّف ہوں یہ بات ممکن نہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کی مخلوقات میں غور کرنے سے

یہ سب باتیں عیاں ہو جاتی ہیں، اور سمجھ میں آجاتا ہے کہ اللہ نے انسان کو جو مکلف بنایا ہے وہ ٹھیک ہی بنایا ہے، کائنات کا ذرہ ذرہ اس کی شہادت دیتا ہے۔ آپ پہلے نباتات میں غور کریں، پھر حیوانات میں، پھر انسان کے حالات میں، ان تین مخلوقات میں غور کرنے سے اندازہ ہو جائے گا کہ اللہ نے مخلوق کو کامل سے کامل تر پیدا کیا ہے اور ان میں سب سے اکمل انسان ہے۔

نباتات کے احوال میں غور

آپ درختوں کو، ان کے پتوں کو، ان کے شگوفوں کو، اور ان کے پھلوں کو دیکھیں، اور ان میں جو نظر آنے والی، چکھی جانے والی، چھوئی جانے والی، سونگھی جانے والی اور ٹٹولی جانے والی کیفیات ہیں، ان کو بھی ملاحظہ کریں؟ آپ دیکھیں گے کہ قدرت نے ہر نوع کے لئے مخصوص شکل کے پتے، خاص رنگ کے پھول، اور جداجدا ذائقے دار پھل بنائے ہیں اور انہی چیزوں کے ذریعہ جانا پہچانا جاتا ہے کہ یہ فلاں قسم کا درخت اور پھل ہے۔

اور یہ تمام چیزیں صورت نوعیہ کے تابع اور اس کے ساتھ لپٹی ہوئی ہیں اور جہاں سے صورت نوعیہ آئی ہے، وہیں سے یہ سب چیزیں آئی ہیں۔ اور اللہ کا یہ فیصلہ کر دیا تو — مثال کے طور پر — کھجور کا درخت بنے، اس میں یہ سب باتیں آجاتی ہیں کہ اس کا پھل ایسا ہو اور اس کے پتے ایسے ہوں۔

اور نوع کی بعض خصوصیتیں ہر سمجھدار آدمی سمجھ سکتا ہے، اور بعض صرف ذہین اور زیرک ہی سمجھ سکتا ہے، مثلاً یاقوت کی یہ خصوصیت ہے کہ جو اس کو اپنے پاس رکھے گا اس کو فرحت حاصل ہوگی اور وہ بہادر بنے گا مگر کونسا پتھر یاقوت ہے، وہ ہیروں کا ماہر ہی جان سکتا ہے۔

اسی طرح نوع کی بعض خصوصیتیں ہر ہر فرد میں پائی جاتی ہیں، اور بعض مخصوص افراد میں پائی جاتی ہیں، جیسے ہلیلہ کا کوئی دانہ ایسا ہوتا ہے کہ جو اس کو ہاتھ میں پکڑے رکھے اس کا قبض ٹوٹ جاتا ہے، مگر یہ خاصیت ہلیلہ کے ہر دانہ میں نہیں ہوتی، کسی دانہ میں ہوتی ہے اور وہ بہت کمیاب ہے اور اس کو ماہر ہی پہچان سکتا ہے۔

پس یہاں یہ سوال کرنے کا کسی کو حق نہیں کہ کھجور کا درخت ایسا کیوں ہے؟ یہ سوال سرے سے غلط ہے، کیونکہ ماہیت کے لوازم کا ماہیت کے ساتھ پایا جانا ضروری ہے، جیسے سورج نکلنے کے لئے وجود نہار لازم ہے اور انسان ہونے کے لئے ناطق وضاحک ہونا ضروری ہے، پس ''کیوں؟'' سے سوال باطل ہے۔

> ﴿باب إنشقاق التكليف من التقدير﴾
>
> إعلم أن لله تعالى آيات في خلقه يهتدي الناظر فيها، إلى أن الله له الحُجّةُ البالغة في تكليفه لعباده بالشرائع:

کرتا ہے، جو اس کو اپنے ہاتھ میں پکڑے رہتا ہے۔

اور آپ کو حق نہیں کہ آپ پوچھیں کہ کھجور کا پھل ایسا کیوں ہے؟ کیونکہ یہ سوال ہی غلط ہے، اس لئے کہ ماہیتوں کے لوازم کا پایا جانا ماہیتوں کے ساتھ نہیں طلب کیا جاتا "کیوں؟" کے ذریعہ۔

لغات:

یَنْشَقُّ الشیئُ: پھٹنا، انْشَقَّ الفجرُ: فجر کا طلوع ہونا ۔ یَشْتَبِکُ: مختلط ہونا، بعض کا بعض میں داخل ہونا ۔۔ الخُوص: کھجور کے پتے مفرد خُوصۃ ۔ البَالُ: دل، کہا جاتا ہے ما خطر ببالی: میرے دل میں نہیں گزرا۔ الأَلْمَعُ والأَلْمَعِیُّ: تیز ذہن، تیز فہم، الألمعیۃ: ذکاوت۔

حیوانات کے احوال میں غور

اب آپ حیوانات کی مختلف اقسام پر نظر ڈالیں۔ نباتات میں جو جو باتیں پائی جاتی ہیں، وہ سب باتیں آپ کو حیوانات میں ملیں گی، آپ دیکھیں گے کہ ہر نوع کی الگ شکل اور جدا بناوٹ ہے، مزید برآں حیوانات اپنے اختیار سے حرکت کرتے ہیں، اور ان کو فطری الہامات ہوتے ہیں، ان کی سرشت میں زندگی گزارنے کی تدبیریں رکھ دی گئی ہیں۔ اور وہ کئی چیزوں کی وجہ سے ایک دوسرے سے ممتاز ہوتے ہیں۔ مثلاً: چوپائے گھاس کھاتے ہیں اور جگالی کرتے ہیں، گھوڑے، گدھے اور خچر گھاس تو کھاتے ہیں مگر جگالی نہیں کرتے، درندے گوشت کھاتے ہیں۔ پرندے ہوا میں اڑتے ہیں اور مچھلی پانی میں تیرتی ہے، اسی طرح حیوانات کی ہر نوع کی الگ آواز ہے، نر مادہ کے ملنے کا الگ طریقہ ہے، اور اولاد کی پرورش کا الگ ڈھنگ ہے، جس کی تفصیل غیر ضروری ہے۔

اور اللہ تعالیٰ نے حیوانات کی ہر نوع کو وہ علوم الہام فرمائے ہیں جو اس کے مزاج کے مناسب ہیں، اور جو اس نوع کے لئے کارآمد ہیں، اور یہ سب الہامات حیوانات کی انواع پر خالق تعالیٰ کی طرف سے صورت نوعیہ کے روزن سے ہوتے ہیں، جیسے پھولوں کے مختلف ذائقے اور پھلوں کے مزے صورت نوعیہ کے ساتھ گندھے ہیں۔

اور حیوانات کی انواع کے بعض احکام تمام افراد کو عام ہوتے ہیں، اور بعض احکام صرف بعض افراد میں پائے جاتے ہیں، جہاں مادہ میں استعداد ہوتی ہے اور اتفاقاً اسباب جمع ہو جاتے ہیں، اگرچہ نفس استعداد سب میں ہوتی ہے، جیسے شہد کی مکھی یعسوب (شہد کی مکھیوں کا سردار) کہ اس میں بھی کوئی ہی مخفی ہے، اور انسان کی آواز کی نقل ہر پرندہ نہیں کر سکتا، طوطا ہی کرتا ہے۔

ثم انظر إلى أصناف الحيوان، تجد لكل نوع شكلا وخلقة، كما تجد في الأشجار، وتجد مع ذلك لها حركات اختيارية، وإلهامات طبيعية، وتدبيرات جبلية، يمتاز كل نوع بها، فبهيمة الأنعام ترعى الحشيش وتجترّ، والفرس والحمار والبغل ترعى الحشيش ولا تجتر، والسباع تأكل اللحم، والطير يطير في الهواء، والسمك يسبح في الماء، ولكل نوع من الحيوان صوت غير صوت الآخر، ومسافدة غير مسافدة الآخر، وحضانة للأولاد غير حضانة الآخر؛ وشرح هذا يطول.

وما ألهم الله نوعا من الأنواع إلا علوما تناسب مزاجه، وإلا ما يصلح به ذلك النوع؛ وكل هذه الإلهامات تترشح عليه من جانب بارئها، من كوّة الصورة النوعية؛ ومثلها كمثل تخاطيط الأزهار وطعوم الثمرات في تشابكها مع الصورة النوعية.

ومن أحكام النوع: ما يعم الأفراد، ومنها: ما لا يوجد إلا في البعض، حيث تستعد المادة، وتتفق الأسباب، وإن كان أصل الاستعداد يعم الكل، كاليعسوب من بين النحل، والببغاء: يتعلم محاكاة أصوات الناس بعد تعليم وتمرين.

ترجمہ: پھر آپ حیوانات کی اقسام کو دیکھیں، آپ ہر نوع کے لئے ایک شکل اور ایک بناوٹ پائیں گے، جیسا آپ نے پایا ہے درختوں میں اور آپ اس کے ساتھ پائیں گے حیوانات کے لئے اختیاری حرکتیں، فطری ہدایت اور جبلی تدبیریں، جن کے ذریعہ ہر نوع ممتاز ہوتی ہے، مثلاً: پالتو چوپائے گھاس چرتے ہیں اور جگالی کرتے ہیں اور گھوڑے، گدھے اور خچر گھاس چرتے ہیں اور جگالی نہیں کرتے، اور درندے گوشت کھاتے ہیں، اور پرندے ہوا میں اڑتے ہیں، اور مچھلی پانی میں تیرتی ہے، اور حیوان کی ہر قسم کے لئے ایک آواز ہے دوسرے کی آواز کے مغایر، اور جفتی کا طریقہ ہے دوسرے کی جفتی کے طریقہ کے مغایر، اور اولاد کی پرورش کا طریقہ ہے دوسرے کے طریقہ کے مغایر، اور اس کی تفصیل لمبی ہو جائے گی۔

اور اللہ تعالیٰ نے حیوانات کی انواع میں سے ہر نوع کو وہی علوم الہام فرمائے ہیں جو اس کے مزاج کے مناسب ہیں، اور جن کے ذریعہ وہ نوع سنور سکتی ہے۔ اور یہ سب الہامات نوع پر ٹپکتے ہیں انواع کو پیدا کرنے والے کی جانب سے صورت نوعیہ کے سوراخ سے، اور ان علوم کا حال شگوفوں کی لکیروں اور پھلوں کے مزوں جیسا ہے، ان کے گتھے ہوئے ہونے میں صورت نوعیہ کے ساتھ۔

اور نوع کے احکام میں سے بعض وہ ہیں جو تمام افراد کو عام ہوتے ہیں، اور ان میں سے بعض صرف بعض افراد میں پائے جاتے ہیں، جہاں مادہ میں استعداد پیدا ہوتی ہے اور اتفاقاً اسباب جمع ہو جاتے ہیں، اگرچہ نفس استعداد سب میں ہوتی ہے، جیسے یعسوب (شہد کی مکھیوں کا بادشاہ) شہد کی مکھیوں کے درمیان میں سے، اور طوطا لوگوں کی آوازوں کی نقل کرنا سیکھتا ہے تعلیم اور تمرین کے بعد۔

لغات:

يجتر البعير: جگالی کرنا اجترّ الشيء: کھینچنا ۔ ۔ ضافة المذكر أنثاه مُضافَّة: جفتی کرنا ۔ ۔ الحضانة: پرورش ۔ ۔ قوله: والا ما يصطلح به استثناء در استثناء ہے .... خطط: لکیریں کھینچنا تخاطيط: لکیریں، دھاریاں، کیونکہ وہ لکیروں سے بنتی ہے ۔ ۔ استعد للأمر: تیار ہونا۔

انسان کے احوال میں غور

اب آپ نوعِ انسانی کو دیکھیں نباتات اور حیوانات میں جو جو باتیں ہیں، وہ سب انسان میں موجود ہیں، انسان بھی دیگر حیوانات کی طرح کھانا، انگڑائی لینا، ڈکار لینا، فضلات کو دفع کرتا اور پیدا ہوتے ہی پستان چوستا ہے، مزید برآں انسان میں چند ایسی خصوصیات پائی جاتی ہیں جن کی وجہ سے وہ دیگر حیوانات سے ممتاز ہوتا ہے، مثلاً:

① وہ بات چیت کرتا ہے، دوسروں کا کلام سمجھتا ہے، بدیہی باتیں مرتب کر کے نئے علوم پیدا کرتا ہے، اسی طرح تجربات، جائزے اور زیرکی سے بھی علوم پیدا کرتا ہے۔

② وہ ایسی باتوں کا اہتمام کرتا ہے، جن کو وہ عقل سے اچھا سمجھتا ہے، اگرچہ حواس اور قوت واہمہ سے ان کی خوبی سمجھ میں نہ آئے جیسے نفس کو سنوارنا اور ممالک کو زیر نگیں کرنا۔

اور ان امور کے نوعی ہونے کی دلیل یہ ہے کہ تمام انسان، پہاڑوں کی چوٹیوں پر رہنے والے بھی، ان کی بنیادی باتوں پر متفق ہیں اور یہ بات بلاوجہ نہیں ہو سکتی، اس میں گہرا راز ہے، جو صورت نوعیہ کی جڑ سے پھوٹتا ہے۔

اور وہ راز یہ ہے کہ مزاج انسانی کا مقتضی یہ ہے کہ عقل دل پر، اور دل نفس پر غالب رہے، اسی لئے وہ نفس کے تقاضوں کو دل کے فیصلہ پر دبا لیتا ہے، اور دل کی چاہتوں کا عقل کے فیصلے کے سامنے خون کرتا ہے۔

ثم انظر إلى نوع الإنسان، تجد له ما وجدت في الأشجار، وما وجدت في أصناف الحيوان، كالتغذي، والتمطي، والجُشاء، ودفع الفضلات، ومصّ الثّدي في أول نشأته. وتجد مع ذلك فيه خواصّ، يمتاز بها من سائر الحيوان:

منها: النطق، وفهم الخطاب، وتوليد العلوم الكسبية من ترتيب المقدمات البديهية، أو من التجربة، والاستقراء، والحدس.

ومنها: الاهتمام بأمور يَسْتَحْسِنُهَا بعقله، ولا يجدها بحسّه ولا وهمه، كتهذيب النفس،

حیوانات کی اور انسان کی صورت حال کیا ہے؟ اب کیف دبر اللہ الخلق؟ کا مضمون شروع ہوتا ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے کائنات کا کیا انتظام کیا ہے؟ پہلے آپ نباتات اور حیوانات کا انتظام دیکھیں، پھر انسان کی تدبیر کا بیان آئے گا۔

نباتات میں چونکہ حس و حرکت نہیں، اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان کو جڑیں دی ہیں، جن سے وہ انرجی (Energy) حاصل کرتی ہیں۔ جڑیں زمین سے مادہ چوستی ہیں اور صورت نوعیہ کی ذین کے مطابق ٹہنیوں، پتوں، پھلوں اور پھولوں کو سپلائی کرتی ہیں، اس طرح تمام نباتات نشوونما پاتے ہیں۔ اور حیوانات میں چونکہ حس و حرکت ہے، اس لئے ان کو جڑیں نہیں دیں، بلکہ ان کو مکلف کیا کہ وہ گھاس، دانہ اور پانی ان کے ٹھکانوں سے حاصل کریں، نیز ان کو دیگر مرافق زندگی بھی الہام کئے۔

اور جو حیوانات کیڑوں کی طرح پیدا نہیں ہوتے، ان میں افزائش نسل کا یہ انتظام کیا کہ ان کو آلات تناسل دیئے، اور مادہ میں رطوبت پیدا کی، جس سے جنین کی پرورش ہوتی ہے، پھر وہی رطوبت خالص دودھ بن جاتی ہے، اور نوزائیدہ بچے کو الہام کیا کہ وہ پستان چوسے، اور جو دودھ منہ میں آئے اس کو نگل جائے۔

اور مرغی میں بھی رطوبت پیدا کی، جس سے انڈے تیار ہوتے ہیں، پھر جب مرغی تمام انڈے دے چکتی ہے تو اندر ایک خشکی اور خلا پیدا ہوجاتا ہے جو اس کو پاگل سا بنادیتا ہے، وہ دوسری مرغیوں سے دور ہوجاتی ہے، اور کوئی چیز دبا کر بیٹھنا چاہتی ہے تاکہ اندر کے خلا کو پُر کرے۔

اور کبوتر کے جوڑے میں الفت رکھی اور انڈوں سے فارغ ہونے کے بعد ان کو سینے کی وہی دُھن ہے جو مرغی میں ہے، پھر جب چوزے نکل آتے ہیں تو یہی رطوبت بشکل قے کا سبب بن جاتی ہے، اور اللہ نے کبوتری کے دل میں چوزوں کی محبت رکھی، جو پرانی رطوبت کے ساتھ مل کر قے کا سبب بنتی ہے، جس سے غلہ باہر نکلتا ہے اور ان کو چوزے کھاتے ہیں، اور باہمی انسیت کی وجہ سے نر بھی مادہ کی نقل کرتا ہے، جس سے چوزوں کو غذا فراہم ہوتی ہے، اور چوزوں میں بھی رطوبت پیدا کی ہے، جو بعد میں پروں کی شکل اختیار کرلیتی ہے اور ان سے بچے اڑنے لگتے ہیں اور اپنی غذا خود حاصل کرتے ہیں۔

ثم انظر إلى تدبير الحق لكل نوع، وتربيته إياه، ولطفه به: فلما كان النبات لايُحِسُّ ولايتحرك، جعل له عروقا، تَمُصُّ المادةَ المجتمعة من الماء والهواء ولطيفِ التراب، ثم يُفرِّقها في الأغصان وغيرها، على تقسيمٍ تعطيه الصورةُ النوعية.

ولما كان الحيوان حسّاسا، متحركا بالإرادة، لم يجعل له عروقا، تَمُصُّ المادةَ من الأرض، بل ألهمه طلب الحبوب والحشيش والماء من مظانِّها، وألهمه جميع مايحتاج إليه من الارتفاقات.

والنوع الذي لايتكوَّن من الأرض تكوُّنَ الديدان منها، دبّر الله تعالى له، بأن أودع فيه قُوى

التناسل، وخلق في الأنثى رطوبة، يصرفها إلى تربية الجنين، ثم حوّلها لبناً خالصاً، وألهمه السعي لمصّ الثدي وازدراد اللبن.

وجعل في الدجاجة رطوبة يصرفها إلى تكوّن البيض؛ فإذا باضت أصابها يُبْسٌ وخُلُوُّ جوف، يحملانها على جنون، يستدعي ترك مخالطة بني نوعها، واستصحاب حضانة شيء، تسُدُّ به جوفها.

وجعل من طبع الحمامة الأنس بين ذكرها وأنثاها، وجعل خُلُوَّ جوفها هو الحامل على حضانة البيض، ثم جعل رطوبتها البالية تتوجه إلى التهوُّع، وجعل لها رحمة على الفرخ، وجعل رحمتها مع الرطوبة البالية سببَ تهوُّعها، ودفع الحبوب والماء إلى جوف فرخها؛ وجعل الذكر منها بسبب الأنس يقلِّد أنثاها، وخلق للفراخ مزاجاً رخواً، ثم حوّل رطوبتها ريشاً تطير به.

ترجمہ: پھر آپ ہر نوع کے لیے حق تعالیٰ کے نظم و انتظام کو، اور اس کی پرورش کو، اور اس پر لطف و کرم کو دیکھئے: پس جب نباتات احساس نہیں رکھتے تھے اور حرکت نہیں کرتے تھے تو ان کے لیے جڑیں بنائیں، جو اس مادہ کو چوستی ہیں جو پانی، ہوا اور مٹی کے لطیف اجزاء سے اکٹھا ہوتا ہے، پھر اللہ تعالیٰ اس مادہ کو شاخوں وغیرہ میں بانٹ دیتے ہیں، اس اندازے کے مطابق جو صورت نوعیہ چاہتی ہے۔

اور جب حیوان احساس کرنے والا اور بااِرادہ حرکت کرنے والا تھا تو اس کے لیے ایسی جڑیں نہیں بنائیں جو زمین سے مادہ کو چوسیں، بلکہ ان کو غلہ، گھاس اور پانی کو ان کے ٹھکانوں سے ڈھونڈھنے کا الہام کیا۔ اور ان کو الہام کیں وہ تدبیرات نافعہ جن کے وہ محتاج ہیں۔

اور حیوانات کی جو قسم مٹی سے پیدا نہیں ہوتی، کیڑوں کے مٹی سے پیدا ہونے کی طرح، ان کا یہ انتظام کیا کہ ان میں نسل بڑھانے والی صلاحیتیں ودیعت فرمائیں۔ اور مادہ میں ایک رطوبت پیدا کی، جس کو اللہ تعالیٰ پیٹ کے بچے کی پرورش میں خرچ کرتے ہیں، پھر اس کو خالص دودھ میں تبدیل کر دیا، اور نوزائیدہ بچے کو پستان چوسنے کا اور دودھ نگلنے کا الہام فرمایا۔

اور اللہ تعالیٰ نے مرغی میں رطوبت پیدا کی، جس کو وہ انڈے بننے میں خرچ کرتے ہیں، پھر جب مرغی انڈے دے چکتی ہے تو اس کو ایسی خشکی اور باطن کا خالی ہونا پہنچتا ہے، جو وہ دونوں اس کو ایسے پاگل پن پر ابھارتے ہیں کہ وہ اپنے نوع سے اختلاط کو ترک کر دینا چاہتی ہے۔ اور کسی ایسی چیز کے سینے کو پسند کرتی ہے جس سے وہ اپنے اندر کے خلا کو بھرے۔

اور کبوتر کی فطرت میں نر و مادہ میں انسیت رکھی، اور اس کے اندر کے خلا ہی کو انڈوں کے سینے پر ابھارنے والا بنایا، پھر اس کی بوسیدہ رطوبت کو بتکلف قے کرنے کی طرف متوجہ کر دیا، اور کبوتری میں چوزے پر مہر رکھی ہے، اور اس کی مہر کو پرانی رطوبت کے ساتھ مل کر بتکلف قے کا اور غلہ پانی کو چوزے کے پیٹ میں پہنچانے کا سبب بنایا، اور اللہ

نے اس کے زکو ۔۔ بعجہ نسبت کے ـــــ اس کی مادہ کا مقلد بنایا، اور چوزوں میں مرغوب مزاج پیدا کیا، پھر ان کی رطوبت کو اسی پر جمادیا، جس سے وہ انڈے نے تھے۔

لغات:

مَظَانّ جمع ہے مَظِنَّۃ کی، جس کے معنی ہیں ٹھکانہ یعنی وہ جگہ جہاں کسی چیز کے موجود ہونے کا گمان ہو، جیسے کوئی بازار سرمہ دانی لینے جاتا ہے تو وہ ہر دوکان پر دریافت نہیں کرتا بلکہ جہاں سرمہ دانی ملنے کا احتمال ہوتا ہے وہیں رکتا ہے۔ یہ لفظ شاہ صاحب آگے بار بار استعمال کریں گے اس لئے اس کا مفہوم یاد رکھیں۔ ... اِرتفاقات جمع ہے اِرتفاق کی، اِرتفق بہ کے معنی ہیں نفع اٹھانا، یہ بھی شاہ صاحب کی خاص اصطلاح ہے، اس کا مفہوم ہے آرام سے زندگی گزارنے کی تدبیریں، مفید اسکیمیں، اس کی مزید وضاحت بحث ثالث کے شروع میں آئے گی۔ اِزْدَرَدَ اللُّقْمَةَ: لقمہ کو جلدی سے نگلنا ... تَهَوَّعَ تَهَوُّعًا: تکلف سے قے کرنا۔

☆ ☆ ☆

انسان کی تربیت وتدبیر کا بیان

پروردگار عالم نباتات اور حیوانات کی پرورش کس طرح کرتے ہیں؟ قدرت نے ان کا نظم ونسق کس طرح کیا ہے؟ یہ مضمون آپ پڑھ چکے، اب انسان کی تربیت وتدبیر کا بیان شروع ہوتا ہے۔ انسان میں نباتات اور حیوانات کی سب خصوصیتیں موجود ہیں، وہ نشو ونما پاتا ہے، احساس رکھتا ہے، ارادے سے حرکت کرتا ہے، جبلی الہامات قبول کرتا ہے اور اس کو فطری علوم بھی عطا کیے گئے ہیں، مزید برآں اس کو اور خصوصیات سے بھی نوازا گیا ہے، اس کو عقل وافر دی گئی ہے اور وہ اکتسابی علوم پیدا کرنے پر بھی قادر ہے اس لئے قدرت نے اس کے لئے سامان زندگی تیار نہیں کیا، بلکہ خود اس کو اسباب حیات پیدا کرنے کا حکم دیا ہے، اس کو کھیتی باڑی، باغبانی، تجارت اور معاملات کا مکلف کیا ہے تاکہ وہ محنت کرکے اپنے لئے اسباب بقا فراہم کرے۔

صلاحیتوں کا فرق: پھر تمام انسان ایک درجہ کے نہیں، کوئی فطری طور پر آقا ہے تو کوئی اتفاق سے (ByChance) آقا بن گیا ہے، کوئی فطری طور پر غلام ہے تو کوئی اتفاقاً غلام بن گیا ہے، کوئی بادشاہ ہے تو کوئی رعایا، کوئی دانشمند ہے تو کوئی غبی، اور دانشمند بھی ایسا کہ حکمت الٰہی، علم طبعی، علم ریاضی اور حکمت عملی میں کمال انشائی کرتا ہے، اور جو غبی ہے وہ مذکورہ علوم کی طرف کسی کی تقلید کے بغیر راہ نہیں پاتا۔

یہ سب انسان کی فطری باتیں ہیں، چنانچہ تمام انسان خواہ وہ دیہاتی ہوں یا شہری، ان باتوں میں متفق ہیں۔ اور یہ انسان کی ظاہری خصوصیات اور نظم ونسق کا بیان ہے، جس کا تعلق انسان کی قوت بہیمیہ اور دنیوی تدبیرات نافعہ سے ہے۔

قوت ملکیہ کے تعلق سے انسان کے احوال: اب آپ قوت ملکیہ کے تعلق سے انسان کے احوال میں غور کریں۔ انسان دیگر حیوانات کی طرح نہیں، اس کو حیوانات سے اشرف فہم وادراک دیا گیا ہے، اور انسان کے وہ مخصوص علوم جن پر انسان کے تمام افراد متفق ہیں یہ ہیں:

① وہ جاننا چاہتا ہے کہ اس کو کس نے پیدا کیا ہے؟ اور کیوں پیدا کیا ہے؟ اور اس کا پیدا کرنے والا اس کی پرورش کیوں کر رہا ہے؟

② وہ جاننا چاہتا ہے کہ کائنات کا نظم وانتظام کون کر رہا ہے؟ جو خود اس شخص کا بھی خالق ورازق ہے۔

③ انسان بصیرت اور پوری توجہ سے اپنے پیدا کرنے والے اور پرورش کرنے والے کی بندگی کرنا چاہتا ہے، اس کے سامنے گڑگڑانا چاہتا ہے، جس طرح دوسرے تمام حیوانات زبان حال سے دائمی طور پر تضرع کناں ہیں۔

زبان حال سے تضرع: دنیا کی تمام مخلوقات: انسان وحیوانات، اشجار واحجار وغیرہ، اکل وشرب، افزائش نسل اور دیگر مادی ضروریات کی حد تک سختی کے ساتھ قوانین الٰہی کے پابند ہیں، اور یوں فطری طور پر تمام مخلوقات عاجزی کرنے والی ہیں، اور یہی ان کا زبان حال سے تضرع (گڑگڑانا) ہے، البتہ انسان روحانی طور پر بھی مسلمان ہونے کی اہلیت رکھتا ہے، اسلام کے معنی ہیں بغیر خارجی دباؤ کے اللہ کی حاکمیت کے آگے سر جھکانا، انسان پر اس معاملہ میں کوئی جبر نہیں، جو خوشی سے سر جھکاتا ہے، جنت کا حقدار ہوتا ہے۔ اور جو سرتابی کرتا ہے سزا پاتا ہے، سورۃ الحج آیت ۱۸ میں ارشاد ہے: ''کیا تجھ کو یہ بات معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے سب عاجزی کرتے ہیں، جو آسمانوں میں ہیں اور زمین میں ہیں، اور سورج اور چاند اور ستارے اور پہاڑ اور درخت اور چوپائے اور بہت سے آدمی۔ اور بہت سے ایسے ہیں جن پر (بوجہ منقاد نہ ہونے کے) عذاب ثابت ہو گیا''

کیا نباتات کا ہر جزء اس نفس نباتیہ کے سامنے ہر وقت ہاتھ پسارے ہوئے نہیں، جو درختوں کی تدبیر کرتا ہے؟ کیا درختوں کی ٹہنیاں، پتے، پھول وغیرہ ہر وقت نفس نباتیہ سے فیضان کی بھیک نہیں مانگتے؟ یہ نفس نباتیہ کس نے پیدا کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے، وہی یہی نباتات کی زبان حال سے عاجزی ہے۔ پس اگر نباتات میں کامل عقل ہوتی تو ان کا ہر جزء نفس نباتیہ کی ایسی تعریف کرتا جو دوسرے جزء کی تعریف سے مختلف ہوتی۔ اور اگر ان میں فہم وشعور ہوتا تو اس زبان حال سے ہاتھ پسارنے کا ان کے فہم پر اثر پڑتا اور وہ علم وبصیرت اور پوری توجہ سے بھی ہاتھ پسارنے لگتے، اسی سے یہ بات سمجھ لیجئے کہ انسان چونکہ تیز عقل رکھتا ہے اس لئے اس کا دل تکلف حالی کے مطابق تکلف علمی سے بھر گیا ہے اور اس کے نفس میں زبان حال سے دست طلب پھیلانے کی طرح علم وبصیرت سے دست طلب دراز کرنے کا بے پناہ جذبہ پیدا ہو گیا ہے۔

انسان کی چند اور خصوصیات: انسان میں دو خصوصیتیں اور بھی ہیں:

پہلی خصوصیت: نوعِ انسانی میں کچھ ایسے کامل افراد ہوتے ہیں جن کی خاص توجہ علوم عقلیہ کے سرچشمہ کی طرف رہتی ہے، وہ ان علوم کو اس سرچشمہ سے بذریعہ وحی یا حدس یا خواب حاصل کرتے ہیں، اور کچھ دوسرے لوگ ہوتے ہیں جو اس کامل انسان میں رشد و برکت کے آثار محسوس کرتے ہیں، چنانچہ وہ اوامر و نواہی میں ان کی پیروی کرتے ہیں۔ اول انبیائے کرام ہیں اور دوم ان کی امتیں ہیں اور اگرچہ خواب، ندائے غیبی، آواز اور فراست کے ذریعہ غیب کی طرف خاص توجہ کرنے کی تھوڑی صلاحیت سب لوگوں میں ہوتی ہے مگر سب انسان برابر نہیں ہوتے، کوئی کامل ہوتا ہے اور کوئی ناقص، اور ناقص ہمیشہ کامل کا محتاج رہتا ہے، غرض ہر شخص بذاتِ خود غیب سے علوم حاصل نہیں کرسکتا، عام لوگوں کو اس معاملہ میں کامل کی پیروی کرنی پڑتی ہے۔

دوسری خصوصیت: انسان کو اللہ تعالیٰ نے چند ایسی صفات سے بہرہ ور کیا ہے، جن کا انداز جانوروں کی صفات کے انداز سے جدا ہے۔ وہ صفات یہ ہیں (۱) تشوّق (۲) ظرافت (۳) عدالت (۴) سماحت (۵) ملکوت و جبروت کی روشنیوں کا ظاہر ہونا یعنی دعاؤں کا قبول ہونا، کرامتوں کا ظاہر ہونا، اور احوال و مقامات کا پیش آنا۔ جن کی تفصیل آگے آئے گی۔

ولما كان الإنسان مع حساسه وتحركه، وقبوله للإلهامات الجبلية والعلوم الطبيعية، ذا عقل وتوليد للعلوم الكسبية، ألهمه الزرع، والغرس، والتجارة، والمعاملة، وجعل منهم السيد بالطبع والاتفاق، والعبد بالطبع والاتفاق، وجعل منهم الملوك والرعية، وجعل منهم الحكيم المتكلم بالحكمة الإلهية، والطبيعية، والرياضية، والعملية، وجعل منهم غبي الذي لا يهتدي لذلك إلا بضرب من تقليد؛ ولذلك ترى أمم الناس من أهل الوادي والحضر متواردين على هذه.

وهذا كله شرح الخواص والتدبيرات المقررة، المتعلقة بقوته البهيمية، وارتفاقاته المعاشية، ثم انتقل إلى قوته الملكية واعلم أن الإنسان ليس كسائر أنواع الحيوان، بل له إدراك أشرف من إدراكاتهم

ومن علومه التي يتوارد عليها أكثر أفراده، غير من غشيت مذلته أحكام نوعه:

[۱] التفتيش عن سبب إيجاده وتربيته.

[۲] والتنبيه بإثبات مدبر في العالم، هو أوجده ورزقه.

[۳] والتضرع بين يدي بارئه ومدبره بهيئته وعلمه، حسب ما يتضرع إليه هو وجميع أبناء

تشریح:

(۱) "فطری طور پر، اتفاق سے" یعنی کسی میں آقا بننے کی فطری صلاحیت ہوتی ہے، وہ باکمال، صاحب ثروت اور فہم و بصیرت کا مالک ہوتا ہے، اور کسی کو ان باتوں میں سے کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا مگر اتفاق سے وہ آقا کا لڑکا ہوتا ہے، اس لئے آقا بن جاتا ہے۔

اسی طرح کسی میں فطری طور پر غلام بننے کی صلاحیت ہوتی ہے، وہ محنت ہی کر سکتا ہے، دانا و سمجھدار نہیں ہو سکتا اور کوئی اتفاق سے یعنی کسی جنگ میں گرفتار ہونے کی وجہ سے یا غلام زادہ ہونے کی وجہ سے غلام بن جاتا ہے۔

(۲) علم الٰہی (الٰہیات) وہ حکمت نظری ہے جس میں ایسے موجودات واقعیہ کے احوال سے بحث کی جاتی ہے جن کو وجود میں لانا ہمارے بس کی بات نہیں، اور وہ دونوں وجودوں (وجود خارجی اور وجود ذہنی) میں مادہ کے محتاج نہیں ہوتے، جیسے اللہ تعالیٰ کہ وہ خارج میں بھی بلا مادہ موجود ہیں اور جب ان کا تصور کیا جاتا ہے تو بھی بلا مادہ ہوتا ہے (مزید تفصیل کے لئے معین الفلسفہ ص ۲۸ دیکھیں)

(۳) علم طبیعی: وہ حکمت نظری ہے جس میں ایسے موجودات واقعیہ کے احوال سے بحث کی جاتی ہے، جن کو وجود پذیر کرنا ہماری قدرت سے باہر ہے، اور وہ چیزیں دونوں وجودوں میں مادہ کی محتاج ہوتی ہیں۔ جیسے انسان، کہ اگر خارج میں پایا جائے گا تو گوشت پوست اور ہڈیوں کی مخصوص شکل میں ہوگا، اور اگر اس کا تصور کیا جائے گا تو بھی اسی شکل میں ہوگا، مادہ سے مجرد کر کے ہم انسان کا تصور نہیں کر سکتے۔ یہی حال تمام اشیائے دنیویہ اور مرکبات عنصریہ کا ہے (معین الفلسفہ ص ۴۲)

(۴) علم ریاضی: وہ حکمت نظری ہے جس میں ایسے موجودات واقعیہ سے بحث کی جاتی ہے، جن کو موجود کرنا ہماری قدرت و اختیار میں نہیں ہے اور وہ چیزیں وجود ذہنی میں تو کسی مخصوص مادہ کی محتاج نہیں، مگر وجود خارجی میں مخصوص مادہ کی محتاج ہیں، جیسے عدد اور علم ہندسہ کی اشکال، کہ ان کا تصور تو مخصوص مادہ کے بغیر کیا جا سکتا ہے، مگر خارج میں مادہ کے بغیر موجود نہیں ہو سکتیں (مزید تفصیل کے لئے دیکھیں معین الفلسفہ ص ۳۳)

(۵) حکمت عملیہ: جن موجودات حقیقیہ کو وجود پذیر کرنا ہماری قدرت و اختیار میں ہے، ان کے واقعی احوال کو اس حیثیت سے جاننا کہ ان پر عمل کرنے سے ہماری دنیا اور آخرت سنور جائے گی، حکمت عملیہ ہے، جیسے اصول شرعیہ: نماز، روزہ وغیرہ اور اعمال حسنہ اور سیئہ کی معرفت اور ان پر عمل پیرا ہونا۔ پھر حکمت عملیہ کی تین قسمیں ہیں: تہذیب اخلاق، تدبیر منزل اور سیاست مدنیہ (تفصیل کے لئے دیکھیں معین الفلسفہ ص ۳۲)

باقی ترجمہ: اور یہ سب تفصیل ان خصوصیات کی وضاحت ہی ہو رہی ہے جن کا تعلق انسان کی قوت سمجھ سے اور اس کی دنیوی تدبیرات کا تعلق سے ہے۔ اور جان لیجئے کہ انسان حیوانات کی دیگر اقسام کی طرح نہیں، بلکہ اس کو حیوانات کے ادراک سے بڑھ کر ادراک حاصل ہے۔

ظاہر ہوں یعنی دعا کی قبولیت اور دیگر کرامات واحوال ومقامات۔

تشریح:

(۱) خشوع یعنی اللہ کے سامنے نیاز مندی۔ نظافت یعنی پاکی۔ عدالت یعنی انصاف اور سماحت یعنی عالی ظرفی۔ یہ چار صفات انسان کی خصوصی صفات ہیں۔ ان کی پوری وضاحت مبحث رابع کے باب رابع (رحمۃ اللہ: ۵۴۰) میں ہے۔

(۲) جبروت: اللہ تعالیٰ کی ذات سے تعلقات رکھنے والے معاملات۔ ملکوت: فرشتوں سے تعلق رکھنے والے معاملات۔ ناسوت: انسان یعنی انسان سے تعلق رکھنے والے معاملات۔ مقامات واحوال: احسان (تصوف) کے ثمرات ونتائج، جیسے اللہ کی محبت، اللہ پر اعتماد وغیرہ جن کی تفصیل جلد دوم میں ابواب الاحسان کے تحت المقامات والاحوال کے عنوان سے آرہی ہے (دیکھیں رحمۃ اللہ ۳۱۲-۵۱۰)

(۳) انسان کی ماہیت حیوان ناطق ہے۔ اس میں حیوان جنس ہے، یعنی جو مخلوقات حیوانیت میں شریک ہیں وہ سب انسان کی جنس کے بیٹے ہیں۔ اور ناطق فصل ہے، مخصوص بنتی ہے، جس جتنے افراد ناطق ہیں وہ سب انسان کی نوع کے بیٹے ہیں۔ اول کو "ابنائے جنس" اور دوم کو "ابنائے نوع" کہتے ہیں۔

لغات:

فحص وافتحص عنہ: سوال کرنا، بحث کرنا ۔ نبھہ: واقف کرنا، جتلانا ۔ ذکی (صفت) تیز، ذکی یذکی ذکاءً: تیز خاطر ہونا ۔ خلص (ن) خلوصا: خالص ہونا تخلص من کذا الی کذا منتقل ہونا ۔ تفرس: علامت سے کوئی چیز پہچاننا ۔ خفیف: فعیل بمعنی فاعل، ھاتف (اسم فاعل) جس کی آواز سنائی دے، مگر بولنے والا دکھائی نہ دے ۔ فطن (ن س ک) ادراک کرنا، سمجھنا ۔ حلی جلاءً: بڑے مرتبہ والا ہونا۔

تصحیح: لہ قوۃ التخلص مطبوعہ نسخوں میں لتخلص تھا تصحیح مخطوطہ کراچی سے کی ہے۔

☆ ☆ ☆

انسانی امتیازات کا خلاصہ

انسان کی امتیازی صفات، جن کی وجہ سے وہ دیگر حیوانات سے ممتاز ہوتا ہے، بہت ہیں۔ مگر ان کا خلاصہ اور نچوڑ دو باتیں ہیں: (۱) قوت عقلیہ کی فراوانی (۲) اور قوت عملیہ کی برتری۔ پھر ہر ایک کے دو دو پہلو ہیں۔ تفصیل درج ذیل ہے:

① قوت عقلیہ کی زیادتی: قوت عقلیہ اللہ نے ہر حیوان کو دی ہے، تمام جانور اپنا نفع ونقصان سمجھتے ہیں، بھینس چرتے چرتے کوئی گھاس چھوڑ دیتی ہے، وہ جانتی ہے کہ وہ گھاس اس کے کھانے کی نہیں۔ مگر انسان کو اللہ تعالیٰ نے قوت عقلیہ وافر مقدار میں بخشی ہے اور یہی اس کا امتیاز ہے۔ پھر انسان کی قوت عقلیہ کے دو پہلو ہیں۔

(الف) عقل معاش: یعنی دنیوی عقل، یہ وہ عقل ہے جو دنیا کے گورکھ دھندوں میں لگی رہتی ہے، ہر وقت راحت رسانی کے سامان ایجاد کرنے کی فکر میں لگی رہتی ہے، اور ارتفاقات کی باریکیاں تلاش کرتی رہتی ہے یعنی نت نئی ایجادات کی دھن میں لگی رہتی ہے۔

(ب) عقل معاد: یعنی اخروی عقل، یہ وہ عقل ہے جو علوم شرعیہ میں مشغول رہتی ہے۔ یہ علوم اللہ تعالیٰ نے انسانیت کو اس کی اخروی بھلائی کے لئے بخشے ہیں۔

نوٹ: انسان کا کمال عقل کے دونوں پہلوؤں کو ساتھ لے کر چلنا ہے، عقل کو صرف دنیا کے پیچھے لگا دینا کسی طرح قرین عقل نہیں۔

(۲) قوت عملیہ کی برتری: اللہ تعالیٰ نے انسان کو حیوانات سے کچھ زائد قوت عمل نہیں دی، ہاتھی گھوڑے، بیل، بھینسے انسان سے زائد کام کرتے ہیں، بلکہ انسان کا امتیاز قوت عمل کی برتری، فوقیت اور عظمت ہے۔ قوت عمل کے بھی دو پہلو ہیں:

(الف) انسان کا اختیار و ارادہ کے گلے کی راہ سے اعمال کو نگل لینا —— انسان اور جانوروں کے اعمال میں فرق یہ ہے کہ حیوانات اپنے کئے ہوئے اعمال کے اثرات کو قبول نہیں کرتے، ان کے اعمال ان کے نفس کی تہ میں نہیں پہنچتے، نہ ان کے نفوس اعمال کی رنگ سے رنگین ہوتے ہیں۔ اور انسان اپنے کئے ہوئے اعمال کا عرق نچوڑ کر پی لیتا ہے، اس کا دل اس کے اعمال سے متاثر ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے جانور ایک ہی غلطی بار بار کرتا ہے، اور انسان ایک بار غلطی کرنے کے بعد سنبھل جاتا ہے، مثلاً بھینس بھڑک جاتی ہے اور اپنی جولانی میں کسی کو زخمی کر دیتی ہے یا مار دیتی ہے تو اس کے دل پر کوئی اثر نہیں ہوتا، چنانچہ وہ یہی غلطی روز بروز کر سکتی ہے، مگر انسان سے اگر یہ غلطی ہو جائے تو وہ نہایت پشیمان ہوتا ہے اور عہد کرتا ہے کہ وہ آئندہ کبھی یہ غلطی نہیں کرے گا۔

یہی حال اعمال صالحہ کا ہے، جانور کو کسی بھی عمل صالح سے خوشی نہیں ہوتی، کیونکہ اس کے دل نے اس عمل کا اثر قبول نہیں کیا، ایک شیر نے ایک صحابی کو اپنی پشت پر بٹھا کر قافلہ تک پہنچا دیا تھا، مگر وہ اپنے اس کارنامہ کی اہمیت سے ناواقف تھا، اگر یہی کارنامہ کوئی انسان انجام دیتا تو پھولا نہ سماتا، بلکہ وہ کارنامہ اس کی سوانح میں لکھا جاتا۔

غرض حیوانات کے اعمال وجود پذیر ہو کر روح ہوائی یعنی نسمہ کے قویٰ سے چپک جاتے ہیں، پھر فنا ہو جاتے ہیں، اس لئے وہی عمل دوبارہ کرنے میں حیوان کو کوئی بات محسوس نہیں ہوتی، اور انسان کے اعمال بھی اگرچہ وجود پذیر ہو کر ختم ہو جاتے ہیں مگر ان کی روح نفس پی لیتا ہے، اس لئے اچھے اعمال سے نفس میں نور، اور برے اعمال سے نفس میں تاریکیاں پیدا ہوتی ہیں۔

اس کے بعد فصل دخل مقدر کے طور پر ایک سوال کا جواب ہے۔

سوال: شاہ صاحب رحمہ اللہ نے حیوانات کے اعمال اور انسان کے اعمال میں جو فرق بیان کیا ہے اس کا مقتضیٰ یہ ہے کہ انسان کو اس کے ہر عمل پر جزا یا سزا ملے خواہ اس نے وہ فعل اختیار و ارادہ سے کیا ہو یا جبراً کرایا ہو، یا بھول چوک سے، کیونکہ اس کے ہر فعل کی روح اور اسپرٹ نفس میں ضرور پہنچتی ہے، اس لئے کہ یہی انسانی اعمال کا امتیاز ہے، حالانکہ روایات میں صراحت ہے کہ بھول سے یا چوک سے یا کرا دے جو کام کرایا جاتا ہے اس پر مؤاخذہ نہیں، مؤاخذہ کے لئے شرط ہے کہ انسان نے وہ عمل ارادہ و اختیار سے کیا ہو۔

جواب: پہلے دو باتوں میں فرق سمجھ لیں۔ ایک ہے کسی چیز کا فی نفسہ حکم، دوسری ہے اس چیز کا ثمرہ اور نتیجہ، جیسے طعام و شراب کی فی نفسہ خاصیت شکم سیر کرنا اور سیراب کرنا ہے۔ رہی یہ بات کہ کھانے پینے سے کب روزہ ٹوٹے گا اور کب نہیں ٹوٹے گا؟ یہ طعام و شراب کا نتیجہ ہے، شریعت نے روزہ ٹوٹنے کے لئے تعمد کو شرط قرار دیا ہے، پس بھول کر کھانے پینے سے روزہ نہیں ٹوٹتا مگر شکم سیر اور سیراب تو اس صورت میں بھی ہو جاتا ہے۔ یعنی جو طعام و شراب کا فی نفسہ حکم ہے وہ تو پایا جائے گا۔

دوسری مثال: اطباء کہتے ہیں کہ زہر جان ہلاک ہے اور تریاق نفع بخش ہے یعنی اس سے سانپ کا کاٹا اچھا ہو جاتا ہے، یہاں دونوں چیزوں کی فی نفسہ تاثیر کا بیان ہے، مگر ان کا ثمرہ ظاہر ہونے کے لئے ان کا کھانا پینا شرط ہے، شیشی میں رکھے ہوئے زہر سے کوئی نہیں مرتا، اور کٹورے میں دھرے تریاق سے کوئی سانپ کا کاٹا شفایاب نہیں ہوتا، مگر زہر کی فی نفسہ زہرناکی اور تریاق کا فی نفسہ نفع ہونا ان کے کھانے پینے پر موقوف نہیں۔

اسی طرح اعمال انسانی کی فی نفسہ تاثیرات وہ ہیں جو اوپر بیان کی گئیں۔ رہی یہ بات کہ ان پر کب مؤاخذہ ہوگا اور کب نہیں ہوگا؟ اس کے لئے شریعت نے شرط لگائی ہے کہ جب انسان ان کو ارادہ و اختیار سے کرے گا تب مؤاخذہ ہوگا ورنہ نہیں، مگر اعمال کی اپنی تاثیرات تو مؤاخذہ نہ ہونے کی صورت میں بھی موجود ہوں گی، مگر شریعت نے کسی مصلحت سے مؤاخذہ اٹھا دیا۔ (جواب پورا ہوا)

اوپر جو حیوانات اور انسان کے اعمال کے درمیان فرق بیان کیا گیا ہے اس کی واضح نشانی یہ ہے کہ ساری دنیا کے لوگ عبادتوں اور ریاضتوں کے قائل ہیں، کیونکہ وہ وجدانی طور پر ان کے انوار محسوس کرتے ہیں، اسی طرح معاصی اور منہیات سے احتراز کے بھی قائل ہیں۔ کیونکہ وہ وجدانی طور پر گناہوں کی نحوست دل میں محسوس کرتے ہیں، پس ثابت ہوا کہ اعمال انسانی کا اثر درون پر پڑتا ہے، کیونکہ تمام لوگوں کا اتفاق بلاوجہ نہیں ہو سکتا۔

(ب) انسان اپنی قوتِ عملیہ سے جو عبادتیں اور ریاضتیں کرتا ہے اس سے احوالِ رفیعہ پیدا ہوتے ہیں جیسے اللہ کی محبت، اللہ پر اعتماد کا بڑھنا اور حیوانات کے اعمال سے اس قسم کے متعلق اثرات پیدا نہیں ہوتے۔ یہ انسان کی قوتِ عمل کی برتری ہے۔

والأمورُ التي يمتازُ بها الإنسانُ من سائر افراد الحيوان، كثيرةٌ جدًا، لكنّ جماعَ الأمر وملاكَه خصلتان:

أحدهما: زيادة القوة العقلية، ولها شُعبتان:

[۱] شعبةٌ قائمة في الارتفاقات لمصلحة نظام البشر، واستنباط دقائقها.

[۲] وشعبة مستعدةٌ للعلوم الغيبية، القائضة بطريق الوهب.

وثانيهما: براعة القوة العملية، ولها أيضاً شعبتان:

[۱] شعبة: هي انطلاقها للأعمال من طريق العزم اختيارها وإرادتها، فالبهائم تفعل أفعالاً بالاختيار، ولا تدخل أفعالها في جذر أنفسها، ولا تلوّن أنفسُها بأرواح تلك الأفعال، وإنما تلتصق بالقوى القائمة بالروح الهوائي فقط، ليسهل عليها صدورُ أمثالها؛ والإنسان يفعل أفعالاً، فتفنى الأفعالُ، وتنزع منها أرواحُها، فتلقفها النفسُ، فتظهر في النفس: إما نور، وإما ظلمة.

ولمّوثّ الشرع: شرطُ التّصوّر حذوة على الأفعال: أن يفعلها بالاختيار بمنزلة قول الطبيب: شرطُ التضرّر بالسّمّ، والانتفاع بالترياق أن يدخلا في الحلقوم، ويتركا في الجوف.

وأمارةُ ما قلنا: من أن النفس الإنسانية تبلُغ أرواحَ الأعمال: ما اتفق عليه أُممُ بني آدم: من عمل الرياضات والعبادات، ومعرفة أنوارِ كلِّ ذلك وجدانًا، ومن الكفّ عن المعاصي والمنهيات، ورؤية قسوة كلِّ ذلك وجدانًا.

[۲] وشعبةٌ: هي أحوال ومقامات سنية، كمحبة الله، والتوكل عليه، مما ليس في البهائم جنسُها.

ترجمہ: اور وہ باتیں جن کی وجہ سے انسان حیوان کے دیگر افراد سے ممتاز ہوتا ہے، بہت زیادہ ہیں، مگر ان کا خلاصہ اور نچوڑ دو باتیں ہیں:

ان میں سے ایک: قوتِ عقلیہ کی زیادتی ہے، اور اس کی دو شاخیں ہیں:

ایک شاخ: انسانوں کے نظام کی مصلحت کے لئے تدبیرات نافعہ میں، اور اس کی باریکیاں مستنبط کرنے میں ڈوبنے والی ہے۔

اور دوسری شاخ: ان علوم غیبیہ (علوم وہبیہ) کے لئے مستعد ہے، جن کا فیضان بطور بخشش ہوتا ہے۔

اور ان میں سے دوسری: قوتِ عملیہ کی برتری ہے، اور اس کی بھی دو شاخیں ہیں:

ایک شاخ: قوتِ عملیہ کا اعمال کو نکالنا ہے، اپنے اختیار اور اپنے ارادے کے گلے کی راہ سے، پس چوپائے اختیار سے

اعمال کرتے ہیں اور ان کے اعمال ان کے نفس کی جڑ میں داخل نہیں ہوتے اور ان کے نفوس ان اعمال کی روح سے رنگین نہیں ہوتے۔ وہ اعمال بس ان قوتوں کے ساتھ چپک جاتے ہیں جو فقط روح ہوائی (نسمہ) کے ساتھ قائم ہیں (حیوانات میں روح ربانی نہیں) چنانچہ ان سے ان کے مانند افعال کا صادر ہونا آسان ہو جاتا ہے۔ اور انسان بھی اعمال کرتا ہے، پس وہ فنا ہو جاتے ہیں اور ان میں سے اسپرٹ کھینچ لی جاتی ہے، جس کو نفس نگل لیتا ہے، چنانچہ نفس میں یا تو نور یا تاریکی ظاہر ہوتی ہیں۔

اور شریعت کا ارشاد کہ ”اعمال پر مواخذہ کے لئے شرط یہ ہے کہ آدمی نے وہ اعمال اختیار سے کئے ہوں“ یہ قول طبیب کے اس قول جیسا ہے کہ: ”زہر سے نقصان پہنچنے کے لئے اور تریاق سے فائدہ حاصل کرنے کے لئے شرط یہ ہے کہ دونوں چیزیں گلے میں داخل ہوں اور پیٹ میں اتریں“

اور اس بات کی نشانی جو ہم نے کہی کہ ”انسان کا نفس اعمال کی روح کو نگل لیتا ہے“ وہ ہے جس پر انسانوں کے تمام گروہوں نے اتفاق کیا ہے یعنی ریاضتیں اور عبادتیں کرنا اور وجدان سے ان میں سے ہر ایک کے نور کو پہچاننا اور گناہوں اور ممنوعات سے بچنا اور وجدان سے ان میں سے ہر ایک کی تاریکی کو دیکھنا۔

اور دوسری شاخ: وہ بلند احوال ومقامات ہیں، جیسے اللہ کی محبت اور اللہ پر بھروسہ۔ ان احوال میں سے جزئیات پائی ، مطلق نہیں پائے جاتے۔

لغات:

الجماع (مصدر) جامع: ہر چیز کی جڑ حدیث میں ہے الخمر جماع الإثم: شراب گناہ کی جڑ بنیاد ہے۔ ملاک الأمر: معاملہ کا مدار ۔۔۔ غاص یغوص غوصا فی الماء: پانی میں غوطہ لگانا۔ برع (ن ک) براعۃ: علم یا فضیلت یا جمال میں کامل ہونا۔ بلع (ف) بلعا وابتلع الشیئ: نگلنا۔ البلعم والبلعوم: حلق مجرائے طعام، بلعم اللقمۃ: نگلنا۔ فنی وفنی یفنی فناء: معدوم ہونا۔ السَنِیّ: عالی مرتبہ مؤنث سَنِیّۃ، سنی (س) سناءً: بلند مرتبہ ہونا۔ ظلمۃ: تاریکی۔ تضرر: نقصان پہنچنا۔ أمارۃ مبتدا ما اتفق خبر۔ حسبما بھانتم سے بدل ہے یعنی مواقع تک یہ باتیں مطلق نہیں پائی جاتیں۔

تصحیح: وأما ظلمۃ مطبوعہ نسخہ میں وإما ظلمۃ (جمع) ہے تصحیح مخطوطہ کراچی سے کی ہے۔ من أن النفس الإنسانیۃ تبلع أرواح الأعمال مطبوعہ نسخہ میں أن النفس الإنسانیۃ تبلع من أرواح الأعمال تھا، یہ تصحیح بھی مخطوطہ کراچی سے کی ہے۔

☆ ☆ ☆

انسان کی تربیت کے لئے شریعت ضروری ہے

کیف خلق اللہ الخلق؟ اور کیف دبّر اللہ الخلق؟ کی تفصیل گزر چکی۔ اب نیا عنوان شروع ہوتا ہے اور وہ ہے الانسان یحتاج فی تربیتہ الی الشریعۃ یعنی انسان کی تربیت کے لئے ایک قانون ضروری ہے۔ کیونکہ انسان کے مزاج میں ایک نوعی قسم کا اعتدال ہے، جو دیگر حیوانات کی بہ نسبت اکمل ہے۔ اور یہ مزاج کا اعتدال اس کی صورت نوعیہ کی دین ہے یعنی انسان کا مزاج نہایت درجہ معتدل اس لئے ہے کہ وہ "انسان" ہے۔

انسان کے مزاج کا یہ اعتدال چار چیزوں کا مرہون منت ہے یعنی چار باتیں پائی جائیں گی تو اس کا مزاج معتدل رہے گا ورنہ اعتدال باقی نہ رہ سکے گا۔ وہ چار باتیں یہ ہیں:

(۱) انسان کے لئے کچھ ایسے علوم ضروری ہیں جو اللہ کی طرف سے نازل ہوئے ہوں، جن کو انبیائے کرام نے پوری توجہ سے حاصل کئے ہوں اور وہ دوسروں کو پہنچائے ہوں اور دوسروں نے ان علوم میں انبیاء کی تقلید کی ہو۔

(۲) انسان کے پاس ایسی شریعت اور قانون ہو، جو علوم ربانیہ اور معارف الٰہیہ پر مشتمل ہو، اور اس قانون میں آرام سے زندگی گزارنے کی مفید تدبیریں بھی ہوں۔

(۳) انسان کے لئے ایسے قواعد وضوابط ضروری ہیں، جو اس کے افعال اختیاریہ سے بحث کریں اور ان کو اقسام خمسہ: واجب، مستحب، مباح، مکروہ اور حرام میں تقسیم کریں، تاکہ انسان واجب، مستحب اور مباح پر درجہ بدرجہ عمل کرے اور مکروہ اور حرام سے بچے۔

(۴) سلوک کی کچھ ابتدائی تمہیدی باتیں بھی اس کو بتلائی جائیں، جن میں احوال ومقامات کی وضاحت ہو۔

مذکورہ چاروں باتیں انسان کے مزاج میں اعتدال پیدا کرنے کے لئے اور پھر اس کو برقرار رکھنے کے لئے ضروری ہیں، انہی امور اربعہ سے انسان کے مزاج میں وہ اعتدال پیدا ہوگا جو اس کی صورت نوعیہ کا مقتضی ہے۔ اس لئے حکمت خداوندی میں ضروری ہوا کہ اللہ تعالیٰ اپنے علم ازلی میں انسان کی قوت منقلبہ کی روزی کا سامان کریں۔ اور اس کو بہترین انسان پوری طرح متوجہ ہوکر حاصل کرے اور وہ علوم دوسروں کو پہنچائے، اور دوسرے لوگ ان علوم میں اس کی پیروی کریں یعنی سلسلۂ نبوت کا آغاز کیا جائے اور مذکورہ علوم نازل کئے جائیں تاکہ انسان کی پرورش کا سامان ہو۔ غرض جس طرح شہد کی مکھیوں کے نظم وانتظام کے لئے یعسوب کا ہونا ضروری ہے، اسی طرح انسانوں کے لئے نبی کی شخصیت ضروری ہے۔

اس کی مثال یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کوئی گھاس خور مخلوق پیدا کریں تو ساتھ ہی ایسی چراگاہ بھی پیدا کرنا ضروری ہے جس میں وافر مقدار میں گھاس موجود ہو، ایسی چراگاہ کے بغیر اس حیوان کی تربیت ناممکن ہے، کیونکہ گھاس کے بغیر وہ مخلوق کیسے جیئے گی؟!

غرض چراگاہ کا وجود اس حیوان کی پلاننگ میں داخل ہے۔ اسی طرح جب اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا اور اس کو ایک مخصوص قسم کی صورت نوعیہ دی، جو خاص علوم کی مقتضی ہے تو ضروری ہوا کہ اس کو مذکورہ علوم دیے جائیں، خواہ بلا واسطہ یا بالواسطہ، تاکہ وہ کمال مقدر حاصل کر سکے، کیونکہ ان علوم کے بغیر کمال مقدر حاصل کرنا ممکن نہیں۔ غرض انسان کی پلاننگ میں ان علوم کا دیا جانا بھی شامل ہے اور ان علوم پر عمل کرنے ہی کا نام "تکلیف شرعی" ہے۔ پس ثابت ہوا کہ انسان کا مکلف ہونا اس کی پلاننگ کا ایک جزء ہے۔

واعلم أنه لما كان اعتدالُ مزاج الإنسان بحسب ما تعطيه الصورةُ النوعيةُ، لا يتم إلا:

[١] بعلوم يتخلص إليها أزكاهم، ثم يقلده الآخرون.

[٢] وشريعة تشتمل على معارف إلٰهية، وتدبيرات ارتفاقية،

[٣] وقواعد تبحث عن الأعمال الاختيارية، وتقسّمها إلى الأقسام الخمسة: من الواجب، والمندوب إليه، والمباح، والمكروه، والحرام.

[٤] ومقدمات تبيّن مقامات الإحسان.

وجب في حكمة الله تعالى، ورحمته، أن يهيّئ في غيب قدسه رزق قوته العقلية، يتخلّص إليه أزكاهم، فيتلقاه من هنالك، وينقاد له سائر الناس، بمنزلة ما ترى في نوع النحل من يعسوب يدبّر لسائر أفرادها.

لولا هذا التلقي بواسطة، ولا بواسطة، لم يتكمّل كماله المكتوبُ له، فكما أن المستبصر إذا رأى نوعا من أنواع الحيوان لا يعيش إلا بالحشيش، استيقن أن الله دبّر له مرعىً، فيه حشيش كثير، فكذلك المستبصر في صنع الله يستيقن أن هنالك طائفةً من العلوم، يتلقاها العقلُ عنه، فيكمل كماله المكتوبُ له.

ترجمہ: اور جان لیجئے کہ جب صورت نوعیہ کی ڈیزائن کے موافق انسان کے مزاج کا اعتدال تکمیل پذیر نہیں ہو سکتا تھا مگر:

(۱) ایسے علوم کے ذریعہ جن کی طرف انسانوں میں سے نہایت ستھرا انسان پوری طرح متوجہ ہو، پھر دوسرے اس کی پیروی کریں۔

(۲) اور ایسی شریعت کے ذریعہ جو معارف ربانیہ اور تدبیرات نافعہ پر مشتمل ہو۔

(۳) اور ایسے قوانین کے ذریعہ جو انسان کے اعمال اختیاریہ سے بحث کریں، اور ان کو اقسام خمسہ: واجب، مندوب، مباح، مکروہ اور حرام کی طرف تقسیم کریں۔

(۴) اور ایسی تمہیدی باتوں کے ذریعہ جو سلوک کے مقامات کی وضاحت کریں۔

تو حکمت خداوندی اور مہربانی میں ضروری ہوا کہ وہ اپنی ذات مقدسہ کے علم ازلی میں انسان کی قوت عقلیہ کی روزی کا سامان کریں، جس کی طرف انسانوں میں سے پاکیزہ ترین شخصیت پوری توجہ کرے، پس اس کو وہاں سے حاصل کرے اور تمام لوگ اس شخصیت کی تابعداری کریں، جیسے آپ دیکھتے ہیں شہد کی مکھیوں میں کہ یعسوب کا ہونا ضروری ہے، جو اس کے تمام افراد کا نظم و انتظام کرے۔

اگر نہ ہوتا یہ علوم کا حاصل کرنا، بالواسطہ یا بلاواسطہ تو نہ پورا ہوتا انسان کا وہ کمال جو اس کے لئے لکھ دیا گیا ہے۔ پس جس طرح یہ بات ہے کہ جب کوئی غور و فکر کرنے والا حیوانات کی انواع میں سے کسی نوع کو دیکھتا ہے کہ وہ گھاس کھائے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی تو وہ یقین کر لیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے ضرور کسی ایسی چراگاہ کا انتظام کیا ہوگا جس میں وافر مقدار میں گھاس موجود ہو، پس اسی طرح اللہ تعالیٰ کی کاریگری میں غور و فکر کرنے والا یقین کرتا ہے کہ وہاں (یعنی نفس الامر میں) علوم کا ایک حصہ ہے، جس سے عقل اپنی حاجت روائی کر سکتی ہے، اور اس کا وہ کمال تکمیل پذیر ہو سکتا ہے جو اس کے لئے مقدر کیا گیا ہے۔

لغات:

حسب: اندازہ، کسی چیز کی مقدار یا تعداد جیسے الأجر بحسب العمل اور کہا جاتا ہے هذا بحسب ذلك: یہ اس کے موافق ہے، اسی طرح حسبما ذکر میں بھی یہی لفظ ہے، اردو میں بھی حسب حال کہتے ہیں طلبہ بھی سین پر جزم پڑھ ڈالتے ہیں یہ غلطی ہے تخلص إلى كذا: خَلَص ہوا خلص (ن) خُلُوْصًا إلى المكان: پہنچنا سَدَّ (ن) سدًّا الثلمة رخنہ درست کرنا سدّ الباب دروازہ بند کرنا .. الخلة حاجت جمع خلال اور خلل۔

تشریح:

(۱) بشر یعة کا عطف معلومہ پر ہے، باء حرف جر ہے اور قواعد اور مقدمات کا عطف بھی اسی پر حرف جر کا اعادہ کئے بغیر ہے۔

(۲) وجب الخ لما کان کی جزاء ہے۔

(۳) بالواسطہ علوم کی تلقی کرنے والے انبیاء کی امتیں ہیں اور بلاواسطہ تلقی کرنے والے خود انبیائے کرام ہیں۔ انبیائے کرام خود اپنی شریعتوں پر عمل کرنے کے مکلف ہوتے ہیں۔

(۴) نفسهما میں ھما ضمیر مقدمات قواعد کی طرف، اور ھا ضمیر الاعمال کی طرف راجع ہے۔

تصحیح: مطبوعہ نسخہ میں تعبیرات إتفاقیا اور مقامات للإحسان تھا۔ تصحیح مخطوطہ کراچی سے کی ہے۔

☆ ☆ ☆

انسان کی تربیت کے لئے پانچ علوم ضروری ہیں

انسان کی تربیت وتکمیل پانچ علوم پر موقوف ہے، جو درج ذیل ہیں۔

(۱) توحید وصفات کا علم۔ یعنی یہ جاننا ضروری ہے کہ معبود صرف ایک ہستی ہے، بندگی اسی کا حق ہے، کوئی اور بندگی کا سزاوار نہیں اور اس معبود میں یہ یہ صفات ہیں یعنی وہ ہستی ان ان خوبیوں کی مالک ہے اور وہ ہر طرح کے نقائص سے پاک ہے۔

اور یہ علم اس لئے ضروری ہے کہ انسان مخلوق ہے اور اللہ تعالیٰ خالق ہیں، مخلوق اگر خالق کو نہ پہچانے تو وہ کیا کمال حاصل کرسکتی ہے؟! اور صرف پہچاننا بھی سودمند نہیں، اپنی تمام نیازمندیاں اسی کے لئے مخصوص کرنا ضروری ہے، ورنہ دربدری ٹھوکریں کھانے کے سوا حاصل کیا ہوگا؟! اسی طرح صفات حسنیٰ کا علم بھی ضروری ہے، کیونکہ انسان کی تربیت کا تعلق صفات سے بھی ہے، جو اللہ تعالیٰ کو علیم وخبیر مانے گا کبھی خلوت وجلوت میں اس کے احکام کی تعمیل کرے گا۔ جو اللہ کی رزاقیت پر مطمئن ہونے کے بعد ہی ناخداؤں سے رشتہ توڑے گا۔ غرض صفات جاننے پر یہ بات موقوف ہے کہ بندوں کو اللہ کے ساتھ کس قسم کا معاملہ کرنا چاہئے۔

مگر ذات وصفات کا علم دقیق ترین علم ہے کیونکہ انسان معقولات کو بھی محسوسات کے ذریعہ سمجھنے کا عادی ہے اور ذات وصفات وراء الوراء ہیں، محسوسات سے ان کی کوئی مشابہت نہیں، پھر انسان سمجھے تو کیسے سمجھے؟ مگر بہرحال ان کی معرفت بھی ضروری ہے اور ہر شخص کے لئے ضروری ہے، اس لئے قرآن وحدیث میں یہ مسئلہ نہایت وضاحت سے سمجھایا گیا ہے۔

پہلے دو مختصر جملوں میں ساری بات سمجھا دی ہے، فرمایا: سبحانہ وبحمدہ (اللہ پاک ہیں اور خوبیوں کے ساتھ متصف ہیں) یعنی ان کی ذات ہر نقص وعیب اور ہر کمی سے پاک ہے، اس میں تو صفات سلبیہ کی طرف اشارہ ہے، اور وہ اپنی تعریف کے ساتھ ہیں، اور تعریف اسی ہستی کی جاتی ہے جو خوبیوں کے ساتھ متصف ہو، یہ تمام صفات ثبوتیہ کی طرف اشارہ ہے۔

پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے لئے وہ صفات ثابت کیں، جو انسانوں میں صفات مدح سمجھی جاتی ہیں، مثلاً زندگی، سننا، دیکھنا، قادر ہونا، ارادہ کرنا، بات کرنا، غصہ ہونا، خوش ہونا، مہربانی کرنا، بادشاہ ہونا، بے نیاز ہونا وغیرہ۔ اور ساتھ ہی یہ ضابطہ سمجھا دیا کہ "اللہ کے مانند کوئی چیز نہیں" تاکہ اللہ کی صفات کو سمجھنے میں انسان غلطی نہ کرے، پھر اس "مانند ہونے" کو بھی کھول کر سمجھا دیا کہ وہ جانتے ضرور ہیں مگر ان کا جاننا ہمارے جاننے کی طرح نہیں۔ وہ بارش کے قطروں کی گنتی، بیابان کے ریت کی مقدار اور درختوں کے پتوں کا شمار اور جانداروں کی سانسوں کی گنتی بھی جانتے ہیں۔ وہ دیکھتے ضرور

ہیں مگر ان کا دیکھنا ہمارے دیکھنے کی طرح نہیں ہے، وہ تاریک رات میں چیونٹی کے رینگنے کو بھی دیکھتے ہیں۔ وہ سنتے یقیناً ہیں مگر ان کا سننا ہمارے سننے کی طرح نہیں، وہ کواڑ بھڑے ہوئے کمروں میں لحافوں کے نیچے دلوں کی دھڑکن کو بھی سنتے ہیں۔ اسی طرح دیگر صفات میں بھی عدم مماثلت واضح فرمادی تاکہ انسان اللہ تعالیٰ کی صفات کو اپنی صفات جیسا نہ سمجھ بیٹھے۔ شرک کی دلدل یہیں سے شروع ہوتی ہے، مشرکین اللہ کی صفات کا کماحقہ ادراک نہیں رکھتے۔ اس لئے وہ شرک کی گندگی میں مبتلا ہیں۔

(۲) عبادتوں کا علم: یعنی بندوں کو پروردگار کی بندگی کس طرح کرنی چاہئے؟ اس کی درست صورتیں کیا ہیں؟ اور غلط طریقے کیا ہیں؟ کیونکہ غلط طریقوں سے بندگی کرنے سے بجائے تقرب کے دوری پیدا ہوتی ہے۔

(۳) تدبیرات نافعہ کا علم: انسان کو اللہ کی بندگی اور آخرت کے کاموں کے لئے پیدا کیا گیا ہے، مگر اسے ایک وقت تک دنیا میں رہنا ہے اس لئے ارتفاقات کا علم بھی ضروری ہے، جیسے مدارس عربیہ کے طلبہ کا مقصد حیات دین پڑھ کر دین کی خدمت کرنا ہے، مگر ان کو دنیا سے بھی سابقہ پڑتا ہے، اس لئے ضروری دنیوی علوم، بالخصوص ارتفاقات کا علم ضروری ہے، تاکہ دنیوی زندگی میں ان کو کسی الجھن سے دوچار نہ ہونا پڑے۔

(۴) استدلال کا علم: یعنی جب کسی اسلامی مسئلہ میں معقول لوگوں کو شبہات پیش آئیں، اور وہ اسلام پر اعتراضات کریں تو ان کی عقدہ کشائی کیسے کی جائے؟ قرآن کریم میں مشرکین، یہود ونصاریٰ اور منافقین کے شکوک وشبہات کا قلع قمع کیا گیا ہے۔ یہ استدلال کا علم بھی انسان کے لئے ضروری ہے۔

(۵) پندو موعظت کا علم: لوہے کی طرح دل بھی زنگ آلود ہوتا ہے، دنیا کی مشغولیتوں سے دل سخت ہو جاتا ہے، اس لئے وقتاً فوقتاً پندو موعظت ضروری ہے، قرآن بھی درمیان درمیان کلام میں یہ کام کرتا ہے اور رسول اللہ ﷺ بھی وقفہ وقفہ سے وعظ کہتے تھے اور پندو موعظت تین قسم کے مضامین سے کی جانی چاہئے:

(۱) انسان کو اللہ کی نعمتیں یاد دلائی جائیں۔ مشہور مقولہ ہے: الإنسان عبد الإحسان یعنی احسان مند ہونا انسان کی خصوصیت ہے، اس لئے جب اس کو اللہ کی نعمتیں یاد دلائی جائیں گی تو اس میں ضرور شکر گزاری کا جذبہ پیدا ہوگا۔

(۲) وہ واقعات بیان کئے جائیں جو حق وباطل کی کشمکش کے نتیجہ میں پیش آئے ہیں، جن میں اہل حق کو نجات ملی ہے اور اہل باطل تباہ ہوئے ہیں۔ جیسے موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کا سمندر سے پار ہونا اور فرعونیوں کے قہر وعذاب سے بچ جانا، اور فرعون کا لاؤلشکر سمیت غرقاب ہو جانا اور صفحۂ ہستی سے مٹ جانا۔ غرض اس قسم کے واقعات بھی پندو موعظت میں مفید ہیں، کیونکہ انسان کے سامنے جب عواقب اعمال کے نمونے پیش کئے جاتے ہیں تو اس کا دل پگھل جاتا ہے۔

(۳) مرنے کے بعد قبر میں، پھر قیامت کے میدان میں جو احوال پیش آئیں گے۔ اسی طرح جہنم اور اس کی ہولناکیوں کا تذکرہ کرنے سے بھی دل متأثر ہوتا ہے، اور آدمی میں آخرت کے لئے تیاری کرنے کی فکر پیدا ہوتی ہے۔

وتلك الطائفة:

منها : علم التوحيد والصفات: ويجب أن يكون مشروحا،يشرح ينالُه العقل الإنساني بطبيعته، لامُغْلَقا لاينالُه إلا من يَنْدُرُ وجودُ مثله؛ فَشَرَح هذا العلمَ بالمعرفة المشار إليها بقوله: "سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ" فأثبت لنفسه صفاتٍ يعرفونها ويستعملونها بينهم: من الحياة والسمع، والبصر، والقدرة، والإرادة، والكلام، والغضب،والسُّخط، والرحمة، والمُلْك، والغِنى؛ وأثبت مع ذلك: أنه ليس كمثله شيئ في هذه الصفات، فهو حيٌّ لاكحياتنا، بصير لاكبصرنا،قدير لاكقدرتنا، مريد لاكإرادتنا، متكلم لاككلامنا، ونحوُ ذلك؛ ثم فَسَّر عدمَ المماثلة بأمور نَسْتَبْعِدُها في جنسنا، مثلُ أن يقال: يَعلم عددَ قَطْرِ الأمطار، وعددَ رمل الفيافيْ، وعددَ أوراقِ الأشجار، وعددَ أنفاس الحيوانات، ويبصر دَبِيْبَ النمل في الليلة الظَّلْماء، ويسمع ما يُتَوَسْوَس به تحت اللُّحُف،في البيوت المُغْلَقة عليها أبوابُها،ونحو ذلك.

ومنها: علم العبادات.

ومنها: علم الارتفاقات.

ومنها : علم المخاصمة، أعني: أن النفوس السِّفْلية إذا تولَّدت بينها شُبُهاتٌ، تُدافع بها الحقَّ، كيف يُحل تلك العُقَد؟

ومنها: علم التذكير بآلاء الله، وبأيام الله، وبوقائع البرزخ والحشر.

ترجمہ: اور وہ مجموعہ علوم یہ ہیں:

ان میں سے ایک: توحید وصفات کا علم ہے، اور ضروری ہے کہ اس کی اس طرح وضاحت کی جائے کہ انسانی عقل اپنی فطری صلاحیت سے سمجھ لے، ایسا مغلق انداز بیان نہ ہو کہ جسے وہ لوگ ہی سمجھ سکیں جن کے مانند کا پایا جانا نادر ہے (یعنی شاذ ونادر لوگ ہی سمجھ سکیں) چنانچہ اس علم کی تشریح کی اس معرفت کے ذریعہ جس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے سبحان اللہ وبحمدہ سے، پس اللہ نے اپنے لئے وہ صفات ثابت کیں جن کو لوگ جانتے ہیں، اور جن کو باہم استعمال کرتے ہیں یعنی زندہ ہونا، سننا، دیکھنا، قادر ہونا، ارادہ کرنا، بات کرنا، غصہ ہونا، ناراض ہونا، مہربانی کرنا، بادشاہ ہونا اور بے نیاز ہونا، اور اسی کے ساتھ ثابت کیا کہ اللہ کے مانند ان صفات میں کوئی چیز نہیں۔ پس وہ زندہ ہیں مگر ہمارے زندہ ہونے کی طرح نہیں، وہ دیکھنے والے ہیں مگر ہمارے دیکھنے کی طرح نہیں، وہ قدرت والے ہیں مگر ہماری قدرت کی طرح نہیں، وہ ارادہ کرنے والے ہیں مگر ہمارے ارادہ کرنے کی طرح نہیں، وہ بات کرنے والے ہیں مگر ہمارے بات کرنے کی طرح نہیں، اور اس کے مانند، پھر اس "مانند نہ ہونے" کی تفسیر کی گئی ایسی چیزوں کے ذریعہ جن کو ہم مستبعد سمجھتے ہیں

ہماری جنس میں (یعنی انسانوں میں) جیسے یہ کہا جائے کہ وہ بارش کے قطروں کی تعداد، جنگل کے ریت کے ذروں کی مقدار، درختوں کے پتوں کا شمار اور حیوانات کے سانسوں کی گنتی جانتے ہیں۔ اور وہ تاریک رات میں چیونٹی کے رینگنے کو دیکھتے ہیں اور وہ ان باتوں کو سنتے ہیں جن کے پاس سے گزرتے ہیں، کانوں کے نیچے ایسے گھروں میں جن کے دروازے بھڑے ہوئے ہیں، اور اس کے مانند تعبیرات۔

اور ان میں سے ایک: محاوروں کا علم ہے۔

اور ان میں سے ایک: تدبیرات نافعہ کا علم ہے۔

اور ان میں سے ایک: جھگڑا کرنے کا علم ہے، میری مراد یہ ہے کہ معمولی وجہ کے لوگوں کے دلوں میں جب شبہات جم لیں، جس سے وہ حق کا مقابلہ کریں، تو ان رسیوں کو کیسے کھولا جائے؟

اور ان میں سے ایک: اللہ کی نعمتوں، اللہ کے دنوں اور برزخ اور حشر کے واقعات سے نصیحت کرنے کا علم ہے۔

تصحیح: نسخہ علمیہ میں جمعنا مطبوعہ نسخوں میں مستعدۃ تھی جمعنا تصحیح مخطوطہ کراچی سے کی ہے۔

☆ ☆ ☆

علم ازلی میں علوم خمسہ کی تعیین

اوپر جن علوم خمسہ کا ذکر آیا ہے، جو انسانوں کی تربیت کے لئے ضروری ہیں، وہ آدم علیہ السلام سے لیکر خاتم النبیین ﷺ تک سبھی امتوں کے لئے ضروری ہیں، ہر زمانہ میں یہی علوم نازل کئے گئے ہیں، البتہ ہر زمانہ کے لوگوں کی استعداد ملحوظ رکھ کر ان کی شرح کی گئی ہے۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ازل میں چند باتوں پر نظر ڈالی:

ایک: نوع انسانی پر، جو کہ وجود میں آنے والی ہے۔

دوسری: انسانوں کی اس استعداد پر جو ان میں برابر چلتی رہے گی، اور ایک دوسرے کا وارث ہوتا رہے گا۔

تیسری: انسانوں کی قوت مطلبیہ پر، کیونکہ اس کی غذا بھی فراہم کرنی ضروری ہے۔

چوتھی: اس تدبیر پر جو انسانوں کی اصلاح کے لئے ضروری ہے۔ یعنی مذکورہ علوم خمسہ ضروری ہیں جن کی ہر زمانہ کی استعداد کے مطابق شرح کی گئی ہے۔

مذکورہ چاروں باتوں پر نظر ڈالی کہ اللہ پاک کی ذات میں مذکورہ علوم خمسہ محدود و متعین ہو کر متمثل ہو گئے۔ یعنی ایک گونہ ان کا وجود ہو گیا۔ علوم خمسہ کا یہی وجود اشاعرہ کی اصطلاح میں "کلام نفسی" کہلاتا ہے اور وہ اسی کو قدیم مانتے ہیں اور یہی اللہ کی صفت کلام ہے جو اللہ کی صفات علم، ارادہ اور قدرت کے علاوہ ہے۔

فنظر الحق تبارك وتعالى في الأزل إلى نوع الإنسان، وإلى استعداده الذي يتوارثه أبناء النوع، ونظر إلى قوته الملكية، والتدبير الذي يصلحه من العلوم الخمسة حسب استعداده، فتمثلت تلك العلوم كلها في غيب الغيب محدودة ومخصصة، وهذا التمثل هو الذي يعبر عنه الأشاعرة بالكلام النفسي، وهو غير العلم، وغير الإرادة والقدرة.

ترجمہ: پس حق تبارک وتعالیٰ نے ازل میں دیکھا نوع انسانی کو، اور اس کی اس استعداد کو جس کے وارث ہوتے رہتے ہیں نوع کے افراد (یعنی جو استعداد نسلوں میں منتقل ہوتی رہتی ہے) اور اس کی قوت ملکیہ کو دیکھا، اور اس تدبیر کو دیکھا جو نوع انسانی کی اصلاح کرنے والی ہے یعنی وہ علوم (خمسہ) جن کی (مجرد ذات میں) انسان کی استعداد کے موافق تشریح کی گئی ہے۔ پس وہ تمام علوم مقررہ متعین ہوکر متمثل ہوگئے (یعنی پیکر موجود ہوگئے) غیب کے غیب میں (یعنی اللہ کے علم ازلی میں) اور اسی تمثل کو اشاعرہ "کلام نفسی" سے تعبیر کرتے ہیں، اور وہ علم کے علاوہ اور ارادہ وقدرت کے علاوہ صفت ہے۔

لغات:

توارث القوم: ایک دوسرے کا وارث ہونا — تمثل له الشيء: متصور ہونا — محدودة: حد کیا ہوا، احاطہ کیا ہوا
خصص الشيء: متعین کرنا۔

تشریح:

کلام نفسی وہ معانی ہیں جو متکلم کے دل میں ہوتے ہیں، جن پر الفاظ یا لکھنا یا اشارہ وغیرہ دلالت کرتے ہیں۔ اخطل کہتا ہے:

إن الكلام لفي الفؤاد وإنما — جعل اللسان على الفؤاد دليلا

اور اللہ تعالیٰ کی صفت کلام اور قرآن کریم کے قدیم ہونے کی بحث طویل ہے۔ شائقین حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی قدس سرہ کی کتاب جهد المقل في تنزيه المعز والمذل دیکھیں، وعلم کلام کی بڑی کتابیں دیکھیں۔ دستور العلماء (۳: ۴۳) میں بھی مختصر گفتگو ہے۔

☆ ☆ ☆

علوم خمسہ کا پہلا ظلی روحانی وجود

پھر جب کائنات کا آغاز ہوا اور ملائکہ کی تخلیق کا وقت آیا تو حق تعالیٰ کے علم ازلی میں یہ بات تھی کہ افراد انسانی کی بہبودی کے لئے ملائکہ کا وجود ضروری ہے۔ ملائکہ کا تعلق انسانوں سے گہرا ہے جیسے ہمارے قویٰ عقلیہ کا ہم سے۔ انسان: انسان ہی عقل وفہم سے ہے، عقل نہ ہو تو انسان وحیوان میں کوئی فرق نہیں۔ فرشتوں کی اہمیت عقل جیسی سمجھی جاتی

نوع انسان سے تعلق سے ملائکہ کی ہے چنانچہ افراد انسانی پر مہربانی فرماتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کو کلمہ "کن" سے پیدا فرمایا، اور ان کے سینوں میں ان علوم خمسہ کا پیڑا امانت رکھ دیا، جو عالم مثال میں مقرر و متعین ہو کر متمثل ہو چکے تھے۔ اس طرح علوم خمسہ روحانی صورت میں متصور ہو گئے۔ اور ان ملائکہ کا ذکر اَلَّذِیْنَ یَحْمِلُوْنَ الآیۃ میں آیا ہے۔ یہ آیت پہلے ملا اعلیٰ کے باب میں گزر چکی ہے۔

ثم لما جاء وقت خلق الملائكة، علم الحقُّ ان مصلحة افراد الإنسان لاتتم الا بنفوس كريمة، نسبتها إلى نوع الإنسان كنسبة القوى العقلية في الواحد منا إلى نفسه، فأوجدهم بكلمة: ﴿كُنْ﴾ بمحض العناية بافراد الإنسان، فاودع في صدورهم ظلاً من تلك العلوم المحدودة المُخصّاة في غيب غيبه، فتصوَّرتْ بصورة رُوحية، وإليهم الإشارة في قوله تبارك وتعالى: ﴿الَّذِيْنَ يَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهُ﴾ الآية.

ترجمہ: پھر جب ملائکہ کی تخلیق کا وقت آیا تو حق تعالیٰ نے جانا کہ افراد انسانی کی مصلحت تکمیل پذیر نہیں ہو سکتی مگر چند ایسے نفوس کریمہ کے ذریعہ، جن کا تعلق نوع انسانی کے ساتھ ایسا ہے، جیسا ہم میں سے ایک آدمی کے قوی عقلیہ کا تعلق اس کی ذات سے، پس اللہ تعالیٰ نے ان ملائکہ کو پیدا فرمایا کلمہ "کن" سے محض انسان کے افراد پر مہربانی فرماتے ہوئے۔ پھر ان کے سینوں میں امانت رکھا ان علوم کے پیڑ کو، جو مقرر و متعین ہو چکے تھے غیب الغیب میں، پس وہ علوم روحانی صورت میں متصور ہو گئے۔ اور انہی ملائکہ کی طرف اشارہ ہے ارشاد باری تعالیٰ: اَلَّذِیْنَ یَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهُ الیٰ آخر الآیۃ میں۔

لغت: تصوَّر له الشیءُ: اس کے ذہن میں صورت آ گئی۔

☆ ☆ ☆

علوم خمسہ کا دوسرا روحانی وجود

پھر جب وہ ادوار آتے ہیں، جن کا تقاضا ہوتا ہے کہ ملتوں اور حکومتوں میں تبدیلی آئے تو ان علوم خمسہ کو دوسرا روحانی وجود دیا جاتا ہے۔ اور یہ وجود مفصل و مشرح ہوتا ہے یعنی ان ادوار کے موافق ان علوم خمسہ کی شرح و تفصیل کر دی جاتی ہے۔ پھر وہاں سے وہ علوم ہر زمانہ کے نبی پر نازل ہوتے ہیں، جیسے خاتم النبیین ﷺ کا دور آیا تو پورا قرآن ایک ساتھ لوح محفوظ سے سمائے دنیا پر شب قدر میں نازل کیا گیا۔ سورۃ الدخان آیات (۳-۴) میں اس کا تذکرہ ہے۔ یہ شریعت محمدیہ کا دوسرا روحانی وجود ہے۔ اسی طرح ہر پیغمبر کے زمانہ میں اس نبی کی شریعت کو پہلے دوسرا روحانی وجود بخشا جاتا ہے پھر وہ

شریعت اُس زمانہ کے پیغمبر پر نازل کی جاتی ہے۔

ثم لما جاء بعض القرانات المقتضية تغيير الدُّوَل والملل قضى بوجود روحاني آخر لتلك العلوم، فصارت مشروحة مفصلة بحسب مايليق بتلك القرانات، واليها الإشارة في قوله تعالى: ﴿إِنَّا أَنزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةٍ مُّبَارَكَةٍ، إِنَّا كُنَّا مُنذِرِينَ، فِيهَا يُفْرَقُ كُلُّ أَمْرٍ حَكِيمٍ﴾

ترجمہ: پھر جب بعض وہ قرانات (زمانے) آتے ہیں جو ملتوں اور حکومتوں میں تبدیلی کے مقتضی ہوتے ہیں تو اللہ تعالیٰ اُن علوم کے لئے ایک دوسرے روحانی وجود کا فیصلہ فرماتے ہیں، پس وہ علوم اُن قرانات کے حسب حال مفصل و مشرح ہوجاتے ہیں۔ اور انہی قرانات کی طرف اشارہ آیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ میں کہ: ''بیشک ہم نے اس کو (لوح محفوظ سے آسمان دنیا پر) ایک برکت والی رات (یعنی شب قدر میں) اتارا ہے، بیشک ہم آگاہ کرنے والے ہیں، اس رات میں (اس میں اشارہ ہے ادوار کی طرف) ہر حکمت والا معاملہ طے کیا جاتا ہے۔

تشریح:

(۱) دُوَل اور دُوَل جمعیں ہیں دَولۃ کی، جس کے معنی ہیں ادلنے بدلنے والی چیز۔ جو کبھی ایک کے پاس ہو تو کبھی دوسرے کے پاس، جیسے مال اور حکومت وغیرہ۔ یہاں حکومتیں مراد ہیں۔ اور المِلَل جمع ہے المِلّۃ کی، جس کے معنی ہیں مذہب شریعت۔

(۲) قرانات جمع ہے قرانۃ کی علم نجوم کی اصطلاح میں جب دو ستارے ایک برج میں ایک درجہ میں جمع ہوتے ہیں تو اس اجتماع کو قِرانہ اور نظر کہتے ہیں (دستور العلماء ۳: ۴۷ مادہ نظرات الکواکب)

پہلے باب رابع (صفت اللہ کے بیان) میں اس پر مفصل گفتگو گزری ہے کہ علویات کے سفلیات پر اثرات پڑتے ہیں۔ نیز حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کا رجحان ثبوت کی طرف ہے۔ قرانات کا ذکر اسی نقطۂ نظر سے سمجھنا چاہئے۔ حضرت اقدس مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس سرہ نے بھی ﴿فَلَا أُقْسِمُ بِمَوَاقِعِ النُّجُومِ، وَإِنَّهُ لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُونَ عَظِيمٌ﴾ (سورۃ الواقعہ آیات ۷۵، ۷۶) کی تفسیر میں علویات کی سفلیات پر تاثیر مانی ہے ان کے الفاظ یہ ہیں:

''سفلیات را اگرچہ انفعال نبود اما علویات را علویہ انفعال دادہ اند، و بہر تغیرے و انقلابے کہ در خاکدان زمین روی دہد منشأ آں دور در عالم اسباب ہمیں کواکب اند، کہ باطوار مختلف می آیند وی روند۔

عمدہ تغیرے و کلاں انقلابے کہ یکی از ''انقلاب ظہور قدم بآئینہ حدوث'' بروئے کار آمدہ نزول قرآنی است۔

نظر بریں زائچہ ایں انقلاب از جملہ زائچہا برتر باشد، وقتے ایں احتمال کہ از اجتماع جملہ نجوم بہیئت مخصوص ظہور فرمودہ، از جملہ تعجب نے کہ در حوادث عالم اثر بہم رساند احسن واعلیٰ باشد، بہر یں وجہ نقشے دیگر حوادث کہ مقسم بر تعداد انوار کرید،

تو جو بیانات ضمناً آئے ہیں وہ سب مسلوب ہیں ''حکم'' ہی ہیں (امداد الفتاوی سوال ۲ جواب سوال دوم)

(۳) بعض لوگ ''بابرکت رات'' سے شب براءت (پندرھویں شعبان) مراد لیتے ہیں۔ یہ تفسیر ضعیف اور شاذ تفسیر ہے۔ قابل التفات نہیں۔

(۴) المقصبة تمام نسخوں میں المقضیة تھا، تصحیح مخطوطہ کراچی سے کی ہے۔

☆ ☆ ☆

علوم خمسہ کا انبیاء پر نزول

علوم خمسہ کو دوسرا وجود حاصل ہو چکنے کے بعد حکمت خداوندی کسی ایسی شخصیت کے پائے جانے کی منتظر رہتی ہے، جس میں وحی قبول کرنے کی استعداد ہو، جس کی رفعت شان کا خطیرۃ القدس میں فیصلہ کیا جا چکا ہو۔ پھر جب ایسی شخصیت موجود ہو جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو برگزیدہ کر لیتے ہیں۔ اور اس کو اپنے کام کے لئے منتخب کر لیتے ہیں اور اس پر کتاب نازل فرماتے ہیں۔ اور لوگوں پر اس کی اطاعت ضروری قرار دیتے ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام کے قصہ میں سورۂ طٰہٰ آیت (۴۱) میں آیا ہے کہ ''میں نے تم کو اپنے لئے منتخب کیا'' اور آیت (۱۳) میں فرمایا گیا ہے کہ ''میں نے تم کو (نبی بنانے کے لئے) منتخب فرمایا ہے۔ پس (اس وقت) جو کچھ وحی کی جا رہی ہے اس کو سن لو'' ان آیات میں یہی مضمون ہے اور یہی معاملہ ہر نبی کے ساتھ پیش آتا ہے کہ اس کو نبوت کے لئے انتخاب کیا جاتا ہے۔

ثم انتظرت حكمة الله لوجود رجل زكي، يستعد للوحي، قد قُضي بعلوّ شأنه وارتفاع مكانته، حتى إذا وُجد: اصطنعه لنفسه، واتخذه جارحةً لإتمام مراده، وأنزل عليه كتابه، وأوجب طاعته على عباده؛ وهو قوله تعالى لموسى عليه السلام: ﴿وَاصْطَنَعْتُكَ لِنَفْسِي﴾

ترجمہ: پھر حکمت خداوندی انتظار کرتی ہے کسی ایسی پاکیزہ نفس پائے جانے والی شخصیت کے وجود کا، جو وحی کے لئے تیار ہو، جس کی بلندی شان اور رفعت مکانی کا فیصلہ ہو چکا ہو۔ یہاں تک کہ جب ایسی شخصیت پائی جاتی ہے تو اس کو اللہ تعالیٰ اپنے کام کے لئے منتخب فرما لیتے ہیں۔ اور اس کو اپنی مراد کی تکمیل کے لئے عضو (وسیلہ) بنا لیتے ہیں۔ اور اس پر اپنی کتاب نازل فرماتے ہیں۔ اور اس کی فرمانبرداری کو اپنے بندوں پر واجب کرتے ہیں۔ اور موسیٰ علیہ السلام سے اللہ پاک کا یہی ارشاد ہے کہ ''میں نے آپ کو منتخب فرمایا ہے''

☆ ☆ ☆

باب کا خلاصہ

باب کے تفصیلی مضامین کا ماحصل یہ ہے کہ (۱) اللہ تعالیٰ کے علم ازلی میں مذکورہ علوم خمسہ کی تعیین نوع انسانی پر مہربانی کی وجہ سے ہوئی ہے (۲) اور ملأ اعلیٰ کی تخلیق کا تقاضا نوع انسانی کی حاجت وضرورت نے کیا ہے (۳) اور ادوار اور زمانے بدلنے پر نئی شریعتوں کا اصرار نوع انسانی کے احوال نے کیا ہے —— پس انسانوں کو مکلف بنانا بلاوجہ نہیں، ان کا فطری تقاضا ہے۔ اور مخلوق کے فطری تقاضوں کی تکمیل اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ لی ہے۔ یہی تکلیف شرعی کی مضبوط دلیل ہے۔

اب یہ سوال کہ انسان پر نماز پڑھنا کیوں ضروری ہوا؟ اور رسول کی فرمانبرداری کیوں ضروری ہوئی؟ اور زنا، چوری وغیرہ کیوں حرام ہوئے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ جس طرح چوپایوں پر گھاس کھانا ضروری ہے، اور گوشت کھانا حرام ہے، اور درندوں پر گوشت کھانا ضروری ہے اور گھاس کھانا حرام ہے، اور شہد کی مکھیوں پر یعسوب کی اطاعت ضروری ہے، اور یہ سب باتیں فطرت کے تقاضے ہیں، اسی طرح انسان پر مذکورہ باتیں ضروری ہیں۔ وہ سب باتیں بھی انسان کی فطرت کے تقاضے ہیں۔ بس فرق اتنا ہے کہ حیوانات یہ علوم فطری الہامات سے حاصل کرتے ہیں، اور انسان وحی کے ذریعہ یا دوسروں کی پیروی کے ذریعہ حاصل کرتا ہے، یا غور وفکر سے معلوم کرلیتا ہے۔

فما أوجب تعيين تلك العلوم في غيب الغيب إلا العنايةُ بالنوع، ولا سأل الحقَّ فيضانَ نفوسِ الملأ الأعلى إلا استعدادُ النوع، ولا ألحَّ عند القرانات بنزول تلك الشريعة الخاصة إلا أحوالُ النوع: فلله الحجةُ البالغةُ!

فإن قيل: من أين وجب على الإنسان أن يُصلي؟ ومن أين وجب عليه أن يَنْقاد للرسول؟ ومن أين حُرِّم عليه الزنا والسرقةُ؟

فالجواب: وجب عليه هذه، وحُرِّم عليه ذلك، من حيث وجب على البهائم أن تَرْعى الحشيش، وحرم عليه أكلُ اللحم، ووجب على السَّبُع أن تأكل اللحم، ولا تَرْعى الحشيش، ومن حيث وجب على النَّحل أن يَتَّبِع اليعسوب: إلا أن الحيوانَ استوجب تلقِّيَ علومها إلهاما جِبِلِّيًّا، واستوجب الإنسانُ تلقِّيَ علومه كَسْبًا ونظرًا، أو وحيًا، أو تقليدًا، والله أعلم.

ترجمہ: پس نہیں واجب کیا غیب الغیب (یعنی علم باری تعالیٰ) میں ان علوم کی تعیین کو مگر نوع انسانی پر مہربانی نے۔ اور حق تعالیٰ سے نہیں درخواست کی ملأ اعلیٰ کی ارواح کے فیضان کی مگر نوع انسانی کی استعداد نے۔ اور اصرار سوال نہیں کیا مختلف ادوار میں خاص شریعتوں کا مگر نوع انسانی کے احوال نے۔ پس کامل برہان اللہ ہی کے لئے ہے!

پس اگر سوال کیا جائے کہ کہاں سے انسان پر واجب ہوا کہ وہ نماز پڑھے؟ اور کہاں سے اس پر واجب ہوا کہ وہ رسول کی اطاعت کرے؟ اور کہاں سے اس پر زنا اور چوری حرام ہوئے؟

تو جواب یہ ہے کہ اس پر یہ چیز واجب اور وہ چیز حرام ہوئی ہے جہاں سے چوپایوں پر گھاس چرنا واجب ہوا ہے اور ان پر گوشت کھانا حرام ہوا ہے۔ اور درندوں پر گوشت کھانا واجب ہوا ہے اور یہ بات ضروری ہوئی ہے کہ وہ گھاس نہ چریں، اور جہاں سے شہد کی مکھیوں پر واجب ہوا ہے کہ وہ اپنے سردار کی اتباع کریں۔ البتہ حیوان جبلی الہام سے اپنے علوم کو حاصل کرنے کا مستحق ہو جاتا ہے، اور انسان غور وفکر سے یا دوسرے کی تقلید سے اپنے علوم کو حاصل کرنے کا مستحق ہوتا ہے۔ باقی اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں۔

فائدہ: کسب لغوی معنی میں نہیں ہے، بلکہ یہ منطق کی اصطلاح ہے اور تفریع مترادف ہے۔ اور آخر میں واللہ اعلم مخطوطہ کراچی سے بڑھایا ہے۔

باب — ۸

تکلیفِ شرعی جزاوسزا کو چاہتی ہے

اور

مجازات کی چار وجوہ ہیں

انسان کو اس کے اعمال کا اچھا یا برا بدلہ ضرور ملنے والا ہے، جیسی کرنی ویسی بھرنی۔ اور مجازات چار وجوہ سے ہوتی:

(۱) مجازات انسان کی صورت نوعیہ کا تقاضا ہے۔

(۲) مجازات ملأ اعلیٰ کی وجہ سے بھی ہوتی ہے۔

(۳) مجازات نازل کردہ شریعت کی وجہ سے بھی ہوتی ہے۔

(۴) مجازات تعلیمات انبیاء کی وجہ سے بھی ہوتی ہے۔

مذکورہ بالا مجازات کی وجوہ اربعہ کی تفصیل درج ذیل ہے۔

پہلی وجہ: مجازات صورت نوعیہ کا تقاضا ہے

انسان چونکہ انسان ہے اس لئے اس کے اعمال کا اچھا یا برا بدلہ ملنا ضروری ہے، اگر وہ کوئی اور جانور ہوتا تو مجازات

متوازن اعتدال چوپایا گر گھاس چرے اور درندہ گوشت کھائے تو دونوں تندرست رہتے ہیں کیونکہ یہی ان کی صورت نوعیہ کا مقتضی ہے اور اگر معاملہ برعکس ہو جائے تو دونوں بیمار ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح انسان اگر ایسے اعمال کرے جن کا نچوڑ، خلاصہ اور روح اخلاق اربعہ اور صفات حسنہ ہوں تو اس کا ملکی مزاج درست رہے گا اور بصورت دیگر اس کا ملکی مزاج بگڑ جائیگا اور جب تک وہ بقید حیات رہے گا اعمال بد کا اثر ظاہر نہ ہوگا۔ مگر جب علاقہ جسمانی سے رہا ہو جائیگا یعنی وفات پا جائے گا تو اس کو پورا احساس ہوگا کہ اس نے دنیا میں جو کام کئے تھے وہ اس کی ملکیت کے موافق نہیں تھے جس طرح جسم کو سن کر کے آپریشن کیا جائے تو تکلیف کا احساس نہیں ہوتا مگر دوا کا اثر زائل ہوتے ہی شدت کا درد اٹھتا ہے۔ اسی طرح دنیا کی مصروفیت احساس نہیں ہونے دیتی یہ غفلت دور ہوتے ہی احساس شروع ہو جائے گا۔

اور اخلاق اربعہ چار ہیں: (۱) پاکی اور اس کی ضد ناپاکی (۲) اخبات یعنی بارگاہ خداوندی میں نیازمندی، اور اس کی ضد الحاد اور دین حق کے سامنے اکڑنا (۳) سماحت یعنی سیر چشمی اور عالی ظرفی اور اس کی ضد شح یعنی انتہائی درجہ کی بخیلی (۴) العدل اور اس کی ضد نا انصافی ——— ان کا مفصل بیان آگے مبحث چہارم کے باب چہارم میں اور ابواب الاحسان کے بالکل شروع میں آئے گا۔

﴿باب اقتضاء التكليف المجازاة﴾

اعلم أن الناس مجزيون بأعمالهم، إن خيرا فخير، وإن شرا فشر، من أربعة وجوه:

أحدها: مقتضى الصورة النوعية، فكما أن البهيمة إذا علفت الحشيش، والسبع إذا علف اللحم، صلح مزاجهما؛ وإذا علفت البهيمة اللحم، والسبع الحشيش، فسد مزاجهما؛ فكذلك الإنسان إذا باشر أعمالا: أرواحها الخشوع لجناب الحق، والطهارة، والسماحة، والعدالة: صلح مزاجه الملكي؛ وإذا باشر أعمالا: أرواحها أضداد هذه الخصال، فسد مزاجه الملكي؛ فإذا تخفف عن ثقل البدن أحس بالملاءمة والمنافرة، شبه ما يحس أحدنا من ألم الإحراق.

ترجمہ باب: تکلیف شرعی کا مجازات کو چاہنا بیان یہ ہے کہ لوگوں کو ان کے کاموں کا بدلہ دیا جائے گا، اچھے اعمال کا اچھا بدلہ اور برے اعمال کا برا بدلہ، چار وجوہ سے:

ان میں سے ایک: صورت نوعیہ کا تقاضا ہے، پس جس طرح چوپایہ گھاس چرتا ہے اور درندہ گوشت کھاتا ہے تو دونوں کا مزاج درست رہتا ہے اور جب چوپایہ گوشت کھاتا ہے اور درندہ گھاس، تو دونوں کا مزاج بگڑ جاتا ہے، اسی طرح جب انسان ایسے کام کرتا ہے جن کی روح بارگاہ خداوندی میں عاجزی، پاکی، عالی ظرفی اور عدالت ہوتی ہے تو اس کا ملکوتی مزاج درست رہتا ہے اور جب وہ ایسے کام کرتا ہے جن کی روح مذکورہ اعمال کی ضد ہوتی ہے تو اس کا ملکوتی مزاج

ضرر ہوتا ہے۔ پھر جب وہ بدن کے بوجھ سے ہلکا ہوجاتا ہے یعنی مر جاتا ہے تو اس کو مناسب ہونے یا نامناسب ہونے کا احساس ہونے لگتا ہے جیسے (سُن کرنے والی دوا کا اثر ختم ہونے کے بعد) آدمی سے ہر شخص جلنے کی تکلیف محسوس کرنے لگتا ہے۔

تصحیح: لجذب الحق، مطبوعہ نسخوں میں بحذب الحق تھا۔ تصحیح مخطوطہ کراچی سے کی ہے۔

☆ ☆ ☆

دوسری وجہ: مجازات ملأ اعلیٰ کی وجہ سے بھی ہوتی ہے

جس طرح غلام، نوکر اور خدمت گزار اولاد کی خوش حالی ماں باپ کی دعاؤں کا ثمرہ ہوتی ہے اور نافرمان، ناہنجار اولاد کی تنگ حالی اور پریشان حالی ماں باپ کی آہوں کا اثر ہوتی ہے، اسی طرح جزاء وسزا کا ایک سبب ملأ اعلیٰ کی دعائیں اور لعنتیں بھی ہیں۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ ملأ اعلیٰ کا تعلق انسانوں سے بالکل ایسا ہے جیسا ہمارے قُوی ادراکیہ (عقل وفہم) کا ہم سے ہے۔ مثلاً ہمارا پاؤں چنگاری یا بچھو کے ڈنک پر پڑتا ہے تو دماغ میں امانت رکھے ہوئے قُوی ادراکیہ اس کو فوراً اور ذرا جان لیتے ہیں، ٹھیک اسی طرح ہمارے اچھے برے اعمال کا ملأ اعلیٰ فوراً ادراک کر لیتے ہیں۔

اس کی مزید تفصیل یہ ہے کہ کلی طبعی کے بارے میں متأخرین کا مذہب یہ ہے کہ وہ خارج میں نہیں پائی جاتی، یعنی مستقلاً اور اپنے افراد کے ضمن میں، خارج میں صرف کلی طبعی کے افراد پائے جاتے ہیں۔ وہ اسی کو مجازاً کلی طبعی کا پایا جانا کہتے ہیں (کلی کے متعلق جمہور کی یہی رائے ہے)

مگر عالم ملکوت میں تمام انواع پائی جاتی ہیں، نوع انسانی کی صورت بھی وہاں متحقق ہے، جس کو "انسان اکبر" کہتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی مہربانی نے اس صورت نوعیہ کے لئے خدام پیدا کئے ہیں، اور وہ ملائکہ ہیں، کیونکہ جس طرح انسان قُوی ادراکیہ (عقل وفہم) کے بغیر مفید نہیں ہوسکتا اسی طرح ملائکہ کے بغیر بھی انسان کارگزار نہیں بن سکتی۔

غرض جب کوئی انسان اچھا کام کرتا ہے تو وہ فرشتے اس کا ادراک کر لیتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں، اور جب برا کام کرتا ہے تو اس کا بھی ادراک کرتے ہیں اور ناخوش ہوتے ہیں، پھر اس خوشی اور ناخوشی کی لہریں چلتی ہیں اور اس عامل کے دل میں حلول کرتی ہیں، جس سے اس کے دل میں بہجت وسرور یا وحشت ونفرت پیدا ہوتی ہے، یہی اعمال کی جزاء وسزا ہے۔ اسی طرح وہ لہریں ملأ سافل کے دلوں میں بھی حلول کرتی ہیں، یعنی لوگوں کے دلوں میں اترتی ہیں اور وہ الہام کئے جاتے ہیں کہ وہ حضرات اس عمل کرنے والے سے محبت کریں اور اس کے ساتھ حسن سلوک کریں یا اس سے نفرت وبغض رکھیں

وراس کے ساتھ برا سلوک کریں۔

اور یہ بات ایک مثال سے سمجھئے: گرم مزاج کسی بیماری پر پڑتا ہے تو صفراوی قوتیں اور گرمی کے عوامل اس کا احساس کرتے ہیں، پھر دماغ سے اوپر اٹھتی ہیں اور دل میں گھٹتی ہیں تو دل ملول ہوتا ہے اور طبیعت میں گھٹن پیدا ہوتی ہے تو آدمی غم زدہ ہوجاتا ہے اسی طرح فرشتے بھی غم پا اثر انداز ہوتے ہیں۔

اور ہمارے ادراکات واحساسات کی اثر اندازی کی تفصیل یہ ہے کہ جب کسی شخص کو کوئی تکلیف یا رسوائی کا یقین ہو جائے تو اس کے مرنے کا خوف ستانے لگتا ہے، رنگ پیلا پڑ جاتا ہے، بدن کمزور ہوجاتا ہے اور کبھی آدمی بیمار ہوجاتا ہے، اس کا پیشاب سرخ ہوجاتا ہے اور کبھی وہ پیشاب کر دیتا ہے یا استطلاق ہو جاتا ہے، یہ سب قوی ادراکیہ کے طبیعت پر مرتب ہونے والے اثرات ہیں قوی طبیعت کو دعوت دیتے ہیں اور طبیعت اس کی تعمیل کرتی ہے اور قوی طبیعت پر غالب ہوتے ہیں اس لئے طبیعت متاثر ہوتی ہے۔

اسی طرح جو ملائکہ انسان کی خدمت کے لئے مامور ہیں ان کی طرف سے بھی فطری الہامات اور عملی تحریکات انسانوں پر بارش کی طرح پہنچتے ہیں، کیونکہ افراد انسان بمنزلہ طبیعت ہیں اور ملائکہ بمنزلہ قوی ادراکیہ کے ہیں اور قوی ادراکیہ کے اثرات طبیعت پر لامحالہ پڑتے ہیں۔

اور جس طرح یہ چیزیں نیچے کی طرف اترتی ہیں ان کا ایک رنگ عالم بالا کی طرف بھی چڑھتا ہے اور وہ حظیرۃ القدس میں پہنچ کر رحمت و رضا یا غضب و لعن کا سبب بنتا ہے، جیسے آگ سے پانی کا قرب اس میں گرم ہونے کی صلاحیت پیدا کرتا ہے، اور قیامت میں صوری کبریٰ نتیجہ تیار کرتے ہیں اور وہ بخشش خوب کو توڑ کر اللہ سے ملنا قبولیت کا تیار کرتا ہے۔

اسی طرح جبروت میں نئی صورت حال پیدا ہوتی ہے مثلاً بندے کے ناجائز کاموں سے خدا ناراض ہوتے ہیں، پھر جب بندہ توبہ کر لیتا ہے تو وہ ناراضگی ختم ہوجاتی ہے اسی طرح بندوں کے اچھے اطوار سے اللہ تعالیٰ مہربان ہوتے ہیں، پھر جب لوگ اپنے احوال بدل لیتے ہیں تو وہ رحمت غضب سے بدل جاتی ہے۔ سورۃ الرعد آیت ۱۱ میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: "بیشک اللہ تعالیٰ کسی قوم کی (اچھی) حالت میں تبدیلی نہیں کرتے جب تک کہ وہ لوگ خود اپنی (اچھی) حالت کو بدل نہیں دیتے۔"

اس مضمون بارے دلائل وہ تمام روایات ہیں جن میں آنحضور ﷺ نے اطلاع دی ہے کہ فرشتے انسانوں کے اعمال بارگاہ خداوندی میں پیش کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ فرشتوں سے دریافت کرتے ہیں کہ تم نے میرے بندوں کو کس حال میں چھوڑا؟ اور دن کے اعمال رات کے اعمال شروع ہونے سے پہلے ہی بارگاہ خداوندی میں پیش کر دیے جاتے ہیں۔ ان تمام روایات میں آنحضور ﷺ نے یہ مضمون سمجھایا ہے کہ انسانوں کے درمیان اور اللہ تعالیٰ کی اس تجلی کے درمیان جو حظیرۃ القدس کے بیچ میں قائم ہے فرشتوں کی ایک قسم کی وساطت پائی جاتی ہے۔

وثانيها: جهة الملأ الأعلى. فكما أن الواحد منا له قوى إدراكية، موضوعة في الدماغ، يُحس بها ما وقعت عليه قدمه من جمرة أو ثلجة، فكذلك لصورة الإنسان المتمثلة في الملكوت خدامٌ من الملائكة، أوجدها عناية الحق بنوع الإنسان، لأن نوع الإنسان لايصلح إلا بهم، كما أن الواحد منا لايصلح إلا بالقوى الإدراكية

فكلما فعل فرد من أفراد الإنسان فعلاً صالحا، خرجت من تلك الملائكة أشعة بهجة وسرور، وكلما فعل فعلاً مُهلكا، خرجت منها أشعة نفرة وبغض: فحلّت تلك الأشعة في نفس هذا الفرد، فأورثت بهجة أو وحشة، أو في نفوس بعض الملائكة، أو بعض الناس، فانعقد الإلهامُ أن يُحبّوه ويُحسنوا إليه، أو يُبغضوه ويُسيئوا إليه، شبه ما نرى من أن أحدنا إذا وقعت رجله على جمرة أحسّت قوته الإدراكية بألم الاحتراق، ثم خرجت منها أشعّة تؤثّر في القلب فيحزن، وفي الطبع فيُحَمّ.

وتأثير أولئك الملائكة فيما يشبه تأثير الإدراكات في أبداننا: فكما أن الواحد منا قد يتوقع ألمًا أو ذلاً، فترتعد فرائصه، ويصفرّ لونه، ويضعف جسده، وربما تسقط شهوته، ويختل سوله، وربما بال أو خرئ من شدة الخوف، فهذا كله تأثير القوى الإدراكية في الطبيعة، ونزولها إليها، وقهرها عليها، فكذلك الملائكة الموكلة ببني آدم، يترشح منها عليهم، وعلى نفوس الملائكة السفلية، إلهاماتٌ جبلية، وإحالات طبيعية؛ وأفرادُ الإنسان كلهم بمنزلة القوى الطبيعية لهذه الملائكة، وهذه الملائكة بمنزلة القوى الإدراكية لهم.

وكما تهبطُ تلك الأشعةُ إلى السفل، فكذلك تصعد إلى حظيرة القدس منها نوك، يُعِدّ لفيضان هيئة، تسمى بالرحمة والرضا، أو الغضب واللعن، مثلُ إعداد مجاورة النار الماء لتسخينه، وإعداد المقدمات للنتيجة، وإعداد الدعاء للإجابة، فيتحقق التجدُّد في الجبروت من هذا الوجه، فيكون غضبٌ ثم توبة، ويكون رحمةٌ ثم غضب. قال الله تعالى: ﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّىٰ يُغَيِّرُوا مَا بِأَنفُسِهِمْ﴾

ولقد أخبر النبيُّ صلى الله عليه وسلم في أحاديث كثيرة: أن الملائكة ترفع أعمال بني آدم إلى الله تعالى، وأن الله يسألهم: كيف تركتم عبادي؟ وأن عمل النهار يُرفع إليه قبل عمل الليل: فنبّه صلى الله عليه وسلم على ضرب من توسّط الملائكة بين بني آدم وبين نور الله القائم وسط حظيرة القدس.

تصحیح: (۱) فکما ان الواحد منا لہ قوی ادراکیۃ میں منا کے بجائے منہا تھا (۲) لصورۃ الانسان مطبوعہ نسخہ میں بصورۃ الانسان تھا (۳) حالات مطبوعہ نسخہ میں حالات تھا (۴) وھؤلاء الملائکۃ بمنزلۃ القوی الادراکیۃ ہونے کے شروع میں وھؤلاء الملائکۃ مطبوعہ نسخہ میں نہیں ہے (۵) بعضہ متاخر الادراکات اصل میں شبیۃ بالتغیر تھا (۶) اور غضب واللعن مطبوعہ میں او کے بجائے واو تھا —— یہ تمام اصلاحات مخطوطہ برلن سے کی گئی ہیں۔

☆ ☆ ☆

تیسری وجہ: مجازات شریعت منزلہ کی وجہ سے بھی ہوتی ہے

مختلف شریعتیں جو مختلف زمانوں میں نازل کی گئی ہیں، وہ بھی جزاؤ سزا کا ایک سبب ہیں۔ اور اس مضمون کو سمجھنے کے لئے پہلے ایک مثال پیش ہے: آپ کے اس ادارہ میں اس وقت دو قانون ہیں (۱) جو طالب علم پندرہ دن مسلسل غیر حاضر رہے گا اس کا نام کاٹ دیا جائے گا یعنی داخلہ ختم کر دیا جائے گا (۲) جس کی پورے سال کسی سبق میں کوئی غیر حاضری نہ ہوگی، اس کو سو روپے نقد انعام دیا جائے گا۔

یہ دونوں قانون پہلے نہیں تھے، اب حالات کے تقاضے سے یہ قوانین بنائے گئے ہیں، پہلے کوئی بھی طالب علم بغیر عذر کے سبق سے غیر حاضر نہیں رہتا تھا، کیونکہ وہ پڑھنے کے جذبے سے آتا تھا، مگر اب صورت حال وہ نہیں رہی تو ترغیب وترہیب کے لئے مذکورہ قوانین بنائے گئے ہیں۔ اب جبکہ یہ دونوں قانون بن گئے تو ان کی وجہ سے جزاؤ سزا ہوگی، اب ان کی غیر حاضری پر دفتر تعلیمات داخلہ ختم کر سکتا ہے، کسی کو اعتراض یا احتجاج کا حق نہ ہوگا۔ اور حاضر باش انعام کا مستحق ہوگا اور وہ اپنے حق کا مطالبہ بھی کر سکتا ہے۔ اور دور اول میں جبکہ یہ قوانین نہیں تھے نہ جزا تھی نہ سزا۔

اسی طرح آدم علیہ السلام کی شریعت میں بہن سے نکاح جائز تھا۔ کیونکہ اس وقت بہن کے علاوہ کوئی عورت نہیں تھی، بعد کی شریعتوں میں بہن سے نکاح حرام ہوگیا۔ اسی طرح یوسف علیہ السلام کی شریعت میں سجدہ تحیہ جائز تھا، ہماری شریعت میں حرام ہے۔ اور بنی اسرائیل کی شریعت میں غنیمت حلال نہیں تھی، آسمان سے سفید آگ آتی تھی اور اس کو جلا دیتی تھی، اب ہماری شریعت میں غنیمت حلال ہے۔

غرض مختلف زمانوں میں، ان زمانوں کے تقاضوں کے مطابق جو شریعتیں یعنی احکام وقوانین نازل کئے گئے ہیں ان پر عمل درآمد ضروری ہے، اس کی تعمیل باعث اجر اور خلاف ورزی باعث عقاب ہے، اگر یہ بات تسلیم نہ کی جائے تو قوانین بے فائدہ ہوکر رہ جائیں گے۔ شرائع منزلہ کے سبب مجازات ہونے کا یہی مطلب ہے۔

رہی یہ بات کہ مختلف زمانوں میں جو مختلف شریعتیں نازل کی جاتی ہیں، اس کی صورت کیا ہوتی ہے؟ شاہ صاحب اس کی صورت بیان فرماتے ہیں کہ جس طرح علویات کے سفلیات پر اثرات پڑتے ہیں یعنی جب ستاروں کی خاص

توجہات ہوتی ہیں تو اُن سے ایک روحانیت یعنی ایک غیر مرئی چیز وجود میں آتی ہے، جو مختلف ستاروں کی صلاحیتوں کا آمیزہ ہوتی ہے۔ یہ صلاحیت اولاً فلک کے کسی حصہ میں متحقق ہوتی ہے، پھر فلک کا ڈاکیہ یعنی چاند اس روحانیت کو زمین کی طرف منتقل کرتا ہے تو عالم زیریں کی چیزیں اس سے متاثر ہوتی ہیں یعنی زمینی مخلوقات کے جذبات اور ارادے اس روحانیت کے مطابق ڈھل جاتے ہیں۔

اسی طرح جو شخص اللہ کے معاملات کا علم رکھتا ہے، وہ جانتا ہے کہ جب ایک خاص وقت آتا ہے، جس کو قرآن کریم میں ''مبارک رات'' کہا گیا ہے، اور جس میں ہر دانشمندانہ معاملہ طے کیا جاتا ہے، اس رات میں فرشتوں کی دنیا میں ایک خاص روحانیت وجود میں آتی ہے، جو نوع انسانی کے احکام اور اس وقت کے تقاضوں سے مرکب ہوتی ہے، پھر وہ روحانیت الہام بن کر یعنی وحی کے ذریعہ ملکوت سے زمین پر ترشح ہوتی ہے۔ اس زمانہ میں جو سب سے زیادہ ذہین اور ستھرا شخص ہوتا ہے اس پر وحی نازل ہوتی ہے اور اس کے توسط سے وہ احکام دوسرے کم ذہین لوگوں تک پہنچتے ہیں۔ وہ لوگ سب سے پہلے اس دین وشریعت کو قبول کرتے ہیں، پھر عام طور پر لوگوں کے دلوں میں یہ بات ڈالی جاتی ہے کہ وہ اس دین کو پسند کریں اور اس کو قبول کریں۔ پس لوگ فوج در فوج دین میں داخل ہونے لگتے ہیں اور اس دین کے انصار کو قوت پہنچائی جاتی ہے اور مخالفین کو رسوائیوں سے دوچار کیا جاتا ہے۔ نیز ملأ سافل کو بھی الہام کیا جاتا ہے کہ اس دین کی تابعداری کرنے والوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کریں اور نافرمانوں کے ساتھ برا معاملہ کریں۔ پھر ملأ سافل کے اثرات کا ایک رنگ ملأ اعلیٰ کی طرف چڑھتا ہے اور حظیرۃ القدس میں پہنچتا ہے تو وہاں خوشنودی اور ناراضگی متحقق ہوتی ہے۔ جن سے اللہ پاک خوش ہوتے ہیں ان کو جزائے خیر عطا فرماتے ہیں اور جن کے اعمال سے ناراض ہوتے ہیں ان کو سزا دیتے ہیں۔ اس طرح شرائع منزلہ جزاؤ سزا کا سبب بن جاتی ہیں۔

وثالثها: مقتضى الشريعة المكتوبة عليهم: فكما يعرف المنجِّم: أن الكواكب إذا كان لها نظرٌ من النظرات، حصلت روحانيةٌ ممتزجةٌ من قواها، متمثلةٌ في جزء من الفلك، فإذا نقلها إلى الأرض ناقلُ أحكام الفلكيات، أعني القمر، انقلبت خواطرهم حسب تلك الروحانية.

فكذلك يعرف العارف بالله: أنه إذا جاء وقت من الأوقات — يُسمى في الشرع بالليلة المباركة، التي فيها يُفْرَق كلُّ أمر حكيم — حصلت روحانيةٌ في الملكوت، ممتزجةٌ من أحكام نوع الإنسان، ومقتضى هذا الوقت، يترشح من هنالك إلهاماتٌ على أذكى خلق الله يومئذ، وعلى نفوسٍ تليه في الذكاء بواسطته، ثم يُلهم سائرُ الناس قبولَ تلك الإلهامات، واستحسانها، ويؤيَّدُ ناصرُها، ويُخذَلُ معاندُها، وتُلْهمُ الملائكةُ السفليةُ الإحسانَ لمطيعها، والإساءةَ إلى عاصيها، ثم يصعد منها لونٌ إلى الملأ الأعلى وحظيرة القدس، فيحصل هنالك رضًا وسُخط.

ترجمہ: ان میں سے تیسری وجہ: اُس شریعت کا تقاضا ہے جو ان پر فرض کی گئی ہے، پس جس طرح علم نجوم کو جاننے والا جانتا ہے کہ جب ستاروں کے لئے تو جہات میں سے کوئی (مخصوص) توجہ ہوتی ہے[1] تو ایک روحانی چیز وجود میں آتی ہے، جو ان ستاروں کی صلاحیتوں کا آمیزہ ہوتی ہے، جو فلک کے کسی حصہ میں پائی جاتی ہے، پس جب اس روحانیت کو زمین کی طرف منتقل کرتا ہے فلکیات کے احکام کو منتقل کرنے والا یعنی چاند، تو لوگوں کے ارادے اس روحانیت کے مطابق پلٹ جاتے ہیں۔

پس اسی طرح اللہ کے معاملات کو جاننے والا، جانتا ہے کہ جب اوقات میں سے کوئی خاص وقت آتا ہے — جو شریعت کی اصطلاح میں "شب مبارک" کہلاتا ہے، جس میں ہر دانشمندانہ معاملہ طے کیا جاتا ہے — تو فرشتوں کی دنیا میں ایک روحانی چیز وجود میں آتی ہے، جو نوع انسانی کے احکام کا اور اس وقت کے تقاضے کا آمیزہ ہوتی ہے (یعنی اس میں دونوں باتوں کا لحاظ ہوتا ہے) (پھر) وہاں سے الہامات مترشح ہوتے ہیں، اس زمانہ میں اللہ کی خلقت میں سب سے زیادہ ذہین شخص پر، اور اس کے واسطے سے دوسرے ایسے لوگوں پر جو ذہانت میں اس کے لگ بھگ ہوتے ہیں، پھر دوسرے لوگ الہام کئے جاتے ہیں، ان الہامات کو قبول کرنے کا اور ان کو پسند کرنے کا، اور ان الہامات کا مددگار تائید کیا جاتا ہے اور اس کا مخالف رسوا کیا جاتا ہے، اور نچلے فرشتے الہام کئے جاتے ہیں اُن الہامات کی اطاعت کرنے والوں کے ساتھ حسن سلوک کرنے کا، اور ان کی نافرمانی کرنے والوں کے ساتھ برا برتاؤ کرنے کا، پھر ان ملائکہ سے ایک رنگ چڑھتا ہے ملاً اعلی اور حظیرۃ القدس کی طرف، پس وہاں خوشنودی اور ناخوشی وجود میں آتی ہے۔

لغات: امتزج بہ: ملنا ...... ذکی یذکی ذکاء: تیز خاطر ہونا بصفت ذکی جمع اذکیاء ...... تمثل الشیئ: تصور ہونا یعنی تصور کے درجہ میں پایا جانا، نفس الامر میں پایا جانا ...... قولہ: یترشح ۔ سے پہلے ف مقدر ہے۔

☆ ☆ ☆

چوتھی وجہ: مجازات تعلیمات انبیاء کی وجہ سے بھی ہوتی ہے

یہ مضمون بھی پہلے ایک مثال سے آسان طریقہ پر سمجھ لیں، نصاب میں دو قسم کی کتابیں ہیں:

(۱) مطالعہ کی کتابیں: طلبہ ان کتابوں کا اساتذہ کی نگرانی اور راہ نمائی میں مطالعہ کرتے ہیں، باقاعدہ وہ کتابیں پڑھائی نہیں جاتیں۔

(۲) درس کی کتابیں: جو باقاعدہ پڑھائی جاتی ہیں، اساتذہ انکے دقائق حل کرتے ہیں اور لفظ لفظ سمجھاتے ہیں۔

---

[1] نظر اور قران مترادف لفظ ہیں اور یہ علم نجوم کی اصطلاحیں ہیں، جب دو ستارے کسی ایک برج میں ایک درجہ میں اکٹھا ہوتے ہیں تو اس کو قران اور نظر کہتے ہیں مزید تفصیل دستور العلماء ۳: ۳۷ میں ہے ۱۲

امتحان دونوں قسم کی کتابوں کا ہوتا ہے مگر اول کا پرچہ آسان بنایا جاتا ہے اور جوابات کی جانچ بھی نرمی کی جاتی ہے اور دوسری قسم کی کتابوں کا پرچہ بھی سخت بنایا جاتا ہے اور جانچ بھی کس کر کی جاتی ہے۔ نیز دونوں کے نمبرات ترجیحی ہوتے ہیں اور دوم کے بنیادی امتحان پر ترقی اور تنزل کا مدار ہوتا ہے، کیونکہ جو طالب علم اتنی محنت اور دلسوزی سے پڑھائی ہوئی کتاب کو بھی یاد نہ کرے اور فیل ہو جائے، اس کی سزا تنزل کے سوا کیا ہو سکتی ہے؟!

اسی طرح جب کسی قوم پر اللہ تعالیٰ کی مہربانی مبذول ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ کو اس کے ساتھ خیر منظور ہوتی ہے اور اس قوم کی طرف نبی مبعوث کئے جاتے ہیں تاکہ وہ لوگوں کو خیر سے قریب کریں، اور نبی کی اطاعت ان پر فرض کی جاتی ہے تو جو علوم وحی کے ذریعہ اس نبی کو دئے جاتے ہیں تاکہ ان کے ذریعہ نبی قوم کی اصلاح کرے، وہ علوم متشخص و متعین ہو جاتے ہیں، نبی کی توجہ، محنت اور دعائیں ان علوم کے ساتھ مل جاتی ہیں، اللہ کی نصرت کا فیصلہ بھی ان کے ساتھ شامل ہو جاتا ہے پس یہ سب چیزیں نازل کردہ علوم کو مؤکد و متحقق کر دیتی ہیں، اب جو لوگ ان علوم کو حاصل کرتے ہیں، ان پر عمل پیرا ہوتے ہیں وہ دونوں جہاں میں کامیاب ہوتے ہیں اور جو اعراض کرتے ہیں وہ اپنی قسمت کو روتے ہیں۔ کیونکہ جب اللہ تعالیٰ نے ان کی ہدایات کا ہر قسم کا سامان کر دیا، نبی کو بھیجا، اس پر علوم نازل کئے، پھر نبی نے بھی محنت کرنے میں کسر نہ چھوڑی، اور بھی جو لوگ توجہ نہ کریں، ان ناقدروں کو سزا ملنی ہی چاہئے، اس طرح تعلیمات انبیاء بھی مجازات کا سبب بن جاتی ہیں۔

ورابعها: أن النبي إذا بعث في الناس، وأراد الله تعالى ببعثه لطفا بهم، وتقريبا لهم إلى الخير، وأوجب طاعته عليهم، صار العلم الذي يوحى إليه متشخصا متمثلا، وامتزج بهمة هذا النبي ودعائه، وقضاء الله تعالى بالنصر له، فتأكد وتحقق.

ترجمہ: اور ان میں سے چوتھی وجہ یہ ہے کہ جب پیغمبر لوگوں میں مبعوث کئے جاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ نبی کی بعثت کے ذریعہ لوگوں پر مہربانی کرنا چاہتے ہیں اور ان کو بھلائی سے قریب کرنا چاہتے ہیں اور نبی کی اطاعت لوگوں پر واجب کرتے ہیں تو وہ علم جو نبی کی طرف وحی کیا گیا ہے متشخص ہو کر موجود ہو جاتا ہے اور وہ علم مل جاتا ہے اس نبی کی پوری توجہ کے ساتھ، اس کی دعاؤں کے ساتھ اور اس علم کے لئے اللہ تعالیٰ کی نصرت کے فیصلہ کے ساتھ تو وہ علم مؤکد (پختہ) متحقق ہو جاتا ہے۔

لغات:

متشخصا (اسم مفعول) تشخص: متعین ہونا، ممتاز ہونا ... متمثلا (اسم مفعول) تمثل الشيئ: متصور ہونا، نفس الامر میں پایا جانا ... همة: پوری توجہ، یہ شاہ صاحب کی خاص اصطلاح ہے ... تأكد (فعل ماضی) تأكد وتوكد: مضبوط ہونا، ثابت ہونا ... تحقق (فعل ماضی) تحقق الخبر: ثابت ہونا۔

مختلف نہیں ہوتا اور تمام انبیاء ان باتوں میں متفق ہیں، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ: "یہ تمہارا یعنی سب انبیاء کا طریقہ ہے، جو کہ وہ ایک ہی طریقہ ہے" اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ: "تمام انبیاء علاتی بھائی ہیں، ان کا باپ ایک ہے اور مائیں مختلف ہیں" — اور اتنی مقدار پر مؤاخذہ ضرور ہونے والا ہے، بعثت انبیاء سے پہلے بھی اور بعد میں بھی یکساں طور پر۔

اور رہی تیسری وجہ سے مجازات تو وہ زمانوں کے اختلاف سے مختلف ہوتی ہے — اور زمانوں کا یہ اختلاف ہی بعثت انبیاء ورسل کا باعث ہے۔ اور اسی اختلاف اعصار کی طرف اشارہ آیا ہے اس ارشاد نبوی میں کہ:

"میری حالت اور اس دین کی حالت جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے مجھ کو مبعوث فرمایا ہے اس شخص جیسی ہے جو ایک قوم کے پاس آیا۔ پس اس نے کہا: اے میری قوم! میں نے دشمن کا لشکر اپنی دونوں آنکھوں سے دیکھا ہے اور میں ننگا (کھلم کھلا) ڈرانے والا ہوں، پس بچو! بچو! پس اس کی قوم کی ایک جماعت نے اس کی بات مان لی، سو وہ راتوں رات چلے، پس وہ چلتے رہے آہستہ آہستہ، پس نجات پالی انھوں نے۔ اور ان کی ایک جماعت نے جھٹلایا، پس انھوں نے وہیں صبح کی، پس شب خون مارا ان پر دشمن کے لشکر نے، پس ہلاک کر دیا ان کو اور جڑ سول سے اکھاڑ دیا ان کو، پس یہ مثال ہے اس شخص کی جس نے میری فرماں برداری کی پس اس نے پیروی کی اس دین کی جس کو میں لے کر آیا ہوں، اور یہ مثال ہے اس شخص کی جس نے میری نافرمانی کی، اور اس دین حق کو جھٹلایا جس کو میں لیکر آیا ہوں" (یعنی جب زمانہ بدلا اور ضرورت متقاضی ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا تا کہ لوگوں کو آنے والے خطرہ سے واقف کریں)

اور رہی چوتھی وجہ سے مجازات تو وہ بعثت انبیاء کے بعد اور شبہات کھلنے کے بعد اور اچھی طرح تبلیغ کرنے کے بعد ہی ہوتی ہے: "تا کہ جس کو برباد ہونا ہے وہ دلیل پہنچنے کے بعد برباد ہو، اور جس کو زندہ (ہدایت یافتہ) ہونا ہے وہ دلیل پہنچنے کے بعد زندہ ہو" (سورۃ الانفال آیت ۴۲)

لغات:

حدود اللہ: احکام شرعیہ..... من المحاملة میں ھی ضمیر اختلاف کی طرف لوٹتی ہے اختلاف مضاف نے تانیث مضاف الیہ الاعصار سے حاصل کی ہے، اس لئے مؤنث ضمیر استعمال کی ہے۔ الیہا کی ضمیر بھی اسی کی طرف لوٹتی ہے۔

تشریح:

ابوھم واحد کسی روایت میں نظر سے نہیں گزرا، مسلم شریف کی روایت کے الفاظ یہ ہیں الانبیاء إخوۃ من علّات، وأمہاتہم شتّی، ودینہم واحد۔ البتہ علّات کا مفہوم ابوھم واحد ہے۔

☆　☆　☆

باب — ۹

اللہ تعالیٰ نے لوگوں کی فطرت مختلف بنائی ہے

سب لوگوں کی جبلت اور فطرت یکساں نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ نے گلہائے رنگ رنگ سے چمن کو مزین کیا ہے اور جبلتوں کے اس اختلاف سے انسانوں کے احوال و اخلاق مختلف ہو گئے ہیں، نیز ان کے کمالات کے مراتب بھی مختلف ہو گئے ہیں۔ کوئی عام انسانی مرتبہ پر اٹک کر رہ جاتا ہے اور کوئی اتنا اونچا اڑتا ہے کہ اس کی نسبت پتہ لگانا ممکن نہیں ہوتا۔ یعنی کوئی آدمی ترقی میں کم ہے تو کوئی ترقی میں آگے ہے۔

فطرت اور جبلت کا یہ اختلاف درج ذیل دلائل سے ثابت ہے:

(۱) حدیث شریف میں ہے کہ اگر تم کسی پہاڑ کے بارے میں سنو کہ وہ اپنی جگہ سے ہٹ گیا ہے تو تم اس خبر کو مان سکتے ہو (کیونکہ پہاڑ کا اپنی جگہ سے ہٹ جانا نہ عقلاً ممتنع ہے نہ عادۃً، بلکہ ممکن ہے اور واقع ہے اور پہاڑ کبھی اپنی جگہ سے سرک جاتے ہیں) اور اگر تم کسی شخص کے بارے میں سنو کہ اس کی فطرت بدل گئی ہے تو یہ بات مت مانو (کیونکہ فطرت میں تبدیلی گو عقلاً ممتنع نہیں مگر عادۃً تبدیلی نہیں ہوتی) وہ شخص دکھاوے کی خاطر چند دن اس جبلت کی طرف ضرور لوٹے گا جس پر وہ پیدا کیا گیا ہے (کیونکہ مشہور ہے کہ خُلق مرکوز و جبلی کو، اور اہلِ کمال جو اخلاق بدلے ہوئے نظر آتے ہیں تو وہ تربیت کا اثر ہے اور تحریک کے وقت فطرت تربیت پر غالب آتی ہے۔ بادشاہ کی بلیوں نے جب چوہا دیکھا تھا تو وہ موم بتیاں پھینک کر چوہا پر جھپٹ پڑی تھیں)

(۲) آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ: "سنو! انسان مختلف المراتب پیدا کئے گئے ہیں" (مشکوٰۃ)

(الف) بعض مؤمن جنے جاتے ہیں (یعنی مسلمان والدین کے گھر میں یا اسلامی ماحول میں پیدا ہوتے ہیں) اور مؤمن جیتے ہیں اور مؤمن مرتے ہیں — اور بعض کافر جنے جاتے ہیں، کافر جیتے ہیں اور کافر مرتے ہیں — اور بعض مؤمن جنے جاتے ہیں، مؤمن جیتے ہیں اور کافر مرتے ہیں — اور بعض کافر جنے جاتے ہیں، کافر جیتے ہیں اور مؤمن مرتے ہیں۔

(ب) اور آپ ﷺ نے غصہ کے درجات کا ذکر فرمایا کہ بعض کو غصہ جلدی آتا ہے اور جلدی اتر جاتا ہے، پس ایک کی دوسرے سے تلافی ہو جاتی ہے — اور بعض کو غصہ دیر میں آتا ہے اور دیر میں اترتا ہے، پس ایک کی دوسرے سے تلافی ہو جاتی ہے — اور بہترین شخص وہ ہے جس کو غصہ دیر میں آئے اور جلدی اتر جائے — اور بدترین شخص وہ ہے جس کو غصہ جلدی آئے اور دیر میں اترے۔

(۲) اور آپ ﷺ نے قرض کے تقاضا کرنے کا تذکرہ فرمایا کہ بعض لوگ قرض کی ادائیگی میں اچھے ہوتے ہیں اور وصولی میں سخت ہوتے ہیں، گویا ایک کی دوسرے سے تلافی ہو جاتی ہے — اور بعض ادائیگی میں برے ہوتے ہیں اور وصولی میں نرم ہوتے ہیں، تو بھی ایک کی دوسرے سے تلافی ہو جاتی ہے — اور بہترین شخص وہ ہے جو ادائیگی میں بھی اچھا ہو اور وصولی میں بھی نرم ہو — اور بدترین شخص وہ ہے جو ادائیگی میں برا ہو اور تقاضا کرنے میں بھی سخت ہو۔

یہ سب جبلت وفطرت کے اختلاف کا بیان ہے، اور بری عادت کو سنوارنے کی تعلیم ہے۔

(۳) آنحضور ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ: "لوگ سونے چاندی کی کانوں کی طرح ہیں" یعنی جس طرح سونے چاندی کی سب کانیں یکساں نہیں ہوتیں، لوگوں کی فطری صلاحیتیں بھی یکساں نہیں ہوتیں۔

(۴) اور اللہ پاک کا ارشاد ہے: "کہیے کہ ہر شخص اپنے ڈھنگ پر کام کرتا ہے" یعنی ہر شخص کی ایک فطری عادت اور جبلی طبیعت ہوتی ہے، وہ اسی ڈھب پر کام کرتا رہتا ہے۔

ان تمام نصوص سے یہ بات ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی فطرت مختلف بنائی ہے اور وہی اعمال واخلاق کے اختلاف کا سبب ہے اور مراتب کمال کا بھی اسی پر انحصار ہے۔

﴿باب اختلاف الناس في جبلتهم﴾

المستوجب لاختلاف أخلاقهم، وأعمالهم، ومراتب كمالهم

والأصل فيه: ما رُوي عن النبي صلى الله عليه وسلم أنه قال: ﴿إذا سمعتم بجبلٍ زال عن مكانه فصدِّقوه، وإذا سمعتم برجلٍ تغيَّر عن خُلُقه فلا تصدِّقوا به، فإنه يصير إلى ما جُبل عليه﴾

وقال: ﴿ألا إن بني آدم خُلقوا على طبقات شتّى: فمنهم من يولد مؤمنا﴾ فذكر الحديث بطوله، وذكر طبقاتهم في الغضب، وتقاضي الدين.

وقال: ﴿الناس معادنُ كمعادن الذهب والفضة﴾

وقال الله تعالى: ﴿قل: كلٌّ يعمل على شاكلته﴾ أي طريقته التي جُبل عليها.

ترجمہ: جبلت میں لوگوں کے مختلف ہونے کا بیان، جو ان کے اخلاق، اعمال اور کمال کے مرتبوں کے مختلف ہونے کا سبب ہے: اور بنیاد اس بارے میں وہ روایت ہے جو نبی کریم ﷺ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: "جب تم کسی پہاڑ کے بارے میں سنو کہ وہ اپنی جگہ سے ہٹ گیا ہے تو اس کو مان لو، اور جب تم کسی آدمی کے بارے میں سنو کہ اس کی فطرت بدل گئی ہے تو اس کو مت مانو، پس بیشک وہ لوٹنے والا ہے اس فطرت کی طرف جس پر وہ پیدا کیا گیا ہے"[1]

[1] مشکوٰۃ ۲۳ باب الایمان بالقدر، تنقیح الرواۃ ۲۸۱ وهذا حديث منقطع، لأن الزهري لم يدرك أبا الدرداء

کہلاتے ہیں اور جبروت کی باریکیاں اسرار الٰہیہ کہلاتی ہیں، پس جن لوگوں میں ملأ اعلیٰ جیسی ملکیت ہوتی ہے وہ بھی اسرار الٰہیہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔

(ج) اللہ تعالیٰ کو زمین میں جو نظام پسند ہے، ملأ اعلیٰ اس کو تفصیل سے سمجھ کر حاصل کرتے ہیں، پس جن لوگوں میں ملأ اعلیٰ جیسی ملکیت ہوتی ہے وہ بھی اللہ کی مرضی اور اللہ کے پسندیدہ نظام کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اللہ کا پسندیدہ نظام دین اسلام اور اعمال صالحہ والا نظام ہے۔

(د) ملأ اعلیٰ اللہ تعالیٰ کے پسندیدہ نظام کو وجود میں لانے کی طرف پوری توجہ مبذول کئے رہتے ہیں، پس ملأ اعلیٰ جیسی ملکیت رکھنے والے حضرات بھی نظام اسلامی کو بروئے کار لانے کی کوششوں میں لگے رہتے ہیں، ان کی پوری توانائیاں اسی پر خرچ ہوتی ہیں، اور ان کی شب و روز کی محنتیں اسی نقطہ پر مرکوز رہتی ہیں۔

۲ — ملأ سافل جیسی ملکیت: جن لوگوں میں اس طرح کی ملکیت ہوتی ہے، وہ ملأ سافل والے کام کرتے ہیں۔ ملأ سافل کے تین احوال ہیں:

(الف) ملأ سافل پر عالم بالا سے ایک تقاضا مترشح ہوتا ہے، وہ اس کے لئے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں، مگر وہ اس معاملہ کا پوری طرح احاطہ کئے ہوئے نہیں ہوتے، نہ ان کی پوری توجہ اس پر مجتمع ہوتی ہے، نہ وہ اس کی پوری تفصیلات جانتے ہیں، بس جو حکم ملتا ہے اس کی تعمیل کرتے ہیں، مثلاً حق اور باطل کی جنگ ہو رہی ہے، اہل باطل نے اہل حق پر بم پھینکا یا میزائل داغا، ملأ سافل کو حکم ملتا ہے کہ اسے بے اثر کردیں، وہ کوئی ایسی اڑچن کھڑی کردیتے ہیں کہ وہ نشانہ پر لگنے کے بجائے کہیں اور جگہ پر گرتا ہے، اور بے کار ہو جاتا ہے۔ مگر ملأ سافل کو بم اور میزائل رکوانے کے نتائج و عواقب کا پورا علم نہیں ہوتا نہ وہ جنگ کا نتیجہ جانتے ہیں، انہیں جو حکم ملا ہے بس وہ اس کی تعمیل کرتے ہیں۔ اسی طرح جن لوگوں میں ملأ سافل جیسی ملکیت ہوتی ہے، ان کو اکابر کی طرف سے جو دینی کام یاذکر وعمل بتایا جاتا ہے وہ اس میں لگ جاتے ہیں، مگر وہ معاملہ کا پوری طرح احاطہ کئے ہوئے نہیں ہوتے، نہ ان کی پوری توجہ اس کام پر مجتمع ہوتی ہے، نہ وہ اس کی پوری تفصیلات جانتے ہیں، بس ان کو جو حکم ملا ہے اسی کی تعمیل میں لگے رہتے ہیں۔

(ب) ملأ سافل سراپا نور ہوتے ہیں، پس ملأ سافل جیسی ملکیت رکھنے والے حضرات بھی سراپا نور بننے کی کوشش کرتے ہیں۔

(ج) وہ بہیمی آلائشوں سے پاک و صاف ہوتے ہیں، پس ان کے انداز کے لوگ بھی خود کو ایسی آلائشوں سے پاک رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اور قوت بہیمیہ بھی دو طرح کی ہوتی ہے:

۱ — نہایت تیز و تند بہیمیت: جیسے اس مست قوی اونٹ کی حالت، جس کی پرورش وافر مقدار اور مناسب انداز پر ہوئی ہو، چنانچہ وہ جسیم، مضبوط، بلند آواز، سخت گیر، ارادہ نافذ رکھنے والا، نہایت متکبر، قوی غیظ و غضب والا اور شدید حسد و کینہ

رکھنے والا، اور قوتِ شہوانی رکھنے والا، مقابلہ میں غالب ہونے کا جذبہ رکھنے والا اور بہادر ہوتا ہے۔ جن لوگوں میں اس قسم کی بہیمیت ہوتی ہے ان میں بھی یہ صفات پائی جاتی ہیں۔

۲ — نہایت ضعیف بہیمیت: جیسے بدھیا، ناقص الخلقت کی حالت، جس کی پرورش قحط سالی میں نہایت نامناسب انداز پر ہوئی ہو۔ چنانچہ اس کا جسم معمولی، وہ کمزور دبلا ہوتا ہے، آواز پتلی، گرفت ڈھیلی، بزدل، بے ہمت اور مقابلہ میں غالب آنے کا کوئی جذبہ اس میں نہیں ہوتا۔ جن لوگوں میں ایسی بہیمیت ہوتی ہے وہ بھی انہی وصفوں میں کم رکھتے ہیں۔

اس کے بعد جاننا چاہئے کہ ملکیت اور بہیمیت کے یہ دو دو انداز تو فطری ہوتے ہیں جن کو آدمی بدل نہیں سکتا، مگر ان کو بنایا جا سکتا ہے اور ان کو اس میں انسان کے اکتساب کا دخل ہوتا ہے۔ بعض اعمال ملکیت کو اور اس کے ایک رخ کو تقویت پہنچاتے ہیں اور بعض اعمال بہیمیت کو اور اس کے ایک رخ کو بڑھاوا دیتے ہیں۔ مثلاً اعمالِ صالحہ، نیک لوگوں کی صحبت، ذکر و اذکار اور اسرارِ الٰہیہ میں غور و فکر ملکیت کو قوی کرتے ہیں اور اس کو مدد پہنچاتے ہیں اور رفتہ رفتہ آدمی میں اعلیٰ درجہ کی ملکیت پیدا ہوتی ہے اور دنیوی مشغولیت، معاصی اور برے اعمال کی صورت حال اس کے برعکس ہے۔

وإن شئت أن تستجلي ما فتح الله عليّ في هذا الباب وفهّمني من معاني هذه الأحاديث:

فاعلم: أن القوة الملكية تُخلق في الناس على وجهين:

أحدهما: الوجه المناسب بالملأ الأعلى، الذين شأنهم الانصباغ بعلوم الأسماء والصفات، ومعرفة دقائق الجبروت، وتلقي نظام على وجه الإحاطة به، واجتماع الهمة على طلب وجوده.

والثاني: الوجه المناسب بالملأ السافل: الذين شأنهم انبعاث بداعية تترشح عليهم من فوقهم، من غير إحاطة، ولا اجتماع الهمة، ولا المعرفة؛ ونورانية؛ ورفض للألواث البهيمية.

وكذلك القوة البهيمية تُخلق على وجهين.

أحدهما: البهيمية الشديدة المتفيقة، كهيئة الفحل القارح، الذي نشأ في غذاء غزير وتدبير مناسب، فكان عظيم الجسم، شديده، جهوريّ الصوت، قوي البطش، ذا همة نافذة، وتيه عظيم، وغضب وحسد قويين، وشبق وافر، منافسًا في الغلبة والظهور، شجاع القلب.

والثاني: البهيمية الضعيفة المهلهلة، كهيئة الخصيّ المخدج، الذي نشأ في جدب وتدبير غير مناسب، فكان حقير الجسم، ضعيفه، ركيك الصوت، ضعيف البطش، جبان القلب، غير ذي همة، ولا منافسة في الغلبة والظهور.

والقوتان جميعًا، لهما جبلة تخصص أحد وجهيها، وكسب يزيده، ويقويه، ويبطله.

ترجمہ: اور اگر آپ وہ بات واضح طور پر جاننا چاہتے ہیں، جو اللہ نے مجھ پر اس باب میں کھولی ہے، اور مجھے ان

ملکیت اور بہیمیت کا اجتماع

اللہ تعالیٰ نے انسان میں دو متضاد قوتیں ودیعت فرمائی ہیں یعنی ملکیت اور بہیمیت۔ ان دونوں قوتوں کے تقاضے ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں، پھر یہ دونوں قوتیں انسان میں جمع کیسے ہیں؟ شاہ صاحب قدس سرہ فرماتے ہیں کہ یہ دونوں متضاد قوتیں انسان میں دو طرح پر جمع ہوتی ہیں: ایک باہمی کشمکش کے ساتھ، دوسرے مصالحت کے ساتھ۔ اگر دونوں قوتیں اپنے تقاضے کامل طور پر پورے کرنا چاہیں تو ضرور دونوں میں رسہ کشی ہوگی۔ اور اگر ہر قوت اپنے کچھ تقاضے چھوڑ دے تو باہم موافقت ہو جائے گی۔

مثلاً دو مختلف طبیعت، مزاج، خواہش اور جذبات رکھنے والے زوجین ایک گھر میں جمع ہوں تو یہ اجتماع دو طرح پر ہوگا۔ اگر دونوں اپنی چلائیں گے تو متنازعت ہوگی اور زندگی اجیرن ہو جائے گی اور مصالحت کرلیں گے یعنی ہر شریک حیات اپنے کچھ تقاضے اور مطالبات چھوڑ دے گا اور دوسرے کی موافقت کرے گا تو زندگی خوش گوار ہوگی اسی طرح ملکیت اور بہیمیت کا اجتماع بھی انسان میں دو طرح پر ہوتا ہے:

۱ — باہمی کشمکش کے ساتھ: ایسا اس صورت میں ہوتا ہے جب ہر قوت اپنے تقاضوں کو کامل طور پر پورا کرنا چاہے، ہر قوت کی نظر اس کی آخری حد کی طرف اٹھی رہے، اور ہر ایک اپنے فطری انداز پر چلنا چاہے تو یقیناً ان میں کھینچا تانی ہوگی۔ ملکیت کا کامل تقاضا اللہ سے ملنا اور ملأ اعلیٰ میں شامل ہونا ہے اور بہیمیت کے پیش نظر مفاد پرستی، خود غرضی، دنیا پر ریجھنا اور حیوانی حاجتوں پر فریفتہ رہنا ہے۔ پھر اگر ملکیت غالب آجاتی ہے تو بہیمیت کے اثرات مضمحل ہو جاتے ہیں، اور بہیمیت غالب آتی ہے تو ملکیت کے آثار ماند پڑ جاتے ہیں۔

۲ — مصالحت اور موافقت کے ساتھ: ایسا اس صورت میں ہوتا ہے کہ ملکیت اپنے اعلیٰ تقاضے سے ذرا نیچے اتر آئے۔ ملکیت کی پرواز وصول الی اللہ اور شمول مع الملأ الاعلیٰ تک ہے، وہ ان مطالبے سے ذرا نیچے اتر آئے، اور ایسی باتوں پر قناعت کرلے جو بہیمی مطالبے کے نزدیک ہیں، اور وہ یہ امور ہیں:

(۱) عقل کے مقتضی پر چلنا اور نفس، خواہش اور طبیعت کی پیروی نہ کرنا۔

(۲) سخاوتِ نفس سے کام لینا۔ سخاوت، شُح کی ضد ہے۔ شُح کے معنی ہیں خود غرضی، پس سخاوتِ نفس یہ ہے کہ آدمی دوسروں کا بھلا چاہے۔ حدیث میں ہے کہ: "دین خیر خواہی کا نام ہے" پوچھا گیا: کس کی؟ فرمایا: "اللہ کی، اللہ کی کتاب کی، اللہ کے رسول کی، مسلمانوں کے پیشواؤں کی اور تمام مسلمانوں کی" (رواہ مسلم، مشکوٰۃ حدیث ۴۹۶۶)

(۳) پاکدامنی اختیار کرنا، اور صرف ظاہری پاکدامنی نہیں، بلکہ طبیعت اور مزاج بھی پاک ہو جائے۔

(۴) عام لوگوں کے مفاد کو اپنے ذاتی مفاد پر ترجیح دینا۔ قرآن کریم میں انصار کی خوبی یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ مہاجرین کو اپنے سے مقدم رکھتے ہیں اگرچہ ان کو فاقہ ہی کیوں نہ ہو (سورۃ الحشر آیت ۹)

(۵) آخرت پر نظر رکھنا، صرف دنیا پر نظر نہ روک لینا۔

(۶) تمام امور میں نظافت اور پاکیزگی کا خیال رکھنا۔

مذکورہ تمام امور ملکیت کے اصلی تقاضے تو نہیں ہیں مگر یہ بہر حال قریب ترین امور ہیں، اس لئے ملکیت ان امور کی طرف اتر آئے اور بہیمیت اپنے خالص تقاضوں سے دستبردار ہو جائے اور ایسے کام کرنے کے لئے آمادہ ہو جائے جو متعارف عادت سے بعید ہوں تو حتماً دونوں قوتوں میں مصالحت ہو جائے گی اور ایک ایسا مزاج وجود میں آئے گا جس میں کوئی اختلاف نہ ہوگا۔

واجتماع القوتين فيهم أيضاً يكون على وجهين:

فتارة تجتمعان بالتجاذب: تكون كلُّ واحدة موفرةً في طلب مقتضياتها، طامحةً في أقصى غاياتها، مريدةً سُنّتَها الطبيعيَّ، فلا جرم أن يقع بينهما التجاذبُ، فإن غلبت هذه اضمحلَّتْ آثارُ تلك، وكذلك العكس۔

وتارة: بالاصطلاح: بأن تنزل الملكيةُ عن طلب حكمها الصُّراح إلى ما يقرُب منه: من عقلٍ، ومَخْلوةِ نفسٍ، وعِفّةِ طبعٍ، وإيثارِ النفع العام على انتفاع نفسه خاصةً، والنظرِ إلى الآجل دون الاقتصار على العاجل، وحُبِّ النظافة في جميع ما يتعلق به؛ وتترقى البهيميةُ من طلب حكمها الصُّراح إلى ما ليس ببعيد من الرأي الكلي، ولا منقادٍ له، فتصطلحان، ويحصل مزاجٌ لا تخالُفَ فيه

ترجمہ: اور انسانوں میں دو قوتوں کا اکٹھا ہونا بھی دو طرح پر ہوتا ہے:

کبھی تو: دونوں اکٹھا ہوتی ہیں کشمکش کے ساتھ: ہر ایک اپنے تقاضوں کے مطالبہ میں ہمت صرف کرنے والی ہوتی ہے، اپنی آخری حد کی طرف نظر اٹھانے والی ہوتی ہے، اپنے فطری انداز کو چاہنے والی ہوتی ہے، پس یقیناً ان دونوں کے درمیان رسہ کشی ہوگی، پھر اگر یہ غالب آئے گی تو اس کے آثار ماند پڑ جائیں گے، اور اسی طرح برعکس۔

اور کبھی: مصالحت کے ساتھ (اکٹھا ہوتی ہیں) بایں طور کہ ملکیت اس کے خالص حکم کے مطالبہ سے اتر آتی ہے، ان چیزوں کی طرف جو اس خالص حکم سے نزدیک ہوتی ہیں یعنی عقل، دریادلی، طبیعت کی پاکیزگی، عام لوگوں کے فائدے کو اپنے ذاتی نفع پر ترجیح دینا، مآل (آخرت) کی طرف نظر رکھنا، دنیا پر نظر روک نہ لینا اور پاکیزگی کو پسند کرنا ان تمام چیزوں میں جو آدمی سے تعلق رکھتی ہیں۔ اور بہیمیت اس کے خالص حکم کے مطالبہ سے اس چیز کی طرف چڑھے جو متعارف عادت سے دور نہ ہو اور نہ اس کے مخالف ہو، پس دونوں قوتوں میں مصالحت ہو جائے گی اور ایک ایسا مزاج وجود میں آئیگا جس میں کوئی اختلاف نہ ہوگا۔

لغات:

توفّر على كذا: ہمت صرف کرنا ... طمَحَ بصرَهُ إليه: نگاہ اٹھانا ... السُّنن: طریقہ، جو راستہ ... الصُّراح:

خاص ۔ اصطلح القوم: رضامند ہونا ۔ الرای الکلی: مفاد عامہ: یہ شاہ صاحب کی خاص اصطلاح ہے۔

☆ ☆ ☆

ملکیت وبہیمیت اور ان کے اجتماع کی اقسام

ملکیت کی دو جانبیں ہیں: ایک اعلیٰ دوسری ادنیٰ، اور ایک ان کے بیچ کا نقطہ ہے، پھر بیچ کے نقطے سے طرف اعلیٰ اور طرف ادنیٰ کی جانب یا بالفاظ دیگر اطراف سے بیچ کے نقطے کی طرف بہت سے نقطے ہوتے ہیں۔

یہی حال بہیمیت کا بھی ہے۔ اور یہی صورت حال دونوں قوتوں کے باہمی اختلاط کی بھی ہے یعنی اعلیٰ درجہ کا اجتماع، ادنیٰ درجہ کا اجتماع، اور بین بین صورت، پھر بین بین صورت اور اعلیٰ درجہ کے درمیان بھی درجے ہیں، اسی طرح بین بین صورت اور ادنیٰ درجہ کے درمیان بھی درجے ہیں

پھر جب ان کو باہم ضرب دیں گے تو بے شمار قسمیں پیدا ہونگی۔ مگر ان میں سے آٹھ قسمیں بنیادی ہیں، ان کے احکام علحدہ علحدہ ہیں، اگر وہ احکام جان لئے جائیں تو باقی اقسام کے احکام خود بخود معلوم ہو جائیں گے۔ وہ آٹھ اقسام یہ ہیں:

(١،٢) ملکیت عالیہ تجاذب کے ساتھ جمع ہو بہیمیت شدیدہ کے ساتھ یا بہیمیت ضعیفہ کے ساتھ

(٣،٤) ملکیت سافلہ تجاذب کے ساتھ جمع ہو بہیمیت شدیدہ کے ساتھ یا بہیمیت ضعیفہ کے ساتھ

(٥،٦) ملکیت عالیہ مصالحت کے ساتھ جمع ہو بہیمیت شدیدہ کے ساتھ یا بہیمیت ضعیفہ کے ساتھ

(٧،٨) ملکیت سافلہ مصالحت کے ساتھ جمع ہو بہیمیت شدیدہ کے ساتھ یا بہیمیت ضعیفہ کے ساتھ

نقشہ یوں ہے

نمبر شمار	کیفیت ملکیت	کیفیت بہیمیت	کیفیت اجتماع
١	عالیہ	شدیدہ	تجاذب
٢	عالیہ	ضعیفہ	تجاذب
٣	سافلہ	شدیدہ	تجاذب
٤	سافلہ	ضعیفہ	تجاذب
٥	عالیہ	شدیدہ	مصالحت
٦	عالیہ	ضعیفہ	مصالحت
٧	سافلہ	شدیدہ	مصالحت
٨	سافلہ	ضعیفہ	مصالحت

ولكل من مرتبتي الملكية والبهيمية والاجتماع طرفان ووسط، وما يقرب من طرف أو وسط، وكذلك تنشعب الأقسام إلى غير النهاية؛ إلا أن رءوس الأقسام المنفرزة بأحكامها، والتي يعرف غيرها بمعرفتها، ثمانية، حاصلة من انقسام الاجتماع بالتجاذب إلى أربعة: ملكية عالية تجتمع مع بهيمية شديدة، أو ضعيفة، أو ملكية سافلة تجتمع مع بهيمية شديدة، أو ضعيفة؛ والاجتماع بالاصطلاح أيضا إلى أربعة مثلها؛ ولكل قسم حكم لا يختلف، من رُزق لمعرفة أحكامها استراح من تشويشات كثيرة.

ترجمہ: اور قوت ملکیہ اور قوت بہیمیہ اور ان دونوں کے اجتماع میں سے ہر ایک مرتبہ کے دو دو اطراف ہیں، اور ایک درمیان ہے اور وہ درجات ہیں جو طرف یا وسط سے نزدیکی کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں، اور اس طرح قسمیں بے شمار حد تک چلی جاتی ہیں، لیکن بڑی اقسام، جو اپنے احکام کے ساتھ جدا ہونے والی ہیں، اور جن کے احکام معلوم ہونے سے دوسری قسموں کے احکام معلوم ہو جاتے ہیں، آٹھ ہیں، جو تجاذب کے ساتھ اجتماع کے چار صورتوں پر منقسم ہونے سے پیدا ہوتی ہیں (یعنی) ملکیت عالیہ اکٹھا ہو بہیمیت شدیدہ یا ضعیفہ کے ساتھ یا ملکیت سافلہ اکٹھا ہو بہیمیت شدیدہ یا ضعیفہ کے ساتھ: اور مصالحت کے ساتھ اجتماع بھی ایسی ہی چار قسموں کی طرف منقسم ہوتا ہے، اور ہر قسم کے لئے ایسے احکام ہیں جو مختلف نہیں ہوتے، جس شخص کو ان کے احکام جاننے کی توفیق دی گئی، وہ بہت سی پریشانیوں سے آرام پا لے گا۔

لغات: المنفرزة (اسم فاعل) انفرز عن الشیئ: جدا ہونا۔ استراح استراحۃ: آرام پانا ... تشویش: پریشانی شوّش الأمر: بے ترتیب کرنا۔

☆ ☆ ☆

اقسام ثمانیہ کے ضروری احکام

پہلا حکم: ریاضات شاقہ کی سب سے زیادہ ضرورت (۱، ۳، ۵، ۷) کو ہوتی ہے جن کی بہیمیت بہت سخت ہوتی ہے کیونکہ بہیمیت کی تعدیل، بری حالت کو اچھی حالت سے بدلنا، اخلاق کو سنوارنا: عبادتوں میں محنت کرنے اور حقائق میں غور کرنے ہی سے ہو سکتا ہے، پھر ان میں سے بھی (۱، ۵) کو ریاضات کی بہت زیادہ ضرورت رہتی ہے، کیونکہ ان دو قسموں میں ملکیت اور بہیمیت میں باہم کشاکش ہوتی ہے اس لئے بہیمیت کو لگام دینے کے لئے عبادات و ریاضات کی ضرورت ہوتی ہے۔

دوسرا حکم: کمالات سے حظ وافر وہ لوگ حاصل کرتے ہیں جن کی ملکیت عالیہ ہوتی ہے یعنی (۱، ۲، ۵، ۶) پھر (۲، ۶) جن کی ملکیت اور بہیمیت میں مصالحت ہوتی ہے عمل میں بہتر ہوتے ہیں اور وہ زیادہ سلیقہ مند ہوتے ہیں اور (۱، ۲) جن کی

ملکیت اور بہیمیت میں کشاکش ہوتی ہے جب وہ بہیمیت کے چنگل سے نکل جاتے ہیں تو علم خوب حاصل کرتے ہیں، مگر عمل کی زیادہ پرواہ نہیں کرتے۔

تیسرا حکم: اہم کاموں جیسے جہاد وغیرہ میں سب سے زیادہ بے رغبت وہ لوگ ہوتے ہیں جن کی بہیمیت کمزور ہے یعنی (۸،۶،۴،۲) پھر (۶،۲) جن کی ملکیت عالیہ ہے، سب کام چھوڑ کر اللہ کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں اور (۸،۴) جن کی ملکیت سافلہ ہے جب وہ بہیمیت کے چنگل سے نکل جاتے ہیں تو سب کچھ چھوڑ کر آخرت کی تیاری میں لگ جاتے ہیں ورنہ اگر بہیمیت کے چنگل سے نہیں نکل پاتے تو سستی اور آرام طلبی کے طور پر سب کچھ چھوڑ بیٹھتے ہیں۔

ونحن نذكر ههنا من ذلك ما نحتاج إليه في هذا الكتاب:

[۱] فأحوجُ الناس إلى الرياضات الشاقة: من كانت بهيميته شديدة، لاسيما صاحبُ التجاذب.

[۲] وأحظاهم بالكمال: من كانت ملكيته علية، لكنَّ صاحبَ الاصطلاح أحسنهم عملاً، وآذنهم؛ وصاحب التجاذب، إذا انفلتَ من أسْرِ البهيمة أكثرهم علمًا، ولايبالي بآداب العمل كثيرَ مُبالاة.

[۳] وأزهدهم في الأمور العظام: أضعفهم بهيمية، لكنَّ صاحبَ العالية يترك الكل تفرُّغا للتوجه إلى الله، وصاحب السافلة إذا انفلت يتركه للآخرة، وإلا يتركه كَسَلاً ودَعَة.

ترجمہ: اور ہم یہاں ان احکام میں سے ان کو ذکر کرتے ہیں جن کی ہمیں اس کتاب میں ضرورت ہے:

(۱) پس لوگوں میں سب سے زیادہ محتاج پر مشقت ریاضتوں کے وہ لوگ ہیں جن کی بہیمیت سخت ہے، بالخصوص کشاکش والے۔

(۲) اور لوگوں میں سب سے زیادہ کمالات حاصل کرنے کی توفیق ان لوگوں کو حق ہے جن کی ملکیت عالیہ ہے البتہ مصالحت والے ان میں عمل کے اعتبار سے اچھے ہوتے ہیں اور ان میں زیادہ شائستہ اور مہذب ہوتے ہیں، اور کشاکش والے جب بہیمیت کی قید سے نکل جاتے ہیں تو وہ ان میں علم کے اعتبار سے زیادہ ہوتے ہیں اور وہ عمل کے آداب کی کچھ بہت زیادہ پرواہ نہیں کرتے۔

(۳) اور بڑے کاموں میں سب سے زیادہ بے رغبت وہ لوگ ہوتے ہیں جن کی بہیمیت سب سے زیادہ کمزور ہوتی ہے، البتہ ملکیت عالیہ والے سب کچھ چھوڑ دیتے ہیں اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونے کے لئے فارغ ہونے کے طور پر، اور ملکیت سافلہ والا اگر بہیمیت سے چھوٹ جاتا ہے تو سب کچھ چھوڑ دیتا ہے آخرت (کی تیاری) کے لئے، ورنہ سب

کو چھوڑ دینا ہے سستی اور آرام طلبی کے طور پر۔

لغات:

ریاضت: پُرمشقت محنت ... احظی: زیادہ حصہ حاصل کرنے والا حَظِیَ (س) حُظْوَة: بہرہ ور ہونا ... آدب (اسم تفضیل) از اَدُبَ (ک) اَدَبًا: صاحبِ ادب ہونا، مہذب اور شائستہ ہونا ... انفلت: تخلص، نجات پانا، چھوٹنا ... دعۃ: استراحۃ

☆ ☆ ☆

چوتھا حکم: پُرمشقت کاموں میں وہ لوگ زیادہ چل سکتے ہیں جن کی بہیمیت سخت ہوتی ہے یعنی (۱،۲ اور ۵ والے) مگر

(الف) جن لوگوں کی ملکیت عالیہ ہے یعنی (۱و۵) وہ ریاست وحکومت کے کاموں کو بہتر طریقہ پر انجام دے سکتے ہیں۔

(ب) اور جن کی ملکیت سافلہ ہے یعنی (۲و۳) وہ جنگ اور بوجھ اٹھانے کے کاموں کے لئے زیادہ موزوں ہیں۔

(ج) اور جن کی ملکیت اور بہیمیت میں تجاذب ہے یعنی (۳و۱) وہ جب بہیمیت کی طرف جھکتے ہیں تو صرف دنیوی کاموں کے ہوکر رہ جاتے ہیں، اور جب ملکیت کی طرف ترقی کرتے ہیں تو صرف دینی کاموں میں، نفس کو سنوارنے میں اور اس کو مادے سے مجرد کرنے میں لگ جاتے ہیں۔

(د) اور جن کی ملکیت اور بہیمیت میں مصالحت ہے یعنی (۵و۶) وہ دونوں طرح کے کاموں میں ایک ساتھ مشغول ہوتے ہیں اور دونوں باتوں کو ایک ساتھ لے کر چلتے ہیں وہ "در کفے جام شریعت در کفے سندان عشق" پر عمل کرتے ہیں۔

[۴] وأشدُّهم اقتحاما في الأمور العظام: أشدُّهم بهيمية؛ لكنْ صاحب العالية أقومُهم بالرياسات، ونحوها مما يناسب الرأي الكلي؛ وصاحب السافلة أشدُّهم اقتحاما في نحو القتال وحمل الأثقال؛ وصاحب التجاذب إذا اندفع إلى الأسفل اشتغل بالأمر الدنيوي فقط، وإذا ترقى إلى الأعلى اشتغل بالأمر الديني وتهذيب النفس وتجريدها فقط؛ وصاحب الاصطلاح يشتغل بهما جميعا، ويفصلهما مرة واحدة.

ترجمہ: (۴) اور ان میں سے بڑے کاموں میں اندھا دھند گھسنے والا وہ شخص ہے جس کی بہیمیت ان میں سب سے زیادہ سخت ہے۔ البتہ ملکیت عالیہ والا حکومتوں اور ان کے مانند کاموں کو جو مفادات عامہ سے تعلق رکھتے ہیں سر انجام دینے کی زیادہ صلاحیت رکھتا ہے۔ اور ملکیت سافلہ والا ان میں زیادہ گھسنے والا ہوتا ہے جنگ اور بار برداری جیسے کاموں میں۔ اور کشاکش والا جب نیچے کی طرف بہتا ہے (یعنی بہیمیت کی طرف جھکتا ہے) تو صرف دنیوی کاموں میں مشغول ہوتا ہے اور

جب برتر کی طرف بڑھتا ہے تو صرف دینی کاموں میں اور نفس کو سنوارنے میں اور اس کو مادے سے مجرد کرنے میں مشغول ہوتا ہے، اور مصلحت والا دونوں ہی کاموں میں مشغول ہوتا ہے، اور دونوں ہی باتوں کا ایک ساتھ اہتمام کرتا ہے۔

لغات: تقحم الامر: کسی معاملہ میں زبردستی داخل ہونا۔ قام بالامر: اہتمام کرنا۔ انقلع: بچنا۔

تشریح: زندگی میں نفس مادے سے مجرد نہیں ہو سکتا، البتہ کاملین ترقی کے درجہ میں اور مرنے کے بعد اللہ سے ملنے کے انداز پر مجرد ہو سکتا ہے۔

☆ ☆ ☆

پانچواں حکم: جن لوگوں میں ملکیت غالب ہوتی ہے یعنی (۱و۵و۹) اگر ان کی ملکیت بہت ہی بلند ہوتی ہے تو وہ دین و دنیا کی ایک ساتھ سرداری کے لئے تیار ہو جاتے ہیں، وہ دین کے کاموں کو اوڑھنا بچھونا بنا لیتے ہیں اور نظم ملکی جیسے خلافت اور ملت کی راہنمائی کو بروئے کار لانے میں اللہ تعالیٰ کے دست و بازو بن جاتے ہیں۔ یہ حضرات انبیائے کرام، ان کے ورثہ، دنیا کے نامور شخصیات، سلاطین اسلام اور حکومت کے بڑے ذمہ دار ہیں۔

چھٹا حکم: جن لوگوں میں ملکیت غالب ہوتی ہے اور ملکیت و بہیمیت میں اجتماع مصالحت کے ساتھ ہوتا ہے یعنی (۵و۹) ایسے حضرات کی دین میں پیروی واجب ہے۔

ساتواں حکم: جن لوگوں میں ملکیت سافل ہوتی ہے اور ملکیت و بہیمیت میں اجتماع مصالحت کے ساتھ ہوتا ہے، یعنی (۶و۸) ان لوگوں میں مذکورہ بالا حضرات کی پیروی کرنے کی صلاحیت بہت زیادہ ہوتی ہے، کیونکہ یہ لوگ احکام شرعیہ کو ان کی شکلوں اور محسوس پیکر کے ساتھ حاصل کرتے ہیں یعنی ان کو جس طرح حکم دیا جاتا ہے اسی طرح اس پر عمل پیرا ہوتے ہیں۔

آٹھواں حکم: جن لوگوں کی ملکیت اور بہیمیت میں کشمکش ہوتی ہے وہ لوگ دین سے بہت دور ہوتے ہیں یعنی (۱،۲،۳،۴) کیونکہ یہ لوگ اگر طبیعت کی رنگینیوں میں پھنس جاتے ہیں تو دیانت بھی چھوڑ دیتے ہیں اور جو لوگ طبیعت پر قابو پالیتے ہیں اگر ان کی ملکیت عالیہ ہوتی ہے یعنی (۱و۳) تو وہ احکام شرعیہ کی روح سے چمٹ جاتے ہیں مگر ظاہری شکلوں کو چھوڑ دیتے ہیں، جیسے مجاذیب اللہ نہ نماز پڑھتے ہیں نہ روزہ رکھتے ہیں، حالانکہ احکام کی ظاہری شکلیں بھی مطلوب ہیں مگر یہ لوگ ان میں تسامح برتتے ہیں اور ان کی توجہ زیادہ تر جبروت کی باریکیاں سمجھنے میں اور اس کے لون سے رنگین ہونے میں رہتی ہیں، وہ ہر وقت معرفت خداوندی میں مستغرق رہتے ہیں۔

اور جن لوگوں کی ملکیت فروتر ہوتی ہے یعنی (۲و۴) وہ ریاضتوں اور اوراد کا بہت زیادہ اہتمام کرتے ہیں اور ملکوت کے انوار میں مگن رہتے ہیں یعنی کشف و اشراق اور قبولیت دعا وغیرہ ہی کو بڑا کمال سمجھتے ہیں، وہ لوگ احکام شرعیہ کو دل کی قوت سے مضبوط نہیں پکڑتے، صرف طبیعت کو مغلوب کرنے اور انوار کو حاصل کرنے کی تدبیر کے طور پر عمل اختیار کرتے ہیں۔

یہ آٹھ بنیادی احکام ہیں، جو اللہ تعالیٰ نے شاہ صاحب کو عطا فرمائے ہیں، اگر ان کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے تو اہل اللہ کے احوال، ان کے کمالات کی نہایت، انہوں نے جو اپنے بارے میں اشارے کئے ہیں ان کا مطلب، اور ان کے مراتب سلوک کا اندازہ لگانا آسان ہوجائے گا۔

[٥] ومن كانت عاليته منهم في غاية العلوّ، ينبعث إلى رياسة الدين والدنيا معًا، ويصير باقيًا بمراد الحق، وبمنزلة الجارحة له في إتمام نظام كلي، كالخلافة، وإمامة الملة، وأولئك هم الأنبياء ووَرَثتهم، وأساطين الناس وسلاطينهم، وأولو الأمر منهم.

[٦] والذين يجب انقيادهم في دين الله أهلُ الاصطلاح العالية ملكيتُهم

[٧] وأطوعهم لأولئك أهلُ الاصطلاح السافلة ملكيتُهم، فإنهم يتلقَّون النواميس بأشباحها وهيئاتها.

[٨] وأطرفهم منهم: أهل التجاذب، لأنهم إما منهمكون في ظلمات الطبيعة، فلا يقيمون السنة الراشدة، أو قاهرون عليها: فإن كانوا أهل غلوٍّ عضّوا على أرواح النواميس، وكانت لهم مسامحة في أشباحها، وكان أكثرُ همِّهم معرفة دقائق الجبروت، والاصطباغ بصبغها؛ وإن كانوا دون ذلك، اهتموا بالرياضات والأوراد، وأُعجبوا بخوارق الملكية: من كشف وإشراف، واستجابة دعوة، ونحو ذلك، ولم يعضّوا من النواميس بجذر قلوبهم إلا على حِيَل قهر الطبيعة، وجلب الأنوار.

فهذه أصول أعطانيها ربي، من أتقنها استجلى أحوال أهل الله، ومبلغ كمالهم، ومطمح إشاراتهم عن أنفسهم، ومعارج مراتب سلوكهم ﴿ذَلِكَ مِنْ فَضْلِ اللهِ عَلَيْنَا وَعَلَى النَّاسِ وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ﴾

ترجمہ: (۵) اور وہ شخص جس کی ملکیت عالیہ ان میں سے بہت ہی اونچی ہوتی ہے: وہ ایک ساتھ دین اور دنیا کی سرداری کے لئے اٹھ کھڑا ہوتا ہے، اور وہ اللہ تعالیٰ کی مراد کے ساتھ باقی رہنے والا ہوجاتا ہے (یعنی ہر وقت وہ اللہ تعالیٰ کے کاموں میں لگا رہتا ہے) اور وہ اللہ تعالیٰ کے لئے بمنزلہ ہاتھ کے ہوجاتا ہے نظام کلی میں، جیسے حکومت اسلامیہ اور ملت کی پیشوائی کی تکمیل میں۔ اور یہ لوگ وہ انبیاء، ان کے وارثین، لوگوں کی مرکزی شخصیات، لوگوں کے بادشاہ اور لوگوں میں سے حکومت کے بڑے ذمہ دار ہیں۔

(۶) اور وہ لوگ جن کی تابعداری اللہ کے دین میں واجب ہے: وہ صلاحیت والے لوگ ہیں، جن کی قوت ملکیہ

بلند ہوتی ہے۔

(۷) اور ان لوگوں کی (جن کا تذکرہ نمبر ۱۲ میں گزرا) زیادہ تابعداری کرنے والے اور مصالحت والے لوگ ہیں، جن کی ملکیت ساقط ہوتی ہے، کیونکہ یہ لوگ احکامِ شرعیہ کو ان کے مخصوص اور ان کی شکلوں کے ساتھ عمل کرتے ہیں۔

(۸) اور لوگوں میں سب سے زیادہ (راہ راست سے) دور تشخص والے لوگ ہیں، کیونکہ وہ یا تو طبیعت کی تاریکی میں منہمک ہوتے ہیں تو وہ راہ راست بھی نہیں اپناتے، یا وہ طبیعت پر غالب ہوتے ہیں تو اگر وہ ملکیت عالیہ والے ہوتے ہیں تو وہ احکامِ شرعیہ کی روح کو دعوتوں سے مخلوط کرتے ہیں اور وہ احکام کے ڈھانچوں سے مخصوص ہیں تجرد چاہتے ہیں اور ان کی زیادہ تر توجہ جبروت کی رحمتوں پہچاننے کی طرف، اور ان کے رنگ میں رنگین ہونے کی طرف رہتی ہے ——— اور اگر وہ ملکیت عالیہ والوں سے فروتر ہوتے ہیں تو وہ ریاضتوں اور اوراد کا اہتمام کرتے ہیں اور وہ بھی رہتے ہیں ملکوت کی تجلیوں پر یعنی کشف و اشراف اور دعاؤں کی قبولیت اور ان کے مانند چیزوں پر، اور وہ لوگ احکامِ شرعیہ کو اپنے دلوں کی جڑ سے مضبوط نہیں پکڑتے مگر طبیعت کو مغلوب کرنے اور فوائد کو حاصل کرنے کی تدبیر کے طور پر۔

پس یہ بنیادی باتیں ہیں جو میرے رب نے مجھے عطا فرمائی ہیں۔ جو شخص ان کو مضبوط پکڑے گا وہ اہل اللہ کے احوال، ان کے کمالات کی پختگی اور انھوں نے جو اپنے بارے میں اشارے کئے ہیں ان کا مطلب واضح طور پر جان لے گا، اور وہ ان کے سلوک کے مرتبوں کی توجیہ کر لے گا۔ اور یہ ہم پر اور تمام لوگوں پر اللہ کا فضل ہے، مگر بیشتر لوگ شکر گزار نہیں ہوتے۔

لغات:

الجارحة عضو انسانی خصوصاً ہاتھ جمع جوارح ... إنجام پورا کرنا یہ لفظ کتاب میں نسخہ قلمی کی تصحیح مخطوطہ کراچی سے کی ہے ... اساطین مفرد اسطوانة ستون بولا جاتا ہے ھم اساطین الزمان وہ لوگ زمانے کے ستون ہیں ... نوامیس مفرد الناموس: اصلی معنی راز دار، اصطلاحی معنی: احکامِ شرعیہ وشعائر (۳۱۴) میں ہے ھو فی الشرع: الذی شرعه الله تعالی، یعنی الاسلام، ناموس اکبر حضرت جبرئیل علیہ السلام کو کہتے ہیں ... اظرف (اسم تفضیل) بہت زیادہ خوش طبع، زیرک اور چالاک ... السنة الراشدة: سیدھا راستہ، شرعی راستہ ... سوارق مفرد السارقة چمکنے والا بادل ... انکشف لغوی معنی کھلنا، پردہ اٹھنا، تصوف کی اصطلاح میں مغیبات پر اطلاع پانا ... الاشراف مترادف ہے کشف کا، معنی مغیبات کو جھانک کر دیکھ لینا اشرف علیہ اوپر سے جھانکنا ... خرّج المسئلة مسئلہ کی توجیہ کرنا۔

☆ ☆ ☆

باب ـــــ ١٥

عمل کا باعث بننے والے خیالات کے اسباب

انسان کے دل میں اچھے برے خیالات بارش کی طرح برستے رہتے ہیں، جب وہ وافر مقدار میں جمع ہوجاتے ہیں تو ارادۂ عمل جنم لیتا ہے، پھر اچھا یا برا عمل وجود میں آتا ہے۔ ان خیالات کے کئی اسباب ہیں، کیونکہ یہ دنیا دار الاسباب ہے، اس عالم میں سنت الٰہی یہ ہے کہ ہر چیز کے لئے سبب ہو۔ اس باب میں خیالات کے اسباب کا بیان ہے۔ اور یہ اسباب جاننے اس لئے ضروری ہیں کہ انسان اچھے اسباب اختیار کرے تاکہ اچھے خیالات پیدا ہوں اور نیک عمل کا جذبہ ابھرے، اور برے خیالات کے اسباب سے اجتناب کرے تاکہ برے خیالات پیدا نہ ہوں اور آدمی برے کام نہ کرے۔

غور وفکر اور تجربہ سے خیالات کے چند اسباب سمجھ میں آتے ہیں:

پہلا سبب: جو سب سے بڑا سبب ہے، وہ انسان کی جبلت وفطرت ہے۔ جبلت وہ اصلی حالت ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا ہے، ہر انسان کی الگ انداز پر تخلیق عمل میں آئی ہے، پہلے یہ مضمون حدیث شریف میں آچکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کی ایک جبلت بنائی ہے جو کبھی بدلتی نہیں، اگر کوئی خبر دے کہ فلاں کی فطرت بدل گئی تو اس کی تصدیق نہ کرو، پس جس کی جیسی جبلت ہوگی ویسے خیالات آئیں گے۔ اچھی فطرت ہوگی تو اچھے خیالات دل میں پیدا ہوں گے اور آدمی اچھے اعمال کرے گا، اور فطرت بد ہوگی تو برے خیالات جنم لیں گے اور آدمی برے اعمال کرے گا۔

نوٹ: فطرت کو بنانا یا بدلنا تو انسان کے اختیار میں نہیں، اللہ تعالیٰ نے جس کی جیسی طبیعت بنا دی ہے وہی رہے گی، مگر جبلت کا سنوارنا اور بگاڑنا آدمی کے اختیار میں ہے، جیسا کہ ایمان وکفر، غصہ اور قرض کی وصولی کے درجات والی روایت سے یہ بات ثابت ہوتی ہے۔ یہ حدیث پہلے گزر چکی ہے۔

دوسرا سبب: انسان کا مادی مزاج ہے۔ یہ مزاج لوگوں میں مختلف ہوتا ہے اور اس کو مختلف کیا بھی جاسکتا ہے، کیونکہ یہ مزاج کھانے پینے کی چیزوں سے اور دوسری ان چیزوں سے جو انسان کو گھیرے رہتی ہیں، وجود میں آتا ہے۔ آدمی جس قسم کی چیزیں کھاتا پیتا ہے، یا جو کچھ پڑھتا ہے، یا جن لوگوں کی صحبت میں رہتا ہے، ان کی وجہ سے یہ مزاج مختلف ہوتا ہے، اسی وجہ سے شریعت نے حلال وطیب لقمہ کھانے پر، اچھی صحبت اختیار کرنے پر اور برے ماحول سے بچنے کو ملحوظ رکھنے پر زور دیا ہے۔

اور مادی مزاج خیالات کا سبب کیسے بنتا ہے؟ اس کی مثالیں ملاحظہ فرمائیں:

(١) بھوکا کھانے کی خواہش کرتا ہے، اس سے پوچھو کہ دو اور دو کتنے ہوتے ہیں؟ تو وہ جواب دے گا: چار روٹیاں!

(٢) پیاسا پانی ڈھونڈتا ہے، اس کو سراب (چمکتی ریت) بھی پانی دکھائی دیتی ہے۔

(۳) شہوت پرست کو عورتوں کے خیالات آتے ہیں: جو لوگ ایسی غذا استعمال کرتے ہیں جو قوت باہ کو بڑھاتی ہیں، وہ لوگ عورتوں کو تکتے جھانکتے رہتے ہیں، دل ہر وقت عورتوں سے تعلق رکھنے والے خیالات سے بھرا رہتا ہے، اور ان کی طبیعت میں شہوانی انفعال کے لئے ہیجان بپا رہتا ہے۔

(۴) کچھ لوگ سخت غذا استعمال کرتے ہیں، جس کی وجہ سے ان کے دل سخت ہو جاتے ہیں اور ان میں قتل وخوں ریزی کی جرأت پیدا ہو جاتی ہے اور ان کو بہت سی ایسی چیزوں میں غصہ آ جاتا ہے، جہاں دوسرے آدمی غصہ نہیں کرتے۔

مگر یہ دو شخص یعنی نمبر ۳ و ۴ اگر نماز روزے کی ریاضت کے ذریعہ نفس کی اصلاح کرلیں، یا بڑھاپے کے قریب ہو جائیں یا کسی نڈھال کرنے والی بیماری میں مبتلا ہو جائیں تو ان کے بیشتر احوال بدل جاتے ہیں، دل نرم پڑ جاتا ہے اور نفس پاکیزہ ہو جاتا ہے۔ اسی وجہ سے بوڑھوں اور جوانوں کے احکام میں فرق ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے بوڑھے کو روزے کی حالت میں بیوی کے ساتھ لیٹنے کی اجازت دی ہے اور جوان کو نہیں دی (ابوداؤد، مشکوٰۃ کتاب الصوم باب تنزیہ الصوم حدیث نمبر ۲۰۰۶)

تیسرا سبب: عادت و مالوف ہے: جس شخص کو جس چیز کے ساتھ بہت زیادہ تعلق ہوتا ہے اس کو اس چیز سے تعلق رکھنے والی باتوں کا خیال آتا ہے، کیونکہ وہ چیز اس کے دل میں جمی ہوئی ہے، پس اس کا بار بار خیال آنا ایک لازمی امر ہے۔ مثلاً: جس کو چائے کی عادت ہے اس کو چائے کا خیال آئے گا، جو بیڑی، سگریٹ یا پان تمباکو کا عادی ہے اس کو ان چیزوں کا خیال آئے گا، جس کو شراب کی لت پڑی ہوئی ہے اس کو شراب کا خیال آئے گا، جو نماز کا پابند ہے اس کا دل ہمیشہ مسجد میں اٹکا رہے گا، اور اس کو بار بار نماز کا خیال آئے گا۔ مالوف کے معنی ہیں: دل پسند چیز، آدمی کو جس چیز سے الفت ہو۔ عادت و مالوف تقریباً مترادف الفاظ ہیں۔

چوتھا اور پانچواں سبب: بعض اتفاقات اچھے یا برے خیالات کا سبب بن جاتے ہیں۔ مثلاً: ایک شخص کسی دینی اجتماع میں اپنے مقصد سے گیا تھا، وہاں اس نے کسی مقرر سے کوئی بھلی بات سنی، جو اس کے دل میں اتر گئی اور وہ اس کے لئے باعث انس بن گئی یا اس کی ساری زندگی بدل گئی، یا کوئی چور کسی بزرگ کے گھر میں چوری کرنے گھسا تھا، اس نے بزرگ کی عبادت دیکھی، جس سے اس کی کایا پلٹ گئی۔ ڈاکوؤں کے سردار نے حضرت جیلانی قدس سرہ کے سچ سے متاثر ہو کر توبہ کرلی تھی۔ اسی طرح ایک نیک آدمی بروں کی صحبت میں جا بیٹھا، ان لوگوں نے اس کو ایسی پٹی پڑھائی کہ اس کی ساری زندگی تباہ ہوگئی۔ غرض اس قسم کے اتفاقات بھی اچھے برے خیالات کا سبب بنتے ہیں۔

حضرت شاہ صاحب قدس سرہ اس مضمون کو اپنے انداز پر سمجھاتے ہیں کہ انسان کا نفس ناطقہ کبھی بہیمیت کے پھندے سے نکل جاتا ہے، تو وہ اچانک ملائکہ کی جگہ سے حسب استعداد نورانی صورتیں جھپٹ لاتا ہے، جو اس کے لئے سکون قلب کا سبب بنتی ہیں یا اس کی زندگی بدل دیتی ہیں، وہ اچھے اعمال شروع کر دیتا ہے اور ولی اللہ بن جاتا ہے۔

اسی طرح بعض نفوس شیاطین سے متاثر ہوجاتے ہیں، خواہ وہ شیاطین الانس ہوں یا شیاطین الجن، ان شیاطین کا رنگ اس پر چڑھ جاتا ہے اور اس کی وجہ سے برے خیالات آنے لگتے ہیں اور وہ برے اعمال شروع کردیتا ہے۔

فائدہ: خوابوں کا معاملہ خیالات جیسا ہے۔ یعنی جو خیالات کے اسباب ہیں وہی خوابوں کے بھی ہیں، اچھے اسباب پیدا ہوتے ہیں تو اچھے خواب نظر آتے ہیں اور برے اسباب جمع ہوتے ہیں تو برے خواب نظر آتے ہیں۔ البتہ خیالات اور خوابوں میں فرق یہ ہے کہ خیالات میں چیزیں متشکل نہیں ہوتیں اور خواب میں جو خیالات دل میں گزرتے ہیں وہ دل کی آنکھوں کے سامنے متشکل ہوتے ہیں۔

اور یہ فرق اس وجہ سے ہے کہ بحالت بیداری جب آدمی کچھ خیال کرتا ہے تو دماغ اس میں مستغرق ہوکر نہیں سوچتا۔ کیونکہ بیداری کی حالت میں آنکھ کچھ دیکھ رہی ہے، کان کچھ سن رہا ہے، منہ میں کوئی چیز ہے جس کا مزہ زبان لے رہی ہے، ناک کوئی خوشبو یا بدبو سونگھ رہا ہے اور جسم سے جو چیز مس کررہی ہے اس کا بھی ادراک ہورہا ہے اور یہ تمام ادراکات دماغ کررہا ہے۔ اس وجہ سے دماغ پوری طرح خیال کی طرف متوجہ نہیں ہوتا۔ مگر جب آدمی سوجاتا ہے تو اس وقت بھی خیالات کا سلسلہ برابر چلتا رہتا ہے۔ البتہ جب تک نیند گہری ہوتی ہے خواب یاد نہیں رہتے، پھر جب نیند ہلکی پڑتی ہے تو دل میں جو خیالات گزرتے ہیں دماغ ان میں پوری طرح مستغرق ہوکر سوچتا ہے، اس لئے وہ خیالات دل کی نگاہوں کے سامنے متشکل ہوکر نظر آتے ہیں۔

اور یہ تمام خوابوں کی حقیقت کا بیان نہیں، صرف ان خوابوں کا بیان ہے جو خیالات ہوتے ہیں، رہے ڈراؤنے خواب اور مبشرات تو ان کی حقیقت جدا ہے، ڈراؤنے خواب شیطان کا تماشا ہوتے ہیں۔ حدیث میں ہے کہ ایک صحابی نے اپنا خواب سنایا کہ گویا ان کا سر قلم کردیا گیا ہے، آنحضرت ﷺ نے تبسم فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ: "جب شیطان تم میں سے کسی کے ساتھ نیند میں کھیل کرے تو اس کو لوگوں میں بیان نہ کیا کرو" (رواہ مسلم، مشکوۃ کتاب الرؤیا حدیث نمبر ۴۶۱۶)

اور مبشرات اللہ تعالیٰ کی طرف سے دکھائے جاتے ہیں۔ خواب کی یہ تین قسمیں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی مرفوع روایت میں آئی ہیں۔ دیکھئے سنن دارمی ۲:۱۲۵ ترمذی شریف ابواب الرؤیا اور ابن سیرین رحمہ اللہ جو بڑے تابعی ہیں ان سے بھی مروی ہیں (خوابوں کی تفصیل کے لئے دیکھیں رحمۃ اللہ ۵:۵۲۵-۵۳۸)

﴿باب في أسباب الخواطر الباعثة على الأعمال﴾

اعلم: أن الخواطر التي يجدها الإنسانُ في نفسه، وتبعثه على العمل بموجَبها، لاجرم أن لها أسبابا، كسنة الله تعالى في سائر الحوادث. والنظرُ والتجربةُ يُظهران أنَّ:

منها ـــ وهو أعظمها ـــ جِبِلَّةُ الإنسان التي خُلق عليها، كما نبَّهَ النبي صلى الله عليه وسلم

في الحديث الذي رويناه من قبل.

ومنها: مزاجه الطبيعي، المتغيّر بسبب التدبير المحيط به: من الأكل والشرب ونحو ذلك، كالجائع يطلب الطعام، والظمآن يطلب الماء، والمغتلم يطلب النساء، ورب إنسان يأكل غذاءً يقوّي الباءة فيميل إلى النساء، ويحدّث نفسه بأحاديث تتعلق بهن، وتصير هذه مُهَيِّجَةً له على كثير من الأفعال؛ ورب إنسان يغتذي غذاءً شديدًا فيقسو قلبه، ويجترئ على القتل، ويعنف في كثير مما لا يعنف فيه غيره؛ ثم إذا راض هذان أنفسهما بالصيام والقيام، أو شابا وكبرا، أو مرضا مرضًا مدنفًا، تغير أكثر ما كان عليه، ورقّت قلوبهما، وضعفت نفوسهما، ولذلك ترى الاختلاف بين الشيوخ والشبان، ورخص النبي صلى الله عليه وسلم للشيخ في القبلة وهو صائم، ولم يرخص للشاب.

ومنها: العادات والمألوفات: فإن من أكثر ملابسة شيئ، وتمكن من لوح نفسه ما يناسبه من الهيئات والأشكال، مال إليه كثير من خواطره.

ومنها: أن النفس الناطقة في بعض الأوقات، تنفلت من أسر البهيمية، فتختطف من حيّز الملأ الأعلى ما يتيسر لها من هيئة نورانية: فتكون تارة من باب الأنس والطمأنينة، وتارة من باب العزم على الفعل.

ومنها: أن بعض النفوس الخسيسة تتأثر من الشياطين، وتنصبغ ببعض صبغهم، وربما انقدحت تلك الهيئة خواطر وأفعالا.

واعلم أن المنامات أيضًا كأمر الخواطر، غير أنها تتجرد لها النفس، فتتشبح لها صورها وهيئاتها؛ وقال محمد بن سيرين: الرؤيا ثلاث: حديث النفس، وتخويف الشيطان، وبشرى من الله.

ترجمہ: ان خیالات کے اسباب کا بیان جو اعمال کا باعث ہوتے ہیں: جان لیجئے کہ وہ خیالات جن کو انسان اپنے دل میں پاتا ہے اور جو اس کو اپنے تقاضے کے مطابق عمل کرنے پر ابھارتے ہیں، یقیناً ان کے لئے کئی اسباب ہیں، جو یا کہ نفس میں حدت ہے، مگر حوادث (نئے پیدا ہونے والے واقعات) میں۔ اور خواطر اور تجربہ ظاہر کرتے ہیں:

ان میں سے ایک: ـــــ اور وہ ان اسباب میں سب سے بڑا سبب ہے ـــــ انسان کی وہ فطرت ہے جس پر وہ پیدا کیا گیا ہے، جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے تنبیہ فرمائی ہے اس حدیث میں جس کو ہم نے پہلے (باب ۱۱ میں) روایت کیا ہے۔

اور ان میں سے ایک: انسان کا مادی مزاج ہے، جو اس تدبیر کی وجہ سے بدلتا رہتا ہے جو انسان کو گھیرے ہوئے

ہے یعنی کھانا پینا اور اس کے مانند، جیسے بھوکا کھانا چاہتا ہے، پیاسا پانی ڈھونڈتا ہے، شہوت پرست عورتوں کو چاہتا ہے اور جو انسان ایسی غذا کھاتے ہیں جو قوت باہ کو قوی کرتی ہے، پس وہ شخص عورتوں کی طرف مائل ہوتا ہے اور اپنے دل سے ایسی باتیں کرتا ہے جو عورتوں سے تعلق رکھتی ہیں اور یہ باتیں اس کو بہت سے کاموں پر برانگیختہ کرنے والی ہوتی ہیں۔ اور جو انسان سخت غذا کھاتے ہیں، پس اس کا دل سخت ہو جاتا ہے اور وہ قتل پر جری ہو جاتا ہے اور وہ بہت سی ایسی جگہوں میں غصہ کرتا ہے، جہاں دوسرے کو غصہ نہیں آتا۔ پھر جب یہ لوگ اپنے نفس کو سدھا لیتے ہیں (نفل) روزوں اور نفل نمازوں سے یا بوڑھے ہو جاتے ہیں اور بہت بوڑھے ہو جاتے ہیں یا ڈھال کرنے والی بیماری میں مبتلا ہو جاتے ہیں تو ان باتوں میں سے بیشتر باتیں بدل جاتی ہیں جو ان میں تھیں اور ان کے دل ہلکے ہو جاتے ہیں اور ان کے نفس پاکدامن ہو جاتے ہیں، اور اسی وجہ سے آپ بوڑھوں اور جوانوں کے درمیان (احکام میں) فرق پاتے ہیں اور اجازت دی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بوڑھے کو بوسہ لینے کی، روزے کی حالت میں، اور جوان کو اجازت نہ دی (اخرجہ مالک فی الموطا، جامع الاصول ۶:۱۲۷)

اور ان میں سے ایک: عادات اور مألوفات ہیں، پس بیشک جس شخص کا کسی چیز کے ساتھ زیادہ تعلق ہوتا ہے اور اس کے دل کی تختی میں اس چیز سے مناسبت رکھنے والی ہیئتیں اور شکلیں جم جاتی ہیں تو اس کی طرف اس کے بہت سے خیالات مائل ہو جاتے ہیں۔

اور ان میں سے ایک: یہ ہے کہ نفس ناطقہ بعض اوقات میں بہیمیت کی قید سے چھوٹ جاتا ہے، پس وہ ملأ اعلیٰ کی جگہ سے جھپٹ لیتا ہے وہ نورانی ہیئتیں جو اس کے لئے آسان کی جاتی ہیں، پس کبھی وہ انس و اطمینان کے قبیل سے بن جاتی ہیں اور کبھی کام کا پختہ ارادہ کرنے کے قبیل سے ہو جاتی ہیں۔

اور ان میں سے ایک: یہ ہے کہ بعض نچلے نفوس شیاطین سے متاثر ہو جاتے ہیں اور ان کے کچھ رنگ میں رنگین ہو جاتے ہیں اور کبھی یہ حالت خیالات اور اعمال کا تقاضا کرتی ہے۔

(فائدہ) اور جان لیجئے کہ خوابوں کا معاملہ خیالات کے معاملہ کی طرح ہے، البتہ خوابوں کے لئے نفس تنہا ہو جاتا ہے، پس خوابوں کی صورتیں اور شکلیں متشکل ہوتی ہیں۔ فرمایا حضرت محمد بن سیرین رحمہ اللہ نے کہ خواب تین ہیں: دل کی باتیں (یعنی خیالات) اور شیطان کا ڈرانا، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے خوش خبری (حدیث متفق علیہ، مشکوۃ کتاب الرؤیا حدیث نمبر ۴۶۱۳)

لغات:

الخواطر مفرد الخاطر: وہ امر، تدبیر یا خیال جو دل میں گزرے اور کبھی دل اور نفس پر بھی مجازاً اطلاق کیا جاتا ہے ...

مُوجَب (مصدر میمی) چاہنا، لازم ہونا، ثابت ہونا۔ مُوجَب (اسم مفعول) حکم، مقتضا   جبلت: فطرت، طبیعت۔ جبلہ (ن) طبیعت پیدا کرنا ۔ لاجرم اور لاجرم: یقیناً، ضرور   نظر عمیق کی اصطلاح ہے گہری غور و فکر   منہمک (عفت) اغتلم شہوت پرست ہونا ۔ الباءۃ والبائۃ والباء والباہ: منزل، گھر، جماع کی قوت، باہ، کیونکہ گھر بسانے کے لئے یہ قوت ضروری ہے   ھیّج تہییجا الشیءَ: برانگیختہ کرنا، بھڑکانا ۔ ارتاض العظمُ: ہڈی کا سدھ جانا   شاب یشیب شیبا: بوڑھا ہونا ۔ کبر (س) کبرا فی السن: عمر رسیدہ ہونا   اقنعہ المرض: بیماری نے اس کو لاغر کر دیا۔ ادنف (س) المریض دنفا: بیماری کا بڑھ جانا اور قریب مرگ ہونا   عفّ (ض) عفا: پاک دامن ہونا ۔ حیز: مکان، جگہ تحیّز   تجرّد: الگ ہونا، تمام کاموں سے فارغ ہو کر مشغول ہونا۔

نوٹ: مخطوطہ کراچی اور مخطوطہ برلین میں یہ باب مختصر کے عنوان سے ہے۔

☆ ☆ ☆

باب ــــ ۱۱

عمل کا نفس سے وابستہ ہونا اور اس کا ریکارڈ کیا جانا

انسان اور دیگر حیوانات میں فرق یہ ہے کہ انسان جب اپنے اختیار سے کوئی کام کرتا ہے تو وہ عمل وجود میں آ کر ختم نہیں ہو جاتا، بلکہ اس کے نفس کے ساتھ وابستہ ہو جاتا ہے یعنی دل میں اس کا اثر باقی رہتا ہے، اور دیگر حیوانات کے اعمال وجود پذیر ہو کر ختم ہو جاتے ہیں، ان کے دلوں میں ان کا کوئی اثر باقی نہیں رہتا۔ مثلاً ایک جانور بھاگتا ہے اور اپنی جولانی کا وحشی کسی کو زخمی کرتا ہے یا مار ڈالتا ہے تو اس کے دل کو اس کا کوئی احساس نہیں ہوتا کہ اس نے کوئی برا کام کیا اور بار بار نقصان پہنچاتا ہے، اور اس کے نفس کا حال یکساں رہتا ہے۔ مگر انسان کی صورت حال جانوروں سے مختلف ہے۔ جب اس سے کوئی زیادتی ہو جاتی ہے تو اول وہلہ ہی میں وہ اپنے عمل سے متاثر ہوتا ہے، وہ نادم ہوتا ہے، اپنے آپ کو ملامت کرتا ہے، اور وہ کوشش کرتا ہے کہ وہ دوبارہ یہ غلطی نہ دہرائے۔ یہ اس بات کی علامت ہے کہ اس کا کیا ہوا کام اس کے نفس کے ساتھ چپک گیا ہے ـــــ اعمال صالحہ کا معاملہ بھی یہی ہے جو نہی کوئی اچھا کام کرتا ہے تو اسے کوئی خوشی محسوس نہیں ہوتی اور انسان کا دل خوشی سے لبریز ہو جاتا ہے، وہ پھولا نہیں سماتا، اس کے تن بدن میں شادمانی کی لہر دوڑ جاتی ہے اور وہ تمنا کرتا ہے کہ ہمیشہ ہی وہ ایسے اچھے کام کرتا رہے (رحمۃ اللہ ۱؍۲۱۳ پر یہ مضمون گذر چکا ہے)

خلاصہ یہ ہے کہ انسان کا ہر عمل خواہ نیک ہو یا بد نفس کے دامن سے چپک جاتا ہے اور وابستہ ہونے کے علاوہ اس کو باقاعدہ ریکارڈ بھی کیا جاتا ہے۔ یہ سارا ریکارڈ محفوظ ہے، کل قیامت کے دن اس کے سامنے رکھ دیا جائے گا۔ سورۃ

(الاسراء آیت ۱۳) میں ارشاد فرمایا گیا ہے: "اور ہم نے ہر انسان کا عمل اس کے گلے کا ہار بنا کر رکھا ہے اور قیامت کے دن ہم اس کا نامۂ اعمال اس کے سامنے کر دیں گے، جسے وہ کھلی کتاب کی طرح پائے گا: پڑھ تو اپنا نامۂ اعمال، آج تو خود ہی اپنا حساب لگانے کے لئے کافی ہے"

اس آیت میں جو فرمایا گیا ہے کہ: "ہم نے ہر انسان کی گردن میں اس کا نامۂ اعمال چپکا دیا ہے" یہ قرآنی تعبیر ہے۔ حضرت شاہ صاحب نے اسی کو نفس کے دامن سے چپکانا کہا ہے۔ اور قیامت کے دن جو نامۂ اعمال کھلی کتاب کی صورت میں اس کے سامنے رکھا جائے گا، وہی ریکارڈ ہے جو انسانی اعمال کا برابر تیار کیا جا رہا ہے۔

اور حدیث قدسی میں ہے کہ تم پر جو آفتیں بلائیں اور خیرات وبرکات نازل ہوتی ہیں: "وہ تمہارے اعمال ہی ہیں، جو میں نے تمہارے لئے جمع کر رکھے ہیں، پھر میں وہ اعمال تم کو پورے پورے چکاؤں گا، پس جو شخص خیر پائے وہ اللہ کی تعریف کرے، اور جو دوسری طرح کا معاملہ پائے وہ اپنے نفس ہی کو کوسے" یعنی وہ برے حالات تمہارے برے اعمال کا نتیجہ ہیں ـــــ اس حدیث سے واضح ہوا کہ اعمال جمع کر رکھے گئے ہیں، یہی اعمال کا ریکارڈ کیا جانا ہے۔

اور ایک دوسری حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ: "نفس آرزو کرتا ہے اور خواہش کرتا ہے اور شرمگاہ اس کی تصدیق وتکذیب کرتی ہے" اس حدیث سے واضح ہوا کہ اعضاء کے زنا کی خواہش اور تمنا دل کرتا ہے، معلوم ہوا کہ اعضاء سے صادر ہونے والے اعمال کا تعلق دل سے ہے یعنی اعمال کا نفس سے صادر ہوتا ہے۔

﴿باب لُصوق الأعمال بالنفس، وإحصائها عليها﴾

قال الله تعالى: ﴿وَكُلَّ إِنسَانٍ أَلْزَمْنَاهُ طَائِرَهُ فِي عُنُقِهِ وَنُخْرِجُ لَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ كِتَابًا يَلْقَاهُ مَنشُورًا، اقْرَأْ كِتَابَكَ، كَفَى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيبًا﴾ وقال النبي صلى الله عليه وسلم، راويًا عن ربه تبارك وتعالى: ﴿إنما هي أعمالكم، أُحصيها عليكم، ثم أُوفيكم إياها، فمن وجد خيرًا فليحمد الله، ومن وجد غير ذلك فلا يلومنَّ إلا نفسه﴾ وقال النبي صلى الله عليه وسلم: ﴿النفس تمنّى وتشتهي، والفرج يصدّق ذلك ويكذّبه﴾

ترجمہ: نفس کے ساتھ اعمال کے چپکنے کا اور نفس کے خلاف ان کے ریکارڈ کئے جانے کا بیان: اللہ پاک نے ارشاد فرمایا: "اور ہر انسان پر اس کی گردن میں اس کا پرندہ (اڑنے والا نامۂ اعمال) ہم نے چپکایا ہے، اور نکالیں گے ہم اس کے لئے قیامت کے دن ایک نوشتہ، ملاقات کرے گا وہ اس سے کھلے ہوئے ہونے کی حالت میں، (کہا جائے گا) پڑھ تو تیرا نوشتہ، کافی ہے تو خود ہی آج تیرے خلاف حساب کرنے کے لئے" ـــــ اور فرمایا نبی کریم ﷺ نے اپنے پروردگار تبارک وتعالیٰ سے روایت کرتے ہوئے: "وہ (آفات وبلیات اور رحمت وبرکات) تمہارے اعمال ہی ہیں،

جمع کرکے رکھ رہا ہوں میں ان کو تمہارے خلاف، پھر پورا پورا چکاؤں گا میں تم کو وہ اعمال، پس جو شخص خیر پائے (یعنی اس کو اچھے احوال پہنچیں) پس وہ اللہ تعالیٰ کی تعریف کرے، اور جو شخص اس کے علاوہ پائے (یعنی الائیں بلائیں اس کو پہنچیں) تو وہ ہرگز ملامت نہ کرے مگر اپنی ذات کو (رواہ مسلم ۱۶: ۲۳۲ مصری، مشکوۃ کتاب الدعوات باب الاستغفار حدیث نمبر ۲۳۲۶)

اور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ: "نفس آرزو کرتا ہے اور خواہش کرتا ہے اور شرمگاہ اس کی تصدیق کرتی ہے اور اس کی تکذیب کرتی ہے" یعنی اگر شرمگاہ نے زنا کیا تو اس نے نفس کی خواہش پر صاد کر دیا اور اگر نہ کیا تو اس نے نفس کی خواہش کو جھٹلا دیا اور اس کی اطاعت نہ کی (حدیث متفق علیہ، مشکوۃ کتاب الایمان باب الایمان بالقدر حدیث نمبر ۸۶)

لغات:

طائر: اڑنے والا پرندہ، مراد نامۂ اعمال، کیونکہ نامۂ اعمال قیامت کے دن اڑائے جائیں گے ...... حدیث قدسی: وہ حدیث ہے جس کا مضمون اللہ تعالیٰ کی طرف سے آیا ہو، اور اس کو الفاظ کا جامہ آنحضور ﷺ نے پہنایا ہو، یعنی آپ نے اس مضمون کو اپنے الفاظ میں تعبیر فرمایا ہو ...... أحصی الشیء: شمار کرنا، گننا ...... وفّی توفیۃ اور أوفی إیفاء: پورا حق دینا۔

☆ ☆ ☆

چار باتیں

اس باب میں شاہ صاحب چار باتیں بیان فرما رہے ہیں:

(۱) اعمال و اخلاق کا نفس کی تہ سے پھوٹنا — انسان جو کام پوری سنجیدگی اور قصد و ارادے سے کرتا ہے، اسی طرح اخلاق و صفات راسخۃ فی النفس، نفس ناطقہ کی جڑ سے پھوٹتے ہیں۔

(۲) اعمال و اخلاق وجود پذیر ہو کر ختم نہیں ہو جاتے، بلکہ نفس کی طرف لوٹتے ہیں۔

(۳) اختیاری اعمال و اخلاق نفس کی طرف لوٹ کر نفس کے دامن سے چمٹ جاتے ہیں یعنی وابستہ ہو جاتے ہیں۔

(۴) انسانی اعمال و اخلاق ریکارڈ کر لئے جاتے ہیں۔ ان کو جمع کر کے رکھ دیا جاتا ہے۔

۱ — اعمال و اخلاق کا نفس کی جڑ سے اٹھنا

انسان جو کام اپنے ارادے سے کرتا ہے، اسی طرح ملکات راسخۃ فی النفس، جیسے بہادری و بزدلی اور سخاوت و بخل وغیرہ، یہ سب نفس ناطقہ کی تہ سے اٹھتے ہیں۔ اوپر حدیث آئی ہے کہ زنا کی آرزو نفس کرتا ہے، اعضاء اس کی مطاوعت کرتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ زنا جو ایک برا عمل ہے نفس ناطقہ کی تہ سے ابھرتا ہے۔ یہی حال تمام نیک و بد اعمال کا ہے اور یہی معاملہ تمام اخلاق راسخۃ فی النفس کا ہے۔

انسان جو کچھ بھول چوک، لغزش یا کراہیت کی وجہ سے کرتا ہے وہ بھی سرسری اعمال ہوتے ہیں نفس ناطقہ کی تہہ سے نہیں اٹھتے اسی طرح صفات عارضہ: جیسے کوئی خوش خبری سنی تو چہرہ دمک گیا یا خوف زدہ کی بات سنی تو تھوڑی دیر کے لئے چہرہ اتر گیا یہ عوارض، اخلاق بھی نفس ناطقہ کی جڑ سے نہیں پھوٹتے۔

اور مذکورہ دعوی کی دلیل یہ ہے کہ آپ باب (۱) میں ملکیت اور بہیمیت اوران کے باہمی اجتماع کی قسمیں پڑھ چکے ہیں اور ہر قسم کا حکم بھی معلوم کر چکے ہیں۔ نیز باب (۲) میں خیالات کے اسباب سے بھی واقف ہو چکے ہیں کہ طبعی مزاج کا غلبہ، ملائکہ یا شیاطین کا رنگ پکڑنا اور دیگر اسباب انسان کی جبلت اور فطری مناسبت کے مطابق عمل کرتے ہیں، پس ثابت ہوا کہ تمام اعمال واخلاق کی لوٹنے کی جگہ نفس ہے خواہ بلا واسطہ لوٹیں یا بالواسطہ، اگر اسباب کا لحاظ نہیں کریں گے تو تمام اعمال واخلاق بلا واسطہ نفس کی طرف لوٹیں گے، اور اگر اسباب کا لحاظ کریں گے تو بالواسطہ (بواسطہ اسباب) لوٹیں گے۔

نباتات کا ماہر پودا دیکھ کر ہی سمجھ جاتا ہے کہ آگے چل کر یہ کیسا درخت بنے گا۔ مثل ہے: "ہونہار بروے کے چکنے چکنے پات" یعنی جس پودے کے پتے خوب چکنے ہوں وہ آگے چل کر شاندار درخت بنتا ہے۔

تجربہ کار بچپن ہی سے بچہ کا مزاج تاڑ لیتے ہیں اور دو ٹوک کہہ جاتے ہیں کہ اگر بچہ کا یہ مزاج جوان ہونے تک باقی رہا تو ضرور وہ عورتوں کی سی عادات اختیار کرے گا، ان کا سا پوشاک پہنے گا اور ان کی عادتیں اپنائے گا۔

ایک طبیب پہچان لیتا ہے کہ اگر فلاں بچہ اپنے فطری مزاج پر جوان ہوا اور کوئی ناگہانی آفت پیش نہ آئی تو وہ دیر تک جوان رہتا ہوگا یا نحیف وزار رہے گا۔

یہ سب باتیں پہلے سے اس لئے معلوم ہو جاتی ہیں کہ درخت کی پوری صورت حال پودے اور بیج سے نمودار ہوتی ہے، آدمی کی زندگی بھر کے احوال اس کی فطرت اور بچپن کے اندر ہوتے ہیں، ٹھیک اسی طرح اعمال واخلاق کا منبع بھی نفس ہے، تمام اعمال واخلاق نفس کی جڑ ہی سے ابھرتے ہیں۔

اعلم: أن الأعمال التي يقصدها الإنسان قصدًا مؤكدًا، والأخلاق التي هي راسخة فيه: تنبعث من أصل النفس الناطقة، ثم تعود إليها، ثم تتشبث بذيلها، وتحيط عليها.

أما الانبعاث منها: فلما عرفت: أن للملكية والبهيمية واجتماعهما أقسامًا، ولكل قسم حكمًا؛ وغلبةُ المزاج الطبيعي، والانصباغُ من الملائكة والشياطين، ونحوُ ذلك من الأسباب، لاتكون إلا حسب ماتعطيه الجبلة، وتحصُل فيه المناسبة، فلذلك كان المرجعُ إلى أصل النفس، بوسط أو بغير وسط.

ألست ترى المتخنثَ: يتعلق في أول أمره على مزاج ركيك، فيستدل به العارف على أنه إن شب

على مزاجه يوجب أن يعتاد بعادات النساء، ويتزيا بزيهن، وينتحل رسومهن، وكذلك يدرك الطبيب أن الطفل إن نشأ على مزاجه، ولم يفجأه عارض، كان قويا فارها، أو ضعيفا ضارعا.

ترجمہ: یہ بات جان لیں کہ جو اعمال انسان اپنے پختہ ارادے سے کرتا ہے اور جو اخلاق آدمی میں راسخ ہوتے ہیں، ان کا ظہور نفس ناطقہ کی جڑ سے ہوتا ہے، پھر وہ نفس کی طرف لوٹتے ہیں، پھر وہ نفس کے دامن سے چمٹ جاتے ہیں اور نفس کے خلاف ثبت کر دئے جاتے ہیں۔

رہا نفس سے ظہور تو اس کی دلیل وہ باتیں ہیں جو آپ جان چکے ہیں کہ قوت ملکیہ اور قوت بہیمیہ اور ان کے اتصال کی مختلف قسمیں ہیں، اور ہر قسم کا حکم جدا ہے۔ اور (آپ یہ بھی جان چکے ہیں کہ) مادی مزاج کا غلبہ اور ملائکہ و شیاطین سے رنگ پکڑنا، نیز اس قسم کے دیگر اسباب نہیں ہوتے (یعنی عمل نہیں کرتے) مگر جبلت کے اپنے ارادوں میں مناسبت پیدا ہونے کے موقع، بلا واسطہ یا بالواسطہ نفس کی جڑ میں مرتج (لوٹنے کی جگہ) ہے۔

کیا آپ نہیں دیکھتے کہ مخنث شروع ہی سے مخنث مزاج پر پیدا کیا جاتا ہے اور واقف کار اس مزاج سے اس بات پر استدلال کرتا ہے کہ اگر وہ اپنے مزاج پر جوان ہوا (اور اس کا کوئی مانع نہ ہوا) تو ضروری ہے کہ وہ عورتوں کی سی عادتیں اپنائے اور ان کی سی وضع قطع پہنے اور ان کے طور طریقوں کی طرف منسوب ہو۔

اور اسی طرح طبیب سمجھ جاتا ہے کہ (فلاں) بچہ اگر اپنے مزاج پر جوان ہوا اور اچانک کوئی عارض پیش نہ آیا تو وہ توانا قوی ہوگا یا کمزور لاغر ہوگا۔

لغات و ترکیب:

قصدا مؤکدا: مرکب توصیفی مفعول مطلق ہے۔ ... نشأ نشأ وتنشئۃ بکذا: پرورش پانا، متعلق ہونا۔ غلبۃ المزاج الخ مبتدا ہے اور لاتکون الخ خبر ہے ... ماتعطیہ میں ما مصدریہ ہے اور تحصل کا عطف یعطیہ پر ہے۔ رکیک: کمزور، جمع رکاک و رکائک ... تزیی: آراستہ ہونا، تزیا بزی القوم: قوم کا لباس پہننا، الزی: ہیئت، شکل، وضع قطع، کہا جاتا ہے اقبل بزی العرب: وہ عرب کے لباس میں آیا ... انتحل: منسوب ہونا، دوسرے کی چیز اپنی طرف منسوب کرنا۔ الفارہ: خوب کھانے والا ... ضرع (ف س ک) کمزور ہونا۔

۲ — اعمال و اخلاق کا نفس کی طرف لوٹنا

جب انسان کوئی کام بار بار کرتا ہے تو اس کی عادت پڑ جاتی ہے، پھر وہ کام بسہولت ہونے لگتا ہے۔ اب اس کام کو کرنے کے لئے نہ بہت زیادہ غور و فکر کی ضرورت ہوتی ہے نہ ارادہ کو زحمت دینی پڑتی ہے، خود بخود آسانی سے وہ کام

ہو جاتا ہے۔ ایسا کیوں ہو گیا ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب کام بوجود عمل آکر بار بار نفس کی طرف لوٹتا ہے اور نفس اس کو قبول کرتا ہے تو نفس پر اس کا رنگ چڑھتا ہے اور رفتہ رفتہ نفس اس کام کے اثر سے رنگین ہو جاتا ہے۔ اس کو مشاق ہونا اور عادی ہونا بھی کہتے ہیں مثلاً ایک شخص نے آج قلم پکڑا ہے اور دوسرا شخص چھ ماہ سے کتابت سیکھ رہا ہے۔ آپ دونوں کو چار سطریں کتابت کے لئے دیں، پہلا شخص آدھ گھنٹے میں کتابت کرے گا اور دوسرا پانچ منٹ میں لکھ دے گا اور اول سے بہتر لکھے گا، کیونکہ اس نے چھ ماہ تک جو کتابت کا عمل کیا ہے وہ بار بار اس کے نفس کی طرف لوٹتا رہا ہے اور نفس اس سے متأثر ہوا ہے، اس وجہ سے اس کو کتابت کی مشق ہو گئی ہے۔

غرض ہم جنس اعمال کا نفس کی اثر پذیری میں دخل ہوتا ہے اگرچہ یہ دخل بوجہ قلیل ہونے کے محسوس نہ ہو، اسی کی طرف حدیث شریف میں اشارہ ہے کہ فتنے دلوں پر اس طرح پیش کئے جاتے ہیں، جس طرح چٹائی بننے والا تنکا تنکا ملا کر رکھتا ہے اور تین چار گھنٹے میں چٹائی تیار ہو جاتی ہے، اسی طرح سارے فتنے دل پر ایک ساتھ ہجوم نہیں کرتے، ایک ایک کرکے فتنے دل کو متأثر کرتے ہیں اور رفتہ رفتہ دل مفتون ہو جاتا ہے۔

وأما العود إليها: فلأن الإنسان إذا عمل عملاً، فأكثر منه، اعتادته النفس، وسهل صدوره منها، ولم يحتج إلى روية وتجشم داعية، فلاجرم أن النفس تأثرت منه، وقبلت لونه؛ ولاجرم أن لكل عمل من تلك الأعمال المتجانسة مدخلاً في ذلك التأثر، وإن دقّ وخفي مكانه، وإليه الإشارة في قوله صلى الله عليه وسلم: «تعرض الفتن على القلوب كالحصير عودًا عودًا، فأي قلب أشربها نكتت فيه نكتة سوداء، وأي قلب أنكرها نكتت فيه نكتة بيضاء، حتى تصير على قلبين: أبيض مثل الصفا، فلا تضره فتنة مادامت السماوات والأرض؛ والآخر أسود مربادًا كالكوز مجخيا، لا يعرف معروفًا، ولا ينكر منكرًا، إلا ما أشرب من هواه»

ترجمہ: اور رہا (اعمال کا) نفس کی طرف لوٹنا تو اس کی دلیل یہ ہے کہ انسان جب کوئی کام کرتا ہے اور بار بار کرتا ہے تو نفس اس کا عادی ہو جاتا ہے اور اس عمل کا نفس سے صادر ہونا آسان ہو جاتا ہے اور غور وفکر اور ارادہ کو تکلیف دینے کی ضرورت باقی نہیں رہتی، پس لامحالہ یہ بات ہے کہ نفس اس عمل سے متأثر ہوا ہے۔ اور نفس نے اس عمل کا رنگ قبول کر لیا ہے اور یقیناً یہ بات ہے کہ ان ایک جیسے اعمال میں سے ہر عمل کا اس اثر پذیری میں دخل ہے، اگرچہ وہ دخل باریک ہے اور اس کی جگہ پوشیدہ ہے (یعنی اس کا سمجھنا دشوار ہے) اور اسی دخل کی طرف اشارہ ہے اس ارشاد نبوی میں کہ: "فتنے دلوں پر پیش کئے جاتے ہیں، چٹائی کی طرح تنکا تنکا کرکے، پس جو دل بھی فتنے پلا دیا گیا (یعنی فتنے اس میں پیوست ہو گئے یعنی فتنوں سے اس دل کو دلچسپی ہو گئی ہے) اس دل میں ایک سیاہ دھبہ لگا دیا جاتا ہے۔ اور جو دل فتنوں کو ناپسند کرتا ہے اس

میں ایک سفید نقطہ لگایا جاتا ہے یہاں تک کہ دل دو طرح کے ہو جاتے ہیں (ایک) مثل صفا کی طرح سفید، پس اس کو کوئی فتنہ ضرر نہیں پہنچاتا جب تک آسمان و زمین برقرار ہیں (یعنی تا ابد) اور دوسرا سیاہ خاکستری اوندھی صراحی کی طرح، وہ نہ کسی نیکی کو پہچانتا ہے اور نہ کسی برائی کو جانتا ہے، مگر وہی خواہش جو وہ پلایا گیا ہے یعنی اس کی محبت میں اس کا دل گرفتار رہتا ہے

(رواہ مسلم، مشکوۃ، کتاب الفتن حدیث نمبر ۵۳۸۰)

لغات:

الرویۃ: امور میں غور و فکر ۔ تجشم الامر: مشقت سے کام کرنا ۔ عوداً عوداً: بوریے میں تنکے ایک کے پیچھے ایک لگائے جاتے ہیں، اسی طرح سے دلوں پر فتنے وارد ہوتے ہیں ۔ ربدۃ (ربد اربداداً وارْبادّ اربیداداً) خاکستری رنگ والا ہونا ۔ مجخی (اسم مفعول) مجخیا (اسم فاعل) سرنگوں ۔ تجخی الکوز: سرنگوں ہونا، اوندھا ہونا۔ اوندھی کی ہوئی صراحی میں کچھ بھی نہیں بھرا جا سکتا، جو کچھ اس میں ڈالا جائے گا وہ فوراً نکل پڑے گا، اسی طرح اس دل میں بھی کوئی خیر کی بات نہیں ڈالی جا سکتی۔

۳ — اعمال و اخلاق کا نفس کے دامن سے چمٹنا

اس مضمون کو سمجھنے کے لئے پہلے دو باتیں سمجھنی ضروری ہیں:

(۱) بچے کا نفس شروع میں ہیولانی ہوتا ہے — جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو آغاز میں اس کا نفس ہیولی جیسی کیفیت میں ہوتا ہے، جس طرح ہیولی میں کوئی صورت نہیں ہوتی مگر اس میں ہر صورت کو قبول کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے، اسی طرح بچے کے ذہن میں بھی کوئی صورت نہیں ہوتی مگر اس میں ہر صورت کو قبول کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے، یا جیسے کوری تختی ہر نقش سے خالی ہوتی ہے مگر اس میں ہر نقش کو قبول کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے، اس پر جو چاہیں لکھ سکتے ہیں، اسی طرح ابتدائے آفرینش میں بچے کا ذہن کورا، ہر نقش سے خالی ہوتا ہے مگر اس میں ہر نقش کو قبول کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ پھر بچہ جوں جوں بڑھتا ہے اس کے نفس میں صورتیں جمنی شروع ہو جاتی ہیں یعنی نفس کا تدریجاً قوت سے فعل کی طرف نکلتا ہے۔

نوٹ: ہیولی یونانی زبان کا لفظ ہے، اس کے لغوی معنی اصل اور مادہ کے ہیں اور اصطلاح میں ہیولی اجسام طبعیہ کا وہ جوہری جزء ہے جو اتصال و انفصال کو قبول کرتا ہے۔ وہ خود اس کی نہ کوئی خاص شکل ہوتی ہے نہ کوئی معین صورت، البتہ وہ ہر شکل اور ہر صورت کو قبول کرنے کی استعداد رکھتا ہے، جیسے موم، اس کی کوئی خاص صورت نہیں مگر اس میں ہر صورت کو قبول کرنے کی صلاحیت ہے، موم جب بھی پایا جائے گا کسی نہ کسی صورت میں پایا جائے گا، وہ گول ہوگا یا لمبا ہوگا، چوکور ہوگا یا کسی اور صورت میں ہوگا، موم کسی معین صورت کے بغیر خارج میں نہیں پایا جا سکتا مگر وہ خاص صورت کا محتاج نہیں، یہی حال ہیولی کا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے عالم مادی کی تمام چیزیں ہیولی سے بنائی ہیں، وہ جسم کے دونوں جوہری اجزاء:

(ب) تقدیر الٰہی سے اچانک کوئی اچھی یا بری حالت پیش آجائے جو احوال کو بدل کر رکھ دے، جیسے کوئی ایسی نیکی کرنے کی توفیق مل گئی: اسلام قبول کر لیا، یا حج کی توفیق مل گئی، جن سے سابقہ گناہ مٹ گئے جیسا کہ قرآن میں ضابطہ آیا ہے کہ نیکیاں برائیوں کو مٹا دیتی ہیں اور حدیث میں ہے کہ توبہ کرنے والا ایسا ہو جاتا ہے کہ گویا اس نے گناہ کیا ہی نہیں یعنی سارا ریکارڈ دُھل جاتا ہے۔ اور مؤمن شرک میں مبتلا ہو جائے تو اس کے سابقہ تمام اعمال صالحہ اکارت ہو جاتے ہیں۔

غرض مذکورہ دو صورتیں مستثنیٰ کر کے قاعدہ کلیہ یہ ہے کہ انسان کے تمام اعمال و اخلاق نفس کے دامن سے وابستہ رہتے ہیں، وہ موجود ہو کر ختم نہیں ہو جاتے۔

وأما التشبث بذيلها: فلأن النفس في أول أمرها تُخلق هَيُولانية، فارغة عن جميع ما تصطبغ به، ثم لاتزال تخرج من القوة إلى الفعل يوما فيوما؛ وكلُّ حالة متأخرة لها مُعِدٌّ من قبلها، والمعدّات كلها سلسلة مترتّبة، لايتقدم متأخرُها على متقدِّمه، مُستصحَبٌ في هيئة النفس الموجودة اليومَ حكمُ كلِّ مُعِدٍّ قبلها، وإن خفي عليها بسبب اشتغالها بما هو خارج منها؛ اللهم إلا أن يفنى حاصلُ القوة المنبعثة تلك الأعمالُ منها، كما ذكرنا في الشيخ والمريض، أو تهجم عليها هيئةٌ من فوقها تُغيِّر نظامها كالتغير المذكور، كما قال الله تعالى: ﴿إِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ﴾ وقال: ﴿لَئِنْ أَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ﴾

ترجمہ: اور رہا نفس کے دامن کے ساتھ چمٹنا: تو اس کی دلیل یہ ہے کہ نفس ابتدائے آفرینش میں ہیولیٰ جیسی حالت میں پیدا کیا جاتا ہے، درانحالیکہ وہ ان تمام چیزوں سے خالی ہوتا ہے جن کے ساتھ (آئندہ) وہ رنگین ہوتا ہے۔ پھر دن بدن نفس قوت (ہوسکنے) سے فعل (ہونے) کی طرف نکلتا رہتا ہے۔ اور ہر پچھلی حالت کے لئے ایک تیار کرنے والا ہے اس کے پہلے سے (یعنی معد کے تیار کرنے سے پچھلی حالت موجود ہوتی ہے) اور معدات تمام کے تمام سلسلہ وار مرتب ہوتے ہیں، ان کا پچھلا پہلے پر مقدم نہیں ہو سکتا۔ نفس کی آج موجودہ حالت ساتھ لینے والی ہے اس سے پہلے کے ہر معد کے حکم کو، اگرچہ نفس پر یہ بات پوشیدہ ہوتی ہے، اس کے اس عمل میں مشغول ہونے کی وجہ سے جو اس سے (یعنی اعمال) صادر ہو رہا ہے۔ اے اللہ! مگر یہ کہ اس قوت کا حاصل ہی ختم ہو جائے جس سے وہ اعمال ابھرنے والے ہیں، جیسا کہ ہم نے بوڑھے اور بیمار کے سلسلہ میں بیان کیا ہے۔ یا نفس پر اوپر سے کوئی ایسی حالت آدھمکے جو اس کے نظام کو تبدیل کر دے مذکورہ (شیخ اور مریض کی حالت کی) تبدیلی کی طرح، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: "بیشک نیک کام (نامۂ اعمال سے) برے کاموں کو مٹا دیتے ہیں" (ہود ۱۱۴) اور ارشاد فرمایا: "(اے عام مخاطب!) اگر تو شرک کرے گا تو تیرا کیا کرایا سب غارت ہو جائے گا" (الزمر ۶۵)

لغات: تشبث بکذا: چمٹنا، متعلق ہونا۔ استصحبہ: ساتھ لینا۔ تہجم علی الشیء: کسی چیز پر اچانک آپڑنا۔ ھیئۃ النفس أی صورتہا الحاصلۃ من أرواح الأعمال

ترکیب:

کلّ حالۃ متأخرۃ مبتدا ہے اور جملہ لہا مُعِدّۃ خبر ہے۔ لہا خبر مقدم ہے اور مُعِدّۃ مبتدا مؤخر ہے۔ المعدات کلّہا مبتدا ہے، سلسلۃ الخ پہلی خبر ہے، مترتبۃ پہلی صفت ہے خبر کی اور جملہ لایعقلہ دوسری صفت ہے۔ منتضحۃ (اسم فاعل) دوسری خبر ہے۔ مستصحب (اسم فاعل) کا فاعل ھو ضمیر مستتر ہے جو معدّ کی طرف راجع ہے۔ الموجودۃ صفت ہے ھیئۃ کی اور الیوم صفت کا ظرف ہے۔ حکم الخ مفعول ہے مستصحب کا۔ ترجمہ: اور ہر پچھلی حالت اس کے لئے ایک مُعِدّ (تیار کرنے والا) ہے اس کے ماقبل سے، اور تمام معدات ایک ترتیب وار سلسلہ ہیں، اس سلسلہ کا پچھلا متقدم نہیں ہوتا پہلے والے پر ساتھ لینے والا ہے وہ معدّ آج نفس میں پائی جانے والی صورت کا مثلاً شش ماہی پڑھنے کے حکم کا، یعنی چھ ماہ تربیت سیکھنے کے بعد آج جو استعداد نفس میں پائی جاتی ہے اس میں چھ ماہ تک مسلسل سیکھنے کا حکم موجود ہے۔ المتبعۃ صفت ہے الفوقی کی اور تلک الأعمال فاعل ہے المنتشئۃ کا۔

۴ — اعمال واخلاق کا ریکارڈ کیا جانا

واقعہ یہ ہے کہ انسان کے تمام اختیاری اعمال اور تمام ملکات راسخہ ریکارڈ کئے جاتے ہیں، فحسبانہ منضبط نہیں ہو جاتے۔ نصوص میں اس کی طرف اشارے آئے ہیں۔ مثلاً یہ ارشاد کہ: "انسان کوئی لفظ منہ سے نکالنے نہیں پاتا مگر اس کے پاس ایک تاک لگانے والا تیار ہے" (ق ۱۸) اور یہ ارشاد کہ "قیامت کے دن ہم ان کے مونہوں پر مہر لگادیں گے، اور ان کے ہاتھ ہم سے کلام کریں گے اور ان کے پاؤں شہادت دیں گے جو کچھ یہ لوگ کیا کرتے تھے" (یٰس ۶۵) اور سورۃ الزلزال کی تفسیر میں ترمذی شریف میں صحیح حدیث مروی ہے کہ قیامت کے دن بنی آدم نے جو برے بھلے کام زمین پر کئے ہیں، زمین سب کو ظاہر کردے گی، مثلاً کہے گی: فلاں نے مجھ پر نماز پڑھی تھی، فلاں نے چوری کی تھی، فلاں نے خون ناحق کیا تھا، وغیرہ ذلک۔ گویا آج کل کی زبان میں یوں کہیں کہ جس قدر اعمال زمین پر کئے جاتے ہیں، زمین میں ان سب کے ریکارڈ موجود رہتے ہیں، قیامت میں وہ پروردگار کے حکم سے کھول دئے جائیں گے (فوائد عثمانی)

اب رہی یہ بات کہ ریکارڈ کرنے کی صورت کیا ہوتی ہے؟ تو نصوص میں اس کی وضاحت نہیں آئی۔ اور انسان کے لئے یہ بات چنداں اہمیت کی حامل بھی نہیں، کائنات کے تمام اسرار و رموز انسان کو سمجھنا ضروری نہیں۔ انسان کے لئے تو بس اتنی بات کافی ہے کہ اس کو ہوشیار کردیا جائے کہ تیرا ہر عمل ریکارڈ ہو رہا ہے تاکہ وہ سنبھل کر زندگی گزارے، اور یہ بات بار بار مختلف پیرایوں میں قرآن و حدیث میں بیان کی گئی ہے۔

مگر شاہ صاحب رحمہ اللہ کی یہ کتاب چونکہ اسرار و رموز سمجھانے کے لئے ہے، اس لئے آپ اپنے ذوق و وجدان سے اس کی حقیقت بیان کرتے ہیں کہ عالم بالا میں وہاں کے نظام کے مطابق ہر انسان کا ایک مثنیٰ (Duplicat) ہے، عہد الست میں انسانوں سے جو عہد و پیمان لیا گیا ہے، وہ بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے یعنی وہ عہد و پیمان انسانوں کے مثنیٰ سے لیا گیا تھا۔ پھر جب انسان اپنے وقت میں دنیا میں وجود پذیر ہوتا ہے تو وہ عالم بالا والا انسان ہی ہوتا ہے یعنی اس کی صورت اس پر منطبق ہوتی ہے اور وہ دونوں ایک ہوتے ہیں۔

غرض انسان کا یہ مثنیٰ ٹیپ ریکارڈ ہے۔ دنیا میں جب بھی کوئی انسان کوئی اچھا یا برا عمل کرتا ہے تو فطری طور پر بے اختیار وہ مثنیٰ منشرح یا منقبض ہوتا ہے، گویا انسان کے اعمال کی اس بالائی صورت میں ریکارڈنگ ہو رہی ہے۔

یہی ریکارڈنگ میدان قیامت میں مختلف شکلوں میں ظاہر ہوگی، کبھی تو ایسا ظاہر ہوگا کہ سب کچھ عالم بالا میں محفوظ کرلیا گیا ہے چنانچہ نامۂ اعمال تقسیم کئے جائیں گے، لوگ ان کو پڑھیں گے اور کبھی ایسا محسوس ہوگا کہ اعمال انسان کے اعضاء کے ساتھ چپکے ہوئے ہیں، چنانچہ میدان قیامت میں انسان کے ہاتھ پیر بولیں گے اور عمل کی گواہی دیں گے۔

فائدہ: ہر شخص خود بخود جتلاتا رہتا ہے کہ دنیا اور آخرت میں اس کی جزاء کیا ہے؟ امتحان میں پرچہ لکھنے کے بعد طالب عالم خود فیصلہ کرلیتا ہے کہ وہ کامیاب ہوگا یا فیل؟ چنانچہ فرشتے نامۂ اعمال میں عمل کے ساتھ ساتھ اس کی جزاء بھی لکھتے جاتے ہیں، مگر بعض اعمال کی جزاء فرشتوں کی سمجھ میں نہیں آتی تو ان کو حکم دیا جاتا ہے کہ بس عمل لکھ لو، جزاء کا خانہ خالی چھوڑ دو، قیامت کے دن اللہ تعالیٰ بذات خود اس کا بدلہ ظاہر فرمائیں گے، حدیث قدسی میں ہے کہ: "بندے نے روزہ میرے لئے رکھا ہے اور میں ہی اس کا بدلہ دونگا" یعنی فرشتے ہر شخص کے روزے کے ثواب کو نہیں سمجھ پاتے وہ صرف روزہ ہی کو لکھ لیتے ہیں، قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ان کا ثواب بذات خود ظاہر فرمائیں گے اور اتنا ثواب دیں گے کہ بندہ خوش خوش ہو جائے گا، جیسا کہ حدیث میں ہے کہ: "روزہ دار کے لئے دو خوشیاں ہیں: ایک بوقت افطار دوسری اللہ سے ملاقات کے وقت (جب اس کو روزوں کا ثواب دیا جائے گا)" (فائدہ ختم ہوا)

اس کے بعد حضرت شاہ صاحب قدس سرہ نے اعمال کے ریکارڈ ہونے کی جو صورت بیان کی ہے اس کی تائید میں امام غزالی رحمہ اللہ کی ایک عبارت لائے ہیں۔ امام غزالیؒ نے ایک دوسرے مسئلہ میں اسی طرح کی بات کہی ہے جس طرح کی بات شاہ صاحب نے اعمال کے سلسلہ میں فرمائی ہے۔ وہ مسئلہ یہ ہے کہ جمیع ما کان وما یکون لوح محفوظ میں لکھا ہوا ہے۔ لوح کیا ہے؟ اور اس میں کس طرح لکھا ہوا ہے؟ امام غزالی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ لوح محفوظ اللہ تعالیٰ کی ایک مخلوق ہے اور جمیع ما کان وما یکون اس مخلوق کے دماغ میں محفوظ ہے۔ اس مخلوق کو قرآن میں کہیں لوح (تختی) کہیں کتاب مبین (واضح نوشتہ) اور کہیں امام مبین (واضح رجسٹر) کہا گیا ہے اور جو باتیں لوح محفوظ میں لکھی ہوئی ہیں وہ آنکھ سے نظر نہیں آسکتیں، کیونکہ وہ تختی لکڑی کی یا لوہے کی یا ہڈی کی بنی ہوئی نہیں ہے اور وہ کتاب کاغذ

بالکل نہیں ہے، اسی کو اس طرح سمجھئے کہ جس طرح اللہ کی ذات وصفات مخلوق کی ذات وصفات کے مشابہ نہیں، اسی طرح اللہ کی تختی مخلوق کی تختی کے مشابہ نہیں اور اللہ کی کتاب مخلوق کی کتاب کے مشابہ نہیں۔ پھر وہ کس طرح کی کتاب ہے؟ اور اس میں کس طرح لکھا ہوا ہے؟ — امام غزالی رحمہ اللہ اس کو ایک مثال سے سمجھاتے ہیں کہ جس طرح حافظ قرآن کے دل ودماغ میں قرآن کے کلمات وحروف محفوظ ہوتے ہیں، اسی طرح ساری باتیں لوحِ محفوظ کے حافظہ میں محفوظ ہیں۔ حافظ قرآن کے دماغ میں سارا قرآن لکھا ہوا ہوتا ہے، جب حافظ پڑھتا ہے تو اس کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گویا وہ قرآن میں دیکھ کر پڑھ رہا ہے، لیکن اگر آپ حافظ قرآن کے دماغ کے ایک ایک جزء کا جائزہ لیں تو آپ کو کہیں کوئی حرف لکھا ہوا نہیں ملے گا۔ اسی طرح لوحِ محفوظ کو سمجھنا چاہئے۔ اللہ تعالیٰ نے جو باتیں طے فرمائی ہیں، اور جن باتوں کے فیصلے ہو چکے ہیں وہ ساری باتیں لوحِ محفوظ میں ثبت ہوئی ہیں (امام غزالی کی بات پوری ہوئی)

اسی طرح انسان کا عمل بھی اس کی اس صورت میں جو عالم مثال میں پائی جاتی ہے ریکارڈ ہوتا رہتا ہے، مگر یہ ریکارڈنگ دنیوی ریکارڈنگ کی طرح نہیں، بلکہ اس صورت کی قوت خیالیہ میں سب باتیں محفوظ ہوتی رہتی ہیں۔

اعمال کے ریکارڈ ہونے کی ایک اور دلیل: آدمی زندگی بھر جو اعمال کرتا ہے، وہ اس کو یاد نہیں رہتے، پھر وہ یاد کرتا ہے اور اس کے اچھے برے بدلے کی توقع رکھتا ہے، یہ بھی اس بات کی دلیل ہے کہ انسان کا عمل ختم نہیں ہوا، بلکہ محفوظ ہے واللہ اعلم

وأما الإحصاء عليها: فسرُّه عندي ما وجدته بالذوق: أن في الحيِّز المثالي تظهر صورةٌ لكل إنسان بما يعطيه النظام الفوقاني ——— والتي ظهرت في قصة الميثاق شعبة منها ——— فإذا وُجد هذا الشخص انصبغت الصورة عليه، واتحدت معه؛ فإذا عمل عملاً انشرحت هذه الصورة بذلك العمل انشراحاً طبيعياً بلا اختيار منه، فربما تظهر في المعاد: أن أعماله مُحصاةٌ عليه من فوقها، ومنه: قراءة الصُّحف؛ وربما تظهر أن أعمالها فيها، ومنبثة بأعضائها، ومنه: نطق الأيدي والأرجل.

ثم كل صورة عمل مُفصِحةٌ عن ثمرته في الدنيا والآخرة؛ وربما تتوقف الملائكة في تصويره، فيقول الله تعالى: ﴿اكتبوا العمل كما هو﴾

قال الغزالي: كلُّ ما قدَّره الله تعالى من ابتداء خلق العالم إلى آخره مسطورٌ ومُثْبَتٌ في خلقٍ خلقه الله تعالى، يُعبر عنه تارة باللوح، وتارة بالكتاب المبين، وتارة بإمام مبين، كما ورد في القرآن؛ فجميع ما جرى في العالم وما سيجري مكتوب فيه، ومنقوش عليه نقشاً لا يُشاهد بهذه العين

ولا تظنن أن ذلك اللوح من خشب أو حديد أو عظم، وأن الكتاب من كاغذ أو ورق، بل ينبغي أن تفهم قطعا: أن لوح الله لا يشبه لوح الخلق، وكتاب الله تعالى لا يشبه كتاب الخلق، كما أن ذاته وصفاته لا تشبه ذات الخلق وصفاتهم.

بل إن كنت تطلب له مثالا يقربه إلى فهمك فاعلم أن ثبوت المقادير في اللوح المحفوظ يضاهي ثبوت كلمات القرآن وحروفه في دماغ حافظ القرآن وقلبه، فإنه مسطور فيه، حتى كأنه حيث يقرأ ينظر إليه، ولو فتشت دماغه جزءا جزءا، لم تشاهد من ذلك الخط حرفا؛ فمن هذا النمط ينبغي أن تفهم كون اللوح منقوشا بجميع ما قدره الله تعالى وقضاه (انتهى)

ثم كثيرا ما تتذكر النفس ما عملته من خير أو شر، وتتوقع جزاءه، فيكون ذلك وجها آخر من وجوه استقرار عمله. والله أعلم.

ترجمہ: اور رہا نفس کے خلاف ریکارڈ کرنا: تو اس کا راز اس طور پر جس کو میں نے ذوق سے پایا ہے یہ ہے کہ: عالم بالا میں ہر انسان کی ایک صورت ظاہر ہوتی ہے، نظامِ توالد کی ریت کے مطابق —— اور وہ صورت جو خارج کے واقعہ میں ظاہر ہوئی تھی وہ اسی کی ایک شاخ تھی — پھر جب یہ شخص پایا جاتا ہے تو وہ صورت اس پر منطبق ہو جاتی ہے اور اس کے ساتھ متحد ہو جاتی ہے۔ پھر جب یہ شخص کوئی (نیک) عمل کرتا ہے تو یہ (نورانی) صورت اس عمل کی وجہ سے منشرح ہوتی ہے، فطری طور پر منشرح ہوتا اس کے اختیار کے بغیر، پس بھی قیامت میں ظاہر ہوگا کہ اس صورت کے اعمال اس کے خلاف اس کے اوپر سے ریکارڈ کئے گئے ہیں اور نامہ اعمال کا پڑھنا اسی قبیل سے ہے، اور یہی ظاہر ہوگا کہ اس کے اعمال اس (نامہ اعمال) میں ہیں، اور اس کے اعضاء کے ساتھ چپٹے والے ہیں۔ اور ہاتھوں اور پیروں کا بولنا اسی قبیل سے ہے۔

پھر عمل کی ہر صورت واضح کرنے والی ہے دنیا و آخرت میں عمل کے ثمرہ کو، اور کبھی ملائکہ ٹھٹکتے ہیں عمل کی تصویر کشی میں (یعنی ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کتنا ثواب لکھیں) تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ: "عمل کو جیسا وہ ہے لکھ لو"

(ترغیب منذری ۲: ۴۴۳)

امام غزالی رحمہ اللہ نے فرمایا: وہ تمام باتیں جو اللہ تعالیٰ نے طے فرمادی ہیں، عالم کی پیدائش کے آغاز سے اس کے آخر تک، سب لکھی ہوئی اور ثابت کی ہوئی ہیں ایک ایسی مخلوق میں جس کو اللہ تعالیٰ نے (اسی غرض سے) پیدا کیا ہے، جس کو کبھی لوح سے، کبھی کتاب مبین سے، اور کبھی امام مبین سے تعبیر کیا جاتا ہے، جیسا کہ قرآن میں وارد ہوا ہے۔ پس تمام وہ باتیں جو عالم میں ہو چکی ہیں اور جو آئندہ ہوں گی اس مخلوق میں لکھی ہوئی ہیں، اور اس مخلوق پر نقش ہیں ایسے نقوش سے جو اس آنکھ سے نہیں دیکھے جا سکتے۔

اور آپ ہرگز گمان نہ کریں کہ وہ تحقیق عنصری کی یا طبعی کی یا طبیعی کی ہے اور یہ کہ کتاب کا غذ کی پنیوں کی ہے، بلکہ مناسب یہ ہے کہ آپ قطعی طور پر اس فرق کو سمجھیں کہ اللہ کی تحقیق مخلوق کی تحقیق کے مشابہ نہیں ہے۔ اور اللہ کی کتاب مخلوق کی کتاب کے مشابہ نہیں ہے، جیسا کہ اللہ کی ذات اور اس کی صفات مخلوق کی ذات اور ان کی صفات کے مشابہ نہیں ہیں۔

بلکہ اگر آپ لوح محفوظ کی کوئی ایسی مثال چاہتے ہیں جو اس کو آپ کے ذہن سے قریب کرے تو جان لیں کہ حافظ کے دماغ میں قرآن کا ثبوت لوح محفوظ میں مشابہ ہے کلمات قرآن اور اس کے حروف کے ثبوت کے۔ حافظ قرآن کے دماغ میں یقیناً قرآن لکھا ہوا ہے حافظ کے دماغ میں، یہاں تک کہ وہ یاد سے پڑھتا ہے درانحالیکہ وہ دیکھ رہا ہے اس لکھے ہوئے کو۔ اور اگر آپ اس کے دماغ کے ایک ایک جز کی تلاشی لیں تو آپ اس تحریر میں سے ایک حرف کو بھی نہیں دیکھیں گے۔ پس اسی انداز سے مناسب ہے کہ آپ سمجھیں لوح محفوظ میں ان تمام چیزوں کے لکھے ہوئے ہونے کو، جو اللہ تعالیٰ نے لکھی ہیں اور جن کا فیصلہ کیا ہے (ترجمہ ختم شد)

پھر ہر شخص یاد کرتا ہے ان بھلی بری باتوں کو جو اس نے کی ہیں، اور امید لگاتا ہے وہ اس کے بدلہ کی، پس ہوتی ہے وہ ایک دوسری وجہ اس کے عمل کے ثبوت کی وجوہ میں سے، واللہ اعلم۔

لغات:

ذوق کے لغوی معنی ہیں طبیعت کا اندازہ اور شاہ صاحب کی اصطلاح میں ایک مخصوص وہبی علم کا نام ذوق ہے التفہیمات جلد دوم صفحہ ۱۲۲ میں ہے الذوق: وهو منصب الحكيم وحدُّه: العلم الذى ينزل عليه من حيث ينزل عليه من وجوده مولانا سندھی رحمہ اللہ فرماتے ہیں اعلم أن اصطلاح المصنف أن رؤية الشيء بالنور الخاص من حظيرة القدس ومعرفته به يقال له: الذوق اهـ بمایعطیہ میں ما مصدریہ ہے مفصحۃ (اسم فاعل) أفصح عن الشيء ظاہر کرنا، بیان کرنا قوله: مفصحة اى مظهرة، قال العلامة. تكتب الحفظة الأعمال بصورتها حتى يظهر من رؤيتها أن هذا الرجل ناج أو هالك، مثلاً زنى رجل بامرأة، فيكتبون صورة الرجل والمرأة في حال زناهما، فيظهر منها أنهما معذبان، وهذه القاعدة كانت رائجة في الناس في الزمان الماضي، فمثلاً يصورون مجئ زيد في صورة زيد وباب، حتى يُعلم انه جاء، وكذلك كانوا يكتبون جميع حاجاته.

قوله: في تصويره: قال العلامة: كانت قاعدة الكتابة في الزمان الماضي بالتصوير، فربما لايمكن التصوير، مثلاً قال رجل: اللهم لك الحمد عدد قطار الأمطار، فيقال لهم: اكتبوا العمل كما هو اهـ.

قوله: من ورق: پہلے پتوں پر بھی تحریر لکھی جاتی تھیں۔

باب — ۱۲

اعمال کا ملکات سے جوڑ

ملکات جمع ہے مَلَکَۃ کی، جس کے معنی ہیں: وہ صفت جو نفس کے اندر راسخ ہو جائے، اور جب تک راسخ نہ ہو اسے "حال" کہتے ہیں۔ گذشتہ باب میں جو بیان کیا گیا تھا کہ انسان کے اختیاری اعمال نفس کی طرف لوٹتے ہیں اور اس کے ساتھ چمٹ جاتے ہیں۔ یہ اعمال نفس میں رفتہ رفتہ ایک حالت پیدا کرتے ہیں، جب تک وہ حالت عارضی رہتی ہے "حال" کہلاتی ہیں اور جب وہ راسخ ہو جاتی ہے تو اس کو "ملکہ" کہتے ہیں۔ اخلاق حسنہ اور سیئہ بھی اسی طرح پیدا ہوتے ہیں۔ شاہ صاحب قدس سرہ نے ان ملکات کو ھیئات نفسانیہ کہا ہے۔ ھیئت کے معنی ہیں حالت، کیفیت، اس کی جمع ھیئات ہے اور نفسانی کے معنی ہیں اندرونی، جلبی، پس ھیئات نفسانیہ کے معنی ہیں کیفیاتِ قلبیہ، مگر عارضی نہیں، بلکہ راسخ کیفیات مراد ہیں۔

ملکات اور اعمال کے درمیان چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ملکات اور اخلاق کے مطابق اعمال وجود میں آتے ہیں، ارشاد ہے: إنما الأعمال بالنيات، اور ملکات واخلاق اعمال کے ذریعہ پیدا ہوتے ہیں۔ مثلاً مسلسل مشق کر کے ایک شخص فنِ کتابت میں مہارت پیدا کرتا ہے، تو یہ ملکہ مسلسل لکھنے کا نتیجہ ہوتا ہے، اور اسی ملکہ سے خوشنویس عمدہ تحریر لکھتا ہے۔ غرض اعمال وملکات میں گہرا ربط ہے۔ اس باب میں اسی ارتباط کا بیان ہے، اگرچہ عرفِ عام میں دونوں کو ایک ہی چیز سمجھا جاتا ہے یعنی عام لوگ ملکات کو اعمال ہی سے تعبیر کرتے ہیں، جیسے روح اور بدن دو الگ الگ چیزیں ہیں اور ان میں ارتباط ہے، مگر عام لوگ دونوں میں فرق نہیں کرتے۔ وہ روح کو بھی بدن ہی سے تعبیر کرتے ہیں۔ اسی طرح عام لوگ ملکہ کا بھی ادراک نہیں کرتے، وہ اعمال ہی کو اصل بلکہ سب کچھ سمجھتے ہیں۔

اس باب میں شاہ صاحب رحمہ اللہ نے دو باتیں بیان کی ہیں:

(۱) اعمال ھیئات نفسانیہ کے پیکر ہائے محسوس اور ان کی تشریحات ہیں یعنی ملکات ایک مخفی چیز ہیں، ایک ماہر خوشنویس بھی عام انسان کی طرح ہوتا ہے، مگر جب وہ قلم پکڑتا ہے تو اس کی مہارت اور عبقریت ظاہر ہوتی ہے، اس کی تحریر ہی اس کی مہارت فن کی نظر آنے والی صورت ہوتی ہے، اور وہی اس کی مہارت کی ترجمانی اور تشریح کرتی ہے۔

(۲) اعمال ایک جال ہیں، ملکات واخلاق کو ان کے ذریعہ شکار کیا جاتا ہے، یعنی کوئی ملکہ اور مہارت پیدا کرنی ہو تو مسلسل عمل کر کے ہی پیدا کی جا سکتی ہے۔

اور یہ دونوں باتیں فطری اور صورت نوعیہ کی ذین ہیں، انسان میں انسان ہونے کی وجہ سے یہ دونوں باتیں پائی

جاتی ہیں، دیگر حیوانات میں یہ صورت حال نہیں پائی جاتی۔

اور اس کی دلیل یہ ہے کہ جب آدمی میں کسی کام کا داعیہ (تقاضا) پیدا ہوتا ہے اور نفس اس کی مطاوعت (فرماں برداری) کرتا ہے تو داعیہ کو انشراح ہوتا ہے۔ اور نفس مطاوعت نہیں کرتا تو داعیہ کو انقباض ہوتا ہے، یہ اس بات کا قرینہ ہے کہ عمل کے پیچھے کوئی کیفیت نفسانیہ ہے، جس کی مطاوعت اور عدم مطاوعت کا داعیہ پر اس کے واسطے سے اثر پڑتا ہے۔

پھر جب آدمی عمل کر چکتا ہے تو اس کا عمل جس قوت سے تعلق رکھتا ہے وہ قوت طاقت ور ہوجاتی ہے، اور مقابل قوت دب جاتی ہے اور کمزور ہوجاتی ہے، یہ اس بات کا قرینہ ہے کہ اچھے برے اعمال باطن پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ حدیث میں اس طرف اشارہ ہے، فرمایا: ''نفس گناہ کی آرزو اور خواہش کرتا ہے، اور شرمگاہ اس کی تصدیق یا تکذیب کرتی ہے'' یعنی داعیہ کا پیکر محسوس شرمگاہ کا عمل ہے۔ اگر یہ عمل پایا جائے تو داعیہ واقعی ہے، ورنہ محض وسوسہ ہے۔ لیکن اگر پیکر محسوس کسی مجبوری کی وجہ سے نہ پایا جائے تو وہ کالعدم یعنی انکار کا مصداق نہیں ہے۔ یعنی داعیہ واقعی ہے اور اس پر مؤاخذہ ہوگا۔ متفق علیہ روایت ہے کہ ''جب دو مسلمان تلواریں لے کر بھڑتے ہیں تو قاتل اور مقتول دونوں جہنم میں جاتے ہیں'' راوی نے دریافت کیا: قاتل کا جہنم میں جانا تو سمجھ میں آیا، مقتول جہنم میں کیوں گیا؟ آپ نے ارشاد فرمایا کہ: ''وہ اپنے ساتھی کے قتل کا حریص تھا'' یعنی وہ قتل کا عزم مصمم لے کر نکلا تھا، مگر اتفاق سے وہ مار نہ سکا، مارا گیا، پس وہ بھی جہنم رسید ہوگا (مشکوٰۃ کتاب القصاص، باب قتل اہل الردۃ حدیث نمبر ۳۵۳۸)

غرض ہر خلق اور ہر ملکہ کے لئے کچھ اعمال اور ظاہری صورتیں ہیں، جن کے ذریعہ اس ملکہ اور اس صفت کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے اور اس ملکہ اور صفت کو ان کے ذریعہ تعبیر کیا جاتا ہے اور وہ پیکر ہائے محسوس اس ملکہ اور صفت کو سمجھاتے ہیں۔ مثلاً آپ کہیں کہ فلاں آدمی بہادر یا سخی ہے اور کوئی دلیل پوچھے تو آپ اس کے بہادرانہ کارناموں کو اور داد و دہش کو بیان کریں گے، اسی طرح کوئی شخص بہادری اور سخاوت کو سمجھنا چاہے تو وہ بھی اعمال اور پیکر ہائے محسوس کا سہارا لے گا، جیسے ایک شخص نے کسی مولوی صاحب سے پوچھا کہ پرہیزگاری کیا ہے؟ مولوی صاحب نے جواب دیا: فرض کرو تم جوان رعنا ہو اور کوئی عورت بھی جوان مہ جبیں ہو، تم دونوں کو ایک رات ایک مکان میں تنہائی میسر آئے، مگر تمہارے دل میں برائی کا کوئی خیال تک پیدا نہ ہو تو یہ پرہیزگاری ہے۔ دیکھئے مولوی صاحب نے پرہیزگاری کو جو ایک ملکہ ہے اس کے پیکر محسوس کے ذریعہ سمجھایا ہے۔

لطیفہ: پھر مولوی صاحب نے اس شخص سے پوچھا کہ سمجھے تقویٰ کیا ہے؟ اس نے کہا: جی ہاں! سمجھ گیا، تقویٰ ہیجڑا ہونے کا دوسرا نام ہے!

سوال: کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ ایک شخص بہادر یا سخی ہو اور زندگی بھر کوئی بہادرانہ کارنامہ انجام نہ دے، نہ ایک پیسہ

خرچ کرے؟

جواب: ایسا ہو سکتا ہے، جب کوئی اللہ کا پیارا کی ہوئی فطرت کو بدل ڈالے البتہ عام حالات میں ایسا نہیں ہوتا۔

اسی طرح اگر کوئی شخص اپنے اندر کوئی ایسا ملکہ یا صفت پیدا کرنا چاہے، جو اس میں نہیں، مثلاً بہادری نہیں ہے، اور وہ بہادر بننا چاہتا ہے، یا سخاوت کی صفت نہیں ہے، اور وہ سخی بننا چاہتا ہے تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ بہادری اور سخاوت کے مواقع کا متلاشی رہے، اور جب بھی موقع ملے بے تکلف بہادری والے کام کرے اور زیادہ سے زیادہ سخاوت کرے تو رفتہ رفتہ بہادر اور سخی بن جائے گا۔ یہی مطلب ہے اعمال کے ذریعہ سے ملکات کو شکار کرنے کا۔ اسی طرح اس لائن کے جو اکابر گذرے ہیں ان کے واقعات کو پڑھنے، سننے سے بھی اس صفت کو پیدا کرنے میں مدد ملتی ہے۔

اس کے بعد جاننا چاہئے کہ: اگرچہ اعمال وملکات دو الگ الگ چیزیں ہیں، اور اصل ملکات ہیں، اعمال صرف مظاہر ہیں، مگر شریعت میں بحث اعمال سے اور ان کی ظاہری شکلوں سے کی جاتی ہے اور انہی کے احکام مقرر کئے جاتے ہیں۔ ان کے پیچھے جو ملکات ہیں ان سے شریعت کچھ زیادہ بحث نہیں کرتی، ان کے متعلق چند صولی باتیں بتادی گئی ہیں اور ان کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، مثلاً:

(۱) إنما الأعمال بالنيات الخ میں ملکات کی طرف اشارہ ہے اور یہ بات بیان کی گئی ہے کہ ثواب کی کمی زیادتی اور اعمال کی قبولیت وعدم قبولیت کا انہی پر مدار ہے۔

(۲) سورۃ حج آیت ۳۷ میں ہے ﴿لَن يَنَالَ اللهَ لُحُومُهَا وَلَا دِمَاؤُهَا، وَلٰكِن يَنَالُهُ التَّقْوَىٰ مِنكُمْ﴾ یعنی تمہاری قربانیوں کا گوشت اور خون اللہ تعالیٰ کو نہیں پہنچتا بلکہ ان کو تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے یعنی تم نے کیسی خوش دلی اور جوشِ محبت سے ایک قیمتی اور نفیس چیز، اس کی اجازت سے، اس کے نام پر، اس کے گھر کے پاس لے جا کر قربان کی ہے، گویا اس قربانی کے ذریعہ سے تم نے ظاہر کردیا ہے کہ ہم خود بھی اللہ کی راہ میں اسی طرح قربان ہونے کے لئے تیار ہیں، یہی وہ تقویٰ (دل کا ادب) ہے جس کی بدولت خدا کا عاشق اپنے محبوب حقیقی سے خوشنودی حاصل کرتا ہے۔ اس آیت میں جس کیفیت کو تقویٰ کہا گیا ہے اسی کو شاہ صاحب رحمہ اللہ نے ہیئت نفسانی اور ملکہ سے تعبیر کیا ہے۔

(۳) مسلم شریف کی روایت ہے: ان اللہ لا ینظر إلی صُوَرِکم، ولا أموالکم، ولکن ینظر إلی قلوبکم وأعمالکم یعنی اللہ تعالیٰ تمہاری صورتوں کو اور تمہارے مالوں کو نہیں دیکھتے، بلکہ وہ تمہارے دلوں کو اور تمہارے اعمال کو دیکھتے ہیں (مشکوۃ کتاب الرقاق، باب الریاء، حدیث نمبر ۵۳۱۴) اس حدیث میں اعمال کے ساتھ ملکات کی طرف بھی اشارہ ہے۔

اور شریعت میں عام طور پر اعمال سے بحث اس لئے کی جاتی ہے کہ اعمال ہی منضبط کئے جاسکتے ہیں، انہی کے لئے قواعد وضوابط مقرر کئے جاسکتے ہیں، انہی کے اوقات وحدود متعین کئے جاسکتے ہیں، وہی نظر آتے ہیں اور دیکھے جاسکتے ہیں، نقل بھی انہی کو کیا جاسکتا ہے، وہی قابل حکایت ہیں، اور انسان کی قدرت واختیار کے ماتحت بھی وہی آتے ہیں اور انہی کے

اطاعت کرتا ہے تو داعیہ خوش ہوتا ہے اور منشرح ہوتا ہے اور اگر مخالفت کرتا ہے تو داعیہ منقبض ہوتا ہے اور سکڑتا ہے پھر جب آدمی عمل کر چکتا ہے تو ملکیت یا بہیمیت میں سے اس عمل کا سرچشمہ زیادہ تیز اور قوی ہو جاتا ہے اور اس کا مد مقابل منحرف اور کمزور ہو جاتا ہے اور حدیث میں اس کی طرف اشارہ ہے کہ ”نفس تمنا کرتا ہے اور خواہش کرتا ہے اور شرمگاہ اس کی تصدیق کرتی ہے اور اس کی تکذیب کرتی ہے“ (مشکوٰۃ کتاب الایمان، باب الایمان بالقدر، حدیث نمبر ۸۶)

اور آپ ہرگز کوئی خلق نہیں دیکھیں گے مگر اس کے لئے اعمال اور شکلیں ہوں گی، جن کے ذریعہ اس خلق کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے اور جن کے ذریعہ اس خلق کو تعبیر کیا جاتا ہے، اور جن کی صورتیں اس خلق کے لئے آئینہ شفاف بن کر پائی جاتی ہیں، پس اگر کوئی شخص کسی دوسرے انسان کو بہادری کے ساتھ متصف کرے، اور اس سے اس کی وضاحت پوشیدہ رہ جائے، پس وہ بیان کرنے، تو نہیں بیان کرے گا وہ مگر اس کے تحت معرکوں کو۔ اور اگر کوئی شخص کسی کو سخاوت کے ساتھ متصف کرے تو نہیں بیان کرے گا وہ مگر ان درہموں اور دیناروں کو جن کو وہ خرچ کرتا ہے! اور اگر کوئی انسان چاہے کہ حاضر کرے بہادری اور سخاوت کی صفت کو (یعنی اس کو سمجھنا چاہے) تو مجبور ہوگا وہ ان اعمال کی شکلوں کی طرف ـــــ اے خدا مگر یہ کہ اس نے اس فطرت کو بدل دیا ہو جس پر اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو پیدا کیا ہے ـــــ اور اگر کوئی شخص چاہے کہ کسی ایسے خلق کو اپنے اندر پیدا کرے جو اس میں نہیں ہے تو اس کی کوئی راہ نہیں مگر یہ کہ اس خلق کے مواقع میں، اور ان اعمال کو بہ تکلف کرنا جو اس خلق سے تعلق رکھنے والے ہیں۔ اور اس خلق والوں میں سے قوی لوگوں کے واقعات کو یاد کرنا۔

پھر دل کی وہ چیزیں ہیں جو ضبط کی ہوئی ہیں، جو اوقات کی تعیین کے ساتھ بار بار دہرائی گئی ہیں اور نظر آتی ہیں اور دیکھی ہیں اور حکایت کی جاتی ہیں اور نقل کی جاتی ہیں اور قدرت و ارادہ کے تحت آتی ہیں، اور ان کے ذریعہ اور ان پر پابندی ہو سکتی ہے۔

لغات و ترکیب:

مظہر: ظاہر ہونے کی جگہ ۔ شرح: وضاحت ... قَصَّ واقتصّ الخبر: ذکر کرنا قوله: شركات لانتهاضها أى شبكة لاصطياد الهيئات يعني يكون في بعض الناس ملكة الأعمال راسخةً في القلب، فيعمل الأعمال الموافقة له، فتكون الأعمال حينئذ مظاهر الملكات وشروحًا لها، وأما إذا لم تكن ملكةُ أعمالٍ مخصوصة في رجل، فهو يعمل أعمالاً مخصوصة مرارًا كثيرة حتى تثبت ملكة تلك الأعمال في نفسه، فحينئذ تكون الأعمال شبكة لاصطياد الملكة (سندی) ۔ بسبب طبعی کا تعلق مظاہر وشرکات ہونے کے ساتھ ہے تجشم العمل: بہ تکلف کرنا ... قوله: في العرف الطبيعي أى في العرف الذى تقتضيه طبيعة الإنسان قوله: أن يؤاخذ بها أى على فعلها إذا كانت شرًا، وعليها أى على تركها إذا كانت حسنة مأمورة بها (سندی)

کسی کے ملکات زیادہ ریکارڈ کئے جاتے ہیں اور کسی کے اعمال

انسان کے اعمال و ملکات (کیفیاتِ قلبیہ) دونوں ریکارڈ کئے جاتے ہیں، مگر اعتبار میں لوگوں کے احوال مختلف ہیں: جو قوی استعداد کے لوگ ہیں۔ جیسے انبیائے کرام، ان میں اعمال سے زیادہ ملکات پائے جاتے ہیں اور کمزور استعداد کے لوگ ظاہری اعمال ہی کو سب کچھ سمجھتے ہیں، تفصیل درج ذیل ہے:

① قوی استعداد والوں میں اعمال سے ملکات زیادہ پائے جاتے ہیں، ان کا اصل کمال اخلاق و ملکات ہوتے ہیں مگر وہ اعمال بھی کرتے ہیں، کیونکہ اعمال، ملکات کے سانچے اور شکلیں ہیں اور اخلاق سانچوں میں ڈھلتے ہیں اور ظاہری شکلوں سے پیدا ہوتے ہیں، اس لئے یہ حضرات ظاہری اعمال سے بھی صرف نظر نہیں کرتے۔ ان حضرات کے اصل ملکات ریکارڈ کئے جاتے ہیں اور اعمال بھی ریکارڈ کئے جاتے ہیں مگر ان کا اعتبار ضعیف ہوتا ہے، کیونکہ مقصود ملکات ہیں، اعمال تو مظاہر ہیں، مگر ضروری وہ بھی ہیں، جیسے خواب کی ظاہری شکل مقصود نہیں ہوتی اس کا ایک مطلب ہوتا ہے اور وہی مقصود ہوتا ہے، مگر وہ مطلب ظاہری شکل ہی سے سمجھا جاتا ہے، اس طرح وہ ظاہری شکل بھی مطلوب ہو جاتی ہے۔ مثلاً ایک شخص نے خواب دیکھا کہ وہ لوگوں کی مونہوں اور شرمگاہوں پر مہر لگا رہا ہے، اس نے تعبیر کے امام حضرت محمد بن سیرین رحمہ اللہ (۳۳-۱۱۰ھ) سے تعبیر معلوم کی۔ آپ نے فرمایا: تم مؤذن ہو اور (رمضان میں) وقت سے پہلے فجر کی اذان دیتے ہو (جسے سن کر لوگ سحری موقوف کر دیتے ہیں) اس خواب کی جو ظاہری شکل ہے وہ مراد نہیں، مراد وہ تعبیر ہے جو محمد بن سیرین رحمہ اللہ نے دی، مگر وہ تعبیر مستفاد خواب کی ظاہری شکل ہی سے ہے۔

اور ملکات کے اقوی اور اعمال کے اضعف ہونے کی مثال یہ ہے کہ امتی، نبی سے اعمال کی مقدار میں تو بڑھ سکتا ہے، مگر امتی کی زندگی بھر کی نمازیں نبی کے دوگانہ کے ہم پلہ نہیں ہو سکتیں، کیونکہ امتی کا ملکہ نبی کے ملکہ کے ہم پلہ نہیں ہو سکتا، اور عمل میں وزن نیت و کیفیت قلبی (ملکہ) سے پیدا ہوتا ہے۔

② اور ضعیف استعداد کے لوگ ظاہری اعمال ہی کو عین کمال سمجھتے ہیں، کیونکہ ان کے اعمال کے پیچھے جو ملکات ہیں وہ اتنے کمزور ہوتے ہیں کہ عام لوگ ان کا ادراک بھی نہیں کر سکتے۔ ایک عام مسلمان سے پوچھو تو اسے معلوم ہی نہیں ہوتا کہ اس کے عمل کے پیچھے کوئی ملکہ بھی ہے، وہ بس عمل کرتا ہے اور اسی کو سب کچھ سمجھتا ہے، ایسے لوگوں کے اعمال اصالۃً ریکارڈ کئے جاتے ہیں اور ملکات کا اعتبار بس برائے نام ہوتا ہے۔

اور دنیا میں اسی قسم کے لوگوں کی تعداد زیادہ ہے، اس لئے ان لوگوں کی خاطر اعمال کی تعیین و تحدید ضروری ہے، تاکہ وہ صحیح طور پر اعمال کو انجام دے سکیں، چنانچہ شرائع الٰہیہ میں ہمیشہ اصل زور اعمال پر دیا گیا ہے اور انہی کی اہمیت نمایاں کی گئی ہے اور انہی کی مکمل تفصیلات مرتب کی گئی ہیں۔

ثم النفوس ليست سواءً في إحصاء الأعمال والملكات عليها:

فمنها: نفوس قوية تتمثل عندها الملكات أكثر من الأعمال، فلا يعدُّ من كمالها بالإصالة إلا الأخلاق؛ ولكن تتمثل الأعمال لها، لأنها قوالبها وصورها، فتحصى عليها الأعمال إحصاءً أضعف من إحصاء الأخلاق، بمنزلة ما يتمثل في الرؤيا من أشباح المعنى المراد، كالختم على الأفواه والفروج.

ومنها: نفوس ضعيفة، تحتجب أعمالها عن كمالها، لعدم استقلال الهيئات النفسانية، ولا تتمثل إلا مضمحلةً في الأعمال، فتحصى عليها أنفس الأعمال؛ وهم أكثر الناس، وهم المحتاجون جدًا إلى التوقيت البالغ؛ ولهذه المعاني عظُم الاعتناء بالأعمال في النواميس الإلهية.

ترجمہ: پھر نفوس یکساں نہیں ان کے اعمال وملکات ریکارڈ کئے جاتے ہیں:

پس ان میں سے بعض: قوی نفوس ہیں۔ ان میں ملکات، اعمال سے زیادہ پائے جاتے ہیں، پس ان کے کمالات میں سے اصالۃً نہیں شمار کئے جاتے مگر اخلاق۔ لیکن ان اخلاق کے لئے اعمال بھی پائے جاتے ہیں، کیونکہ اعمال اخلاق کے سانچے اور شکلیں ہیں، پس ان کے اعمال ریکارڈ کئے جاتے ہیں ایسا ریکارڈ کیا جانا جو اخلاق کی ریکارڈنگ سے کمزور تر ہوتا ہے، جیسے وہ بات جو خواب میں پائی جاتی ہے اس معنی مرادی کی شکلوں میں سے، جیسے مونہوں اور شرمگاہوں پر مہر لگانا۔ (قولہ: اکثر ای تمثلا اکثر)

اور ان میں سے بعض: کمزور نفوس ہیں، وہ اپنے اعمال ہی کو اپنا کمال سمجھتے ہیں۔ ہیئات نفسانیہ (ملکات) کے مستقل بالذات نہ ہونے کی وجہ سے، نہیں پائی جاتیں وہ ہیئات مگر اعمال میں مضمحل ہوکر، پس ان کے اعمال ہی ریکارڈ کئے جاتے ہیں۔ اور زیادہ تر یہی لوگ ہیں اور یہ لوگ بہت زیادہ محتاج ہیں مفصل توقیت کے، اور اسی وجہ سے شرائع آسمانیہ میں اعمال کے ساتھ بہت زیادہ اعتناء کیا گیا ہے۔

بہت سے اعمال بذات خود مقصود ہوتے ہیں

ملکات کی اہمیت کے باوجود بہت سے اعمال بذات خود مقصود ومؤثر ہوتے ہیں۔ مثلاً نماز کی ظاہری شکل مقصود ہے، اگر کوئی کہے کہ "اللہ کی یاد" مطلوب ہے نماز کی ظاہری شکل مطلوب نہیں، تو وہ شخص گمراہ بلکہ کافر ہے۔ اسی طرح زنا، چوری کی ظاہری شکلوں سے بچنا ضروری ہے، اچھی نیت سے گناہ جائز نہیں ہوجاتا، پس اگر کوئی کہے کہ "تقوی" مقصود ہے، اگر کوئی شخص اللہ سے ڈرتا ہے اور کسی اچھی نیت سے زنا یا چوری کرتا ہے تو کوئی حرج نہیں، ایسا شخص مردود وملعون ہے۔

اور اعمال ہی مطلوب ومقصود اس وجہ سے ہوجاتے ہیں کہ وہ ملاء اعلی میں پہنچ کر وہاں ثابت ہوجاتے ہیں اور ملکات

ثم إن كثيرًا من الأعمال تستقر في الملأ الأعلى، ويتوجّه إليها استحسانهم أو استهجانهم بالأصالة مع قطع النظر عن الهيئات النفسانية التي تصدر عنها، فيكون أداء الصالح منها بمنزلة قبول إلهام من الملأ الأعلى، في التقرّب منهم، والتشبه بهم، واكتساب أنوارهم، ويكون اقتراف السيئة منها خلاف ذلك.

وهذا الاستقرار يكون بوجوه:

منها: أنهم يتلقّون من بارئهم أن نظام البشر لايصلح إلا بأداء أعمال، والكف عن أعمال، فتتمثل تلك الأعمال عندهم، ثم تنزل في الشرائع من هنالك.

ومنها: أن نفوس البشر التي مارست ولازمت الأعمال، إذا انتقلت إلى الملأ الأعلى، وتوجّه إليها استحسانهم واستهجانهم، ومضى على ذلك القرون والدهور، استقرت صور الأعمال عندهم.

وبالجملة: فتؤثر الأعمال حينئذ تأثير العزائم والرُّقى المأثورة عن السلف بهيئتها وصفتها، والله أعلم.

ترجمہ: پھر بہت سے اعمال ملأ اعلیٰ میں ٹھہر جاتے ہیں اور ان کی طرف ملأ اعلیٰ کی پسندیدگی یا ناپسندیدگی بالذات متوجہ ہوتی ہے، ان ہیئات نفسانیہ سے قطع نظر کرتے ہوئے جن سے وہ اعمال صادر ہوتے ہیں۔ پس ان میں سے نیک کاموں کا کرنا ملأ اعلیٰ کے الہام کو قبول کرنے جیسا ہو جاتا ہے۔ ملأ اعلیٰ سے نزدیک ہونے میں، اور ان کے ساتھ مشابہت پیدا کرنے میں اور ان کے انوار حاصل کرنے میں۔ اور ان میں سے برے اعمال کا ارتکاب کرنا اس کے برخلاف ہوتا ہے۔

اور یہ ٹھہرنا چند وجوہ سے ہے:

ان میں سے ایک: یہ ہے کہ ملأ اعلیٰ اپنے پیدا کرنے والے کی طرف سے (یہ بات) حاصل کرتے ہیں کہ انسانوں کا نظام سنور نہیں سکتا مگر کچھ کاموں کے کرنے سے اور کچھ اعمال سے باز رہنے سے، پس وہ اعمال ملأ اعلیٰ کے پاس موجود ہو جاتے ہیں، پھر وہاں سے شرائع میں نازل ہوتے ہیں۔

اور ان میں سے ایک: یہ ہے کہ انسان کے وہ نفوس جو اعمال کی ہمیشگی کرتے رہے ہیں اور ان کے ساتھ چپکے رہے ہیں، جب وہ نفوس ملأ اعلیٰ کی طرف منتقل ہوتے ہیں اور ان نفوس کی طرف ملأ اعلیٰ کی پسندیدگی یا ناپسندیدگی متوجہ ہوتی ہے اور اس پر زمانے اور صدیاں گزر جاتی ہیں تو ان اعمال کی صورتیں ملأ اعلیٰ کے پاس ٹھہر جاتی ہیں۔

اور خلاصہ یہ ہے کہ اس وقت اعمال اثر کرنے لگتے ہیں ان منتروں اور افسونوں کے اثر کرنے کی طرح، جو سلف سے منقول ہیں، ان کی شکلوں اور صفتوں کے ساتھ۔ واللہ اعلم

مطلب اس کی جزا کا ملاحظہ کرنا ہے۔ علامہ سندھی رحمہ اللہ فرماتے ہیں قولہ: وأحاطت بہ خطیئتہ الآیۃ، أی جزاؤھا فی الدنیا من ندامۃ وحسرۃ وألم وتمثل وقعات إیلام وإہانۃ وتہدید فی المنام أو الیقظۃ اھ

مگر آیت کی صحیح تفسیر وہ ہے جو جمہور نے کی ہے کہ قصور کے احاطہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ گناہ اس پر ایسا غلبہ کرلے کہ کوئی جانب ایسی نہ ہو کہ گناہ کا قبضہ نہ ہو حتی کہ دل میں ایمان وتصدیق باقی ہوں تو بھی احاطہ مذکور متحقق نہ ہوگا۔ تو آپ کافری پر یہ صورت صادق آسکتی ہے (فوائد شیخ الہند)

غرض اس آیت میں تو صحیح تفسیر کے مطابق اس اصل کی طرف اشارہ نہیں مگر سورۃ الزمر آیت ۵۶ میں یہ اصل صراحۃً مذکور ہے ارشاد ہے: ﴿أَنْ تَقُولَ نَفْسٌ يَا حَسْرَتَا عَلَى مَا فَرَّطْتُ فِي جَنْبِ اللهِ وَإِنْ كُنْتُ لَمِنَ السَّاخِرِينَ﴾ (کہیں کوئی شخص کہنے لگے کہ افسوس میری اس کوتاہی پر جو میں نے خدا کی جناب میں روا رکھی، اور میں تو (احکام خداوندی پر) ہنستا ہی رہا) یہ حسرت بوقت مرگ بھی ہوسکتی ہے اور اس سے پہلے بھی ہوسکتی ہے اور اس کے بعد قبر اور میدان قیامت میں بھی ہوسکتی ہے۔ یہ احساس برے عمل کا بدلہ ہے۔

دوسری اصل: حظیرۃ القدس کی توجہ یعنی فیصلہ خداوندی بھی سبب مجازات ہے ——— اس کی تفصیل یہ ہے کہ ملاء اعلیٰ کو انسانوں کی کچھ کیفیات نفسانیہ، کچھ اعمال واخلاق پسند ہیں اور کچھ ناپسند ہیں، ملاء اعلیٰ اپنے رب سے اصرار کے ساتھ درخواست کرتے ہیں کہ اچھے لوگوں کو راحتیں پہنچائی جائیں اور برے لوگوں کو سزا دی جائے۔ ان کی یہ دعائیں بارگاہ خداوندی میں مقبول ہوتی ہیں۔ اسی طرح ملاء اعلیٰ کی توجہات بھی انسانوں کو گھیر لیتی ہیں۔ ان دونوں باتوں کے نتیجہ میں لوگوں پر خوشنودی اور لعنت کی شکلیں بنتی ہیں، جس طرح دیگر علوم بنتے ہیں اور مجازات کی درج ذیل صورتیں متحقق ہوتی ہیں:

(۱) تکلیف دہ یا راحت رساں واقعات رونما ہوتے ہیں اور فرشتے اس حال میں نظر آتے ہیں جیسے دھتکار رہے ہوں یا خوش کرنے والی باتیں کررہے ہوں۔ قریب المرگ کے پاس اور قبر میں منکر نکیر اسی طرح ظاہر ہوتے ہیں۔

(۲) نفس کبھی ملاء اعلیٰ کی ناراضگی سے متاثر ہوتا ہے تو بے ہوشی یا اس جیسی کیفیت طاری ہوجاتی ہے۔ قبل نبوت جب بنائے کعبہ کے موقعہ پر آپ ﷺ نے پتھر اٹھانے کے لئے کپڑا کھول کر کندھے پر رکھنے کا ارادہ کیا تھا تو فوراً بیہوشی طاری ہوگئی تھی۔ اسی طرح سیرت کی کتابوں میں یہ واقعہ ہے کہ نبوت سے پہلے آپ ﷺ قریش کی کسی شادی وغیرہ کی تقریب میں بھی تشریف لے گئے تو وہاں پہنچتے ہی نیند طاری ہوگئی اور آنکھ اس وقت کھلی جب کھیل ختم ہوچکا تھا (دیکھئے البدایۃ والنہایۃ ۲: ۲۸۷)

(۳) کبھی ملاء اعلیٰ کی نہایت قوی توجہ کمزور باتوں مثلاً خیالات وغیرہ پر پڑتی ہے تو وہ ملاء سافل یا انسانوں کے لئے الہام بن جاتی ہے کہ وہ اس اچھے یا برے عمل کرنے والے کے ساتھ اچھا یا برا سلوک کریں۔ یہ مضمون پہلے بار بار گذر چکا ہے، ثم یوضع لہ القبول فی الأرض اور ثم یوضع لہ البغضاء فی الأرض والی روایت باب ذکر الملأ الأعلیٰ

کے شروع میں گزر چکی ہے وہ روایت اس کی دلیل ہے۔

(۴) کبھی آدمی کے متعلقات میں سے کوئی چیز سنور جاتی ہے یا بگڑ جاتی ہے اور راحتوں اور تکلیفوں کی شکلیں پیدا ہوتی ہیں مثلاً کوئی مرجاتا ہے یا کوئی بھاری مالی نقصان ہوجاتا ہے یا بیمار شفایاب ہوجاتا ہے یا معمولی مال میں خوب برکت ہوتی ہے، جس سے رنج وراحت پہنچتی ہے۔ یہ بھی مجازات کی صورتیں ہیں۔ پہلے باب (۸) میں مسلم شریف کی روایت گزری ہے کہ لوگوں کو جو بلائیں پہنچتی ہیں اور خیرات وبرکات پہنچتی ہیں وہ لوگوں کے اعمال کا ثمرہ ہیں یعنی جزاء وسزا کی شکلیں ہیں۔

اور یہ سب باتیں ملائکہ کی دعاؤں کا نتیجہ رکھ کر کہی گئی ہیں، بالکل بے لاگ بات یہ ہے کہ تخلیق ارض وسماء کے وقت ہی اللہ تعالیٰ کی عنایت نے یہ بات طے کردی تھی کہ انسان کو شتر بے مہار نہیں چھوڑا جائے گا، اس کا اعمال پر مؤاخذہ کیا جائے گا۔ یہ فیصلہ خداوندی مجازات کا اصل سبب ہے مگر چونکہ اس بات کا سمجھنا دشوار تھا اس لئے شاہ صاحب رحمہ اللہ نے فرشتوں کی دعاؤں کو عنوان بنایا ہے۔ اور اسی پیرایۂ بیان میں مجازات کو سمجھایا ہے واللہ اعلم

اور اس اصل دوم کی طرف قرآن کریم میں اشارہ آیا ہے۔ سورۃ البقرۃ آیت (۱۶۱، ۱۶۲) میں ہے: "بیشک جن لوگوں نے انکار کیا (یعنی اسلام نہیں لائے) اور وہ اسی حالت کفر پر مرگئے تو ایسے لوگوں پر اللہ تعالیٰ کی اور فرشتوں کی اور تمام لوگوں کی لعنت ہے، وہ ہمیشہ اسی میں رہیں گے نہ اُن سے عذاب ہلکا کیا جائے گا اور نہ ان کو مہلت دی جائے گی" اللہ کی یہ لعنت مجازات کی اصل ہے۔

﴿باب: أسباب المجازاة﴾

اعلم: أن أسباب المجازاة، وإن كثرت، ترجع إلى أصلين:

أحدهما: أن تحس النفس، من حيث قوتها الملكية، بعمل أو خلق اكتسبه: أنه غير ملائم لها، فتنشئ فيها ندامة وحسرة وألم؛ ربما أوجب ذلك تمثل واقعات في المنام أو اليقظة، تشتمل على إيلام وإهانة وتهديد.

ورب نفس استعدت لإلهام المخالفة، فخوطبت على ألسنة الملائكة: بأن تتراءى له كسائر ما تستعده من العلوم

وإلى هذا الأصل وقعت الإشارة في قوله تعالى: ﴿بَلَىٰ مَن كَسَبَ سَيِّئَةً وَأَحَاطَتْ بِهِ خَطِيئَتُهُ فَأُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ﴾

والثاني: توجه حظيرة القدس إلى بني آدم؛ فعند الملأ الأعلى هيئات وأعمال وأخلاق، مرضية ومسخوطة، فتطلب من ربها طلبًا قويًا تنعيم أهل هذه، وتعذيب أهل تلك، فيستجاب دعاؤهم، وتحيط بني آدم همتهم، وتترشح عليهم صورة الرضا واللعنة، كما تترشح سائر

العلوم: فتترشح واقعات إيلامية أو تنعيمية، وتتراءى للملأ الأعلى منفذة لهم، أو مسلطة إليهم
وربما تأثرت النفس من سخطها، فعرض لها كهيئة الغشي، أو كهيئة المرض.
وربما ترشح ما عندهم من الهمة المتأكدة على الحوادث المتضعفة، كالخواطر ونحوها، فألهمت الملائكة أو بنو آدم أن يحسنوا أو يسيئوا إليه.
وربما أحيل أمر من ملابساته إلى صلاح أو فساد، وظهرت تقريبات لتنعيمه أو تعذيبه.
بل الحق الصراح: أن لله تبارك وتعالى عناية بالناس، يوم خلق السماوات والأرض، توجب أن لايهمل أفراد الإنسان سدى، وأن يؤاخذهم على مايفعلونه، لكن لدقة مدركها جعلنا دعوة الملائكة عنوانا لها، والله أعلم.
والى هذا الأصل وقعت الإشارة في قوله تعالى: ﴿إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَمَاتُوا وَهُمْ كُفَّارٌ أُولَئِكَ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللهِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ، خَالِدِينَ فِيهَا، لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ، وَلَا هُمْ يُنْظَرُونَ﴾

ترجمہ: مجازات کے اسباب کے بیان میں: جان لیں کہ مجازات کے اسباب اگرچہ بہت ہیں (مگر) وہ لوٹتے ہیں دو اصلوں کی طرف:

ان میں سے ایک: یہ ہے کہ نفس قوت ملکیہ کی وجہ سے احساس کرے کسی ایسے عمل یا اخلاق کے بارے میں جس کو اس نے اپنے اختیار سے کیا ہے کہ وہ (عمل یا خلق) نفس کے لئے نامناسب ہے، چنانچہ نفس میں ندامت، حسرت اور تکلیف پیدا ہو۔ وہ کوئی واجب کرے خواب میں یا بیداری میں ایسے واقعات کے پائے جانے کو جو تکلیف دینے، توہین کرنے اور دھمکانے پر مشتمل ہوں۔

اور بعض نفوس میں مخالفت کے الہام کی استعداد پیدا ہوتی ہے تو وہ نفوس متشکل کئے جاتے ہیں ملائکہ کی زبانی اس طور پر کہ دیکھتے ہیں فرشتے ان کو جیسے دوسرے علوم جن کی نفس میں استعداد پیدا ہوتی ہے۔

اور اسی اصل کی طرف اشارہ آیا ہے اللہ تعالیٰ کے ارشاد میں: "ہاں، جس نے اختیار سے کوئی برائی کی اور اس کو اس کی برائی نے گھیر لیا، تو وہ لوگ دوزخ والے ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے"۔

اور دوسری اصل: انسانوں کی طرف حظیرۃ القدس کی توجہ ہے ——— پس ملائکہ کے نزدیک پسندیدہ اور ناپسندیدہ ہیئات نفسانیہ اور اعمال واخلاق ہیں، پس وہ درخواست کرتے ہیں اپنے رب سے قوی درخواست کرنا ان لوگوں کو راحت پہنچانے کی اور ان لوگوں کو تکلیف پہنچانے کی، پس ان کی دعا قبول کرلی جاتی ہے اور انسانوں کو ملأ اعلیٰ کی گہری توجہات گھیر لیتی ہیں اور لوگوں پر خوشنودی اور پھٹکار کی صورت ٹپکتی ہے، جس طرح دیگر علوم ٹپکتے ہیں: پس پائے جاتے ہیں تکلیف دہ اور راحت رساں واقعات اور نظر آتے ہیں فرشتے اس حال میں کہ وہ ان کو دھمکانے والے ہیں یا

ان کے ساتھ خندہ پیشانی سے بات چیت کرنے والے ہیں۔

اور کبھی نفس ملاء اعلیٰ کی ناراضگی سے متاثر ہوتا ہے، پس نفس کو بے ہودگی جیسی حالت یا بیماری جیسی علامت پیش آتی ہے۔

اور کبھی وہ گہری توجہ جو ملاء اعلیٰ کے پاس سے مترشح ہوتی ہے، کمزور باتوں پر، جیسے خیالات وغیرہ پر، تو ملائکہ یا انسان الہام کئے جاتے ہیں کہ وہ اس شخص سے اچھا معاملہ کریں یا برا معاملہ کریں۔

اور کبھی آدمی کے متعلقات میں سے کوئی چیز صلاح کی طرف یا فساد کی طرف بدل دی جاتی ہے۔ اور راحت رسانی یا تکلیف دہی کی تقریبات ظاہر ہوتی ہیں۔

بلکہ خالص حق بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی لوگوں پر مہربانی ہے، جس نے اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا آسمانوں کو اور زمین کو، جو واجب کرتی ہے اس بات کو کہ نہ مہمل (بے مقصد) چھوڑیں وہ انسانوں کو، اور اس بات کو کہ پکڑ کریں ان کی ان کاموں پر جو وہ کریں۔ لیکن اس بات کو سمجھنے کی باریکی کی وجہ سے ہم نے ملائکہ کی دعاؤں کو مجازات کے لئے عنوان بنایا ہے۔ واللہ اعلم

اور اسی اصل کی طرف اشارہ آیا ہے اللہ تعالیٰ کے ارشاد میں کہ "بیشک جن لوگوں نے انکار کیا اور مرے وہ بحالت انکار، تو ان پر اللہ کی اور فرشتوں کی اور سب لوگوں کی پھٹکار ہے، ہمیشہ رہیں گے وہ اس لعنت میں، نہیں ہلکا کیا جائے گا ان سے عذاب، اور نہ وہ مہلت دیئے جائیں گے"۔

لغات:

أحَسَّ يُحِسُّ إحساسًا: احساس کرنا۔ تَشَبَّحَ تَشَبُّحًا: پایا جانا۔ تمثل میں یک تا محذوف ہے۔ مخالفت یعنی عمل یا خلق کا ملکیت کے موافق نہ ہونا۔ عُوطِفَ مجہول ہے عاطف: ہمدردی کرنا۔۔۔ حظیرۃ القدس سے ذات پاک مراد ہے۔۔۔ هَذَّبَهُ: دھوکا دور کرنا۔۔۔ انْتَسَفَ: کھلنا، بے تکلف ہونا۔ تَرَشَّحَ میں ایک تا محذوف ہے۔۔۔ المأکلۃ (اسم مفعول) پختہ کی ہوئی۔ الحوادث الضعیفة: کمزور واقعات یعنی وہ باتیں جن میں تبدیلی ہو سکتی ہے۔۔۔ أحَالَ إحالةً: تبدیل کرنا۔۔۔ ملابس جمع ہے مَلْبَس اور مَلْبَس کی جس کے معنی ہیں لباس، یہاں مراد متعلقہ چیزیں ہیں۔۔۔ تقریب: لغوی معنی نزدیک کرنا، عرفی معنی کوئی موقع کا لانا۔ مَتْرُوك (مصدر میمی) بمعنی ادراک ہے۔

تشریح:

قوله: من حيث الملكية اى بوسيلة القوة الملكية (سندى) قوله: ملابساته اى متعلقاته من المال والأولاد وغيرها فتنقلب او تتقلب بصلاحهم او فسادهم بخلاف الجزء الأول، لأنه كان راجعا إلى نفسه بدون واسطة، ويمكن أن يقال فى تفسير أحيل الخ اى قدر أمر من الأمور المتعلقة به إلى صلاح بأن عمل صالحًا، كما عهدت آثار الملابسة بإبراهيم ملامح الطيبة، أو إلى فساد بأن عمل سيئا، كما يكون عند رجل دراهم أو دنانير فصارت رمادا؛ وهذا التفسير يُفهم من الباب الآتي (سندى)

مجازات کی کونسی اصل کہاں کام کرتی ہے؟

مجازات کی اوپر جو دو اصلیں بیان کی گئی ہیں یعنی نفس کا احساس اور فیصلہ خداوندی، یہ دونوں اصلیں الگ الگ بھی کام کرتی ہیں اور دونوں جمع بھی ہوتی ہیں یعنی کسی جگہ مجازات دونوں بنیادوں کی وجہ سے ہو، ایسا ہو سکتا ہے۔ پھر ترکیب کی بھی مختلف صورتیں ہو سکتی ہیں، اس طرح کہ کونسی اصل زیادہ مؤثر ہے، پس اجتماع کی بہت سی صورتیں پیدا ہوں گی۔

علاوہ ازیں مجازات کے معاملہ میں نفس کی استعداد کے بھی مختلف درجات ہیں اسی طرح اعمال کی نوعیت بھی اچھے برے ہونے میں مختلف ہوتی ہے، پس جب دونوں اصلوں کے اجتماع کے مختلف درجات کو استعداد و عمل کے مختلف درجات میں ضرب دیں گے تو بے شمار عجیب عجیب صورتیں پیدا ہوں گی، جن کے تفصیلی احکام کہ کہاں کونسی اصل کام کرے گی، بہت مشکل امر ہے، البتہ بالاجمال قاعدہ سمجھ لیں:

اصل اول ان اعمال و اخلاق میں کام کرتی ہے جن کا اثر خود عمل کرنے والے تک محصور رہتا ہے، دوسروں تک متعدی نہیں ہوتا، جیسے کسی نے نماز نہیں پڑھی تو اس کا نقصان اسی کو پہنچے گا، دوسروں تک کوئی ادنیٰ ضرر نہیں پہنچے گا۔

اور جو لوگ نیک صالح اور قوی النفس ہوتے ہیں وہ اس اصل کا اثر جلد قبول کرتے ہیں، ان سے اگر برائی سرزد ہو جاتی ہے تو وہ فوراً بے چین ہو جاتے ہیں۔ سورۂ آل عمران آیت ۱۳۵ میں اس کا تذکرہ ہے کہ ”متقین وہ لوگ ہیں کہ جب کوئی ایسا کام کر گذرتے ہیں جو بے حیائی کا ہو یا اپنی ذات پر زیادتی کرتے ہیں تو (فوراً) اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے ہیں، پھر اپنے گناہوں کی معافی چاہتے ہیں، اور اللہ کے سوا کون ہے جو گناہوں کو بخشے! اور وہ لوگ اپنے کئے پر اڑتے نہیں درانحالیکہ وہ جانتے ہوں“ ﴿وَالَّذِينَ إِذَا فَعَلُوا فَاحِشَةً﴾ الآية.

اور اصل دوم ان اعمال و اخلاق میں زیادہ مؤثر ہے جو مفاد عامہ کے خلاف ہیں، یعنی خود عمل کرنے والے تک ان کا ضرر منحصر نہیں رہتا، بلکہ دوسروں تک اس کا ضرر متعدی ہوتا ہے اور انسانوں کے نظام کی مصالح سے جن چیزوں کا تعلق ہے وہ کام اس کے برخلاف ہے، جیسے زنا، چوری، سود خوری، ظلم و ستم، اتہام طرازی اور سابقہ کتب میں جو نبی آخر الزماں کی صفات تھیں ان کو چھپانا وغیرہ۔

جو لوگ دینی اعتبار سے کمزور اور بدکردار ہوتے ہیں وہ اس اصل کا اثر جلدی قبول کرتے ہیں۔ وہ جلدی مورد عتاب بنتے ہیں اور غضب خداوندی ان پر جلد نازل ہوتا ہے۔ سود خور کا خبطی ہونا سورۃ البقرہ آیت ۲۷۵ میں مذکور ہے اور آنحضور ﷺ کی صفات کو چھپانے والوں کا ملعون ہونا سورۃ البقرہ آیت ۱۵۹ میں مذکور ہے اور پاک دامن عورتوں پر اتہام طرازی کرنے والوں کا دنیا و آخرت میں ملعون ہونا سورۃ النور آیت ۲۳ میں مذکور ہے۔

ويتركب الأصلان، فيحدث من تركيبهما، بحسب استعداد النفس والعمل، صور كثيرة عجيبة.

لكن الأول أقوى في أعمال وأخلاق تُصلِح النفس أو تفسدها، وأكثر النفوس له قبولا أزكاها وأقواها؛ والثاني أقوى في أعمال وأخلاق مناقضة للمصالح الكلية منافرة لما يرجع إلى صلاح نظام بني آدم؛ وأكثر النفوس له قبولا أضعفها وأسمجها.

ترجمہ: اور دونوں اصلیں مرکب ہوتی ہیں تو ان کے مرکب ہونے سے اور عمل اور نفس کی استعداد کے موافق بہت سی عجیب عجیب صورتیں پیدا ہوتی ہیں۔ لیکن اصل اول ان اعمال واخلاق میں زیادہ مؤثر ہے جو نفس کو سنوارتے یا بگاڑتے ہیں اور لوگوں میں اس اصل کو زیادہ قبول کرنے والے زیادہ ستھرے اور زیادہ مضبوط نفوس ہیں۔

اور دوسری اصل ان اعمال واخلاق میں زیادہ مؤثر ہے جو مصالح کلیہ (مفاد عامہ) سے متضاد ہیں۔ اور جو ان باتوں کے برخلاف ہیں جن کا تعلق انسانوں کے نظام کی صلاح سے ہے۔ اور لوگوں میں اس اصل کو زیادہ قبول کرنے والے کمزورترین اور بدترین نفوس ہیں۔

لغات:

مناقضة (اسم فاعل) ناقض مناقضة: مخالف ہونا ۔ منافرة (اسم فاعل) نافرہ: حاصمہ: جھگڑا کرنا یہاں معنی مخالفة ہے ۔ أزكى (اسم تفضیل) زیادہ نیک، صالح زکا یزکو زکاءٌ: نیک وصالح ہونا ۔ اسمج (اسم تفضیل) زیادہ قبیح سَمُجَ (ک) سماجة: قبیح ہونا۔ قوله: الثاني أقوى يعني: الغضب الناشي ذلك أقوى في أعمال والأخلاق مخالفة لمصلحة عامة الناس، ووفقا لما يرجع إلى نظام عامة الناس، كما إذا كان الرجل تفرّق بين المسلمين، أو يغصب حق عامة الناس، ونحو ذلك اھ (سندی)

اسبابِ مجازات کے لئے موانع

مجازات کے دونوں سببوں کے لئے کچھ موانع ہیں، جو ایک خاص وقت تک ان اسباب کے احکام کو روک دیتے ہیں۔ مثلاً ایک عورت نے زنا کیا اور وہ زنا سے حاملہ ہے تو وضع حمل تک حد جاری نہیں ہوگی۔ دو موانع کی تفصیل درج ذیل ہے:

پہلے سبب کے لئے مانع: ملکیت کا کمزور ہونا اور بہیمیت کا زور آور ہونا ہے ـــــ جب یہی صورت حال ہوتی ہے تو نفس سراپا بہیمیت بن جاتا ہے اس میں ملکیت کا کوئی حصہ باقی نہیں رہتا اور بہیمیت کو جن چیزوں سے تکلیف پہنچتی ہے ان کا نفس کو کوئی احساس نہیں ہوتا ـــــ ایسا شخص جب اپنی چادر یعنی بدن سے جدا ہو جاتا ہے یعنی مر جاتا ہے اور موت کے بعد بہیمیت کی کدک کم ہو جاتی ہے، نیز غیرہ سے اس کو مدد پہنچنی بند ہو جاتی ہے اور ملکیت کی تجلیاں اس پر چمکتی ہیں تو اعمال واخلاق کی ملائمت اور منافرت کا احساس ہونے لگتا ہے اور آہستہ آہستہ تنعیم وعذاب شروع ہوتا ہے۔

اور دوسرے سبب کے لئے مانع: مخالف اسباب کا قوی تر جمع ہوتا ہے ـــــ یعنی بہت سے دوسرے اسباب جیب

پہلی قسم

قواعد کلیہ کے بیان میں

مبحث دوم

دنیا میں اور موت کے بعد جزا و سزا کی کیفیت کا بیان

مبحث دوم

دنیا میں اور موت کے بعد جزاء و سزا کی کیفیت کا بیان

باب (۱) دنیا میں جزائے اعمال کا بیان

باب (۲) موت کی حقیقت کا بیان

باب (۳) برزخی مجازات میں لوگوں کے مختلف احوال کا بیان

باب (۴) قیامت اور اس کے بعد کے واقعات کے کچھ اسرار و رموز کا بیان

مبحث دوم

دنیا میں اور موت کے بعد جزاؤسزا کی کیفیت کا بیان

باب ——— ۱

دنیا میں جزائے اعمال کا بیان

(نقلی دلائل)

مبحث اول میں تکلیف شرعی اور جزائے اعمال کی بحث تفصیل سے گزر چکی ہے۔ اب اس دوسرے مبحث میں دنیوی زندگی میں اور مرنے کے بعد جزاؤسزا کی کیفیت کا بیان ہے کہ یہ مجازات کس طرح ہوتی ہے؟ یعنی اس کی کیا صورتیں ہوتی ہیں؟

مجازات: دنیوی زندگی میں، اور مرنے کے بعد قبر میں، میدان حشر میں، آخرت کے راستہ میں پل صراط پر، اور بالآخر آخرت میں جنت وجہنم کی صورت میں ہوتی ہے۔ اور یہ جزاؤسزا تدریجاً ہوتی ہے یعنی دنیا میں بس برائے نام، بطور نمونہ از خروارے، قبر میں اس سے سخت اور آگے اور سخت ہوتی جاتی ہے اور دنیا میں تمام اعمال کی جزاؤسزا نہیں دی جاتی، بعض ہی اعمال کا بدلہ دیا جاتا ہے، مگر اس سلسلہ میں کوئی ضابطہ نہیں بتلایا گیا کہ کن اعمال پر دنیا میں مجازات ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر والدین کے ساتھ حسن سلوک کا بدلہ دنیا میں ضرور ملتا ہے، اسی طرح زنا پھیلنے کی، ماں باپ کی نافرمانی کی، ناپ تول میں کمی کرنے کی اور سود کھانے کی سزا بھی دنیا میں ضرور ملتی ہے۔

اور دنیا میں اعمال صالحہ کی جو جزائے خیر ملتی ہے، وہ اللہ کی رحمت ہوتی ہے، عمل کا بدلہ نہیں ہوتا اور ضروری نہیں کہ وہ رحمت سب کو پہنچے، اللہ تعالیٰ جس کو چاہتے ہیں یہ رحمت پہنچاتے ہیں۔ سورۂ یوسف آیت (۵۶، ۵۷) میں ہے کہ: "ہم جس پر چاہتے ہیں اپنی عنایت مبذول کرتے ہیں اور ہم نیکی کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتے، اور آخرت کا اجر کہیں بڑھ کر ہے، ایمان اور تقوی والوں کے لئے" ﴿نُصِيبُ بِرَحْمَتِنَا مَنْ نَّشَآءُ﴾ الآیتین۔

اور مؤمن کو جو دنیا میں عمل سیئہ کی سزا ملتی ہے، وہ گناہوں کا کفارہ بن جاتی ہے، اور آگے معاملہ صاف ہو جاتا

ہے بلکہ جن لوگوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو خیر منظور ہوتی ہے ان کو دنیا میں طرح طرح کی تکلیفوں میں مبتلا کر کے گناہوں سے پاک صاف کر کے اٹھایا جاتا ہے۔ حدیثوں میں یہ مضمون آیا ہے۔

اور کافر کو جو دنیا میں مجازات ہوتی ہے تو اس میں ابتلاء (امتحان) کا پہلو بھی ہوتا ہے۔ سورۃ الاعراف آیات (۹۴ و ۹۵) میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ: "ہم نے کسی بستی میں کوئی نبی نہیں بھیجا مگر وہاں کے باشندوں کو ہم نے محتاجی اور بیماری میں پکڑا تاکہ وہ ڈھیلے پڑ جائیں، پھر ہم نے اس بدحالی کی جگہ خوش حالی بدل دی، یہاں تک کہ ان کو خوب ترقی ہوئی اور وہ کہنے لگے کہ ہمارے اسلاف کو بھی تنگی اور راحت پیش آئی تھی! تو ہم نے ان کو دفعتاً پکڑ لیا اور ان کو خبر تک نہ تھی"

شاہ صاحب قدس سرہ سب سے پہلے وہ دلائل نقلیہ لکھتے ہیں جن سے دنیا میں مجازات ثابت ہوتی ہے، پھر اپنی بات کہیں گے۔ ارشاد فرماتے ہیں:

(۱) اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: "اور تم کو جو کچھ مصیبت پہنچتی ہے وہ تمہارے ہاتھوں کی کمائی کی وجہ سے ہے اور اللہ تعالیٰ بہت سے گناہوں سے درگزر فرمادیتے ہیں" (سورۃ الشوریٰ آیت ۳۰) اس آیت میں دنیوی مجازات کا بیان ہے۔

(۲) اور ارشاد فرمایا: "اور اگر یہ لوگ (اہل کتاب) تورات کی اور انجیل کی اور اس کتاب کی جو ان کے پاس ان کے رب کی طرف سے بھیجی گئی ہے (یعنی قرآن کی) پوری پابندی کرتے تو وہ اپنے اوپر سے اور اپنے پیروں کے نیچے سے (یعنی ہر طرف سے) خوب فراغت سے کھاتے" (سورۃ المائدہ آیت ۶۶) اس میں بھی دنیوی برکات کا ذکر ہے۔

(۳) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ یمن کے شہر صنعاء کے قریب ایک باغ تھا، اس کا اصل مالک پیداوار سے اللہ کا حق دیا کرتا تھا، لیکن اس کے مرنے کے بعد اس کے وارثوں نے بخل کی وجہ سے اللہ کا حق دینا بند کر دیا، تو اس باغ پر کوئی آسمانی آفت نازل ہوئی اور وہ باغ بالکل تباہ و برباد ہو گیا۔ سورۃ القلم آیات (۱۷-۳۲) میں یہ واقعہ اس طرح مذکور ہے:

"اور اللہ تعالیٰ نے ایک باغ والوں کی آزمائش کی، جبکہ انہوں نے قسم کھائی کہ وہ ضرور اس کا پھل صبح چل کر توڑ لیں گے، اور انہوں نے ان شاء اللہ بھی نہ کہا، سو اس باغ پر تیرے رب کی طرف سے ایک پھرنے والا عذاب پھر گیا اور وہ سو رہے تھے پھر صبح کو وہ باغ ایسا رہ گیا جیسے کٹا ہوا کھیت۔ پس صبح کے وقت وہ ایک دوسرے کو پکارنے لگے کہ اپنے کھیت پر سویرے چلو اگر تم کو پھل توڑنا ہے۔ پھر وہ لوگ آپس میں چپکے چپکے باتیں کرتے چلے کہ آج تم تک کوئی محتاج نہ آنے پائے اور اپنے کو محتاج کے نہ دینے پر قادر سمجھ کر چلے۔ پھر جب اس باغ کو دیکھا تو کہنے لگے کہ بیشک ہم راستہ بھول گئے، بلکہ ہماری قسمت پھوٹ گئی۔ ان میں جو اچھا آدمی تھا، کہنے لگا: کیوں میں نے تم سے کہا نہ تھا! اب تسبیح کیوں نہیں کرتے !! سب کہنے لگے کہ ہمارا رب پاک ہے، بیشک ہم قصوروار ہیں۔ پھر ایک دوسرے کو مخاطب بنا کر باہم الزام دینے لگے، بیشک ہم حد سے نکلنے والے تھے! شاید ہمارا پروردگار ہم کو اس سے اچھا باغ اس کے بدلے میں دیدے۔ ہم اپنے رب کی

طرف رجوع کرتے ہیں۔ اسی طرح (دنیا کا) عذاب ہوا کرتا ہے اور آخرت کا عذاب اس سے بھی سخت ہے۔ کاش وہ لوگ جانتے!"

(۳) ترمذی شریف (۲:۱۴۳) میں یہ حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد باری تعالیٰ: وَإِنْ تُبْدُوا الخ (اور اگر ظاہر کرو تم ان باتوں کو جو تمہارے دلوں میں ہیں یا پوشیدہ رکھو، اللہ تعالیٰ تم سے ان کے بارے میں حساب لیں گے) اور ارشاد باری تعالیٰ: من یعمل الخ (جو شخص کوئی برا کام کرے گا، وہ اس کے بدلے میں سزا دیا جائے گا) کی تفسیر میں ارشاد فرمایا:

"یہ (مکافات اور جزاء) اللہ تعالیٰ کا بندے پر عتاب ہے بخار اور رنج سے جو اس کو پہنچتے ہیں۔ یہاں تک کہ پونجی جس کو وہ کرتے کے جیب میں رکھتا ہے، پس وہ گم ہو جاتی ہے تو وہ اس کی وجہ سے غمگین ہوتا ہے (تو ان سے اس کے گناہ معاف ہوتے ہیں) یہاں تک کہ بندہ گناہوں سے نکل جاتا ہے، جس طرح سرخ سونا بھٹی سے (صاف ہو کر) نکلتا ہے" (مشکوۃ کتاب الجنائز، باب عیادۃ المریض حدیث نمبر ۱۵۵۵)

مذکورہ آیات و احادیث اس باب میں صریح ہیں کہ مجازات اس دنیا میں بھی ہوتی ہے۔

المبحث الثاني

مبحث كيفية المجازاة في الحياة وبعد الممات

باب الجزاء على الأعمال في الدنيا

قال الله تعالى: ﴿وَمَا أَصَابَكُمْ مِنْ مُصِيبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ أَيْدِيكُمْ وَيَعْفُو عَنْ كَثِيرٍ﴾ وقال: ﴿وَلَوْ أَنَّهُمْ أَقَامُوا التَّوْرَاةَ وَالْإِنْجِيلَ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْهِمْ مِنْ رَبِّهِمْ لَأَكَلُوا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ أَرْجُلِهِمْ﴾ وقال الله تعالى في قصة أصحاب الجنة، حين منعوا الصدقة ما قال. وقال رسول الله صلى الله عليه وسلم في قوله تعالى: ﴿وَإِنْ تُبْدُوا مَا فِي أَنْفُسِكُمْ أَوْ تُخْفُوهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللَّهُ﴾ وقوله تعالى: ﴿مَنْ يَعْمَلْ سُوءًا يُجْزَ بِهِ﴾ "هذه معاتبة الله العبد بما يصيبه من الحمى والنكبة، حتى البضاعة يضعها في يد قميصه، فيفقدها، فيفزع لها، حتى إن العبد ليخرج من ذنوبه، كما يخرج التبر الأحمر من الكير"

ترجمہ: مبحث دوم: دنیا میں اور مرنے کے بعد مجازات کی کیفیت کی بحث۔ دنیا میں اعمال پر جزاء کا بیان: اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: "اور جو مصیبت تم کو پہنچتی ہے وہ تمہارے اپنے کرتوتوں کی وجہ سے ہے، اور اللہ تعالیٰ بہت سی باتوں سے درگذر فرماتے ہیں" اور ارشاد فرمایا: "اور اگر وہ (اہل کتاب) تورات و انجیل اور اس قرآن پر ٹھیک ٹھیک عمل کرتے

جو ان کی طرف نازل کیا گیا ہے تو ضرور کھاتے وہ اپنے اوپر سے اور اپنے پیروں کے نیچے سے" اور اللہ تعالیٰ نے بستی
والوں کے واقعہ میں ارشاد فرمایا: جب انھوں نے خیرات روک دی، تو وہ جو ارشاد فرمایا۔

اور رسول اللہ ﷺ نے ارشاد باری ﴿وَإِنْ تُبْدُوْا﴾ الخ (بقرہ ۲۸۴) اور ارشاد باری ﴿مَنْ يَعْمَلْ سُوْءًا يُجْزَ بِهِ﴾ الخ (النساء ۱۲۳) کی تفسیر میں ارشاد فرمایا کہ "یہ اللہ تعالیٰ کا سرزنش فرمانا ہے بندے کو اس چیز کے ذریعہ جو اس کو پہنچتی ہے بخار اور مصیبت میں سے، یہاں تک کہ پونجی، جسے رکھتا ہے بندہ اپنی قمیص کے ہاتھ میں (پہلے جیب آستین میں ہوتی تھی) پس اس پونجی کو گم کرتا ہے، پس اس کی وجہ سے گھبرا جاتا ہے (تو اس سے بھی گناہ معاف ہوتے ہیں) یہاں تک کہ بندہ گناہوں سے نکل جاتا ہے جیسا سرخ سونا بھٹی سے (صاف ہو کر) نکلتا ہے۔

نوٹ: کتاب میں مُعَاتَبَة تھا، اصل مطبوعہ صدیقی، ترمذی شریف اور مشکوٰۃ شریف سے تصحیح کی گئی ہے۔ مخطوطہ کراچی میں بھی اسی طرح ہے۔

☆ ☆ ☆

دنیا میں جزائے اعمال کا بیان

(عقلی دلیل)

دنیا میں جزائے اعمال کی عقلی وجہ سمجھنے کے لئے پہلے تین باتیں سمجھ لیں:

پہلی بات: انسان میں اللہ تعالیٰ نے ملکیت اور بہیمیت کی دونوں قوتیں یکساں پیدا کی ہیں ﴿فَأَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا﴾ (پھر اللہ تعالیٰ نے نفس کو اس کی بدکرداری اور پرہیزگاری الہام کی) مگر خارجی اثرات کی وجہ سے ایک دوسری پر غالب آتی ہے۔ جب تک آدمی زندہ رہتا ہے عام طور پر ملکیت، بہیمیت کے اثرات میں دبی رہتی ہے، کیونکہ بہیمیت کو کھانے وغیرہ سے مدد پہنچتی رہتی ہے، مگر ملکیت کا بھی موقعہ آتا ہے، ایک دن وہ بھی ظاہر ہوتی ہے۔ ایسا دو صورتوں میں ہوتا ہے۔

(۱) جب آدمی طبعی موت مرجاتا ہے تو بہیمیت کو غذا وغیرہ سے جو مدد پہنچتی رہتی ہے وہ بند ہوجاتی ہے، اور پہلے سے موجود مادہ تحلیل ہوتا رہتا ہے اور اس کو بدل ما یتحلل میسر نہیں آتا۔ نیز اب بھوک، شہوت، غیرت اور غصہ وغیرہ بھی نفس کو اکساتے بھی نہیں، تو اس وقت ملکیت پر عالم بالا سے ایک رنگ مترشح ہوتا ہے۔ اور جب ملکیت کو مدد پہنچنی شروع ہوجاتی ہے تو وہ قوی ہوجاتی ہے۔

(۲) جب آدمی ریاضتوں کے ذریعہ اور عالم بالا کی طرف مسلسل توجہ رکھنے کے ذریعہ نفس کشی کرلیتا ہے، جیسا کہ صوفیا فرماتے ہیں: مُوْتُوْا قَبْلَ أَنْ تَمُوْتُوْا (موت سے پہلے نفس کشی کرلو) جب آدمی یہ مرتبہ حاصل کرلیتا ہے تو نفس

پر ملکوت سے بجلیاں کوندنی شروع ہوتی ہیں، جس کی وجہ سے ملکیت قوی ہوجاتی ہے۔

دوسری بات: ملکیت اور بہیمیت میں سے ہر قوت کو ان اعمال وکیفیات سے انشراح وانبساط حاصل ہوتا ہے جو اس کے مناسب حال ہیں، اور ہر قوت منقبض ہوتی ہے اور سکڑتی ہے ان اعمال وکیفیات کی وجہ سے جو اس کے مناسب حال نہیں ہوتے۔ چنانچہ اچھے آدمی کو نیکیوں سے خوشی اور برائیوں سے شدید گھٹن ہوتی ہے اور برے آدمی کا حال اس کے برعکس ہوتا ہے۔

تیسری بات: ہر تکلیف اور ہر لذت کا ایک پیکر محسوس ہے، جیسے جسم میں کہیں تکلیف دہ خلط جمع ہوجاتی ہے تو چبھن ہونے لگتی ہے، جسم میں صفراء کی گرمی بڑھ جاتی ہے تو دل میں بے چینی اور تنگی پیدا ہوتی ہے۔ اور خواب میں آگ اور شعلے نظر آتے ہیں اور بلغم کی زیادتی ہوجاتی ہے تو سردی لگتی ہے اور خواب میں پانی اور برف نظر آتا ہے۔ اسی طرح ہر تکلیف کا اور ہر لذت کا ایک پیکر محسوس ہے۔

اب مثال کی وجہ سمجھئے: جب ملکیت کو ابھارنے کا موقعہ ملتا ہے تو بیداری میں یا خواب میں انسیت اور سرور کی شکلیں پیدا ہوتی ہیں۔ اگر اس نے نظافت، طہارت، خشوع اور اخبات کی صفتیں پیدا کی ہیں تو یہ صفات نور وبہجت کی صورتوں میں نمودار ہوتی ہیں اور یہی ان اعمال صالحہ کی جزاء ہے۔ اور اگر مذکورہ صفات کی اضداد اپنے اندر پیدا کی ہیں تو وہ غیر معتدل کیفیات کی صورتوں میں نمودار ہوتی ہیں۔ علاوہ ازیں خواب یا بیداری میں ایسے واقعات رونما ہوتے ہیں جو توہین آمیز اور ذلت آمیز شکل ہوتے ہیں۔ غصہ کاٹنے والے درندے کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے، اور بخل ڈسنے والے سانپ کی شکل اختیار کرلیتا ہے۔

اعلم:

[۱] أن للملكية بروزا بعد كمونها في البهيمية، وانفكاكًا بعد اشتباكها بها.

فتارة بالموت الطبيعي، فإنه حينئذ لا يأتي مددُها من الغذاء، وتتحلّل موادُّها لا إلى بدل، ولا تُهيِّج النفسَ أحوالٌ طارئة: كجوع وشبع وغضب، فيرشح لونُ عالم القدس عليها.

وتارة بالموت الاختياري: فلا يزال يكسر بهيميته برياضة، واستدامة توجه إلى عالم القدس، فيبرُق عليه بعض بوارق الملكية.

[۲] وأن لكل شيئ انشراحا وانبساطا بما يلائمه من الأعمال والهيئات، وانقباضا وتقلصا بما يخالفه منها.

[۳] وأن لكل ألم ولذة شبحا يتشبّح به: فشبح الخلط اللذّاع النخس، وشبح التأذي من حرارة الصفراء الكرْب والضجر، وأن يرى في منامه النيران والشُّعل، وشبح التأذي من البلغم مقاساةُ البرد، وأن يرى في المنام المياه والثلج.

فإذا برزت الملكية ظهر في اليقظة أو المنام أشباح الأنس والسرور، إن كان اكتسب

> للطافة والخشوع وسائر ما يناسب الملكية؛ وبتشبح أضدادها في صورة كيفيات مضادة للاعتدال؛ وواقعات تشتمل على إهانة وتهديد، ويظهر الغضب في صورة سبع ينهش، والبخل في صورة حية تلدغ.

ترجمہ یوں لکھیں:

(۱) کہ ملکیت کے لئے بہیمیت میں چھپنے کے بعد نمودار ہونا ہے اور بہیمیت کے ساتھ گتھنے کے بعد جدا ہونا ہے۔

پس کبھی فطری موت سے ہوتا ہے، پس پیغمبر شان یہ ہے کہ اس وقت نہیں آتی بہیمیت کی مدد غذا سے، اور تحلیل ہو جاتا ہے اس کا (سابق) مواد، بدن کا تحلیل کے بغیر، اور نہیں ستاتے نفس کو پیش آنے والے حالات، جیسے بھوک، تشنگی، سیری اور غصہ، پس عالم پاک (یعنی اللہ تعالیٰ کی معرفت) سے ایک رنگ اس پر پہنچتا ہے۔

اور کبھی اختیاری موت سے ہوتا ہے، پس آدمی برابر اپنی بہیمیت کو توڑتا رہتا ہے ریاضت اور عالم پاک کی طرف مسلسل متوجہ رہنے کے ذریعہ، پس اس پر ملکیت کی تجلیاں چمکتی ہیں۔

(۲) اور یہ کہ (ملکیت و بہیمیت میں سے) ہر ایک کو انشراح اور انبساط ہوتا ہے اُن اعمال وملکات کی وجہ سے جو اس قوت کے مناسب ہیں اور انقباض اور سکڑنا ہے اُن اعمال وملکات کی وجہ سے جو اس قوت کے برخلاف ہیں۔

(۳) اور یہ کہ ہر تکلیف اور ہر لذت کا ایک پیکر محسوس ہے، جس کے ساتھ وہ تکلیف یا لذت متمثل ہوتی ہے۔ پس نہایت تکلیف دہ خلط کا پیکر محسوس چبھن ہے، اور صفرا کی گرمی سے تکلیف اٹھانے کا پیکر بے چینی اور تنگ دلی ہے اور یہ بات ہے کہ وہ خواب میں آگ اور شعلے دیکھے۔ اور بلغم کی تکلیف اٹھانے کا پیکر سردی کی تکلیف برداشت کرنا ہے اور یہ بات ہے کہ وہ خواب میں پانی اور برف دیکھے۔

پس جب ملکیت نمودار ہوتی ہے تو بیداری میں یا خواب میں انسیت اور خوشی کی شکلیں ظاہر ہوتی ہیں، اگر اس نے نظافت، خشوع اور دیگر وہ صفات جو ملکیت کے مناسب ہیں حاصل کی ہیں۔ اور ان صفات کی اضداد متمثل ہوتی ہیں اعتدال کے برخلاف کیفیات کی شکلوں میں اور ایسے واقعات نمودار ہوتے ہیں جو اہانت اور دھمکی پر مشتمل ہوتے ہیں اور غصہ ظاہر ہوتا ہے ایسے درندے کی شکل میں جو کاٹ رہا ہو اور بخل ظاہر ہوتا ہے ایسے سانپ کی شکل میں جو ڈس رہا ہو۔

لغات وترکیب:

برز بُروزًا: میدان کی طرف نکلنا ... كَمَن (ن س) كُمُونًا: چھپنا ... اشتبك: خلط ہونا، بعض کا بعض میں داخل ہونا ... شبّحه: برانگیختہ کرنا، بھڑکانا، اکسانا ... تقلّص: سکڑنا ... نخس الدابة: جانور کے پہلو یا پچھلے حصہ پر لکڑی وغیرہ چبھو کر اکسانا ... اللذّاع (اسم مبالغہ) بہت تکلیف دہ، لذع فلانا بلسانه: زبان سے تکلیف پہنچانا

ضجر (س) ضجرا: تنگ دل ہونا، زچ ہونا ..... نہس (ف س) نہسا اللحم گوشت کو آگے کے دانتوں سے نوچنا ..... اخلاط الجسد: خون، بلغم، سودا، صفراء ..... واقعات کا عطف اشباح پر ہے ..... ینہس کتاب میں ینہر تھا، مطبوعہ صدیقی اور مخطوطہ کراچی سے تصحیح کی گئی ہے۔

☆ ☆ ☆

خارجی جزاؤ سزا کا ضابطہ

اعمال کی جزاؤ سزا ایک تو اندرونی ہوتی ہے، جیسے نیک اعمال کی وجہ سے دل میں خوشی کا پیدا ہونا اور برے اعمال کی وجہ سے دل میں ندامت وحسرت کا پیدا ہونا۔ اس مجازات کا نظام عالم سے کوئی تعارض نہیں ہوتا، اس لئے یہ جزاؤ سزا تو بہر حال ہوتی ہے، اس میں نظام عالم کے تقاضوں کو پیش نظر نہیں رکھا جاتا۔

دوسری بیرونی مجازات ہے، جیسے نیک اعمال کی وجہ سے جان ومال میں برکت ہونا، عزت وراحت ملنا وغیرہ اور برے اعمال کی وجہ سے خوف اور فاقہ پیش آنا، جان ومال اور ثمرات کا گھٹ جانا وغیرہ۔ اس مجازات کا بھی نظام عالم کے تقاضوں سے تعارض ہوتا ہے اس لئے یہ بیرونی مجازات نظام عالم کے اسباب کی رعایت کے ساتھ ہوتی ہے تاکہ نظام عالم میں خلل نہ پڑے۔

پس جو شخص نظام عالم کے اسباب کا احاطہ کرلے اور اس نظام کو پیش نظر رکھے جو اسباب سے رونما (پیدا) ہوتا ہے[1] تو وہ یہ بات قطعی طور پر جان لے گا کہ اللہ تعالیٰ کسی گنہگار کو دنیا میں سزا دیئے بغیر نہیں چھوڑتے، مگر یہ سزا نظام عالم کی مصلحتوں کی رعایت کے ساتھ ہوتی ہے اور اس کی چار صورتیں ہوتی ہیں، جو درج ذیل ہیں:

① جب نظام عالم کے اسباب پر سکون ہوں یعنی ان کا کوئی تقاضا نہ ہو، تو آدمی کے اچھے اعمال کام کرتے ہیں یعنی ان کے مطابق جزاؤ سزا ہوتی ہے۔

② نظام عالم کے اسباب چاہتے ہیں کہ:

(۱) زید کو تکلیف پہنچے، اور وہ نیک آدمی ہوتا ہے۔ اور اس کی نیکی کے مقابل نظام عالم کے اسباب کو سکیڑ لینا نامناسب نہیں ہوتا یعنی اس میں کوئی قباحت نہیں ہوتی۔ تو نظام عالم کے اسباب کو سکیڑ لیا جاتا ہے اور زید کے نیک اعمال کو کام کرنے دیا جاتا ہے۔ اس صورت میں اس کے اعمال صالحہ آنے والی بلاؤں کو ختم کرتے ہیں یا ان کو ہلکا کر دیتے ہیں۔

(۲) نظام عالم کے اسباب چاہتے ہیں کہ زید کو راحتیں پہنچیں، اور وہ بدکار ہوتا ہے، اور اس کی بدکاری کے مقابل

---

[1] یہ بات تفصیل سے سمجھنا تو ممکن نہیں، رموز کائنات، خالق کائنات ہی جانتے ہیں، مگر ایک مؤمن اجمالاً اس بات کا ادراک کرسکتا ہے ۱۲

نظام عالم کے اسباب کو تغیر لینا نامناسب نہیں ہوتا تو نظام عالم کے اسباب کو سکیڑ لیا جاتا ہے۔ اور زید کے برے اعمال کو کام کرنے دیا جاتا ہے۔ اس صورت میں اس کی بدکاریاں نعمتوں کو روک دیتی ہیں یا کم کر دیتی ہیں۔ اور ان دونوں صورتوں میں گو بظاہر اعمال کا نظام عالم کے اسباب سے تعارض ہوتا ہے مگر حقیقی تعارض نہیں ہوتا اس لئے کہ نظام عالم کے اسباب کو سکیڑ لینا نامناسب نہیں ہوتا۔

(۳) اسباب کا تقاضا ہوتا ہے کہ زید کو تکلیف یا راحت پہنچے اور زید نیک یا بد ہوتا ہے یعنی نظام عالم کے اسباب کا تقاضا بھی وہی ہوتا ہے جو آدمی کے اپنے اعمال کا تقاضا ہوتا ہے تو شراب دو آتشہ ہو جاتی ہے یعنی اب دوسرا نیز تر ہو جاتی ہے۔ اس کو خوب راحتیں میسر آتی ہیں یا سخت سزا ملتی ہے نتیجۃً نیک آدمی اچھے کام اور زیادہ کرنے لگتا ہے اور برا آدمی برائیوں میں اور بڑھ جاتا ہے۔

(۳) نظام عالم کے اسباب قوی ہوں اور ان کے تقاضوں کا پایا جانا زیادہ ضروری ہو اور آدمی کے اپنے اعمال کے تقاضوں کا پایا جانا اتنا ضروری نہ ہو تو نظام عالم کے اسباب کی رعایت کی جاتی ہے اور آدمی کے اعمال کے تقاضوں کو روک دیا جاتا ہے۔ اور بدکار کو ڈھیل دے دی جاتی ہے اور نیکوکار کو بظاہر تنگی پیش آتی ہے اور اس کی یہ تنگی اس کے نفس کی اصلاح کا ذریعہ بنتی ہے اور اس کو یہ حقیقت سمجھا دی جاتی ہے، جیسے مریض کڑوی دوا رغبت سے پیتا ہے، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اس میں اس کی شفاء ہے۔ اسی طرح نیک آدمی یہ سمجھتا ہے کہ میری پریشانیاں میری ترقی کا سبب ہیں اور میری نیکیوں کا صلہ محفوظ ہے۔ متفق علیہ حدیث میں ہے کہ مومن کا حال تر و تازہ کھیتی جیسا ہے، ہوا کے ذرا سے جھونکے بھی اس کو ہلا کر رکھ دیتے ہیں، اسی طرح مومن پر پوری زندگی احوال آتے رہتے ہیں اور وہ کفارۂ سیئات اور رفع درجات کا سبب بنتے ہیں، جیسا کہ دوسری متفق علیہ حدیث میں آیا ہے کہ مومن کو جو بھی تکلیف پہنچتی ہے اس سے اس کے گناہ معاف ہوتے ہیں۔

(۴) بعض علاقوں پر شیطان کی اطاعت غالب آجاتی ہے، جیسے تمام کافر ممالک، بالخصوص یورپ اور امریکہ۔ اور وہاں کے باشندے سراپا بہیمیت بن جاتے ہیں، تو ایک مدت تک بطور استدراج ان لوگوں کی سزا روک دی جاتی ہے۔ سورۃ الاعراف آیات (۹۴-۹۶) میں اس کا تذکرہ ہے کہ نبی کی بعثت کے بعد لوگوں کو سختیوں سے دوچار کیا جاتا ہے تاکہ وہ ڈھیلے پڑیں، اگر وہ ڈھیلے نہیں پڑتے تو ان کو برکتوں سے نوازا جاتا ہے کہ شاید شکر گزار ہوں، اور جب اس کا بھی کوئی ثمرہ سامنے نہیں آتا تو دفعۃً ان کو پکڑ لیا جاتا ہے۔ اور یہ برکتیں آزمائش کے لئے ہوتی ہیں، حقیقی نعمتیں اور برکتیں وہ ہیں جو ایمان اور اعمال صالحہ کے صلہ میں ملتی ہیں، مگر جب لوگ تکذیب پر تلے رہتے ہیں تو پاداش عمل کا قانون روبعمل آتا ہے اس کی مثال ہود علیہ السلام کی بستیاں ہیں کہ عرصہ تک وہ خوش حال رہیں مگر بالآخر وہ تباہ کر دی گئیں۔

اس آخری صورت کی مثال یہ ہے کہ آپ کے غلام شرارت پر اترے ہوئے ہیں، مگر کسی وجہ سے آقا کو سزا دینے کی فرصت نہیں، اس وجہ سے مدت سے اصطبل میں دھما چوکڑی مچا رہے ہیں، مگر جونہی آقا فارغ ہوتا ہے تو ایسی سزا دیتا ہے کہ

سب کھا پی کر نکل جاتا ہے۔ اسی طرح جب قیامت کا دن آئے گا تو ان لوگوں کو سزا ملے گی، گویا اب اللہ تعالیٰ کو سزا دینے کی فرصت ملی۔ سورۃ الرحمٰن آیت ۳۱ میں ارشاد فرمایا ہے کہ: "اے جن وانس! ہم عنقریب تمہارے لئے فارغ ہوجاتے ہیں" یعنی حساب وکتاب لینے والے ہیں۔ اور اس کو مجازاً فارغ ہونا فرمایا ہے۔ اس آیت میں اسی مصلحت سے ایک وقت تک جزاء کے مؤخر ہونے کی طرف اشارہ ہے۔

والضابطة في المجازاة المخرجة: أنها تكون في تضاعيف أسباب؛ فمن أحاط بتلك الأسباب، وتمثل عنده النظام المنبعث منها، علم قطعاً أن الحق لا يدع عاصياً إلا يجازيه في الدنيا مع رعاية ذلك النظام:

فيكون إذا هدأت الأسباب عن تنعيمه وتعذيبه، نُعِّم بسبب الأعمال الصالحة، أو عُذِّب بسبب الأعمال الفاجرة.

ويكون إذا اجتمعت الأسباب على إيلامه، وكان صالحاً، وكان قبضها لمعارضة صلاحه غير قبيح، صُرفت أعماله إلى رفع البلاء أو تخفيفه، أو على إنعامه، وكان فاسقاً، صُرفت إلى إزالة نعمته، وكان كالمعارض لأسبابها؛ أو اجتمعت على مناسبة أعماله أُمِدّ في ذلك إمداداً بيّناً.

وربما كان حكمُ النظام أوجب من حكم الأعمال، فيُستدرج بالفاجر، ويُضيَّق على الصالح في الظاهر، ويُصرف التضييق إلى كسر بهيميته، ويُفهَّم ذلك ليرضى، كالذي يشرب الدواء المرّ راغباً فيه، وهذا معنى قوله صلى الله عليه وسلم: «مثلُ المؤمن كمثل الخامة من الزرع، تفيئها الرياح، تصرعها مرة، وتعدلها أخرى، حتى يأتيه أجله، ومثلُ المنافق كمثل الأرزة المجذية التي لا يصيبها شيء، حتى يكون انجعافها مرة واحدة» وقوله صلى الله عليه وسلم: «ما من مسلم يصيبه أذى من مرض فما سواه، إلا حطَّ الله به سيئاته، كما تحط الشجرة ورقها»

ورُبَّ إقليم غلبت عليه طاعة الشيطان، وصار أهله كمثل النفوس البهيمية، فتقلّص عنه بعضُ المجازاة إلى أجل، وذلك قوله تعالى: ﴿وما أرسلنا في قرية من نبي إلا أخذنا أهلها بالبأساء والضراء لعلهم يضَّرَّعون، ثم بدلنا مكان السيئة الحسنة، حتى عفوا وقالوا قد مسَّ آباءنا الضراء والسراء فأخذناهم بغتة وهم لا يشعرون، ولو أن أهل القرى آمنوا واتقوا لفتحنا عليهم بركات من السماء والأرض، ولكن كذبوا فأخذناهم بما كانوا يكسبون﴾

وبالجملة: فالأمر ههنا يُشبه بحال سيّد لا يتفرغ للجزاء، فإذا كان يومُ القيامة صار كأنه تفرَّغ، وإليه الإشارة في قوله تعالى: ﴿سنفرُغ لكم أيها الثقلان﴾

سے ترقی کا سبب ہونا اور مزید برائیوں میں پھنستے چلے جانا حتی کہ دل پر مہر لگ جانا وغیرہ دوسرے نزدیک کیا جانا بھی مجازات ہے۔ اور اس مجازات کی دو صورتیں ہوتی ہیں: ایک یہ کہ مزید نیک کاموں کا اس کو الہام کیا جاتا ہے یا شیاطین کے وسوسے بڑھ جاتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ آدمی کے احوال میں تبدیلی کر دی جاتی ہے یعنی ایسے حالات پیش آتے ہیں کہ آدمی نیک کاموں میں ترقی کرتا ہے یا برائیوں میں جا پڑتا ہے۔

فائدہ: جو شخص مذکورہ بالا مضامین کو اچھی طرح سمجھ لے، اور ہر بات کو اس کے موقعہ پر رکھے، تو وہ بہت سے اشکالات سے نجات پالے گا مثلاً:

(۱) ایک حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نیکی سے روزی بڑھتی ہے اور دوسری حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نیک لوگوں کو آخرت میں اجر ملے گا اور دنیا میں بلائیں نیک لوگوں کو زیادہ پہنچتی ہیں۔

(۲) ایک حدیث میں ہے کہ بدی سے روزی گھٹتی ہے اور دوسری حدیث میں ہے کہ بدکاروں کو ان کی نیکیاں دنیا میں کھلا دی جاتی ہیں۔

تو اس تعارض کا جواب یہ ہے کہ فی نفسہ نیکی سے روزی بڑھتی ہے اور بدی سے گھٹتی ہے لیکن نظام عالم کے اسباب کی وجہ سے نیک لوگوں کی آزمائش ہوتی ہے اور ان کی مصلحت کے لئے ان کی نیکیوں کا اجر آخرت میں محفوظ کیا جاتا ہے اور کافروں کے لئے چونکہ آخرت میں کچھ نہیں اس لئے ان کی نیکیوں کا صلہ دنیا ہی میں دے دیا جاتا ہے۔ تا کہ آخرت میں ان کا کوئی مطالبہ باقی نہ رہے۔ اور کبھی آزمائش کے لئے ان کی روزی گھٹا دی جاتی ہے۔ واللہ اعلم

ثم المجازاة:

تارةً: تكون في نفس العبد بإفاضة البسط والطُّمأنينة، أو القبض والفزع.

وتارةً: في بدنه، بمنزلة الأمراض الطارئة: من هجوم غمٍّ أو خوف؛ ومنه وقوع النبي صلى الله عليه وسلم مغشيا عليه قبل نبوته، حين كشف عورته.

وتارةً: في ماله وأهله.

وربما: أُلهم الناسُ والملائكة والبهائم: أن يُحسنوا إليه أو يُسيئوا.

وربما: قُرّب إلى خير أو شر بإلهامات أو إحالات.

ومن فهم ما ذكرناه، ووضع كلَّ شيء في موضعه، استراح من إشكالات كثيرة:

كمعارضة الأحاديث الدالة على أن البرَّ سببُ زيادة الرزق، والفجور سببُ نقصانه؛ والأحاديث الدالة على أن الفجار يُعجَّل لهم الحسناتُ في الدنيا، وأن أكثر الناس بلاءً الأمثلُ فالأمثل، ونحو ذلك. والله أعلم.

ترجمہ۔ پھر جزا و سزا:
کبھی: بندے کے دل میں ہوتی ہے، کشادگی اور اطمینان یا انقباض و حیرانی کے فیضان کے ذریعہ۔
اور کبھی: بندے کے بدن میں ہوتی ہے، جیسے بے چینی یا خوف کے ہجوم سے پیش آنے والی بیماریاں، اور اسی قبیل سے ہے: نبی کریم ﷺ کا نبوت سے پہلے بے ہوش ہو کر گر پڑنا، جب آپ نے اپنا ستر کھولا۔
اور کبھی: بندے کے مال میں اور اہل و عیال میں ہوتی ہے۔
اور کبھی: لوگ، فرشتے اور چوپائے الہام کئے جاتے ہیں کہ وہ اس بندے سے اچھا سلوک کریں یا برا سلوک کریں۔
اور کبھی: بندہ نزدیک کیا جاتا ہے خیر سے یا شر سے، الہامات کے ذریعہ یا تقریبات کے ذریعہ۔
فائدہ: اور جو شخص وہ باتیں سمجھ لے جو ہم نے ذکر کیں، اور ہر چیز کو اس کی جگہ میں رکھے (یعنی ہر روایت کا صحیح مطلب سمجھے) تو وہ شخص بہت سے اشکالات سے آرام پالےگا۔ جیسے ان روایات کا تعارض جو اس پر دلالت کرتی ہیں کہ نیک اعمال رزق کی فراخی کا سبب ہیں، اور برے اعمال رزق کی تنگی کا سبب ہیں، اور وہ روایات جو اس پر دلالت کرتی ہیں کہ گنہگاروں کو ان کی نیکیوں کا بدلہ دنیا میں جلدی دیدیا جاتا ہے، اور جو اس پر دلالت کرتی ہیں کہ سب سے زیادہ آزمائش بڑے لوگوں کی ہوتی ہے، پھر درجہ بدرجہ اور اس قسم کی دیگر روایات واللہ اعلم

لغات:

بسط (ن) بسطا الثوب: پھیلانا۔ بسط الرجلَ: دل خوش کرنا۔ بسط الید: ہاتھ کشادہ کرنا یہاں مراد دل کی کشادگی، بشاشت اور خوشی ہے۔ ... الطمأنينة: الاطمئنان۔ إحالة: تبدیلی تغیر۔ الأمثل (اسم تفضیل): الأفضل جمع أماثل و مُثُل مؤنث مُثلیٰ مُثل مثل (ک) مثالة: افضل ہونا۔ فالأمثل میں ف ترتیب کے لئے ہے۔
تصحیح: ماذکرنا اصل میں ماذکرنا بغیر ضمیر کے تھا، تصحیح مخطوطہ کراچی سے کی ہے۔

باب ــــــ ۴

موت کی حقیقت کا بیان

گذشتہ باب میں دنیوی مجازات کا ذکر تھا، آئندہ باب میں برزخی مجازات کی تفصیلات آرہی ہیں درمیان میں موت کی حقیقت کا بیان ہے۔ کیونکہ موت ایک پل ہے، اس سے گزر کر ہی قبری زندگی تک پہنچا جاسکتا ہے، اس لئے پہلے موت کی حقیقت سمجھنا ضروری ہے۔

نوعیہ کو چھوڑ کر مبدأ فیاض سے ایک نئی صورت ترکیبی کے فیضان کے قابل ہو جائے، اور وہ نئی صورت نوعیہ ترکیبی اس مرکب کی کافی عرصہ تک حفاظت کرے اور اس کو باقی رکھے تو وہ مرکب تام کہلاتا ہے —— استقراء سے مرکب تام کی تین قسمیں دریافت ہوئی ہیں یعنی معدنیات، نباتات اور حیوانات۔ مرکب تام میں اگر نمو اور حرکت ارادیہ نہ ہو تو وہ معدنیات ہیں۔ اور اگر نمو تو ہو مگر حرکت ارادیہ متحقق نہ ہو تو وہ نباتات ہیں۔ اور اگر نمو اور حرکت ارادیہ دونوں متحقق ہوں تو وہ حیوانات ہیں۔

مرکب ناقص: جب اجزاء عنصریہ اس طور سے جمع ہو جائیں کہ مرکب میں بھی ان کی صور نوعیہ بدستور باقی رہیں، جیسے گارا: مٹی اور پانی کا مرکب ہے، وہ ترکیب کے بعد بھی مٹی اور پانی کی صورتیں باقی ہیں، نئی صورت نوعیہ جلوہ گر نہیں ہوئی۔ یا نئی صورت ترکیبی پیدا تو ہو مگر وہ مرکب کی کافی عرصہ تک حفاظت نہ کرے، بلکہ اس کا وجود وقتی اور عارضی ہو، جیسے شہاب (ٹوٹتا ہوا تارہ): مادہ دخانیہ اور آگ کا مرکب ہے، اور ترکیب کے بعد نئی صورت کا فیضان بھی ہوتا ہے، مگر وہ تھوڑی دیر کے لئے ہے۔ اسی طرح کہر اور شبنم وغیرہ یہ سب مرکب غیر تام ہیں (معین الفلسفہ ص ۱۳۲)

دو عناصر کے مرکبات: بخار (بھاپ): پانی اور آگ سے مرکب ہے۔ غبار: مٹی اور ہوا سے مرکب ہے۔ دخان (دھواں) آگ اور ہوا سے مرکب ہے۔ ثریٰ (نمناک مٹی) پانی اور مٹی سے مرکب ہے۔ ارض منثارۃ (پھولی ہوئی زمین) مٹی اور ہوا سے مرکب ہے۔ جو تری سے زمین میں تخلخل ہوتا ہے اور ہوا اندر گھستی ہے تو زمین ابھر جاتی ہے۔ جمرۃ (چنگاری) مٹی اور آگ سے مرکب ہے۔ سعفہ (آگ کی لپٹ) آگ اور ہوا سے مرکب ہے۔ شعلہ آگ اور ہوا سے مرکب ہے (سعفہ اور شعلہ ایک ہی چیز ہیں)

تین عناصر کے مرکبات: طین مخمّر (سڑا ہوا گارا): پانی، مٹی اور ہوا سے مرکب ہے اور اس میں ہوا کے ہونے کی علامت یہ ہے کہ اس میں سے بدبو اٹھتی ہے۔ طحلب (کائی): پانی، مٹی اور ہوا سے مرکب ہے۔

چار عناصر کے مرکبات: تمام نباتات اور حیوانات (بشمول انسان) ہیں۔

فلکیات، کائنات الجو اور مَوالید: زمین سے انتہائی بلندی پر جو اجسام پائے جاتے ہیں وہ علویات اور فلکیات کہلاتے ہیں، جیسے آسمان (افلاک) ستارے اور سیارے۔ اور جو چیزیں زمین و آسمان کے بیچ میں پیدا ہوتی ہیں وہ کائنات الجو (فضائی مخلوقات) کہلاتی ہیں، جیسے بادل، بارش، برف وغیرہ۔ ان میں مزاج متحقق نہیں ہوتا اس لئے یہ جلد ختم ہو جاتی ہیں اور ان کو مرکب غیر تام کہتے ہیں۔ اور جو چیزیں زمین میں پیدا ہوتی ہیں وہ مَوالید کہلاتی ہیں، ان میں مزاج متحقق ہوتا ہے اس لئے وہ عرصہ تک قائم رہتی ہیں اور مرکب تام کہلاتی ہیں۔ مَوالید تین ہیں: معدنیات، نباتات اور حیوانات۔ معدنیات مختلف طرح کی ہوتی ہیں، بعض دو عناصر سے مرکب ہوتی ہیں، بعض تین سے اور بعض چاروں عناصر سے۔ اور تمام نباتات اور حیوانات عناصر اربعہ کے مرکبات ہیں۔

اس ضروری تمہید کے بعد اب حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمہ اللہ کی تمہید ملاحظہ فرمائیں۔

معدنیات، نباتات، حیوانات اور انسان سب عناصر اربعہ سے بنی ہوئی مخلوقات ہیں۔ اس لئے سب کی صورت حال بظاہر یکساں نظر آتی ہے، مگر حقیقت حال مختلف ہے۔ ہر ایک کی صورت نوعیہ کا فیضان الگ الگ مادوں پر ہوتا ہے۔ جس مادہ میں سونا بننے کی صلاحیت ہوتی ہے، اس پر سونے کی صورت نوعیہ جاری ہوتی ہے اور جس مادہ میں چاندی بننے کی صلاحیت ہوتی ہے، اس پر چاندی کی صورت نوعیہ طاری ہوتی ہے۔ یہی حال تمام معدنیات، نباتات اور حیوانات کا ہے۔ مادے میں جو صلاحیت پیدا ہوتی ہے وہی صورت فائض ہوتی ہے۔ ہر صورت کی سواری الگ ہونے کا یہی مطلب ہے۔

اسی طرح ہر صورت نوعیہ کا یعنی ہر نوع کا کمال نوعی الگ ہے۔ یعنی مبدأ فیض سے ہر نوع کو جو کمال فطری طور پر ملتا ہے وہ الگ الگ ہوتا ہے، جیسے شہد کی مکھی کو ایک کمال ملتا ہے، گوبریلے کو دوسرا کمال ملتا ہے، اونٹ کو الگ اور بیل کو جدا کمال ملتا ہے اور مخلوقات اکتساب یعنی اپنی محنت سے جو کمال حاصل کرتی ہیں وہ کمال ثانوی کہلاتا ہے، جیسے انسان لکھ پڑھ کر کمالات حاصل کرتا ہے یہ سب ثانوی کمالات ہیں۔ اور انسان کو بحیثیت انسان جو صلاحیتیں ملی ہیں وہ اس کا کمال اولی ہیں۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ عناصر جب ممکن اور باریک ہوتے ہیں اور قلت و کثرت کے اعتبار سے مختلف طرح پر ملتے ہیں تو دو عنصر والی مخلوقات، تین عناصر والی مخلوقات، اور چار عناصر والی مخلوقات وجود میں آتی ہیں۔ اور ان میں سے ہر ایک کی خصوصیت الگ ہوتی ہے اور وہ اس کے اجزاء کی خصوصیات کا مجموعہ ہوتی ہے، ان کے علاوہ کوئی نئی چیز ان میں نہیں ہوتی۔ اس کی مثال حکیموں کا معجون ہے جو مفرد ادویہ سے مرکب ہوتا ہے۔ اور اس معجون میں جو خاصیت پیدا ہوتی ہے وہ مفردات کے خواص کا مجموعہ ہی ہوتی ہے، ان کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا۔ پھر مفردات کی مقداروں کی کمی بیشی سے بھی معجون کے خواص میں فرق پڑتا ہے۔

شاہ صاحب رحمہ اللہ نے ان تمام مرکبات کو کائنات الجو کا نام دیا ہے۔ مگر صحیح بات یہ ہے کہ ان میں سے بعض کائنات الجو ہیں اور بعض موالید یعنی زمینی مخلوقات ہیں۔

اس کی مزید تفصیل یہ ہے کہ عناصر کے باہم ملنے کے بعد جب کسی دھات کا مثلاً سونے کا یا چاندی کا مزاج پیدا ہوتا ہے تو اس کی صورت معدنیہ آکر اس مزاج پر سوار ہو جاتی ہے اور سونا یا چاندی موجود ہو جاتے ہیں۔ اور اس مادے میں سونے کی یا چاندی کی خصوصیات پیدا ہو جاتی ہیں اور وہ صورت معدنیہ ایک عرصہ تک اس مزاج کی حفاظت کرتی ہے اس لئے وہ سونا یا چاندی ہی رہتا ہے، کسی دوسری دھات وغیرہ میں بدل نہیں جاتا۔

اسی طرح جب کسی نبات کا مثلاً گندم کا یا امرود کا مزاج پیدا ہوتا ہے تو اس نوع کی صورت نامیہ آکر اس جسم کو جو مخلوط المزاج ہے سواری بنا لیتی ہے۔ اور وہ صورت نوعیہ ایک ایسی طاقت بن جاتی ہے جو عناصر اور فضا کے اجزاء کو اپنے

نسمہ میں حسب سابق حلول کئے ہوئے ہوتی ہے، جیسے کسی ماہر خوش نویس کے — جو خود اپنے فن پر فریفتہ ہو — دونوں ہاتھ کٹ جائیں، یا اس کی سر انگشت کے دونوں پورے کٹ جائیں یا کوئی شنوا بینا، بہرہ اندھا ہو جائے تو بھی اصل ملکہ بدستور باقی رہتا ہے۔ اگر سرجری کر کے مصنوعی ہاتھ پیر لگا دیے جائیں تو ان سے وہ لکھنے اور گھومنے لگے گا، اسی طرح آپریشن کر کے یا آلہ لگا کر آدمی کو شنوا بینا کر سکتے ہیں۔

اسی طرح جسد خاکی سے نفس ناطقہ کے حقیقی تعلق کے ختم ہونے کے بعد بھی وہمی (خیالی) تعلق باقی رہتا ہے اور نسمہ سے تو حقیقی تعلق برقرار رہتا ہے، جو اس کی بقا و قیام کے لئے کافی سامان ہے۔

﴿باب ذكر حقيقة الموت﴾

اعلم أن لكل صورة من المعدنية، والنامية، والحيوانية، والإنسانية مطيةً غير مطية الأخرى، ولها كمالاً أوليا غير كمال الأخرى، وإن اشتبه الأمر في الظاهر.

فالأركان إذا تصغَّرت وامتزجت بأوضاع مختلفة، كثرة وقلة، حدثت ثُنائياتٌ: كالبخار، والغبار، والدخان، والثرى، والأرض المثارة، والخميرة، والشعلة، والشُّعلة؛ وثلاثيات: كالطين المختمر، والحطب، ورباعيات: نظائرُ ما ذكرنا؛ وتلك الأشياء لها خواصٌّ مركبةٌ من خواص أجزائها، ليس فيها شيئ غيرُ ذلك؛ ونُسمي بكائنات الجو.

فتأتي المعدنيةُ، فتحفظ ضرب ذلك المزاج، وتتخذه مطيةً، وتصير ذات خواصَّ نوعية، وتحفظ المزاج.

ثم تأتي النامية، فتتخذ الجسم المحفوظ المزاج مطيةً، وتصير قوةً محوِّلةً لأجزاء الأركان والكائنات الجوية إلى مزاج نفسه، لتخرُج إلى الكمال المتوقع لها بالفعل.

ثم تأتي الحيوانية، فتتخذ الروح الهوائية الحاملة لقُوى التغذية والتنمية مطيةً، وتُنفِّذ التصرف في أطرافها بالحس والإرادة، انبعاثا للمطلوب، وانخناسًا عن المهروب.

ثم تأتي الإنسانية، فتتخذ النسمة المتصرفة في البدن مطيةً، وتقصِد إلى الأخلاق التي هي أمهات الانبعاثات والانخناسات، فتُقَنِّنها، وتحسِّن سياستها، وتأخذها نفثةً لما تتلقاه من فوقها.

فالأمر وإن كان مشتبها بادي الرأي، لكن النظر المُمْعِن يلحق كلَّ آثار بمنبعها، ويُفرز كلَّ صورة بمطيتها.

وكل صورة لابد لها من مادة تقوم بها، وإنما تكون المادة ما يناسبها؛ وإنما مَثَلُ الصورة كمثل

خلقة الإنسان القائمة بالنسمة في المعاد، ولا يمكن أن توجد الخلقة إلا بالنسمة: فمن قال بأن النفس النطقية المخصوصة بالإنسان، عند الموت ترفض المادة مطلقا، فقد خرص.

نعم، لها مادة بالذات وهي النسمة، ومادة بالعرض وهو الجسم الأرضي؛ فإذا مات الإنسان لم ينقص منه زوال المادة الأرضية، ويبقى حالة بمادة النسمة، ويكون كالكاتب المجيد، المشغوف بكتابته، إذا قطعت يداه وملكة الكتابة بحالها؛ والمستهتر بالمشي إذا قطعت رجلاه، والسميع والبصير إذا جعل أصم وأعمى.

ترجمہ: موت کی حقیقت کا بیان۔ جاننا چاہئے کہ جمادات، نباتات، حیوانات اور انسانوں میں سے ہر صورت کے لئے ایک سواری ہے دوسری کی سواری کے علاوہ، اور ہر صورت کے لئے کمال اولی ہے دوسری کے کمال اولی کے علاوہ، اگرچہ معاملہ بظاہر متشابہ (یکساں نظر آتا) ہے۔

پس جب عناصر اربعہ چھوٹے چھوٹے مل جاتے ہیں اور وہ مختلف تناسب سے ملتے ہیں، زیادہ ہونے اور کم ہونے کے اعتبار سے، تو دو عنصر والی چیزیں پیدا ہوتی ہیں، جیسے بھاپ، غبار، دھواں، تمباکو کی جمی ہوئی راکھ، زمین پر چنگاری، آگ کی لپٹ اور شعلہ ——— اور تین عنصر والی چیزیں پیدا ہوتی ہیں، جیسے خمیر اٹھی ہوئی مٹی (سڑا ہوا گارا)، کائی (وہ سبزی جو اکثر بند پانی کے اوپر یا پرمرطوب جگہ کی دیواروں پر جمتی ہے) اور چار عناصر والی چیزیں (پیدا ہوتی ہیں) ان چیزوں کی طرح جو ہم نے ذکر کیں۔ اور ان چیزوں کے لئے خصوصیات ہیں، جو ان کے اجزاء کی خصوصیات سے مرکب ہیں۔ ان میں کوئی چیز ان خصوصیات کے علاوہ نہیں۔ اور وہ "فضائی چیزیں" کہلاتی ہیں۔

پھر صورت معدنیہ آتی ہے، اور اس مزاج کی گردن پر بیٹھ جاتی ہے۔ وہ اس کو سواری بنالیتی ہے اور وہ صورت نوعی خصوصیات کے ساتھ پائی جاتی ہے اور مزاج کی نگہداشت کرتی ہے۔

پھر صورت نباتیہ آتی ہے۔ پس وہ اس جسم کو سواری بناتی ہے جو مختلط المزاج ہے۔ اور وہ صورت ایک قوت (پاور) بن جاتی ہے، جو تبدیل کرنے والی ہوتی ہے عناصر اربعہ کے اجزاء کو اور لطیف کائنات (ہوا وغیرہ) کے اجزاء کو اس کے اپنے مزاج کی طرف، تاکہ وہ بالفعل نکلے اس کمال کی طرف جس کی اس کے لئے امید باندھی گئی ہے۔

پھر آتی ہے صورت حیوانیہ، پس وہ اس روح ہوائی کو سواری بناتی ہے، جو غذائیہ اور تنمیہ کی صلاحیتوں کی حامل ہوتی ہے۔ اور وہ احساس اور ارادہ کے ذریعہ روح ہوائی کے اطراف میں آزاد چلاتی ہے تاکہ وہ مطلوب کی طرف اٹھے اور بھاگنے کی چیز سے دور ہٹے۔

پھر آتی ہے صورت انسانیہ، پس وہ نسمہ کو سواری بناتی ہے، جو بدن میں تصرف کرنے والا ہے۔ اور وہ ان افعال کا ارادہ کرتی ہے جو مطلوب کی طرف اٹھ کھڑے ہونے اور مرہوب سے پیچھے ہٹ جانے کی بنیادیں ہیں۔ اور وہ صورت ان

ملکات کی پرورش کرتی ہے، اور ان کی بہترین تدبیر کرتی ہے، اور ان کو جلوہ گاہ بناتی ہے اُن باتوں کے لئے جن کو وہ اپنے اوپر سے حاصل کرتی ہے۔

پس معاملہ اگرچہ سرسری نظر میں یکساں دکھتا ہے، مگر گہری نظر تمام آثار کو ان کے سرچشموں کے ساتھ ملاتی ہے اور ہر صورت کو اس کی سواری کے ساتھ جدا کرتی ہے۔

اور ہر صورت کے لئے ایک مادہ ضروری ہے، جس کے ساتھ وہ قائم ہو، اور وہ وہی چیز ہوسکتی ہے جو اس کے مناسب ہو۔ اور صورت نوعیہ کا حال تو بس انسان کی اس شکل جیسا ہے جو مجسمہ میں موم کے ساتھ قائم ہے، اور حلیہ پایا نہیں جاسکتا مگر موم کے ساتھ، پس جو شخص کہتا ہے کہ: "نفس ناطقہ، جو انسان کے ساتھ مخصوص ہے، بوقت موت بالکلیہ مادہ کو چھوڑ دیتا ہے" تو اس نے اٹکل پچو ہانکا!

ہاں صورت نوعیہ کے لئے ایک مادہ بالذات ہے، اور وہ نسمہ ہے اور ایک مادہ بالعرض ہے، اور وہ جسد خاکی ہے۔ پس جب انسان مرجاتا ہے تو اس کو ضرر نہیں پہنچتا، زمینی مادہ کے زائل ہونے سے، اور باقی رہتی ہے صورت نوعیہ نسمہ کے مادہ کے ساتھ حلول کئے ہوئے۔ اور ہوتا ہے اس ماہر کاتب کی طرح، جو اپنی کتابت کا دلدادہ ہو، جب اس کے دونوں ہاتھ کاٹ دیئے جائیں، وہ ایسا کتابت کا ملکہ ہونا باقی رہتا ہے اور چلنے کا شوقین، جب اس کے دونوں پیر کاٹ دیئے جائیں اور سننے والا اور دیکھنے والا جب بہرہ اندھا ہوجائے۔

نوٹ: اس بحث میں نفس ناطقہ اور انسان کی صورت نوعیہ روح ربانی کے معنی میں استعمال کئے گئے ہیں۔

لغات:

ناموس اور نہایہ مترادف الفاظ ہیں ۔ اَوضاع جمع ہے وَضع کی، ہیئتی حالت، یہ مقولات عرض میں سے ایک مقولہ ہے (دیکھئے معین الفلسفہ ص ۸۲) ... ثُمَّ بار بار ترتیب ذکری کے لئے آیا ہے، جیسے سورۃ البلد آیت ۱۷ میں ثُمَّ اسی معنی میں آیا ہے ... المحفوظ المزاج احتراز ہے مرکب غیر تام کے عارضی مزاج سے، جو تھوڑی دیر میں ختم ہوجاتا ہے ... اقتنی المال: حاصل کرنا۔ اقتنی الحیوان: پالنا، پرورش کرنا ... مُجید (اسم فاعل) اجاد اِجادۃ: عمدہ کرنا اِستَهتَر الرجل بکذا: بہت فریفتہ ہونا۔

تصحیح: تنقیتها اصل میں تقیتها تھا، جس کے معنی ہیں مزین کرنا۔ تصحیح تینوں مخطوطوں سے کی ہے۔

☆ ☆ ☆

لوگوں کی مختلف انواع

موت کے بعد عالم برزخ میں جو مجازات ہوگی، اس کو سمجھنے کے لئے باب کے آخر میں شاہ صاحب رحمہ اللہ بطور تمہید تین باتیں بیان فرماتے ہیں:

ہوتی بات: مختلف اعتبارات سے لوگ مختلف طرح کے ہوتے ہیں، مثلاً:

(۱) کوئی دل کے تقاضے سے اعمال کرتا ہے اور ملکات کو اپناتا ہے اور کوئی برادری کی موافقت میں، یا کسی عارضی باعث سے اعمال کرتا ہے، بشرطیکہ وہ عارضی عادت ثانیہ نہ بن گیا ہو، ورنہ وہ عارضی نہیں رہے گا، بلکہ دل کا داعیہ بن جائے گا۔ حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے اپنے مرشد حضرت حاجی امداد اللہ صاحب کو اپنا حال لکھا تھا کہ: "عبادت عادت بن گئی ہے" یعنی دل کا تقاضا بن گئی ہے، عبادت کے لئے نہ تو تکلف کرنا پڑتا ہے نہ دل کو آمادہ کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے — اس پر حضرت حاجی صاحب قدس سرہ نے مبارک باد دی تھی۔

پہلی قسم کے لوگوں کو یعنی جو دل کے تقاضے سے اعمال کرتے ہیں اور ملکات کو اپناتے ہیں ان کو نگرانی کی ضرورت نہیں ہوتی، اگر ان کو بالکل بالطبع چھوڑ دیا جائے تب بھی وہ اعمال کرتے رہیں گے اور وضع قطع اور اخلاق کو سنبھالے رکھیں گے، اور دوسری قسم کے لوگ یعنی جو برادری کی موافقت میں یا کسی عارضی سبب سے اعمال کرتے ہیں، وہ جب تک عارضی رہتا ہے اعمال کرتے ہیں اور اخلاق برتتے ہیں اور جب عارضی ہٹ جاتا ہے تو اعمال میں سست پڑ جاتے ہیں اور اخلاق کو خیرباد کہہ دیتے ہیں۔

جیسے بعض طلبہ فطری طور پر نیک طبع اور سلامت روی کا مزاج رکھتے ہیں۔ وہ قلبی رغبت سے نیک لوگوں کی شکل وصورت، وضع قطع، اعمال صالحہ اور اخلاق حمیدہ اپناتے ہیں۔ مدرسہ میں ان کی نگرانی نہ بھی کی جائے تب بھی ان کی حالت درست رہتی ہے اور گھر جانے کے بعد بھی ان کی وضع شکل وصورت برقرار رہتی ہے، اور اعمال واخلاق محفوظ رہتے ہیں۔ اور بعض طلبہ فطری طور پر لاابالی اور آزاد ہوتے ہیں، وہ اعمال صالحہ اور نیک لوگوں کی شکل وصورت میں بے رغبت ہوتے ہیں مگر مدرسہ کی زندگی میں ان کو مجبوراً ماحول کی موافقت کرنی پڑتی ہے، ایسے طلبہ کی اگر پوری نگرانی نہ کی جائے یا جب وہ وطن لوٹ جاتے ہیں تو ان کے اعمال میں، اخلاق میں، شکل وصورت میں حتی کہ وضع قطع میں بھی فرق پڑ جاتا ہے (شاہ صاحب رحمہ اللہ کی دی ہوئی مثال کتاب میں آ رہی ہے)

(۲) کچھ لوگ فطری طور پر بیدار طبیعت ہوتے ہیں، اور کچھ خوابیدہ طبیعت۔ پہلی قسم کے حضرات متعدد چیزوں کے درمیان جو امر جامع ہوتا ہے اس کو سمجھ لیتے ہیں، ان کا ذہن معلولات میں الجھنے کے بجائے علت کو ڈھونڈھتا ہے۔ وہ اعمال سے زیادہ ملکات کو اہمیت دیتے ہیں اور دوسری قسم کے لوگوں کی صورت حال اس کے برعکس ہوتی ہے، وہ کثرت (متفرق چیزوں) میں الجھے رہتے ہیں، ان کی رسائی وحدت (امر جامع) تک نہیں ہوتی۔ وہ ملکات سے صرف نظر کر کے اعمال میں، اور اعمال کی بھی اسپرٹ کو نظر انداز کر کے ان کی ظاہری شکلوں میں مشغول رہتے ہیں۔

مثلاً ایک مدرسہ میں چند دنوں میں طلبہ میں بے راہ روی کے مختلف واقعات رونما ہوئے، کسی نے چوری کی، کوئی سینما بینی میں پکڑا گیا، کوئی جھگڑا کر بیٹھا اور کچھ آوارہ گردی کرنے لگے تو سمجھدار منتظم ان متفرق واقعات کو اہمیت دینے کے بجائے ان کا اصل سبب تلاش کرے گا اور بآسانی اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ طلبہ میں بے راہ روی کی وجہ تربیت کا فقدان ہے، وہ فوراً تربیت

کا نظام مضبوط کرے گا تو واقعات خود بخود رک جائیں گے اور سادہ منہتم واقعات میں الجھا رہے گا، وہ کسی کا کھانا بند کرے گا، کسی کی پٹائی کرے گا، کسی کا اخراج کرے گا اور مرض بڑھتا رہے گا اور واقعات کا تسلسل جاری رہے گا۔

واعلم أن من الأعمال والهيئات مايباشرها الإنسانُ بداعية من قلبه، فلو خُلّي ونفسه لانساق إلى ذلك، ولامتنع من مخالفه؛ ومنها مايباشره لموافقة الإخوان، أو لعارض خارجي: من جوع وعطش ونحوهما، إذا لم يصر عادةً لايستطيع الإقلاع عنها، فإذا انقضَى العارضُ انحلّت الداعيةُ؛ فرب مستهترٍ بعشق إنسان،أو بالشعر،أو بشيئ آخر، يضطر إلى موافقة قومه في اللباس والزّيّ،فلو خُلي ونفسه، وتبدّل زِيُّه، لم يجد في قلبه بأسًا؛ ورب إنسان يحب الزّيّ بالذات، فلو خلي ونفسه، لما سَمَح بتركه.

وأن من الإنسان اليقظانَ بالطبع، يتفطن بالأمر الجامع بين الكثرات، ويُمسك قلبُه بالعلة، دون المعلولات، والملكةِ دون الأفاعيل؛ ومنه الوَسْنانُ بالطبع، يبقى مشغولاً بالكثرة عن الوَحدة، وبالأفاعيل عن الملكات، وبالأشباح عن الأرواح.

ترجمہ: اور جان لیں کہ بعض کام اور بعض ملکات وہ ہیں جن کو انسان داعیہ قلب سے کرتا ہے، پس اگر وہ اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے تو بھی وہ ان کی طرف ہانکا جائے گا یعنی وہ ان کاموں کی طرف مائل رہے گا۔ اور اس کے برخلاف سے باز رہے گا۔ اور بعض اعمال وملکات وہ ہیں جن کو آدمی اختیار کرتا ہے برادری کی موافقت میں یا کسی بیرونی عارض (باعث) کی وجہ سے، جیسے بھوک، پیاس اور ان کے مانند، جب وہ عارض ایسی عادت نہ بن جائے، جس کو چھوڑنا بس میں نہ رہے، پس جب عارض چھوٹ جاتا ہے تو داعیہ کھل جاتا ہے یعنی جب وہ عارض ختم ہو جاتا ہے تو داعیہ بھی باقی نہیں رہتا —— مثلاً بعض لوگ جو کسی کے عشق میں یا فن شاعری پر یا کسی دوسری چیز پر وارفتہ ہوتے ہیں (تاہم) وہ لباس اور پوشاک میں اپنی قوم کی موافقت کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ پھر اگر اس کو اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے اور اس کی پوشاک بدل جائے تو وہ اپنے دل میں کوئی تنگی محسوس نہیں کرے گا —— اور بعض لوگ کسی پوشاک کو بالذات پسند کرتے ہیں، پس اگر اس کو اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے تو بھی وہ اس پوشاک کو چھوڑنے کا روادار نہیں ہوگا۔

اور یہ (بات بھی جان لیں) کہ بعض لوگ فطری طور پر بیدار (مغز) ہوتے ہیں، وہ اس امر جامع کو فوراً پالیتے ہیں جو بہت سی چیزوں میں (مشترک) ہوتا ہے، اور اس کا دل معلولات (نتائج وآثار) کو چھوڑ کر، علت (اور سبب) کو پکڑتا ہے اور اعمال کو چھوڑ کر، ملکہ کو پکڑتا ہے —— اور بعض انسان فطری طور پر خوابیدہ (طبیعت) ہوتے ہیں، وہ وحدت (اکائی) کو چھوڑ کر کثرت میں، اور ملکات کو چھوڑ کر اعمال میں، اور ارواح کو چھوڑ کر اشکال میں مشغول ہوتے ہیں۔

نہ پڑے۔ پھر بہیمیت کا ملکیت سے متاثر ہونا تو خیر محض ہے، البتہ ملکیت کا بہیمیت سے متاثر ہونا مضر ہے۔ مگر تھوڑی مقدار میں اثر قبول کرنے میں کچھ حرج بھی نہیں۔ ہاں سخت نقصان دہ بات یہ ہے کہ ملکیت میں نہایت درجہ ناموافق کیفیات پیدا ہو جائیں۔ اور نہایت مفید بات یہ ہے کہ اس میں نہایت درجہ موافق یا مناسب کیفیات جلوہ گر ہوں۔

ناموافق کیفیات درج ذیل ہیں:

(۱) مال اور اہل وعیال کی محبت میں آدمی یہاں تک گرفتار ہو جائے کہ اس کو ان چیزوں کے سوا زندگی کا اور کوئی مقصد نظر نہ آئے اور خسیس صفات اس کے نفس کی تہ تک جم جائیں۔ اور اس قسم کی دوسری چیزیں جو اس کو سماحت سے دور کر دیں۔ اور سماحت کے معنی ہیں: نفس کا ایسا ہو جانا کہ وہ قوت بہیمی کی خواہشات کی اطاعت نہ کرے۔

(۲) آدمی ہر وقت نجاستوں میں لت پت رہے اور اللہ تعالیٰ کے سامنے متکبر ہو جائے۔ نہ تو کبھی اس کو جاننے کی کوشش کرے، اور نہ کبھی اس کے سامنے عجز وانکساری کرے۔ اور اس قسم کی دوسری باتیں جو اس کو احسان سے دور کر دیں۔ اور احسان (نکو کردن) کے معنی ہیں: ہر کام اخلاص سے کرنا یعنی اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لئے کرنا۔

(۳) آدمی کا رویہ اعانت حق کے سلسلہ میں، امر الٰہی کی تعظیم کے بارے میں، بعثت انبیاء کے معاملہ میں اور پسندیدہ نظام کے قیام کے سلسلہ میں مرضی خداوندی کے خلاف ہو جائے۔ یعنی بجائے اس کے کہ حق کی اعانت کرے اس سے عداوت رکھنے لگے۔ اور بجائے اس کے کہ اوامر الٰہی کی تعظیم وتوقیر کرے اور ان کو بجا لائے، ان کی تحقیر ومخالفت کرنے لگے اور ان کے خلاف عمل کرنے لگے اور بجائے اس کے کہ انبیاء کے کاز کو تقویت پہنچائے، لوگوں کو اللہ کی راہ سے روکنے لگے اور بجائے اس کے کہ نظام اسلامی کو دنیا میں پھیلائے، اس کے راستہ کا روڑا بن جائے، جس کی وجہ سے ملأ اعلیٰ کی نفرتیں اور لعنتیں اس پر برسنے لگیں۔

اور موافق کیفیات درج ذیل ہیں:

(۱) آدمی ایسے کام کرنے لگے جن سے طہارت اور حضور خداوندی میں عجز وانکساری پیدا ہو، ملائکہ کے حالات یاد آئیں اور ایسے عقائد کی راہ ملے جن کی وجہ سے انسان حیات دنیوی پر مطمئن نہ ہو بیٹھے۔

(۲) آدمی نرم روی ہو جائے، سخت گیری سے کام نہ لے، کیونکہ نرمی سے کام سنورتے ہیں، اور سختی سے کام بگڑتے ہیں۔ حدیث شریف میں ہے کہ: ”تم زمین والوں پر مہربانی کرو، تم پر آسمان والا مہربانی کرے گا“ اور حدیث میں ہے کہ: ”اللہ تعالیٰ نرم برتاؤ کرنے والے ہیں اور نرم برتاؤ کو پسند کرتے ہیں اور نرم برتاؤ پر وہ چیز عطا فرماتے ہیں جو نہ تو سخت برتاؤ پر عطا فرماتے ہیں، نہ کسی اور چیز پر“ (رواہ مسلم، مشکوٰۃ صفحہ ۴۲۱ باب الرفق والحیاء)

(۳) آدمی ایسا پاکباز بن جائے کہ ملأ اعلیٰ کی دعائیں اور ان کی خاص توجہات، جو نظام خیر کے لئے مخصوص ہیں، اس کو نصیب ہوں۔

واعلم أن الملكية عند غوصها في البهيمية، وامتزاجها بها، لا بد أن تذعن لها إذعانا ما وتتأثر منها أثرا ما؛ لكن الضار كل الضرر أن تتشبح فيها هيئات منافرة في الغاية، والنافع كل النفع أن تتشبح فيها هيئات مناسبة في الغاية.

فمن المنافرات: أن يكون قوي التعلق بالمال والأهل، لا يستيقن أن وراءهما مطلوبا، قوي الإمساك للهيئات الدنية في جذر جوهرها، ونحو ذلك مما يجمعه أنه على الطرف المقابل للسماحة، وأن يكون متلبسا بالنجاسات، مكبرا على الله، لم يعرفه، ولم يخضع له يوما، ونحو ذلك مما يجمعه أنه على الطرف المقابل للإحسان، وأن يكون ناقض ترجه حظيرة القدس في نصر الحق، وتنويه أمره، وبعثة الأنبياء، وإقامة النظام المرضي، فأصيب منهم بالبغضاء واللعن.

ومن المناسبات: مباشرة أعمال تحاكي الطهارة والخضوع للباري، وتذكر حال الملائكة، وعقائد تنزعها من الاطمئنان بالحياة الدنيا، وأن يكون سمحا سهلا، وأن ينعطف عليه أدعية الملأ الأعلى، وتوجهاتهم للنظام المرضي، والله أعلم

ترجمہ: اور جان لیں کہ جب ملکیت، بہیمیت میں غوطہ لگاتی ہے اور اس کے ساتھ رل مل جاتی ہے، تو ضروری ہے کہ وہ بہیمیت کی کچھ نہ کچھ تابعداری کرے، اور اس سے کچھ نہ کچھ متاثر ہو (لیکن اتنی مقدار میں اثر قبول کرنا مضر نہیں) البتہ نہایت ضرر رساں امر یہ ہے کہ ملکیت میں ایسی ہیئتیں متشکل ہوں، جو نہایت درجہ اس سے بے جوڑ ہوں، اور نہایت نافع امر یہ ہے کہ اس میں ایسی ہیئتیں متشکل ہوں جو نہایت درجہ اس سے ہم آہنگ ہوں۔

پس ناموافق ہیئتوں میں سے یہ بات ہے کہ (۱) آدمی کا مال اور آل سے اس قدر مضبوط تعلق ہو جائے کہ اس کو یقین ہی نہ رہے کہ ان دونوں کے سوا کوئی اور مقصود بھی ہے، وہ مضبوطی سے تھامنے والا ہو اپنی ذات کی جڑ میں رذیل ہیئتوں کو، اور اسی قسم کی دوسری چیزیں، ان چیزوں میں سے جو انسان کو اکٹھا کرتی ہیں کہ وہ سماحت کی مقابل جانب پر ہے (۲) اور یہ کہ وہ نجاستوں میں ملوث ہونے والا، اللہ تعالیٰ کے سامنے اکڑنے والا ہو، وہ نہ اللہ تعالیٰ کو پہچانتا ہو، اور نہ اس نے کسی دن اللہ تعالیٰ کے حضور میں عجز وانکساری کی ہو، اور اس کے مانند دوسری چیزیں ان چیزوں میں سے جو اس کو اکٹھا کرتی ہیں کہ وہ احسان کی مقابل جانب پر ہے (۳) اور یہ کہ وہ دین حق کی مدد میں، دین حق کے معاملہ کو بلند شان بنانے میں، انبیاء کی بعثت میں اور پسندیدہ نظام (نظام اسلامی) کو برپا کرنے میں حظیرۃ القدس کی توجہ کو توڑنے والا ہو، پس وہ ملأ اعلیٰ کی طرف سے نفرت اور لعنت پہنچایا گیا ہو۔

اور موافق سببوں میں سے: (۱) ایسے کاموں کا کرنا ہے جو پاکی اور اللہ تعالیٰ کے لئے انکساری کے مظنہ ہوں اور ملائکہ کی حالت کو یاد دلانے والے ہوں (۲) اور ایسے عقیدے ہیں جو اس کو نچلی زندگی پر مطمئن ہونے سے ہٹائیں (۳) اور یہ کہ وہ زمرۂ خواص سے مربوط ہو (۴) اور یہ کہ ملائکہ کی دعائیں اور ان کی پسندیدگی اور نظام کے لئے مخصوص توجہات اس پر نازل ہوں۔ واللہ اعلم

لغات و ترکیب:

غاص یغوص غوصا: پانی میں غوطہ لگانا۔ امتزج بہ: ملنا۔ اذعن لہ: مطیع ہونا، فرمانبردار ہونا، فروتنی کرنا، اذعن بالحق: اقرار کرنا۔ نوّہ تنویھا الشیئ: بلند کرنا۔ حاکی محاکاۃ: مشابہ ہونا۔ تذکر کا عطف تعمل پر ہے۔ عقائد کا عطف مباشرۃ پر ہے۔

باب — ۳

برزخی مجازات میں لوگوں کے مختلف احوال

لغت میں برزخ کے معنی ہیں: دو چیزوں کے درمیان کی روک۔ سورۃ الرحمٰن آیت ۲۰ اور سورۃ الفرقان آیت ۵۳ میں شیریں اور شور دریاؤں کے درمیان کے حجاب کو برزخ کہا گیا ہے۔ اور اصطلاحِ شریعت میں برزخ کے معنی ہیں: مرنے کے وقت سے دوبارہ اٹھنے تک کا زمانہ۔ سورۃ المؤمنون آیت ۱۰۰ میں برزخ کا لفظ اسی معنی میں آیا ہے۔

عالمِ برزخ کو عالمِ قبر اور قبری زندگی بھی کہتے ہیں۔ شریعت کی اصطلاح میں قبر صرف مٹی کے گڑھے کا نام نہیں، بلکہ وہ ایک پوری دنیا (زندگی) ہے، اور جو بھی مرتا ہے وہ عالمِ قبر میں پہنچ جاتا ہے، خواہ وہ مٹی کے گڑھے میں دفن کیا جائے یا نہ کیا جائے۔ کیونکہ مرکر انسان ختم نہیں ہوجاتا، بلکہ اس کا انتقال ہوجاتا ہے یعنی وہ اس دنیا سے دوسری دنیا میں منتقل ہوجاتا ہے۔ اور لاش (جسم) جو رہ جاتی ہے، وہ لاشی (کچھ بھی نہیں) ہوتا ہے۔ پس انسان یہاں سے جو اعمال کرکے گیا ہے اسی کو برزخی زندگی میں بھگتتا ہے۔ اور اس دنیا میں اعمال کے اعتبار سے لوگوں کے احوال اس قدر مختلف ہیں کہ ان کو شمار نہیں کیا جاسکتا، پس عالمِ برزخ میں مجازات بھی مختلف طرح سے ہوگی۔ بلکہ جتنے انسان ہیں، مجازات کی بھی اتنی ہی صورتیں ہوں گی۔ مگر مختلف چیزوں کو بھی بعض اعتبارات سے سمیٹا جاسکتا ہے۔ دارالعلوم دیوبند میں تین ہزار طلبہ ہیں، ان کو جماعتوں کے اعتبار سے یا صوبوں کے لحاظ سے سمیٹا جاسکتا ہے۔ اسی طرح اس دنیا میں اعمال کے اعتبار سے جو انسانوں کی بے شمار قسمیں ہیں، ان کو اگر سمیٹا جائے تو ان کی بڑی قسمیں چار نکلتی ہیں۔ اور عالمِ برزخ میں ان کو مجازات بھی چار طرح سے ہوگی۔ تفصیل درج ذیل ہے:

(تذکر الباری عز اسمه دائما سرمدا اھ سندی) یعنی آدمی کوئی بھی کام کرے کسی بھی حال میں رہے خدا کی یاد دل سے نہ جائے، ہمیشہ خدا اور اس کے احکام کو مدنظر رکھے اور زبان سے یا اپنے افعال سے اللہ کو یاد کرتا رہے۔

اور اگر کوئی یہ سوال کرے کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ آدمی بیک وقت دو کام کرے، دنیوی کام بھی انجام دے اور ساتھ ہی خدا کی یاد بھی دل میں قائم رکھے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ بالکل ممکن ہے، عاشق کے دل میں ہر حال میں معشوق بسا رہتا ہے اور حسی مثال یہ ہے کہ سائیکل چلانے والا جب چلتے چلتے کسی سے باتیں کرتا ہے تو وہ باتوں کی طرف بھی متوجہ ہوتا ہے اور سائیکل کا توازن قائم رکھنے کی طرف بھی اس کا دھیان رہتا ہے — یہ بات اگرچہ شروع شروع میں کچھ مشکل نظر آتی ہے مگر بعد میں جب عادت ثانیہ بن جاتی ہے تو سوتے ہوئے بھی ذکر جاری رہتا ہے۔

(۷) یہ رحمت خداوندی کا نور بھی ہوسکتا ہے یعنی اعمال صالحہ کرنے پر بندے کی طرف جو رحمت خداوندی متوجہ ہوتی ہے اس کا نور بھی ہوسکتا ہے

نوٹ: بیدار قلب اور موافق وناموافق کیفیات کا بیان گذشتہ باب میں گذر چکا ہے۔

﴿باب اختلاف أحوال الناس في البرزخ﴾

اعلم أن الناس في هذا العالم على طبقات شتى، لا يرجى إحصاؤها، لكن رءوس الأصناف أربعة:

[۱] صنف هم أهل اليقظة، وأولئك يُعذَّبون ويتنعمون بأنفس تلك الملائمات والمنافرات، وإلى حال هذا الصنف وقعت الإشارة في قوله تعالى: ﴿أَنْ تَقُوْلَ نَفْسٌ يٰحَسْرَتٰى عَلٰى مَا فَرَّطْتُّ فِيْ جَنْبِ اللّٰهِ، وَإِنْ كُنْتُ لَمِنَ السّٰخِرِيْنَ﴾

ورأيتُ طائفة من أهل السنة صارت نفوسهم بمنزلة الجوابي المملوءة ماءً راكدًا، لا تُهَيِّجُهُ الرياح، فضربها ضوء الشمس في الهاجرة، فصارت بمنزلة قطعة من النور، وذلك النور: إما نور الأعمال المرضية، أو نور ياد داشت، أو نور الرحمة.

ترجمہ: برزخ میں (بسلسلۂ مجازات) لوگوں کے احوال کے مختلف ہونے کا بیان: جان لیں کہ اس دنیا میں لوگ (باعتبار احوال) اس قدر مختلف درجات میں ہیں کہ ان کو شمار نہیں کیا جا سکتا، البتہ بڑی قسمیں چار ہیں۔

(۱) ایک قسم: وہ بیداری والے ہیں، اور یہ لوگ سزا دیے جائیں گے اور راحت پہنچائے جائیں گے انہی ناموافق وموافق کیفیات کی وجہ سے (جن کا بیان گذشتہ باب کے آخر میں آیا ہے) اور اسی قسم کی طرف اشارہ ہے ارشاد باری تعالیٰ میں کہ مرنے کے بعد "کہیں کوئی شخص کہنے لگے کہ ہائے افسوس! اس کوتاہی پر جو میں نے اللہ کے پہلو میں روا رکھی، اور یقیناً میں ٹھٹھا کرنے والوں میں سے تھا!"

اور میں نے اہل اللہ کی ایک جماعت کو (کشف میں) دیکھا: ان کی ارواح ان ٹکڑوں جیسی ہوتی ہیں جو ٹھہرے ہوئے پانی سے لبالب بھرے ہوئے ہوں، جن میں ہوائیں بھی ہیجان نہ پیدا کرتی ہوں، جب دوپہر میں ان پر سورج کی کرنیں پڑتی ہیں تو وہ حضرت نور کے ایک ٹکڑے کی طرح ہو جاتے ہیں ——— اور وہ نور یا تو پسندیدہ اعمال کا نور ہے، یا نسبت یادداشت کا نور ہے یا رحمت خداوندی کا نور ہے۔

دوسری قسم

خوابیدہ طبیعت لوگوں کی مجازات

جو لوگ صلاحیتوں کے اعتبار سے تو پہلی قسم کے لوگوں کے لگ بھگ ہوتے ہیں، مگر وہ فطری طور پر خوابیدہ طبیعت ہوتے ہیں (جس کی تفصیل گذشتہ باب کے آخر میں گزر چکی ہے) ان لوگوں کو عالم برزخ میں مجازات بصورت "خواب" ہوتی ہے، مثلاً درندہ صفت آدمی عالم برزخ میں دیکھتا ہے کہ اس کو درندہ پھاڑ رہا ہے، اور بخیل آدمی دیکھتا ہے کہ اس کو سانپ بچھو ڈس رہے ہیں، اور بالائی عوالم کا نزول ایسے فرشتوں کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے جو اس سے سوال کرتے ہیں کہ تیرا رب کون ہے؟ تیرا دین کیا ہے؟ اور آنحضور ﷺ کی زیارت کرا کر دریافت کرتے ہیں کہ اس ہستی کے بارے میں تو کیا کہتا ہے؟

غرض یہ لوگ بصورت خواب معذب ہوتے ہیں، مگر عالم برزخ میں ان کو جو خواب نظر آتا ہے وہ صرف خواب کی صورت ہوتی ہے، حقیقۃً خواب نہیں ہوتا، بلکہ عالم قبر ہی میں مجازات ہوتی ہے، کیونکہ خواب کی حقیقت اس دنیا میں یہ ہے کہ ہماری قوت خیالیہ میں جو معلومات جمع ہوتی ہیں، وہی نیند کی حالت میں نظروں کے سامنے آتی ہیں اور متشکل ہو کر نظر آتی ہیں، جب تک ہوائی جہاز نہیں بنا تھا کسی نے خواب میں ہوائی جہاز اڑتے نہیں دیکھا تھا، کیونکہ اس وقت لوگوں کے خزانۂ معلومات میں اس کی صورت نہیں تھی۔

غرض خواب: خیالات (حدیث النفس) ہیں۔ اور یہ خیالات بیداری میں بھی آتے ہیں، مگر بیداری کی حالت میں چونکہ حواس خمسہ ظاہرہ اپنے کاموں میں مشغول ہوتے ہیں: کان کچھ سنتے ہیں، آنکھیں کچھ دیکھتی ہیں، وقس علیٰ ہذا، اور ان سب چیزوں کا ادراک حس مشترک کرتی ہے، اسی طرح قوت متصرفہ کی کرشمہ سازی سے جو خیالات پیدا ہوتے ہیں ان کا ادراک بھی حس مشترک کرتی ہے، اس وجہ سے حس مشترک ان خیالات میں پوری طرح سے مستغرق نہیں ہوتی، نیز بیداری میں یہ خیال بھی مستحضر رہتا ہے کہ میں جو کچھ سوچ رہا ہوں وہ محض خیالات ہیں، اس وجہ سے وہ خیالات بیداری کی حالت میں متشکل ہو کر نگاہوں کے سامنے نہیں آتے، مگر جب آدمی سو جاتا ہے تو حواس اپنا کام چھوڑ دیتے ہیں اور قوت متصرفہ جو خیالات پیدا کی

في رؤياه: أنها لم تكن أشياء خارجية، وأن التوجع والتنعم لم يكن في العالم الخارجي؛ ولولا يقظة لم ينتبه لهذا السر. فعسى أن يكون تسمية هذا العالم عالما خارجيا أحق وأفصح من تسميته بالرؤيا، فربما يرى صاحب السبعية أنه يخدشه سبع، وصاحب البخل أنه تنهشه حيات وعقارب، ويشبح نزول العلوم الفرقانية بملكين يسألانه: من ربك؟ وما دينك؟ وما قولك في النبي صلى الله عليه وسلم؟

ترجمہ: (۲) اور ایک (اور) قسم، جو صلاحیت میں پہلی قسم کے لوگوں کے قریب قریب ہیں، یعنی وہ فطری نیند والے ہیں، پس ان لوگوں کو خواب دکھائی دیتے ہیں — اور خواب کی حقیقت ہمارے اندر حس مشترک میں ابھرے ہوئے علوم کا ہمارے سامنے حاضر ہوتا ہے، بیداری کی حالت میں ان علوم میں مستغرق ہونے سے، اور ان کے خیالات ہونے سے بے ہوش (بے خبر) ہونے سے ناشی ہوتی تھی، پھر جب آدمی سو جاتا ہے تو اس کو اس میں کوئی تردد نہیں رہتا کہ نظر آنے والی وہ صورتیں حقیقۃً وہی صورتیں ہیں جن کی وہ صورتیں ہیں۔

اور صفراوی مزاج بھی (خواب میں) دیکھتا ہے کہ وہ گرمی اور لو کے موسم کے دن میں کسی خشک بیابان میں ہے، پھر دریں اثنا کہ وہ اسی طرح ہوتا ہے، اچانک ہر چہار طرف سے اس کو آگ گھیر لیتی ہے، پس وہ ادھر ادھر بھاگنے لگتا ہے، مگر اسے بھاگ نکلنے کی کوئی جگہ نہیں ملتی، پھر آگ اس کو جلا ڈالتی ہے اور وہ اس سے سخت ترین تکلیف محسوس کرتا ہے — اور بلغمی مزاج آدمی بھی (خواب میں) دیکھتا ہے کہ وہ موسم سرما کی رات میں ٹھنڈی ندی میں سخت سرد ہوا میں ہے، پس موجیں اس کی کشتی کو مضطرب کرتی ہیں، پس وہ ادھر ادھر بھاگنے لگتا ہے، مگر اسے بھاگ نکلنے کی کوئی جگہ نہیں ملتی، پھر وہ ڈوب جاتا ہے اور وہ اس سے سخت ترین تکلیف محسوس کرتا ہے — اور اگر آپ لوگوں کا جائزہ لیں تو آپ کسی کو بھی نہیں پائیں گے مگر اس حال میں کہ اس نے ذاتی تجربہ کیا ہوگا نفس میں اٹھنے والے واقعات کے متشکل ہونے کا، ایسی راحت انگیز اور دردناک صورتوں میں، جو ان واقعات سے اور خواب دیکھنے والے شخص سے، دونوں ہی سے مناسبت رکھنے والی ہیں۔

پس یہ شخص خواب میں معذب ہے، علاوہ ازیں کہ وہ ایسا خواب ہے جس سے وہ شخص قیامت تک بیدار نہیں ہوگا، اور (دنیا میں) خواب دیکھنے والا دوران خواب یہ نہیں جانتا کہ وہ چیزیں جو وہ دیکھ رہا ہے ان کا خارج میں وجود نہیں، اور نہ وہ یہ جانتا ہے کہ یہ تکلیف وراحت عالم خارجی میں موجود نہیں۔ اور اگر وہ شخص بیدار نہ ہوتو وہ اس راز سے کبھی بھی واقف نہ ہوگا، پس شاید عالم برزخ (کے خواب) کو عالم خارجی نام دینا زیادہ قابل قبول ہو، اس کو خواب کہنے سے، اور زیادہ اچھی طرح سے مراد کو ظاہر کرنے والا ہو — پس درندہ خصلت آدمی بھی (عالم برزخ میں) دیکھتا ہے کہ اس کو کوئی درندہ نوچ رہا ہے، اور بخیل آدمی دیکھتا ہے کہ اس کو سانپ بچھو ڈس رہے ہیں۔ اور ملائی علوم کا نزول ایسے دو فرشتوں کی شکل

میں متشکل ہوتا ہے جو اس سے پوچھتے ہیں کہ تیرا رب کون ہے؟ اور تیرا دین کیا ہے؟ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں تو کیا کہتا ہے؟

لغات:

المَسْكَة: پانی روکنے کا بند، بندش، جمع مَسَك، امساك (ک) مَسَكَه تمسيكًا: مشکیزہ کا پانی ڈور سے بند کر دینا... فَعَل (ن) فَعولا: ہوش میں ہونا۔ الغيضة: جھاڑی، جنگل۔ خَمَش (ف) النار: جھلس دینا۔ خَدَشَه (ض) خَدْشًا: خراش لگانا۔ نَهَشه (ف، س) نَهْشًا: اگلے دانتوں سے کاٹنا، دانت سے کاٹ کر نشان لگانا۔

تشریح:

(۱) معلومات حس مشترک کے خزانہ میں یعنی خیال میں بھری ہوئی ہوتی ہیں، حس مشترک کا کام حواس ظاہرہ کی حاصل کی ہوئی صورتوں کو قبول کرنا ہے، پھر جب محسوسات حواس ظاہرہ کے سامنے سے غائب ہو جاتے ہیں تو حس مشترک ان کی صورتوں کو اپنے خزانہ میں جمع کر دیتا ہے تاکہ بوقت ضرورت کام آئیں اور حس مشترک کے خزانہ کا نام "خیال" ہے۔ مزید تفصیل معین اللغۃ ص ۱۴۳ میں دیکھیں۔

(۲) عينُ ما هي صُوَرُها یعنی خیالات ان چیزوں کا عین ہیں جن کی وہ صورتیں ہیں۔ مثلاً خواب میں اپنی بھینسوں کا خیال آتا ہے تو وہ خیال متشکل ہو کر سامنے آتا ہے اور آدمی خواب میں ان کو خیالات نہیں سمجھتا بلکہ اپنی واقعی بھینسیں سمجھتا ہے۔

(۳) صفراء مؤنث اصفر کا، پتہ جو ایک خلط ہے، جس کی زیادتی سے یرقان ہوتا ہے۔

(۴) المجتمعة اسم مفعول ہے، یعنی خیال میں اکٹھا حوادث۔

(۵) هذا المعنٰى في الرؤيا مبتدا خبر ہیں، جیسے هذا المال لزيد۔ في الرؤيا متعلق عام كائنٌ یا ثابتٌ سے متعلق ہو کر خبر ہے یہ ترکیب مولانا سندھی رحمہ اللہ نے کی ہے اور اسی ترکیب کو پیش نظر رکھ کر اوپر مطلب بیان کیا گیا ہے۔

(۶) اشباه خارجية تمام نسخوں میں أسماء خارجية ہے، مگر یہ تصحیف ہے، صحیح لفظ أشباه ہے۔ یہ تصحیح بھی مولانا سندھی رحمہ اللہ نے کی ہے۔ اور تینوں مخطوطوں میں بھی ایسا ہی ہے۔

(۷) نزول العلوم تمام نسخوں میں زوال العلوم ہے مگر یہ بھی تصحیف ہے، صحیح لفظ نزول ہے اور یہ تصحیح بھی حضرت علامہ عبید اللہ سندھی رحمہ اللہ نے کی ہے اور اتنی اہم تصحیح ہے کہ شاید کوئی دوسرا شخص نہ کر سکے اور مخطوطہ کراچی اور مخطوطہ پٹنہ میں بھی یہی ہے۔ فالحمد للہ علی ذلک۔

نزول العلوم کا مطلب یہ ہے کہ اس دنیا میں اللہ تعالیٰ نے آسمان سے دین نازل کیا ہے اور علوم وہبیہ کا فیضان کیا ہے

تاکہ لوگ ان کے ذریعہ عالم بالا کا یقین کریں اس لئے عالم برزخ میں وہیں پہنچتے ہی امتحان داخلہ ہوتا ہے اور تین بنیادی باتیں دریافت کی جاتی ہیں، جن پر نجات کا مدار ہے یہ سوالات یہ جاننے کے لئے کئے جاتے ہیں کہ میت ان بنیادی باتوں کا علم دنیا سے لے کر آئی ہے یا خالی ہاتھ آئی ہے۔ کیونکہ بعد میں تو یہ سب علوم عالم بالا سے نازل ہونے والے ہی ہیں مگر ان کی وجہ سے نجات نہیں ہو سکتی۔ سورۂ یونس آیت ۹۱ میں فرعون کے قصہ میں ہے ﴿آٰلْـٰٔنَ وَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ وَكُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ﴾ ترجمہ: اب ایمان لاتا ہے! اور (معاینۂ آخرت سے) پہلے سرکشی کرتا رہا، اور مفسدوں میں داخل رہا (اب نجات چاہتا ہے!) یہ بات کیسے ممکن ہے!

تیسری قسم

کمزور قوت ملکیہ اور بہیمیہ والوں کی مجازات

جن لوگوں کی قوت بہیمیہ اور قوت ملکیہ دونوں کمزور ہوتی ہیں، وہ اگر نیک لوگ ہوتے ہیں تو مرنے کے بعد ملائکہ سافلہ کے ساتھ مل جاتے ہیں، اور اس ملنے پر جو خوشی ہوتی ہے، وہی ان کے اعمال صالحہ کی جزاء ہے۔ ارشاد ربانی ہے ﴿فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ﴾ پس تو میرے (خاص) بندوں میں شامل ہو جا (یہ بھی نعمت روحانی ہے) اور حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو آنحضور ﷺ نے ایک جو دعا سکھلائی ہے اس کا ایک جزء ہے: أَنْتَ وَلِيِّيْ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ، تَوَفَّنِيْ مُسْلِمًا وَأَلْحِقْنِيْ بِالصَّالِحِيْنَ (مسند احمد ۵:۱۹۱) ترجمہ: آپ ہی میرے کارساز ہیں دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی، مجھے بحالت ایمان واطاعت موت دیجئے اور مجھے نیک لوگوں کے ساتھ ملا دیجئے ـــــ اس دعا میں بھی اسی الحاق کی طرف اشارہ ہے۔

اور اگر وہ برے لوگ ہوتے ہیں تو مرنے کے بعد شیاطین کے ساتھ مل جاتے ہیں، اور اس ملنے پر جو گھٹن اور غم وغصہ ہوتا ہے وہی ان کے اعمال سیئہ کی سزا ہے۔ سورۃ النساء آیت ۳۸ میں ہے ﴿وَمَنْ يَّكُنِ الشَّيْطٰنُ لَهٗ قَرِيْنًا فَسَآءَ قَرِيْنًا﴾ (اور شیطان جس کا مصاحب ہو، اس کا وہ برا مصاحب ہے) یہ مصاحبت عام ہے دنیا میں بھی ہوتی ہے اور موت کے بعد بھی۔ اور یہ لحاق فطری اسباب سے بھی ہوتا ہے اور اکتسابی اسباب سے بھی، جس کی تفصیل درج ذیل ہے:

ملائکہ سے ملانے والے فطری اسباب: قوت ملکیہ کا قوت بہیمیہ میں کم سے کم ڈوبنا، اس کی ناہمواری نہ کرنا اور اس سے متاثر نہ ہونا۔

ملائکہ سے ملانے والے اکتسابی اسباب: ہمیشہ ذہن سے پاکیزگی کے ساتھ متصف رہنا، اور اعمال واذکار کے ذریعہ نفس میں ملکوتی الہامات اور انوار کی قابلیت پیدا کرنا۔

شیاطین سے ملانے والے فطری اسباب: مزاج کا ایسا بگڑ جانا کہ وہ ایسی باتوں کو چاہے جو حق کے برخلاف اور مفادِ کلی سے متضاد ہوں اور مکارمِ اخلاق سے کوسوں دور ہوں۔

شیاطین سے ملانے والے اکتسابی اسباب: خسیس ہیکلوں اور فاسد خیالات کے ساتھ مخلص رہنا، شیاطین کے وسوسوں کی تابعداری کرنا اور لعنت کا ان کو گھیر لینا۔

مثال سے وضاحت: کبھی انسان لڑکے کی صورت میں پیدا ہوتا ہے مگر اس کے مزاج میں کھلنڈراپن اور زنانی حرکات کی طرف میلان ہوتا ہے مگر بچپن میں زنانی اور مردانی خواہشات ممتاز نہیں ہوتیں، کیونکہ اس وقت کھیل کود اور کھانے پینے سے فرصت نہیں ہوتی، اس بچہ کو جس روش پر چلنے کا حکم دیا جاتا ہے چلتا رہتا ہے، مگر جب وہ جوان ہوتا ہے اور وہ اپنی لااُبالی فطرت کی طرف لوٹتا ہے تو وہ زنانہ لباس پہن لیتا ہے اور عورتوں کی سی عادتیں بنا لیتا ہے اور اس میں مفعولیت کی خواہش پیدا ہوجاتی ہے۔ اس وقت وہ مردوں کے زمرے سے نکل کر عورتوں میں شامل ہوجاتا ہے۔

اسی طرح انسان جب تک زندہ رہتا ہے دنیوی زندگی کے جھمیلوں میں گھرا رہتا ہے، مگر اس میں صلاحیتیں ملأ سافل جیسی ہوتی ہیں، وہ ان کی طرف بہت زیادہ کشش رکھتا ہے یا وہ شیطان صفت ہوتا ہے، اس کو شیاطین سے بے حد مناسبت ہوتی ہے اس لئے جب وہ مرجاتا ہے اور موانع مرتفع ہوجاتے ہیں تو وہ اپنی فطرت کی طرف لوٹ جاتا ہے، اگر وہ نیک ہوتا ہے تو فرشتوں کے ساتھ مل جاتا ہے اور اس کو ملائکہ جیسے الہامات ہونے لگتے ہیں اور وہ ان کاموں میں لگ جاتا ہے جو فرشتے کرتے ہیں اور بدکردار ہوتا ہے تو شیاطین کے ساتھ مل جاتا ہے۔ حدیث شریف میں حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ کا جنت میں فرشتوں کے ساتھ اڑنا مروی ہے۔ یہ حدیث ترمذی طبرانی اور حاکم وغیرہ نے روایت کی ہے اور مشکوۃ شریف باب مناقب اہل بیت، فصل ثانی حدیث نمبر ۶۱۵۳ پر مذکور ہے۔ یہ روایت حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کے ملأ اعلیٰ کے ساتھ ملنے کی طرف مشیر ہے۔ اور تقابل سے دوسری قسم کے لوگوں کا شیاطین کے ساتھ ملنا مفہوم ہوتا ہے۔

ملائکہ سے ملنے والوں کے بعض احوال:

(۱) کبھی وہ لوگ اعلائے کلمۃ اللہ میں، اور حزب اللہ کی مدد کرنے میں مشغول ہوتے ہیں: مولانا عبدالحق صاحب حقانی دہلوی رحمہ اللہ نے عمدۃ البیان ترجمہ حجۃ اللہ البالغہ (ص ۱۱۱) میں لکھا ہے کہ جب روم اور روس میں سیواستوپول کے قلعہ پر لڑائی ہوئی تو بہت سے اہل اللہ نے تہجد کے وقت مسجد نبوی میں آنحضرت ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کو تیر مارتے دیکھا، چنانچہ اسی روز صبح کو لشکر اسلام غالب آیا۔

(۲) کبھی وہ کسی انسان کو کچھ خیر پہنچاتے ہیں: بہت سے واقعات مروی ہیں کہ آڑے وقت میں کوئی نیک بندہ جو دنیا سے گزر چکا ہے ظاہر ہوتا ہے اور مدد کرتا ہے۔

(۳) کبھی ان میں سے کوئی بندہ صورت جسمانی کا بے حد مشتاق ہوتا ہے اور یہ اشتیاق فطری ہوتا ہے پس عالم

مثال کی مدد سے اس کو نورانی جسم ملتا ہے۔

(۴) کبھی ان میں سے کسی کو کھانے وغیرہ کی خواہش ہوتی ہے تو ان کا یہ شوق بھی پورا کیا جاتا ہے۔ سورۃ آل عمران آیات ۱۶۹-۱۷۱ میں شہداء کے بارے میں ہے کہ وہ ان کے پروردگار کے پاس روزی دیئے جاتے ہیں اور وہ اس پر خوش ہوتے ہیں جو ان کو اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے عطا فرماتے ہیں اور مسلم شریف میں اس آیت کی تفسیر میں مروی ہے کہ شہداء کی روحیں ہرے پرندوں کے پیٹوں میں رہتی ہیں، وہ جنت میں جہاں چاہتی ہیں چرتی چگتی ہیں اور وہ عرش سے بندھی ہوئی فانوسوں میں بسیرا کرتی ہیں (مشکوۃ کتاب الجہاد حدیث نمبر ۳۸۰۴)

شیاطین سے ملنے والوں کے بعض احوال:

(۱) وہ ظلمانی (تاریک، سیاہ) لباس پہنائے جاتے ہیں۔

(۲) ان کے لئے ایسی چیزیں متشکل کی جاتی ہیں جن سے وہ خسیس لذتوں میں سے بعض حاجت پوری کرتے ہیں جیسے جہنمیوں کو زقوم، پیپ اور لہو کھانے کو دیا جائے گا اور حمیم پینے کو، اسی طرح عالم برزخ میں بھی گندی غذا رسانی کی جاتی ہے۔

[۳] وصنف بهيميتهم وملكيتهم ضعيفتان، يلحقون بالملائكة السافلة، لأسباب جبلية: بأن كانت ملكيتهم قليلة الانغماس في البهيمية، غير مذعنة لها، ولا متأثرة منها، وكسبية: بأن لابست الطهارات بداعية قلبية، وتمكنت من نفسها لإلهامات وبوارق ملكية.

فكما أن الإنسان ربما يتخلق في صورة الذكران، وفي مزاجه خنوثة وميل إلى صفات الإناث، لكنه لا يتميز شهوات الأنوثة من شهوات الذكورة في الصبا، إنما الهمُّ حينئذ شهوة الطعام والشراب وحب اللعب، فيجري حسبما يؤمر به من تقوشُم بسمت الرجال، ويمتنع عما يُنهى عنه من اختيار زيّ النساء، حتى إذا شبّ ورجع إلى طبيعته الماجنة، امتنّ باختيار زيّهن، والتعوّد بعاداتهن، وغلبت عليه شهوة الأُبنة، وفعل ما يفعله النساء، وتكلم بكلامهن، وسمّى نفسه تسمية الأنثى: فعند ذلك خرج من حيز الرجال بالكلية.

فكذلك الإنسان قد يكون في حياته الدنيا مشغولاً بشهوة الطعام والشراب والغُلمة وغيرها من مقتضيات الطبيعة والرسم، لكنه قريبُ المأخذ من الملأ السافل، قويُّ الانجذاب إليهم: فإذا مات انقطعت العلاقات، ورجع إلى مزاجه، فلحق بالملائكة وصار منهم، وأُلهم كإلهامهم، وسعى فيما يسعون له؛ وفي الحديث: ﴿رأيتُ جعفر بن أبي طالب ملكاً يطير في الجنة مع الملائكة بجناحين﴾

وربما اشتغل هؤلاء بإعلاء كلمة الله، ونصر حزب الله، وربما كان لهم لمة خير ببني آدم،

وربما اشتاق بعضهم إلى صورة جسدية اشتياقا شديدا، فاشتغل من أصل جبلته، فقرع ذلك بابا من المثال، واختلطت قوة منه بالنسمة الهوائية، وصار كالجسد النوراني؛ وربما اشتاق بعضهم إلى مطعوم ونحوه، فأمد فيما اشتهى، قضاءً لشوقه؛ وإليه الإشارة في قوله تعالى: ﴿وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتًا بَلْ أَحْيَاءٌ عِندَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُونَ، فَرِحِينَ بِمَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِن فَضْلِهِ﴾ الآية.

وبإزاء هؤلاء قوم قريب المأخذ من الشياطين جبلةً: بأن كان مزاجهم فاسدا يستوجب آراءً مناقضةً للحق، منافرةً للرأي الكلي، على طرف شاسع من محاسن الأخلاق؛ أو كسبًا: بأن لابست هيئات خسيسةً، والأفكار فاسدةً، وانقادت لوسوسة الشياطين، وأحاط بهم اللعن؛ فإذا ماتوا لحقوا بالشياطين، وألبسوا لباسًا ظلمانيًا، وصُوِّر لهم ما يقصدون به بعض وطرهم من الملاذّ الخسيسة.

والأول ينعم بحدوث ابتهاج في نفسه، والثاني يعذب بضيق وغم، كالمخنث يعلم أن الخنوثة أسوأ حالات الإنسان، ولكن لا يستطيع الإقلاع عنها.

ترجمہ: (۲) اور ایک (دوسری) قسم جن کی قوت ملکیہ اور قوت بہیمیہ دونوں کمزور ہوتی ہیں۔ وہ لوگ (اگر نیک ہوتے ہیں تو) ملاءِ سافلہ کے ساتھ مل جاتے ہیں فطری اسباب کی بنا پر بایں طور کہ ان کی قوت ملکیہ قوت بہیمیہ میں کم زور ہے والی ہو، بہیمیت کی تابعداری کرنے والی نہ ہو، نہ اس سے متأثر ہونے والی ہو ــــــ اور اکتسابی اسباب کی بنا پر بایں طور کہ نفس کا قلبی تقاضے سے پاکیزگی کے ساتھ تعلق رہا ہو اور آدمی نے اپنے نفس کو انہماکات اور ملکی انوار کے قابل بنایا ہو۔

پس جس طرح یہ بات ہے کہ کبھی انسان مردانی صورت میں پیدا کیا جاتا ہے، اور اس کے مزاج میں نکڑاپن اور عورتوں کے اطوار کی طرف میلان ہوتا ہے، مگر بچپن میں زنانی خواہشات، مردانی خواہشات سے ممتاز نہیں ہوتیں اس وقت اسے چیز کھانے پینے کی خواہش اور کھیل کود کی محبت ہوتی ہے اس لئے وہ بچہ جس طرح مردوں کی روش اپنانے کا حکم دیا جاتا ہے، چلتا رہتا ہے، اور اس کو زنانہ پوشاک اختیار کرنے سے روکا جاتا ہے تو وہ باز رہتا ہے۔ یہاں تک کہ جب وہ جوان ہو جاتا ہے اور وہ اپنی ابتدائی طبیعت کی طرف لوٹ جاتا ہے تو وہ عورتوں کی پوشاک اختیار کرنے میں، اور ان کی عادتیں اپنانے میں خود مختار ہو جاتا ہے، اور اس پر مفعولیت کی خواہش غالب آجاتی ہے اور وہ عورتوں جیسے کام کرنے لگتا ہے، اور ان کے انداز پر بولنے لگتا ہے، اور اپنا نام عورتوں جیسا رکھ لیتا ہے، پس اس وقت وہ مردوں کے زمرے سے بالکل نکل جاتا ہے۔

پس اسی طرح انسان کبھی اپنی دنیوی زندگی میں، کھانے پینے اور شہوت وغیرہ، فطرت و عادت کے تقاضوں میں

مشغول رہتا ہے مگر وہ صلاحیت کے اعتبار سے ملأ سافل کے لگ بھگ ہوتا ہے، اور وہ ان کی طرف بہت زیادہ کشش رکھتا ہے، پس جب وہ مرجاتا ہے تو موانعات مرتفع ہو جاتے ہیں، اور وہ اپنے مزاج کی طرف لوٹ جاتا ہے تو فرشتوں کے ساتھ مل جاتا ہے۔ اور انھیں میں سے ہو جاتا ہے اور انہی جیسا الہام کیا جاتا ہے۔ اور ان کاموں میں لگ جاتا ہے جو وہ فرشتے کرتے ہیں۔ اور حدیث میں آیا ہے کہ نبیﷺ نے جعفر رضی اللہ عنہ کو بصورت فرشتہ، جنت میں فرشتوں کے ساتھ دو پروں سے اڑتے دیکھا ہے۔

اور کبھی یہ لوگ اعلائے کلمۃ اللہ میں اور حزب اللہ (اللہ کی جماعت) کی مدد کرنے میں مشغول ہوتے ہیں، اور کبھی وہ حضرات کسی انسان کو کچھ خیر پہنچاتے ہیں، اور کبھی ان میں سے کوئی صورت جسمانی کا بے حد مشتاق ہوتا ہے، وہ اشتیاق ان کی فطرت کی جڑ سے پیدا ہونے والا ہوتا ہے، تو وہ اشتیاق عالم مثال کا ایک دروازہ کھولتا ہے، اور عالم مثال کی ایک قوت روح ہوائی (نسمہ) کے ساتھ مل جاتی ہے، اور وہ نورانی جسم بن جاتی ہے۔ اور کبھی ان میں سے کوئی کھانے وغیرہ کی خواہش رکھتا ہے، پس اس کے شوق کو پورا کرنے کے لئے اس کی خواہش میں تک پہنچائی جاتی ہے، اور اسی کی طرف اس ارشاد باری میں اشارہ آیا ہے: "اور جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل کئے گئے ان کو مردہ مت خیال کر، بلکہ وہ لوگ زندہ ہیں، ان کے پروردگار کے پاس، روزی دیئے جاتے ہیں، وہ خوش ہوتے ہیں اس چیز سے جو ان کو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے عطا فرمائی ہے" (آخر آیت تک پڑھیے)

اور ان لوگوں کے بالمقابل ایک اور قسم کے لوگ ہیں، جو صلاحیت کے اعتبار سے شیاطین سے لگ بھگ ہوتے ہیں، فطری طور پر، اس طرح کہ ان کا مزاج ایسا فاسد ہوتا ہے، جو ایسی باتیں لازم جانتا ہے جو حق کے برخلاف ہوں، جو رضائے الٰہی سے متضاد ہوں، جو مکارم اخلاق سے کوسوں دور ہوں ——— اور اکتسابی طور پر: اس طرح کہ وہ گندی باتوں سے اور فاسد خیالات سے تعلق رکھتے ہوں اور شیاطین کے وسوسوں کی تابعداری کرتے ہوں اور لعنت نے ان کو گھیر لیا ہو، پس جب وہ مرجاتے ہیں تو شیاطین کے ساتھ مل جاتے ہیں اور وہ ظلمانی (تاریک) لباس پہنائے جاتے ہیں، اور ان کے نے بعض وہ چیزیں متصور کی جاتی ہیں جن کے ذریعہ وہ نفسیں مذکورہ میں سے اپنی حاجات پوری کرتے ہیں۔

اور قسم اول کے لوگ ان کے دل میں نرمی پیدا کرنے کے ذریعہ راحتیں پہنچائے جاتے ہیں، اور قسم دوم کے لوگ گھٹن اور غصہ کے ذریعہ تکلیف پہنچائے جاتے ہیں، جیسے غلام ہوتا ہے کہ جو اپنے آقا کی بدترین حالت سے ڈر کر اس سے باز نہیں آسکتا۔

لغات:

سکن من الشیئ: قدرت دینا، جگہ دینا، جما دینا ... نوّہ به: علامت بنانا، پہچان بنانا ... السمت: راستہ اور اہل خیر وصلاح کی ہیئت، جیسے ما أحسن سمت فلان: فلاں کی حالت کس قدر اچھی ہے ... معن(ن) المجنون:

تحمّل کرتا ہے حیا ہو، صفت ہے جس ۔۔ الأبنة کے اصل معنی ہیں: لاٹھی کی گانٹھ، یعنی عیب، یہاں مراد مفعولیت کی بری عادت ہے ۔ الغلمة: شہوت غلبہ (س) غلما وغلمة واغتلم: شہوت پرست ہونا ..... اللمّة کچھ اثر، جیسے اصابته لمة من الجن یعنی اس کو جنات کا کچھ اثر پہنچا ... ملاذ جمع ملذ کی، بمعنی لذتیں۔

تصحیح: یمتنع عما ینھی اصل میں یمتنع عما ینھی تمتنع عن الشیء کے معنی ہیں رکنا۔ تصحیح مخطوطہ کراچی و پٹنہ سے کی گئی ہے۔

تشریح:

حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ: آنحضور ﷺ کے چچازاد بھائی اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حقیقی بھائی ہیں اور ان سے دس سال بڑے ہیں۔ قدیم الاسلام ہیں، اکتیسویں نمبر پر اسلام قبول کیا ہے۔ پہلے حبشہ کی طرف ہجرت کی تھی۔ آپ ہی کے دست مبارک پر حبشہ کے بادشاہ نجاشی رحمہ اللہ نے اسلام قبول کیا تھا۔ فتح خیبر کے موقعہ پر مدینہ کی طرف ہجرت کی۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آنحضور ﷺ کے بعد افضل الناس حضرت جعفر رضی اللہ عنہ ہیں۔ جمادی الاولی ۸ھ میں ملک شام میں غزوۂ موتہ میں چالیس سال کی عمر میں اسّی سے زیادہ زخم کھا کر شہادت پائی۔ جنگ میں آپ کے دونوں ہاتھ کٹ گئے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے عوض میں دو پر عنایت فرمائے، جن سے جہاں چاہیں اڑ کر تشریف لے جاتے ہیں، اس لئے جعفر طیار کہلاتے ہیں۔ غریبوں کے بہت ہمدرد تھے، حضور ان کو ابو المساکین کہا کرتے تھے۔ آنحضور ﷺ سے اخلاق اور حلیہ میں بہت زیادہ مشابہ تھے۔

چوتھی قسم

قوی بہیمیت اور ضعیف ملکیت والوں کی مجازات

جن لوگوں کی قوت بہیمیہ قوی اور قوت ملکیہ ضعیف ہوتی ہے، اور دونوں قوتوں میں باہم مصالحت وموافقت ہوتی ہے ـــ اور دنیا میں بیشتر لوگ اسی قسم کے ہیں ـــ ان کے کثر معاملات اس دنیا میں نسمہ (روح حیوانی) کے تابع ہوتے ہیں۔ نسمہ کا جسم پر راج ہے، بدن سے اس کا تدبیری تعلق ہے، وہ بدن میں ہر قسم کا تصرف کرتا ہے، اور بدن نے رگ رگ میں سرایت کئے ہوئے ہے۔ اس کا جسم سے اس قدر قوی تعلق ہے کہ موت کے وقت بھی وہ تعلق بالکلیہ ختم نہیں ہوتا، صرف تدبیری طور پر ختم ہوتا ہے۔ اور حواسی اور خیالی تعلق باقی رہتا ہے۔

یہ لوگ جب مرجاتے ہیں تو ان پر دوسری دنیا کی بجلی کی روشنی چمکتی ہے، اور معمولی سے خیالات آنے لگتے ہیں، اور

عالم قبر میں جو جزاء کی شکلیں کبھی خیالی صورتوں میں اور کبھی مثالی صورتوں میں متحقق ہونی شروع ہوتی ہیں۔ اگر دنیا میں ان کا ملکوتی اعمال سے تعلق رہا ہے تو وہ ملکیت کے موافق اعمال بوقت نزع یا قبر میں ایسے خوبصورت فرشتوں کی صورت میں سامنے آتے ہیں، جن کے ہاتھوں میں ریشم ہوتا ہے، وہ نرم لہجے میں بات چیت کرتے ہیں، وہ ایسے خوبصورت ہوتے ہیں کہ ان کی دید ہی جزاء نعمتیں ہوتی ہے، وہ جنت کی طرف ایک دروازہ وا کر دیتے ہیں، جس سے جنت کی خوشبوئیں آنے لگتی ہیں —— اور اگر ان لوگوں کا تعلق ملکیت کے برخلاف کاموں سے رہا ہوتا ہے، یا وہ موجب لعنت کام کرتے رہے ہیں تو یہ ملکیت کے ناموافق اعمال بوقت نزع یا قبر میں ایسے بدنما سیاہ فرشتوں کی صورت میں سامنے آتے ہیں جن کے ہاتھوں میں بدبودار ٹاٹ ہوتا ہے، وہ درشت لہجے میں بات چیت کرتے ہیں، اور ان کی صورت ایسی مکروہ ہوتی ہے کہ ان کی دید ہی بذات خود ایک عذاب ہوتی ہے — الغرض کچھ ملائکہ اسی کام کے لئے ہیں۔ ان کی فطری صلاحیت کا تقاضا ہوتا ہے کہ ان کو ایسے مواقع پر مقرر کیا جائے، اور وہ سزا دہی یا راحت رسانی کا فریضہ انجام دیں۔ ان ملائکہ کو اہل قبور اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں، گو وہ دنیا والوں کو نظر نہ آئیں۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ روح ہوائی (نسمہ) کا بدن سے تدبیری تعلق ہوتا ہے، جیسے بادشاہ کا ملک سے تدبیری تعلق ہے۔ اور روح ہوائی (نسمہ) کی وجہ سے بدن کو تین اختصاصات حاصل ہوتے ہیں یعنی اختصاص تصرف، اختصاص توریث اور اختصاص تزویج، جب تک نسمہ کا بدن سے تدبیری تعلق باقی رہتا ہے، اس کا بدن گلتا سڑتا نہیں، خواہ کتنا ہی عرصہ آدمی بے ہوش رہے، بدن صحیح سلامت رہتا ہے اور اس کے مال کے مالک ورثاء نہیں ہوتے، مال بدستور اس کی ملکیت میں رہتا ہے۔ اور اس کی ازواج سے کوئی نکاح نہیں کر سکتا، وہ بدستور اس کے نکاح میں رہتی ہیں۔ اور جب روح حیوانی بدن سے جدا ہو جاتی ہے تو یہ تینوں اختصاصات ختم ہو جاتے ہیں۔ اس لئے کہ مدبر بدن باقی نہیں رہا۔ بدن سڑنے لگتا ہے، مال کے ورثاء مالک ہو جاتے ہیں اور بیوی عدت کے بعد دوسرے شخص سے نکاح کر سکتی ہے۔ جیسے بادشاہ جب تک موجود ہوتا ہے، ملک پر امن رہتا ہے اور اگر بادشاہ مر جائے اور کوئی اس کا قائم مقام نہ ہو تو ملک کا امن وامان درہم برہم ہو جاتا ہے۔ اسی وجہ سے بادشاہ کی وفات کے بعد پہلے قائم مقام کا اعلان کیا جاتا ہے، پھر بادشاہ کی موت کا اعلان کیا جاتا ہے۔

غرض موت سے نسمہ کا بدن سے تدبیری تعلق ختم ہو جاتا ہے، مگر دوسرا یعنی خیالی تعلق باقی رہتا ہے، جیسے ٹیلیفون کا بے شمار نمبروں سے بیک وقت تعلق ہوتا ہے۔ یہ دوسری تعلق کی مثال ہے، جس کی تفصیل پہلے گذر چکی ہے۔

اس چوتھی قسم کے لوگوں کی پہچان یہ ہے کہ وہ روح اور جسم کو ایک ہی چیز سمجھتے ہیں اگر جسم کو روند جائے یا کاٹا جائے تو وہ یہی خیال کرتے ہیں کہ یہ معاملہ روح کے ساتھ کیا گیا، بلکہ وہ جسم کو اصل سمجھتے ہیں اور روح کو بدن کا تابع سمجھتے ہیں جیسے معتزلہ صفات باری کو عین باری تعالیٰ سمجھتے ہیں، یا روح کو ایک عارضی چیز سمجھتے ہیں، جیسے خوشی غمی انسان کو عارض ہوتی ہے۔ اسی طرح وہ روح کو بھی ایک عرض خیال کرتے ہیں، جو اجسام پر طاری ہوتی ہے۔ اگرچہ وہ زبان سے اس کا دعویٰ

کی تقلید میں یہ معاشرہ کی ریت اور قوم کے مسلمات سے پیش نظر اس کے خلاف کہیں یعنی یہ کہیں کہ انسان درحقیقت روح کا نام ہے، اور بدن تو محض روح کی سواری ہے تو گمان کے دل کی تہ میں وہی عقیدہ ہوتا ہے جو اوپر مذکور ہوا۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ انسان درحقیقت روح کا نام ہے، اور بدن اس روح کی سواری ہے۔ بعض مرتبہ حوادث میں جسم کا کافی حصہ ضائع ہو جاتا ہے مگر آدمی بدستور باقی رہتا ہے، اسی طرح جب آدمی مر جاتا ہے تو لوگ کہتے ہیں کہ گزر گیا حالانکہ جسم گھر میں موجود ہے، جب آدمی کا انتقال ہو گیا یعنی دوسری جگہ منتقل ہو گیا تو یہ جسم کیا ہے؟ لوگ اس کو لاش کہتے ہیں یہ لفظ لاشئ کا مخفف ہے یعنی یہ جسم کچھ بھی نہیں۔

غرض حقیقت حال تو یہ ہے مگر عام لوگ روح اور بدن میں فرق نہیں کرتے، وہ دونوں کو ایک ہی چیز سمجھتے ہیں، یہ سب چوتھی قسم کے لوگ ہیں، اور انہی کی مجازات کا بیان چل رہا ہے۔

اس کے بعد جاننا چاہئے کہ عالم (جہاں) دو ہیں، ایک ہمارا یہ جہاں، جہاں ہم اس وقت ہیں، دوسرا وہ جہاں، جہاں ہم قیامت کے بعد منتقل ہوں گے، جہاں جنت اور جہنم ہیں۔ یہ دونوں جہاں فی الحال موجود ہیں۔ اور ساتھ ساتھ چل رہے ہیں، اور جب دو مکان ہوتے ہیں تو ان کے درمیان حد فاصل بھی ہوتی ہے۔ جس کا نام عالم برزخ اور عالم قبر ہے۔ یہ حد فاصل طرفین کے احکام کا مجموعہ ہوتی ہے، جیسے دھوپ اور سایہ کے درمیان ایک نقطہ اشتراک ہے، جس میں سایہ کے بھی احکام ہوتے ہیں، اور دھوپ کے بھی ــــ نیز حد فاصل کوئی مستقل چیز نہیں ہوتی طرفین کا مجموعہ ہوتی ہے، البتہ طرفین میں سے کسی ایک کے ساتھ اس کا قریبی تعلق ہوتا ہے۔ عالم برزخ کا بھی ہماری اس دنیا سے قریبی تعلق ہے، وہ اسی دنیا کا بقیہ اور ضمیمہ ہے، اس لئے وہاں عالم آخرت کے احکام بہت خفیف ظاہر ہوتے ہیں، جیسے شکم مادر کی زندگی عالم ارواح اور ہمارے اس عالم اجساد کے درمیان ایک برزخی زندگی ہے، مگر شکم مادر کی یہ زندگی عالم ارواح کا بقیہ (آخری حصہ) نہیں ہے، بلکہ ہمارے اس عالم اجساد کا ابتدائی حصہ ہے، اس وجہ سے عالم ارواح کے احکام وہاں بس برائے نام ظاہر ہوتے ہیں، وہاں پورے احکام ہماری اس دنیا کے ظاہر ہوتے ہیں، وہاں جو کچھ ماں کھاتی پیتی ہے، اور جو تکلیف پہنچتی ہے، بچہ بھی سہتی ہے، اس سب کے اچھے برے اثرات جنین پر پڑتے ہیں۔ البتہ یہاں کے پورے احکام وہاں ظاہر نہیں ہوتے، بچہ براہ راست غذا نہیں لے سکتا ــــ اسی طرح عالم برزخ بھی دو جہانوں کے درمیان کی آڑ ہے، اور وہ اس دنیا کا بقیہ یعنی ضمیمہ ہے اس لئے عالم آخرت کے احکام وہاں ہلکے ظاہر ہوتے ہیں، اسی کو روایات میں جنت وجہنم کی طرف دریچے کھولنے سے تعبیر کیا ہے اور شاہ صاحب رحمہ اللہ نے اس کو "پردہ کے پیچھے سے علوم نکلنے" سے تعبیر کیا ہے۔

عالم برزخ اور عالم آخرت میں ایک فرق یہ بھی ہے کہ جس طرح ہماری اس دنیا میں انفرادی احکام ــــ جو ہر ہر فرد کے ساتھ مختص ہیں ــــ ظاہر ہوتے ہیں، اسی طرح عالم برزخ میں بھی انفرادی احکام ظاہر ہوتے ہیں، کیونکہ وہ عالم اسی عالم کا بقیہ ہے اور قیامت کے دن اور اس کے بعد نوعی احکام ظاہر ہوں گے۔ سورۃ یس آیت ۵۹ میں ہے: وَامْتَازُوا

الْيَوْمَ أَيُّهَا الْمُجْرِمُونَ﴾ (اور اے مجرمو! آج (اہل ایمان سے) الگ ہو جاؤ) کیونکہ اہل ایمان کو جنت میں پہنچانا ہے اور مجرموں کو دوزخ میں۔ سورۂ مریم آیت ۸۵ میں ہے: ﴿يَوْمَ نَحْشُرُ الْمُتَّقِينَ إِلَى الرَّحْمٰنِ وَفْدًا﴾ (جس دن ہم متقیوں کو رحمان کی طرف مہمان بنا کر جمع کریں گے) اور سورۃ الزمر آیت ۷۱ میں ہے: "جو کافر ہیں وہ جہنم کی طرف گروہ گروہ بنا کر ہانکے جائیں گے"۔ اور آیت ۷۳ میں ہے: "جو لوگ اپنے رب سے ڈرتے تھے وہ گروہ گروہ بنا کر جنت کی طرف روانہ کئے جائیں گے" —— ان آیات میں اشارہ ہے کہ قیامت میں اور اس کے بعد مجموعی احکام ظاہر ہوں گے، انفرادی احکام باقی نہیں رہیں گے، جیسے امتحان ہر طالب علم کا الگ الگ لیا جاتا ہے، جوابات بھی الگ الگ جانچے جاتے ہیں، نمبرات بھی الگ الگ دیے جاتے ہیں، مگر جب نتیجہ امتحان کا فیصد نکالا جاتا ہے تو مجموعہ کا لحاظ کر کے کہا کرتے ہیں کہ اتنے فیصد کامیاب ہوئے اور اتنے فیصد ناکام۔ اس کی مزید تفصیل اگلے باب میں آرہی ہے۔

[۴] وصنفٌ هم أهل الاصطلاح: قويةٌ بهيميتُهم، ضعيفةٌ ملكيتُهم: وهم أكثر الناس وجودًا، يكون غالبُ أمورهم تابعًا للصورة الحيوانية، المجبولة على التصرف في البدن، والانغماس فيه، فلا يكون الموتُ انفكاكًا لنفوسهم عن البدن بالكلية، بل تنفكُّ تدبيرًا، ولا تنفك وهمًا، فتعلم علمًا مرتكزًا —— بحيث لا يخطر عندها إمكانُ مخالفته —— أنها عينُ الجسد، حتى لو رُضَّ الجسدُ، أو قُطع، لأيقنت أنه فُعل ذلك بها؛ وعلامتُهم: أنهم يقولون من جذر قلوبهم: إن أرواحهم عينُ أجسادهم، أو عرضٌ طارٍ عليها، وإن نطقت ألسنتُهم لتقليد أو رسم خلافَ ذلك.

فأولئك إذا ماتوا برق عليهم بارقٌ ضعيف، وتتراءى لهم عيانٌ خفيف، مثلُ ما يكون هنا للمرتاضين، وتتشبح الأمور في صُوَرٍ خيالية تارة، ومثالية خارجية أخرى، كما قد تتشبح للمرتاضين، فإن كان لابسَ أعمالاً سنيّةً تمثّل علمُ الملاءمة في أشباح ملائكةٍ حسان الوجوه، بأيديهم الحريرُ، ومخاطبات وهيئات لطيفة، وفُتح بابٌ إلى الجنة، تأتي منه روائحها، وإن كان لابس أعمالاً منافرة للملكية، أو جالبةً للَّعن، تمثّل علمُ ذلك في أشباح ملائكةٍ سود الوجوه، ومخاطبات وهيئات عنيفة، كما قد يتمثّلُ الغضبُ في صورة السباع، والجبنُ في صورة الأرنب.

وهنالك نفوسٌ ملكية تستوجب استعدادهم أن يُوكَّلوا بمثل هذه المواطن، ويؤمروا بالتعذيب أو التنعيم، فيراهم الميتُ عيانًا، وإن كان أهل الدنيا لا يرونهم عيانًا.

واعلم أنه ليس عالمُ القبر إلا من بقايا هذا العالم، وإنما يترشح هنالك العلوم من وراء حجاب،

وإنما تظهر أحكامُ النفوس المختصةُ بفرد دون فرد بخلاف الحوادث الحشرية، فإنها تظهر عليها، وهي فانية عن أحكامها الخاصة بفرد فرد، باقيةٌ بأحكام الصورة الإنسانية. والله اعلم.

ترجمہ: (۴) اور ایک (اور) قسم ہے، وہ مصالحت والے لوگ ہیں: جن کی قوت بہیمیہ قوی اور قوت ملکیہ ضعیف ہے، اور وہ بیشتر لوگ ہیں پائے جانے کے اعتبار سے۔ اُن کے اکثر امور (دنیا میں) اُس روح حیوانی کے تابع ہیں، جو بدن میں تصرف کرنے کے لئے اور بدن میں ڈوبنے کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ پس موت کے وقت ان کی ارواح ان کے جسموں سے بالکلیہ جدا نہیں ہوتیں، بلکہ تدبیری طور پر جدا ہوتی ہیں، اور خیالی طور پر جدا نہیں ہوتیں۔ پس وہ نفوس پختہ طور پر جانتے ہیں —— اس طرح کہ اس کے برخلاف کا امکان تک ان کے دل میں نہیں گزرتا —— کہ وہ ارواح بعینہٖ جسم ہیں، حتی کہ اگر جسم روندا جاتا ہے یا کاٹا جاتا ہے، تو وہ لوگ یقین کرتے ہیں کہ یہ معاملہ ان کی ارواح کے ساتھ کیا گیا ہے۔ اور ان لوگوں کی نشانی یہ ہے کہ وہ اپنے دل کی تہ سے کہتے ہیں کہ ان کی روحیں بعینہٖ ان کے اجسام ہیں، یا (وہ ارواح) اعراض ہیں جو اجسام پر طاری ہوتے ہیں۔ اگرچہ وہ لوگ زبان سے تقلید کے طور پر یا ریت رواج کی بنا پر اس کے برخلاف کہیں۔

پس جب یہ لوگ مرجاتے ہیں تو اُن پر خفیف سی روشنی چمکتی ہے، اور ہلکے سے خیالات ان کو نظر آتے ہیں، جیسا کہ بعض ریاضت کرنے والوں کو یہاں نظر آیا کرتا ہے۔ اور (عالم برزخ میں مجازات کے لئے) چیزیں کبھی خیالی صورتوں میں اور کبھی مثالی صورتوں میں متشکل ہوتی ہیں، جیسا کہ بعض ریاضت کرنے والوں کے لئے کبھی متشکل ہوتی ہیں — پس اگر اس شخص کا ملکوتی اعمال سے تعلق رہا ہوتا ہے تو موافقت کا علم ایسے خوبصورت فرشتوں کی شکل میں مُتھیایا جاتا ہے، جن کے ہاتھوں میں ریشم ہوتا ہے، جو نرم لہجے میں بات چیت کرتے ہیں، اور اچھی ہیئت میں نظر آتے ہیں، اور جنت کی طرف ایک دروازہ وا کیا جاتا ہے، جس سے جنت کی خوشبوئیں آتی ہیں — اور اگر اس شخص کا ملکیت کے برخلاف کاموں سے یا لعنت کو کھینچنے والے کاموں سے تعلق رہا ہوتا ہے تو اس علم کو سیاہ چہرے والے فرشتوں کی شکل میں چھپایا جاتا ہے، جو درشت لہجے میں بات چیت کرتے ہیں، اور مکروہ ہیئتوں میں نظر آتے ہیں، جیسا کہ کبھی (خواب میں) غصہ درندوں کی شکل میں، اور بزدلی خرگوش کی صورت میں چھپائی جاتی ہے۔

اور وہاں (یعنی نفس الامر میں) ایسے ملکی نفوس ہیں، جن کی استعداد لازم جانتی ہے کہ ان کو اس جیسے مواقع میں مقرر کیا جائے۔ اور ان کو سزا دینے کا یا راحتیں پہنچانے کا حکم دیا جائے، پس معذب آدمی اُن کو آنکھوں سے دیکھتا ہے، اگرچہ دنیا والے ان کو سری آنکھوں سے نہیں دیکھتے۔

اور جان لیں کہ عالم قبر اسی عالم کا بقیہ ہے۔ اور وہاں علوم (اور احکام) پردہ کے پیچھے سے ٹپکتے ہیں۔ اور نفوس کے صرف وہ احکام ظاہر ہوتے ہیں جو ہر ہر فرد کے ساتھ مختص ہیں، قیامت کے واقعات کے برخلاف، پس وہ واقعات

نفوس پر ظاہر ہوں گے درانحالیکہ وہ فنا ہونے والے ہوں گے اپنے ان احکام سے جو ہر ہر فرد کے ساتھ خاص ہیں، باقی رہنے والے ہوں گے نوعِ انسانی کی صورت کے احکام کے ساتھ، باقی اللہ بہتر جانتا ہے۔

تشریح:

(۱) عرض: وہ ممکن ہے جو کسی محل میں پایا جائے یعنی وہ پائے جانے میں اور باقی رہنے میں اور متمکن ہونے میں کسی محل کا محتاج ہو، جیسے کپڑے کی سیاہی اور سفیدی وغیرہ اعراض نو ہیں، جن کی تفصیل معین الفلسفہ ص ۹۷ میں ہے —— شاہ صاحب کی مراد یہ ہے کہ چوتھی قسم کے لوگ ارواح کو جوہر نہیں مانتے، بلکہ عرض مانتے ہیں، جو قیام اور بقاء میں جسم کی محتاج ہوتی ہیں۔

(۲) مرتاض: وہ حضرات ہیں جو عبادات میں سخت محنت اور حقائق الہٰیہ میں غور وفکر کرتے ہیں، ان پر تجلیات کی روشنی کس طرح چمکتی ہے؟ اور ان کو اللہ تعالیٰ اور آخرت کے بارے میں کیسے خیالات آتے ہیں؟ اور معاملاتِ آخرت کے امور ان کے سامنے کس طرح متشکل ہوتے ہیں؟ یہ سب واردات ہیں، راہِ خدا کے سالک کے علاوہ کے لئے ان کو سمجھنا اور سمجھانا مشکل ہے، ایسی چیز مثال میں نہیں پیش کرنی چاہئے جو خود مسئلہ ہو، مثال تو مسئلہ کی وضاحت کے لئے ہوتی ہے، اس لئے میں نے یہ مثال نہیں چھیڑی۔

(۳) خیالی صورتیں: جیسے بیداری یا خواب کے تصورات جن کا خارج میں کوئی وجود نہیں ہوتا، اور مثالی خارجی (صورتیں) جیسے کوئی شخص سامنے آیا اور کچھ کہہ کر یا کر کے ایک دم غائب ہوگیا، یہ مثالی صورت ہے، اور وہ خارج میں پائی جاتی ہے مگر چونکہ وہ مادی نہیں، اس لئے غائب ہو جاتی ہے۔

(۴) دسّ (ن) الشیء تحت التراب: دفنانا، چھپانا —— یہاں مراد یہ ہے کہ آدمی نے دنیا میں جو اعمال کئے ہیں، وہ ملکیت کے شایانِ شان ہیں یا اس سے متضاد ہیں، یہ موافقت یا منافرت کا علم آدمی کو عالم برزخ میں رنگی شکلوں کے ذریعہ ہوتا ہے، ان کی صورتوں میں یہ علم چھپا دیا جاتا ہے، ان کو دیکھتے ہی آدمی سمجھ جاتا ہے کہ میں کس قسم کے کام کر کے آیا ہوں، اور یہ اشارہ ہے بہت سی حدیثوں کے مضمون کی طرف کہ مؤمن کی روح قبض کرنے کے لئے فرشتے کس حال میں آتے ہیں اور کافر کے ساتھ بوقتِ مرگ فرشتے کیا معاملہ کرتے ہیں۔ یہ حدیثیں مشکوۃ شریف کتاب الجنائز، باب مایقال عند من حضرہ الموت میں ملاحظہ فرمائیں۔

(۵) اس عبارت میں چند تصحیحات کی گئی ہیں: (الف) لنعلم علما من كذا: اصل میں فنعلم علما من كذا تھا (ب) إمكان مخالفة: اصل میں بإمكان مخالفة تھا (ج) طار: مطبوعہ میں طاری تھا (د) عنقة: مخطوطہ میں عنفة تھا (ھ) عن احکامها سے پہلے واو تھا۔ یہ سب تصحیحات مخطوطہ کراچی سے ہیں۔

باب ــــــ ۴

قیامت اور اس کے بعد کے واقعات کے اسرار ورموز

حشر (ن ض) حشراً کے لغوی معنی ہیں جمع کرنا۔ اور اصطلاح میں یوم الحشر قیامت کے دن کو کہتے ہیں، کیونکہ اس دن میں اولین و آخرین جمع کئے جائیں گے۔ اس دنیا میں لوگ ارسالاً (گروہ گروہ) آرہے ہیں۔ جب اس دنیا کا آخری دن (الیوم الآخر) آئے گا تو پہلے تمام مخلوقات ختم کردی جائیں گی۔ پھر دوسری مرتبہ صور پھونکا جائے گا، پس تمام مخلوقات دوبارہ زندہ ہو کر میدان حشر میں جمع ہو جائیں گی۔ مَحْشَر (شین کے زیر، زبر کے ساتھ) لوگوں کے جمع ہونے کی جگہ ــــــ شاہ صاحب رحمہ اللہ نے حشر کا لفظ عام استعمال کیا ہے۔ دوبارہ زندہ ہونے سے لے کر جنت وجہنم کی ابدی زندگی تک سب کو لفظ حشر سے تعبیر کیا ہے ــــــ اس باب میں بھی تمہید ہے۔ پہلے پانچ باتیں بیان کی ہیں، پھر اصل مدعیٰ شروع کریں گے۔

پہلی بات

موت کے بعد انفرادی احکام ختم ہو جاتے ہیں، صرف نوعی احکام باقی رہتے ہیں

مرنے کے بعد روحوں کا ایک مرکز ہے، جس کی طرف تمام روحیں سمٹ جاتی ہیں، جیسے مقناطیس لوہے کو کھینچ لیتا ہے، وہ مرکز بھی روحوں کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔ وہ مرکز حظیرۃ القدس (بارگاہِ مقدس) ہے۔ وہاں نوعِ انسانی کی صورت پائی جاتی ہے، جس کے بہت سے منہ اور زبانیں ہیں، وہ مختلف بولیاں بولتی ہے، جیسا کہ حدیث شریف میں آیا ہے (دیکھئے بحث اول، باب (۳) ملأ اعلیٰ کا بیان) اس صورت کا نام "انسانِ اکبر" ہے اور "روحِ اعظم" بھی، اور روحِ اعظم کا یہ تشکل (پایا جانا) یا تو عالم مثال میں ہے یا ذکر بعنی لوح محفوظ میں۔ آپ جو چاہیں تعبیر اختیار کریں۔ جب روحیں اجسام کی چادروں سے مجرد ہو جاتی ہیں تو وہ روحِ اعظم کے پاس پہنچ جاتی ہیں، وہاں پہنچنے کے بعد انفرادی خصوصیات ختم ہو جاتی ہیں، صرف نوعی خصوصیات یا نوعی خصوصیات جیسی خصوصیات باقی رہ جاتی ہیں۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ آدمی میں دو قسم کی چیزیں ہیں: انفرادی خصوصیت اور اجتماعی خصوصیات:

انفرادی خصوصیات: وہ ہیں جن کی وجہ سے بعض افراد بعض سے ممتاز ہوتے ہیں۔ ان کو تشخصات بھی کہتے ہیں۔ مثلاً ہر فرد کا ناک نقشہ، خد و خال، قد و قامت اور انداز مختلف ہوتا ہے، جو اس کو دوسرے افراد سے ممتاز کرتا ہے۔ یہ سب انفرادی خصوصیات ہیں، جو مرنے کے بعد ختم ہو جاتی ہیں۔

اجتماعی خصوصیت: وہ ہیں جو تمام افراد میں یکساں طور پر پائی جاتی ہیں، ظاہر ہے کہ ایسی چیزیں نوع کی وجہ ہی سے ہوسکتی ہیں۔ حدیث میں جو فرمایا گیا ہے کہ: ''ہر بچہ فطرت (اسلامی) پر پیدا ہوتا ہے'' یہ نوعی حکم کا بیان ہے، جو تمام افراد میں پایا جاتا ہے، کوئی فرد اس سے خالی نہیں (یہ حدیث بخاری شریف کتاب الجنائز میں ہے فتح الباری ۳: ۲۴۶)

اور نوعی چیزیں دو قسم کی ہیں: ظاہری اور باطنی:

ظاہری چیزیں: جیسے ہر نوع کی بناوٹ مختلف ہے، رنگ، شکل اور جسم کی مقدار متفاوت ہے، اسی طرح ہر نوع کی آواز بھی جداگانہ ہے۔ یہ تمام امور نوع کے ظاہری احکام ہیں یعنی نوع کا جو بھی فرد نوع کی عطا کردہ ہیئت پر پایا جائے گا اس میں یہ باتیں ضرور ہوں گی، کوئی فرد ان باتوں سے خالی نہ ہوگا۔ البتہ اگر مادہ کے نقص کی وجہ سے کوئی فرد ناقص اخلقت پیدا ہو تو وہ دوسری بات ہے۔ مثلاً انسان کا قد سیدھا ہوگا یعنی وہ دو پیروں پر کھڑا ہوگا، وہ ناطق ہوگا یعنی الفاظ کے ذریعہ مافی الضمیر سمجھے گا اور سمجھائے گا، اور اس کی جسم بالوں سے صاف ہوگی یعنی بھیڑ بکری کی طرح اس کا پورا بدن بالوں سے ڈھکا ہوا نہ ہوگا اور گھوڑا ترچھی قامت ہوگا یعنی اس کا جسم بیل کی طرح چار پیروں پر پھیلا ہوا ہوگا، وہ ہنہنانے والا اور بال والا ہوگا اور اسی طرح کی دوسری وہ چیزیں جو نوع کے افراد سے مزاج کی درستگی کے وقت جدا نہیں ہوتیں۔

باطنی چیزیں: جیسے ہر نوع کا ادراک (سمجھنا) مختلف ہوتا ہے، معاش (زندگی گزارنے) کے طریقے جدا ہوتے ہیں اور اچانک پیش آنے والے واقعات سے نمٹنے کی شکلیں الگ الگ ہوتی ہیں، کوئی سینگ مارتا ہے تو کوئی لات مارتا ہے، کوئی کاٹتا ہے تو کوئی ڈنک مارتا ہے۔ غرض ہر نوع اپنا طریقۂ مدافعت جانتی ہے اور وہ طریقہ ہر نوع کا مختلف ہے۔ شہد کی مکھیوں کے احوال میں غور کیجئے یا چڑیوں کے احوال پر نظر ڈالیے تو آپ کو احوال کا یہ اختلاف عیاں نظر آئے گا۔ یہ تمام امور صورت نوعیہ کے تقاضے سے ہیں، وہ نوعی احکام ہیں۔

غرض موت کے بعد جب روحیں اپنی بارگاہ کی طرف سمٹ جاتی ہیں تو انفرادی احکام، جیسے ہر فرد کے تشخصات، وہاں پہنچ کر ختم ہو جاتے ہیں۔ اور نوعی احکام خواہ وہ ظاہری ہوں یا باطنی، وہاں پہنچنے کے بعد باقی رہ جاتے ہیں۔ اسی طرح وہ احکام جن پر نوع کی جانب غالب ہوتی ہے یعنی گو وہ نوعی احکام نہیں ہوتے مگر شمول ولزوم کی وجہ سے نوعی احکام جیسے ہو جاتے ہیں، جیسے مومنین کا ایمان اور کفار کا کفر اور منافقین کا نفاق، یہ نوعی احکام جیسے ہیں، یہ بھی باقی رہتے ہیں۔

نوٹ: روح اعظم کی طرف ارواح کا سمٹنا جگہ کے اعتبار سے نہیں ہوتا، جیسا کہ تیسری بات کے ضمن میں تفصیل سے آرہا ہے۔

﴿باب ذكر شيئ من أسرار الوقائع المحشرية﴾

اعلم أن للأرواح البشرية حضرةً تنجذب إليها انجذابَ الحديد إلى المغناطيس؛ وتلك الحضرةُ هي حظيرة القدس: محلُّ اجتماع النفوس المجرَّدة عن جلابيب الأبدان، والروح

الأعظم الذي وصفه النبي صلى الله عليه وسلم بكثرة الوجوه والألسن واللغات؛ وإنما هو تشبحٌ لصورة نوع الإنسان: في عالم المثال، أو في الذكر — أيّهما شئت فقل — ومحلُّ فنائها عن المتأكد من أحكامها الناشئة من الخصوصية الفردية، وبقائها بأحكامها الناشئة من النوع، أو الغالب عليها جانب النوع.

وتفصيلُه: أن أفراد الإنسان لها أحكام يمتاز بها بعضُها من بعض، ولها أحكام تشترك فيها جُملتُها، وتتوارد عليها جميعُها، ولاجرم أنها من النوع، وإليه الإشارة في قوله صلى الله عليه وسلم: ﴿كل مولود يولد على الفطرة﴾ الحديث.

وكل نوع يختص به نوعان من الأحكام:

أحدهما: الظاهرة، كالخلقة، أي اللون والشكل والمقدار، وكالصوت، أيُّ فرد وُجد منه على هيئة يعطيها النوع، ولم يكن مُخدَجًا من قِبَل عصيان المادة، فإنه لابد يتحقق بها، ويتوارد عليها: فالإنسانُ مستوي القامة، ناطق، بادي البَشَرة؛ والفرس مُعْوَجُّ القامة، صاهلٌ، أشعر، إلى غير ذلك مما لاينفك عن الأفراد عند سلامة مزاجها.

وثانيهما: الأحكام الباطنة، كالإدراك والاهتداء للمعاش، والاستعداد لما يهجُم عليها من الوقائع؛ فلكل نوع شريعة. ألا ترى النحل كيف أوحى الله تعالى إليها أن يتّبع الأشجار فتأكل من ثمراتها، ثم كيف تتخذ بيتًا يجتمع فيه بنو نوعها، ثم كيف تجمع العسل هنالك؟ وأوحى إلى العصفور أن يرغب الذكر في الأنثى، ثم يتخذا عُشًّا، ثم يحضُنا البَيْضَ، ثم يزقّا الفراخ، ثم إذا نهضت الفراخ علّمها أين الماء؟ وأين الحبوب؟ وعلّمها أن تجتنبها من عدوها، وعلّمها كيف تفر من السنور والصياد؟ وكيف تنازع بني نوعها عند جلب نفع أو دفع ضُر؟ وهل تظنُّ الطبيعةُ السليمة بتلك الأحكام أنها لاترجع إلى اقتضاء الصورة النوعية؟

ترجمہ: واقعاتِ حشر کے کچھ اسرار و رموز کا بیان: جان لیں کہ انسانی روحوں کے لئے ایک ایسی بارگاہ ہے، جس کی طرف روحیں کھنچ جاتی ہیں، مقناطیس کی طرف لوہے کے کھنچنے کی طرح۔ اور وہ بارگاہ، وہ حظیرۃ القدس ہے۔ جو بدن کی چادروں سے تجرد (بے تعلق) ہونے کے بعد روحوں کے اکٹھا ہونے کی جگہ ہے، اس روح اعظم کے ساتھ جس کو متصف کیا ہے رسول اللہ ﷺ نے بہت سے مونہوں، زبانوں اور بولیوں کے ساتھ۔ اور وہ روح اعظم نوع انسانی کی صورت کا تمثل (پایا جانا) ہے، عالم مثال میں، یا ذکر یعنی لوح محفوظ میں — جو چاہیں آپ تعبیر اختیار کریں — اور وہ (حظیرۃ القدس) افرادی خصوصیت سے پیدا ہونے والے احکام میں سے مؤکد (پختہ) احکام کے فنا ہونے کی جگہ ہے، اور نوع

دوسری بات

نوع کے افراد میں نوعی احکام کا پایا جانا کمال ہے

کسی بھی نوع کے افراد کی نیک بختی (کمال) یہ ہے کہ اس میں نوعی احکام پورے پورے پائے جائیں اور افراد کا مادہ نوع کے احکام کی نافرمانی نہ کرے، مثلاً عمدہ بھینس وہ ہے جو خوب دودھ دے، اچھا گھوڑا وہ ہے جس میں گھوڑے کی تمام خوبیاں پائی جائیں، اعلیٰ درجہ کی چھری تلوار وہ ہیں جو بہترین کاٹ کریں، اور کامل انسان وہ ہے جس میں کمال عبودیت ہو۔ غرض جس فرد میں جس قدر نوعی احکام پائے جائیں گے، وہ فرد اسی قدر کامل ہوگا۔ اور اگر کوئی فرد نوعی احکام سے خالی ہو تو وہ بے کار فرد ہے۔ اور نوعی احکام میں کمی ہو تو اسی قدر ناقص ہے جیسے بھینس اگر بچہ اور دودھ نہ دے تو وہ کیلا کے قابل ہے، گھوڑے میں اس کی خوبیاں نہ پائی جائیں تو وہ گدھا ہے، چھری تلوار کاٹ نہ کریں تو ان کی جگہ ردی کی ٹوکری ہے اور انسان میں اگر عبودیت نہ ہو تو وہ جہنم کا ایندھن ہوگا۔

اسی طرح نوع کے افراد جب تک نوع کے اقتضاء پر باقی رہتے ہیں، ان کو کوئی تکلیف نہیں ہوتی، نہ ان کو کوئی سزا دی جاتی ہے، مگر بعض مرتبہ عارضی اسباب کی وجہ سے افراد کی فطرت متغیر ہو جاتی ہے۔ اس وقت پریشانی کھڑی ہوتی ہے، جیسے جسم میں کہیں سوجن آجاتی ہے، تو جسم بدنما ہو جاتا ہے اور تکلیف بھی ہوتی ہے۔ مذکورہ بالا حدیث میں اسی عارضی تبدیلی کی طرف اشارہ ہے فرمایا: "ہر بچہ فطرت اسلامی پر پیدا ہوتا ہے، پھر اس کے ماں باپ (یعنی ماحول جس میں وہ بچہ پلتا ہے) اس کو یہودی یا عیسائی یا مجوسی (آتش پرست) بنا دیتے ہیں" یعنی عوارض فطرت کو بدل دیتے ہیں۔

> واعلم أن سعادة الأفراد: أن تتمكن منها أحكام النوع وافرةً كاملةً، وأن لاتعصيَ مادتُها عليه، ولذلك يختلف أفراد الأنواع فيما يُعَدُّ لها من سعادتها أو شقاوتها، ومهما بقيت على ما يعطيه النوعُ لم يكن لها ألم، لكنها قد تَغَيَّرُ فطرتُها بأسباب طارئة، بمنزلة الورم، وإليه وقعت الإشارة بقوله صلى الله عليه وسلم: ﴿ثم أبواه يُهَوِّدَانِه، أو يُنَصِّرَانه، أو يُمَجِّسَانه﴾

ترجمہ: اور جان لیں کہ (کسی بھی نوع کے) افراد کی نیک بختی یہ ہے کہ قدرت دیں افراد اپنے اندر نوع کے احکام کو پورے پورے طور پر (یعنی ان افراد میں نوع کے احکام پورے پورے پائے جائیں) اور یہ بات ہے کہ افراد کا مادہ نوع کی نافرمانی نہ کرے۔ اور اسی وجہ سے نوع کے افراد مختلف ہوتے ہیں ان باتوں میں جو افراد کی نیک بختی اور بدبختی میں سے شمار کی جاتی ہیں —— اور جب تک افراد نوع کی دین پر باقی رہتے ہیں، ان کے لئے کوئی تکلیف نہیں ہوتی، مگر کبھی عارضی اسباب کی وجہ سے افراد کی فطرت متغیر ہو جاتی ہے، جیسے سوجن، اور اسی (تبدیلی) کی طرف اشارہ

فرمایا ہے: آپ نے اپنے اس ارشاد میں کہ: "پھر اس بچے کے ماں باپ اس کو یہودی یا عیسائی یا مجوسی بنا دیتے ہیں"

تیسری بات

ارواح کا بارگاہ عالی کی طرف سمٹنا

حظیرۃ القدس کی طرف ارواح انسانی کا سمٹنا دو طرح پر ہوتا ہے:

اول: بصیرت یعنی ایمان اور ذکر و فکر کے ذریعہ: جو بھی شخص بہیمیت کی آلودگیوں سے پاک صاف ہوتا ہے، اس کی روح بارگاہ عالی میں پہنچ جاتی ہے، اور اس بارگاہ کی کچھ باتیں اس پر منکشف ہوتی ہیں۔ حدیث شریف میں ہے کہ آدم علیہ السلام اور موسیٰ علیہ السلام کی پروردگار کے پاس بحث ہوئی (رواہ مسلم، مشکوۃ کتاب الایمان، باب الایمان بالقدر، حدیث نمبر ۸۱) اس حدیث میں اسی انجذاب کی طرف اشارہ ہے، دونوں حضرات کی ارواح بارگاہ عالی میں پہنچیں اور وہاں آپس میں گفتگو ہوئی۔ اور متعدد صحابہ سے یہ مضمون صراحۃً مروی ہے کہ نیک لوگوں کی روحیں روح اعظم کے پاس اکٹھی ہوتی ہیں اور روح اعظم حظیرۃ القدس میں ہے، پس صراحۃً یہ بات ثابت ہوئی کہ کچھ ارواح کھنچ کر اس بارگاہ کی طرف سمٹ جاتی ہیں۔

دوم: تعلق قائم ہونے کے ذریعہ سمٹنا: موت کے بعد بارگاہ عالی کا ارواح کے ساتھ تکلیف دہی یا راحت رسانی کا تعلق قائم ہوتا ہے، یعنی حظیرۃ القدس کے آثار ان ارواح میں نمودار ہوتے ہیں، یہ تعلق قائم ہونا بھی گویا انجذاب (سمٹنا) ہے۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ قیامت کے دن جسموں کو جو دوبارہ بنائے جائیں گے، اور ان میں ارواح کو لوٹایا جائے گا، تو وہ نئی زندگی نہ ہوگی، نہ جسم نئے ہوں گے، نہ روحیں نئی ہوں گی، بلکہ وہ گذشتہ زندگی کا تتمہ ہوگی، روحیں بھی وہی ہوں گی، اور جسم بھی وہی ہوں گے۔ روحیں تو موت سے فنا نہیں ہوتیں، بعینہ باقی رہتی ہیں۔ اور اجسام جو گل سڑ کر ریزہ ریزہ ہوگئے ہیں ان کی نشأۃ ثانیہ ہوگی، یعنی جسم کے سابقہ اجزاء ہی سے تعمیر نو ہوگی، اس میں مٹی کے نئے اجزاء شامل نہیں ہوں گے۔ رہا یہ سوال کہ قیامت میں تو بہت لمبے چوڑے اجسام ہوں گے، ہر شخص کا قد ساٹھ ہاتھ کا ہوگا، سابقہ اجزاء سے اتنا بڑا جسم کیسے تیار ہوگا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ جس طرح گوندھے ہوئے آٹے کو کچھ دیر گرمی میں رکھ کر یا کسی ترش چیز سے پھلایا جاتا ہے، تو آٹے میں کچھ زیادتی نہیں ہوتی۔ اور تخمہ (بدہضمی) میں جو وافر مقدار میں فضلات خارج ہوتے ہیں وہ سابقہ فضلات ہی ہوتے ہیں، ان میں کچھ اضافہ نہیں ہوتا۔ اسی طرح قیامت میں اجسام کے سابقہ اجزاء ہی سے عالم مثال کی مدد سے لمبے چوڑے اجسام تیار ہو جائیں گے، ان میں ذرا بھی نئی مٹی شامل نہ ہوگی۔

نہ ہوں تو ان کے علاوہ ہوں گے اور البتہ نہیں پکڑے جائیں گے وہ ان کاموں کی وجہ سے جو بھول سے کئے ہیں۔

چوتھی بات

قیامت میں واقعات تمثیلی رنگ میں ظاہر ہوں گے

جس طرح خواب میں معنویات تمثیلی پیرایہ میں دکھائی جاتی ہیں، جیسے حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمہ اللہ نے خواب دیکھا تھا کہ آپ خانہ کعبہ پر کھڑے ہیں، اور آپ سے نہریں نکل کر چاروں طرف بہہ رہی ہیں، اس کی معبر نے تعبیر دی تھی کہ آپ سے علم کا فیض جاری ہوگا۔ اسی طرح خارج میں بھی بعض مرتبہ معنویات تمثیلی رنگ میں ظاہر ہوتی ہیں، مثلاً:

(۱) حضرت داؤد علیہ السلام کی ایک کوتاہی فرشتوں کے مقدمہ کی شکل میں سامنے آئی تھی۔ یہ کوتاہی ''خود پسندی'' تھی (من عُجْبٍ عجب به من نفسه، قاله ابن عباس رضي الله عنه) یہی اس آیت کی صحیح تفسیر ہے۔ یہ مستدرک حاکم (۲: ۴۳۳) میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے صحیح سند سے مروی ہے، اور اس کی تفصیل فوائد عثمانیہ میں سورۂ ص کی تفسیر میں ہے —— اور حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ نے جو تفسیر کی ہے وہ ایک دوسری روایت کے پیش نظر ہے، مگر وہ روایت صحیح نہیں، ابن کثیر رحمہ اللہ اس کی بابت لکھتے ہیں: قد ذكر المفسرون ههنا قصةً، أكثرها مأخوذ من الإسرائيليات، ولم يثبت فيها عن المعصوم حديث يجب اتباعه اهـ —— مگر مثال پر کوئی اثر نہیں پڑتا، کوتاہی خواہ یہ ہو یا وہ، بہرحال وہ ایک معنوی چیز ہے، جو فریقین کے مقدمہ کی شکل میں نمودار ہوئی۔

(۲) شب معراج میں فطرت (اسلام) اور شہوت کو دودھ اور شراب کی شکل میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کیا گیا۔ آپ نے دونوں کو دیکھا، پھر دودھ کو لے لیا۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے فرمایا: الحمد لله الذي هداك للفطرة، لو أخذت الخمر غوت أمتك (اللہ کا شکر ہے کہ اس نے آپ کو فطرت کی راہ دکھائی، اگر آپ شراب کو لے لیتے تو آپ کی امت گمراہ ہو جاتی) یہ روایت بخاری شریف میں سورۂ بنی اسرائیل کی تفسیر میں ہے۔ اس میں ہدایت اور ضلالت کو، جو معنوی چیزیں ہیں، دودھ اور شراب کے محسوس پیکر میں پیش کیا گیا ہے —— اور امت کے صالح افراد ہدایت کو قبول کریں گے، یہ بات دودھ کے انتخاب کی صورت میں ظاہر کی گئی ہے۔

(۳) بخاری شریف، کتاب فضائل اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم، باب قول النبي صلى الله عليه وسلم لو كنت متخذا خليلا میں حدیث نمبر ۳۶۷۴ ہے کہ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اریس نامی کنویں کی منڈیر پر پیر لٹکا کر تشریف فرما تھے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ آئے اور آپ کی دائیں جانب کنویں میں پیر لٹکا کر بیٹھ گئے، پھر

حضرت عمر رضی اللہ عنہ آئے وہ بھی اس جانب اسی طرح بیٹھ گئے، پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ آئے تو آنحضور ﷺ کے پاس منڈیر پر جگہ نہیں تھی اس لئے وہ مقابل جانب میں اکیلے بیٹھ گئے۔ حضرت سعید بن المسیب رحمہ اللہ نے، جو جلیل القدر تابعی ہیں یہ حدیث بیان کر کے ارشاد فرمایا فاوّلتها قبورهم (میں نے اس کا مطلب ان حضرات کی قبریں لیا ہے) یعنی ان چاروں حضرات کی وفات کے بعد جس طرح ان کی قبریں بنیں، یہ واقعہ اس کا پیکر محسوس ہے کہ اول تین حضرات کی قبریں ایک ساتھ ہیں، اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی قبر علحدہ بقیع میں ہے۔

اسی طرح قیامت میں جو واقعات پیش آئیں گے وہ بھی تمثیلی رنگ میں ہوں گے، مثلاً آنحضور ﷺ جو ہدایت لے کر تشریف لائے ہیں وہ میدان محشر میں حوض کوثر کی صورت میں نمودار ہوگی۔ اور صراط مستقیم پل صراط کی شکل اختیار کرے گی۔

واعلم أن كثيرا من الأشياء المتحققة في الخارج، تكون بمنزلة الرؤيا، في تشبح المعاني بأجسام مناسبة لها، كما ظهرت الملائكة لداود عليه السلام في صورة خصمين، ورفعت إليه القضية، ليعرف أنه تنبيه لما فرط منه في امرأة أوريا، فاستغفر وأناب؛ وكما كان عرض قدحي الخمر واللبن عليه صلى الله عليه وسلم، واختياره اللبن تشبحا لعرض الفطرة والشهوات على أمته، واختيار الراشدين منهم الفطرة؛ وكما كان جلوس النبي صلى الله عليه وسلم، وأبي بكر، وعمر، مجتمعين على قف البئر، وجلوس عثمان منفردا منهم، تشبحا لما قدر الله تعالى من حال قبورهم ومدافنهم، على ما أوله سعيد بن المسيب وناهيك به! وأكثر الوقائع الحشرية من هذا القبيل.

ترجمہ: اور جان لیں کہ بہت سی چیزیں جو خارج میں پائی جاتی ہیں، وہ خواب کی طرح ہوتی ہیں، معنویات کے پائے جانے میں ان سے مناسبت رکھنے والے اجسام کے ساتھ، جیسے فرشتے داؤد علیہ السلام کے سامنے ظاہر ہوئے فریقین کی صورت میں۔ اور انھوں نے آپ کے سامنے قضیہ پیش کیا، پس داؤد علیہ السلام سمجھ گئے کہ یہ اس کوتاہی کی تمثیل ہے، جو ان سے اُوریا کی بیوی کے معاملہ میں ہو چکی ہے، پس انھوں نے معافی طلب کی اور وہ رجوع ہوئے ——— اور جس طرح شراب اور دودھ کے دو پیالوں کا آپ ﷺ کے سامنے پیش کرنا اور آپ کا دودھ کو پسند کرنا فطرت اور شہوت کو آپ کی امت کے سامنے پیش کرنے اور امت کے نیک لوگوں کا فطرت کو پسند کرنے کی تمثیل تھا ——— اور جیسے نبی کریم ﷺ اور ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کا کنویں کی منڈیر پر اکٹھا بیٹھنا، اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا ان سے علحدہ بیٹھنا اس بات کی تمثیل تھا، جو اللہ تعالیٰ نے ان کی قبروں اور ان کے دفن کی جگہوں کے بارے میں مقدر فرمائی تھی، جیسا

کہ اس روایت کا مطلب بیان کیا ہے حضرت سعید بن المسیب رحمہ اللہ نے۔ اور کافی ہیں تجھ کو حضرت سعید (یعنی ان کا بیان کیا ہوا مطلب تیرے لئے کافی ہے، کسی اور سے اس کا مطلب دریافت کرنے کی ضرورت نہیں) اور قیامت کے بعد کے اکثر واقعات اسی قبیل سے ہیں۔

پانچویں بات

فوقانی علوم آسانی سے حاصل نہیں ہوسکتے

علوم دو طرح کے ہیں: حسی علوم اور معنوی علوم:

حسی علوم: وہ ہیں جو حواس خمسہ ظاہرہ کی گرفت میں آتے ہیں، آنکھ سے دیکھ کر، کان سے سن کر، ناک سے سونگھ کر، زبان سے چکھ کر یا جسم سے ٹٹول کر ان کا علم حاصل کیا جاسکتا ہے۔ یہ علوم نسبۃً آسان ہوتے ہیں۔ اسکولوں اور کالجوں میں عام طور پر یہی حسی (مادی) علوم پڑھائے جاتے ہیں۔

معنوی علوم: وہ ہیں جو حواس خمسہ باطنہ یا عقل سے جانے جاتے ہیں، وہ حواس ظاہرہ کے دائرہ سے خارج ہیں۔ مدارس اسلامیہ میں جو علوم پڑھائے جاتے ہیں وہ اکثر از قبیل معنویات ہیں ــــ پھر علوم معنوی دو طرح کے ہیں: ایک وہ جن سے انسان کو کچھ نہ کچھ مناسبت ہوتی ہے۔ یہ وہ علوم ہیں جو خود انسان سے یا کائنات سے تعلق رکھتے ہیں۔ جیسے نماز، روزہ، حج وغیرہ عبادات کے اسرار و رموز۔ اسی طرح کونسا معاملہ مبنی بر انصاف ہے اور کونسا مبنی بر ظلم؟ یہ سب علوم معنوی ہیں مگر انسان کو اس سے کچھ نہ کچھ مناسبت ہے ــــ دوسرے وہ علوم ہیں جن سے انسان کو بالکل مناسبت نہیں، یہ ذات وصفات کے علوم ہیں، اسی طرح آخرت کے معاملات اور ان کے اسرار و رموز کے علوم بھی غیر مانوس ہیں۔

دونوں قسم کے معنوی علوم نہایت مشکل علوم ہیں، آسانی سے ان کو نہیں سمجھا جاسکتا جیسے مادر زاد اندھا رنگ اور روشنی کو خیال میں نہیں لاسکتا۔ ان کی پوری حقیقت مدت دراز گزرنے کے بعد واقعات اور تمثیلات کے ضمن میں اس کی سمجھ میں آتی ہے۔ اسی وجہ سے مدارس اسلامیہ میں ایک ہی فن کی کتابیں ہر سال پڑھائی جاتی ہیں، فقہ کی مثال لیجئے: تعلیم الاسلام سے شروع کرکے ہدایہ تک پڑھایا جاتا ہے، پھر بھی جب قرآن وحدیث کا نمبر آتا ہے تو بہت سے طلبہ مسائل فقہیہ سے نابلد نظر آتے ہیں، پھر طالب علم افتاء کی تعلیم حاصل کرتا ہے، مگر اب بھی مسائل کا کما حقہ ادراک نہیں کرسکتا، پھر ایک لمبی زندگی فتوی نویسی کرتا ہے اور مطالعہ جاری رکھتا ہے، تب کہیں جاکر فقہ کی کچھ فقہ بوجھ ہوتی ہے ــــ اور علوم معنوی کی دوسری قسم کا معاملہ تو اس سے بھی اہم ہے۔ اس لئے قیامت اور اس کے بعد کے واقعات کے جو اسرار و رموز آگے بیان کئے جارہے ہیں، ان کو ابھی بس سرسری طور پر ہی سمجھا جاسکتا ہے۔ جب وہ واقعات رونما ہونگے اور اعمال

کے پیکر ہائے محسوس سامنے آئیں گے تب رفتہ رفتہ ان کی حقیقت واشگاف ہوگی۔

اور اس کی وجہ یہ ہے کہ حقائق فہمی کے لئے نفس ناطقہ کا التفات ضروری ہے، اور جس قدر التفات زیادہ ہوگا، بات اتنی جلدی سمجھ میں آئے گی۔ تجربہ ہے کہ جو طالب علم پڑھنے کا شوق رکھتا ہے اور سبق کی طرف متوجہ ہوتا ہے، وہ جلدی مسئلہ سمجھ جاتا ہے، اور جس کا ذہن کھیل کود میں لگا رہتا ہے، سبق کی طرف ملتفت نہیں ہوتا وہ کورا رہ جاتا ہے۔ اور اکثر لوگوں کا حال یہ ہے کہ ان کے نفس ناطقہ کا تعلق نسمہ کے ساتھ نہایت پختہ ہوتا ہے، اور نسمہ مادہ کی پیداوار ہے، اس وجہ سے ان کا التفات مادیات کی طرف زیادہ ہوتا ہے اور وہ مادی علوم آسانی سے سمجھ لیتے ہیں۔ اور علوم فوقانی کی طرف چونکہ پورا التفات نہیں ہوتا، اس لئے وہ آسانی سے سمجھ میں نہیں آتے۔

دوسری وجہ: یہ ہے کہ انسان معنویات کو بھی مادیات کے سہارے سمجھنے کا عادی ہے، اور علوم معنوی کی پہلی قسم کے لئے چونکہ سہارا موجود ہے، اس لئے وہ ان کو کسی نہ کسی صورت سے سمجھ لیتا ہے، مگر علوم معنوی کی دوسری قسم چونکہ مادیات سے کوئی مناسبت نہیں رکھتی اس لئے اس کو خالص عقل سے سمجھنا ہوتا ہے، اور وہ مشکل ہے۔ ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ﴾ کی تعبیر بھی اس لئے کرنی پڑی ہے کہ انسان ذات وصفات کو مادیات کے ساتھ موازنہ کرکے سمجھنے کی کوشش نہ کرے۔ ورنہ وہ جہل مرکب کا شکار ہوکر رہ جائے گا۔

واعلم أن تعلق النفس الناطقة بالنسمة أكيدٌ شديدٌ في حق أكثر الناس، وإنما مَثَلُها بالنسبة إلى العلوم البعيدة من مألوفها، كمثل الأكمه: لايتخيل الألوان والأضواء أصلا، ولا مطمعَ لها في حصول ذلك إلا بعد أحقاب كثيرة ومُدَدٍ متطاولة في ضمن تشبُّحات وتمثلات.

ترجمہ: اور جان لیں کہ اکثر لوگوں کی بہ نسبت نفس ناطقہ (روح ربانی) کا تعلق نسمہ (روح حیوانی) کے ساتھ تعلق نہایت ہی پختہ ہے۔ اور نفس ناطقہ کا حال اُن علوم کی بہ نسبت جن سے اس کو بالکل ہی مناسبت نہیں، مادرزاد اندھے کے حال جیسا ہے جو رنگوں اور روشنیوں کو بالکل خیال میں نہیں لا سکتا —— اور نفوس کے لئے اُن نامانوس علوم کے حاصل ہونے کی کوئی امید نہیں ہے مگر قرون کثیرہ اور مدتہائے دراز کے بعد، واقعات وتمثیلات کے ضمن میں۔

☆ ☆ ☆

قیامت اور اس کے بعد پیش آنے والے واقعات کا بیان

مجازات کا سلسلہ دنیا سے شروع ہوتا ہے اور جنت وجہنم پر ختم ہوتا ہے۔ بعض اعمال کا اچھا برا بدلہ دنیا ہی میں دیدیا جاتا ہے۔ کفار کو ان کی نیکیاں دنیا ہی میں کھلا دی جاتی ہیں اور مؤمنین کے لئے بھی بعض پریشانیوں کو کفارۂ سیئات بنادیا

جاتا ہے۔ پھر عذاب قبر اور قبر کی راحتوں کی صورت میں مجازات ہوگی، پھر میدان حشر میں، پھر جنت وجہنم کے راستہ میں، اور آخر میں جنت وجہنم کی صورت میں مجازات ہوگی۔

جن لوگوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو خیر منظور ہوتی ہے ان کو جلد سزا دے کر قصہ ختم کر دیا جاتا ہے۔ نیک لوگوں کو ان کی کوتاہیوں پر دنیا ہی میں ابتلاء میں ڈال کر، پاک صاف کر کے اٹھایا جاتا ہے۔ اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کو زیادہ تر سزا قبر میں دے دی جاتی ہے، قیامت میں جب وہ اٹھیں گے تو گناہوں سے پاک صاف ہوں گے۔

پھر قیامت کے لمبے دن میں، پھر جنت وجہنم کے راستہ میں مختلف لوگوں کو مختلف طرح سے بدلہ دیا جائے گا۔ کسی کا آسان حساب لیا جائے گا، کسی کی سخت دار و گیر کی جائے گی۔ کوئی پل صراط پر سے بجلی کی طرح پار ہو جائے گا تو کسی کو آنکڑے زخمی کر کے جہنم میں کھینچ لیں گے۔ کچھ لوگوں کو حکم دیا جائے گا کہ وہ اپنے راہنماؤں کے پیچھے ہو لیں، پھر وہ راہنما یا تو ان کو جنت میں لے جائیں گے یا جہنم میں پہنچائیں گے۔ کسی کے حق میں اور کسی کے خلاف ہاتھ پاؤں گواہی دیں گے۔ دائیں والے اور بائیں والے اپنے اپنے نامۂ اعمال پڑھیں گے۔ جس نے مال کی زکوٰۃ ادا نہ کی ہوگی، اس کا وہ مال سامنے آئے گا، اور اس کو اسی مال کے ذریعہ مختلف طرح سے سزا دی جائے گی۔ خلاصہ یہ کہ یہ سب واقعات ان اعمال کے پیکر ہائے محسوس ہیں، جو لوگ دنیا سے کما کر لے گئے ہیں اور صورت نوعیہ کی زبان کے مطابق جو تشکل جس کے لئے مناسب ہوگی، وہ اس کے حق میں ظاہر ہوگی۔

اور دوسری زندگی میں کچھ چیزیں ایسی بھی پائی جائیں گی جن کا سب لوگ یکساں طور پر مشاہدہ کریں گے مثلاً ہدایت حوض کوثر کی صورت اختیار کرے گی، نامۂ اعمال، وزن اعمال کی شکل میں سامنے آئیں گے اور جنت کی نعمتیں لذیذ کھانوں، خوشگوار مشروبات، پسندیدہ ازواج، چمکدار لباس اور خوبصورت مکانوں کے روپ میں متشکل ہوں گی۔

اور جو مؤمنین گناہوں کی وجہ سے جہنم میں جائیں گے وہ وہاں سے تدریجاً نکلیں گے۔ مسلم شریف میں اس آدمی کا قصہ مروی ہے جو جہنم میں سے سب سے آخر میں نکلے گا، اس سے اندازہ ہوگا کہ کس طرح آہستہ آہستہ نکلنا ہوگا۔ یہ روایت مشکوٰۃ شریف کتاب احوال القیامۃ، باب الحوض والشفاعۃ۔ حدیث نمبر ۵۵۸۲ پر مذکور ہے۔

اور جنتیوں کی بعض خواہشات عام ہوں گی، کیونکہ وہ نوعی تقاضا ہوں گی، جنت کی عام نعمتیں انہی خواہشات کی تکمیل کے لئے ہوں گی، اور یہی جنت کی اصل نعمتیں ہیں۔ اور بعض خواہشات انفرادی ہوں گی، یہ اول سے کمتر ہیں۔ مگر جنتیوں کے لئے یہ بھی مہیا کی جائیں گی۔ کنز العمال (۱۱: ۶۶۰) فضل جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ حدیث نمبر ۳۳۱۸۷ پر روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جنت میں جہاں سب حوریں (گوری عورتیں) ہیں، حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ کی پسند کی گندمی، سیاہی مائل سرخ ہونٹوں والی لڑکی پیدا کی ہے۔ اور مشکوٰۃ شریف، کتاب احوال القیامۃ باب صفۃ الجنۃ، حدیث نمبر ۵۶۴۳ پر بحوالہ ترمذی شریف روایت ہے کہ جو شخص جنت میں گھوڑ سواری کرنا چاہے گا اس کے لئے اس کا انتظام کر دیا جائے گا۔ اور مشکوٰۃ شریف

کے مذکورہ کتاب اور باب میں حدیث نمبر ۵۶۵۳ پر بحوالہ بخاری شریف روایت ہے کہ اگر کوئی جنت میں کھیتی کرنا چاہے گا تو اس کا بھی انتظام کردیا جائے گا۔

پھر آخر میں پروردگارِ عالم کا دیدار ہوگا، اور اللہ تعالیٰ کی سب سے بڑی تجلی ظاہر ہوگی، اور جنتی مشک کے ٹیلوں پر بیٹھ کر جمالِ انور سے لطف اندوز ہوں گے، پھر اس کے بعد جو کچھ ہونے والا ہے اس کا تذکرہ مناسب نہیں، کیونکہ شارع علیہ السلام نے سکوت فرمایا ہے، پھر دوسرا کیسے لب کشائی کرسکتا ہے۔

والنفوس أول ما تُبعث تُجازى بالحساب اليسير، أو العسير أو بالمرور على الصراط ناجيًا ومخدوشا، أو بأن يتبع كلُّ أحد متبوعه فينجو أو يهلك، أو بنطق الأيدي والأرجل، وقراءة الصُّحُف، أو بظهور ما بخل به، وحمله على ظهره، أو الكَيِّ به؛ وبالجملة فتشبُّحات وتمثُّلات لما عندها، بما تعطيه أحكام الصورة النوعية.

وأيما رجل كان أوثق نفسًا، وأوسع نسمةً، فالتشبحات الحشرية في حقه أتمُّ وأوفرُ؛ ولذلك أخبر النبي صلى الله عليه وسلم: أن أكثر عذاب أمته في قبورهم.

وهنالك أمور متمثِّلة تتساوى النفوس في مشاهدتها، كالهداية المبسوطة ببعثة النبي صلى الله عليه وسلم تتشبَّح حوضًا؛ وتتشبح أعمالُها المحصاة عليها وزنًا، إلى غير ذلك؛ وتتشبح النِّعمة بمطعم هنيئ، ومشرب مريء، ومنكح شهيٍّ، وملبس وضيء، ومسكن بهيّ.

وللخروج من ظلمات التخليط إلى النعمة تدريجات عجيبة، كما بينه النبي صلى الله عليه وسلم في حديث الرجل الذي هو آخرُ أهل النار خروجًا منها؛ وإن للنفوس شهواتٍ تتوارد عليها من تلقاء نوعها، تتمثل بها النعمةُ؛ وشهواتٍ دون ذلك، يتميز بها بعضها من بعض، وهو قول النبي صلى الله عليه وسلم: «دخلتُ الجنة فإذا جارية أدْماءُ، لَعْساءُ، فقلتُ: ماهذه يا جبريل؟ فقال: إن الله تعالى عرف شهوة جعفر بن أبي طالب للأُدْم اللُّعس، فخلق له هذه» وقوله صلى الله عليه وسلم: «إن الله أدخلك الجنة، فلا تشاء أن تُحمل فيها على فرس من ياقوتة حمراء، يطير بك في الجنة حيث شئتَ، إلا فعلتَ» وقوله: «إن رجلاً من أهل الجنة استأذن ربَّه في الزرع، فقال له: ألستَ فيما شئتَ؟ قال: بلى! ولكني أحب أن أزرع، فبذر، فبادر الطرفَ نباتُه واستواؤه واستحصادُه، فكان أمثال الجبال، فيقول الله تعالى: دونك يا ابن آدم! فإنه لايُشبعك شيئٌ»

ثم آخرُ ذلك رؤيةُ رب العالمين، وظهورُ سلطان التجليات في جَنَّة الكثيب، ثم كائنٌ بعدَ ذلك ما أسكتُ عنه، ولا أذكره، اقتداءً بالشارع صلى الله عليه وسلم.

ترجمہ: اور لوگ دوبارہ زندہ کیے جانے کے بعد، سب سے پہلے آسان حساب یا سخت حساب کے ذریعہ بدلہ دیئے جائیں گے یا پل صراط پر گزرنے کے ذریعہ: بچ جانے کے طور پر یا زخمی ہو جانے کے طور پر، یا بایں طور کہ ہر کوئی اپنے متبوع کی پیروی کرے، پھر وہ نجات پائے یا ہلاک ہو، یا ہاتھوں اور پیروں کے بولنے کے ذریعہ اور نامۂ اعمال پڑھنے کے ذریعہ یا اس مال کے سامنے آنے کے ذریعہ جس میں آدمی نے بخیلی کی ہے (یعنی زکوۃ ادا نہیں کی) اور اس کو پیٹھ پر لادنے کے ذریعہ یا اس سے داغ دیئے کے ذریعہ — اور جامع بات یہ ہے کہ یہ تمام واقعات ان اعمال کی تمثیلات اور پیکر ہائے محسوس ہیں جو نفوس کے پاس ہیں بصورت نوعیہ کے احکام کی ذہن کے مطابق۔

اور جو بھی شخص مضبوط نفس والا اور کشادہ نسمہ والا ہے، قیامت میں تمثیلات اس کے حق میں زیادہ کامل اور زیادہ عظیم ہوں گی، اور اسی وجہ سے نبی کریم ﷺ نے خبر دی ہے کہ آپ ﷺ کی امت کی سزا عام طور پر ان کی قبروں میں ہوگی (رواہ مسلم ۲۰۳:۱۷)

اور وہاں (یعنی قیامت کے بعد) کچھ چیزیں ایسی پائی جائیں گی جن کا بھی لوگ یکساں مشاہدہ کریں گے، جیسے وہ ہدایت جو نبی ﷺ کی بعثت کے ذریعہ (عالم میں) پھیلائی گئی ہے، وہ حوض کوثر کی صورت میں متمثل ہوگی۔ اور وہ اعمال جو نفوس کے خلاف ریکارڈ کئے گئے ہیں، وہ وزن اعمال وغیرہ کی شکل میں متمثل ہوں گے، اور اللہ تعالیٰ کی نعمتیں مزے دار کھانوں، خوش گوار مشروبات، پسندیدہ بیویوں، عمدہ پوشاک اور خوبصورت مکانوں کے روپ میں متمثل ہوں گی۔

اور نیکیوں کے ساتھ گناہوں کو ملانے کی تاریکیوں سے نعمت خداوندی کی طرف نکلنے میں بھی حیرت انگیز تمثیل ہوگی، جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے اس کو بیان فرمایا ہے، اس آدمی کے قصہ میں جو جنتیوں میں آخری شخص ہوگا جہنم سے نکلنے کے اعتبار سے۔

اور بیشک نفوس کی کچھ خواہشات تو ایسی ہیں جن پر وہ متفق ہیں، ان کی نوع کی جانب سے (یعنی نوعی تقاضا ہونے کی وجہ سے) اللہ کی نعمتیں ان خواہشات کے ساتھ متمثل ہوں گی — اور کچھ خواہشات ان کے علاوہ ہیں (یعنی کم درجہ کی ہیں) جن کے ساتھ بعض افراد بعض سے ممتاز ہوتے ہیں (یعنی وہ خواہش کسی کسی کی ہوگی) — وہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے (یعنی اس حدیث میں اسی انفرادی خواہش کا تذکرہ ہے) کہ میں جنت میں گیا تو اچانک میں نے ایک گندم گوں، سیاہی مائل سرخ ہونٹوں والی لڑکی دیکھی، تو میں نے پوچھا: جبرئیل! یہ کیا؟ تو انھوں نے جواب دیا: "اللہ تعالیٰ جانتے ہیں کہ حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ کو گندمی رنگ، سیاہی مائل سرخ ہونٹوں والی عورتیں پسند ہیں، اس لئے اللہ تعالیٰ نے یہ لڑکی ان کے لئے پیدا کی ہے" — اور آپ ﷺ کا ارشاد ہے کہ: "بیشک اللہ تعالیٰ تجھ کو جنت میں داخل کریں گے، پھر اگر تو جنت میں چاہے گا کہ سرخ یاقوت کے گھوڑے پر سوار ہو کر جنت میں جہاں چاہے اڑتا پھرے تو یہ بات بھی تجھ کو وہاں حاصل ہوگی — اور آپ ﷺ کا ارشاد ہے کہ: ایک جنتی نے اپنے رب سے کھیتی کرنے کی اجازت

ہو گی۔ اللہ تعالیٰ نے اس سے پوچھا: کیا تجھ کو ہر نعمت میسر نہیں؟ اس نے جواب دیا: کیوں نہیں! مگر میں کھیتی کرنا پسند کرتا ہوں۔ پس وہ بیج بوئے گا، تو کھیتی دیکھتے دیکھتے اُگ آئے گی، سیدھی کھڑی ہو جائے گی اور کٹ جائے گی، وہاں اناج کا پہاڑ جیسا ڈھیر لگ جائے گا۔ پس اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: ''لے لے، اے ابن آدم! تیرا پیٹ کسی چیز سے نہیں بھرتا''

پھر ان سب چیزوں کے بعد پروردگار عالم کا دیدار ہوگا اور اللہ کی سب سے بڑی تجلی ظاہر ہوگی، مخلف کے ٹیلوں والے باغ میں، پھر اس کے بعد جو کچھ ہونے والا ہے اس کے بارے میں، میں سکوت اختیار کرتا ہوں۔ اور میں اس کا تذکرہ نہیں کرتا۔ شارع علیہ السلام کی پیروی کرتے ہوئے۔

لغات:

خدش (ض) خراش لگانا   کوئی نکوچ کٹ لوہے وغیرہ سے داغ دینا ۔ اوثق نفسا: جس کا نفس ناطقہ (روح ربانی) مضبوط ہو   اوسع نسمۃ: جس کا نسمہ (روح حیوانی) زیادہ کشادہ ہو۔ یعنی زیادہ مضبوط ہوا یعنی مضبوط نفس اور جسم والی گذشتہ امتیں ہیں، میدان قیامت کے واقعات ان کے حق میں زیادہ ظاہر ہوں گے۔ امت محمدیہ کمزور جسم والی امت ہے اس لئے ان کا عذاب زیادہ تر قبر میں ہوگا۔ مولانا سندھی رحمہ اللہ فرماتے ہیں قولہ: ایما رجل کان اوثق نفسا یعنی کل رجل وامرأۃ کان عظیم النفس، واسع النسمۃ، جسیم البدن، کالأمم الماضیۃ، فالشبحات الحشریۃ فی حقہم أتم وأعظم یعنی حیاتہم وعقاربہم وغیرہما أتم وأوفر بالنسبۃ إلی أمۃ سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، ولذا أخبر إلخ اھ   الہنیئ: خوش گوار هنأ (ض ف ک) الطعام: خوش گوار ہونا   المریئ: خوش گوار مرأ الطعام: خوش گوار ہونا۔   منکح: نکاح کی جگہ یعنی عورت   الشہی: مرغوب جیسے شیئ شہی: پسندیدہ چیز   الرضیۃ: پاکیزہ خوبصورت جمع وضاۃ ۔ البہی: حسین و خوبصورت مؤنث بہیۃ، بہا (ن س ک) بہاء: حسین و خوبصورت ہونا   تواود: عشق بازی   آدم: گندم گوں مؤنث ادماء جمع اُدم ۔ لعس (س) لعسا: سیاہی مائل سرخ ہونٹ والا ہونا صفت ألعس مؤنث لعساء جمع لُعس۔

(بفضلہ تعالیٰ جمعہ ۳ ربیع الثانی ۱۴۲۰ھ مطابق ۱۶ جولائی ۱۹۹۹ء کو مبحث دوم کی شرح مکمل ہوئی)

پہلی قسم

قواعد کلیہ کے بیان میں

مبحث سوم

ارتفاقات کی بحث

مبحث سوم

ارتفاقات کی بحث

باب (۱) ارتفاقات کو مستنبط کرنے کا طریقہ

باب (۲) ارتفاق اول میں شامل چیزیں

باب (۳) فن آداب معاش کا بیان

باب (۴) فن تدبیر منزل (خانگی انتظام) کا بیان

باب (۵) فن معاملات کا بیان

باب (۶) نظام حکومت کا بیان

باب (۷) سربراہ مملکت کے لئے ضروری اوصاف

باب (۸) سرکاری عملہ کے نظم و انتظام کا بیان

باب (۹) خلافت کبریٰ کا بیان

باب (۱۰) ارتفاقات کی بنیادی باتیں متفق علیہ ہیں

باب (۱۱) لوگوں میں رائج طور وطریق کا بیان

مبحث سوم

ارتفاقات کی بحث

ارتفاق. شاہ صاحب رحمہ اللہ کی ایک خاص اصطلاح ہے۔ شاہ صاحب اپنی تصنیفات میں یہ اصطلاح کثرت سے استعمال فرماتے ہیں، اس لئے اس کا مفہوم ذہن نشین کر لینا چاہئے۔

ارتفق به کے معنی ہیں نفع اٹھانا۔ اس کا مادہ ہے رفق (ر۔ ف۔ ق) رفق به وله وعليه. مہربانی کا برتاؤ کرنا ——— اور شاہ صاحب کے اصطلاحی معنی ہیں: آسائش سے زندگی بسر کرنے کی مفید تدبیریں۔ تدبیرات نافعہ، زندگی کی سہولتیں اور مفید اسکیمیں بھی اس کا ترجمہ کیا جا سکتا ہے۔ حضرت علامہ سندھی رحمہ اللہ وجہ تسمیہ بیان کرتے ہیں: "جو چیزیں اللہ تعالیٰ نے دنیا میں پیدا کی ہیں، وہ انسان کے ساتھ خشونت سے پیش آتی ہیں، اور فائدہ دینے سے ابا کرتی ہیں، انسان اُن چیزوں کو نہایت نرمی سے تسخیر کر لیتا ہے، جیسے درخت کو آہستہ آہستہ نرمی سے کلہاڑی سے کاٹتا ہے" (حاشیہ عربی) اسی طرح زمین کو آہستہ آہستہ کھود کر اس میں سے کھوٹ پانی نکال لیتا ہے، بچھڑے کو نرمی سے سدھا لیتا ہے، ہاتھی کو رام کر لیتا ہے، گھوڑے کو لگام دیدیتا ہے، شیر کو شکنجہ میں کس لیتا ہے، وقس علیٰ ہذا۔ انسان کا اسی قسم کا طریق کار اور یہی کار گری ارتفاق کہلاتی ہے۔

باب ——— ۱

ارتفاقات کو مستنبط کرنے کا طریقہ

ارتفاقات (تدبیرات نافعہ) فطری بھی ہوتے ہیں اور اکتسابی بھی۔ انتفاع کے فطری طریقے قدرت نے تمام حیوانات کو الہام فرمائے ہیں۔ انسان بھی اس سے محروم نہیں۔ ان فطری طریقوں کو رائیگاں نہیں چھوڑنا چاہئے، استعمال کرنا چاہئے۔ اور اکتسابی ارتفاقات وہ ہیں جو انسان اپنی عقل سے مستنبط کرتا ہے۔ یہ صلاحیت اللہ تعالیٰ نے دیگر حیوانات کو نہیں دی، صرف انسان کو بخشی ہے۔ انسان نے خداکی بخشی ہوئی اس صلاحیت سے کام لے کر تمدن کو زمین سے آسمان تک پہنچا دیا ہے!

علامہ سندھی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: قوله: الارتفاقات: جمع ارتفاق بمعنى الانتفاع برفق، والمراد طُرق

الانتفاع، فالمعنى: هذا باب في كيفية إيجاد طرق الانتفاع من الأشياء، واستعمالها إن كانت موجودة، ومعرفتها واستعمالها إن كانت جبلية اھ

آسائش سے زندگی بسر کرنے کے لئے ارتفاقات ضروری ہیں

انسان بھی دیگر حیوانات کی طرح بہت سی حاجتیں رکھتا ہے، وہ کھانے پینے کا، مباشرت کرنے کا، دھوپ اور بارش سے بچاؤ کرنے کا، سردی میں آگ یا کپڑوں سے گرمی حاصل کرنے کا اور ان کے علاوہ بہت سی چیزوں کا محتاج ہے۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کا کرم ہے کہ اس نے انسان کو فطری طور پر سمجھا دیا ہے کہ وہ ان حاجات کو رفع کرنے کے لئے کیا تدبیریں اختیار کرے؟ اور جب یہ امور فطری ہیں تو ضروری ہے کہ تمام انسان اس سلسلہ میں برابر ہوں۔ ہاں اگر انسان کا کوئی فرد ناقص ہو مثلاً نامرد ہو تو اس کو مباشرت کی حاجت ہوگی نہ اس کے لئے کوئی تدبیر کرنے کی ضرورت۔

اور ان فطری امور کا الہام صرف انسان کو نہیں کیا گیا، اللہ تعالیٰ نے تمام حیوانات کو ان کی ضروریات سمجھا دی ہیں۔ شہد کی مکھیوں اور چڑیوں کے احوال پر نظر ڈالنے سے یہ بات بخوبی آشکارا ہو جاتی ہے۔ البتہ انسان کو چونکہ تمام انواع سے بہتر صورت نوعیہ عطا فرمائی گئی ہے یعنی وہ اشرف المخلوقات ہے، اس لئے وہ مذکورہ بالا فطری الہامات کے ساتھ تین چیزیں مزید ملاتا ہے۔

اول: عقلی فائدے کے لئے کام کرنا: حیوانات ہمیشہ طبیعت کے تقاضے سے کام کرتے ہیں، جیسے بھوک، پیاس اور شہوت وغیرہ حاجات کی تکمیل کے لئے جدوجہد کرتے ہیں، ان کو کوئی پانی نظر آتا ہے یا خیال ہوتا ہے کہ فلاں جگہ یہ چیزیں ملیں گی تو وہ فطری داعیہ سے اس کی طرف چل پڑتے ہیں ــــ مگر انسان ہمیشہ طبیعت کا تقاضا ہی پیش نظر نہیں رکھتا، بلکہ وہ عقلی فائدے کے لئے بھی کام کرتا ہے۔ مثلاً ملک میں صالح نظام برپا کرنے کے لئے محنت کرتا ہے، اپنے اخلاق کی تکمیل اور نفس کو سنوارنے کے لئے کوششیں کرتا ہے، عذاب آخرت سے رستگاری کا سامان کرتا ہے، اور لوگوں میں اپنی ساکھ بنانے کے لئے دوڑ دھوپ کرتا ہے، اور اسی قسم کے دوسرے کام کرتا ہے جن کا فائدہ عقل سے معلوم ہو سکتا ہے۔

دوم: حاجت روائی کے ساتھ نفاست کا خیال رکھنا: حیوانات صرف حاجت برآری چاہتے ہیں، اس سے آگے ان کا کوئی مقصد نہیں ہوتا۔ اور انسان چاہتا ہے کہ اس کی حاجتیں عمدہ طریقہ پر پوری ہوں۔ وہ تکمیل حاجت کے ساتھ آنکھ کی ٹھنڈک اور نفس کی لذت بھی چاہتا ہے۔ اس لئے وہ خوبصورت بیوی، لذیذ کھانا، عمدہ لباس اور شاندار رہائش کا خواہشمند ہوتا ہے۔

سوم: ان میں عقلمندوں کا پایا جانا: انسانوں میں ایسے عقلمند اور بابصیرت لوگ پائے جاتے ہیں، جو ضروریات زندگی کی تکمیل کے لئے بہترین راہیں وجود میں لا سکتے ہیں، اور دوسرے ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جن کو ضرورتیں تو

احساس تو ہوتا ہے مگر کسی وجہ سے وہ مفید تدبیریں نکال نہیں سکتے مگر جب عقل مندوں کی نکالی ہوئی تدبیریں ان کے سامنے آتی ہیں تو وہ اس کو دل سے قبول کر لیتے ہیں، کیونکہ وہ ان کے دل کی خواہش کے مطابق ہوتی ہیں۔

مثال سے وضاحت: فرض کیجئے: ایک شخص تمدن کے بالکل ابتدائی زمانہ میں ہے۔ اسے بھوک پیاس لگتی ہے، مگر وہ کوئی چیز کھانے پینے کے لئے نہیں پاتا، وہ بہت پریشان ہوتا ہے اور حاجت برآری کی شکلیں سوچتا ہے، مگر کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ پھر اس کی کسی دانشمند سے ملاقات ہوتی ہے، جو اسی کی طرح ان تکالیف سے دوچار ہو چکا ہے، چنانچہ اس نے کھانے کے لئے غلہ دریافت کر لیا ہے اور اس کو بونے کاٹنے گاہنے برسانے اور وقت حاجت کے لئے محفوظ کرنے کا طریقہ جان لیا ہے اور جو زمینیں نہروں اور چشموں سے دور ہیں ان کی آبپاشی کے لئے کنویں کھودنے کا طریقہ اور مٹکے مشکیں اور رہٹ کے پیالے بنانے کا طریقہ مستنبط کر لیا ہے پس وہ شخص اس دانشمند کے تمام طریقوں کو اپنا لیتا ہے۔ یہ ارتفاقات (تدبیرات نافعہ) کا ایک باب ہے۔

پھر اس شخص نے غلہ تو اگا لیا، مگر استعمال کا طریقہ نہیں جانتا، یونہی کچا چباتا ہے، اور سبزی ترکاری اور پھلوں کو کچا کھاتا ہے، اس لئے وہ ہضم نہیں ہوتے، اور پیٹ میں شکایت پیدا ہوتی ہے اس لئے وہ کوئی مناسب تدبیر سوچتا ہے، مگر اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا، اچانک کسی دانشمند سے اس کی ملاقات ہوئی، جس نے پکانے تلنے، پیسنے اور روٹی بنانے کا طریقہ جان لیا ہے تو وہ شخص ان چیزوں کو بھی فوراً اپنا لیتا ہے، اور یہ ارتفاقات کا دوسرا باب ہو جاتا ہے۔

یوں نئی نئی ایجادیں وجود میں آتی رہتی ہیں اور تمدن ترقی کرتا رہتا ہے۔ دنیا کے احوال پر غور کریں، آج دنیا جہاں تک پہنچی ہوئی ہے، یک بارگی وہاں تک نہیں پہنچ گئی، مثلاً آگ پہلے صرف پتھر (چقماق) میں تھی یا بعض درختوں میں تھی، پھر انسان نے گندھک دریافت کر لی جس سے ماچس بننے لگی، پھر مزید کھوج لگائی تو برق (بجلی) ہاتھ آ گئی جس کی وجہ سے تمدنی ترقیات آسمان کو چھونے لگیں۔

غرض ارتفاقات رفتہ رفتہ وجود میں آتے ہیں۔ پھر صدیوں تک لوگ ان کو نباہتے رہتے ہیں۔ اس طرح علوم الہامیہ کی اچھی خاصی مقدار جمع ہو جاتی ہے۔ تجربات اس کی افادیت پر صاد کرتے ہیں اور لوگ ان ارتفاقات کے ساتھ چلتے رہتے ہیں اور اسی پر ان کا مرنا جینا ہوتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ یہاں دو چیزیں ہیں: ایک فطری الہامات، دوسری مذکورہ تمدنی چیزیں جو انسان کی امتیازی چیزیں ہیں ان دونوں کا حال سانس جیسا ہے۔ حیات انسانی کے لئے سانس ضروری ہے، جیسے نبض کی حرکت ضروری ہے، چنانچہ انسان کو فطری طور پر سانس لینے کا الہام کیا گیا ہے۔ قدرت نے اس کا علم انسان کی صورت نوعیہ میں سمو دیا ہے مگر سانس کو چھوٹا بڑا کرنا انسان کے اختیار میں ہے، اسی طرح فطری علوم کو سنوارنا انسان کے اختیار میں ہے اور ان علوم کو سنوار کر ہی انسان آسائش کی زندگی بسر کر سکتا ہے۔

المبحث الثالث: مبحث الارتفاقات

باب كيفية استنباط الارتفاقات

اعلم أن الإنسان يُوافق أبناء جنسه في الحاجة إلى الأكل والشُّرب، والجماع، والاستظلال من الشمس، والمطر، والاستدفاء في الشتاء وغيرها.

وكان من عناية الله تعالى به أن ألهمه: كيف يرتفق بإزاء هذه الحاجات إلهاماً طبيعياً من مقتضى صورته النوعية، فلا جرم يتساوى الأفراد في ذلك، إلا كلُّ مُخْدَج عصت مادتُه؛ كما ألهم النحل: كيف تأكل الثمرات؟ ثم كيف تتخذ بيتا يجتمع فيه أشخاصٌ من بني نوعها؟ ثم كيف تنقاد ليعسوبها؟ ثم كيف تعسِّل؟ وكما ألهم العصفور: كيف يبتغي الحبوبَ النافية؟ وكيف يرد الماء؟ وكيف يفرعن السنّور والصياد؟ وكيف يقاتل من صدَّه عما يحتاج إليه؟ وكيف يسافد ذكرُه الأنثى عند الشبق، ثم يتخذان عُشًّا عند الحمل؟ ثم كيف يتعاونان في حضانة البَيض؟ ثم كيف يزُقّان الفراخ؟ وكذلك لكل نوع شريعةٌ تُنفث في صدور أفراده من طريق الصورة النوعية.

وكذلك ألهم الإنسان: كيف يرتفق من هذه الضرورات؟ غير أنه انضمَّ له مع هذا ثلاثةُ أشياء، لمقتضى صورته النوعية الرابية على كل نوع:

أحدها: الانبعاث إلى شيء من رأي كلي: فالبهيمة إنما تنبعث إلى غرض محسوس أو متوهَّم، من داعية ناشئة من طبيعتها، كالجوع والعطش والشبق، والإنسان ربما ينبعث إلى نفع معقول، ليس له داعية من طبيعته، فيقصد أن يُحَصِّل نظاما صالحا في المدينة، أو يُكمِّل خُلُقه ويهذِّب نفسه، أو يَتَفَصّى من عذاب الآخرة، أو يُمكِّن جاهه في صدور الناس.

والثاني: أنه يَضُمُّ مع الارتفاق الظرافة: فالبهيمة إنما تبتغي ما تَسُدُّ به خَلَّتَها، وتدفع حاجتها فقط، والإنسان ربما يريد أن تَقَرَّ عينُه، وتَلَذُّ نفسه زيادةً على الحاجة، فيطلب زوجة جميلة، وطعاما لذيذا، وملبسا فاخرا، ومسكنا شامخا.

والثالث: أنه يوجد منهم أهلُ عقل ودراية يستنبطون الارتفاقات الصالحة، ويوجد منهم من يختلج في صدره ما اختلج في صدور أولئك، ولكن لا يستطيع الاستنباط، فإذا رأى من الحكماء وسمع ما استنبطوه، تلقّاه بقلبه، وعضَّ عليه بنواجذه، لِمَا وجدَه موافقا لعلمه الإجمالي.

فرب إنسان يجوع ويظمأ، فلا يجد الطعام والشراب، فيقاسي ألما شديدا، حتى يجدهما،

فيحاول ارتفاقاً بإزاء هذه الحاجة، ولا يهتدي سبيلاً، ثم يتفق أن يلقى حكيماً، أصابه ما أصاب ذلك، فتعرّف الحبوب الغاذية، واستنبط بَذْرَها وحصادها ودياسها وتذريتها، وحفظها إلى وقت الحاجة، واستنبط حَفْرَ الآبار للبعيد من العيون والأنهار، واصطناعَ القِلالِ والقِرَبِ والقِصاع، فيتخذ ذلك باباً من الارتفاق.

ثم إنه يَقْضِمُ الحبوب كما هي، فلا تنهضم في معدته، ويرتع الفواكه نِيئةً فلا تنهضم، فيحاول شيئاً بإزاء هذه، فلا يهتدي سبيلاً فيلقى حكيماً استنبط الطبخ والقلي والطحن والخُبْز، فيتخذ ذلك باباً آخر، وقس على ذلك حاجاته كُلَّها.

والمستبصر يشهد عنده لِمَا ذكرنا حدوثُ كثير من المرافق في البلدان بعد ما لم تكن تمضي على ذلك قرون، ولم يزالوا يعملون ذلك، حتى اجتمعت جملة صالحة من العلوم الإلهامية المؤيَّدة بالمكتسبة، وتمكنت عليها نفوسهم، وعليها كان محياهم ومماتهم.

وبالجملة: فحال الإلهامات الضرورية مع هذه الأشياء الثلاثة، كمَثَل النفس: أمره ضروري بمنزلة حركة النبض، وقد تقتحمه الاختيار في صِغَرِ الأنفاس وكِبَرِها.

ترجمہ: مبحث سوم: ارتفاقات کی بحث: باب: ارتفاقات کو مستنبط کرنے (نکالنے، وجود میں لانے) کا طریقہ:
جان لیں کہ انسان اس کے ابنائے جنس کی طرح ہے کھانے پینے، مباشرت کرنے، دھوپ اور بارش سے بچاؤ کرنے، سردی میں گرم ہونے اور ان کے علاوہ دیگر حاجات میں۔

اور انسان پر اللہ تعالیٰ کی عنایت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو اس کی صورت نوعیہ کے اقتضاء سے فطری طور پر الہام فرمایا کہ وہ ان حاجات کو رفع کرنے کے لئے کچھ تدابیر اختیار کرے۔ پس یہ امر یقینی ہے کہ ان امور میں تمام افراد انسانی برابر ہوں گے، ہاں ناقص الخلقت انسان مستثنیٰ ہے، جس کے مادہ نے نافرمانی کی ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ نے شہد کی مکھیوں کو الہام فرمایا کہ وہ پھل کیسے کھائے؟ پھر وہ چھتا کیسے بنائے جس میں اس کی نوع کے افراد اکٹھا ہوں؟ پھر وہ اپنے سردار کی اطاعت کس طرح کرے؟ پھر وہ شہد کیسے بنائے؟ — اور جس طرح اللہ تعالیٰ نے چڑیوں کو الہام فرمایا ہے کہ وہ کھانا دانا کس طرح تلاش کرے؟ اور کس طرح وہ پانی پر پہنچے؟ اور کس طرح وہ بلی اور شکاری سے بھاگے؟ اور کس طرح وہ لڑے اس سے جو اس کو اس کی ضروریات سے روکے؟ اور بوقت شہوت اس کا مادہ سے کس طرح جفتی کرے، پھر دونوں مل کر پہاڑ کے قریب (کس طرح) آشیانہ بنائیں؟ پھر انڈے سینے میں کس طرح ایک دوسرے کی معاونت کریں؟ پھر کس طرح دونوں چوزوں کو چگائیں؟ اور اسی طرح (حیوانات کی) ہر نوع کے لئے ایک قانون ہے، جو صورت نوعیہ کی راہ سے اس نوع کے افراد کے سینوں میں پھونکا گیا ہے۔

اور اسی طرح اللہ تعالیٰ نے انسان کو الہام فرمایا کہ وہ ان ضروریات کی تکمیل کے لئے کیا مفید تدبیر اختیار کرے؟ مگر انسان کے لئے اس عام الہام کے ساتھ تمام انواع پر اس کی برتر صورت نوعیہ کے تقاضے سے تین چیزیں بڑھائی گئی ہیں

ان میں سے ایک: رائے کلی سے کسی چیز کے لئے اٹھ کھڑا ہونا ہے — یعنی چوپائے اپنی طبیعت سے پیدا ہونے والے داعیے کسی محسوس یا وہمی مقصد ہی کے لئے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں جیسے بھوک، پیاس اور شہوت۔ اور انسان کبھی عقلی فائدے کے لئے اٹھ کھڑا ہوتا ہے، اس کام کے لئے اس کی طبیعت کا کوئی تقاضہ نہیں ہوتا، جیسے وہ ملک میں صالح نظام قائم کرنے کا ارادہ کرتا ہے یا اپنے اخلاق کی تکمیل یا اپنے نفس کی تہذیب کرتا ہے یا عذاب آخرت سے رستگاری کی فکر کرتا ہے، یا لوگوں کے سینوں میں اپنا دبدبہ جماتا ہے۔

اور دوسری چیز: یہ ہے کہ انسان حاجت پوری کرنے کے ساتھ نفاست کو ملاتا ہے — جبکہ چوپایہ صرف وہ چیز چاہتا ہے جس سے وہ اپنی حاجت برآری کرے، اور صرف اپنی ضرورت کو بنائے۔ اور انسان کبھی چاہتا ہے کہ حاجت برآری کے علاوہ اس کی آنکھ ٹھنڈی ہو اور اس کا نفس لطف اندوز ہو، اس لئے وہ خوبصورت بیوی، مزے دار کھانا، عمدہ لباس، فاخرہ، اور بلند مکان ڈھونڈھتا ہے۔

اور تیسری چیز: یہ ہے کہ انسانوں میں ایسے صاحب عقل وبصیرت پائے جاتے ہیں جو ضروریات زندگی کی تکمیل کے لئے مفید تدبیریں وجود میں لا سکتے ہیں۔ اور ان میں ایسے لوگ بھی پائے جاتے ہیں جن کے سینوں میں وہ بات کھٹکتی ہے جو ان لوگوں کے سینوں میں کھٹکتی ہے، مگر وہ مفید تدبیریں وجود میں نہیں لا سکتا۔ پھر جب وہ عقل مندوں کو دیکھتا ہے اور ان مفید تدبیروں کے بارے میں سنتا ہے، جو انھوں نے قائم کی ہیں، تو وہ ان کو دل سے قبول کر لیتا ہے اور ان کو اپنی ذات سے مضبوط پکڑ لیتا ہے، اس لئے کہ اس نے ان تدبیرات کو اپنے علم اجمالی کے موافق پایا ہے۔

مثلاً: ایک شخص بھوکا پیاسا ہوتا ہے، یعنی وہ کھانے پینے کی کوئی چیز نہیں پاتا، یعنی وہ انتہائی تکلیف برداشت کرتا رہتا ہے تا آنکہ ان دونوں چیزوں کو پالے، یعنی وہ اپنی اس حاجت کو رفع کرنے کے لئے مفید تدبیریں سوچتا رہتا ہے، اور وہ اس کی کوئی راہ نہیں پاتا، پھر اتفاقاً اس کی کسی دانشمند سے ملاقات ہوتی ہے، جو اسی کی طرح ان تکالیف سے دوچار ہو چکا ہے، یعنی اس نے کھانے کے لئے غلے کو دریافت کر لیا ہے، اور اس نے اس غلہ کو بونے کاٹنے گاہنے پیسنے اور وقت حاجت کے لئے محفوظ رکھنے کا طریقہ نکال لیا ہے، اور چشموں اور نہروں سے دور مقامات کے لئے کنویں کھودنے اور مٹکے، سبو اور (ریت کے) چولہے بنانے کا طریقہ مستنبط کر لیا ہے، پس وہ شخص اس کو تدبیرات نافعہ کا ایک باب بتلاتا ہے۔

پھر بیشک وہ غلہ کو یونہی کچا چباتا ہے، یعنی وہ اس کے پیٹ میں ہضم نہیں ہوتا، اور وہ کچے ہی پھل کھاتا ہے، پس وہ ہضم نہیں ہوتے، پس وہ اس سلسلہ میں کوئی اچھی تدبیر چاہتا ہے اور وہ اس کی کوئی راہ نہیں پاتا، پس وہ کسی ایسے دانشمند سے ملتا ہے جس نے پکانے بھوننے، پیسنے اور روٹی بنانے کا طریقہ مستنبط کر لیا ہے، پس وہ اس کو ایک (دوسرا) باب بتلاتا ہے

اور اسی پر انسان کی تمام حاجات کو قیاس کر لیجئے۔

اور عقل مند آدمی کے سامنے، ان باتوں کے لئے جو ہم نے ذکر کیں کوئی دیتا ہے ممالک میں بہت سی تدبیرات نافعہ کا جو پیدا ہونا جو پہلے نہیں تھیں، پس اس پر صدیاں گزر گئیں اور لوگ برابر وہ کام کرتے رہے یہاں تک کہ علوم الہامیہ کی نئی نئی: بھی خاصی مقدار جمع ہوگئی جو تجربات سے تائید یافتہ ہے۔ اور ان علوم پر لوگوں کے نفوس خشک ہوگئے (یعنی لوگوں کی محبتیں ان علوم پر پیوستہ رہیں) اور اسی پر وہ مرتے جیتے رہے۔

اور خلاصہ یہ کہ ان تین چیزوں کے ساتھ ضروری الہامات کا تعلق ایسا ہے جیسے سانس کا معاملہ کہ اس کی اصل ضروری ہے جیسے نبض کی حرکت اور تحقیق اس کے ساتھ ملا لیا گیا ہے ماحولوں کو جمع کرنے کا اختیار۔

لغات:

إسْتَظَلَّ من الشيء سایہ لینا . إستدفأ گرم ہونا، گرم کپڑا پہننا . اليعسوب: شہد کی مکھی، شہد کی مکھیوں کا بادشاہ . سَافَر مُسَافَرَۃ: سفر کرنا . الشبق: قوت شہوت شبق (س) شبقا بہت شہوت والا ہونا . الراجية: پر آرام بسر کرنے والی زندگی نما ینمو نماء: زیادہ ہونا، بڑھنا ... حصّل الشيء: حاصل کرنا . تفصّی تفصّیا رہائی پانا ..... سَدَّ (ن) سدًّا: بند کرنا . الخلّة: حاجت ... خَبَزَ (ض) خبزًا: روٹی پکانا . عاوَن معاونۃ: مدد کرنا ... رَتَعَ (ف) رتعا: آسودہ زندگی بسر کرنا، یہاں پھل کھانے کے لئے استعمال کیا گیا ہے، کیونکہ پھل آسودہ لوگ کھاتے ہیں . قلی یقلی قلیا: گوشت وغیرہ بھوننا . الغاذية (اسم فاعل واحد مؤنث) خوراک . غذا یغذو غذوا الرجل بالطعام: خوراک دینا۔

تصحیح: ینبت اصل میں تنبت تھا جس کے معنی ہیں لازم ہونا یعنی ان علوم کے ساتھ لوگوں کے نفوس چمٹے رہے۔ تصحیح مخطوطات سے کی گئی ہے، تینوں مخطوطوں میں ینبت ہے۔

تشریح:

(۱) انسان کی حد تام ہے حیوان ناطق اس میں حیوان جنس ہے اور ناطق فصل۔ پس حیوان انسان کی جنس ہے اور اس جنس کے جتنے افراد ہیں یعنی تمام حیوانات وہ انسان کے ابنائے جنس ہیں ___ اور انسان خود حیوان کی ایک نوع ہے اس نوع کے جتنے افراد ہیں وہ سب انسان کے ابنائے نوع ہیں۔

(۲) رائے کلی: یہ شاہ صاحب رحمہ اللہ کی خاص اصطلاح ہے۔ اس کا مقابل رائے جزئی ہے۔ مولانا سندھی رحمہ اللہ نے رائے کلی کا مفہوم عقل، وہم اور فکر کا مل بیان کیا ہے اور حاشیہ میں لکھا ہے کہ مفاد عامہ کے لئے کام کرنا رائے کلی ہے اور ذاتی اور شخصی غرض کے لئے کام کرنا رائے جزئی ہے۔

☆ ☆ ☆

ارتفاقات مستنبط کرنے کا طریقہ

انسان کے جو تین امتیازی اوصاف ہیں یعنی رائے کلی کے پیشِ نظر اقدام کرنا، ضروریات کی تکمیل میں نفاست کا خیال رکھنا اور بعض لوگوں کا تدبیراتِ نافعہ مستنبط کرنا اور دوسروں کا ان میں پیروی کرنا۔ ان تین باتوں میں تمام انسان برابر نہیں۔ لوگوں کے مزاج اور عقلیں متفاوت ہیں اور ان تین باتوں کا تعلق مزاج اور عقل سے ہے۔ نیز تمام لوگ ان تین باتوں میں غور وفکر کے لئے فارغ بھی نہیں۔ نہ سب لوگ عمرانیات (Sociology) کا پورا علم رکھتے ہیں۔ اس وجہ سے ارتفاقات کے دو درجے ہوگئے:

پہلا درجہ: تمدن کا معمولی درجہ ہے۔ جیسے خانہ بدوش لوگوں کی تہذیب، پہاڑوں کی چوٹیوں پر بسنے والوں کا تمدن اور شہروں سے دور آباد کنارے رہنے والوں میں سکونت پذیر لوگوں کی معاشرت — تمدن کا یہ درجہ ارتفاقِ اول یعنی تمدن کا ابتدائی درجہ (دیہی تمدن) کہلاتا ہے۔

دوسرا درجہ: ترقی یافتہ تمدن، جیسے شہری لوگوں کا رہن سہن اور فاضل، دانش خطوں کی آبادیوں کا تمدن — ایسے اجتماعات میں ضروری ہوتا ہے کہ دانشمند لوگ اور اخلاقِ فاضلہ کے حاملین پیدا ہوں۔ گنجان آبادی، ضرورتوں کی زیادتی اور تجربات کی فراوانی معیشت کے اعلیٰ طریقے مستنبط کرنے کا باعث ہوتی ہے اور لوگ ان طریقوں کو اپنا بھی لیتے ہیں۔
تمدن کا یہ درجہ ارتفاقِ ثانی یعنی ترقی یافتہ تمدن یا شہری تمدن کہلاتا ہے۔ پھر شہری تمدن کا بھی اعلیٰ درجہ شاہوں کی معیشت ہے۔ ان کے دربار میں دنیا بھر کے دانشمند جمع ہوتے ہیں، اس لئے شاہ صاحبان ان سے معیشت کے بہترین طریقے اخذ کرتے ہیں اور ٹھاٹھ سے زندگی بسر کرتے ہیں۔

پھر جب ترقی یافتہ تمدن وجود پذیر ہوجاتا ہے تو تین وجوہ سے نظامِ حکومت ضروری ہوتا ہے:

(۱) جب لوگوں میں باہم معاملات ہوتے ہیں تو ان میں کبھی حرص وحسد، حق تلفی اور جانتے ہوئے بھی حق کے انکار کی برائیاں درآتی ہیں، جس کی وجہ سے لوگوں میں اختلافات اور تنازعات جنم لیتے ہیں۔ ان سے نمٹنے کے لئے نظامِ حکومت ضروری ہے۔

(۲) ہر بڑے اجتماع میں بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جن پر درندگی خواہشات کا غلبہ ہوتا ہے، یا ان میں فطری طور پر قتل وغارت گری کی جرأت ہوتی ہے اور وہ بے باک ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ معاشرہ کے لئے دردِ سر بن جاتے ہیں۔ ان سے نمٹنے کے لئے نظامِ حکومت ضروری ہے۔

(۳) ترقی یافتہ تمدن میں کچھ ایسی مفید اسکیمیں ہوتی ہیں جن کا نفع عام ہوتا ہے، جیسے سڑکیں اور پل بنانا، ریل کا سلسلہ پھیلانا، پانی بجلی کا انتظام کرنا وغیرہ۔ یہ کام کوئی ایک شخص نہیں کرسکتا، یا کرسکتا ہے مگر آسان نہیں ہوتا یا وہ اس کے

شاہ صاحب کی اصطلاح میں بدوی معاشرت یعنی صحرائی رہن سہن ارتفاق اول ہے اور ترقی یافتہ تمدن یعنی شہری معاشرت ارتفاق ثانی ہے، اور نظام حکومت ارتفاق ثالث ہے اور مرکزی نظام حکومت یعنی خلافت کبریٰ ارتفاق رابع ہے۔

ولما كانت هذه الثلاثة لا توجد في جميع الناس سواءً، لاختلاف أمزجة الناس وعقولهم، الموجبة للانبعاث من رأي كلي، ولحب الظرافة، ولاستنباط الارتفاقات والاقتداء فيها، ولاختلافهم في الفراغ للنظر ونحو ذلك من الأسباب: كان للارتفاقات حدّان:

الأول: هو الذي لا يمكن أن ينفك عنه أهل الاجتماعات القاصرة، كأهل البدو وسكان شواهق الجبال، والنواحي البعيدة من الأقاليم الصالحة؛ وهو الذي نسميه بالارتفاق الأول.

والثاني: ما عليه أهل الحضر والقُرى العامرة من الأقاليم الصالحة، المستوجبة أن ينشأ فيها أهلُ الأخلاق الفاضلة والحكماءُ، فإنه كثُر هنالك الاجتماعات، وازدحمت الحاجات، وكثرت التجارب، فاستُنبطت سننٌ جزيلة، وعضُّوا عليها بالنواجذ؛ والطرف الأعلى من هذا الحد: ما يتعامله الملوكُ أهلُ الرفاهية الكاملة، الذين يرِدُ عليهم حكماءُ الأمم، فينتحلون منهم سننا صالحة؛ وهو الذي نسميه بالارتفاق الثاني.

ولما كمُل الارتفاق الثاني أوجب ارتفاقاً ثالثاً، وذلك: أنهم لما دارت بينهم المعاملاتُ، ودخلها الشُّحُّ والحسد والمَطْلُ والتجاحد، نشأت بينهم اختلافاتٌ ومنازعات؛ وأنهم نشأ فيهم من تغلِبُ عليه الشهواتُ الرديئة، أو يُجبَل على الجرأة في القتل والنهب؛ وأنهم كانت لهم ارتفاقاتٌ مشتركةُ النفع، لا يطيق واحد منهم إقامتها، أو لا تسهُل عليه، أو لا تسمح نفسه بها: فاضطروا إلى إقامة ملِكٍ يقضي بينهم بالعدل، ويزجُر عاصيهم، ويقاوم جريئهم، ويجبي منهم الخراج، ويصرفه في مصرفه.

وأوجب الارتفاق الثالث ارتفاقاً رابعاً، وذلك: أنه لما انفرز كلُّ ملِكٍ بمدينته، وجُبي إليه الأموالُ وانضمَّ إليه الأبطالُ، ودخلهم الشحُّ والحرص والحقد، تشاجروا فيما بينهم وتقاتلوا، فاضطروا إلى إقامة الخليفة، أو الانقياد لمن تسلّط عليهم تسلُّطَ الخلافة الكبرى.

وأعني بالخليفة: من يحصل له من الشوكة ما يُرى معه كالممتنع أن يسلبه رجلٌ آخرُ ملكَه؛ اللهم إلا بعد اجتماعات كثيرة، وبذلِ أموالٍ خطيرة، لا يتمكن منها إلا واحدٌ في القرون المتطاولة.

ويختلف الخليفة باختلاف الأشخاص والعادات، وأيُّ أمةٍ طبائعها أشدُّ حدةً فهي أحوج

إلى الملوك والخلفاء ممن هي دونها في الشح والسخاء.

ونحن نريد أن ننبهك على أصول هذه الارتفاقات ونفهرس أبوابها، كما أوجبه عقول الأمم الصالحة ذوي الأخلاق الفاضلة، واتخذوه سنة مسلمة، لا يختلف فيها أقاصيهم ولا أدانيهم، فاستمع لما يتلى عليك.

ترجمہ: اور جب یہ تین چیزیں تمام انسانوں میں برابر درجہ میں نہیں پائی جاتیں لوگوں کے مزاجوں اور عقلوں کے متفاوت ہونے کی وجہ سے، جو واجب کرنے والے ہیں رائے کلی سے اقدام کرنے کو اور نفاست پسندی کو اور تدبیرات نافعہ کے نکالنے کو اور ان میں پیروی کرنے کو، اور غور وفکر کرنے کے لئے فارغ ہونے میں لوگوں کے مختلف ہونے کی وجہ سے، اور اس قسم کے دوسرے اسباب کی وجہ سے، تو ارتفاقات کی دو حدیں ہو گئیں:

پہلی حد: وہ ہے جس سے جدا نہیں ہوتے اولی درجہ کے تمدن والے (بھی) جیسے قوت بدوی، پہاڑوں کی چوٹیوں پر بسنے والے اور قابل رہائش علاقوں سے دور کناروں کے باشندے۔ اور یہی وہ حد ہے جس کو ہم ارتفاق اول کہتے ہیں

دوسری حد: وہ ہے جس پر شہروں کے باشندے اور قابل رہائش خطوں کی آباد بستیوں کے بسنے والے ہیں، جن خطوں کے لئے لازم ہے کہ ان میں دانشمند اور اخلاق فاضلہ والے لوگ پیدا ہوں، اس لئے کہ ایسی جگہوں میں لوگوں کا بڑا بھاری اجتماع رہتا ہے، اور ضرورتوں کی بھیڑ ہوتی ہے، اور تجربات کی کثرت ہوتی ہے، اس لئے وہاں اعلی درجہ کے طریقے نکالے جاتے ہیں، اور لوگ ان کو دانتوں سے مضبوط پکڑتے ہیں ـــــ اور اس حد کا اعلی درجہ وہ ہے جس کو کامل نباہ کرنے والے بادشاہ برتتے ہیں، جن کے پاس اقوام کے عقلاء جمع ہوتے ہیں، پس وہ ان سے مفید طریقے اخذ کرتے ہیں ـــــ اور یہی وہ حد ہے جس کو ہم ارتفاق ثانی کہتے ہیں۔

اور جب ارتفاق ثانی مکمل ہو جاتا ہے تو وہ ارتفاق ثالث کو واجب کرتا ہے۔ اور وہ اس طرح کہ جب لوگوں میں باہمی معاملات ہوتے ہیں اور ان میں خود غرضی، حسد، ٹال مٹول اور حق کا انکار کرنا در آتا ہے تو لوگوں میں جھگڑے اور اختلافات پیدا ہوتے ہیں؛ اور اس طرح کہ ان میں ایسے لوگ پیدا ہوتے ہیں جن پر نفسانی خواہشات غالب ہوتی ہیں، یا وہ قتل وغارت گری کی جرأت پر پیدا کئے جاتے ہیں؛ اور اس طرح کہ ان لوگوں کی کچھ ایسی مفید سکیمیں ہوتی ہیں جن کا نفع عام ہوتا ہے، اور ان میں سے ایک شخص ان کو پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچا سکتا، یا ایک شخص کے لئے وہ آسان نہیں ہوتیں یا ایک شخص ان کی فیاضی نہیں کرتا، تو لوگ مجبور ہوتے ہیں ایسے بادشاہ کو مقرر کرنے کی طرف جو ان کے درمیان انصاف سے فیصلہ کرے، اور ان کے نافرمان کو جھڑکے، اور ان کے بے باک کا مقابلہ کرے، اور ان سے محصول وصول کرے، اور اس کو اس کے مصرف میں خرچ کرے۔

اور ارتفاق ثالث ارتفاق رابع کو واجب کرتا ہے، اور وہ اس طرح کہ جب ہر بادشاہ اپنی مملکت کے ساتھ جدا ہو جاتا

ہے اور اس کے پاس مال جمع کیا جاتا ہے اور اس کے ساتھ بہادر لوگ مل جاتے ہیں، وہاں بھی خود غرضی حرص اور کینہ در آتا ہے تو ان میں باہم اختلاف ہو جاتا ہے اور وہ آپس میں لڑتے ہیں، پس وہ مجبور ہوتے ہیں خلیفہ منتخب کرنے کی طرف، یا ایسے شخص کی اطاعت کرنے کی طرف جو ان پر خلافت کبریٰ کے مسلط ہونے کی طرح مسلط ہو۔

اور میں خلیفہ سے مراد لیتا ہوں ایسے شخص کو جس کو اس درجہ دبدبہ حاصل ہو کہ اس کے ساتھ یہ خیال بھی نہ نظر آتا ہو کہ کوئی دوسرا شخص اس کے ملک کو چھین لے۔ الا مگر بھاری اجتماع اور زیادہ سرمایہ خرچ کرنے کے بعد، مگر اس پر مدتہائے دراز میں کوئی ایک ہی کامیاب ہوتا ہے۔

اور خلیفہ کی ضرورت اشخاص و عادات کے اختلاف سے مختلف ہوتی ہے۔ اور جن اقوام کی طبیعتیں سخت و تیز ہوتی ہیں وہ بادشاہوں اور خلفاء کی زیادہ محتاج ہوتی ہیں، ان اقوام سے جو خود غرضی اور عداوت میں کمتر ہوتی ہیں۔

اور ہم چاہتے ہیں کہ آپ کو ان ارتفاقات کے اصولوں اور ان کے ابواب کی فہارس سے آگاہ کریں، جس طرح ان کو اخلاق فاضلہ رکھنے والی صالح امتوں کی عقلوں نے ثابت کیا ہے، اور ان کو مسلسل طریقہ بنالیا ہے، نہ ان میں قریب کے لوگوں کا اختلاف ہے نہ دور کے لوگوں کا۔ پس آپ وہ باتیں سماعت فرمائیں جو آپ کے سامنے (آئندہ ابواب میں) پیش کی جاتی ہیں۔

لغات:

انتحل كلاما: اپنی طرف منسوب کرنا ... قاوم مقاومة: مخالفت کرنا، مقابلہ کرنا ... جبا (ن) جبا و جبی (ض) جباية: جمع کرنا ..... [illegible] كانت هذه الثلاثة بلغن ... انهم سائقيهم اور انهم كانت لهم کا عطف انهم لها وارث پر ہے ... الشح (مثلثة الشين) انتہائی درجہ کا بخل، خود غرضی ... اقاصی اور اقاصی جمع ہیں الاقصیٰ (اسم تفضیل) کی، جس کے معنی ہیں بہت دور ... ادانی اور ادانی جمع ہیں الادنیٰ (اسم تفضیل) کی جس کے معنی ہیں نزدیک ... فهارس جمع ہے فهرس کی اور یہ معرب ہے فہرست کا جو فارسی کلمہ ہے۔

تشریح:

اقالیم صالحہ یعنی وہ علاقے جو بودوباش کے لئے اچھے ہیں۔ یہ خط جدی اور خط سرطان کے درمیان کا علاقہ ہے۔ اس خطہ میں موسم نہ بہت زیادہ گرم ہوتا ہے نہ بہت زیادہ سرد اور شب و روز میں تفاوت بھی بہت زیادہ نہیں ہوتا۔ مگر یہ بات بجلی (Electricity) اور بھاپ (Steam) کی دریافت سے پہلے کی ہے۔ اب لوگ مصنوعی زندگی (Artificial Life) گزارنے لگے ہیں، اس لئے پورا کرۂ ارض بودوباش کے اعتبار سے یکساں ہو گیا ہے۔

☆ ☆ ☆

باب —— ۲

ارتفاقِ اول میں شامل چیزیں

ارتفاقِ اول یعنی دیہی تمدن میں بھی کم از کم چار چیزیں ضرور پائی جاتی ہیں۔

۱ —— زبان یعنی بولی —— انسانی معاشرہ خواہ کتنی ہی فروتر یعنی ابتدائی مرحلہ میں ہو، وہ کوئی نہ کوئی زبان ضرور بولتا ہے کیونکہ انسان حیوانِ ناطق ہے۔ ناطق کے معنی ہیں وہ جاندار جو الفاظ کی مدد سے اپنا مافی الضمیر سمجھاتا بھی ہے اور سمجھتا بھی ہے اس لئے کوئی انسانی معاشرہ بے زبان نہیں ہوسکتا —— پھر زبان کی دو قسمیں ہیں: اصلی اور فرعی۔ اصلی یعنی ام الالسنہ وہ زبان ہے جو بذاتِ خود وجود میں آئی ہے اور فرعی زبان وہ ہے جو دوسری زبانوں سے الفاظ مستعار لے کر بنائی جاتی ہے مثلاً اردو اور انگریزی فرعی زبانیں ہیں۔ عربی، فارسی، ہندی، سنسکرت وغیرہ زبانوں سے الفاظ لے کر اردو بنی ہے اور انگریزی بہت سی یورپین زبانوں کا مجموعہ ہے اس میں عربی کے الفاظ بھی ہیں۔

اصلی زبانیں کیسے وجود میں آتی ہیں؟ اس بارے میں شاہ صاحب رحمہ اللہ نے تین بنیادی باتیں بیان کی ہیں:

اول: جب کوئی جسم، یا کوئی فعل، یا کوئی حالت، مجاورت یا سببیت یا کسی اور طرح سے کسی آواز سے ملتے ہیں تو اس آواز کو بعینہ زبان میں نقل کرلیا جاتا ہے جیسے ٹھوس جسم، جسم سے ملتا ہے تو "کھٹ" کی آواز، اور بار بار ملتا ہے تو "کھٹ کھٹ" کی آواز، اور تلواریں متواتر چلتی ہیں تو "چکا چک" کی آواز پیدا ہوتی ہے اسی طرح کورے کپڑے پہن کر چلنے سے "مر مر" کی آواز، اور تیز ہوا کے چلنے سے "سائیں سائیں" کی آواز پیدا ہوتی ہے اسی طرح صدمہ اور سخت افسوس کے وقت جو منہ سے تیز سانس نکلتا ہے اس سے "آہ" کی آواز پیدا ہوتی ہے۔ ان آوازوں کو زبان میں نقل کرلیا جاتا ہے یعنی یہی آوازیں الفاظ بن گئی ہیں۔ پھر مختلف معانی کے لئے اشتقاق کے ذریعہ مختلف الفاظ بنالئے گئے ہیں، جیسے کھٹکا، کھٹکنا، کھٹکا لگا رہنا، کھٹک لگنا، کھٹکا کرنا، کھٹ کھٹانا، کھٹکا (کھڑکا) کھٹ ہونا وغیرہ۔ اسی طرح مر مر، سائیں سائیں، چکا چک اور آہ سے بھی مختلف الفاظ بنائے گئے ہیں۔

دوم: نگاہ کو متاثر کرنے والی چیز کو، اور نفس میں کوئی وجدانی کیفیت پیدا کرنے والی چیز کو قسم اول کے مانند قرار دے کر اس کے لئے بھی کوئی آواز بتکلف بنالی جاتی ہے، جیسے سورج کی طرف مسلسل دیکھنے سے نگاہ پر جو اثر پڑتا ہے اس کے لئے "چکا چوند" اور روشنی کے بار بار جلنے بجھنے سے جو وجدانی کیفیت پیدا ہوتی ہے اس کے لئے "جھپ جھپ" کی آواز بنالی گئی، پھر اس میں اشتقاق کرکے بہت سے الفاظ بنالئے گئے۔

سوم: علاقہ مشابہت یا مجاورت کی وجہ سے لفظ کو مجازی معنی میں استعمال کیا جاتا ہے یا کسی مناسبت سے لفظ کو کسی

دوسرے معنی میں نقل کیا جاتا ہے جیسے بے تمیز کے لئے "گدھا" اور بے وقوف کے لئے "بیل" اور موچی کے پاس بیٹھنے کی وجہ سے صاحب حذاء (موچی) مجازاً کہا جاتا ہے (خالد حذاء حدیث شریف کے ایک راوی ہیں) اور لفظ صلاۃ کو جس کے اصلی معنی دعا کے ہیں نماز کے لئے نقل کرلیا گیا ہے۔ کیونکہ نماز بھی دعا پر مشتمل ہے۔

علاوہ ازیں زبان کے سلسلہ میں دیگر اصول بھی ہیں۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ "ان کو آپ ہمارے کلام میں جگہ جگہ پائیں گے" مگر حجۃ اللہ البالغہ میں تو کہیں ان کا تذکرہ نہیں آیا اور دیگر کتابوں میں بھی یہ نہیں پڑھا۔

اور یہ خیال بے دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو تمام زبانیں سکھلادی تھیں اور اس سلسلہ میں ﴿وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا﴾ (سورۃ البقرۃ ۳۱) سے استدلال بھی درست نہیں کیونکہ مفسرین نے اسماء کی اتنی تفسیریں کی ہیں کہ آیت متشابہ بن گئی ہے۔ امام رازی رحمہ اللہ نے اسماء سے مسمیات (چیزیں) مراد لی ہیں وہ فرماتے ہیں: المراد بالأسماء صفات الأشياء ونعوتها وخواصها، لأنها علامات دالة على ماهياتها فجاز أن يعبر عنها بالأسماء (روح المعانی ۱: ۲۲۳)

۲ — دیہی تمدن میں بھی لوگ کھیتی باڑی، باغبانی، کنویں کھودنے، کھانا پکانے اور اون بننے کا طریقہ جانتے ہیں۔

۳ — ظروف سازی اور چمڑے کی مشکیں بنانے کے طریقے بھی لوگ جانتے ہیں۔

۴ — چوپایوں کو سدھانے اور پالنے کا بھی ان میں رواج ہوتا ہے تاکہ ان پر سواری کریں، ان کا گوشت استعمال کریں، ان کی کھالوں، بالوں اور اون سے کام لیں اور ان کے دودھ اور نسل سے متمتع ہوں۔

۵ — مکان بنانے کے طریقے بھی وہ لوگ جانتے ہیں، تاکہ گرمی سردی میں ان میں ٹھکانہ حاصل کریں خواہ وہ پہاڑوں کی غاریں یا پھونس کے جھونپڑے ہی کیوں نہ ہوں۔

۶ — لباس جو انسان کے لئے زینت ہے اس سے بھی لوگ واقف ہوتے ہیں، خواہ وہ چوپایوں کے چمڑے کا ہو یا درختوں کے پتوں کا ہو یا انسانی مصنوعات کا۔

۷ — ان میں نکاح کا طریقہ بھی رائج ہوتا ہے یعنی عقد کے ذریعہ وہ زن منکوحہ کی تعیین کرتے ہیں تاکہ کوئی دوسرا اس میں مزاحمت نہ کرے، جس سے وہ اپنی خواہش پوری کرے، نسل بڑھائے، خانگی ضرورتوں میں اس سے مدد لے اور اولاد کی تربیت اور پرورش میں اس سے اعانت حاصل کرے۔

اور انسان کے علاوہ دیگر حیوانات میں جوڑا محض اتفاق سے متعین ہوتا ہے یعنی اتفاقی طور پر نر و مادہ ساتھ ہو جاتے ہیں اور ساتھ ساتھ رہنے لگتے ہیں یا ایک ساتھ پیدا ہوتے ہیں یا انڈوں سے نکلتے ہیں اور بڑے ہونے تک ساتھ ساتھ رہتے ہیں تو بلوغ کے بعد ان کا جوڑا بن جاتا ہے اور اسی قسم کے دیگر اسباب کی وجہ سے ان کا جوڑا قائم ہوتا ہے۔

۸ — دیہی تمدن میں بھی لوگ وہ کاریگریاں جانتے ہیں جن کے بغیر کھیتی باڑی، باغبانی، کنووں کی کھدائی اور مویشیوں کی نگہداشت نہیں ہوسکتی۔ جیسے پھاوڑا، کدال، ڈول، رسی، ہل کا پھالہ وغیرہ چیزیں بنانا وہ جانتے ہیں۔

۹ — تبادلۂ اشیاء کے طریقے اور بعض اہم کاموں میں تعاون باہمی کی شکلیں بھی ان میں رائج ہوتی ہیں۔ تبادلۂ اشیاء کی تفصیل اسی مبحث کے باب پنجم (معاملات کے بیان) میں آرہی ہے۔

۱۰ — ان میں قبائلی حکومت بھی ہوتی ہے۔ وہ شخص جو ان میں سب سے زیادہ صائب الرائے اور مضبوط گرفت والا ہوتا ہے وہ دوسروں کو مسخر کرکے سردار بن جاتا ہے اور کسی نہ کسی نہج سے ٹیکس وصول کرکے حکومت کا نظام چلاتا ہے۔

۱۱ — ان میں جیسے مسلم قوانین بھی ہوتے ہیں جن سے باہمی نزاعات میں فیصلہ کیا جاتا ہے، ظالموں پر روک لگائی جاسکتی ہے اور جو ان سے برسرِ پیکار ہو اس سے نمٹا جاسکتا ہے۔

فائدہ: ہر قوم میں چار قسم کے لوگ ضرور ہوتے ہیں:

(۱) وہ لوگ جو اہم کاموں میں مفید سکیمیں بنائیں تاکہ دوسرے لوگ ان کی پیروی کریں اور ان کی اسکیم پر کاربند ہوں۔

(۲) وہ لوگ جو کسی بھی طرح اطاعت پسند، آسودگی کے خواہاں اور آرام طلب ہوں۔

(۳) وہ لوگ جو اپنے کمالات پر فخر کریں، جیسے بہادری، زبانی فصاحت، وزیرکی وغیرہ کمالات پر فخر کریں۔

(۴) وہ لوگ جو شہرت کے خواہاں ہوں اور اپنی عظمت و دبدبہ کو بلند کرنا چاہتے ہوں۔

فائدہ: قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے اپنے اس احسان کا تذکرہ فرمایا ہے کہ اس نے اپنے بندوں کو ارتفاق اول میں پائی جانے والی باتوں کا الہام فرمایا ہے۔ شہری تمدن میں پائی جانے والی باتوں کا اور شاہوں اور امیروں کو جو نعمتیں بخشی ہیں ان کا تذکرہ نہیں فرمایا۔ کیونکہ اللہ پاک جانتے ہیں کہ قرآن کریم اور اس کی ہدایت تمام انسانوں کے لئے ہے اور تمام لوگوں میں پائی جانے والی نعمتیں یہی ارتفاق اول کی نعمتیں ہیں، اس لئے سب لوگ انہی کو سمجھ سکتے ہیں۔ واللہ اعلم

نوٹ: ارتفاق اول کے لئے الگ بھی ایک باب ہے۔

﴿باب الارتفاق الأول﴾

منه: اللغة المعبّرة عما في ضمير الإنسان، والأصل في ذلك: أفعال وهيئات وأجسام تُلابس صوتًا، بالمجاورة أو التسبب أو غيرهما، فيحكي ذلك الصوت كما هو، ثم يتصرف فيه باشتقاق الصِّيَغ، بإزاء اختلاف المعاني، ويُشَبَّه أمورٌ مؤثرة في الأبصار، أو مُحْدِثَةٌ لهيئاتٍ وجدانية في النفس بالقسم الأول، ويتكلف له صوتٌ كمثله، ثم تُوُسِّعت اللغات بالتجوّز، لمشابهة أو مجاورة، والنقل لعلاقة ما، وهنالك أمور أخرى ستجدها في بعض كلامنا.

ومنه: الزرع والغرس وحفر الآبار، وكيفية الطبخ والائتدام.

ومنہ: اصطناع الأواني والقرب.

ومنہ: تسخیر البھائم واقتناؤھا، لیستمتعات بظھورھا ولحومھا وجلودھا، وأشعارھا، وأوبارھا، وألبانھا، وأولادھا.

ومنہ: مسکن یزویہ من الحرّ والبرد، من الغیران والعُشوش ونحوھا.

ومنہ: لباس یقوم مقام الریش، من جلود البھائم، أو أوراق الأشجار، أو مما عملت أیدیھم.

ومنہ: أن اھتدی لتعیین منکوحۃ لایزاحمہ فیھا أحد، یدفع بھا شبقہ، ویذرأ بھا نسلہ، ویستعین بھا في حوائجہ المنزلیۃ، وفي حضانۃ الأولاد وتربیتھا؛ وغیر الإنسان لایُعیِّنھا إلا بنحو من الاتفاق، أو یکونھما توافقین أدرکا علی المرافقۃ، ونحو ذلک.

ومنہ: أن اھتدی لصناعات لایتم الزرع والغرس والحفر، وتسخیر البھائم وغیر ذلک إلا بھا، کالمعْوَل والدلو والسکۃ والحبال ونحوھا.

ومنہ: أن اھتدی لمبادلات ومعاونات في بعض الأمر.

ومنہ: أن یقوم أسدُّھم رأیا، وأشدُّھم بطشا، فیسخّر الآخرین، ویترأس ویبرع، ولو بوجہ من الوجوہ.

ومنہ: أن تکون فیھم سنۃ مسلمۃ لفصل خصوماتھم، وکف ظالمھم، ودفع من یرید أن یغزوھم ولابد أن یکون في کل قوم من یستنبط طرق الارتفاق فیما یھُمُّھم شأنہ، فیقتدی بہ سائر الناس؛ وأن یکون فیھم من یحب الجمال والرفاھیۃ والدعۃ، ولو بوجہ من الوجوہ؛ ومن یباھي بأخلاقہ: من الشجاعۃ والسماحۃ والفصاحۃ والکَیْس وغیرھا؛ ومن یُحب أن یطیر صیتُہ، ویرتفع جاھُہ.

وقد منّ اللہ تعالی في کتابہ العظیم علی عبادہ بإلھام شُعب ھذا الارتفاق، لعلمہ بأن التکلیف بالقرآن یعُمُّ أصناف الناس، وأنہ لایشملُھم جمیعا إلا ھذا النوع من الارتفاق؛ واللہ أعلم.

ترجمہ: ارتفاق اول کا بیان: اور اس میں سے وہ بولی ہے جس کے ذریعہ انسان اپنے مافی الضمیر کو تعبیر کرتا ہے۔ اور زبان کی اصل: وہ افعال، کیفیات اور اجسام ہیں جو علامت یا سبب بیان کے علاوہ کسی اور طرح سے، کسی بھی آواز سے ملے ہیں، پس وہ آواز بعینہ نقل کر لی جاتی ہے۔ پھر مختلف معانی کے مقابل صیغے بنانے کا تصرف کیا جاتا ہے ——— اور نگاہوں کو متاثر کرنے والی چیزوں کو، یا نفس میں وجدانی کیفیت پیدا کرنے والی چیزوں کو کسی قسم کے ساتھ تشبیہ دی جاتی ہے، اور پس تشبیہ اس کے لئے کوئی آواز بنائی جاتی ہے ——— پھر علاقہ مشابہت یا علاقہ مجاورت کی وجہ سے مجازی معنی لیے

سے اور کسی اور تعلق کی وجہ سے (لفظ کو ایک معنی سے دوسرے معنی کی طرف) نقل کرنے سے زبانیں پھیلتی ہیں — اور زبان کے بارے میں کچھ اور اصول بھی ہیں، جن کو آپ ہمارے کلام میں کہیں کہیں پائیں گے۔

اور اس میں سے: کھیتی باڑی، باغبانی، کنویں کھودنا اور پکانے نیز سالن بنانے کا طریقہ ہے۔

اور اس میں سے: ظروف سازی اور مشکیں بنانا ہے۔

اور اس میں سے: چوپایوں کو سدھانا اور ان کو پالنا ہے، تاکہ ان کی پیٹھ، گوشت، کھال، بال، اون، دودھ اور نسل سے کام لیا جائے۔

اور اس میں سے: مکان ہے، جس میں انسان گرمی سردی میں ٹھکانا حاصل کرے، خواہ وہ غاریں ہوں یا جھونپڑے یا اس قسم کی کوئی اور چیز۔

اور اس میں سے: لباس ہے، جو (زینت میں) پرندوں کے پروں کے قائم مقام ہوتا ہے۔ خواہ وہ چوپایوں کی کھالوں کا ہو یا درخت کے پتوں کا یا انسانی مصنوعات کا۔

اور اس میں سے: یہ بات ہے کہ دیہی تمدن والوں نے (بھی) ایسی زن منکوحہ کی تعیین کی راہ پائی ہے، جس میں کوئی دوسرا اس سے مزاحمت نہ کرے، جس سے وہ اپنی خواہش پوری کرے، اور جس کے ذریعہ وہ اپنی نسل بڑھائے اور جس سے وہ اپنی خانگی ضرورتوں میں اور اولاد کی تربیت اور پرورش میں اعانت حاصل کرے ——— اور انسان کے علاوہ دیگر حیوانات اپنے جوڑے کو متعین نہیں کرتے مگر اتفاقیہ طور پر یا دونوں کے ایسے جڑواں ہونے کی وجہ سے جو ساتھ ساتھ بلوغ تک پہنچے ہیں یا اس کے علاوہ دیگر اسباب کی وجہ سے (ان کا جوڑا قائم ہوتا ہے)

اور اس میں سے: یہ بات ہے کہ انسان نے ایسی کاریگریوں کی راہ پائی ہے جن کے بغیر کھیتی باڑی، باغبانی، کنووں کی کھدائی اور مویشیوں کو سدھانا وغیرہ کام تکمیل پذیر نہیں ہو سکتے، جیسے پھاوڑا، ڈول، ہل کا پھار، رسیاں اور ان جیسی چیزیں۔

اور اس میں سے: یہ بات ہے کہ اس نے (یعنی دیہی تمدن والوں نے) تبادلۂ اشیاء کی اور بعض کاموں میں تعاون باہمی کی راہ پائی ہے۔

اور اس میں سے: یہ بات ہے کہ وہ شخص اٹھے جو ان میں سب سے زیادہ صاحب الرائے ہو اور مضبوط پکڑ والا ہو، جو دوسروں کو مسخر کرے، اور سردار بنے اور کسی نہ کسی نہج سے ٹیکس وصول کرے۔

اور اس میں سے: یہ بات ہے کہ ان میں باہمی تنازعات کا فیصلہ کرنے کے لئے، ظالم کو لگام دینے کے لئے اور جو شخص ان سے برسرِ پیکار ہو اس سے نمٹنے کے لئے کوئی مسلّم طریقہ ہو۔

اور ضروری ہے کہ ہر قوم میں ایسے لوگ ہوں جو ان امور میں جن کا معاملہ لوگوں کو فکرمند بنائے ہوئے ہو مفید اسکیمیں بنا سکیں، پس دوسرے لوگ اس کی پیروی کریں اور یہ کہ ان میں ایسے لوگ ہوں جو کسی نہ کسی نہج پر لطافت پسند،

جاتا ہے۔ دو ارتفاق کے دونوں درجوں میں کیا کیا چیزیں شامل ہیں، اس کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔ غرض ارتفاق کے دوسرے درجے یعنی شہری تمدن کی جو ضروریات باب اول میں بیان کی گئی ہیں ان کے لئے تدبیرات نافعہ کیا ہوسکتی ہیں؟ اس سے جس فن میں بحث کی جاتی ہے وہ فن آداب معاش ہے۔

اس فن میں بنیادی نقطہ یہ ہے کہ شہری تمدن کوئی مستقل تمدن نہیں، بلکہ دیہی تمدن کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ اور وہ اس طرح ترقی کرتا ہے کہ ارتفاق اول میں جو چیزیں پائی جاتی ہیں ان کو تین معیاروں پر پرکھا جاتا ہے، جو باتیں اس معیار پر پوری اترتی ہیں وہ لے لی جاتی ہیں اور جو باتیں اس معیار کے مطابق نہیں ہوتیں ان کو چھوڑ دیا جاتا ہے اور شہری زندگی کی ضروریات کی تکمیل کے لئے باقی مفید چیزیں بڑھادی جاتی ہیں، اس طرح شہری تمدن کا ڈھانچہ تیار ہوتا ہے۔ اور وہ تین معیار یہ ہیں:

(۱) ارتفاق اول میں رائج تدبیرات نافعہ کو صحیح تجربات کی کسوٹی پر کسا جاتا ہے، یعنی ان کا تجربہ کرکے دیکھا جاتا ہے، اگر وہ باتیں ضرر سے بعید اور نفع سے قریب ہوں تو ان کو لے لیا جاتا ہے، ورنہ چھوڑ دیا جاتا ہے۔

(۲) ارتفاق اول میں جو چیزیں پائی جاتی ہیں ان کا کامل مزاج رکھنے والوں کے اخلاق عالیہ سے موازنہ کیا جاتا ہے، اگر وہ باتیں اس مزاج سے ہم آہنگ ہوتی ہیں تو ان کو اختیار کرلیا جاتا ہے، ورنہ ترک کردیا جاتا ہے۔ مثلاً عقد کے ذریعہ زن منکوحہ کی تعیین اخلاق فاضلہ کا بھی تقاضا ہے۔ پس صحرائی تمدن میں اس کی جو شکلیں رائج ہیں، ضروری نہیں کہ وہ بلند اخلاق کے معیار پر بھی پوری اتریں۔

(۳) حسن معاشرت، بہترین اجتماعی زندگی اور اس قسم کی دوسری باتیں جو عقل تام سے پیدا ہوتی ہیں، ان کے ساتھ ارتفاق اول میں رائج امور کو ملا کر دیکھا جاتا ہے، جو باتیں مناسب ہوتی ہیں وہ لے لی جاتی ہیں، اور جو نامناسب ہوتی ہیں وہ چھوڑ دی جاتی ہیں۔

اس فن کے بڑے مسائل یہ ہیں: ۱- کھانے کے آداب ۲- پینے کے ضابطے ۳- چلنے کے طریقے ۴- بیٹھنے کے آداب ۵- سونے کے طریقے ۶- سفر کرنے کے مسائل ۷- چھوٹا بڑا استنجا کرنے کے آداب ۸- بیوی سے مقاربت کے قواعد ۹- لباس کے مسائل ۱۰- رہنے سہنے کے آداب ۱۱- نظافت اور پاکیزگی کے طریقے ۱۲- زیب وزینت کے مسائل ۱۳- باہمی گفتگو کا سلیقہ ۱۴- آفتوں اور بیماریوں میں دواؤں اور جھاڑ پھونک کے استعمال کے مسائل ۱۵- اتفاقی حوادث کو پہلے سے جان لینے کی شکلیں، مثلاً مانسون، دریائی طوفان، دشمن کے آنے کا پہلے سے اندازہ کرلینا ۱۶- خوشی کے مواقع میں جیسے بچے کی ولادت، شادی، عید، مسافر کی حج وغیرہ کے سفر سے واپسی اور اس کے علاوہ دیگر مواقع میں دعوت کرنے کا بیان ۱۷- بوقت مصائب صبر کرنے کے طریقے ۱۸- بیمار پرسی کرنے کے آداب ۱۹- مردوں کو دفن کرنے کے مسائل (ان مسائل میں سے ہر مسئلہ ایک باب کا عنوان ہے، اس لئے شاہ

صاحب رحمہ اللہ نے اس باب میں ان مسائل کو ”باب“ سے تعبیر کیا ہے)

دس اجمالی باتیں

آباد شہروں میں بسنے والے اور صحیح مزاج رکھنے والے تمام عقلاء حضرات ان باتوں پر متفق ہیں:

۱- گندہ کھانا نہ کھایا جائے، جیسے اپنی موت مرا ہوا جانور، گلا سڑا کھانا، اور وہ جانور جن کے مزاج میں اعتدال اور جن کے اخلاق میں باقاعدگی نہ ہو۔

۲- کھاتے وقت کھانا برتنوں میں رکھا جائے اور برتن دسترخوان پر رکھے جائیں۔

۳- کھانے سے پہلے ہاتھ منہ دھو لئے جائیں اور کھاتے وقت حماقت اور دیوانوں کی شکلوں سے اور ایسی باتوں سے بچا جائے جو ساتھیوں کے اذہان میں تکدر پیدا کرتی ہیں۔

۴- بدبودار پانی نہ پیا جائے، نہ پانی کے برتن (مشک، مٹکے اور جگ وغیرہ) میں منہ لگا کر پیا جائے، نہ جانوروں کی طرح سانس لئے بغیر گٹ گٹ پیا جائے۔

۵- نظافت، پاکیزگی اور صفائی کا اہتمام کیا جائے یعنی بدن، کپڑوں اور مکان کو دو چیزوں سے پاک صاف رکھا جائے: ایک گھناؤنی بدبودار ناپاکیوں سے جیسے پیشاب، پاخانہ اور نجاست وغیرہ کو دھو کر صاف کیا جائے۔ دوسرے جسم میں طبعی طور پر پیدا ہونے والے میل کچیل سے، جیسے منہ کی بو: اس کو مسواک سے دور کیا جائے اور بغل اور زیر ناف کے بال: ان کی صفائی کی جائے اور کپڑوں کا میل ہو: ان کو دھو کر صاف کیا جائے اور مکان کا کوڑے کرکٹ سے بھر جانا: اس کو جھاڑ کر صاف کیا جائے۔

۶- آدمی کو لوگوں کے درمیان نمایاں حالت میں رہنا چاہئے مثلاً لباس درست ہو، مرد داڑھی میں کنگھی کرتا ہو اور منکوحہ عورت خضاب اور زیور سے آراستہ پیراستہ ہو۔

۷- برہنگی معیوب اور ذلت ہے اور لباس زینت ہے اور سوأتین کا کھلنا عار کی بات ہے۔

۸- کامل لباس وہ ہے جو سارے جسم کو چھپائے اور شرمگاہ کو چھپانے والا کپڑا (پاجامہ) باقی بدن کو چھپانے والے کپڑے سے علحدہ ہونا چاہئے تاکہ اگر اتفاقاً اوپر کا کپڑا نکل جائے تو بے پردگی نہ ہو۔

۹- کسی بھی طرح سے حوادث کی پیش بینی کرنی چاہئے مثلاً خواب سے یا علم نجوم سے یا فال سے یا شگون، کہانت اور رمل وغیرہ سے۔ پیش بینی کے یہ مختلف طریقے لوگوں میں قدیم زمانہ سے رائج تھے۔ اب رصدگاہوں، پیمائش کے مختلف پیمانوں اور ریڈاروں کے ذریعہ آنے والے حالات کا پہلے سے اندازہ کرلیا جاتا ہے۔

۱۰- فصیح گفتگو کرنی چاہئے یعنی الفاظ ثقیل اور غیر مانوس نہ ہوں، ترکیب عمدہ، مضبوط اور چست ہو اور اسلوب بیان

مرغوب، جاذب اور دلکش ہو۔ اور ایسا ہی شخص فصاحت کا معیار ہوتا ہے۔

اسی طرح مسائل باب کی مذکورہ فہرست کے ہر باب میں اجمالی اور مسلمہ مسائل ہیں۔ جن پر دنیا کے تمام لوگ متفق ہیں۔ البتہ قواعد وضوابط کی ترتیب و تفصیل لوگ اپنے اپنے انداز پر کرتے ہیں۔ مثلاً ماہر طبعیات طب کے قواعد پیش نظر رکھتا ہے، نجومی ستاروں کے خواص کو ملحوظ رکھتا ہے اور مسلمان ماہر دینیات احسان (اللہ تعالیٰ کی پسندیدگی) کی بنیاد پر قواعد تیار کرتا ہے۔ اور آپ کو یہ تمام باتیں ان کی کتابوں میں تفصیل سے مل جائیں گی۔ اور یہ اختلاف ایسا ہے جیسے ہر قوم کی پوشاک اور طور وطریق علحدہ ہوتے ہیں اور وہی ان کی پہچان ہوتے ہیں۔ یہ اختلاف قوموں کے مزاج اور عادتوں کے اختلاف کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اسی طرح فن آداب معاش کی تفصیلات کا اختلاف بھی سمجھ لینا چاہئے۔

﴿باب في آداب المعاش﴾

وهي الحكمة الباحثة عن كيفية الارتفاق بالحاجات المُبَيَّنة من قبلُ على الحدّ الثاني، والأصل فيه: أن يُعرَضَ الارتفاق الأول على التجربة الصحيحة في كل باب، فيُختار الهيئاتُ البعيدةُ من الضرر، القريبةُ من النفع، ويُترك ما سوى ذلك؛ وعلى الأخلاق الفاضلة التي جُبل عليها أهلُ الأمزجة الكاملة، فيختار ما توجبه وتقتضيه، ويُترك ما سوى ذلك؛ وعلى حسن الصحبة بين الناس وحسن المشاركة معهم، ونحو ذلك من المقاصد الناشئة من الرأي الكلي.

ومعظم مسائله: آداب الأكل، والشرب، والمشي، والقعود، والنوم، والسفر، والخلاء، والجماع، واللباس، والمسكن، والنظافة، والزينة، ومراجعة الكلام، والتمسك بالأدوية والرُّقى في العاهات، وتقدمة المعرفة في الحوادث المُجتمعة، والولائم عند عروض فرح، من ولادة، ونكاح، وعيد، وقدوم مسافر، وغيرها، والمآتم عند المصائب، وعيادة المرضى، ودفن الموتى.

فإنه أجمع من يُعتد به من أهل الأمزجة الصحيحة: سُكّان البلدان المعمورة، على أن لا يؤكل الطعامُ الخبيث، كالميت حَتفَ أنفه، والمتعفِّن، والحيوان البعيد من اعتدال المزاج وانتظام الأخلاق، ويستحبون أن يوضع الطعامُ في الأواني، وتوضع هي على السُّفَر ونحوها، وأن يُنظَّف الوجه واليدان عند إرادة الأكل، ويُحترز عن هيئات الطَّيش، والشَّره، والتي تورث الضغائن في قلوب المشاركين، وأن لا يُشرب الماءُ الآجِنُ وأن يُحترز من الكَرْع والعَبّ.

وأجمعوا على استحباب النظافة: نظافة البدن والثوب والمكان عن شيئين: عن النجاسات

النتنة المتقذرة، وعن الأوساخ النابتة على نهج طبيعي، كالظفر يُزال بالسواك، وكشعر الإبط والعانة، وكتوسخ الثياب، واعشيشاب البيت؛ وعلى استحباب أن يكون الرجل شامة بين الناس: قد سوّى لباسه، وسرّح رأسه ولحيته؛ والمرأة إذا كانت تحت رجل تتزين بخضاب وحُليّ ونحو ذلك؛ وعلى أن العُري شينٌ، واللباس زين، وظهور السوأتين عار، وأن أتم اللباس ما ستر عامة البدن، وكان ساترُ العورة غيرَ ساتر البدن؛ وعلى تقدمة المعرفة بشيء من الأشياء: إما بالرؤيا، أو بالنجوم، أو الطيرة، أو العيافة والكهانة والرمل، ونحو ذلك.

وكل من خُلق على مزاج صحيح وذوق سليم يختار لامحالة في كلامه من الألفاظ كلَّ لفظ غير وحشي، ولا ثقيل على اللسان، ومن التراكيب كلَّ تركيب متين جيد، ومن الأساليب كلَّ أسلوب يميل إليه السمعُ، ويركن إليه القلب، وهذا الرجل هو ميزان الفصاحة.

وبالجملة ففي كل باب مسائلُ إجماعية مسلّمةٌ بين أهل البلدان، وإن تباعدت، والناس بعدها في تمهيد قواعد الآداب مختلفون: فالطبيعيُّ يمهّدها على استحسانات الطب، والمنجّم على خواص النجوم، والإلهيُّ على الإحسان، كما نجدها في كتبهم مفصلة؛ ولكل قوم زيٌّ وآدابٌ يمتازون بها، يوجبها اختلاف الأمزجة والعادات، ونحو ذلك.

ترجمہ: فن آداب معاش کا بیان: فن آداب معاش وہ حکمت ہے جو حصول معاش کے پیچھے بیان کردہ ضروریات کی تدبیرات نافعہ سے بحث کرتی ہے۔ اور بنیادی بات اس فن میں یہ ہے کہ ارتفاق اول کو (فن آداب معاش کے) ہر باب میں کسوٹی پر پیش کیا جائے۔ پھر وہ ہیئتیں اختیار کی جائیں جو ضرر سے بعید اور نفع سے قریب ہوں اور ان کے علاوہ کو چھوڑ دیا جائے۔ اور ان اخلاق فاضلہ پر پیش کیا جائے جن پر کامل مزاج رکھنے والے لوگ پیدا کئے جاتے ہیں۔ پھر وہ باتیں لے لی جائیں جن کو اخلاق عالیہ ثابت کرتے ہیں اور چاہتے ہیں، اور ان کے علاوہ کو چھوڑ دیا جائے —— اور حسن معاشرت اور بہترین تمدنی زندگی پر اور اس قسم کے دیگر مقاصد پر جو رائے کلی سے پیدا ہوتے ہیں، پیش کیا جائے۔

اور اس فن کے بڑے مسائل یہ ہیں: کھانے، پینے، سونے، سفر کرنے، استنجاء کرنے، صحبت کرنے، کپڑا پہننے، رہنے سہنے، نظافت وزینت، باہم گفتگو کرنے، آفتوں میں دواؤں اور منتروں کو استعمال کرنے، حوادث اجتماعیہ کو پہلے سے پہچاننے، اور خوشی پیش آنے پر، جیسے بچہ کی ولادت، شادی، عید، مسافر کی واپسی وغیرہ کے موقعہ پر دعوت کرنے، مصائب کے وقت ماتم کرنے، بیمار پرسی کرنے اور مُردوں کو دفن کرنے کے آداب۔

پس وسیع آباد خطوں میں بسنے والے، صحیح مزاج رکھنے والے، معتدل لوگ:

۱-: اس پر متفق ہیں کہ گندہ کھانا نہ کھایا جائے، جیسے اپنی موت مرا ہوا جانور، اور سڑا ہوا کھانا (گوشت وغیرہ) اور وہ جانور جن کا مزاج اعتدال سے دور ہے اور جن کے اخلاق میں باقاعدگی نہیں ہے۔

۲-: اور وہ پسند کرتے ہیں کہ کھانا برتنوں میں رکھا جائے، اور برتن دسترخوان وغیرہ (جیسے میز) پر رکھے جائیں۔

۳-: اور یہ بات کہ کھانے سے پہلے دونوں ہاتھ اور منہ دھولیا جائے، اور حماقت اور حرص کی شکلوں سے اور ایسی باتوں سے بچا جائے جو ساتھیوں کے دلوں میں تکدر پیدا کریں۔

۴-: اور یہ بات کہ بدبودار پانی نہ پیا جائے اور پانی کے برتن میں منہ لگا کر اور جانوروں کی طرح غٹ غٹ نہ پیا جائے۔

۵-: اور وہ لوگ نظافت کی پسندیدگی پر متفق ہیں یعنی بدن، کپڑوں اور مکان کو ان چیزوں سے پاک رکھا جائے (ایک) گھناؤنی بدبودار ناپاکیوں سے، (دوسرے) طبعی طور پر پیدا ہونے والے میل کچیل سے، جیسے گندہ دانتی کہ اس کو مسواک سے دور کیا جائے، اور جیسے بغل اور زیر ناف کے بال، اور جیسے کپڑوں کا میلا ہونا، اور گھر کا کوڑے سے بھر جانا۔

۶-: اور اس بات کی پسندیدگی پر کہ آدمی لوگوں کے درمیان نمایاں رہے: اس نے لباس درست کر رکھا ہو اور سر اور ڈاڑھی میں کنگھی کر رکھی ہو اور عورت جب کسی کے عقد میں ہو تو خضاب (مہندی) اور زیور وغیرہ سے آراستہ ہو۔

۷-: اور اس بات پر کہ برہنگی عیب ہے اور لباس زینت ہے اور وہ شرمگاہوں کا کھلنا عار کی بات ہے۔

۸-: اور یہ کہ کامل لباس وہ ہے جو سارے جسم کو چھپائے۔ اور شرمگاہ کو چھپانے والا کپڑا، باقی بدن کو چھپانے والے کپڑے کے علاوہ ہو۔

۹-: اور کسی طرح سے پیش بینی کرنے پر یا خواب سے یا ستاروں سے یا فال سے یا شگون سے اور کہانت سے اور رمل سے اور اسی قسم کی دوسری چیزوں سے۔

۱۰-: اور ہر وہ شخص جو صحیح مزاج اور سلیم ذوق پر پیدا کیا گیا ہے لامحالہ اپنے کلام میں ایسے الفاظ استعمال کرنا پسند کرتا ہے جو غیر مانوس اور ثقیل نہ ہوں اور ایسی ترکیبیں استعمال کرنا پسند کرتا ہے جو عمدہ اور مضبوط ہوں، اور ایسا اسلوب بیان استعمال کرنا پسند کرتا ہے جس کی طرف کان مائل ہوں اور دل کھنچیں، اور یہی شخص فصاحت کی میزان ہے۔

اور خلاصہ یہ ہے کہ ہر باب میں ایسے مسائل ہیں جو مختلف ممالک کے لوگوں کے درمیان اجماعی اور مسلم ہیں، اگرچہ وہ علاقے ایک دوسرے سے کتنے ہی فاصلہ پر ہوں — اور لوگ اس کے بعد آداب کے قواعد تیار کرنے میں مختلف ہیں: علم طبیعی کا ماہر علم طب کے مستحسنات (پسندیدہ باتوں) پر، اور علم نجوم کا ماہر ستاروں کے خواص (خصوصیات) پر، اور فن الٰہیات کا ماہر احسان (اللہ کی پسندیدگی) پر قواعد تیار کرتا ہے جیسا کہ آپ ان تمام باتوں کو انہی کی کتابوں میں مفصل طور پر پائیں گے۔ اور ہر قوم کی پوشاک اور طور طریقے ہے، جن کی وجہ سے وہ ممتاز ہوتے ہیں، جس کو مزاجوں اور عادتوں

وغیرہ کا اختلاف ثابت کرتا ہے۔

لغات:

صحب (س) صحبة: ایک ساتھ زندگی بسر کرنا۔ شارک: باہم شریک ہونا۔ العشرة: ساتھی، ہمدم۔ راجعه الکلام: دوبارہ گفتگو کرنا، مراجعة الکلام: باہم گفتگو کرنا۔ رقی: رقیة کی جمع ہے بمعنی منتر، تعویذ۔ قدّم تقدمة: آگے کرنا۔ حتف: موت، حتف انفه: اس کی ناک کی موت یعنی اپنی موت مرنا۔ جاہلیت میں عربوں کا خیال تھا کہ جو میدان کارزار میں مارا جاتا ہے اس کی روح تو منہ کے راستے نکلتی ہے، اور جو بستر پر اپنی موت مرتا ہے اس کی روح کو نکلنے کے لئے منہ کا راستہ نہیں رہتا اس لئے وہ ناک کے راستے نکلتی ہے۔ پھر یہ اپنی موت مرنے کے لئے محاورہ ہوگیا۔ اس کا مقابل قتل یا جہاد ہے۔ سفر: جمع ہے سفرة کی بمعنی دسترخوان۔ طاب یطیب طیبًا: اچھا ہونا، حلال ہونا۔ شره (س) شرهًا إلی الطعام: بہت حریص ہونا۔ الضغائن: جمع ہے الضغینة کی بمعنی کینہ۔ ضغن (س) ضغنًا: کینہ رکھنا۔ کرع (ف س) کرعًا: پانی یا برتن میں منہ لگا کر پینا۔ عبّ (ن) عبًّا الماء: جانوروں کی طرح منہ لگا کر پانی پینا (کرع کا مترادف)۔ عبّ الدلو: ڈول کا بھرتے وقت آواز کرنا۔ عبّ الماء: سانس لئے بغیر جلدی جلدی گھونٹ پینا۔ شاعة کے اصل معنی ہیں کھیل جانا، چونکہ کھیل نمایاں ہوتا ہے اس لئے مجازًا معنی نمایاں آتا ہے۔ الطیرة: شگون (اچھا یا برا) عرب پرندوں کو اڑا کر شگون لیتے تھے اس لئے طیر سے یہ لفظ بنایا گیا ہے۔ الطیرة: ما یتفاءل به أو یتشاءم منه۔ العیافة: پرندہ اڑا کر اس کے نام، آواز اور کس طرف جاتا ہے اس سے اچھا برا شگون لینا۔ العیافة: زجر الطیر والتفاؤل بأسمائها وأصواتها وممرها (المعجم الوسیط)۔ الکهانة: غیب کی باتیں بتانا۔ الرمل: ایک علم کا نام ہے جس میں بعض ہندسوں اور نقطوں وغیرہ کے ذریعہ غیب کی باتیں دریافت کرتے ہیں (فیروز اللغات)۔

ترکیب:

هي الحکمة میں هي ضمیر حکمت عملیہ کی طرف لوٹتی ہے۔ علی الحد الذي متعلق ہے المبینة سے۔ علی الأخلاق الفاضلة الخ اور علی حسن الصحبة الخ کا عطف علی التجربة پر ہے۔ علی أن تجری الخ اور علی تقدمة المعرفة الخ کا عطف علی استحباب أن یکون الرجل پر ہے۔

نوٹ: کما تجدها اصل میں کما تجدهم تھا، جو تصحیف ہے، مخطوطہ کراچی سے تصحیح کی ہے۔

☆ ☆ ☆

باب ـــــ ۴

خانگی انتظام کا بیان

فن تدبیر منزل: وہ علم ہے جو ترقی یافتہ تمدن میں، خاندانی تعلقات کی نگہداشت سے بحث کرتا ہے یعنی اس فن میں ان مصلحتوں کو بیان کیا جاتا ہے جن کا تعلق ایک گھر میں بسنے والے افراد کی اجتماعی زندگی سے ہوتا ہے۔ تدبیر کے معنی ہیں انتظام کرنا، اور وجہ تسمیہ ظاہر ہے۔ اس علم سے گھر کا نظام سنورتا ہے۔ اس فن کا خلاصہ چار مسائل ہیں: ۱- نکاح (شادی بیاہ) ۲- ولادت (اولاد کے مسائل) ۳- ملکیت یعنی غلام اور آقا کے معاملات ۴- تعاون باہمی کی ضرورت اور اس کی شکلیں۔ تفصیل درج ذیل ہے:

پہلا مسئلہ: شادی بیاہ

ہم بستری کی ضرورت نے مرد وزن میں ربط ورفاقت پیدا کی ہے، پھر اولاد پر شفقت ومہربانی نے ان کی پرورش میں تعاون باہمی کی ضرورت ثابت کی۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ کچھ خوبیاں مرد میں ہوتی ہیں اور کچھ عورت میں، اسی طرح کچھ نقائص مرد میں ہوتے ہیں، اور کچھ عورت میں، اس لئے نکاح ضروری ہوا، تاکہ مرد کی خوبیوں سے عورت متمتع ہو اور اپنے نقصان کی تلافی کرے، اور عورت کی خوبیوں سے مرد فائدہ اٹھائے اور اپنی کمی کو دور کرے، اور دونوں مل کر آسائش کی زندگی بسر کریں۔

عورت مرد کی بہ نسبت اولاد کی پرورش کے طریقے بہتر جانتی ہے۔ وہ حیادار ہوتی ہے، خانہ نشینی کی زندگی بسر کرسکتی ہے، گھریلو ہلکے پھلکے کاموں میں ماہر ہوتی ہے، فطری طور پر اس میں تابعداری کی صلاحیت زیادہ ہوتی ہے مگر اس کی عقل خفیف، بدن ناتواں اور عزم وحوصلہ کمزور ہوتا ہے اور وہ محنت کے کاموں سے جی چراتی ہے۔

اور مرد نسبۃً صائب الرائے ہوتا ہے، وہ حرم کی پوری طرح حفاظت کرسکتا ہے، محنت ومشقت کے کام خوب انجام دے سکتا ہے۔ اس میں غرور، تسلط، مناقشہ کی صلاحیت اور غیرت کامل ہوتی ہے اور بارہا ان صفات کی ضرورت پڑتی ہے۔ مگر اس میں اولاد کی پرورش کا سلیقہ نہیں ہوتا، نہ وہ ہر وقت گھر میں بیٹھا رہ سکتا ہے، معمولی کاموں سے اس کا جی کتراتا ہے اور تابعداری کی پوری صلاحیت بھی اس کی فطرت میں نہیں۔ اس لئے عورت کی زندگی مرد کے بغیر ناتمام رہتی ہے اور مرد کی عورت کے بغیر، اسی ضرورت کی تکمیل کے لئے نکاح ضروری ہوا۔

اور عورتوں کے معاملہ میں مردوں میں رقابت اور غیرت کا جذبہ پایا جاتا ہے، اس لئے ضروری ہوا کہ گواہوں کے سامنے مرد کا کسی عورت کے ساتھ اختصاص کھلے طور پر طے ہوجائے۔ اور مرد کی عورت میں رغبت ہے یا نہیں؟ یہ بات جانے

کے لئے عقل اور مہر کی ضرورت ہوئی۔ اور عورت ولی کو عزیز ہوتی ہے اور وہ اس سے ہر دست درازی کو ہٹاتا ہے اس لئے نکاح میں ولی کی رضامندی بھی ضروری ہوئی۔

اور محارم سے نکاح اس لئے حرام ہوا کہ اس سے عورتوں کو بڑا ضرر پہنچ سکتا ہے مثلاً:

۱- عورت جس مرد سے نکاح کرنا چاہتی ہے ولی (باپ، بیٹا، بھائی وغیرہ) نہیں کرنے دے گا۔ خود کرنا چاہے گا، جس سے عورت کے جذبات کو ٹھیس پہنچے گی۔

۲- اگر شوہر عورت کے حقوق ادا نہیں کرتا تو عورت کی طرف سے اولیاء حقوق زوجیت کا مطالبہ کرتے ہیں، کیونکہ عورت کمزور ہوتی ہے۔ وہ خود جھگڑا نہیں کرسکتی، اس لئے عورت اس کی محتاج ہے کہ ایسے نازک وقت میں اولیاء اس کی دستگیری کریں۔ مگر جب ولی خود شوہر بن جائے گا، اور عورت کی حق تلفی کرے گا تو عورت کی طرف سے حقوق زوجیت کا مطالبہ کون کرے گا؟ کوئی مطالبہ کرنے والا نہیں ہوگا، جس سے عورت کو ضرر عظیم پہنچے گا۔

۳- اگر ولی کے نکاح میں بہن بیٹی کے علاوہ کوئی اور عورت بھی ہوگی تو جب سوکنوں میں جھگڑا ہوگا، اور شوہر دوسری عورت کا ہوکر رہ جائے گا تو قطع رحمی ہوگی۔

۴- سلیم المزاج لوگوں کی رغبت بیٹی، بیٹی اور بھائی بہن کی طرف نہیں ہوتی، اور بے رغبت نکاح بے فائدہ ہوتا ہے۔

نکاح کی عمر: جب لڑکا لڑکی بالغ ہو جائیں اور وہ صحبت کی ضرورت محسوس کریں تو نکاح کر دینا چاہئے۔ اور چونکہ ہم بستری کی خواہش کا اظہار بے شرمی کی بات ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کو بلوغ کے ضمن میں چھپا دیا ہے، کیونکہ بلوغ ہی بچے کے نشو ونما کا درجۂ کمال ہے۔ اس کو بلوغ تک ضرور پہنچنا ہے۔ اور بلوغ کی علامتیں (مرد میں ڈاڑھی اور عورت میں چھاتی) ایسی واضح رکھی ہیں کہ ان کو چھپایا نہیں جاسکتا۔ یہ علامات دیکھتے ہی والدین پر اولاد کے نکاح کی فکر سوار ہو جاتی ہے۔

تقریب ولیمہ: جب عقد نکاح ہو جائے اور شوہر کا بیوی پر قبضۂ تام بھی ہو جائے یعنی وہ بیوی سے متمتع بھی ہو چکے تو اس کی لطیف انداز پر اور عمدہ طریقے سے تشہیر کرنے کے لئے تقریب ولیمہ ہونی چاہئے، جس میں لوگوں کو مدعو کیا جائے، صرف دل خانہ کرنا کافی نہیں، ورنہ مقصد حاصل نہ ہوگا — اور ولیمہ کے موقعہ پر کچھ چہل پہل، کچھ شور، کچھ دف ہونی چاہئے مگر اس میں حدود سے تجاوز نہیں کرنا چاہئے۔

دَف: (عربی میں دال کے پیش کے ساتھ اور اردو میں زبر کے ساتھ) ڈفلی کو کہتے ہیں۔ یہ ایک ہاتھ سے بجانے کا تھالی نما ایک باجا ہے عرب میں شادی کے موقعہ پر اس کو بجانے کا رواج تھا۔ اس کے قائم مقام روشنی، جھنڈیاں وغیرہ بھی ہو سکتی ہیں۔ مگر یہ سب ولیمہ کے دن لڑکے کے گھر ہونا چاہئے۔ لڑکی کے باپ کے گھر عقد نکاح کے دن ان امور کا ثبوت نہیں۔

نکاح میں ولی بڑوں کا لحاظ: غرض مذکورہ بالا وجوہ سے اور ان کے علاوہ بہت سی وجوہ سے جن کا تذکرہ نہیں کیا گیا۔

ذلک بان اخوتہ یحسبونہ لیس کے معروف طریقہ پر نکاح ایک لازمی طریقہ، مسلسل سنت اور فطری امر ہو گیا ہے۔ عرب و عجم میں اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں۔ اور معروف طریقہ سے مراد یہ ہے کہ نکاح میں ان باتوں کا لحاظ رکھا جائے:

۱- غیر محارم سے نکاح کیا جائے محارم سے نکاح کی حرمت ابھی اوپر گزر چکی ہے۔

۲- نکاح علی الاعلان ہونا چاہئے، مخفی طور پر نہیں ہونا چاہئے۔ نبی کریم ﷺ کو چپکے سے نکاح کرنا (نکاح السر) ناپسند تھا (مسند احمد ۲:۳۰۷) نیز حدیث شریف میں ہے کہ "نکاح میں حلال و حرام کے درمیان امتیاز شور اور دف سے ہوتا ہے" (مشکوٰۃ، کتاب النکاح، باب اعلان النکاح، حدیث نمبر ۳۱۵۲)

۳- نکاح میں مہر ضروری ہے۔ مہر عورت کا گراں قدر ہونا ظاہر کرتا ہے، بے قیمت چیز بے قدر ہوتی ہے۔ ہدایہ میں ہے: لأن المهر واجب شرعا إبانة (أي إظهارا) لشرف المحل اھ (کتاب النکاح، باب المہر) نیز مَہر (میم کے زبر کے ساتھ) مُہر (میم کے زیر کے ساتھ یعنی محبت) بھی پیدا کرتا ہے۔ نیز مہر کی رقم نا گہانی مصارف میں بھی کام آتی ہے۔ شوہر کا اچانک انتقال ہو جائے اور ترکہ نہ ہو تو عدت میں اور نکاح ثانی تک مہر کی رقم سے کام چل سکتا ہے۔ پس مہر معتد بہ رقم ہونی چاہئے۔

۴- شادی سے پہلے منگنی ہونی چاہئے، یعنی لڑکے کی طرف سے لڑکی کو مانگنا چاہئے، اس سے بھی طلب اور عورت کی اہمیت ظاہر ہوتی ہے —— لڑکی کی طرف سے منگنی کا رواج عربوں میں نہیں تھا اور حدیث میں ہے کہ لا يخطب الرجل على خطبة أخيه حتى ينكح أو يترك (مشکوٰۃ، کتاب النکاح) یعنی کوئی شخص اپنے مسلمان بھائی کی منگنی پر منگنی نہ بھیجے (بلکہ انتظار کرے) تا آنکہ وہ نکاح کرے یا چھوڑ دے۔ اس میں اشارہ ہے کہ منگنی لڑکے کی طرف سے ہونی چاہئے۔

۵- نکاح میں کفاءت (مساوات، برابری) کا لحاظ رہنا چاہئے، تاکہ نکاح پائدار ہو۔ اور کفاءت میں ہر زمانہ میں اور ہر علاقہ میں رائج اقدار میں برابری دیکھنی چاہئے۔ جن اقوام میں ذات برادری یا پیشوں کی اہمیت ہے وہاں اس کا بھی لحاظ رہنا چاہئے۔

۶- نکاح ولی کی رضامندی سے ہونا چاہئے، عورتیں اپنی مرضی سے نکاح کریں یہ نہایت معیوب بات ہے۔ حدیث میں ہے (لا نكاح إلا بولي) یعنی ولی کی مرضی کے بغیر نکاح نہیں۔

۷- زفاف کے بعد دعوت ولیمہ ہونی چاہئے۔ اور اس کی وجہ ابھی مذکور ہوئی۔

۸- نکاح کے بعد مرد، عورت کا قوام رہے یعنی خانگی زندگی میں مرد کی بالادستی ہونی چاہئے، اگر اس کا برعکس ہو گا یا دونوں آزاد ہوں گے، کسی کی کسی پر بالادستی نہ ہوگی تو اس گھر کا خدا حافظ!

۹- نکاح کے بعد مرد عورت کی معیشت کا کفیل ہو، یعنی عورت کا نان و نفقہ مرد کے ذمہ ہونا چاہئے۔ قرآن کریم میں مرد کی قوامیت کی ایک وجہ یہ بیان کی گئی ہے ﴿وَبِمَا أَنْفَقُوا مِنْ أَمْوَالِهِمْ﴾ (النساء ۳۴) اور اس سبب سے کہ مردوں

نے اپنے مال (مہر نفقہ وغیرہ) خرچ کئے ہیں۔ یورپ و امریکہ میں جہاں مرد، عورت کی معیشت کا کفیل نہیں ہوتا، بلکہ عورت خود کفیل ہوتی ہے، وہاں عورتیں مردوں کے بالکل زیر اثر نہیں ہوتیں، اور ان کی فیملی لائف مہر و محبت سے بالکل خالی ہوتی ہے، بلکہ رشتۂ ازدواج کچے دھاگے کی مثال ہوتا ہے، صبح یا شام کسی بھی وقت ٹوٹ سکتا ہے۔

۱۰- نکاح کے بعد عورت شوہر کی خدمت گزار و اطاعت شعار ہو اور وہ اولاد کی پرورش کو اپنی ذمہ داری سمجھے۔

نکاح دائمی ہو۔ یعنی زوجین ایک دوسرے کو شریک حیات بنا کر ہمیشہ ساتھ رہنے کا عہد کریں۔ اس جذبہ کے بغیر تعاون باہمی کا مقصد پروان نہیں چڑھ سکتا اور یہ بات اسی وقت ممکن ہے جب ہر ایک دوسرے کے نفع و نقصان کو اپنا نفع و نقصان سمجھے، اور یہ تصور نکاح میں پختگی کے جذبہ کے بغیر ممکن نہیں۔ حدیث شریف میں ہے کہ: "اللہ تعالیٰ چکھنے والوں کو اور چکھنے والیوں کو پسند نہیں کرتے" (کنز العمال، کتاب الطلاق حدیث نمبر ۲۷۸۷۲)

طلاق کی ضرورت: جب زوجین میں موافقت اور باہمی رضامندی نہ رہے تو رستگاری کی راہ بھی ضروری ہے، گو وہ جائز کاموں میں حق تعالیٰ کو ناپسندیدہ ہو، اس لئے شرائط و قیود کے ساتھ اور عدت کی پابندی کے ساتھ طلاق مشروع ہوئی۔

عدت کی ضرورت: طلاق کے بعد اور شوہر کی وفات کے بعد چند وجوہ سے عدت ضروری ہے:

۱: عدت سے نکاح کی اہمیت ظاہر ہوتی ہے، کیونکہ عورت آج ایک کے ساتھ تھی کل دوسرے کے یہاں چلی گئی، تو رشتۂ ازدواج کی حیثیت کیا رہ گئی!

۲- عدت کی صورت میں عورت شریک حیات کا کسی درجہ میں حق ادا کرتی ہے۔

۳- عدت کے ذریعہ رفاقت کے عہد و پیمان کو کسی درجہ میں پورا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

۴- عدت میں سب سے اہم فائدہ یہ ہے کہ نسب خلط ملط ہونے سے محفوظ رہتا ہے کیونکہ عورت بوقت طلاق یا وفات حاملہ ہو سکتی ہے اور چند روز کا حمل ہونے کی وجہ سے اس کا پتہ نہ چل سکا ہو ایسا ہو سکتا ہے۔ پس اگر طلاق کے بعد یا شوہر کی وفات کے بعد عورت فوراً دوسرا نکاح کر لے گی تو کسی کا بچہ کسی کی طرف منسوب ہو جائے گا۔

نوٹ: اور مرد پر عام حالات میں[1] عدت اس لئے نہیں کہ وہ مرد کے موضوع کے خلاف ہے اور اس کے مشاغل میں حارج ہے نیز عدت کی بنیادی غرض (استبراء رحم) اس میں نہیں پائی جاتی۔ واللہ اعلم۔

---

[1] عام حالات میں اس لئے کہا کہ ایک صورت میں مرد پر بھی عدت (انتظار) لازم ہے اور وہ یہ ہے کہ کسی نے بیوی کو طلاق دی اور اب وہ اس بیوی کی بہن سے نکاح کرنا چاہتا ہے تو مطلقہ کی عدت پوری ہونے کے بعد ہی نکاح کر سکتا ہے اسی طرح کسی کے نکاح میں چار عورتیں تھیں اور وہ ایک کو طلاق دیدے تو اب کسی عورت سے نکاح اس مطلقہ کی عدت گزرنے کے بعد ہی کر سکتا ہے ورنہ پہلی صورت میں جمع بین الاختین اور دوسری صورت میں پانچ عورتوں کو نکاح میں جمع کرنا لازم آئے گا، جو کہ حرام ہے۔ اور یہ بات یہاں بھی لازم آئے گی کہ معتدہ کی عدت کے زمانہ تک نکاح فی الجملہ باقی رہتا ہے۱۲

﴿باب تدبير المنزل﴾

وهو الحكمة الباحثة عن كيفية حفظ الربط الواقع بين أهل المنزل على الحد الثاني من الارتفاق؛ وفيه أربع جُمَل: الزواج، والولاد، والملكة، والصحبة.

والأصل في ذلك: أن حاجة الجماع أوجبت ارتباطا واصطحابا بين الرجل والمرأة، ثم الشفقةُ على المولود أوجبت تعاونا منهما في حضانته. وكانت المرأة أهداهما للحضانة بالطبع، وأخفهما عقلا، وأكثرهما تحجاما من المشاق، وأتمهما حياءً ولزوما للبيت، وأحذقهما سعيا في محقّرات الأمور، وأوفرهما انقياداً؛ وكان الرجل أسدهما عقلا، وأشدهما ذبًّا عن الذِّمار، وأجرأهما على الاقتحام في المشاق، وأتمهما تيهًا وتسلُّطا ومناقشة وغيرة؛ فكان معاش هذه لايتم إلا بذاك، وذاك يحتاج إلى هذه.

وأوجبت مزاحمةُ الرجال على النساء، وغيرتُهم عليهن: أن لايصلح أمرُهم إلا بتصحيح اختصاص الرجل بزوجته على رؤوس الأشهاد

وأوجبت رغبة الرجل في المرأة، وكرامتُها على وليها، وذبُّه عنها: أن يكون مهرٌ، وخطبة، وتَصَدٍّ من الولي.

وكان لوفتح رغبةُ الأولياء في المحارم أفضى ذلك إلى ضرر عظيم عليها: من عضلها عمن ترغب فيه، وأن لايكون لها من يطالب عنها بحقوق الزوجية ـ مع شدة احتياجها إلى ذلك، وتكدير الرُّحم بمنازعات الضَّرَّات ونحوها، مع ما تقتضيه سلامةُ المزاج من قلة الرغبة في الذي نشأ معها، أو نشأت معه، أو كانا كغُصْنَيْ دَوْحة.

وأوجب الحياءُ عن ذكر الحاجة إلى الجماع: أن تُجعل مدسوسة في ضمن عروج يتوقع لهما، كأنه الغاية التي وُجدا لها

وأوجب التلطف في التشهير، وجعل النكاح المرئي عروجًا: أن تُجعل وليمة، يدعى الناسُ إليها، ودُفٌّ وطَرَبٌ.

وبالجملة: فلمعروجةٍ مما ذكرنا ومما حذفنا ـــ اعتمادا على ذهن الأذكياء ـــ كان النكاح بالهيئة المعتادة ـــ أعني نكاح غير المحارم، بمحضر من الناس، مع تقديم مهر وخطبة، وملاحظة كفاءة، وتصدٍّ من الأولياء، ووليمة، وكون الرجال قوّامين على النساء، متكفلين

معاشهن، وكونهن خادمات، حاضنات، مقبلات — سنةً لازمة، وأمرًا مسلمًا عند الكافة، وفطرةً فطر الله الناس عليها، لايختلف في ذلك عربهم ولا عجمهم.

ولما لم يكن بذل الجهد منهما في التعاون، بحيث يجعل كلُّ واحد ضرر الآخر ونفعه كالراجع إلى نفسه، إلا بأن يوطِّنا أنفسهما على إدامة النكاح؛ ولابد من إبقاء طريق للخلاص إذا لم يتطاوعا ولم يتراضيا، وإن كان من أبغض المباحات: وجب في الطلاق ملاحظة قيود، وعدة، وكذا في وفاته عنها، تعظيمًا لأمر النكاح في النفوس، وأداءً لبعض حق الإدامة، ووفاءً لعهد الصحبة، ولئلا تشتبه الأنساب.

ترجمہ: خانگی تدابیر کا بیان: اور تدبیر منزل: وہ حکمت (عملیہ) ہے جو ارتفاق کی صورت پر ایک گھر کے باشندوں میں پائے جانے والے ربط و تعلق کی نگہداشت کی کیفیت سے بحث کرنے والی ہے۔ اور اس فن میں چار مبحثے ہیں: ازدواج، ولادت، ملکیت اور رفاقت۔

اور بنیادی بات اس (ازدواج) میں یہ ہے کہ معاش کی ضرورت نے مرد اور عورت کے درمیان باہمی تعلق اور رفاقت ثابت کی ہے۔ پھر اولاد پر شفقت نے ان کی پرورش میں تعاون باہمی کو ثابت کیا ہے۔ اور عورت فطری طور پر اولاد کی پرورش میں دونوں میں زیادہ راہ یاب تھی اور عقل کے اعتبار سے ہلکی تھی، اور محنت و مشقت کے کاموں سے زیادہ باز رہنے والی تھی، اور شرم اور خانہ نشینی کے اعتبار سے کامل تر تھی، اور معمولی کاموں کو انجام دینے میں زیادہ ماہر تھی، اور تابعداری میں زیادہ کامل تھی — اور مرد دونوں میں زیادہ درست رائے والا تھا، اور عار کی باتوں کو ہٹانے میں زیادہ مضبوط تھا، اور محنت و مشقت کے کاموں میں گھسنے میں زیادہ دلیر تھا۔ اور غرور، بغض، جھگڑا کرنے اور غیرت میں کامل تر تھا، اس لئے عورت کی زندگی مرد کے بغیر ناتمام تھی، اور مرد کو عورت کی احتیاج تھی۔

اور عورتوں پر مردوں کی مزاحمت (تعرض) اور غیرت نے ثابت کیا کہ مردوں کا معاملہ اسی وقت ختم ہو سکتا ہے جب گواہوں کے سامنے مرد کا اس کی بیوی کے ساتھ اختصاص (خاص ہونا) صحیح طور پر طے کر دیا جائے۔

اور عورت میں مرد کی رغبت نے، اور ولی کی نظر میں عورت کی عزت نے، اور عورت سے ولی کی مدافعت نے ثابت کیا کہ مہر، منگنی اور ولی کی طرف سے آمادگی ہو۔

اور اگر نکاح میں ولی کی رغبت کا دروازہ کھول دیا جاتا تو یہ چیز عورتوں کے حق میں ضرر عظیم کا باعث تھی۔ یعنی عورت کو اس شخص کے ساتھ نکاح کرنے سے روکنا جس میں عورت رغبت رکھتی ہے اور یہ کہ عورت کے لئے کوئی ایسا شخص نہ ہو جو اس کی طرف سے زوجیت کے حقوق کا مطالبہ کرے، حالانکہ عورت اس چیز کی بہت زیادہ محتاج ہے، اور سوکنوں کے جھگڑوں سے خاندانی رشتہ داری کا مزہ کرکرا کر دینا، اور اس قسم کے دوسرے امور کے ساتھ جس کو مزاج کی سلامتی چاہتی

ہے یعنی اس مرد میں رغبت نہ ہونا جو خود اس عورت سے پیدا ہوا ہو (یعنی بیٹے میں) اور وہ اس مرد سے پیدا ہوئی ہو (یعنی بیٹی میں) یا دونوں ایک بڑے درخت کی دو شاخوں کی طرح ہوں (یعنی بھائی بہن ہوں)

اور جماع کی ضرورت کے تذکرہ سے شرم نے ثابت کیا کہ وہ ضرورت ایسے عروج (بلوغ) کے ضمن میں چھپا دی جائے، جس کی ان دونوں (لڑکے لڑکی) کے لئے امید باندھی گئی ہو، گویا وہ وہ آخری حد ہے جس تک پہنچنے کے لئے وہ دونوں پیدا کئے گئے ہیں۔

اور تشہیر میں لطیف انداز اختیار کرنے نے، اور کمال فیض کے بام عروج تک پہنچ جانے نے ثابت کیا کہ ایسا ولیمہ کیا جائے جس میں لوگوں کو دعوت دی جائے اور دفلی اور خوشی ہو۔

اور خلاصہ یہ ہے کہ وجوہ کثیرہ کی وجہ سے ــــ جن میں سے بعض کو ہم نے ذکر کیا اور بعض کا تذکرہ لانا کیا ہے کہ ہم پر اہتمام کرتے ہوئے چھوڑ دیا ــــ معروف طریقہ پر نکاح ــــ یعنی غیر محارم سے نکاح، لوگوں کی موجودگی میں، مہر اور منگنی کی پیش کش کے ساتھ، اور کفاءت کا لحاظ رکھ کر، اور اولیاء کی آمادگی (رضامندی) سے، اور ولیمہ کے ساتھ، اور عورتوں پر مردوں کی بالادستی کے ساتھ اور مردوں کے عورتوں کی معیشت کا متکفل ہونے کے ساتھ اور عورتوں کے خدمت گزار، اطاعت شعار اور اولاد کی پرورش کرنے والیاں ہونے کے ساتھ ــ سب لوگوں کے نزدیک ایک لازمی طریقہ، مسلّم امر اور اسکی فطری بات ہو گیا جس پر اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو پیدا کیا ہے۔ جس میں نہ عربوں کا اختلاف ہے، نہ عجمیوں کا۔

اور جب دونوں کا تعاون باہمی کی کوشش کرنا ــ اس طرح کہ ہر ایک دوسرے کے نفع نقصان کو اپنی ذات کی طرف لوٹنے والے نفع و ضرر کی طرح سمجھے ــ ممکن نہیں تھا مگر اس طرح کہ دونوں خود کو نکاح ہمیشہ رکھنے پر آمادہ کر لیں (اس لئے نکاح میں دوام ضروری ہوا) اور جب دونوں میں موافقت اور باہمی رضامندی نہ رہے تو رستگاری کی کوئی راہ باقی رکھنی بھی ضروری تھی، اگرچہ وہ راہ جائز کاموں میں سب سے زیادہ ناپسندیدہ ہو، تو طلاق میں قیود کا لحاظ اور عدت ضروری ہوئی۔ اور اسی طرح عدت ضروری ہے جب مرد عورت کو چھوڑ کر وفات پا جائے: دلوں میں نکاح کے معاملہ کی اہمیت ظاہر کرنے کے لئے اور منگنی کا کچھ حق ادا کرنے کے لئے اور رفاقت کے عہد کو نباہنے کے لئے، اور تاکہ نسب میں اشتباہ پیدا نہ ہو۔

لغات:

اِصْطَحَبُوْا: ایک دوسرے کے ساتھ ہونا ... اَلْخَجَم: باز رہنا خَجَم (ن) فلانا عن الأمر: کفّ وصرفه ... جُمَلٌ جمع ہے جُمْلَةٌ کی اور یہ وہی لفظ ہے جو بالجملة میں ہے یعنی باب کا ما حصل چار باتیں ہیں ... مَشَاقٌ جمع ہے مَشَقَّةٌ کی یعنی دشواری، محنت ... اَلْفَعلو: حرم، ہر وہ چیز جس کی حمایت و حفاظت ضروری ہو ... الْبِنَهُ غرور تاؤ (ن) بِنْهًا: تکبر کرنا ... مناقشة: جھگڑا کرنا ... مَلَاك: اقتدار، قبضہ السلاك العنزلی محبت سے کنایہ ہے

وطّن علی الامر: آمادہ کرنا، برانگیختہ کرنا۔

ترکیب: علی العھد الثانی متعلق ہے الواقع سے۔

تصحیح: الذی نشأمنھا اصل میں اور تمام مخطوطات میں الذی نشأمنھا ہے۔ یہ سبقت قلم ہے یا تصحیف ہے، دلیل نشأ مذکر کا صیغہ ہے۔

دوسرا مسئلہ: اولاد کے احوال

اولاد کے سلسلہ میں شاہ صاحب رحمہ اللہ نے دو باتیں بیان کی ہیں:

اول: اولاد ابتداء میں ماں باپ کی محتاج ہوتی ہے، ان کی دیکھ بھال سے ہی پروان چڑھتی ہے نیز ماں باپ فطری طور پر اولاد پر مہربان ہوتے ہیں، اس لئے باپ کی ذمہ داری ہے کہ وہ اولاد کی ایسی تربیت کرے جو آئندہ ان کے حق میں مفید ہو۔ پہلے اس کو دین کا ضروری علم سکھائے، کیونکہ دنیا وآخرت کی کامیابی اسی پر موقوف ہے۔ پھر بچہ کی صلاحیت اور رغبت دینی یا دنیوی تعلیم کی طرف ہو تو اعلی تعلیم دلائے۔ صنعت وحرفت یا کاروبار کی طرف ہو تو اس راہ پر لگائے، مگر دینی تربیت کی طرف سے کبھی غفلت نہ برتے۔

دوم: تین وجہ سے ضروری ہے کہ اولاد ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کرے:

(۱) ماں باپ بہرحال اولاد سے بڑے ہوتے ہیں۔ اولاد خواہ کتنی ہی عمر رسیدہ ہوجائے، ماں باپ ان سے کم از کم پندرہ بیس سال بڑے ہوتے ہیں، اس لئے عقل کی فراوانی اور تجربات کی زیادتی کی دولت ان کو حاصل ہوتی ہے۔ اور بڑوں کی عزت کرنا حسن سلوک کا ایک حصہ ہے۔

(۲) اخلاق عالیہ کا تقاضا یہ ہے کہ بھلائی کا بدلہ بھلائی سے دیا جائے جب ماں باپ نے اولاد کے ساتھ ہر طرح سے بھلائی کی ہے تو ضروری ہے کہ اولاد بھی اس کا بدلہ بھلائی سے دے۔

(۳) ماں باپ نے اولاد کی پرورش میں جو تکالیف برداشت کی ہیں وہ اظہر من الشمس ہیں، پس جب ماں باپ بڑی عمر میں اولاد کی خدمت کے محتاج ہو جائیں تو ضروری ہے کہ اولاد ہر طرح سے ان کی خدمت کرے۔

تیسرا مسئلہ: ملکیت (نوکری اور غلامی)

ملکیت یعنی مالک ہونا دو طرح کا ہوتا ہے: ایک ملکیت بمعنی ملازمت (نوکری) دوسرے ملکیت بمعنی غلامی۔ دونوں کی تفصیل درج ذیل ہے:

(۱) تمام انسان یکساں استعداد کے مالک نہیں ہوتے، اس لئے کوئی فطری طور پر آقا (سیّد) ہے تو کوئی نوکر۔ جو

شخص کاروباری ذہن رکھتا ہے مستقل معیشت (کاروبار) کا مالک ہے فطری طور پر اس میں نظم و انتظام کی صلاحیت ہے، جو آسودہ حال ہے اور خوش گوار زندگی گزارتا ہے وہ آقا ہے، اور جو کاروبار میں بے توقف ہے یا سرمایہ نہیں رکھتا اور اس میں تابعداری کا پورا جوہر موجود ہے اس طرح کہ اس کو جدھر کھینچا جائے کھنچ جاتا ہے۔ ایسا شخص دوسرے کے یہاں ملازمت کرتا ہے۔ غرض سیٹھ ملازموں کا محتاج ہے ان کے تعاون کے بغیر اس کا کاروبار نہیں چل سکتا، اور ملازم سیٹھ کے محتاج ہیں، آقا سے ان کی روزی روٹی کا مسئلہ وابستہ ہے۔ اس طرح ملکیت یعنی ملازمت وجود میں آئی، اور آج ساری دنیا میں یہ ملکیت رائج ہے۔ بڑی بڑی ڈگریوں کے مالک ملازمت کے ذریعہ پیٹ بھرتے ہیں اور کوئی بڑا کاروبار ملازموں کے تعاون کے بغیر نہیں چل سکتا۔ اس لئے ضروری ہے کہ اس رشتہ کو پاکیزہ بنایا جائے۔ سیٹھ خود کو ملازموں کا محسن سمجھے، نہ دولت کا مالک نہ بن جائے۔ اور ملازمین ہر طرح سے آقا کے اور اس کے کاروبار کے خیر خواہ رہیں۔ جبھی خوشی و ناخوشی میں باہمی تعاون ممکن ہے۔

(ج) ملکیت یعنی غلامی جنگوں کا پیدا کیا ہوا مسئلہ ہے۔ جب دو فریق لڑتے ہیں اور ایک دوسرے کے آدمیوں کو قید کرتے ہیں اور قیدیوں کا کوئی مناسب حل نہیں نکلتا تو قدیم زمانہ سے ساری دنیا میں اس کا یہ حل چلا آرہا تھا کہ ان قیدیوں کو غلام بنایا جائے اس طرح ملکیت یعنی غلامی وجود میں آئی۔ غلامی کا مسئلہ اسلام کا پیدا کیا ہوا نہیں نہ اسلام کو اس پر اصرار ہے۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ جنگی قیدیوں کا مسئلہ مختلف طرح سے حل کیا جاسکتا ہے۔ یا تو قیدیوں کو قتل کر دیا جائے یا قیدیوں کا قیدیوں سے تبادلہ کیا جائے۔ یا مفت چھوڑ دیا جائے یا جنگ کا جرمانہ (فدیہ) لے کر چھوڑ دیا جائے یا جیل میں رکھ کر زندگی بھر کھلایا جائے۔ اگر یہ سب حل ممکن نہ ہوں یا مناسب نہ ہوں تو آخری حل یہ ہے کہ ان کو فوج میں تقسیم کر دیا جائے۔ اور ہر فوجی اپنے غلام کو اپنے گھر بھیج دے، وہاں وہ کام کرے اور کھائے۔

اسلام نے مسئلہ کے اس حل کو جو پہلے سے چلا آرہا تھا اور ساری دنیا میں رائج تھا باقی رکھا ہے۔ اس میں قیدیوں کا یہ فائدہ ہے کہ جب وہ اسلامی معاشرہ میں پہنچیں گے تو اسلامی تعلیمات سے روشناس ہوں گے اور دیر سویر ان کے سینے نور ایمان سے منور ہو جائیں گے۔ اسلام کی ابتدائی تاریخ اس کی بہترین مثال ہے — اور اسلام نے غلاموں کے لئے ایسے قواعد و ضوابط بنا دیئے ہیں جن سے ظلم و ستم کا سد باب ہو جاتا ہے، نیز غلامی سے نکلنے کی بہت سی راہیں بھی تجویز کر دی ہیں، تاکہ غلامی کا طوق ہمیشہ کے لئے گردن میں نہ پڑ جائے۔

نیز غلامی کا مسئلہ دنیا سے ختم نہیں ہوا۔ آج بھی مختلف ممالک میں، خاص طور پر یورپ و امریکہ میں عورتوں اور بچوں کی خرید و فروخت جاری ہے مگر چونکہ یہ غیر قانونی کاروبار ہے اس لئے ان بے چاروں کے لئے نہ کوئی قانون ہے نہ رستگاری کی کوئی راہ!

وأوجبت حاجةُ الأولاد إلى الآباء، وحدَبُهم عليهم بالطبع: أن يكون تمرينُ الأولاد على ما ينفعهم فطرةً؛ وأوجب تفضُّلُ الآباء عليهم، فلم يكبُروا إلا والآباءُ أكثر عقلاً وتجربةً، مع ما يوجبه صحةُ الأخلاق من مقابلة الإحسان بالإحسان، وقد قاسوا في تربيتهم ما لا حاجة إلى شرحه: أن يكون برُّ الوالدين سنةً لازمةً.

وأوجب اختلافُ استعداد بني آدم: أن يكون فيهم السيِّدُ بالطبع، وهو الأكيَس المستقل بمعيشته، ذو سياسة ورفاهية جِبِلِّيَّين، والعبدُ بالطبع، وهو الأخرق التابع، ينقاد كما يُقاد؛ وكان معاش كل واحد لا يتم إلا بالآخر، ولا يمكن التعاون في المَنْشَط والمَكْرَه إلا بأن يُوَطِّنا أنفسَهما على إدامة هذا الربط.

ثم أوجبت اتفاقاتٌ أُخَرُ: أن يأسِر بعضُهم بعضًا، فوقع ذلك منهم بموقع، وانتظمت المَلَكَة؛ ولابد من سنة يؤاخذ كلُّ واحد نفسَه عليها، ويُلام على تركها؛ ولابد من إبقاء طريق الخلاص في الجملة بمال أو بدونه.

ترجمہ: اور آباء کی طرف اولاد کی احتیاج نے، اور اولاد پر آباء کی فطری مہربانی نے واجب کیا کہ اولاد کو ایسے امور کی تربیت دی جائے جو اولاد کے حق میں مفید ہو۔ اور اولاد سے آباء کے پہلے ہونے نے، پس نہیں بڑی ہوتی اولاد مگر اس حال میں کہ آباء کی عقل اور تجربہ زیادہ ہوتا ہے، اس چیز کے ساتھ جس کو اخلاق کی درستگی واجب کرتی ہے یعنی احسان کے مقابلہ میں احسان کرنا۔ اور تحقیق آباء نے اولاد کی پرورش میں جو تکلیفیں برداشت کی ہیں ان کی تفصیل کی حاجت نہیں (ان وجوہ ثلاثہ نے واجب کیا) کہ والدین کے ساتھ حسن سلوک ایک لازمی امر ہو۔

اور انسانوں کی استعداد کے اختلاف نے واجب کیا کہ ان میں (کچھ لوگ) فطری طور پر آقا (سیٹھ) ہوں ——— اور وہ نہایت ذہین، اپنی مستقل معیشت رکھنے والا، فطری طور پر سیاست (بہترین نظم و انتظام جاننے) والا، آسودہ زندگی گزارنے والا شخص ہے ——— اور (کچھ لوگ) فطری طور پر غلام (نوکر) ہوں ——— اور وہ بے وقوف فرمانبردار ہے جو کھنچتا ہے جس طرح کھینچا جائے ——— اور ہر ایک کی معاش (گذر بسر کا سامان) دوسرے کے بغیر تکمیل پذیر نہیں ہوسکتی۔ اور خوشی اور ناخوشی میں ایک دوسرے کا تعاون ممکن نہیں مگر اس طرح کہ دونوں اپنے آپ کو اس تعلق کو ہمیشہ رکھنے پر آمادہ رکھیں۔

پھر کچھ دوسرے اتفاقات نے واجب کیا کہ بعض، بعض کو قید کریں۔ پس یہ بات (یعنی ملکیت یعنی غلامی) ان کو بہت ہی پسند آئی (یعنی قیدیوں کا ان کو یہ بہترین حل نظر آیا) اور ملکیت منظم ہوگئی (یعنی اس کا سلسلہ شروع ہوگیا) اور کوئی

ایسا طریقہ ہونا ضروری ہے جس کا ہر شخص خود کو پابند بنائے، اور وہ اس کے ترک پر ملامت کیا جائے۔ اور کسی نہ کسی طرح دستگاری کی راہ باقی رکھنی بھی ضروری ہے۔ خواہ مال کے ذریعہ ہو یا بغیر مال کے (کسی اور طرح سے ہو، جیسے کفاروں میں غلاموں کو آزاد کرنا وغیرہ)

لغات:

حدب علیہ: مہربان ہونا حدب (س) حدبًا: کبڑا ہونا ۔ الأکیس (اسم تفضیل) نہایت ذہین ۔۔۔ رفاہیۃ: آسودگی خوش گوار زندگی ۔ الأخرق (اسم تفضیل) نہایت بےوقوف خرق (س) خرقًا: بےوقوف ہونا ۔ الغبطۃ: خوش دلی .... المنکرۃ: ترشی ۔۔ زغّل علیہ: آمادہ کرنا، برانگیختہ کرنا۔

چوتھا مسئلہ: صحبت (رفاقت)

صحبت کے معنی ہیں ساتھی ہونا، ایک ساتھ زندگی بسر کرنا۔ انسان چونکہ مدنی الطبع ہے اس کی فطرت میں مل جل کر رہنے کا جذبہ ہے اس لئے صحبت (رفاقت) کا مسئلہ پیدا ہوا یعنی آپس میں رشتۂ الفت و مودت قائم کرنا، اور اس کو ہمیشہ باقی رکھنا ضروری ہوا کیونکہ بارہا ایسا اتفاق ہوتا ہے کہ حاجتیں اور آفتیں آدمی پر ٹوٹ پڑتی ہیں، کوئی سخت بیماری آگھیرتی ہے یا ایسے حقوق لازم ہو جاتے ہیں کہ دوسروں کے تعاون کے بغیر ان سے عہدہ برآ ہونا مشکل ہوتا ہے۔ اور ایسی آفت ہر کسی پر پڑسکتی ہے، کوئی اس سے مستثنیٰ نہیں، اس لئے تعاون باہمی کی شکلیں ترقی یافتہ معاشرہ کی بنیادی ضرورت بن گئیں۔

اسی طرح مدد خواہوں کی مدد کے لئے اور مظلوموں کی اعانت کے لئے ایسے طریقے ہونے بھی ضروری ہیں جن کا ہر کسی سے مطالبہ کیا جاسکے، اور جو پیچھے ہٹے اس کو ملامت کی جاسکے۔

دو طرح کی حاجتیں: پھر انسانی حاجتیں دو طرح کی ہیں:

① نہایت اہم اور بڑی حاجتیں، جیسے بیوی کا نان نفقہ، اولاد پر خرچ کرنا اور ان کی خبرگیری کرنا، ماں باپ پر خرچ کرنا اور ان کی خدمت گذاری۔ یہ حاجتیں اسی وقت پوری ہوسکتی ہیں جب چار باتیں پائی جائیں:

(۱) جب محتاج اور محتاج الیہ میں سے ہر ایک دوسرے کے نفع و ضرر کو اپنا نفع و ضرر سمجھے۔

(۲) جب ہر ایک دوسرے کی مدد کرنے میں اپنی پوری طاقت صرف کرے۔

(۳) جب ہر ایک دوسرے پر خرچ کرنے کو واجب جانے۔

(۴) جب ہر ایک دوسرے کا وارث بنے۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ انسان کی کچھ حاجتیں نہایت اہم ہوتی ہیں۔ اور وہ وقتی نہیں ہوتیں، بلکہ لمبے عرصہ تک ان حاجتوں میں تعاون ضروری ہوتا ہے، جیسے بیوی اس کی محتاج ہے کہ شوہر اس پر پوری زندگی خرچ کرے، شوہر اس کا محتاج

ہے کہ بیوی بچوں والا ہو اور ان کی جب تک پرورش کرے اور زندگی بھر کا خرچ سنبھالے۔ اور والدین کی محتاجی ہے کہ پورے بچپن کے زمانہ میں ماں باپ ان کی دیکھ بھال کریں اور ان پر خرچ کریں۔ ماں باپ اس کے محتاج ہیں کہ کوئی بڑھاپے کے پورے زمانہ میں اور وہ ان کا سہارا بنے اور تنگی کی صورت میں ان پر خرچ بھی کرے۔

یہ حاجتیں اہم ہونے کے ساتھ چونکہ لمبی ہیں اس لئے ان کی تکمیل اسی صورت میں ممکن ہے کہ محتاج و محتاج الیہ میں سے ہر ایک دوسرے کے نفع نقصان کو اپنا نفع نقصان سمجھے۔ جب یہ تصور ہوگا تو جس طرح آدمی اپنی ذات پر لمبے عرصہ تک خرچ کرتا ہے دوسروں پر بھی کرے گا۔ نیز یہ بھی ضروری ہے کہ ہر ایک دوسرے کی مدد کرنے میں انتہائی طاقت صرف کرے، کیونکہ اس کے بغیر دوسرے کی لمبے عرصہ تک حاجت روائی ممکن نہیں۔ نیز یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اس حاجت روائی کو شرعاً واجب سمجھے کیونکہ لزوم شرعی کے تصور کے بغیر عمل دشوار ہوتا ہے۔ نیز توارث یعنی ایک دوسرے کا وارث ہونا بھی ضروری ہے، کیونکہ جب آدمی خرچ کیا ہے تو کل اس کا عوض بھی ملنا چاہئے۔ یہ کسی طرح قرین عقل نہیں کہ خرچ تو کوئی کرے اور مال کوئی لے اڑے۔ حدیث شریف میں ضابطہ کلیہ آیا ہے کہ الغُنم بالغُرم یعنی نفع بعوض تاوان ہے یعنی جس نے زندگی بھر خرچ کیا ہے اور ہر طرح دیکھ بھال اور خدمت کی ہے میراث کا بھی وہی زیادہ حقدار ہے۔ علاوہ ازیں انسان باہمی تعاون کرنے کا عادی ہے پس وہ میراث کی لالچ میں حاجت روائی کے لئے تیار ہوجائے گا ﴿وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ﴾ (البقرة ۲۳۳) میں اسی طرف اشارہ ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس پہلی قسم کی حاجتیں انہی چیزوں ہی سے تکمیل پذیر ہوسکتی ہیں جو ان حاجتوں سے لازم ہوں۔ اور اس وجہ سے اقربا زیادہ سزاوار ہیں یعنی انہیں کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ آپس میں ایک دوسرے کی یہ حاجتیں پوری کریں، کیونکہ ان کا ایک دوسرے سے محبت کرنا اور ان کی باہمی محبت و مودت فطری امر کی طرح ہے۔ اس لئے وہ لمبے عرصہ تک ایک دوسرے کی حاجتیں خوش دلی کے ساتھ پوری کرسکتے ہیں۔ دوسرے لوگوں کے لئے یہ بات دشوار ہے۔

(۲) ہلکی اور وقتی حاجتیں: یہ ہر کوئی پوری کرسکتا ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ لوگوں میں اہل مصائب کی ہمدردی کے لئے کوئی مستقل طریقہ ہو، اور آپس کے دائرے ہوں، جو یہ کام انجام دیں۔

اور بوقت تعارض پہلی صورت زیادہ مؤکد اور مقدم ہے مثلاً ایک شخص کے پاس سو روپے ہیں، جس کی اس کو بال بچوں کے خرچ کے لئے ضرورت ہے، اب ایک حاجت مند تعاون کا طالب ہوتا ہے تو حاجت مند سے مؤکد اور مقدم اولاد ہے۔

وكان يتفق كثيرًا أن تقع على الإنسان حاجاتٌ وعاهاتٌ: من مرض، وزمانة، وتوجُّه حق عليه، وحوائج يضعف عن إصلاح أمره معها إلا بمعاونة بني جنسه، وكان الناس فيها سواسيةً، فاحتاجوا إلى إقامة ألفة بينهم وإدامتها، وأن تكون لإغاثة المستغيث، وإعانة الملهوف سنةً بينهم، يطالبون بها، ويلامون عليها.

ولما كانت الحاجات على حدين:

حدٌّ لا يتم إلا بأن يعدّ كلُّ واحد ضرَّ الآخر ونفعه راجعًا إلى نفسه، ولا يتم إلا ببذل كل واحد الطاقة في موالاة الآخر، ووجوب الإنفاق عليه، والتوارث؛ وبالجملة: فأمور تلزمهم من الجانبين، ليكون الغُنم بالغُرم؛ وكان ألفى الناس بهذا الحد الأقارب، لأن تحابّهم واصطحابهم كالأمر الطبيعي.

وحد يتأتى بأقل من ذلك، فوجب أن تكون مواساةُ أهل الحاجات سنةً مسلّمة بين الناس، وأن تكون صلة الرحم أوكد وأشد من ذلك كله.

ترجمہ: اور بارہا ایسا اتفاق ہوتا ہے کہ انسان پر حاجتیں اور آفتیں آن پڑتی ہیں، جیسے بیماری، اپاہجپن یا کسی ایسے حق یا حاجتوں کا اس کی طرف متوجہ ہونا کہ وہ شخص ان حقوق وحاجات کے ساتھ، دوسروں کی دستگیری کے بغیر، اپنے معاملے کو سنوارنے میں کمزور پڑ جائے۔ اور لوگ حاجات میں یکساں تھے، پس لوگوں کو آپس میں رشتہ الفت قائم کرنے کی، اور اس کو ہمیشہ باقی رکھنے کی ضرورت محسوس ہوئی اور یہ بھی ضروری ہوا کہ مددخواہوں کی امداد کے لئے اور مظلوم کی اعانت کے لئے لوگوں میں کوئی ایسا طریقہ ہو، جس کا ہر ایک سے مطالبہ کیا جائے۔ اور اس کے ترک پر وہ شخص ملامت کیا جائے۔

اور جب انسانی ضرورتوں کے دو درجے تھے۔

ایک درجہ: وہ ہے جس کی تکمیل بغیر اس کے ممکن نہیں کہ ہر انسان دوسرے کے نفع وضرر کو اپنا نفع ونقصان تصور کرے اور یہ بات بدوں اس کے مکمل نہیں ہوسکتی کہ ہر ایک دوسرے کی مدد کرنے میں اپنی پوری طاقت صرف کرے، اور دوسرے پر خرچ کرنے کو اور ایک دوسرے کے وارث ہونے کو واجب جانے۔ اور خلاصہ یہ ہے کہ اس درجہ کی تکمیل ایسی چیزوں ہی سے ہوسکتی ہے جو لوگوں پر جانبین سے لازم ہوں تا کہ نفع بعوض نقصان ہو جائے۔ اور اس درجہ کے زیادہ سزاوار رشتہ دار ہیں، اس لئے کہ ان کا ایک دوسرے سے محبت کرنا اور ان کی باہم رفاقت فطری چیز جیسی ہے۔

اور دوسرا درجہ: وہ ہے جو اس سے کم میں بھی حاصل ہو جاتا ہے۔ پس ضروری ہوا کہ لوگوں میں اہل مصائب کی ہمدردی ایک مسلمہ طریقہ ہو۔ اور یہ (بھی ضروری ہوا) کہ صلہ رحمی ان سب سے زیادہ موکد اور زیادہ مضبوط ہو۔

لغات:

الزمانۃ: آفت، اپاہجپن ...... بعض جنسہ سے مراد ہم نوع ہیں یعنی انسان مراد ہیں، حیوانات مراد نہیں ہیں......

اغاثہ اِغاثۃ: مدد کرنا المستغیث: مدد طلب کرنے والا ..... الملھوف: مظلوم، غمگین لھف (س) لَھَفًا علی مافات: غمگین ہونا لُھِفَ لَھفًا: ظلم کیا جانا ...... والی مُوالاۃ الرجلَ: مدد کرنا ...... فامور متعلق ہے لا یتم سے ...... الغُنم:

تیمست، قائدہ ۔ الغرم۔ تاوان، وہ مال جس کا ادا کرنا ضروری ہو۔

فن کے مسائل

اس فن کے بڑے مسائل میں ہیں جو عبارت کے ترجمہ سے سمجھ میں آجائیں گے۔ ان میں سے ہر مسئلہ ایک پورا باب ہے۔ اور ان ابواب کی بنیادی باتوں کو دنیا کی تمام اقوام تسلیم کرتی ہے۔ اور ان کو روبعمل لانے کی کوشش کرتی ہیں، خواہ ان کا کوئی بھی مذہب ہو اور خواہ وہ کسی ملک کے باشندے ہوں۔

ومُعْظَم مسائل هذا الفن: معرفةُ الأسباب المقتضية للزواج وتركه، وسنةُ الزواج، وصفةُ الزوج والزوجة، وماعلى الزوج: من حسن المعاشرة وصيانة الحرم عن الفواحش والعار، وما على المرأة: من العفف وطاعة الزوج وبذل الطاقة في مصالح المنزل؛ وكيفيةُ صلح المتشاجرَين، وسنةُ الطلاق، وإحدادُ المتوفى عنها زوجها، وحضانةُ الأولاد، وبرُّ الوالدين، وسياسةُ المماليك والإحسانُ إليهم، وقيامُ المماليك بخدمة المولى، وسنةُ الإعتاق، وصلةُ الأرحام والجيران، والقيامُ بمواساة فقراء البلد، والتعاونُ في دفع عاهات طارئة عليهم، وأدبُ نقيب القبيلة، وتعهُّدُه حالهم، وقسمةُ التركات بين الورثة، والمحافظةُ على الأنساب والأحساب.
فلن تجد أمةً من الناس إلا وهم يعتقدون أصولَ هذه الأبواب، ويجتهدون في إقامتها على اختلاف أديانهم، وتباعد بلدانهم، والله أعلم.

ترجمہ: اور اس فن کے بڑے مسائل یہ ہیں: ۱- ان اسباب کو جاننا جو ازدواجی تعلق کو قائم کرنے یا ترک کرنے کے مقتضی ہوتے ہیں ۲- نکاح کا طریقہ ۳- زوجین کے اوصاف یعنی شوہر کیسا ہونا چاہئے اور بیوی کیسی ہونی چاہئے؟ ۴- شوہر کے فرائض جیسے حسن معاشرت، بیوی کی نواحش اور ننگ وعار کی باتوں سے حفاظت ۵- عورت کے فرائض، جیسے پاکدامنی، شوہر کی فرماں برداری اور گھر کے مفادات میں پوری کوشش خرچ کرنا ۶- زوجین میں کشیدگی کی صورت میں مصالحت کا طریقہ ۷- طلاق دینے کا طریقہ ۸- خاوند کے مرنے کے بعد بیوی کا سوگ کرنا ۹- اولاد کی پرورش ۱۰- ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک ۱۱- غلاموں اور باندیوں (نوکروں) کا نظم وانتظام اور ان کے ساتھ حسن سلوک ۱۲- غلاموں کا اپنے آقا کی خدمت کے لئے آمادہ رہنا ۱۳- غلاموں کو آزاد کرنے کا طریقہ ۱۴- رشتہ داروں اور پڑوسیوں کے ساتھ نیک سلوک کرنا ۱۵- شہر کے غریبوں کی غم خواری کے لئے آمادگی ۱۶- لوگوں پر

ٹوٹ پڑنے والے مصائب کو ہٹانے کے لئے تعاون باہمی تھا۔ -قبیلہ کے سردار کا احترام ۱۸- سردار قبیلہ کا لوگوں کی خبر گیری کرنا ۱۹- ورثاء کے درمیان ترکہ کی تقسیم ۲۰- حسب (خاندانی خوبیوں) اور نسب کی حفاظت۔

پس لوگوں میں کوئی قوم آپ کو ایسی نہیں ملے گی مگر وہ ان ابواب کی بنیادی باتوں کو مانتی ہوگی اور ان کو روبعمل لانے کی کوشش کرتی ہوگی۔ ان کے مذاہب کے اختلاف اور ان کی آبادیوں کے دور دراز ہونے کے باوجود۔ باقی اللہ بہتر جانتے ہیں۔

باب ——— ۵

فنِ معاملات کا بیان

یہ ارتفاق ثانی کا تیسرا اور آخری باب ہے۔ فنِ معاملات حکمت عملیہ کی ایک قسم ہے۔ فنِ معاملات: وہ علم ہے جس میں ترقی یافتہ تمدن میں تبادلہ اشیاء، تعاون باہمی اور ذرائع معاش کو وجود پذیر کرنے کے طریقوں سے بحث کی جاتی ہے۔ ذیل میں ان تینوں باتوں کی تفصیل ہے، پہلے تبادلہ اشیاء کا بیان ہے، پھر ذرائع معاش کا، پھر تعاون باہمی کی شکلوں کا۔

پہلی بات: تبادلۂ اشیاء

مبادلہ: یعنی چیزوں کو چیزوں سے بدلنے کا رواج کیسے ہوا؟ اس کا رواج اس طرح ہوا کہ جب تمدن نے ترقی کی تو بے شمار ضرورتیں پیدا ہوئیں اور ہر ضرورت کی خاطر خواہ تکمیل بھی مطلوب ہوئی۔ مگر تنہا ایک شخص اپنی تمام ضرورتیں بہتر طریقے سے پوری نہیں کرسکتا تھا، کیونکہ کسی کے پاس کھانے کا ذخیرہ موجود تھا تو پانی نہیں تھا، اور دوسرے کی صورت حال اس کے برعکس تھی۔ اور ہر ایک کی خواہش تھی کہ اس کو وہ چیز میسر آئے جو دوسرے کے پاس ہے۔ مگر اس کی کوئی صورت مبادلہ کے علاوہ نہیں تھی۔ اس طرح لوگوں میں تبادلۂ اشیاء کا رواج چل پڑا۔ اور لوگوں نے طے کرلیا کہ ہر شخص کوئی ایک کام پکڑے، اور اس کو شاندار سے شاندار طریقہ پر انجام دے، اور اپنی باقی ضرورتیں مبادلہ کے ذریعہ پوری کرے۔

کرنسی کا رواج کیسے پڑا؟: اس کا رواج اس طرح چلا کہ جب ہر شخص نے ایک دھندا پکڑ لیا، اور اس نے اپنی مصنوعات تیار کیں۔ مثلاً کپڑا تیار کیا، مگر جب اس نے کپڑے کا اشیائے خوردنی سے تبادلہ کرنا چاہا تو غلہ والا تیار نہیں ہوا، کیونکہ اس کو فی الحال کپڑے کی ضرورت نہیں، مکان بنانے کے لئے اینٹوں کی ضرورت ہے۔ اسی طرح غلہ والے نے گیہوں کا کپڑے سے تبادلہ کرنا چاہا، مگر کپڑے والا تیار نہیں ہوا، کیونکہ اس کو فی الحال گیہوں کی حاجت نہیں۔ اب دشواری کو حل کرنے کے لئے لوگوں نے سوچا کہ مبادلہ (چیزوں کو چیزوں سے بدلنے) میں کوئی واسطہ رکھا جائے جس سے یہ دشواری حل ہوجائے۔ اسی واسطہ کا نام کرنسی ہے۔ اب کپڑے والا اپنا مال کرنسی میں فروخت کرتا ہے، اور کرنسی وقت

اور کوئی چیز آگے کردی جائے تاکہ بوقت ضرورت اس کے ذریعہ مبادلہ کیا جاسکے، اسی کو ہم نے "واسطہ" سے تعبیر کیا ہے
رَغِبَ فیہ: رغبت کرنا، خواہش کرنا۔ رَغِبَ عنہ: اعراض کرنا...... اِنْفَضَّ إلیہ: جانا، نکل پڑنا۔
ترکیب: المضطر واجزاء ہے لما کاف کبیر کی ..... أن تکون المصطلح بدل ہے جو لفعو سے۔

دوسری بات: ذرائع معاش

ذرائع معاش دو طرح کے ہیں: اصلی اور فرعی۔ اصلی ذرائع معاش چار ہیں:

(۱) کاشتکاری (باغبانی اس میں شامل ہے)

(۲) گلہ بانی یعنی مویشی: اونٹ، گائے، بھینس اور بھیڑ بکریاں پالنا اور ان کے دودھ اور نسل سے فائدہ اٹھانا۔

(۳) خشکی اور تری میں سے مباح اموال جمع کرنا اور خود ان سے یا ان کو فروخت کر کے ان کی قیمت سے فائدہ اٹھانا، خواہ وہ اموال از قبیل معدنیات ہوں یا نباتات یا حیوانات۔

(۴) کاریگریاں، جیسے بڑھئی کا پیشہ، لوہاری، پارچہ بافی اور ان کے علاوہ وہ پیشے جو دھاتوں کو ایسا بنا دیتے ہیں کہ ان سے مطلوبہ منفعت حاصل ہوتی ہے، جیسے سناری ظروف سازی وغیرہ۔

اور فروعی پیشے بے شمار ہیں، چند درج ذیل ہیں:

(۱) تجارت۔ حدیث شریف میں سچے دیانتدار تاجر کی بڑی فضیلت آئی ہے۔

(۲) ملکی مصالح کی انجام دہی یعنی سرکاری ملازمتیں۔

(۳) انسانی ضروریات میں سے کسی بھی ضرورت کی تکمیل کو ذریعہ معاش بنانا۔

(۴) جب لوگوں میں نزاکت آتی ہے اور وہ عیش پسند اور آسودگی کے طالب ہوتے ہیں تو طرح طرح کے ذرائع معاش وجود میں آتے ہیں۔

رہی یہ بات کہ کس کے لئے کونسا پیشہ مناسب ہے؟ تو جاننا چاہئے کہ ہر شخص دو چیزوں میں سے کسی ایک چیز کے پیش نظر کسی پیشے کے ساتھ خاص کیا جاتا ہے۔ وہ دو چیزیں یہ ہیں:

(۱) صلاحیتوں کے لحاظ سے کام سونپنا چاہئے جیسے بہادر آدمی جنگ اور فوج کے لئے موزوں ہے۔ ذہین مضبوط حافظہ کا آدمی حساب (Account) کے لئے مناسب ہے۔ طاقتور آدمی بار برداری اور مشقت کے کاموں کے لئے بہتر ہے۔

(۲) جس کو جس پیشہ کا موقع مل جائے وہی اس کے لئے مناسب ہے۔ مثلاً لوہار کے لڑکے اور ہمسایہ کے لئے لوہاری کا پیشہ جس قدر آسان ہے دوسرا کوئی پیشہ آسان نہیں، اور ان دونوں کے علاوہ کے لئے لوہاری کا پیشہ بہت مشکل

پیشہ ہے۔ اسی طرح ساحلِ سمندر کے باشندوں کے لئے مچھلیاں شکار کرنا آسان ہے کوئی دوسرا کام ان کے لئے آسان نہیں۔ اور ساحل سے دور رہنے والوں کے لئے ماہی گیری کا پیشہ مشکل پیشہ ہے ان کا پانی میں اترتے ہی دم ہوا ہوجاتا ہے۔

مضر پیشے: کچھ لوگوں کو پیٹ پالنے کے لئے کوئی اچھا پیشہ نہیں ملا، وہ لوگ ملک کو نقصان پہنچانے والے پیشے اختیار کرتے ہیں، جیسے چوری، جوا اور بھیک مانگنا۔

نوٹ: مبادلہ اگر چیز کا چیز کے ساتھ ہو تو اس کا نام بیع (خرید وفروخت) ہے، اور اگر چیز کا منفعت کے ساتھ ہو تو اس کا نام اجارہ (مزدوری) ہے۔

وأصول المكاسب: الزرع، والرعي، والتقاط الأموال المباحة من البر والبحر: من المعدن والنبات والحيوان، والصناعات: من نجارة، وحدادة، وحياكة، وغيرها، مما هو من جعل الجواهر الطبيعية بحيث يتأتى منها الارتفاق المطلوب، ثم صارت التجارة كسبًا، ثم صار القيام بمصالح المدينة كسبًا، ثم صار الإقبال على كل ما يحتاج الناس إليه كسبًا، وكلما رقت النفوس، وأمعنت في حب اللذة والرفاهية، تفرعت حواشي المكاسب.

ويختص كلُّ رجل بكسب لأحد شيئين:

[١] مناسبة القوى: فالرجل الشجاع يناسب الغزو، والكيّس الحافظ يناسب الحساب، وقويُّ البطش يناسب حمل الأثقال وشاقّ الأعمال.

[٢] واتفاقات توجد: فولدُ الحداد وجارُه يتيسر له من صناعة الحدادة ما لا يتيسر له من غيرها، ولا لغيره منها؛ وقاطنُ ساحل البحر يتأتى منه صيد الحيتان، دون غيره، ودون غيرها؛ وبقيت نفوسٌ أخبثت بهم المذاهب الصالحة، فانحدروا إلى أكساب ضارّة بالمدينة، كالسرقة والقمار، والتكدّي.

والمبادلة: إما عين بعين، وهو البيع، أو عين بمنفعة، وهي الإجارة.

ترجمہ: اور معاشی پیشے یہ ہیں: کھیتی باڑی، گلہ بانی، خشکی اور تری سے مباح اموال چننا (جمع کرنا) خواہ وہ معدنیات میں سے ہوں یا نباتات، یا حیوانات میں سے۔ اور کاریگریاں، جیسے بڑھئی کا پیشہ، آہنگری، پارچہ بافی اور ان کے علاوہ ان پیشوں میں سے جو مادی دھاتوں کو ایسا بناتے ہیں کہ ان سے مطلوبہ منفعت حاصل ہوتی ہے ___ پھر تجارت پیشہ بن گئی، پھر ملکی مصالح کی نگہداشت پیشہ بن گئی، پھر حوائج انسانی میں سے کسی بھی چیز کی طرف متوجہ ہونا پیشہ بن گیا۔ اور

جوں جوں نفوس پتلے ہوتے ہیں (یعنی نزاکت آتی ہے) اور نفوس لذت اور آسودگی کی محبت میں گہرے اترتے ہیں تو پیشوں کے متعلقات پھوٹتے ہیں (اور قسم قسم کے ذیلی پیشے وجود میں آتے ہیں)

اور ہر آدمی دو چیزوں میں سے کسی ایک کی وجہ سے کسی پیشے کے ساتھ خاص کیا جاتا ہے۔

۱- صلاحیتوں کے لحاظ سے: جیسے بہادر آدمی جنگ کے لئے موزوں ہے اور ذہین مضبوط حافظہ کا آدمی حساب کے لئے مناسب ہے، اور طاقتور آدمی بار برداری اور مشقت کے کاموں کے لئے موزوں ہے۔

۲- اور اتفاق ہونا (یعنی موقع ملنا) جیسے لوہار کے لڑکے اور اس کے ہمسایہ کے لئے لوہاری کا پیشہ جس قدر آسان ہے، دوسرا کوئی پیشہ اتنا آسان نہیں، اور اس کے علاوہ کے لئے لوہاری آسان نہیں۔ اور ساحل سمندر کا باشندہ مچھلیاں شکار کر سکتا ہے، اس کے علاوہ کوئی یہ کام نہیں کر سکتا، اور وہ اس کام کے علاوہ کوئی کام نہیں کر سکتا۔

اور رہ گئے کچھ لوگ جن کو اچھی راہوں نے تھکا دیا (یعنی وہ کمائی کی اچھی راہیں ڈھونڈتے ڈھونڈتے تھک گئے) پس وہ ملک کو نقصان پہنچانے والے پیشوں کی طرف اتر پڑے، جیسے چوری، جوا، بھیک مانگنا۔

اور مبادلہ یا تو چیز کا چیز سے ہوگا اور وہ بیع ہے، یا چیز کا منفعت (نفع) سے ہوگا، اور وہ اجارہ ہے۔

لغات:

المکاسب جمع ہے المکسب کی بمعنی کمائی، پیشہ۔ . من الیو متعلق ہے انتفاع سے اور من المعدن محذوف سے متعلق ہو کر الأموال کی صفت ہے۔ . جملہ تو جد صلت کا مفعول ہے تفاقات کی۔ . . انحدر: نیچے کی طرف اترنا ... دون غیرہ کی ضمیر قاطنی کی طرف لوٹتی ہے یعنی جو ساحل سمندر پر نہیں رہتا وہ ماہی گیری کا کام نہیں کر سکتا دون غیرھا کی ضمیر صید (صید بمعنی شکار کرنا) کی طرف لوٹتی ہے یعنی ساحل سمندر کا باشندہ ماہی گیری کے علاوہ کوئی کام نہیں کر سکتا اور صید الحیتان چونکہ ول ضاغۃ ہے اس لئے مؤنث کی ضمیر لوٹائی ہے یا مضاف نے مضاف الیہ سے تانیث کا استفادہ کیا ہے واللہ اعلم۔

تیسری بات: تعاون باہمی

شہر (یعنی معاشرہ) کی درستگی کے لئے شہریوں میں الفت ومودت ضروری ہے۔ اور مودت یا معاوضہ دینے پر مجبور کرتی ہے، یا موقوف ہوتی ہے۔ موطا مالک وغیرہ میں حدیث ہے کہ تَهَادَوْا تَحَابُّوا وَتَذْهَبُ الشَّحْنَاءُ ایک دوسرے کو ہدیہ دو، آپس میں محبت کرنے لگو گے اور بغض وکینہ ختم ہو جائے گا (ترغیب ۳: ۴۳۳) اسی طرح ہبہ اور عاریت (برتنے کے لئے کوئی چیز دینے) کی شکلیں نکل آئیں ____ نیز الفت ومودت کے لئے غریبوں کی غمخواری بھی ضروری ہے اس لئے صدقہ وخیرات کا رواج ہو گیا۔

ذکر نے والا اور وہ جس پر ضرورتوں کا ہجوم ہے اور فارغ البال ہوں، نیز ہر ایک کی معیشت دوسرے کی معاونت کے بغیر تکمیل پذیر نہیں ہوسکتی تھی۔ اور معاونت کے نئے عقد، شرطیں اور نئی طریقہ پر اتفاق ضروری تھا تو مزارعت، مضاربت، اجارہ، شرکت اور توکیل (وکیل بنانے) کی صورتیں پیدا ہوئیں ——— اور کچھ ایسی ضرورتیں پیش آتی ہیں جو قرض لینے اور امانت رکھنے کی طرف بلاتی ہیں۔ اور لوگوں نے خیانت، حق کا انکار، تال مٹول کا تجربہ کیا تو لوگ گواہ بنانے، دستاویزات لکھنے، گروی رکھنے، ضامن بنانے اور حوالہ کرنے کی طرف مجبور ہوئے ——— اور جوں جوں لوگ خوش حال ہوتے ہیں، تعاون باہمی کی نئی نئی شکلیں نکلتی ہیں ——— اور آپ لوگوں میں سے کسی گروہ کو نہیں پائیں گے مگر وہ ان معاملات پر عمل پیرا ہوں گے، اور وہ عدل کیا ہے اور ظلم کیا ہے اس کو جانتے ہوں گے، واللہ اعلم۔

لغات: انتظم الأمر: درست ہونا ... المحتاج إليه: وہ چیز جس کی احتیاج ہے یعنی ضرورت ... المبعدات کی تشریح مبحث اول باب (۱) میں گزر چکی ہے، وہاں دیکھ لی جائے۔ یہاں مراد گذشتہ اسباب ہیں جو موجودہ حالت کا باعث بنے ہیں۔

باب ——— ۶

نظامِ حکومت کا بیان

یہاں سے ارتفاق ثالث (نظامِ حکومت) کا بیان شروع ہو رہا ہے۔ اور یہ بیان بھی تین بابوں میں ہے۔ سیاسۃ المدینۃ: (نظامِ حکومت) وہ فن ہے جس میں ایک شہر یا ایک ملک کے لوگوں کے درمیان پائے جانے والے رابطہ وتعلق کو محفوظ رکھنے کے طریقوں سے بحث کی جاتی ہے۔ ساس الأمر کے معنی ہیں انتظام کرنا اور ساس القومَ کے معنی ہیں لوگوں کے امور کی تدبیر کرنا۔ اور مدینہ (شہر) سے مراد وہ لوگ ہیں جن میں تعلقات پائے جاتے ہوں، جن میں باہم معاملات ہوتے ہوں اور جو جدا جدا مکانوں میں بود وباش رکھتے ہوں، خواہ ایک شہر یا ایک بستی میں رہتے ہوں یا مختلف بستیوں میں۔ پس ارتفاق ثالث نظامِ بلدیہ اور نظامِ مملکت دونوں کو شامل ہے۔

سربراہِ مملکت کی ضرورت

دو وجہ سے مملکت کے لئے سربراہ ضروری ہے:

(۱) مملکت کو اختلال سے بچانے کے لئے، اس کے امراض کا علاج کرنے کے لئے اور اس کی تندرستی کی حفاظت کرنے کے لئے سربراہ ضروری ہے۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ مملکت کے لوگوں میں باہم ارتباط ہوتا ہے، اس لئے وہ ایک شخص حکمی (Legal Person) ہے، جو چند اجزاء اور ایک ہیئت ترکیبی سے مرکب ہے۔ اور ہر مرکب کے مادہ میں یا صورت میں خلل واقع ہوسکتا ہے، نیز

اس کو صحت بھی لاحق ہوسکتی ہے اور بیماری بھی۔ مثلاً زید شخص حقیقی ہے، اور مرکب ہے۔ بسیط نہیں[1] اس کے حقیقی اجزاء عناصر اربعہ ہیں اور مجازی اجزاء ہاتھ پاؤں، سر سینہ وغیرہ ہیں اور ایک اس کی مجموعی ہیئت ہے۔ پس اس کے حقیقی اجزاء میں اختلال پیدا ہوسکتا ہے، اور اس وقت اس کا صحیح مزاج باقی نہیں رہے گا، اور اسی کا نام بیماری ہے، اور صحیح مزاج کا نام تندرستی ہے۔ اسی طرح زید کی ہیئت کذائی میں بھی خلل پڑسکتا ہے، ہاتھ ٹوٹ سکتی ہے، ہاتھ شل ہوسکتا ہے اور کچھ بھی نقصان ہوسکتا ہے۔ اسی طرح مملکت کا معاملہ سمجھنا چاہئے۔ اہل مملکت میں پائے جانے والے روابط کی وجہ سے پورا ملک ایک وحدت (اکائی) ہے، جو چند اجزاء سے مرکب ہے۔ اور ہر مرکب کے مادہ میں یا صورت میں خلل واقع ہوسکتا ہے، یا اسے مرض لاحق ہوسکتا ہے اور مرض سے مراد یہ ہے کہ مملکت کے لئے کوئی ایسی حالت رونما ہوجائے، جو باعتبار نوع کے اس کے لئے مناسب و موزوں نہ ہو اور مملکت کی تندرستی ایسی حالت ہے جو اس کو شاندار اور خوبصورت بنائے۔

(۳) لوگوں کو انصاف کی راہ پر قائم رکھنے کے لئے بھی سربراہ کی ضرورت ہے۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ شہر اور مملکت میں لوگوں کا اجتماع عظیم ہوتا ہے، اس لئے یہ بات ممکن نہیں کہ سب لوگ "انصاف کی راہ" پر قائم رہیں، اور "ناانصافی کی راہ" اپنانے والوں پر نکیر کرنے کے لئے منصب کی ضرورت ہے۔ منصب کے بغیر روک ٹوک کرنے سے بڑے جھگڑے کھڑے ہوتے ہیں، اس لئے شہر اور ملک کا معاملہ ایسے شخص کے بغیر منتظم نہیں ہوسکتا، جس کو اہل حل وعقد نے متفق ہوکر چنا ہو اور اس کے پاس ملک کو سنبھالنے کے لئے فوج بھی ہو اور شان وشوکت اور دبدبہ بھی ہو۔

فائدہ: اور اسی مبحث کے باب اول کے آخر میں فائدہ (۲) میں یہ مضمون گذر چکا ہے کہ جو لوگ زیادہ خود غرض، بہت تیز مزاج اور خون ریزی میں دلیر اور غصہ میں آپے سے نکل جانے والے ہوتے ہیں ان کو سربراہی اور سیاست کی سب سے زیادہ ضرورت ہے۔

﴿باب سياسة المدينة﴾

وهي الحكمة الباحثة عن كيفية حفظ الربط الواقع بين أهل المدينة؛ وأعني بالمدينة جماعةً متقاربةً تجري بينهم المعاملاتُ، ويكونون أهلَ منازلَ شتّى.

والأصل في ذلك: أن المدينة شخص واحد من جهة ذلك الربط، مركبٌ من أجزاء وهيئة اجتماعية؛ وكلُّ مركب يمكن أن يلحقه خللٌ في مادته أو صورته، ويلحقه مرضٌ — أعني حالةً

[1] بسیط میں کوئی تبدیلی نہیں آتی ۱۲ شمشلاً زید کا غیر معمولی موٹا ہوجانا، یا قد بڑھ جانا انسان کے مناسب نہیں، تو ہاتھی اور گینڈے کے لئے تو بالکل ٹھیک ہے ۱۲

غير هذه الهيئة باعتبار نوعه — وصحته: في حالة تحسّنه وتجمّله.

ولما كانت المدينة ذات اجتماع عظيم، لا يمكن أن يتفق رأيهم جميعا على حفظ السنة العادلة، ولا أن ينكر بعضهم على بعض من غير أن يمتاز بمنصب، إلا يفضي ذلك إلى مقاتلات عريضة، لم ينتظم أمرها إلا برجل اصطلح على طاعته جمهور أهل الحل والعقد، له أعوان وشوكة، وكل من كان أشحّ وأحدّ وأجرأ على القتل والغضب، فهو أشد حاجة إلى السياسة.

ترجمہ: ملکی سیاست کا بیان: اور سیاست مدنیہ: وہ علم ہے جو شہر والوں کے درمیان پائے جانے والے ربط (تعلق) کی حفاظت کے طریقوں سے بحث کرنے والا ہے۔ اور "شہر" سے میری مراد وہ جماعت ہے جن میں باہمی تعلقات ہوں، جن میں معاملات چلتے ہوں، اور جو جدا جدا مکانوں میں بود و باش رکھتے ہوں۔

اور اس بارے میں بنیادی بات یہ ہے کہ "شہر" باہمی ربط کی وجہ سے ایک شخص (حکمی) ہے، جو چند اجزاء اور کسی ہیئت سے مرکب ہے۔ اور ہر مرکب کے لئے ممکن ہے کہ اس کے مادے میں یا صورت میں کوئی خلل پیدا ہو جائے یعنی کسی قسم کا مرض لاحق ہو ——— اور مرض سے میری مراد ایسی حالت ہے جس کے علاوہ حالت بہ تقاضائے نوع اس کے لئے زیادہ موزوں ہو ——— اور تندرستی لاحق ہونے کی وہ حالت ہے جو اس کو شاندار اور خوبصورت بناتی ہے۔

اور جب "شہر" میں ایک اجتماع عظیم پایا جاتا ہے اس لئے یہ ناممکن ہے کہ اس کے تمام باشندے "انصاف کی راہ" کی حفاظت پر متفق ہو جائیں اور نہ یہ بات ممکن ہے کہ بعض بعض پر نکیر کرے بغیر اس کے کہ وہ کسی منصب کے ساتھ ممتاز کیا جائے، کیونکہ یہ چیز لمبے چوڑے جھگڑوں تک پہنچا دے گی (پس) شہر کا معاملہ ایسے شخص کے بغیر منظم نہیں ہو سکتا، جس کی اطاعت پر جمہور اہل حل و عقد متفق ہو جائیں، جس کے پاس لشکر اور دبدبہ ہو۔

اور جو بھی شخص بہت زیادہ خود غرض، بہت تیز مزاج اور خوں ریزی اور غصہ کرنے میں بہت زیادہ دلیر ہوتا ہے، وہ سیاست کا سب سے زیادہ محتاج ہوتا ہے۔

☆ ☆ ☆

نظام مملکت میں خلل ڈالنے والی چیزیں

ابھی گذرا کہ مملکت ایک شخص کی طرح مرکب ہے، اس کے احوال میں کسی بھی وقت اختلال پیدا ہو سکتا ہے، اس لئے سربراہ مملکت کی ذمہ داری ہے کہ وہ ہر وقت احوال پر نظر رکھے۔ اور کوئی خلل نظر آئے تو اصلاح کی کوشش کرے۔ حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ نے ایسی آٹھ چیزیں بیان فرمائی ہیں جو حکومت کے نظام کو درہم برہم کرتی ہیں:

(۱) کبھی کچھ شریر لوگ، جن کو قوت و شوکت حاصل ہو جاتی ہے، من مانی کرنے کا اور انصاف کے جادہ کو چھوڑ دینے کا

قبضہ کر لیتے ہیں۔ اور وہ یہ فعل چند مقاصد سے کرتے ہیں (الف) لوگوں کے مال کی خاطر یہ لوگ راہزنی کرتے ہیں (ب) کسی عداوت کی بناء پر لوگوں کے درپے آزار ہو جاتے ہیں۔ اور طرح طرح سے لوگوں کو نقصان پہنچاتے ہیں (ج) حکومت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اس لئے فساد پھیلاتے ہیں اور شر انگیزی کرتے ہیں ۔ ان کا علاج یہ ہے کہ فوج کے ذریعہ ان سے نمٹا جائے۔ اور ان کا قلع قمع کیا جائے۔

(۲) کبھی کوئی ظالم کسی کو ظلماً قتل کرتا ہے یا زخمی کرتا ہے یا مارتا ہے یا اس کی ملکیت میں دست درازی کرتا ہے مثلاً اس کی بیوی میں مزاحمت کرتا ہے یا اس کی بہن بیٹی کی ناحق طمع کرتا ہے یا مال میں ہاتھ ڈالتا ہے، مثلاً ڈکیتی ڈالتا ہے یا خفیہ چوری کرتا ہے یا آبرو کے درپے ہوتا ہے یعنی اس پر کوئی تہمت لگاتا ہے یا اس کے ساتھ سخت کلامی سے پیش آتا ہے ـــــ ایسے لچوں اور غنڈوں کا علاج یہ ہے کہ ان کو سخت سزا دی جائے تا کہ وہ اپنی حرکتوں سے باز آئیں۔

(۳) بعض کام در پردہ مملکت کو نقصان پہنچاتے ہیں، جیسے جادو، اشیائے خوردنی میں زہریلی چیزوں کی آمیزش، لوگوں کو دنگا فساد کی تعلیم دینا، پبلک کو حکومت کے خلاف، نوکروں کو آقا کے خلاف، اولاد کو باپ کے خلاف اور بیوی کو شوہر کے خلاف ورغلانا ـــــ اس قسم کے اعمال بھی مملکت کے لئے تباہ کن ہیں۔ مدبر مملکت کو ایسی چیزوں پر کڑی نظر رکھنی چاہئے۔

(۴) بری عادتیں بھی نظام مملکت میں خلل ڈالتی ہیں۔ یہ بری عادتیں کئی طرح کی ہوتی ہیں (الف) بعض میں تدبیرات نافعہ کی طرف سے لاپرواہی برتی جاتی ہے، جیسے غلام (لڑکوں کے ساتھ بدفعلی کرنا) سحاقت (عورت کی عورت کے ساتھ مباشرت) چوپایوں سے بدفعلی، مشت زنی وغیرہ۔ یہ تمام چیزیں نکاح سے روک دیتی ہیں (ب) بعض میں آدمی فطرت سلیمہ سے نکل جاتا ہے، جیسے مرد کا ہیجڑا بن جانا اور عورت کا مرد بن جانا (ج) بعض خصال بد لڑائی جھگڑوں کا باعث بنتی ہیں، جیسے کسی منکوحہ کے معاملہ میں، اس کے ساتھ کسی اختصاص کے بغیر، شوہر وغیرہ سے مزاحمت کرنا اور جیسے ہر وقت شراب کے نشے میں چور رہنا ـــــ ان بری عادتوں کی روک تھام بھی ضروری ہے، اور اس کے لئے بہترین تدبیر اختیار کرنی چاہئے۔

(۵) بعض معاملات بھی مملکت کو نقصان پہنچاتے ہیں، جیسے جوا، چندور چند بڑھا ہوا سود ـــــ اور ہر سود چندور چند بڑھتا رہتا ہے ـــــ رشوت ستانی، ناپ تول میں کمی کرنا، مال تجارت کے عیب کو چھپانا، تجارتی قافلے سے ملاقات کرنا (یعنی جو مال ایک شہر سے دوسرے شہر میں فروخت کے لئے لے جایا جا رہا ہے، اس کو شہر سے باہر ہی تاجروں سے خرید لینا تا کہ اونچے نرخ سے اس کو بیچ سکے) ذخیرہ اندوزی، خریداری کے ارادے کے بغیر، دوسرے کو پھنسانے کے لئے مبیع کے دام زیادہ لگانا ـــــ ایسے ضرر رساں معاملات کی بھی روک تھام ضروری ہے۔

(۶) ایسے الجھے ہوئے تنازعات جن میں ہر فریق بوگس (Bogus) دلیل رکھتا ہے۔ اور اصل حقیقت واضح نہیں ایسے

جھگڑے بھی فصل کا باعث بنتے ہیں — ایسے نزاعات میں گواہوں سے، قسموں سے، دستاویزات (Documents) سے، قرائنِ احوال وغیرہ سے تمسک کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اور مقدمہ کو مسلّمہ طریقوں کی طرف لوٹانے کی ضرورت ہوتی ہے اور فیصلہ میں وجہ ترجیح ظاہر کرنی پڑتی ہے اور فیصلہ کرنے والے کو فریقین کی چالوں سے واقف رہنا ضروری ہوتا ہے۔

(۷) اگر شہر کے باشندے بادیہ نشینی اختیار کرلیں اور دیہی تمدن پر قناعت کرلیں یا ایک شہر کے سارے باشندے کسی دوسرے شہر میں جا بسیں یا پیشوں کے اختیار کرنے میں ملکی مصالح کا خیال نہ رکھیں مثلاً ملک کی اکثر آبادی تجارت کی طرف متوجہ ہوجائے اور زراعت چھوڑ دے یا اکثر لوگ فوج میں ملازمت کو ذریعۂ معاش بنالیں اور دوسرے ضروری کام کرنے والے نہ رہیں تو بھی ملک کا انتظام مختل ہوجائے گا —— یہاں اربابِ حکومت کو یہ نکتہ یاد رکھنا چاہئے کہ کسان بمنزلہ غذا ہیں اور کاریگر، تاجر اور ملک کے محافظین بمنزلہ نمک ہیں جس سے غذا کی اصلاح ہوتی ہے۔ اس لئے حکومت کی پوری توجہ زراعت کو فروغ دینے کی طرف ہونی چاہئے۔

(۸) اگر حملہ آور درندوں کی کثرت ہوجائے یا موذی حشرات پھیل پڑیں تو اس سے بھی لوگ پریشان ہوجائیں گے۔ پس حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ ان کو نابود کرنے کی کوشش کرے۔

ومن الخلل: أن تجتمع أنفس شريرة، لهم منعة وشوكة، على اتباع الهوى، ورفض السنة العادلة: إما طمعا في أموال الناس — وهم قطاع الطريق — أو إضرارا لهم بغضب، أو حقد، أو رغبة في الملك؛ فيحتاج في ذلك إلى جمع رجال، ونصب قتال.

ومنه: إصابة ظالم إنسانا بقتل، أو جرح، أو ضرب، أو في أهله: بأن يزاحم على زوجته، أو يطمع في بناته وأخواته بغير حق؛ أو في ماله: من غصب جهرة، أو سرقة خفية؛ أو في عرضه: من نسبته إلى أمر قبيح يلام به، أو إغلاظ القول عليه.

ومنه: أعمال ضارة بالمدينة ضررا خفيا، كالسحر، ودس السم، وتعليم الناس الفساد، وتخبيب الرعية على الملك، والعبد على مولاه، والزوجة على زوجها.

ومنه: عادات فاسدة، فيها إهمال للارتفاقات الواجبة، كاللواطة، والسحاقة، وإتيان البهائم، فإنها تصد عن النكاح؛ أو انسلاخ عن الفطرة السليمة، كالرجل يؤنث، والمرأة تذكر؛ أو حدوث لمنازعات عريضة كالمزاحمة على الموطوءة من غير اختصاص بها، وكإدمان الخمر.

ومنه: معاملات ضارة بالمدينة، كالقمار والربا أضعافا مضاعفة، والرشوة وتطفيف الكيل والوزن، والتدليس في السلع، وتلقي الجلب، والاحتكار، والنجش.

ومنها: خصومات مشكلة يتمسك فيها كلٌّ بشبهة، ولا تنكشف جليةُ الحال، فيُحتاج إلى التمسك بالبينات، والأيمان، والوثائق، وقرائن الحال، ونحوها، وردِّها إلى سنة مسلَّمة، وإبداء وجه الترجيح، ومعرفة مكايد المتخاصمين، ونحو ذلك.

ومنها: أن يتبدّى أهلُ المدينة ويكتفوا بالارتفاق الأول، أو يتمدنوا في غير هذه المدينة، أو يكون توزُّعهم في الإقبال على الاكتساب بحيث يضُرُّ بالمدينة. مثل أن يُقبل أكثرهم على التجارة، ويدَعوا الزراعة، أو يكتسب أكثرهم بالغزو ونحوه، وإنما ينبغي أن يكون الزُّرّاع بمنزلة الطعام، والصُّنّاع والتُّجّار والحفظة بمنزلة الملح المصلح له.

ومنها: انتشار السباع الضارية والهوامّ المؤذية، فيجب السعي في إفنائها.

ترجمہ اور خلل (پیدا کرنے والی چیزوں) میں سے یہ بات ہے کہ کچھ شریر لوگ، جن کو قوت و دبدبہ حاصل ہو گیا ہو، خواہشات کی پیروی کرنے پر اور انصاف کی راہ چھوڑنے پر متفق ہو جائیں، یا تو لوگوں کے اموال کی لالچ میں — اور یہ لوگ راہزن ہیں — یا کسی غصہ یا کینہ کی وجہ سے لوگوں کو نقصان پہنچانے پر، یہ ملک کی طرح ہیں۔ پس اس صورت میں لوگوں کو اکٹھا کرنے کی اور جنگ شروع کرنے کی ضرورت پیش آئے گی۔ (اور لوگوں کو اکٹھا کرنے کے دو مطلب ہو سکتے ہیں (۱) رائے عامہ کو ہموار کر کے جنگ شروع کی جائے (۲) جنگ کے لئے لوگوں کو اکٹھا کیا جائے۔ اور یہ بات اس زمانہ کی ہے جب حکومتوں کے پاس باقاعدہ فوج نہیں ہوتی تھی)

اور منجملہ ازاں: کسی ظالم کا کسی انسان کو قتل کرنا، یا زخمی کرنا، یا پٹائی کرنا، یا اس کی حویلی میں ہاتھ ڈالنا ہے: بایں طور کہ اس کی بیوی کے معاملہ میں مزاحمت کرے، یا اس کی بہن بیٹی کی ناحق طمع کرے، یا اس کے مال میں دست درازی ہے: علانیہ چھین کر، یا چپکے سے چرا کر، یا اس کی آبرو میں ہاتھ ڈالنا ہے، یعنی اس کو کسی ایسی بات کی طرف منسوب کرتا ہے جس کے ذریعہ وہ ملامت کیا جائے، یا اس کے ساتھ سخت کلامی سے پیش آنا۔

اور منجملہ ازاں: ایسے اعمال ہیں جو پوشیدہ طور پر شہر کو نقصان پہنچانے والے ہیں، جیسے جادو، زہر کی آمیزش، لوگوں کو فساد کی تعلیم دینا، پبلک کو بادشاہ کے خلاف، غلام کو آقا کے خلاف، اور بیوی کو شوہر کے خلاف ورغلانا۔

اور منجملہ ازاں: وہ بری عادتیں ہیں جن میں ضروری تدبیرات نافذ کرنا انکار کرتا ہے، جیسے غلام بازی، چوپایوں سے بدفعلی، [illegible] یہ سب امور نکاح سے روک دیتے ہیں۔ یا ان (بری عادتوں) میں فطرت سلیمہ سے نکل جانا ہے، جیسے مرد کا ہیجڑا بن جانا، یا عورت کا مرد بن جانا۔ یا ان میں لمبے چوڑے جھگڑوں کا پیدا ہونا ہے، جیسے کسی منکوحہ پر مزاحمت کرنا، اس کے ساتھ کسی اختصاص کے بغیر، اور جیسے ہر وقت شراب کے نشہ میں چور رہنا۔

اور منجملہ ازاں: شہر کو نقصان پہنچانے والے معاملات ہیں، جیسے جوا، چند در چند بڑھایا ہوا سود، رشوت ستانی، ناپ

تول میں کمی کرنا، مال تجارت کے عیب کو چھپانا، تجارتی قافلہ سے ملاقات کرنا، ذخیرہ اندوزی، گاہک کو پھنسانے کے لئے زیادہ دام لگانا۔

اور منجملہ ان: الجھے ہوئے جھگڑے ہیں، جن میں ہر فریق کسی نہ کسی دلیل سے استدلال کرتا ہے، درا صل حقیقت واضح نہیں ہوتی۔ پس گواہوں سے، قسموں سے، دستاویزات سے، صورت حال کے قرائن سے، اور اس طرح کی چیزوں سے تمسک کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اور مقدمہ کو مسلمہ طریقہ کی طرف لوٹانے کی، اور وجہ ترجیح ظاہر کرنے کی، اور فریقین کی چالیں جاننے کی اور اسی قسم کی دوسری چیزوں کی (حاجت ہوتی ہے)

اور منجملہ ان: یہ بات ہے کہ شہر کے باشندے بادیہ نشینی اختیار کرلیں، اور دیہاتوں پر اکتفا کرلیں، یا اپنے شہر کے علاوہ کسی دوسرے شہر میں جا بسیں، یا ان کا پیشوں پر متوجہ ہونے میں منقسم ہونا اس طرح پر ہو کہ وہ شہر کے لئے ضرر رساں ہو، جیسے اکثر لوگ تجارت کی طرف متوجہ ہوجائیں اور زراعت کو چھوڑ دیں۔ یا اکثر لوگ جہاد وغیرہ سے کمائی کرنے لگیں۔ اور مناسب یہ ہے کہ کاشتکاروں کو بمنزلہ غذا کے قرار دیا جائے۔ اور کاریگروں، تاجروں اور محافظوں کو بمنزلہ نمک کے جس سے غذا کی اصلاح ہوتی ہے۔

اور منجملہ ان: جنگلی درندوں کا، اور موذی حشرات الارض کا پھیلنا ہے، پس ان کو نابود کرنے کی کوشش کرنا ضروری ہے۔

لغات: دفن الشیئ تحت التراب، وفیہ: چھپانا ... غَشَّہ: خراب کرنا، کہا جاتا ہے غشّ علی فلان صدیقہ: اس نے فلاں کے دوست کو بگاڑ دیا ... نَتُنَ (ک) النتن: بدبو، أَنْتَنَ: بدبودار ہونا، گندا ہونا ... بدا (ن) بداوۃ: بادیہ میں اقامت اختیار کرنا ... وزّع المال علیہم: تقسیم کرنا ... الضاریۃ: شکاری جانور ضری یضری ضراوۃ الکلب بالصید: شکار کا خوگر ہونا یعنی گوشت وخون کے چسکے پڑ جانا۔

☆ ☆ ☆

ملک کی حفاظت کے لئے انتظامات

ملک کی حفاظت اور اس کی ترقی مختلف انتظامات سے ہوتی ہے۔ حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ نے چار قسم کے انتظامات کا تذکرہ فرمایا ہے:

(۱) ایسی عمارتیں بنائی جائیں جن سے عام لوگ فائدہ اٹھائیں، جیسے شہر پناہیں (فصیلیں، شہر کی چار دیواریں) سرحدی چوکیاں (وہ جگہ جہاں لشکر حفاظت سرحد کے لئے قیام کرے) قلعے (وہ محفوظ اور مستحکم عمارتیں جن میں بادشاہ کی فیملی یا فوج رہے، جیسے لال قلعہ وغیرہ) سرحدیں (کنٹرول لائن) مارکیٹ اور پل وغیرہ۔

(۳) پینے اور آب پاشی کے لئے کنویں کھودے جائیں اور چشمے نکالے جائیں اسی طرح پانی کے تالاب (Reservoir) اور ڈیم باندھے جائیں اور دریاؤں (بڑی ندیوں) پر کشتیاں تیار رکھی جائیں جو وقت آنے پر لوگوں کی مدد کریں اور عام حالات میں لوگوں کو دریا پار کرنے میں مدد دیں۔

(۴) (الف) ملک کی بنیادی ضرورت غلہ اور اشیائے خوردنی ہیں، اگر ملک اس سلسلہ میں خود کفیل نہ ہو تو ملکی یا غیر ملکی تاجروں کو غلہ کی درآمد پر آمادہ کیا جائے، ملکی تاجروں کو سہولیات فراہم کی جائیں اور غیر ملکی تاجروں کو مانوس کیا جائے اور ان کی دلداری کی جائے۔ اور ملک کے باشندوں کو تاکید کی جائے کہ وہ ان پردیسیوں کے ساتھ اچھا سلوک کریں، اس سے غیر ملکی سوداگروں کی آمد و رفت بڑھے گی اور ملک کو ضرورت کی چیزیں فراہم ہوں گی۔

(ب) نیز کاشتکاروں کو اس پر آمادہ کیا جائے کہ وہ کوئی زمین بے کار نہ چھوڑیں، زیادہ سے زیادہ کاشت کریں، تاکہ نہ صرف یہ کہ مملکت کی ضرورت پوری ہو، بلکہ مملکت غلہ برآمد کرنے کی پوزیشن میں آ جائے۔

(ج) دستکاری اور صنعت و حرفت کو نہ صرف یہ کہ فروغ دیا جائے بلکہ متعلقہ لوگوں کو اس پر بھی آمادہ کیا جائے کہ وہ چیزوں کو عمدہ اور مضبوط بنائیں، تاکہ مارکیٹ میں ملک کی مصنوعات کو مقام حاصل ہو۔

(د) شہر کے باشندوں کو فضائل و کمالات کی تحصیل پر آمادہ کیا جائے، جیسے خوش نویسی، حساب و کتاب، فن تاریخ، علم طب، اور دیگر فنی کے صحیح طریقوں میں مہارت پیدا کرنے کی ترغیب دی جائے اور اس کے لئے ممکنہ وسائل فراہم کئے جائیں۔

(ھ) شہر کے احوال کا تفقد کیا جائے تاکہ مفسد اور مملکت کے لئے خیر خواہ کا پتہ چلتا رہے، اول سے بچا جائے، اور اس کی ریشہ دوانیوں پر نظر رکھی جائے۔ اور ثانی کو شریک کار رکھا جائے یا اس کی دلداری کی جائے۔ دوستوں کی دلداری بھی ضروری ہے۔

اسی طرح تفقد احوال سے محتاجوں کا پتہ چلے گا اور ان کی مدد کی جاسکے گی، اور عمدہ صنعت کاروں کا بھی پتہ چلے گا، اور ملک ان سے استفادہ کرے گا۔

ومن باب كمال الحفظ: بناءُ الأبنية التي يشتركون في الانتفاع بها، كالأسوار، والرُّبَط، والحصون، والثُّغور، والأسواق، والقناطر.

ومنه: حفر الآبار واستنباط العيون، وتهيئة السُّفُن على سواحل الأنهار.

ومنه: حملُ التجار على الميرة، بتأنيسهم وتأليفهم، وتوصية أهل البلد أن يُحسنوا المعاملة مع الغرباء، فإن ذلك يفتح باب كثرة ورودهم؛ وحملُ الزُّرَّاع على أن لا يتركوا أرضًا مهمَلة؛ والصنّاع على أن يحسنوا الصناعات، ويتقنوها؛ وأهلِ البلد على اكتساب الفضائل، كالخط،

والحساب، والتاريخ، والطب، والوجوه الصحيحة من تقدمة المعرفة.

ومنه: معرفة أخبار البلد، ليتميز الداعر من الناصح، وليعلم المحتاج فيُعان، وصاحب صنعة مرغوبة، فيستعان به.

ترجمہ: اور مملکت کی کامل حفاظت کے باب سے ایسی عمارتیں بنانا ہے جن سے فائدہ اٹھانے میں سب لوگ شریک ہوں، جیسے شہر پناہیں، سرائیں، قلعے، سرحدیں، بازار اور پل۔

اور از اں جملہ: کنویں کھودنا، چشمے نکالنا اور دریاؤں کے کناروں پر کشتیوں کو تیار رکھنا ہے۔

اور از اں جملہ: تاجروں کو قافلہ لانے پر آمادہ کرنا ہے، ان کو مانوس کرکے اور ان کی دلداری کرکے، اور اہل شہر کو تاکید کرنا ہے کہ وہ پردیسیوں کے ساتھ اچھا سلوک کریں۔ پس یہ چیز سوداگروں کی آمد ورفت کا دروازہ کھولے گی —— اور کاشتکاروں کو آمادہ کرنا ہے اس پر کہ وہ کوئی زمین بے کار نہ چھوڑیں —— اور دستکاروں کو آمادہ کرنا ہے اس پر کہ وہ چیزوں کو عمدہ اور مضبوط بنائیں —— اور شہر والوں کو فضائل کی تحصیل پر آمادہ کرنا ہے، جیسے لکھنا، حساب، تاریخ، طب اور پیش بینی کے صحیح طریقے۔

اور از اں جملہ: شہر کے احوال کا جاننا ہے، تاکہ مفسد، خیر خواہ سے ممتاز ہو جائے، اور حاجت مند کا پتہ چلے، پس اس کی مدد کی جائے، اور کار آمد صنعت والے کا پتہ چلے تاکہ اس سے مدد لی جائے۔

لغات: السُّور: شہر پناہ، جمع اَسوار وسِیران ... الرِّباط: قلعہ یا وہ جگہ جہاں لشکر حفاظت سرحد کے لئے قیام کرے، جمع رُبُط اور جو رِباط الخیل کی سرائے ہے اس کی جمع رِباطات ہے ... المِیرة: خوراک جس کو ذخیرہ کرکے رکھا جائے، جمع مِیَر ... الغریب: مسافر، اجنبی، وطن سے دور ... الداعر: شریر خبیث، جمع دُعّار۔

☆ ☆ ☆

ملک کی ویرانی کے بڑے اسباب

بارہویں صدی ہجری میں حضرت شاہ صاحب قدس سرہ تحریر فرماتے ہیں کہ اس زمانہ میں مملکت کی ویرانی کے بڑے اسباب دو ہیں:

① سرکاری خزانے کا غیر ضروری مصارف کے بوجھ تلے دب جانا —— جیسے اس زمانہ میں جنگ کرنے والے بیت المال ہی کو ذریعۂ معاش بنائے ہوئے ہیں۔ شعراء بیت المال میں اپنا حق سمجھتے ہیں۔ بزرگوں اور شاعروں کے ساتھ حسن سلوک کرنا بادشاہوں کی عادت ہے، اسی طرح اور لوگ بھی بادشاہوں سے مختلف طرح سے بھیک مانگتے ہیں۔ وہ ان

سب لوگوں کا مقصد محض پیٹ پالنا ہے، وہ مملکت کی کوئی مصلحت پوری نہیں کرتے۔ یہ لوگ بار بار بادشاہوں کے پاس آتے ہیں، اور ان کی زندگی مکدر کئے رہتے ہیں اس طرح کہ ایک بادشاہ کے پاس سے نکلتا بھی نہیں کہ دوسرا پہنچ جاتا ہے، اسی طرح بعض بعض کو تنگ کرتے ہیں اور مملکت پر بوجھ بنے رہتے ہیں۔

(۲) کاشتکاروں، تاجروں اور پیشہ وروں پر بھاری ٹیکس لگانا بھی ملک کی بربادی کا سبب ہے۔ اس سے خیر خواہوں کی تعداد گھٹ جاتی ہے اور رفتہ رفتہ فرمانبردار ختم ہو جاتے ہیں۔ اور سخت جنگ جو لوگ قوت پکڑ لیتے ہیں اور وہ بغاوت پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔

سب لوگوں کو یہ اہم نکتہ یاد رکھنا چاہئے کہ مملکت ہلکے ٹیکسوں اور بقدر ضرورت عملہ ہی سے سنور سکتی ہے۔

> وغالب سبب خراب البلدان في هذا الزمان شيئان:
> أحدهما: تضييقهم على بيت المال، بأن يعتادوا التكسُّب بالأخذ منه، على أنهم من الغزاة، أو من العلماء الذين لهم حق فيه، أو من الذين جرت عادة الملوك بصلتهم، كالزُّهّاد، والشعراء، أو بوجه من وجوه التكدي؛ ويكون العمدة عندهم هو التكسب، دون القيام بالمصلحة؛ فيدخل قوم على قوم، فيُنغِّصُون عليهم، ويصيرون كلاًّ على المدينة.
> والثاني: ضرب الضرائب الثقيلة على الزُّرّاع والتجار والمحترفة، والتشديدُ عليهم، حتى يُفضي إلى إجحاف المطاوعين واستئصالهم، وإلى تمنُّع أولي بأس شديد، وبغيهم؛ وإنما تصلُحُ المدينة بالجباية اليسيرة، وإقامة الحفظة بقدر الضرورة؛ فلينتبه أهل الزمان لهذه النكتة، والله أعلم.

ترجمہ: اور اس زمانہ میں ملک کی ویرانی کے بڑے اسباب دو ہیں:

ان میں سے ایک: لوگوں کا بیت المال پر بوجھ بننا ہے، اس طرح کہ لوگ بیت المال سے لینے کے ذریعہ کمائی کرنے کے عادی بن گئے ہیں، اس بنیاد پر کہ وہ غازیوں میں سے ہیں۔ یا اُن علماء میں سے ہیں جن کا بیت المال میں حق ہے۔ یا اُن لوگوں میں سے ہیں جن کے ساتھ سلوک کرنا بادشاہوں کی عادت ہے، جیسے بزرگ لوگ اور شعراء، یا بھیک مانگنے کی صورتوں میں سے کسی اور صورت کے ذریعہ اور ان لوگوں کا مقصد محض اپنا پیٹ پالنا ہے بغیر اس کے کہ ان سے ملک کی کوئی مصلحت بھی پذیر ہو۔ پس ایک قوم دوسری قوم پر داخل ہوتی ہے (یعنی یکے بعد دیگرے خواہاں بادشاہوں کے پاس آتے ہیں) پس وہ ان (بادشاہوں) کی زندگی مکدر کئے رہتے ہیں۔ اور وہ لوگ مملکت پر بار بن جاتے ہیں۔

اور دوسری: کاشتکاروں، تاجروں اور پیشہ وروں پر بھاری ٹیکس لگانا ہے، اور ان پر سختی کرنا ہے، تا آنکہ یہ چیز

فرمانبرداروں کو بہالے جاتی ہے، وہ ان کو جڑ سے مٹا دیتی ہے۔ در حقیقت جنگ جو لوگ قوت پکڑ لیتے ہیں، اور وہ بغاوت پر آمادہ ہو جاتے ہیں اور مملکت ہلکے ٹیکسوں سے اور بقدر ضرورت محافظین (سرکاری عملہ، پولیس وغیرہ) مقرر کرنے ہی سے سنورسکتی ہے۔ اہل زمانہ کو اس اہم نکتے سے آگاہ ہو جانا چاہئے، باقی اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں۔

لغات:

تَكَسَّبَ مالاً: کمائی کرنا۔۔۔ نَغَّصَ العیشَ: زندگی مکدر کر دینا۔۔۔ اَجْحَفَ السیلُ بہ: لے جانا: اجحف العدوَّ: ہلاک کرنا، جڑ سے مٹانا۔۔۔ اِستأصَلَ الشیئَ: جڑ سے اکھیڑنا۔ تَمنّع بقومہ: قوت پکڑنا۔ الجِبایۃ: خراج تحصیل جبا (ن) جَبْواً وجَبْیاً (ض) جِبایۃ: جمع کرنا۔

باب ـــــ ۷

سربراہ مملکت کے لئے ضروری اوصاف

سربراہ مملکت میں درج ذیل چودہ اوصاف ضروری ہیں:

۱- پسندیدہ اخلاق ـــــ اگر بادشاہ میں اخلاق حسنہ نہیں ہوں گے تو وہ مملکت پر بار ہو جائے گا۔

۲- بہادری ـــــ اگر بادشاہ میں شجاعت نہیں ہوگی تو وہ سرپھرے لوگوں سے مقابلہ نہیں کرسکے گا، اور رعایا بھی اس کو حقارت کی نظر سے دیکھے گی۔

۳- بردباری ـــــ بادشاہ اگر حلیم نہیں ہوگا تو اپنے قہر وغضب سے لوگوں کو تباہ کر دے گا۔

۴- دانشمندی ـــــ دانشمند بادشاہ ہی ملک کے لئے تدبیرات نافعہ نکال سکتا ہے۔

۵- بادشاہ عاقل ہو، پاگل نہ ہو۔

۶- بادشاہ بالغ ہو، بچہ نہ ہو۔

۷- بادشاہ آزاد ہو، غلام نہ ہو۔

۸- بادشاہ مرد ہو، عورت نہ ہو، کیونکہ حکومت ایک بھاری ذمہ داری (Heavy Duty) ہے، جو عورت کے ناتواں کاندھوں پر نہیں رکھی جاسکتی۔ نیز عورت اپنی وضع باقی رکھتے ہوئے بڑی حکومت کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ بھی نہیں ہوسکتی۔

۹- بادشاہ ذی رائے ہو، بے وقوف نہ ہو۔

۱۰- بادشاہ شنوا ہو، بہرا نہ ہو۔

۱۱- بادشاہ دیکھتا ہو، آنکھ والا ہو۔

۱۲- بادشاہ گویا ہو، گونگا نہ ہو۔

۱۳- بادشاہ کی پشت (Back) مضبوط ہو یعنی لوگوں نے اس کی اور اس کی قوم کی بزرگی تسلیم کر رکھی ہو اور اس کے اور اس کے اسلاف کے اچھے کارنامے دیکھ چکے ہوں۔

۱۴- بادشاہ کو لوگوں کا اعتماد حاصل ہو یعنی لوگ اس کے بارے میں یقین رکھتے ہوں کہ وہ مملکت کی اصلاح میں ذرا کوتاہی نہیں کرے گا۔

مذکورہ تمام اوصاف کی ضرورت کو عقل تسلیم کرتی ہے اور دنیا کے تمام لوگ بھی اس پر متفق ہیں، حالانکہ ان کے ملک ایک دوسرے سے دور ہیں اور ان کے مذاہب مختلف ہیں۔ اور اس اتفاق کی وجہ یہ ہے کہ سب لوگوں کو احساس ہے کہ بادشاہ مقرر کرنے سے جو مصلحت مقصود ہے وہ مذکورہ اوصاف کے بغیر ممکن الحصول نہیں۔ چنانچہ اگر لوگ مذکورہ باتوں میں سے کسی بات کی بادشاہ میں کمی دیکھتے ہیں تو اس بادشاہ کو نامناسب تصور کرتے ہیں، اور اس کو ان کے دل ناپسند کرتے ہیں اور اگر خاموش رہتے ہیں تو ناراضگی کے ساتھ خاموش رہتے ہیں۔

نوٹ: اسلام نے خلیفہ کے لئے جو مسلمان، مجتہد اور قرشی ہونے کی شرطیں بڑھائی ہیں، ان کا بیان جلد ثانی (رحمۃ اللہ ۲۰۵) میں الخلافۃ کے عنوان کے تحت آرہا ہے۔

﴿باب سیرة الملوك﴾

يجب أن يكون الملك متصفا بالأخلاق المرضية، وإلا كان كَلًّا على المدينة، فإن لم يكن شجاعا ضعف عن مقاومة المحاربين، ولم تنظر إليه الرعيةُ إلا بعين الهوان؛ وإن لم يكن حليمًا، كاد يهلكهم بسطوته؛ وإن لم يكن حكيما، لم يستنبط التدبيرَ المُصْلِحَ؛ وأن يكون عاقلا بالغا، حُرًّا، ذكرًا، ذا رأي، وسمع، وبصر، ونُطق، ممن سلّم الناسُ شرفه وشرفَ قومه، ورأوا منه ومن آبائه المآثرَ الحميدة، وعرفوا أنه لا يألوا جُهدا في إصلاح المدينة.

هذا كلُّه يدل عليه العقلُ، وأجمعت عليه أمم بني آدم، على تباعُد بُلدانهم واختلاف أديانهم، لما أحسُّوا من أن المصلحة المقصودة من نصب الملك لا تتم إلا بها؛ فإن وقع شيئ من إهماله رأوه خلاف ما ينبغي، وكرِهَتْه قلوبُهم، ولو سكتوا سكتوا على غيظ.

ترجمہ: سیرت پادشاہاں کا بیان: بادشاہ کے لئے ضروری ہے کہ وہ پسندیدہ اخلاق سے متصف ہو، اگر ایسا نہ ہوگا تو وہ شہر (مملکت) پر بوجھ ہو جائے گا۔ پھر اگر وہ بہادر نہیں ہے تو وہ برسرپیکار لوگوں سے مقابلہ میں کمزور پڑ جائے

گا۔ اور رعایا اس کو حقارت کی نظروں سے دیکھے گی۔ اور اگر وہ بردبار نہیں ہے تو ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے قہر سے لوگوں کو ہلاک کر ڈالے۔ اور اگر وہ دانشمند نہیں ہے تو تدبیرات نافعہ نہیں نکال سکے گا۔ اور بادشاہ کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ عقل مند، بالغ، آزاد، مرد، ذی رائے، دشمنوں پر چھا جانے والا ہو۔ (اور) ان لوگوں میں سے ہو جس کی اور جس کی قوم کی بزرگی لوگوں نے تسلیم کر رکھی ہو۔ اور اس کے اور اس کے اسلاف کے اچھے کارنامے لوگ دیکھ چکے ہوں اور لوگ جانتے ہوں کہ بادشاہ ملک کی اصلاح میں ذرا کوتاہی نہیں کرے گا۔

ان سب باتوں کے ضروری ہونے پر عقل دلالت کرتی ہے۔ اور اس پر انسانوں کے تمام گروہوں نے اتفاق کیا ہے باوجود ان کے ملکوں کے ایک دوسرے سے دور ہونے اور ان کے مذاہب کے مختلف ہونے کے باوجود، یہی وجہ ہے کہ دنیا کی تمام اقوام کو اس کا احساس ہے کہ بادشاہ مقرر کرنے سے جو مصلحت مقصود ہے وہ ان امور کے بغیر پوری نہیں ہو سکتی۔ پس اگر بادشاہ (ان امور میں) کوئی فروگذاشت کرے گا تو لوگ اس کو نامناسب سمجھیں گے۔ اور اس بادشاہ کو ان کے دل ناپسند کریں گے۔ اور اگر وہ خاموش رہیں گے تو ناراضگی کے ساتھ خاموش رہیں گے۔

بادشاہ کے لئے حشمت کی ضرورت

بادشاہ کے لئے ضروری ہے کہ وہ رعایا کے دلوں میں حشمت و عظمت اور رعب پیدا کرے، پھر اس کی نگہداشت کرے۔ اور حشمت کو نقصان پہنچانے والی کوئی بات پیش آئے تو مناسب تدبیر سے اس کی اصلاح کرے، اور کسی طرح حشمت و عظمت کو لوگوں کے دلوں سے زائل نہ ہونے دے۔

اور عظمت و حشمت پیدا کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ بادشاہ خود کو ایسے اخلاق عالیہ سے مزین کرے جو ریاست کے شایان شان ہوں۔ مثلاً بہادری، دانشمندی، فیاضی، خطاؤں سے درگذر کرنا، مفاد عامہ کے لئے کام کرنا وغیرہ۔ اور بادشاہ لوگوں کو رام کرنے کے لئے وہ انداز اختیار کرے جو شکاری جنگلی جانوروں کے ساتھ اختیار کرتا ہے۔ جب کوئی شکاری ہرنوں کے شکار کے لئے نکلتا ہے۔ اور جنگل میں اس کو ہرن نظر پڑتے ہیں تو وہ ان کے حسب حال ہیئت بناتا ہے۔ ہاتھ زمین پر ٹیک کر چوپایوں سے مشابہ جھک کر جانوروں کی طرح چلتا ہے۔ اور دور سے ان کے سامنے نمودار ہوتا ہے اور ان کی آنکھوں اور کانوں پر نظر جمائے رکھتا ہے۔ پھر جب یہ محسوس کرتا ہے کہ ہرنوں کو کھٹک پڑ گئی تو ساکت و صامت کھڑا ہو جاتا ہے، گویا وہ کوئی بے جان چیز ہے ذرا حرکت نہیں کرتا۔ اور جب ان کو غافل پاتا ہے تو ان کی طرف رینگنے لگتا ہے۔ اور کبھی نغموں سے ان کو خوش کرتا ہے تو کبھی ان کے سامنے وہ چارہ ڈالتا ہے جو ان کو مرغوب ہوتا ہے اور یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ طبعی طور پر صاحب کرم ہے اس لئے چارہ ڈال رہا ہے۔ اس کا مقصد ان کو شکار کرنا نہیں ہے۔ احسان محسن کی محبت پیدا کرتا ہے اور محبت کی بیڑیاں لوہے کی بیڑیوں سے مضبوط ہوتی ہیں، چنانچہ ہرن شکاری کی م

میں پھنس جاتے ہیں۔

اسی طرح جو شخص پبلک لائف میں آنا چاہے اس کے لئے ضروری ہے کہ ایسی حالت اختیار کرے جو لوگوں کو پسند ہو، پوشاک، بات چیت کا انداز اور طریقہ ایسا اختیار کرے جو لوگوں کو مرغوب ہو، پھر ہولے ہولے لوگوں سے قریب ہو اور خیر خواہی اور محبت کا مظاہرہ کرے، مگر بات الٹی پلٹی نہ ہو اور کوئی ایسا قرینہ ظاہر ہونے دے جس سے پتہ چلے کہ وہ کسی "ووٹ" کا خواہاں ہے۔ پھر وہ لوگوں کو یہ بات باور کرائے کہ اس جیسی شخصیت لوگوں کو ملنا مشکل ہے۔ اور یہ طرز عمل اس وقت تک جاری رکھے کہ اس کو اطمینان ہو جائے کہ لوگوں کے دل اس کی فضیلت و برتری سے مطمئن ہو گئے ہیں۔ اور ان کے سینے اس کی عظمت و محبت سے لبریز ہو گئے ہیں اور ان کے اعضاء اس کے سامنے خاکساری اور نیازمندی کے عادی ہو چکے ہیں۔ پھر بادشاہ اپنے اس دبدبہ کی حفاظت کرے اور کوئی ایسا کام نہ کرے جس کی آڑ لے کر لوگ اس کی مخالفت پر اتر آئیں۔ اور خدانخواستہ بادشاہ سے کوئی کوتاہی اور لغزش سرزد ہو جائے تو لطف و احسان سے اس کا تدارک کرے اور لوگوں کو یہ بات سمجھائے کہ مصلحت کا تقاضا وہی تھا جو اس نے کیا۔ اس عمل سے لوگوں کو فائدہ پہنچے گا ضرر نہیں پہنچے گا۔

ولا بد للملك من إنشاء الجاه في قلوب رعيته، ثم حفظه، وتدارك الخادشات له بتدبيرات مناسبة.

ومن قصد الجاه فعليه أن يتحلّى بالأخلاق الفاضلة مما يناسب رياسته، كالشجاعة، والحكمة، والسخاوة، والعفو عمن ظلم، وإرادة نفع العامة.

ويفعل بالناس ما يفعل الصياد بالوَحش: فكما أن الصياد يلعب إلى الغَيْضة، فينظر إلى الظباء، ويتأملّ الهيئةَ المناسبةَ لطباعها وعاداتها، فيتهيّأ بتلك الهيئة، ثم يبرز لها من بعيد، ويُغْضِي النظرَ على عيونها وآذانها، فمهما عرف منها تيقُّظا أقام بمكانه، كأنه جماد، ليس به حِراك، ومهما عرف منها غفلةً دبَّ إليها دبيبًا وربما أطْرَبَهَا بالنَّغم، وألقى إليها أطيبَ ما ترومه من العلف، على أنه صاحبُ كرم بالطبع، وأنه لم يقصد بذلك صيدها، والنِّعَمُ تورث حبَّ المُنعِم، وهذه المحبة أوثقُ من هذه الحبالة.

فكذلك الرجل الذي يبرز إلى الناس ينبغي أن يؤثِر هيئة ترغب فيها النفوسُ، من زِيّ، ومنطقٍ، وأدب، ثم يتقرّب منهم قُوْتًا، ويُظهر إليهم النُّصْحَ والمحبة، من غير مُجازفة ولا ظهور قرينة تدل على أن ذلك لصيدهم، ثم يُعْلِمُهم أن نظيره كالممتنِع في حقهم، حتى يرى أن نفوسهم قد اطمأنت بفضله وتقدمه، وصدورَهم قد امتلأت مودةً وتعظيمًا، وجوارحَهم قد أُشْرِبَتْ خشوعًا وإخباتًا، ثم ليَحفظْ ذلك فيهم، فلا يكثر من ما يختلفون به عليه، فإن فرط شيءٌ من

ذلك تعنفاً وتغمده بلطف وإحسان، وإظهار أن المصلحة خفيت بما فعل، وأنه لهم، لا عليهم.

ترجمہ: اور بادشاہ کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنی رعایا کے دلوں میں دبدبہ پیدا کرے، پھر اس کی حفاظت کرے، پھر اس کو نقصان پہنچانے والی چیزوں کا مناسب تدبیروں سے تدارک کرے۔ اور جو شخص حشمت و دبدبہ چاہتا ہے اس پر لازم ہے کہ وہ خود کو ایسے اخلاق عالیہ سے مزین کرے جو اس کی ریاست کے مناسب ہوں، جیسے بہادری، دانشمندی، فیاضی، گنہگار سے درگذر کرنا، اور عوام کا فائدہ چاہنا۔

اور وہ لوگوں کے ساتھ ایسا برتاؤ کرے جیسا شکاری، وحشی جانوروں کے ساتھ کیا کرتا ہے۔ پس جس طرح شکاری جھاڑی میں جاتا ہے، پس وہ ہرنوں کو دیکھتا ہے، اور ان کی طبیعتوں اور عادتوں کے مناسب ہیئت کو سوچتا ہے، اور ان کی ہیئت کے مطابق اپنی ہیئت بنالیتا ہے، پھر دور سے ان کے سامنے آتا ہے۔ اور ان کی آنکھوں اور کانوں کی طرف اپنی نگاہ جمائے رکھتا ہے، پس جب جب وہ محسوس کرتا ہے کہ ہرن چوکنا ہوگئے ہیں تو وہ اسی جگہ ٹھہر جاتا ہے، گویا وہ کوئی بے جان چیز ہے، اس میں ذرا حرکت نہیں ہوتی۔ اور جب جب ان کو غافل پاتا ہے تو ان کی طرف آہستہ آہستہ رینگتا ہے۔ اور کبھی ان کو نغموں (خوش کن آواز) سے خوش کرتا ہے، اور ان کے سامنے وہ چارہ ڈالتا ہے جو ان کو مرغوب ہوتا ہے، گویا وہ فطری طور پر صاحب جود و کرم ہے، اور وہ اس ذریعہ سے ان کو شکار کرتا نہیں چاہتا۔ اور انعامات منعم کی محبت پیدا کرتے ہیں۔ اور محبت کی بیڑی لوہے کی بیڑی سے زیادہ مضبوط ہے۔

پس اسی طرح جو شخص لوگوں کے سامنے نمودار ہونا چاہتا ہے، مناسب یہ ہے کہ وہ پوشاک، بات چیت اور ادب وسلیقہ کی ایسی حالت اختیار کرے جو لوگوں کو مرغوب ہو، پھر آہستہ آہستہ ان کے قریب ہو، اور ان کے سامنے خیر خواہی اور محبت کا اظہار کرے، لاف وگزاف سے بچتے ہوئے، اور کوئی ایسا قرینہ ظاہر نہ ہونے دے جو اس پر دلالت کرتا ہو کہ وہ خیر خواہی کی باتیں ان کو شکار کرنے کے لئے ہیں۔ پھر ان کو بتلائے کہ اس جیسا شخص ان کے حق میں کتنا محسن ہے، یہاں تک کہ دیکھ لے کہ لوگوں کے دل اس کی فضیلت اور برتری پر مطمئن ہوگئے ہیں، اور ان کے سینے محبت وعظمت سے بھر گئے ہیں، اور ان کے اعضاء انکساری اور نیازمندی کے عادی ہو چکے ہیں۔ پھر وہ ان سب باتوں کی لوگوں میں حفاظت کرے، کوئی کام اس سے ایسا سرزد نہ ہونے پائے جس کی آڑ لے کر لوگ اس کی مخالفت پر اتر آئیں، پھر اگر اس معاملہ میں بادشاہ سے کوئی کوتاہی ہو جائے تو بادشاہ کو چاہئے کہ مہربانی اور نیک سلوک سے، اور یہ بات ظاہر کرکے اس کا تدارک کرے کہ مصلحت کا تقاضا وہ تھا جو اس نے کیا۔ اور یہ بات سمجھائے کہ وہ کام ان کے مفاد میں ہے، ان کے لئے مضر نہیں ہے۔

لغات: عَنَّفَه (ض) عَنفاً: خراش لگانا، عیب لگانا۔۔۔۔ الغَيْضَة: جھاڑی، پانی کی جگہ میں بہت درخت جمع جیاض وغیضات۔۔۔ الحَرَاك: حرکت حَرَك (ک) حَرَكا وحركة: ہلنا۔۔۔۔ دَبَّ (ض) دَبًّا ودبِيباً: رینگنا، ہاتھوں اور پیروں کے بل چلنا۔۔۔۔ رامَ (ن) رَوْماً الشيئَ: ارادہ کرنا۔۔۔۔ القَيْد: بیڑی، جانور کے پاؤں باندھنے کی رسی وغیرہ

قیلہ: جڑی ڈالنا اور وکنا ... المجازفۃ: اٹکل پچو، بے تکی باتیں کرنا جازفہ مجازفۃ: اٹکل سے خرید و فروخت کرنا ....
تعوّد: باب تفعّل کے معنی ہیں عادی ہونا۔ مصدر: عادۃ ہے جس کے معنی ہیں حاجت، عادت۔ یہ لفظ مطبوعہ کراچی میں اعراب کے ساتھ لکھا ہوا ہے اور بین السطور میں اس کا ترجمہ اعتادت بھی لکھا ہوا ہے۔ مطبوعہ مصر میں یہ لفظ بگڑ گیا ہے۔

☆ ☆ ☆

سربراہ مملکت کے لئے سات ضروری باتیں

سربراہ مملکت کے لئے درج ذیل سات باتیں ضروری ہیں:

① اپنی فرمانبرداری ثابت کرنے کے لئے بادشاہ کو چاہئے کہ بہترین کارکنوں کی ہمت افزائی کرے، اور ناکارہ افراد کی ہمت شکنی کرے، اور جو اس کی نافرمانی کرے اس کی سرزنش کرے مثلاً بادشاہ کسی شخص کی کسی جنگ میں یا خراج کی تحصیل میں یا مملکت کے نظم و انتظام میں اچھی کارکردگی دیکھے تو بطور انعام اس کی تنخواہ میں اضافہ کرے، اس کا منصب بلند کرے اور اس سے خندہ پیشانی سے پیش آئے۔ اور اگر خیانت دیکھے یہ دیکھے کہ وہ کام میں پیچھے رہتا ہے یا کھسک جاتا ہے تو بطور سرزنش اس کی تنخواہ گھٹا دے، اس کا منصب پست کر دے اور اس سے روگردانی کرے۔

② بادشاہ کو دوسروں سے زیادہ دولت مند ہونا چاہئے۔ مگر اس کی مالداری ایسی چیزوں کے ذریعہ ہونی چاہئے جو پبلک کے لئے تنگی کا باعث نہ ہوں۔ مثلاً ویران زمین کی آبادکاری کرنا یا کسی محفوظ علاقہ (Reserve Area) کو قیمتی بنانا اور اس کی آمدنی سے فائدہ اٹھانا۔

③ بادشاہ کسی پر سخت گیری اس وقت کرے جب پہلے وہ ارکان دولت اور اکابر مملکت کی ذہن سازی کر لے۔ وہ پہلے ان کے سامنے یہ بات ثابت کرے کہ وہ شخص سزا کا مستحق ہے اور ملکی مصلحت کا تقاضا یہ ہے کہ اس کی گوشمالی کی جائے۔ اس ذہن سازی کا فائدہ یہ ہوگا کہ اگر بادشاہ کے اقدام سزا کے بعد لوگوں میں چہ میگوئیاں شروع ہوں گی تو ملک کا یہ عالی دماغ طبقہ اس کو سنبھال لے گا، ورنہ یہ لوگ خود آپس میں حصہ دار بن جائیں گے اور ملک میں خلفشار ہوگا۔

④ بادشاہ میں فراست اور قیافہ شناسی ضروری ہے، تاکہ وہ لوگوں کے دلوں کی مخفی باتوں کو تاڑ لے۔

⑤ بادشاہ نہایت زیرک ہونا چاہئے کہ اگر وہ کسی کے بارے میں اٹکل باندھے تو گویا اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، اور کانوں سے سنا ہے۔

⑥ بادشاہ ضروری کاموں کو التوا میں نہ ڈالے، تاخیر سے بعض مرتبہ نقصان ہوتا ہے اور کاموں کا ہجوم بھی ہو جاتا ہے۔

⑦ اگر کوئی شخص دل میں بادشاہ سے عداوت رکھتا ہے تو بادشاہ اس کے معاملہ میں غفلت نہ برتے، بلکہ جب تک اس کے پروگرام کو تہس نہس نہ کردے، اور اس کے زور کو توڑ نہ دے چین سے نہ بیٹھے۔

والملك مع ذلك يحتاج إلى إيجاب طاعته بالانتقام ممن عصاه، فمهما استشعر من رجل كفاية في حرب، أو جباية، أو تدبير، فليضاعف عطاءه، وليرفع قدره، وليبسط له بشره؛ ومهما استشعر منه خيانة، وتخلفا، وانسلالا، فلينقص من عطائه، وليخفض من قدره، وليقبض عنه بشره؛ وإلى يسار أكمل من يسار الناس؛ ولكن مما لا يضيق عليهم، كثمرات يجبيها، وناحية بعيدة يحميها، ونحو ذلك؛ وإلى ان لا يبطش بأحد، إلا بعد أن يصح على أهل الحل والعقد: أنه يستحقه، وأن المصلحة الكلية حاكمة به؛ ولا بد للملك من فراسة يعرف بها ما أضمرت نفوسهم، ويكون ألمعيا يظن بك الظن كأن قد رأى وقد سمع؛ ويجب عليه أن لا يؤخر ما لا بد منه إلى غد، ولا يقصر إذا رأى منهم أحدا يضمر عداوته دون فك نظامه، وإضعاف قوته، والله أعلم.

ترجمہ: اور بادشاہ ان (گذشتہ) باتوں کے ساتھ (مستزاد) اپنی فرمانبرداری ثابت کرنے کے لئے اس بات کا محتاج ہے کہ وہ اس شخص سے بدلہ لے (یعنی سرزنش کرے) جو اس کی نافرمانی کرتا ہے۔ پس جب جب بادشاہ کسی شخص کی کسی جنگ میں یا خراج کی تحصیل میں یا مملکت کی تدبیر میں کوئی اچھی کارکردگی محسوس کرے تو اس کی تنخواہ بڑھادے، اور اس کا منصب بلند کرے، اور اس کے ساتھ خندہ پیشانی سے پیش آئے۔ اور جب جب اس سے خیانت، پیچھے رہنا اور کھسک جانا دیکھے تو اس کی تنخواہ کم کردے، اور اس کا منصب گھٹادے، اور اس سے روگردانی کرے — اور بادشاہ ایسی مالداری کا بھی محتاج ہے جو عام لوگوں کی مالداری سے کامل تر ہو، اور چاہئے کہ وہ مالداری ان چیزوں کے ذریعہ ہو جو لوگوں پر تنگی نہ کریں، جیسے کوئی نہر یا زمین جس کی آبادکاری کرے اور دور افتادہ علاقہ جس کو محمی (محفوظ علاقہ) قرار دے، اور اس طرح کی دوسری چیزیں — اور بادشاہ اس کا بھی محتاج ہے کہ وہ کسی پر سخت گیری نہ کرے مگر ارباب حل وعقد کے سامنے یہ بات ثابت کرنے کے بعد کہ وہ شخص سزا کا مستحق ہے اور یہ کہ مصلحت کلی کا مقتضی دار وگیر ہے — اور بادشاہ میں ایسی فراست ضروری ہے جس کے ذریعہ وہ لوگوں کے دلوں میں چھپی ہوئی باتیں جان لے — اور بادشاہ کے لئے ضروری ہے کہ اَلْمَعِی (نہایت زیرک) ہو، جو تیرے بارے میں اگر کوئی اٹکل باندھے تو گویا اس نے اپنی آنکھوں اور کانوں سے دیکھا اور سنا ہے — اور بادشاہ پر واجب ہے کہ وہ ضروری کاموں کو کل پر نہ ٹالے — اور اگر بادشاہ کسی کو دیکھے کہ وہ دل میں بادشاہ سے عداوت پوشیدہ رکھتا ہے تو اس کے نظام کو درہم برہم کئے بغیر، اور اس کی

وينصح له ظاهرًا وباطنًا؛ وكلُّ من خالف هذه الشريطة فقد استحق العزل، فإن أهمل الملك عزله فقد خان المدينة، وأفسد على نفسه أمره.

وينبغي أن لا يتخذ الأعوانَ ممن يتعسر عزله، أو ممن له حقٌّ على الملك: من قرابة، أو نحوها، فيقبُح عزله؛ وليميِّز الملك بين محبيه: فمنهم من يحبه لرهبته أو لرغبته، فليَجُرَّه إليه بحيلة، ومنهم من يحبه لذاته، ويكون نفعُه نفعا له، وضررُه ضررًا عليه، فذلك المحبُّ الناصح؛ ولكل إنسان جبلةٌ جُبل عليها، وعادةٌ اعتادها، ولا ينبغي للملك أن يرجو من أحد أكثرَ مما عنده.

والأعوان: إما حفظةٌ من شر المخالفين، بمنزلة اليدين الحاملتين للسلاح من بدن الإنسان؛ وإما مدبِّرون للمدينة، بمنزلة القُوى الطبيعية من الإنسان؛ أو المشاورون للملك، بمنزلة العقل والحواس للإنسان؛ ويجب على الملك أن يسأل كلَّ يوم ما فيهم من الأخبار، ويعلم ما وقع من الإصلاح وضده.

ترجمہ: اہل کاروں کے ساتھ برتاؤ کا بیان: جب بادشاہ بذاتِ خود حکومت کے تمام کاموں کو سرانجام نہیں دے سکتا، تو ضروری ہے کہ بادشاہ کے لئے ہر کام کے مناسب مددگار (اہل کار) ہوں۔ اور معاونین کے لئے شرط ہے: امانت داری اور اس کام کی انجام دہی کی قدرت جس کا ان کو حکم دیا گیا ہے۔ اور بادشاہ کی فرمانبرداری اور ظاہر و باطن میں بادشاہ کی خیر خواہی — اور ہر وہ کارکن جس میں یہ شرط نہ پائی جائے وہ یقیناً برطرفی کا مستحق ہے۔ پس اگر بادشاہ نے اس کو معزول نہ کیا تو اس نے مملکت کے ساتھ خیانت کی، اور خود اپنی ذات کے لئے خرابی پیدا کی۔

اور مناسب یہ ہے کہ ان لوگوں میں سے ملازم نہ رکھے جن کو معزول کرنا دشوار ہو، یا جن کا بادشاہ پر حق ہو، رشتہ داری کی وجہ سے یا اس طرح کی کسی اور چیز کی وجہ سے، پس برا ہوگا اس کا برطرف کرنا — اور چاہئے کہ بادشاہ اپنے محبین میں امتیاز کرے، کیونکہ بعض لوگ بادشاہ سے محبت کرتے ہیں اس کے خوف کی وجہ سے، یا اس سے کسی امید کی وجہ سے، پس چاہئے کہ بادشاہ اس کو کسی تدبیر سے اپنی طرف کھینچے۔ اور بعض لوگ بادشاہ سے اس کی ذات کی وجہ سے محبت کرتے ہیں۔ وہ لوگ بادشاہ کا نفع اپنا نفع اور بادشاہ کا نقصان اپنا نقصان سمجھتے ہیں۔ پس یہی شخص "مخلص دوست" ہے — اور ہر انسان کی ایک فطرت ہوتی ہے، جس پر وہ پیدا کیا جاتا ہے، اور ایک عادت ہوتی ہے جس کا وہ عادی ہوتا ہے، اور بادشاہ کے لئے یہ مناسب نہیں ہے کہ وہ کسی سے اس چیز سے زیادہ امید رکھے جو اس کے پاس ہے (یہ سوال مقدر کا جواب ہے)

اور معاونین یا تو مخالفین کے شر سے محفوظ رکھنے والے لوگ ہیں۔ اور یہ لوگ بدنِ انسانی میں ان ہاتھوں کی طرح ہیں جو ہتھیار اٹھانے والے ہیں — یا وہ شہر کا انتظام کرنے والے ہیں۔ یہ لوگ انسان کے فطری قویٰ کی طرح ہیں — یا بادشاہ کے مشیر ہیں۔ یہ لوگ انسان کی عقل اور حواس کی طرح ہیں — اور بادشاہ کے لئے ضروری ہے کہ وہ روزانہ ان سے خبریں معلوم

ترجمہ: اور جب بادشاہ اور اس کے معاونین مملکت کے لئے مفید خدمات انجام دیتے ہیں تو ضروری ہے کہ ان کا روزینہ مملکت کے ذمہ ہو۔ اور ضروری ہے کہ عشر و خراج کی وصولی کے لئے کوئی منصفانہ طریقہ ہو، جو رعایا کے حق میں ضرر رساں نہ ہو اور ضروریات مملکت کے لئے کافی ہو جائے۔ اور یہ بات مناسب نہیں ہے کہ ہر شخص پر اور ہر قسم کے مال پر لگان مقرر کیا جائے۔ اور کوئی تو وجہ ہے کہ مشرق و مغرب کے بادشاہوں نے اتفاق کیا ہے کہ محصول اہل ثروت سے اور لگے ہوئے ذخیروں سے اور بڑھنے والے اموال سے، جیسے افزائش نسل کے لئے پالے ہوئے مویشی، کھیتی باڑی اور تجارت میں سے وصول کیا جائے — پھر اگر اس سے زیادہ مال کی ضرورت پیش آئے تو مزدوروں کاریگروں پر ٹیکس لگایا جائے۔

ترکیب: سنۃ عادلۃ اسم ہے ان یکون کا، اور خبر کا فصل آگیا ہے اس لئے یکون مذکر ہے۔

☆ ☆ ☆

عسکری تنظیم کی ضرورت

پہلے بادشاہ خود "سالار افواج" ہوتا تھا، اس لئے بادشاہ کے لئے اپنے لشکر کی تنظیم ضروری ہے۔ اور عسکری تنظیم کا طریقہ وہی ہے جو اصطبل پچھیرے کو سدھانے کا ہے۔ اس فن کا ماہر گھوڑے کی چالوں کو خوب جانتا ہے یعنی رہوار، دلکی، چوٹیہ، سرپٹ وغیرہ اور گھوڑوں کی بری عادتوں سے بھی واقف ہوتا ہے یعنی اڑنا وغیرہ اور وہ طریقے بھی جانتا ہے جس سے گھوڑے کو خوب تنبیہ ہوتی ہے یعنی ڈانٹنا، لکڑی وغیرہ چبھونا اور کوڑا استعمال کرنا۔ پھر جب وہ پچھیرے کو سدھانے کے لئے لے چلتا ہے تو اس پر برابر نظر رکھتا ہے۔ جب بھی گھوڑا کوئی ایسی حرکت کرتا ہے جو ناپسندیدہ ہوتی ہے یا وہ کسی پسندیدہ بات کو چھوڑتا ہے تو وہ شخص گھوڑے کو سخت تنبیہ کرتا ہے۔

اس طرح بار بار تنبیہ کرنے سے گھوڑے کی طبیعت مطیع ہو جاتی ہے اور اس کی تیزی ٹوٹ جاتی ہے۔ دوسرے سرکش جانور ہاتھی، شیر وغیرہ بھی اسی طرح مطیع بنائے جاتے ہیں اور ان کو مختلف کاموں کے لئے ٹریننگ دیا جاتا ہے۔

اور ٹریننگ دینے والے کو اس بات کا خیال رکھنا چاہئے کہ وہ گھوڑے کو کوئی ایسی تنبیہ نہ کرے، جس سے گھوڑے کا دل پراگندہ ہو جائے اور وہ سمجھ نہ سکے کہ اس کو کیوں مارا؟ جو بھی تنبیہ کرے اس سے گھوڑے کی سمجھ میں آنا چاہئے کہ اس کو فلاں غلطی پر تنبیہ کی گئی ہے۔ اور یہ بات اس کے دل میں بیٹھ جانی چاہئے کہ وہ جب بھی یہ غلطی کرتا ہے تو اس کو سزا ملتی ہے۔ اور سزا کا خوف اس کے دل میں مستقل رہنا چاہئے — پھر تمرین مکمل ہونے کے بعد بھی اس وقت تمرین و ریہرسل (Rehearsal) جاری رکھنی چاہئے کہ سکھلائی ہوئی باتیں اس میں ملکہ راسخہ اور عادت ثانیہ بن جائیں۔ اور صورت حال ایسی ہو جائے کہ اگر گھوڑے کو تنبیہ نہ بھی کی جائے تب بھی وہ سکھائے ہوئے طریقے کے خلاف ورزی نہ کرے۔

اسی طرح عسکری تنظیم کرنے والے کے لئے یہ جاننا ضروری ہے کہ فوج کو کیا کام کرنے چاہئیں اور کیا کام نہیں

کرنے جو ہتھیں اور دوسرے طریقوں کو بھی جانتا ہو جن سے فوج کو تنبیہ ہوتی ہے۔ نیز سالار افواج کی یہ بھی ذمہ داری ہے کہ وہ ہر بار فوج سے درپیش عمل کراتا رہے، کسی وقت بھی ان کو بے کار نہ چھوڑے۔

ولابد للملك من سياسة جنوده: وطريق السياسة ما يفعله الرائض الماهر بفرسه، حيث يتعرف أصناف الجري: من إيغال، وحرونة، وعدو، ونحوها، والعادات الذميمة: من حرونة، ونحوها؛ والأمور التي تنبه الفرس تنبيها بليغا كالنخس، والزجر، والسوط، ثم يراقبه، فكلما فعل ما لا يرتضيه، أو ترك ما يرتضيه نبهه بما ينقاد له طبعه، وتنكسر به سورته، وليقصد في ذلك أن لا يشوش خاطره، فلا يعقل لماذا ضربه؟ ولتكن صورة الأمر الذي يلقيه إليه متمثلة في صدره، متمكنة في قلبه، والخوف من المجازاة مقيما في خاطره، ثم إذا حصل فعل المطلوب، والكف عن المهروب، لا ينبغي أن يترك الرياضة، حتى يرى أن الطريقة المطلوبة صارت خلقا له وديدنا، وصار بحيث لولا الزجر لما ركن إلى خلافها، فكذلك يجب على رائض الجنود أن يعرف الطريقة المطلوبة فعلا وكفا، والأمور التي يقع بها تنبيههم، ولتكن من شأنه أن لا يهمل شيئا من ذلك أبدا.

ترجمہ: اور بادشاہ کے لئے اپنے لشکر کی تنظیم ضروری ہے۔ اور تنظیم کا طریقہ وہ ہے جو گھوڑے کو سدھانے کا ماہر اپنے گھوڑے کے ساتھ اختیار کرتا ہے۔ چنانچہ وہ خوب پہچانتا ہے چال کی قسمیں یعنی پویہ (ڈکی) تیز روی (رہوار) سرپٹ وغیرہ، اور (جانتا ہے گھوڑوں کی) بری عادتیں یعنی اڑنا اور اس کے مانند، اور ان باتوں کو جو گھوڑے کو خوب تنبیہ کرتی ہیں، جیسے (لکڑی وغیرہ) چبھونا، جھڑکنا اور کوڑا۔ پھر وہ گھوڑے کی نگرانی رکھتا ہے۔ پس جب بھی گھوڑا کوئی ایسی حرکت کرتا ہے جو اس کو ناپسند ہوتی ہے یا کوئی ایسی بات چھوڑتا ہے جو اس کو پسند ہوتی ہے تو وہ گھوڑے کو ایسی سخت تنبیہ کرتا ہے کہ گھوڑے کی طبیعت اس کی مطیع ہو جاتی ہے اور اس کی تیزی ٹوٹ جاتی ہے — اور چاہئے کہ تربیت دینے والا جو بھی تنبیہ کرے اس میں اس بات کا خیال رکھے کہ گھوڑے کا دل مشوش نہ ہو جائے کہ وہ نہ سمجھ پائے کہ سدھانے والے نے اس کو کیوں مارا؟ اور چاہئے کہ اس امر کی صورت جس کو وہ گھوڑے کی طرف ڈال رہا ہے (یعنی جس غلطی پر تنبیہ کر رہا ہے اس کی صورت) اس کے سینہ میں موجود ہو، اس کے دل میں بیٹھنے والی ہو (یعنی وہ خوب سمجھ رہا ہو کہ فلاں غلطی پر مارا گیا) اور سزا کا خوف اس کے دل میں بیٹھا رہنا چاہئے (کہ وہ جب بھی یہ غلطی کرے گا پیٹا جائے گا) — پھر جب مطلوبہ کام کرنا اور جس بات سے بھاگا (بچا) جا رہا ہے اس سے رکنا حاصل ہو جائے تو مناسب نہیں ہے کہ وہ عمل چھوڑ دے (بلکہ تمرین جاری رکھے) تا آنکہ دیکھ لے کہ مطلوبہ طریقہ گھوڑے میں ملکہ راسخہ اور اس کا وطیرہ بن گیا ہے اور گھوڑا ایسا

ہو چکا ہے کہ اگر وہ بھی کاٹ دی جائے تب بھی وہ اس کے (سکھلائے ہوئے طریقے کے) خلاف کی طرف مائل نہ ہوگا ——
جیسا اسی طرح عسکری تنظیم کرنے والے کے لئے ضروری ہے کہ وہ کرنے اور نہ کرنے کے مطلوبہ طریقوں کو جانے اور ان امور کو بھی جانے جن کے ذریعہ فوج کو تنبیہ ہوتی ہے اور چاہئے کہ سالار افواج کی یہ حالت ہو کہ وہ ان باتوں میں سے کسی کو بھی کبھی نہ چھوڑے۔

لغات: راض یروض روضا و ریاضة المهر: بچھیرے کو سدھانا، مشق کرانا — ارقل: پویہ چلانا گھوڑے کا درمیانی چال چلنا جس میں ایک وقت میں تھوڑا ہی اٹھتے ہیں — عزولة: تیز چھری — خرت (ن،ک) خروتا البلد: ز جانا، زمین میں — سخی الدابة: جانور کے پہلو یا پچھلے حصہ پر گدی یا زین چھوڑ کر کسانا — المذبذب: العادة: فعلا وکفا تمیز بین المطلوب تی۔

☆ ☆ ☆

سرکاری عملہ کی تعداد

سرکاری عملہ کی تعداد کسی حد میں محدود نہیں، مملکت کی ضرورت پر اس کا دار و مدار ہے۔ کبھی ایک کام کے لئے دو آدمی ضروری ہوتے ہیں۔ اور کبھی دو کام ایک ہی آدمی سے نکل سکتے ہیں۔ البتہ سرکاری ملازمین کے بڑے صیغے پانچ ہیں:

(١) قاضی: (عدلیہ) اور قاضی میں یہ صفات ضروری ہیں ١- آزاد ہو، غلام نہ ہو ٢- مرد ہو، عورت نہ ہو ٣- بالغ ہو بچہ نہ ہو ٤- عاقل ہو، پاگل نہ ہو ٥- منصب کی ذمہ داری ادا کرنے کی پوری صلاحیت رکھتا ہو، نا اہل نہ ہو ٦- لوگوں میں ہونے والے معاملات کے طریقوں کو جانتا ہو اور مقدمات میں فریقین کی چالوں کو سمجھتا ہو، بے بصیرت نہ ہو ٧- مضبوط آدمی ہو، دھمکیوں سے ڈرنے والا نہ ہو مگر ساتھ ہی بردبار بھی ہو، بھڑک جانے والا نہ ہو۔

اور قاضی (Judge) کو مقدمات میں دو باتوں پر غور کرنا چاہئے۔

اول: مقدمہ کی حقیقت حال کیا ہے؟ کیا وہ کوئی عقد ہے، جیسے خرید و فروخت، ہبہ، نکاح وغیرہ، یا وہ کوئی ظلم و زیادتی کا معاملہ ہے، جیسے قتل، چوری، تہمت، حق تلفی وغیرہ، یا فریقین میں کسی معاملہ میں ریس (Race) ہے کہ دیکھیں کون جیتتا ہے؟

دوم: قاضی یہ جانے کہ فریقین میں سے ہر شخص اپنے مقابل سے کیا چاہتا ہے، اور کس کی خواہش برحق و لائق ترجیح ہے؟

اور قاضی کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ مقدمہ کی مسل اچھی طرح پڑھے، اور دلائل کے وزن کا اندازہ کرے۔ کیونکہ بعض دلائل صاف اور کھرے ہوتے ہیں۔ ان میں ادنیٰ شک کی گنجائش نہیں ہوتی، وہ دو ٹوک فیصلہ چاہتے ہیں۔ اور بعض دلائل ایسے نہیں ہوتے۔ ان میں دو ٹوک فیصلہ ممکن نہیں ہوتا۔ اس لئے قاضی کو خوب غور کرکے حسب دلائل فیصلہ کرنا چاہئے۔

(۲) سالارِ افواج: (وزیرِ دفاع، چیف آف آرمی، کرنل، میجر، کپتان وغیرہ) اس میں یہ صفات ضروری ہیں: ۱- جنگی ساز وسامان کی واقفیت ۲- فوج کے جوانمردوں اور بہادروں کی تالیفِ قلب کے طریقوں سے باخبر ہو۔ ۳- کون فوجی کس درجہ کارآمد ہے اس کی واقفیت ۴- میدانِ جنگ میں لشکر کی ترتیب، تنظیم کے طریقے جاننا ۵- دشمن کے مکر وفریب کو جاننے کے لئے مخبر (Reporter) اور جاسوس (Spy) مقرر کرنے کی مہارت۔

(۳) منتظمِ مملکت: (وزیرِ داخلہ، رئیسِ بلدیہ (Mayor) قصبہ کا چیئرمین۔ اور ان میں یہ صفات ضروری ہیں۔
۱- مملکت اور شہر کو سنوارنے اور بگاڑنے والی چیزوں کی واقفیت ۲- مضبوط ہونا ۳- بردبار ہونا ۴- ایسی قوم کا فرد ہونا جو ناپسندیدہ باتوں کو دیکھ کر خاموش نہ رہ سکتے ہوں۔

اور منتظمِ مملکت کا طریقۂ کار یہ ہونا چاہئے کہ وہ ہر قوم پر انہی میں سے ایک نگراں (چودھری، مکھیا) مقرر کرے جو ان لوگوں کے احوال سے باخبر ہو۔ وہ اس چودھری کے ذریعہ لوگوں کے معاملات پر کنٹرول کرے۔ اور اگر اس قوم میں کوئی شر وفساد پیدا ہو تو اس نگراں سے باز پرس کرے۔

(۴) عامل: (وزیرِ مالیات، تحصیلدار وغیرہ) اور وہ ایسا شخص ہونا چاہئے جو ٹیکس اور محصول جمع کرنے کی شکلوں سے اور مستحقین میں اس کو تقسیم کرنے کے طریقوں سے واقف ہو۔

(۵) وکیل (وہ شخص جس کو بادشاہ اپنے ذاتی کام سپرد کرے، پرائیویٹ سکریٹری) یہ شخص بادشاہ کے معاشی امور سرانجام دے گا۔ کیونکہ بادشاہ مملکت کے کاموں میں مشغولیت کی وجہ سے اپنی ضروریات کا انتظام نہیں کرسکتا۔

وليس للأعوان حصر في عدد، لكنه يدور على دوران حاجات المدينة، فربما تقع الحاجة إلى اتخاذ عونين في حاجة، وربما كفى عونٌ لحاجتين، غير أن رؤوس الأعوان خمسة:

[۱] القاضي: وليكن حرًا، ذكرًا، بالغًا، عاقلًا، كافيًا، عارفًا بسنة المعاملات، وبمكايد الخصوم في اختصامهم، وليكن صُلْبًا، حليمًا، جامعًا للأمرين؛ ولينظر في مقامين: أحدهما: معرفةُ جليّة الحال، وهي: إما عقد، أو مظلمة، أو مسابقة بينهما؛ وثانيهما: ما يريد كلُّ واحد من صاحبه: أيُّ الإرادتين أصوبُ وأرجح؟ ولْيَنْظُرْ في وجه المعرفة: فهنالك حجةٌ لا يريب فيها الناس، تقتضي الحكمَ الصُّراحَ، وحجةٌ ليست بذاك، تقتضي حكمًا دون الحكم الأول.

[۲] وأمير الغزاة: وليكنْ من شأنه معرفةُ عُدّة الحرب، وتأليف الأبطال والشجعان، ومعرفة مبلغ كل رجل في النفع، وكيفية تَعْبِئة الجيوش، ونصب الجواسيس والخبرة بمكايد الخصوم

[۳] وسائس المدينة: وليكنْ مجرِّبًا، قد عرف وجوه صلاح المدينة وفسادها، صُلْبًا، حليمًا، وليكن من قوم لا يستنكرون إذا رأوا خلاف ما يرتضونه؛ وليتخذ لكل قوم نقيبا منهم،

عارفا باخبارهم، ينتظم به أمرهم، ويؤاخذه بما عندهم.

[4] والعامل: وليكن عارفا بكيفية جباية الأموال، وتفريقها على المستحقين.

[5] والوكيل: المتكفل بمعايش الملك، فإنه مع ما به من الأشغال لا يمكن أن يتفرغ للنظر إلى إصلاح معاشه.

ترجمہ: اور معاونین کی تعداد کسی عدد میں محدود نہیں ہے، بلکہ وہ مملکت کی ضرورتوں کے گھومنے کے ساتھ گھومتی ہے۔ پس کبھی ایک کام کے لئے دو ملازم رکھنے کی ضرورت پیش آتی ہے، اور کبھی دو کاموں کے لئے ایک ملازم کافی ہوجاتا ہے۔ البتہ معاونین کے بڑے شعبے پانچ ہیں:

۱۔ قاضی: اور چاہئے کہ وہ آزاد، مرد، بالغ، عاقل، منصب کی ذمہ داری پوری کرنے کی صلاحیت رکھنے والا، معاملات کے طریقہ کو اور لوگوں کے مقدمات میں فریقین کی چالوں کو جاننے والا ہو۔ اور چاہئے کہ وہ مضبوط اور بردبار، دونوں باتوں کا جامع ہو — اور چاہئے کہ وہ مقدمات میں دو باتوں میں غور کرے: اول: حقیقت حال سمجھے کہ کوئی عقد ہے یا زیادتی ہے یا کوئی دعویٰ ہے۔ دوم: ہر شخص اپنے مقابل سے جو چاہتا ہے (اس کو سمجھے، نیز یہ جانے کہ) دونوں میں سے کس کا چاہنا برحق اور قابل ترجیح ہے — اور چاہئے کہ پہچاننے کی صورت میں غور کرے: پس جہاں کوئی بینت ایسی ہوتی ہے جس میں لوگوں کو کچھ شک نہیں ہوتا، جو نااس حکم چاہتی ہے، اور دوسری دلیل ایسی نہیں ہوتی، وہ پہلے حکم سے فروتر حکم چاہتی ہے۔

۲۔ اور سالارِ افواج: اور چاہئے کہ اس کے صاحب میں سے ہو جو جنگی ساز و سامان کو پہچانتا ہو، اور جو فوجوں اور بہادروں کی تالیف کے طریقوں کو جانتا ہو۔ اور یہ جانتا ہو کہ کس آدمی سے کس قدر نفع متوقع ہے۔ اور میدان جنگ میں لشکر کو مرتب کرنے کا طریقہ جانتا ہو، اور دشمن کی قریب کارروائیوں کی خبر دینے والوں کو اور جاسوسوں کو مقرر کرنے کا طریقہ جانتا ہو۔

۳۔ اور منتظم شہر: اور چاہئے کہ وہ تجربہ کار ہو۔ شہر کی صلاح و فساد کی شکلوں کو خوب جانتا ہو، مضبوط اور بردبار ہو، اور چاہئے کہ وہ ان لوگوں میں سے ہو جو خاموش نہ رہ سکتے ہوں، جب وہ کوئی ایسی بات دیکھیں جو ان باتوں کے خلاف ہو جو ان کو پسند ہیں (یعنی وہ ناپسندیدہ باتوں کو دیکھ کر خاموش نہ رہ سکتے ہوں) اور چاہئے کہ وہ ہر قوم پر انہی میں سے ایک نگراں مقرر کرے، جو ان لوگوں کے احوال سے باخبر ہو، جس کے ذریعہ ان لوگوں کے معاملات منظم ہوں، اور اس سے ان باتوں کا مؤاخذہ کرے جو اس قوم میں پیش آئیں۔

۴۔ اور عامل: اور چاہئے کہ وہ اموال کا محصول جمع کرنے کے طریقوں کو، اور ان کو مستحقین میں تقسیم کرنے کی صورتوں کو جاننے والا ہو۔

۵۔ اور وکیل: جو بادشاہ کے معاشی امور کا ذمہ دار ہو۔ پس بیشک بادشاہ کے لئے اپنے مشاغل کے ساتھ ممکن نہیں ہے کہ وہ اپنی ضروریات زندگی کی اصلاح میں غور و فکر کرنے کے لئے وقت نکال سکے۔

لغات: الجَلِيُّ واضح، مؤنث جلیۃ، جَلِیَّۃُ الأمر کھلا ہوا معاملہ۔ عبّأ تعبئۃ وتعبیئًا الجیشَ للحرب میدان جنگ میں لشکر کو مرتب کرنا۔

نوٹ: متن نسخۂ اصل میں اور تینوں مخطوطوں میں سابقۃ ہے جو تصحیف ہے۔ یہ تصحیح مولانا سندھی رحمہ اللہ کی تقریر سے کی گئی ہے۔

باب — ۹

خلافت کبری کا بیان

ارتفاق رابع کے لئے صرف یہی ایک باب ہے۔ اور ارتفاق رابع سے مراد خلافت کبری (مرکزی حکومت) کا نظام ہے۔ یہ بھی حکمت عملیہ کی ایک قسم ہے۔ اور یہ وہ فن ہے جو مختلف ممالک کے حکام اور فرمانرواؤں کے ساتھ برتاؤ اور مختلف علاقوں (ممالک) کے درمیان پائے جانے والے رابطہ کی نگہداشت کے طریقوں سے بحث کرتا ہے۔

خلیفہ کی ضرورت: جب متعدد بادشاہ مستقل فرماں رواں بن جاتے ہیں، اور ان کے پاس خزانہ جمع ہوجاتا ہے اور فوج اکٹھا ہوجاتی ہے تو ان میں نخرے شروع ہوجاتے ہیں۔ سب کی طبیعتیں اور استعدادیں یکساں نہیں ہوتیں، اس لئے ظلم وزیادتی شروع ہوجاتی ہے۔ اور وہ دستور چھوڑ دیتے ہیں۔ بعض، بعض کی مملکت کی آرزو کرنے لگتے ہیں، اور ایک دوسرے پر حسد شروع ہوجاتا ہے، اور ذاتی مفادات کے لئے جنگ چھڑ جاتی ہے، جیسے ثروت کی لالچ، غلبہ کی ہوس، جلن، کینہ وغیرہ۔ جب اس قسم کی باتیں بادشاہوں میں بہت زیادہ ہوگئیں تو لوگوں نے خلیفہ کی ضرورت محسوس کی اور مرکزی حکومت کا قیام ضروری ہوگیا۔

اور خلیفہ سے مراد وہ شخص ہے جس کے پاس اتنا لشکر اور فوجی ساز وسامان ہو کہ دوسرا کوئی شخص اس کا ملک چھین لے یہ بات بظاہر محال نظر آتی ہو۔ گو یہ بات فی نفسہ ممکن ہے مگر عام شورش، بھاری کوشش، زبردست فوج اور اربوں کھربوں دولت خرچ کرکے ہی ممکن ہوتی ہے، جس کی ہمت کون کرسکتا ہے؟ عادۃً یہ بات ناممکن ہے۔

﴿باب الارتفاق الرابع﴾

وهي الحكمة الباحثة عن سياسة حُكّام المُدن وملوكها، وكيفية حفظ الربط الواقع بين أهل الأقاليم؛ وذلك: أنه لما انفرز كلُّ مَلِكٍ بمدينته، وجُبي إليه الأموالُ، وانضمّ إليه الأبطالُ، أوجب اختلافُ أمزجتهم، وتشتُّتُ استعداداتهم: أن يكون فيهم الجَوْرُ، وترك السنة الراشدة، وأن يطمع بعضُهم في مدينة الآخر، وأن يتحاسدوا، ويتقاتلوا بآراء جزئية: من نحو

> رغبة في الأموال والأراضي، أو حسد وحقد؛ فلما كثر ذلك في الملوك اضطروا إلى الخليفة؛
> وهو: من حصل له من العساكر والعُدد ما يُرى كالممتنع أن يسلب رجلٌ آخرُ مُلكه؛ فإنه إنما
> يُتصوّر بعد بلاءٍ عام، وجهد كبير، واجتماعات كثيرة، وبذل أموال خطيرة، تتقاصر الأنفسُ
> دونها، وتُحيله العادة.

ترجمہ: ارتفاق رابع کا بیان: اور ارتفاق رابع وہ فن ہے جو مختلف شہروں کے حکام اور فرماں رواؤں کے ساتھ برتاؤ اور مختلف ممالک کے درمیان پائے جانے والے روابط کی نگہداشت کے طریقوں سے بحث کرنے والا ہے۔ اور وہ (یعنی خلیفہ کی ضرورت) اس لئے ہے کہ جب ہر بادشاہ اپنی مملکت کے ساتھ علحدہ ہو گیا۔ اور اس کے پاس اموال جمع کئے گئے، اور اس کے ساتھ بہادر مل گئے، تو ان کے مزاجوں کے اختلاف نے اور ان کی استعدادوں کے تفاوت نے واجب کیا کہ ان میں ظلم اور راہ راست کا چھوڑنا پایا جائے۔ اور یہ کہ بعض بعض کی مملکت کی آرزو کریں۔ اور یہ کہ وہ ایک دوسرے پر حسد کریں اور وہ ذاتی اغراض سے باہم لڑیں: جیسے اموال و اراضی کی خواہش یا جلن اور کینہ جیسی چیزیں۔ پس جب یہ چیزیں بادشاہوں میں بہت زیادہ ہو گئیں تو وہ خلیفہ مقرر کرنے کی طرف مجبور ہوئے۔

اور خلیفہ وہ شخص ہے جس کے پاس اتنا لشکر اور ساز و سامان ہو کہ تو اس کو ایسا خیال کرے کہ ممتنع ہے کہ کوئی دوسرا شخص اس کا ملک چھین لے۔ پس بیشک یہ بات عام آزمائش اور بھاری کوشش اور بڑے اجتماعات اور ڈھیر سارا مال خرچ کرنے کے بعد ہی متصور ہے، جس کے ورے نفوس کوتاہ رہ جاتے ہیں، اور جس کو عادت محال سمجھتی ہے۔

لغات: المُدُن (دال کے پیش اور سکون کے ساتھ) المدینۃ کی جمع ہے۔　فذلکما مشار الیہ الارتفاق الرابع ہے۔　العُدّۃ: سامان حرب وغیرہ جمع عُدَد۔　البلاء: آزمائش، آفت، شورش　فانہ انما یتصور میں ضمیر سلب کی طرف لوٹتی ہے، جو یسلب سے مفہوم ہے اور انما مخطوطہ کراچی سے بڑھایا ہے۔۔۔ ھی الخلیفۃ میں ضمیر ھی، الارتفاق الرابع کی طرف لوٹتی ہے۔ کیونکہ اس سے مراد خلافت ہے۔

☆　☆　☆

خلافت کا فائدہ

خلافت اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے، اس کے زیر سایہ خدا کے بندے اطمینان کا سانس لیتے ہیں۔ بیہقی کی شعب الایمان میں حدیث ہے: إن السلطانَ ظِلُّ اللہ في الأرض يأوي إليه كلُّ مظلوم من عباده (مشکوۃ کتاب الامارۃ حدیث نمبر ۳۷۱۸) ترجمہ: بادشاہ زمین میں اللہ تعالیٰ کا سایہ ہے۔ اللہ کے بندوں میں جو بھی مظلوم ہوتا ہے وہ اس سایہ میں ٹھکانہ لیتا ہے۔ اور متفق علیہ روایت ہے کہ: إنما الإمام جُنَّةٌ يُقاتَل من ورائه، ويُتَّقٰى به (مشکوۃ کتاب الامارۃ حدیث نمبر ۳۶۶۱)

ترجمہ: امام تو ڈھال ہے، اس کی آڑ میں لڑا جاتا ہے اور اس کے ذریعہ بچاؤ کیا جاسکتا ہے، اس لئے جب خلیفہ پایا جاتا ہے اور وہ زمین میں اچھے انداز پر کام کرتا ہے اور سرکش لوگ اس کے سامنے سرنگوں ہو جاتے ہیں اور دوسرے بادشاہ اس کے فرمانبردار ہو جاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کی نعمت کامل ہو جاتی ہے۔

جنگ کی دو بنیادیں

خلیفہ کو دو وجہ سے جنگ چھیڑنی پڑتی ہے:

(۱) دفاع کے لئے: جب درندہ صفت لوگ حملہ کرتے ہیں، لوگوں کے اموال لوٹتے ہیں، ان کے اہل وعیال کو قید کر کے لے جاتے ہیں، ان کی عزت کی دھجیاں اڑاتے ہیں اور لوگوں کا ناک میں دم کر دیتے ہیں تو خلیفہ کے لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ لوگوں سے شر ہٹانے کے لئے تلوار اٹھائے اور دشمنوں کا منہ کچل دے، ہاتھ توڑ دے اور پاؤں اکھاڑ دے۔ بنی اسرائیل جب اسی قسم کے حالات سے دوچار ہوئے تھے تو انھوں نے اپنے پیغمبر سے درخواست کی تھی کہ ہمارے لئے ایک بادشاہ مقرر کر دیجئے کہ ہم اللہ کی راہ میں (جالوت سے) قتال کریں (سورۃ البقرۃ آیت ۲۴۶)

(۲) اقدامی طور پر: جب خواہش پرست اور درندہ صفت لوگ بد راہی اختیار کرتے ہیں، زمین میں اودھم مچاتے ہیں اور اللہ کی زمین کو فتنہ سے بھر دیتے ہیں تو اللہ تعالیٰ انبیاء کے توسط سے یا براہ راست خلیفہ کو الہام فرماتے ہیں کہ وہ ان شر پسندوں کی شوکت کو توڑ دے اور ان لوگوں کو تہ تیغ کرے جن کی اصلاح کی توقع کوئی امید نہیں، جو انسانوں میں سڑے گلے ہوئے عضو کی طرح ہیں، جس کو کاٹ کر پھینک دینا ہی مصلحت ہے۔ سورۃ البقرہ آیت ۲۵۱ میں ہے ﴿وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْأَرْضُ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ﴾ (اور اگر یہ بات نہ ہوتی کہ اللہ تعالیٰ بعض آدمیوں کو بعضوں کے ذریعے دفع کرتے ہیں تو زمین فساد سے پُر ہو جاتی، مگر اللہ تعالیٰ جہان والوں پر بڑے فضل والے ہیں) اور سورۃ الحج آیت ۴۰ میں ہے: "اور اگر یہ بات نہ ہوتی کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کو بعض کو بعض کے ذریعہ دفع کرتے ہیں تو (اپنے اپنے زمانہ میں) نصاریٰ کے خلوت خانے اور عبادت خانے اور یہود کے عبادت خانے اور مسلمانوں کی وہ مسجدیں جن میں اللہ تعالیٰ کا نام بکثرت لیا جاتا ہے سب منہدم کر دیئے جاتے۔ بیشک اللہ تعالیٰ اس کی مدد کرے گا جو اللہ کے دین کی مدد کرے گا، بیشک اللہ تعالیٰ قوت والا اور غلبہ والا ہے" اور سورۃ البقرہ آیت ۱۹۳ میں ہے: "ان کے ساتھ اس حد تک لڑو کہ فتنہ نہ رہے" یہی مضمون سورۃ الانفال آیت ۳۹ میں بھی ہے۔ ان تمام آیات میں جنگ کے اسی سبب کی طرف اشارہ ہے۔ غرض جب دین اور دعوت کی راہ میں دشمن رکاوٹ ڈالیں اور اسلام کی راہ میں اڑچن کھڑی کریں اور مسلمانوں کا جینا دوبھر کر دیں تو خلیفہ کے لئے جنگ چھیڑنا ضروری ہو جاتا ہے۔

وإذا وُجد الخليفة، وأحسن السيرة في الأرض، وخضعت له الجبابرة، وانقاد له الملوك: تمّت النعمة، واطمأنّت البلاد والعباد.

واضطر الخليفة إلى إقامة القتال:

[۱] دفعًا للضرر اللاحق لهم من أنفس سَبُعِيَّة: تنهب أموالهم، وتسبي ذراريهم، وتهتك حُرَمَهم؛ وهذه الحاجة هي التي دعت بني إسرائيل إلى أن ﴿ قَالُوا لِنَبِيٍّ لَّهُمُ: ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُّقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ﴾

[۲] وابتداءً، إذا استاءت أنفسٌ شهوية أو سبعية السيرة، وأفسدوا في الأرض، فألهمهم الله سبحانه — إما بلا واسطة، أو بواسطة الأنبياء —: أن يَسْلُبَ شوكتهم، ويقتل منهم من لاسبيل له إلى الإصلاح أصلاً، وهم في نوع الإنسان بمنزلة العضو المتآكل بالأكَلَة؛ وهذه الحاجة هي المشار إليها بقوله تعالى: ﴿وَلَوْلاَ دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ﴾ الآية، وقوله تعالى: ﴿ وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّى لاَتَكُوْنَ فِتْنَةٌ﴾

ترجمہ: اور جب خلیفہ پایا جاتا ہے، اور وہ زمین میں اچھی طرح کام کرتا ہے اور سرکش لوگ اس کے سامنے سرنگوں ہوجاتے ہیں، اور تمام بادشاہ اس کے فرمانبردار ہوجاتے ہیں تو اللہ کی نعمت کامل ہوجاتی ہے۔ اور شہر اور بندے اطمینان کا سانس لیتے ہیں — اور خلیفہ جنگ چھیڑنے کے لئے مجبور ہوتا ہے:

۱— اس ضرر کو ہٹانے کے لئے جو لوگوں کو لاحق ہوتا ہے درندہ خو انسانوں کی طرف سے: جو لوگوں کے اموال لوٹتے ہیں۔ اور ان کے عیال کو گرفتار کرتے ہیں، اور ان کے ناموس کی پردہ دری کرتے ہیں۔ اور یہی وہ ضرورت ہے جس نے بنی اسرائیل کو اس بات کی طرف بلایا کہ: ”انھوں نے اپنے پیغمبر سے درخواست کی کہ ہمارے لئے کوئی بادشاہ مقرر کردیجئے کہ ہم راہِ خدا میں لڑیں“

۲— اور ابتداءً: جب خواہش پرست اور درندہ صفت لوگ بدروی اختیار کرتے ہیں اور زمین میں بگاڑ پھیلاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ (خلیفہ کو) الہام فرماتے ہیں — یا تو بلاواسطہ یا انبیاء کے واسطے — کہ وہ ان شریروں کی شوکت چھین لے، اور ان میں سے ان لوگوں کو قتل کردے جن کی اصلاح کی قطعاً کوئی امید نہیں رہی اور وہ نوعِ انسانی میں سڑا گلے ہوئے ناسور عضو کی طرح ہیں۔ اور یہی ضرورت اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کا مشار الیہ ہے: ”اور اگر اللہ تعالیٰ لوگوں کو بعض کو بعض کے ذریعہ ہٹایا نہ کرتے تو خلوت خانے اور عبادت خانے ڈھادیئے جاتے“ آخر آیت تک پڑھیں اور اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کا کہ: ”اور ان سے لڑو تا آنکہ فتنہ ختم ہوجائے“۔

لغات: الحُرْمة: مالا يحل انتهاكه من ذمة، أو حق، أو صحبة، أو نحو ذلك، والجمع حُرَم (المعجم الوسيط)

خلیفہ اور جنگ

مختلف وجوہ سے خلیفہ کو جنگ سے سابقہ پڑتا ہے۔ اس لئے اس سلسلہ میں آ تھ بنیادی باتیں ملحوظ رکھنی چاہئیں:

① سرکش فرمانرواؤں سے نبرد آزمائی، اور ان کی شان و شوکت کی پامالی، بھاری خزانے اور عظیم افواج کے بغیر ممکن نہیں۔ اس لئے خلیفہ کو ان دونوں چیزوں کی فراہمی کی طرف خاص طور پر متوجہ رہنا چاہئے۔

② دشمن سے کب جنگ مناسب ہے اور کب صلح؟ اور کب ان کو زمینیں دے کر خراج و جزیہ مقرر کرنا بہتر ہے؟ ان تینوں چیزوں کے اسباب کا جاننا خلیفہ کے لئے ضروری ہے — جب کوئی ملک فتح کر کے اس کے باشندوں کو زمینوں پر برقرار رکھا جاتا ہے تو زمین کا جو محصول ان سے لیا جاتا ہے وہ "خراج" کہلاتا ہے۔ اور خود ان غیر مسلموں سے جو سالانہ رقم وصول کی جاتی ہے وہ "جزیہ" کہلاتی ہے۔ نوشیروان کے وقت میں فوجی خدمات سے بچنے والوں سے یہ ٹیکس لیا جاتا تھا۔ اور عہد اسلام میں صرف غیر مسلموں سے لیا جاتا ہے، کیونکہ ان کو بھی فوجی خدمات سے مستثنیٰ رکھا گیا ہے اور اسلامی حکومت غیر مسلم رعایا کی جان، مال اور عزت کی حفاظت کی ذمہ داری لیتی ہے، جو فوج اور پولس کے ذریعہ انجام دی جاتی ہے۔ اس لئے جزیہ کی رقم کا ایک حصہ اس مد میں خرچ کیا جاتا ہے۔

③ جنگ چھیڑنے سے پہلے جنگ کا مقصد متعین کر لینا اہم ہے تا کہ مقصد برآری پر اکتفا کیا جائے اور مقصد سے تجاوز نہ کیا جائے، ورنہ ظلم و زیادتی ہوگی۔ مثال کے طور پر جنگ کے چار مقاصد ہو سکتے ہیں:

(۱) کسی ظلم کے دفعیہ کے لئے جنگ چھیڑی گئی ہے، تو جب ظالم ظلم سے باز آجائے اور اس کا اطمینان ہو جائے تو جنگ بند کر دینی چاہئے۔

(۲) اگر جنگ کا مقصد خبیث فطرت درندہ خو لوگوں کا قلع قمع ہے، جن کی اصلاح کی قطعاً کوئی امید نہیں، تو ان کو بہر حال قتل کرنا چاہئے، اس سے پہلے جنگ نہیں روکنی چاہئے۔

(۳) اگر تمرد و سرکشی کے خبیث لوگوں کی شوکت و سطوت کا خاتمہ کر کے ان کو پچھاڑنا مقصود ہے تو اسی پر اکتفا کرنا چاہئے۔

(۴) اگر زمین میں شر و فساد پھیلانے والوں کو نیست و نابود کرنا مقصود ہے تو ان کے ان سرداروں کو قتل کرنا چاہئے جو ان کے لئے چالیں چلتے ہیں، یا ان کو پابہ زنجیر کر دینا چاہئے، یا ان کے مال و متاع اور آراضی کی قرقی کر لینی چاہئے، یا رعایا کا رخ ان سے پھیر دینا چاہئے تا کہ وہ بے حیثیت ہو کر رہ جائیں۔

④ جنگ کوئی کھیل نہیں۔ جنگ سے زمین ویران، عورتیں بیوہ اور بچے یتیم ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا معمولی مقاصد کے لئے مثلاً مال غنیمت حاصل کرنے کے لئے جنگ چھیڑنا مناسب نہیں، ہم نواؤں کی مختصر جماعت کو دنیا کی چند کوڑیوں کے لئے فنا کر دینا کسی طرح بھی قرین صواب نہیں۔

⑤ خلیفہ کو یہ کام ضرور کرنے چاہئیں: (الف) پبلک کے دلوں کو اپنی طرف مائل کرنا (ب) رعیت میں کون شخص کس درجہ کار آمد ہے؟ اس کو پہچاننا تاکہ خلیفہ کسی سے اس کی حیثیت سے زیادہ توقعات وابستہ نہ کرے (ج) سرداروں اور زیرک وذہین لوگوں کی قدر ومنزلت بڑھانا (د) ترغیب وترہیب کے ذریعہ لوگوں کو جنگ پر ابھارنا۔

⑥ جنگ میں خلیفہ کی اولین توجہ مخالفین کی جمعیت منتشر کرنے کی طرف، ان کی دھار کو کند کرنے کی طرف اور ان کے دلوں کو خوفزدہ کرنے کی طرف ہونی چاہئے تاکہ دشمن خلیفہ کے سامنے دست بستہ حاضر ہوجائیں۔

⑦ جب جنگ میں خلیفہ ظفریاب ہوجائے تو دشمن کے معاملہ میں جنگ سے پہلے اس نے جو خیال قائم کیا تھا اس کو پورا کرے، محض لڑنے کے سبب کو معاف کرکے معاملہ رفع دفع نہ کردے ورنہ ملک کا ذہین عنصر یہ خیال کرے گا کہ خلیفہ نے خواہ مخواہ جنگ لڑی ہے۔

⑧ اگر اندیشہ ہو کہ دشمن دوبارہ شر وفساد پر اتر آئے گا تو ان پر کمرتوڑ خراج اور نابود کرنے والا جزیہ مقرر کرے۔ ان کی کلغیوں کو دھو دے اور ان کو ایسا کرکے رکھ دے کہ وہ پھر سر نہ اٹھا سکیں۔

ولا يتصور للخليفة مقاتلة الملوك الجبابرة، وإزالة شوكتهم إلا بأموال وجمع رجال؛ ولابد في ذلك من معرفة الأسباب المقتضية لكل واحد من القتال، والهدنة، وضرب الخراج، والجزية، وأن يتأمل أولاً مايقصد بالمقاتلة من دفع مظلمة، أو إزهاق أنفس شقية خبيثة لايرجى صلاحها، أو كسر أنفس دونها في الخبث بإزالة شوكتها، أو كسر قوم مفسدين في الأرض: بقتل رءوسهم المدبرين لهم، أو حبسهم، أو حيازة أموالهم وأراضيهم، أو صرف وجوه الرعية عنهم.

ولاينبغي للخليفة أن يقتحم لتحصيل مقصد فيما هو أشدُّ منه، فلا يقصد حيازة الأموال بإفناء جماعة صالحة من المسلمين، ولابد من استمالة قلوب القوم، ومعرفة مبلغ نفع كل واحد، فلا يعتمد على أحد أكثر مما هو فيه، والتنويه بشأن السَّراة والدُّهاة، والتحريض على القتال ترغيبا وترهيبا، وليكن أولُ نظره إلى تفريق جمعهم وتكليل حدِّهم، وإخافة قلوبهم، حتى يتمثلوا بين يديه، لايستطيعون لأنفسهم شيئا؛ فإذا ظفر بذلك فليتحقق فيهم ظنُّه الذي زوَّره قبل الحرب؛ فإن خاف منهم أن يُفسدوا تارة أخرى ألزمهم خراجا مُنْهِكًا، وجزية مستأصلة، وقتل شجعانهم، وجعلهم بحيث لايمكن لهم أن يفعلوا فعلهم ذلك.

ترجمہ: اور خلیفہ کے لئے سرکش بادشاہوں سے جنگ کرنے کا اور ان کے دبدبہ کو توڑنے کا تصور نہیں کیا جاسکتا مگر

خلافت کے لئے ضروری چیزیں

خلیفہ کے لئے ضروری کام درج ذیل ہیں:

اول: چونکہ خلیفہ ایک بڑے ملک کا حاکم ہوتا ہے اس کے ماتحت بے حد مختلف مزاج رکھنے والے عناصر ہوتے ہیں۔ اور وہ ان سب کا محافظ ہوتا ہے اس لئے خلیفہ کو بیدار مغز، عالی دماغ اور ہوشیار رہنا ضروری ہے تاکہ وہ ماتحت ممالک کے نظم کو خلل سے بچا سکے اور ان ممالک کے حکمرانوں اور رعایا میں جو تنازعات پیدا ہوں ان کا مناسب حل نکال سکے، ورنہ خود خلیفہ کی حکومت متزلزل ہو جائے گی۔ اور خلیفہ مملکت میں ہر جانب جاسوس پھیلا دے اور مملکت کے احوال سے پوری طرح باخبر رہے اور جو خبریں اس کو پہنچیں ان میں فراست کاملہ اور قیافہ شناسی سے کام لے اور حکم لگائے۔

دوم: اگر خلیفہ اپنی افواج میں بغاوت کے جراثیم محسوس کرے اور دیکھے کہ اس کی افواج میں کوئی جماعت اس کے خلاف بن رہی ہے تو وہ فوراً اس کے مقابلہ میں ایک اور ایسی ہی جماعت بنائے جو برگشتہ جماعت کا توڑ کر مقابلہ کرے، اور خلیفہ یہ دوسری جماعت ایسے لوگوں کی بنائے جن کا عادۃً پہلی جماعت کے ساتھ موافقت کرنا ممکن نہ ہو۔

سوم: اگر خلیفہ محسوس کرے کہ کوئی دوسرا شخص خلافت کا خواہاں ہے اور وہ اس کے لئے ہاتھ پیر مار رہا ہے تو اس کو قرار واقعی سزا دے، اس کی شوکت وسطوت کو توڑ دے اور اس کی قوت کو پامال کر دے، جب تک خلیفہ یہ سب کر لے چین سے نہ بیٹھے۔

چہارم: خلیفہ اپنی اطاعت اور خیر خواہی کو لوگوں پر لازم کرے، اور اس سلسلہ میں محض زبانی قبول کرنے پر اکتفاء نہ کرے، بلکہ اس قبولیت کے لئے کوئی ظاہری علامت مقرر کرے، جس سے لوگوں کی اطاعت کا پتہ چلے اور اس کی خلاف ورزی کی صورت میں رعایا سے داروگیر کرے، مثلاً جمعہ وعیدین کے خطبوں میں خلیفہ کے لئے دعا کرنا اور بڑے اجتماعات میں خلیفہ کی رفعت شان کا اظہار کرنا۔

پنجم: خلافت کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ کسی خاص ہیئت کا لوگوں کو خوگر بنائے۔ مثلاً سرکاری نشان کا نمود (Show) اور کرنسی، پاسپورٹ وغیرہ پر اتفاق کرنا وغیرہ۔

ولما كان الخليفة حافظا لصحة مزاج جامع من أخلاط متشاكسة جدا، وجب أن يكون متيقظا، ويبعث عيونا في كل ناحية، ويستعمل فراسة نافذة، وإذا رأى اجتماعا منعقدا من عسكره فلا صبر دون أن ينصب اجتماعا آخر مثله ممن تحيل العادة تواطؤهم معهم؛ وإذا رأى من رجل التماس الخلافة فلا صبر دون إفناء جزئه، وإزالة شركه، وإضعاف قوته؛ ولابد أن يجعل قبول أمره والاتفاق على مناصحته سنة مسلمة عندهم. ولا يكفي في ذلك مجرد القبول، بل لابد من أمارة ظاهرة للقبول، بها يؤاخذ الرعية، كالدعاء له، والتنويه بشأنه في الاجتماعات

العظيمة، وأن يوطنوا أنفسهم على زي وهيئة أمر بها الخليفة، كالاصطلاح على الدنانير المنقوشة باسم الخليفة في زماننا، والله أعلم

ترجمہ: اور جب خلیفہ جیسے مزاج کی درستی کا محافظ ہے جو بہت ہی زیادہ متضاد عناصر سے مرکب ہے تو ضروری ہے کہ وہ بیدار مغز ہو اور ملک کے ہر کونے میں جاسوس بھیجے اور فراست کامل استعمال کرے —— اور جب دیکھے اس کی افواج ہی سے کوئی جماعت اس کے خلاف بن رہی ہے تو اس وقت تک آرام سے نہ بیٹھے جب تک کہ اس کے مقابلہ میں ایک اور ایسی جماعت نہ بنالے ان لوگوں میں سے جن کا عادۃً مخالفین کے ساتھ اتفاق کرلینا محال ہو —— اور جب خلیفہ دیکھے کہ کوئی دوسرا شخص خلافت کا خواہاں ہے تو چین سے نہ بیٹھے جب تک اس کو قرار واقعی سزا نہ دے لے اور اس کا دبدبہ توڑ نہ دے اور اس کی قوت کو کمزور نہ کردے —— اور ضروری ہے کہ خلیفہ اپنے حکم کے قبول کرنے کو اور اپنی خیر خواہی پر لوگوں کے اتفاق کرنے کو لوگوں کے نزدیک ''لازمی طریقہ'' بنائے۔ اور اس مسئلہ میں محض زبانی قبول کرنا کافی نہیں، بلکہ قبولیت کی کوئی ظاہری علامت بھی ضروری ہے، جس کے ذریعہ موافق و ناموافق کو تمیز کرسکے۔ جیسے خلیفہ کے لئے دعا کرنا اور بڑے اجتماعات میں اس کی شان کی بلندی کا اظہار کرنا —— اور یہ (بھی ضروری ہے) کہ لوگ خود کو کسی ایسی شکل اور ہیئت کا خوگر بنائیں، جس کا خلیفہ نے حکم دیا ہے، جیسے ہمارے زمانہ میں لوگوں کا ان اشرفیوں پر اتفاق کرنا جن پر خلیفہ کا نام کندہ ہوتا ہے۔ باقی اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں۔

لغات:

تَشَاكَسَهُ أي خالفه. تَشَاكَسَ القومُ: باہم مخالفت کرنا کہا جاتا ہے الليلُ والنهارُ يتشاكسان: دن اور رات ایک دوسرے کی ضد ہیں ... واطَأَهُ مُوَاطَأَةً: موافقت کرنا ... أَيْفَاءٌ: پورا دینا ... سُنَّةٌ مُسَلَّمَةٌ: مفعول ثانی ہے يجعل کا ... الزِيُّ یہاں هيئة کا مترادف ہے بمعنی پوشاک نہیں ہے۔

باب —— ۱۰

ارتفاقات کی بنیادی باتیں متفق علیہ ہیں

ارتفاقات اربعہ کا بیان مکمل ہو چکا۔ اب دو عام باب ہیں، جن کا تعلق چاروں ارتفاقات سے ہے۔ اس پہلے باب میں یہ مضمون ہے کہ ارتفاقات کی بنیادی باتیں متفق علیہ ہیں، گو فروعات اور رسوم میں اختلاف ہے۔ اور اس اتفاق کی وجہ بیان کی ہے کہ یہ ارتفاقات فطری امور ہیں اس لئے ان میں اختلاف نہیں۔ اور اس دعوی پر جو اشکالات وارد ہوتے ہیں ان کا جواب دیا ہے۔

پہلے اصول اور رسوم میں فرق سمجھ لینا چاہئے: اصول از قبیل معنویات ہیں اور رسوم (اصول کی) ممثل صورتیں (ان کے پیکر) ہائے محسوس ہیں یعنی رسوم افعالِ ظاہرہ ہیں جو معنویات پر دلالت کرتے ہیں۔ مثلاً "نکاح" ارتفاق کے اصولوں میں سے ایک اصل ہے اور معنوی چیز ہے اور اس کا طریقہ مثلاً ایجاب وقبول، گواہ، لوگوں کا اجتماع اور دعوتِ ولیمہ وغیرہ رسوم (ریت رواج) ہیں جو نکاح پر دلالت کرتے ہیں۔ اسی طرح مُردوں کی تعزیت کا ارادہ اور ان کے جسم کو چھپانا ارتفاق کے اصولوں میں سے ایک اصل ہے اور دفن کرنا وغیرہ رسوم ہیں اس کی تعبیر۔

اس کے بعد جاننا چاہئے کہ کوئی بھی انسانی معاشرہ ارتفاقات سے خالی نہیں ہوسکتا۔ آبادی یا کسی بھی بستی میں اور معتدل مزاج اور اخلاقِ فاضلہ کی حامل برادری میں ارتفاقات کا وجود ضروری ہے۔ عہدِ آدم سے قیامِ قیامت تک یہی صورت چلی آرہی ہے اور چلتی رہے گی۔ فرض کرو ایک انسان کسی ایسے بیابان میں پیدا ہوتا ہے اور پلتا بڑھتا ہے جو انسانی آبادی سے بہت دور ہے اور اس نے کسی سے زندگی کی کوئی ریت نہیں سیکھی۔ اس کو بھی یقیناً کچھ ضرورتیں پیش آئیں گی۔ جیسے بھوک، پیاس اور خواہشِ نفس وغیرہ۔ اور وہ ضرور کسی عورت کا مشتاق ہوگا۔ اور جب مرد وزن یکجا ہوں گے تو ان کے یہاں اولاد بھی ہوگی۔ اور رفتہ رفتہ بہت سے گھر آباد ہوجائیں گے۔ پھر ان میں باہمی معاملات ہوں گے تو ارتفاقِ اول اپنی تمام تفصیلات کے ساتھ منظم ہوجائے گا۔ پھر جب لوگوں کی کثرت ہوگی تو ضروری ہوگا کہ ان میں ایسے اخلاقِ فاضلہ رکھنے والے لوگ پیدا ہوں جن میں مختلف قسم کے واقعات رونما ہوں جن کی وجہ سے بقیہ تمام ارتفاقات بھی معرضِ وجود میں آجائیں گے۔

اس کے بعد جاننا چاہئے کہ ارتفاقات کی اصولی اور بنیادی باتیں ہمیشہ مسلّم اور متفق علیہ رہی ہیں۔ کبھی ان میں اختلاف نہیں ہوا۔ جمہور ہمیشہ ان لوگوں پر سخت نکیر کرتے رہے ہیں جو ارتفاقات کی خلاف ورزی کرتے ہیں مثلاً نکاح نہیں کرتے، مُردوں کی لاشوں کو چھپاتے نہیں، ننگے پھرتے ہیں، کھانا نہیں کھاتے، بس درختوں کا چھلکا کھاتے ہیں وغیرہ اور لوگ ارتفاقات کو نہایت شہرت کی وجہ سے بدیہی امور سمجھتے ہیں اور دلائل سے ثابت نہیں کرتے، صرف تنبیہ کافی ہوتی ہے۔

اس کے بعد جاننا چاہئے کہ ارتفاقات کے بارے میں یہ گمان کرنا کہ دنیا جہاں کے لوگ خواہ مخواہ (بلا کسی وجہ) کے ان باتوں پر متفق ہوگئے ہیں، ایسا ہے جیسا مشرق ومغرب کے تمام لوگ ایک غذا پر متفق ہوجائیں اور کوئی کہے کہ یہ اتفاق خواہ مخواہ بلا وجہ ہے۔ بھلا اس سے بڑا مغالطہ اور کیا ہوسکتا ہے؟ بغیر کسی وجہ کے یہ بات ممکن نہیں کہ دنیا کے سب لوگ ایک غذا پر متفق ہوجائیں۔ اسی طرح ارتفاقات پر اتفاق بھی بلا وجہ نہیں ہوسکتا۔ مزاجوں کے تنوع، ممالک کے بُعد اور مذاہب کے اختلاف کے ساتھ ارتفاقات پر کسی وجہ ہی سے اتفاق ہوسکتا ہے یہی فطرتِ سلیمہ کا فیصلہ ہے۔

اور ارتفاقات پر لوگوں کا اتفاق تین وجوہ سے ہوتا ہے:

اول: ارتفاقات انسان کی صورتِ نوعیہ کا تقاضا ہیں۔ لوگوں کو ان سے فطری مناسبت ہے، کیونکہ اعمال وافعال

صورتِ نوعیہ میں بھرے ہوئے ہوتے ہیں۔ پھر وہ افراد میں آتے ہیں۔ جب وہ خارج میں پائے جاتے ہیں۔ وہ ان کے تمام افراد کی فطرت ایک ہوتی ہے، اس وجہ سے امورِ ارتفاقیہ پر لوگوں کا اتفاق ہو گیا ہے۔

دوم: ارتفاقات کی بنیاد ایسی بکثرت پیش آنے والی حاجتیں ہیں جن پر نوعِ انسانی کے افراد متفق ہیں، کوئی فرد ان حاجتوں سے خالی نہیں، جیسے کھانا پینا وغیرہ۔ اور جب حاجتیں عام ہیں تو ان کی تکمیل کی تدبیرات بھی عام ہوں گی۔ اس وجہ سے لوگ ارتفاقات پر متفق ہیں۔

سوم: ارتفاقات کی بنیاد ایسے اخلاق و ملکات ہیں جن کو نوعی مزاج افراد کے مزاج میں ثابت کرتی ہے، یعنی جب نوع کے افراد کے قویٰ، حس وغیرہ درست ہوں تو وہ افراد میں کچھ اخلاق و ملکات پیدا کرتے ہیں، جن سے اعمال صادر ہوتے ہیں، جو ارتفاقات کی بنیاد بنتے ہیں، اور نوعی اخلاق ہمیشہ یکساں ہوتے ہیں، اس لئے ان سے پھوٹنے والے اعمال میں بھی یکسانیت ہوتی ہے۔ وہی اعمال اتفاق کی اساس (Base) ہیں، اس وجہ سے لوگ ارتفاقات پر اتفاق رکھتے ہیں۔

سوال: (۱) ارتفاقات میں لوگوں کا اتفاق کہاں ہے؟ کوئی مردوں کو دفن کرنا پسند کرتا ہے، کوئی آگ میں جلاتا، کوئی نکاح میں گواہوں کو اور ایجاب وقبول کو ضروری قرار دیتا ہے، کوئی باجا گانا، سجاوٹ اور آرائش کو کافی سمجھتا ہے، کوئی زانی کو رجم کرتا ہے، اور چور کا ہاتھ کاٹتا ہے، اور کوئی دو تین سال تک قید اور بھاری جرمانے کو کافی سمجھتا ہے!

جواب: یہ ارتفاقات کے اصول (بنیادی باتیں) نہیں ہیں، بلکہ رسوم (شکلیں، صورتیں اور ریت رواج) ہیں۔ اصول: مردوں کی بدبو کو دور کرنا اور ان کا ستر چھپانا، نکاح کی تشہیر کرنا اور یوں اس کو زنا سے ممتاز کرنا اور زانیوں اور چوروں کی سزا کو ضروری سمجھنا ہیں۔ اور ان پر سب لوگوں کا اتفاق ہے۔ اختلاف جو کچھ ہے وہ ارتفاقات کی شکلوں میں اور جزئیات میں ہے اور ہم نے دعویٰ اصول میں اتفاق کا کیا ہے، رسوم میں نہیں!

سوال: (۲) ارتفاقات میں لوگوں کا اتفاق کہاں ہے؟ احمق لوگ کسی طریقہ کی پابندی نہیں کرتے، یہی حال فساق وفجار کا ہے، پھر سب کا اتفاق کہاں؟

جواب: احمق تو حیوانات کی طرح ہیں۔ سب کے نزدیک ان کا مزاج ناقص اور ان کی عقلیں ناکارہ ہیں۔ اور ان کی حماقت کی دلیل یہی ہے کہ وہ اپنے آپ کو ارتفاقات کا پابند نہیں سمجھتے — رہے بدکار لوگ تو اگر ان کے دل ٹٹولے جائیں تو معلوم ہوگا کہ وہ ارتفاقات کے معتقد ہیں، مگر ان پر خواہشِ نفس غالب آجاتی ہے، اس وجہ سے وہ ارتفاقات کی خلاف ورزی کرتے ہیں، مگر وہ اپنے دل کی تہہ میں ان کاموں کو بدکاری سمجھتے ہیں۔ وہ لوگ اوروں کی بیٹیوں اور بہنوں کے ساتھ بدکاری کرتے ہیں، لیکن اگر ان کی بیٹیوں اور بہنوں کے ساتھ یہ حرکت کی جائے تو وہ غیظ وغضب سے پھٹ پڑتے ہیں، حالانکہ وہ لوگ اچھی طرح جانتے ہیں کہ اس جرم کے ارتکاب سے جو صدمہ اور رنج انہیں ہوتا ہے وہی دوسروں کو بھی

ہوتا ہے۔ نیز وہ یہ بات بھی جانتے ہیں کہ اس قسم کی بدکاریوں سے نظامِ مملکت درہم برہم ہوجاتا ہے۔ مگر خواہش ان کو اندھا کر دیتی ہے یہی حال چوری، غصب وغیرہ برائیوں کا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ یہ لوگ ارتفاقات سے متفق ہیں مگر ان پر عمل پیرا نہیں۔

نوٹ: اس باب کی تقریر بہ ترتیب بدل کر کی گئی ہے قارئین کرام عربی متن سے تطبیق کے وقت اس کا خیال رکھیں۔

﴿باب اتفاق الناس على أصول الارتفاقات﴾

اعلم أن الارتفاقات لا تخلو عنها مدينة من الأقاليم المعمورة، ولا أمة من الأمم أهل الأمزجة المعتدلة والأخلاق الفاضلة، من لدن آدم عليه السلام إلى يوم القيامة، وأصولها مسلّمة عند الكل، قرناً بعد قرن، وطبقة بعد طبقة، لم يزالوا ينكرون على من عصاها أشد نكير، ويرونها أموراً بديهية من شدة شهرتها.

ولا يصدنّك عما ذكرنا اختلافهم في صُوَر الارتفاقات وفروعها، فاتفقوا مثلاً على إزالة نتن الموتى وستر سوآتهم، ثم اختلفوا في الصور: فاختار بعضهم الدفن في الأرض، وبعضهم الحرق بالنار؛ واتفقوا على تشهير أمر النكاح وتمييزه عن السفاح على رءوس الأشهاد، ثم اختلفوا في الصور: فاختار بعضهم الشهود، والإيجاب والقبول، والوليمة، وبعضهم الدُّفّ والغناء، ولُبْس ثياب فاخرة، لا تُلبس إلا في الولائم الكبيرة؛ واتفقوا على زجر الزُّناة والسُّرّاق، ثم اختلفوا: فاختار بعضهم الرجم، وقطع اليد، وبعضهم الضرب الأليم، والحبس الوجيع، والغرامات المُنْهِكة.

ولا يصدنّك أيضاً مخالفة طائفتين:

أحدهما: البُلْه الملتحقون بالبهائم، ممن لا يشك الجمهور أن أمزجتهم ناقصة، وعقولهم مُخْدَجة، وصاروا يستدلون على بلاهتهم بما يرون من عدم تقييدهم أنفسهم بتلك القيود.

والثانية: الفُجّار الذين لو نُقِّح ما في قلوبهم ظهر أنهم يعتقدون الارتفاقات، لكن تغلب عليهم الشهوات، فيصيرون بها شاهدين على أنفسهم بالفجور، ويريدون بنات الناس وأخواتهم، ولو زُني ببناتهم وأخواتهم كادوا يتميزون من الغيظ، ويعلمون قطعاً أن الناس يصيبهم ما أصابهم أولاً، وأن إصابة هذه الأمور مُخِلّة بانتظام المدينة، لكن يُعميهم الهوى؛ وكذلك الكلام في السرقة، والغصب، وغيرهما.

ولا ينبغي أن يُظن أنهم اتفقوا على ذلك من غير شيء، بمنزلة الاتفاق على أن يتغدى بطعام واحد

أهلُ المشارق والمغارب كلهم، وهل سفسطة أشدُّ من ذلك؟ بل الفطر السليمة حاكمة بأن الناس لم يتفقوا عليها، مع اختلاف أمزجتهم، وتباعد بلدانهم، وتشتت مذاهبهم وأديانهم، إلا لمناسبة فطرية منشعبة من الصورة النوعية، ومن حاجات كثيرة الوقوع، يتوارد عليها أفرادُ النوع، ومن أخلاق توجبها الصحةُ النوعية في أمزجة الأفراد

ولو أن إنسانا نشأ ببادية نائية عن البلدان، ولم يتعلم من أحد رسما، لكان له لا جرم حاجاتٌ من الجوع، والعطش، والغلمة، واشتاق لا محالة إلى امرأة، ولا بد عند صحة مزاجهما أن يتولد بينهما أولادٌ، وينضمّ أهلُ أبيات، وينشأ فيهم معاملاتٌ، فينتظم الارتفاق الأول عن آخره، ثم إذا كثُروا لابد أن يكون فيهم أهلُ أخلاق فاضلة، تقع فيهم وقائع، تُوجب سائر الارتفاقات، والله أعلم.

ترجمہ: ارتفاقات کے اصولوں پر لوگوں کے اتفاق کا بیان: جان لیں کہ ارتفاقات سے خالی نہیں آبادعالم کا کوئی شہر اور نہ معتدل مزاج اور اخلاق عالیہ رکھنے والی امتوں میں سے کوئی امت، آدم علیہ السلام کے وقت سے قیامت کے آنے تک۔ اور ارتفاقات کی بنیادیں، تمام قرنوں بعد قرن اور طبقہ بعد طبقہ سب کے نزدیک تسلیم شدہ ہیں۔ لوگ برابر سخت نکیر کرتے رہتے ہیں ان لوگوں پر جو ارتفاقات کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔ اور لوگ ارتفاقات کو ان کے نہایت مشہور ہونے کی وجہ سے بدیہی چیزیں سمجھتے ہیں۔

اور ہرگز نہ روکے آپ کو ان باتوں کے تسلیم کرنے سے جو ہم نے ذکر کیں لوگوں کا ارتفاقات کی شکلوں اور جزئیات میں اختلاف کرنا۔ پس لوگ متفق ہیں مثلاً مردوں کی عفونت دور کرنے پر اور ان کے ستر کو چھپانے پر، پھر اس کی شکلوں میں لوگوں میں اختلاف ہے، بعض زمین میں دفن کرنا پسند کرتے ہیں، اور بعض آگ میں جلانا پسند کرتے ہیں۔ اور لوگ نکاح کے معاملہ کی تشہیر کرنے پر اور گواہوں کے روبرو نکاح کو زنا سے ممتاز کرنے پر متفق ہیں۔ پھر اس کی شکلوں میں اختلاف ہے بعض لوگ گواہوں کو اور ایجاب وقبول کو اور دعوت ولیمہ کو پسند کرتے ہیں۔ اور بعض لوگ دف (ڈفلی) اور گانے کو اور ایسے ملبوسات فاخرہ کو پسند کرتے ہیں جو بڑی تقریبات ہی میں پہنا جاتا ہے۔ اور لوگ زانیوں اور چوروں کو سزا دینے پر متفق ہیں، پھر ان میں اختلاف ہے، بعض سنگسار کرنے اور ہاتھ کاٹنے کو پسند کرتے ہیں، اور بعض دردناک مار، اور قید بامشقت اور کڑوی زہریلی باتوں کو پسند کرتے ہیں۔

اور نیز ہرگز نہ روکے آپ کو دو جماعتوں کی مخالفت:

اول: احمق لوگ، جو جانوروں کے ساتھ ملتے جلتے ہیں۔ وہ ان لوگوں میں سے ہیں کہ عام لوگوں کو اس میں ذرا شک نہیں کہ ان کے مزاج ناقص اور ان کی عقلیں ادھوری ہیں۔ اور عام لوگ ان کی بے وقوفی پر اسی بات سے استدلال

کرتے ہیں جو وہ دیکھتے ہیں یعنی ان کا خود کو ان قیود (ارتفاقات اور ان کے طریقوں) کا پابند کرنا۔

اور دوم: بدکار لوگ جن کے دلوں کی اگر تفتیش و تحقیق کی جائے تو پتہ چلے گا کہ وہ ارتفاقات کے قائل ہیں مگر ان پر شہوت غالب آجاتی ہے پس وہ ارتفاقات کی خلاف ورزی کرتے ہیں درانحالیکہ وہ اپنے اوپر بدکاری کا اقرار کر رہے ہیں (یعنی وہ ان کاموں کو بدکاری سمجھتے ہوئے کرتے ہیں) اور وہ لوگوں کی بیٹیوں اور بہنوں کے ساتھ زنا کرتے ہیں اور اگر ان کی بیٹیوں اور بہنوں کے ساتھ زنا کیا جائے تو وہ قریب ہیں کہ غصہ سے پھٹ پڑیں۔ اور وہ خوب جانتے ہیں کہ دوسرے لوگوں کو بھی وہ صدمہ پہنچتا ہے جو ان کو پہنچتا ہے، اور وہ یہ بات بھی جانتے ہیں کہ ان کاموں کا کرنا نظام مملکت کو درہم برہم کرتا ہے مگر خواہش ان کو اندھا کر دیتی ہے۔ اور اسی طرح چوری اور غصب اور ان کے علاوہ جرائم میں گفتگو ہے۔

اور مناسب نہیں ہے کہ گمان کیا جائے کہ لوگ اس بات (ارتفاقات) پر بغیر کسی سبب کے متفق ہو گئے ہیں، جیسے مشرق و مغرب کے تمام لوگوں کا اس بات پر اتفاق کرنا کہ وہ کوئی ایک غذا استعمال کریں۔ اور کیا اس سے بڑا بھی کوئی مغالطہ ہو سکتا ہے؟ بلکہ فطرت سلیمہ فیصلہ کرتی ہے کہ لوگ اس چیز (ارتفاقات) پر متفق نہیں ہوئے، ان کے مزاجوں کے اختلاف کے ساتھ، اور ان کے ممالک کے دور دراز ہونے کے ساتھ، اور ان کے مسالک و مذاہب کے مختلف ہونے کے ساتھ مگر ۱:- کسی فطری مناسبت کی وجہ سے جو صورت نوعیہ سے پھوٹنے والی ہے ۲:- اور ایسی کثیر الوقوع ضروریات کی وجہ سے جن پر نوع انسانی کے افراد متفق ہیں ۳:- اور ایسے اخلاق و ملکات کی وجہ سے جن کو نوعی درستی افراد کے مزاج میں ثابت کرتی ہے۔

اور اگر یہ بات ہو کہ کوئی انسان کسی ایسے بیابان میں پروان چڑھا ہو جو شہروں سے دور ہو، اور اس نے کسی سے کوئی ریت نہ سیکھی ہو تو اس کے لئے بھی یقینی بات ہے کہ کچھ ضرورتیں ہوں گی، جیسے بھوک، پیاس اور شہوت۔ اور وہ لامحالہ کسی عورت کا مشتاق ہوگا۔ اور مرد و زن کے مزاج کی درستی کی صورت میں ضروری ہے کہ ان دونوں کے درمیان اولاد ہو۔ اور متعدد گھرانے باہم ملیں اور ان میں معاملات وجود میں آئیں، پس ارتفاق اول اس کے سارے اجزاء کے ساتھ منظم ہو جائے گا۔ پھر جب لوگ زیادہ ہو جائیں گے تو ضروری ہے کہ ان میں ایسے اخلاق فاضلہ والے لوگ پائے جائیں جن میں (مختلف قسم کے) واقعات رونما ہوں، جو باقی (تینوں) ارتفاقات کو ثابت کریں۔ باقی اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں۔

لغات:

البُلْه: بے وقوف، ضعیف العقل، مفرد الأبله، مؤنث بلهاء فعل بَلِهَ (س) بَلَهًا وبَلاهةً: ضعیف العقل ہونا.....

السفسطة: وہ استدلال و قیاس جس کی غرض مغالطہ دہی ہو۔ النائي: دور، مؤنث نائية فعل نأى ينأى نأيًا، دور ہونا.. عن آخره معنى جميعًا ہے یعنی ارتفاق اول مع اس کی تمام جزئیات کے۔

باب — ۱۱

لوگوں میں رائج طور وطریق کا بیان

رُسُوم: رَسْم کی جمع ہے جس کے معنی ہیں: طور وطریق، ریت، رواج اور عام معاملات، خواہ اچھے ہوں یا برے۔ اردو میں برے رواجوں کو رسوم کہتے ہیں۔ مگر عربی میں یہ لفظ عام ہے۔ اس باب میں بھی عام معنی مراد ہیں۔

ارتفاقات ایک معنوی چیز ہیں، خارج میں ان کا وجود نہیں۔ خارج میں "رسوم" پائی جاتی ہیں۔ وہی ارتفاقات کے مَظہر یعنی محسوس ہیں یعنی لوگوں میں جو طور وطریق رائج ہیں وہی ارتفاقات (مفید تدبیریں) ہیں۔ اس لئے اس آخری باب میں رسوم کی تفصیلات بیان کی جارہی ہیں۔

رسوم کی اہمیت: لوگوں میں جو طور وطریق رائج ہوتے ہیں، ارتفاقات میں ان کی حیثیت وہی ہے جو بدن انسانی میں دل کی ہے۔ دل پر زندگی کا مدار ہے۔ دل سنورتا ہے تو سارا جسم سنور جاتا ہے اور دل بگڑتا ہے تو سارا جسم اور اس کے تمام احوال بگڑ جاتے ہیں۔ اسی طرح رسوم ہی ارتفاقات کی بنیاد ہیں۔ معاشرہ میں رائج طور وطریق ہی سے ارتفاقات کا ڈھانچہ تیار ہوتا ہے اور اچھے طور وطریق سے معاشرہ شاندار بنتا ہے اور طور وطریق بگڑ جائیں تو معاشرہ بدنما ہو جاتا ہے۔ اللہ کی شریعتیں بھی اولاً اور بالذات رسوم ہی کو پیش نظر رکھتی ہیں۔ انبیائے کرام انہی کی اصلاح وتعدیل کرتے ہیں۔ قوانین شرعیہ میں بھی انہی سے بحث ہوتی ہے اور نصوص میں بھی انہی کی طرف اشارے آتے ہیں۔ اس کی کچھ تفصیل مبحث ساوس باب (۱۱) میں آئے گی۔

رسوم کے اسباب: لوگوں میں رائج رسوم چند اسباب سے پیدا ہوتی ہیں مثلاً:

(۱) وہ ریت دانشمندوں نے چلائی ہے، جیسے دیت کے اونٹ دس سے سو حضرت عبدالمطلب نے کئے تھے اور قسامہ کا طریقہ ابوطالب نے چلایا تھا۔ ان دونوں طریقوں کو شریعت نے برقرار رکھا (مبحث ۶ باب ۱۱)

(۲) وہ ریت اللہ تعالیٰ نے اپنے نیک بندوں کے دل میں الہام کی ہے، جیسے ہندوستان پر انگریزوں کے قبضہ کے بعد اس زمانہ کے اہل اللہ کے دلوں میں اللہ تعالیٰ نے الہام فرمایا کہ: "چندے کے مدرسے" قائم کئے جائیں، انہی سے دین کی حفاظت ہوگی۔ چنانچہ شدہ شدہ لاکھوں مدارس، مکاتب اور جامعات و دارالعلوم قائم ہو گئے اور ملک اسپین اور روس کی مثال بننے سے بچ گیا۔

اور چند اسباب کی وجہ سے رسوم لوگوں میں پھیلتی ہیں، مثلاً:

(۱) وہ ریت کسی ایسے بڑے بادشاہ کی چلائی ہوئی ہوتی ہے جس کی عظمت وسطوت کے سامنے لوگوں کی گردنیں

بھی ہوئی ہوتی ہیں، اس لئے لوگ تیزی سے وہ طریقہ اپنا لیتے ہیں، جیسے عشر و خراج کا طریقہ نوشیرواں عادل نے چلایا تھا۔ اسلام نے بکچھ ترمیم کے ساتھ اس کو باقی رکھا ہے۔ (مبحث ۶ باب ۱۱)

(۲) لوگ اپنے دلوں میں اجمالاً ایک ضرورت محسوس کرتے ہیں، پھر کوئی ایسا طریقہ نکل آتا ہے جو اس اجمال کی تفصیل ہوتا ہے تو لوگوں کے دل گواہی دیتے ہیں کہ یہ "اچھا طریقہ" ہے، اس لئے لوگ اس کو قلبی شہادت سے قبول کرلیتے ہیں اور وہ طریقہ چل پڑتا ہے، جیسے قلم سے لکھنے اور کپڑے سینے کا طریقہ حضرت ادریس علیہ السلام سے چلا ہے۔ لوگ پہلے سے ضرورت محسوس کرتے تھے کہ کوئی ایسا طریقہ ہونا چاہئے کہ بولے بغیر مافی الضمیر سمجھایا جاسکے، اور موجودین کے علاوہ غیر موجودین تک بھی بات پہنچائی جاسکے، اور چادریں لپیٹنے کے بجائے کپڑوں کو بدن کے مطابق سی کر پہنا جائے مگر کوئی طریقہ سمجھ میں نہیں آتا تھا، جب حضرت ادریس علیہ السلام نے یہ دونوں طریقے رائج کئے تو لوگوں نے ان کو اچھا سمجھ کر فوراً اپنا لیا اور وہ طریقے لوگوں میں رائج ہوگئے (فتح الباری ۳: ۲۲۶ بحوالہ لغات القرآن ۱: ۵۳)

اور کچھ اسباب کی وجہ سے لوگ رسوم کو دانتوں سے مضبوط پکڑتے ہیں، مثلاً:

(۱) لوگوں کو بار بار تجربہ ہوتا ہے کہ جب کوئی ریت جان بوجھ کر یا بھول کر چھوڑ دی جاتی ہے تو قدرت کی طرف سے سزا ملتی ہے، اس لئے لوگ سزا سے بچنے کے لئے وہ ریت ضرور پوری کرتے ہیں۔ مثلاً بھوگ (دیوتاؤں کا چڑھاوا) دینے کی بنیاد یہی ہے۔ مصریوں کو بار بار کا تجربہ ہوا کہ سال کی معین تاریخ میں ایک دوشیزہ دریائے نیل میں نہیں ڈالی جاتی تھی تو دریا کی سطح گھٹ جاتی تھی اور نہریں خشک ہوجاتی تھیں، جس سے فصلیں تباہ ہوجاتی تھیں، چنانچہ وہ یہ رسم پابندی سے پوری کرتے تھے۔ طلوعِ اسلام کے بعد حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے نامۂ مبارک بنام دریائے نیل سے یہ شیطانی حرکت موقوف ہوئی۔

یا جیسے بعض جاہلوں کو بار بار کا تجربہ ہوتا ہے کہ اگر وہ "میلادِ مروجہ" نہیں کراتے تو جان یا مال میں نقصان ہوجاتا ہے یا کسی ولی کی قبر پر حاضری نہیں دیتے تو نقصان کا سامنا کرنا پڑتا ہے، چنانچہ وہ یہ بدعات وخرافات ضرور کرتے ہیں یاد رکھنا چاہئے کہ یہ بھی شیطانی حرکات اور قدرت کی طرف سے آزمائش ہے۔ اور دین وہ ہے جو اللہ نے بھیجا ہے، جو آج ہمارے پاس قرآن وحدیث کی شکل میں موجود ہے، باقی سب بکواس ہے۔

(۲) کسی ریت سے غفلت برتنے پر کسی بگاڑ کا پیدا ہونا۔ جیسے نکاح کا معروف طریقہ اختیار نہ کیا جائے تو بڑا بگاڑ پیدا ہوگا اس لئے لوگ شادی بیاہ کے طریقہ کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے ہیں۔

(۳) وہ ریت ایسی ہے جس کے ترک پر سمجھدار لوگوں نے یعنی انبیاء اور علماء نے سخت ملامت کی ہے، اس لئے لوگ اس کو مضبوطی سے پکڑتے ہیں، جیسے تمام اسلامی طریقے انبیاء کے چلائے ہوئے ہیں اور شرعاً ان کے ترک کی گنجائش نہیں، اس لئے دیندار لوگ وہ ریتیں مضبوط پکڑے رہتے ہیں۔

اور مفکر و بصیر آدمی مذکورہ باتوں کی ان کی نظائر سے تصدیق کرے گا یعنی مختلف ملکوں میں جو طریقے وجود میں آتے رہتے ہیں اور مٹتے رہتے ہیں وہ مذکورہ رسوم کی نظائر ہیں۔ ان پر نظر ڈال کر کوئی دانا آدمی شاہ صاحب رحمہ اللہ کی باتوں کی تصدیق کر سکتا ہے۔

﴿باب الرسوم السائرة في الناس﴾

اعلم أن الرسوم من الارتفاقات هي بمنزلة القلب من جسد الإنسان، وإياها قصدت الشرائعُ أولاً وبالذات، وعنها البحثُ في النواميس الإلهية، وإليها الإشارات؛ ولها:

أسبابٌ: تنشأ منها، كاستنباط الحكماء، وكإلهام الحق في قلوب المؤيَّدين بالنور الملكي.

وأسباب: تنتشر بها في الناس، مثلُ كونها سنةَ ملِكٍ كبيرٍ، دانت له الرقابُ، أو كونها تفصيلاً لما يجده الناس في صدورهم، فيتلقَّونها بشهادة قلوبهم.

وأسباب: يَعَضُّون عليها بالنواجذ لأجلها: من تجربة مجازاةٍ غيبيَّةٍ على إهمالها، أو وقوعِ فسادٍ في إغفالها، وكملامة أهل الآراء الراشدة اللائمةِ على تركها، ونحوِ ذلك.

والمستبصر ربما يؤول لتصديق ذلك، من إحياء سُنَنٍ زاغت بها في كثير من البلدان، بنظائر ما ذكرنا.

ترجمہ: جان لیں کہ رسوم کو ارتفاقات میں وہی حیثیت حاصل ہے جو جسم انسانی میں دل کو حاصل ہے۔ اور انہی کا اللہ کی شریعتیں اولاً اور بالذات ارادہ کرتی ہیں۔ اور انہی سے قوانین شرعیہ میں بحث کی جاتی ہے، اور انہی کی طرف اشارے ہیں —— اور ان کے لئے:

کچھ اسباب ہیں جن سے وہ پیدا ہوتی ہیں، جیسے دانشمندوں کا نکالنا۔ اور جیسے اللہ تعالیٰ کا الہام فرمانا اُن لوگوں کے دلوں میں جو نور ملکی سے مؤید ہیں۔

اور کچھ اسباب ہیں جن کی وجہ سے وہ لوگوں میں پھیلتی ہیں، جیسے ان کا کسی بڑے بادشاہ کا طریقہ ہونا، جس کے سامنے گردنیں جھکی ہوئی ہیں۔ یا ان کا تفصیل ہونا اس بات کی جس کو لوگ (بطور اجمال) اپنے سینوں میں پاتے ہیں، پس لوگ ان کو دلی شہادت سے قبول کر لیتے ہیں۔

اور کچھ اسباب ہیں جن کی وجہ سے لوگ ان کو ڈاڑھوں سے مضبوط پکڑتے ہیں، جیسے ان کو جان بوجھ کر یا بھول سے چھوڑنے پر کسی غیبی سزا کا تجربہ، یا ان سے غفلت برتنے کی صورت میں کسی فساد (بگاڑ) کا پیدا ہونا۔ اور جیسے نیک سمجھ رکھنے والوں کا ملامت کو قائم کرنا ان کو ترک کرنے پر اور اسی کے مانند۔

اور غور وفکر کرنے والا بھی توفیق دیا جاتا ہے ان باتوں کی تصدیق کرنے کی مختلف ملکوں میں سنتوں (طور وطریق) کو زندہ کرنے اور ان کو مارنے کے ذریعہ ان باتوں کی نظائر سے جو ہم نے ذکر کیں۔

ترکیب:

الملائمة: مصدر بمعنی الملائمة ہے اور إقامة کا مفعول بہ ہے۔ من. جهاد إلخ: اور بمظاهر إلخ دونوں ظرف تصدیق سے متعلق ہیں یعنی دونوں ظرفوں کا ایک ہی مطلب ہے اور وہ یہ ہے کہ مختلف علاقوں میں جو نئے نئے طریقے نکلتے رہتے ہیں اور پرانے طریقے مٹتے رہتے ہیں وہ ہماری ذکر کردہ باتوں کی نظیریں ہیں، ان میں غور وفکر کرکے فہیم آدمی ہماری باتوں کی تصدیق کرسکتا ہے۔

☆ ☆ ☆

اچھی رسمیں ضروری ہیں

لوگوں میں رائج طور وطریق فی نفسہ اچھی چیزیں ہوتی ہیں۔ ان سے ارتفاقات صالحہ (مفید اسکیموں) کی حفاظت ہوتی ہے، وہ انسانوں کو علم وعمل میں کمال تک پہنچاتے ہیں۔ مثلاً بارگاہ خداوندی میں نیازمندی (اِخبات) اور ذکر الٰہی ارتفاقات صالحہ میں سے ہیں اور معنوی چیزیں ہیں۔ ان کا پیکر محسوس نماز وغیرہ عبادات کی مختلف شکلیں ہیں اور یہ رسوم ہی خارج میں پائی جاتی ہیں، جن سے ارتفاق صالح (اِخبات وذکر) کی حفاظت ہوتی ہے اور انسان علم (ذکر وفکر) اور عمل میں درجۂ کمال تک پہنچتا ہے۔

اگر رسوم یعنی مسلسل طور وطریق نہ ہوں تو اکثر لوگوں کی زندگیاں چوپایوں جیسی ہو کر رہ جائیں مثلاً لوگ شریعت کے مطلوبہ طریقوں کے مطابق نکاح ومعاملات کرتے ہیں، یہی رسوم انسان کو انسانیت کے دائرہ میں رکھتی ہیں، اگرچہ اکثر لوگ ان کی افادیت اور ضرورت سے واقف نہیں ہوتے۔ اگر آپ لوگوں سے پوچھیں کہ تم نکاح وطلاق اور دیگر معاملات کی قیود کی پابندی کیوں کرتے ہو؟ تو وہ اس کا بجز اس کے کوئی جواب نہیں دے سکتے کہ یہ ہمارا قومی طریقہ ہے۔ بلکہ لوگ رسوم کی افادیت اجمالاً ضرور جانتے ہیں، گو وہ زبان سے اس کو نہ سمجھا سکیں۔ اور جب وہ زبان سے رسوم کی افادیت سمجھانے پر قادر نہیں تو وہ اس کی بنیادیں کیسے سمجھا سکتے ہیں؟ مگر بہر حال رسوم کی پابندی ایسے لوگوں کے لئے بھی ضروری ہے ورنہ ان کا حال چوپایوں جیسا ہو کر رہ جائے گا۔

بری رسمیں کیسے وجود میں آتی ہیں؟

لوگوں میں رائج رسوم (طور وطریق) فی نفسہ اچھی ہوتی ہیں۔ مگر کبھی ان کے ساتھ غلط چیزیں مل جاتی ہیں تو وہ معاملہ

کو مشتبہ کرا دیتے ہیں۔ جیسے غیر اسلامی معاشرہ میں ہونے والے معاملات میں سود کا اتنا عمل دخل ہو گیا ہے کہ بعض لوگ سود کی حرمت کے معاملہ میں تذبذب میں پڑ گئے ہیں، وہ طرح طرح کی باتیں کرتے ہیں، مثلاً مہاجنی سود حرام ہے، تجارتی نہیں، اضعافاً مضاعفۃ حرام ہے ورنہ نہیں، غریبوں سے لینا حرام ہے، کیونکہ یہ حاجتمندوں کا خون چوستا ہے۔ بنکوں کا سود حرام نہیں، کیونکہ بنک تو غریبوں کو خون سپلائی کرتے ہیں، ان کی معمولی بچتوں کا ان کو منافع دیتے ہیں۔ یہ سب باتیں اس لئے کی جاتی ہیں کہ ان لوگوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی ہے کہ سود کے بغیر بھی کاروبار چل سکتا ہے۔

اور رائج طور وطریق میں باطل چیزیں اس طرح آتی ہیں کہ ایسے سرغنے۔ لیڈر اور سردار پیدا ہوتے ہیں، جن پر شخصی اور ذاتی مفاد کا غلبہ ہوتا ہے، وہ اپنا ہی فائدہ چاہتے ہیں، چاہے دنیا تباہ ہو کر رہ جائے۔ مفاد عامہ کا انہیں بالکل خیال نہیں آتا، وہ اپنے فائدہ کے لئے مختلف برے طریقے اختیار کرتے ہیں، مثلاً:

۱- وہ درندگی والے کام کرنے لگتے ہیں، جیسے راہزنی، چوری، غصب، قتل وغیرہ۔

۲- وہ شہوانی بداعمالیاں شروع کرتے ہیں، جیسے اغلام، ہیجڑا پن وغیرہ۔

۳- وہ ایسے کام کرتے ہیں جو ذرائع معاش کو نقصان پہنچاتے ہیں، جیسے سود خوری اور ناپ تول میں کمی کرنا۔

۴- وہ رہن سہن، کھانے پینے، لباس اور تقریبات میں فضول خرچی شروع کرتے ہیں اور اپنی دولت اڑاتے ہیں جس کے لئے رات دن کمائی کرنی پڑتی ہے یا قرض لینا پڑتا ہے۔

۵- وہ عیش وعشرت، رنگ رلیوں اور سامان تفریح کی طرف اتنے مائل ہو جاتے ہیں کہ دین و آخرت کے سارے کام چھوڑ بیٹھتے ہیں، جیسے ریڈیو، ہائی فائی، ٹی وی، ویڈیو، گانے باجے، بانسریاں، پتے، شطرنج، شکار، کبوتر بازی وغیرہ لغویات۔

۶- وہ دوسرے ملکوں کے داروں پر کمر توڑ ٹیکس لگاتے ہیں اور اپنی رعایا سے جابرانہ لگان وصول کرتے ہیں۔

۷- ان میں باہم حرص وطمع اور بغض وعناد کی آگ بھڑک اٹھتی ہے۔

یہ تمام کام وہ ہیں جو وہ رؤساء دوسروں کے ساتھ کرنا پسند کرتے ہیں، مگر وہ یہ پسند نہیں کرتے کہ یہ حرکتیں ان کے ساتھ کی جائیں۔ اور جب ان کی جاہ وحشمت کی وجہ سے کوئی شخص ان کے خلاف آواز نہیں اٹھاتا تو باقی لوگ تین طرح کے ہو جاتے ہیں:

۱- جو لوگ بدکار ہوتے ہیں وہ ان سرغنوں کی پیروی کرتے ہیں، ان کی ہاں میں ہاں ملاتے ہیں، ان کی نصرت واعانت کرتے ہیں اور وہ ان برائیوں کی خوب اشاعت کرتے ہیں۔

۲- وہ لوگ جن کے دلوں میں نیک اعمال صالحہ کی قوی رغبت ہوتی ہے، مگر ان کا ماحول طالحی ہو، والناس على دين ملوكهم کے قاعدے سے ان رؤساء کے نقش قدم پر چل پڑتے ہیں۔ اور کبھی وہ کمائی کرنے کے برے طریقے اس لئے

اختیار کرتے ہیں کہ اچھی راہیں ان کو تھکا دیتی ہیں یعنی کمائی کی اچھی راہیں ان کے ہاتھ نہیں آتیں، اس لئے وہ غلط راہوں پر پڑ جاتے ہیں۔

۳- وہ لوگ جن کی فطرت میں سلامتی ہے، وہ غصہ بھرے خاموش رہتے ہیں، وہ ان کی ہمنوائی نہیں کرتے مگر بے ہمتی سے ہونٹ بھی سی لیتے ہیں۔ اور جب کوئی بھی غلط طور وطریق پر نکیر کرنے والا نہیں رہتا تو برے طریقے وجود پذیر ہو کر پختہ اور مستحکم ہو جاتے ہیں۔ اور لوگوں کو ان سے ہٹانا ایک بڑا مسئلہ بن جاتا ہے۔

والسنن السائرة وإن كانت من الحق في أصل أمرها، لكونها حافظةً على الارتفاقات الصالحة، ومُفضِيَةً بأفراد الإنسان إلى كمالها النظري والعملي؛ ولولاها لالتحق أكثر الناس بالبهائم، فكم من رجل يباشر النكاحَ والمعاملاتِ على الوجه المطلوب، وإذا سُئل عن سبب تقيُّده بتلك القيود، لم يجد جوابا إلا موافقةَ القوم، وغايةُ جهده علمٌ إجمالي، لايُعْرِب عنه لسانُه، فضلاً عن تمهيد ارتفاقه، فهذا لو لم يلتزم سنةً كاد يلتحق بالبهائم.

لكنها قد ينضم معها باطلٌ، فيَلْبِسُ على الناس سنتَهم، وذلك بأن يترأَّس قومٌ يغلب عليهم الآراءُ الجزئيةُ، دون المصالح الكلية، فيخرجون إلى أعمالٍ سَبُعية، كقطع الطريق والغصب؛ أو شَهَوِيَّة، كاللِّواطة، وتأنُّث الرجال؛ أو أكساب ضارَّة، كالربا، وتطفيف الكيل والوزن؛ أو عاداتٍ في الزِّيِّ والولائم تميل إلى الإسراف، وتحتاج إلى تعمق بليغ في الأكساب؛ أو الإكثار من المُسْلِيَاتِ، بحيث يُفضي إلى إهمال أمر المعاش والمعاد، كالمزامير، والشطرنج، والصيد، واقتناء الحَمَام، ونحوِها؛ أو جباياتٍ مُنْهِكَةٍ لأبناء السبيل، وخراجٍ مستأصِلٍ للرعية؛ أو التشاحُحِ والتشاحُنِ فيما بينهم فيستحسنون أن يفعلوها مع الناس، ولايستحسنون أن يُفعل ذلك معهم، فلايُنكر عليهم أحدٌ لجاههم وصَوْلتهم، فيجيئ فَجَرَةُ القوم فيقتدون بهم، وينصرونهم، ويبذلون السعي في إشاعة ذلك؛ ويجيئ قوم لم يُخلق في قلوبهم ميلٌ قوي إلى الأعمال الصالحة، ولا إلى أضدادها، فيحملهم ما يرون من الرؤساء على التمسك بذلك، وربما أعيت بهم المذاهبُ الصالحة؛ ويبقى قومٌ فطرتُهم سَوِيَّةٌ في أُخرَيَاتِ القوم، لايخالطونهم، ويسكتون على غيظ، فتنعقد سنةٌ سيئة وتتأكد.

ترجمہ: اور رائج طور وطریق: اگرچہ اپنی اصلیت کے لحاظ سے برحق ہوتے ہیں، کیونکہ وہ ارتفاقات صالحہ کے محافظ اور انسان کے افراد کو ان کے کمالِ علمی اور عملی تک پہنچانے والے ہیں۔ اگر ریت رواج نہ ہوں تو اکثر لوگوں کی

زندگیاں چوپایوں جیسی ہوکر رہ جاتی ہیں۔ چنانچہ بہت سے لوگ مطلوبہ شکل میں نکاح اور معاملات کرتے ہیں، اور جب ان سے ان قیود کی پابندی کی وجہ دریافت کی جاتی ہے تو وہ قوم کی موافقت کے علاوہ کوئی جواب نہیں دے سکتے۔ اور ان کی انتہائی کوشش ایک اجمالی علم ہے (یعنی وہ بہت کوشش کریں تو صرف اجمالاً جان سکتے ہیں) جس کو وہ ان کی زبان میں تعبیر نہیں کرسکتیں۔ چہ جائے کہ وہ اس ارتفاق کی تمہید بیان کریں۔ پس یہ شخص اگر کسی طریقہ کی پابندی نہیں کرے گا تو وہ چوپایوں کے ساتھ مل جائے گا۔

مگر کبھی رسوم کے ساتھ باطل چیزیں مل جاتی ہیں، پس وہ باطل لوگوں پر ان کے (صحیح) طریقہ کو مشتبہ کردیتا ہے۔ اور وہ اس طرح کہ کچھ ایسے لوگ سرغنہ بن جاتے ہیں جن پر ذاتی مفادات کا غلبہ ہوتا ہے، وہ مصالح کلیہ (مفادات عامہ) کا لحاظ نہیں رکھتے، پس وہ نکلتے ہیں: ۱- درندگی والے کاموں کی طرف، جیسے مار دھاڑ اور غصب ۲- یا شہوانی کاموں کی طرف، جیسے اغلام اور ننگا پن ۳- یا ضرر رساں کمائیوں کی طرف، جیسے سود اور ناپ تول میں کمی کرنا ۴- یا پوشاک اور تقریبات میں ایسی عادتوں کی طرف جو فضول خرچی کی طرف مائل کرتی ہیں۔ اور جن کے لئے کمائیوں کا بہت زیادہ اہتمام کرنے کی ضرورت پڑتی ہے ۵- یا سامان تفریح بہت زیادہ کرنے کی طرف اس طرح کہ وہ دنیا و آخرت کے کاموں کو چھوڑنے کی طرف پہنچا دیتا ہے: جیسے بانسریاں، شطرنج، شکار، کبوتر پالنا، اور اس جیسی چیزیں ۶- یا مسافروں پر مقرر کردہ ٹیکسوں کی طرف اور رعایا پر بھاری محصول مقرر کرنے کی طرف ۷- یا آپس میں حرص وطمع اور بغض وعناد کی طرف —— پس وہ اچھا سمجھتے ہیں کہ یہ کام لوگوں کے ساتھ کریں۔ اور اس کو اچھا نہیں سمجھتے کہ یہ کام ان کے ساتھ کئے جائیں، پس ان کی جاہ و حشمت کی وجہ سے ان کے خلاف کوئی آواز نہیں اٹھاتا —— پھر قوم کے بدکار لوگ آتے ہیں، پس وہ ان (سرغنوں) کی اقتدا کرتے ہیں، اور ان کی اعانت کرتے ہیں۔ اور ان برائیوں کی اشاعت کی کوشش کرتے ہیں —— اور کچھ اور لوگ آتے ہیں جن کے دلوں میں نہ تو اعمال صالحہ کی طرف قوی میلان پیدا کیا گیا ہے اور نہ ان کی اضداد کی طرف، پس ان کو ان برائیوں کے پکڑنے پر وہ چیز ابھارتی ہے جو وہ اپنے سرداروں سے دیکھتے ہیں۔ اور کبھی ان کو (کمائی کی) تنگ راہیں تھکا دیتی ہیں —— اور قوم کی آخری صفوں میں وہ لوگ رہ جاتے ہیں جن کی فطرت درست ہوتی ہے وہ ان کے ساتھ نہیں ملتے، اور غصہ میں بھرے ہوئے خاموشی اختیار کرتے ہیں، پس برے طریقے وجود میں آتے ہیں اور مستحکم ہوجاتے ہیں۔

لغات:

لکنھا: استدراک ہے وإن کانت من الحق سے ... تفرّأس: باب تفعّل سے ہے بمعنی اتخذ یجعل نفسه رئیسا۔ المَلْهَاة: سامان تفریح جو غم کو بھلا دے تسلّى به: لاعن همه بے غم ہو جانا ... التشاحن: ایک دوسرے سے کینہ رکھنا۔

رسوم و بدعات کی اصلاح کرنا بہترین عمل ہے

جو لوگ ملت کے مفادات کے لیے کام کرتے ہیں اور قوم کی اصلاح کا بیڑا اٹھائے ہوئے ہیں ان پر واجب ہے کہ دین کی اشاعت اور ترویج کے لیے اور باطل کو مٹانے اور روکنے کے لیے انتھک جدوجہد کریں۔ اور یہ بات ذہن نشین رکھیں کہ بدعات و رسوم جب کسی قوم میں جڑ پکڑ لیتی ہیں تو ان کو اکھاڑنا سخت دشوار ہوتا ہے۔ کبھی جھگڑے اور لڑائیوں تک کی نوبت آجاتی ہے مگر مصلحین کو اس سے گھبرانا نہیں چاہیے۔ انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام نے کبھی ہمت نہیں ہاری اور ہتھیار نہیں ڈالے، پھر ان کے وارث کیوں پیچھے ہٹیں! یہ سب جھگڑے نیکی کے بہترین کاموں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ البتہ اپنی طرف سے کوشش یہ ہونی چاہیے کہ کوئی دنگا فساد نہ ہو، لوگوں کو پیار و محبت سے حق کا راستہ بتایا جائے اور بدعات و رسوم کی قباحت سمجھائی جائے۔ لیکن اگر مفسد لوگ دنگے فساد پر اتر آئیں تو ان کا بھی مردانہ وار مقابلہ کیا جائے یہ بھی ایک طرح کا جہاد ہے۔

صحیح طریقہ چھوڑ کر غلط طریقہ کون اختیار کرتا ہے؟

جب کوئی اچھا طریقہ وجود پذیر ہو جاتا ہے، جیسے معروف طریقہ پر نکاح کرنا اور محارم سے نکاح نہ کرنا اسلامی طریقہ ہے۔ مسلمان ہر زمانہ میں اس کو مانتے رہے ہیں اور اسی طریقہ پر مرتے جیتے رہے ہیں یعنی زندگیاں گزرتی ہیں اس طریقہ پر اور لوگوں کے نفوس اور علوم اس پر متفق ہو گئے ہیں یعنی مسلمان ہمیشہ دل سے اس طریقہ کی حقانیت کے قائل رہے ہیں اور ان کے علماء دلائل و براہین سے اس طریقہ کی افادیت اور اس کی خلاف ورزی کی قباحت سمجھاتے رہے ہیں اور لوگ وجوداً اور عدماً اس طریقہ کو اصول ارتفاقات کے ساتھ لازم و ملزوم سمجھنے لگے ہیں یعنی اگر یہ طریقہ ہے تو ارتفاقات کی بنیادی باتیں حاصل ہیں، ورنہ نہیں۔ جب صورت حال ایسی ہو جائے تو اس سے نکلنے کا اور اس کی خلاف ورزی کرنے کا ارادہ وہی شخص کر سکتا ہے جس کا نفس نہایت گندہ ہو، عقل اوچھی ہو، شہوت زوروں پر ہو اور اس کی گردن پر خواہش سوار ہو، پھر جب وہ صحیح طریقہ چھوڑ کر غلط طریقہ اختیار کر لیتا ہے، نکاح کے بجائے پرائیویٹ معاملہ کرتا ہے، یعنی یا بہن سے نکاح کرتا ہے یا دو بہنوں کو نکاح میں جمع کرتا ہے تو اس کا دل اقراری ہوتا ہے کہ وہ بدکاری کر رہا ہے اور اس کے اور مصلحت کلیہ کے درمیان ایک پردہ حائل کر دیا جاتا ہے۔ یعنی وہ مصلحت کلیہ والا کام جو پوری سوسائٹی کے لیے مفید ہے چھوڑ کر خواہش نفس کی تکمیل کرتا ہے، اور وہ ایسا کرنے میں بہت زیادہ قباحت محسوس نہیں کرتا، کیونکہ اس کے دل پر پردہ پڑ گیا ہے۔ اور جب وہ غلط روش پر پڑ جاتا ہے اور سمجھانے سے بھی باز نہیں آتا تو اس کا یہ عمل اس کے نفسانی مرض کا پیکر محسوس بن جاتا ہے اور پتہ چل جاتا ہے کہ وہ بس نام کا مسلمان تھا۔ حقیقت میں دل ایمان سے خالی تھا۔ اور اس کا یہ عمل اس کے دلی

اس کو چلانے میں، اور باطل کو ختم کرنے میں اور اس کو روکنے میں۔ نیز کبھی یہ بات ممکن نہیں ہوتی مگر جھگڑوں اور لڑائیوں کے ذریعہ۔ پس شمار کی جاتی ہیں یہ سب چیزیں (یعنی لڑائی جھگڑے) نیکی کے بہترین کاموں میں۔

اور جب سنت راشدہ وجود میں آجاتی ہے۔ پس اس کو لوگ عصر بعد عصر مان لیتے ہیں، اور اس پر ان کا مرنا جینا ہوتا ہے۔ اور اس پر ان کی ارواح اور علوم خشک ہو جاتے ہیں۔ پس لوگ اس اچھے طریقے کو جو قواعد فاضلہ اور ارتفاقات کے ساتھ متلازم گمان کرنے لگتے ہیں۔ تو اس طریقہ سے نکلنے کا اور اس کی خلاف ورزی کرنے کا ارادہ وہی شخص کرتا ہے جس کا نفس قبیح ہوتا ہے اور جس کی عقل ڈھکی ہوئی ہوتی ہے اور جس کی شہوت قوی ہوتی ہے اور جس کی گردن پر خواہش سوار ہوتی ہے۔ پس جب وہ اس طریقہ سے نکلنے کا عمل اختیار کرتا ہے تو وہ اپنے دل میں اپنی بدکاری کا اقرار چھپائے ہوئے ہوتا ہے اور اس کے اور صحت قلبی کے درمیان پردہ ڈال دیا جاتا ہے۔ پس جب اس کا (خروج کا) عمل مکمل ہو جاتا ہے تو وہ اس کے نفس کی مرض کا پیکر محسوس بن جاتا ہے اور وہ اس کے دین میں دراڑ ہوتا ہے۔

پھر جب یہ چیز واضح طور پر ثابت ہو جاتی ہے تو ملاءِ اعلیٰ کی دعائیں اور گزارشیں بلند ہوتی ہیں ان لوگوں کے حق میں جو اس سنت کی موافقت کرتے ہیں۔ اور ان لوگوں کے خلاف جو اس کی مخالفت کرتے ہیں۔ اور بارگاہِ مقدس میں خوشنودی اور ناراضگی وجود میں آتی ہے ان لوگوں سے جو اس طریقہ پر عمل کرتے ہیں یا ان لوگوں کے برخلاف جو اس طریقہ کی مخالفت کرتے ہیں۔

اور جب طریقے اپنے عروج پر ہوتے ہیں تو وہ اس فطرت میں شمار ہونے لگتے ہیں جس پر اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو پیدا کیا ہے باقی اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں۔

(بفضلہ تعالیٰ آج ۲۰ ربیع الثانی ۱۴۲۰ھ مطابق ۳ اگست ۱۹۹۹ء بروز منگل مبحث سوم کی شرح مکمل ہوئی)

پہلی قسم

قواعد کلیہ کے بیان میں

مبحث چہارم

سعادت کے بیان میں

مبحث چہارم

سعادت کے بیان میں

باب (۱) سعادت (نیک بختی) کی حقیقت کیا ہے؟

باب (۲) نیک بختی میں اختلاف درجات

باب (۳) تحصیل سعادت کے مختلف طریقے

باب (۴) وہ اصول جو سعادت حاصل کرنے کے طریق ثانی کی تحصیل کا مرجع ہیں

باب (۵) خصال اربعہ کی تحصیل، تکمیل اور تلافیٔ مافات کا طریقہ

باب (۶) ظہور فطرت کے حجابات

باب (۷) حجابات مذکورہ کو دور کرنے کا طریقہ

مبحث چہارم

سعادت کے بیان میں

باب ــــــ ۱

سعادت کی حقیقت کیا ہے؟

اب تک تمہیدی مباحث تھے، اب اصل مقصود شروع ہوتا ہے۔ حیات انسانی کا بنیادی مقصد "سعادت دارین" حاصل کرنا ہے۔ یہ نعمت میسر آجائے تو زہے قسمت! ورنہ کف افسوس ملنے کے سوا چارہ نہیں!

انسان میں انسانیت کے علاوہ حیوانیت، نباتیت اور جمادیت بھی پائی جاتی ہے یعنی ان کی خصوصیات بھی پائی جاتی ہیں۔ حیوان کی خصوصیت ہے حساس اور متحرک بالارادہ ہونا، نباتات کی خصوصیت ہے پنپنا بڑھنا اور نشوونما پانا اور جمادات کی خصوصیت ہے قابل ابعاد ثلاثہ ہونا۔ یہ تینوں باتیں انسان میں بھی پائی جاتی ہیں۔ اس لئے انسان دو قسم کے کمالات کا مجموعہ ہے:

(۱) نوعی کمالات: یعنی وہ خوبیاں جو انسان میں انسان ہونے کی وجہ سے پائی جاتی ہیں، جیسے عمدہ اخلاق والا ہونا، تدبیرات نافعہ کے سہارے آسائش کی زندگی بسر کرنا، اعلیٰ صنعتیں وجود میں لانا اور تعلیم وتعلم کا اہل ہونا۔ یہ تمام خوبیاں وہ ہیں جو انسان میں اس کی صورت نوعیہ کے اقتضاء سے پائی جاتی ہیں یعنی انسان چونکہ انسان ہے اس لئے اس میں یہ خوبیاں ہیں۔ یہی انسان کے امتیازی اور انفرادی کمالات ہیں۔ کسی بھی اور مخلوق میں یہ باتیں نہیں پائی جاتیں۔

(۲) جنسی کمالات: یعنی حیوانیت، نباتیت اور جمادیت والے کمالات۔ جمادات کی خوبیاں مثال کے طور پر قد کی درازی اور جسم کی بڑائی ہیں۔ نباتات کی خوبیاں مناسب نشوونما، بہترین ڈیل ڈول یعنی خوبصورتی اور تروتازگی وغیرہ ہیں۔ حیوانات کی خوبیاں مضبوط بازو، آواز کی کرختگی، شہوت کی فراوانی، کھانے پینے کی زیادتی اور حسد وغصہ کی تیزی ہیں۔ یہ سب خوبیاں انسان میں بھی پائی جاتی ہیں اور کمالات شمار ہوتی ہیں۔

اب غور طلب بات یہ ہے کہ انسان کے اصل اور قابل لحاظ کمالات کیا ہیں؟ بدیہی بات ہے کہ وہ نوعی کمالات ہیں۔

وذلك: أنه قد يُمدح في العادة: بصفاتٍ يشارك فيها الأجسامَ المعدنية، كالطول، وعِظَمِ القامة، فإن كانت السعادة هذه فالجبالُ أتمُّ سعادةً؛ وصفاتٍ يشارك فيها النبات، كالنمو المناسب، والخروج إلى تخاطيطَ جميلةٍ وهيئاتٍ ناضرة، فإن كانت السعادة هذه فالشقائق والأوراد أتمُّ سعادةً؛ وصفاتٍ يشارك فيها الحيوان، كشدة البطش، وجَهْوَرِيَّة الصوت، وزيادة الشَّبَق، وكثرة الأكل والشرب، ووفور الغضب والحسد، فإن كانت السعادة هذه فالحمار أتمُّ سعادةً؛ وصفاتٍ يختص بها الإنسانُ، كالأخلاق المهذَّبة، والارتفاقات الصالحة، والصنائع الرفيعة، والجاه العظيم، فبادي الرأي: أنها سعادةُ الإنسان، ولذلك ترى كلَّ أمة من أمم الناس: يستحب أتمُّها عقلاً، وأصلبُها رأيًا: أن يكتسب هذه، ويجعل ما سواها كأنها ليست صفاتِ مدح.

ولكنَّ الأمرَ إلى الآن غيرُ منقَّح، لأن أصلَ هذه موجود في أفراد الحيوان، فالشجاعةُ أصلُها الغضب، وحب الانتقام، والثباتُ في الشدائد، والإقدام على المهالك، وهذه كلُّها مركوزةٌ في الفحول من البهائم، لكنْ لا تُسمى شجاعةً إلا بعد ما يُهذِّبها بعضُ النفس النُّطْقية، فتصير منقادةً للمصلحة الكلية، منبعثةً من داعيةٍ معقولة؛ وكذلك أصل الصناعات موجود في الحيوان كالعصفور الذي يَنْسِجُ العُشَّ، بل رب صنعة يصنعها الحيوانُ بطبيعته لا يتمكن منها الإنسان بجهده.

كلا، بل الحق أن هذه سعادةٌ بالعرض، وأن السعادة الحقيقية هي: انقياد البهيمية للنفس النطقية، واتباعُ الهوى للعقل، وكونُ النفس الناطقة قاهرةً على البهيمية، والعقلِ غالبًا على الهوى، وسائرُ الخصوصيات مُلْغاة.

ترجمہ: بحث چہارم: نیک بختی کے بیان میں: نیک بختی کی حقیقت کیا ہے؟ جان لیں کہ انسان کے کچھ کمالات ایسے ہیں جن کو صورتِ نوعیہ چاہتی ہے اور کچھ کمالات ایسے ہیں جن کو نوع کا موضوع یعنی جنسِ قریب وبعید چاہتے ہیں۔ اور انسان کی وہ سعادت جس کا فقدان مضر ہے، اور جس (کی تحصیل) کا درست عقل رکھنے والے لوگ نہایت ہی اہتمام سے ارادہ کرتے ہیں، وہ قسمِ اول کے کمالات ہیں۔

اور اس کی تفصیل یہ ہے کہ عادۃً انسان کی تعریف (مدح وغیرہ) کی جاتی ہے: ۱- ایسی خوبیوں کی وجہ سے جن میں وہ اجسامِ معدنیہ (جمادات) کے ساتھ شریک ہوتا ہے، جیسے قد کی درازی، جسم کی بڑائی۔ پس اگر نیک بختی ان چیزوں کا نام ہے تو پہاڑ انسان سے زیادہ نیک بخت ہیں! ۲- اور ایسی خوبیوں کی وجہ سے جن میں وہ نباتات کے ساتھ شریک ہوتا ہے، جیسے مناسب نشوونما اور خوبصورت لمبائی اور تروتازگی کی طرف نکلنا۔ پس اگر نیک بختی ان چیزوں کا نام ہے تو گل لالہ اور

(۲) متخاطِط: خط (لکیر) سے ہے۔ ذیزائن چونکہ لکیروں کا مجموعہ ہوتی ہے۔ اس لئے شکل وصورت ودیزائن کو متخاطِط کہتے ہیں۔

(۳) تین جگہ بَطْر لِکَ آیا ہے۔ اس کا فاعل ضمیر مستتر ہے، جو انسان کی طرف راجع ہے۔

لغات: شَقَائِقُ النُّعْمَان: گلہائے لالہ، واحد شقیقۃ النعمان گل لالہ: ایک قسم کا سرخ پھول، جس کے اندر سیاہ داغ ہوتا ہے۔ ۔ وَرْدٌ: گلاب کا پھول۔ تَلَفَّقَ (مصدر مجہول) تَلْفِيْقُ الشَّيْءِ: باطل کرنا۔

حقیقی نیک بختی حاصل کرنے کا طریقہ

سعادت حقیقیہ کیسے حاصل کی جائے؟ یعنی بہیمیت کو روح ربانی کے تابع کیسے کیا جائے؟ خواہش نفس پر عقل کی حکمرانی کیسے قائم کی جائے؟ اس سلسلہ میں شاہ صاحب رحمہ اللہ کی لمبی عبارت کا خلاصہ یہ ہے کہ دنیوی زندگی میں انسان کو دو طرح کے کام ایک ساتھ کرنے ہوتے ہیں:

① امور معاش یعنی دنیوی مشاغل۔ یہ کام سعادت حقیقیہ کے لئے نہ صرف یہ کہ مفید نہیں، بلکہ بعض مرتبہ نقصان پہنچاتے ہیں۔ اس لئے ان امور میں بقدر ضرورت ہی مشغول ہونا چاہئے۔

② عبادات وریاضات جو بہیمیت کو ملکیت کے ماتحت کرتے ہیں۔ یہ کام حقیقی نیک بختی حاصل کرنے میں مدد معاون ہیں۔ اس لئے اس قسم کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا چاہئے۔ ان شاء اللہ سعادت حقیقیہ حاصل ہوگی۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ انسان کو چونکہ دنیا میں رہ کر آخرت کی تیاری کرنی ہوتی ہے، اس لئے دنیا کے جھمیلوں سے اس کو مفر نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو کچھ پیدا ہی ایسا کیا ہے کہ اس کو آخرت کی تیاری کے ساتھ زندگی بسر کرنے کا سامان بھی کرنا پڑتا ہے۔ اس لئے انسان کو دنیا میں دو طرح کے کام کرنے ہوتے ہیں:

(ا) اپنی روزی روٹی کا انتظام کرنا۔ لیکن اگر انسان ان کاموں میں پوری طرح مشغول ہو جائے تو وہ حقیقی نیک بختی حاصل نہیں کر سکے گا۔ دنیا اپنی ظاہری کشش کی وجہ سے سد راہ بن جائے گی خاص طور پر ناقص انسان کے لئے جو ذاتی مفادات کے لئے دنیوی کاموں میں مشغول ہوتا ہے۔

اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر مقصد کو حاصل کرنے کا ایک طریقہ ہوتا ہے، اسی طریقہ سے وہ مقصد حاصل ہو سکتا ہے، مثلاً آدمی بہادر اس وقت بنتا ہے جب مقابلوں کی نوبت آئے۔ قصہ بہرام کا کر اور کشتی مار کر کوئی شخص بہادر نہیں بن سکتا۔ اسی طرح آدمی فصیح وبلیغ اس وقت بنتا ہے جب زبان وقلم کے جوہر دکھانے کا موقعہ ملے۔ اساتذۂ سخن کا کلام اور شعلہ بیان مقرروں کی تقریریں یاد کر کے کوئی شخص فصاحت وبلاغت میں کمال پیدا نہیں کر سکتا۔ اسی طرح دانشمند تدبیرات نافعہ اس وقت نکالتا ہے جب ضرورت پیش آتی ہے، ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ اور صنعت وحرفت آلات (Tools) اور مادہ کی

محتاج ہے، ان کے بغیر صنعت کار کچھ نہیں کرسکتا۔

اسی طرح حقیقی نیک بختی حاصل کرنے کا بھی ایک طریقہ ہے، اسی ذریعہ سے نیک بختی حاصل ہوسکتی ہے۔ دنیا کے گورکھ دھندوں میں پھنسے ہوئے کو یہ دولت حاصل نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ دنیا کے مشاغل دنیوی زندگی کے اختتام کے ساتھ ختم ہوجانے والے ہیں، وہ آخرت میں کیا کام آسکتے ہیں؟

پھر یہ ناقص انسان اگر دنیا کے جھمیلوں ہی میں چل بسا، اور وہ فیاضِ ازلی تعالیٰ شانہٗ دنیا کی چیزوں میں اس کا دل اٹکا ہوا نہیں تھا تو وہ آخرت میں صرف نیک بختی سے عاری رہ جائے گا، اور کچھ نقصان نہ ہوگا۔ اور اگر دنیا اس کے دل میں گھر کئے ہوئے تھی تو آخرت میں اس کو بھاری نقصان اٹھانا پڑے گا (اس کی تفصیل آئندہ ابواب میں آرہی ہے)

④ عبادتیں اور ریاضتیں کرنا یعنی فرائض و نوافل اعمال میں خوب کوشش کرنا۔ یہ کام بھی انسان کو دنیوی مشاغل کے ساتھ کرنے پڑتے ہیں۔ یہ اعمال اس اعتبار سے "عبادت" کہلاتے ہیں کہ یہ ملکیت کا اقتضاء ہیں۔ عبادت کے معنی ہیں بندگی یعنی وہ اعمال جن کے ذریعہ بندہ اپنے بندہ ہونے کا ثبوت پیش کرتا ہے اور یہی اعمال اس اعتبار سے "ریاضت" کہلاتے ہیں کہ یہ بہیمیت کو رام کرتے ہیں۔ ریاضت کے معنی ہیں نفس کشی یعنی ایسے کام کرنا جن کا ست، جوہر اور خلاصہ دو چیزیں ہوں: (الف) بہیمیت کی تابعداری یعنی بہیمیت، ملکیت کے اشاروں پر عمل پیرا ہو اور بہیمیت پر ملکیت کا پوری طرح رنگ چڑھ جائے (ب) ملکیت، بہیمیت سے بری اور بیزار ہوجائے یعنی اس کا گندا رنگ ملکیت قبول نہ کرے، اور جس طرح موم پر انگوٹھی کے نقوش ابھرتے ہیں ملکیت میں بہیمیت کے گندے نقوش نہ چھپیں۔

اور بہیمیت کو رام کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ ملکیت پوری سنجیدگی سے کوئی چیز چاہے، اور اس کی بہیمیت کی طرف وحی کرے۔ اور اس سے مطالبہ کرے اور بہیمیت اس کی تابعداری کرے، نہ سرکشی کرے نہ تعمیلِ حکم سے باز رہے۔ پھر اسی طرح بار بار ملکیت، بہیمیت کے سامنے اپنی خواہشات پیش کرتی رہے اور بہیمیت اس کو مانتی رہے، تا آنکہ بہیمیت اطاعت کی عادی، مشاق اور خوگر ہوجائے۔

اور بہیمیت کو سدھانے کے لئے ضروری ہے کہ ملکیت اس سے دو طرح کے کام کرائے: (الف) وہ کام کرائے جن سے ملکیت کو انشراح اور بہیمیت کو انقباض اور تنگی لاحق ہو۔ اس قسم کے کام وہ ہیں جن سے عالمِ ملکوت کے ساتھ مشابہت پیدا ہوتی ہے۔ اور عالمِ جبروت کی طرف توجہ ہوتی ہے۔ یہ کام ملکیت کا خاصہ ہیں اور بہیمیت ان سے کوسوں دور ہے۔ پس جب ملکیت بہیمیت سے اس قسم کے کام کرائے گی تو ملکیت کو انشراح، سرور اور انبساط حاصل ہوگا۔ اور بہیمیت کو انقباض، دل گرفتگی اور تنگی لاحق ہوگی (ب) بہیمیت جو کام چاہتی ہے، جن سے وہ لذت اندوز ہوتی ہے اور نشاطِ جوانی میں ان کی مشتاق ہوتی ہے یعنی شہوتِ بطن اور شہوتِ فرج والے کام: ملکیت وہ کام بالکل چھوڑ دے، ان کو کرنے کی قطعاً روادار نہ ہو تو رفتہ رفتہ بہیمیت رام ہوجائے گی۔

خلاصہ یہ ہے کہ حقیقی نیک بختی عبادتوں اور ریاضتوں کے ذریعہ ہی حاصل ہوسکتی ہے۔ اور اگر حاصل شدہ کمال ہاتھ سے نکل جائے تو اس کو بھی دوبارہ اعمال ہی کے ذریعہ پکڑا جاسکتا ہے۔ اسی وجہ سے شریعت کلی بانگ دہل انسانوں کو پکارتی ہے اور تاکید کرتی ہے کہ وہ ثانوی درجہ کے کمالات میں یعنی ارتفاقات صالحہ اور صنائع جمیلہ میں بقدر ضرورت ہی مشغول ہوں اور اپنی اصل توجہ نفس کو سنوارنے کی طرف رکھیں اور وہ کام اختیار کریں جو ان کو ملاء اعلیٰ جیسا کردیں۔ اور ان میں جبروت وملکوت کے انوار کے نزول کی استعداد پیدا ہوجائے اور بہیمیت ملکیت کے ماتحت اور فرمانبردار بن جائے۔ اور ملکیت کے تقاضے بہیمیت کے اینچ سے ظاہر ہونے لگیں۔

واعلم: أن الأمور التي تشتبك بالسعادة الحقيقية على قسمين:

قسم: هو من باب ظهورِ فيض النفس النُّطقية في المعاش بحكم الجبلة، ولا يمكن أن يَحصُل الخُلُقُ المطلوبُ بهذا القسم، بل ربما يكون الغوصُ في تلك الأفعال بزينتها - لاسيما بفكر جزئيٍ، كما هو شأن الناقص - ضِدَّ الكمالِ المطلوب، كالذي يقصد تحصيلَ الشجاعة بإثارة الغضب والمصارعة، ونحو ذلك؛ أو الفصاحة بمعرفة أشعار العرب وخُطَبِهم؛ والأخلاق لاتظهر إلا عند مزاحماتٍ من بني النوع؛ والارتفاقاتُ لاتُقْتَضَى إلا بحاجاتٍ طارئة؛ والصنائعُ لاتتم إلا بآلاتٍ ومادة؛ وهذه كلُّها منقضية بانقضاء الحياة الدنيا؛ فإن مات الناقص في تلك الحالة، وكان شحيحا بقي عاريا عن الكمال وإن لزق بنفسه صُوَرُ هذه الملاقات كان الضررُ عليه أشدَّ من النفع.

وقسم: إنما روحُه هيئةُ إذعانِ البهيمية للملكية: بأن تتصرَّف حسب وحيها، وتصبغ بصبغها، وتمنَعُ الملكيةُ منها: بأن لاتقبل ألوانها الدنيَّة، ولاتنطبع فيها نقوشُها الخسيسةُ، كما تنطبع نقوشُ الخاتَم في الشمعة.

ولاسبيل إلى ذلك إلا أن تقتضي الملكيةُ شيئًا من ذاتها، وتُوجهه إلى البهيمية، وتفترضه عليها، فتنقاد لها، ولاتأبى عليها، ولاتَمْتَنِعُ منها، ثم تقتضي أيضًا لتنقادَ هذه أيضًا، ثم وثم، حتى تعتادَ ذلك وتتمرَّن.

وهذه الأشياء التي تقتضيها هذه من ذاتها، وتُفْتَرَضُ عليها تلك، على رغم أنفها، إنما يكون من جنس مافيه انشراح لهذه، وانقباض لتلك، وذلك كالتشبُّه بالملكوت، والتَّطَلُّع للجبروت، فإنها خاصة الملكية، بعيدةٌ عنها البهيميةُ غاية البُعد، أو بترْك ماتقتضيه البهيمية، وتتلذذه، وتشتاق إليه في غلوائها:

یہاں تک کہ وہ اس کی (یعنی اطاعت کی) عادی ہو جائے اور مشتاق ہو جائے (یعنی خوگر ہو جائے)

اور یہ چیزیں جن کو ملکیت اپنی ذات سے چاہتی ہے۔ اور وہ بہیمیت ان چیزوں پر مجبور کی جاتی ہے اس کی مرضی کے خلاف (الف) انہی چیزوں کے قبیل سے ہوتی چاہئیں جن میں ملکیت کا انشراح ہو اور بہیمیت کا انقباض ہو، جیسے عالم ملکوت سے مشابہت پیدا کرنا اور جبروت کی طرف جھانکنا۔ پس بیشک یہ کام ملکیت کا خاصہ ہیں، بہیمیت ان سے بہت ہی دور ہے (ب) یا وہ چیزیں چھوڑ دی جائیں جن کو بہیمیت چاہتی ہے۔ اور ان سے لذت اندوز ہوتی ہے اور جن کی اپنی اتنا جوانی میں مشتاق ہوتی ہے۔

اور یہی عبادتیں اور ریاضتیں کہلاتی ہیں۔ اور وہ جال ہیں مطلوبہ اخلاق کے جو ہاتھ سے نکل جانے والے کو حاصل کرنے کے لئے۔ پس مقام (یعنی مسئلہ) کی تحقیق اس طرف ہوئی (یعنی تحقیق کا خلاصہ یہ نکلا) کہ ''سعادت حقیقیہ عبادتوں کے ذریعہ ہی شکار کی جا سکتی ہے''۔ اور اسی وجہ سے مصلحت کلی (یعنی نوع انسانی کا مفاد) انسان کے افراد کو صورت نوعیہ کے روزن (سوراخ) سے پکارتی ہے۔ اور انہیں بے حد تاکید سے حکم دیتی ہے کہ وہ ان کمالات کی اصلاح کو جو کہ وہ نوعی وجہ کے کمالات ہیں بقدر ضرورت کروا لے۔ اور یہ کہ وہ کروانے اپنی توجہ کی آخری حد اپنی نگاہ کے کرنے کی جگہ نفس کے سنوارنے کو، اور اس کے مزین کرنے کو ایسی شکلوں سے جو ان کو بالائی مخلوق ملأ اعلیٰ سے مشابہ کر دیں، اس پر جبروت اور ملکوت کے رنگوں کے نزول کے لئے تیار کر دیں۔ اور یہ کہ بہیمیت کو ملکیت کی فرمانبرداری، اور اس کی اطاعت شعاری اور اس کے احکام کے ظاہر ہونے کا منبع بنا دیں۔

ترکیب: هذا الكمال الخ یکون کی خبر ہے المصابحة کا عطف الشجاعة پر ہے نسخے میں ایک ت محذوف ہے هذه الأشباه اور ربما یکون کی خبر ہے

تصحیح: سمحا (صفت) مطبوعہ میں سمحة (تاء کے ساتھ) ہے۔ اور حاشیہ میں اس کا ترجمہ شدت (برا) کیا ہے۔ مگر یہ تصحیف ہے تصحیح مخطوطہ کراچی سے کی ہے تكون الجبروت اصل میں كون الجبروت ہے یہ بھی تصحیف ہے اور تصحیح بھی مخطوطہ کراچی سے کی ہے۔

لغات: الطغواء حد سے گزرنا، نازجوانی اتنا جوانی۔ نخوة روزن، روشن دان، سوراخ۔ المنصة اسم آلہ میں معنی ہیں دلہن کے لئے آراستہ کیا ہوا کمرہ شادی کے وقت میاں بیوی کے بیٹھنے کے لئے سنوارا ہوا چبوترہ۔

سعادت حقیقیہ انسان کا فطری تقاضا ہے

ہر انسان سعادت حقیقیہ کا مشتاق ہے۔ وہ اس کی طرف ایسا کھنچتا ہے جیسا لوہا مقناطیس کی طرف کھنچتا ہے۔ بشرطیکہ اس کو فطری تندرستی حاصل ہو یعنی اس میں کامل انسانیت پائی جاتی ہو، اور اس کا مادہ فطری اور کامل عمل ظاہر ہونے کا

ہوتی رہے۔ یہ سعادت وہ اخلاق ہیں جن پر اللہ تعالیٰ نے بندوں کی تخلیق فرمائی ہے۔ اور یہی انسانی فطرت ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو پیدا کیا ہے۔ چنانچہ معتدل المزاج امتوں میں ایسے لوگ ضرور پائے جاتے ہیں جو یہ خُلقی تہذیب حاصل کرنے کا اہتمام کرتے ہیں اور اس کو آخری اقبال مندی تصور کرتے ہیں۔ اور بادشاہ اور حکماء سے لے کر نیچے تک سب لوگ ان کو "بزرگ" تسلیم کرتے ہیں۔ یعنی ان کو ایک ایسی نعمت حاصل کرنے میں کامیاب سمجھتے ہیں جو دنیا کی تمام سعادتوں سے بالاتر ہے۔ ان کو فرشتوں کے ساتھ ملنے والا اور ان کی لڑی میں پرویا ہوا تصور کرتے ہیں۔ ان سے برکتوں کے طالب ہوتے ہیں اور ان کے ہاتھ پیر چومتے ہیں۔ تو کیا عرب و عجم عادتوں اور مذہبوں کے اختلاف، اور علاقوں کے دور دراز ہونے کے باوجود کسی فطری مناسبت کے بغیر ایک چیز پر متفق ہوگئے ہیں؟ اور اتفاق بھی کیسا فطری باتوں جیسا؟ یہ بات ناممکن ہے۔ اس کا ضرور کوئی فطری سبب ہے۔

علاوہ ازیں فطرت انسانی میں ملکیت موجود ہے اور مبحث اول (باب ۹) میں یہ مضمون گزر چکا ہے کہ جن حضرات میں ملکیت نہایت اعلیٰ درجہ کی ہوتی ہے وہی اکابر اور بڑے مرتبے والے ہیں۔ اور سعادت حقیقیہ ملکیت کو بلند سے بلند تر کرنے ہی کا نام ہے۔ پس ثابت ہوا کہ انسان کا سب سے بڑا کمال سعادت حقیقیہ کی تحصیل ہے۔ واللہ اعلم۔

وأفراد الإنسان عند الصحة المزاجية، وتمكين المادة لظهور أحكام النوع كاملةً وافرةً، تشتاق إلى هذه السعادة، وتنجذب إليها انجذاب الحديد إلى المغناطيس، وذلك خُلُقٌ خلق الله الناس عليه، وفطرةٌ فطرهم عليها.

ولهذا ما كانت في بني آدم أمة من أهل المزاج المعتدل إلا فيها قوم من عظمائهم يهتمون بتكميل هذا الخلق، ويرونه السعادة القصوى، ويراهم الملوك والحكماء فمن دونهم فائزين بما يعجزُ عن سعادات الدنيا كلها، ملتحقين بالملائكة، منخرطين في سلكهم، حتى صاروا يتبركون بهم، ويقبّلون أيديهم وأرجلهم؛ فهل يمكن أن يتفق عربُ الناس وعجمُهم، على اختلاف عاداتهم وأديانهم، وتباعد مساكنهم وبلدانهم، على شيء واحد، وحدةً نوعيةً، لا لمناسبة فطرية؟ كيف لا، وقد عرفت أن الملكية موجودة في أصل فطرة الإنسان، وعرفت أفاضل الناس وأساطينهم من هم؟ والله أعلم.

ترجمہ: اور انسان کے افراد کو مزاجی تندرستی کے وقت اور مادہ کے قدرت دینے کی صورت میں نوع کے احکام کو کامل مکمل طور پر ظاہر ہونے کی، اس نیک بختی کی طرف مشتاق ہوتے ہیں۔ اور اس کی طرف کھنچتے ہیں جس طرح لوہا مقناطیس کی طرف کھنچتا ہے۔ اور یہ وہ اخلاق (خوبی) ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے بندوں کی تخلیق فرمائی ہے اور یہ وہ فطرت (بناوٹ)

ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو پیدا کیا ہے۔

اور اسی وجہ سے (یعنی فطری امر ہونے کی وجہ سے) انسانوں میں معتدل مزاج لوگوں کا کوئی گروہ نہیں ہے مگر ان میں ان کے بڑوں میں سے کچھ لوگ اس اخلاق کی تکمیل کا اہتمام کرتے ہیں اور اس کو سعادت کی آخری منزل تصور کرتے ہیں۔ اور بادشاہ، وزراء، دانشمند اور ان سے فروتر لوگ، ان حضرات کو اسی نعمت حاصل کرنے میں وجود دنیا کی تمام سعادتوں سے بڑھ کر کامیاب، مالک کے ساتھ ملنے والا، اور ان کی زندگی میں پرپا ہوا سمجھتے ہیں، یہاں تک کہ وہ ان سے برکتیں حاصل کرنے لگتے ہیں، اور ان کے ہاتھ پیر چومنے لگتے ہیں۔ تو کیا یہ بات ممکن ہے کہ عرب کے لوگ اور عجم کے باشندے ان کی عادتوں اور مذاہب کے اختلاف، اور ان کے مکانات اور علاقوں کے دور دراز ہونے کے باوجود ایک چیز پر ان کی اتحاد کی طرح متفق ہو گئے ہوں بغیر کسی فطری مناسبت کے؟ فطری مناسبت کا انکار کیسے کیا جا سکتا ہے، درانحالیکہ آپ جان چکے ہیں کہ ملکیت انسان کی اصل فطرت میں موجود ہے اور آپ یہ بھی جان چکے ہیں کہ افاضل راکا بروں لوگ ہیں؟ باقی اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں۔

تصحیح: الالسانیة فطریة میں الا مخطوط کراچی سے بڑھایا گیا ہے۔

باب ــــ ۲

نیک بختی میں اختلاف درجات

اخلاق خواہ عالیہ ہوں یا سافلہ تمام انسان ان میں یکساں نہیں ہوتے۔ سخاوت، شجاعت، امانت وغیرہ، اسی طرح بخیلی، بزدلی اور خیانت وغیرہ صفات میں لوگ متفاوت ہوتے ہیں۔ اسی طرح سعادت کے معاملہ میں بھی اختلاف درجات پایا جاتا ہے۔ شاہ صاحب رحمہ اللہ نے مثال کے طور پر وصف شجاعت میں لوگوں کے چار مختلف درجات بیان فرمائے ہیں:

① بعض لوگ شجاعت سے بالکل کورے ہوتے ہیں، اور ان میں اس وصف کی قابلیت ہی نہیں ہوتی، کیونکہ ان کی فطرت میں شجاعت کے برعکس کیفیت موجود ہوتی ہے یعنی ان کے خمیر میں بزدلی شامل ہوتی ہے اور ضدین کا اجتماع ہو نہیں سکتا، پھر ان میں بہادری کیونکر پائی جائے گی، جیسے مخنث اور نہایت درجہ بزدل آدمی بہادری کے جوہر سے خالی ہوتے ہیں اور یہ وصف ان کے لئے متوقع بھی نہیں ہوتا۔

② بعض لوگوں میں فی الوقت تو شجاعت موجود نہیں ہوتی مگر محنت کرکے پیدا کی جا سکتی ہے۔ اگر وہ بہادرانہ اقوال وافعال واحوال کی مشق وتمرین کریں، بہادروں سے یہ وصف حاصل کریں۔ بڑے بڑے بہادروں کے واقعات پڑھیں یا سنیں اور گذشتہ بہادران قوم پر جو احوال بیتے ہیں اور جس طرح وہ مختیوں میں ثابت قدم رہے ہیں اور خطرات

میں انھوں نے جو اقدامات کئے ہیں ان سب، تو ان کو وہ یاد کریں تو رفتہ رفتہ بہادر بن سکتے ہیں۔

(۲) بعض لوگ فطری طور پر بہادر ہوتے ہیں۔ ان کا جوش اور جذبہ بار بار ابھرتا رہتا ہے۔ اگر ان کو جوانمردی کے کاموں سے روکا جائے تو ان پر بہت شاق ہوتا ہے اور وہ غصہ کے ساتھ خاموش رہتے ہیں۔ اور اگر بہادری کے کام کرنے کے لئے کہا جائے تو ان کی مثال اس بارود کی سی ہوتی ہے جس کو آگ دکھائی جائے، تو بھڑکنے میں دیر نہیں لگتی۔

(۳) بعض لوگوں میں بہادری کا جوہر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہوتا ہے۔ وہ اس وصف کے تقاضوں کی طرف خود بخود چل پڑتے ہیں۔ اگر ان کو نہایت سختی سے کم ہمتی کے کاموں کی طرف جذب ہونے تو وہ قبول نہیں کرتے۔ بہادرانہ کارنامے انجام دینا اور ان کے مناسب حال شکلیں پیدا کرنا ان کے لئے آسان ہوتا ہے۔ وہ کسی ریت رواج کے محتاج ہوتے ہیں نہ ان کو جوش دلانے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ یہی لوگ بہادری کے وصف میں امام ہیں۔ ان کو کسی دوسرے امام کی قطعاً ضرورت نہیں۔ اور جو لوگ بہادری میں ان سے فروتر ہیں ان کے لئے ضروری ہے کہ ان بہادروں کے طریقہ کو مضبوطی سے تھامیں، اور ان کی ریت کو دانتوں سے پکڑیں۔ ان کے طریقوں کی بہ تکلف نقل کریں اور ان کے واقعات کو پڑھیں یا سنیں، تا کہ جتنا مقدر میں ہو بہادری کا وصف ان کو بھی حاصل ہو۔

اسی طرح نیک بختی کے تعلق سے بھی لوگوں کے چار مختلف درجات ہیں:

(۱) بعض لوگ سعادت کے وصف سے کورے ہوتے ہیں اور اس وصف کے سنورنے کی بھی ان کے لئے سبیل نہیں ہوتی، جیسے وہ لڑکا جس کو خضر علیہ السلام نے مار ڈالا تھا، اس کی سرشت ہی میں کفر تھا۔ سورۃ البقرۃ آیت ۱۸ میں جو ارشاد فرمایا گیا ہے کہ: "وہ منافقین بہرے، گونگے، اندھے ہیں، پس وہ نہیں لوٹیں گے" اس میں اسی قسم کے لوگوں کی طرف اشارہ ہے۔

(۲) بعض لوگوں میں فی الحال تو وصف سعادت نہیں ہوتا، مگر کوشش کر کے وہ لوگ نیک بخت بن سکتے ہیں۔ اگر وہ سخت ریاضتیں کریں، مسلسل اعمال صالحہ کا خود کو پابند رکھیں تو وہ فائز المرام ہو سکتے ہیں۔ یہ لوگ انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی پرجوش دعوت اور ان سے منقول طریقوں کے محتاج ہوتے ہیں۔ دنیا میں پائے جانے والے بیشتر لوگ اسی قبیل سے ہیں اور انبیاء کی بعثت سے اولاً اور بالذات یہی لوگ مقصود ہیں۔ انہی لوگوں کی اصلاح کے لئے سلسلۂ نبوت جاری کیا گیا ہے۔

(۳) بعض لوگ فطری طور پر نیک ہوتے ہیں۔ ان کے خمیر میں نیک بختی شامل ہوتی ہے۔ ان میں نیک بختی کی ترنگیں ابھرتی رہتی ہیں۔ بار بار ان میں نیک کاموں کا ولولہ اٹھتا رہتا ہے۔ مگر وہ نیک بختی کے کاموں کی تفصیلات میں کسی امام کی راہنمائی کے محتاج ہوتے ہیں۔ نیک بختی کے بہت سے کاموں میں، ان کے مناسب شکلوں کی تشکیل میں ان لوگوں کو امام کی ضرورت پڑتی ہے۔ سورۃ النور آیت ۳۵ میں نور ہدایت کی جو مثال آئی ہے کہ: "ایک طاق میں ایک چراغ رکھا

ہے، وہ چراغ ایک قندیل میں ہے، وہ قندیل ایسا ہے جیسا ایک چمکدار ستارہ، وہ چراغ ایک نہایت مفید درخت کے تیل سے روشن کیا گیا ہے یعنی زیتون کا درخت، جو نہ پورب رُخ ہے نہ پچھم رُخ۔ اس کا تیل (اس قدر صاف اور سلگنے والا ہے کہ) اگر اس کو آگ بھی نہ چھوئے تب بھی وہ خود بخود جل اٹھتا ہے" یہ مثال اسی قسم کے لوگوں کی ہے۔ یہی لوگ اقبال مندی میں سب سے آگے بڑھنے والے ہیں۔

(۳) انبیائے کرام علیہم الصلوۃ والسلام کی ذوات قدسیہ ہیں۔ ان کے لئے وصف سعادت کے کمال تک پہنچنا اور اس کی مناسب حالت تک اختیار کرنا آسان ہے۔ وہ فوت شدہ کی تحصیل کا طریقہ اور موجود کو باقی رکھنے کا سلیقہ جانتے ہیں۔ ان کو نقص کی تکمیل کا ڈھنگ بھی معلوم ہے۔ اور دوسرے سب باتوں میں نبی کی راہنمائی کے محتاج ہیں، انسان کو کسی موجد کی حاجت ہے۔ یہ حضرات اپنی فطرت کے مقتضی کے پیچھے رہتے ہیں اور اس سے وہ تعلیم و تفہیم مستغنی ہو جاتے ہیں جن کو لوگ یاد کرتے ہیں اور دستور زندگی بناتے ہیں۔ کیونکہ دنیائے معمولی کا ملو باری، زراعت، سوداگری وغیرہ تقلید (پیروی) کے بغیر سرانجام نہیں پا سکتے۔ عام لوگوں کے لئے ان میں اسلاف سے منقول طریقوں کی پیروی ضروری ہوتی ہے، پھر دین اور تہذیب نفس کا معاملہ، جو یا تو بعض لوگوں ہی کے حصہ میں آتا ہے، تقلید انبیاء کے بغیر کیسے درست ہو سکتا ہے؟ اور یہیں سے یہ بات بھی سمجھ میں آتی ہے کہ انبیائے کرام علیہم الصلوۃ والسلام کی شدید ضرورت کیوں ہے؟ اور ان کی سنتوں کی پیروی اور ان کی باتوں سے تمسک کیوں ضروری ہے؟ باقی اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں!

﴿باب اختلاف الناس في السعادة﴾

اعلم أن الشجاعة وسائر الأخلاق كما يختلف أفراد الإنسان فيها:

فمنهم: الفاقد الذي لا يرجى له حصولها أبدا، لقيام هيئة مضادة في أصل جبلته، كالمخنث، وضعيف القلب جدا بالنسبة إلى الشجاعة

ومنهم: الفاقد الذي يُرجى له ذلك بعد ممارسة أفعال وأقوال وهيئات تناسبها، وتلقّي ذلك من أهلها، وتذكر أحاديث أئمتها، وما جرى عليهم من الحوادث في الأيام، فثبتوا في الشدائد، وأقدموا على المهالك.

ومنهم: الذي خُلق فيه أصلُ الخُلق، ولا تزال تنبجسُ له فلتاتٌ كلَّ حين، فإذا أُمر يحبس نفسه عنها ضاق عليه الأمر، وسكت على غَيْظ، وإذا أُمر بما يناسب جبلته كان كالكبريت يتصل به النار، فلا يتراخى احتراقه.

ومنهم: الذي خُلق فيه الخُلق كاملا وافرا، ويندفع إلى مقتضياته ضرورةً، وإن دُعي إلى

اور منجملہ ان کے: (وصف شجاعت کو) اپنا کام کرنے والا ہے، جس کے لئے اس وصف کی امید ہوتی ہے، ایسے افعال واقوال واحوال کی ممارست (مشق) کے بعد جو وصف شجاعت کے مناسب ہوں۔ اور یہ وصف بہادروں سے حاصل کرنے کے بعد اور بہادری کے پیشواؤں کے واقعات یاد کرنے کے بعد، اور وہ باتیں یاد کرنے کے بعد جو ان حضرات پر گزشتہ زمانہ میں گزری ہیں، یعنی وہ سختیوں میں ثابت قدم رہے اور خطرات میں انہوں نے اقدامات کئے۔

اور منجملہ ان کے: وہ شخص ہے جس میں اصل ملکۂ شجاعت پیدا کیا گیا ہے اور برابر ہر لحظہ اس کے اندر شجاعت کی ترغیب ابھرتی رہتی ہیں۔ پس اگر وہ حکم دیا جائے کہ وہ خود کو جوانمردی کے کاموں سے روکے تو اس پر یہ بات نہایت شاق گذرتی ہے اور وہ غصہ سے بھرا ہوا خاموش رہتا ہے۔ اور اگر اس کو اس کی جبلت کے مناسب کام کا حکم دیا جائے تو وہ اس گندھک کی طرح ہوتا ہے جس کو آگ لگتی ہے تو اس کے بھڑکنے میں ذرا دیر نہیں لگتی۔

اور منجملہ ان کے: وہ شخص ہے جس میں وصف شجاعت وافر وکامل پیدا کیا گیا ہے۔ اور وہ اس وصف کے تقاضوں کی طرف خود بخود چلتا ہے اور اگر وہ — بطور فرض — بزدلی کی طرف نہایت سختی سے بلایا جائے تو وہ اس کو قبول نہیں کرتا۔ اور اس کے لئے بغیر کسی ریت اور دعوت کے فطری طور پر آسان ہے اس وصف (شجاعت) کے کاموں کی طرف، اور اس کے مناسب حال شکلوں کی طرف نکلنا۔ اور یہی شخص اس وصف میں "پیشوا" ہے۔ اسے قطعاً کسی دوسرے پیشوا کی ضرورت نہیں۔ اور ان لوگوں پر جو اس وصف میں اس سے کم تر ہیں واجب ہے کہ وہ اس کے طریقہ کو مضبوط تھامیں، اور اس کی ریت کو دانتوں سے پکڑیں۔ اور اس کی سیرتوں کی بہ تکلف نقل کریں، اور اس کے واقعات کو یاد کریں، تاکہ وہ اس کمال کی طرف نکلیں جس کی ان کے لئے امید باندھی گئی ہیں، یعنی بہادری میں سے جتنی ان کے لئے مقدر کی گئی ہے۔

پس اسی طرح لوگ مختلف ہیں اس اخلاق میں (یعنی بہیمیت کو نفس ناطقہ کا مطیع بنانے میں، اور خواہش پر عقل کی فرماں روائی قائم کرنے میں) جس پر لوگوں کی سعادت (نیک بختی) کا مدار ہے۔

پس منجملہ ان کے: (وصف سعادت کو) نہ کام کرنے والا ہے، جس کے لئے اس وصف کے حصول کی (یعنی حاصل ہونے کی) امید نہیں، جیسے وہ لڑکا جس کو خضر نے قتل کیا تھا، وہ کافر پیدا کیا گیا تھا۔ اور اسی قسم کی طرف اس ارشاد نبوی میں اشارہ ہے کہ: "بہرے، گونگے، اندھے ہیں۔ پس وہ نہیں لوٹیں گے"

اور منجملہ ان کے: (وصف سعادت کو) اپنا کام کرنے والا ہے جس کے لئے اس وصف کی امید ہے سخت ریاضتوں کے بعد، اور مسلسل ایسے اعمال کرنے کے بعد جن سے وہ بے نفس کی باگ گیر کرتا ہے۔ اور یہی شخص انبیاء کی پیروی، دعوت اور ان سے منقول سنتوں کا محتاج ہے۔ اور دنیا میں پائے جانے والے بیشتر لوگ اسی قبیل سے ہیں۔ اور بعثت انبیاء سے اولاً اور بالذات یہی لوگ مقصود ہیں۔

اور منجملہ ان کے: وہ شخص ہے جس میں اجمالاً یہ وصف ترکیب دیا گیا ہے۔ اور اس سے اس وصف کی ترغیبیں ابھرتی رہتی

ہیں مگر وہ اس وصف کی تفصیلات میں اور ان کی شکلوں کو تیار کرنے میں اس انداز پر جو اس وصف کے مناسب ہیں، بہت سی باتوں میں جو اس وصف کے مناسب ہیں، کسی امام کا محتاج ہے، اور اسی کے حق میں ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ: "اس کا تیل قریب ہے کہ روشن ہو جائے، اگرچہ اس کو آگ نے نہ چھوا ہو" اور یہی لوگ سباق غایات ہیں۔

اور منجملہ ان کے انبیاء ہیں۔ ان کے لئے آسان ہے (۱) اس اخلاق کے کمال کی طرف ڈھلنا اور اس کے مناسب حال شکلوں کو اختیار کرنا (۲) اور اس وصف میں سے جو فوت ہو جائے اس کو دوبارہ حاصل کرنے کا طریقہ نکالنا (۳) اور موجود کو باقی رکھنا (۴) اور ناقص کی تکمیل کا طریقہ اختیار کرنا۔ کسی پیشوا اور کسی دعوت کے بغیر۔ پس ان حضرات کے اپنی فطرت کے مقتضیٰ پر چلتے رہنے سے جو شکلیں ہوتی ہیں وہ سنتیں ہیں جن کو لوگ یاد کرتے ہیں اور جن کو دستور زندگی بناتے ہیں۔ اور لوگ ان کو دستور زندگی کیوں نہ بنائیں جبکہ لوہاری، سوداگری اور ان کے مانند کام، عام لوگوں سے حاصل نہیں ہوتے مگر ان کے اسلاف سے منقول طریقوں (کی پیروی) سے، پس آپ کا کیا خیال ہے ان شریف (نہایت اہم) مقاصد کے بارے میں جن کی راہ با توفیق لوگوں کے علاوہ کوئی نہیں پاتا؟ اور اسی باب سے مناسب ہے کہ جان لی جائے انبیاء کی شدید ضرورت، اور ان کی سنتوں کی پیروی اور ان کی باتوں میں مشغول ہونے کا وجوب، باقی اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں۔

لغات:

الخُلُق والخُلْق: طبعی خصلت، عادت جمع اخلاق — انبجس الماءُ: پانی جاری ہونا، بہنا — الفلتة: غور و فکر کے بغیر کیا ہوا کام، ترتیب، جوش و ولولہ — الدیمة: مسلسل عمل، اصل معنی ہیں مسلسل بارش جس میں چمک اور گرج نہ ہو — الحثیثة: تیز برانگیختہ کرنے والی حثه على الأمر: آمادہ، برانگیختہ کرنا۔

باب — ۳

تحصیل سعادت کے مختلف طریقے

بہیمیت کو روح ربانی کے تابع کرنا، خواہش نفس پر عقل کی حکمرانی قائم کرنا، اور بہیمیت پر نفس ناطقہ کو اور خواہشات پر عقل کو غالب کرنا حقیقی نیک بختی ہے۔ یہ نیک بختی دو طریقوں سے حاصل کی جا سکتی ہے:

اول: نفس کشی کے ذریعہ یہ سعادت حاصل کی جائے۔ مگر یہ نہایت مشکل طریقہ ہے، نفس کو کچلنا آسان نہیں۔ اور اس طریقہ میں کامیابی کا تناسب بھی ایک فی صد سے زیادہ نہیں۔ اشراقی حکماء، مجذوب صوفیاء، سادھو سنت اور عیسائی راہب اسی طریقہ کو اختیار کرتے ہیں، اور بہت کم کامیاب ہوتے ہیں۔

دوم: نفس کی اصلاح کر کے یہ سعادت حاصل کی جائے۔ یہ ایک بے خطر راہ ہے اور اس طریقہ میں کامیابی بھی صد فی صد ہے۔ اور یہ راہ ہر کسی کے لئے آسان ہے۔ اس لئے انبیاء کے ذریعہ یہی طریقہ لوگوں کو سکھلایا گیا ہے۔ اور پہلے طریقہ کی طرف صرف اشارے کئے گئے ہیں — یہ اس باب کا خلاصہ ہے۔ اب تفصیل پیش کی جاتی ہے:

حقیقی نیک بختی دو طریقوں سے حاصل کی جا سکتی ہے:

پہلا طریقہ: آدمی بہیمیت سے بالکل جدا ہو جائے۔ خواہشاتِ نفس کو کچل دے۔ زاہدانہ زندگی اختیار کرے۔ اور نفس بہیمی کی چاہتوں پر پانی پھیر دے تو نیک بختی حاصل ہو سکتی ہے۔ اور نفس کو کچلنے کا طریقہ یہ ہے کہ ایسی تدبیریں اختیار کرے جن سے بہیمیت کے احکام وتقاضے رک جائیں، نفس کی تیزی ٹوٹ جائے اور اس کے علوم وحالات کی لپٹیں بجھ جائیں۔ اور جبروت یعنی ذاتِ باری کی طرف، جو ماورائے جہات ہستی ہے، توجہ مرکوز کر دے۔ اور نفس کو ایسے علوم حاصل کرنے کی طرف متوجہ کرے جو زمان ومکان کی قید کے ساتھ مقید نہیں ہیں۔ زمان ومکان کا دائرہ ہمارے اس مادی عالم تک ہے۔ یعنی آدمی دنیوی علوم سے دست بردار ہو کر لاہوتی (ذات وصفات کے) علوم میں پوری طرح مشغول ہو جائے اور ایسی لذتوں میں دلچسپی لینے لگے جو لذائذ شہوانی کے قبیل سے نہیں ہیں، بلکہ روحانی لذتیں ہیں۔ اور لوگوں سے قطعاً میل جول چھوڑ دے حتی کہ اہل وعیال کے خرخشوں سے بھی آزاد ہو جائے۔ اور انسانی مرغوبات سے بے رغبت ہو جائے اور ملکوتی رغبتوں کو اپنی رغبتیں بنا لے۔ اور فقر وبیماری اور بے عزتی وبے وقعتی کے جو اندیشے لوگوں کو گھیرے رہتے ہیں ان سے بالاتر ہو جائے۔ اور انسانوں کی بستی چھوڑ کر جنگل باسی اور سنیاسی بن جائے۔ غرض نفس میں نفسانیت کی خوبو بھی باقی نہ چھوڑے۔ اور مرنے سے پہلے مر کر رہ جائے۔

سعادت حاصل کرنے کا یہ طریقہ اشراقی حکماء اور مجذوب صوفیاء اختیار کرتے ہیں۔ اور بہت کم کامیاب ہوتے ہیں۔ اکثر لوگ تو آخری منزل کے اشتیاق ہی میں مر جاتے ہیں۔ اُن کی نگاہیں زندگی بھر آخری حد کی طرف اٹھی رہتی ہیں اور وہ یہ نمائش کرتے ہیں کہ گویا وہ آخری منزل پر پہنچ گئے ہیں، حالانکہ دلی ہنوز دور است!

دوسرا طریقہ: آدمی بہیمیت کو باقی رکھتے ہوئے اس کو سنوار لے اور اس کی کجی کو دور کر کے اس کو سیدھا کر لے تو نیک بختی حاصل ہو سکتی ہے۔ اور بہیمیت کو سنوارنے کا طریقہ یہ ہے کہ جس طرح گونگا آدمی اپنے اشاروں سے لوگوں کی باتوں کی نقل کرتا ہے اور جس طرح ایک مصور اپنی تصویر کے ذریعہ وجدانی کیفیات: خوف وشرمندگی وغیرہ کی منظر کشی کرتا ہے اور جس طرح مرنے والے بچے کی ماں پرسوز کلمات اور گلوگیر آواز سے اپنی دردمندی کا ایسا اظہار کرتی ہے کہ جو سنتا ہے غمگین ہو جاتا ہے۔ اور اس کی نگاہوں کے سامنے اس عورت کی مصیبت زدگی کا نقشہ گھوم جاتا ہے۔ اسی طرح قوتِ بہیمی سے ایسے کام کرائے جائیں جن سے نفس ناطقہ کے احوال کی ترجمانی ہوتی رہے۔ نفس ناطقہ کے احوال: پاکیزگی، نیک روی، سیر چشمی، فیاضی، بارگاہِ خداوندی میں انکساری اور نیازمندی، صدق وامانت اور عدالت وغیرہ ہیں۔ یعنی بہیمیت سے ایسے

کام کرائے جائیں۔ اس کو ایسی شکلیں اختیار کرنے کا مکلف کیا جائے، اور ایسے اذکار کا پابند بنایا جائے جن سے نفس ناطقہ کی مذکورہ کیفیات کی ترجمانی ہوتی رہے۔ اور ظاہر چونکہ باطن پر اثر انداز ہوتا ہے اس لئے رفتہ رفتہ نفس سنور جائے گا اور اس کی کجی دور ہو جائے گی اور وہ روح ربانی کی اطاعت قبول کرلے گا، اور یہی حقیقی نیک بختی ہے۔

﴿باب توزُّع الناس في كيفية تحصيل هذه السعادة﴾

اعلم أن هذه السعادة تُحْصَلُ بوجهين:

أحدهما: ما هو كالانسلاخ عن الطبيعة البهيمية، وذلك: أن يتمسك بالحيل الجالبة لركود أحكام الطبيعة، وخمود سَوْرتها، وانطفاء لَهَب علومها وحالاتها، ويُقْبِلَ على التوجه التام إلى ما وراء الجهات من الجبروت، وقبول النفس لعلوم مفارقة عن الزمان والمكان بالكلية، ولذات مباينة للذات المألوفة من كل وجه، حتى يصير لا يخالط الناس، ولا يرغب فيما يرغبون، ولا يرهب مما يرهبون، ويكون منهم على طرف شاسع، وصقع بعيد.

وهذا هو الذي يرومه المتألهون من الحكماء، والمجذوبون من الصوفية، فوصل بعضهم غاية مداها، وقليل ما هم! ويبقى آخرون مشتاقين لها، طامحين أبصارَهم إليها، متكلفين لمحاكاة هيئتها.

وثانيهما: ما هو كالإصلاح للبهيمية، والإقامة لعوجها، مع بقاء أصلها؛ وذلك: أن يسعى في محاكاة البهيمية ما عند النفس النُّطقية، بأفعال وهيئات، وأذكار، ونحوها، كمثل ما يحاكي الأخرسُ أقوال الناس بإشاراته؛ والمصوِّرُ أحوالاً نفسانية: من الوجل والخجل بهيئات مُبْصَرة، يوجدها متناسبة متشابكة مع تلك الأحوال؛ والثكلى تَفَجُّعَها بكلمات وترجيعات، لا يسمعها أحد إلا حزن، وتمثل عنده صورةُ الفجع.

ترجمہ: اس سعادت کی تحصیل کی کیفیت میں لوگوں کے اختلاف کا بیان: جان لیں کہ یہ سعادت دو طریقوں سے حاصل کی جاتی ہے:

ان میں سے ایک: وہ ہے جو گویا طبیعت بہیمیہ سے نکل جانے کی طرح ہے۔ اور وہ اس طرح کہ ایسی تدبیریں مضبوط پکڑے جو طبیعت کے احکام (تقاضوں) کے ٹھہرنے کو، اور اس کی تیزی کے ختم کرنے کو، اور اس کے علوم اور اس کے حالات کی لپٹوں کے بجھنے کو کھینچنے والی ہوں۔ اور پوری طرح سے متوجہ ہو جہات سے ورا ہستی یعنی جبروت کی طرف، اور نفس کے قبول کرنے کی طرف ایسے علوم کو جو زمان ومکان سے بالکلیہ جدا ہیں، اور ایسی لذتوں کی طرف جو ہر

اعتبار سے مالوف (پیاری) لذتوں سے مبائن ہیں۔ حتی کہ وہ لوگوں سے اختلاط قطعاً ترک کردے۔ اور ان چیزوں کی رغبت نہ کرے جن کی لوگ رغبت کرتے ہیں۔ اور ان چیزوں سے نہ ڈرے جن سے لوگ ڈرتے ہیں۔ اور ہو جائے وہ لوگوں سے دور کنارے میں اور بعید جگہ میں۔

اور یہی وہ طریقہ ہے جس کا قصد کرتے ہیں حکماء میں سے اللہ والے بنے والے لوگ، اور صوفیاء میں سے مجذوب لوگ۔ پس ان میں سے جو لوگ اس طریقہ کی آخری حد کو پہنچے، اور وہ بہت کم ہیں، اور رہ گئے باقی لوگ منزل کی آخری حد کے اشتیاق میں نگاہیں اٹھائے ہوئے آخری حد کی طرف، بہ تکلف نقل کرتے ہوئے آخری حد کی شکلوں کی۔

اور ان میں سے دوسرا طریقہ: وہ ہے جو بہیمیت کو سنوارنے اور اس کی کجی کو سیدھا کرنے کی طرح ہے۔ بہیمیت کی اصل باقی رہتے ہوئے۔ اور وہ اس طرح کہ بہیمیت سے نقل کرانے کی کوشش کی جائے ان احوال کی جو نفس ناطقہ (روح ربانی) کے پاس ہیں: افعال واشکال واذکار وغیرہ کے ذریعہ، گونگے آدمی کے نقل کرنے کی طرح لوگوں کی باتوں کی اپنے اشاروں سے۔ اور تصویر کشی کرنے والے کے نقل کرنے کی طرح نفسانی (وجدانی) احوال کی یعنی خوف و شرمندگی کی بانظر آنے والی شکلوں کے ذریعہ مصور ان تصویروں کو بناتا ہے ان احوال کے ساتھ ملا جلا خلط ملط، اور بچہ فوت کرنے والی عورت کے نقل کرنے کی طرح اپنی دردمندی کو ایسے کلمات اور حلق میں آواز گھمانے کے ذریعہ کہ جو بھی اس کو سنتا ہے غمگین ہو جاتا ہے۔ اور دردمندی کا نقشہ اس کی نگاہوں کے سامنے کھنچ جاتا ہے۔

لغات:

توزّع: اختلاف، اصل معنی پراگندہ ہونا ... حَصَّلَ الشیءَ: حاصل کرنا ... اِنسلخ عنہ: نکل جانا اِنسلخت الحیۃ عن قشرھا: سانپ کا کینچلی سے نکل جانا ... الحیل مفرد الحیلۃ: تدبیر ... جلب: اکٹھا کرلانا، کھینچنا ... رکد (ن) رُکودًا: ٹھہرنا ... سَوْرۃ: تیزی، جوش ... شابع: بعید ... صقع: کنارہ ... تألّہ: با خدا ہونا ... مجذوب (اسم مفعول) جذبہ (ض) جذبًا: کھینچنا الجذب: کشش، کھچاوٹ، وہ حالات جو مجذوب فقیروں کے لئے مخصوص ہیں ... الغایۃ: آخری حد ... التمدّی: نہایت، انتہا ... تفجّع: اظہار درد ... رام الشیءَ (ن) رَوْمًا ومرامًا: قصد کرنا ... ثکل (س) ثُکلًا وثَکَلًا اب: گم کرنا ... رَجَّع فی صوتہ: حلق میں آواز گھمانا، مصیبت کے وقت إنّا للہ پڑھنا۔ اس صورت میں ترجیعات اور کلمات میں عام خاص مطلق کی نسبت ہوگی۔

تصحیح: مع بقاء اصل میں مع تعلق ہے، جو تصحیف ہے مخطوطہ کراچی سے تصحیح کی ہے ... یوجدھا اصل میں اور تینوں مخطوطوں میں یجدھا ہے۔ یہ تصحیح حضرت مولانا سندھی رحمہ اللہ نے کی ہے ... طامحین اصل میں طامحۃ تھا، یہ تصحیح مخطوطہ کراچی سے کی ہے۔

ترکیب: من الجبروت بیان ہے ما موصولہ کا ... متشائلین، طامحین، متکلفین احوال ہیں ... بافعال بالغ معاکاۃ سے متعلق ہے ...... فانہ تحاکی میں با مصدریہ ہے۔

تشریحات: (۱) جہت اشارۂ حسیہ کی آخری حد کو یا حرکت مستقیمہ کی آخری حد کو کہتے ہیں۔ جہتیں چھ ہیں، دو حقیقی اور چار اضافی (تفصیل معین الفلسفہ ص ۱۴۳ میں ہے) عالم جہات اس مادی عالم کو کہتے ہیں اور ماورائے جہت: عالم طبیعی سے آگے کی دنیا کو کہتے ہیں۔

(۲) السمالہ: وہ شخص جو انتہائی جدوجہد کرے اور پوری توجہ اور سخت ریاضتیں کرے تاکہ اس کے باطن میں جلا، صفائی اور چمک پیدا ہو۔ اس کو اشراقی بھی کہتے ہیں۔ اشراق کے معنی ہیں چمکنا۔ ریاضتیں کرنے سے باطن روشن ہوتا ہے اس لئے اس کو اشراقی کہتے ہیں۔ یہاں فلاسفہ میں سے تارک الدنیا، تجرد کی زندگی اختیار کرنے والے لوگ مراد ہیں۔

(۳) جذب اور مجذوب کے معنی شاہ صاحب رحمہ اللہ نے التفہیمات جلد دوم تفہیم ۲۴۸ میں بیان کئے ہیں، دلچسپی رکھنے والے حضرات اس کی مراجعت کریں۔

☆ ☆ ☆

نیک بختی حاصل کرنے کے لئے کونسا طریقہ بہتر ہے؟

اس کے بعد جاننا چاہئے کہ نیک بختی حاصل کرنے کے مذکورہ دونوں طریقوں میں سے بہتر طریقہ دوسرا ہے، کیونکہ خداوند عالم نے اس عالم کے نظم و انتظام میں تین باتوں کا لحاظ رکھا ہے:

① نظام عالم کے لئے جو بہتر سے بہتر اور آسان سے آسان طریقہ ہوتا ہے وہ اختیار کیا جاتا ہے۔

② اصلاح کا وہ طریقہ اختیار کیا جاتا ہے جو عام انسانوں کے لئے مفید ہوتا ہے، اکا دکا لوگوں کے لئے جو طریقہ مفید ہوتا ہے وہ نہیں اپنایا جاتا۔

③ دونوں عالم کی مصلحتیں ایک ساتھ ملحوظ رکھی جاتی ہیں۔ ایسا طریقہ اختیار نہیں کیا جاتا جس سے دنیا کا یا آخرت کا نظام درہم برہم ہو جائے۔

مذکورہ تینوں باتیں صرف دوسرے طریقے میں پائی جاتی ہیں۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے لطف و مہر سے رسولوں کو اولاً اور بالذات دوسرے طریقہ کو قائم کرنے کے لئے اور اس کی دعوت دینے کے لئے اور اس پر ابھارنے کے لئے بھیجا ہے۔ اور پہلا طریقہ صرف اشارۃً بیان فرمایا ہے، اور ساتھ ہی یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا پسندیدہ طریقہ نہیں۔ سورۃ الحدید آیت ۲۷ میں ہے۔

وَرَهْبَانِيَّةَ ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ إِلَّا ابْتِغَاءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا

اور رہبانیت کو خود ایجاد کیا تھا، ہم نے اُن پر اس کو واجب نہ کیا تھا، لیکن انھوں نے حق تعالیٰ کی رضا کے واسطے اس کو اختیار کیا تھا، سو انھوں نے اس کی پوری رعایت نہ کی۔

یعنی جس غرض سے رہبانیت ان لوگوں نے اختیار کی تھی، وہ غرض طلب رضائے حق تھی، مگر ان لوگوں نے اس کا اہتمام نہ کیا، گو وہ صورۃً راہب (تارک الدنیا) بنے رہے مگر در پردہ سب کچھ کرتے رہے! اسی لئے اسلام میں رہبانیت نہیں ہے۔ زبان زد جملہ ہے: لَا رَهْبَانِيَّةَ فِي الْإِسْلَامِ اسلام کی رہبانیت جہاد فی سبیل اللہ، سرحدوں کی حفاظت، حج کرنا اور مسجد میں نماز کے انتظار میں بیٹھنا ہے۔

پہلے طریقہ کے نقائص: نیک بختی حاصل کرنے کا پہلا طریقہ پانچ وجوہ سے موزون نہیں:

۱- پہلے طریقے پر ہر کوئی عمل پیرا نہیں ہوسکتا۔ صرف لاہوتی کشش رکھنے والے حضرات ہی اس طریقہ کو اپنا سکتے ہیں اور وہ ہیں کتنے؟!

۲- پہلے طریقہ میں سخت ریاضتوں کی اور کامل یکسوئی کی ضرورت پڑتی ہے۔ اور ایسا کرنے والے بھی بہت کم لوگ ہیں۔

۳- پہلے طریقہ سے درجہ کمال تک وہی لوگ پہنچتے ہیں، جن کو اپنی معاش کی کچھ نہیں پڑی، نہ ان کو دنیا کی کوئی رغبت ہے اور یہ بات انسانی فطرت کے مطابق نہیں۔

۴- پہلے طریقہ کے لئے دوسرے طریقہ کی اچھی خاصی مقدار کو مقدم کرنا ضروری ہے یعنی جب دوسرے طریقے پر ریاضتیں کرکے بہیمیت کو کمزور کرلے گا تبھی اس سے پیچھا چھوٹے گا۔ شروع ہی سے پہلا طریقہ اختیار نہیں کیا جاسکتا، پس ایسا طریقہ اختیار کرنے میں کیا فائدہ جو خود دوسرے طریقہ کا محتاج ہو۔

۵- پہلے طریقہ میں دو مفید باتوں میں سے ایک کو ضرور چھوڑنا پڑے گا۔ یا تو ارتفاقات کو بالائے طاق رکھنا ہوگا یا نفس کو آخرت کے لئے سنوارنے کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوگا۔

خلاصہ یہ کہ اگر اکثر لوگ پہلے طریقہ کو اپنائیں تو دنیا ویران ہوجائے اور سب لوگوں کو پہلے طریقہ کا مکلف بنانا تکلیف بالمحال کے قبیل سے ہے۔ اس لئے کہ ارتفاقات امور فطریہ جیسے ہوگئے ہیں۔ اور فطری چیزیں چھوڑی نہیں جاسکتیں۔ اور ارتفاقات کی رعایت کے ساتھ پہلے طریقے کو اپنانا ممکن نہیں ہے۔

دوسرے طریقے کی خوبیاں: اور دوسرے طریقہ سے درجہ کمال تک خداداد فہم والے اور وہ لوگ پہنچتے ہیں جن کی ملکیت اور بہیمیت میں مصالحت ہوتی ہے۔ اور وہ خداداد فہم والے آٹھ حضرات ہیں: یعنی کامل، حکیم، خلیفہ، مؤید بروح القدس، مزکی، امام، منذر اور نبی (تفصیل مبحث سادس باب دوم میں ہے) یہی حضرات دین و دنیا کی ایک ساتھ قیادت

اس کی طرف دعوت دینے کے لئے، اور اس پر ابھارنے کے لئے مبعوث فرمائیں۔ اور پہلے طریقہ کی طرف صرف التزامی اشارات اور مخفی ایماءات سے راہنمائی فرمائیں اور برہان کامل اللہ ہی کے لئے ہے۔

اور اس کی تفصیل یہ ہے کہ پہلا طریقہ ان لوگوں سے بن پڑتا ہے جو نا ہموتی کشش والے ہیں، اور وہ بہت تھوڑے ہیں اور سخت ریاضتوں اور کامل ترین یکسوئی کے ذریعہ حاصل ہو سکتا ہے۔ جو ایسا کرنے والے بہت کم ہیں۔ اور پہلے طریقہ کے پیشوا وہی لوگ ہیں جنھوں نے اپنی معاش کو رائیگاں کر دیا ہے۔ اور ان کے لئے دنیا میں کوئی رغبت نہیں ہے اور پہلا طریقہ، دوسرے طریقے کی اچھی خاصی مقدار کو مقدم کئے بغیر تکمیل پذیر نہیں ہو سکتا۔ اور پہلا طریقہ دو نیک بختیوں میں سے ایک کو رائیگاں کرنے سے خالی نہیں: (۱) دنیا میں ارتفاقات کو سنوارنا (۲) اور نفس کو آخرت کے لئے سنوارنا ——— پس اگر بیشتر لوگ پہلے طریقہ کو اپنا لیں تو دنیا ویران ہو جائے۔ اور اگر لوگوں کو پہلے طریقہ کا مکلف کر دیا جائے تو وہ تکلیف بالمحال کی طرح ہوگا۔ کیونکہ ارتفاقات امورِ فطریہ کی طرح ہو گئے ہیں۔

اور دوسرے طریقہ کے پیشوا خداداد فہم والے اور مصالحت والے حضرات ہیں۔ اور وہی دین و دنیا کی ایک ساتھ سرداری کرنے والے ہیں اور انھی کا پیغام مقبول ہے اور انھیں کا طریقہ قابل اتباع ہے، اور اسی میں تابعین اور اصحاب یمین میں سے مصالحت والے لوگوں کا کمال منحصر ہے اور دنیا میں یہی لوگ زیادہ پائے جاتے ہیں۔ اور اسی طریقہ پر ذکی و غبی اور مشغول و فارغ عمل پیرا ہو سکتے ہیں اور اس میں کسی قسم کی تنگی نہیں۔ اور یہ طریقہ آدمی کے لئے کافی ہے، اپنے نفس کی اصلاح کے لئے اور اس کی کجی کو دور کرنے کے لئے اور نفس سے ان تکالیف کو ہٹانے کے لئے جن کا آخرت میں اندیشہ ہے، کیونکہ ہر نفس کے لئے (آخرت میں) ایسے مخلوق کام ہیں جن کے موجود ہونے سے نفس راحتیں پاتا ہے، اور جن کے مفقود ہونے سے نفس تکلیفیں اٹھاتا ہے۔

لغات:

مضوی: نالی جگہ۔ الفذ: اکیلا، نفس فاذۃ: اکیلا شخص۔ انخرم: پھٹ جانا، شگاف پڑ جانا۔ لوّح تلویحا: دور سے اشارہ کرنا۔ لا غرو یعنی لا عجب۔ المفہم (اسم مفعول) فہمہ: سمجھانا، یہ اصطلاح ہے، مراد وہ حضرات ہیں جن کو اللہ نے دین کا خصوصی فہم عطا فرمایا ہے۔ ذو: صاحب، والا، جمع ذوو، نون اضافت کی وجہ سے گر گیا ہے۔

تشریح:

لفظ کی معنی موضوع لہ کے جز پر دلالت تضمنی کہلاتی ہے، جیسے انسان کی صرف حیوان پر دلالت۔ اور لفظ کی کسی ایسے معنی پر دلالت جو معنی موضوع لہ سے علیحدہ ہوں، مگر معنی موضوع لہ سے خصوصی تعلق رکھتے ہوں، التزامی کہلاتی ہے، جیسے حاتم کی دلالت سخاوت پر۔

ترجمہ: رہے مجرد ہونے کے احکام (یعنی علوم) تو ابھی قبر اور حشر کی زندگیاں (ان علوم کو) نفس کی طرف لائیں گی، ایسے طور سے کہ اس کو پتہ بھی نہیں چلے گا، نفس کی فطرت کے تقاضے سے، تھوڑی مدت کے بعد۔ جو شعر

عنقریب ظاہر کرے گا تیرے لئے زمانہ وہ باتیں جو تو نہیں جانتا

اور تیرے پاس وہ شخص خبریں لائے گا جس کے لئے تو نے توشہ تیار نہیں کیا

اور حاصل کلام یہ ہے کہ خیر کی شکلوں کا احاطہ اور استقصاء اکثر لوگوں کے حق میں محال جیسا ہے اور جمل بعید نہیں، واللہ اعلم

لغات: تجرُّد: تنہا ہونا۔ یہاں مراد نفس کا حقیقۃً یا عملاً مادہ سے مجرد ہونا ہے ۔ النَّشْأَۃ: زندگی، پیدائش۔ سورۃ الواقعہ آیت ۶۲ میں ہے: وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ النَّشْأَۃَ الْأُولٰى ۔ اِسْتَقْصَى المسألۃ: مسئلہ کی تہ کو پہنچنا۔

تشریح:

(۱) کچھ علوم وہ ہیں جو مادہ کے ساتھ آلودگی کی حالت میں حاصل نہیں ہو سکتے، جب آدمی حقیقۃً یا عملاً مادہ سے جدا ہوتا ہے اس وقت وہ علوم حاصل ہوتے ہیں۔ یہ علوم، روحانی علوم، ملکوتی علوم، اخروی علوم، ربانی علوم، غیبی علوم وغیرہ کہلاتے ہیں۔ احکام التجرد سے یہی علوم مراد ہیں۔

(۲) ہر زندگی کی ایک فطرت ہے، اس زندگی میں فطری طور پر اس کے علوم حاصل ہوتے ہیں۔ مثلاً بچپن اور جوانی الگ الگ زندگیاں ہیں، صغر سنی میں جوانی کے علوم حاصل نہیں ہو سکتے اور بالغ ہوتے ہی اس زندگی کے علوم و احکام آدمی کو حاصل ہو جاتے ہیں، اس طرح کہ پتہ بھی نہیں چلتا کہ کب اور کیسے جوانی کے علوم حاصل ہو گئے۔ اسی طرح آنے والی زندگیوں کی بھی ایک فطرت ہے، جب آدمی مر کر ان زندگیوں میں پہنچے گا تو روحانی علوم جو ان زندگیوں کے مخصوص علوم ہیں خود بخود حاصل ہو جائیں گے اور آدمی کو پتہ بھی نہیں چلے گا کہ کب اور کیسے وہ علوم حاصل ہو گئے۔ واللہ اعلم

باب ــــ ۴

وہ اصول جو سعادت حاصل کرنے کے طریق ثانی کی تحصیل کا مرجع ہیں

گذشتہ باب میں سعادت حقیقیہ حاصل کرنے کے دو طریقے بیان کئے گئے ہیں: ایک: بہیمیت کو کچل کر کے نیک بختی حاصل کرنا۔ دوسرا: بہیمیت کو سنوار کر کے نیک بختی حاصل کرنا۔ پہلا طریقہ مشکل اور چونکہ زیادہ پسندیدہ نہیں ہے اور دوسرا طریقہ آسان اور پسندیدہ ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کو دوسرے طریقہ کی تعلیم دینے کے لئے مبعوث فرمایا ہے، وہ لوگوں کو اسی طریقہ کی ترغیب دیتے ہیں۔

اب اس باب میں یہ بیان ہے کہ دوسرے طریقے سے سعادت حاصل کرنے کی راہیں اور شکلیں تو بہت ہیں ساتھ

شرائع اور قرآن و حدیث اس کی تفصیلات سے بھرے پڑے ہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ نے شاہ صاحب رحمہ اللہ کو اپنے خاص فضل سے یہ بات سمجھادی ہے کہ سب بے پناہ تفصیلات کا مرجع اور خلاصہ چار باتیں ہیں:

۱۔طہارت (پاکی) ۲۔اخبات (نیاز مندی) ۳۔سماحت (فیاضی) ۴۔عدالت (انصاف)

یہ چاروں باتیں درحقیقت نفس کی کیفیات ہیں، اور ان کے پیکر ہائے محسوس اعمال ہیں یعنی ہم جن چیزوں کو پاکی، فیاضی اور انصاف وغیرہ کہتے ہیں وہ دراصل ان کے اسباب وموجبات اور مظاہر و پیکر ہیں۔ اور شریعت الٰہی یہ احکام جاری کرتی ہے اور انہی سے بحث کرتی ہے۔

یہ کیفیات کیسے پیدا ہوتی ہیں؟ جب روح، روانی بہیمیت کو زیر دست کرلیتی ہے، اور خواہی نخواہی اس سے خصال مذکورہ کے مناسب حال عمل کراتی ہے تو رفتہ رفتہ انسانی نفس (نسمہ) ان کیفیات کے ساتھ متصف ہو جاتا ہے۔ دیگر ملکات کا بھی یہی حال ہے جیسے کتابت کی مہارت مسلسل لکھتے رہنے سے حاصل ہوتی ہے۔ اسی طرح مذکورہ کیفیات بھی اعمال کے ذریعہ پیدا ہوتی ہیں۔

ان کیفیات کا فائدہ: یہ کیفیات ملائکہ کے احوال سے بے حد مشابہ ہیں۔ جب یہ کیفیات پیدا ہوتی ہیں تو آدمی ملکوتی صفات کا حامل ہو جاتا ہے اور ملائکہ کے ساتھ لاحق ہو جاتا ہے اور ان کے سلسلہ میں منسلک ہو جاتا ہے۔

پہلی صفت: طہارت (پاکی)

پہلی صفت: طہارت ہے۔ طہارت کی حیثیت صرف یہی نہیں ہے کہ وہ نماز وغیرہ عبادات کے لئے چولی اور لازمی شرط ہے، بلکہ وہ بذات خود بھی مطلوب ہے۔ مسلم شریف کی حدیث میں پاکی کو آدھا ایمان قرار دیا گیا ہے، اور قرآن کریم میں متعدد جگہ ہے کہ اللہ تعالیٰ خوب پاک وصاف رہنے والے بندوں سے محبت کرتے ہیں۔

طہارت کی حقیقت: اور طہارت کی حقیقت یہ ہے کہ سلیم الفطرت اور صحیح المزاج آدمی، جس کا دل ایسے سفلی تقاضوں سے فارغ ہو، جو غور و فکر میں مانع بنتے ہیں، جب نجاستوں میں آلودہ ہوتا ہے یا اس کو پیشاب پاخانہ کا سخت تقاضا ہوتا ہے یا وہ مباشرت اور اس کے مقدمات سے ابھی ابھی فارغ ہوا ہوتا ہے، تو وہ دل میں انقباض، تنگی اور گھٹن محسوس کرتا ہے اور خود کو بھاری بوجھ کے دبا ہوا پاتا ہے۔ پھر جب وہ پاک وصاف ہو جاتا ہے یعنی نہا لیتا ہے، وضو کر لیتا ہے، بول و براز سے فارغ ہو جاتا ہے، نہا دھو کر اچھے کپڑے پہن لیتا ہے اور خوشبو لگا لیتا ہے تو وہ انقباض دور ہو جاتا ہے اور اس کی جگہ انشراح و سرور و انبساط محسوس کرتا ہے۔ پہلی کیفیت حدث (ناپاکی) اور دوسری طہارت (پاکی) کہلاتی ہے۔ مگر طہارت کی یہ کیفیت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب آدمی نے اعمال طہارت روح ربانی کے تقاضے اور حکم سے کئے ہوں، محض دکھاوے کے لئے یا رسم و رواج کی تقلید میں نہ کئے ہوں، کیونکہ اعمال کا مدار نیتوں پر ہے۔ عبادت کی

نیت کرنے ہی سے مذکورہ کیفیت حاصل ہوتی ہے۔

طہارت وحدث میں فرق: جو شخص نیک خو ہے، درست فطرت رکھتا ہے اور اس کا وجدان صحیح ہے، وہ طہارت وحدث کی ان دونوں کیفیتوں کے فرق کو صحیح طور پر محسوس کرتا ہے، وہ اپنی فطرت کے تقاضے سے حدث کی حالت کو ناپسند اور طہارت کی حالت کو پسند کرتا ہے۔ اور کم درجہ آدمی جب بہیمیت کا حجاب دور کر لیتا ہے اور یکسوئی اختیار کرتا ہے اور یکسوئی سے دونوں حالتوں میں غور کرتا ہے تو وہ بھی دونوں حالتوں میں امتیاز کر لیتا ہے۔

طہارت کا فائدہ: طہارت کی یہ حالت فرشتوں کی حالت سے بہت مشابہت رکھتی ہے۔ ملائکہ کے احوال میں سے یہ ہے کہ وہ ہمیشہ بہیمی آلودگیوں سے پاک وصاف اور اپنی نورانی کیفیات پر شاداں وفرحاں رہتے ہیں۔ اس وجہ سے طہارت نفس انسانی کو کمال کے ساتھ متصف کرتی ہے۔

حدث کا نقصان: جب نفس انسانی کا نور بجھ جاتا ہے اور ہمہ وقت گندگیوں میں ملوث رہتا ہے تو اس میں شیاطین کے وساوس قبول کرنے کی استعداد پیدا ہو جاتی ہے۔ اور وہ حس باطن سے شیاطین کو دیکھنے لگتا ہے، اس کو ڈراؤنے خواب نظر آتے ہیں اور اس کی روح کو ظلمت گھیر لیتی ہے اور ملعون دکھنے والی چیزیں اس کے سامنے متمثل ہوتی ہیں۔

طہارت کے آثار: اور جب طہارت ملکہ راسخہ بن جاتی ہے، آدمی پوری طرح پاکی کا اہتمام کرنے لگتا ہے اور وہ طہارت کی حقیقت سے آگاہ ہو جاتا ہے تو اس میں ملائکہ کے الہامات قبول کرنے کی استعداد پیدا ہوتی ہے، کبھی اس کو فرشتے نظر بھی آتے ہیں، اس کو اچھے اچھے خواب نظر آتے ہیں اور اس پر علوی انوار ظاہر ہوتے ہیں اور پسندیدہ اور مبارک چیزیں اس کے سامنے متمثل ہوتی ہیں۔

نوٹ: طہارت وحدث کی مزید تفصیل بحث ششم کے باب (۸) میں اور قسم ثانی کے ابواب الطہارات اور ابواب الاحسان کے شروع میں آئے گی۔

﴿باب الأصول التي يرجع إليها تحصيل الطريقة الثانية﴾

اعلم: أن طرق تحصيل السعادة على الوجه الثاني كثيرة جداً، غير أني فهمني الله تعالى بفضله: أن مرجعها إلى خصال أربع، تتشبه بها البهيمية متى غلبتها النفس النطقية، وقسرتها على ما يناسبها، وهي أشبه حالات الإنسان بصفة الملأ الأعلى، مُعِدّة للحوقه بهم، وانخراطه في سلكهم.

وفهمني أنه إنما بُعث الأنبياء للدعوة إليها، والحث عليها، وأن الشرائع تفصيل لها، وراجعة إليها:

أحدها: الطهارة، وحقيقتها: أن الإنسان عند سلامة فطرته وصحة مزاجه، وتفرُّغ قلبه من الأحوال السفلية الشاغلة له عن التدبُّر، إذا تلطخ بالنجاسات، وكان حاقناً حاقباً، قريب العهد

من الجماع ودواعيه، انقبضت نفسه، وأصابه ضيق وحزن، ووجد نفسه في غاشية عظيمة، ثم إذا تخفف عن الأخبثين، ودلك بدنه واغتسل، ولبس أحسن ثيابه وتطيّب، اندفع عنه ذلك الانقباض، ووجد مكانه انشراحًا وسرورًا وانبساطًا، كلُّ ذلك لا بمراءاة الناس، والحفظ على رسومهم، بل لحكم النفس النطقية فقط: فالحالة الأولى تسمى "حدثًا" والثانية: "طهارة" والذكي من الناس، والذي نرى منه سلامةَ أحكام النوع، وتمكينَ المادة لأحكام الصورة النوعية: يعرف الحالتين متميزةً، كلٌّ واحدة من الأخرى، ويحب أحدهما، ويبغض الأخرى بطبيعته؛ والغبي منهم إذا انمحق شيئًا من البهيمية، ولجّ بالطهارات والتنبُّل، وتفرَّغ لمعرفتهما: لابد يعرفهما، ويميز كلٌّ واحدة من الأخرى.

والطهارة أشبه الصفات النفسية بحالات الملأ الأعلى، في تجرُّدها عن الألواث البهيمية، وابتهاجها بما عندها من النور، ولذلك كانت مُعِدَّةً لتلبُّس النفس بكمالها بحسب القوة العملية.

والحدث إذا تمكّن من الإنسان، وأحاط به من بين يديه ومن خلفه، أورث له استعدادًا لقبول وساوس الشياطين، ورؤيتهم بحاسة الحس المشترك، ولمنامات موحشة، ولظهور الظلمة عليه بما يلي النفسَ النطقية، وتمثُّلِ الحيوانات الملعونة للنهمة.

وإذا تمكنت الطهارةُ منه، وأحاطت به، وتنبّه لها، وركن إليها، أورثت استعدادًا لقبول إلهامات الملائكة ورؤيتها، ولمنامات صالحة، ولظهور الأنوار، وتمثل الطيبات، والأشياء المباركة المعظمة.

ترجمہ: ان اصول (بنیادی باتوں) کا بیان جن کی طرف طریق ثانی کی تحصیل لوٹتی ہے (یعنی جو طریق ثانی کی تحصیل کی تفصیلات کے بنیادی نکات ہیں) جان لیں کہ طریق ثانی یعنی احسان حاصل کرنے کی بہت سی راہیں ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے مجھے یہ حقیقت سمجھادی ہے کہ ان راہوں کا مرجع (یعنی نچوڑ) چار باتیں ہیں۔ بہیمیت ان کے ساتھ متصف ہوتی ہے جب اس کو نفس ناطقہ مغلوب کر لیتا ہے۔ اور اس کو ایسے کاموں پر مجبور کرتا ہے جو خصال اربعہ کے مناسب حال ہوتے ہیں۔ اور وہ (یعنی خصال اربعہ کے ساتھ اتصاف کی) حالت آدمی کے تمام احوال میں ملأ اعلیٰ کی حالت کے ساتھ زیادہ مشابہ ہے۔ وہ انسان کو تیار کرنے والی ہے ملأ اعلیٰ کے ساتھ ملنے کے لئے اور ان کی لڑی میں پروئے جانے کے لئے اور اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ بات بھی سمجھادی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء کو انہی باتوں کی طرف دعوت دینے کے لئے، اور ان پر ابھارنے کے لئے مبعوث فرمایا ہے۔ اور یہ بات بھی سمجھادی ہے کہ (منزل من السماء) شریعتیں انہی خصال اربعہ کی تفصیل ہیں اور انہیں کی طرف لوٹتی ہیں۔

پہلی صفت: طہارت ہے۔ اور طہارت کی حقیقت یہ ہے کہ جب آدمی سلیم الفطرت اور صحیح المزاج ہو، اور اس کا ذہن

اور یہ حالت بشری احوال میں سے ملکوتی حالت سے بہت قریب اور بے حد مشابہ ہے کیونکہ ملائکہ ہمہ وقت اپنے خالق و مالک کی طرف متوجہ رہتے ہیں اور اللہ کی عظمت کے سامنے حیران و سرگشتہ ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے تقدس میں مستغرق رہتے ہیں۔ اسی وجہ سے یہ حالت انسان کو کمال علمی کے ساتھ متصف کرتی ہے یعنی اس میں معرفت الٰہیہ پیدا ہوتی ہے اس کے ذہن میں علوم ربانی مرتسم ہوتے ہیں اور اس کو اللہ کا وصل نصیب ہوتا ہے اگرچہ اس کی کیفیت کے بیان سے زبان و قلم قاصر ہیں۔

نوٹ: اخبات کی انواع: زہد، قناعت، جود، تواضع وغیرہ کا بیان قسم ثانی میں ابواب الاحسان میں آئے گا۔

والثانية: الإخبات لله تعالى، وحقيقته: أن الإنسان عند سلامته وتفرغه، إذا ذُكِّر بآيات الله تعالى وصفاته، وأمعن في التذكر: تنبهت النفس النطقية، وخضعت الحواس والجسدُ لها، وصارت كالحائرة الكليلة، ووجد ميلاً إلى جانب القدس، وكان كمثل الحالة التي تعتري السُّوقة بحضرة الملوك، وملاحظة عجز أنفسهم، واستبداد أولئك بالمنع والعطاء.

وهذه الحالة أقربُ الحالات النسمية وأشبهُها بحال الملأ الأعلى في توجهها إلى بارئها، وغيبتها في جلاله، واستغراقها في تقديسه، وبذلك كانت معدّةً لخروج النفس إلى كمالها العلمي، أعني: انتقاش المعرفة الإلهية في لوح ذهنها، واللحوق بتلك الحضرة بوجه من الوجوه، وإن كانت العبارة تَقْصُرُ عنه.

ترجمہ: اور دوسری صفت: اللہ تعالیٰ کے سامنے نیازمندی ہے۔ اور اس کی حقیقت یہ ہے کہ انسان جب سلیم و فارغ ہو، اور اس کو اللہ کی آیات و صفات یاد دلائی جائیں، اور وہ خوب اچھی طرح سے ان کو یاد کرے تو نفس ناطقہ بیدار ہو جاتا ہے اور حواس و بدن اس کے سامنے فروتنی کرتے ہیں اور نفس ناطقہ حیرت زدہ، تھکا ہوا سا ہو جاتا ہے۔ اور وہ عالم قدس (ذات باری) کی طرف میلان پاتا ہے۔ اور آدمی ایسا ہو جاتا ہے جیسے عوام کو صورت پیش آتی ہے جب وہ بادشاہوں کے دربار میں پہنچتے ہیں اور خود کو بالکل عاجز دیکھنے لگتے ہیں اور ان کو داد و دہش میں مختار دیکھتے ہیں۔

اور یہ حالت بشری احوال میں ملائکہ کی حالت سے قریب تر اور بہت زیادہ مشابہ ہے ان کے متوجہ ہونے میں اپنے پیدا کرنے والے کی طرف اور اللہ تعالیٰ کی عظمت میں ان کے حیران و سرگشتہ ہونے میں اور اللہ کی تقدیس و پاکی بیان کرنے میں مستغرق ہونے میں۔ اور اسی وجہ سے یہ حالت تیار کرنے والی ہے نفس کے نکلنے کو اس کے کمال علمی کی طرف (یعنی یہ حالت آدمی میں کمال علمی کی صلاحیت پیدا کرتی ہے) میری مراد: معرفت الٰہیہ کے نقوش کا اس کے ذہن کی تختی پر مرتسم ہونا ہے۔ اور اس بارگاہ (خداوندی) کے ساتھ کسی نہ کسی طرح الحاق ہو جانا ہے۔ اگرچہ اس کے بیان سے زبان و قلم قاصر ہیں۔

ساعة في هذه الكيفية، لا ترفع إلى ما وراءها النظر ألبتة، ثم إذا زالت تلك الحالة: فإن كانت سمحةً خرجت من تلك المضايق، كأن لم تكن فيها قط، وإن كانت غير ذلك، فإنها تشتبك معها تلك الكيفيات، وتنتشح كما تنتشح نقوشُ الخاتم في الشَّمْعة؛ فإذا فارقت الجسد، وانخلعت عن العلائق الظلمانية المتراكمة، ورجعت إلى ما عندها، لم تجد شيئًا مما كان في الدنيا من مخالفات الملكية، فحصل لها الأنس، وصارت في أرغد عيش، والشحيحةُ تتمثل نقوشُها عندها، كما ترى بعض الناس يُسرق منه مالٌ نفيس: فإن كان سخيا لم يجد له بالا، وإن كان ركيكَ النفس صار كالمجنون، وتمثلت عنده.

والسماحة وضدُّها لهما ألقاب كثيرة، بحسب ما يكونان فيه: فما كان منهما في المال يسمى سخاوة وشُحًّا، وما كان في داعية شهوة الفرج أو البطن يسمى عِفّةً وشرَهًا، وما كان في داعية الرَّفاهية والنُّبُوِّ عن المشاقِّ يسمى صبرًا وهلعًا، وما كان في داعية المعاصي الممنوعة عنها في الشرع يسمى تقوى وفجورًا.

وإذا تمكنت السماحةُ من الإنسان بقيت نفسُه غريبةً عن شهوات الدنيا، واستعدت لِلَذّات الملكية المجردة؛ والسماحة هيئةٌ تمنع الإنسان من أن يتمكن منه ضدُّ الكمال المطلوب علما وعملا.

ترجمہ: اور تیسری صفت: سماحت ہے۔ اور سماحت کی حقیقت نفس کا ایسا ہونا ہے کہ وہ قوت بہیمیہ کے تقاضوں کی اطاعت نہ کرے۔ اور اس میں بہیمیت کے نقوش نہ پائے جائیں۔ اور اس کے ساتھ بہیمیت کے رنگ کا میل نہ ہو۔ اور اس کی تفصیل یہ ہے کہ جب نفس اپنے دنیوی معاملات میں تصرف کرتا ہے اور عورتوں کی خواہش کرتا ہے اور لذتوں کی مزاولت کرتا ہے یا کسی کھانے کا مشتاق ہوتا ہے، پھر وہ اس کو حاصل کرنے کی پوری کوشش کرتا ہے، یہاں تک کہ وہ اس سے اپنی حاجت پوری وصول کرلیتا ہے، اور اسی طرح جب نفس غضبناک ہوتا ہے یا کسی چیز کی لالچ کرتا ہے تو اس حالت میں ضروری ہے کہ نفس ایک گھڑی کیلئے اس کیفیت میں ڈوب جائے، وہ کسی چیز کی طرف قطعاً نظر نہ اٹھائے جو اس کیفیت سے بلند ہے ـــــ پھر جب وہ کیفیت زائل ہوجاتی ہے تو اگر نفس فیاض ہوتا ہے تو وہ ان تنگ گھاٹیوں سے اس طرح نکل جاتا ہے کہ وہ گویا اس میں کبھی تھا ہی نہیں ـــــ اور اگر نفس اس کے علاوہ ہوتا ہے (یعنی دنیا کا لالچی ہوتا ہے) تو وہ دنیوی کیفیات نفس کے ساتھ گتھ جاتی ہیں۔ اور وہ کیفیات پائی جاتی ہیں جیسے مہر کے نقوش موم میں پائے جاتے ہیں ـــــ پھر جب نفس جسم سے جدا ہوتا ہے اور تہ بہ تہ تاریک تعلقات سے الگ ہوتا ہے اور اس چیز کی طرف لوٹتا ہے جو اس کے پاس ہے، تو وہ ملکیت کے برخلاف چیزوں میں سے جو دنیا میں تھیں کوئی چیز نہیں پاتا ہے۔ پس اس کو انسیت حاصل ہوتی ہے اور اس کو نہایت خوش گوار زندگی حاصل ہوجاتی ہے ـــــ اور دنیا کے لالچی نفس کے پاس ملکیت

کے برخلاف چیزوں کے نقوش پائے جاتے ہیں، جیسا کہ آپ بعض لوگوں کو دیکھتے ہیں کہ اس کا کوئی قیمتی مال چرایا جاتا ہے، پس اگر وہ سخی ہوتا ہے تو اس کی کوئی پرواہ نہیں کرتا۔ اور اگر وہ نفس کا مزدور ہوتا ہے تو وہ پاگل جیسا ہو جاتا ہے اور چرائی ہوئی چیزیں اس کی آنکھوں کے سامنے پھرتی ہیں۔

اور سماحت اور اس کی ضد کے لئے بہت سے القاب ہیں اُس چیز کے اعتبار سے جس میں وہ دونوں پائے جاتے ہیں۔ پس جو ان میں سے مال میں پائے جاتے ہیں وہ سخاوت اور شُحّ کہلاتے ہیں۔ اور جو شہوتِ فرج اور شہوتِ بطن کے تقاضوں میں پائے جاتے ہیں، وہ عفت اور شَرَہ (بدنفسی، حدت، تندی) کہلاتے ہیں۔ اور جو آسودگی اور بے رنگی کاموں سے جی چرانے میں پائے جاتے ہیں، وہ صبر اور ہلع (کم ہمتی) کہلاتے ہیں۔ اور جو شریعت میں ممنوع معاصی کے تقاضوں میں پائے جاتے ہیں، وہ تقویٰ (پرہیزگاری) اور فجور (بدکاری) کہلاتے ہیں۔

اور سماحت جب انسان میں جم جاتی ہے تو آدمی کا نفس دنیا کی خواہشات سے خالی ہو جاتا ہے اور وہ مجرد (روحانی) اعلیٰ لذتوں کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ اور سماحت ایک ایسی کیفیت ہے جو انسان کو روکتی ہے اس بات سے کہ اس میں علم اور عمل کے اعتبار سے کمال کی ضد جگہ پائے۔

لغات:

سَمُحَ (ک) سَمَاحًا وسَمَاحَةً: فیاض دل ہونا ۔ الوَضَر: چکناہٹ کی وجہ سے میل کچیل ۔ تَاقَ (ن) إليه: مشتاق ہونا ۔ عَالَجَہ: مزاولت کرنا، کسی کام کو ٹھیک کرنا ۔ قَرِمَ (س) إلى اللحم: خواہش مند ہونا ۔ المَضِيق: تنگ جگہ، مشکل کام، معانی جمع مَضَايِق ۔ تَرَائَى الشيءُ: دکھائی دینا ۔ رَغُدَ (کرم، سمع) رَغِدَ (س) رَغْدًا عيشُه: آسودہ و خوش حال ہونا ۔ رَكَّ (ض) رَكَاكَةً: ضعیف و کمزور ہونا، الرَّكِيك: کمزور عقل یا کمزور رائے والا، ڈھیلا ڈھالا، کم عقل کم ہمت ۔ نَبَا يَنْبُو نُبُوًّا الطبعُ عن الشيء: نفرت کرنا۔ المَشَقَّة: دشواری، محنت، جمع مَشَاقّ ۔ عَرِيَ يَعْرَى عُرْيَةً: ننگا ہونا، خالی ہونا۔

ترکیب: من مخالفات الملکیۃ بیان ہے ما کان فی الدنیا میں ما کا ۔ والبِرُّ عطف تفسیری ہے، یعنی رفاہیت اور مشقتوں سے جی چرانا ایک ہی چیز ہیں ۔ علمًا اور عملًا المطلوب سے تمیز ہیں۔

تصحیح: ثم إذا زالت اصل میں زایلت تھا۔ تصحیح مولانا سندھی نے کی ہے ۔ تخففت اصل میں تخفف تھا یعنی مذکر کا صیغہ تھا۔ صحیح صیغہ واحد مؤنث ہے اور ضمیر نفس کی طرف لوٹتی ہے۔ یہ تصحیح مخطوطہ کراچی سے کی گئی ہے۔

چوتھی صفت: عدالت (انصاف)

چوتھی بنیادی صفت عدالت ہے، جس کی طرف شریعت کی تفاصیل لوٹتی ہیں۔ عدالت کے معنی مساوات اور برابری

مگر اس حالت میں بھی فطری بہادری اور دریادلی تھوڑی تھوڑی باقی رہتی ہے، بالکلیہ زائل نہیں ہوتی۔ اسی طرح روح کی فطرت میں جو عدالت رچی بسی ہے، وہ جسم کے ساتھ ملنے کے بعد بھی باقی رہتی ہے، ختم نہیں ہو جاتی۔ ایسے مفرد پڑ جاتی ہے اس لئے فطری امر جیسی ہوتی ہے بالکل فطری نہیں رہتی۔

اور عدالت ارواح مجردہ کی جبلت اس لئے ہے کہ ملائکۃ اللہ میں جو کہ ہر طرح سے ارواح مجردہ ہیں اور ان بشری ارواح میں جو جسمانی تعلقات سے جدا ہوگئی ہیں، اور ملائکہ کے زمرہ میں شامل ہوگئی ہیں، جیسے انبیائے کرام اور اولیائے عظام کی ارواح، ان حضرات میں وہ باتیں مرتسم اور منقش ہوتی ہیں جو نظام عالم کی اصلاح کے لئے اللہ تعالیٰ چاہتے ہیں فطری علوم کی طرح یہ باتیں ان پر چھاگئی ہیں۔ اور نظام عالم کی صلاح و فلاح عدل وانصاف پر مبنی ہے۔ خود اللہ پاک کی ایک صفت العدل ہے یعنی بڑے انصاف کرنے والے یعنی اللہ تعالیٰ ہر حقدار کو جو اس کا حق ہے عطا فرماتے ہیں کسی کی ادنیٰ حق تلفی نہیں کرتے۔ پھر جب "انصاف کی باتیں" ان حضرات پر مترشح ہوتی ہیں تو ان کی مرضیات (پسندیدگیاں) ان کاموں کی طرف پھر جاتی ہیں، اور وہ دل سے ان باتوں کو پسند کرنے لگتے ہیں۔ اسی طرح نظام عالم کو سنوارنے والی چیزیں یعنی عدل وانصاف کی باتیں ارواح مجردہ کی جبلت وفطرت ہو جاتی ہیں۔

اور عدالت کا فائدہ: موت کے بعد ظاہر ہوتا ہے۔ جب ارواح اجسام سے الگ ہوتی ہیں اور لوگ دنیا سے گذر جاتے ہیں، تو جن میں وصف عدالت کسی درجہ میں موجود ہوتا ہے، ان کو نہایت درجہ خوشی حاصل ہوتی ہے اور ان لوگوں کو ایسی روحانی لذت نصیب ہوتی ہے جو جسمانی لذتوں سے بالکل جداگانہ ہوتی ہے۔ اور اگر کسی عدل وانصاف سے نہ صرف یہ کہ تہی دست ہوتا ہے، بلکہ اس کی ضد ظلم وجور اس میں جگہ پکڑے ہوئے ہوتے ہیں تو مرنے کے بعد اس پر تنگی کی جاتی ہے، وہ وحشت میں ہوتا ہے اور درد دکھ اور تکلیف سے دوچار ہوتا ہے۔ مثلاً جو لوگ منصفین میں عدل وانصاف کرتے ہیں وہ آخرت میں عرش کے سایہ میں ہوں گے اور ظلم وجور کرنے والے اللہ تعالیٰ کی رحمت سے محروم ہوں گے۔

عدالت کی اعانت ومخالفت کا ثمرہ: جب اللہ تعالیٰ کسی پیغمبر کو مبعوث فرماتے ہیں تاکہ وہ دین کو قائم کرے اور لوگوں کو تاریکیوں سے روشنی میں لائے اور لوگ انصاف پر کاربند ہوں تو جو لوگ اس نور کی اشاعت کرتے ہیں یعنی عدل وانصاف کو پھیلاتے ہیں اور اس کے لئے لوگوں میں راہ ہموار کرتے ہیں، وہ مورد الطاف خداوندی بنتے ہیں۔ اور جو لوگ انصاف کو پھیرنے کی یعنی دور کرنے کی اور اس کو کالعدم اور بے قدر کرنے کی فکر کرتے ہیں وہ ملعون ومردود ہوتے ہیں۔

عدالت کی برکت: جب آدمی انصاف پرور ہو جاتا ہے اور عدل وانصاف اس کی طبیعت ثانیہ بن جاتی ہے تو اس کے درمیان اور حاملین عرش ملائکہ کے درمیان ایک نقطہ اشتراک پیدا ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اس کے درمیان اور مقربین بارگاہ خداوندی یعنی حظیرۃ القدس کے فرشتوں کے درمیان بھی اشتراک ہو جاتا ہے۔ اور ان کے درمیان فیضان کا دروازہ وا ہو جاتا ہے۔ اور ملائکہ کے انوار کے نزول کی اس میں استعداد پیدا ہو جاتی ہے، جیسے شخص میں ملائکہ کے الہام کی اور ان

سے جگہ کی تحصیل کی استعداد پیدا ہوتی ہے اسی طرح نزول نور اور برکات کی بھی استعداد پیدا ہوتی ہے۔ اس کی نظیر یہ ہے کہ جب طالب علم "معین مدرس" بن جاتا ہے تو اس میں اور دیگر اساتذہ میں ایک گونہ اشتراک پیدا ہوجاتا ہے۔ وہ بھی من جملہ مدرسین شمار ہونے لگتا ہے اور اساتذہ سے کسب علم کا دروازہ کھل جاتا ہے اور وہ بڑے اساتذہ کے الطاف کا بہ نسبت طلباء کے زیادہ حقدار ہوجاتا ہے۔

صفاتِ اربعہ کی اہمیت: اگر آپ مذکورہ صفات اربعہ کے تعلق سے یہ باتیں سمجھ گئے ہوں تو آپ کو بڑی قیمتی چیز مل گئی۔ سورۃ البقرۃ آیت ۲۶۹ میں اسی کو حکمت کہا گیا ہے اور آپ کو "دین کا فہم" نصیب ہوگیا، جو انہی بندوں کو حاصل ہوتا ہے جن کے ساتھ اللہ کو خیر منظور ہوتی ہے۔ یہ مضمون حدیث متفق علیہ میں آیا ہے اور وہ چار باتیں یہ ہیں:

۱- صفات اربعہ کی حقیقت و ماہیت کو خوب اچھی طرح سمجھ لینا۔

۲- صفات اربعہ کمالات علمی و عملی کو کس طرح چاہتی ہیں اس کو جان لینا۔

۳- صفات اربعہ کے ساتھ اتصاف آدمی کو کس طرح ملائکہ کی لڑی میں پروتا ہے اس سے واقف ہوجانا۔

۴- ہر زمانے کے تقاضے کے مطابق صفات اربعہ سے شرائع الٰہیہ کس طرح پھوٹتی ہیں اس کو سمجھ لینا۔

فطرت صفات اربعہ کا آمیزہ ہے: مذکورہ صفات اربعہ سے مرکب حالت "فطرت" کہلاتی ہے۔ اس لئے آگے صفات اربعہ کے بجائے لفظ "فطرت" استعمال کیا جائے گا۔ اب اس بحث کے تین مضامین باقی رہ گئے ہیں جو آگے تین ابواب میں بیان کئے جائیں گے:

پہلے باب میں تحصیل فطرت کے اسباب بیان کئے جائیں گے ان میں سے بعض اسباب علمی ہیں اور بعض عملی۔

دوسرے باب میں وہ حجابات (پردے) ذکر کئے جائیں گے جو تحصیل فطرت میں مانع بنتے ہیں۔

تیسرے باب میں وہ تدبیریں مذکور ہیں جو ان حجابات کا ازالہ کرتی ہیں۔

ان تین ابواب پر یہ بحث ختم ہوجائے گی۔ آپ آئندہ ابواب خوب غور سے پڑھیں وہی اس بحث کا نچوڑ ہیں۔

والرابعة: العدالةُ، وهي ملكة في النفس، تصدر عنها الأفعالُ التي يُقام بها نظامُ المدينة والحيِّ بسهولة، وتكون النفسُ كالمجبول على تلك الأفاعيل، والسرُّ في ذلك: أن الملائكة والنفوس المجردة عن العلائق الجسمانية، ينطبع فيها ما أراد الله في خلق العالم من إصلاح النظام ونحوه، فتنقلب مرضياتُها إلى ما يناسب ذلك النظام، فهذه صبغة الروح المجردة؛ فإن فارقت جسدها وفيها شيء من هذه الصفة، ابتهجت كلَّ الابتهاج، ووجدت سبيلاً إلى اللذة المفارقة عن اللذات الخسيسة، وإذا فارقت وفيها ضدُّ هذه الخصلة: ضاق عليها المجالُ، وتوحشت وتألمت، وإذا بعث الله نبيا لإقامة الدين، وليُخرج الناس من الظلمات

إلى النور، ويقوم الناس بالعدل، فمن سعى في إشاعة هذا النور، ورواجه في الناس كان مرحوماً، ومن سعى لردها وإخمالها كان ملعوناً مرجوماً.

وإذا تمكنت العدالة من الإنسان: وقع اشتراك بينه وبين حملة العرش ومقرَّبي الحضرة من الملائكة الذين هم وسائط نزول الجود والبركات، وكان ذلك باباً مفتوحاً بينه وبينهم، ومُعِدًّا لنزول ألوانهم وصبغهم، بمنزلة تمكين النفس من إلهام الملائكة، والانبعاث حسْبَها.

فهذه الخصال الأربع إن تحققت حقيقتها، وفهمت كيفية اقتضائها للكمال العلمي والعملي، وإعدادها للانسلاك في سلك الملائكة، وعلمت كيفية انشعاب الشرائع الإلٰهية بحسب كل عصر منها، أوتيت الخير الكثير، وكنت فقيها في الدين ممن أراد الله به خيراً.

والحالة المركبة منها تسمى بالفطرة؛ وللفطرة أسبابٌ تحصُل بها، بعضها علمية، وبعضها عملية، وحُجُبٌ تصُدُّ الإنسان عنها، وحِيَلٌ تكسر الحجب، ونحن نريد أن ننبهك على هذه الأمور، فاستمع لما يتلى عليك، بتوفيق الله تعالى، والله أعلم.

ترجمہ: اور چوتھی صفت عدالت ہے۔ اور عدالت نفس میں راسخ ایک کیفیت ہے، جس سے وہ افعال صادر ہوتے ہیں جن سے تدبیر اور مملکت کا نظام بسہولت قائم ہوتا ہے۔ اور نفس گویا ان کاموں کے کرنے پر پیدا کیا ہوا ہوتا ہے یعنی اپنی فطرت کے لحاظ سے مجبور ہوتا ہے۔ اور راز اس میں یہ ہے کہ ملائکہ میں اور جسمانی تعلقات سے جدا شدہ لوگوں میں وہ باتیں ہوتی ہیں جو اللہ تعالیٰ عالم کی تخلیق میں چاہتے ہیں یعنی نظام عالم کی اصلاح اور اس کے مانند چیزیں۔ پس ان حضرات کی مرضیات پلٹ جاتی ہے ان چیزوں کی طرف جو اس نظام کے مناسب ہوتی ہیں۔ پس یہ دین مجرد کی فطرت ہے — پھر اگر روح اس کے جسم سے جدا ہوتی ہے اس حال میں کہ اس روح میں اس صفت (عدالت) میں سے کچھ ہوتا ہے تو اس کو نہایت درجہ خوشی حاصل ہوتی ہے۔ اور وہ اس لذت کی طرف راہ پالیتا ہے جو خسیس لذتوں سے جداگانہ ہے — اور اگر نفس اس حال میں جدا ہوتا ہے کہ اس میں اس صفت کی ضد ہوتی ہے تو اس پر حالت تنگ ہوتی ہے، اور وہ متوحش ہوتا ہے اور روگی ہوتا ہے — پھر جب اللہ تعالیٰ دین کو برپا کرنے کے لئے پیغمبر کو بھیجتے ہیں، اور تا کہ وہ لوگوں کو تاریکیوں سے روشنی کی طرف نکالے، اور لوگ انصاف پر کاربند ہوں، تو جو شخص اس نور کی اشاعت میں کوشش کرتا ہے، اور اس کے لئے لوگوں میں راہ ہموار کرتا ہے تو وہ مہربانی کیا ہوا ہوتا ہے۔ اور جو اس کو پھیرنے کی اور اس کو گمنام کرنے کی کوشش کرتا ہے وہ ملعون ومردود ہوتا ہے۔

اور جب عدالت آدمی میں راسخ ہو جاتی ہے تو اشتراک پیدا ہو جاتا ہے اس میں اور حاملین عرش ملائکہ میں، اور ان مقربین بارگاہ ملائکہ میں جو جود وبرکات کے نزول میں واسطہ ہیں۔ اور یہ صفت ایک دروازہ کھول دیتی ہے اس کے اور ملائکہ کے درمیان میں، اور یہ صفت ملائکہ کے انوار والوان کے نزول کو تیار کرنے والی ہو جاتی ہے، جیسے نفس کا موقعہ دینا

ملائکہ کے الہام اور ان الہامات کے موافق تعمیل حکم کے لئے اٹھ کھڑا ہونا۔

پس اگر آپ ان چاروں صفتوں کی حقیقت خوب سمجھ گئے ہوں، اور ان کے کمال علمی اور عملی کو جانچنے کی کیفیت کو بھی سمجھ گئے ہوں اور ان کے ملائکہ کی لڑی میں پروئے جانے کو تیار کرنے کی کیفیت کو بھی سمجھ گئے ہوں اور بزرگوں کے تقاضے کے موافق ان خصال اربعہ سے شرائع الہیہ کے نکلنے کی کیفیت کا بھی آپ نے ادراک کر لیا ہو تو آپ کو بڑی خوبی حاصل ہوگئی، اور آپ کو دین کی سمجھ مل گئی، جو انہی لوگوں کو ملتی ہے جن کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو خیر منظور ہوتی ہے۔

اور چاروں صفتوں سے مرکب حالت "فطرت" کہلاتی ہے۔ اور فطرت کے لئے کچھ اسباب ہیں۔ جن کے ذریعہ اس کو حاصل کیا جاتا ہے، ان میں سے بعض علمی ہیں اور بعض عملی۔ اور کچھ تجابات ہیں جو انسان کو فطرت سے روکتے ہیں۔ اور کچھ تدبیریں ہیں جو تجابات کو توڑتی ہیں اور ہم چاہتے ہیں کہ آپ کو ان باتوں سے آگاہ کریں۔ پس آپ وہ باتیں سنئے جو آپ کے سامنے بتوفیق الٰہی بیان کی جاتی ہیں واللہ اعلم

باب ـــــ ۵

خصال اربعہ کی تحصیل، تکمیل، اور تلافی مافات کا طریقہ

گذشتہ باب میں جن خصال اربعہ: طہارت، اخبات، سماحت اور عدالت کا تذکرہ آیا ہے، اگر کسی شخص میں یہ چاروں صفات نہ پائی جاتی ہوں یا بعض نہ پائی جاتی ہوں اور وہ ان کو حاصل کرنا چاہے یا ناتمام ہوں، اور وہ ان کی تکمیل کرنا چاہے، یا وہ مل تو گئی تھیں مگر کسی وجہ سے ہاتھ سے نکل گئیں اور وہ تلافی مافات کرنا چاہے تو اس کا طریقہ کیا ہے؟ اس باب میں اسی کا بیان ہے۔ یاد رہے کہ جو تحصیل کا طریقہ ہے وہی تکمیل و تلافی کا بھی ہے --- یہ خصال اربعہ دو تدبیروں سے حاصل کی جا سکتی ہیں۔ ایک تدبیر علمی، دوسری تدبیر عملی۔ دونوں تدبیروں کو ایک ساتھ عمل میں لانا ضروری ہے۔ کسی ایک پر اکتفا کرنا درست نہیں۔

پہلی تدبیر علمی ہے اور تدبیر علمی کی ضرورت اس لئے ہے کہ طبیعت قویٰ علیہ (دل و دماغ) کی مطیع ہوتی ہے، چنانچہ خطرات کے وقت جب نفس کو شرم یا خوف لاحق ہوتا ہے تو اکل، جماع اور مباشرت کی خواہش بالکل ٹھنڈی پڑ جاتی ہے اسی طرح جب دل و دماغ فطرت کے مناسب حال علوم سے لبریز ہو جاتے ہیں تو خصال اربعہ نفس میں ایک امر واقعی بن جاتے ہیں۔

تدبیر علمی کا بیان

تدبیر علمی: اللہ تعالیٰ پر اور ان کی صفات ایجابیہ و سلبیہ پر جزم و یقین اور اس کا استحضار ہے یعنی یہ اعتقاد رکھے کہ اس کا رب بشری کمزوریوں سے منزہ ہے۔ وہ ضعف و ناتوانی، بے بسی و بے کسی اور نادانی و بے خبری سے پاک ہے۔ اس کا علم ایسا محیط ہے کہ زمین و آسمان میں ذرہ برابر چیز اس کے علم سے غائب نہیں ہو سکتی۔ تین آدمی سرگوشی کرتے ہیں تو چوتھا وہ ہوتا

ہے اور پانچ آدمی سرگوشی کرتے ہیں تو چھٹا وہ ہوتا ہے۔ وہ قادر ہے کہ جو چاہتا ہے کرتا ہے، اور جو چاہتا ہے حکم کرتا ہے۔ اس کے فیصلہ کو کوئی روکنے والا ہے نہ کوئی پھیرنے والا۔ وہ انتہا درجہ کا انعام فرمانے والا ہے۔ اس نے ہمیں وجود بخشا ہے۔ اگر وہ ہمیں نیست سے ہست نہ کرتا تو کونسی طاقت تھی جو ہمیں جامہ وجود پہناتی؟! اس نے ہمیں جسمانی اور روحانی نعمتوں سے سرفراز فرمایا۔ اور اشرف مخلوقات بنایا۔ وہ ہر شخص کو اس کے اعمال کا بدلہ دینے والا ہے۔ اگر اچھے اعمال کئے ہیں تو اچھا بدلہ دے گا۔ اور برے کرتوت کئے ہیں تو وہ ان کی سزا بھگتے گا۔ یہ مضمون ایک متفق علیہ حدیث قدسی میں آیا ہے۔ مسلم شریف باب قبول التوبة من الذنوب وإن تكررت الذنوب والتوبة، كتاب التوبة (۱۷:۷۶) کی روایت اس طرح ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے، ان باتوں میں جو آپ اپنے پروردگار عز وجل سے نقل کرتے ہیں روایت کیا ہے کہ اللہ پاک نے ارشاد فرمایا: "میرے بندے نے ایک گناہ کیا، پس (اس نے توبہ کی اور) کہا: اے اللہ! میرا گناہ بخش دے، تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا کہ میرے بندے نے ایک گناہ کیا پس اس نے جانا کہ اس کا ایک ایسا رب ہے جو گناہ کو معاف کرتا ہے اور گناہ پر پکڑتا ہے۔ پھر وہ لوٹا اور (دوسرا) گناہ کیا۔ پھر اس نے توبہ کی تو اللہ نے مذکورہ بات ارشاد فرمائی۔ پھر اس نے تیسری بار گناہ کیا، پھر توبہ کی تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ میرا بندہ بار بار گناہ کرتا ہے اور توبہ کرتا ہے۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اس کا ایک ایسا رب ہے جو گناہ بخشتا بھی ہے اور گناہ پر پکڑتا بھی ہے، تو جو چاہے کر، میں نے تیرا گناہ بخش دیا" یعنی بندہ گناہ کے بعد سچی توبہ کرے تو پروردگار عالم بار بار گناہ بخشتے ہیں۔ ان کی بارگاہ، رحمت کی بارگاہ ہے، ناامیدی کی بارگاہ نہیں ہے۔ وہ صرف غفور رحیم ہی نہیں ہے بلکہ اس کی پکڑ بھی بڑی سخت ہے۔ وہ انتقام لینے والا بھی ہے۔ اس لئے ایک ساتھ دونوں باتوں پر ایمان لانا ضروری ہے۔ جو اللہ کی غفاریت پر تکیہ کر لیتا ہے وہ بے عملی کا شکار ہو جاتا ہے اور جو قہاریت کا تصور جما لیتا ہے وہ قنوطیت سے دوچار ہوتا ہے۔ اسی لئے سورۃ الحجر (آیات ۴۹، ۵۰) میں دونوں صفتوں کی ایک ساتھ خبر دی گئی ہے: ﴿نَبِّئْ عِبَادِي أَنِّي أَنَا الْغَفُورُ الرَّحِيمُ، وَأَنَّ عَذَابِي هُوَ الْعَذَابُ الْأَلِيمُ﴾ (آپ میرے بندوں کو اطلاع دیدیجئے کہ میں بڑا مغفرت ورحمت والا ہوں، اور یہ کہ میری سزا دردناک سزا ہے)

خلاصہ یہ ہے کہ ایسا پختہ اعتقاد جو دل میں رب کی ہیبت اور غایت درجہ عظمت پیدا کرے، اور مچھر کے پر کے برابر بھی غیر اللہ کی نیازمندی اور خوف باقی نہ چھوڑے اور آدمی یہ اعتقاد رکھے کہ انسان کا کمال یہ ہے کہ وہ پروردگار کی طرف متوجہ رہے اور اس کی بندگی کرتا رہے اور یہ بھی اعتقاد ہو کہ بہترین بشری حالت فرشتوں سے مشابہت پیدا کرنا اور ان سے نزدیک ہونا ہے اور یہ بھی اعتقاد ہو کہ یہ عقائد واعمال پروردگار سے قریب کرنے والے ہیں۔ اور یہ بھی اعتقاد رکھے کہ اللہ تعالیٰ کو بندوں کی یہ چیزیں پسند ہیں۔ اور یہ چیزیں بندوں پر اللہ تعالیٰ کا ایک ایسا حق ہیں جس کا ادا ضروری ہے۔ بات کا لب لباب یہ ہے کہ یہ جزم ویقین ہو کہ نیک بختی فضائل اربعہ کی تحصیل پر موقوف ہے اور بدبختی ان کے ترک میں ہے

چابک کی ضرورت: چابک سوار ہاتھ میں ہنٹر (Hunter) لئے رہتا ہے، جو گھوڑے کے لئے ہوتا ہے اور وقت

ضرورت اس سے تھوڑے کو تنبیہ بھی کی جاتی ہے، اسی طرح تدبیر منزل کے لئے بھی ایک "کوڑا" ضروری ہے۔ جو نصیحت کہ نہایت مؤثر تنبیہ کرے اور اس کو سخت ڈانٹے۔ انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی راہیں اس سلسلہ میں مختلف رہی ہیں:

حضرت ابراہیم علیہ السلام پر اس سلسلہ میں بہترین چیز تذکیر بآیات اللہ نازل فرمائی گئی تھی یعنی اللہ تعالیٰ کی آیات باہرہ، صفات کاملہ اور آفاقی اور انفسی نعمتوں کی یاد دہانی کے ذریعہ بندوں کو نصیحت کرنا ہے کہ لوگ خوب اچھی طرح سمجھ لیں کہ اللہ تعالیٰ اس بات کے لائق ہیں کہ ان کے لئے دلچسپیوں کو اور عزیزوں کو خیر باد کہہ دیا جائے۔ ان کے ذکر کو ہر چیز پر ترجیح دی جائے۔ ان سے بے حد محبت کی جائے اور اپنی پوری کوشش سے ان کی بندگی کی جائے۔

اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لئے تذکیر بآیات اللہ کے ساتھ تذکیر بایام اللہ کا اضافہ فرمایا گیا۔ اور ایام اللہ (اللہ کے دنوں) سے مراد جزاء و سزا کے دن ہیں یعنی مختلف زمانوں میں فرمانبردار بندوں کو اور نافرمان لوگوں کو دنیا میں کس طرح جزاء و سزا دی؟ اس کو بیان کر کے لوگوں کو سمجھایا جائے تا کہ لوگ نافرمانی سے باز آئیں اور اطاعت شعاری اختیار کریں۔ اور اللہ تعالیٰ کا نعمت کو چھینا ہے اور نقمت کو نعمت سے بدلنا بیان کیا جائے تا کہ لوگوں کو تنبیہ ہو، دلوں میں معاصی کا خوف بیٹھ جائے اور اطاعت کا شوق پیدا ہو، مثلاً کس طرح اللہ تعالیٰ نے فرعون کو غرقاب کیا، اور وہ باغات، چشمے، کھیتیاں، عمدہ مکانات اور آرام کے سامان چھوڑ کر چل دیئے جس میں وہ خوش رہا کرتے تھے اور اللہ تعالیٰ نے ان سب چیزوں کا ان لوگوں کو وارث بنادیا جو زمین میں بالکل کمزور شمار کئے جاتے تھے اور ان کو زمین کے پورب پچھم کا مالک بنادیا؟! پھر اس قوم کو بھی جس کو سارے جہاں پر فضیلت بخشی تھی، جتلا دیا کہ تم زمین میں دو مرتبہ فساد پھیلاؤ گے اور بڑا زور چلانے لگو گے تو اس وقت ہم تمہاری سرکوبی کریں گے، چنانچہ ایسا ہوا اور ان کو سخت سزا دی گئی۔ سورۂ بنی اسرائیل کے پہلے رکوع میں یہ واقعات بیان کئے گئے ہیں۔

اور اللہ تعالیٰ نے ہمارے پیغمبر حضرت محمد ﷺ کے لئے ان دو امور کے ساتھ تذکیر بالموت و ما بعدہ کو ملایا یعنی قبر، حشر اور اس کے بعد پیش آنے والے واقعات کے ذریعہ لوگوں کو سمجھانا اور نیکیوں اور گناہوں کی خصوصیات کو تفصیل سے بیان کرنا۔ کیونکہ آدمی نفع و نقصان سوچنے کا عادی ہے۔ جب اس کو نیکی کی بھلائی اور گناہ کی خرابی معلوم ہوگی تو وہ ضرور نیکی کی طرف جھکے گا اور گناہ سے باز آئے گا۔

فائدہ: (۱) آلاء اللہ، ایام اللہ اور موت اور اس کے بعد کے واقعات کا محض جاننا کافی نہیں۔ بلکہ ضرورت ہے کہ ان باتوں کو بار بار ذہن نشین کیا جائے اور مکرر سہ کرر ان باتوں کی یاد دہانی کی جائے ہر لمحہ ان کو ملاحظہ کیا جائے، اور ہر وقت ان کو پیش نظر رکھا جائے، حتی کہ دل و دماغ ان مضامین سے لبریز ہو جائیں اور اعضاء ان کے مطیع ہو جائیں اسی لئے قرآن کریم میں یہ مضامین بار بار بیان کئے گئے ہیں اور ہمیشہ تلاوت کرتے رہنے کا حکم دیا گیا ہے۔

فائدہ: (۲) مذکورہ بالا تذکیرات ثلاثہ اور دوسرے دو مضامین: علم الاحکام اور علم المخاصمہ کو ملا کر کل پانچ علوم ہوتے

ہیں جو قرآن کریم کے عمودی (مرکزی) مضامین ہیں۔

﴿باب طريق اكتساب هذه الخصال، وتكميل ناقصها، ورد فائتها﴾

اعلم: أن اكتساب هذه الخصال يكون بتدبيرين: تدبير علمي، وتدبير عملي:

أما التدبير العلمي: فإنما احتيج له، لأن الطبيعة منقادة للقوى العلمية، ولذلك ترى سقوط الشهوة والشبق عند خطور مايورث في النفس كيفية الحياء أو الخوف، فمتى امتلأ علمه بما يناسب الفطرة جرّ ذلك إلى تحققها في النفس.

وذلك: أن يعتقد أن له ربا منزّها عن الأدناس البشرية، لايعزب عنه مثقالُ ذرة في الأرض ولافي السماء، مايكون من نجوى ثلاثة إلا هو رابعهم، ولاخمسة إلا هو سادسهم، يفعل مايشاء ويحكم مايريد، لارادّ لقضائه، ولامانع لحكمه، مُنْعِمٌ بأصل الوجود وتوابعه من النِّعَم الجسمانية والنفسانية، مجازٍ على أعماله: إن خيرًا فخير، وإن شرًا فشر، وهو قوله تعالى: ﴿أذنب عبدي ذنبًا، فعلِم أنه له ربا يغفر الذنب، ويأخذ بالذنب: قد غفرتُ لعبدي﴾

وبالجملة: فيعتقد اعتقاداً: مؤكدًا مايفيد الهيبة وغاية التعظيم، وما لايُبقي ولايَذَرُ في قلبه جَناحَ بَعوضة من إخبات غيره ورهبته، ويعتقد أن كمال الإنسان أن يتوجّه إلى ربه ويعبُدَه، وأن أحسن حالات البشر أن يتشبه بالملائكة ويَدْنُوَ منهم، وأن هذه الأمورَ مُقرِّبةٌ له من ربه، وأن الله تعالى ارتضى منهم ذلك، وأنه حق الله عليه لابد له من تَوْفِيَتِه؛ وبالجملة فيعلم علما لايحتمل النقيض: أن سعادته في اكتساب هذه، وأن شقاوته في إهمالها.

ولابد له من سوط ينبّهُ البهيمية تنبيها قويا، ويُزْعِجُها أزعاجاً شديدا؛ واختلفت مسالك الأنبياء في ذلك: فكان عمدةُ ما أنزل الله تعالى على إبراهيم عليه السلام التذكيرَ بآيات الله الباهرة، وصفاته العُلياء، ونِعَمِه الآفاقية والنفسانية. حتى يصحّح بما لامزيد عليه: أنه حقيق أن يبذلوا له المَلاذَ، وأن يُؤْثِرُوْا ذكرَهُ على ما سواه، وأن يحبوه حبا شديدا ويعبدوه بأقصى مجهودهم؛ وضمّ الله معه لموسى عليه السلام التذكيرَ بأيام الله، وهو بيان مجازاة الله تعالى للمطيعين والعصاة في الدنيا، وتقليبه النعمَ والنِّقَم، حتى يتمثل في صدورهم الخوف عن المعاصي، ورغبةٌ قوية في الطاعات؛ وضمّ معهما لنبينا صلى الله عليه وسلم الإنذارَ والتبشيرَ بحوادث القبر ومابعده، وبيانَ خواص البر والإثم.

ولايفيد أصلُ العلم بهذه الأمور، بل لابد من تكرارها وتردادها، وملاحظتها كلَّ حين، وجَعْلها بين عينيه، حتى تمتلئ القوى العلمية بها، فتنقادُ الجوارح لها.

وهذه الثلاثة مع اثنين آخرين: أحدهما: بيانُ الأحكام من الواجب والحرام وغيرهما،
وثانيهما: مخاصمة الكفار: فتوٌ خمسةٌ هي عمدة علوم القرآن العظيم.

ترجمہ: ان صفات کو حاصل کرنے اور ان کے ناقص کی تکمیل کرنے اور ان کے فوت شدہ کو واپس لانے کے طریقہ کا بیان: جان لیں کہ ان خصلتوں کا حاصل کرنا دو تدبیروں سے ہوتا ہے: ایک تدبیر علمی اور دوسری تدبیر عملی:

رہی تدبیر علمی تو اس کی ضرورت اس لئے ہے کہ طبیعت قوائے علمیہ کی مطیع ہوتی ہے۔ چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ شہوت اور جماع کی شدید خواہش ختم ہو جاتی ہے جب کوئی ایسی بات پیش آتی ہے جو نفس میں حیا یا خوف کی کیفیت پیدا کرتی ہے۔ پس جب اس کا علم لبریز ہو جاتا ہے اس چیز سے جو فطرت (خصال اربعہ) کے مناسب حال ہوتی ہے تو وہ چیز کھینچتی ہے نفس کو فطرت کے امر اتفاقی بن جانے کی طرف۔

اور وہ (یعنی تدبیر علمی) یہ ہے کہ آدمی اعتقاد رکھے: اس کا ایک پروردگار ہے جو بشری میل کچیل سے پاک ہے۔ اس کے علم سے کوئی ذرہ برابر چیز غائب نہیں ہوتی، نہ زمین میں اور نہ آسمان میں۔ کوئی سرگوشی تین آدمیوں کی ایسی نہیں ہوتی جس میں چوتھا وہ نہ ہو، اور نہ پانچ کی جس میں چھٹا وہ نہ ہو۔ وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے اور جو چاہتا ہے حکم کرتا ہے۔ اس کے فیصلہ کو کوئی پھیرنے والا نہیں اور اس کے حکم کو کوئی روکنے والا نہیں۔ اصل وجود کے ذریعہ اور جسمانی اور روحانی نعمتوں میں سے جو نعمتیں وجود کے تابع ہیں، ان کے ذریعہ انعام فرمانے والا ہے۔ وہ آدمی کے اعمال پر بدلہ دینے والا ہے: اگر اچھے اعمال ہیں تو اچھا بدلہ دے گا، اور اگر برے اعمال ہیں تو برا بدلہ (سزا) دے گا۔ اور نبی اللہ پاک کا ارشاد ہے: "میرے بندے نے ایک گناہ کیا، پس اس نے جانا کہ اس کا ایک ایسا پروردگار ہے جو گناہ کو معاف بھی کرتا ہے اور گناہ پر پکڑ بھی کرتا ہے: میں نے یقیناً اپنے بندے کو بخش دیا" (بخاری ۸:۱۹۹ مصری)

اور حاصل کلام یہ ہے کہ وہ ایسا پختہ اعتقاد رکھے جو ہیبت اور غایت درجہ تعظیم پیدا کرے۔ اور اس کے دل میں مچھر کے پر کے برابر غیر اللہ کی نیازمندی اور ذرہ باقی نہ چھوڑے۔ اور یہ اعتقاد رکھے کہ انسان کا کمال یہ ہے کہ وہ اپنے پروردگار کی طرف متوجہ ہو، اور اس کی بندگی کرے اور یہ اعتقاد رکھے کہ بشری احوال میں بہترین حالت یہ ہے کہ وہ فرشتوں کے مشابہ بنے اور ان سے قریب ہو، اور یہ اعتقاد رکھے کہ یہ چیزیں اس کو اس کے پروردگار سے نزدیک کرنے والی ہیں۔ اور یہ اعتقاد رکھے کہ اللہ تعالیٰ کو بندوں کی یہ چیزیں پسند ہیں۔ اور یہ اعتقاد رکھے کہ یہ چیزیں اللہ تعالیٰ کا بندوں پر ایک ایسا حق ہے جس کو پورا پورا ادا کرنا ضروری ہے۔ اور خلاصہ یہ ہے کہ وہ ایسا جانے جس میں نقیض کا احتمال نہ ہو کہ آدمی کی نیک بختی ان صفات اربعہ کے حاصل کرنے میں ہے، اور اس کی بدبختی ان صفات کو چھوڑنے میں ہے۔

اور تدبیر علمی کے لئے کوئی "ڈرانا" ہونا بھی ضروری ہے، جو بہیمیت کو نہایت موثر تنبیہ کرے، اور اس کو سخت زجر کرے۔ اور انبیاء کی راہیں اس سلسلہ میں مختلف ہیں۔ اور ان تعلیمات میں جو اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام

وہ باقی رہیں، اور پکا کرتی رہیں۔ اور مطلوبہ صفت کی تحصیل پر نفس کو برانگیختہ کرتی رہیں، اور ابھارتی رہیں۔ اس وجہ سے کہ امورِ مذکورہ میں اور صفتِ مطلوبہ میں "تلازمِ عادی" ہے۔ یعنی جب بھی امورِ مذکورہ انجام دیئے جاتے ہیں تو صفت مطلوبہ حاصل ہوجاتی ہے۔ یہ کسی فطری مناسبت کی وجہ سے امورِ مذکورہ صفتِ مطلوبہ کے ملنے کی جگہ ہیں یعنی ظنِ غالب یہ ہوتا ہے کہ مذکورہ کام کرنے سے صفتِ مطلوبہ حاصل ہوگی، جیسے:

(۱) جب کوئی شخص اپنے اندر غیظ وغضب کی کیفیت پیدا کرنا چاہتا ہے تو وہ اس گالی گلوچ کو یاد کرتا ہے جو اس کے مخالف نے دی ہے، نیز اس سے جو مار اور ذلت اس کو پہنچی ہے اس کو یاد کرتا ہے تو غصہ بھڑک اٹھتا ہے، کیونکہ ان کے درمیان تلازمِ عادی ہے یعنی عادۃً یہ چیزیں یاد کرنے سے غصہ آجاتا ہے۔

(۲) ماتم کرنے والی عورت جب اپنی مصیبت زدگی کی یاد تازہ کرنا چاہتی ہے تو میت کے محاسن کو یاد کرتی ہے اور خیالات کے گھوڑ سوار اور پیادے یعنی ہر طرح کے خیالات میت کی خوبیوں کی طرف کھینچتی ہے اور سوچ سوچ کر اس کے گن یاد کرتی ہے تو رو پڑتی ہے۔ کیونکہ ان دونوں چیزوں میں تلازمِ عادی ہے۔

(۳) جو شخص جماع کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو وہ مباشرت کے مقدمات اور دواعی کو اختیار کرتا ہے۔ کیونکہ دواعی فطرت کے تقاضے سے جماع کی تحریک پیدا کرتے ہیں۔

علاوہ ازیں اس کی بے شمار مثالیں ہیں، اگر کوئی ان کو جمع کرنا چاہے تو بے محنت کر سکتا ہے، اس کو کوئی دشواری پیش نہیں آنے کی، اس لئے ہم انہی تین مثالوں پر اکتفا کرتے ہیں۔

رہی یہ بات کہ وہ افعال واعمال اور وہ اسباب کیا ہیں جن کے ذریعہ ان صفاتِ اربعہ کو حاصل کیا جا سکتا ہے؟ تو اس سلسلہ میں ذوقِ سلیم رکھنے والے لوگوں کے مذاق پر اعتماد کرنا ضروری ہے۔ انھوں نے جو اسباب تجویز کئے ہیں ان کو تسلیم کرنا ہوگا۔ ذیل میں وہ اسباب بیان کئے جاتے ہیں، طہارت کے اسباب تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں اور اسباب ہی نہیں، موانعات بھی مفصل بیان کئے ہیں کیونکہ تحلیہ، تخلیہ کے بعد ہی ہوسکتا ہے۔ اور باقی تین صفات کے صرف اسباب بیان کئے ہیں، موانعات کا تذکرہ نہیں کیا۔ ان پر سیر حاصل گفتگو کتاب کی قسم دوم میں بقیۃ مباحث الاحسان کے عنوان سے آرہی ہے۔

حدث کے اسباب: ۱- دل کا سفلی احوال سے بھر جانا جیسے صحبت سے یا بدخوابی سے لطف اندوز ہونا ۲- حق کی مخالفت دل میں رکھنا جس کی وجہ سے ملأ اعلیٰ کی لعنت احاطہ کر لیتی ہے ۳- بول وبراز کا شدید تقاضا ۴- پیشاب پاخانہ یا ریح خارج کر کے فارغ ہونا۔ یہ تینوں معدہ کے فضلات ہیں ۵- بدن کا نجس ہونا ۶- گندہ دہنی ۷- رینٹ کا ناک میں جمع ہونا ۸- زیر ناف یا بغل میں بالوں کا بڑھنا ۹- غلیظ نجاستوں سے بدن اور کپڑوں کا ملوث ہونا ۱۰- ایسی امور واشکال سے حواس کا بھر جانا جو نفس کو شہوانی حالت یاد دلائیں۔ جیسے گندگیاں، اپنی یا بیوی کی شرمگاہ کو دیکھنا، چوپایوں کی جفتی کو دیکھنے سے

دیکھنا اور شہوانی نظر سے جماع کرنا یعنی گدھوں کی طرح ننگا ہونا اور ایک دوسرے کی شرمگاہ کو دیکھنا اور صحبت کرنا ۱۱- ملا
ئکۃ اللہ اور اللہ کے نیک بندوں پر لعن وتشنیع کرنا ۱۲- لوگوں کو ستانا اور ان کو تکلیف دینا۔

پاکی کے اسباب: ۱- گندگی دور کرنا اور ان کی اضداد کو حاصل کرنا ۲- ایسے کام کرنا جن کا عادۃً نظافت باعث ہونا ثابت ہو چکا ہے جیسے وضو، غسل، حجامت، کپڑے صاف ستھرے پہننا، خوشبو لگانا۔ ان چیزوں کا استعمال طہارت کے طریقوں کی طرف نفس کو منعطف کرتا ہے۔

اخبات کے اسباب: بارگاہ خداوندی میں نیازمندی اور عجز وانکساری پیدا کرنے کے لئے ایسے احوال اختیار کرنا اور نفس کو ان کے کرنے پر مجبور کرنا جو اس کے نزدیک اللہ تعالیٰ کی عظمت وکبریائی کے لئے سب سے زیادہ موزوں ہوں، مثلاً سرنگوں ہو کر کھڑا ہونا، سجدہ کرنا، ایسے کلمات کا ورد کرنا جو خشوع وخضوع، عجز وانکساری اور مناجات پر دلالت کرتے ہوں، اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی حاجتیں پیش کرنا۔ یہ سب کام اعلیٰ درجہ کی نیازمندی اور غایت درجہ کا خشوع وخضوع پیدا کرتے ہیں۔

فیاضی کے اسباب: سخاوت، انفاق اور خطا سے درگذر کی عادت ڈالنا۔ اور ناگواریوں میں صبر کرنے پر نفس کو مجبور کرنا وغیرہ۔

انصاف کے اسباب: سنت راشدہ (انصاف کی راہ) کی نیز اس کی تفصیلات کی نگہداشت کرنا یعنی زندگی کے ہر معاملہ میں اسلام کی بتائی ہوئی انصاف کی راہ پر مضبوط رہنا۔

أما التدبير العملي: فالعمدةُ فيه: التلبس بهيئات وأفعال وأشياءَ تذكّرُ النفسَ الخصلةَ المطلوبةَ، وتُنبّهُها لها، وتُهيّجُها إليها، وتَحُثُّها عليها، إما لتلازمٍ عاديٍّ بينها وبين تلك الخصلة، أو لكونها مظنّةً لها بحكم المناسبة الجبلّية؛ فكما أن الإنسان إذا أراد أن يُنبّه نفسه للغضب، ويُحضِرَه بين عينيه، يتخيّلُ الشتمَ الذي تفوّه به المغضوبُ عليه، والذي يلحقه من العار ونحو ذلك؛ والنائحةُ إذا أرادت أن تجدّد عهدها بالفجع تذكّرُ نفسها محاسنَ الميت، وتتخيّلها وتبعث من خواطرها الخيلَ والرَّجِلَ إليها؛ والذي يريد الجماع يتمسك بدواعيه؛ ونظائر هذا الباب كثيرة جدًا، لا تخفى على من يريد الإحاطة بجوانب الكلام؛ فكذلك لكل واحد من هذه الخصال أسبابٌ تُكتسب بها؛ والاعتمادُ في معرفة تلك الأمور على ذوق أهل الأذواق السليمة:

فأسباب الحدث: امتلاءُ القلب بحالة سِفلية، كقضاء الشهوة من النساء جماعًا ومباشرةً، وإضمارُه مخالفةَ الحق، وإحاطةُ لعن الملأ الأعلى به، وكونُه حالبًا حاقنًا، وقُربُ العهد بالبول والغائط والريح، وهذه الثلاثة لفضول المعدة، وتوسُّخُ البدن، والبَخَرُ، واجتماعُ المُخاط، ونباتُ الشعر على العانة والإبط، وتلطُّخُ الثوب والبدن بالنجاسات المستقذرة، وامتلاءُ الحواس

بصورة تذكر الحالة السفلية، كالقاذورات والنظر إلى الفرج ومسافدة الحيوانات، والنظر الممعن في الجماع، والطعن في الملائكة والصالحين والسعي في إيذاء الناس.

وأسباب الطهارة: إزالة هذه الأشياء، واكتساب أضدادها، واستعمال ما تقرر في العادات كونه نظافة بالغة، كالغسل والوضوء، ولبس أحسن ثيابه، واستعمال الطيب، فإن استعمال هذه الأشياء تنبه النفس على صفة الطهارة.

وأسباب الإخبات: مؤاخذة نفسه بما هو أعلى حالات التعظيم عنده: من القيام مطرقا، والسجود، والنطق بألفاظ دالة على المناجات، والتذلل لديه، ورفع الحاجات إليه، فإن هذه الأمور تنبه النفس تنبيها قويا على صفة الخضوع والإخبات.

وأسباب السماحة: التمرن على السخاوة، والبذل، والعفو عمن ظلم، ومؤاخذة نفسه بالصبر عند المكاره، ونحو ذلك.

وأسباب العدالة: المحافظة على السنة الراشدة بتفاصيلها، والله أعلم.

ترجمہ: رہی تدبیر عملی تو اس سلسلہ میں بہترین طریقہ ایسی شکلوں، افعال اور چیزوں کے ساتھ تعلق پیدا کرنا ہے جو نفس کو مطلوب صفت یاد دلائیں اور وہ چیزیں نفس کو مطلوبہ صفت سے خبردار کریں اور وہ نفس کو مطلوبہ صفت (کے حاصل کرنے) پر برانگیختہ کریں اور نفس کو مطلوبہ صفت پر ابھاریں، تو ان چیزوں کے درمیان اور اس صفت کے درمیان عادۃً تلازم ہونے کی وجہ سے یا اس وجہ سے کہ کسی فطری مناسبت کے باعث وہ چیزیں اس صفت کے "ملنے کی جگہ" ہیں۔ پس جس طرح یہ بات ہے کہ انسان جب چاہتا ہے کہ وہ نفس کو غصہ سے خبردار کرے اور وہ اس غصہ کو اپنی دونوں آنکھوں کے سامنے حاضر کرے تو وہ اس گالی کا تصور کرتا ہے جو مغضوب علیہ نے بکی ہے اور اس عار اور اس کے مانند چیزوں کو یاد کرتا ہے جو اس کو (گالی کی وجہ سے) لاحق ہوئی ہیں۔ اور بین کرنے والی عورت جب چاہتی ہے کہ اپنے دکھ درد کا زمانہ تازہ کرے تو وہ اپنے نفس کو میت کی خوبیاں یاد دلاتی ہے اور ان کو سوچتی ہے اور اپنے خیالات کے سوا اور پیادہ ان خوبیوں کی طرف بھیجتی ہے۔ اور جو شخص جماع کا ارادہ کرتا ہے وہ مباشرت کے دواعی کو اختیار کرتا ہے۔ اور اس باب کی نظائر بہت زیادہ ہیں، جو شخص کلام کے گوشوں کا احاطہ کرتا ہے وہ نظائر اس شخص سے بھاگ نہیں سکتیں (بلکہ بسہولت قابو میں آجاتی ہیں) پس اسی طرح ان صفاتِ اربعہ میں سے ہر ایک کے لئے ایسے اسباب ہیں جن کے ذریعہ اس صفت کو حاصل کیا جاسکتا ہے۔ اور ان چیزوں کے پہچاننے میں ذوقِ سلیم رکھنے والے لوگوں کے مذاق پر اعتماد ہے۔

پس حدث کے اسباب: دل کا سِفلی حالت سے لبریز ہوجانا ہے، جیسے عورتوں سے جماع اور ساتھ لگ کر خواہش پوری کرنا۔ اور آدمی کا دل میں حق کی مخالفت کو چھپانا اور ملأ اعلیٰ کی لعنت کا اس کو گھیر لینا اور اس کو پیشاب پاخانہ کا شدید

حادثات میں گھرا رہتا ہے۔ اور انسان کو جو بھی حالت پیش آتی ہے اس کے تین مرحلے ہوتے ہیں ایک حالت پیش آنے سے پہلے کا مرحلہ، دوسرا عین حالت پیش آنے کا مرحلہ، اور تیسرا وہ حالت ہٹنے کے بعد کا مرحلہ۔ مثلاً بھوک، پیاس، رنج وغم، محبت یا عشق کی حالت پیش آتی ہے تو پہلے مرحلہ میں نفس اس حالت کے اسباب کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور اس حالت کے مناسب چیزیں آدمی کے دل ودماغ اور حواس پر طاری ہو جاتی ہیں۔ مثلاً محبت یکدم پیدا نہیں ہوتی، پہلے نفس اسباب محبت کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ نگاہ حسن وجمال دیکھتی ہے۔ کان دلکش آواز سنتے ہیں۔ ہاتھ گداز جسم کو چھوتا ہے، دماغ اس کی خوبیوں کو سوچتا ہے۔ پھر جب دل ودماغ "پسند" سے بھر جاتے ہیں۔ نگاہ کو صورت کی خوبی، ملامسہ کو جسم کی گدازی اور سامعہ کو آواز کی دلکشی بھا جاتی ہے اور قوت خیالیہ اور قوت ادراکیہ بھی ان کی ہمنوائی کرتے ہیں تو دوسرا مرحلہ شروع ہوتا ہے اور نفس محبت میں پھنس جاتا ہے اور وہ اس حالت میں ایسا مستغرق ہو جاتا ہے کہ اس کو اور چیزوں کی کچھ خبر نہیں رہتی۔ دل برابر محبوب میں لگا رہتا ہے۔ خواہ محبوب سامنے ہو یا نہ ہو یا کوئی دوسری حالت بھوک پیاس وغیرہ پیش آجائے تب بھی دل محبوب سے نہیں ہٹتا۔ پھر تیسرا مرحلہ شروع ہوتا ہے یعنی جب وہ حالت چلی جاتی ہے تب بھی وہ چیز رنگ اور میل چھوڑ جاتی ہے اور دل میں محبت کی کسک باقی رہتی ہے۔ محبوب تصور سے نہیں نکلتا۔ اسی طرح اس کے دن رات گزرتے رہتے ہیں اور اس کو تحصیل کمال کی فرصت ہی نہیں ملتی۔ پھر کچھ لوگ تو عرصہ دراز کے بعد اس حالت سے نکل جاتے ہیں۔ اور کچھ مدت العمر اسی میں پھنسے رہتے ہیں۔ اور کچھ عشق ومحبت میں دیوانے ہو جاتے ہیں وہ نہ ریت رواج کی پرواہ کرتے ہیں نہ عقل کی سنتے ہیں۔ ان کو نصیحت وملامت کی جائے تو وہ بھی کارگر نہیں ہوتی۔ یہ حالت "حجاب نفس" کہلاتی ہے۔ کیونکہ جب نفس اس حالت کے اسباب کی طرف متوجہ ہوتا ہے تبھی وہ حالت پیش آتی ہے اور اسی کو "حجاب طبیعت" بھی کہتے ہیں۔ کیونکہ یہ حجاب طبیعت کے تقاضے سے پیدا ہوتا ہے۔

(۲) حجاب دنیا کا بیان: حجاب نفس کا شکار تو کم عقل والے ہوتے ہیں۔ مگر حجاب دنیا میں بڑے بڑے عقل مند پھنستے ہیں۔ کیونکہ جن کو کامل عقل ملی ہے اور تیقظ وبیداری میں سے بھی ان کو وافر حصہ ملا ہے۔ وہ ہر وقت طبیعت کے تقاضوں میں تو مبتلا نہیں رہتے۔ وہ فرصت کے کچھ ایسے لمحات نکال لیتے ہیں کہ جن میں نفس کے تقاضے تھم جاتے ہیں۔ اور ان کے دل میں نفسانی تقاضوں کے علاوہ دوسری چیزوں کی گنجائش نکل آتی ہے۔ ان کے دل میں قوت عاقلہ اور قوت عاملہ کے مناسب حال علوم وکمالات کی تحصیل کا شوق بھی انگڑائیاں لیتا ہے اور وہ اس کو ضروری سمجھتے ہیں۔ مگر جب یہ لوگ بصیرت کی آنکھ کھولتے اور ہوش سنبھالتے ہیں تو سب سے پہلے ان کی نگاہ ماحول پر پڑتی ہے۔ وہ دیکھتے ہیں کہ لوگوں کے پاس شاندار کوٹھیاں ہیں۔ بہترین کاروبار ہیں۔ خوبصورت بیویاں اور خوش شکل اولاد ہے، شاندار لباس وپوشاک ہے، عیش وعشرت کی زندگی گزارتے ہیں اور فصاحتوں میں اور صنعت وحرفت میں مقابلہ بازیاں کرتے ہیں تو یہ چیزیں ان کو بے حد پسند آجاتی ہیں۔ وہ ان کے دلدادہ ہو جاتے ہیں اور عزم وہمت اور کامل توجہ سے وہ دنیا کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں اور اپنی قوم کے

ساتھ دنیا کی دوڑ میں شریک ہوجاتے ہیں۔ اور ان میں جو تحصیل کمالات کا جذبہ ابھرا تھا وہ خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہوپاتا۔ یہ "حجاب رسم" کہلاتا ہے۔ کیونکہ قوم کی رسوم رواج اور رائج اقدار نے اس شخص کو فطری کمالات کی تحصیل سے روک دیا ہے۔ اور یہی "حجاب دنیا" کہلاتا ہے۔ کیونکہ یہ تمام امور جن میں آدمی مشغول ہوا ہے دنیوی چیزیں ہیں، اور فطری کمالات سے فروتر ہیں۔ اور گو وہ مفید ہیں مگر دنیا کی حد تک مفید ہیں، آخرت میں یہ چیزیں کچھ کام آنے والی نہیں۔

(۳) حجاب سوئے فہم کا بیان: اور جو لوگ موت تک دنیا میں پھنسے رہتے ہیں، وہ جب مرجاتے ہیں تو تمام تر دنیوی فضائل وکمالات سے تہی دست رہ جاتے ہیں۔ کیونکہ دنیوی کمالات جسم واعضاء کے محتاج ہیں۔ اور وہ اب رہے نہیں، اس لئے نفس دنیوی خوبیوں سے غافل ہوجاتا ہے اور دنیا کا کوئی کمال ان کے پاس باقی نہیں رہتا اور ان کا حال اُس باغ والے جیسا ہوکر رہ جاتا ہے جس کو کوئی بگولا آکر خاکستر کردے یا ان کا حال اس مالک جیسا ہوجاتا ہے جس کو موسم گرما کی تیز ہوا آکر اڑالے جائے یعنی اس کی ساری پونجی برباد ہوجائے اور وہ کف افسوس ملتے رہ جائیں۔

لیکن اگر وہ دانا بینا بھی ہوتا ہے اور وہ عقل مند نہایت چوکنا اور بے حد سمجھدار ہوتا ہے تو وہ دلیل برہانی سے یا دلیل خطابی سے یا شریعت کی تقلید کے ذریعہ رب کا یقین پیدا کرلیتا ہے۔ وہ کائنات میں پھیلی ہوئی ہرسو خدا کے وجود اور قدرت کی نشانیوں میں غور کرتا ہے یا کسی واعظ کی دلنشیں اور موثر تقریر سنتا ہے یا کسی مذہب کو مانتا ہے اور اس مذہب کی رو سے وہ مان لیتا ہے کہ اس کا ایک رب ہے جو بندوں پر غالب ہے، جو بندوں کے تمام کاموں کا نظم وانتظام کرتا ہے اور جو بندوں کو ہر قسم کی نعمتوں سے سرفراز فرماتا ہے۔ جب دل میں یہ یقین جاگزیں ہوجاتا ہے تو اس میں پروردگار کی طرف میلان اور اس کی محبت پیدا ہوتی ہے اور وہ قرب خداوندی کا طالب ہوتا ہے اپنی تمام تر حاجتیں اس کے سامنے پیش کرتا ہے اور اپنے تمام اختیارات اس کے حوالہ کردیتا ہے —— ان لوگوں میں سے بعض برحق ہوتے ہیں اور بعض گمراہ۔

اور گمراہی کے بڑے اسباب دو ہیں:

پہلا سبب: اللہ تعالیٰ میں مخلوق کی صفات مان لینا۔

دوسرا سبب: مخلوق میں اللہ تعالیٰ کی صفات مان لینا۔

پہلی گمراہی تشبیہ (مانند ٹھہرانا) کہلاتی ہے اور دوسری اِشراک (شریک ٹھہرانا) اور پہلی گمراہی اس وجہ سے پیدا ہوتی ہے کہ غائب (اللہ تعالیٰ) کو حاضر (مخلوق) پر قیاس کیا جاتا ہے یعنی اللہ تعالیٰ کو بھی مخلوقات جیسا سمجھ لیا جاتا ہے اس لئے مخلوقات کی کمزوریاں اللہ تعالیٰ میں بھی مان لی جاتی ہیں۔ اور دوسری گمراہی اس لئے پیدا ہوتی ہے کہ بعض مخلوقات سے خارق عادت کام دیکھنے میں آتے ہیں تو یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ ان کے اپنے کام ہیں یعنی وہ خود ان کاموں کے خالق ہیں اور یہ خلق (پیدا کرنا) ان کی ذاتی صفت ہے جیسے عیسیٰ علیہ السلام کا گارے سے پرندہ بنانا اور اس میں پھونک مارنے سے پرندہ کا زندہ ہوجانا اور مادرزاد اندھوں کو اور برص کے بیماروں کو اچھا کرنا اور مردوں کو قبروں سے زندہ کرکے نکالنا وغیرہ۔

یہ اور اس کے علاوہ دوسری چھوٹی موٹی بد عقیدگیاں "سوئے فہم کا حجاب" اور "جہالت کا حجاب" کہلاتی ہیں۔ یہ بھی تحصیل کمالات کی راہ سے بے راہ کرتی ہیں۔ کیونکہ ادنی شرک و تشبیہ کے ساتھ بھی کوئی عبادت قبول نہیں کی جاتی۔ قرآن و حدیث اس مضمون سے بھرے پڑے ہیں۔

حاصل کلام: یہ ہے کہ اگر آپ لوگوں کا جائزہ لیں تو آپ کو وہ سب باتیں بلا کم و کاست لوگوں میں مل جائیں گی جو ہم نے بیان کی ہیں۔ آپ ان باتوں میں ادنی تفاوت نہیں پائیں گے۔ آپ دیکھیں گے کہ ہر انسان خواہ وہ کسی مذہب کا ماننا ہو: بعض اوقات میں کم و بیش حجاب نفس میں زوبار رہتا ہے اگرچہ وہ اس حالت میں بھی رسمی کام (Routine Work) کرتا رہتا ہے۔

اور بعض اوقات میں وہ رسم و رواج کے چکر میں پڑا رہتا ہے۔ اس وقت اس پر بس یہی فکر سوار رہتی ہے کہ وہ قوم کے عقل مندوں کی موافقت کرے۔ ان کی طرح بات چیت کرے۔ ان کے جیسا لباس و پوشاک پہنے۔ انہی جیسے اخلاق و عادات اپنائے اور انہیں جیسا رہن سہن اختیار کرے۔

اور بعض اوقات میں وہ شرک و تشبیہ اور دوسری بد عقیدگیوں کی ان باتوں کی طرف سر جھکائے رہتا ہے جو وہ آباء و اجداد سے سنتا آیا ہے اور جبروت کی باتوں پر کان نہیں دھرتا یعنی اللہ تعالیٰ کو اس طرح پہچاننے کی کوشش نہیں کرتا جس طرح اس کو پہچاننے کا حق ہے۔ اسی طرح عالم میں جو قدرت کا مخفی نظام ہے اس کو سمجھنے کی بھی کوشش نہیں کرتا یعنی یہ جاننے کی زحمت نہیں کرتا کہ اللہ تعالیٰ بعض بندوں کے ہاتھ سے کیوں خارق عادت امور ظاہر فرماتے ہیں اور اس میں کیا حکمت ملحوظ ہوتی ہے؟ مثلاً انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے ہاتھوں پر معجزات اس لئے ظاہر کئے جاتے ہیں کہ نبوت و رسالت خود ایک خرق عادت امر ہے، جو اللہ کی قدرت میں ہے۔ یہ بات ظاہر کرنے کے لئے نبی کے دست مبارک سے دیگر خرق عادت امور ظاہر کرائے جاتے ہیں تاکہ وہ لوگوں کے لئے دلیل اور نظیر بنیں کہ جس طرح یہ خرق عادت امور ممکن ہیں، نبوت و رسالت اور وحی و نزول کتاب بھی ایک ممکن امر ہے، پھر اس کا انکار کیوں کیا جائے!

﴿باب الحُجُب المانعة عن ظهور الفطرة﴾

اعلم: أن مُعْظَم الحجب ثلاثة: حجاب الطبع، وحجاب الرسم، وحجاب سُوْءِ المعرفة:

وذلك: لأنه رُكِّبَ في الإنسان دواعي الأكل والشرب، والنكاح، وجُعل قلبه معدّة للأحوال الطبيعية، كالحزن والنشاط والغضب والوَجَل وغيرها، فلايزال مشغولا بها، إذ كُلُّ حالة يقدمها توجهُ النفس إلى أسبابها، وانقيادُ القوى العلمية لمايناسبها، ويجتمع معها استغراقُ النفس فيها، وذهولُها عما سواها، ويتخلف عنها بقيةُ ظِلِّها وزَمْخَرُ لونها، فمر الأيام والليالي وهو على ذلك،

لا يتفرغ لتحصيل غيرها من الكمال؛ ورب إنسان ارتطمت قدماه في هذا الوحل، فلم يخرج منه طولَ عمره؛ ورب إنسان غلب عليه حكم الطبع، فخلع ربقة الرسم والعقل، ولم ينزجر بالملامة؛ وهذا الحجاب يسمى بالنفس.

لكن من تمّ عقلُه، وتوفّر تيقظه، يختطف من أوقاته فُرصًا يركد فيها أحوالُه الطبيعية، ويتسع نفسه لهذه الأحوال وغيرها، ويستوجب لفيضان علوم أخرى غير استيفاء مقتضيات الطبع، ويشتاق إلى الكمال النوعي بحسب القوتين: العاقلة والعاملة؛ فإذا فتح حدقة بصيرته أبصر في أول الأمر قومه في ارتفاقات، وزِيّ، ومباهات، وفضائل من الفصاحات والصناعات، فوقعت من قلبه بموقع عظيم، واستقبلها بعزيمة كاملة، وهمة قوية؛ وهذا حجاب الرسم، ويسمى بالدنيا.

ومن الناس من لا يزال مستغرقا في ذلك إلى أن يأتيه الموت، فتزول تلك الفضائلُ بأسرها، لأنها لا تتم إلا بالبدن والآلات، فتبقى النفس عاريةً ليس بها شيء، وصار مثله كمثل ذي جنة أصابها إعصار، أو كرماد اشتدت به الريح في يوم عاصف؛ فإن كان شديد الانتباه، عظيم الفطنة: استدل بدليل برهاني، أو خطابي، أو بتقليد الشرع: أن له ربا قاهرًا فوق عباده، مدبرًا أمورهم، منعما عليهم جميع النعم، لم يخلق في قلبه ميلٌ إليه، ومحبة به، وإرادة التقرب منه، ورفع الحاجات إليه، والطّراح لديه، فمن مصيب في هذا القصد ومخطئ.

ومُعظَم الخطأ شيئان:

[١] أن يُعتقد في الواجب صفاتُ المخلوق.

[٢] أو يُعتقد في المخلوق صفاتُ الواجب.

فالأول: هو التشبيه، ومنشؤُه قياس الغائب على الشاهد؛ والثاني: هو الإشراك، ومنشؤُه رؤيةُ الآثار الخارقة من المخلوقين، فيُظنُّ أنها مضافةٌ إليهم بمعنى الخلق، وأنها ذاتيةٌ لهم.

وينبغي لك أن تستقري أفراد الإنسان، هل ترى من تفاوت فيما أخبرتك؟ لا أظنك تجد ذلك، بل كلُّ إنسان، وإن كان في تشريع ما، لا بد له من أوقات يستغرق في حجاب الطبع، قلّت أو كثُرت، وإن لم يزل مباشرا للأعمال الرسمية، ومن أوقات يستغرق في حجاب الرسم، ويهمه حينئذ التشبهُ بعاقلي قومه كلامًا وزيًا وخُلُقًا ومعاشرةً، وأوقاتٍ يُصغي فيها إلى ما كان يسمع، ولا يُصغي من أحاديث الجبروت والتدبير الغيبي في العالم، والله أعلم.

ترجمہ: ان حجابات کا بیان جو فطرت کو ظاہر ہونے سے روکنے والے ہیں: جان لیں کہ بڑے حجابات تین ہیں

طبیعت (نفس) کا حجاب، رسمیت رواج (دنیا) کا حجاب اور بدفہمی (جہالت) کا حجاب:

اور وہ اس لئے ہے کہ انسان میں کھانے پینے اور نکاح کے تقاضے مرکب کئے گئے ہیں۔ اور اس کو اول فطری احوال کی سواری بنایا گیا ہے جیسے غم، بشاشت، بشاشی، بھوک، غصہ اور خوف وغیرہ۔ پس انسان برابر ان احوال میں مشغول رہتا ہے۔ کیونکہ ہر حالت سے پہلے نفس اس کے اسباب کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ اور قوی علمیہ اس چیز کے تابع ہوتے ہیں جو اس حالت کے مناسب حال ہوتی ہے۔ اور اکٹھا ہوتا ہے اس حالت کے ساتھ نفس کا اس میں مستغرق ہونا، اور اس حالت کے ماسوا سے بے خبر ہونا۔ اور اس حالت سے پیچھے رہ جاتا ہے اس کا باقی سایہ اور اس کے رنگ کا میل۔ پس دن رات گذرتے رہتے ہیں اور وہ اسی حالت میں ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ کمال کی تحصیل کے لئے فارغ نہیں ہوتا۔ اور بعض لوگوں کے پاؤں اس کیچڑ میں دھنس جاتے ہیں، پس وہ اس سے زندگی بھر نہیں نکلتا۔ اور بعض لوگوں پر طبیعت کا تقاضا غالب آجاتا ہے۔ پس وہ رسمیت رواج اور عقل کے حلقہ سے اپنی گردن نکال لیتے ہیں۔ اور وہ ملامت کرنے سے بھی باز نہیں آتے۔ اور یہ "حجاب نفس" کہلاتا ہے۔

لیکن جس کی عقل تام ہوتی ہے اور بیداری سے اس کو وافر حصہ ملا ہوتا ہے، وہ اپنے اوقات میں سے کچھ لمحات جھپٹ لیتا ہے جس میں اس کے طبعی احوال تھم جاتے ہیں۔ اور اس کے نفس میں ان احوال کے لئے اور ان کے علاوہ دیگر امور کے لئے گنجائش نکل آتی ہے۔ اور وہ طبیعت کے تقاضوں کی تحصیل کے علاوہ دیگر علوم کے فیضان کو واجب ولازم جانتا ہے۔ اور وہ قوت عاقلہ اور قوت عاملہ کے اعتبار سے کمال نوعی کا مشتاق ہوتا ہے۔ پس جب وہ اپنی بصیرت کی آنکھ کھولتا ہے تو وہ اول امر میں اپنی قوم کو دیکھتا ہے۔ تدبیرات نافعہ اور پوشاک اور فخر اور فصاحت وکاریگریوں کے کمالات میں۔ پس یہ چیزیں اس کو بہت ہی پسند آجاتی ہیں۔ اور وہ عزیمت کاملہ اور پوری توجہ سے ان چیزوں کا استقبال کرتا ہے۔ اور یہ رسمیت رواج کا پردہ ہے جو "دنیا" کہلاتی ہے۔

اور بعض لوگ برابر ان (دنیوی) حالات میں مستغرق رہتے ہیں تا آنکہ ان کی موت کا وقت آجاتا ہے۔ پس وہ (دنیوی) کمالات بالکلیہ زائل ہوجاتے ہیں۔ کیونکہ وہ بغیر بدن اور آلات (اعضاء) کے بغیر تکمیل پذیر نہیں ہوتے۔ پس نفس عاری رہ جاتا ہے اس میں کوئی کمال نہیں ہوتا۔ اور اس کا حال اس باغ والے کے حال جیسا ہوجاتا ہے جس کو کوئی بگولا پہنچے پس اس کو خاکستر کردے (دیکھئے سورۃ البقرۃ آیت ۲۶۶) یا اس راکھ جیسا ہوجاتا ہے جس کو سخت آندھی کے دن میں ہوا اڑا دے (دیکھئے سورۃ ابراہیم آیت ۱۸) پس اگر وہ شخص نہایت ہی چوکنا ہے، اور بہت زیادہ سمجھ دار ہے تو وہ دلیل برہانی یا دلیل خطابی یا تقلید شرعی سے اس بات کا یقین کرلیتا ہے کہ اس کا ایک رب ہے جو اپنے بندوں پر غالب ہے، جو ان کے کاموں کا انصرام کرنے والا ہے جو ان پر ہر قسم کی نعمتیں مبذول کرنے والا ہے۔ پھر اس کے دل میں اس رب کی طرف میلان اور اس کے ساتھ محبت پیدا کی جاتی ہے۔ اور وہ اس رب سے نزدیک ہونا چاہتا ہے اور اس کے

سامنے جو چیز پیش کرنا چاہتا ہے اور اپنے آپ کو اس کے سامنے ڈال دیتا ہے۔ پس کوئی تو اس مقصد میں مصیب ہوتا ہے اور کوئی غلط راہ چلنے والا۔

اور بڑی غلطیاں دو ہیں:

ایک: یہ کہ واجب تعالیٰ میں مخلوق کی صفات مان لی جائیں۔

دوسری: یا مخلوق میں واجب تعالیٰ کی صفات مان لی جائیں۔

پس اول "تشبیہ" ہے اور اس کے پیدا ہونے کی جگہ غائب کو حاضر پر قیاس کرنا ہے۔ اور دوسری "شرک" (شریک ٹھہرانا) ہے اور اس کے پیدا ہونے کی جگہ مخلوق سے خارق عادت آثار کو دیکھنا ہے۔ پس وہ گمان کرتا ہے کہ یہ کام ان لوگوں کی طرف منسوب ہیں خلق (پیدا کرنے) کے معنی کے اعتبار سے، اور یہ کہ وہ ان لوگوں کے ذاتی کام ہیں۔

اور آپ کے لئے مناسب یہ ہے کہ آپ انسانوں کے فرقوں کا جائزہ لیں، کیا آپ کوئی تفاوت پاتے ہیں ان باتوں میں جو میں نے آپ کو بتلائیں؟ جہاں تک میرا خیال ہے آپ کوئی تفاوت نہیں پائیں گے! بلکہ ہر انسان، خواہ وہ کسی مذہب کو مانتا ہو، اس کے لئے کچھ اوقات ایسے ضرور ہوتے ہیں جن میں وہ طبیعت کے حجاب میں ڈوبا رہتا ہے، خواہ وہ اوقات کم ہوں یا زیادہ، اگرچہ وہ قوم میں رائج اعمال کو برابر کرتا رہے ——— اور کچھ اوقات ایسے ہوتے ہیں کہ وہ رسم و رواج کے حجاب میں ڈوب جائے۔ اور اس وقت اس کا مصرف یہ فکر ہوتی ہے کہ اپنی قوم کے عقل مندوں کی مشابہت اختیار کرے، بات چیت میں، لباس وپوشاک میں، اخلاق وعادات میں اور رہن سہن میں ——— اور کچھ اوقات ایسے ضروری ہیں کہ وہ ان باتوں کی طرف کان دھرے جن کو وہ (آباء واجداد سے) سنتا آیا ہے، اور جبروت کی باتوں کی طرف اور قلم میں تدبیر الٰہی کی طرف کان نہ جھکائے۔ باقی اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں۔

لغات: مُعظم الشئ: چیز کا بڑا حصہ، جمع معاظم ۔ اِرتطم: کیچڑ میں گرنا ۔ رِبقہ اور رَبقہ: رسی کا پھندا، الربقۃ کی جمع ربق ... طَرَحَ: ڈالدینا، پھینک دینا یعنی وہ اپنے آپ کو اللہ کے سامنے ڈالدیتا ہے ۔ اَمْعَنَ: غور وفکر کرنا، کام میں ڈالنا۔

باب ——— ۷

حجابات مذکورہ کو دور کرنے کا طریقہ

پچھلے باب میں تحصیل فطرت کی راہ کے تین حجابات ذکر کئے گئے ہیں: ۱- نفس کا حجاب ۲- دنیا کا حجاب ۳- بدفہمی یعنی اللہ کے صفات کو صحیح نہ جاننے کا حجاب۔ اب اس باب میں ان حجابات کو دور کرنے کا طریقہ بیان کیا گیا ہے۔

جو مناسب نہیں اور سنگین جرائم پر محض زبانی تکیر کافی نہیں۔ بلکہ دردناک مار اور کمر توڑ جرمانہ کرنا ضروری ہے اور ایسی سخت سزائیں ان جرائم کے لئے مناسب ہیں جن کا ضرر متعدی ہے جیسے زنا اور قتل۔ ایسے سنگین جرائم پر ہلکی سزائیں دینا جرائم روکنے میں نا کافی ہے۔

﴿باب طريق رفع هذه الحجب﴾

اعلم: أن تدبير حجاب الطبع شيئان: أحدهما يُؤمر به، ويرغب فيه، ويُحثُّ عليه، والثاني يُضرب عليه من فوقه، ويُؤاخذ به، أشاء أم أبى:

فالأول: رياضات تُضعف البهيمية، كالصوم، والسهر، ومن الناس من أفرط، واختار تغيير خلق الله، مثل قطع آلات التناسل، وتجفيف عضوٍ شريف، كاليد، والرِّجل؛ وأولئك جهال العُبّاد، وخير الأمور وسطها، وإنما الصوم والسهر بمنزلة دواءٍ مُرٍّ يجب أن يُقدَّر بقدر ضروري.

والثاني: إقامة الإنكار على من اتّبع الطبيعة، فخالف السنّة الراشدة، وبيانُ طريق التفصي من كل غلبة طبيعية، وضرب سنة له، ولا ينبغي أن يُضيَّق على الناس كلّ التضييق؛ ولا يكفي في الكل الإنكارُ القولي، بل لابد من ضرب وجيع، وغرامة مُنهِكة في بعض الأمور؛ والأليق بذلك الارتفاقات فيها ضررٌ متعدٍّ، كالزنا، والقتل.

ترجمہ: ان پردوں کو اٹھانے کے طریقہ کا بیان: جان لیں کہ حجابِ طبیعت کی تدبیر دو چیزیں ہیں۔ ان میں سے ایک کا حکم دیا جائے گا اور اس کی ترغیب دی جائے گی اور اس پر ابھارا جائے گا۔ اور دوسری اس پر مسلط کی جائے گی اس کے اوپر سے اور اس کے ذریعہ دار و گیر کی جائے گی۔ خواہ وہ چاہے یا انکار کرے۔

پس پہلی چیز: ایسی ریاضتیں ہیں جو بہیمیت کو کمزور کریں، جیسے روزہ اور شب بیداری۔ اور بعض لوگ (ریاضتوں میں) حد سے بڑھ گئے ہیں اور انھوں نے اللہ کی بناوٹ کو بدلنا پسند کیا، جیسے آلاتِ تناسل کا کاٹنا اور کسی کارآمد عضو کو خشک کرنا، جیسے ہاتھ اور پیر اور یہ لوگ بڑے ہی جاہل عبادت گزار ہیں۔ اور بہترین راہ میانہ راہ ہے۔ اور روزہ اور شب بیداری تو بس کڑوی دواء جیسی ہیں۔ ضروری ہے کہ ضروری مقدار کے ساتھ وہ اندازہ کی جائے۔

اور دوسری چیز: اس شخص پر نکیر کرنا ہے جو نفس کی پیروی کرتا ہے اور سنت راشدہ کی خلاف ورزی کرتا ہے اور ہر نفسانی غلبہ سے چھٹکارے کا طریقہ بیان کرنا ہے اور اس کے لئے ایک طریقہ مقرر کرنا ہے۔ اور یہ بات نامناسب ہے کہ لوگوں پر ہر طرح سے تنگی کی جائے۔ اور تمام جرائم میں محض زبانی نکیر کافی نہیں۔ بلکہ بعض امور میں دردناک مار اور کمر توڑ جرمانہ ضروری ہے اور اس سزا کی زیادہ مستحق اور وہ زیادتیاں ہیں جن کا نقصان دوسروں تک پہنچتا ہے، جیسے زنا اور قتل۔

لغات: سَهر (س) سَهرًا: ساری رات بیدار رہنا۔ وسط: میانہ معتدل اور وَسْط: درمیان تَفَصَّى تَفَصِّيًا: رہائی پانا۔ أَفَما: میں ہمزہ استفہام کا ہے اور ما نفی کا معادل ہے اور بغیر ہمزہ کے بھی درست ہے۔

④ حجابِ دنیا کے ازالہ کا طریقہ

حجابِ دنیا کے ازالہ کی بھی دو ترکیبیں ہیں:

پہلی ترکیب: تمام دنیوی معاملات کے ساتھ ذکر الٰہی شامل کر دیا جائے۔ یا تو باقاعدہ دعائیں یاد کرائی جائیں کہ صبح وشام میں، کھانے سے پہلے اور بعد میں، بیت الخلاء جاتے اور نکلتے وقت، گھر میں داخل ہوتے وقت اور باہر نکلتے وقت اور سوتے اور جاگتے وقت یہ دعائیں پڑھی جائیں۔ یا معاملات کے لئے شرعی حدود وقیود مقرر کی جائیں کہ اس طرح معاملہ کرنا شرعاً جائز ہے اور اس طرح کرنا ناجائز ہے۔ اس طرح کرنے سے دنیا کی ہر چیز عبادت بن جائے گی اور آدمی کسی بھی وقت اللہ کو نہیں بھولے گا اور دنیا میں انہماک کی برائیوں سے محفوظ رہے گا۔

دوسری ترکیب: کچھ عبادتوں کو رواجِ عام دیا جائے یعنی سب لوگوں کے لئے وہ عبادتیں ضروری قرار دی جائیں، جیسے پانچ فرض نمازیں، رمضان کے روزے وغیرہ۔ ان عبادتوں کی پابندی لوگوں پر لازم کی جائے، خواہ لوگ رضامند ہوں یا نہ ہوں۔ اور ان عبادتوں کے ترک پر ملامت کی جائے۔ اور اگر کوئی شخص ان طاعات کو فوت کر دے تو بطورِ سزا اس کی مرغوبات (مثلاً طلبہ کا کھانا اور امراء کا عہدہ) سے اس کو محروم کر دیا جائے۔

ان دو تدبیروں سے رسم ورواج کی خرابیاں یعنی دنیا کے جھمیل کی برائیاں دفع ہو جائیں گی۔ اور دنیا، دنیا نہیں رہے گی، بلکہ دین بن جائے گی اور عبادات غیروں کو متاثر کریں گی۔ اور ان کے دل میں اسلام کے حق میں لگاؤ پیدا کریں گی۔

> وتدبير حجاب الرسم: شيئان
>
> أحدهما: أن يُضَمَّ مع كل ارتفاقٍ ذكرُ الله تعالى، تارةً بحفظ ألفاظ يؤمر بها، وتارة بمراعاة حدود وقيود لا تُراعى إلا لله.
>
> والثاني: أن يُجعلَ أنواعٌ من الطاعات رسمًا فاشيًا، ويُشَدَّدَ على المحافظة عليها، أشاء أم أبى، ويُلامَ على تركها، ويُكبَحَ عن المرغوبات من الجاه وغيره، جزاءً لتفويتها.
>
> فبهذين التدبيرين تندفع غوائلُ الرسم، وتصير مؤيِّدةً لعبادة الله تعالى، وتصير السنّةُ تدعو إلى الحق.

ترجمہ: اور حجابِ رسم (دنیا) کی تدبیر دو چیزیں ہیں:

ان میں سے ایک: یہ ہے کہ ہر تدبیرِ نافع کے ساتھ اللہ کا ذکر ملایا جائے۔ یعنی ایسے الفاظ یاد کرنے کے ذریعہ جن کے پڑھنے کا آدمی کو حکم دیا جائے اور کبھی ایسی حدود و قیود کی رعایت کرنے کے ذریعہ جن کی رعایت اللہ ہی کے لئے کی جاتی ہے (یعنی اس کو امرِ شرعی سمجھ کر اس کی پابندی کرے)

اور دوسری: یہ ہے کہ کچھ عبادتوں کو رواجِ عام دیا جائے اور ان عبادات کی نگہداشت کا فیصلہ کیا جائے۔ خواہ وہ چاہے یا انکار کرے اور ان طاعات کے ترک پر ملامت کی جائے۔ اور مرغوبات یعنی جاہ وغیرہ سے وہ شخص بند رکھا جائے ان طاعات کو فوت کرنے کی سزا کے طور پر۔

پس ان دو تدبیروں سے رواج کی برائی دور ہو جاتی ہے اور رسم و رواج اللہ کی عبادت کی تائید کرنے والی ہو جاتی ہیں اور وہ عادات ایسی زبانیں بن جاتی ہیں جو دینِ حق کی طرف دعوت دینے والی ہوتی ہیں۔

لغات: سَجَلَ القاضي عليه: فیصلہ کرنا ... كَبَحَ (ف) كَبْحًا عن الحاجة: باز رکھنا الغائلة: برائی مصیبت ... لاتراعي الا لله اصل میں لا يرعى الا الله ہے یہ تصحیف ہے تصحیح مخطوطہ کراچی سے کی گئی ہے۔

(۳) حجابِ بدعقیدگی کو زائل کرنے کا طریقہ

بدعقیدگی کی دونوں قسمیں یعنی تشبیہ و اشراک دو سببوں سے پیدا ہوتی ہیں۔ اس لئے علاج بھی دو ہیں:

پہلا سبب اور اس کا علاج: اللہ کی ذات والا صفات بشری صفات سے برتر و بالا ہے۔ وہ محسوسات اور نو پید چیزوں کے مانند ہونے سے پاک ہے۔ اس لئے کچھ لوگ حق تعالیٰ کو کما حقہ پہچان نہیں سکتے اور تشبیہ یا اشراک کی گمراہی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

گمراہی کے اس سبب کا علاج یہ ہے کہ لوگوں کو صفاتِ باری کے بارے میں صرف اتنی بات بتائی جائے جس کی ان کے ذہنوں میں سمائی ہو، زائد باتیں نہ بتائی جائیں، ورنہ وہ گمراہی کا باعث ہوں گی۔ مثلاً لوگوں سے صرف یہ کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ موجود ہیں مگر ان کا موجود ہونا ہمارے موجود ہونے کی طرح نہیں ہے، بلکہ ان کے شایانِ شان ہے۔ اور وہ زندہ ہیں، مگر ہمارے زندہ ہونے کی طرح نہیں ہیں، ان کی زندگی ان کے شایانِ شان ہے، ہم اس کی کیفیت کو نہیں سمجھ سکتے۔

صفاتِ باری کو سمجھا جا سکتا ہے: انسان دوسری چیزوں کی طرح اللہ پاک کی ذات کو اور ان کی صفات کو بھی سمجھ سکتا ہے۔ کیونکہ وہ ہر موجود و معدوم کو اور ہر مکانی اور غیر مکانی (مجرد) چیز کو جان سکتا ہے۔ اور جاننے کی دو صورتیں ہیں:

(۱) معلوم کی صورت ذہن میں لا کر اس کو جاننا۔ تمام محسوسات جو نظر کے سامنے ہوتی ہیں اسی طرح جانی جاتی ہیں۔

(۲) معلوم کو کسی چیز کے ساتھ تشبیہ دے کر یا کسی چیز پر قیاس کر کے جاننا۔ تمام معقولات اور وہ محسوسات جو نظر کے سامنے موجود نہیں ہیں اسی طرح جانی جاتی ہیں۔

(مردہ) میں بالفعل تو یہ صفت نہیں پائی جاتی مگر اس میں اس صفت کے پائے جانے کا امکان ہے۔ مردے پہلے بھی معجزہ سے زندہ ہوئے ہیں اور آئندہ قیامت میں بھی زندہ ہوں گے۔

اب غور کیجئے موالید میں برتر مخلوق "جاندار" سمجھی جاتی ہے، جماد کا کوئی مقام نہیں اور میت کا یک گونہ احترام ضروری ہے اسی لئے جنازہ لے کر دوڑنا مکروہ ہے اور شامی میں کراہیت کی وجہ میت کی بے توقیری بیان کی گئی ہے۔ پس ثابت ہوا کہ حیات صفات مدحیہ میں سے ہے، اس لئے اس کو اللہ تعالیٰ کے لئے ثابت کیا جائے۔ اسی طرح آپ صفت عدل کو ان تین مادوں میں پھیر کر دیکھیں تو اندازہ ہوگا کہ یہ بھی صفت مدح ہے اور بکاء (رونا) کو ان مادوں میں پھیر کر دیکھیں یا ظلم کو دیکھیں تو اندازہ ہوگا کہ یہ صفتیں تو خود مخلوق میں عیب ہیں پس ان صفات سے اللہ تعالیٰ کی پاکی بیان کرنا ضروری ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ صفت مادحہ (خوبی) کو اللہ تعالیٰ کے لئے اس دلیل سے ثابت کیا جائے کہ اللہ تعالیٰ میں اس صفت کے آثار پائے جاتے ہیں، جیسے زندہ میں زندگی کے آثار محسوس ہوتے ہیں اس لئے ہم اس کو زندہ کہتے ہیں۔ عادل میں عدل کے آثار پائے جاتے ہیں۔ ظالم میں ظلم کے آثار پائے جاتے ہیں۔ اسی طرح جن صفات کے آثار اللہ تعالیٰ میں پائے جاتے ہیں وہ صفات ثابت کی جائیں اور جن کے آثار نہیں پائے جاتے ان کی نفی کی جائے۔ اور تشبیہ کے ایہام کو یہ کہہ کر دفع کیا جائے کہ وہ "ہم جیسے" نہیں ہیں۔

دوسرا سبب اور اس کا علاج: اللہ تعالیٰ کی صحیح معرفت حاصل نہ ہونے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ لوگ دنیا کے خرخشوں میں اس بری طرح پھنسے رہتے ہیں کہ ان کو معرفت خداوندی حاصل کرنے کی فرصت ہی نہیں ملتی۔ دنیا اپنی زیبائش کے ساتھ اور لذتیں اپنی رعنائیوں کے ساتھ ہر وقت ان کی نگاہوں کے سامنے موجود رہتی ہیں۔ اور قوی علیہ: دل و دماغ اور حواس ظاہرہ اور باطنہ ہمیشہ حسی صورتوں سے بھرے رہتے ہیں۔ اس لئے آدمی کا دل دنیا کی چیزوں میں الجھا رہتا ہے۔ اور اس کو حق تعالیٰ کی طرف خالص توجہ کرنے کا موقعہ نہیں ملتا۔

اس حجاب کا علاج یہ ہے کہ دنیا کو دل و دماغ سے نکالا جائے اور دنیا کی مشغولیت کم کی جائے۔ اور اس کے لئے تین کام کئے جائیں:

۱- ایسی ریاضتیں اور ایسے اعمال اختیار کئے جائیں جن سے آدمی میں تجلیات ربانی کی صلاحیت پیدا ہو۔ تجلیات ربانی کا دیدار تو آخرت میں ہوگا مگر اس کی قابلیت یہاں پیدا کرنی ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ جو شخص آخرت میں دیدار خداوندی کا متمنی ہے وہ فجر اور عصر کی نماز میں غفلت نہ برتے (متفق علیہ، مشکوٰۃ، باب رؤیۃ اللہ، کتاب احوال القیامۃ، حدیث نمبر ۵۶۵۵) اس حدیث سے معلوم ہوا کہ نماز وغیرہ عبادتیں آدمی میں تجلیات ربانی کی زیارت کی استعداد پیدا کرتی ہیں۔

۲- خلوت نشینی اختیار کی جائے یعنی کچھ وقت کے لئے دنیا کے دھندوں سے دامن جھاڑ کر گوشہ نشینی اختیار کی جائے یا مسجد میں اعتکاف کیا جائے۔ جہاں اللہ کا ذکر و فکر کیا جائے، صحیح اسلامی عقائد سیکھے جائیں، معتبر علماء کی کتابوں کا مطالعہ کیا

پہلی قسم

قواعد کلیہ کے بیان میں

بحث پنجم

تمیز اور گن دوکی بحث

مبحث پنجم

نیکی اور گناہ کی بحث

تمہید : نیکی اور گناہ کی حقیقت کا بیان

باب (۱) توحید کا بیان

باب (۲) شرک کی حقیقت کا بیان

باب (۳) مظاہر شرک یعنی شرک کی صورتوں کا بیان

باب (۴) صفات الٰہیہ پر ایمان لانے کا بیان

باب (۵) تقدیر پر ایمان لانے کا بیان

باب (۶) عبادت اللہ تعالیٰ کا بندوں پر ایک حق ہے

باب (۷) شعائر اللہ کی تعظیم کا بیان

باب (۸) وضوء و غسل کے اسرار ورموز کا بیان

باب (۹) نماز کے اسرار ورموز کا بیان

باب (۱۰) زکوٰۃ کے اسرار کا بیان

باب (۱۱) روزوں کی حکمتوں کا بیان

باب (۱۲) حج کی حکمتوں کا بیان

باب (۱۳) نیکی کے مختلف کاموں کی حکمتیں

باب (۱۴) گناہوں کے مدارج

باب (۱۵) گناہوں کے مفاسد کا بیان

باب (۱۶) وہ گناہ جو آدمی کی ذات سے تعلق رکھتے ہیں

باب (۱۷) وہ گناہ جن کا لوگوں سے تعلق ہوتا ہے

مبحث پنجم

نیکی اور گناہ کی بحث

تمہید

نیکی اور گناہ کی حقیقت کا بیان

کتاب کے آغاز میں، مقدمہ کے آخر میں، جہاں فہرست مضامین دی گئی ہے، حضرت شاہ صاحب نے ارشاد فرمایا ہے کہ:

"میں نے دیکھا کہ اسرار شریعت کی تفصیلات دو بنیادوں کی طرف لوٹتی ہیں: ایک نیکی اور گناہ کی بحث، دوسری سیاست ملیہ (مذہبی حکومت) کی بحث، پھر میں نے دیکھا کہ نیکی اور گناہ کی حقیقت کا سمجھنا اس پر موقوف ہے کہ پہلے مجازات، ارتفاقات اور سعادت نوعیہ کی ابحاث جان لی جائیں"

اب شاہ صاحب ارشاد فرماتے ہیں کہ جب مبحث اول و دوم میں جزاؤ سزا کی باتیں، ہر طرح کی دلیلیں ذکر کی جاچکیں، پھر مبحث سوم میں ارتفاقات یعنی تدبیرات نافعہ کو بیان کردیا گیا، جو انسان کی گھٹی میں پڑی ہوئی ہیں، چنانچہ وہ انسانوں میں مسلسل چلی آرہی ہیں، کبھی بھی انسانی معاشرہ ان سے خالی نہیں رہا، پھر مبحث چہارم میں تحصیل سعادت کی راہ بیان کردی گئی تو اب وقت آگیا کہ ہم نیکی اور گناہ کی حقیقت بیان کریں۔

نیکی چار قسم کے کام ہیں:

۱- وہ کام جو ملأ اعلیٰ کی اطاعت کے تقاضے سے اور الہام الٰہی کو قبول کرنے اور مرضیات خداوندی میں فنا ہونے کی وجہ سے انجام دیئے جائیں یعنی کمال عبودیت و اطاعت کے تقاضے سے جو کام کئے جائیں وہ نیکی کے کام ہیں۔

۲- جن کاموں پر دنیا میں یا آخرت میں اچھا بدلہ ملے وہ نیکی کے کام ہیں۔

۳- جو کام ارتفاقات کو سنوارنے والے ہیں، جن پر انسانی معاشرہ کا مدار ہے، وہ نیکی کے کام ہیں۔

۴- جو کام اطاعت خداوندی کی حالت پیدا کریں اور حجابات کو دور کریں تاکہ قرب و حضور میسر آئے وہ سب نیکی

کے کام ہیں۔

اور گناہ بھی چار طرح کے کام ہیں

۱- جو کام شیطان کی اطاعت کے تقاضے سے اور اس کی مرضیات میں فنا ہونے کی وجہ سے کئے جائیں وہ گناہ کے کام ہیں۔

۲- جن کاموں پر دنیا میں یا آخرت میں سزا ملے وہ گناہ کے کام ہیں۔

۳- ارتفاقات کو بگاڑنے والے کام بھی گناہ کے کام ہیں۔

۴- جو کام خدا کی نافرمانی کی حالت پیدا کریں اور حجابات کو پختہ کریں وہ سب گناہ کے کام ہیں۔

نیکی بدی کی تشکیل: جس طرح سمجھدار لوگ آسائش کی زندگی بسر کرنے کے لئے مفید تدبیریں ڈھونڈ نکالتے ہیں، اور لوگ ان کو مفید سمجھ کر قبول کرتے ہیں اور رفتہ رفتہ وہ عام ہوجاتی ہیں، اسی طرح "نیکی کے طریقے" اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو الہام فرماتے ہیں جو ملکوتی انوار سے بہرہ ور ہوتے ہیں، اور جن پر امورِ فطرت (طہارت، اخبات، سماحت اور عدالت) کا غلبہ ہوتا ہے۔ یعنی انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کو وہ طریقے اسی طرح الہام کئے جاتے ہیں، جس طرح نیکوں کے دل میں وہ باتیں ڈالی جاتی ہیں جن سے ان کا طریقۂ زندگی سنورتا ہے۔ انبیاء ان طریقوں کو اپناتے ہیں اور دوسروں کو ان کی دعوت و ترغیب دیتے ہیں۔ دوسرے لوگ ان کی پیروی کرتے ہیں، اور رفتہ رفتہ نیکی کے وہ طریقے عام ہوجاتے ہیں۔ اب تمام لوگ ان "نیکی بدی" پر متفق ہیں، خواہ وہ کہیں کے رہنے والے ہوں، اور خواہ ان کا کوئی مذہب ہو۔ اور یہ بات ظاہر ہے کہ کسی فطری مناسبت اور نوعی تقاضے کی وجہ ہی سے ہوسکتی ہے۔ خواہ مخواہ یا اتفاقاً نہیں ہوسکتی۔ پس ثابت ہوا کہ "نیکی بدی" فطری امور ہیں۔

سوال: بر واثم کا تصور تو تمام اقوام و ملل میں پایا جاتا ہے مگر ہر قوم میں اس کی شکلیں مختلف ہیں۔ مثلاً کوئی صرف اللہ تعالیٰ کی بندگی کرتا ہے اور اسی کو نیکی سمجھتا ہے، اور کوئی شرک کا بھی روادار ہے اور اس کو بھی نیکی گردانتا ہے۔ پھر "نیکی بدی" پر اربابِ ملل کا اتفاق کہاں رہا؟ اسی طرح بہت سے لوگ نیکی کے کاموں سے کوسوں دور ہوتے ہیں، وہ زنا، چوری اور سود خوری جیسے اعمالِ بد اختیار کئے ہوئے ہوتے ہیں، پھر "نیکی بدی" فطری امور کیسے ہوئے؟

جواب: نیکی کی شکلوں کا اختلاف مضر نہیں، پس اس سے اعتراض درست نہیں، کیونکہ اصول پر سب کا اتفاق ہے اور وہ کافی ہے۔ مثلاً بندگی کی ضرورت کے سب قائل ہیں، اگرچہ اس کی صورتوں میں اختلاف ہے۔ اور جو لوگ نیکی سے روگردانی کرتے ہیں وہ انسانوں کا ناقص گروہ ہیں۔ اہلِ بصیرت ان کے احوال میں غور کریں گے تو ان کی سمجھ میں یہ بات آجائے گی کہ وہ خلافِ فطرت طریقۂ زندگی اختیار کئے ہوئے ہیں۔ اور انسانوں میں ان کی حیثیت اس زائد عضو کی ہے جس کو کاٹ پھینکنا باقی رکھنے سے زیادہ بہتر ہے۔ پس ان کے اطوار سے اعتراض بھی درست نہیں۔

۵۔ احسان: جس طرح فنِ بر انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی تعلیم سے لوگوں کو نصیب ہوا ہے، اس کی اشاعت کی تدبیریں بھی انہی حضرات نے تلقی کی ہیں۔ جن کا انسانیت کی گردنوں پر عظیم بار احسان ہے۔ (ان سب تدبیرات کا بیان مبحث سادس میں آئے گا)

آئندہ ابواب کے مقدمہ میں: اس مبحث کے آئندہ ابواب میں تین باتیں بیان کی گئی ہیں۔

(۱) فنِ بر کی بنیادی باتیں بیان کی گئی ہیں یعنی نیکی کے اہم کاموں کا تذکرہ کیا گیا ہے جیسے توحید (اللہ کو ایک ماننا) صفات پر ایمان، تقدیر پر ایمان وغیرہ۔ نیکی کے تمام کاموں کو بیان نہیں کیا گیا کیونکہ اس میں طول ہے۔ اور یہ اصولِ بر وہ ہیں جن پر تقسیم سے پہلے کی بڑی بڑی اقوام متفق ہیں۔ ان اقوام میں ایسے لوگ اٹھے ہیں جو اقتدار والے سلاطین اور صائب الرائے دانشمند تھے، عرب و عجم، یہود و ہنود اور مجوس کی اقوام میں ایسے لوگ پیدا ہوئے ہیں اور وہ سب ان اصولِ بر پر متفق ہیں۔

(۲) جب قوتِ بہیمیہ قوتِ ملکیہ کی مطیع ہوجاتی ہے تو نیکی کے کام کس طرح وجود میں آتے ہیں؟ اس کی کیفیت بیان کی گئی ہے۔

(۳) فنِ بر کے بعض وہ اصول بیان کئے گئے ہیں جو تجربہ سے معلوم ہوئے ہیں اور جنہیں عقلِ سلیم پرکھتی ہے۔

المبحث الخامس: مبحث البرّ والإثم

مقدمة: في بيان حقيقة البر والإثم

إذ قد ذكرنا سُنَّةَ المجازاة وأسبابَها، ثم ذكرنا الارتفاقات التي جُبل عليها البشر، فهي مستمرة فيهم، لاتنفك عنهم. ثم ذكرنا السعادة وطريق اكتسابها، حان أن نشتغل بتحقيق معنى البر والإثم.

فالبر: كلُّ عمل يفعله الإنسانُ قضيةً لانقياده للملأ الأعلى، واضمحلاله في تلقي الإلهام من الله، وصيرورته فانيًا في مراد الحق، وكلُّ عملٍ يُجزى عليه خيرًا في الدنيا أو الآخرة، وكلُّ عمل يُصلح الارتفاقات التي بُني عليها نظامُ الإنسان، وكلُّ عمل يهيئ حالةَ الانقياد، ويدفع الحُجُب.

والإثم: كلُّ عمل يفعله الإنسان قضيةً لانقياده للشيطان، وصيرورته فانيًا في مراده، وكلُّ عملٍ يُجازى عليه شرًا في الدنيا أو الآخرة، وكلُّ عمل يُفسد الارتفاقات، وكُلُّ عمل يفيد هيئةً مضادةً للانقياد، ويؤكِّدُ الحُجُب.

وكما أن الارتفاقات استنبطها أولو الخبرة، فاقتدى بهم الناس بشهادة قلوبهم، واتفق عليها أهل الأرض، أو من يُعتدُّ به منهم، فكذلك للبر سُنَنٌ ألهمها الله تعالى في قلوب المؤمنين

بالنور الملكي، الغالب عليهم خُلُق الفطرة، بمنزلة ما أُلهم في قلوب النحل ما يصلح به معاشها، فتحرّزوا عليها، وأخذوا بها، وأرشدوا إليها، وحثّوا عليها، فاقتدى بهم الناس، واتفق عليها أهل الملل جميعها في أقطار الأرض، على تباعُد بلدانهم، واختلاف أديانهم، بحكم مناسبة فطرية، واقتضاء نوعي.

ولا يضُرُّ ذلك اختلاف صور تلك السنن بعد الاتفاق على أصولها، ولا صدودُ طائفة مُتخدِّجة، لو تأمل فيهم أصحابُ البصائر، لم يشكّوا أن مادّتهم عصت الصورة النوعية، ولم تمكّن لأحكامها، وهم في الإنسان كالعضو الزائد من الجسد، زواله أجملُ له من بقائه.

ولشيوع هذه السنن أسباب جليلة، وتدبيرات محكمة، أحكمها المؤيَّدون بالوحي، صلوات الله عليهم، فأثبتوا لهم منّة عظيمة في رقاب الناس.

ونحن نريد أن ننبهك على أصول هذه السنن، مما أجمع عليه جمهورُ أهل الأقاليم الصالحة، من الأمم العظيمة التي يجمع كلُّ واحد أقوامًا من المتألهين، والملوك، والحكماء ذوي الرأي الثاقب، من عربهم، وعجمهم، ويهودهم، ومجوسهم، وهنودهم؛ ونشرح كيفية تولدها من انقياد البهيمية للقوة الملكية، وبعض فوائدها، حسبما جربنا على أنفسنا غير مرة، وأدى إليه العقل السليم. والله أعلم.

ترجمہ: مبحث پنجم: نیکی اور گناہ کی بحث۔ تمہید: نیکی اور گناہ کی حقیقت کا بیان: جب ہم ارتفاقات کے فلسفی اور انسی دلائل بیان کرچکے، پھر ہم نے وہ مفید تدبیریں بیان کیں، جن پر لوگ پیدا کئے گئے ہیں، یعنی وہ انسانوں میں مسلسل چلی آرہی ہیں، وہ ان سے جدا نہیں ہوتیں، پھر ہم نے نیک خُلق اور اس کو حاصل کرنے کی راہ ذکر کردی، تو اب وقت آگیا کہ ہم نیکی اور گناہ کے معنی کی تحقیق میں مشغول ہوں۔

پس نیکی ہر وہ عمل ہے جس کو انسان کرتا ہے ملأ اعلیٰ کی اطاعت کے اقتضاء سے، اور اس کے پاش پاش ہونے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے الہام حاصل کرنے میں، اور اس کے فنا ہونے کی وجہ سے مرضیاتِ خداوندی میں — اور ہر وہ عمل ہے جس پر دنیا میں یا آخرت میں اچھا بدلہ دیا جاتا ہے — اور ہر وہ عمل ہے جو ان ارتفاقات کو سنوارتا ہے جن پر نظامِ انسانی کا مدار ہے — اور ہر وہ عمل ہے جس سے تابعداری کی حالت پیدا ہوتی ہے اور حجابات دور ہوتے ہیں۔

اور گناہ ہر وہ عمل ہے جس کو انسان کرتا ہے شیطان کی اطاعت کے اقتضاء سے، اور اس کے شیطان کی مرادوں میں فنا ہونے کی وجہ سے — اور ہر وہ عمل ہے جس پر دنیا میں یا آخرت میں برا بدلہ دیا جاتا ہے — اور ہر وہ عمل ہے جو ارتفاقات کو بگاڑتا ہے — اور ہر وہ عمل ہے جس سے تابعداری کے برخلاف حالت پیدا ہوتی ہے اور جو حجابات کو پختہ کرتا ہے۔

اور جس طرح یہ بات ہے کہ جمہور لوگوں نے "مفید تدبیریں" نکالی ہیں، پس دین کی گواہی سے لوگوں نے ان کی پیروی کی ہے، اور ان پر زمین کے تمام باشندوں نے یا ان میں سے قابلِ لحاظ لوگوں نے اتفاق کرلیا ہے، پس اسی طرح حق کے لئے بھی "طریقے" ہیں، جو اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے دلوں میں الہام فرماتے ہیں جو ملکوتی انوار سے تائید یافتہ ہیں۔ اور جن پر فطرت کی باتیں چھائی ہوئی ہیں، جس طرح اللہ تعالیٰ نے شہد کی مکھیوں کے دلوں میں وہ باتیں ڈالی ہیں جن سے ان کا طریقۂ زندگی سنورتا ہے۔ پس وہ مُلْہَم حضرات ان سُنَن پر چلے، اور انھوں نے اُن طریقوں کو پکڑا اور انھوں نے (لوگوں) کو ان طریقوں کی راہ دکھلائی اور ان پر ابھارا، پس لوگوں نے ان کی پیروی کی، اور ان پر تمام اہلِ مِلَل نے اتفاق کیا، چار دانگِ عالَم میں، ان کے علاقوں کے دور دراز ہونے اور ان کے مذاہب کے مختلف ہونے کے باوجود ایک فطری مناسبت اور لوازم اقتضاء کی وجہ سے۔

اور ضرر نہیں پہنچاتا اس (دعوی) کو ان سنن پر کی شکلوں کا مختلف ہونا، ان کی بنیادی باتوں پر اتفاق کرنے کے بعد، اور نہ اس "ناقص کردہ" کا باز رہنا، جن میں اگر اہل بصیرت غور کریں گے تو ان کو ذرا شک نہیں رہے گا کہ ان کے مادہ نے صورتِ نوعیہ کی نافرمانی کی ہے اور ان کے مادے نے صورتِ نوعیہ کے احکام کو (روبعمل آنے کا) موقعہ ہی نہیں دیا ہے۔ اور وہ لوگ جسمِ انسانی میں اس زائد عضو کی طرح ہیں جس کا ختم ہوجانا، اس کے باقی رہنے سے انسان کے لئے زیادہ خوبصورتی کی بات ہے۔

اور ان طریقوں کے پھیلنے کے لئے بڑے اسباب اور مضبوط تدبیریں ہیں، جن کو ان حضرات نے پختہ کیا ہے جو وحی کے ساتھ مؤید ہیں۔ ان پر اللہ تعالیٰ کی بے پایاں رحمتیں نازل ہوں! ۔ پس انھوں نے اپنے لئے لوگوں کی گردنوں پر بڑے احسانات ثابت کئے ہیں۔

اور ہم آپ کو ان طریقوں کی بنیادی باتوں سے آگاہ کرنا چاہتے ہیں، جو ان باتوں میں سے ہیں جن پر معتدل روشن علاقوں کے باشندوں میں سے جمہور نے اتفاق کیا ہے۔ جو ان بڑی امتوں میں سے ہیں، جن میں سے ہر امت اللہ والوں، بادشاہوں اور درست رائے رکھنے والے دانشمندوں کی گروہوں کو جمع کرتی ہے۔ جو عرب وعجم، یہود ومجوس اور ہندوؤں میں سے ہیں — اور ہم ان طریقوں کے پیدا ہونے کی کیفیت کی تشریح کرنا چاہتے ہیں، بہیمیت کی تابعداری کرنے سے قوت ملکیہ کی — اور ہم ان طریقوں کے بعض فوائد کی تشریح کرنا چاہتے ہیں، جس طرح ہم نے ان کا بذاتِ خود بار بار تجربہ کیا ہے اور جس تک عقل سلیم پہنچاتی ہے۔ باقی اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں۔

لغات:

الاضمحلال: الاضمحلال: گھل جانا، پاش پاش ہونا، فنا ہونا، نیست ونابود ہونا ۔ تأكَّدَ: پختہ ہونا، مضبوط ہونا

اسمٰا الهون: هم علماء الحكمة الإلٰهية الرأي الثاقب (سوراخ کرنے والی رائے یعنی روشن رائے جو زیرِ غور مسئلہ میں سوراخ کردے یعنی حل کردے)

تشریح:

(۱) کسی حکم کو اس کی علت واقتضیہ سے ثابت کرنا دلیل لِمّی ہے اور کسی علامت سے ثابت کرنا دلیل انّی ہے، جیسے آگ دھویں کی علت ہے اور دھواں علامت ہے آگ کی، پس اگر کسی نے بھٹی میں آگ جلتی دیکھی جس کا دھواں چمنی کے ذریعہ اوپر نکل رہا ہے اور اس نے وہ دھواں نہیں دیکھا ہے اور کہا کہ آگ موجود ہے اور جب آگ موجود ہے تو دھواں بھی موجود ہوگا، یہی دھواں موجود ہے تو یہ دلیل لِمّی ہے۔ اور اگر کسی نے صرف چمنی سے دھواں نکلتے دیکھا اور آگ نہیں دیکھی اور کہا کہ "دھواں موجود ہے اور جب دھواں موجود ہے تو آگ بھی موجود ہوگی، پس آگ موجود ہے" یہ دلیل انّی ہے۔

دلیل لِمّی کو تعلیل اور دلیل انّی کو استدلال کہتے ہیں اور تعلیل استدلال سے قوی ہوتی ہے کیونکہ علت سے معلول متخلف نہیں ہوسکتا۔ اور علامت کی یہ شان نہیں، اور شاہ صاحب کا مقصود یہ ہے کہ مبحث اول میں مجازات کو دو قسم کے دلائل سے ثابت کیا جاچکا ہے: نسبة المجازاة یعنی مجازات کی علت اور ابنية المجازاة یعنی مجازات کی علامت یعنی علت وعلامت دونوں طریقوں سے مجازات کو ثابت کیا جاچکا ہے۔

(۲) قوله: بحكم مناسبة فطرية أي بسبب مناسبة البر لفطرة الإنسان، وبسبب اقتضاء النوع للبر (سندی)

(۳) قوله: حسبما جربنا أي نشرح بعد تجربة، لا بسمع ولا بتخمين.

باب — ۱

توحید کا بیان

نیکی کے کاموں میں اصل الاصول اور بہترین نیکی توحید (ایک خدا پر ایمان لانا) ہے اور توحید کی اہمیت چار وجوہ سے ہے:

پہلی وجہ: نیک بختی حاصل کرنے کے لئے جو چار صفات ضروری ہیں (دیکھئے مبحث چہارم کا باب چہارم) ان میں سب سے اہم صفت اخبات (بارگاہِ خداوندی میں نیازمندی) ہے۔ اور اس صفت کا حصول توحید پر موقوف ہے، کیونکہ چند خداؤں کا پرستار ششدر رہتا ہے، وہ کسی کا بھی نہیں ہوتا۔ سورۃ الزمر آیت ۲۹ میں موحد و مشرک کی مثال بیان کی گئی ہے کہ ایک غلام وہ ہے جس میں کئی ساجھی ہیں، جن میں ضد اضدی بھی ہے اور دوسرا غلام پورا کا پورا ایک ہی شخص کا ہے،

تو کیا ان دونوں غلاموں کی حالت یکساں ہو سکتی ہے؟! یعنی مشرک ہمیشہ ڈانواڈول رہتا ہے، کبھی غیر اللہ کی طرف دوڑتا ہے، کبھی خدا کی طرف، پھر غیر اللہ میں سے بھی کسی ایک پر وہ مطمئن نہیں ہوتا، کبھی کسی کی طرف رجوع کرتا ہے، کبھی کسی کی طرف، ایسی صورت میں کسی ایک کے ساتھ کمال نیاز مندی کیسے پیدا ہو سکتی ہے؟! اخبات ونیاز مندی تو خالص توحید ہی سے پیدا ہو سکتی ہے۔ پس سب قریب کی صورت یہ بن گئی کہ ”سعادت حقیقیہ کا حصول اخبات پر موقوف ہے، اور اخبات کی تحصیل توحید پر موقوف ہے، پس نیک بختی اور سعادت مندی توحید پر موقوف ہوئی“۔

دوسری وجہ: نیک بختی کی تحصیل جن صفات اربعہ پر موقوف ہے، ان کو اپنے اندر پیدا کرنے کی دو تدبیریں ہیں: ایک علمی، دوسری عملی۔ اور دونوں میں مفید تر علمی تدبیر ہے۔ اور اس کی بنیاد اور اس کا مدار توحید اور صفات باری تعالیٰ کی صحیح معرفت پر ہے (تفصیل کے لئے مبحث چہارم، باب پنجم ملاحظہ فرمائیں) اور سعادت کی تحصیل انسان کی غایت قصویٰ (سب سے بڑا مقصد) ہے، پس اس کے موقوف علیہ یعنی توحید کا بھی یہی درجہ ہوگا۔

تیسری وجہ: توحید یعنی ایک خدا پر ایمان لانے سے انسان کی پوری توجہ اللہ تعالیٰ کی طرف ہو جاتی ہے۔ اور عمدہ طریقہ پر اللہ کے ساتھ وصل کی نفس کے اندر استعداد پیدا ہو جاتی ہے۔ اور جو ایک خدا پر ایمان نہیں رکھتا، بلکہ در بدر جھکتا ہے، وہ کہیں کا بھی نہیں رہتا۔ سورۂ لقمان آیت ۲۲ میں ہے کہ: ”جو شخص اپنا رخ اللہ تعالیٰ کی طرف جھکا دے، اور وہ مخلص بھی ہو، تو اس نے بڑا ہی مضبوط حلقہ (کڑا) تھام لیا“ اور وہ ہلاکت وخسران سے محفوظ ہو گیا۔ سب و توجہ تام کی وجہ سے وہ اللہ تعالیٰ سے قریب ہوتا رہے گا، تا آنکہ اس کو وصال میسر آ جائے گا۔

چوتھی وجہ: احادیث شریفہ میں توحید کی اہمیت اور عظمت مرتبہ پر تنبیہ وارد ہوئی ہے اور اس کو تمام انواع بر (نیکی کے کاموں) میں ”دل“ کی حیثیت دی گئی ہے۔ یعنی جس طرح جسم کے صلاح وفساد کا مدار دل پر ہے، وہ سنورتا ہے تو تمام اعضاء سنور جاتے ہیں اور وہ بگڑتا ہے تو تمام اعضاء کے اعمال غلط ہو جاتے ہیں، اسی طرح نیکی کے کاموں کی قبولیت وعدم قبولیت کا مدار توحید پر ہے۔ اگر ایمان درست ہے تو ہر نیکی مقبول ہے۔ اور ایمان میں کھوٹ ہے تو ہر نیکی ضائع ہے۔

اور توحید کا یہ مقام ومرتبہ روایات سے اس طرح ثابت ہے کہ احادیث میں بالتصریح بطور عموم واطلاق کے ساتھ یہ بات آئی ہے کہ: ”جس کی موت اس حالت میں ہو کہ اس نے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کیا، تو وہ جنت میں داخل ہوگا“ (مشکوٰۃ شریف حدیث نمبر ۲۶، ۳۸) اور مسلم شریف کی ایک روایت میں ہے کہ: ”دوزخ کی آگ اس پر حرام ہے“ (مشکوٰۃ حدیث نمبر ۳۶) اور مسلم شریف ہی کی ایک دوسری روایت میں ہے کہ: ”وہ شخص جنت سے روکا نہیں جائے گا“ (مسلم شریف ۱:۴۳ مصری) احادیث میں اس قسم کی اور بھی تعبیرات آئی ہیں۔ مثلاً متفق علیہ حدیث میں ہے کہ أدخله الله الجنة على ما كان من العمل (اللہ تعالیٰ اس کو جنت میں داخل کریں گے، خواہ اس نے کچھ بھی عمل کیا ہو) (مشکوٰۃ شریف حدیث نمبر ۲۷)

اور مسلم شریف میں حدیث قدسی ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ ”جو شخص مجھ سے زمین کے برابر گناہ لے کر ملے اور اس نے میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کیا ہو تو میں اس سے اسی کے بقدر مغفرت کے ساتھ ملوں گا“ (جامع الاصول ۱۰: ۳۴۰)

﴿باب التوحید﴾

أصل أصول البر، وعمدة أنواعه: هو التوحيد؛ وذلك: لأنه يتوقف عليه الإخبات لرب العالمين، الذي هو أعظم الأخلاق الكاسبة للسعادة، وهو أصل التدبير العلمي الذي هو أنفع التدبيرين؛ وبه يحصل للإنسان التوجه التامُّ تلقاء الغيب؛ وتستعد نفسه للحوق به بالوجه المقدس؛ وقد نبه النبيُّ صلى الله عليه وسلم على عظم أمره، وكونه من أنواع البر بمنزلة القلب: إذا صلح صلح الجميعُ، وإذا فسد فسد الجميعُ، حيث أطلق القول فيمن مات لا يشرك بالله شيئا: ﴿أنه دخل الجنة﴾ أو ﴿حرمه اللهُ على النار﴾ أو ﴿لا يُحْجَبُ من الجنة﴾ ونحو ذلك من العبارات، وحكى عن ربه تبارك وتعالى: ﴿ومن لقيني بقراب الأرض خطيئة لا يشرك بي شيئا، لقيتُه بمثله مغفرةً﴾

ترجمہ: نیکی کے کاموں میں اصل الاصول اور اس کی انواع (اقسام) میں سب سے عمدہ یعنی سب کی بنیاد توحید ہے۔ اور یہ بات اس لئے ہے کہ رب العالمین کے حضور میں اخبات (انکساری) توحید پر موقوف ہے۔ اور اخبات وہ صفت ہے جو سعادت کو حاصل کرنے والے اخلاق میں سب سے بڑی (اہم) صفت ہے — اور توحید تدبیر علمی کی بنیاد ہے، جو دونوں تدبیروں میں مفید ترین تدبیر ہے — اور توحید کی وجہ سے انسان کو غیب (اللہ تعالیٰ) کی طرف توجہ تام حاصل ہوتی ہے اور نہایت عمدہ طریقہ پر غیب کے ساتھ ملنے کی نفس کے اندر استعداد پیدا ہوتی ہے — اور نبی کریم ﷺ نے توحید کی جلالت شان پر اور اس کے انواع بر میں بمنزلہ دل ہونے پر تنبیہ فرمائی ہے، جب وہ ٹھیک ہو جاتا ہے تو سب ٹھیک ہوتے ہیں اور جب وہ بگڑ جاتا ہے تو سب بگڑ جاتے ہیں۔ اس طرح کہ آپ نے بے قید (تعمیم کے ساتھ) اس شخص کے بارے میں جس کی موت اس حال میں آئی ہو کہ اس نے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کیا، ارشاد فرمایا ہے کہ: ”وہ جنت میں جائے گا“ یا ”دوزخ پر اللہ تعالیٰ نے اس کو حرام کر دیا ہے“ یا ”وہ جنت سے نہیں روکا جائے گا“ اور اس قسم کی (دیگر) تعبیرات۔ اور آپ ﷺ نے اپنے پروردگار تبارک وتعالیٰ سے نقل کیا ہے کہ: ”جو شخص مجھ سے ملے زمین کے برابر خطاؤں کے ساتھ درانحالیکہ اس نے میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کیا ہو تو میں اس سے اسی کے بقدر مغفرت کے ساتھ ملوں گا“

لغات: بالوجه المقدس أي بالوجه الأحسن (سندی) قراب الشيء (قاف کے کسرہ اور ضمہ کے

ساتھ) اندازے میں برابر۔

توحید کے چار مرتبے

جاننا چاہئے کہ توحید کے چار مرتبے ہیں:

پہلا مرتبہ: توحید ذات کا ہے یعنی صرف اللہ تعالیٰ کو واجب الوجود ماننا، کسی اور کو اس صفت کے ساتھ متصف نہ ماننا۔

واجب: وہ ہستی ہے جس کا عدم (نہ ہونا) ممتنع ہو یعنی اس کا وجود (ہونا) ضروری ہو۔ وجوب، وَجَبَ یَجِبُ کا مصدر ہے، جس کے معنی ہیں ثابت ہونا، لازم ہونا۔ اور واجب (اسم فاعل) بمعنی ثابت ہے۔ اور واجب الوجود کے معنی ہیں ثابت الوجود اور لازم الوجود —— پھر واجب کی دو قسمیں ہیں، واجب لذاتہ اور واجب لغیرہ۔

۱- واجب لذاتہ: وہ ہستی ہے جس کا وجود ذاتی ہو یعنی خانہ زاد ہو، وہ اپنے وجود میں غیر کا محتاج نہ ہو۔ ایسی ذات صرف اللہ تعالیٰ کی ہے اور کوئی ہستی واجب لذاتہ نہیں ہے۔

۲- واجب لغیرہ: وہ ہستی ہے جس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے وجود ملا ہو مگر وہ کبھی معدوم نہ ہو، جیسے عقول عشرہ فلاسفہ کے خیال کے مطابق واجب لغیرہ ہیں، مگر اسلامی تعلیمات کی رو سے کوئی چیز واجب لغیرہ نہیں ہے۔

دوسرا مرتبہ: توحید خلق کا ہے یعنی عرش، آسمان، زمین اور دیگر تمام جواہر کا خالق صرف اللہ تعالیٰ کو خالق ماننا۔

دنیا میں جو بھی چیز موجود ہے وہ یا تو جوہر ہوگی یا عرض:

جوہر: وہ ممکن ہے جو محل کے بغیر موجود ہو سکے یعنی وہ کسی ایسے محل کا محتاج نہ ہو جو اس کو موجود کرے، جیسے کپڑا، کتاب، قلم وغیرہ بے شمار چیزیں جواہر ہیں۔

عرض: وہ ممکن ہے جو کسی محل میں پایا جائے یعنی وہ پائے جانے میں، باقی رہنے میں اور متمکن ہونے میں کسی ایسے محل کا محتاج ہو جو اس کو سہارا دے، جیسے مقدار، زمانہ، اعداد، کیفیات، الوان، احوال، صفات، ملکات اور افعال عباد وغیرہ۔

اس کے بعد جاننا چاہئے کہ تمام اقوام جواہر کا خالق صرف اللہ تعالیٰ کو مانتی ہیں اور شاہ صاحب نے اسی کو توحید کا دوسرا مرتبہ قرار دیا ہے، کیونکہ آگے اس کو متفق علیہ بتلایا ہے۔ اور اعراض کا خالق گمراہ اقوام غیر اللہ کو بھی مانتی ہیں مثلاً شفا دینا، بیمار کرنا، فقر سے ہمکنار کرنا وغیرہ کا خالق مشرکین دیوی دیوتاؤں اور اولیاء کو بھی مانتے ہیں اور معتزلہ تو افعال عباد کا خالق خود بندوں کو مانتے ہیں۔

اس کے بعد شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ توحید کے ان دونوں مرتبوں سے آسمانی کتابوں میں بحث نہیں کی گئی۔ کیونکہ ان میں کسی کا اختلاف نہیں تھا۔ عرب کے مشرکین اور یہود و نصاریٰ جو قرآن کریم کے اولین مخاطب تھے وہ توحید کی ان دونوں قسموں کے قائل تھے۔ بلکہ قرآن کریم کی صراحت کے مطابق توحید کے یہ دونوں مرتبے مقدمات مسلمہ میں سے

تھے۔ اسی لئے قرآن کریم نے ان دونوں مرتبوں کو "مسلمہ باتوں" کی طرح ذکر فرمایا ہے ان پر دلائل قائم نہیں کئے۔

تیسرا مرتبہ: توحید تدبیر کا ہے یعنی یہ عقیدہ رکھنا کہ آسمان وزمین اور ان کے درمیان کی تمام چیزوں کا نظم وانتظام صرف اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے وہی کائنات کے مدبر و منتظم ہیں ان کے ساتھ کائنات کے نظم وانتظام میں کوئی شریک نہیں ہے۔ یعنی پروردگار وہی تنہا ہیں۔ اس مرتبہ کا دوسرا نام توحید ربوبیت ہے۔

چوتھا مرتبہ: توحید الوہیت کا ہے یعنی یہ عقیدہ رکھنا کہ اللہ تعالیٰ ہی معبود برحق ہیں۔ بندگی اور عبادت انہی کا حق ہے۔ ان کے علاوہ کوئی عبادت کا مستحق نہیں۔

توحید کے یہ دونوں آخری مرتبے باہم مربوط اور لازم وملزوم ہیں یعنی تدبیر اور عبادت کے درمیان فطری ارتباط اور باہمی تلازم ہے اس لئے ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوسکتے۔ جو مدبر و منتظم اور پروردگار ہوگا وہی عبادت کا حق دار ہوگا۔ اور عبادت اسی کا حق ہے جو کائنات کا نظم وانتظام اور پروردگاری کرتا ہے۔

نوٹ: توحید کے ان آخری دو مرتبوں میں اختلاف ہے جو آگے آرہا ہے۔

واعلم أن للتوحيد أربع مراتب:

إحداها: حصرُ وجوب الوجود فيه تعالى، فلا يكون غيره واجبًا.

والثانية: حصر خلق العرش، والسماوات والأرض، وسائر الجواهر فيه تعالى —— وهاتان المرتبتان لم تبحث الكتب الإلهية عنهما، ولم يخالف فيهما مشركو العرب، ولا اليهود ولا النصارى، بل القرآن العظيم ناصٌّ على أنهما من المقدمات المسلَّمة عندهم.

والثالثة: حصر تدبير السماوات والأرض وما بينهما فيه تعالى.

والرابعة: أنه لا يستحق غيرُه العبادةَ — وهما متشابكتان متلازمتان لربط طبيعي بينهما.

ترجمہ: اور جاننا چاہئے کہ توحید کے چار درجے ہیں:

اول: وجود (ہونے) کے ضروری ہونے کو اللہ تعالیٰ میں منحصر کرنا، پس ان کے علاوہ کوئی واجب نہ ہوگا۔

دوم: عرش، آسمان، زمین اور دیگر جواہر کے پیدا کرنے کو اللہ تعالیٰ میں منحصر کرنا —— اور ان دو مرتبوں سے کتب الہیہ نے بحث نہیں کی۔ اور ان میں نہ عرب کے مشرکوں نے اختلاف کیا ہے، نہ یہودیوں نے اور نہ نصاریٰ نے۔ بلکہ قرآن عظیم صراحت کرتا ہے کہ توحید کے یہ دونوں مرتبے ان لوگوں کے نزدیک "مسلمہ باتوں" میں سے تھے۔

سوم: آسمانوں، زمین اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے اس کے نظم وانتظام کو اللہ تعالیٰ میں منحصر کرنا۔

چہارم: یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی عبادت کا مستحق نہیں —— اور یہ دونوں مرتبے باہم گتھے ہوئے اور لازم

وملزوم ہیں، ان دونوں کے درمیان کسی فطری ارتباط کی وجہ سے۔

لغات: ناصّ (اسم فاعل) نصّ (ن) نصًّا الشیءَ: نمایاں کرنا، ظاہر کرنا۔ نصّ علیہ صراحت کرنا۔ انفکّ الامران: منقطع ہونا۔ تلازم الشیئان: ایک دوسرے کے ساتھ لازم ہونا، دو چیزوں کا باہم لازم وملزوم ہونا۔

تشریح: قوله: لربط الخ ای بین التدبیر والعبادة ارتباط فطری وتلازم عادی، لاینفك احدهما عن الآخر (سندی)

توحیدِ تدبیر اور توحیدِ الوہیت میں اختلاف

توحید کے آخری دو مرتبوں میں یعنی توحیدِ تدبیر اور توحیدِ الوہیت (معبودیت) میں مختلف جماعتوں نے اختلاف کیا ہے، ان کے بڑے گروہ تین ہیں:

پہلا گروہ ستارہ پرستوں کا ہے، ان کا خیال یہ ہے کہ ستارے پرستش کا استحقاق رکھتے ہیں، اور دنیا میں ان کی عبادت مفید ہے، اور ان کے سامنے حاجتیں پیش کرنا برحق ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ ہمیں تحقیق سے یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ روز مرہ کے واقعات میں، سعادت وشقاوت میں اور تندرستی اور بیماری میں ستاروں کی واضح تاثیرات ہیں، ان کے خیال میں ستارے جاندار مخلوقات ہیں۔ ان کی مادے سے مجرد ارواح ہیں یعنی وہ روحانی مخلوقات ہیں، اور سمجھ بوجھ رکھتی ہیں اور وہی ارواح ستاروں کی حرکت کا باعث ہیں، جو لوگ ان کی پرستش کرتے ہیں ان سے وہ باخبر رہتی ہیں، ان سے غافل نہیں ہوتیں۔ اس قسم کے وساوس کی وجہ سے انھوں نے ستاروں کے ہیکل (مجسمے) بنائے اور ان کی پوجا شروع کردی۔ مثلاً ہندوستان کے ستارہ پرستوں نے سورج کا ہیکل (مجسمہ) ایسی صورت میں بنایا ہے جس کے ہاتھ میں سرخ ہیرا ہے اور چاند کا ہیکل ایک بچھڑا بنایا ہے جسے چار بیل کھینچتے ہیں اور مورتی کے ہاتھ میں ہیرا ہے (ملل ونحل شہرستانی ۲: ۲۴۹)

وقد اختلف فيهما طوائفُ من الناس، مُعْظَمُهم ثلاثُ فِرَقٍ:

[۱] المنجِّمون: ذهبوا إلى أن النجوم تستحق العبادة، وأن عبادتها تنفع في الدنيا، ورفعَ الحاجات إليها حقٌّ، قالوا: قد تحققنا أن لها أثرًا عظيمًا في الحوادث اليومية، وسعادةِ المرء وشقاوتِه، وصحتِه وسُقْمِه، وأن لها نفوسًا مجردة عاقلةً تبعثُها على الحركة، ولا تَغْفُلُ عن عُبّادها، فبنوا هياكلَ على أسمائها، وعَبَدُوها.

ترجمہ: اور ان دو مرتبوں میں مختلف لوگوں نے اختلاف کیا ہے۔ اور ان کے بڑے فرقے تین ہیں:

(۱) ستارہ پرست ہیں۔ وہ لوگ اس طرف گئے ہیں کہ ستارے پرستش کے مستحق ہیں اور (اس طرف گئے ہیں) کہ ان کی عبادت دنیا میں مفید ہے اور ان کے سامنے اپنی حاجتیں پیش کرنا برحق ہے۔ ان کا استدلال یہ ہے کہ ہم نے تحقیق

سے یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ ان ستاروں کی بڑی تاثیر ہے، روزمرہ کے واقعات میں، آدمی کی نیک بختی اور بدبختی میں اور اس کی تندرستی اور بیماری میں اور یہ بات بھی محقق ہوگئی ہے کہ ستاروں کے لئے ایسے نفوس (ارواح) ہیں جو غیر مادی اور سمجھ بوجھ رکھنے والے ہیں، جو ان کو حرکت کرنے پر آمادہ کرتے ہیں۔ اور وہ اپنی پرستش کرنے والوں کی طرف سے غافل نہیں ہوتے۔ پس ان لوگوں نے ان ستاروں کے نام پر ہیکل (مجسمے) بنائے اور ان کی پوجا کرنے لگے۔

لغات: تحقق الرجل الأمر یقین کرنا، دل سے جاننا ۔۔ الْهَيَاكِلُ جمع هَيكَل: مجسمہ، پیکر۔ قوله نفوساً مجردةً أي عن المادة أو عن الألواث الهيولية، قال العلامة السندي رحمه الله: والصحيح أنه ليس لها نفوس ولا أرواح، بل هي جمادات وإنما حركة النجوم وغيرها من الأجرام السماوية بيد الملائكة الموكلة عليها اھ

☆ ☆ ☆

دوسرا گروہ مشرکین یعنی مورتی پوجنے والوں کا ہے۔ یہ لوگ مسلمانوں کی طرح بڑی بڑی چیزوں کا منتظم اللہ تعالیٰ کو مانتے ہیں اور کسی بھی معاملہ میں قطعی فیصلہ کرنے کا اختیار صرف اللہ تعالیٰ کے لئے ثابت کرتے ہیں۔ وہ لوگ ان دونوں باتوں میں مسلمانوں کے ہمنوا ہیں۔ مگر دیگر امور میں وہ مسلمانوں کے ساتھ متفق نہیں ہیں۔ وہ تین باتیں کہتے ہیں۔

پہلی بات: مشرکین کہتے ہیں کہ جو نیک بندے ہم سے پہلے گذرے ہیں انھوں نے اللہ تعالیٰ کی خوب بندگی کی ہے اور اللہ تعالیٰ کا قرب خاص حاصل کرلیا ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان کو خلعت الوہیت سے سرفراز کردیا ہے اور وہ دیگر مخلوقات کی بندگی کے حق دار ہوگئے ہیں، جیسے کوئی غلام بادشاہ کی شاندار خدمت کرتا ہے تو بادشاہ خوش ہوکر اس کو "شاہی پوشاک" عطا کرتا ہے اور اپنی مملکت کے کچھ حصہ کا نظم ونسق اس کو سونپ دیتا ہے، جس کی وجہ سے وہ اس علاقہ کے لوگوں کی طرف سے سمع وطاعت (بات سننے اور حکم ماننے) کا مستحق ہوجاتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ان اولیاء کو بعض بعض امور کا اختیار دیدیا ہے اس لئے ان کی بندگی ضروری ہے۔

مشرکین کی یہ بات محض بے دلیل ایک دعوی ہے۔ گو کہ یہ بات صحیح ہے کہ نیک لوگوں نے خدا کی خوب بندگی کرکے قرب خاص حاصل کرلیا ہے، مگر اللہ تعالیٰ نے خوش ہوکر ان کو خلعت الوہیت پہنایا ہے، اس کی کوئی دلیل نہیں، اور بادشاہ اور غلام کی تمثیل سے یہ بات ثابت کرنا غائب کو شاہد پر قیاس کرنا ہے جو کسی طرح درست نہیں۔ قرآن کریم میں ان کا یہ دعوی یہ کہہ کر رد کردیا ہے کہ حکومت اور ملک صرف اللہ تعالیٰ کے لئے مخصوص ہے، سورۃ الانعام آیت ۵۶ و ۵۷ میں ارشاد پاک ہے:

"آپ کہہ دیجئے کہ مجھ کو اس بات کی ممانعت کی گئی ہے کہ میں ان کی عبادت کروں جن کی تم لوگ اللہ کو چھوڑ کر عبادت کرتے ہو۔ آپ (یہ بھی) کہہ دیجئے کہ میں تمہارے خیالات کا اتباع نہ کروں گا (مشرکین کا یہ خیال ہی ہے جو اوپر

فلم يفطنوا للفرق بين الأصنام، وبين من هي على صورته، فظنوها معبودات بأعيانها.

ولذلك ردَّ الله تعالى عليهم تارةً بالتنبيه على أن الحكم والملك له خاصة، وتارة ببيان أنها جمادات: ﴿أَلَهُمْ أَرْجُلٌ يَمْشُونَ بِهَا؟ أَمْ لَهُمْ أَيْدٍ يَبْطِشُونَ بِهَا؟ أَمْ لَهُمْ أَعْيُنٌ يُبْصِرُونَ بِهَا؟ أَمْ لَهُمْ آذَانٌ يَسْمَعُونَ بِهَا؟﴾

ترجمہ: (۲) اور مشرکین مسلمانوں کے ساتھ ہم نوا ہیں بڑی چیزوں کے نظم و نسق میں اور قطعی اور بالجزم فیصلہ کرنے میں، وہ لوگ کسی اور کو اس کا کوئی اختیار نہیں دیتے۔ مگر وہ دیگر امور میں مسلمانوں کے ساتھ متفق نہیں ہیں۔ وہ اس طرف گئے ہیں کہ ان سے پہلے جو نیک بندے گزرے ہیں انھوں نے اللہ تعالیٰ کی خوب عبادت کی ہے اور انھوں نے اللہ کا قرب حاصل کر لیا ہے۔ پس اللہ نے ان کو الوہیت (خدائی) بخشی ہے، پس وہ اللہ کی دیگر مخلوق کی پرستش کے حقدار ہو گئے ہیں، جس طرح کہ شہنشاہ کی خدمت اس کا غلام کرتا ہے، پس وہ اس کی بہترین خدمت کرتا ہے تو بادشاہ اس کو "شاہی پوشاک" عطا فرماتا ہے۔ اور اس کو اپنی مملکت کے کچھ حصہ کا نظم و نسق سپرد کر دیتا ہے، پس وہ اس علاقہ والوں کی طرف سے سمع و طاعت کا مستحق ہو جاتا ہے۔

اور مشرکین یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت اس وقت تک مقبول نہیں ہوتی جب تک کہ اس کے ساتھ ان نیک لوگوں کی پرستش شامل نہ کی جائے، بلکہ حق تعالیٰ تو غایت درجہ برتر و بالا ہیں، پس (صرف) ان کی عبادت سے ان کی نزدیکی حاصل نہیں ہو سکتی، بلکہ ان نیک لوگوں کی پرستش بھی ضروری ہے تا کہ وہ اللہ کا نہایت مقرب بندہ بنا دیں۔

اور مشرکین یہ کہتے ہیں کہ یہ لوگ (یعنی اولیاء) سنتے ہیں اور دیکھتے ہیں اور اپنے پرستاروں کی سفارش کرتے ہیں اور ان کے کاموں کا نظم و نسق کرتے ہیں اور ان کی مدد کرتے ہیں، پس انھوں نے ان بزرگوں کے ناموں پر پتھر تراشے تا کہ وہ ان اصنام کو قبلہ بنائیں، جبکہ وہ ان بزرگوں کی طرف متوجہ ہوں، پھر ان کے بعد ایسے ناخلف پیدا ہوئے جو فرق نہیں سمجھ سکے مورتیوں کے درمیان اور ان لوگوں کے درمیان جن کی شکل پر یہ مورتیاں ہیں۔ پس ان لوگوں نے ان مورتیوں ہی کو بعینہٖ معبود سمجھ لیا۔

اور اسی بناء پر اللہ تعالیٰ نے کبھی تو ان پر رد کیا اس بات پر تنبیہ کر کے کہ حکم اور ملک صرف اللہ تعالیٰ کے لئے مخصوص ہے اور کبھی یہ بیان فرما کر کہ وہ مورتیاں محض جمادات (بے جان چیزیں) ہیں "کیا ان کے ایسے پاؤں ہیں جن سے وہ چلیں؟ یا ان کے ایسے ہاتھ ہیں جن سے وہ پکڑیں؟ یا ان کی ایسی آنکھیں ہیں جن سے وہ دیکھیں؟ یا ان کے ایسے کان ہیں جن سے وہ سنیں؟" (سورۃ الاعراف آیت ۱۹۵)

لغات:

فیما أبرم میں مصدر یہ ہے أی فی الإبرام والجزم الخیرۃ (مصدر) انتخاب کرنا، اختیار ہونا۔

الصانی (مصدر) بلندی ... الزلفی: نزدیکی، درجہ، مرتبہ　　لطف (ن ک س) للأمر ادراک کرنا، سمجھنا　　الخلعۃ: وہ کپڑے جو عزت کے طور پر پہنائیں خلعۃ الملک أی خلعۃ تدل علی أن منصب الأملاک حصلہ ملکًا (سندی)

☆　　☆　　☆

تیسرا گروہ: عیسائیوں کا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کا قرب خاص حاصل ہے، اور ان کا رتبہ تمام مخلوق سے بلند ہے سورۃ آل عمران آیت ۳۹ و ۴۵ میں آپ کو کلمۃ اللہ (اللہ کا بول) کہا گیا ہے، اس لئے ان کو "اللہ کا بندہ" نہیں کہنا چاہئے، ایسا کہنے سے ان کو دوسرے بندوں کے برابر کرنا لازم آئے گا اور اس میں ان کی سر شان اور ان کے مقام قرب خاص کو نظر انداز کرنا ہے۔ پھر عیسائیوں میں اختلاف ہوا کہ آپ کی اس خصوصیت کی تعبیر کس لفظ سے کی جائے؟ ان کی دو جماعتیں ہو گئیں۔

ایک جماعت: آپ کو "اللہ کا بیٹا" کہنے لگی، کیونکہ باپ بیٹے پر مہربان ہوتا ہے اور اپنی نگاہوں کے سامنے اس کی پرورش کرتا ہے۔ اور اس کا درجہ بندوں (غلاموں) سے بلند ہوتا ہے، پس یہی نام ان لوگوں کے خیال میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لئے موزون ہے۔

اور دوسری جماعت: نے سیدھا آپ کو "خدا" کہنا شروع کر دیا۔ ان کے خیال میں واجب تعالیٰ نے آپ میں حلول کیا ہے۔ حلول کے معنی ہیں ایک چیز کا دوسری چیز میں اس طرح داخل ہونا کہ دونوں میں تمیز نہ ہو سکے۔ یعنی اللہ تعالیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام "شیر و شکر" ہو گئے ہیں اور دوئی ختم ہو گئی ہے، اسی وجہ سے آپ سے ایسے کارنامے صادر ہوئے ہیں جو کسی انسان سے جانے پہچانے نہیں گئے مثلاً مردوں کو زندہ کرنا، مادرزاد اندھے کو اور برص کے بیمار کو چنگا کرنا اور گارے سے پرندہ بنا کر اس کو زندہ کرنا۔ اور جب آپ میں اللہ تعالیٰ موجود ہیں تو آپ کا کلام، اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، اور آپ کی عبادت اللہ تعالیٰ کی عبادت ہے۔

پھر بعد میں ایسے ناخلف پیدا ہوئے جنھوں نے وجہ تسمیہ نہیں سمجھی کہ آپ کو "اللہ کا بیٹا" یا "اللہ" کیوں کہا گیا ہے اور انھوں نے تقریباً آپ کو حقیقی بیٹا اور ہر اعتبار سے "واجب" سمجھ لیا تو اللہ تعالیٰ نے یہ فرما کر ان کی تردید کی کہ "اللہ کے اولاد کہاں ہو سکتی ہے اور اس کی کوئی بیوی تو ہے نہیں!؟" (سورۃ الانعام آیت ۱۰۱) اور جو بعض "پاگلوں" نے حضرت مریم رضی اللہ عنہا کو اللہ کی بیوی کہہ دیا ہے تو اس عقیدہ کو عیسائیوں میں قبول عام حاصل نہیں ہوا۔ اور کہیں اس طرح تردید کی کہ صفات کمالیہ لوازم ذات واجب سے ہیں، غیر اللہ میں وہ معدوم ہیں، پھر عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے بیٹے یا اللہ کیسے ہو سکتے ہیں؟ سورۃ البقرۃ آیات ۱۱۶ و ۱۱۷ میں ارشاد ہے:

"اور انھوں نے کہا کہ خدا تعالیٰ اولاد رکھتا ہے۔ اس کی ذات اولاد سے پاک ہے، بلکہ اسی کا مملوک ہے جو کچھ بھی

آسمانوں اور زمین میں ہے، سب اسی کے محکوم ہیں۔ وہ آسمانوں اور زمین کا موجد (نیا پیدا کرنے والا) ہے۔ جب وہ کسی کام کا ہونا طے کرتا ہے تو بس یہ فرماتا ہے کہ ”ہوجا“ پس وہ ہوجاتی ہے“

یعنی جو مملوک ومحکوم ہو وہ خدا کا بیٹا یا خدا کیونکر ہوسکتا ہے؟! اور جو موجد کائنات اور قادر مطلق ہو اور جس کے اشارہ پر چیزیں وجود میں آجاتی ہوں اسے اولاد اور مددگار کی کیا حاجت ہے؟!

نوٹ: تینوں جماعتوں کے بڑے لمبے چوڑے دعاوی اور بے شمار خرافات ہیں۔ شہرستانی نے الملل والنحل میں صابئین، آفتاب پرستوں اور روحانیت والوں کا اور موحدوں کا ایک لمبا مناظرہ لکھا ہے، اس کے مطالعہ سے پہلے گروہ کے دعاوی کا علم ہوگا۔ اور مشرکین کی خرافات نومسلم حنفی عالم مولانا عبید اللہ پائلی (متوفی ۱۳۱۰ھ) کی مشہور زمانہ کتاب تحفۃ الہند میں دیکھی جاسکتی ہے اور عیسائیوں کے عقیدۂ تثلیث والوہیت کی بھول بھلیوں کے لئے اظہار الحق وغیرہ ملاحظہ فرمائیں۔ قرآن کریم نے بھی توحید کے آخری دو مرتبوں سے جگہ جگہ بحث کی ہے۔ اور کافروں کے وساوس وشبہات کی سیر حاصل تردید کی ہے۔

[۳] والنصارى: ذهبوا إلى أن للمسيح عليه السلام قربا من الله، وعلوًّا على الخلق، فلا ينبغي أن يُسمى عبدًا، فيُسَوَّى بغيره، لأن هذا سوء أدب معه، وبهتانٌ لقربه من الله، ثم مال بعضُهم عند التعبير عن تلك الخصوصية إلى تسميته ابنَ الله، نظرًا إلى أن الأب يرحم الابن، ويُربِّيه على عينه، وهو فوق العبد، فهذا الاسم أولى به، وبعضهم إلى تسميته بالله، نظرًا إلى أن الواجب حلَّ فيه، وصار داخله، ولهذا يصدُر منه آثارٌ لم تُعهد من البشر، مثلِ إحياء الأموات وخلق الطير؛ فكلامُه كلامُ الله، وعبادتُه هي عبادة الله، فخلف من بعدهم خلفٌ لم يفطُنوا لوجه التسمية، وكادوا يجعلون البُنُوَّة حقيقية، أو يزعمون أنه الواجب من جميع الوجوه، ولذلك ردَّ اللهُ تعالى عليهم تارة بأنه لا صاحبة له، وتارة بأنه: ﴿بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ، إِنَّمَا أَمْرُهُ إِذَا أَرَادَ شَيْئًا أَنْ يَقُوْلَ لَهُ: كُنْ فَيَكُوْنُ﴾

وهذه الفِرَقُ الثلاث لهم دعاوى عريضة، وخُرافات كثيرة، لا تخفى على المتتبع؛ وعن هاتين المرتبتين بحث القرآن العظيم، ورد على الكافرين شبهتهم ردًّا متينًا

ترجمہ: (۳) اور عیسائی اس طرف گئے ہیں کہ حضرت مسیح علیہ السلام کو خدا سے قرب خاص حاصل ہے، اور تمام مخلوقات سے ان کا رتبہ بلند ہے اس لئے ان کو ”بندہ“ کہنا مناسب نہیں۔ ایسا کہنے سے ان کو دوسرے بندوں کے برابر کرنا لازم آئے گا۔ اس لئے کہ یہ (برابر کرنا) ان کی شان میں بے ادبی ہے اور ان کے تقرب الٰہی کے لحاظ کو ترک

کرتا ہے۔ پھر بعض لوگ اس خصوصیت کی تعبیر کے وقت ان کو "اللہ کا بیٹا" کہنے کی طرف مائل ہوئے، اس بات پر نظر کرتے ہوئے کہ باپ بیٹے پر مہربانی کرتا ہے اور اپنی نگاہوں کے سامنے اس کی پرورش کرتا ہے، اور اس کا درجہ غلاموں سے بلند ہوتا ہے جیسا یہ معاملہ ان کے لئے معروف ہے — اور بعض عیسائی آپ کو "خدا" نام رکھنے کی طرف مائل ہوئے اس بات کی طرف نظر کرتے ہوئے کہ واجب تعالیٰ نے آپ میں حلول کیا ہے اور واجب تعالیٰ آپ کے اندر ہوتے ہیں اور اسی وجہ سے آپ سے ایسے آثار صادر ہوئے ہیں جو کسی بشر سے پہچانے نہیں گئے، جیسے مردوں کو زندہ کرنا اور پرندوں کو پیدا کرنا۔ پس آپ کا کلام اللہ کا کلام ہے اور آپ کی عبادت اللہ ہی کی عبادت ہے —— پھر ان کے بعد ایسے ناخلف پیدا ہوئے جنھوں نے بیٹے کی تعبیر نہیں کی اور قریب تھے کہ وہ بیٹا ہونے کو حقیقی بیٹا ہونا سمجھ لیں یا وہ آپ کو من کل الوجوہ واجب سمجھ لیں۔ اور اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے بھی تو ان کی تردید اس طرح کی کہ اللہ کی بیوی نہیں اور بھی اس طرح کی کہ "وہ آسمانوں اور زمین کے موجد ہیں جب وہ کسی چیز کو پیدا کرنے کا ارادہ فرماتے ہیں تو اس سے کہتے ہیں کہ ہو جا پس وہ فوراً ہو جاتی ہے"۔

اور ان تینوں جماعتوں کے پاس بے جوڑ دعوے اور بے ثبوت خرافات ہیں، جو تلاش کرنے والے پر پوشیدہ نہیں ہیں، اور انہی دونوں مرتبوں سے قرآن عظیم نے بحث کی ہے، اور کافروں کے بوگس دلائل کی بھرپور تردید کی ہے۔

لغات: انداحل: اندر ہونا صار دخلہ اندر کسی کے اندر ہو گئے۔ یہی معنی ہے۔ پس یہ جملہ پہلے جملے کے ہم معنی ہے عہد الامر: پہنچانا۔ دعوی کی جمع دعاوی اور دعاوی آتی ہیں الخرافۃ: باطل اور فضولیات۔ بے سروپا باتیں۔

باب —— ۲

شرک کی حقیقت کا بیان

شرک: کسی مخلوق میں واجب تعالیٰ کی صفات ثابت کرنے کا نام ہے۔ بہ الفاظ دیگر: شرک غیر اللہ کی عبادت کرنے کا نام ہے۔ ان دونوں باتوں میں چولی دامن کا ساتھ ہے، جب اللہ کی صفات کسی مخلوق میں مان لیں گے تو اب اس مخلوق کی بندگی لازم ہے۔ اور شرک پیدا اس طرح ہوتا ہے کہ لوگ کسی مخلوق — نبی یا ولی — سے کوئی حیرت انگیز (خارق عادت) کام صادر ہوتا ہوا دیکھتے ہیں تو وہ اس کام کو اس مخلوق کا "ذاتی" فعل تصور کرنے لگتے ہیں یعنی یہ سمجھتے ہیں کہ وہ بندے اس کام کے خالق ہیں۔ پھر لوگ ان بندوں کی عبادت کرنے لگتے ہیں۔

شرک کی حقیقت سمجھنے کے لئے "صفت واجب" اور "عبادت" کی حقیقت جاننی ضروری ہے۔ کیونکہ خالق اور مخلوق کی صفت بظاہر یکساں نظر آتی ہیں۔ حیات (زندگی) سمع وبصر (سننا، دیکھنا) قدرت (طاقت) مشیت، ارادہ شرف (بزرگی) تسخیر (تابعدار بنانا) اور نفاذ حکم وغیرہ صفات ایسی ہیں جس طرح واجب میں پائی جاتی ہیں، مخلوق میں بھی

پائی جاتی ہیں۔ اس لئے دونوں کی صفات میں امتیاز کرنا ضروری ہے۔ اسی وقت شرک کی حقیقت یعنی "صفات واجب کو مخلوق میں ماننے" کا مطلب سمجھ میں آسکتا ہے۔

اسی طرح "عبادت" کسی انتہائی درجہ تعظیم کرنے کا یا کسی کے سامنے غایت درجہ خاکساری کرنے کا نام ہے۔ نفس تعظیم اور محض خاکساری کا نام عبادت نہیں۔ لہٰذا یہ جاننا ضروری ہے کہ "غایت تذلل" اور "نہایت تعظیم" کیا ہے؟ اسی سے شرک کی حقیقت سمجھ میں آئے گی۔ شاہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

عبادت: غایت درجہ تذلل کا نام ہے۔ تذلل کے معنی ہیں خاکساری۔ عاجزی اور فروتنی کرنا یعنی عمل سے خود کو عاجز وحقیر قرار دینا۔ اب یہ مسئلہ حل طلب رہتا ہے کہ کونسا عمل غایت تذلل ہے اور کونسا کمتر درجہ کا؟ یہ بات دو طرح سے متعین کی جاسکتی ہے۔

① عمل کی حالت دیکھ کر، مثلاً قیام (کسی کے سامنے دست بستہ کھڑا ہونا) اور سجدہ (کسی کے سامنے ماتھا زمین پر ٹیکنا) دو عمل ہیں ظاہر ہے کہ قیام میں کمتر درجہ کی فروتنی ہے، اور سجدہ میں اعلیٰ درجہ کی، کیونکہ اس سے آگے عاجزی کرنے کا کوئی درجہ باقی نہیں ہے، پس سجدہ کو عبادت کہا جائے گا اور قیام کو عبادت قرار نہیں دیا جائے گا۔

② نیت کے اعتبار سے، یعنی جس فعل سے ایسی تعظیم مقصود ہو جیسی بندے خدا کی کیا کرتے ہیں، وہ فعل عبادت ہے۔ اور جس فعل سے ایسی تعظیم مقصود ہو جیسی رعایا بادشاہوں کی، یا شاگرد استاذوں کی کرتے ہیں، وہ فعل عبادت نہیں، کیونکہ یہ کمتر درجہ کی تعظیم ہے۔

امتیاز کی یہی دو صورتیں ہیں، تیسری کوئی صورت نہیں۔ مگر جب یہ دیکھا جاتا ہے کہ ملائکہ نے آدم علیہ السلام کو اور برادران یوسف نے یوسف علیہ السلام کو "سلامی کا سجدہ" کیا تھا تو "سجدہ" کو مطلقاً غایت تذلل اور عبادت قرار نہیں دیا جاسکتا۔ پس تعیین کی صورت اول مفید مطلب نہیں۔ صرف دوسری صورت ہی کو معیار بنایا جاسکتا ہے مگر بات ابھی تک غیر واضح ہے۔ "اللہ جیسی تعظیم" کا کیا مطلب ہے؟ لہٰذا تفصیل ساعت فرمایئے!

جب کوئی کسی کے سامنے خاکساری کرتا ہے تو وہاں دو طرف ہوتے ہیں: ایک خاکساری کرنے والے کی جانب۔ دوسری اس ہستی کی جانب جس کے سامنے خاکساری کی جارہی ہے۔ اور تذلل کا تحقق اس وقت ہوتا ہے جب خاکساری کرنے والے میں ضعف وناتوانی، خست وکمینگی اور عاجزی ونیازمندی کا لحاظ کیا جائے اور دوسری جانب میں قوت وبزرگی، شرف وعظمت اور تسخیر وتفوق وتحکم کا لحاظ کیا جائے یعنی یہ تصور کیا جائے کہ خاکساری کرنے والا ہر اعتبار سے ضعیف وناتواں، ناچیز وہیچ اور عاجز ومغلوب ہے۔ اور جس کے سامنے خاکساری کی جارہی ہے وہ ہستی قادر مطلق، بزرگ وبرتر ہے اور ہر چیز اس کے تابع فرمان ہے، اور ہر حکم اس کا نافذ ہو کر رہنے والا ہے کوئی اس کو روک نہیں سکتا، جب دونوں جانبوں میں یہ باتیں ملحوظ ہونگی تو وہ خاکساری غایت تذلل ہوگی ورنہ نہیں۔

صفات کمالیہ کے دو درجے۔ یہاں ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ غایت تذلل کے دونوں جانبوں میں مذکورہ بالا حضرہ باتوں کا لحاظ کیسے کیا جاسکتا ہے؟ جبکہ دونوں جانب کی صفات میں یکسانیت ہے؟ یعنی خاکساری کرنے والا اور جس کے سامنے خاکساری کرتا ہے دونوں حیات، علم، سمع و بصر، مشیت، ارادہ، قوت، تصرف، تدبیر اور نفاذ حکم وغیرہ صفات کمالیہ کے مالک ہیں۔ پھر "خاکساری طرف غایت وجود قلت" اور واجب تعالیٰ کی طرف غایت وجود علو (بلندی) کیسے فرض کی جاسکتی ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ صفات کمالیہ میں اگرچہ بظاہر یکسانیت نظر آتی ہے مگر حقیقت میں دونوں کی صفات میں ویسا ہی جیسا آسمان و زمین کا فرق ہے۔ اگر آدمی کچھ بالغ نظر ہو اور غور کرے تو یہ بات اچھی طرح اس کی سمجھ میں آجائے گی کہ خود آدمی صفات کمالیہ کے دو انداز سے اور دو درجے کرتا ہے۔ ایک ادنیٰ درجہ یعنی ایسی قوت و جزئی و ادنیٰ تدبیر و تصرف جو خود اس غور کرنے والے میں اور اس کے مانند لوگوں میں پائی جاتی ہے۔ دوسرا اعلیٰ درجہ یعنی ایسی قوت و تصرف اور ایسی تسخیر و حکم بالحق جو فرشتوں میں ہوتا ہے اور حدوث و امکان کے عیب سے پاک ہیں۔ اور جس طرح یہ صفات اس مخلوق میں ہوتی ہیں جس کی طرف بندہ اللہ تعالیٰ کی خصوصیات میں سے کوئی خصوصیت منتقل مانی جاتی ہے۔

غرض دونوں طرف کی صفات میں بہت بڑا فرق ہے تین مثالوں سے یہ بات واضح ہوگی۔

پہلی مثال: غیب کی باتوں کو جاننے کے دو طریقے ہیں: ایک: غور و فکر کر کے اور مقدمات معلومہ (جانی ہوئی باتوں) کو ترتیب دے کر جاننا، یا دانائی اور زیرکی سے جاننا یا خواب اور ندا سے جاننا، یا کشف و الہام کے ذریعہ جاننا۔ مغیبات کو جاننے کے ان طریقوں سے ہر کوئی استفادہ کر سکتا ہے اور بعض غیوب کو جان سکتا ہے۔ دوسرا: غیب کا ذاتی علم جو صفات ذاتیہ ہوتا ہے، کسی سے مستفاد نہیں ہوتا، نہ اس کی تحصیل کے لئے تحقیق کرنا پڑتا ہے۔ مغیبات کو جاننے کے ان دونوں طریقوں میں آسمان و زمین کا تفاوت ہے۔ پس ان سے حاصل ہونے والے علم میں بھی اسی درجہ کا تفاوت ہوگا۔ پہلا علم مخلوقات کا ہے اور دوسرا خالق کا۔ اور دونوں میں یکسانیت تو کجا قرب و تقارب بھی نہیں ہے۔

دوسری مثال: تاثیر یعنی متاثر کرنا، تدبیر یعنی نظم و انتظام کرنا اور تسخیر یعنی تابع فرمان کرنا اور ان کے علاوہ دیگر صفات نفوذ و غلبہ کا بھی یہی حال ہے۔ آدمی اس کے بھی دو درجے کرتا ہے: ایک: معنی مباشرت یعنی کسی کام کو بدست خود کرنا، اپنی صلاحیتوں کو اور اپنے اعضاء کو استعمال کرنا، اشیاء کی حرارتی کیفیات، حرارت و برودت وغیرہ سے مدد لینا اور اپنی خداداد صلاحیتوں سے کام لے کر کسی کام کو انجام دینا اور کسی مادہ کو متاثر کر کے کوئی چیز بنانا، پھر اس کو اپنے زیر حکم و تصرف رکھنا۔ دوسرا معنی تکوین یعنی آلات و اسباب کی احتیاج کے بغیر کسی چیز کو پیدا کرنا، جو خدا کی شان ہے کہ جب وہ کسی چیز کو نیست سے ہست کرنا چاہتے ہیں تو بس "ہوجا" کہتے ہیں تو وہ ہوجاتی ہے۔ پس خالق و مخلوق میں یہ صفات بظاہر یکساں نظر آتی ہیں مگر درحقیقت آسمان و زمین کا تفاوت ہے، دونوں میں کوئی جوڑ ہی نہیں ہے۔

تیسری مثال: اسی طرح عظمت وشرف اور قوت ومقدرت کے بھی آدمی دو درجے کرتا ہے۔ ایک: بادشاہ کی عظمت جو رعایا کی بہ نسبت اس کو حاصل ہوتی ہے، جس کا تعلق عملہ کی کثرت اور مال واسباب کی فراوانی کے ساتھ ہے یا بہادر آدمی کی اور استاذ کی عظمت، جوان کو کمزور اور شاگردی بہ نسبت حاصل ہوتی ہے، یا ایسی عظمت ہے، جس کو خود غور کرنے والا بھی اپنے اندر کسی درجہ میں پاتا ہے۔ دوسرا درجہ: اس عظمت کا ہے جو صرف ذات متعالی (بلند وبرتر) میں پائی جاتی ہے، جس کی کوئی نہایت ہی نہیں اور جس کو الفاظ تعبیر ہی نہیں کر سکتے غور کریں، عظمت وشرف کے ان دونوں درجوں میں کس قدر تفاوت ہے؟ کوئی مناسبت ہے ان دونوں درجوں میں؟

الغرض: آپ یہ راز پانے میں ذرا بھی سستی نہ کریں، یقین کامل کے حصول تک غور وفکر جاری رکھیں جو بھی شخص اس بات کا معترف ہے کہ ممکنات کا سلسلہ ایک ایسے واجب تعالیٰ پر منتہی ہوتا ہے جو کسی کے محتاج نہیں، وہ ضرور ان صفات کمالیہ کے، جن کے ذریعہ لوگ باہم ایک دوسرے کی تعریف کرتے ہیں، دو درجے کرے گا ایک برتر درجہ جو واجب تعالیٰ کے لئے خاص ہے، دوسرا کم تر درجہ جو ان مخلوقات کے لئے ہے جن کو وہ معترف اپنے جیسا سمجھتا ہے۔

الحاصل: شرک نام ہے صفات واجب کو کسی مخلوق میں مان کر اس کی بندگی کرنے کا یعنی ایسے افعال کرنے کا جس سے اس مخلوق کی غایت درجہ تعظیم، اور عبادت کرنے والے کی غایت درجہ خاکساری ظاہر ہوتی ہے۔

﴿باب في بيان حقيقة الشرك﴾

اعلم أن العبادة هو التذلل الأقصى، وكونُ تذللٍ أقصى من غيره لايخلو إما أن يكون بالصورة، مثلُ كونِ هذا قياما، وذلك سجودًا، أو بالنية: بأن نوى بهذا الفعل تعظيمَ العباد لمولاهم، وبذلك تعظيمَ الرعية للملوك، أو التلامذةِ للأستاذ، لاثالث لهما.

ولما ثبت سجودُ التحية من الملائكة لآدم عليه السلام، ومن إخوة يوسف ليوسف عليه السلام، وأن السجود أعلى صُوَرِ التعظيم، وجب أن لايكون التميُّزُ إلا بالنية؛ لكن الأمرَ إلى الآن غيرُ منقح، إذ المولى ــ مثلاً ــ يُطلق على معانٍ، والمراد ههنا المعبود لامحالة، فقد أُخذ في حد العبادة.

فالتنقيح: أن التذلُّلَ يستدعي ملاحظة ضَعفٍ في الذليل، وقوةٍ في الآخر، وخِسَّةٍ في الذليل، وشرفٍ في الآخر، والقيادِ وإخباتٍ في الذليل، وتسخيرٍ ونفاذِ حكمٍ للآخر.

والإنسان إذا خُلِّيَ ونفسَه أدرك لامُحالة: أنه يُقدَّرُ للقوة والشرف والتسخير، وما أشبهها مما يعبَّرُ به عن الكمال، قَدْرَيْنِ: قدرًا لنفسه، ولمن يُشْبِهُهُ بنفسه، وقدرًا لمن هو متعالٍ عن

وصمة الحدوث والإمكان بالكلية، ولمن انتقل إليه شيء من خصوصيات هذا المتعالي.

فالعلم بالمغيبات يجعله على درجتين: علمٌ بِرويّةٍ، وترتيب مقدمات، أو حدس، أو منام، أو تلقي إلهام، مما يجد نفسه لا يباين ذلك بالكلية؛ وعلمٌ ذاتي، هو مقتضى ذات العالم لا يتلقاه من غيره، ولا يتجشم كسبه.

وكذلك يجعل التأثير والتدبير والتسخير — أي لفظ فت — على درجتين: بمعنى المباشرة واستعمال الجوارح والقوى، والاستعانة بالكيفيات المزاجية، كالحرارة والبرودة، وما أشبه ذلك مما يجد نفسه مستعدة له، استعدادًا قريبًا أو بعيدًا، وبمعنى التكوين من غير كيفية جسمانية، ولا مباشرة شيء، وهو قوله: ﴿إِنَّمَا أَمْرُهُ إِذَا أَرَادَ شَيْئًا أَنْ يَقُولَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ﴾

وكذلك يجعل العظمة والشرف والقوة على درجتين:

أحدهما: كعظمة الملك بالنسبة إلى رعيته، مما يرجع إلى كثرة الأعوان، وزيادة الطَّوْل، أو عظمة البطل والأستاذ بالنسبة إلى ضعيف البطش والتلميذ، مما يجد نفسه يشارك العظيم في أصل الشيء.

وثانيتهما: ما لا يوجد إلا في المتعالي جدًا.

ولأنت في تفتيش هذا الشرح تستيقن أن المعترف بانصرام سلسلة الإمكان إلى واجب لا يحتاج إلى غيره، يضطر إلى جعل هذه الصفات التي يتمادحون بها على درجتين: درجةٌ لما هنالك، ودرجةٌ لما يخصه بنفسه.

ترجمہ: شرک کی حقیقت کا بیان: جان لیں کہ عبادت نہایت درجہ تذلل (خاکساری و فروتنی کرنے) ہی کا نام ہے۔ اور کسی تذلل کا انتہائی درجہ ہونا اس کے غیر سے ممتاز ہو کر دو حال سے خالی نہیں: یا تو صورت (عمل) سے ہوگا جیسے اس کا (یعنی غیر اقصی تذلل کا) قیام ہونا اور اس کا (یعنی اقصی تذلل کا) سجدہ ہونا۔ یا نیت سے ہوگا بایں طور کہ اس فعل سے بندوں کے سچے مولیٰ کی تعظیم کا ارادہ کرے، اور اس فعل سے رعایا کے بادشاہوں یا تلامذہ کے استاذوں کی تعظیم کا ارادہ کرے۔ تیسری (یعنی صورت و نیت کے علاوہ) کوئی صورت نہیں۔

اور جب فرشتوں کا آدم علیہ السلام کو اور برادرانِ یوسف کا یوسف علیہ السلام کو سجدۂ تحیہ کرنا ثابت ہے اور یہ بھی ثابت ہے کہ تعظیم کی تمام صورتوں میں سجدہ ہی اعلیٰ قسم کی تعظیم ہے تو ضروری ہے کہ ان ہر دو قسم کے سجدوں میں امتیاز نیت ہی سے کیا جائے لیکن بات ابھی تک واضح نہیں ہے، کیونکہ لفظ مولیٰ کا۔ مثال کے طور پر۔ کئی معنی پر اطلاق ہوتا ہے۔ اور یہاں لفظ "مولیٰ" سے یقیناً معبود مراد ہے، کیونکہ وہ لفظ عبادت کی تعریف میں استعمال کیا گیا ہے۔

یہی سچی بات یہ ہے کہ تذلل چاہتا ہے عاکسِ رحمی ضعف کے لحاظ کرنے کو، اور دوسرے میں قوت کے لحاظ کرنے کو۔ اور تذلیل میں کمینگی اور دوسرے میں بزرگی کے لحاظ کرنے کو، اور تذلیل میں تابعداری اور نیازمندی اور دوسرے میں تسخیر ونفاذِ حکم کے لحاظ کرنے کو۔

اور انسان جب تخلی بالطبع ہو کر غور کرے تو وہ لامحالہ سمجھ لے گا کہ قوت وشرف اور تسخیر کے لئے اور ان کلمات کے لئے جو مذکورہ کلمات سے ملتے جلتے ہیں، ان کلمات میں سے جن کے ذریعہ کمالات کو تعبیر کیا جاتا ہے ان سب کے لئے وہ دو اندازے کرتا ہے۔ ایک اندازہ اپنے لئے اور ان لوگوں کے لئے جن کو وہ اپنے جیسا سمجھتا ہے۔ اور دوسرا اندازہ اس ہستی کے لئے جو حدوث وامکان کے عیب سے بالکلیہ برتر ہے، اور اس شخص کے لئے جس کی طرف (بالفرض) اس برتر کی خصوصیات میں سے کوئی خصوصیت منتقل ہوگئی ہے۔

مثلاً غیب کی باتوں کو جاننے کے آدمی دو درجے کرداتا ہے۔ ایک: غور وفکر اور جانی ہوئی باتوں کو ترتیب دے کر یا زیرکی یا خواب یا الہام کے ذریعہ جاننا، جو ان چیزوں میں سے ہیں کہ آدمی خود کو ان چیزوں سے بالکلیہ منافر نہیں پاتا۔ اور (دوسرا) علم ذاتی ہے، جو خود عالم (جاننے والے) کی ذات کا مقتضی ہے، وہ اس علم کو کسی غیر سے حاصل نہیں کرتا، اور نہ اس کے لئے اکتساب کی زحمت کرنی پڑتی ہے۔

اور اسی طرح تاثیر وتدبیر اور تسخیر —— جو لفظ چاہو استعمال کرو —— آدمی ان کے بھی دو درجے کرتا ہے (ایک) بعض مباشرت (یعنی کسی کام کو بدست خود کرنا) اور بعض اعضا اور قویٰ (صلاحیتوں) کو استعمال کرنا اور بعض مزاجی کیفیات جیسے حرارت وبرودت سے مدد طلب کرنا (جیسے بادو دعا اور دوائی سے بیماریوں کا علاج کرنا) اور ان چیزوں کے مثل کرکے جو ان چیزوں کے مشابہ ہیں۔ ان میں سے کہ آدمی اپنے میں ان کی استعداد پاتا ہے، خواہ وہ قریبی استعداد ہو یا دوری۔ اور (دوسرا درجہ) بعض تکوین یعنی جسمانی کیفیت کے بغیر اور کسی چیز کو بدست خود کئے بغیر بنانا، جس کا تذکرہ اس آیت میں ہے کہ: "جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو بس اس سے کہتا ہے کہ "ہوجا" تو وہ ہوجاتی ہے (سورہ یٰسین آیت ۸۲)

اور اسی طرح آدمی عظمت، شرف اور قوت کے بھی دو درجے کرتا ہے۔

ان میں سے ایک: جیسی بادشاہ کی عظمت اس کی رعایا کی بہ نسبت، جس کا تعلق کارندوں کی کثرت اور مالداری کی زیادتی سے ہے، یا بہادر اور استاذ کی عظمت، کمزور بچہ والے اور شاگرد کی بہ نسبت۔ یہ عظمتیں ایسی ہیں کہ آدمی خود کو پاتا ہے کہ وہ معظَّم کے ساتھ نفسِ عظمت میں شریک ہے (کمی بیشی کا فرق الگ چیز ہے)

اور ان میں سے دوسرا درجہ: وہ عظمت ہے جو صرف ذات متعالی کے اندر ہی پائی جاتی ہے۔

اور آپ ذرا سستی نہ کریں اس راز کی تفتیش میں تاکہ آپ یقین کرلیں کہ سلسلہ امکان کے ایسے واجب پر ختم ہونے کا معترف، جو اپنے علاوہ کا قطعاً محتاج نہیں ہے، مجبور ہے ان صفات کو جن کے ذریعہ لوگ باہم ایک دوسرے کی

تعریف کرتے ہیں دو درجوں میں گزرا سنہ کی طرف۔ ایک وہ جو ان صفات کے لئے جو یہاں (ذات واجب میں) ہیں، اور دوسرا وہ جو ان مخلوقات کے لئے جن کو وہ اپنے جیسا سمجھتا ہے۔

لغات:

تغلّل: طرق کرنا، جاری کرنا۔ اپنے کو حقیر سمجھنا۔ تمیز تمیزاً: جدا ہونا۔ قشر تقشیراً: اتارنا۔ رکوع۔ الوضمة: عیب۔ الروية: امور میں غور و فکر کرنا۔ انحصر: اراں ذریعی۔ لا يلقاها (فعل مضارع مجہول منفی) از تلقية (تفعیل) وہ نہیں عطا کیا جاتا۔ تجشم الأمر: مشقت سے کام کرنا۔ لا تني (فعل نہی) از ونى ينى ونيا: سست ہونا، تھکنا، کمزور ہونا۔ انفصم: کٹ جانا، منقطع ہونا۔

تصحیح: العظيم اصل میں العظم تھا، جو تخییم کی جمع ہے۔ تصحیح مخطوط کراچی سے کی ہے۔

شرک وتشبیہ متوارث گمراہیاں ہیں

شرک کے معنی اوپر بیان ہوئے۔ اور تشبیہ کے معنی ہیں: "مخلوق کی صفات واجب تعالیٰ میں ماننا"۔ مخلوق کی ساری ہی صفات ناقص ہوتی ہیں، جیسا کہ اوپر گذرا۔ اور جب ناقص صفات واجب تعالیٰ میں مان لی گئیں تو خدا بھی ناقص ہوا۔ اور ناقص خدا کو مددگاروں کی ضرورت ہوئی اور مددگار معاملات میں دخیل ہوتے ہیں۔ اس لئے ان شرکاء کی عبادت ضروری ہوئی۔ مشرکین میں دیوی دیوتاؤں کا جو تصور پایا جاتا ہے وہ خدا کے بارے میں ان کے تصور کی اسی کمزوری پر مبنی ہے۔

غرض شرک وتشبیہ کی بیماریاں متوارث ہیں۔ نسل در نسل چلی آرہی ہیں اور یہ بیماریاں تین وجہ سے پیدا ہوتی ہیں:

پہلی وجہ: صفات کمالیہ کے دونوں درجوں میں مستعمل ہونے والے الفاظ قریب قریب یکساں ہیں۔ یعنی جو الفاظ واجب تعالیٰ کی صفات کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں، تقریباً وہی الفاظ مخلوق کی صفات کے لئے بھی استعمال کئے جاتے ہیں۔ مثلاً سورۃ التوبہ آیت ۱۲۸ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے رؤف اور رحیم کی صفتیں استعمال کی گئی ہیں کہ "آپ ایمانداروں کے ساتھ بڑے ہی شفیق (اور) مہربان ہیں" اور یہی صفتیں قرآن کریم میں جگہ جگہ اللہ تعالیٰ کے لئے بھی استعمال کی گئی ہیں۔ ایسے مواقع میں صفات واجب اور صفات مخلوق میں فرق مراتب کرنا ضروری ہے۔ کیونکہ خدا کی رأفت و رحمت کا درجہ اور ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفقت و مہربانی کا درجہ اور ہے۔ اسی طرح بہت سی اور بھی صفات خالق و مخلوق دونوں کے لئے نصوص میں وارد ہوئی ہیں۔ یہاں بھی فرق درجات کرنا ضروری ہے۔ مگر کبھی ایسا ہوتا ہے کہ جاہل یا کج فہم دونوں کے اس فرق کو ملحوظ نہیں رکھتا اور نصوص شرعیہ کو غیر محل میں استعمال کرنے لگتا ہے۔ تو شرک یا تشبیہ کی گمراہیاں پیدا ہوتی ہیں یعنی لوگ یا تو مخلوق میں واجب جیسی صفتیں ماننے لگتے ہیں، یا مخلوق جیسی ناقص صفات واجب تعالیٰ میں مان لیتے ہیں۔ اور گمراہی کا یہ سلسلہ بہت قدیم زمانہ سے چلا آرہا ہے۔

دوسری وجہ: ہر نوع شرک وتشبیہ کی گمراہیاں اس وجہ سے پیدا ہوئی ہیں کہ لوگ بعض انسانوں سے، یا فرشتوں سے، یا ستاروں وغیرہ سے ایسے حیرت زا محیر العقول خارق عادت آثار صادر ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں جن کی توجیہ ان کی عقل میں ممکن نہیں ہوتی۔ ان کو وہ کسی مخلوق کی استعداد سے مستبعد معلوم ہوتے ہیں، چنانچہ وہ گمان کا شکار ہو جاتے ہیں اور ان مخلوقات کے لئے اللہ جیسی عظمت اور خدا جیسی قوت تسخیر مان لیتے ہیں۔ اور ان کی پوجا شروع کر دیتے ہیں۔

تیسری وجہ: اللہ تعالیٰ کی صفات کی ٹھیک معرفت کا نہ ہونا: ناقص معرفت کی وجہ سے مخلوق کی خدا والی صفتوں کے بارے میں غلط فہمی میں مبتلا ہونا بھی شرک وتشبیہ کی گمراہی کا سبب ہے۔ کیونکہ صفات کا جو تذکرہ ہے یعنی واجب تعالیٰ کی صفات۔ ان کی معرفت میں سب لوگ یکساں نہیں ہوتے۔ بعض لوگ تو صفات (ارادہ، سماعت اور بصارت) کی "خدا والی" صفتوں کو سمجھتے ہیں کہ وہ خود ان کی صلاحیتوں کے قبیل سے ہیں کوئی مافوق الفطرت صلاحیتیں نہیں ہیں۔ تو بعض لوگ یہ بات نہیں سمجھ سکتے۔ اس لئے وہ غلط فہمی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ وہ نبیوں کو، فرشتوں کو، اور ستاروں کو غیر معمولی صلاحیتوں کا مالک سمجھ بیٹھتے ہیں اور اس طرح ان کو خدائی کا درجہ دے کر ان کے سامنے جبہ سائی شروع کر دیتے ہیں۔

فائدہ: صفات واجب کی معرفت میں جہل بسیط مضر نہیں، وہ قابل عفو ہے۔ کیونکہ ہر شخص اسی کا مکلف ہے جس کی اس کے اندر استطاعت ہے۔ قرآن کریم میں یہ ضابطہ جگہ جگہ مذکور ہے۔ پس اگر کسی میں عقل کی کمی ہو اور وہ صفات واجب کو کما حقہ نہ سمجھ سکے تو ایسا شخص قابل عفو ہے۔ صحیحین میں جو قصہ مروی ہے اس کا یہی محمل ہے۔ وہ قصہ یہ ہے:

"رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمایا کہ ایک ایسے شخص نے جس نے کبھی کوئی بھی نیک کام نہیں کیا تھا اپنے گھر والوں سے کہا ـ اور ایک روایت میں یہ ہے کہ اس نے اپنے نفس پر زیادتی کی تھی یعنی گناہ بہت کئے تھے ـ یعنی جب اس کی موت کا وقت قریب آیا تو اس نے اپنے بیٹوں کو وصیت کی کہ جب وہ مرجائے تو وہ اس کو جلادیں۔ پھر اس کی آدھی راکھ جنگل میں اڑادیں، اور آدھی دریا میں ڈال دیں۔ پس بخدا! اگر اللہ تعالیٰ نے اس پر قدرت حاصل کرلی تو وہ اس کو ایسی سخت سزا دیں گے کہ دنیا میں کسی کو ایسی سخت سزا نہ دی ہوگی۔ پھر جب وہ مرگیا تو اس کے بیٹوں نے ویسا ہی کیا جیسا اس نے کہا تھا۔ پس اللہ تعالیٰ نے سمندر کو حکم دیا: اس نے اپنے اندر کے اجزاء جمع کئے، اسی طرح جنگل نے بھی جمع کئے اور وہ شخص درست ہو کر پیدا ہو گیا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اس سے پوچھا کہ "تو نے یہ حرکت کیوں کی؟" اس نے جواب دیا: "آپ کے ڈر سے، اے میرے رب! اور آپ (میری نیت کو) خوب جانتے ہیں" پس اللہ تعالیٰ نے اس کو بخش دیا (بخاری کتاب التوحید باب ۳۵ حدیث نمبر ۷۵۰۶ و مسلم شریف کتاب التوبہ باب ۴ (مصری) مشکوٰۃ شریف کتاب الدعوات باب سعۃ رحمۃ اللّٰہ حدیث نمبر ۲۳۶۹)

مذکورہ شخص اللہ تعالیٰ کو قادر مطلق تو مانتا تھا مگر وہ یہ سمجھتا تھا کہ قدرت کا تعلق ممکنات سے ہے، محالات سے نہیں۔ اور جب وہ جلا دیا جائے گا اور اس کی خاک منتشر کردی جائے گی تو اس کا جمع کرنا محال ہے، اور ایسی بات وہ پہلی

تشریح: اس حدیث میں بھی سید (آقا) کہنے کی ممانعت ایک معنی کے اعتبار سے ہے یعنی معنی کامل آقا، کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ ہی ہیں، اور غلام جو اپنے مولیٰ کو سید کہتے ہیں یا لوگ جو اپنے بڑوں کو سید کہتے ہیں وہ ایک اور معنی کے اعتبار سے کہتے ہیں۔

ناہنجاروں نے تشبیہ ذبوئی: پھر جب انبیاء کے مخصوص صحابہ اور ان کے دین کے اصل حامل دنیا سے اٹھ گئے تو ناخلف ان کے جانشین ہوئے، جنھوں نے دین پر چلنا چھوڑ دیا اور وہ خواہشات کے پیچھے پڑ گئے اور انبیاء کی وحی میں جو ذومعنی الفاظ آئے تھے، جیسے انجیل میں بیٹا اور محبوب کے الفاظ، ان کو غیر محل میں استعمال کرنا شروع کردیا۔ حالانکہ تمام شریعتوں میں محبوب، شفیع اور دوسرے الفاظ اللہ تعالیٰ کے مخصوص بندوں کے لئے استعمال کئے گئے ہیں۔ اسی طرح نبیوں اور ولیوں سے جو خوارق عادات صادر ہوئے یعنی جو کشف وکرامات اور انوار وبرکات مشاہدہ میں آئے ان کو بھی انھوں نے غلط معنی پہنائے۔ اور ان حضرات کے لئے علم غیب اور تسخیر وتصرف کی حیثیتیں مان لیں۔ حالانکہ وہ تمام باتیں ناسوتی یا روحانی قوتوں کی کرشمہ سازی تھی۔ بیچارہ تکوین اور خدائی کمالات سے ان کا کوئی تعلق نہیں تھا۔

ولما كانت الألفاظ المستعملة في الدرجتين متقاربةً، فربما يحمل نصوص الشرائع الإلهية على غير محملها؛ وكثيرًا ما يطلع الإنسان على أثر صادر من بعض أفراد الإنسان، أو الملائكة، أو غيرهما، يستبعده من أبناء جنسه، فيشتبه عليه الأمر، فيثبت له شركًا مقدسًا، وتسخيرًا إلهيا.

وليسوا في معرفة الدرجة المتعالية سواءً، فمنهم: من يحيط بقوى الأنوار المحيطة الغالبة على العوالم، ويعرفها من جنسه، ومنهم: من لا يستطيع ذلك.

وكلُّ إنسان مكلَّف بما عنده من الاستطاعة، وهذا تأويل ما حكاه الصادق المصدوق صلى الله عليه وسلم، من نجاة مُسرف على نفسه، أمر أهله بحرقه، وتذرية رماده، حذرًا من أن يبعثه الله، ويقدر عليه؛ فهذا الرجل استيقن بأن الله متصف بالقدرة التامة، لكن القدرة إنما هي في الممكنات، لا في الممتنعات، وكان يظن أن جمع الرماد المتفرق نصفُه في البَرّ ونصفُه في البحر، ممتنعٌ، فلم يجعل ذلك نقصًا، فأخذ بقدر ما عنده من العلم، ولم يُعدّ كافرًا.

كان التشبيه والإشراك بالنجوم، وبعضا لبعض العباد الذين ظهر منهم خوارق العوائد، كالكشف، واستجابة الدعاء متوارثًا فيهم.

وكل نبي يُبعث في قومه، فإنه لابد أن يُفهمهم حقيقة الإشراك، ويميِّز كلًّا من الدرجتين، ويحصر الدرجة المقدسة في الواجب، وإن تقاربت الألفاظ، كما قال رسول الله صلى الله

عليه وسلم لطبيب: ﴿إنما أنت رفيق، والطبيب هو الله﴾ وكما قال: ﴿السيد هو الله﴾ يشير إلى بعض المعاني دون بعض

ثم لما انقرض الحواريون من أصحابه وحملة دينه، خلف من بعدهم خلف أضاعوا الصلاة واتبعوا الشهوات، فحملوا الألفاظ المستعملة المتشابهة على غير محملها، كما حملوا المحبوبية والشفاعة التي أثبتها الله تعالى في قاطبة الشرائع لخواص البشر على غير محملها، وكما حملوا صدور خوارق العوائد والإشراقات على انتحال العلم والتسخير الأقصى إلى هذا الذي يرى منه. والحق: أن ذلك كله يرجع إلى قوى ناسوتية أو روحانية، نعم لنزول التدبير الإلهي على وجه، وليس من الإيجاد والأمور المختصة بالواجب في شيء

ترجمہ: اور جب دونوں درجوں میں استعمال ہونے والے الفاظ قریب قریب یکساں تھے تو کبھی ان معانی کی نصوص غیر محل پر محمول کردی جاتی ہیں، اور بارہا آدمی انسانوں کے بعض افراد سے، یا ملائکہ سے یا ان کے علاوہ دیگر مخلوقات سے ایسے آثار صادر ہوتے ہوئے دیکھتا ہے جن کو وہ اپنے ابنائے جنس سے مستبعد سمجھتا ہے، پس معاملہ اس پر مشتبہ ہوجاتا ہے، پس وہ اس مخلوق کے لئے اللہ تعالیٰ جیسی بزرگی اور اللہ جیسی تصرف کی قوت ثابت کردیتا ہے۔

اور لوگ (صفات کے) بلند درجہ کے پہنچنے میں یکساں نہیں ہیں۔ پس ان میں سے بعض وہ ہیں جو ان انوار کی صلاحیتوں کا احاطہ کرلیتے ہیں جو سوانح کو گھیرے ہوئے ہیں اور جو سوالیہ پر چھائی ہوئی ہیں اور وہ ان کو اپنی جنس ہی سے سمجھتے ہیں۔ اور ان میں سے بعض لوگ اس کے ادراک کی طاقت نہیں رکھتے۔

اور ہر انسان اس چیز کا مکلف ہے جس کی اس کے اندر استطاعت ہے۔ اور یہی مطلب ہے اس واقعہ کا جس کو صادق ومصدوق ﷺ نے نقل کیا ہے یعنی ایک سخت گنہگار شخص کا نجات پانا جس نے اپنے گھر والوں کو حکم دیا تھا کہ جب وہ مرجائے تو وہ اس کی لاش کو جلادیں اور اس کی راکھ کو اڑادیں، اس بات سے ڈرتے ہوئے کہ اللہ تعالیٰ اس کو زندہ کردیں اور قدرت حاصل کرلیں، پس یہ شخص یقین رکھتا تھا کہ اللہ تعالیٰ قدرت تامہ کے ساتھ متصف ہیں۔ لیکن وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ قدرت کا تعلق ممکنات سے ہے، ممتنعات سے نہیں اور وہ یہ گمان کرتا تھا کہ جس کا آدھا حصہ اڑادیا گیا ہو اور آدھا دریا میں بہادیا گیا ہو اس کو جمع کرنا محال ہے۔ پس اس کا یہ گمان ایمان کی نفی نہیں کرتا۔ اور اس کے علم وفہم کے بقدر اس سے معاملہ کیا گیا اور وہ شخص کافر شمار نہیں کیا گیا۔ (تو) تشبیہ اور متشابہات کو اور ایسے نیک بندوں کو جن سے خارق عادت امور جیسے کشف اور دعا کی قبولیت کا ظہور ہوا شریک گرداننا لوگوں میں موروثی چیز ہوگیا۔

اور جو بھی پیغمبر اپنی قوم میں مبعوث کیا جاتا ہے، اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ قوم کو شرک کی حقیقت سمجھائے اور دونوں درجوں کو ایک دوسرے سے ممتاز کرے اور مقدس درجہ کو واجب تعالیٰ میں منحصر کرے، اگرچہ الفاظ قریب قریب

ہوں، جیسا کہ آنحضرت ﷺ نے ایک حکیم کو مخاطب کرکے فرمایا: ''آپ مہربان (سہولت فراہم کرنے والے) ہی ہیں اور طبیب اللہ تعالیٰ ہی ہیں'' اور جیسا کہ آپ ؐ نے فرمایا کہ: ''سید تو اللہ تعالیٰ ہیں'' آنحضور ﷺ (لفظ طبیب اور سید کے) بعض معانی کی طرف اشارہ کررہے ہیں مت کہ بعض کی طرف۔

پھر جب اس پیغمبر کے ساتھیوں میں سے مخصوص حضرات کا، اور اس کے دین کے حاملین کا زمانہ گذر گیا، تو ان کے بعد ایسے ناخلف جانشین آئے جنھوں نے نماز ضائع کردی اور خواہشات کی پیروی کی، پس انھوں نے ان مشتبہ الفاظ کو جو (شرائع آسمانیہ میں) استعمال کئے گئے تھے، غیر محل پر محمول کردیا۔ جس طرح انھوں نے محبوبیت اور شفاعت کے الفاظ کو، جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنی تمام شریعتوں میں اپنے مخصوص بندوں کے لئے ثابت کیا ہے، غیر محل پر محمول کردیا۔ اور جس طرح انھوں نے خارقِ عادت امور کے صدور کو اور اشراقات (وانوار) کو محمول کیا آخری درجہ کے علم اور آخری درجہ کی قوت تصرف (وتصرف) کی صفتوں کے منتقل ہونے پر اس شخص کی طرف جس سے وہ باتیں دیکھی گئی ہیں۔ اور سچی بات یہ ہے کہ یہ سب باتیں (خوارق وانوار) نا سوتی یا روحانی طاقتوں کی طرف لوٹتی ہیں، جو تدبیر الٰہی کے نزول کو کسی طور پر تیار کرتی ہیں۔ اور ایجاد (وتکوین) اور ان امور سے جو ذات واجب کے ساتھ خاص ہیں: کوئی تعلق نہیں۔

لغات:

الصادق (اسم فاعل) المصدوق (اسم مفعول) سچا اور سچے کئے گئے یعنی لوگ آپ کو سچا کہتے ہیں۔ صادق وہ ہے جو اپنی باتوں میں سچا ہو، اور مصدوق وہ ہے جس کی صداقت کو لوگ تسلیم کرلیں　ثم کانت الألفاظ المستعملة إلخ دور تک جملہ شرطیہ ہے اور کان التشبیہ والإشراقات إلخ جملہ جزائیہ ہے اور ف محذوف ہے ...... العوائد جمع العادة. الإشراقات جمع الإشراقة: چمک، روشنی، انوار ...... الأقصی (اسم تفضیل) زیادہ دور، انتہائی ...... المتشبهة: مکہم المراد غیر ظاہر المعنی ...... ناسوت: عالم اجسام، قوی ناسوتیہ: جسمانی صلاحیتیں۔ مراد یہ ہے کہ جب مواليد (اجسام) میں جسمانی یا روحانی صلاحیت پیدا ہوتی ہے تو تدبیر الٰہی نازل ہوتی ہے اور اس کے نزول کا ایک انداز ہوتا ہے۔ عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات کے ساتھ سورۃ المائدہ آیت ۱۱۰ میں جو بار بار لفظ باذنی آیا ہے اس سے یہی تدبیر الٰہی مراد ہے۔

قوله: كما حملوا المحبوبية إلخ، لأن المحبوبية أثبتها الله تعالى لخواص البشر بمعنى أنهم مطيعون لله تعالى، خاشعون له، ناصحون لدينه، فحملها الناس على كون المحبوب مختاراً كلياً أو جزئياً، وكذلك الشفاعة، أثبتها الله تعالى أيضاً لخواص البشر بمعنى أنهم يشفعون بعد إذن الله تعالى، فحملها الناس على أنهم في الشفاعة مختارون: يشفعون لمن شاؤا ويتركون لمن شاؤا ولحاة العصاة موقوفة على رضاهم، فالناس يجتهدون كل الجهد في إرضائهم بمحافل العرس والتضرع إليهم، وهذا الحمل جهل منهم بشأنهم، وشأن الله تعالى (سندي بتعديل وحذف)

قوله: والحق الخ أي الحق أن صدور الخوارق والمكاشفات ثابتةٌ بقوى ناسوتية مختلطة بطبيعة الإنسان كما يلين الحديد في يد داود عليه السلام، أو بقوى روحانية كما انشق القمر بإشارة سيد البشر صلى الله عليه وسلم، لأن القوى تعد لنزول التدبير الإلهي في العالم بوجه ما، فإن تمهير تليين الحديد وانشقاق القمر كان تدبيراً إلهياً، لا اختيار له للبشر، والمعدُّ لنزول هذا التدبير قواه الناسوتية كما لداود عليه السلام أو قواه الروحانية، كما لنبينا صلى الله عليه وسلم (سندی معدین)

شرک وتشبیہ کے بیماروں کی انواع

شرک وتشبیہ کے بیمار دو طرح کے ہیں:

(١) بعض لوگ اللہ تعالیٰ کے جلال وعظمت، بڑائی اور بزرگی کو بالکل فراموش کردیتے ہیں۔ اور صرف اپنے خود ساختہ معبودوں کی عبادت کرتے ہیں۔ اپنی تمام حاجتیں انہیں کے سامنے پیش کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف قطعاً ملتفت نہیں ہوتے۔ گو وہ عقل واستدلال سے جانتے ہیں کہ موجودات کا سلسلہ پرمیشور (خدا تعالیٰ) کی ذات پر جاکر ختم ہوتا ہے۔ ہندوستان کے عام مشرکین کا یہی حال ہے۔ وہ ایشور کو مانتے ہیں، کائنات کا خالق ومالک اسی کو سمجھتے ہیں۔ مگر ساری دنیا میں ایک بھی مندر خالص بھگوان کی عبادت کے لئے نہیں ہے۔ تمام مندر کسی نہ کسی دیوی دیوتا کی عبادت کے لئے ہیں، انہیں سے وہ اپنی حاجتیں طلب کرتے ہیں اور انہی کی پرستش کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے ان کا عبادت کا رشتہ منقطع ہے۔

(٢) اور بعض لوگوں کا عقیدہ یہ ہے کہ آقا اور مالک تو صرف اللہ تعالیٰ ہیں۔ وہی کائنات کے مدبر ومنتظم ہیں۔ مگر وہ یہ بھی مانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے بعض بندوں کو بزرگی، تقدس اور الوہیت کا جامہ پہنایا ہے اور بعض مخصوص امور میں ان کو متصرف کردیا ہے۔ اور لوگوں کے حق میں اللہ تعالیٰ ان اولیاء کی سفارش قبول کرتا ہے، جیسے شہنشاہ، ملک کے اطراف میں اپنے نمائندے بھیجتا ہے اور ان کو بعض علاقوں کا نظم ونسق سونپ دیتا ہے، اور اہم امور کو مستثنیٰ کرکے باقی امور کا ان کو ذمہ دار بنادیتا ہے۔ اور اللہ کے جن بندوں کے حق میں ان کا یہ خیال خام ہوتا ہے، ان کو وہ "اللہ کے بندے" اور "بشر" کہنے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ ان کے خیال میں ایسا کہنے سے ان مخصوص بندوں کو دوسرے عام بندوں کے ساتھ برابر کرنا لازم آتا ہے، اس لئے وہ ان کو "اللہ کے بندے" کہنے کے بجائے "اللہ کے بیٹے" اور "محبوب سبحانی" کہتے ہیں اور اپنے نام عبدالمسیح (حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا بندہ) عبدالعزیٰ (عزیٰ نامی بت کا بندہ) عبدالمصطفیٰ (رسول اللہ ﷺ کا بندہ) غلام مصطفیٰ، غلام نبی، غلام رسول وغیرہ رکھتے ہیں۔ اہل کتاب یہود ونصاریٰ جو توحید ورسالت کے قائل ہیں ان میں یہ مرض عام ہے۔ اسی طرح دور حاضر میں ملت مصطفوی کی اتباع کے دعوے دار بعض غالی منافقوں کا یہی

مرض ہے۔ جو دنیا میں مختلف ناموں سے پہچانے جاتے ہیں۔ برصغیر میں وہ بریلوی اور رضاخانی کہلاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو ہدایت نصیب فرمائے (آمین)

مظاہرِ شرک کا حکم: اصل شرک تو وہی ہے جس کی اوپر وضاحت کی گئی کہ صفات کے دونوں درجوں میں فرق نہ کیا جائے، دونوں درجوں کو باہم خلط ملط کر دیا جائے اور صفات کے برتر مقدس درجہ کو کسی مخلوق کے لئے ثابت کیا جائے۔ مگر چونکہ احکام شرعیہ کا مدار ''مظنہ'' کو اصل کے قائم مقام کرنے پر ہے۔ مظنہ یعنی وہ جگہ جہاں کسی چیز کے موجود ہونے کا گمان ہو، اس کو سبب حقیقی کے قائم مقام کر کے احکام شرعیہ اسی سے متعلق کئے جاتے ہیں۔ جیسے گہری نیند کو خروج ریح کا مظنہ ہونے کی وجہ سے اصل حدث کے قائم مقام کر دیا گیا ہے۔ اور دے کلومیٹر اور ۳۷ میٹر کے سفر کو اصل علت ''مشقت'' کے قائم مقام کیا گیا ہے اور تمام احکام اصل علت کے بجائے سبب ظاہری سے متعلق کئے گئے ہیں۔ اسی طرح باب شرک میں کچھ محسوس چیزوں کو جو شرک کے مظان تھے شرک و کفر قرار دیا گیا ہے مثلاً بتوں کو، قبروں کو سجدہ کرنا، دیوی دیوتاؤں یا ولیوں کے لئے جانور ذبح کرنا اور ان کے نام کی قسمیں کھانا وغیرہ۔

ایک واقعہ جس سے شرک کی حقیقت واضح ہوئی: حضرت شاہ صاحب قدس سرہ نے خواب میں یا مکاشفہ میں یا مراقبہ میں ایک منظر دیکھا کہ ایک چھوٹی سی زہری گئی ہے جو ہر وقت دم ہلاتی رہتی ہے۔ ایک قوم اس کو پوج رہی ہے اور اس کے سامنے سجدہ ریز ہے۔ یہ واقعہ دیکھ کر شاہ صاحب کے ذہن میں یہ سوالات ابھرے کہ کیا ان لوگوں کی عبادت میں شرک کی وہ خصلت پائی جاتی ہے جو بت پرستوں میں پائی جاتی ہے؟ شاہ صاحب نے غور کیا تو آپ کو وہ خصلت نظر نہ آئی کیونکہ ان لوگوں نے اس کو صرف قبلہ بنایا تھا، خود اسی کی وہ بندگی نہیں کر رہے تھے اور تذلل کے دونوں درجوں میں انھوں نے خلط ملط بھی نہیں کیا تھا۔ یعنی غایت تذلل کا تحقق نہیں ہوا تھا۔ اس واقعہ سے شاہ صاحب قدس سرہ نے مسئلہ شرک کی حقیقت پائی اور آپ کا سینہ اس علم سے معمور ہو گیا اور مسئلہ میں آپ کو پوری بصیرت حاصل ہوئی کہ توحید کیا ہے؟ شرک کیا ہے؟ توحید کے مظان کیا ہیں؟ اور شرک کے مظان کیا ہیں؟ اسی طرح عبادات و تدبیر میں کیا ربط ہے؟ یہ سب باتیں شاہ صاحب قدس سرہ پر کھل گئیں، جو اس باب میں آپ نے ہمیں سمجھائی ہیں اور آگے بھی جگہ جگہ بیان کریں گے۔

والغرض: بهذا المرض على أصناف:

منهم: من نسي جلال الله بالكلية، فجعل لا يعبد إلا الشركاء، ولا يرفع حاجته إلا إليهم، لا يلتفت إلى الله أصلاً، وإن كان يعلم بالنظر البرهاني أن سلسلة الوجود تنتهي إلى الله.

ومنهم: من اعتقد أن الله هو السيد، وهو المدبر، لكنه قد يخلع على بعض عبيده لباس الشرف والتأله، ويجعله متصرفا في بعض الأمور الخاصة، ويقبل شفاعته في عباده، بمنزلة ملك الملوك يبعث على كل قطر ملكا، ويقلده تدبير تلك المملكة، فيما عدا الأمور العظام،

(یعنی جن سے شرک کے پیدا ہونے کا احتمال تھا) کفر گردانا، جیسے بتوں کو سجدہ کرنا، ان کے لئے جانور ذبح کرنا اور ان کے نام کی قسم کھانا اور اس قسم کی اور چیزیں۔

اور یہ علم سب سے پہلے مجھ پر اس وقت کھلا کہ میرے سامنے ایک ایسی قوم پیش کی گئی جو ایک چھوٹی سی زہریلی مکھی کے سامنے، جو ہر وقت اپنی دُم اوپر ہلایا کرتی تھی، سجدہ کر رہی تھی۔ پس میرے دل میں ڈالا گیا: کیا تم ان لوگوں کے اندر شرک کی تاریکی پاتے ہو؟ اور جس گناہ نے بت پرستوں کو گھیر رکھا ہے اس نے ان کو بھی گھیر رکھا ہے؟ میں نے کہا: نہیں، ان کے اندر میں وہ چیزیں نہیں پاتا، اس لئے کہ ان لوگوں نے مکھی کو قبلہ گردانا ہے۔ اور تذلل کے ایک درجہ کو دوسرے درجہ کے ساتھ خلط ملط نہیں کیا۔ کہا گیا کہ آپ نے راز پالیا۔ پس اس دن سے میرا دل اس علم سے معمور ہوگیا اور میں معاملہ میں بابصیرت ہوگیا۔ اور میں نے توحید و شرک کی اور جن امور کو توحید و شرک کا مظنہ گردانا گیا ہے ان کی حقیقت سمجھ لی اور میں عبادت و تدبیر میں جو ربط ہے اس سے بھی واقف ہوگیا۔ باقی اللہ بہتر جانتے ہیں۔

لغات:

النظر البرهاني أى بالدليل العقلي ... ألهة فالهٌ: خدا کا مرتبہ دینا ... لَجْلَجَ لَجْلَجَةً وتَلَجْلَجَ: ہکلانا، جھکانا، رک رک کر بولنا، صاف نہ بولنا ... المَرْضَى جمع المريض۔

قوله: لأنهم جعلوا الذباب إلخ أى جعلوها قبلة فقط، ولم يخلطوا الدرجة السافلة بالدرجة العالية المخصوصة بالله سبحانه وتعالى، وإنما لم يحكم المصنف رحمه الله بإشراك هذا القوم، وإن كانت السجدة مظنة الإشراك بالله تعالى لأنه علم بالمكاشفة علماً يقيناً أنهم لم يعبدوا للذباب التدبير والتسخير، ولم يتوقعوا منه النفع والضرر، بل جعلوه قبلة فقط، وإنما الاعتبار بالمظان إذا لم يُعلم الحقيقة من جانب الله تعالى بالوحي أو المكاشفة أو بنحوهما من الإلقاء في الرُّوع (سندي رحمه الله)

قوله: ارتباط العبادة بالتدبير أى تقتضي طبيعة الإنسان أن يعبد لمدبره فقط (سندي)

باب ——— ٣

مظاہرِ شرک یعنی شرک کی صورتوں کا بیان

شرک کی حقیقت یہ ہے کہ کسی بڑے آدمی کے بارے میں یعنی کسی نبی یا ولی کے بارے میں یہ عقیدہ رکھا جائے کہ اس سے جو خارقِ عادت آثارِ عجیبہ یعنی معجزات و کرامات صادر ہوئی ہیں وہ اس کے ذاتی افعال ہیں یعنی وہ افعال اس سے بایں وجہ صادر ہوئے ہیں کہ وہ صفاتِ کمالیہ میں سے کسی ایسی صفت کے ساتھ متصف ہے جو انسانوں میں نہیں

پائی جاتی، واجب تعالیٰ کے ساتھ وہ صفت خاص ہے۔ پھر بندہ میں وہ صفت اسی وقت پائی جاسکتی ہے جب اللہ تعالیٰ کی
خلعت الوہیت سے نوازے، یا کوئی فانی فی اللہ، باقی باللہ ہوجائے، یا اسی قسم کے اور خرافی عقائد جو شرک میں مبتلا
لوگوں میں پائے جاتے تھے۔ مسلم شریف (کتاب الحج، باب التلبیہ ۸:۹۰ مصری) میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے
مروی ہے کہ مشرکین کہا کرتے تھے:

"لبیك (ہم تیرے حضور میں حاضر ہیں) لاشریك لك (تیرا کوئی شریک نہیں) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے: تمہارا ناس ہو، بس بس! (یعنی اس پر رک جاؤ، آگے مت کہو) مگر مشرکین اس پر بس نہیں کرتے تھے، بلکہ وہ کہتے: الا شریکا ھو لك تملکه وما ملك (مگر ایک شریک جو تیرا ہے، تو اس کا مالک ہے اور وہ کسی چیز کا مالک نہیں (یہ ترجمہ مانافیہ کی صورت میں ہے) یا تو اس کا مالک ہے اور اس چیز کا بھی مالک ہے جس کا وہ مالک ہے (یہ ترجمہ ما موصولہ کی صورت میں ہے) مشرکین یہ کہتے ہوئے بیت اللہ کا طواف کرتے تھے"

یعنی مشرکین جو بندہ کو ایک شریک مانتے تھے، اس کو اللہ کی طرف سے مختار مانتے تھے، وہ لوگ اصل حق دار ملک خدا ہی کو مانتے تھے۔ اسی طرح مشرک اقوام معظم ہستیوں کو عطائی اختیارات کا حامل مانتی ہیں۔ ذاتی اختیارات کی قائل نہیں ہیں۔ پھر وہ بزرگ ہستی کے سامنے غایت تذلل کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ان کی مورت بنا کر پوجتے ہیں، یا اس کی قبر، یا اس کی کسی یادگار کو سجدہ کرتے ہیں یا اس کا طواف کرتے ہیں، مرادیں مانگتے ہیں، چڑھاوے چڑھاتے ہیں، منتیں مانتے ہیں اور اس کے نام کی قسمیں کھاتے ہیں۔ غرض اس کے ساتھ وہ معاملہ کرتے ہیں جو صرف خدا کے ساتھ کرتے ہیں، یہی شرک ہے۔

شرک کے مظاہر: شرک ایک معنوی چیز ہے، کیونکہ وہ ایک اعتقاد ہے، جو دل کا عمل ہے۔ البتہ اس کے مظاہر (ظاہری افعال) ہیں، جو شرک پر دلالت کرتے ہیں۔ مثلاً غیر اللہ کو سجدہ کرنا، ان کے نام کی قسم کھانا وغیرہ۔ اور شریعت جن صورتوں، شکلوں، ناموں اور مجسموں وغیرہ سے بحث کرتی ہے جن کو لوگ بہ نیت شرک اختیار کرتے ہیں، پھر رفتہ رفتہ وہ مظاہر، شرک کی "احتمالی جگہیں" بن جاتی ہیں، یعنی ان سے شرک پیدا ہونے کا ظن غالب ہوجاتا ہے۔ اور وہ بھی وہ شرک کے ساتھ لازم ہیں، ان سے منفک نہیں۔ اور شریعت کا طریقہ یہ ہے کہ وہ ان علامات وافعال ظاہرہ کو جو مصالح ومفاسد کے ساتھ لازم وملزوم ہوتے ہیں، اصل مصالح اور مفاسد کے قائم مقام کردیتی ہے۔ مثلاً بخل وسخاوت افعال قلبیہ ہیں، شریعت نے ان کی جگہ زکوٰۃ دینے کو رکھ دیا ہے، جو زکوٰۃ ادا کرتا ہے، شریعت کی نظر میں سخی ہے اور جو زکوٰۃ نہیں دیتا وہ بخیل ہے۔ اسی طرح نوم مستغرق کو خروج ریح کے قائم مقام کیا ہے کیونکہ بحالت نوم حصول حدث کا ادراک مشکل ہے، اسی طرح نفس سفر کو مشقت کے قائم مقام کیا ہے، کیونکہ مشقت کو جانچنے کا کوئی پیمانہ نہیں۔ اسی طرح یہاں بھی مظاہر شرک کو اصل شرک کے قائم مقام کردیا ہے، کیونکہ اصل شرک جو دل کا ایک عقیدہ ہے، اس کو جاننے کی کوئی صورت نہیں، پس تمام احکام انہیں مظاہر پر دائر ہوں گے، جو بھی بت کو یا قبر کو سجدہ کرے گا اس پر شرک کا حکم

لگایا جائے گا کہ شرک کی حقیقت اس کے دل میں نہ پائی جاتی ہو۔

﴿باب أقسام الشرك﴾

حقيقة الشرك: أن يعتقد إنسانٌ في بعض المعظَّمين من الناس: أن الآثار العجيبة الصادرة منه إنما صدرت لكونه متصفاً بصفة من صفات الكمال، مما لم يُعهد في جنس الإنسان، بل يختص بالواجب جلّ مجده، لايوجد في غيره، إلا أن يَخلَع هو خِلْعةَ الألوهية على غيره، أو يَفنى غيرُه في ذاته، ويبقى بذاته، أو نحوُ ذلك مما يظنه هذا المعتقدُ من أنواع الخُرافات، كما ورد في الحديث: ﴿إن المشركين كانوا يُلَبُّوْنَ بهذه الصيغة: لبيك لبيك لاشريك لك، إلا شريكا هو لك، تملكه وما مَلَكَ﴾ فيتذلل عنده أقصى التذلل، ويُعامل معه معاملةَ العباد مع الله تعالى.

وهذا معنى، له أشباح وقوالبُ، والشرعُ لايبحث إلا عن أشباحه وقوالبه التي باشرها الناس بنية الشرك، حتى صارت مظِنَّةً للشرك، ولازماً له في العادة، كسنة الشرع في إقامة العلل المتلازمة للمصالح والمفاسد مقامَها.

ترجمہ: اقسام شرک کا بیان: شرک کی حقیقت یہ ہے کہ کسی بڑے آدمی کی نسبت یہ اعتقاد رکھا جائے کہ اس سے جو آثار عجیبہ صادر ہوئے ہیں وہ صرف اس وجہ سے صادر ہوئے ہیں کہ وہ صفات کمالیہ میں سے کسی ایسی صفت کے ساتھ متصف ہے جو جنس انسان میں نہیں پائے گئے، بلکہ وہ واجب تعالیٰ کے ساتھ خاص ہیں۔ ان کے علاوہ میں نہیں پائے جاسکتے مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنے علاوہ کو خدائی کی پوشاک پہنا دیں، یا کوئی غیر اللہ، اللہ کی ذات میں فنا ہو جائے اور وہ اللہ کی ذات کے ساتھ باقی رہے یا اس قسم کی دیگر خرافات جن کا یہ معتقد قائل ہے۔ جیسا کہ حدیث شریف میں وارد ہوا ہے کہ مشرکین حج کا تلبیہ اس طرح پڑھتے تھے لبيك إلى آخره (ہم تیرے حضور میں حاضر ہیں، ہم تیرے حضور میں حاضر ہیں۔ تیرا کوئی شریک نہیں، مگر ایک شریک جو تیرا ہے، اس کا اور اس کی ملکیت کا تو مالک ہے یا اس کا تو مالک ہے اور وہ مالک نہیں ہے) پس وہ اس (بڑے آدمی) کے سامنے نہایت درجہ عاجزی کرتا ہے اور اس کے ساتھ ویسا معاملہ کرتا ہے، جیسا بندے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کیا کرتے ہیں۔

اور یہ شرک (جس کی حقیقت اوپر بیان کی گئی) ایک معنوی چیز ہے، جس کے لئے صورتیں اور سانچے ہیں اور شریعت انہی صورتوں اور سانچوں سے بحث کرتی ہے، جن کو لوگ شرک کی نیت سے اختیار کرتے ہیں، یہاں تک کہ وہ شرک کا مظنہ (کسی چیز کے ملنے کی احتمالی جگہ) ہو گئے ہیں اور عادتاً شرک کے لئے لازم ہیں۔ جس طرح شریعت کا طریقہ ہے کہ وہ ان علتوں (علامتوں) کو جو مصالح ومفاسد کے ساتھ لازم ملزوم ہیں، ان مصالح ومفاسد کے قائم مقام گردانتی ہے۔

تشریح: اللہ کی ذات میں فنا ہونے اور اللہ کی ذات کے ساتھ باقی رہنے کا مطلب یہ ہے کہ اس شخصیت کو اللہ کا عین قرار دیا جائے۔ اور اس کے لئے خلق و تدبیر کی صفات مان لی جائیں جو کہ خدائی صفات ہیں۔

فائدہ:

نیت اور مظاہر کے اعتبار سے شرک کی چند قسمیں ہیں:

۱- وہ شرک جس کا مرتکب کافر، مخلد فی النار ہے۔

۲- وہ شرک جو حرام ہے مگر اس کا مرتکب نہ کافر ہے، نہ مخلد فی النار۔ صرف گناہ کبیرہ کا مرتکب ہے۔

۳- وہ شرک جو مکروہ تحریمی ہے اور اس کا مرتکب سخت گنہگار ہے، مگر کافر نہیں ہے۔

اور ان اقسام کو پہچاننے کا قاعدہ یہ ہے کہ جس فعل شرک کے ساتھ معظم ذات کی الوہیت، تدبیر عالم اور تصرف فی الکائنات کا عقیدہ بھی ہو تو وہ مفضی الی الکفر ہے، ورنہ نہیں۔ اور چونکہ یہ عقیدہ ایک مخفی امر ہے، اللہ تعالیٰ ہی اس کو جانتے ہیں، اس لئے غایت تذلل ظاہر کرنے والے افعال کو نیت و اعتقاد کا قائم مقام گردانا گیا ہے، جیسے غیر اللہ کو سجدہ کرنا اور ان کی قسم کھانا، ان کی منت ماننا، ان کے نام کا وظیفہ پڑھنا وغیرہ اسی طرح کے دیگر اعمال شرکیہ جو عام طور پر الوہیت کے عقیدہ ہی سے ہوتے ہیں۔

اور شرک کی نظیر "بغاوت" ہے۔ بغاوت کے بعض جرم واجب القتل ہوتے ہیں، بعض حبس دوام یا لمبی قید کے سزاوار ہوتے ہیں اور بعض زجر شدید کے مستحق ہوتے ہیں۔

پس جو شخص اسلام کا اقرار کرتا ہے، نماز پڑھتا ہے، زکوٰۃ ادا کرتا ہے اور ساتھ ہی اعمال شرکیہ بھی کرتا ہے، بزرگوں کی قبروں کو سجدہ کرتا ہے، ان کی قسمیں کھاتا ہے، ان سے مدد طلب کرتا ہے اور اولاد مانگتا ہے، وہ مشرک تو ہے مگر کافر نہیں۔ اللہ تعالیٰ جب تک چاہیں گے وہ جہنم میں گناہوں کی سزا پائے گا مگر بالآخر نجات پائے گا۔ وہ اسلام سے خارج نہیں۔ واللہ اعلم

شرک کی صورتوں کا تفصیلی بیان

اب حضرت شاہ صاحب قدس سرہ شرک کے چند ابواب مخصوص بیان کرتے ہیں، جن کو اللہ تعالیٰ نے شریعت اسلامی میں شرک کے مظان (مواقع شرک) قرار دیا ہے اور ان کی ممانعت فرمائی ہے۔ شاہ صاحب نے اس باب میں شرک کی نو صورتیں بیان کی ہیں، وہ یہ ہیں: ۱- غیر اللہ کو سجدہ کرنا ۲- حوائج میں غیر اللہ سے مدد طلب کرنا ۳- کسی کو اللہ کا بیٹا یا بیٹی کہنا ۴- علماء و مشائخ کو تحلیل و تحریم کا اختیار دینا ۵- غیر اللہ کے لئے جانور ذبح کرنا ۶- غیر اللہ کے نام پر جانور چھوڑنا ۷- غیر اللہ کے نام کی قسم کھانا ۸- غیر اللہ کی تعظیم کا حج کرنا ۹- غیر اللہ کی طرف بندگی کی نسبت کر کے نام رکھنا۔

یہ نو چیزیں ایسی ہیں جو دل میں مضمون شرک کی غمازی کرتی ہیں۔ اور اگر دل میں ابھی شرک متحقق نہیں ہوا تو رفتہ رفتہ ہو جائے گا۔ اس لئے شریعت میں ان امور کی شدت سے ممانعت فرمائی گئی ہے۔ ذیل میں ان تمام شکلوں کا تفصیلی بیان ہے۔

① غیر اللہ کو سجدہ کرنا

لوگ بتوں کو اور ستاروں کو سجدہ کیا کرتے ہیں اس لئے غیر اللہ کو سجدہ کرنے کی ممانعت آئی۔ سورہ حٰم السجدۃ آیت ۳۷ میں ارشاد ہے:

"اور اس کی نشانیوں میں سے رات، دن، سورج، اور چاند ہیں۔ سو تم نہ تو سورج کو سجدہ کرو، اور نہ چاند کو۔ اور اس خدا کو سجدہ کرو جس نے ان کو پیدا کیا ہے، اگر تم کو خدا کی عبادت کرنی ہے۔"

اور ممانعت کی وجہ یہ ہے کہ شرک فی السجدہ، اور شرک فی العقیدہ میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ یعنی جو غیر خدا کو مدبر عالم مانتا ہے وہ ضرور اس کو سجدہ کرتا ہے یا کرے گا۔ اسی طرح جو غیر خدا کو سجدہ کرتا ہے، وہ ضرور اس کو مدبر عالم سمجھتا ہے یا سمجھے گا۔ اس بحث کے باب اول میں جو توحید کے بیان میں ہے اس بات کی طرف اشارہ آچکا ہے کہ توحید کے مراتب اربعہ میں سے آخری دو مرتبے باہم مربوط اور لازم ملزوم ہیں۔ ان میں فطری ارتباط اور عادی تلازم ہے۔ دونوں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتے۔

توحید عبادت، دین کا بنیادی اور عقلی مسئلہ ہے

فرشتوں نے آدم علیہ السلام کو جو سجدہ کیا تھا اس کے متعلق اجماع ہے کہ وہ عبادت کا سجدہ نہیں تھا۔ تعظیم اور سلامی کا سجدہ تھا، کیونکہ غیر اللہ کو عبادت کا سجدہ کرنا کفر ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کفر کے کاموں کا بندوں کو حکم نہیں دیتے۔ پھر تین رائیں ہیں:

ایک رائے: یہ ہے کہ آدم علیہ السلام صرف قبلہ تو جہ تھے۔ سجدہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کیلئے تھا۔ یہ قول صحیح نہیں ہے۔

دوسری رائے: یہ ہے کہ سجدہ آدم علیہ السلام ہی کو کیا گیا تھا مگر یہ سجدہ تعظیم و تحیہ تھا، سجدہ عبادت نہیں تھا۔ اور سابقہ امتوں میں ایسا سجدہ روا تھا۔ یہ رائے صحیح ہے۔

تیسری رائے: یہ ہے کہ درحقیقت سجدہ کیا ہی نہیں گیا تھا۔ بلکہ ملائکہ نے حضرت آدم علیہ السلام کے سامنے انقیاد و خضوع کا اظہار کیا تھا۔ یعنی سر اطاعت خم کیا تھا، جس کو سجدہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یہ رائے بھی صحیح نہیں ہے۔

پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ سجدہ تو عبادت ہے، اور عبادت غیر اللہ کی جائز نہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کو سجدہ کا حکم کیسے دیا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ سجدہ ہمیشہ عبادت نہیں ہوتا۔ وہ نیت کے تابع ہے۔ اگر بہ نیت تعظیم و تحیہ سجدہ کیا جائے تو وہ عبادت نہیں ہے مگر چونکہ وہ شرک کا منفذ ہے، اس لئے ہماری شریعت میں مطلقاً غیر اللہ کو سجدہ کرنا ممنوع قرار دیا گیا

ہے۔ اور اگر سجدہ بہ نیت بندگی ہو تو وہ عبادت ہے۔ اور فرشتوں کا سجدہ اسی نیت سے تھا۔ کیونکہ غیر اللہ کی عبادت کی حرمت دین کا بنیادی مسئلہ ہے اور ہر مرسل سے منقول ہے یعنی اس پر دلیل عقلی قائم کی جاسکتی ہے۔ اور یہ مسئلہ ورود شرع کا محتاج نہیں۔ یہ مسئلہ کوئی فرعی مسئلہ نہیں ہے کہ ادیان کے اختلاف سے اس کا حکم مختلف ہو۔ اور اس پر دلیل قائم نہ کی جاسکے (تفصیل کے لئے تفسیر رازی ۳۰۰:۲ دیکھیں)

بعض لوگوں نے مذکورہ اشکال کا یہ جواب دیا ہے کہ سجدۂ عبادت سابقہ شریعتوں میں غیر اللہ کے لئے جائز تھا۔ کیونکہ وہ ایک فرعی اور فقہی حکم ہے، جو ادیان کے اختلاف سے مختلف ہو سکتا ہے۔ غیر اللہ کی عبادت کی حرمت کا مسئلہ کوئی دین کا بنیادی مسئلہ نہیں ہے، جس پر استدلال عقلی قائم کیا جاسکے۔ روح المعانی (۲۲۸:۱) میں اس خیال کو ذکر کر کے اس کی تردید کی گئی ہے۔ حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ بھی اس قول کی تردید کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ:

بعض متکلمین کا یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ توحید عبادت یعنی صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنا احکام فقہیہ میں سے ایک حکم ہے، جو اختلاف ادیان سے مختلف ہو سکتا ہے۔ اور اس پر کسی دلیل عقلی کا مطالبہ نہیں کیا جاسکتا۔ یہ قول اس لئے غلط ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بندوں پر لازم کیا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کو تخلیق و تدبیر میں متفرد سمجھیں یعنی یہ عقیدہ رکھیں کہ کائنات کے ذرہ ذرہ کو پیدا کرنے والے تنہا اللہ تعالیٰ ہیں۔ اور وہی نظام عالم چلا رہے ہیں۔ وہی پروردگار ہیں اور بلا شرکت غیرے منتظم ہیں۔ سورۃ النمل آیات ۵۹-۶۴ میں ارشاد ہے:

"آپ (بیان توحید کے لئے بطور خطبہ کے) کہئے کہ تمام تعریفیں اللہ ہی کے لئے ہیں۔ اور اس کے ان بندوں پر سلام ہو، جن کو اس نے منتخب فرمایا ہے۔ کیا اللہ بہتر ہے یا وہ جن کو شریک ٹھہراتے ہیں؟

یا وہ اللہ (بہتر ہے) جس نے آسمان اور زمین کو بنایا، اور اس نے تمہارے لئے آسمان سے پانی برسایا، پھر اس سے ہم نے رونق دار باغ اگائے، تم سے تو ممکن نہ تھا کہ تم ان کے درختوں کو اگاتے (یا وہ بہتر ہیں جن کو لوگ شریک ٹھہراتے ہیں؟) کیا اللہ تعالیٰ کے ساتھ کوئی اور معبود ہے؟ مگر یہ ایسے لوگ ہیں جو دوسروں کو خدا کے برابر ٹھہراتے ہیں!

یا وہ اللہ بہتر ہے جس نے زمین کو قرارگاہ بنایا، اور اس کے درمیان نہریں بہائیں، اور اس کے استقرار کے لئے پہاڑ بنائے، اور دو دریاؤں کے درمیان ایک حد فاصل بنائی (یا شرکاء بہتر ہیں؟) کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود ہے؟ بلکہ ان میں زیادہ تو سمجھتے ہی نہیں!

یا وہ اللہ (بہتر ہے) جو بے قرار آدمی کی سنتا ہے، جب وہ اس کو پکارتا ہے، اور مصیبت کو دور کر دیتا ہے، اور تم کو زمین میں صاحب تصرف بناتا ہے (یا وہ شرکاء بہتر ہیں؟) کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود ہے؟ تم لوگ بہت ہی کم نصیحت پذیر ہوتے ہو!

یا وہ اللہ (بہتر ہے) جو تم کو خشکی اور دریا کی تاریکیوں میں رستہ سوجھاتا ہے، اور جو ہواؤں کو بارش سے پہلے بھیجتا ہے، جو بارش کی امید دلا کر دلوں کو خوش کر دیتی ہے (یا وہ شرکاء بہتر ہیں؟) کیا اللہ تعالیٰ کے ساتھ کوئی اور معبود ہے؟ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے شرک سے برتر ہیں!

یا وہ اللہ (بہتر ہے) جو مخلوقات کو اول بار پیدا کرتا ہے، پھر اس کو دوبارہ پیدا کرے گا، اور جو آسمان اور زمین سے تم کو روزی دیتا ہے (یا وہ شرکاء بہتر ہیں؟) کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود ہے؟ آپ کہئے: تم اپنی دلیل پیش کرو، اگر تم سچے ہو!

ان آیات پاک کا خلاصہ یہ ہے کہ خالق بھی وہی ہے اور مدبر و منتظم بھی وہی ہے پس معبود بھی وہی ہے۔ کیونکہ خلق وتدبیر اور معبودیت میں تلازم ہے۔ ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتے۔ پس برحق بات یہ ہے کہ خود مشرکین صرف اللہ تعالیٰ کو خالق مانتے تھے اور امور عظام کا مدبر و منتظم بھی اللہ تعالیٰ ہی کو مانتے تھے۔ اور وہ یہ بھی مانتے تھے کہ توحید تدبیر اور توحید عبادت میں تلازم ہے۔ یعنی جو خالق و مدبر ہے وہی معبود ہے، اور کوئی معبود نہیں ہو سکتا، اور جو معبود ہے وہی خالق و مدبر ہے، دوسرا کوئی خالق و مدبر نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ دونوں باتوں میں فطری ارتباط ہے، جیسے کہ باب التوحید میں گذرا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے مشرکین پر مذکورہ پانچ آیتوں میں حجت قائم کی ہے کہ جب تم اللہ ہی کو ہر چیز کا خالق اور امور عظام کا مدبر مانتے ہو تو پھر عبادت شرکاء کی کیوں کرتے ہو؟ سوچو، ان کا عبادت کا استحقاق کہاں سے پیدا ہو گیا؟ اللہ اکبر! کیسی کامل برہان الٰہی ہے! اور کتنی مضبوط و مستحکم دلیل ہے! پس قائل کا یہ قول کہ توحید عبادت پر دلیل عقلی قائم نہیں کی جا سکتی، کیسے درست ہو سکتا ہے؟!

ونحن نريد أن ننبهك على أمور جعلها الله تعالى في الشريعة المحمدية - على صاحبها الصلوات والتسليمات - مظنّاتٍ للشرك، فنهى عنها: فمنها: أنهم كانوا يسجدون للأصنام والنجوم، فجاء النهي عن السجدة لغير الله تعالى، قال الله تعالى: ﴿لَا تَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ، وَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِيْ خَلَقَهُنَّ﴾ والإشراك في السجدة كان متلازمًا للإشراك في التدبير، كما أومأنا إليه. وليس الأمر كما يظنّ بعض المتكلمين من أن توحيد العبادة حكمٌ من أحكام الله تعالى مما يختلف باختلاف الأديان، لايطلب بدليل برهاني، كيف؟ ولو كان كذلك لم يُلزمهم الله تعالى بتفرده بالخلق والتدبير، كما قال - عزّ من قائل -: ﴿قُلِ: الْحَمْدُ لِلّٰهِ، وَسَلَامٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى، آللّٰهُ خَيْرٌ﴾ إلى آخر خمس آيات؛ بل الحق: أنهم اعترفوا بتوحيد الخلق، وبتوحيد التدبير في الأمور العظام، وسلّموا أن العبادة متلازمةٌ معهما، لما أشرنا إليه في تحقيق

معنى التوحيد، فلذلك ألزمهم الله بما ألزمهم، ولله الحجة البالغة.

ترجمہ: اور ہم چاہتے ہیں کہ آپ کو ان امور سے آگاہ کریں جن کو اللہ تعالیٰ نے شریعت محمدیہ — صاحب شریعت پر بے پایاں رحمتیں اور سلام ہو — میں شرک کے مظان (احتمالی جگہیں) گردانی ہیں، پس ان سے روک دیا ہے:

ان میں سے ایک: یہ ہے کہ لوگ بتوں اور ستاروں کے سامنے سجدہ کیا کرتے تھے۔ پس غیر اللہ کے آگے سجدہ کرنے کی ممانعت آئی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "تم نہ آفتاب کو سجدہ کرو، نہ چاند کو، اور اس اللہ کو سجدہ کرو جس نے ان کو پیدا کیا ہے" اور سجدہ میں شریک گرداننا، تدبیر عالم میں شریک گرداننے کے ساتھ لازم وملزوم ہے، جیسا کہ ہم نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔

اور معاملہ ایسا نہیں ہے جیسا بعض علمائے کلام خیال کرتے ہیں کہ توحید عبادت احکام خداوندی میں سے ایک حکم ہے، جو اختلاف ادیان کی وجہ سے مختلف ہوتا ہے (اور) اس پر کوئی دلیل عقلی قائم نہیں کی جاسکتی۔ بعض متکلمین کی یہ بات کیونکر درست ہوسکتی ہے؟ اگر ایسا ہوتا تو اللہ تعالیٰ لوگوں پر لازم قرار نہ دیتے کہ وہ اسے تخلیق وتدبیر میں منفرد سمجھیں، جیسا کہ اللہ نے فرمایا — بات کا قائل بڑی عزت والا ہے —: "کہہ دیں: تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں، اور سلام ہو اللہ کے ان بندوں پر جن کو اللہ نے چن لیا ہے، کیا اللہ تعالیٰ بہتر ہیں" (اس آیت کے بعد کی) پانچ آیتوں تک پڑھ جاؤ۔ بلکہ سچی بات یہ ہے کہ مشرکین توحید خلق اور امور عظام میں توحید تدبیر کے معترف تھے اور وہ یہ بھی تسلیم کرتے تھے کہ عبادت مذکورہ دونوں توحیدوں کے ساتھ لازم وملزوم ہے، اس وجہ سے جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے توحید کے معنی کی تحقیق میں، پس اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے مشرکین پر وہ بات لازم کی ہے جو ان پر لازم کی ہے، اور کامل برہان اللہ تعالیٰ کے لئے ہے!

② حوائج میں غیر اللہ سے مدد طلب کرنا

مشرکین اپنی حاجتوں میں جیسے شفایابی اور مالداری میں غیر اللہ سے مدد طلب کیا کرتے تھے۔ اور اپنے مقاصد کی حاجت برآری کے لئے ان کی منتیں مانا کرتے تھے۔ اور حصول برکت کی غرض سے ان کے ناموں کی مالا جپا کرتے تھے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے لوگوں پر لازم کیا کہ وہ اپنی نمازوں میں یہ کہا کریں کہ: "ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں۔ اور ہم تجھی سے مدد چاہتے ہیں" (سورۃ الفاتحۃ آیت ۴) اور ارشاد فرمایا: "تم اللہ کے ساتھ کسی کو نہ پکارو" (سورۃ الجن آیت ۱۸) اور پکارنے سے مراد عبادت نہیں ہے، جیسا کہ بعض مفسرین نے کہا ہے، بلکہ پکارنے سے مراد استغاثہ (داد فریاد) اور طلب اعانت ہے۔ سورۃ الانعام آیت ۴۰ و ۴۱ میں "پکارنا" اسی معنی میں آیا ہے۔ ارشاد ہے:

"بتلاؤ اگر تم پر خدا کا کوئی عذاب آپڑے، یا تم پر قیامت ہی آپہنچے تو کیا خدا کے سوا کسی اور کو پکارو گے اگر تم

سکتے ہو؟ بلکہ اسی کو (اللہ تعالیٰ ہی کو) پکارنے لگو گے، پھر جس مصیبت کے لئے تم پکارو گے اگر وہ چاہے گا تو اس کو ہٹا دے گا، اور جن کو تم شریک ٹھہراتے ہو ان کو بھول جاؤ گے"

اس آیت میں پکارنے سے مراد آڑے وقت میں مدد کے لئے پکارنا ہے، پس سورۃ الجن کی آیت میں بھی یہی معنی ہیں۔ پس غیر اللہ سے مدد طلب کرنے کی صراحۃً ممانعت ہوگئی۔

فائدہ:

مفسرین عام طور پر سورۃ الجن کی آیت میں دعا بمعنی عبادت لیتے ہیں۔ اور سیاق آیت سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ پوری آیت یہ ہے ﴿وَأَنَّ الْمَسَاجِدَ لِلَّهِ فَلَا تَدْعُوا مَعَ اللَّهِ أَحَدًا﴾ ترجمہ: "اور یہ کہ مسجدیں اللہ کی یاد کے واسطے ہیں سو مت پکارو اللہ کے ساتھ کسی کو (ترجمہ شیخ الہند) فوائد عثمانی میں ہے کہ "یوں تو خدا کی ساری زمین اس امت کے لئے مسجد بنادی گئی ہے لیکن خصوصیت سے وہ مکانات جو مسجدوں کے نام سے خاص عبادت الٰہی کے لئے بنائے جاتے ہیں ان کو مزید امتیاز حاصل ہے، وہاں جاکر اللہ کے سوا کسی ہستی کو پکارنا ظلم عظیم اور شرک کی بدترین صورت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خالص خدائے واحد کی طرف آؤ۔ اور اس کا شریک کرکے کسی کو کہیں بھی مت پکارو، خصوصاً مساجد میں جو اللہ کے نام پر تنہا اسی کی عبادت کے لئے بنائی گئی ہیں"

اور حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے ترجمہ کیا ہے: "اور جتنے سجدے ہیں وہ سب اللہ کا حق ہیں سو اللہ کے ساتھ کسی کی عبادت مت کرو" اور حاشیہ میں لکھا ہے: "یعنی یہ جائز نہیں کہ کوئی سجدہ اللہ کو کیا جاوے اور کوئی سجدہ غیر اللہ کو جیسا مشرکین کرتے تھے"

غرض مفسرین کی عام رائے یہ ہے کہ سورۃ الجن کی آیت میں دعا بمعنی عبادت ہے اور سورۃ الانعام کی آیت میں دعا بمعنی استغاثہ وطلب اعانت ہونے سے ضروری نہیں کہ وہی معنی سورۃ الجن کی آیت میں بھی ہوں۔ شاہ صاحب رحمہ اللہ کا مقصود درحقیقت قرآن کریم سے صراحۃً طلب اعانت کی نفی ثابت کرنا ہے، مگر یہ بات اس آیت سے ثابت نہیں ہوتی۔

(۳) کسی کو اللہ کا بیٹا یا بیٹی کہنا

مشرکین اپنے خود ساختہ معبودوں کو "اللہ کی بیٹیاں" اور "اللہ کے بیٹے" کہتے تھے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ ان آلائشوں سے پاک ہیں۔ ﴿سُبْحَانَهُ﴾ ان کی شان ہے۔ اس لئے بیٹا کہنے سے سختی سے روکا گیا۔ اور اس کی وجہ گذشتہ باب کے آخر میں بیان کی جاچکی ہے کہ مشرکانہ مزاج کی حامل اقوام بعض شخصیات کو "بندہ" کہنے میں ان کی کسر شان سمجھتے ہیں، اس لئے ان کی قدر افزائی کے لئے اس طرح کی تعبیرات اختیار کرتے ہیں، جو شرک کا پیش خیمہ ہیں۔

ومنها: أنهم كانوا يستعينون بغير الله في حوائجهم: من شفاء المريض، وغناء الفقير،

ويستنصرون بهم، يتوقعون إنجاح مقاصدهم بتلك النذور، ويتلون أسماءهم رجاء بركتها، فأوجب الله تعالى عليهم أن يقولوا في صلاتهم: ﴿إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ﴾ وقال تعالى: ﴿فَلاَ تَدْعُوْا مَعَ اللهِ أَحَدًا﴾ وليس المراد من الدعاء العبادةَ، كما قال بعض المفسرين، بل هو الاستعانة، لقوله تعالى: ﴿بَلْ إِيَّاهُ تَدْعُوْنَ فَيَكْشِفُ مَا تَدْعُوْنَ﴾

ومنها: أنهم كانوا يسمّون بعض شركائهم بنات الله، وأبناء الله، فنُهوا عن ذلك أشد النهي، وقد شرحنا سره من قبل.

ترجمہ: اور ان صورتوں میں سے یہ ہے کہ لوگ اپنی حاجتوں میں جیسی مریض کی شفایابی میں اور فقیر کی مالداری میں غیر اللہ سے مدد طلب کیا کرتے تھے۔ اور ان کی منتیں مانتے تھے۔ امید رکھتے تھے ان منتوں سے اپنے مقاصد کے پورا ہونے کی اور ان کے ناموں کی مالا جپا کرتے تھے ان ناموں کی برکت کی امید سے۔ پس اللہ تعالیٰ نے لوگوں پر لازم کیا کہ وہ اپنی نمازوں میں کہیں: "ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور ہم تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں" اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "پس مت پکارو تم اللہ کے ساتھ کسی کو" اور "پکارنے" سے مراد عبادت نہیں ہے جیسا کہ بعض مفسرین نے کہا ہے۔ بلکہ طلب اعانت ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی وجہ سے "بلکہ اسی کو پکارنے لگو گے تم پس وہ ہٹائے گا اس کو جس کے لئے تم پکارتے ہو"

اور ان صورتوں میں سے یہ ہے کہ لوگ اپنے شرکاء (خود ساختہ معبودوں) کو "اللہ کی بیٹیاں" اور "اللہ کے بیٹے" نام رکھتے تھے۔ پس وہ سختی کے ساتھ اس سے روکے گئے۔ اور ہم اس کو راز پہلے بیان کر چکے ہیں۔

نوٹ: کانوا یستعینون مخطوطہ کراچی میں کانوا یستعینونا اور بل ھو الاستعانۃ بل ھو الاستعانۃ ہے۔

④ علماء و مشائخ کو تحلیل و تحریم کا اختیار دینا

یہود و نصاریٰ اللہ کو چھوڑ کر اپنے علماء و مشائخ کو رب بنائے ہوئے تھے۔ اَحبار، حَبر کی جمع ہے۔ جس کے معنی ہیں "بڑا عالم"۔ یہ یہود کی اصطلاح ہے۔ ان میں زہد و درویشی کا رواج نہیں ہے ان کے عوام پر علماء کا قبضہ ہے اور رُہبان، راہب کی جمع ہے جس کے معنی ہیں عابد و زاہد۔ یہ عیسائیوں کی اصطلاح ہے۔ ان کے یہاں بزرگی اور ترک دنیا کو بہت اہمیت حاصل ہے اور ان کے عوام پر مشائخ کا قبضہ ہے۔ غرض یہود اپنے علماء کی اور عیسائی اپنے بزرگوں کی تحلیل و تحریم کے باب میں اللہ کی اطاعت کی طرح اطاعت کرتے ہیں یعنی ان کا یہ عقیدہ ہے کہ جو چیز یہ لوگ حلال یا حرام کر دیں وہ نفس الامر میں بھی حلال یا حرام ہو جاتی ہے۔ پس اس حلال کے کرنے میں کوئی حرج نہیں اور حرام کے ارتکاب پر مؤاخذہ ہوگا۔ ظاہر ہے ایسی اطاعت صریح عبادت ہے اور یہی ان کو رب بنانا ہے۔

حضرت عدی رضی اللہ عنہ جو پہلے عیسائی تھے جب اسلام لائے تو انھوں نے سورۃ التوبہ کی آیت ۳۱ کے بارے میں اپنا

تھا جان خدمت نبوی میں پیش کیا کہ یہود و نصاریٰ اپنے علماء و مشائخ کی عبادت نہیں کرتے ہیں، پھر ان کو رب بنانے کا کیا مطلب ہے؟ آپ نے دریافت کیا: کیا ان کے علماء و مشائخ جن چیزوں کو حلال یا حرام ٹھہراتے ہیں ان کو وہ لوگ حلال یا حرام نہیں سمجھتے؟ حضرت عدیؓ نے کہا: ہاں ایسا تو وہ سمجھتے ہیں! آپ نے فرمایا: یہی ان کو رب قرار دینا ہے (ترمذی ۱۳۲۲)

غیر اللہ کو تحلیل و تحریم کا اختیار دینا شرک کیوں ہے؟ اللہ کے سوا کسی کو تحلیل و تحریم کا اختیار دینا شرک اس لئے ہے کہ حلال و حرام ہونے کے معنی ہیں: عالم ملکوت (حظیرۃ القدس) میں نافذ ہونے والا اللہ کا تکوینی حکم کہ فلاں کام کرنے پر مؤاخذہ نہ ہوگا۔ کیونکہ وہ حلال ہے اور فلاں کام کے کرنے پر مؤاخذہ ہوگا کیونکہ وہ حرام ہے۔ اور تکوینی حکم صرف اللہ تعالیٰ کا ہوتا ہے اور اس کی اطاعت ضروری ہوتی ہے۔ اب اگر احکام دینے کا اختیار غیر اللہ کے لئے مان لیا جائے تو یہ صفت تکوین میں اشتراک ہے۔ اور اشتراک فی التکوین اشتراک فی العبادۃ کو مستلزم ہے، اس لئے ممنوع ہے۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ساری کائنات پیدا کر کے اس کو تکوینی احکام دے رکھے ہیں۔ سورۃ الاعراف آیت ۵۴ میں ہے:

"بیشک تمہارا رب اللہ ہی ہے، جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں پیدا کیا۔ پھر عرش پر قائم ہوا۔ وہ رات سے دن کو ڈھانکتا ہے۔ دن رات کو جلدی سے آلیتا ہے۔ اور پیدا کیا سورج، چاند اور ستاروں کو، جو اس کے حکم کے تابعدار ہیں۔ سنو! اسی کا کام ہے پیدا کرنا اور حکم دینا ﴿أَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْأَمْرُ﴾ اللہ بڑی برکت والے ہیں جو تمام عالم کے پروردگار ہیں!"

خلق کے معنی ہیں پیدا کرنا۔ اور پیدا کرنے کے بعد تکوینی احکام دینا امر ہے۔ یہ دونوں باتیں اسی کے قبضہ و اختیار میں ہیں۔ پس وہی ساری خوبیوں اور برکتوں کا سرچشمہ ہے۔ اور تمام کائنات کو جس طرح اللہ تعالیٰ نے تکوینی احکام دے رکھے ہیں، انسانوں کے لئے احکام بھی تکوینی طور پر پہلے عالم ملکوت میں یعنی ملأ اعلیٰ میں طے ہوتے ہیں۔ پھر جب وہ احکام انبیاء پر نازل ہوتے ہیں تو تشریعی احکام کہلاتے ہیں۔ پس مؤاخذہ اور عدم مؤاخذہ کا اصل سبب تکوینی حکم ہے۔ اور یہ امر یعنی تکوینی حکم دینا صرف اللہ تعالیٰ کا اختیار ہے۔ اب اگر یہ اختیار غیر اللہ کو دیدیا جائے تو یہ شرک فی الصفت ہے۔ جس کے نتیجے میں عبادت میں اس غیر اللہ کو شریک کرنا لازم ہے۔ اس لئے ایسا اختیار غیر اللہ کے لئے تسلیم کرنا حرام ہے۔

سوال: قرآن کریم میں اور بہت سی احادیث میں رسول اللہ ﷺ کی طرف تحلیل و تحریم کی نسبت کی گئی ہے۔ جیسے سورۃ الاعراف آیت ۱۵۷ میں ہے: ﴿يُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ﴾ (وہ نبی اُمی پاکیزہ چیزیں لوگوں کے لئے حلال کرتے ہیں اور گندی چیزیں ان پر حرام کرتے ہیں) جب تحلیل و تحریم کا حق اللہ ہی کا ہے تو یہ نسبت کیوں؟

جواب: یہ نسبت مجازی ہے۔ چونکہ رسول اللہ اور بندوں کے درمیان واسطہ ہوتے ہیں اس لئے علاقۂ توسط کی وجہ سے نسبت کی جاتی ہے۔ تحلیل و تحریم درحقیقت اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہوتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد اس کی خبر اور قطعی علامت ہوتا ہے۔ مسند دارمی کے مقدمہ میں روایت ہے کہ حضرت جبرئیل جس طرح کتاب اللہ لے کر

آتے تھے، احادیث کی وحی بھی لے کر آتے تھے (دارمی ۱: ۱۴۵ باب السنۃ قاضیۃ علی کتاب اللہ)

تیسرا سوال مجتہدین کے تعلق سے پیدا ہوتا ہے کہ مسائل کی جوان کی طرف نسبتیں کی جاتی ہیں وہ کیسی ہیں؟ تشریع (قانون سازی) کا حق تو صرف اللہ تعالیٰ کو ہے، پھر ان کا کام کیا ہے؟

اس کا جواب بھی یہی ہے کہ یہ نسبت بھی مجازی ہے۔ چونکہ مجتہدین مسائل شرعیہ کے ناقل ہیں، اس لئے ان کی طرف نسبت کی جاتی ہے۔ اور نقل کرنا عام ہے خواہ نص صریح سے وہ مسئلہ بیان کریں یا کسی نص سے مستنبط کرکے بیان کریں۔ دونوں باتیں یکساں ہیں۔ وہ بہر صورت راوی ہیں یعنی وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مسئلہ بتلاتے ہیں، اپنی طرف سے نہیں بتلاتے۔ علامہ ابن القیم حنبلی رحمہ اللہ نے ایک قیمتی کتاب اصول اجتہاد و فتاویٰ میں لکھی ہے۔ اس کا نام إعلام الموقعین عن رب العالمین ہے موقع اسم فاعل ہے توقیع سے، جس کے معنی ہیں دستخط کرنا۔ پس کتاب کے نام کا مطلب ہے: جو لوگ اللہ تعالیٰ کی طرف سے دستخط کرنے والے ہیں ان کو ضروری باتوں سے باخبر کرنا یعنی مجتہدین علماء اور مفتیان کرام جو کچھ کہتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کہتے ہیں۔ اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتے۔

فائدہ:

ہندوستان کی ایک جماعت اپنے استناد کے لئے حضرت شاہ صاحب قدس سرہ کو ”غیر مقلد“ بتلاتی ہے، مگر شاہ صاحب کی اس بحث سے واضح ہوتا ہے کہ آپ غیر مقلد (اہل حدیث) نہیں تھے، بلکہ مقلد تھے۔ کیونکہ غیر مقلدین تو اِتَّخَذُوا أَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ سے تقلید کی تردید کرتے ہیں اور اس کو شرک بتاتے ہیں۔ اور شاہ صاحب مجتہدین کی طرف سے دفاع کررہے ہیں۔ اشکال کا جواب دے رہے ہیں اور یہ کام وہی کرسکتا ہے جو مجتہدین کرام کو برحق سمجھتا ہو اور ان کا معتقد ہو۔ منکر تقلید کو مجتہدین کی طرف سے دفاع کرنے کی کیا ضرورت ہے؟!

شریعت کی بعض باتوں سے اِبا بھی شرک کے زمرہ میں آتا ہے

جب اللہ تعالیٰ کسی رسول کو مبعوث فرماتے ہیں اور اس کی رسالت معجزات سے مؤید ہو جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ اس کے ذریعہ بعض وہ چیزیں حلال کرتے ہیں جو قدیم ملت میں حرام تھیں، جیسے یہودی ملت میں بار کا دن معظم تھا یا اونٹ کا دودھ اور گوشت حرام تھا۔ پھر عیسیٰ علیہ السلام کا دور آیا اور بار کی جگہ اتوار کی حرمت آئی اور بار کی تعظیم ختم ہوگئی پھر خاتم النبیین ﷺ کا دور آیا تو جمعہ محترم قرار پایا اور اونٹ کا دودھ اور گوشت حلال قرار دیا گیا۔ اب اگر کوئی یہودی یا عیسائی مسلمان ہوتا ہے مگر اس کا دل بار یا اتوار کی تعظیم کی طرف مائل رہتا ہے یا وہ اب بھی اونٹ کا دودھ یا گوشت استعمال نہیں کرتا تو یہ بات دو وجہ سے ہو سکتی ہے:

۱- اس کو نئی شریعت کے ثبوت میں تردد ہے تو یہ نئے نبی کا انکار ہے پس وہ مسلمان نہیں۔

۲- ان کا یہ عقیدہ ہے کہ تحریم اول ناقابل نسخ ہے۔ کیونکہ سابق پیغمبر کو اللہ تعالیٰ نے الوہیت کی پوشاک پہنائی ہے۔ یا وہ فانی فی اللہ، باقی باللہ ہے۔ اس لئے اس نے جن چیزوں کو حرام یا مکروہ قرار دیا ہے، اگر ان کا ارتکاب کیا جائے گا تو وہ ناراض ہو جائے گا، مال یا نسل میں آفت آئے گی تو یہ عقیدہ شرک ہے، جو غیر اللہ کے لئے اللہ جیسی ناراضی اور غضب اور اللہ جیسی تحلیل و تحریم کا اختیار ثابت کرتا ہے، پس یہ چیز بھی شرک کے زمرہ میں آتی ہے۔

فائدہ:

بعض ہندو مسلمان ہوتے ہیں اور اسلام قبول کرنے کے بعد بھی گائے کا گوشت کھانے سے پرہیز کرتے ہیں۔ اگر یہ انکار مذکورہ وجوہ سے ہے تو اس کا حکم گذر چکا۔ اور اگر محض طبعی نفرت ہے، کیونکہ انھوں نے زندگی بھر گائے کا گوشت نہیں کھایا اس لئے اب جی نہیں چاہتا تو یہ کوئی اچھی بات نہیں۔ ان کو بہ تکلف اپنی طبیعت بدلنی چاہئے۔ اور اسلام میں پورا پورا داخل ہو جانا چاہئے۔ اسی سلسلہ میں سورۃ البقرۃ کی آیت ۲۰۸ نازل ہوئی ہے۔ ارشاد ہے:

"اے ایمان والو! اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ اور شیطان کے قدم بقدم مت چلو، واقعی وہ تمہارا کھلا دشمن ہے"

یعنی ظاہر و باطن اور عقیدہ و عمل میں صرف احکام اسلام کا اتباع کرو، رسوم و بدعات اور خواہشات نفس کی پیروی مت کرو۔ اور مسلمان ہونے کے بعد بھی گائے کے گوشت سے اجتناب خواہش نفس کی پیروی ہے۔

ومنها: أنهم كانوا يتخذون أحبارهم ورهبانهم أربابا من دون الله تعالى، بمعنى أنهم كانوا يعتقدون أن ما أحله هؤلاء حلال، لا بأس به في نفس الأمر، وأن ما حرمه هؤلاء حرام، يؤاخذون به في نفس الأمر؛ ولما نزل قوله تعالى: ﴿اتَّخَذُوا أَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ﴾ الآية، سأل عدي بن حاتم رسول الله صلى الله عليه وسلم عن ذلك، فقال: ﴿كانوا يُحِلُّون لهم أشياء، فيستحلونها، ويحرِّمون عليهم أشياء، فيحرمونها﴾

وسر ذلك: أن التحليل والتحريم عبارة عن تكوين نافذ في الملكوت: أن الشيء الفلاني يؤاخذ به أو لا يؤاخذ به، فيكون هذا التكوين سببا للمؤاخذة وتركها، وهذا من صفات الله تعالى.

وأما نسبة التحليل والتحريم إلى النبي صلى الله عليه وسلم، فبمعنى أن قوله أمارة قطعية لتحليل الله وتحريمه؛ وأما نسبتها إلى المجتهدين من أمته، فبمعنى روايتهم ذلك عن الشرع: من نص الشارع، أو استنباط معنىً من كلامه.

واعلم: أن الله تعالى إذا بعث رسولا، وثبت رسالته بالمعجزة، وأحل على لسانه بعض

ما كان حراماً عندهم، ووجد بعض الناس في نفسه انجماعاً عنه، وبقي في نفسه ميل إلى حرمته، لما وجد في ملته من تحريمه، فهذا على وجهين:

[۱] إن كان لتردد في ثبوت هذه الشريعة فهو كافر بالنبي.

[۲] وإن كان لاعتقاد وقوع التحريم الأول تحريماً لايحتمل النسخ، لأجل أنه تبارك وتعالى خالع على عبد خلعة الألوهية، أو صار فانيا في الله، باقيا به، فصار تهيُّه عن فعل أو كراهيته له، مستوجبا للحرج في ماله وأهله، فذلك مشرك بالله تعالى، مثبت لغيره غضبا وسُخطا مقدِّسين، وتحليلاً وتحريماً مقدَّسين

ترجمہ: اور ان صورتوں میں سے ایک یہ ہے کہ لوگ اپنے علماء وزہاد کو اللہ کو چھوڑ کر رب (خدا) بنا تے تھے یعنی وہ لوگ یہ اعتقاد رکھتے تھے کہ جو چیز ان لوگوں نے حلال کی ہے وہ حلال ہے۔ اس کے کرنے میں نفس الامر (واقعہ) میں کوئی گرفت نہیں اور یہ کہ ان لوگوں نے جو چیز حرام کی ہے وہ حرام ہے۔ اس کی وجہ سے نفس الامر میں پکڑے جائیں گے۔ اور جب یہ ارشاد نازل ہوا کہ: ”انھوں نے اپنے علماء ومشائخ کو رب بنایا“ — تا آیت تک پڑھئے تو حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے اس بارے میں دریافت کیا تو آپ نے فرمایا: ”وہ لوگ ان کیلئے کچھ چیزوں کو حلال کرتے تھے پس وہ ان کو حلال سمجھتے تھے۔ اور کچھ چیزوں کو ان پر حرام کرتے تھے پس وہ ان کو حرام سمجھتے تھے“

اور اس کا راز یہ ہے کہ تحلیل وتحریم نام ہے عالم ملکوت میں نافذ ہونے والے تکوینی حکم کا کہ فلاں چیز کی وجہ سے مؤاخذہ ہوگا یا فلاں چیز کی وجہ سے مؤاخذہ نہیں ہوگا۔ پس یہ تکوینی حکم مؤاخذہ اور ترک مؤاخذہ کا سبب ہوتا ہے (کیونکہ اسی تکوینی حکم کے مطابق دنیا میں تشریعی حکم نازل ہوتا ہے) اور یہ (تکوینی حکم دینا) اللہ کی صفت ہے۔

اور رہی تحلیل وتحریم کی نسبت آنحضور ﷺ کی طرف تو اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ کا ارشاد ایک قطعی علامت ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے تحلیل وتحریم کی۔ اور رہی اس کی نسبت آپ کی امت کے مجتہدین کی طرف تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ حضرات ان مسائل کے شریعت کی طرف سے ناقل ہیں۔ خواہ شارع کی نص سے بیان کریں یا شارع کے کلام سے کوئی معنی مستنبط کرکے بیان کریں۔

اور جان لیں کہ جب اللہ تعالیٰ کسی رسول کو مبعوث فرماتے ہیں اور اس کی رسالت معجزے سے ثابت ہو جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ اس کی زبان سے بعض وہ چیزیں حلال کرتے ہیں جو ان کے نزدیک (قدیم ملت) میں حرام تھیں۔ اور بعض لوگ اپنے دل میں اس سے انقباض پاتے ہیں۔ اور ان کے دل میں اس کی حرمت کی طرف میلان باقی رہتا ہے اس وجہ سے کہ اس نے اپنی ملت میں اس کی حرمت پائی ہے تو اس کی دو صورتیں ہوتی ہیں:

۱- اگر یہ بات اس لئے ہے کہ اس (نئی) شریعت کے ثبوت میں اسے تردد ہے تو وہ اس (نئے) نبی کا منکر ہے۔

۴- اور آخر دو باب اس لئے ہے کہ اس کا اعتقاد یہ ہے کہ تحریم اول کا وقوع اتنی تحریم ہے جو منع کا احتمال نہیں رکھتی، اس وجہ سے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی بندے کو الوہیت کی پوشاک پہنادی ہے یا وہ اللہ میں فنا ہو گیا ہے اس کے ساتھ باقی رہنے والا ہے۔ پس اس کا کسی امر کی نفی کرنا یا اس کا کسی چیز کو ناپسند کرنا لازم کرنے والا ہے مال، و آل میں نقصان کو تو وہ شخص اللہ کے ساتھ شریک ٹھہرانے والا ہے۔ غیر اللہ کے لئے اللہ جیسا قصد اور اللہ جیسی ناراضگی اور اللہ جیسا تحلیل کا اور اللہ جیسا تحریم کا اختیار ثابت کرنے والا ہے۔

لغات: اِنْجَحَمَ (تقدیم الجیم) اور انحجم (تقدیم الحاء) عن الشیء: کف و نکص وامتنع: رکنا، باز رہنا، انکار کرنا۔ استوجب الشیء: واجب و لازم جاننا۔ الحرم: النقصان

☆ ☆ ☆

⑤ غیر اللہ کے لئے جانور ذبح کرنا

یہ بھی شرک کا ایک سانچا ہے، جس میں شرک ڈھل کر تیار ہوتا ہے۔ اسلام سے پہلے مشرکین بتوں اور ستاروں کا قرب حاصل کرنے کے لئے ان کے نام پر جانور ذبح کیا کرتے تھے۔ اور اس کی دو صورتیں ہوتی تھیں:

(۱) ذبح کے وقت غیر اللہ کا نام لیتے تھے، جیسے ہندو "کالی ماتا" کہہ کر بکرے کا جھٹکا کرتے ہیں۔

(۲) معبودانِ باطل کی پرستش گاہوں (آستانوں) پر جانور لے جا کر ذبح کرتے تھے۔

قرآن کریم میں دونوں صورتوں کی ممانعت فرمائی گئی ہے۔ پہلی صورت کی ممانعت قرآن کریم میں چار جگہ آئی ہے ارشاد ہے: "جس جانور پر اللہ کے سوا کسی اور کا نام پکارا جائے وہ حرام ہے" (سورۃ البقرۃ آیت ۱۷۳، المائدہ ۳، الانعام ۱۴۵، النحل ۱۱۵) اور دوسری صورت کی ممانعت سورۃ المائدہ آیت چار میں آئی ہے، ارشاد ہے: "جو جانور پرستش گاہوں پر ذبح کیا جائے وہ حرام ہے" ﴿وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ﴾

⑥ غیر اللہ کے نام پر جانور چھوڑنا

کسی جانور کا کان کاٹ کر یا کوئی دوسری علامت لگا کر غیر اللہ کی تعظیم اور تقرب حاصل کرنے کے لئے چھوڑ دینے کا بھی مشرکین میں رواج تھا۔ پھر وہ نہ اس سے کام لیتے تھے، نہ ذبح کرتے تھے، نہ اس سے اور کوئی فائدہ اٹھاتے تھے۔ یہ فعل بھی حرام ہے اور اس سلسلہ میں سورۃ المائدہ کی آیت ۱۰۳ نازل ہوئی ہے، ارشاد ہے:

"اللہ تعالیٰ نے نہ بحیرہ کو مشروع کیا ہے اور نہ سائبہ کو، اور نہ وصیلہ کو، اور نہ حامی کو، لیکن جو لوگ کافر ہیں وہ اللہ تعالیٰ پر جھوٹ لگاتے ہیں (کہ خدا تعالیٰ نے جانور چھوڑنے کا حکم دیا ہے اور وہ اس سے خوش ہوتے ہیں) اور

انکو کاٹ کر قتل نہیں رکھتے (بلکہ بزرگوں کی دیکھا دیکھی ایسی جہالتیں کرتے ہیں)"

مذکورہ جانوروں کی تفسیر میں مفسرین میں اختلاف ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے حضرت سعید بن المسیب رحمہ اللہ سے جو تفسیر نقل کی ہے وہ یہ ہے:

بحیرہ: وہ جانور ہے جس کا دودھ بتوں کے نام پر وقف کر دیا جاتا تھا، اس کو کوئی اپنے کام میں نہیں لاتا تھا۔

سائبہ: وہ جانور ہے جس کو بتوں کے نام پر چھوڑ دیا جاتا تھا۔ جیسے ہندو سانڈ کو چھوڑ دیتے ہیں۔

وصیلہ: وہ اونٹنی ہے جو مسلسل مادہ بچے جنے اور درمیان میں نر بچہ پیدا نہ ہو تو اسے بھی بتوں کے نام پر چھوڑ دیتے تھے۔

حامی: وہ نر اونٹ ہے جو ایک خاص عدد تک جفتی کر چکا ہو اسے بھی بتوں کے نام پر چھوڑ دیتے تھے۔

مسئلہ: بتوں یا بزرگوں کے نام پر اس طرح جانور چھوڑنا حرام اور مشرکانہ رسم ہے۔ بہ نص قرآنی حرام ہے۔ مگر اس حرام عمل سے جانور حرام نہیں ہوتا۔ بلکہ عام جانوروں کی طرح حلال رہتا ہے۔ اور یہ جانور اپنے مالک کی ملک سے خارج بھی نہیں ہوتا۔ پس اگر وہ شخص خود اس جانور کو کسی کے ہاتھ فروخت کر دے یا ہبہ کر دے تو خریدار کے لئے یہ جانور حلال ہے اور اس کی قربانی بھی درست ہے۔ اسی طرح اگر مالک نے مندر کے پجاریوں کو یا قبر کے مجاوروں کو اختیار دے دیا ہو کہ وہ جو چاہیں کریں۔ اور یہ پجاری اور مجاور اس کو کسی کے ہاتھ فروخت کر دیں تو یہ بھی حلال ہے (معارف القرآن ۲۴۴:۳)

⑦ غیر اللہ کی قسم کھانا

لوگ بعض انسانوں کے بارے میں یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ ان کے نام بابرکت اور محترم ہیں اور ان کے ناموں کی جھوٹی قسم کھانا مال اور آل میں نقصان کا باعث ہے۔ اس لئے وہ اس کی کبھی ہمت نہیں کرتے اور نزاعات اور جھگڑوں کے موقعوں میں مخالف کو ان کے ناموں کی قسم کھلایا کرتے ہیں۔ یہ بھی حرام عمل ہے: احادیث میں اس سے روکا گیا ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ: "جس نے غیر اللہ کی قسم کھائی اس نے (مقسوم بہ کو) خدا کے ساتھ (تعظیم میں) ساجھی بنایا" (رواہ الترمذی، مشکوٰۃ، کتاب الایمان والنذور حدیث نمبر ۳۴۱۹) امام ترمذی رحمہ اللہ نے بعض اہل علم کا قول نقل کیا ہے کہ یہ حدیث تغلیظ وتہدید پر محمول ہے یعنی غیر اللہ کی قسم کھانا گناہ کبیرہ ہے، ارتداد نہیں ہے (ترمذی: ۱۱۹۵ ابواب الایمان والنذور، باب فی کراھیۃ الحلف بغیر اللہ)

شاہ صاحب رحمہ اللہ کی رائے میں یہ محمل صحیح نہیں ہے بلکہ مراد حدیث یہ ہے کہ مذکورہ عقیدہ سے غیر اللہ کی قسم کھائی جائے، خواہ یمین منعقدہ ہو یا یمین غموس۔ ظاہر ہے کہ مذکورہ عقیدہ سے ایسی قسم کھانا مشرکانہ عمل اور ارتداد ہے۔ اور یمین منعقدہ وہ قسم ہے جو آئندہ کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے پر کھائی جائے اور یمین غموس وہ قسم ہے جو گذشتہ کسی کام پر جان کر جھوٹی کھائی جائے۔ اور جو قسم روز مرہ کلام (تکیہ کلام) کے لئے کھائی جاتی ہے وہ یمین لغو ہے۔ جیسے واللہ (اس کے

باپ کی قسم) ولقرۃ عینی (میری آنکھوں کی ٹھنڈک کی قسم) یہ یمین لغو ہے جو حدیث میں مراد نہیں ہے۔

(۸) غیر اللہ کے آستانوں کا حج کرنا

خود ساختہ معبودوں کی لوگوں کے گمان کے مطابق مخصوص متبرک جگہوں کی یا نبیوں اور نیکوں کی قبروں اور آثار کی زیارت کے لئے جانا اور اس کو موجب تقرب سمجھنا بھی شرک کا مظہر ہے۔ جیسے لوگ اجمیر وغیرہ جاتے ہیں اور اس کو باعث اجر سمجھتے ہیں۔ اور جہلاء کا یہ اعتقاد ہے کہ سات بار اجمیر کا سفر حج کے برابر ہے۔ یہ مشرکانہ خیالات ہیں اس لئے لوگوں کو اس سے روکا گیا ہے۔ متفق علیہ حدیث میں ہے کہ:

"اونٹ پر کجاوے نہ کسے جائیں (یعنی دور کا سفر نہ کیا جائے) مگر تین مسجدوں کی طرف: مسجد حرام، مسجد اقصیٰ اور میری یہ مسجد (یعنی مسجد نبوی) (مشکوۃ باب المساجد حدیث نمبر ۶۹۳)

فائدہ:

یہ حدیث مساجد کے تعلق سے ہے۔ مسند احمد میں مستثنیٰ مذکور ہے اور وہ یہ ہے لاینبغی للمطی ان تشد رحاله الی مسجد یبتغی فیه الصلاة، غیر الخ (مجمع الزوائد ۴:۳) مگر اشتراک علت کی وجہ سے قبور وغیرہ کے حج زیارت کو بھی شامل ہے۔ البتہ قبر کی زیارت کو ضمنی مقصد بنانا جائز ہے۔ مثلاً کوئی شخص اجمیر یا اس کے قریب اپنی کسی ضرورت سے گیا اور نیت یہ ہے کہ حضرت چشتی رحمہ اللہ کی قبر پر فاتحہ یعنی ایصال ثواب کے لئے بھی جائے گا تو یہ جائز ہے۔ مستقل مقصد بنا کر دور دراز سے جانا جائز نہیں۔ یہی حکم تمام اولیاء اور انبیاء کی قبور کا ہے۔ اور سید الانبیاء ﷺ کی قبر اطہر چونکہ مسجد نبوی میں ہے اس لئے اس کی زیارت کی مستقل نیت نہیں ہو سکتی۔ اس لئے مسئلہ میں نزاع بلا وجہ ہے واللہ اعلم۔

فائدہ:

تجارتی اسفار، عزیز و اقارب سے ملنے کے لئے سفر، تاریخی یا مشہور مقامات و عبرت کے لئے دیکھنے کے لئے سفر ممنوع نہیں۔ وہ بالاجماع اس حدیث کا مصداق نہیں۔

(۹) غیر اللہ کی طرف بندگی کی نسبت کرنا

لوگ اپنے بیٹوں کے ناموں میں غیر اللہ کی طرف عبدیت کی نسبت کیا کرتے تھے اور عبد العزیٰ، عبد الشمس، عبد المطلب وغیرہ نام رکھا کرتے تھے۔ یہ بھی شرک کا سانچا ہے۔ اس سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ بچہ اللہ تعالیٰ کے بجائے ان بتوں یا ان بزرگوں کا بخشا ہوا ہے۔ اس لئے قرآن و حدیث میں اس کی ممانعت آئی ہے۔ سورۃ المائدہ آیات ۱۸۹ و ۱۹۰ میں عقیدۂ توحید کا ذکر ہے، جو اسلام کا بنیادی عقیدہ ہے، اور اس کے ساتھ شرک کے باطل اور نامعقول ہونے کا بیان

ہے قال: كان هذا في بعض أهل الملل، ولم يكن بآدم (ابن کثیر)

(۵) علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ نے ان روایات کو قطعی طور پر اسرائیلی قرار دیا ہے۔ اور اس پر مفصل کلام کیا ہے۔

(۶) شرعاً اور عقلاً یہ بات ممکن نہیں کہ کوئی نبی شرک کا ارتکاب کرے: چوں کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی؟! اور روایت میں یہ صراحت ہے کہ آدم و حوا علیہما السلام نے مل کر یہ نام رکھا تھا (الدر المنثور ۳: ۱۵۱) غرض یہ روایت عصمت انبیاء کے بنیادی عقیدہ کے خلاف ہے اس لئے مردود ہے (فائدہ ختم ہوا)

اور بے شمار احادیث سے یہ بات ثابت ہے کہ جن صحابہ کے نام عبد العزیٰ، عبد الشمس وغیرہ تھے، مسلمان ہونے کے بعد رسول اللہ ﷺ نے ان کے نام بدل کر عبد اللہ، عبد الرحمٰن اور ان سے ملتے جلتے نام رکھ دیے تھے۔

فائدہ:

جن لوگوں کے نام عبد النبی، عبد الرسول، غلام محمد، غلام نبی، غلام رسول، نبی بخش، رسول بخش وغیرہ ہیں، ان کو اپنے نام بدل دینے چاہئیں اور اس تاویل کا سہارا نہیں لینا چاہئے کہ غلام بمعنی خادم ہے۔ اللہ کے رسول دنیا میں موجود ہوتے تو ان کا کوئی خادم ہوتا، مگر جب آپ کی وفات ہوگئی تو اب کوئی خادم کیسے ہو سکتا ہے؟! یہ تاویل عذر گناہ بدتر از گناہ کی مثال ہے۔ اللہ تعالیٰ توفیق عطا فرمائیں (آمین)

دلیل عقلی: اور غیر اللہ کی طرف عبدیت کی نسبت کے غلط اور باطل ہونے کی عقلی دلیل یہ ہے کہ ساری کائنات بشمول انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام اللہ کے بندے ہیں۔ سرور عالم ﷺ کے لئے قرآن کریم میں جگہ جگہ عبد (بندہ) ہونے کی صراحت موجود ہے، پھر عبد کا عبد (بندے کا بندہ) کیسے ہو سکتا ہے؟!

ومنها: أنهم كانوا يتقربون إلى الأصنام والنجوم بالذبح لأجلهم: إما بالإهلال عند الذبح بأسمائهم، وإما بالذبح على الأنصاب المخصوصة لهم، فنهوا عن ذلك.

ومنها: أنهم كانوا يُسَيِّبُوْن السوائب والبحائر تقربا إلى شركائهم، فقال الله تعالى: ﴿مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنْ بَحِيْرَةٍ وَّلَا سَائِبَةٍ﴾ الآية.

ومنها: أنهم كانوا يعتقدون في أناس: أن أسماءهم مباركة معظمة، وكانوا يعتقدون أن الحلف بأسمائهم على الكذب يستوجب حرمًا في ماله وأهله، فلا يُقْدِمون على ذلك، ولذلك كانوا يستحلفون الخصوم بأسماء الشركاء بزعمهم، فنُهوا عن ذلك، وقال النبي صلى الله عليه وسلم: ﴿من حلف بغير الله فقد أشرك﴾ وقد فسره بعض المحدثين على معنى التغليظ والتهديد، ولا أقول بذلك، وإنما المراد عندي: اليمينُ المنعقدة واليمينُ الغموس باسم غير

اللہ تعالی باعتقاد ما ذکرنا.

ومنها: الحج لغير الله تعالى، وذلك أن يقصد مواضع متبركة مختصة بشركائهم، يكون الحلول بها تقربا من هؤلاء، فنهى الشرع عن ذلك، وقال النبي صلى الله عليه وسلم: ﴿لا تشد الرحال إلا إلى ثلاثة مساجد﴾

ومنها: أنهم كانوا يسمون أبناءهم عبد العزى وعبد الشمس، ونحو ذلك، فقال الله تعالى: ﴿هو الذي خلقكم من نفس واحدة، وجعل منها زوجها، ليسكن إليها، فلما تغشاها﴾ الآية، وجاء في الحديث: أن حواء سمت ولدها عبد الحارث، وكان ذلك من وحي الشيطان. وقد ثبت في أحاديث لا تحصى: أن النبي صلى الله عليه وسلم غيّر أسماء أصحابه عبد العزى، وعبد الشمس، ونحوهما إلى عبد الله، وعبد الرحمن، وما أشبههما، فهذه أشباح وقوالب للشرك، نهى الشارع عنها، لكونها قوالب له، والله أعلم.

ترجمہ: اور ان صورتوں میں سے یہ ہے کہ لوگ بتوں اور ستاروں کی قربت ڈھونڈھا کرتے تھے ان کے نام پر جانور ذبح کرکے، یا تو ذبح کے وقت ان کے نام با آواز بلند پکارتے تھے یا ان جانوروں کو ان بتوں اور ستاروں کے مخصوص آستانوں پر لے جا کر ذبح کرتے تھے۔ پس لوگوں کو ایسا کرنے سے روک دیا گیا۔

اور ان صورتوں میں سے یہ ہے کہ لوگ اپنے خود ساختہ معبودوں کا تقرب حاصل کرنے کے لئے سائبہ وغیرہ کو چھوڑا کرتے تھے۔ پس اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "نہیں مشروع کیا اللہ نے کوئی بحیرہ، اور نہ کوئی سائبہ" آخر آیت تک۔

اور ان صورتوں میں سے یہ ہے کہ لوگ بعض انسانوں کے بارے میں اعتقاد رکھتے تھے کہ ان کے نام متبرک اور محترم ہیں اور وہ یہ بھی عقیدہ رکھتے تھے کہ ان کے ناموں کی جھوٹی قسم کھانا مال اور اہل میں نقصان کا باعث ہے، اس لئے وہ اس پر اقدام نہیں کرتے تھے۔ اور یہی سبب تھا کہ وہ خصومت کے موقعوں پر ان کے حسب گمان اللہ کے ان ساجھیوں کے ناموں کی فریق مخالف کو قسم کھلایا کرتے تھے۔ پس لوگوں کو اس سے منع کیا گیا۔ اور آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ: "جس نے غیر اللہ کی قسم کھائی اس نے خدا کے ساتھ شریک کیا" اور بعض محدثین نے حدیث کو تغلیظ وتہدید پر محمول کیا ہے، مگر میں اس کا قائل نہیں ہوں۔ میرے نزدیک حدیث کی مراد اس اعتقاد سے جو ہم نے ذکر کیا غیر اللہ کے نام کی یمین منعقدہ اور یمین غموس ہے۔

اور ان صورتوں میں سے غیر اللہ کا حج کرنا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ ان مقامات کا قصد کیا جائے جن کو لوگ اپنے خود ساختہ معبودوں کی مخصوص متبرک جگہیں تصور کرتے ہیں۔ ان جگہوں میں اترنا ان معبودوں کا تقرب ہوتا ہے۔ پس لوگ اس سے روک دیے گئے۔ اور نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ: "کجاوے نہ کسے جائیں مگر تین مسجدوں کی طرف"

اور ان صورتوں میں سے یہ ہے کہ لوگ اپنے بیٹوں کے نام عبد العزیٰ اور عبد الشمس اور اس کے مانند رکھا کرتے

تھے۔ پس اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "اللہ وہ ذات ہے جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا، اور اس ایک جان سے اس کا جوڑا بنایا تاکہ وہ اس کے پاس جا کر سکون حاصل کرے، پھر جب میاں نے بیوی سے قربت کی" آخر آیت تک۔ اور حدیث میں آیا ہے کہ حضرت حواء نے اپنے بچے کا نام عبدالحارث رکھا، اور یہ نام رکھنا شیطان کے اشارے سے تھا۔ اور بے شمار احادیث سے ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے صحابہ کے ناموں کو بدل دیا اور عبدالعزیٰ اور عبدالشمس اور ان کے مانند ناموں کی جگہ عبداللہ، عبدالرحمٰن اور ان سے ملتے جلتے نام رکھے۔

غرض یہ شرک کی صورتیں اور سانچے ہیں، شریعت نے ان سے اس لئے روکا ہے کہ شرک ان سانچوں میں ڈھل کر تیار ہوتا ہے، باقی اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں۔

باب — ۴

صفات الٰہیہ پر ایمان لانے کا بیان

صفت: وہ حالت ہے جو موصوف کے ساتھ قائم ہو اور جس سے موصوف کی پہچان ہو، جیسے قاضی، مفتی، سخی وغیرہ۔ پھر صفات کی دو قسمیں ہیں: ایک صفات حسنہ یعنی خوبیاں۔ یہ صفات کمالیہ کہلاتی ہیں۔ دوسری صفات قبیحہ یعنی برائیاں جیسے بزدلی، بخیلی وغیرہ۔

اس کے بعد جاننا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ ذات بحت (محض وجود) نہیں ہیں، جیسا کہ فرقہ معطلہ کہتا ہے۔ بلکہ وہ بے شمار خوبیوں اور کمالات کے ساتھ متصف ہیں اور تمام عیوب ونقائص سے منزہ ہیں۔ اول کا نام صفات کمالیہ اور صفات ثبوتیہ ہے یعنی یہ سب صفات اللہ تعالیٰ کے لئے کمالات کو ثابت کرتی ہیں، جیسے علیم (بہت جاننے والا) اور ثانی کا نام صفات سلبیہ ہے یعنی وہ نقائص اللہ تعالیٰ میں نہیں ہیں، جیسے اللہ تعالیٰ کی کوئی اولاد نہیں، وہ کسی کے باپ نہیں، اور نہ ان کے ماں باپ ہیں کیونکہ وہ جنے نہیں گئے، اور نہ کوئی ان کا ہمسر ہے۔

اس کے بعد جاننا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات پر ایمان لانا اور اللہ تعالیٰ کو صفات کمالیہ کے ساتھ متصف ماننا اعمال بر میں سب سے بڑی نیکی ہے۔ یہ ایمان ہی معرفت خداوندی کا ذریعہ ہے، اسی سے بندے اور خدا کے درمیان فیضان کا دروازہ کھلتا ہے۔ اور بندے پر اللہ کی عظمت وبزرگی منکشف ہوتی ہے۔ جیسے زید کو محض ایک وجود اور ایک شخص مانا جائے تو اس کا کیا حاصل؟ اس سے لوگوں کو کیا فیض پہنچے گا؟ البتہ جب اس کو خوش نویس، ادیب، عالم، فقیہ یا بزرگ جانیں گے تو لوگ اس سے خوش کتابت سیکھیں گے، ادب وزبان اندوزی کریں گے، علم وفقہ حاصل کریں گے یا کسب فیض کریں گے۔ خوبیوں کے ادراک کے بعد ہی استفادہ ہو سکتا ہے۔ اسی طرح جب بندہ اللہ تعالیٰ کو خوبیوں کے ساتھ متصف مانے گا تبھی فیضان کا دروازہ وا ہوگا۔ وہ اللہ کو رزاق تسلیم کرے گا تو اس سے روزی طلب کرے گا، وہ اس کو رحیم

بکریم مانے گا تو اس سے محروم رکھی نہیں جائے گی، جو اس کو اللہ کی صفات جلیلہ پر ایمان ہوگا تو وہ اس سے ڈرتا ہی زندگی گزارے گا، اور اگر کوئی کوتاہی ہوئی تو اس سے مغفرت کا طلب گار رہے گا۔ غرض انسان کی تربیت کا تمام تر تعلق صفات باری تعالیٰ کے ساتھ ہے، اسی لئے صحیحین کی حدیث میں آیا ہے کہ "اللہ تعالیٰ کے ننانوے یعنی ایک کم سو نام ہیں، جو ان کو محفوظ کرے گا اور ان کی نگہداشت کرے گا وہ جنت میں جائے گا" نگہداشت کرنا یہ ہے کہ ان کو ہر وقت پیش نظر رکھے اور ان صفات کی خو بو (مقتضی کو) اپنے اندر پیدا کرے۔ حدیث شریف میں ہے کہ "مہربانی کرنے والوں پر رحمان مہربانی کرتے ہیں، تم زمین والوں پر مہربانی کرو، تم پر آسمان والا مہربانی کرے گا"

﴿ باب الإيمان بصفات الله تعالى ﴾

اعلم: أن من أعظم أنواع البر الإيمان بصفات الله تعالى، واعتقاد اتصافه بها، فإنه يفتح بابا بين هذا العبد وبينه تعالى، ويُعِدُّه لانكشاف ما هنالك من المجد والكبرياء.

ترجمہ: اللہ تعالیٰ کی صفات پر ایمان لانے کا بیان: جان لیں کہ نیکیوں کی اقسام میں سب سے بڑی نیکی اللہ تعالیٰ کی صفات پر ایمان لانا ہے اور خدا تعالیٰ کے صفات کے ساتھ متصف ہونے کا عقیدہ رکھنا ہے۔ پس بے شک یہ ایمان اس بندے کے درمیان اور اللہ تعالیٰ کے درمیان ایک دروازہ کھولتا ہے۔ اور بندے کو تیار کرتا ہے اس بزرگی اور عظمت کے انکشاف کے لئے جو وہاں ہے (یعنی اللہ تعالیٰ میں ہے)

تشریح: قوله: يفتح بابا أي باب الفيض والجود قوله ويعدّه أي يصير الإنسان به مستعدا لمعرفة ما في حضرة الملك من المجد والكبرياء، ولائقا لمشاهدة الأنوار الإلهية (سندی)

صفات کے باب میں دشواریاں اور ان کا حل

حق تعالیٰ کی ذات وصفات کے مسئلہ میں چار باتیں انتہائی الجھن کی ہیں:

(۱) حق تعالیٰ کی ذات وصفات کا کما حقہ ادراک ممکن نہیں، کیونکہ ان کا نہ تو کسی محسوس چیز سے اندازہ کیا جا سکتا ہے، اور نہ کسی معقول چیز سے قیاس لگایا جا سکتا ہے۔ ان کی شان عالی ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ﴾ (الشوریٰ ۱۱) ہے، نہ ذات میں ان کا کوئی مماثل ہے نہ صفات میں، وہ سمیع وبصیر بے شک ہے مگر اس کا دیکھنا سننا مخلوق کی طرح نہیں، کمالات اس کی ذات میں سب ہیں، مگر کوئی کمال ایسا نہیں جس کی کیفیت بیان کی جا سکے، کیونکہ اس کی نظیر کہیں موجود نہیں، وہ مخلوق کی مشابہت ومماثلت سے بالکلیہ پاک اور مقدس ومنزہ ہے، پھر اس کا قیاس واندازہ کیسے کیا جائے۔ انسان کے معقولات بھی تمام تر محسوسات سے مستفاد ہوتے ہیں۔ وہ محسوسات سے پوری طرح بندھا ہوکر

نہیں سوچ سکتا[1] غرض حق تعالیٰ کی ذات وصفات کے کما حقہ ادراک کی کوئی صورت نہیں۔

(۲) حق تعالیٰ کی صفات ان کی ذات کے ساتھ قائم ہیں، مگر وہ ذات میں اس طرح حلول کئے ہوئے نہیں ہیں جس طرح اعراض کا ان کے محل میں حلول ہوتا ہے حلول کے لئے احتیاج ضروری ہے یعنی اعراض اپنے وجود وقیام میں محل کے محتاج ہوتے ہیں، اعراض کا بذات خود کوئی وجود نہیں ہوتا۔ اور وہ بارگاہ بے نیاز احتیاج وافتقار سے منزہ ہے۔

(۳) عقل عام کی رسائی ذات وصفات تک نہیں ہے، دانائے شیراز نے کیسی پتے کی بات کہی ہے:

اے برتر از خیال و قیاس و گمان و وہم	وز ہر چہ گفتہ اند و شنیدیم و خواندہ ایم
دفتر تمام گشت و بہ پایاں رسید عمر	ما ہم چناں در اول وصف تو ماندہ ایم

(گلستان در دیباچہ)

ترجمہ: اے وہ ذات جو خیال، قیاس، گمان اور وہم سے بالاتر ہے اور ہر اس بات سے جو لوگوں نے کہی ہے اور ہم نے سنی ہے اور پڑھی ہے۔ کتاب زندگی ختم ہوگئی اور عمر نہایت کو پہنچ گئی ہم اسی طرح تیری تعریف کی ابتداء میں تھکے ماندے ہیں۔

یعنی ابھی تو تعریف کا ابتدائی حق بھی ادا نہیں ہوا آپ کی پوری تعریف ہم سے کہاں ممکن ہے؟! کیونکہ تعریف معرفت کو چاہتی ہے اور عقول انسانی ذات وصفات کی تہہ نہیں پاسکتے۔

(۴) ہماری لغت کے الفاظ اللہ کی ذات وصفات کو شامل نہیں ہیں۔ کیونکہ ہمارے الفاظ کا موضوع لہ وہ محسوسات ومعقولات ہیں جو ہمارے مشاہدے میں آتے ہیں یا ہماری عقل میں سماتے ہیں۔ اور اللہ کی ذات وصفات نہ تو ہمارے لئے محسوس ہیں نہ ان کی ہماری عقل میں سمائی ہے۔ پھر ہم ان کو موضوع لہ بنا کر الفاظ کیسے وضع کر سکتے ہیں؟ ہماری بول چال میں مستعمل الفاظ دوسرے ہی لئے ہیں یعنی وہ ہماری ذات وصفات کو شامل ہیں اللہ تعالیٰ کی صفات کی کما حقہ ان سے تعبیر ممکن نہیں۔ اور اگر نئے وضعی الفاظ سے صفات کو تعبیر کیا جائے تو وہ الفاظ ہمارے لئے ناقابل فہم ہو جائیں گے، اور وہ تعبیرات بے فائدہ ثابت ہوں گی۔

مگر مذکورہ دشواریوں کے باوجود لوگوں کو اللہ کی پہچان کرانا بھی ضروری ہے کیونکہ انسان کی تربیت کا تعلق صفات باری سے ہے جیسا کہ ابھی گذرا، انسان اپنے لئے ممکن کمالات معرفت الٰہی کے ذریعہ ہی حاصل کر سکتا ہے۔ اس لئے صفات باری تعالیٰ کے بیان میں پانچ قاعدے ملحوظ رکھنے ضروری ہیں:

پہلا قاعدہ: صفات باری تعالیٰ کے بیان کے لئے جو الفاظ استعمال کئے جائیں، وہ غایات پائے جانے کے معنی میں استعمال کئے جائیں، مبادی پائے جانے کے معنی میں استعمال نہ کئے جائیں۔ مثلاً لفظ رحمٰن "انعام فرمانے" کے معنی

[1] تفصیل کے لئے دیکھیں علم الکلام از علامہ شبلی نعمانی رحمہ اللہ (۱:۷۱) تحت عنوان وجود باری کا تصور کیوں مشکل ہے؟

میں لیا جائے "دل مڑنے اور پسیجنے" کے معنی میں نہ لی جائے۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ قرآن وحدیث میں جو الفاظ حق تعالیٰ کی صفات کو بیان کرنے کے لئے اختیار کئے جاتے ہیں، ان میں اکثر وہ ہیں جن کا مخلوق کی صفات پر بھی اطلاق ہوتا ہے۔ مثلاً خدا کو حیی (زندہ) سمیع (سننے والا) بصیر (دیکھنے والا) اور متکلم (کلام فرمانے والا) کہا گیا ہے۔ اور انسان کے لئے بھی یہی الفاظ استعمال کئے گئے ہیں، مگر دونوں جگہ استعمال کی حیثیت بالکل جداگانہ ہے۔ کسی مخلوق کو سمیع وبصیر کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے پاس دیکھنے والی آنکھ اور سننے والے کان موجود ہیں۔ اب اس میں دو چیزیں ہوگئیں: ایک وہ آلہ جسے "آنکھ" کہتے ہیں، اور جو دیکھنے کا مبدأ اور ذریعہ بنتا ہے۔ دوسرا اس کا نتیجہ اور غرض وغایت (دیکھنا) یعنی وہ خاص علم جو رویت بصری سے حاصل ہوتا ہے۔ مخلوق کو جب "بصیر" کہا جاتا ہے تو یہ مبدأ اور غایت دونوں چیزیں مراد ہوتی ہیں۔ لیکن یہی لفظ جب خدا کی نسبت استعمال کیا جائے گا تو وہ مبادی اور کیفیات جسمانیہ مراد نہیں لی جائیں گی جو مخلوق کے خواص میں سے ہیں اور جن سے خداوند قدوس قطعاً منزہ ہے۔ البتہ یہ اعتقاد ضروری ہے کہ بصارت (دیکھنے) کا مبدأ اس کی ذات میں موجود ہے اور اس کا نتیجہ یعنی وہ علم جو رویت بصری سے حاصل ہوتا ہے، اس کو بدرجۂ کمال حاصل ہے۔ آگے یہ کہ وہ مبدأ کیسا ہے؟ اور دیکھنے کی کیا کیفیت ہے؟ تو بجز اس بات کے کہ اس کا دیکھنا مخلوق کی طرح نہیں، ہم اور کیا کہہ سکتے ہیں؟! ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ﴾ اس کی شان اقدس ہے۔ اور نہ صرف سمیع وبصیر بلکہ اس کی تمام صفات کو اسی طرح سمجھنا چاہئے (ماخوذ از فوائد عثمانی در تفسیر سورۃ الاعراف آیت ۵۴) اب دو مثالیں ملاحظہ فرمائیں تاکہ یہ مضمون واضح ہوکر ذہن نشین ہوجائے:

پہلی مثال: لفظ رحمت جو صفت رحمان ورحیم کا ماخذ ہے، لغت میں اس کے معنی ہیں: "کسی پریشان حال اور مصیبت زدہ کو دیکھ کر دل کا پگھلا ہونا (پسیجنا) اور اس کی طرف مڑنا اور مائل ہونا اور دل میں مہربانی کا جذبہ ابھرنا اور اس پر تفضل واحسان اور مہر وانعام کرنا" اب یہاں دو چیزیں ہیں: ایک "دل" اور اس کی کیفیات: پگھلا ہونا، مڑنا، جذبہ کا ابھرنا۔ یہ مبدأ اور سبب ہیں دوسری انعام واحسان جو غایت ونتیجہ ہے۔ جب انسان کو رحیم ومہربان کہا جاتا ہے تو یہ مبدأ اور غایت دونوں مراد ہوتے ہیں۔ مگر جب اللہ تعالیٰ کو رحمان ورحیم کہا جاتا ہے تو صرف غایت یعنی انعام واحسان مراد لیا جاتا ہے۔ اور مبدأ کے وجود کا اعتقاد تو رکھا جاتا ہے مگر اس کی کیفیت کو اللہ کے حوالے کردیا جاتا ہے۔

دوسری مثال: استواء علی العرش میں عرش کے معنی تخت شاہی اور بلند مقام کے ہیں اور استواء کے معنی معتدل ویرابر اور سیدھا ہونے کے ہیں۔ اور جب کوئی تخت حکومت پر بیٹھتا ہے تو ملک کا سب کام اور نظم وانتظام کرتا ہے اور اقتدار ونفوذ وتصرف کو ذمکن ہوتا ہے۔ اب یہاں دو چیزیں ہیں: ایک تخت شاہی پر بیٹھنا یہ مبدأ اور سبب ہے دوسری نفوذ واقتدار وتصرف کا ممکن ہونا یہ نتیجہ اور غایت ہے۔ اب اگر یہ صفت کسی انسان کے لئے ثابت کی جائے گی تو وہاں مبدأ اور غایت دونوں مراد ہوں گے اور مبدأ کی کیفیت کا ادراک بھی ہم کرسکیں گے۔ مگر جب یہ صفت اللہ تعالیٰ کے لئے ثابت

کی جائے گی تو غایت پائے جانے کے معنی میں ہوگی یعنی آسمانوں پر اور زمین پر اقتدار اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے، وہی کائنات میں متصرف ہیں۔ رہا استواء تو اس کے وجود کا اعتقاد تو ضروری ہے مگر اس کی کیفیت کو نہ کوئی سمجھ سکتے ہیں نہ سمجھ سکتے ہیں پس اس کو اللہ تعالیٰ کے علم کے حوالے کر دیا جائے گا۔

دوسرا قاعدہ: تمام کائنات کے خالق و مالک اللہ تعالیٰ ہیں، موجودات کا ذرہ ذرہ ان کے تابع فرمان ہے۔ کوئی مخلوق ان کے حکم سے سرتابی کی طاقت نہیں رکھتی۔ اس مضمون کی ادائیگی کے لئے وہ تعبیرات مستعمل ہو گئی ہیں جو بادشاہ اپنی مملکت کو مسخر کرنے اور تابع فرمان بنانے کے لئے استعمال کرتے ہیں، کیونکہ اس سے زیادہ واضح دوسری تعبیرات نہیں ہیں۔ پس اللہ تعالیٰ کے لئے ملک (بادشاہی) حکم اور جود وغیرہ صفات ثابت کی جائیں۔

تیسرا قاعدہ: اللہ تعالیٰ کی صفات کے بیان میں تشبیہات دو شرطوں کے ساتھ استعمال کی جا سکتی ہیں

پہلی شرط: تشبیہ کے اصل لغوی معنی مراد نہ لئے جائیں، بلکہ وہ معنی مراد لئے جائیں جو عرف میں ان صفات کے مناسب ہوں، جیسے سورۃ المائدۃ آیت ۶۴ میں آیا ہے ﴿بَلْ يَدَاهُ مَبْسُوطَتَانِ﴾ (بلکہ ان کے دونوں ہاتھ کھلے ہوئے ہیں)۔ یہ جواب یہود کے اس مقولہ کا ہے ﴿يَدُ اللَّهِ مَغْلُولَةٌ﴾ (اللہ کا ہاتھ بند ہے) یعنی وہ بخیل ہے۔ اس لئے اس آیت میں بسط ید سے جود و سخاوت مراد لی جائے گی۔

دوسری شرط: ایسی تشبیہ استعمال نہ کی جائے جس سے مخاطبین کو واضح طور پر یہ گمان ہو کہ اللہ تعالیٰ بھی کسی آلودگی سے متصف ہوتے ہیں اور یہ بات مخاطبین کے اختلاف سے مختلف ہو سکتی ہے۔ عربی محاورات میں ایک تشبیہ ایسا وہم پیدا نہیں کرتی ہو اور کسی محاورات میں ایسا ایہام پیدا ہوتا ہو۔ ایسا ممکن ہے۔ مثلاً یہ تو کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ سنتے دیکھتے ہیں، کیونکہ اس سے مذکورہ وہم پیدا نہیں ہوتا، مگر یہ نہ کہا جائے کہ وہ چکھتے چھوتے ہیں، کیونکہ اس سے حیوانی نقائص کی طرف ذہن جاتا ہے۔ نیز ذوق سے یہ خیال پیدا ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کھاتے پیتے ہیں اور ان کو بھوک پیاس لگتی ہے اور لمس سے یہ وہم گذرتا ہے کہ ان کی بیوی ہے (لان الذ الملموسات الصماء لاوا كان له قوة لامسة، يرغب لامحالة فى ان يباشر الذ الملموسات (سندی)

چوتھا قاعدہ: صفات باری کی ترجمانی کے لئے جامع الفاظ استعمال کئے جائیں، جو کسی ایک امر کے تحت تمام معانی کو حاوی ہوں، جیسے رزاق (روزی رساں) اور مصور (صورت گر) وغیرہ اسی طرح تمام اسمائے حسنی جامع الفاظ ہیں۔

پانچواں قاعدہ: جس طرح اللہ تعالیٰ کے لئے صفات ثبوتیہ ہیں، جن کا اثبات ضروری ہے، اسی طرح ان کی صفات سلبیہ بھی ہیں جن کی نفی ضروری ہے یعنی اللہ تعالیٰ سے ہر اس چیز کی نفی کی جائے گی جو اللہ تعالیٰ کے شایان شان نہیں ہے۔ بالخصوص وہ باتیں جو نفوس نے شان عالی میں گھڑی ہیں، جیسے بہت سے لوگ اللہ تعالیٰ کی طرف اولاد منسوب کرتے ہیں۔ نصاریٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا مانتے ہیں۔ مشرکین عرب فرشتوں کو اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں کہتے تھے، کچھ

یہودی بھی اللہ تعالیٰ کے لئے اولاد تجویز کرتے ہیں، وہ حضرت عزیر علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا کہتے ہیں اور ہندو بھی اپنے دیوی دیوتاؤں کے بارے میں کچھ اسی قسم کا عقیدہ رکھتے ہیں۔ اس لئے سورۂ اخلاص میں اس کی نفی کی گئی ہے کہ نہ اس نے کسی کو جنا ہے اور نہ وہ کسی سے جنا گیا۔

واعلم: أن الحق تعالى أجلُّ من أن يُقاس بمعقول أو محسوس، أو يَحُلَّ فيه صفاتٌ كحلول الأعراض في محالّها، أو تعالجه العقول العامية، أو تتناوله الألفاظ العرفية؛ ولابد من تعريفه إلى الناس ليكملوا كمالهم الممكن لهم، فوجب:

[۱] أن تستعمل الصفات بمعنى وجود غاياتها، لابمعنى وجود مباديها، كمعنى الرحمة: إفاضة النعم، لاانعطاف القلب والرقة.

[۲] وأن تستعار ألفاظ تدل على تسخير الملك لمدينته، لتسخيره لجميع الموجودات؛ إذ لاعبارة في هذا المعنى أفصح من هذه.

[۳] وأن تستعمل تشبيهات بشرط أن لايقصد إلى أنفسها، بل إلى معانٍ مناسبة لها في العرف. فيراد ببسط اليد الجودُ مثلا، وبشرط أن لايوهم المخاطبين إيهامًا صريحًا أنه في أسر البهيمية، وذلك يختلف باختلاف المخاطبين، فيقال: يرى ويسمع، ولا يقال: يذوق ويلمس.

[۴] وأن يُسمي إفاضةَ كلِّ معانٍ متفقة في أمر باسم كالرزاق والمصوّر.

[۵] وأن يُسلب عنه كلُّ مالا يليق به، لاسيما ما لهج به الظالمون في حقه، مثل لم يلد ولم يولد.

ترجمہ: اور جان لیں کہ حق تعالیٰ اس سے برتر ہیں کہ وہ قیاس کئے جائیں کسی معقول یا کسی محسوس چیز پر۔ یا ان میں صفات حلول کریں اعراض کے حلول کرنے کی طرح ان کے محل میں۔ یا ان تک عوام الناس کی عقلیں رسائی پائیں۔ یا ان کو عرفی بول چال کے الفاظ شامل ہوں۔ اور لوگوں کو اللہ کی پہچان کرانا بھی ضروری ہے، تاکہ لوگ اپنا وہ کمال حاصل کریں جو ان کے لئے ممکن ہے، پس ضروری ہوا کہ:

(۱) صفات استعمال کی جائیں ان کی غایات پائے جانے کے معنی میں، نہ کہ ان کے مبادی پائے جانے کے معنی میں، جیسے رحمت کے معنی: "نعمتوں کا فیضان کرنا" ہیں۔ "دل کا مڑنا" اور "پگھلنا" اس کے معنی نہیں ہیں۔

(۲) اور یہ کہ ایسے الفاظ مستعار لئے جائیں جو دلالت کرتے ہیں بادشاہ کے مسخر کرنے پر اپنی مملکت کو، اللہ کے مسخر کرنے کے لئے تمام موجودات کو، کیونکہ اس معنی کی ادائیگی کے لئے اس سے واضح تر کوئی عبارت نہیں ہے۔

(۳) اور یہ کہ تشبیہات استعمال کی جائیں، بشرطیکہ ان تشبیہات کے اصل معنی مراد نہ لئے جائیں، بلکہ وہ معنی مراد لئے

عَلَى السَّمَاءِ وَبِيَدِهِ الْمِيزَانُ، يَخْفِضُ وَيَرْفَعُ[1] (اللہ کا ہاتھ بھرا ہوا ہے، کوئی خرچ کرنا اس کو کم نہیں کرتا، رات دن سخاوت کا دریا بہانے والے ہیں۔ بتاؤ، کس قدر خرچ کیا ہے جب سے آسمان وزمین کو پیدا کیا ہے؟ پس نہیں کم کیا اس خرچ کرنے نے اس چیز کو جو ان کے ہاتھ میں ہے، اور اس کا تخت (تخلیق ارض وسماء کے وقت) پانی پر تھا۔ ان کے ہاتھ میں ترازو ہے، پست کرتے ہیں اور بلند کرتے ہیں) اس حدیث کے ذیل میں امام ترمذی نے لکھا ہے:

''ائمہ نے فرمایا ہے کہ اس حدیث پر ایمان لایا جائے، جس طرح وہ آئی ہے، اس کی کوئی تفسیر کی جائے نہ کوئی خیال باندھا جائے۔ متعدد ائمہ نے ایسا ہی فرمایا ہے، جن میں سفیان ثوری، مالک بن انس، ابن عیینہ اور ابن المبارک شامل ہیں (ان حضرات نے فرمایا) کہ یہ باتیں روایت کی جائیں اور ان پر ایمان رکھا جائے اور ان کی کیفیت نہ پوچھی جائے''

اور امام ترمذی رحمہ اللہ ہی نے دوسری جگہ کتاب الزکوۃ (۱:۸۴) میں جہاں یہ حدیث روایت کی ہے کہ: ''جب بھی کوئی شخص کسی حلال مال سے کوئی خیرات کرتا ہے ــــ اور اللہ تعالیٰ پاکیزہ مال ہی قبول فرماتے ہیں ــــ تو رحمان اس کو دائیں ہاتھ میں لیتے ہیں۔ پھر اگر وہ صدقہ کوئی کھجور ہوتی ہے تو وہ رحمان کے ہاتھ میں بڑھتی ہے تا آنکہ وہ پہاڑ سے بڑی ہو جاتی ہے، جس طرح تم میں سے ایک شخص اپنے بچھیرے کی یا بچھڑے کی پرورش کرتا ہے'' اس حدیث کے ذیل میں امام ترمذی نے طویل کلام کیا ہے۔ اور امام مجتہد حضرت اسحاق بن راہویہ کا قول نقل کیا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ:

''ان صفات کو ہو بہو استعمال کرنا تشبیہ نہیں۔ تشبیہ یہ ہے کہ کہا جائے: (اللہ کی) سماعت (مخلوق کی) سماعت جیسی (ہے) اور (اللہ کی) بصارت (مخلوق کی) بصارت جیسی (ہے)'' (یہ امام ترمذی کی بلفظہ عبارت نہیں، شاہ صاحب نے عبارت کا ماحصل بیان کیا ہے)

اور حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے فتح الباری (۱۳: ۳۹۰) میں بخاری شریف کی کتاب التوحید، باب قول اللہ تعالیٰ: ﴿وَلِتُصْنَعَ عَلَىٰ عَيْنِي﴾ میں اللہ تعالیٰ کی صفت عین (آنکھ) پر گفتگو کی ہے۔ اور بحث کے آخر میں کسی کا قول نقل کیا ہے کہ

''نہ تو نبی کریم ﷺ سے بہ سند صحیح صراحۃً مروی ہے اور نہ کسی صحابی سے کہ ان صفات (متشابہات) میں سے کسی کی بھی تاویل واجب ہے۔ اور نہ اس کے لیے صفات متشابہات کے ذکر کی ممانعت آئی ہے۔ اور یہ بات محال ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے نبی کو حکم دیں کہ ''جو کچھ ہم نے آپ پر اتارا ہے اس کو لوگوں تک پہنچا دیں'' اور آپ پر یہ آیت بھی نازل فرمائیں کہ: ''آج میں نے تم پر تمہارا دین مکمل کر دیا'' پھر یہ مسئلہ چھوڑ دیں اور امتیاز نہ فرمائیں کہ کن صفات کی نسبت اللہ کی طرف جائز ہے، اور کن کی نسبت جائز نہیں؟ اس ترغیب کے ساتھ کہ

[1] متفق علیہ، مشکوۃ، کتاب الایمان، باب الایمان بالقدر، حدیث نمبر ۹۲

"موجودین غیر موجود لوگوں کو (دین) پہنچادیں" یہاں تک کہ انھوں نے آپ کے اقوال وافعال واحوال وصفات وردہ کا منقل کئے جو آپ کے سامنے کئے گئے۔ پس یہ بات اس پر دلالت کرتی ہے کہ وہ حضرات متفق تھے ان صفات پر اس طرح ایمان لانے پر جو اللہ تعالی نے ان سے مراد لی ہے۔ اور مخلوق کی مشابہت سے تنزیہ واجب ہے اللہ پاک کے ارشاد سے کہ: "اس کے مانند کوئی چیز نہیں" پس جو شخص اس کے بعد اس کے خلاف ثابت کرتا ہے وہ ان کی راہ کی خلاف ورزی کرتا ہے"

وقد أجمعت المِلَلُ السماوية قاطبتها على بيان الصفات على هذا الوجه، وعلى أن تستعمل تلك العبارات على وجهها، ولا يُبحث عنها أكثر من استعمالها، وعلى هذا مضت القرونُ المشهودُ لها بالخير، ثم خاض طائفةٌ من المسلمين في البحث عنها، وتحقيق معانيها، من غير نص ولا برهانٍ قاطعٍ، قال النبي صلى الله عليه وسلم: ﴿تفكروا في الخلق، ولاتفكروا في الخالق﴾ وقال في قوله تعالى: ﴿وَأَنَّ إِلَىٰ رَبِّكَ الْمُنْتَهَىٰ﴾: ﴿لافكرة في الرب﴾ والصفاتُ ليست بمخلوقاتٍ محدثاتٍ، والفكر فيها إنماهو أن الحقَّ كيف اتَّصف بها؟ فكان تفكُّرا في الخالق.

قال الترمذي في حديث: ﴿يد الله ملأى﴾:

"وهذا الحديث، قال الأئمة: نؤمن به كما جاء من غير أن يفسَّر، أو يُتَوَهَّم، هكذا قال غير واحد من الأئمة، منهم سفيان الثوري، ومالك بن أنس، وابن عيينة، وابن المبارك: أنه تُروى هذه الأشياء، ويُؤْمَنُ بها، ولايقال: كيف؟"

وقال في موضع آخر:

"إن إجراء هذه الصفات كما هي ليس بتشبيه، وإنما التشبيهُ أن يقال: سمع كسمع، وبصر كبصر"

وقال الحافظ ابن حجر:

لم يُنقل عن النبي صلى الله عليه وسلم، ولاعن أحد من الصحابة، من طريق صحيح، التصريحُ بوجوب تأويل شيئ من ذلك يعني المتشابهات، ولا المنع من ذكره، ومن المحال أن يأمر الله نبيه بتبليغ ما أُنزل إليه من ربه، ويَنْزِلُ عليه: ﴿الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ﴾ ثم يترك هذا الباب فلا يميز ما يجوز نسبته إليه تعالى مما لايجوز، مع حضّه على التبليغ عنه بقوله: ﴿ليبلغ الشاهد الغائب﴾ حتى نقلوا أقواله وأفعاله وأحواله وصفاته وما فعل بحضرته، فدل على أنهم اتفقوا على الإيمان بها، على الوجه الذي أراده الله تعالى منها، ووجب تنزيهُه عن

مشابهة المخلوقات بقوله تعالى: ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ﴾ فمن أوجب خلاف ذلك بعدهم فقد خالف سبيلهم (انتهى)

ترجمہ: اور آسمانی مذاہب تمام کے تمام متفق ہیں اس طور پر صفات کے بیان کرنے پر، اور اس پر کہ وہ عبارتیں ہو بہو استعمال کی جائیں۔ اور استعمال سے زیادہ ان عبارتوں کے بارے میں بحث (کھود کرید) نہ کی جائے۔ اور اسی پر گذرے وہ زمانے جن کے لئے بہتر ہونے کی گواہی دی گئی ہے۔ پھر مسلمانوں کی ایک جماعت ان کے مفہوم میں بحث میں گھس گئی۔ اور ان کے معانی کی تحقیق کے درپے ہوئی، کسی نص شرعی اور دلیل قطعی کے بغیر۔ فرمایا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے: ''مخلوق میں غور کرو، اور خالق میں غور مت کرو'' اور ﴿وَاَنَّ اِلٰی رَبِّکَ الْمُنْتَہٰی﴾ کی تفسیر میں فرمایا: ''پروردگار میں غور فکر نہیں ہے'' اور صفات مخلوق و حادث نہیں ہیں۔ اور ان میں غور کرنا یہی ہے کہ حق تعالیٰ ان صفات کے ساتھ کیسے متصف ہیں؟ پس وہ خالق میں غور کرنا ہوا۔ امام ترمذی نے حدیث ید اللہ ملأی کے ذیل میں فرمایا:

''اور یہ حدیث: ائمہ نے فرمایا: اس پر ایمان لایا جائے، جیسی وہ آئی ہے، بغیر اس کے کہ اس کی تفسیر کی جائے یا کوئی خیال جمایا جائے۔ ایسا ہی فرمایا ہے متعدد ائمہ نے، ان میں سے سفیان ثوری، مالک بن انس، ابن عیینہ اور ابن المبارک ہیں کہ روایت کی جائیں یہ چیزیں اور ان پر ایمان رکھا جائے اور نہ پوچھا جائے: کیسے؟''

اور امام ترمذی رحمہ اللہ نے دوسری جگہ فرمایا:

''ان صفات کو ہو بہو استعمال کرنا تشبیہ نہیں ہے۔ تشبیہ یہی ہے کہ کہا جائے: سماعت، سماعت جیسی اور بصارت، بصارت جیسی''

اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فرمایا:

''نہ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بہ سند صحیح اس کی صراحت منقول ہے، اور نہ صحابہ میں سے کسی سے کہ ان میں سے بعض صفات متشابہات میں سے کسی کی بھی تاویل واجب ہے اور نہ اس کے ذکر کی ممانعت مروی ہے۔ اور یہ بات ناممکنات میں سے ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے نبی کو حکم دیں اس بات کو پہنچانے کا جو آپ کی طرف آپ کے رب کی جانب سے اتاری گئی ہے۔ اور آپ پر نازل فرمائیں کہ: ''آج میں نے تمہارے لئے تمہارے دین کی تکمیل کردی'' پھر اس مسئلہ کو چھوڑ دیں اور جدا نہ کریں ان صفات کو جن کی نسبت اللہ کی طرف جائز ہے اور ان کو جن کی نسبت جائز نہیں ہے، آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ترغیب دینے کے ساتھ آپ کی طرف سے دین پہنچانے پر اپنے اس ارشاد سے کہ: ''موجود غیر موجود کو پہنچائیں'' تا آنکہ انھوں نے نقل کئے آپ کے ارشادات کئے ہوئے کام، حالات، صفات اور جو کچھ کیا گیا آپ کے سامنے۔ پس یہ بات اس پر دلالت کرتی ہے کہ وہ حضرات متفق تھے ان صفات پر ایمان لانے پر، اس طور پر جو اللہ تعالیٰ نے ان عبارات سے مراد لی ہے۔ اور مخلوقات کی مشابہت سے

اللہ تعالیٰ کی تحریر واجب ہوئی اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: "ان سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں" یعنی جو شخص ان کے بعد اس کے خلاف ثابت کرے وہ ان کی راوی کی مخالفت کرتا ہے (ابن حجر کی عبارت پوری ہوئی)

تصحیح: خفیہ اصل میں حیۃ تھا، وصفاتہ اصل میں نہیں ہے، علی الإیمان بہا اصل میں بہ تھا، أرادہ اللہ اصل میں أراد اللہ تھا، وجب تعریبہ اصل میں أوجب تعریبہ تھا۔ تصحیح مخطوطہ کراچی سے کی گئی ہے۔

سبھی صفات ازقبیل متشابہات ہیں

اوپر جو بات بیان کی گئی ہے کہ صفات پر دلالت کرنے والے الفاظ استعمال کئے جائیں، ان کی تاویل کی جائے نہ معانی کی تحقیق، کتابوں میں یہ بات صفات متشابہات کے تعلق سے لکھی گئی ہے۔ اور صفات متشابہات سے وہ صفات مراد ہیں جن سے اللہ تعالیٰ کا مخلوق کے مشابہ ہونا مفہوم ہوتا ہے اور جن سے اللہ تعالیٰ کا جسم دار ہونا سمجھا جاتا ہے، جیسے ہاتھ، قدم، انگلیاں، پیر، چہرہ، آنکھ، پنڈلی، آسمان دنیا پر ہر رات اترنا، میدان قیامت میں اترنا، عرش پر متمکن ہونا وغیرہ۔ صفات حقیقیہ سمع و بصر و کلام وغیرہ کے بارے میں یہ بات نہیں کہی جاتی۔ امام ترمذی رحمہ اللہ نے بھی جن حدیثوں میں صفت ید آئی ہے وہاں مذکورہ بات لکھی ہے۔ اسی طرح ابن حجر رحمہ اللہ نے بھی صفت عین (آنکھ) کے تعلق سے مذکورہ بات کہی ہے۔ حالانکہ یہ تفریق صحیح نہیں ہے۔ تمام ہی صفات ازقبیل متشابہات ہیں، کیونکہ جن الفاظ سے اہل لسان کے نزدیک جو بات سمجھی جاتی ہے وہ اللہ تعالیٰ کے شایان شان نہیں۔ اگر صفت ضحک (ہنسی) اس لئے شایان شان نہیں کہ اس کے لئے "منہ" ہونا ضروری ہے تو یہی چیز صفت کلام (بات کرنے) کے لئے بھی ضروری ہے۔ اور اگر صفت بطش (پکڑنا) اور نزول (اترنا) اس لئے محال ہے کہ ان کے لئے ہاتھ اور پیر ضروری ہیں تو سمع و بصر کے لئے بھی کان اور آنکھ ضروری ہیں۔ غرض صفات باری پر دلالت کرنے والے سبھی الفاظ ازقبیل متشابہات ہیں اور سب کا ایک حکم ہے۔ واللہ اعلم۔

أقول: ولا فرق بين السمع والبصر والقدرة والضحك والكلام والاستواء، فإن المفهوم عند أهل اللسان من كل ذلك غيرُ ما يليق بجناب القدس، وهل في الضحك استحالةٌ إلا من جهة أنه يستدعي الفم؟ وكذلك الكلام؛ وهل في البطش والنزول استحالةٌ إلا من جهة أنهما يستدعيان اليد والرجل؟ وكذلك السمع والبصر يستدعيان الأذن والعين، والله أعلم.

ترجمہ: میں کہتا ہوں: اور سمع (سننا) بصر (دیکھنا) قدرت (طاقت) ضحک (ہنسنا) کلام (بات کرنا) اور استواء (بیٹھنا) کے درمیان کچھ فرق نہیں، کیونکہ ان سب الفاظ سے اہل لسان کے نزدیک جو بات سمجھی جاتی ہے وہ علاوہ ہے اس

بات سے کہ جو پاکیزہ بارگاہ کے لائق ہے۔ اور صفت ضحک میں استحالہ نہیں ہے مگر اس اعتبار سے کہ وہ منہ کو چاہتا ہے اور یہی حال صفت کلام کا ہے۔ اور صفت بطش اور صفت نزول میں استحالہ نہیں ہے مگر اس اعتبار سے کہ وہ دونوں ہاتھ اور پیر کو چاہتے ہیں اور اسی طرح سمع وبصر دونوں کان اور آنکھ کو چاہتے ہیں۔ باقی اللہ بہتر جانتے ہیں۔

لغات: استدعى الشيئ: طلب کرنا، پکارنا۔

صفات کے بارے میں محدثین کا موقف صحیح ہے

علامہ محمد بن عبد الکریم شہرستانی رحمہ اللہ (۴۷۹-۵۴۸ھ) کے تجزیہ کے مطابق علم کلام کے چار بنیادی مسائل ہیں[1] جن کی وجہ سے اسلامی فرقوں میں سخت اختلافات اور گروہ بندیاں ہوئی ہیں۔ وہ مسائل یہ ہیں:

(۱) صفات الٰہیہ کا اثبات ونفی۔ اور بصورت اثبات صفات کی نوعیت وکیفیت کا مسئلہ۔

(۲) جبر واختیار کا مسئلہ، اور تقدیر کا اثبات ونفی۔

(۳) عقائد واعمال کا باہمی تعلق یعنی اعمال ایمان کا جزء ہیں یا نہیں؟

(۴) عقل ونقل میں بالادستی کس کو حاصل ہے؟

ہم یہاں صفات کے مسئلہ کی قدرے وضاحت کرتے ہیں:

معتزلہ: صفات باری کا انکار کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں اگر خدا کی صفات مانی جائیں، اور قدیم مانی جائیں تو تعدد قدماء لازم آئے گا، جو تعدد آلہہ کو مستلزم ہے۔ اور حادث مانی جائیں تو خدا کا محل حوادث ہونا لازم آئے گا، جو خدا کے حدوث کو مستلزم ہے۔ اس لئے معتزلہ نے یہ رائے قائم کی کہ خدا کے لئے علحدہ صفات نہیں ہیں، بلکہ اللہ کی ذات ہی سے وہ تمام نتائج حاصل ہوتے ہیں جو ہم کو صفات سے حاصل ہوتے ہیں۔ خلق قرآن کا مسئلہ اسی عقیدہ کا شاخسانہ تھا۔ معتزلہ دیگر صفات کی طرح صفت کلام کے بھی منکر تھے، اس لئے وہ قرآن کریم کو کلام الٰہی اور قدیم نہیں مانتے تھے۔ ان کے نزدیک قرآن مخلوق اور حادث ہے۔ پھر معتزلہ میں سے بڑھتے بڑھتے نفاۃ صفات نکل آئے، جو واجب تعالیٰ کو ذات بحت (وجود محض) مانتے ہیں۔

اہل حق: محدثین، اشاعرہ اور ماتریدیہ کے نزدیک معتزلہ کا یہ موقف درپردہ خدا کی صفات کا انکار ہے، جبکہ قرآن وحدیث صفات کے اثبات سے بھرے پڑے ہیں۔ اس لئے اہل حق نے یہ رائے اختیار کی کہ اللہ تعالیٰ کے لئے صفات ثابت ہیں۔ اور وہ صرف معنی اور جداگانہ ہیں یعنی حقیقت ومفہوم کے لحاظ سے واجب تعالیٰ سے علحدہ ہیں اور وجود کے اعتبار سے متحد ہیں۔ اس لئے صفات نہ عین ہیں نہ غیر، بلکہ عین شی ہیں، پس تعدد قدماء کا محذور لازم نہیں آئے گا۔

[1] دیکھئے شہرستانی کی الملل والنحل (دیباچہ)

پھر بعد میں صفات کے بارے میں اہل حق کے دو موقف ہوگئے:

پہلا موقف: تنزیہ مع التفویض: یعنی مخلوق کی مشابہت سے تقدس بیان کی جائے اور صفات کی کیفیت علم الٰہی کے حوالے کردی جائے۔ مثلاً یہ کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ کا سننا، دیکھنا، جاننا، عرش پر مستوی ہونا وغیرہ مخلوقات کے سننے، دیکھنے، جاننے اور تخت شاہی پر براجمان ہونے کی طرح نہیں ہے۔ پھر یہ صفات کیسی ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی اپنی ان صفات کی حقیقت بہتر جانتے ہیں، ہم نہیں جانتے۔

یہ مسلک برحق، اسلم اور احوط ہے۔ محدثین کرام اور تمام اسلاف اسی کے قائل تھے، اور اسی کا نام ''سلفیت'' ہے۔ سلفیت عدم تقلید کا نام نہیں ہے[1] اور یہ تفویض بمعنی ثبوت مبدأ ہے بمعنی وجود غایت نہیں ہے۔ کیونکہ ان صفات کے جو معانی، غایات، مقاصد اور نتائج ہیں ان کو ماننا ضروری ہے، ورنہ قرآن کریم میں جو سات جگہ[2] استواء علی العرش کی صفت آئی ہے وہ ''بے معنی'' ہوکر رہ جائے گی۔ علاوہ ازیں جو اسلاف نے کہا ہے کہ الاستواء معلوم اس کا بھی یہی مطلب ہے۔ صرف لغوی معنی جاننا مراد نہیں ہے۔

پھر رفتہ رفتہ ایسا ہوا کہ بعض لوگوں نے صفات کی غایات و نتائج سے ذہن ہٹالیا، اور صفات بمعنی ثبوت مبدأ پر ان کا ذہن مرکوز ہوکر رہ گیا تو تفویض والی بات صرف زبان کی حد تک رہ گئی اور وہ لوگ تجسیم و تشبیہ کی دلدل میں پھنس گئے۔ اس طرح محدثین میں سے بڑے بڑے مُجَسِّمَہ اور مُشَبِّہَہ نکل آئے۔ اور لوگوں کو محدثین کرام پر فقرے کسنے کا اور پھبتی اڑانے کا موقع مل گیا کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے لئے جسم مانتے ہیں اور اللہ کو مخلوق کے مشابہ مانتے ہیں۔ اور اپنی بدعقیدگی چھپانے کے لئے بلا تکییف کا پردہ رکھتے ہیں، بلکہ انھوں نے محدثین کا نام ''بَلْكَفِيَّہ'' رکھ دیا یعنی وہ لوگ جو بلا کیف کی آڑ میں سب کچھ کہہ گذرتے ہیں۔

دوسرا موقف: تفویض مع التاویل: یعنی مخلوق کی مشابہت سے اللہ تعالیٰ کی پاکی بیان کرنا اور صفات کو حتی الامکان اللہ کے شایان شان مطلب بیان کرنا۔ یہ متکلمین: اشاعرہ و ماتریدیہ کا مسلک ہے۔ ان حضرات نے یہ راہ اس لئے اختیار کی ہے کہ بیمار ذہنوں کو گمراہی سے بچایا جاسکے۔ کیونکہ صفات کی اگر مناسب تاویل نہیں کی جائے گی تو کمزور ایمان

---

[1] سلفیت علم کلام کا ایک مسلک ہے، تقلید اور عدم تقلید سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ اس زمانہ میں لوگوں نے اس لفظ کو غلط معنی پہنائے ہیں۔ سلفیت سے عدم تقلید مراد لینا لفظ کا غیر موضوع لہ معنی میں استعمال ہے اور یہ کہنا کہ یہ اس زمانہ کی جدید اصطلاح ہے۔ ولا مشاحۃ فی الاصطلاح تو اس کا جواب یہ ہے کہ دھوکہ دہی کے لئے ایسا نہیں کیا جاسکتا۔ یہ تو ایسا ہی ہے جیسا قادیانی اسلامی اصطلاحات: صحابہ، امیر المؤمنین، مسجد، نماز، جماعت وغیرہ استعمال کرتے ہیں اور مسلمان اختلاف کا مظاہرہ کرتے ہیں اور ان اصطلاحات کے استعمال پر پابندی کا مطالبہ کرتے ہیں ۱۲

[2] وہ سات مقامات یہ ہیں: الاعراف ۵۴ یونس ۳ الرعد ۲ طٰہٰ ۵ الفرقان ۵۹ الم السجدۃ ۴ الحدید ۴۔

والے تجسیم وتشبیہ کے قائل ہوکر رہ جائیں گے جیسے استواء کی تاویل استیلاء سے نہیں کی جائے گی تو جاہل لوگ اللہ تعالیٰ کو عرش پر براجمان سمجھیں گے اور محدثین کے حلقہ میں ایسا ہوا بھی۔ اس لئے عوام کے عقائد کی حفاظت کے لئے اور فلسفۂ یونان سے مسموم ذہن کے علاج کے لئے یہ موقف اختیار کیا گیا۔

پھر رفتہ رفتہ اس حلقہ میں بھی بعض لوگ تاویل کی دور دراز راہوں پر چل پڑے۔ اور تاویلات کرتے کرتے اتنے دور نکل گئے کہ انھوں نے ثبوت مبدأ کا بھی کچھ خیال نہ کیا۔ محدثین نے ایسے لوگوں پر سخت نقد کیا ہے اور ان کو منکر صفات اور کافر ومشرک قرار دیا ہے۔ بلکہ ان زمانے کے جہلاء تو مطلقاً اشاعرہ وماتریدیہ کو کافر ومشرک قرار دیتے ہیں فیا للعجب! ولضیعۃ الادب!!

حضرت شاہ صاحب قدس سرہ نے اس باب کے آخر میں انہیں تاویلات بعیدہ کے مقابلہ میں صفات باری کی صحیح اور مناسب تاویلیں (وجوہ احتمال یعنی مطالب) بیان کئے ہیں۔ اس ضروری تفصیل کے بعد اب ہم شاہ صاحب کی بات شروع کرتے ہیں:

متأولین یعنی صفات کی تاویلات بعیدہ اور باطلہ کرنے والے جماعت محدثین کو بدنام کرتے ہیں۔ وہ ان کو اللہ کے لئے جسم ثابت کرنے والا اور اللہ کو مخلوق جیسا قرار دینے والا کہتے ہیں اور ان کو "کلمہ" یعنی "بلا کیف" کے پردہ میں چھپ کر بات کرنے والا کہتے ہیں۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ مجھ پر یہ بات واضح ہوئی ہے کہ ان لوگوں کی یہ زبان درازی بے وجہ ہے۔ ان کی باتیں عقلاً بھی غلط ہیں اور نقلاً بھی۔ اور یہ لوگ محدثین پر جو اعتراضات کرتے ہیں ان میں وہ خطا کار ہیں۔ کیونکہ صفات کے مسئلہ میں غور طلب دو باتیں ہیں:

پہلی بات: یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ اپنی صفات کے ساتھ کس طرح متصف ہیں؟ اور اللہ کی صفات عین ذات ہیں یا ذات سے علحدہ چیز ہیں؟ اور سمع وبصر اور کلام وغیرہ صفات کی حقیقت کیا ہے؟ یہ سوال اس لئے پیدا ہوتا ہے کہ ان الفاظ سے سرسری طور پر جو کچھ سمجھ میں آتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے شایان شان نہیں ہے۔

اس سلسلہ میں برحق بات یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اس بارے میں کچھ گفتگو نہیں فرمائی، بلکہ آپ نے اپنی امت کو اس سلسلہ میں گفتگو کرنے سے اور بحث کرنے سے روکا ہے۔ پھر کسی کے لئے اس مسئلہ میں آگے بڑھنا اور بحث کا دروازہ کھولنا کیسے روا ہو سکتا ہے؟

دوسری بات: یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو کن صفات کے ساتھ متصف کرنا جائز ہے اور کن صفات کے ساتھ متصف کرنا جائز نہیں؟

اس سلسلہ میں برحق بات یہ ہے کہ اللہ کی صفات اور اللہ کے نام توقیفی ہیں۔ اس لئے یہ سوال ہی فضول ہے۔ اور توقیفی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اگرچہ ہم ان قواعد وضوابط کو جانتے ہیں جو صفات کے باب میں ملحوظ رکھے گئے ہیں اور

شروع باب میں ان کی وضاحت بھی کردی گئی ہے، مگر ہم اپنی طرف سے اسماء وصفات بیان کرنے کے مجاز نہیں ہیں۔ قرآن وحدیث میں جو اسماء وصفات آئی ہیں انہیں پر اکتفا کرنا ضروری ہے۔ لوگ اپنی طرف سے کوئی بھی صفت بیان نہیں کرسکتے۔ اور صفات تین حکمتوں کی وجہ سے توقیفی ہیں۔

پہلی حکمت: اگر لوگوں کو صفات میں غور وخوض کرنے کی اجازت دے دی جائے کہ وہ سوچ کر اللہ کے لئے جو صفات مناسب خیال کریں ثابت کرسکتے ہیں تو عقل نارسا کی وجہ سے بہت سے لوگ خود بھی ڈوبیں گے اور دوسروں کو بھی لے ڈوبیں گے!

دوسری حکمت: بعض صفات ایسی ہیں جن کے ساتھ فی نفسہ اللہ تعالیٰ کو متصف کرنا جائز ہے، مگر کفار میں سے کچھ لوگوں نے ان الفاظ کو غلط معنی پہنا دیئے ہیں۔ مثلاً اللہ تعالیٰ کو اصل وجود ہونے کی وجہ سے "باپ" کہنا فی نفسہ درست ہے۔ اور پچھلی آسمانی کتابوں میں یہ صفت آئی بھی ہے۔ مگر گمراہ لوگوں نے اس لفظ کا "رشتہ کا باپ" کے معنی میں استعمال کرنا شروع کردیا ہے اور یہ بات عام ہوگئی اور اسی غلطی کی وجہ سے انھوں نے اللہ کے لئے اولاد تجویز کردی تو آخری شریعت میں ایسی صفات کے استعمال سے روک دیا گیا تاکہ مذکورہ خرابی لازم نہ آئے۔

تیسری حکمت: بہت سی صفات ایسی ہیں جن کا ظاہری معنی میں استعمال خلافِ مراد کا وہم پیدا کرتا ہے، اس لئے ان سے بچنا ضروری ہے۔ جیسے چھونا اور چکھنا ظاہری معنی کے اعتبار سے ذات کے جسمیت سے آلودہ ہونے کی طرف ذہن کو لے جاتا ہے، حالانکہ ملموسات اور مذوقات کے علم کے معنی لئے جائیں تو ان کا استعمال درست ہے۔ جیسے سمع وبصر کا استعمال درست ہے۔ اسی طرح رونا اور ڈرنا اور اس کے مانند صفات کا حال ہے کہ ظاہری معنی کے اعتبار سے ان کا استعمال عیب اور کمزوری کی نشاندہی کرتا ہے، اس لئے ان کا استعمال جائز نہیں، جبکہ ضحک (ہنسنا) فرح (خوش ہونا) بشاشت، غضب (غصہ ہونا) اور خوشنودی کا استعمال درست ہے، جبکہ عوارض طاری ہونے کے اعتبار سے بات محمول ہے۔

غرض مذکورہ بالا حکمتوں کی وجہ سے شریعت نے صفات کو توقیفی کردیا ہے اور اس باب میں عقل کے گھوڑے دوڑانے کی اجازت نہیں دی۔ اور جب صفات توقیفی ہیں تو اس باب میں گنج کاوی کی ضرورت کیا ہے؟ علاوہ ازیں محدثین کے نقطۂ نظر کے پیچھے ایسے مضبوط عقلی ونقلی دلائل ہیں کہ باطل نہ سامنے سے آسکتا ہے نہ پیچھے سے، پھر ان کو بدنام کرنے اور اعتراضات کی بوچھار کرنے کے کیا معنی؟ اور متاخرین کے اقوال ومذہب کی تردید تو اس کے لئے یہ جگہ مناسب نہیں۔

واستطال هؤلاء الخائضون على معشر أهل الحديث، وسمَّوهم مُجَسِّمَة ومُشَبِّهة، وقالوا: هم المتستِّرون بالبلكفة، وقد وضح عليَّ وضوحاً بيّناً: أن استطالتهم هذه ليست بشيء، وأنهم مخطئون في مقالتهم روايةً ودرايةً، وخاطئون في طعنهم أئمة الهدى.

وتفصيل ذلك: أن ههنا مقامين:

أحدهما: أن الله تبارك وتعالى كيف تصف بهذه الصفات؟ وهل هي زائدة على ذاته أو عينُ ذاته؟ وما حقيقة السمع والبصر والكلام وغيرها؟ فإن المفهوم من هذه الألفاظ بادئ الرأي غيرُ لائق بجناب القدس: والحق في هذا المقام: أن النبي صلى الله عليه وسلم لم يتكلم فيه بشيئ، بل حَجَرَ أمتَه عن التكلم فيه، والبحث عنه، فليس لأحد أن يُقْدِمَ على ما حَجَرَهُ عنه.

والثاني: أنه أيُّ شيئ يجوز في الشرع أن نصفَهُ تعالى به، وأيُّ شيئ لايجوز أن نصفه به؟ والحق: أن صفاته وأسماءه توقيفية، بمعنى إنا وإن عرفنا القواعد التي بَنَى الشرعُ بيانَ صفاته تعالى عليها، كما حرَّرْنَا في صدر الباب، لكن كثيراً من الناس لو أبيح لهم الخوض في الصفات لضلُّوا وأضلُّوا، وكثيرٌ من الصفات وإن كان الوصف بها جائزاً في الأصل، لكنَّ قوماً من الكفار حملوا تلك الألفاظ على غير محملها، وشاع ذلك فيما بينهم، فكان حكمُ الشرع النهيَ عن استعمالها، دفعاً لتلك المفسدة، وكثيرٌ من الصفات يوهم استعمالُها على ظواهرها خلافَ المراد، فوجب الاحتراز عنها، فلهذه الحِكَم جعلها الشرعُ توقيفية، ولم يُبح الخوض فيها بالرأي.

وبالجملة: فالضحك والفرح والتَّبَشْبُش والغضب والرضا يجوز لنا استعمالُها، والبكاءُ والخوف ونحوُ ذلك لايجوز لنا استعمالُها، وإن كان المأخذان متقاربين، والمسألةُ على ما حققناه محضَّنَةٌ بالعقل والنقل، لايحوم الباطل من بين يديها ولا من خلفها، والإطالةُ في إبطال أقوالهم ومذاهبهم لها موضع آخرُ غير هذا الموضع.

ترجمہ: اور ان تاویل میں گھسنے والوں نے محدثین کی جماعت کو بدنام کیا ہے، اور وہ ان کو مجسمہ اور مشبّہہ کہتے ہیں۔ اور انہوں نے کہا کہ یہ لوگ "بلاکیف" کے پردہ میں چھپنے والے ہیں۔ اور مجھ پر یہ بات بالکل واضح ہوئی ہے کہ ان کی یہ زبان درازی کچھ بھی نہیں ہے۔ اور یہ کہ وہ اپنی باتوں میں غلطی پر ہیں نقلاً بھی اور عقلاً بھی اور وہ خطا کار ہیں ان کے اعتراض کرنے میں ہدایت کے پیشواؤں پر۔

اور اس کی تفصیل یہ ہے کہ یہاں دو مقام ہیں:

ان میں سے ایک: یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ ان صفات کے ساتھ کس طرح متصف ہیں؟ اور آیا وہ صفات ذات پر زائد (علحدہ) ہیں یا عین ذات ہیں؟ اور سمع وبصر اور کلام وغیرہ کی حقیقت کیا ہے؟ اس لئے کہ ان الفاظ سے سرسری نظر میں جو کچھ سمجھا جاتا ہے وہ پاکیزہ بارگاہ کے لائق نہیں ہے۔ اور حق اس مقام میں یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اس بارے میں کچھ گفتگو نہیں فرمائی، بلکہ آپ نے اپنی امت کو اس بارے میں گفتگو کرنے سے اور کھود کرید کرنے

سے روکا ہے، پس کسی کے لئے بھی جائز نہیں کہ وہ اس چیز پر اقدام کرے جس سے اس کو روکا گیا ہے۔

اور دوسرا مقام یہ ہے کہ شرعاً کونسی چیز جائز ہے کہ ہم اس کے ساتھ اللہ کو متصف کریں اور کونسی چیز جائز نہیں ہے کہ ہم اللہ کو اس کے ساتھ متصف کریں؟ اور حق بات یہ ہے کہ اللہ کی صفات اور اسماء توقیفی ہیں یعنی اگرچہ ہم ان قواعد کو جانتے ہیں جن پر شریعت نے صفات الٰہیہ کے بیان کرنے کی بنیاد رکھی ہے، جیسا کہ شروع باب میں ہم ان قواعد کی وضاحت کر چکے ہیں۔ لیکن بہت سے لوگ اگر ان کو صفات میں غور وخوض کرنے کی اجازت دے دی جائے گی تو وہ خود بھی گمراہ ہوں گے اور دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے۔ اور بہت سی صفات اگرچہ ان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو متصف کرنا در اصل جائز ہے، مگر کئی زمیں سے کچھ لوگوں نے ان الفاظ کو غیر معنی پر محمول کیا ہے اور یہ بات ان میں پھیل چکی ہے۔ پس شریعت کا حکم ان صفات کے استعمال سے ممانعت کا ہوا اس خرابی کو دور کرنے کے لئے۔ اور بہت سی صفات ان کا استعمال ان کے ظاہری معنی میں خلاف مراد کا وہم (خیال) پیدا کرتا ہے۔ پس اس سے بچنا ضروری ہوا۔ پس انہیں حکمتوں کی وجہ سے شریعت نے صفات کو توقیفی گردانا ہے اور عقل سے ان میں غور وخوض جائز نہیں رکھا۔

اور ماحصل کلام یہ ہے کہ ضحک (ہنسنا) فرح (خوش ہونا) ابتشاش (بشاشت) غضب (غصہ کرنا) اور رضا (خوشنودی) کا استعمال ہمارے لئے جائز ہے اور رونا اور ڈرنا اور ان کے مانند کا استعمال ہمارے لئے جائز نہیں، اگرچہ دونوں (قسم کی صفات) کا مأخذ قریب قریب ہے۔ اور مسلک (یعنی محدثین کی رائے) اس طور پر جو ہم نے مدلل کیا ہے عقل ونقل سے تائید یافتہ ہے، باطل نہ اس کے سامنے سے پھٹک سکتا ہے اور نہ اس کے پیچھے سے۔ اور ان کے (یعنی تاویل کرنے والوں کے) اقوال و مذاہب کے ابطال میں دراز نفسی کے لئے اس جگہ کے علاوہ کوئی اور جگہ ہے۔

لغات:

استطال علی عرضہ بدنامی کی شہرت دینا ۔۔۔ استطال ھؤلاء کا مشار الیہ معتزلہ ہیں جو صفات متشابہات کی تاویل میں لگے ہیں۔۔۔ البلکفۃ مصدر ہے اور بلاکیف کا مخفف ہے، جیسے البسملۃ مخفف ہے بسم اللہ کا اور الحوقلۃ مخفف ہے لاحول الخ کا ۔۔۔ إن ھھنا مضامین أی فی باب المتشابھات ۔۔۔ وإن کان المأخذان متقاربین أی متحدین، لأن کلا القسمین من کیفیات القلب بالنسبۃ إلی الإنسان (سندی) ۔۔۔ تَبَشْبَش (مصدر) تَبَشْبَش بہ: کسی سے کشادہ روئی سے پیش آنا۔

صفات الٰہیہ کے معانی کا تفصیلی بیان

معتزلہ کا حال صفات الٰہیہ کے تعلق سے شتر مرغ کی طرح ہے۔ ایک طرف وہ صفات کا انکار کرتے ہیں، دوسری طرف وہ ان کی دور دراز تاویلات بھی کرتے ہیں۔ وہ بدنامی کے ڈر سے کُلی انکار نہیں کرتے، بلکہ تاویلات کا سہارا

پہنچے ہیں۔ مثلاً معتزلہ اللہ کی صفت کلام کا یہ مطلب بیان کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ مخلوقات میں کلام (اصوات وحروف) پیدا کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے وہ قرآن کو مخلوق (حادث) مانتے ہیں۔ قاضی عضد الدین ایجی رحمہ اللہ مواقف میں لکھتے ہیں: قالت المعتزلة: كلامه تعالى أصوات وحروف يخلقها الله في غيره، كاللوح المحفوظ، أو جبريل أو النبي، وهو حادث اھ حالانکہ ان کی یہ تاویل قطعاً نصوص کے خلاف ہے۔

اسی طرح بعض متکلمین بھی صفات کے ایسے معانی بیان کرتے ہیں جو بے جوڑ ہیں، اس لئے شاہ صاحب رحمہ اللہ سات صفات حقیقیہ یعنی صفت ذاتیہ: حیات، علم، سمع، بصر، ارادہ، قدرت اور کلام کے معانی بیان فرماتے ہیں اور تین صفات فعلیہ کی تاویل کرتے ہیں یعنی وجدانیات میں ان کا مطلب بیان کرتے ہیں۔ وہ تین صفات یہ ہیں: ۱- خوشنودی اور شکر گذاری اور ان کی ضد: ناراضگی اور پھٹکار بھیجنا ۲- دعا قبول کرنا ۳- باری تعالیٰ کی رویت (دیکھنا نظر آنا)

اور تمہید یہ قائم کی ہے کہ جب معتزلہ اور اشاعرہ نے صفات کی دور از کار تاویلات کی ہیں تو ہمارے لئے بھی جائز ہے کہ ہم وجدانیات میں صفات کا مطلب بیان کریں۔ ہم جو معانی بیان کر رہے ہیں وہ صفات کو سمجھنے میں معتزلہ وغیرہ کی تاویلات کے مقابلہ میں قریب تر اور حقیقت سے زیادہ ہم آہنگ ہیں۔ ان کے بیان کردہ معانی کو نہ شرعاً قبول کرنا ضروری ہے، نہ دلیل عقلی اس پر مجبور کرتی ہے، نہ ان کو کوئی ترجیح حاصل ہے، نہ ان میں کوئی مرغاب کا پہلو ہے۔ ہاں جو معانی ہم بیان کر رہے ہیں وہ بھی تاویلات ہیں یعنی وجدانیات میں موافق مطالب بیان کر رہے ہیں۔ یہ دعویٰ نہیں ہے کہ اللہ کی مراد یہی معانی ہیں، نہ یہ دعویٰ ہے کہ ہمارے بیان کردہ معانی کا اعتقاد رکھنے پر اجماع امت ہے۔ خوب یاد رہے!

(۱) صفت حیات کا بیان: ہمارے سامنے تین قسم کی چیزیں ہیں: زندہ، مردہ اور بے جان چیزیں۔ اب غور کریں، اللہ تعالیٰ سے قریب ترین مشابہت کس کو حاصل ہے؟ ظاہر ہے کہ زندہ ہی اللہ سے مشابہت رکھتا ہے۔ میت و جماد کا تو کوئی جوڑ ہی نہیں۔ زندہ جانتا بھی ہے اور کسی درجہ میں دوسری چیزوں پر اثر انداز بھی ہوتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ بھی علیم وخبیر ہیں، وہ کائنات کے ذرہ ذرہ سے باخبر ہیں اور ساری خلقت پر اثر انداز بھی ہیں۔ مخلوقات انہیں نے پیدا کی ہے اور وہی مالک ومتصرف بھی ہیں۔ اس لئے اللہ تعالیٰ کے لئے صفت حیات (زندگی) کا ثابت کرنا ضروری ہے۔ وہ حَیّ (زندہ) ہیں اور یہ ان کی صفت حقیقیہ ہے۔ صفت حیات کا بس اتنا ہی مطلب ہم جانتے ہیں۔ آگے کی کیفیت جاننے سے ہم عاجز ہیں۔ کیونکہ زندہ تو ہمارے سامنے ہے، اس لئے ہم اس کی زندگی کی کیفیت کسی درجہ میں جانتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ ہمارے لئے غیب ہیں اور ان کی شان لیس کمثلہ شیئ ہے، اس لئے ہم ان کی حیات کی کیفیت کا کوئی اندازہ نہیں کر سکتے۔

(۲) صفت علم کا بیان: ہمارے لئے چیزوں کے "ظاہر ہونے" کا نام علم (جاننا) ہے۔ اور کائنات کا ذرہ ذرہ اللہ تعالیٰ پر منکشف ہے، سب چیزیں ان کے سامنے ظاہر اور کھلی ہوئی ہیں۔ ازل میں جبکہ کوئی چیز موجود نہیں تھی اللہ تعالیٰ کو سب چیزوں کا ذاتی علم حاصل تھا۔ ازلی علم وہ ہے جس کا منشأ خود ذات ہو، پھر بعد میں جب چیزیں تفصیل سے موجود

ہونے نہیں تو اللہ تعالیٰ کو ان کا علم انہیں معلومات سے حاصل ہے اس لئے اللہ تعالیٰ کے لئے صفت علم ثابت کرنا ضروری ہے۔ وہ علیم (جاننے والے) ہیں۔ اور یہ بھی ان کی ذاتی صفت ہے۔

(۳) صفات سمع وبصر کا بیان: مبصرات اور مسموعات کے ظہور تام کا نام دیکھنا اور سننا ہے یعنی جو چیزیں قابل رویت اور قابل سماعت ہیں وہ خوب ظاہر ہو جائیں تو اسی کا نام ان کو دیکھنا اور سننا ہے۔ اور یہ بات اللہ تعالیٰ کو علی وجہ الاتم حاصل ہے۔ سب چیزیں ان کے سامنے ظاہر اور کھلی ہوئی ہیں اس لئے اللہ تعالیٰ کے لئے صفات سمع وبصر ثابت کرنا ضروری ہے۔ وہ سمیع (سننے والے) اور بصیر (دیکھنے والے) ہیں اور یہ بھی ان کی ذاتی صفات ہیں۔

(۴) صفت ارادہ کا بیان: جب ہم کہتے ہیں کہ: ''فلاں نے ارادہ کیا'' تو ہم اس سے یہی مراد لیتے ہیں کہ فلاں شخص کے دل میں کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ اور اللہ تعالیٰ کے معاملات اس طرح ہیں کہ:

(۱) وہ بعض کام اس وقت کرتے ہیں جب اس کام کے پیدا ہونے کی شرط پائی جاتی ہے۔ مثلاً بادل پیدا ہونے کے بعد وہ بارش برساتے ہیں۔ تو ایک ایسی نئی چیز وجود میں آتی ہے جو پہلے نہیں تھی۔

(۲) اور بعض کام وہ اس وقت کرتے ہیں جب عالم میں استعداد پیدا ہوتی ہے۔ مثلاً بارش ہونے کے بعد جب زمین میں روئیدگی کی استعداد پیدا ہوتی ہے تو وہ سبزہ اگاتے ہیں۔ اور ایک نئی چیز وجود میں آتی ہے۔

(۳) عالم بالا کے بعض مقامات میں مثلاً حظیرۃ القدس میں یا ملأ اعلیٰ میں، جب ابھی کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ اور اس پر اتفاق ہوتا ہے تو اس کے مطابق کائنات میں ایسی نئی چیزیں وجود میں آتی ہیں جو پہلے نہیں تھیں۔

انہیں سب صورتوں کا نام ارادہ ہے۔ اس لئے ضروری ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے لئے صفت ارادہ ثابت کی جائے۔ پس وہ مُرِید (ارادہ کرنے والے) ہیں۔ اور یہ بھی ان کی ذاتی صفت ہے۔

سوال: صفت ارادہ کی اوپر جو تشریح کی گئی ہے اس سے تو اس صفت کا حادث ہونا سمجھ میں آتا ہے۔ کیونکہ جب کسی نئی چیز کے وجود میں آنے کا وقت آتا ہے، اس وقت اس کے ساتھ صفت ارادہ متعلق ہوتی ہے، تو یہ صفت حادث ہوئی، ازلی نہ ہوئی؟

جواب: صفت تو ارادہ حادث نہیں ہے، وہ تو قدیم اور ازلی ہے۔ البتہ اشیاء کے ساتھ اس کا تعلق حادث ہے اور تعلق کے حادث ہونے سے خود صفت کا حادث ہونا لازم نہیں آتا۔ یہی حال صفات خلق، احیاء، اماتت، ترزیق وغیرہ کا ہے۔ یہ تمام صفات جمیع عالم کے ساتھ یکبارگی متعلق ہوتی ہیں۔ اسی طرح صفت ارادہ یعنی اللہ کا چاہنا بھی تمام عالم کے ساتھ یکدم متعلق ہوا ہے پھر چیزیں شیئاً فشیئاً اس وقت وجود میں آتی ہیں جب ان کے ساتھ تفصیلی طور پر یعنی علیحدہ علیحدہ اللہ کا چاہنا متعلق ہوتا ہے۔ اسی طرح صفت خلق، علم وغیرہ کا حال ہے۔ پس یہ کہنا درست ہے کہ اللہ نے یہ پیدا کیا اور وہ پیدا کیا۔ یہ چاہا، وہ چاہا۔ اس کام کا ارادہ کیا، اس کام کا ارادہ کیا۔ ایسے کہنے سے ان صفات کو حادث سمجھنا غلط فہمی ہے۔

ولنا أن نفسرها بمعانٍ هي أقرب وأوفق بما قالوا إبانةً، لأن تلك المعاني لا يتعين القول بها، ولا يضطر الناظر في الدليل العقلي إليه، وأنها ليست راجحة على غيرها، ولا لها مزيةٌ بالنسبة إلى ما عداها، لا نحكم بأن مراد الله ما نقول، ولا إجماعاً على الاعتقاد به، والإذعان به، هيهات ذلك! فنقول - مثلاً -

[۱] لما كان بين يديك ثلاثة أنواع: حي وميت وجماد، وكان الحي أقرب شبهًا بما هنالك، لكونه عالمًا مؤثرًا في الخلق، وجب أن يسمى حيًّا.

[۲] ولما كان العلم عندنا هو الانكشاف، وقد انكشفت عليه الأشياء كلُّها بما هي متميزة في ذاته، ثم بما هي موجودةٌ تفصيلاً، وجب أن يسمى عليمًا.

[۳] ولما كانت الرؤية والسمع انكشافًا تامًّا للمبصَرات والمسموعات، وذلك هنالك بوجه تام، وجب أن يسمى بصيرًا سميعًا.

[٤] ولما كان قولنا: أراد فلانٌ، إنما نعني به أنه جمع عزمه على فعلٍ أو تركٍ، وكان الرحمن يفعل كثيرًا من أفعاله عند حدوث شرطٍ أو استعدادٍ في العالم، فيوجب عنده ذلك ما لم يكن واجبًا، ويتحقق في بعض الأحيان الشافعة إجماعٌ بعد ما لم يكن، بإذنه وحكمه، وجب أن يسمى مريدًا

وأيضًا: فالإرادة الواحدة الأزلية الذاتية المفسَّرة بالقضاء اللازم لمّا تعلقت بالعالم بأسره مرةً واحدةً، ثم حدثت الحوادث يومًا بعد يوم، صحّ أن تُنسب إلى كل حادثٍ على حدته، ويقال: أراد كذا وكذا.

ترجمہ: اور ہمارے لئے جائز ہے کہ ہم صفات کی تشریح کریں ایسے معانی سے جو اظہار حقیقت میں ان کی باتوں سے اقرب اور زیادہ ہم آہنگ ہیں۔ اس لئے کہ ان (معتزلہ کے بیان کردہ) معانی کا قائل ہونا متعین نہیں اور نہ دلیل عقلی میں غور کرنے والا ان معانی (کو ماننے) کی طرف مجبور ہے۔ اور اس لئے کہ وہ معانی ان کے علاوہ معانی پر راجح نہیں ہیں۔ اور نہ ان میں کوئی فضیلت ہے دیگر معانی کی بہ نسبت۔ (ہم یہ معانی) یہ فیصلہ کرتے ہوئے (بیان) نہیں (کررہے) کہ اللہ کی مراد وہی ہے جو ہم کہتے ہیں۔ اور نہ اجماع (کا دعوی) کرتے ہوئے ان معانی کا اعتقاد رکھنے اور ان کا یقین کرنے پر۔ بہت دور کی بات ہے! وہ تو محض ہے کہ ہم بیان کریں۔

پس ہم بطور مثال کہتے ہیں:

(۱) جب آپ کے سامنے تین قسم کی چیزیں تھیں: زندہ، مردہ اور بے جان چیز۔ اور زندہ قریب تر مشابہت رکھنے

والا تھا اس سے جو وہاں ہے (یعنی اللہ تعالیٰ سے) اس لئے کہ اللہ تعالیٰ جاننے والے ہیں اور مخلوقات پر اثر انداز ہیں تو ضروری ہوا کہ ان کو حیّ (زندہ) کہا جائے۔

(۲) اور جب علم (جاننا) ہمارے نزدیک (یعنی ہماری بول چال میں) انکشاف (ظہور) کا نام ہے۔ اور اللہ تعالیٰ پر تمام چیزیں منکشف ہیں اس چیز سے جو ان کی ذات میں چھپائی ہوئی ہے (یعنی ازل میں اللہ تعالیٰ کو تمام کائنات کا ذاتی علم حاصل تھا) پھر اس چیز سے جو منفصل موجود ہے (یعنی پھر جب کائنات پیدا ہونی شروع ہوئی تو ان موجودات کے ذریعہ دوسری مرتبہ انکشاف ہوا یعنی وہ علم ازلی جو کائنات کے ساتھ یکبارگی متعلق ہوا تھا۔ اب وہ ایک ایک چیز سے علٰحدہ علٰحدہ متعلق ہونے لگا۔ یہ تعلق حادث ہے مگر صفت علم قدیم ہے، جیسا کہ ابھی صفت ارادہ کے بیان کے بعد سوال مقدر کے جواب کے طور پر یہ بات آرہی ہے) تو ضروری ہوا کہ ان کو علیم کہا جائے۔

(۳) اور جب رویت (دیکھنا) اور سمع (سننا) مبصرات (دیکھی جانے والی چیزوں) اور مسموعات (قابل سماعت چیزوں) کے ظہور تام کا نام تھا، اور یہ بات وہاں (یعنی اللہ تعالیٰ میں) بوجہ اتم موجود ہے تو ضروری ہوا کہ ان کو بصیر اور سمیع کہا جائے۔

(۴) اور جب ہم کہتے ہیں کہ: "فلاں نے ارادہ کیا" تو ہم اس سے کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کے پختہ ارادہ کے خیال کو مراد لیتے ہیں۔ اور مہربان اللہ اپنے کاموں میں سے بہت سے کام کسی شرط کے نیا پیدا ہونے پر یا دنیا میں استعداد پیدا ہونے پر کیا کرتے ہیں، پس اس وقت وہ چیز ثابت ہوتی ہے (یعنی وجود میں آتی ہے) جو پہلے ثابت نہیں تھی۔ اور عالم بالا کے بعض مقامات میں اللہ کی اجازت اور حکم سے ایسا اجماع منعقد ہوتا ہے جو پہلے نہیں تھا تو ضروری ہوا کہ ان کو مُرِید (ارادہ کرنے والا) کہا جائے۔

اور نیز: پس ایک ازلی ذاتی ارادہ، جس کی تشریح کی گئی ہے: ذات (اللہ تعالیٰ) کے چاہنے کے ساتھ، جب وہ تمام عالم کے ساتھ یکبارگی متعلق ہوا، پھر رونما ہوئے واقعات (چیزیں) تدریجاً تو درست ہے کہ وہ ارادہ واحدہ منسوب کیا جائے ہر ہر واقعہ کی طرف علٰحدہ علٰحدہ طور پر، اور کہا جائے کہ: "اس نے ایسا چاہا اور ایسا چاہا"

لغات وترکیب:

انها ليست واحدة کا عطف لانّ میں انّ پر ہے..... لا حكمًا اى لا نفسرها حكمًا ..... اِنْفَنَجَ فى الشئ: مضبوط گڑ جانا ..... فاجس (اسم فاعل مضاف ہے) هَجَسَ الشئُ فى صدره: دوسرے گزرنا، خیال آنا..... الاحياز جمع الحَيِّز: جگہ..... الشاهقة: بلند۔

☆ ☆ ☆

(۵) صفتِ قدرت کا بیان: اور جب ہم کہتے ہیں کہ "فلاں قادر ہوا" تو ہم اس کا یہی مطلب سمجھتے ہیں کہ فلاں وہ کام کرسکتا ہے، کوئی خارجی سبب اس کو روک نہیں سکتا، البتہ وہ خود ہی ارادہ بدل دے اور نہ کرے تو یہ دوسری بات ہے۔ اسی طرح اس کی ضد بھی جو دونوں زیرِ قدرت ہوں، مثلاً کسی چیز کا کھانا اور نہ کھانا، جب آدمی ان دونوں میں سے ایک پہلو کو اختیار کرے مثلاً کھائے تو بھی دوسرا پہلو زیرِ قدرت رہتا ہے۔ ایک پہلو کو ترجیح دینے سے اس کی ضد قدرت سے خارج نہیں ہوجاتی، جس طرح پہلے دونوں پہلو زیرِ قدرت تھے اب بھی دوسرا پہلو قدرت میں ہے اور ایک پہلو کو متعین کرنا اور دوسرے پہلو کو اختیار نہ کرنا کسی مصلحت سے ہوتا ہے ــــــ اور مہربان اللہ بھی ہر کام کرسکتے ہیں، کوئی ان کو روکنے والا نہیں اور وہ جو دو مقدوروں میں سے ایک کو ترجیح دیتے ہیں تو وہ اپنی مہربانی سے ایسا کرتے ہیں اور ان کا اپنا ارادہ اور فیصلہ اس کا مقتضی ہوتا ہے مثلاً انھوں نے اپنے حبیب کو سب پیغمبروں کے آخر میں مبعوث فرمایا، جبکہ وہ سب سے پہلے بھی اور درمیان میں بھی مبعوث فرماسکتے تھے، تو یہ ترجیح ان کے لطف اور ان کے چاہنے کی وجہ سے ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ دوسرا پہلو ان کے اختیار میں نہیں تھا یا اب نہیں رہا، پہلے بھی دونوں امر مقدور تھے اور اب بھی ہیں۔ جب اللہ کی یہ شان ہے تو ضروری ہے کہ ان کو قادر مانا جائے۔ پس وہ قَدِیْر (قدرت والے) ہیں اور یہ بھی ان کی ذاتی صفت ہے۔

(۶) صفتِ کلام کا بیان: جب ہم کہتے ہیں کہ: "فلاں نے فلاں سے بات کی" تو ہم اس سے یہ مراد لیتے ہیں کہ اس نے اپنے دل کی مراد الفاظ کے ذریعہ دوسرے کو بتائی۔ اور مہربان اللہ بھی کبھی اپنے بندوں پر علوم کا فیضان کرتے ہیں اور صرف معانی کا فیضان نہیں کرتے، بلکہ معانی کے ساتھ الفاظ کا بھی فیضان کرتے ہیں، جو بندے کی قوتِ خیالیہ میں بیٹھ جاتے ہیں اور وہ علوم ومعانی پر دلالت کرتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ معانی کے ساتھ الفاظ کا فیضان اس لئے کرتے ہیں کہ تعلیم زیادہ سے زیادہ واضح طور پر ہو۔ غرض جب شانِ عالی بھی یہ ہے تو ضروری ہے کہ ان کے لئے صفتِ کلام ثابت کی جائے۔ چنانچہ وہ مُتَکَلِّمْ (بات کرنے والے) ہیں اور یہ صفت بھی ان کی ذاتی صفت ہے۔

فائدہ (۱) ذاتی صفت وہ ہے جس کی ضد کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو متصف نہ کیا جاسکے مثلاً وہ زندہ جاننے والے اور قادر ہیں۔ ان کو مردہ ہونے اور جہالت وعجز کے ساتھ متصف نہیں کیا جاسکتا۔ اللہ کی حقیقی (اصلی) ذاتی صفات کل سات ہیں جن کا بیان پورا ہوا۔ اور جس صفت کی ضد کے ساتھ بھی اللہ تعالیٰ کو متصف کیا جاسکتا ہے وہ صفتِ فعلی ہے، جیسا احیاء (زندہ کرنا) اور اماتت (مارنا) دونوں اللہ تعالیٰ کی صفتیں ہیں۔ صفاتِ فعلیہ بہت ہیں۔ شیخ ابو المنتہیٰ مغنیساوی رحمہ اللہ الفقہ الاکبر کی شرح میں لکھتے ہیں: والفرق بين صفات الذات وصفات الفعل أن كل صفة يوصف الله تعالى بضدها فهي من صفات الفعل، كالخلق، وإن كان لا يوصف بضده فهي من صفات الذات، كالحياة، والعزة، والعلم (ص۴۰)

فائدہ (۲) پہلے یہ بات آچکی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تمام صفات کو ایک درجہ تک ہی سمجھا جاسکتا ہے، فہم کے آخری مرحلہ

میں تمام صفات از قبیل متشابہات ہیں یعنی معنی غایات و نتائج تو صفات کو سمجھا جا سکتا ہے مگر مبادی کی کیفیت نہیں سمجھ سکتے پس مبادی کے ثبوت کا اعتقاد رکھنا تو ضروری ہے مگر اس کا ادراک مشکل ہے، واللہ اعلم کے علاوہ کوئی چارہ نہیں۔

فیضانِ علوم (وحی) کی صورتیں

سورۃ الشوریٰ آیت ۵۱ میں ہے کہ: "کسی بشر کی یہ شان نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس سے (روبرو) کلام کریں" یعنی کوئی بھی بشر اپنی عنصری ساخت اور موجودہ قویٰ کے اعتبار سے یہ طاقت نہیں رکھتا کہ اللہ تعالیٰ اس دنیا میں اس کے سامنے ظاہر ہو کر اس سے بالمشافہ کلام فرمائیں اور وہ تحمل کر سکے۔ نیز اللہ تعالیٰ عالی شان ہیں۔ ان کی شان کی بلندی بھی مانع ہے کہ وہ بشر سے روبرو کلام فرمائیں۔ مگر وہ بڑی حکمت والے بھی ہیں۔ ان کی حکمت مقتضی ہوئی کہ فیضانِ علوم کے لئے قابلِ تحمل شکلیں تجویز فرمائیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ بندوں پر چار طرح سے علوم کا فیضان فرماتے ہیں۔

پہلی صورت: اشارہ سے علوم کا فیضان کرنا یعنی اللہ تعالیٰ کوئی مضمون دل میں ڈال دیتے ہیں اور اس کی دو صورتیں ہوتی ہیں: کبھی نیند میں بصورت خواب القاء فرماتے ہیں۔ نبی کا خواب بھی وحی ہوتا ہے۔ اس میں شیطانی تصرف نہیں ہو سکتا۔ اس صورت میں الفاظ عموماً اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہیں ہوتے۔ صرف ایک مضمون خواب کی شکل میں اللہ تعالیٰ دل میں ڈال دیتے ہیں، جس کو پیغمبر اپنے الفاظ میں تعبیر کرتے ہیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی متفق علیہ روایت میں ہے کہ: اول ما بدئ به رسول الله صلى الله عليه وسلم من الوحى الرؤيا الصالحة فى النوم (مشکوٰۃ، کتاب الفضائل، باب المبعث وبدء الوحى حدیث نمبر ۵۸۴۱) یعنی رسول اللہ ﷺ پر وحی کا آغاز نیند میں سچے خوابوں کے ذریعہ ہوا۔

اور کبھی بیداری میں جب بندہ غیب (اللہ تعالیٰ) کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ کوئی واضح علم، جو غور و فکر کا نتیجہ نہیں ہوتا، اس کے دل میں پیدا کر دیتے ہیں جیسا کہ بہت سی احادیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: القی فی رُوعی (میرے دل میں یہ بات ڈالی گئی)

قرآن کریم میں فیضانِ علوم کی ان دونوں صورتوں کو لفظ وحی سے تعبیر کیا ہے، وحی کے لغوی معنی ہیں اشارہ خفیہ، جو مذکورہ دونوں صورتوں کو شامل ہے، اور عرف میں وحی کا لفظ عام ہے، فیضانِ علوم کی تمام صورتوں کو وحی کہا جاتا ہے مگر سورۃ الشوریٰ کی آیت میں لغوی معنی مراد ہیں۔

دوسری صورت: اللہ تعالیٰ بلا واسطہ پردہ کے پیچھے سے بندے کو کوئی منظم و مرتب کلام سناتے ہیں۔ بندہ خوب سمجھتا ہے کہ وہ خارج سے سن رہا ہے مگر بندے کو کوئی بولنے والا نظر نہیں آتا یعنی نبی کی قوتِ سامعہ استماعِ کلام سے لذت اندوز ہوتی ہے مگر آنکھیں دولتِ دیدار سے متمتع نہیں ہوتیں۔

کوہ طور پر اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر اسی طریقہ سے وحی فرمائی تھی۔ اور شب معراج میں سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اسی صورت سے نوازا گیا تھا۔

تیسری صورت: فرشتہ مجسّم ہو کر نبی کے سامنے آتا ہے اور خدا کا کلام و پیام پہنچاتا ہے، جس طرح ایک آدمی دوسرے سے خطاب کرتا ہے۔ وحی کا یہ طریقہ بھی رہا ہے۔ قرآن کریم پورا اسی طریقہ سے بواسطہ جبرئیل نازل ہوا ہے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت جبرئیل ایک دو مرتبہ تو اپنی اصلی شکل میں نظر آئے ہیں۔ مگر اکثر وہ آدمی کی شکل میں تشریف لاتے تھے۔ اس وقت آپ کی آنکھیں فرشتہ کو دیکھتیں اور کان اس کی آواز سنتے تھے اور عام طور پر جبرئیل دوسروں کو نظر نہیں آتے تھے۔ مگر کبھی وہ صحابہ کو بھی نظر آتے تھے اور صحابہ بھی ان کی بات سنتے تھے، جیسا کہ حدیث جبرئیل میں آیا ہے۔

چوتھی صورت: جب بندہ [illegible] کی طرف پوری طرح متوجہ ہو جاتا ہے اور اس کے حواس معطل ہو جاتے ہیں یعنی کام کرنا چھوڑ دیتے ہیں تو نبی کو ایک گھنٹے کی سی آواز سنائی دیتی ہے اور اس ذریعہ سے وحی کی جاتی ہے۔ متفق علیہ حدیث میں ہے کہ حضرت حارث بن ہشام رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ آپ پر وحی کس طرح آتی ہے؟ آپ نے فرمایا:

"میرے پاس وحی کبھی گھنٹے کی آواز کی طرح آتی ہے۔ اور وحی کی یہ صورت مجھ پر بہت بھاری ہوتی ہے۔ پھر وہ مجھ سے موقوف ہوتی ہے اس حال میں کہ میں اس کو یاد کر چکا ہوتا ہوں" (مشکوۃ، کتاب الفضائل، باب المبعث وبدء الوحی، حدیث نمبر ۵۸۴۳)

علماء نے بیان کیا ہے کہ وحی کرنے والے فرشتے اور وحی لینے والے نبی میں مناسبت شرط ہے اور یہ مناسبت دو طرح پر پیدا کی جاتی ہے: کبھی فرشتہ کی ملکیت اور روحانیت نبی پر غالب آتی ہے اور نبی بشریت سے غائب ہو جاتا ہے تو مذکورہ صورت پیش آتی ہے اور کبھی نبی کی بشریت فرشتہ پر غالب آتی ہے تو فرشتہ بصورت بشر نمودار ہوتا ہے اور دوسری صورت پیش آتی ہے (مظاہر حق)

شاہ صاحب رحمہ اللہ نے اس چوتھی صورت کی نظیر پیش کی ہے کہ جس طرح غشی (بے ہوشی) طاری ہونے پر کبھی سرخ و سیاہ رنگ نظر آتے ہیں، اسی طرح اس چوتھی صورت کو سمجھنا چاہئے۔ یہ محض ایک نظیر ہے۔ مثال نہیں جو ممثل کا فرد ہوتی ہے۔

[۵] ولما كان قولنا: قدر فلان، إنما نعني به: أنه يمكن له أن يفعل، ولا يصده من ذلك سبب خارج، وإنما إيثار أحد المقدورين من القادر فإنه لا ينفي اسم القدرة؛ وكان الرحمن قادرا على كل شيء، وإنما يؤثر بعض الأفعال دون أضداده لعنايته واقتضائه الذاتي، وجب أن يسمى قادرا.

[۶] ولما كان قولنا: تكلم فلان فلانا، إنما نعني به: إفاضة المعاني المرادة، مقرونة بألفاظ

دالة عليها، وكان الرحمن ربما يُفيض على عبده علومًا، ويُفيض معها ألفاظًا منعقدة في خياله دالّةً عليها، ليكون التعليمُ أصرحَ ما يكون، وجب أن يسمى متكلّمًا.

قال الله تعالى: ﴿وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُكَلِّمَهُ اللَّهُ إِلَّا وَحْيًا أَوْ مِنْ وَرَاءِ حِجَابٍ أَوْ يُرْسِلَ رَسُولًا فَيُوحِيَ بِإِذْنِهِ مَا يَشَاءُ إِنَّهُ عَلِيٌّ حَكِيمٌ﴾ فالوحي: هو النَّفْثُ في الرُّوع برؤيا، أو خلق علمٍ ضروري عند توجهه إلى الغيب؛ ومن وراء حجاب: أن يسمع كلامًا منظومًا، كأنه سمعه من خارج، ولم ير قائله؛ أو يُرسل رسولاً: فيتمثل الملكُ له، وربما يحصُل عند توجهه إلى الغيب وانبهارِ الحواسِّ صوتُ صلصلة الجرس، كما قد يكون عند عروض الغَشْيِ من رؤية ألوانٍ حُمرٍ وسُودٍ.

ترجمہ: (۵) اور جب ہم کہتے ہیں کہ: "فلاں شخص قادر ہے" تو ہم اس سے مراد لیتے ہیں کہ اس کے لئے کرنا ممکن ہے، اس کو اس سے کوئی خارجی سبب نہیں روک سکتا۔ اور با اقتدار کا دو زیرِ قدرت چیزوں میں سے ایک کو ترجیح دینا تو یہ چیز "قدرت" کے اطلاق کی نفی نہیں کرتی۔ اور مہربان اللہ قادر ہیں ہر چیز پر۔ اور وہ بعض کاموں کو ان کی ضد پر اپنی مہربانی اور اپنے ذاتی چاہنے سے ترجیح دیتے ہیں، تو ضروری ہوا کہ ان کا قادر نام رکھا جائے۔

(۶) اور جب ہم کہتے ہیں کہ: "فلاں نے فلاں سے بات کی" تو ہم اس سے مراد لیتے ہیں معنیٰ مرادی کے افادہ (پہنچانے) کو، درانحالیکہ وہ ایسے الفاظ کے ساتھ مقرون ہوتے ہیں جو ان معانی پر دلالت کرتے ہیں۔ اور مہربان اللہ کبھی اپنے بندے پر علوم کا فیضان کرتے ہیں اور ان کے ساتھ ایسے الفاظ کا بھی فیضان کرتے ہیں جو اس بندہ کی قوت خیالیہ میں منعقد ہوجاتے ہیں، جو ان علوم پر دلالت کرتے ہیں، تاکہ تعلیم زیادہ سے زیادہ صراحت کے ساتھ ہو، تو ضروری ہوا کہ ان کا نام متکلم (بات کرنے والا) رکھا جائے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "اور کسی بشر کی یہ طاقت نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس سے کلام کرے، مگر اشارہ کے طور پر، یا پردے کے پیچھے سے، یا کسی فرشتہ کو بھیج دے پس وہ خدا کے حکم سے، جو خدا کو منظور ہو پیغام پہنچا دے، وہ بڑی اونچی شان والا بڑی حکمت والا ہے۔" پس وحی: وہ دل میں کوئی بات ڈالنا ہے خواب کے ذریعہ یا اس بندہ کے غیب (اللہ تعالیٰ) کی طرف توجہ کرنے کی صورت میں (دل میں) نہایت واضح علم پیدا کرنے کے ذریعہ۔ اور پردے کے پیچھے سے: یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کوئی منظم کلام سنائیں، گویا اس نے اس کو باہر سے سنا اور اس کے بولنے والے کو نہیں دیکھا۔ یا بھیجیں رسول کو: یعنی فرشتہ بندہ کے سامنے متمثل ہو۔ اور کبھی بندے کے غیب (اللہ تعالیٰ) کی طرف توجہ کرنے کے وقت اور حواس کے مغلوب ہونے کے وقت گھنٹے کی سی آواز حاصل ہوتی ہے، جیسے کبھی غشی طاری ہونے پر سرخ و سیاہ رنگ نظر آتے ہیں۔

☆ ☆ ☆

(۷) صفات رضا و شکر، سخط و لعن اور اجابتِ دعا کا بیان: مقدس بارگاہ میں انسانوں کے لئے ایک پروگرام ہے، جس کا نوعِ بشری میں جاری کرنا مقصود ہے۔ اسی لئے نبوت کا سلسلہ جاری فرمایا ہے اور انبیاء کے ذریعہ وہ نظام انسانوں کو پہنچایا ہے۔ تاکہ لوگ اس نظام پر عمل پیرا ہوں۔ اب اگر لوگ اس مطلوب نظام کا اتباع کریں گے تو وہ ملأ اعلیٰ کے ساتھ لاحق ہوں گے اور اللہ تعالیٰ ان کو بشریت کی آلودگیوں سے نکال کر نورانیت کی طرف، اور اپنی بخششوں کی کشادگی کی طرف نکالیں گے اور ان کو نفسانی اور روحانی لذتیں، راحتیں اور نعمتیں حاصل ہوں گی یعنی وہ نیک روی پر شاداں و فرحاں ہوں گے۔ اور فرشتوں اور انسانوں کو الہام پہنچایا جائے گا کہ وہ ان لوگوں کے ساتھ حسن سلوک کریں۔

اور اگر لوگ اس نظام مقصود کی خلاف ورزی کریں گے تو وہ ملأ اعلیٰ سے دور ہو جائیں گے۔ ان پر ملأ اعلیٰ کے توسط سے اللہ کا بغض نازل ہوگا، جیسا کہ مسلم شریف کی روایت میں آیا ہے[1] اور وہ دنیا میں اس طور پر عذاب الیم میں مبتلا کردیئے جائیں گے جس کی تفصیل بحث دوم کے باب اول میں گذری ہے۔

غرض مذکورہ وجوہ سے یہ کہنا ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ بندوں سے خوش ہوئے یا راضی ہوئے اور اللہ تعالیٰ نے بندوں کے بہتر سلوک پر ان کی تعریف کی یا نافرمانی پر ان کو پھٹکارا۔ اور یہ سب صفات فعلیہ ہیں، کیونکہ ضدین کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو متصف کرنا درست ہے۔

اس کے بعد ایک جملہ میں ایک سوال کا جواب ہے:

سوال: جب اللہ تعالیٰ کے پاس بندوں کے لئے ایک مطلوب نظام ہے تو جو لوگ اس کو اپنائیں انہیں کو پنپنے کا موقعہ دیا جانا چاہئے، اور جو اس نظام کی خلاف ورزی کریں ان کو کیفر کردار تک پہنچا دیا جانا چاہئے۔ حکومتیں موافقین کو محبوب رکھتی ہیں اور مخالفین کا قلع قمع ضروری خیال کرتی ہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ مطلوب نظام کے مخالفین کو کیوں برداشت کرتے ہیں؟

جواب: اس عالم میں تمام امور کا مرجع درحقیقت یہ امر ہے کہ نظامِ عالم مصلحتِ خداوندی کے مقتضی کے مطابق جاری رہے اور مصلحت خداوندی یہ ہے کہ یہاں خیر کے ساتھ شر بھی رہے مثلاً کھیتی سے مقصود غلہ ہوتا ہے مگر بھوسا بھی ساتھ رہتا ہے، جو بالآخر جانوروں کا چارہ بنتا ہے۔ اگر اس عالم میں خیر محض ہوتی تو یہ عالم فرشتوں کی دنیا بن کر رہ جاتا۔ اس کا امتیاز ختم ہو جاتا۔ اور فرشتوں کی دنیا پہلے سے موجود تھی، اس عالم کو پیدا کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی" سورۃ البقرہ آیت ۳۰ میں فرشتوں کا یہی سوال مذکور ہے اور آخر میں اللہ تعالیٰ کا یہی جواب ہے کہ: "میں جانتا ہوں اس بات کو جس کو تم نہیں جانتے" یہ اسی حکمت و مصلحت کی طرف اشارہ ہے جس کے مقتضی کے مطابق اس عالم کا کاروبار چل رہا ہے (جواب تمام ہوا)

اسی طرح جب بندہ اللہ تعالیٰ سے اپنی حاجت مانگتا ہے تو جو دعا نظامِ عالم کے مقتضی کے مطابق ہوتی ہے وہ قبول کی

---

[1] دیکھئے مشکوٰۃ شریف کتاب الآداب باب الحب فی اللہ ومن اللہ حدیث نمبر ۵۰۰۵ کہ جب اللہ تعالیٰ کسی بندہ سے نفرت کرتے ہیں تو جبرئیل علیہ السلام کو بتاتے ہیں کہ مجھے فلاں بندہ سے نفرت ہے تم بھی اس سے نفرت کرو الخ۔

جاتی ہے اور بندہ کو مطلوبہ چیز دے دی جاتی ہے۔ اور جس چیز کا دینا مصلحت نہیں ہوتا وہ نہیں دی جاتی۔ پس یہ کہنا درست ہے کہ "بندے نے دعا قبول فرمائی یا اللہ نے دعا قبول نہیں فرمائی" پس یہ بھی تعدی صفت ہے، اور فعلی صفت ہے۔

تو کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں یہ نہیں فرمایا کہ "بندہ جو کچھ مجھ سے مانگے گا میں اس کو ضرور دوں گا" بلکہ سورۃ البقرۃ آیت ۱۸۶ میں یہ فرمایا ہے کہ "میں درخواست کرنے والے کی ہر عرضی منظور کر لیتا ہوں جبکہ وہ میرے حضور میں درخواست پیش کرے" ﴿أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ﴾ اور حدیث شریف میں اس کی تفسیر یہ آئی ہے کہ

"مسلمان جب بھی کوئی دعا کرتا ہے، بشرطیکہ گناہ کی یا قطع رحمی کی دعا نہ کرے، تو اللہ تعالیٰ اس کو تین چیزوں میں سے ایک چیز ضرور عطا کرتے ہیں: یا تو جو مانگا ہے وہ جلد دنیا ہی میں مل جاتا ہے، یا اس کی دعا کو آخرت کے لئے ذخیرہ کر کے رکھ لیا جاتا ہے، یا اس مطلوبہ خیر کے بقدر کوئی تکلیف اس سے دور کر دی جاتی ہے" (رواہ احمد، مشکوۃ، کتاب الدعوات، فصل ثالث حدیث نمبر ۲۲۵۹)

یعنی بندہ کی کوئی بھی جائز دعا رد نہیں کی جاتی، ہر درخواست قبول کر لی جاتی ہے۔ رہا دینا، سو دینا تو یہ نظامِ عالم کی مصلحت پر موقوف ہے، اگر مصلحت ہوتی ہے تو مطلوبہ چیز دے دی جاتی ہے، ورنہ دعا کی وجہ سے مطلوبہ چیز کے بقدر کوئی تکلیف دور کر دی جاتی ہے، پھر اس دعا کو عبادت گردان کر نامۂ اعمال میں لکھ لیا جاتا ہے، جو آخرت میں اس کے کام آتی ہے۔ کیونکہ دعا نہ صرف یہ کہ عبادت ہے بلکہ وہ عبادات کا گودا ہے جیسا کہ حدیث میں آیا ہے۔

اس کی مثال یہ ہے کہ کسی کا اکلوتا بیٹا ملیریا کا شکار ہو جائے اور وہ حسب عادت قلفی مانگے تو شفیق باپ اس کو جھڑک نہیں دیتا، بلکہ درخواست قبول کر لیتا ہے اور نوکر کو بازار کی طرف روانہ کر دیتا ہے کہ جاؤ قلفی لاؤ۔ نوکر چلا جائے گا اور واپس نہیں آئے گا۔ بچہ تھوڑی دیر میں اپنا مطالبہ بھول جائے گا۔ باپ بچے کو برف اسی وقت دے گا جب ڈاکٹر اجازت دے گا، کیونکہ باپ کو بیٹے کی زندگی سے کھیلنا نہیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ بندوں پر باپ سے زیادہ شفیق ہیں۔ وہ بندوں کی ہر دعا قبول فرما لیتے ہیں، مگر دیتے وہی ہیں جس کا دینا مصلحت ہوتا ہے۔ اللہ اکبر! کیسی شان رحمت ہے!!

(۸) صفت رؤیت کا بیان: رؤیت مصدر مجہول ہے۔ رأی یری رؤیۃ کے معنی ہیں دیکھنا، نظر آنا، اور رؤیت کا مطلب ہمارے عرف میں مرئی کا پوری طرح سے منکشف ہونا ہے۔ اور آخرت میں صورت حال یہ ہوگی کہ جب مومن بندے جنت میں پہنچ جائیں گے، جس کا ان سے وعدہ کیا گیا ہے، تو وہ رب العالمین کی اس تجلی اعظم کا مرئی آنکھوں سے دیدار کریں گے جو عالم مثال کے درمیان میں قائم ہے، اس کے متعلق صحیح حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ "بے شک تم اللہ کو دیکھو گے جس طرح چودھویں کے چاند کو دیکھتے ہو"۔ پس ضروری ہے کہ صفت رؤیت اللہ تعالیٰ کے لئے ثابت کی جائے۔ مگر یہ درحقیقت بندوں کی صفت ہے، مگر چونکہ اس کا اللہ تعالیٰ سے تعلق ہوتا ہے اس لئے مجازاً اس کو اللہ تعالیٰ کی صفت شمار کرتے ہیں۔ واللہ اعلم۔

[۷] ولما كان في حظيرة القدس نظامٌ، مطلوبةٌ إقامته من البشر، فإن وافقوه لحقوا بالملأ الأعلى، وأُخرجوا من الظلمات إلى نور الله وبَسْطِه، ونُفِثَ في أنفسهم، وأُلهمت الملائكة وبنو آدم أن يُحسنوا إليهم؛ وإن خالفوا بانُوا من الملأ الأعلى، وأُصيبوا ببغضة منهم، وعُذِّبوا بنحو ما ذُكر، وجب أن يقال: رَضِيَ وشَكَرَ، أو سَخِطَ ولَعَنَ؛ والكلُّ يرجع إلى جريان العلم حسب مقتضى المصلحة؛ وربما كان من نظام العالم خلق المدعوِّ إليه، فيقال: استجاب الدعاء.

[۸] ولما كانت الرؤيةُ في استعمالنا انكشاف المرئيِّ أتمَّ ما يكون، وكان الناس إذا انتقلوا إلى بعض ما وُعِدوا من المعاد، فُصِلوا بالتجلي القائم وسط عالم المثال، ورأوه رأيَ عين بأجمعهم، وجب أن يقال: إنكم سترونه كما ترون القمر ليلة البدر، والله أعلم.

ترجمہ: اور جب حظیرۃ القدس (بارگاہِ مقدس) میں ایسا پروگرام تھا جس کا برپا کرنا انسانوں سے مقصود ہے۔ پس اگر لوگ اس کی موافقت کریں گے تو وہ ملأ اعلیٰ کے ساتھ ملیں گے اور وہ تاریکیوں سے اللہ کے نور اور اللہ کی کشادگی کی طرف نکالے جائیں گے اور وہ ان کے دلوں میں ڈالی جائیں گے اور فرشتے اور انسان الہام کئے جائیں گے کہ وہ ان کے ساتھ حسن سلوک کریں۔ اور اگر لوگ اس نظام کی مخالفت کریں گے تو وہ ملأ اعلیٰ سے جدا ہو جائیں گے۔ اور وہ اللہ کا بغض (نفرت) پہنچائے جائیں گے ملأ اعلیٰ کی طرف سے۔ اور سزا دیئے جائیں گے اس طور پر جو ذکر کی گئی۔ تو ضروری ہوا کہ کہا جائے: "وہ خوش ہوا اور اس نے بندوں کے بہتر سلوک پر ان کی تعریف کی یا وہ ناراض ہوا اور اس نے نافرمانوں کو پھٹکارا" اور سب کچھ لوٹتا ہے دنیا کے چلنے کی طرف مصلحت خداوندی کے مطابق۔ اور کبھی نظامِ عالم میں سے اس چیز کا پیدا کرنا ہوتا ہے جس کی دعا مانگی گئی ہے پس کہا جاتا ہے: "اس نے دعا قبول کی"

(۸) اور جب رویت (دیکھنا) ہمارے عرف میں مرئی کا انکشاف ہے زیادہ سے زیادہ مکمل طور پر جو ہو سکے۔ اور لوگ جب منتقل ہوں گے بعض ان جگہوں کی طرف جن کا وعدہ کئے گئے ہیں آخرت میں تو وہ مل جائیں گے اس تجلی کے ساتھ جو عالم مثال کے بیچ میں قائم ہے اور وہ سب اس تجلی کو دیکھیں گے سر کی آنکھوں سے تو ضروری ہوا کہ کہا جائے: "بے شک تم اس کو دیکھو گے جس طرح چاند کو دیکھتے ہو چودہویں رات میں" باقی اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں۔

لغات:

بَسْطَة: کشادگی... بَانَ مُبَايَنَةً: ایک دوسرے سے جدا ہونا... شَكَر: قدر دانی کی، حق ادا کیا، بہتر سلوک پر تعریف کی... المرئي: دیکھی جانے والی چیز، نظر آنے والی چیز۔

☆ ☆ ☆

باب — ۵

تقدیر پر ایمان لانے کا بیان

تقدیر کے معنی: قَدَر (ض، ن) قَدْرًا و قَدَرًا اور قَدَّرَ تقدیرًا کے معنی ہیں فیصلہ کرنا، حکم لگانا۔ کہا جاتا ہے: قَدَرَ اللّٰہُ علیہ الأمرَ اور قَدَّرَ لہ الأمرَ: اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے کسی امر کا فیصلہ فرمایا، کوئی چیز اس کے لئے تجویز کی۔ شریعت کی اصطلاح میں تقدیر نام ہے قضاء وقدر کا، یعنی کائنات کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے ازل میں جو فیصلہ فرمایا ہے اس کا نام "تقدیر الٰہی" ہے۔ عربی میں عام طور پر لفظ قَدَر کا استعمال ہوتا ہے اور اردو میں "تقدیر" کا۔ مطلب دونوں کا ایک ہے۔

تقدیر مُلْزِم کا مطلب: مُلْزِم (اسم فاعل) باب افعال سے ہے أَلْزَمَ الشیئَ کے معنی ہیں لازم کرنا۔ اور قدرِ ملزم کا مطلب ہے: اللہ کا وہ فیصلہ جو لازم کرنے والا ہے یعنی جس کے مطابق کائنات کا وجود پذیر ہونا ضروری ہے۔ اُس طے شدہ امر سے حوادث کا تخلف نہیں ہوسکتا۔

اور تقدیر معلق (لٹکی ہوئی) صرف بندوں کے اعتبار سے ہوتی ہے، جس کا ذکر حدیث شریف میں آیا ہے کہ: "والدین کے ساتھ حسن سلوک عمر بڑھاتا ہے اور جھوٹ روزی گھٹاتا ہے اور دعا فیصلۂ خداوندی کو پھیر دیتی ہے" (رواہ الاصبہانی۔ ترغیب ۳: ۵۱۱) یہ باتیں معلق صرف بندوں کے علم اور ظہور حوادث کے اعتبار سے ہیں۔ علم الٰہی کے تعلق سے ہر چیز طے شدہ ہے۔ ازل سے خدا کو معلوم ہے کہ کیا ہونا ہے، جیسے کہا جاتا ہے کہ طالب علم اگر محنت کرے گا تو امتحان میں کامیاب ہوگا اور کھیلے کودے گا تو فیل ہوگا۔ یہ بات صرف بندوں کے اعتبار سے ہے۔ اللہ تعالیٰ کے علم ازلی کے اعتبار سے نہیں ہے۔ ان کو ازل سے وہ پہلو معلوم ہے جو ظہور پذیر ہوگا۔ بلکہ وہ پہلو انہی کا طے کیا ہوا ہے۔ ورنہ علم الٰہی کا ناقص ہونا لازم آئے گا کہ کچھ باتیں ان کو ازل میں متعین طور پر معلوم نہیں۔ توبہ! توبہ!! — اور شاہ صاحب رحمہ اللہ کی تعبیر میں محو وثبات کا تعلق عالم مثال سے ہے، ام الکتاب سے نہیں ہے۔ تفصیل باب کے آخر میں آرہی ہے۔

تدبیر وحدانی کا مطلب: تدبیر کے معنی ہیں نظم ونسق کرنا۔ اور وَحَدَ یَحِدُ وَحْدًا کے معنی ہیں: "اکیلا ہونا" صفت وحید آتی ہے۔ پس "تدبیر وحدانی" کے معنی ہیں "متحدہ برتاؤ" یعنی طے شدہ پالیسی کے مطابق سب کے ساتھ یکساں برتاؤ۔ ایسا دستوری مملکت یا ادارہ میں ہوتا ہے، ڈکٹیٹر شپ میں کوئی دستور نہیں ہوتا۔ خداوند قدوس نے خود ہی اپنی کائنات کے لئے ایک دستور تجویز فرمایا ہے۔ اس کا نام تقدیر الٰہی اور قضاء وقدر ہے اور وہ اسی کے مطابق مخلوقات کے ساتھ دستوری معاملہ فرماتے ہیں۔

مجمل بری تقدیر کا مطلب: حدیث جبرئیل میں ایمانیات میں تُؤمِنَ بالقَدَرِ خیرِہِ وشرِّہِ آیا ہے یعنی مؤمن

ہونے کے لئے تقدیر پر ایمان لانا بھی ضروری ہے۔ اس کے بھلے پر بھی اور اس کے برے پر بھی۔ اور ابن ماجہ کے مقدمہ میں والاقدار کلہا، خیرہا وشرہا حلوہا ومرہا آیا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی تمام طے کردہ باتوں پر، خواہ وہ بھلی ہوں یا بری، میٹھی ہوں یا کڑوی، ایمان لانا ضروری ہے۔ ان حدیثوں میں ضمیروں کا مرجع قدر اور اقدار ہیں اور تقدیر الٰہی کا بھلا برا اور میٹھا کڑوا ہونا انسانوں کے اعتبار سے ہے۔ یعنی خواہ وہ طے کردہ چیزیں انسانوں کے لئے مفید ہوں یا مضر، میٹھی ہوں یا کڑوی یعنی بھلی لگیں یا بری، سب پر ایمان لانا ضروری ہے۔ جیسے گل قند کے بارے میں تجویز الٰہی یہ ہے کہ وہ صحت بخش ہے اور زہر کے بارے میں یہ ہے کہ وہ مہلک ہے۔ ایمان اور اعمال صالحہ کے بارے میں طے کیا گیا ہے کہ وہ جنت نصیب کرنے والے اعمال ہیں اور کفر و معاصی جہنم رسید کرنے والے ہیں یعنی اول انسان کے لئے مفید اور ثانی مضر اعمال ہیں۔ اسی طرح بچے کا زندہ رہنا ماں کو پسند ہے اور مر جانا ناپسند ہے۔ بہرحال یہ سب باتیں اللہ کی طرف سے طے شدہ ہیں اور ان پر ایمان لانا اور عمل پیرا ہونا ضروری ہے۔ کوئی چیز اس کی حد تک ہر شخص تقدیر الٰہی کا قائل بھی ہے اور اس کا پابند بھی ہے۔ لوگ بڑی قیمت ادا کر کے گل قند خریدتے ہیں اور استعمال کرتے ہیں اور زہر کے پاس بھی کوئی نہیں جاتا۔ کسی عقلمند کو اس معاملہ میں تقدیر الٰہی پر اعتراض نہیں ہے۔ مگر جب ایمان و اعمال صالحہ اور کفر و اعمال خاطئہ کا موضوع آتا ہے تو انسان طرح طرح کی باتیں نکالتا ہے اور اس کا بچہ فوت ہو جاتا ہے تو جزع فزع کی حد کر دیتا ہے۔ بات درحقیقت یہ ہے کہ بدکار آدمی کفر و معاصی کے ساتھ جنت نصیب بننا چاہتا ہے، گل قند کے بدلے زہر کیسے حاصل کیا جا سکتا ہے! اور جو چاہتا ہے کہ اس کا لاڈلا نہ مرے وہ درحقیقت اپنی مرضی مولیٰ کی مرضی پر غالب کرنا چاہتا ہے۔ ایسا کبھی ہوا ہے؟

تقدیر کی ضرورت: اللہ تعالیٰ فعال لما یرید ہیں۔ وہ جو چاہیں کائنات میں تصرف کر سکتے ہیں اور وہ اپنے چاہنے میں کسی کے پابند نہیں ہیں۔ وہ اپنی مشیت میں ہر طرح آزاد ہیں۔ مگر یہ ان کا مخلوقات پر فضل و کرم ہے اور انسان کے لئے جس کو خلافت ارضی سونپی گئی ہے ضروری بھی ہے کہ انہوں نے اپنی مشیت کو آزاد اور بے قید نہیں رکھا، بلکہ ہر چیز کو تقدیر الٰہی سے وابستہ کر دیا ہے۔ کوئی امر منتظر نہیں رکھا، ہر بات طے شدہ ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ ایسا نہ کرتے تو انسان بڑی الجھن میں پڑ جاتا۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا کہ وہ کیا کھائے اور کیا نہ کھائے۔ کیونکہ نتیجہ معلوم نہیں۔ اس کو نہیں معلوم کہ اللہ تعالیٰ کس چیز کے کیا آثار ظاہر فرمائیں گے، کیونکہ آثار ابھی تک طے شدہ نہیں ہیں۔ اسی طرح وہ اس تحیر میں ہوتا کہ وہ کونسی زندگی اپنائے جس سے مولیٰ خوش ہوں اور کیسی زندگی بتانے سے احتراز کرے جس سے مولیٰ ناخوش ہوں۔ وہ ہمیشہ شش و پنج میں مبتلا رہتا، کوئی فیصلہ نہ کر پاتا، کیونکہ کوئی بات طے شدہ نہیں ہے۔ اور اب جبکہ سب باتیں طے پا چکی ہیں، انسان ہر چیز کے متعلق آسانی سے فیصلہ کر سکتا ہے۔ عقل کی روشنی یا معمولی راہنمائی بھی اس کے لئے کافی ہے۔ اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ہر چیز کے بارے میں عقل سے کام لینے اور اس میں غور و فکر کی دعوت دی ہے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ اگر زندگی اور کائنات کے لئے کوئی قانون یا نظام ہی نہ ہوتا اور یہ سب کچھ بے قید مشیت ایزدی کی کرشمہ سازیوں کا نتیجہ ہوتا

تو پھر ان میں غور وفکر کی ضرورت ہی کیا تھی؟ اور اگر کوئی غور وفکر کرتا بھی تو اس کا حاصل کیا ہوتا؟!

تقدیر کا دائرہ: کائنات خواہ ارضی ہو یا سماوی، اس کا کوئی ذرہ اور اس کا کوئی حال تقدیر کے دائرہ سے باہر نہیں۔ اور تقدیر صرف اجمالی نہیں، بلکہ جملہ تفصیلات کے ساتھ طے شدہ ہے یعنی تقدیر میں صرف مسببات ومعلولات ہی نہیں ہیں، بلکہ ان کے اسباب وعلل بھی ہیں۔ ایک صحابی نے آنحضور ﷺ سے دریافت کیا کہ آپ ؐ یہ ارشاد فرماتے ہیں اس بارے میں کہ وہ جھاڑ پھونک جس کو ہم (دکھ درد میں) استعمال کرتے ہیں اور وہ دوائیں جن سے ہم اپنا علاج کرتے ہیں اور وہ پرہیز (اور بچاؤ کی تدبیریں) جس کو ہم اپناتے ہیں، کیا یہ چیزیں قضاء وقدر کو لوٹا سکتی ہیں؟ آپ ؐ نے جواب دیا: "یہ سب چیزیں بھی اللہ کی تقدیر سے ہیں" (رواہ الترمذی وابن ماجہ واحمد، مشکوٰۃ کتاب الایمان، باب الایمان بالقدر، حدیث نمبر ۹۷) رسول اللہ ﷺ کے جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ ہم جن مقاصد کے حاصل کرنے کے لئے جو تدبیریں اور کوششیں کرتے ہیں، اور اس سلسلہ میں جن اسباب کو استعمال کرتے ہیں، وہ سب بھی اللہ کی قضاء وقدر کے ماتحت ہیں یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ مقدر ومقرر ہے کہ فلاں شخص پر فلاں بیماری آئے گی اور فلاں قسم کی جھاڑ پھونک یا فلاں دوا کے استعمال سے وہ اچھا ہو جائے گا (معارف الحدیث ۱:۷۱)

دوسری حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ: "ہر چیز تقدیر سے ہے، یہاں تک کہ آدمی کا ناکارہ (ناقابل) ہونا اور ہوشیار ہونا (رواہ مسلم، حوالہ بالا حدیث نمبر ۸۰) مطلب یہ ہے کہ آدمی کی صفات: قابلیت وناقابلیت، صلاحیت وعدم صلاحیت اور کند ذہنی وبے وقوفی وغیرہ بھی اللہ کی تقدیر ہی سے ہیں۔ الغرض اس دنیا میں جو کوئی جیسا اور جس حالت میں ہے وہ اللہ کی قضاء وقدر کے ماتحت ہے (معارف الحدیث ۱:۷۳)

اسی طرح مکلف مخلوقات کے جملہ احوال بھی قضاء وقدر کے دائرہ میں ہیں یعنی یہ طے کر دیا گیا ہے کہ جن وانس ایک جزوی اختیار رکھنے والی مخلوقات ہوں گی اور ان میں سے فلاں فلاں اپنے کسب واختیار سے یہ یہ عمل کر کے جنت میں جائیں گے اور اتنے افراد یہ یہ عمل کر کے جہنم میں جائیں گے اور دیگر مخلوقات کے لئے جزوی اختیار بھی نہیں ہوگا اس لئے وہ پاداش عمل کے قانون سے مستثنیٰ رہیں گی۔ غرض سب احوال اپنی تمام تر تفصیلات کے ساتھ تقدیر الٰہی میں طے شدہ ہیں۔

تقدیر کا مسئلہ آسان ہے: اور تقدیر کا مسئلہ آسان ہے۔ اس میں کچھ پیچیدگی نہیں۔ یہ مسئلہ نصرانی کی تثلیث کی طرح نہیں ہے، جس کا راز آج تک کوئی نہیں سمجھ سکا نہ آئندہ سمجھ سکے گا۔ اور اس کی دلیل یہ ہے کہ تقدیر پر ایمان لانا ایمانیات میں شامل ہے۔ تقدیر پر ایمان لائے بغیر کوئی شخص مؤمن نہیں ہو سکتا۔ اور ایمان کا مکلف ہر عاقل وبالغ ہے اور سب لوگوں کی عقلیں یکساں نہیں ہیں۔ پس کوئی ایسا مسئلہ ایمانیات میں کیسے شامل کیا جا سکتا ہے جو ہر ایک کے لئے قابل فہم نہ ہو، ورنہ بعض لوگوں کے حق میں تکلیف مالایطاق لازم آئے گی، جو باطل ہے پس لامحالہ یہ بات تسلیم کرنی ہوگی کہ تقدیر کا مسئلہ ہر کس وناکس کے لئے قابل فہم ہے، کیونکہ یہ کوئی دقیق مسئلہ نہیں ہے ورنہ ترمذی شریف (۲:۳۵) کی

روایت میں جو تقدیر کے باب میں تنازع کی ممانعت آئی ہے اور اس معاملہ میں تنازع کی وجہ سے امم سابقہ کے ہلاک ہونے کا ذکر آیا ہے۔ اس حدیث میں تنازع سے مراد بحث ومباحثہ ہے اور قضا وقدر میں بحث ممنوع اس لئے ہے کہ یہ خدا کی صفات میں بحث ہے۔ کیونکہ قضا وقدر اللہ کی صفت ہے، اور صفات میں بحث کی ذات میں غور وفکر ہے اور خالق میں غور کرنے کی ممانعت آئی ہے جیسا کہ صفات کے بیان میں گذرا۔

اور سابقہ امتوں کے ہلاک ہونے سے مراد غالباً ان کی گمراہی ہے۔ قرآن وحدیث میں ہلاکت کا لفظ گمراہی کے لئے بکثرت استعمال ہوا ہے اس بناء پر آپ کے ارشاد کا مطلب یہ ہوگا کہ اگلی امتوں میں اعتقادی گمراہیاں اس وقت آئیں جب انھوں نے اس مسئلہ کو حجت وبحث کا موضوع بنایا — تاریخ شاہد ہے کہ امت محمدیہ میں بھی اعتقادی گمراہیوں کا سلسلہ اسی مسئلہ سے شروع ہوا ہے" (معارف الحدیث ۱۷۵:۱)

تقدیر کا مسئلہ مشکل کیوں بن گیا ہے؟: اور تقدیر کا مسئلہ دو وجہ سے مشکل بن گیا ہے۔

پہلی وجہ: یہ بات بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ تقدیر کا مسئلہ درحقیقت صفات باری تعالیٰ کا مسئلہ ہے۔ اور صفات الٰہیہ کو ایک حد تک ہی سمجھا جاسکتا ہے۔ ان کی تمام حقیقت جاننا انسان کے بس کی بات نہیں۔ صفات کے باب میں ایک حد تک پہنچ کر رک جانا پڑتا ہے۔ اسی طرح تقدیر کے مسئلہ میں بھی ایک حد پر رکنا ضروری ہے مگر لوگ رکتے نہیں، سب کچھ سمجھنا چاہتے ہیں، حالانکہ یہ بات صفات کے تعلق سے ممکن نہیں۔ یہی بات درج ذیل حدیث میں سمجھائی گئی ہے:

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تم میں سے ہر ایک کا ٹھکانا دوزخ کا اور جنت کا لکھا جاچکا ہے" (یہی تقدیر کا مسئلہ اتنا ہی ہے) صحابہ نے عرض کیا: تو کیا ہم اس نوشتہ پر بھروسہ کرکے نہ بیٹھ جائیں اور عمل نہ چھوڑ دیں؟! (یہ تقدیر کے مسئلہ پر اٹھنے والا سوال ہے) آپ نے فرمایا: "عمل کئے جاؤ، ہر ایک کے لئے وہی عمل آسان کیا جاتا ہے جس کے لئے وہ پیدا کیا گیا ہے: نیک بخت کو نیک بختی کے کاموں کی توفیق ملتی ہے اور بدبخت کو بدبختی کے کاموں کی۔ اور دلیل میں آپ نے سورۃ اللیل کی آیات ۵—۱۰ پیش فرمائیں" (متفق علیہ مشکوٰۃ حدیث نمبر ۸۵)

اس حدیث میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے سوال کا جواب نہیں دیا، بلکہ ان کو عمل میں لگایا ہے۔ کیونکہ قضا وقدر کے مسئلہ کو جس حد تک آپ نے بیان فرمایا ہے، اسی حد تک سمجھا جاسکتا ہے اس سے آگے کی بات سمجھنے کی کوشش نہیں کرنی چاہئے۔ اس حد پر رک جانا ضروری ہے۔ تمام صفات خداوندی کا یہی معاملہ ہے۔

رہی یہ بات کہ تقدیر کا مسئلہ صفات الٰہیہ کا مسئلہ کیسے ہے؟ تو یہ بات اس سے واضح ہے کہ عرف میں قضا وقدر ایک ساتھ بولتے ہیں۔ یہ دو مترادف لفظوں کا عطف تفسیری کے ساتھ استعمال ہے۔ اور "قضا" کا صفت الٰہی ہونا قرآن کریم میں دسیوں جگہ مذکور ہے۔ مثلاً ﴿وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ﴾ (بنی اسرائیل ۲۳) اور سورۃ الاحزاب آیت ۳۸ میں ہے ﴿وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ قَدَرًا مَّقْدُوْرًا﴾ (اور اللہ کا حکم (پہلے سے) تجویز کیا ہوا ہے) ان آیات سے قضاء

وقدر کا صفت الٰہی ہونا صراحت کے ساتھ ثابت ہے۔

دوسری وجہ: ہماری صفات مفہوم کے اعتبار سے ہماری ذوات سے زائد (مغائر) ہیں اور وجود کے اعتبار سے متحد۔ اسی طرح ہماری متعدد صفات اپنے اپنے مفاہیم کے اعتبار سے جدا جدا ہیں، مگر سب ذات کے وجود میں شامل ہیں یعنی صفات، ذات کے ساتھ مل کر ایک اکائی (Unit) بناتی ہیں۔ یہی حال بلاتشبیہ ذات رب اور صفات الٰہیہ کا ہے۔ اور ہر صفت کا اپنا ایک دائرۂ کار ہے، جیسے صفت سمع کا دائرہ الگ ہے اور صفت بصر کا الگ۔ مگر کبھی ایک صفت کے دوسری صفت پر اثرات بھی پڑتے ہیں۔ اگر ان سب باتوں کو باریک بینی سے ملحوظ نہ رکھا جائے تو حقائق فہمی میں دشواری پیش آتی ہے۔ مثلاً خداوند قدوس کے تعلق سے اگر تقدیر معلق کا قائل ہوا جائے تو شمول علم کے مسئلہ پر اس کا اثر پڑے گا۔ یہ ماننا پڑے گا کہ اللہ کا علم عام وتام نہیں۔ حالانکہ شمول علم کے مسئلہ میں آج تک کسی فرقہ نے اختلاف نہیں کیا۔ اسی طرح بندوں کو ان کے اختیاری اعمال میں مختار کامل مانا جائے تو عموم قدرت کے مسئلہ پر اثر پڑے گا۔ ماننا پڑے گا کہ کچھ چیزیں اللہ کے اختیار میں نہیں ہیں، بندوں کے اختیار میں ہیں۔ تو یہ ایسی حماقت بھری بات کون مان سکتا ہے۔

اسی طرح لوگ قضاء وقدر کے مسئلہ کو شمول علم کے مسئلہ کے ساتھ رلا دیتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ کو ازل سے معلوم ہے کہ ایسا ہوتا ہے تو ویسا ہونا ضروری ہے، کیونکہ اللہ کا علم غلط نہیں ہوسکتا۔ پھر بندے بااختیار کیسے ہوئے؟ وہ تو مجبور محض ہوگئے! دیکھئے بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی؟! حالانکہ سوچنے کا انداز یہ ہونا چاہئے تھا کہ اگر ازل میں سب چیزوں کو طے شدہ نہیں مانیں گے تو شمول علم کی بات غلط ہوکر رہ جائے گی۔ جب کائنات کے ذرہ ذرہ پر اللہ کا علم محیط ہے تو ضروری ہے کہ ہر چیز ازل سے طے شدہ ہو، ورنہ اللہ کو ان کا علم کیسے ہوگا؟! غرض صفات کا دائرۂ کار ملحوظ نہ رکھنے سے اور ایک صفت کے دوسری صفت پر پڑنے والے اثرات کا خیال نہ رکھنے سے تقدیر کا مسئلہ پیچیدہ ہوگیا ہے۔ اس ضروری تفصیل کے بعد اب کتاب کے مضامین شروع کئے جاتے ہیں۔

تقدیر پر ایمان لانے کی اہمیت اور اس کے فوائد

تقدیر پر ایمان لانا افضل اعمال ہے سے ہے کیونکہ نیکی کے کاموں میں سب سے افضل ایمانیات ہیں اور ان میں بھی سب سے افضل توحید پر ایمان لانا ہے اور اسی کے درجہ میں اللہ کی صفات پر ایمان لانا ہے اور قضاء وقدر بھی اللہ کی ایک صفت ہے، پس اس پر ایمان لانا بھی بہترین نیک کام ہے۔

اور ایمانیات اعمال کے دائرہ میں اس طرح آتے ہیں کہ اعمال کی دو قسمیں ہیں: اعمال قلب اور اعمال جوارح۔ اللہ کی ذات پر، ان کے بے ہمہ ہونے پر، ان کی صفات پر اور ملائکہ وانبیاء وغیرہ پر ایمان لانا اعمال قلبی میں سے ہے۔ اسی بناپر حدیث جبرئیل میں اسلام کے بارے میں سوال کے جواب میں سب سے پہلے توحید ورسالت کی گواہی کو ذکر کیا

ایمان نہ لائے اور تا آنکہ وہ جان نہ لے کہ جو کچھ اس کو پہنچا ہے، وہ اس کو چوک جائے ایسا نہیں ہوسکتا اور یہ بات بھی جان لے کہ جو کچھ اس کو چوک گیا ہے (یعنی نہیں پہنچا ہے) وہ اس کو پہنچ جائے ایسا نہیں ہوسکتا" یہ حدیث ترمذی شریف (۲: ۳۶) ابواب الایمان بالقدر میں ہے اور اس کی سند میں ایک نہایت ضعیف راوی ہے۔

مگر ان روایات کی تائید اس واقعہ سے ہوتی ہے جو مسلم شریف میں مذکور ہے۔ مشہور تابعی بصرہ کے قاضی یحییٰ بن یعمر کہتے ہیں کہ بصرہ میں تقدیر کا انکار کرنے والا سب سے پہلا شخص مَعبد جُہنی (مقتول ۸۰ھ) تھا۔ پس میں اور حمید بن عبدالرحمن حِمیری حج کے ارادے سے یا عمرہ کے ارادے سے چلے۔ اور دل میں یہ تھا کہ اگر ہماری کسی صحابی سے ملاقات ہوئی تو ان سے ان لوگوں کے بارے میں دریافت کریں گے جو تقدیر کا انکار کرتے ہیں۔ پس توفیق خداوندی سے ہماری ملاقات حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے ہوگئی، جبکہ وہ مسجد میں داخل ہو رہے تھے۔ پس میں اور میرا ساتھی ان کے دائیں بائیں ہوگئے۔ اور میں نے یہ خیال کیا کہ میرا ساتھی مجھی کو بات کرنے کا ذمہ دار بنائے گا، اس لئے میں نے عرض کیا کہ اے ابوعبدالرحمن! (ابن عمر کی کنیت ہے) ہمارے علاقہ میں کچھ لوگ پیدا ہوئے ہیں جو قرآن کریم پڑھتے ہیں اور علم تلاش کرتے ہیں — اور یحییٰ نے ان کی اور بھی تعریف کی — مگر وہ یہ کہتے ہیں کہ: "تقدیر نہیں ہے، معاملہ اچھوتا ہے" (ان لوگوں کے بارے میں آپ کیا ارشاد فرماتے ہیں؟) حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا:

"جب تمہاری ان لوگوں سے ملاقات ہو تو ان کو بتانا کہ میں ان سے بے تعلق ہوں۔ اور ان کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں اور میں اللہ تعالیٰ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ ان میں سے اگر کوئی شخص اُحد پہاڑ کے بقدر سونا خرچ کرے تو بھی قبول نہیں کیا جائے گا تا آنکہ وہ تقدیر پر ایمان لائے۔ (پھر آپؓ نے حدیث جبرئیل سنائی جس میں تقدیر پر ایمان کو ایمانیات میں شمار کیا گیا ہے۔ یہ حدیث مسلم شریف میں کتاب الایمان کی پہلی حدیث ہے)

اس واقعہ سے دونوں روایتوں کے مضمون کی پوری تائید ہوتی ہے، اس لئے سند کا ضعف مضر نہیں۔

﴿ باب الإيمان بالقدر ﴾

من أعظم أنواع البر: الإيمان بالقدر؛ وذلك: أنه به يُلاحظ الإنسانُ التدبيرَ الواحدَ الذي يجمع العالَمَ؛ ومن اعتقده على وجهه يصير طامح البصر إلى ما عند الله، يرى الدنيا ومافيها كالظل له، ويرى اختيار العباد من قضاء الله كالصورة المنطبعة في المرآة، وذلك مُعِدٌّ له لانكشاف ما هنالك من التدبير المؤخذ اتي - ولو في المعاد - أتم إعداد، وقد نبّه صلى الله عليه وسلم على عظيم أمره من بين أنواع البر، حيث قال: ﴿من لم يؤمن بالقدر خيره وشره فأنا برئ منه﴾ وقال صلى الله عليه وسلم: ﴿لا يؤمن عبد حتى يؤمن بالقدر خيره وشره، وحتى يعلم أن ما أصابه لم يكن ليُخطئه، وأن ما أخطأه لم يكن ليُصيبه﴾

ترجمہ: تقدیر پر ایمان لانے کا بیان: نیکی کی عظیم ترین انواع میں سے تقدیر پر ایمان لانا ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان اس کے ذریعہ اس تدبیر واحد کو پیش نظر لا سکتا ہے جو تمام عالم کو شامل کرنے والی ہے۔ اور جو شخص صحیح طور پر تقدیر پر ایمان رکھتا ہے وہ اس چیز کی طرف نگاہ اٹھانے والا ہو جاتا ہے جو اللہ کے پاس ہے (یعنی اللہ کے اختیار کی طرف) وہ دنیا وما فیہا کو اللہ کے ظل (سایے اور پرتو) کی طرح دیکھتا ہے۔ اور بندوں کو اللہ کے فیصلے سے جو اختیار ملا ہے اس کو اسی صورت کے مانند دیکھتا ہے جو آئینہ کے اندر منعکس ہوتی ہے۔ اور تقدیر پر ایمان آدمی کو پوری طرح تیار کرنے والا ہے اس تدبیر وحدانی کے منکشف ہونے کے لئے جو وہاں (اللہ کے پاس) ہے تاکہ وہ انکشاف آخرت میں ہو۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے آگاہ کیا ہے نیکی کی انواع میں سے تقدیر کے معاملہ کی اہمیت پر، چنانچہ آپ نے فرمایا: "جو شخص بھلی بری تقدیر پر ایمان نہیں رکھتا، میں اس سے بری (بے تعلق) ہوں" اور فرمایا: "کوئی بندہ مؤمن نہیں ہوتا تا آنکہ وہ بھلی بری تقدیر پر ایمان لائے اور تا آنکہ وہ جان لے کہ جو چیز اس کو پہنچا ہے وہ نہیں ہو سکتا کہ اس کو چوک جائے اور یہ کہ جو اس کو چوک گیا ہے وہ اس کو پہنچ جائے ایسا نہیں ہو سکتا"

تصحیح: ذلك نبّه لہ اصل میں ذلك نبّہ لہ تھا۔ یہ تصحیف ہے، تصحیح مخطوطہ کراچی سے کی ہے۔

تقدیر الٰہی کے پانچ مدارج ومظاہر

سب سے پہلے یہ بات سمجھ لی جائے کہ لوگ شمولیت علم کے مسئلہ کو تقدیر الٰہی کے مسئلہ کے ساتھ خلط کر دیتے ہیں۔ اس لئے عمومیت علم کے مسئلہ کو الگ کر لیا جائے۔ علم الٰہی کی عمومیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ازل میں اپنے علم ذاتی سے ان تمام حوادث (نو پید چیزوں) کو جانتے تھے جو اب تک موجود ہو چکے ہیں یا جو آئندہ موجود ہوں گے۔ یہ بات قطعاً ناممکن ہے کہ کوئی چیز اللہ کے علم سے باہر رہ جائے یا کوئی ایسی چیز وجود میں آئے جس کو وہ ازل میں نہیں جانتے تھے۔ اگر ایسا ہو جائے تو وہ اللہ کا جہل شمار ہوگا، علم نہیں۔ اور علم اللہ کی ذاتی صفت ہے پس اس کی ضد کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو متصف نہیں کیا جا سکتا۔ یہ شمولیت علم کا مسئلہ ہے، قضاء وقدر کا مسئلہ نہیں اور اسلامی فرقوں میں سے کسی بھی فرقہ کو اس میں اختلاف نہیں۔

اور تقدیر الٰہی یعنی ازلی فیصلہ خداوندی کا مسئلہ جس پر احادیث مشہورہ دلالت کرتی ہیں اور جو سلف صالحین کا عقیدہ رہا ہے اور جس کو سمجھنے کی توفیق صرف علمائے محققین کو ملی ہے اور جس پر یہ اعتراضات کئے جاتے ہیں کہ تقدیر اور تکلیف ایک دوسرے کے خلاف ہیں اور یہ کہا جاتا ہے کہ جب سب کچھ طے ہو چکا ہے تو پھر عمل کی کیا ضرورت ہے؟ وہ تقدیر مبرم ہی کا مسئلہ ہے یعنی خدا کا وہ ازلی فیصلہ جو حوادث (نو پید چیزوں) کے رونما ہونے سے پہلے ہی ان کے ہونے کو لازم کرنے والا ہے۔ پھر اس فیصلہ خداوندی کے واجب کرنے کے مطابق ہی حوادث رونما ہوتے ہیں۔ اور ان کا پایا جانا ایسا ہے کہ نہ تو کوئی بھاگ کر اس سے بچ سکتا ہے نہ کوئی چھٹکارا ہو سکتا ہے۔

یہ تقدیر الٰہی پانچ مرتبہ واقع ہوئی ہے یعنی پانچ مراحل میں ظاہر ہوئی ہے۔ جس طرح حویلی بنانے والا پہلے انجینئر سے نقشہ بنواتا ہے۔ انجینئر پہلے ذہن میں خاکہ بناتا ہے، پھر اس ذہنی خاکہ کے مطابق کاغذ پر نقشہ بناتا ہے۔ پھر معمار اس نقشہ کے مطابق موقعہ پر محل تیار کرتا ہے، اسی طرح بلا تشبیہ تقدیر الٰہی کے بھی پانچ مختلف مراحل ومظاہر ہیں۔ پہلی مرتبہ: اللہ کے علم ازلی میں تمام چیزوں کے اندازے ٹھہرائے گئے ہیں، دوسری مرتبہ: تخلیق ارض وسماء سے پچاس ہزار سال پہلے عرش کی قوت خیالیہ میں سب چیزیں موجود ہوئی ہیں، تیسری مرتبہ: تخلیق آدم کے بعد جب عہد الست لیا گیا ہے اس وقت تقدیر کا تحقق ہوا ہے۔ چوتھی مرتبہ: شکم مادر میں جب روح پڑنے کا وقت آتا ہے تو تقدیر کا ایک گونہ تحقق ہوتا ہے اور پانچویں مرتبہ: دنیا میں واقعہ رونما ہونے سے کچھ پہلے تقدیر پائی جاتی ہے۔ تقدیر کے یہ مراحل خمسہ انسانوں اور ان کے احوال سے متعلق ہیں۔ دیگر مخلوقات کا حال اس سے مختلف ہوسکتا ہے مذکورہ مدارج خمسہ کی تفصیل درج ذیل ہے۔

① تقدیر کا پہلا مرحلہ: ازل میں جبکہ اللہ تعالیٰ کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ آسمان وزمین، عرش وکرسی، ہوا اور پانی میں سے کوئی بھی چیز پیدا نہیں کی گئی تھی، جیسا کہ بخاری شریف (۱:۴۵۳) میں آیا ہے کہ کان اللہ ولم یکن شیئٌ غیرہ یعنی صرف اللہ کی ذات تھی اور اس کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ اس دور ازل میں اللہ تعالیٰ نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ وہ عالم کو تمام مصالح کی رعایت کرتے ہوئے اور حوادث کے وجود کے وقت جو خیر اضافی ہوگی اس کو ترجیح دیتے ہوئے بہتر سے بہتر ممکن صورت میں پیدا کریں گے۔ جس واقعہ کو جس وقت میں رونما کرنا عالم کی مصلحت ہوگی اور جس چیز میں زیادہ بہتری ہوگی اس اضافی خیریت کا واقعات کو وجود پذیر کرنے میں لحاظ رکھا جائے گا۔ اور یہ سب باتیں کلی شکل میں نہیں بلکہ ہر ہر جزئی امر الگ الگ علم الٰہی میں متعین ہوگیا تھا، چنانچہ حوادث (نئے پیدا ہونے والے تمام امورْ) مرتب طور پر سلسلہ وار علم الٰہی میں موجود ہوچکے تھے۔ غرض اللہ تعالیٰ کا: جن پر کوئی امر مخفی نہیں، ایجاد عالم کا ارادہ کرنا ہی حوادث کے موجود ہونے کی صورت کی تخصیص وتعیین ہے یعنی اب جو معین باتیں معین وقت میں رونما ہورہی ہیں اس کی علت وہی ازلی تخصیص وتعیین ہے اسی طرح ابد تک کے تمام واقعات وحوادث ازل میں اللہ تعالیٰ نے فیصل فرمادیے ہیں۔ یہی تقدیر الٰہی کا پہلا مرحلہ اور اس کا ابتدائی ظہور ہے۔

اور تقدیر کے اس پہلے مرحلہ کے لئے کسی دلیل کی حاجت نہیں، بس اتنی بات کافی ہے کہ قضاء وقدر اللہ کی صفت ہے اور اللہ کی تمام صفات ازلی قدیم ہیں پس قضائے خداوندی یعنی کائنات کے بارے میں تمام فیصلے بھی ازل میں ہوچکے ہیں۔ اور صرف اجمالاً کلی طور پر نہیں، بلکہ ہر امر جزئی طور پر مشخص ہوچکا ہے، اور اس کے لئے بس اتنی دلیل کافی ہے کہ اللہ کی تمام صفات، صفات کمالیہ ہیں کسی صفت میں نقص نہیں، پس جس طرح ازل میں اللہ تعالیٰ کو ہر چیز کا تفصیلی علم ہے اسی طرح قضاء وقدر کا معاملہ بھی ہے۔

واعلم: ان اللہ تعالی شَمِلَ علمُه الأزليُّ الذاتي كلَّ ما وُجِد أو سيوجد من الحوادث، فَحالٌ

أن يتخلف علمه عن شيء، أو يتحقق غيرما علم، فيكون جهلاً لا علماً.

وهذه مسألةُ شمولِ العلم، وليست بمسألة القدر، ولا يخالف فيها فرقةٌ من الفِرَق الإسلامية؛ إنما القدرُ الذي دلّت عليه الأحاديث المستفيضة، ومضى عليه السلف الصالح، ولم يوفَّق له إلا المحققون، ويتّجهُ عليه السؤالُ: بأنه متدافع مع التكليف، وأنه فيم العملُ؟ هو القدرُ المُلْزِمُ الذي يوجب الحوادث قبل وجودها، فيوجَد بتلك الإيجاب، لايدفعُه هربٌ، ولاتنفع منه حيلةٌ.

وقد وقع ذلك خمس مرات:

فأولها: أنه أجمع في الأزل أن يوجد العالَمَ على أحسنِ وجهٍ ممكنٍ، مراعياً للمصالح، مؤْثِراً لما هو الخيرُ النِّسْبِيُّ حين وجوده، وكان علم الله ينتهي إلى تعيين صورةٍ واحدةٍ من الصور، لايشاركها غيرُها، فكانت الحوادثُ سلسلةً مترتبةً مجتمعاً وجودُها، لاتصدق على كثيرين، فإرادةُ إيجادِ العالَم ممن لاتخفى عليه خافيةٌ هو بعينه تخصيصُ صورةِ وجوده، إلى آخر ما ينجر إليه الأمر.

ترجمہ: اور جان لیں کہ اللہ تعالیٰ کا علم ازلی ذاتی شامل ہے تمام اُن حوادث (نو پید چیزوں) کو جو موجود ہو چکے ہیں یا آئندہ موجود ہوں گے۔ محال ہے یہ بات کہ اس کا علم کسی چیز سے پیچھے رہ جائے یا پائی جائے کوئی ایسی چیز جس کو وہ نہ جانتے ہوں۔ پس وہ جہل ہوگا علم نہیں۔

اور یہ اللہ کے علم کی عمومیت کا مسئلہ ہے، قضاء وقدر کا مسئلہ نہیں ہے۔ اور اس میں اسلامی فرقوں میں سے کسی بھی فرقے کا اختلاف نہیں ہے۔ تقدیر کا مسئلہ جس پر احادیث مشہورہ دلالت کرتی ہے اور جس پر سلف صالحین کا عقیدہ رہا ہے اور جس کو سمجھنے کی توفیق بس علمائے محققین ہی کو ملی ہے اور جس پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ تقدیر تکلیف سے متخالف ہے اور یہ کہا جاتا ہے کہ پھر عمل کی کیا ضرورت ہے؟ وہ خدا کا لازم کرنے والا فیصلہ ہی ہے جو حوادث کے ہونے سے پہلے اُن کے ہونے کو ثابت کرنے والا ہے۔ پھر حوادث پائے جاتے ہیں اس ثابت کرنے کی وجہ سے، نہ تو بھاگنا اُن واقعات کو ہٹا سکتا ہے اور نہ ان سے بچنے کے لئے کوئی حیلہ مفید ہے۔

اور وہ تقدیر پانچ مرتبہ واقع ہوئی ہے:

پس ان میں سے پہلی بار: یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ازل میں یہ قرار دیا کہ وہ جہاں کو پیدا کریں گے بہتر سے بہتر ممکن صورت پر، مصلحتوں کی رعایت کرتے ہوئے اور عالم کے پائے جانے کے وقت جو خیر اضافی ہوگی اس کو ترجیح دیتے ہوئے۔ اور اللہ کا علم (ازل میں) پہنچ گیا تھا مختلف صورتوں میں سے کسی ایک صورت کی تعیین تک، اس کے ساتھ اس

کے علاوہ صورت شریک نہیں تھی (یعنی کلی طور پر نہیں، بلکہ ازل میں اللہ تعالیٰ آئندہ پائی جانے والی ایک ایک جزئی کو علحدہ علحدہ جانتے تھے) پس حوادث (نو پید چیزیں) مسلسل وار، بالترتیب ان کا وجود ایک ساتھ (علم ازلی میں) تھا اور حوادث کثیرین پر صادق نہیں آتے تھے (یعنی وہ جزئیات تھے کلیات نہیں تھے) پس اسی ہستی کا ایجادِ عالم کا ارادہ کرنا، جس پر کوئی ادنیٰ امر مخفی نہیں ہے، وہی بعینہ وجودِ عالم کی صورت کی تخصیص وتعیین ہے۔ اس چیز کے آخر تک جس تک معاملہ کھینچا چلا جائے (یعنی ابد تک)

لغات:

اِتَّجَهَ إلَيْه: متوجہ ہونا...... مُتَدَافِع (اسم فاعل) تَدَافَعَ القومُ: ایک دوسرے کو ہٹانا..... آثَرَهُ إيثَارًا: فضیلت دینا، ترجیح دینا...... النِّسْبِي اى بالنسبة إلى كلمة یعنی فلاں چیز کے لحاظ سے اضافی طور پر۔ ۔ انْجَرَّ: کھنچا گھسٹنا۔

☆ ☆ ☆

(۲) تقدیر کا دوسرا مرحلہ: پھر ایک وقت آیا، جبکہ پانی اور عرش پیدا کئے جاچکے تھے مگر ابھی زمین وآسمان پیدا نہیں کئے گئے تھے۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے تمام چیزوں کے دوبارہ اندازے ٹھہرائے۔ اور ایک روایت میں ہے کہ تمام مخلوقات کے اندازے، پہلے ازلی اندازے کے مطابق لکھ دئے۔ اور لکھنے کا مطلب بھی وہی اندازہ ٹھہرانا ہے۔ عربی زبان میں کسی چیز کے طے کرنے اور معین ومقرر کرنے کو بھی کتابت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ قرآن کریم میں روزہ کی فرضیت کو ﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ﴾ سے اور قصاص کے حکم کو ﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ﴾ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

اور کتابت تقدیر کے سلسلہ میں روایات میں جو لوح وقلم وغیرہ کا ذکر آیا ہے وہ سب غیر معتبر روایات ہیں، اور اسرائیلیات سے ماخوذ ہیں۔ کتاب کی قسم دوم کے شروع میں، ابواب الایمان کی روایات کی تشریح کے آخر میں، شاہ صاحب رحمہ اللہ نے اس کی صراحت کی ہے۔

اور یہ دوسری مرتبہ اندازہ ٹھہرانے کا واقعہ آسمانوں اور زمین کی تخلیق سے پچاس ہزار سال پہلے پیش آیا ہے۔ اس سے واقعی مدت بھی مراد ہوسکتی ہے اور بہت طویل زمانہ بھی مراد ہوسکتا ہے۔ عربی محاورات میں یہ استعمال بھی شائع ذائع ہے۔

اور اس دوسرے مرحلہ میں مقادیر کا اندازہ ٹھہرانے کی صورت یہ ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے اپنی ازلی مہربانی اور عنایت سے ازل میں اپنے علم میں عالم کے لئے پہلی بار اندازہ ٹھہرایا تھا، اسی کے موافق تمام مخلوقات کو عرش کی قوت خیالیہ میں پیدا کردیا، وہاں تمام صورتوں کو منتقل کردیا۔ عرش کی اس قوت خیالیہ کو وحی کی زبان میں الذکر (الانبیاء ۱۰۵) کتاب مبین (الانعام ۵۹) امام مبین (یٰس ۱۲) ام الکتاب (الرعد ۳۹) اور لوح محفوظ (البروج ۲۲) سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور لوح محفوظ اور عرش کے بارے میں یہ تصورات کہ وہ کوئی لکڑی کی بنی ہوئی چیزیں از قبیل جمادات ہونگی، یہ محض عوامی تصورات ہیں۔ اور اسی تصور نے استواء علی العرش کے مسئلہ میں الجھن پیدا کی ہے۔ اس لئے یہ بات خاص طور پر یاد

رکھنی چاہئے کہ ہمارے اس مادی عالم سے پرے جو غیر مادی چیزیں ہیں، اور جن کا قرآن وحدیث میں ذکر آیا ہے ان میں لفظی اشتراک کے علاوہ کوئی مناسبت نہیں۔ اور ان کی حقیقت اور ماہیت کیا ہے؟ اس کے بارے میں کوئی بیان یا فرض بھی درست نہیں۔ اللہ تعالیٰ ہی ان کی حقیقت کو اور ان کی صحیح نوعیت کو بہتر جانتے ہیں۔

اور عرش کی قوت خیالیہ میں عالم میں رونما ہونے والی تمام چیزیں اپنی تمام تفصیلات کے ساتھ موجود ہیں۔ مثلاً وہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت، مخلوقات کی طرف آپ کی معین وقت میں بعثت کی صورت، آپ کے انذار وتبشیر کی صورت، ابولہب کے انکار کی صورت، پھر اس کے دنیا میں ملعون اور آخرت میں معذب ہونے کی صورت۔ یہ سب صورتیں وہاں تفصیل سے موجود ہیں، جیسے مرقعہ پر جو حویلی تیار کی جاتی ہے اس کی تمام تفصیلات کاغذی نقشہ میں موجود ہوتی ہے۔

اور تمام چیزوں کا یہ خیالی وجود عالم میں واقعات کے رونما ہونے کا سبب ہے۔ جیسے کوئی شخص دیوار پر رکھی ہوئی کڑی پر چلے تو چونکہ پہلے سے ذہن میں گر پڑنے کا اندیشہ ہوتا ہے اس لئے وہ منظر پیش نظر ہوتا ہے۔ ذہن میں جو اندیشہ ہوتا ہے وہی پیر پھسلنے کا سبب بن جاتا ہے۔ چنانچہ یہی کڑی اگر زمین پر رکھی ہوئی ہو اور اس پر کوئی چلے تو نہیں گرتا کیونکہ اس وقت ذہن میں پھسلنے کی صورت نہیں ہوتی جو اثر انداز ہو۔

وثانيها: أنه قدّر المقادير، ويُروى أنه كتب مقادير الخلائق كلّها - والمعنى واحد - قبل أن يخلق السماوات والأرض بخمسين ألف سنة، وذلك: أنه خلق الخلائق حسب العناية الأزلية في خيال العرش، فصوّر هنالك جميع الصور، وهو المعبر عنه بالذكر في الشرائع، فتحقق هنالك مثلاً صورة محمد صلى الله عليه وسلم، وبعثه إلى الخلق في وقت كذا، وإنذاره لهم، وإنكار أبي لهب، وإحاطة الخطيئة بنفسه في الدنيا، ثم اشتعال النار عليه في الآخرة؛ وهذه الصورة سبب لحدوث الحوادث على نحو ما كانت هنالك، كتأثير الصورة المنتقشة في أنفسنا في زلق الرجل على الجذع الموضوع فوق الجدران، ولم تكن لتزلق لو كانت على الأرض.

ترجمہ: اور دوسری بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام چیزوں کا اندازہ کیا (یہ الفاظ مسلم و ترمذی کی روایت میں ہیں الدر المنثور ۲:۲۴۴) اور یہ بھی روایت کی جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مخلوقات کے تمام اندازوں کو لکھ دیا (یہ روایت بھی مسلم شریف میں ہے) اور مطلب ایک ہے (یعنی لکھنے کا مطلب بھی اندازہ کرنا ہے) آسمانوں اور زمین کی تخلیق سے پچاس ہزار سال پہلے۔ اور وہ یوں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی ازلی مہربانی کے مطابق عرش کے خیال میں تمام مخلوقات کو پیدا کیا، پس وہاں تمام صورتوں کو متصور کیا۔ اور اسی کو شرائع میں "ذکر" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ پس مثال کے طور پر وہاں

خداوندی ہے۔کوئی خواہ خدا کا کیسا ہی انکار کرے، آڑے وقت اس کو بھی ایک مافوق الفطرت ہستی کی یاد آتی ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ معرفت خداوندی اس کے گوشۂ دل میں موجود ہے۔اسی کی بنیاد پر آخرت میں مؤاخذہ ہوگا۔

④ تقدیر کا چوتھا مرحلہ: شکم مادر میں جب جنین میں روح پھونکنے کا وقت آتا ہے اس وقت تقدیر الٰہی کا چوتھی بار ظہور ہوتا ہے۔حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ صادق ومصدوق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے بیان کیا کہ:

”تم میں سے ہر ایک کا مادۂ تخلیق اپنی ماں کے پیٹ میں چالیس روز تک نطفہ کی شکل میں جمع رہتا ہے (یعنی پہلے چلے میں کوئی غیر معمولی تغیر نہیں ہوتا) پھر اس کے بعد اتنی ہی مدت تک منجمد خون کی شکل میں رہتا ہے۔ پھر اتنے ہی دنوں تک وہ گوشت کا لوتھڑا رہتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ چار باتوں کے ساتھ ایک فرشتہ کو اس کی طرف بھیجتے ہیں۔پس وہ اس کا عمل، اس کی موت کا وقت اور اس کا رزق لکھتا ہے اور یہ کہ وہ بدبخت ہے یا نیک بخت، پھر اس میں روح ڈالی جاتی ہے الخ (متفق علیہ، مشکوٰۃ کتاب الایمان، باب الایمان بالقدر، حدیث نمبر ۸۲)

اور اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ جس طرح کھجور کی گٹھلی مناسب موسم میں بوئی جائے اور اس کی مناسب دیکھ بھال بھی کی جائے تو باغبان، جو بیج، زمین اور آب وہوا کی خاصیات سے واقف ہو، جان لیتا ہے کہ وہ گٹھلی شاندار طریقہ پر آگے گی اور بڑھے گی۔ وہ شروع ہی سے اس کے بعض احوال جان لیتا ہے۔مثل مشہور ہے: ”ہونہار بروے کے چکنے چکنے پات!“ یعنی ہونہار پودے کے آثار پہلے ہی سے دکھائی دینے لگتے ہیں اسی طرح جو فرشتہ جنین کی تدبیر پر مقرر ہے وہ مذکورہ چاروں باتیں جان لیتا ہے۔سب باتیں اس پر منکشف ہوجاتی ہیں یہ تقدیر کا چوتھی بار ظہور ہے۔

⑤ تقدیر کا پانچواں مرحلہ: جب دنیا میں کسی چیز کے رونما ہونے کا وقت آتا ہے تو اس سے کچھ پہلے تقدیر الٰہی کا پانچواں اور آخری مرتبہ ظہور ہوتا ہے۔اس وقت حظیرۃ القدس سے زمین کی طرف مثالی صورت میں وہ چیز اترتی ہے جو رونما ہونے والی ہے۔پھر زمین میں اس کے احکام کھل جاتے ہیں یعنی اس نازل شدہ مثالی چیز کے موافق حادثہ رونما ہوتا ہے۔شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ میں نے اس چیز کا بارہا مشاہدہ کیا ہے۔اس سلسلے کے دو واقعے درج ذیل ہیں:

پہلا واقعہ: کچھ لوگوں میں نزاع واقع ہوا اور ان میں باہمی رنجش ہوئی۔شاہ صاحب نے اس کے رفع کے لئے بارگاہ خداوندی میں التجا کی تو آپ نے دیکھا کہ حظیرۃ القدس سے ایک نورانی نقطہ زمین کی طرف اترا اور آہستہ آہستہ پھیلنے لگا۔جوں جوں وہ پھیلتا جاتا تھا ان کی باہمی رنجش زائل ہوتی جاتی تھی۔اور ابھی لوگ مجلس سے اٹھنے بھی نہ پائے تھے کہ وہ لوگ ایک دوسرے پر مہربان ہوگئے۔اور سابقہ الفت لوٹ آئی۔شاہ صاحب کے نزدیک یہ واقعہ قدرت کی عجیب نشانیوں میں سے تھا۔

دوسرا واقعہ: شاہ صاحب رحمہ اللہ کا ایک بچہ بیمار پڑا۔شاہ صاحب کا دل اس میں اٹکا ہوا تھا آپ نے ظہر کی نماز کے دوران دیکھا کہ اس بچے کی موت آسمان سے اتری۔چنانچہ اسی رات وہ بچہ فوت ہوگیا۔

وہ باتیں چھپائی ہوئی ہیں جو اس میثاق والے دن میں ان میں چھپائی گئی تھیں۔

اور چوتھی بار: جب جنین میں روح پھونکی گئی۔ پس جس طرح سے یہ بات ہے کہ گٹھلی جب مخصوص وقت میں زمین میں ڈالی جاتی ہے اور مخصوص تدبیر اس کا احاطہ کر لیتی ہے، تو جان لیتا ہے کھجور کی نوع کی خاصیت کا اور اس زمین کی خاصیت کا، اور اس پانی اور ہوا کی خاصیت کا واقف کہ وہ گٹھلی شاندار طریقہ پر اُگے گی۔ اور وہ اس کے احوال میں سے بعض احوال کا پتہ چلا لیتا ہے۔ پس اسی طرح حاصل کرتے ہیں وہ فرشتے جو اس دن جنین کی تدبیر کرنے والے ہیں، اور منکشف ہو جاتا ہے ان پر معاملہ اس کی زندگی اور اس کی روزی کے بارے میں۔ اور کیا وہ اس شخص جیسے کام کرے گا جس کی ملکیت اس کی بہیمیت پر غالب ہے یا اس کے برعکس ہوگا؟ اور اس کی نیک بختی اور بدبختی کس نوعیت کی ہوگی (یعنی وہ اعلیٰ درجہ کا نیک ہوگا یا ادنیٰ درجہ کا۔ اسی طرح وہ اعلیٰ درجہ کا بدبخت ہوگا یا معمولی درجہ کا؟)

اور پانچویں بار: حادثہ رونما ہونے سے کچھ پہلے (تقدیر کا ظہور ہوتا ہے) پس معاملہ حظیرۃ القدس سے زمین کی طرف اترتا ہے اور ایک مثالی چیز منتقل ہوتی ہے۔ پس اس کے احکام زمین میں پھیل جاتے ہیں۔

اور میں نے اس چیز کا بار بار مشاہدہ کیا ہے:

ان میں سے ایک: یہ ہے کہ کچھ لوگ آپس میں لڑے اور ان میں رنجش پیدا ہوئی۔ پس میں نے بارگاہ خداوندی میں التجا کی۔ پس میں نے ایک نورانی مثالی نقطہ دیکھا، جو حظیرۃ القدس سے زمین کی طرف اترا، پس وہ آہستہ آہستہ پھیلنے لگا۔ اور جوں جوں وہ پھیلتا تھا ان کی رنجش زائل ہوتی تھی اور ہم مجلس سے اٹھنے بھی نہ پائے تھے کہ وہ باہم دگر مہربان ہو گئے۔ اور ان میں سے ہر ایک اس الفت کی طرف لوٹ گیا جو پہلے تھی۔ اور یہ واقعہ میرے لئے اللہ کی عجیب نشانیوں میں سے تھا۔

اور ان میں سے ایک: یہ ہے کہ میرا کوئی بچہ بیمار تھا۔ اور میرا دل اس کے ساتھ مشغول تھا۔ پس دریں اثناء کہ میں ظہر کی نماز پڑھ رہا تھا، میں نے اس کی موت کو اترتے ہوئے دیکھا، چنانچہ وہ بچہ اسی رات میں فوت ہو گیا۔

لغات و ترکیب: باذ النفوس تفعیل ہے بوا ختونکی ۔ دس فی التراب چھپانا ۔ تحقق الرجل الامر: یقین کرنا۔

محو و اثبات عالم مثال میں ہوتا ہے، لوح محفوظ میں نہیں

احادیث میں نہایت وضاحت سے یہ بات بیان کی گئی ہے کہ حوادث کو زمین میں پیدا کرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ عالم مثال میں یک گونہ پیدا کرتے ہیں۔ یہ روایات اگلے عنوان کے تحت آ رہی ہیں۔ پھر وہاں سے وہ چیزیں اس عالم میں اترتی ہیں۔ اور جس طرح وہ پہلی بار عالم مثال میں پیدا کی گئی ہیں اسی طرح سے اس عالم میں ظاہر ہوتی ہیں۔ پس

سنت الٰہی ہے۔ پھر کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک چیز عالم مثال میں موجود ہوتی ہے مگر اس دنیا میں وہ نہیں اتاری جاتی۔ یہ اس کا محو (مٹا دینا) ہے۔ اور کبھی ایک چیز عالم مثال میں موجود نہیں ہوتی مگر وہ اس دنیا میں پیدا کردی جاتی ہے۔ یہ عالم مثال میں معدوم کا اس دنیا میں اثبات ہے۔ مگر ام الکتاب میں یعنی عرش کی قوت خیالیہ میں ایسا کچھ نہیں ہوتا، وہاں طے شدہ امر ہے۔ سورۃ الرعد آیت ۳۹ میں ہے کہ: ”اللہ پاک جو کچھ چاہتے ہیں مٹا دیتے ہیں، اور جس چیز کو چاہتے ہیں باقی رکھتے ہیں۔ اور اصل کتاب (یعنی لوح محفوظ) انہی کے پاس ہے“ یعنی محو و اثبات صرف عالم مثال میں ہوتا ہے لوح محفوظ میں نہیں ہوتا۔ مثلاً اللہ تعالیٰ بلا کو عالم مثال میں ایک گونہ وجود بخشتے ہیں، پھر اس کو مصیبت زدہ پر اتارتے ہیں۔ اور دعا چونکہ حق ہے وہ اس کو پھیر دیتی ہے۔ یہ ثابت کا محو ہے۔ اسی طرح کبھی کسی کی موت کو پیدا کرتے ہیں، پس اس کا والدین کے ساتھ حسن سلوک پہنچتا ہے اور موت کو پھیر دیتا ہے یوں عمر میں اضافہ ہوجاتا ہے۔

اور راز اس میں یہ ہے کہ جس طرح دوا ازالۂ مرض کے لئے سبب عادی ہے، علت نہیں ہے کہ ضروری مرض دور ہوجائے۔ اور کھانا پینا شکم سیری اور سیرابی کے لئے سبب عادی ہیں اور زہر کھانا اور تلوار کی چوٹ موت کے لئے سبب عادی ہیں، علت نہیں ہیں، اسی طرح عالم مثال میں پیدا شدہ امر کا ترشح اس دنیا میں اس چیز کے پیدا ہونے کے لئے سبب عادی ہے، علت نہیں ہے کہ ضرور اس عالم میں وہ چیز پیدا ہو، ہو بھی سکتی ہے اور تخلف بھی ہو سکتا ہے۔ پہلی صورت اثبات کی ہے اور دوسری محو کی۔ واللہ اعلم۔

وقد بيّنت السنةُ بيانا واضحًا أن الحوادث يخلقها الله تعالى قبل أن تحدث في الأرض خلقًا ما، ثم ينزل في هذا العالم، فيظهر فيه كما خُلق أولَ مرة، سنةً من الله تعالى. ثم قد يُمحى الثابتُ، ويُثبت المعدومُ بحسب هذا الوجود. قال الله تعالى: ﴿يَمْحُوا اللهُ مَا يَشَاءُ وَيُثْبِتُ، وَعِنْدَهُ أُمُّ الْكِتَابِ﴾ مثل أن يخلق الله تعالى البلاءَ خلقًا ما، فينزله على المبتلى، ويصعد الدعاءُ فيرده، وقد يخلق الموت فيصعد البِرُّ ويردّه.

والفقه فيه: أن المخلوق ثَمَّةَ سببٌ من الأسباب العادية، كالطعام والشراب بالنسبة إلى بقاء الحياة، وتناوُلِ السمّ والضرب بالسيف بالنسبة إلى الموت.

ترجمہ: اور احادیث نے یہ بات نہایت وضاحت سے بیان کردی ہے کہ حوادث کو اللہ تعالیٰ پیدا کرتے ہیں زمین میں پیدا کئے جانے سے پہلے، کسی درجہ میں پیدا کرنا (یعنی عالم مثال میں ان کو ایک گونہ وجود بخشتے ہیں) پھر وہ چیز اس عالم میں اترتی ہے، پس وہ اس عالم میں ظاہر ہوتی ہے جیسی وہ پہلی مرتبہ پیدا کی گئی ہے۔ یہ سنت الٰہی ہے۔ پھر کبھی ثابت مٹا دیا جاتا ہے۔ اور نیست ثابت کردیا جاتا ہے اس وجود (مثالی) کے اعتبار سے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ”مٹاتے ہیں اللہ تعالیٰ جو

چاہتے ہیں اور ثابت کرتے ہیں (جو چاہتے ہیں) اور ان کے پاس اصل کتاب ہے" جیسے کہ اللہ تعالیٰ آفت کو کسی وجہ میں پیدا کرتے ہیں، پھر اس کو مصیبت زدہ پاتے ہیں اور دعا چڑھتی ہے، پس اس کو پھیر دیتی ہے۔ اور کبھی موت کو پیدا کرتے ہیں، پس حسنِ سلوک چڑھتا ہے اور اس کو پھیر دیتا ہے۔

اور سمجھنے کی بات اس میں یہ ہے کہ (عالم مثال میں) ترشّح پانے والی مخلوق اسبابِ عادیہ میں سے ایک سبب ہے (اس کے وجود پانے کے لئے) جیسے کھانا پینا سبب ہے زندگی کی بہ نسبت اور زہر کھانا اور تلوار سے مارنا موت کی بہ نسبت (سبب عادی ہیں۔ پس ان اسباب کے تحقق کے بعد مسببات کا تحقق ضروری نہیں، سبب حقیقی یعنی علت تامہ کے تحقق کے بعد معلول کا تحقق ضروری ہوتا ہے)

☆ ☆ ☆

عالم مثال کا ثبوت

بہت سی احادیث سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ کائنات خداوندی میں ایک ایسا عالم بھی ہے جس میں اعراض مجسّد (جسم دار) ہوتے ہیں جیسے بزدلی ایک عرض ہے، عالم مثال میں اس کو خرگوش کی صورت ملی ہے۔ اسی طرح تمام معنویات کے لئے وہاں مثالی اجسام ہیں، جن کے ذریعہ وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتے ہیں اور چیزیں دنیا میں رونما ہونے سے پہلے اس عالم میں پیدا کی جاتی ہیں۔

مبحث اول کے باب دوم میں، جو کہ عالم مثال کے بیان میں ہے، بہت حدیثیں عالم مثال کے ثبوت میں پیش کی گئی ہیں۔ جیسے:

۱- رشتے (ناتے) کا عرش سے لٹکا ہوا ہونا (رواہ مسلم، کتاب البر والصلة، باب صلة الرحم وتحريم قطيعتها ۱۱۳:۱۶ مصری)

۲- فتنوں کا بارش کی طرح برسنا (باب عالم مثال حدیث ۷)

۳- دریائے نیل وفرات کو سدرۃ المنتہیٰ کی جڑ میں پیدا کرنا، پھر ان کو زمین میں اتارنا (حوالہ بالا حدیث ۸)

۴- لوہے کا اتارنا (سورۃ الحدید آیت ۲۵)

۵- چوپایوں کا اتارنا (سورۃ الزمر آیت ۶)

۶- پورے قرآن کریم کو ایک ساتھ سمائے دنیا پر اتارنا، جبکہ قرآن ایک معنوی چیز ہے (مستدرک حاکم ۵۳۰:۲، الدر ۳۷۲:۶ تفسیر سورۃ القدر)

۷- جنت وجہنم کو حضور ﷺ کے سامنے اور دیوار قبلہ کے درمیان اس طرح حاضر کرنا کہ انگور کا خوشہ لینا ممکن

ہو گیا اور آگ کی گرمی محسوس ہونے لگی (باب عالم المثال حدیث ۹)

۸- بلا اور دعا کا کشتی لڑنا یعنی کشمکش ہونا (حوالہ بالا حدیث ۱۱)

۹- آدم علیہ السلام کی اولاد کو عہد الست میں پیدا کرنا (سورۃ الاعراف آیت ۱۷۲)

۱۰- عقل کو پیدا کرنا اور یہ کہ وہ سامنے آئی اور اس نے پیٹھ پھیری (باب ذکر عالم المثال حدیث ۱۲)

۱۱- دو روشن سورتوں (بقرہ اور آل عمران) کا آنا گویا وہ پرندوں کی دو قطاریں ہیں (حوالہ بالا حدیث ۳)

۱۲- قیامت کے دن اعمال کا تلنا (یہ مضمون بہت سی آیات میں آیا ہے، جیسے سورۃ الاعراف آیت ۸)

۱۳- جنت کو ناگواریوں سے اور جہنم کو خواہشات سے گھیرنا (باب ذکر عالم المثال حدیث ۱۰)

ایسی اور بھی بہت سی احادیث و آیات ہیں، جن سے حدیث شریف کا معمولی طالب علم بھی واقف ہے۔ یہ سب عالم مثال کے ثبوت پر دلالت کرتی ہیں۔

وقد دلّت أحاديث كثيرة على ثبوت عالم تتجسّم فيه الأعراض، وتنتقل المعاني، ويُخلق الشيء قبل ظهوره في الأرض، مثل كون الرَّحِم معلقا بالعرش، ونزول الفتن كمواقع القطر، وخلق النيل والفرات في أصل السدرة، ثم إنزالهما إلى الأرض، وإنزال الحديد والأنعام، وإنزال القرآن إلى السماء الدنيا مجموعًا، وحضور الجنة والنار بين يدي النبي صلى الله عليه وسلم وبين جدار المسجد، بحيث يمكن تناول العنقود، ويأتي حرُّ النار، وكمعالجة البلاء والدعاء، وخلق ذرية آدم، وخلق العقل، وأنه أقبل وأدبر، وإتيان الزهراوين كأنهما فِرْقان، ووزن الأعمال، وحفوف الجنة بالمكاره، والنار بالشهوات، وأمثال ذلك مما لا يخفى على من له أدنى معرفة بالسنة.

ترجمہ: اور بہت سی حدیثیں ایک ایسے عالم کے ثبوت پر دلالت کرتی ہیں، جس میں اعراض جسم دار ہوتے ہیں اور معنویات منتقل ہوتی ہیں۔ اور چیز (اس عالم میں) پیدا کی جاتی ہے زمین میں رونما ہونے سے پہلے۔ جیسے ناتے کا عرش سے لٹکا ہوا ہونا، فتنوں کا بارش کے قطروں کی طرح برسنا، نیل اور فرات کو سدرہ (بیری) کی جڑ میں پیدا کرنا، پھر دونوں کو زمین کی طرف اتارنا، لوہے اور چوپایوں کو اتارنا، سارے قرآن کو ایک ساتھ دنیا والے آسمان پر اتارنا، جنت وجہنم کا حاضر ہونا آنحضور ﷺ کے سامنے اور مسجد کی دیوار کے درمیان: اس طرح کہ خوشہ لینا ممکن ہو گیا اور آگ کی گرمی آنے لگی، اور جیسے آفت اور دعا کا کشتی کرنا اور آدم علیہ السلام کی ذریت کو پیدا کرنا اور عقل کو پیدا کرنا اور یہ کہ وہ سامنے آئی اور اس نے پیٹھ پھیری اور دو روشن سورتوں کا آنا گویا وہ پرندوں کی دو قطاریں ہیں اور اعمال کا (قیامت کے دن) تلنا اور جنت کو ناگواریوں سے گھیرنا اور جہنم کو خواہشات سے۔ اور ان کے مانند روایات میں سے جو پوشیدہ نہیں ہیں اس

پانچ کا حدیث کے مضمون کی معرفت میں دخل ہے۔

☆　☆　☆

تقدیر اور اسباب ظاہری میں تعارض نہیں

قضاء وقدر اور اسباب ظاہری میں کوئی ٹکراؤ نہیں۔ کیونکہ اسباب بھی تقدیر میں داخل ہیں۔ قضائے معلق کا تعلق اسباب ومسببات کے پورے سلسلے کے ساتھ ایک ساتھ ہوتا ہے۔ جیسا کہ حدیث گذر چکی ہے کہ دوا، جھاڑ پھونک اور بچاؤ کی تدابیر بھی اللہ کی تقدیر سے ہیں۔ اور مقام سرغ کے قصہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ارشاد بھی اسی بات کی دلیل ہے۔ سرغ شام میں ایک قریہ کا نام ہے۔ اس کا قصہ یہ ہے کہ شام میں طاعون کی وبا پھیلی ہوئی تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ شام کی طرف جا رہے تھے۔ جب مقام سرغ میں پہنچے تو آپ کو اس وبا کی خبر ملی۔ آپ نے اس بارے میں صحابہ سے مشورہ کیا کہ اس حالت میں آگے جانا چاہئے یا واپس لوٹ جانا چاہئے؟ رائیں مختلف تھیں۔ بالآخر طے پایا کہ واپس لوٹ جانا چاہئے۔ اس وقت حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ نے جو عشرہ مبشرہ میں سے ہیں، اور نبی ﷺ نے ان کو امین هذه الأمة کا خصوصی لقب دیا ہے، اور جو تمام افواج کے سپہ سالار اعظم تھے، اور جو امیر المؤمنین کی زیارت کے لئے جابیہ کی فوج کے جمعیت کی قیادت کرتے ہوئے آئے تھے، کہا: أفراراً من قدر الله؟ (کیا تقدیر الٰہی سے بھاگتے ہو؟) یعنی آپ واپس کیوں لوٹ رہے ہیں؟ کیا یہ خیال ہے کہ اس طرح آپ موت سے بچ جائیں گے؟ آپ کو شام چلنا چاہئے۔ پوری فوج زیارت کے لئے بے تاب ہے۔ جو مقدر ہے ہو کر رہے گا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: لو غيرك قالها يا أبا عبيدة! (کاش کوئی دوسرا یہ بات کہتا! اے ابوعبیدہ!) راوی کہتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کی رائے کے خلاف کرنا ناپسند کرتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

"ہاں ہم اللہ کی ایک تقدیر سے اللہ کی دوسری تقدیر کی طرف بھاگ رہے ہیں۔ بتلائیے! آپ کے پاس اونٹ ہوں، آپ ان کو ایک ایسے میدان میں چرانے کے لئے لے جائیں جس کی ایک جانب سرسبز ہو اور دوسری جانب خشک اور چٹیل ہو، اگر آپ سرسبز حصہ میں چرائیں تو کیا یہ تقدیر الٰہی سے نہیں ہے؟ اور اگر آپ خشک حصہ میں چرائیں تو یہ بھی تقدیر الٰہی سے نہیں ہے؟" (یعنی دونوں صورتیں تقدیر الٰہی میں داخل ہیں)

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ پہنچے، وہ کسی ضرورت سے غیر حاضر تھے۔ آپ نے حدیث شریف سنا کر دونوں کا اختلاف ختم کر دیا۔ وہ حدیث یہ ہے کہ: "جس علاقہ میں طاعون پھیلنے کی خبر سنو وہاں نہیں جانا چاہئے۔ اور اگر کسی جگہ وبا آجائے اور تم وہاں موجود ہو تو وہاں سے بھاگ کر نہیں جانا چاہئے" یہ حدیث سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اللہ کی تعریف کی اور مدینہ کی طرف مراجعت فرمائی (متفق علیہ مشکوٰۃ حدیث ۱۵۴۸ کتاب

الطب، باب فی الطاعون والوباء والفرار منه) حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس ارشاد سے قضا وقدر کی ہمہ گیری ثابت ہوتی ہے (مزید تفصیل میری تفسیر ہدایت القرآن میں سورہ یوسف آیت ۶۸ کی تفسیر میں ہے)

واعلم: أن القدر لا يزاحم سببية الأسباب لمسبَّباتها، لأنه إنما تعلق بالسلسلة المترتبة جملةً مرة واحدة، وهو قوله صلى الله عليه وسلم في الرُّقى والدواء والتُّقاة، هل تَرُدُّ شيئا من قدر الله؟ قال: ﴿هي من قدر الله﴾ وقولُ عمر رضي الله عنه في قصة سَرْغ: "أليس إن رعيتها في الخصب رعيتها بقدر الله؟" إلخ.

ترجمہ: اور جان لیں کہ تقدیر مزاحمت نہیں کرتی مسببات کے لئے ان کے اسباب کے سبب بننے سے۔ اس لئے کہ تقدیر پورے ترتیب وار سلسلہ کے ساتھ ایک بارگی جڑی ہے (یعنی سارا سلسلہ ایک ساتھ مع اسباب ومسببات طے کردیا گیا ہے، کوئی چیز ان میں سے منتظر نہیں) اور وہ آپ ﷺ کا ارشاد ہے جھاڑ پھونک، دوا دارو اور پرہیز کے بارے میں ـ کیا یہ چیزیں پھیرتی ہیں تقدیر خداوندی میں سے کسی چیز کو؟ آپ نے فرمایا: "یہ سب چیزیں تقدیر الٰہی میں داخل ہیں" اور وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے واقعۂ سرغ میں: "کیا یہ بات نہیں ہے کہ اگر آپ اونٹوں کو چرائیں سرسبز وادی میں تو آپ ان کو چرائیں گے قضائے الٰہی سے؟" آخر تک۔

بندوں کا اختیار بھی باذنِ الٰہی ہے

مکلف بندوں کو ان کے اختیاری اعمال کے کرنے نہ کرنے کا اختیار بیشک حاصل ہے، مگر ان کا وہ اختیار، اختیاری نہیں ہے، بلکہ باذن الٰہی ہے۔ کیونکہ بندوں کا عمل کرنے نہ کرنے کا اختیار تین چیزوں کا نتیجہ ہوتا ہے: ایک: بندہ جو کام کرنا چاہتا ہے اس کی صورت اس کی نگاہوں کے سامنے موجود ہو، کیونکہ اگر وہ کام ہی نہیں جانتا تو کرے گا کیا؟ دوم: اس کو اس کام کا فائدہ معلوم ہو، کیونکہ سمجھ دار آدمی بے فائدہ کام نہیں کرتا۔ سوم: اس کام کے کرنے کا دل میں داعیہ پیدا ہو، عزم وارادہ ابھرے، تو ہی آدمی کوئی کام کرتا ہے۔ اور صورت حال یہ ہے کہ بندوں کو ان چیزوں کا سرے سے علم ہی نہیں، پھر جو اختیار ان چیزوں پر متفرع ہوتا ہے وہ اختیاری کہاں رہا؟ سورۃ التکویر کی آخری آیت ہے: ﴿وَمَا تَشَاءُونَ إِلَّا أَن يَشَاءَ اللَّهُ رَبُّ الْعَالَمِينَ﴾ (اور تم بدوں خدائے رب العالمین کے چاہے کچھ نہیں چاہ سکتے) اور حدیث شریف میں ہے کہ "قلوب اللہ تعالیٰ کی انگلیوں میں سے دو انگلیوں کے درمیان ہیں، الٹتے پلٹتے ہیں ان کو جس طرح چاہتے ہیں" (رواہ مسلم وغیرہ، مشکوۃ باب الایمان بالقدر)

فائدہ: یہاں ایک نکتہ ذہن نشین کرلیا جائے: اللہ تعالیٰ قادر مطلق، خالق کل ہیں، کائنات کا کوئی ذرہ نہ تو ان کی قدرت سے باہر ہو سکتا ہے اور نہ ان کے علاوہ کوئی خالق ہو سکتا ہے۔ پس اعمال، بندوں کا چاہنا اور بندوں کا اختیار بھی

اللہ کی قدرت کے ماتحت ہوگا اور انہیں کو اس کا خالق ماننا ہوگا۔ اگر یہ ارادہ بھی ان کے اختیار سے باہر ہو جائے تو خود قدرت و صفت خلق پر اثر پڑے گا۔ جب صورت حال یہ ہے تو پھر بندوں کے مکلف ہونے کی کیا صورت ہو سکتی ہے؟ اس کی صورت یہی ہو سکتی ہے کہ بندوں کو ایک درجہ تک ہی مختار مانا جائے اور اسی پر جزا و سزا کی بنیاد قائم کی جائے۔ اور انسان کا ایک درجہ میں با اختیار ہونا اور دیگر مخلوقات کا بے اختیار ہونا بدیہی امر ہے۔ ہر شخص دونوں کے احوال کا موازنہ کر کے اس فرق کو بخوبی سمجھ سکتا ہے۔ باقی اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں۔

وللعباد اختيارٌ أفعالهم، نعم لا اختيار لهم في ذلك الاختيار، لكونه معلولاً بحضور صورة المطلوب، ونفعه، وهجوم داعية وعزم مما ليس له علم به، فكيف الاختيار فيها؟! وهو قوله: ﴿إن القلوب بين إصبعين من أصابع الله، يقلبها كيف يشاء﴾ والله أعلم.

ترجمہ: اور بندوں کو ان کے کاموں کے کرنے کا اختیار ہے۔ ہاں ان کو کچھ اختیار نہیں ہے اس اختیار میں۔ اس لئے کہ وہ اختیار نتیجہ ہے مطلوب کی صورت اور اس کے فائدے کے مستحضر ہونے کا اور عزم و ارادہ کے اٹھنے کا، جو ان چیزوں میں سے ہیں جن کا اس کو کچھ علم نہیں۔ پس ان چیزوں کا اختیار کیونکر ہو سکتا ہے؟! (اس لئے کہ اختیار علم پر متفرع ہے اور جب ان چیزوں کا علم ہی نہیں تو اختیار کیسے ہو سکتا ہے؟ اور کام کرنے نہ کرنے کا اختیار ان تین چیزوں کے اختیار پر متفرع ہے اور اس کا نتیجہ ہے اور یہ تینوں چیزیں مفقود ہیں) اور وہی آپ ﷺ کا ارشاد ہے: "بیشک دل اللہ کی انگلیوں میں سے دو انگلیوں کے درمیان ہیں، پھیرتے ہیں ان کو جس طرح چاہتے ہیں" باقی اللہ بہتر جانتے ہیں۔

باب — ۲

عبادت اللہ تعالیٰ کا بندوں پر ایک حق ہے

حق کے معنی ہیں ثابت شدہ چیز۔ حق الامر کے معنی ہیں کسی چیز کا ثابت و واجب ہونا۔ اس باب میں یہ بیان ہے کہ عبادت اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں پر ایک لازمی حق ہے، جس کو ماننا اور ادا کرنا ضروری ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بالارادہ بندوں پر انعام واحسان فرمانے والے ہیں اور منعم و محسن کی شکر گذاری ضروری ہے۔ عبادت اسی شکر گذاری کی ایک صورت ہے۔ نیز اللہ تعالیٰ قصد و اختیار سے بندوں کو ان کے اعمال کا بدلہ دیتے ہیں۔ جو شخص بندگی کرتا ہے وہ دنیا و آخرت میں ثمرہ پاتا ہے، اور جو منہ موڑتا ہے وہ سزا پاتا ہے۔ یعنی بندے اپنے ہی فائدے کے لئے عبادت کرتے ہیں۔ اس حق کی بڑی اقسام میں سے ایک یہ ہے کہ آدمی صمیم قلب سے ایسا پختہ یقین رکھے کہ ذہن میں جانب مخالف کا کوئی احتمال باقی نہ رہے کہ عبادت اللہ تعالیٰ کا بندوں پر ایک لازمی حق ہے، اور وہ بندوں سے اسی طرح مطلوب ہے

جس طرح تمام اہل حقوق اپنے حقوق کا مطالبہ کرتے ہیں۔ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی متفق علیہ حدیث میں اس حق کا ذکر ہے، وہ حدیث یہ ہے:

"حضور ﷺ نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا: تم جانتے ہو بندوں پر اللہ کا کیا حق ہے؟ اور اللہ تعالیٰ پر بندوں کا کیا حق ہے؟" حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: اللہ اور ان کے رسول ہی بہتر جانتے ہیں! آپ ﷺ نے فرمایا: "بندوں پر اللہ کا حق یہ ہے کہ بندے اُسی کی بندگی کریں، اور اس کے ساتھ کسی بھی چیز کو شریک نہ کریں۔ اور بندوں کا اللہ تعالیٰ پر حق یہ ہے کہ وہ اس شخص کو عذاب نہ دیں جو ان کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرے" (مشکوۃ حدیث نمبر ۲۴)

اور یہ اعتقاد اس لئے ضروری ہے کہ جس شخص کے ذہن میں کسی بھی وجہ سے یہ احتمال باقی ہے کہ وہ ایک بیکار ٹکا (بے مقصد) وجود ہے، رب مختار و مرید کی طرف سے اس سے نہ تو کسی عبادت کا مطالبہ ہے اور نہ ترک عبادت پر دارو گیر ہے تو ایسا شخص دہریہ (بدعقیدہ) ہے۔ وہ گو عبادت کرے گا بھی تو بے فائدہ ہوگی۔ اس کے دل پر عبادت کا کوئی اثر نہیں پڑے گا، اور اس کے اور پروردگار عالم کے درمیان فیضان کا کوئی دروازہ نہیں کھلے گا۔ اس کی عبادت دیگر عادات کی طرح محض ایک عادت ہوگی۔

باب الإيمان بأن العبادة حقُّ الله تعالى على عباده

لأنه منعمٌ عليهم، مُجازٍ لهم بالإرادة

اعلم: أن من أعظم أنواع البر: أن يعتقد الإنسانُ بمجامع قلبه بحيث لا يحتمل نقيضَ هذا الاعتقاد عنده: أن العبادة حقُّ الله تعالى على عباده؛ وأنهم مطالَبون بالعبادة من الله تعالى، بمنزلة سائر مطالبة ذوي الحقوق من حقوقهم. قال النبي صلى الله عليه وسلم لمعاذ: "يا معاذ! هل تدري ما حقُّ الله على عباده؟ وما حقُّ العباد على الله؟" قال معاذ: الله ورسوله أعلم، قال: "فإن حقَّ الله على العباد أن يعبدوه، ولا يشركوا به شيئا، وحقُّ العباد على الله تعالى أن لا يعذِّب من لا يشرك به شيئا"

وذلك: لأن من لم يعتقد ذلك اعتقادا جازمًا، واحتمل عنده أن يكون سُدًى مهملاً، لا يُطالَب بالعبادة، ولا يؤاخذ بها من جهة رب مريد مختار، كان دهريًا، لا تنفع عبادته ـ وإن باشرها بجوارحه ـ بموقعٍ من قلبه، ولا تفتح بابا بينه وبين ربه، وكانت عنده كسائر عاداته

ترجمہ: اس بات پر ایمان لانے کا بیان کہ عبادت بندوں پر اللہ تعالیٰ کا حق ہے، اس لئے کہ وہ ان پر بالارادہ

اتنی مقرر فرمانے والا اور ان کو بدلہ دینے والا ہے۔ جان لیں کہ نیکی کی عظیم ترین انواع میں سے یہ ہے کہ انسان صمیم قلب سے اس طرح اعتقاد رکھے کہ اس اعتقاد کی تحقیق کا اس کے نزدیک کوئی احتمال نہ رہے کہ عبادت اللہ تعالیٰ کا (ایک حتمی) حق ہے اس کے بندوں پر، اور یہ کہ اللہ کی طرف سے اس حق کا مطالبہ بندوں سے اسی طرح کیا گیا ہے جس طرح دیگر ارباب حقوق اپنے حقوق کا مطالبہ کرتے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے پوچھا "اے معاذ! تم جانتے ہو کہ بندوں پر اللہ تعالیٰ کا کیا حق ہے؟ اور اللہ تعالیٰ پر بندوں کا کیا حق ہے؟" حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ اللہ اور اس کے رسول بہتر جانتے ہیں! (یعنی مجھے علم نہیں ہے) آپ ﷺ نے فرمایا "بندوں پر اللہ تعالیٰ کا حق یہ ہے کہ بندے اس کی عبادت کریں۔ اور کسی چیز کو اس کے ساتھ شریک نہ کریں اور بندوں کا اللہ تعالیٰ پر یہ حق ہے کہ وہ اس شخص کو عذاب نہ دیں جو ان کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتا"

اور یہ اس لئے ہے کہ جو شخص ایسا اعتقاد جازم (مضبوط اعتقاد) نہ رکھے اور اس کے ذہن میں یہ احتمال ہو کہ وہ ایک نکما مہمل وجود ہے، اس سے نہ تو عبادت کا مطالبہ کیا گیا ہے اور نہ بااختیار ارادہ پروردگار کی طرف سے تو جب عبادت پر اس کی پکڑ نہ ہوگی تو ایسا شخص بے پرواہ ہے۔ اس کی عبادت واقع نہیں ہوتی۔ اگرچہ وہ اپنے اعضاء سے عبادت کرے —— اس کے دل کی تہہ تک۔ اور وہ عبادت کوئی دروازہ نہیں کھولتی اس کے درمیان اور اس کے پروردگار کے درمیان اور وہ عبادت اس کی دوسری عادتوں کی طرح ایک عادت ہوتی ہے۔

لغات:

المجمع: جمع مجامع: جمع کرنے یا جمع ہونے کی جگہ، مجامع القلب: پورا قلب، دل کی تہہ   مطالب: اسم مفعول ہے   الدھری: وہ دین جو عالم کے قدیم اور غیر مخلوق ہونے کا قائل ہو، وہ یہ مانتا ہو کہ یہ دنیا خود کار ہے۔

☆ ☆ ☆

صفت ارادہ کا بیان

عنوان باب میں کہا گیا ہے کہ عبادت اللہ تعالیٰ کا حق اس لئے ہے کہ وہ بالارادہ منعم و مجازی ہیں۔ اس سلسلہ میں یہ ضروری بات جان لینی چاہئے کہ حکمت ذیلیہ اگرچہ سب ہی طے ہیں، قضاء و قدر نے کوئی چیز باقی نہیں چھوڑی، جو بات ہونی ہے یا نہیں ہونی ہے سب کا فیصلہ کر دیا گیا ہے، کوئی حالت منتظرہ نہیں ہے مگر نصوص شرعیہ اور تصریحات علماء سے یہ بات بھی ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات میں ایک صفت ارادہ بھی ہے۔ ارادہ کے معنی ہیں کسی کام کے کرنے کا فیصلہ کرنا، مثلاً زید کو کسی خاص وقت میں پیدا کرنے کا فیصلہ کرنا یہ ارادہ ہے۔ صفت ارادہ فی نفسہا مستوی الطرفین ہوتی ہے

یعنی زید کو پیدا کرنا اور نہ کرنا دونوں باتیں درست ہوتی ہیں، دونوں پہلوؤں کے ساتھ اس کا تعلق قائم ہوسکتا ہے مگر جب ایک پہلو کے ساتھ اس کا تعلق قائم ہوجاتا ہے اور کسی چیز کے کرنے کا فیصلہ کردیا جاتا ہے تو اس کا نام ارادہ ہے۔ سورۃ المائدہ کی پہلی ہی آیت میں ہے کہ وہ جو چاہتے ہیں حکم کرتے ہیں ﴿إِنَّ اللهَ يَحْكُمُ مَا يُرِيدُ﴾ اور سورۃ الرحمان آیت ۲۹ میں ہے کہ وہ ہر وقت کسی نہ کسی کام میں رہتے ہیں ﴿كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ﴾ یعنی جتنے تصرفات عالم میں واقع ہورہے ہیں وہ سب انہیں کے تصرفات ہیں، ہر آن کسی نہ کسی چیز کے ساتھ ان کا ارادہ متعلق ہوتا رہتا ہے۔ غرض شریعت میں قضاء وقدر کے ساتھ صفت ارادہ بھی ثابت ہے اور اللہ تعالیٰ قصد وارادہ سے انعام واحسان فرمانے والے ہیں اور بندوں کو ان کے اعمال پر دنیا وآخرت میں بدلہ دینے والے ہیں۔ اس لئے ان کی عبادت ضروری ہے۔

والأصل في ذلك: أنه قد ثبت في معارف الأنبياء وورثتهم عليهم الصلوات والتسليمات — أن موطنًا من مواطن الجبروت، فيه إرادةٌ وقصدٌ، بمعنى الإجماع على فعلٍ، مع صحة الفعل والترك بالنظر إلى هذا الموطن، وإن كانت المصلحةُ الفوقانية لاتُبقي ولا تذر شيئًا — إلا أوجب وجودَه، أو أوجب عدمه، لاوجود للحالة المنتظَرة بحسب ذلك.

ترجمہ: اور بنیادی بات اس بارے میں (یعنی خدا کے بالارادہ متصرف (مختار) ہونے کے بارے میں) یہ ہے کہ انبیاء اور ان کے ورثاء (یعنی علماء) — ان پر اللہ کی بے پایاں رحمتیں اور سلام ہوں — کے علوم میں (یعنی نصوص شرعیہ اور تصریحات علماء سے) یہ بات ثابت ہوچکی ہے کہ مقامات جبروت میں سے ایک مقام میں قصد وارادہ ہے (اللہ کی ذات سے تعلق رکھنے والی باتوں کو لاہوت سے تعبیر کرتے ہیں، اور صفات سے تعلق رکھنے والی باتوں کو جبروت[1] سے۔ پس عبارت کا مطلب یہ ہے کہ منجملہ صفات خداوندی کے ایک صفت ارادہ بھی ہے) یعنی کسی چیز کے کرنے کا فیصلہ کرنا (فَعل ف کے زبر کے ساتھ مصدر ہے اور فِعل ف کے زیر کے ساتھ اسم بمعنی کام ہے) اس مقام (یعنی صفت ارادہ) کی طرف نظر کرتے ہوئے کرنا اور نہ کرنا (دونوں باتوں) کی درستی کے ساتھ (یعنی فی نفسہ صفت ارادہ مستوی الطرفین ہوتی ہے) اگرچہ بالائی مصلحت (یعنی حکمت خداوندی اور صفت قضاء وقدر) نہ تو کوئی چیز باقی رہنے دیتی ہے اور نہ چھوڑتی ہے مگر وہ یا تو اس چیز کے ہونے کو واجب کرتی ہے یا نہ ہونے کو، اس (مصلحت فوقانی) کے اعتبار سے کسی حالت منتظرہ کا وجود ہی نہیں۔

☆ ☆ ☆

[1] شاہ صاحب رحمہ اللہ نے التفہیمات (۱: ۲۲۷) میں لکھا ہے:

ثم يعلوه الجبروت، والتعبير عنها بالصفات لسان قاصر، والأقرب ما يعبر به عنها أنها أسماء اهـ

صفتِ ارادہ کے تعلق سے حکماء پر ردّ

اس میں اختلاف ہے کہ نظامِ عالم کس طرح چل رہا ہے؟ اسباب سے مسببات کس طرح پیدا ہوتے ہیں؟ قدرت نے اشیائے عالم میں جو تاثیرات رکھی ہیں ان کی کارکردگی کی نوعیت کیا ہے؟ اس سلسلہ میں چار رائیں ہیں۔

① اشاعرہ جری عادت کے قائل ہیں یعنی سنت الٰہی یہ چل رہی ہے کہ جب اسباب پائے جاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ مسببات کو پیدا کرتے ہیں، جب آگ کاغذ کو چھوتی ہے تو اللہ تعالیٰ کاغذ کو جلاتے ہیں، آگ نہیں جلاتی۔

② معتزلہ کے نزدیک بہ طریق تولید نظامِ عالم چل رہا ہے۔ تولید کے معنی ہیں جننا، وہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے علل واسباب پیدا کئے ہیں اور ان میں اثر انداز ہونے والی خصوصیات پیدا کی ہیں۔ اب ان اسباب وعلل سے بطور وجوب واضطرار (Automatically) مسببات ومعلولات پیدا ہو رہے ہیں۔ اب ان تاثیرات میں خدا کا کوئی دخل نہیں ہے۔ توبہ!

③ حکماء اور فلاسفہ اعداد کے قائل ہیں۔ اعداد کے معنی ہیں تیار کرنا۔ وہ کہتے ہیں کہ مبدأ فیاض نے اسباب کو تیار کر دیا ہے۔ اب ان سے وجوب عقلی کے طور پر آثار ومسببات صادر ہوتے ہیں۔ مسببات، اسباب سے متخلف نہیں ہو سکتے یعنی فلاسفہ کے نزدیک اللہ تعالیٰ صرف علت اولیٰ ہیں اور ان کا کام صرف اعداد ہے۔ اور اسباب علل حقیقیہ ہیں، انہیں سے مسببات کا صدور ہوتا ہے۔ اب سلسلۂ عالم میں مبدأ فیاض کا کوئی دخل نہیں ہے، جیسے گھڑی بنانے والا اختیار وارادہ سے گھڑی بناتا ہے مگر جب اس کو بنا کر تیار کر دیتا ہے اور اس کو چلا دیتا ہے تو اب وہ چلتی رہتی ہے۔ واچ میکر کا اب اس میں کوئی دخل نہیں ہوتا۔

④ ماتریدیہ تاثیر کے قائل ہیں یعنی اللہ تعالیٰ نے اشیاء میں اثر انداز ہونے والی تاثیرات پیدا کی ہیں۔ انہیں سے مسببات پیدا ہوتے ہیں اور یہ تاثیرات دستِ قدرت میں ہیں۔ مسبب الاسباب اور علۃ العلل اللہ تعالیٰ ہی ہیں۔ جلاتی آگ ہے مگر باذن الٰہی جلاتی ہے۔ یہی برحق مذہب ہے۔ تفصیل معارف السنن (۱: ۱۳۲) میں ہے۔

غرض نظامِ عالم کے تعلق سے حکماء کا نظریہ وہ ہے جو اوپر بیان کیا گیا۔ اس لئے وہ صفت ارادہ یعنی کسی کام کا فیصلہ کرنا تسلیم نہیں کرتے۔ ان کے نزدیک ارادہ بایں معنی باطل ہے۔ ہاں ارادۂ ازلی کو وہ مانتے ہیں۔ مگر اس کے تعلق حادث کے وہ قائل نہیں۔ ان کے نزدیک ارادۂ ازلی نے اسباب کو تیار کر دیا ہے۔ اور اب وہ اسباب خودکار ہیں، ہر چیز کے ساتھ ارادہ کے نیا تعلق قائم ہونے کا سوال ہی نہیں۔

شاہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حکماء نے ایک بات کا تو خیال رکھا یعنی صفت ارادہ قدیمہ کو تو اس کا پورا حق دیا، مگر بہت سی باتیں ان کی نگاہوں سے اوجھل رہ گئیں۔ وہ صفت ارادہ کے تعلق حادث کا ادراک ہی نہ کر سکے، جبکہ یہ بھی

برحق بات ہے۔ حکماء کے نظریہ کے خلاف خود انسان کے اندر اور کائنات میں دلائل موجود ہیں۔

حکماء کی کوتاہ بینی: حکما صفت ارادہ کے تعلق حادث کو نہیں سمجھ سکے۔ اس کا مقام تجلی اعظم اور ملأ اعلیٰ کے درمیان ہے۔ تجلی اعظم سے ذات وصفات قدیمہ کے مجموعہ کو تعبیر کیا ہے اور ملأ اعلیٰ کی تفصیل پہلے گذر چکی ہے۔ صفات قدیمہ کا مخلوق کے ساتھ جو تعلق حادث قائم ہوتا ہے اس کا مقام دونوں کے درمیان ہے یعنی وہ تعلق حادث اللہ تعالیٰ کی صفت نہیں ہے مگر صفت سے بے تعلق بھی نہیں ہے۔ جیسے ہیرے کی چمک دمک نہ ہیرا ہے نہ اس کی صفت، بلکہ اس کا اثر ہے۔ اسی طرح صفت ارادہ کے تعلق حادث کو خیال میں لانا چاہئے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ نے زید کو پیدا کیا تو یہاں دو چیزیں ہیں: ایک اللہ کی صفت خلق جو قدیم ہے دوسری اس صفت کا زید کے وجود سے تعلق، یہ حادث ہے۔ یہ تعلق اللہ کی صفت نہیں ہے البتہ اس کا اثر ہے، جیسے ہیرے کی چمک ہیرے کا اثر ہے۔ مصنف رحمہ اللہ نے اپنے رسالہ حُسن العقیدۃ میں لکھا ہے: ولایقوم بذاتہ حادث، فلیس فی ذاتہ ولا فی صفاتہ حدوث، وإنما الحدوث فی تعلق الصفات بمتعلقاتها حتی تظهر الأعمال. وحقیقتہ: أن التعلق أیضا لیس بحادث، ولکن الحادث هو المتعلَّق، فیظهر أحکام التعلق متفاوتۃ لتفاوت المتعلقات. وهو مبرّی عن الحدوث والتجدد من جمیع الوجوه (التفهیمات الإلهیۃ ١٤٧:١).

غرض اس مقام میں صفت ارادہ کے تعلق سے کسی چیز کے مستوی الطرفین ہونے کے بعد ملأ اعلیٰ کے عزم وہمات کے تقاضے سے کسی چیز کے کرنے پر اتفاق ہوتا ہے۔ یہی ارادہ کا تعلق حادث ہے اور وہ صفت قدیمہ کی طرح ایک برحق حقیقت ہے، جس کے ادراک سے حکما محروم رہ گئے اور انھوں نے اسباب کو خود کار سمجھ لیا۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اسباب کو کارگر یہی صفت ارادہ کا تعلق بناتا ہے۔

حکماء کے خلاف دلیل: ایک مثال میں غور کریں اور یہ حکماء کے خلاف ”انفس“ سے دلیل ہے: ہم ہاتھ بڑھا کر۔ مثال کے طور پر۔ قلم لیتے ہیں تو ہم بدیہی طور پر جانتے ہیں کہ ہم یہ کام قصد وارادہ سے کرتے ہیں۔ حالانکہ قلم لینے کے ارادے کی بہ نسبت اور آدمی کی خداداد صلاحیتوں کی بہ نسبت قلم کا لینا اور نہ لینا یکساں ہے اور قضا وقدر کے اعتبار سے کوئی ایک بات طے ہے۔ اسی طرح جب خاص استعداد کسی چیز کے ہونے کو لازم وواجب جانتی ہے تو خالق کی طرف سے وہ چیز وجود پذیر ہو جاتی ہے اور اس میں متجدد وحادث چیز کا کسی درجہ میں دخل ہوتا ہے جیسے زنگی مادوں میں استعداد پیدا ہوتی ہے تو ان پر صورتوں کا فیضان ہوتا ہے۔ اور دعا کے بعد قبولیت نازل ہوتی ہے۔

ولاعبرة بقوم یسمّون الحکماء، یزعمون أن لا إرادة بهذا المعنی فقد حفظوا شیئًا، وغابت عنهم أشیاء، وهم محجوبون عن مشاهدة هذا الموطن، محجوجون بأدلة الآفاق والأنفس.
أما حجابهم: فهو أنهم لم یهتدوا إلی موطن بین التجلی الأعظم وبین الملأ الأعلی، شبیه

بالشعاع القائم بالجوهرة، ولله المثل الأعلى؛ ففي هذا الموطن يتمثل إجماعٌ على شيء، استوجبه علومُ الملأ الأعلى وهيئاتهم، بعد ما كان مستوى الفعل والترك في هذا الموطن.

وأما الحجة عليهم: فهي أن الواحد منا يعلم بداهةً: أنه يمد يده ويتناول القلم — مثلاً — وهو في ذلك مريدٌ قاصدٌ، يستوي بالنسبة إليه الفعلُ والتركُ، بحسب هذا القصد، وبحسب هذه القوى المنبثة في نفسه، وإن كان كلُّ شيء بحسب المصلحة الفوقانية: إما واجب الفعل أو واجب الترك، فكذلك الحال في كل ما يستوجبه استعدادٌ خاص، فينزل من بارئ الصُّور نزولَ الصور على المواد المستعدة لها، كالاستجابة عقيب الدعاء، مما فيه دخلٌ لمستجدٍّ حادث بوجه من الوجوه.

ترجمہ: اور ان لوگوں کا کوئی اعتبار نہیں جو "حکماء" کہلاتے ہیں: وہ گمان کرتے ہیں کہ باری تعالیٰ کوئی ارادہ نہیں ہے، پس انھوں نے یقیناً ایک چیز محفوظ رکھی اور متعدد چیزیں ان سے غائب ہوگئیں اور وہ محروم رہ گئے اس مقام (یعنی صفت ارادہ سے تعلق حادث) کے مشاہدہ کرنے سے (یعنی سمجھنے سے) (اور) ان کے خلاف انفس و آفاق میں دلائل موجود ہیں۔

رہا ان کا محروم رہنا: تو وہ یہ ہے کہ انھوں نے اس مقام (یعنی تعلق حادث) کی طرف راہ نہیں پائی جو تجلی اعظم اور ملاً اعلیٰ کے درمیان ہے، جو اس روشنی کے مشابہ ہے جو ہیرے کے ساتھ قائم ہے۔ اور اللہ کی شان اعلیٰ ہے (یعنی ہیرے کی شان بلا تشبیہ ہے کیونکہ ان کی شان لیس کمثلہ شیء ہے) پس اس مقام میں کسی ایک چیز کے کرنے پر اتفاق پایا جاتا ہے جس کو ملاً اعلیٰ کے علوم اور ان کی ہیئتیں واجب و لازم جانتی ہیں، اس کے بعد کہ وہ امر اس مقام میں مستوی الطرفین تھا۔

اور رہی ان کے خلاف دلیل: تو وہ یہ ہے کہ ہم میں سے ہر شخص بدیہی طور پر جانتا ہے کہ وہ اپنا ہاتھ بڑھاتا ہے اور مثال کے طور پر قلم لیتا ہے اور وہ اس فعل میں ارادہ کرنے والا قصد کرنے والا ہوتا ہے، درانحالیکہ یکساں ہوتا ہے اس کی نسبت لینا اور نہ لینا، اس ارادے کے اعتبار سے اور ان صلاحیتوں کے اعتبار سے جو اس کی ذات میں دراز ہونے والی ہیں، اگرچہ بالائی مصلحت (قضاء و قدر اور ارادۂ قدیمہ) کے اعتبار سے ہر چیز کا یا تو کرنا ضروری ہوتا ہے یا نہ کرنا۔ یہی صورت حال ہے ہر اس چیز میں جس کو واجب و لازم جانتی ہے مخصوص استعداد، پس وہ چیز اترتی ہے خالق صور کی طرف سے صورتوں کے اترنے کی طرح ان مادوں پر جن میں ان صورتوں کی استعداد پیدا ہو جاتی ہے جیسے دعا کے بعد قبولیت (کا اترنا اور یہ) ان چیزوں میں سے (ہے) جس میں نئی وجود میں آنے والی حادث چیز کا دخل ہے، دخل کی صورتوں میں سے کسی صورت کے ذریعہ۔

لغات و ترکیب:

الحکماء مفعول ثانی ہے اور یسمّون میں ضمیر جمع نائب فاعل ہے۔ محجوب (اسم مفعول) چھپا ہوا یعنی

مُجرِم: مَخْلُوج (اسم مفعول) دلیل میں مغلوب ہوا ہوا۔ مُتَوَجِّه: واجب ولازم ہونا۔ اَلْمُتَّبَعَة (اسم فاعل) تَتَّبِعُ الحِرْبَاءُ عَلَى العُود: گرگٹ کا لکڑی پر ورزش ہونا۔ فَيَنْزِلُ میں ضمیر مستتر ما موصولہ کی طرف لوٹتی ہے جو ما يستوجبه میں ہے۔ نزولَ الصور منصوب بنزع خافض ہے ای کنزول الخ: معما فی دخل الخ خبر ہے مبتدا محذوف ہے ای هذا مما فيه الخ۔

تصحیح: يتوهمون ان لا ارادة الخ اصل میں يتوهمون ان الارادة الخ تھا۔ تصحیح مخطوطہ کراچی اور مخطوطہ پٹنہ سے کی گئی ہے۔

☆ ☆ ☆

صفت ارادہ کے تعلق سے فلاسفہ کا ایک اعتراض اور اس کا جواب

فلاسفہ یہ کہتے ہیں کہ صفت ارادہ کا تعلق حادث ماننا مصلحت خداوندی یعنی قضا وقدر اور ارادہ قدیمہ کے اعتبار سے شی کے وجوب سے بے خبری ہے یعنی جب قضا وقدر نے ہر بات طے کر دی ہے اور ہر ہونے والی چیز کے ساتھ ارادہ ازلی متعلق ہو چکا ہے تو اب اس کا ہونا واجب (ضروری) ہے۔ پھر دوبارہ اس ہونے والی چیز کے ساتھ ارادہ کا تعلق ماننا ہلکی بات ہے جہالت ہے اور ایسی جہالت بھری بات شان خداوندی کے سزاوار کیسے ہو سکتی ہے؟ پس صفت ارادہ کے تعلق حادث کا قائل ہونا باطل ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ تو یہ کہنا کہ ”صفت ارادہ کا تعلق حادث جہالت بھری بات کیسے ہو سکتی ہے؟! وہ تو علم یقینی ایک حقیقت ہے اور وہ اس مقام کا پورا لحاظ کرنا ہے یعنی وہ اس حقیقت واقعیہ (تعلق حادث) کا پورا پورا اعتراف کرتا ہے۔ جہالت بھری بات تو جب ہوتی کہ کہا جاتا کہ ”سرے سے کوئی چیز ہونی ضروری نہیں، اللہ جو چاہتے ہیں کرتے ہیں“ نصوص شرعیہ نے ایسی جہالت والی بات کی نفی کی ہے۔ شرائع خداوندی نے تقدیر پر ایمان لانا ضروری قرار دیا ہے۔ اور تقدیر پر ایمان کا مطلب ہی یہ ہے کہ ہر بات قرار پا چکی ہے اور اس کے مطابق ہونا ضروری ہے۔ وہ طے شدہ بات واقع نہ ہو یہ ممکن ہی نہیں۔ پہلے یہ حدیث گذر چکی ہے کہ: ”جو احوال تجھے پہنچے ہیں وہ تجھے چوک نہیں سکتے تھے اور جو تجھے چوک گئے ہیں یعنی نہیں پہنچے ہیں وہ تجھے پہنچ نہیں سکتے تھے“ لیکن جب اس حقیقت کے اعتراف کے ساتھ یہ کہا جائے کہ ”اللہ تعالیٰ ازل میں طے کر کے عاجز نہیں ہو گئے۔ اب بھی وہ قادر مطلق ہیں اور جو کچھ ہو رہا ہے وہ خود بخود نہیں ہو رہا ہے بلکہ ارادۂ خداوندی کے تعلق حادث کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ صفت ارادہ کے تعلق حادث کے اعتبار سے اب بھی دونوں پہلو ان کی قدرت میں ہیں، وہ چاہیں تو کریں اور چاہیں تو نہ کریں“ یہ کہنا قطعاً ایک برحق بات ہے، جہالت بھری بات کسی طرح بھی نہیں ہے۔ جہالت بھری بات تو یہ ہے کہ قضا وقدر اور ارادۂ قدیمہ پر نظر کر کے معاذ

العیاذ باللہ، اللہ تعالیٰ کو کائنات سے بے دخل اور بے بس کر دیا جائے۔

ایک مثال میں غور کریں، اور یہ مثال عقلاء کے خلاف آفاقی دلیل بھی ہے: جب مادہ یعنی جنسی مست اور پُرشہوت ہوتی ہے تو وہ مخصوص حرکات کرتی ہے، پھر جب وہ نر سے ملتی ہے تو نر اپنی والی حرکتیں کرتا ہے تو عقلاء کیا حکم لگاتے ہیں: کیا دونوں کی یہ حرکات جبری (بے اختیاری) ہیں، جیسے پتھر لڑھکتا ہے؟ اگر وہ یہ فیصلہ کرتے ہیں تو غلط ہے۔ یا یہ حرکتیں اختیاری تو ہیں مگر علت موجبہ کے بغیر صادر ہوتی ہیں یعنی نہ تو نرینہ مزاج کا اس میں کوئی دخل ہے نہ مادینہ مزاج کا۔ اگر عقلاء یہ فیصلہ کرتے ہیں تو یہ بھی غلط ہے۔ یا یہ حرکات اختیاری ہیں اور نر ومادہ میں خدا نے جو صلاحیتیں رکھی ہیں ان کی وجہ سے یہ حرکتیں ہوتی ہیں، مگر یہ درجہ بہ فوقانی کی محض حکایت ہیں یعنی قضاء وقدر میں جو باتیں طے ہیں یہ حرکات محض ان کی نقل (سوانگ، ڈرامہ) ہیں۔ نر ومادہ میں نہ تو بذات خود کوئی ہیجان ہے نہ ان حرکات کے پیچھے ان کا اپنا کوئی مقصد ہے۔ اگر عقلاء یہ فیصلہ کرتے ہیں تو یہ بھی غلط ہے۔ بلکہ حق اور یقینی امر یہ ہے کہ نر ومادہ کی یہ اختیاری حرکات علت موجبہ (قضاء وقدر) کا نتیجہ ہیں۔ یہ حرکات نہ پائی جائیں یہ بات ممکن ہی نہیں۔ اور اس جہت سے قطع نظر کرتے ہوئے نر ومادہ میں ذاتی سرور وہیجان بھی پایا جاتا ہے، جو ان کا ارادہ ہے۔ اسی طرح جو شخص مقام کا حق ادا کرتا ہے اور انسان کے اختیاری اعمال کے بارے میں کہتا ہے کہ یہ حرکات قوتِ الٰہی (قضاء وقدر) کا نتیجہ ہیں۔ مگر اس سے قطع نظر کرتے ہوئے انسان کے لئے فی نفسہ کام کرنا اور نہ کرنا دونوں مساوی ہیں۔ پھر وہ ایک پہلو کو باختیار خود ترجیح دیتا ہے تو اس کا یہ اختیار ایک طرف سے کام کے کرنے کی یا نہ کرنے کی علت بن جاتا ہے تو اس شخص نے حق کہا اور حق کا سرا یعنی وہ صحیح فیصلہ تک پہنچا۔ شریعت نے تکلیف اور جزا وسزا کا مدار اسی اختیار پر رکھا ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ ارادۂ ازلی کے ساتھ ایسا ارادہ بھی ثابت ہو گیا جس کا تعلق نیا قائم ہوتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ قصد وارادہ سے منعم ومجازی ہیں اور ان احسان کے جواب میں عبادت واجب ہے، جس کی ادائیگی یا کوتاہی پر دنیا وآخرت میں مجازات لازمی ہے۔ اور یہ بات بھی ثابت ہوئی کہ مدبر عالم نے تدبیر عالم کے لئے ایک شریعت واجب کی ہے تاکہ لوگ اس پر چلیں اور اس سے فائدہ اٹھائیں۔ اور تکلیف بالشریعہ کی مثال ایسی سمجھنی چاہئے، جیسے ایک آقا نے اپنے غلاموں کو کسی خدمت پر مامور کیا۔ جو شخص خدمت بجا لائے، آقا ان سے خوش ہوا اور جنھوں نے نافرمانی کی آقا ان سے ناراض ہوا۔ یہی تعبیر نصوص شرعیہ میں اختیار کی گئی ہے، کیونکہ اس سے واضح تعبیر نہیں ہو سکتی، اگرچہ یہ تعبیر مشکل نہیں ہے کیونکہ اللہ کا بندوں کو مکلف بنانے میں کوئی فائدہ نہیں، مگر شریعت میں ایسی مجازی تعبیرات بھی اختیار کی جاتی ہیں جو لوگوں میں متعارف ہوں۔ اسی وجہ سے قضاء وقدر میں سب کچھ طے ہونے کے باوجود اور ہر چیز سے ارادۂ ازلی متعلق ہو جانے کے بعد بھی نصوص میں دونوں باتیں آئی ہیں کہ اللہ تعالیٰ جو چاہتے ہیں وہ فیصلہ کرتے ہیں اور بندے باختیار خود اچھے برے کام کرتے ہیں جس کی وجہ سے جزا وسزا پاتے ہیں۔

ولعلك تقول: هذا جهل بوجوب الشيء بحسب المصلحة الفوقانية، فكيف يكون في موطن من مواطن الحق؟

فأقول: حاش لله، بل هو علم وإيفاء لحق هذا الموطن، إنما الجهل أن يقال: "ليس بواجب أصلا" وقد نفت الشرائع الإلهية هذا الجهل، حيث أثبت الإيمان بالقدر، وأن ما أصابك لم يكن ليخطئك، وما أخطأك لم يكن ليصيبك؛ وأما إذا قيل: "يصح فعله وتركه بحسب هذا الموطن" فهو علم حق لامحالة، كما أنك إذا رأيت الفحل من البهائم يفعل الأفعال الفحلية، ورأيت الأنثى تفعل الأفعال الأنثوية، فإن حكمت بأن هذه الأفعال صادرة جبرا، كحركة الحجر في تدحرجه، كذبت، وإن حكمت بأنها صادرة من غير علة موجبة لها، فلا المزاج الفحلي يوجب هذا الباب، ولا المزاج الأنثوي يوجب ذلك، كذبت، وإن حكمت بأن الإرادة المنبجسة في أنفسهما تحكي وجوبا فوقانيا، وتعتمد عليه، وأنها لاتفور فورانا استقلاليا، كأن ليس وراء ذلك مرمى، فقد كذبت

بل الحق اليقين أمر بين الأمرين؛ وهو: أن الاختيار معلول لايتخلف عن علته، والفعل المراد توجبه العلل، ولايمكن أن لايكون، ولكن هذا الاختيار من شأنه: أن يبتهج بالنظر إلى نفسه، ولاينظر إلى ما فوق ذلك؛ فإن أديت حق هذا الموطن، وقلت: "أجد في نفسي أن الفعل والترك كانا مستويين، وأني اخترت الفعل، فكان الاختيار علة لفعله" صدقت وبررت. فأخبرت الشرائع الإلهية عن هذه الإرادة المنبجسة في هذا الموطن.

وبالجملة: فقد ثبتت إرادة يتجدد تعلقها، وثبتت المجازاة في الدنيا والآخرة، وثبت أن مدبر العالم دبر العالم بإيجاب شريعة يسلكونها، ليجزوا بها، فكان الأمر شبيها بأن السيد استخدم عبيده، وطلب منهم ذلك، ورضي عمن خدم، وسخط على من لم يخدم، فنزلت الشرائع الإلهية بهذه العبارة، لما ذكرنا أن الشرائع تنزل في الصفات وغيرها بعبارة ليس هنالك أفصح ولا أبين للحق منها، أكانت حقيقة لغوية، أو مجازا متعارفا.

ترجمہ: اور شاید آپ کہیں: یہ (یعنی صفت ارادہ کا تعلق حادث) مصلحت فوقانی (قضاء وقدر اور ارادۂ ازلی) کے اعتبار سے شی کے وجوب سے بے خبری ہے، پس وہ بات حق تعالیٰ کے مقامات (صفات) میں سے کسی مقام میں کیسے ہوسکتی ہے؟

تو میں کہتا ہوں: معاذ اللہ! بلکہ وہ بات اس مقام (صفت ارادہ) کے حق کو جاننا اور اس حق کی پوری پوری ادائیگی

ب جہات ۔ یہی ہے کہ کہا جائے: ''وہ چیز قطعاً واجب نہیں'' (یعنی اس کا ہونا قطعاً ضروری نہیں) اور شرائع سماویہ نے اس جملہ کو ذکر کیا ہے، چنانچہ شرائع الٰہیہ نے ایمان بالقدر کو ثابت کیا ہے اور یہ کہ: ''جو چیز تجھ کو پہنچی، وہ تجھے چوکنے والی نہیں تھی، اور جو چیز تجھے چوک گئی وہ تجھے پہنچنے والی نہیں ہو سکتی تھی'' اور رہا جبکہ کہا جائے کہ: ''اس مقام (یعنی تعلق حادث) کے اعتبار سے اس کا کرنا اور نہ کرنا درست ہے'' تو وہ قطعاً برحق علم ہے۔ جس طرح سے یہ بات ہے کہ جب آپ کسی تر چوپایے کو زینے پر حرکت کرتے دیکھیں اور کسی مادہ کو مادینہ حرکت کرتے دیکھیں۔ پس اگر آپ یہ فیصلہ کریں کہ یہ حرکات ان سے اضطراراً صادر ہو رہی ہیں، جیسے پتھر کا اس کے لڑھکنے کی حالت میں حرکت کرنا تو آپ نے غلط فیصلہ کیا۔ اور اگر آپ فیصلہ کریں کہ وہ حرکات کسی ایسی علت کے بغیر صادر ہو رہی ہیں جو ان کو واجب کرنے والی ہے، پس نہ تو نرینہ مزاج اس سلسلہ کو واجب کرتا ہے اور نہ مادینہ مزاج اس کو واجب کرتا ہے، تو بھی آپ نے غلط فیصلہ کیا۔ اور اگر آپ فیصلہ کریں کہ وہ ارادہ جو ان دونوں کے نفوس کے ساتھ درانداز ہونے والا ہے وہ بالائی وجوب کی نقل کرتا ہے اور اس پر اعتماد کرتا ہے اور یہ کہ صورت حال یہ ہے کہ ان دونوں میں کوئی مستقل جوش و ہیجان نہیں ہے، گویا ان حرکات کے پیچھے ان کا کوئی مقصد نہیں ہے تو بھی آپ نے غلط فیصلہ کیا۔

بلکہ حق اور صحیح امر دونوں باتوں کے درمیان ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ اختیار ایسا معلول ہے جو اپنی علتوں سے پیچھے نہیں رہ سکتا اور جو کام کرنا مقصود ہے اس کو علتیں واجب کرتی ہیں۔ اور ممکن نہیں ہے کہ وہ نہ ہو لیکن یہ اختیار اس کے حال میں سے یہ بات ہے کہ وہ مسرور ہو اس کی ذات کی طرف نظر کرتے ہوئے، اور اس کے اوپر کی جانب نہ دیکھتے ہوئے، پس اگر آپ اس مقام (یعنی اختیار) کا حق ادا کریں اور کہیں کہ: ''میں اپنی ذات کے اندر پاتا ہوں کہ کرنا اور نہ کرنا دونوں مساوی ہیں، اور یہ کہ میں نے کرنے کو اختیار کیا ہے تو اختیار اس کے کرنے کی علت ہو گیا'' تو آپ نے سچ کہا اور نیکی کا کام کیا۔ پس شرائع سماویہ نے اسی ارادہ کے بارے میں اطلاع دی ہے جو اس مقام میں درانداز ہونے والا ہے (یعنی جو فساد اور صلاحیتوں سے پیدا ہوتا ہے)

اور حاصل کلام: یہ ہے کہ ایسا ارادہ یقیناً ثابت ہو گیا جس کا تعلق نیا قائم ہوتا ہے اور دنیا و آخرت میں مجازات ثابت ہو گئی۔ اور یہ بات ثابت ہوئی کہ مدبر عالم نے عالم کی تدبیر فرمائی ہے ایسی شریعت واجب کر کے جس پر لوگ چلیں تاکہ وہ اس سے فائدہ حاصل کریں۔ پس معاملہ اس سے ملتا جلتا ہے کہ آقا نے اپنے غلاموں کو کسی خدمت پر مأمور کیا اور ان سے وہ خدمت طلب کی۔ اور ان سے خوش ہوا جنھوں نے خدمت کی، اور ان سے ناراض ہوا جنھوں نے خدمت نہ کی۔ پس ادیان سماویہ اس عنوان سے نازل ہوئے اس وجہ سے جو ہم نے (باب الایمان بصفات اللہ میں) ذکر کی ہے کہ شریعتیں صفات وغیرہ کے سلسلہ میں نازل ہوتی ہیں ایسی تعبیر سے جس سے فصیح تر تعبیر نہ ہو اور واضح تر تعبیر نہ ہو حق بات کو بیان کرنے کے لئے، خواہ وہ تعبیر حقیقت لغویہ ہو یا مجاز متعارف ہو۔

لغت و تشریح:

الترامی: تیر پھینکنے کی جگہ، مجازی معنی ہیں مقصد کہا جاتا ہے **کلام بعید الترامی**: دور رس کلام ... **أكانت حلیفة بلغ** میں ہمزہ تسویہ کے لئے ہے، جیسے **لا أبالي أقمت أم قعدت**: مجھے تیرے کھڑے ہونے یا بیٹھنے کی کوئی پروا نہیں یعنی دونوں میرے نزدیک برابر ہیں ... **حقیقت لغویہ**: لفظ کے حقیقی لغوی معنی مراد ہونا۔ **مجاز متعارف**: لفظ کے وہ مجازی معنی مراد لینے جو عرف میں رائج ہیں، جیسے **لا آكل من هذه الشجرة** میں درخت کے پتے، چھلکے وغیرہ مراد لینا حقیقت لغویہ ہے اور اس کے پھل مراد لینا یا اس کی قیمت مراد لینا مجاز متعارف ہے ... پس عبارت کا مطلب یہ ہے کہ صفات الٰہیہ کے بیان میں (اور ارادہ بھی ایک صفت ہے) واضح اور عام فہم تعبیرات اختیار کی جاتی ہیں۔ اور کبھی ان کے حقیقی معنی مراد ہوتے ہیں، اور کبھی مجازی۔ پس جو لوگ صفات کے باب میں اصرار کرتے ہیں کہ ہر جگہ ان کے حقیقی لغوی معنی ہی مراد لئے جائیں، وہ مسئلہ میں غلو کرتے ہیں۔

”حق اللہ“ کی تفہیم کا طریقہ

عبادت اللہ تعالیٰ کا بندوں پر ایک حق ہے چونکہ یہ ایک خالص علم ہے جلدی سے سمجھ میں آنے والی بات نہیں ہے۔ اس لئے شرائع الٰہیہ میں یہ حقیقت ایسی تین باتوں کے ذریعہ ذہن نشین کرائی گئی ہے جو لوگوں کے نزدیک مسلّم اور بدیہی ہیں:

① لوگوں کو یہ سمجھایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ بندوں پر انعام و احسان فرمانے والے ہیں۔ اور منعم و محسن کا شکر بجالانا ضروری ہے اور عبادت نعمتوں کے شکریہ کی ایک صورت ہے۔

② لوگوں کو بتایا گیا ہے کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ سے روگردانی کرتے ہیں اور ان کی عبادت نہیں کرتے، ان کو اللہ تعالیٰ دنیا میں سخت سزا دیتے ہیں۔ عاد و ثمود اور فرعونیوں کا حال سب کو معلوم ہے۔

③ لوگوں کو اس سے بھی واقف کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اطاعت شعاروں کو آخرت میں بہترین صلہ عطا فرمائیں گے اور نافرمانوں کو سزا دیں گے اور ان کو جہنم رسید کریں گے۔

تفہیم کے ان تین طریقوں سے تین علوم وجود میں آئے ہیں:

① تذکیر بآلاء اللہ یعنی اللہ کی نعمتوں کا تذکرہ کر کے لوگوں کو نصیحت کرنا۔

② تذکیر بایام اللہ یعنی گذشتہ نافرمان اقوام کی ہلاکت کے واقعات ذکر کر کے لوگوں کو فہمائش کرنا۔

③ تذکیر بالمعاد یعنی موت و مابعد الموت کے احوال جیسے قبر و حشر اور اس کے بعد کے احوال ذکر کر کے

زیادہ اہتمام کیا گیا ہے۔ اور مطالب پھیر پھیر کر بیان کیے گئے ہیں۔ پس جو شخص ارادۂ خداوندی کا منکر ہے، یا ثبوت حق کا انکار کرتا ہے یا مجازات کا قائل نہیں ہے وہ بد دین ہے، اپنی فطرت سلیمہ کو ضائع کرنے والا ہے۔ وہ فطری میلان کے نائب وخلیفہ کو یعنی اس عقیدہ کو جو اس میلان کی جگہ رکھا گیا ہے خراب کر کے اپنے ہی پیروں پر کلہاڑی مارتا ہے۔

> وإنما عظُمت العناية بشرح هذه العلوم: لأن الإنسان خُلق في أصل فطرته ميلٌ إلى بارئه جَلَّ مجدُه، وذلك الميل أمر دقيق، لايتشبَّح إلا بخليفته ومَظِنَّته؛ وخليفته ومظنته على ما أثبته الوجدانُ الصحيح: الإيمان بأن العبادة حقُّ الله تعالى على عباده، لأنه منعم لهم، مجازٍ على أعمالهم.
>
> فمن أنكر الإرادةَ، أو ثبوت حقه على العباد، أو أنكر المجازاة فهو الدَّهري الفاقد لسلامة فطرته، لأنه أفسد على نفسه مَظِنَّةَ الميل الفطري، المُوْدَع في جبلته، ونائبه وخليفته والمأخوذ مكانه.

ترجمہ: اور (قرآن کریم اور سابقہ شریعتوں میں) ان علوم (ثلاثہ) کی تشریح کا بہت زیادہ اہتمام اس لئے کیا گیا ہے کہ انسان کی اصل فطرت میں اپنے خالق جل مجدہ کی طرف میلان پیدا کیا گیا ہے۔ اور یہ میلان ایک دقیق (مخفی) امر ہے۔ وہ محسوس شکل اختیار نہیں کرتا مگر اس کے خلیفہ اور مظنہ کے ذریعہ۔ اور اس کا خلیفہ (نائب) اور اس کا مظنہ (یعنی کسی چیز کے حاصل ہونے کی احتمالی جگہ) اس طور پر جس کو وجدان صحیح نے ثابت کیا ہے: "اس بات پر ایمان لانا ہے کہ عبادت اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں پر حق ہے، اس لئے کہ وہ (باالارادہ) ان پر انعام کرنے والے ہیں (اور) ان کو ان کے اعمال کا بدلہ دینے والے ہیں"

پس جو شخص ارادۂ خداوندی کا انکار کرتا ہے، یا بندوں پر اللہ کے حق کے ثبوت کا انکار کرتا ہے یا مجازات کا انکار کرتا ہے تو وہ شخص ایسا دہریہ (بد دین) ہے جو اپنی فطرت سلیمہ کو کھونے والا ہے۔ اس لئے کہ اس نے اپنا نقصان کیا ہے، اس فطری میلان کے مظنہ کو بگاڑ کر جو اس کی فطرت میں ودیعت کیا گیا ہے اور اس میلان کے نائب وخلیفہ کو اور اس کی جگہ میں لی ہوئی چیز کو بگاڑ کر۔

☆ ☆ ☆

فطری میلان ایک نورانی لطیفہ ہے

اگر آپ اس فطری میلان کی حقیقت سمجھنا چاہیں تو جان لیں کہ وہ ایک نورانی لطیفہ ہے، جو فطری طور پر اللہ تعالیٰ کی طرف مائل ہوتا ہے، جس طرح لوہا مقناطیس کی طرف مائل ہوتا ہے۔ لطف (ک) لطفا ولطافۃ کے معنی ہیں باریک ہونا، چھوٹا ہونا صفت مذکر لطیف اور صفت مؤنث لطیفۃ ہے یعنی میلان ایک باریک نورانی حقیقت ہے، جیسے مجازی محبت میں

دل کا میلان محبوب کی طرف رہتا ہے۔ یہ میلان ایک وجدانی قلبی کیفیت ہے، اس کا ادراک دیگر وجدانیات بھوک پیاس کی طرح وجدان ہی سے ہو سکتا ہے۔ اس پر دلائل و براہین قائم نہیں کئے جا سکتے۔ جو شخص بدن، نفس، جسد اور نسمہ کی چھان بین کرے، اور ہر لطیفہ کو الگ الگ پہچان لے (ان لطائف کی تشریح شاہ صاحب رحمہ اللہ کی کتاب الطاف القدس فی لطائف النفس (فارسی) میں اور التفہیمات ۲:۲۴۹ میں ہے) تو وہ ضرور اس نورانی لطیفہ (میلان قلبی) کا ادراک کرے گا اور اللہ تعالیٰ کی طرف اس لطیفہ کے میلان کو بھی سمجھے گا۔ صوفیا کی اصطلاح میں اس میلان کو محبت ذاتی کہتے ہیں۔ یعنی وہ محبت جو فطری ہے، کسی عارض کی وجہ سے نہیں ہے۔ اور یہ لطیفہ بھی دیگر وجدانیات کی طرح دلائل سے ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ جیسے بھوکے کی بھوک اور پیاسے کی پیاس کو دلیل سے نہیں سمجھایا جا سکتا، اسی طرح اس میلان کو بھی صرف ادراک کیا جا سکتا ہے، بشرطیکہ وجدان صحیح حاصل ہو، دلائل سے اس کو ثابت کیا جا سکتا ہے اور نہ سمجھایا جا سکتا ہے۔

وإن شئت أن تعلم حقيقة هذا الميل فاعلم: أن في روح الإنسان لطيفةً نورانيةً، تميل بطبعها إلى الله عز وجل ميلَ الحديد إلى المغناطيس، وهذا أمر مدرَك بالوجدان، فكلُّ من أمعن في التفحص عن لطائف نفسه، وعرف كلَّ لطيفة بحيالها، لابد أن يُدرك هذه اللطيفة النورانية، ويُدرك ميلها بطبعها إلى الله تعالى، ويسمى ذلك الميلُ عند أهل الوجدان بالمحبة الذاتية، مثله كمثل سائر الوجدانيات لا يُقتنص بالبراهين، كجوع هذا الجائع، وعطش هذا العطشان

ترجمہ: اور اگر آپ اس میلان کی حقیقت جاننا چاہتے ہیں تو جان لیں کہ روح میں ایک نورانی لطیفہ (باریک چیز) ہے، جو فطری طور پر اللہ تعالیٰ کی طرف مائل ہوتا ہے، جس طرح لوہا مقناطیس کی طرف مائل ہوتا ہے۔ اور یہ چیز وجدان سے جانی جاتی ہے۔ پس ہر وہ شخص جو لطائف نفس کی اچھی طرح تفتیش کرے، اور وہ ہر لطیفہ کو الگ الگ جان لے، ضروری ہے کہ وہ اس نورانی لطیفہ کو پالے، اور اس کے اللہ تعالیٰ کی طرف فطری میلان کو بھی سمجھ لے۔ اور اہل وجدان کے نزدیک یہ میلان محبت ذاتی کہلاتا ہے۔ اور اس کا حال دیگر وجدانیات کے حال جیسا ہے، دلائل سے وہ شکار نہیں کیا جاتا، جیسے مخصوص بھوکے کی بھوک اور مخصوص پیاسے کی پیاس۔

لغات: فحص (ف) الشیء و عنہ: تفتیش کرنا، کھود کرید کرنا ... بحیالها: علحدہ علحدہ کہا جاتا ہے قعد کلٌّ علی حیاله: ہر ایک علحدہ علحدہ بیٹھا۔

☆　☆　☆

فطری میلان کا کبھی احساس نہیں ہوتا

اللہ تعالیٰ کی طرف فطری میلان ہر شخص میں موجود ہوتا ہے۔ ہر شخص کو اپنے خالق جل مجدہ سے محبت ہے۔ سورۃ

فطری میلان ضائع کرنے والوں کے احوال

انسان میں اللہ تعالیٰ نے اپنے خالق جل مجدہٗ کی طرف جو فطری میلان (نورانی لطیفہ) ودیعت فرمایا ہے، اگر انسان اس کو ضائع کر دیتا ہے اور زندگی بھر وہ اللہ تعالیٰ کی طرف مائل نہیں ہوتا تو مرنے کے بعد ایسے لوگ دو قسم کے ہو جاتے ہیں:

ایک: سادہ طریقہ پر میلان کو ضائع کرنے والے یعنی جہل بسیط میں مبتلا لوگ، جن کو جہل کا ادراک ہوتا ہے یہ بے دین مسلمان ہیں۔ جو اللہ تعالیٰ پر ایمان تو رکھتے ہیں، مگر ایمان کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتے۔ نہ نماز پڑھتے ہیں، نہ زکات ادا کرتے ہیں۔ ایسے لوگ موت کے بعد کمال نوری سے محروم رہ جاتے ہیں۔ کمال نوری کی تفصیل مبحث برزخ کے باب اول میں گذر چکی ہے ——— ایسے لوگوں پر ایمان کی برکت سے موت کے بعد کچھ اخروی احوال منکشف ہوتے ہیں، مگر انکشاف تام نہیں ہوتا یعنی وہاں کی کچھ نعمتیں ان کو حاصل ہوتی ہیں، مگر وہ اخروی نعمتوں سے کامل طور پر بہرہ ور نہیں ہوتے۔ اور یہ صورت حال اس لئے پیش آتی ہے کہ ان لوگوں میں انکشاف تام کی استعداد مفقود ہوتی ہے یعنی اعمال نہ کرنے کی وجہ سے ان کی ایمانی صلاحیت بہت ہی کمزور ہوتی ہے، اس وجہ سے اخروی احوال کا ان پر انکشاف تام نہیں ہو پاتا، اور وہ موت کے بعد حیران، پریشان اور ٹھگے ٹھگے رہ جاتے ہیں۔

دوم: وہ لوگ ہیں جنھوں نے نہ صرف یہ کہ فطری میلان کو ضائع کر دیا ہے، بلکہ ان کے قوی علمیہ (دل و دماغ) غلط عقائد سے بھرے پڑے ہیں یا ان کے قوی عملیہ (اعضاء) بدکاریوں میں مبتلا ہیں ——— یہ کفار اور بد دین مسلمان ہیں۔ ان کے اخروی اور دنیوی احوال درج ذیل ہیں:

اُخروی احوال: یہ لوگ بعد از مرگ کھینچا تانی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ ان کا نفس ناطقہ (روح ربانی) چونکہ عالم بالا کی چیز ہے اس لئے وہ تجردات کی طرف کھنچ جاتا ہے۔ اور ان کا نسمہ (روح حیوانی) پستی کی طرف کھنچ جاتا ہے، کیونکہ اس نے فطری میلان کے برخلاف حالت کمارکھی ہے۔ اور اس تجاذب کی وجہ سے ان کے نفوس سے ایک وحشت اٹھتی ہے اور وہ نفوس ہی پر چھا جاتی ہے اور یہ وحشت ناکی ان کے لئے مستقل سوہان روح بنی رہتی ہے۔

علاوہ ازیں کبھی برزخ اور کبھی اس کے بعد کے مواطن میں ان کے سامنے ایسے واقعات رونما ہوں گے جو اس وحشت کے ترجمان اور اس کے پیکر بائے محسوس ہوں گے، جیسے صفراوی مزاج آدمی کو خواب میں آگ اور شعلے نظر آتے ہیں، اسی طرح ان لوگوں کے سامنے سانپ اور بچھو سوار رہیں گے اور وہ ان کو ڈستے رہیں گے۔

اور اس سزا کی بنیاد معرفت نفس کا فقدان ہے یعنی ہر شخص پر لازم ہے کہ وہ اپنے نفس کو اور اس پر لازم ہونے والے حقوق کو پہچانے، ورنہ اس کا انجام وہ ہوگا جو اوپر مذکور ہوا۔ مشہور بزرگ یحییٰ بن معاذ رازی رحمہ اللہ (متوفی ۲۵۸ھ) کا مشہور ارشاد ہے کہ من عرف نفسہ فقد عرف ربہ یعنی جس نے اپنے نفس کو پہچان لیا اس نے اپنے رب کو پہچان لیا۔ کیونکہ معرفت

نفس یا معرفتِ رب کو مستلزم ہے، پس جو شخص اس معرفت (علم) سے کورا ہوتا ہے اس کی یہی سزا ہوتی ہے۔

دنیوی احوال: اور وہ لوگ جب تک بقیدِ حیات رہتے ہیں، ملأ اعلیٰ کا غصہ ان کو گھیرے رہتا ہے۔ ان کا غصہ ملأ سافل کے دلوں میں اور دیگر با اختیار مخلوقات (جن وانس) کے دلوں میں الہام کی شکل اختیار کر لیتا ہے کہ ان کو ستاؤ اور ایذائیں پہنچاؤ —— چنانچہ ایسے لوگ دنیوی زندگی میں بھی تنگی کا جینا جیتے ہیں۔ ہر وقت دنیا کی حرص، ترقی کی فکر میں اور کل کے اندیشہ میں بے آرام رہتے ہیں اور رسوائی اور بدنامی کے اندیشوں میں گھرے رہتے ہیں۔

اور اس سزا کی بنیاد لوگوں کے دلوں میں جو خیالات اور تقاضے پیدا ہوتے ہیں، ان کے اسباب کی معرفت ہے، جس کی تفصیل مبحث اول کے باب دہم میں گذر چکی ہے۔ جو شخص ان اسباب سے واقف نہیں ہوتا اور برے خیالات اور برے تقاضوں کا سد باب نہیں کرتا اس کی سزا یہی ہے جو اوپر مذکور ہوئی۔

حاصلِ کلام یہ ہے کہ تینوں باتیں: جبروت کی جانب میلان، ایسے اعمال کرنا جو سفلی تقاضوں کی مزاحمت سے نجات دیں اور برے اعمال کے ترک پر مشتمل ہوں۔ یہ تینوں باتیں صورتِ نوعیہ کا اور اس کی صلاحیتوں کا مقتضی اور اس کے دو آثار ہیں جن کا خالقِ نوع اور واجب الوجود کی طرف سے مصلحتِ کلیہ کے موافق ہر انسان پر فیضان ہوتا ہے۔ ایسا نہیں سمجھنا چاہئے کہ یہ تینوں باتیں لوگوں نے خود ہی طے کر لی ہیں، اور لوگوں نے خواہ مخواہ اپنے اوپر لازم کر لی ہیں یا ایک ریت چل پڑی ہے جس کے مطابق لوگ عمل پیرا ہیں۔ بلکہ یہ تینوں درحقیقت اس نورانی لطیفہ کے حق کی ادائیگی ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف کھنچتا ہے۔ لوگ عبادت کے ذریعہ اس لطیفہ کے تقاضے کو پورا کرتے ہیں اور اس کی کجی کو سنوارتے ہیں۔ خلاصہ یہ ہے: عبادت وبندگی میلانِ طبعی اور نورانی لطیفہ کا ایک حق ہے جو آدمی ادا کرتا ہے۔

فإذا مات الإنسان وهو غير مُقبِل على الله تعالى:

فإن كان عدمُ إقباله جهلاً بسيطا وفقدًا ساذجا، فهو شقي بحسب الكمال النوعي، وقد يُكشف عليه بعضُ ما هنالك، ولا يتم الانكشاف لفقد استعداده، فبقي حائرًا مبهوتا.

وإن كان ذلك مع قيام هيئةٍ مضادةٍ في قُواه العلمية أو العملية، كان فيه تجاذبٌ: فانجذبت النفسُ الناطقة إلى صُقع الجبروت، والنسمةُ بما كسبت من الهيئة المضادة إلى السفل؛ فكانت فيه وحشةٌ ساطعةٌ من جوهر النفس، منبسطةٌ على جوهرها؛ وربما أوجب ذلك تمثُّل واللعنات في أشباح الموحشة، كما يرى الصفراوي في منامه النيران والشُّعَل —— وهذا أصل توجيهُ حكمةُ معرفةِ النفس.

وكان أيضا فيه تحديقُ غضبٍ من الملأ الأعلى يوجب إلهامات في قلوب الملائكة، وغيرها من ذوات الاختيار: أن تُعذِّبه وتؤلمه؛ —— وهذا أصل توجيهُ معرفةِ أسباب الخطرات

والدواعي الناشئة في نفوس بني آدم.

وبالجملة: فالميلُ إلى صُقع الجبروت، ووجوبُ العمل بما يَفُكُّ وَثاقَه من مزاحمة اللطائف السفلية، والمؤاخذةُ على ترك هذا العمل: بمنزلة أحكامِ الصورة النوعية، وقُواها، وآثارِها الفائضةِ في كل فرد من أفراد النوع، من بارىء الصُّوَر ومُفيض الوجود، وفق المصلحة الكلية، لا باصطلاح البشر، والتزامهم على أنفسهم، وجريانِ رسومهم بذلك فقط.

وكلُّ هذه الأعمال في الحقيقة حظُّ هذه اللطيفة النورانية المنجذبة إلى الله، وتوفيرُ مقتضاها، وإصلاح عوجها.

ترجمہ: پس جب انسان مرجاتا ہے، درانحالیکہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونے والا نہیں ہوتا:

تو اگر اس کی اللہ کی طرف بے توجہی جبلی ہیمیت اور میلانِ وساوس گم کرتا ہے تو وہ کم نصیب رہتا ہے، کمالِ نوعی کے اعتبار سے۔ اور کبھی اس پر بعض وہ چیزیں منکشف کی جاتی ہیں جو وہاں (آخرت میں) ہیں۔ اور انکشاف تام نہیں ہوتا، انکشافِ تام کی استعداد کے مفقود ہونے کی وجہ سے، پس وہ حیران ہکا بکا رہ جاتا ہے۔

اور اگر وہ بات (یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف بے توجہی) ہوتی ہے اس کے قویٰ علمیہ اور عملیہ میں میلان کے برخلاف حالت کے قائم ہونے کے ساتھ، تو اس میں کھینچا تانی ہوتی ہے: پس نفس ناطقہ جبروت کی جانب کھنچ جاتا ہے، اور نسمہ فطری میلان کے برخلاف ہیئت کے ہونے کی وجہ سے نیچے کی طرف کھنچ جاتا ہے۔ پس ہوتی ہے انسان میں وحشت، چڑھنے والی اس کے نفس کی ذات سے، چمٹنے والی نفس کی ذات پر — اور کبھی وہ چیز واجب کرتی ہے ایسے واقعات کے رونما ہونے کو جو وحشت کے پیکر ہائے محسوس ہوتے ہیں، جس طرح صفراوی مزاج آدمی خواب میں آگ اور شعلے دیکھتا ہے — اور یہ (سزائیں) وہ بنیاد ہے جس کو ثابت کرتی ہے نفس کی معرفت کا علم۔

اور نیز ہوتا ہے انسان میں ملأ اعلیٰ کے قصد کا ایسا گھیرا جو الہامات کو واجب کرتا ہے ملائکہ سافلہ کے دلوں میں۔ اور ان کے علاوہ ذی اختیار مخلوقات (یعنی جن وانس) کے دلوں میں کہ وہ اس کو ستائیں اور اس کو تکلیف پہنچائیں — اور یہ (سزائیں) وہ بنیاد ہے جس کو ثابت کرتی ہے انسانوں کے دلوں میں پیدا ہونے والے (برے) خیالات اور (برے) تقاضوں کے اسباب کی معرفت۔

اور خلاصۂ کلام: پس جبروت کی جانب میلان، اور ایسی باتوں پر عمل کا واجب ہونا جو اس کی قید کو کھول دیں سفلی تقاضوں کی مزاحمت سے، اور اس عمل کے ترک کرنے پر مواخذہ کا ہونا (یہ تینوں باتیں) بمنزلہ صورتِ نوعیہ اور اس کی صلاحیتوں کے احکام کے، اور اس کے ان آثار کے ہیں جن کا نوع کے افراد میں سے ہر فرد پر فیضان ہوتا ہے، خالقِ صُوَر اور واہبِ وجود کی طرف سے، مصلحتِ کلیہ کے موافق۔ نہیں ہیں (مذکورہ تینوں باتیں) صرف انسانوں کے اتفاق

خوبصورت بیوی کی طرف رجحان، جاہ ومرتبہ کی طرف رجحان اسی طرح ایک رجحان اللہ تعالیٰ کی طرف بھی ہوتا ہے پس جس طرح "مال ومنال کی خواہش" کہنا نفس کے بعض رجحانات کی تعیین ہے۔ اور "جاہ ومرتبہ کی خواہش" کہنا بعض دوسرے رجحانات کی تعیین ہے اسی طرح عبادت کو اللہ کا حق کہنا بھی دل کے بعض رجحانات کی تعیین ہے۔ کیونکہ عبادت میلان قلبی اور لطیفۂ نورانی کے تقاضے سے وجود میں آتی ہے اور میلان ایک رجحان ہے۔ اور عبادت کو "حق اللہ" کہنا گویا مختصر تعبیر ہے اس لمبی عبارت کی کہ: "عبادت نورانی لطیفہ کا حق ہے اس لطیفہ کے اللہ تعالیٰ کی جانب مائل ہونے کی جہت سے"۔ پس شرائع الٰہیہ میں یہ حقیقت اسی مختصر آسان تعبیر میں ادا کی گئی ہے تا کہ لوگ اپنے خداداد علوم کے ذریعہ اس کو سمجھ سکیں۔ اور سنت الٰہی بھی یہ جاری ہے کہ روحی مضامین کو ان کے مناسب مثالی صورتوں میں نازل کیا جاتا ہے جس طرح معنویات خواب میں ایسی صورتوں میں دکھائی جاتی ہیں جو عادۃً اس معنی کے لئے لازم ہوتی ہیں یا اس کی نظیر ہوتی ہے یا اس سے کوئی تعلق رکھنے والی چیز ہوتی ہیں۔ پس وحی کی زبان میں مجمل تر تعبیر اختیار کرتے ہوئے کہا گیا کہ: "عبادت اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں پر حق ہے"

اسی طرح دیگر حقوق کو بھی سمجھنا چاہئے۔ جیسے قرآن کا حق ایمان داروں پر یہ ہے کہ وہ اس کی تعظیم کریں اور اس کے احکام کی تعمیل کریں۔ رسول اللہ ﷺ کا امت پر یہ حق ہے کہ وہ آپ سے محبت رکھیں اور آپ کی پیروی کریں۔ آقا کا غلاموں پر یہ حق ہے کہ وہ آقا کی خیر خواہی اور تابعداری کریں، والدین کا اولاد پر یہ حق ہے کہ وہ ان کے ساتھ حسن سلوک برتیں اور رشتہ داروں کا حق صلہ رحمی ہے، اسی طرح اولاد کا ماں باپ پر، شوہر کا بیوی پر، بیوی کا شوہر پر، استاذ کا شاگرد پر، شاگرد کا استاذ پر، بادشاہ کا رعایا پر، رعایا کا بادشاہ پر اور مملوکہ جانور کا مالک پر حق ہے۔ یہ سب حقوق درحقیقت آدمی کے اپنی ذات پر اپنے ہی حقوق ہیں۔ جذبۂ بندگی کا حق ہے کہ اس جذبہ کو پورا کیا جائے، قرآن کریم پر ایمان رکھنے کا حق یہ ہے کہ قرآن کی تعظیم اور اس کے احکام کی تعمیل کی جائے ورنہ ایمان کیا ہوا؟ جانور کے مالک ہونے کا حق یہ ہے کہ اس کی اچھی طرح دیکھ بھال کی جائے وقِس علیٰ ھٰذا۔

غرض یہ سب حقوق نفس کے نفس پر ہیں، تا کہ نفس اپنے کمال کی تکمیل کرے، اگر وہ حقوق کی ادائیگی کرتا ہے تو اپنے نفع کے لئے کام کرتا ہے، کسی پر کوئی احسان نہیں کرتا اور اگر وہ حقوق ادا نہیں کرتا تو اپنی ذات پر ظلم وزیادتی کرتا ہے، کسی کا کوئی خاص نقصان نہیں کرتا۔

مگر ان تمام حقوق کی نسبت نفس کی طرف نہیں کی جاتی بلکہ ان کی طرف کی جاتی ہے جن سے معاملہ ہے اور جن کی طرف سے مطالبہ ہے پس کہا جاتا ہے اللہ کا حق، قرآن کا حق، رسول کا حق الخ لہٰذا آپ سرسری باتوں پر نہ رکیں، بلکہ حقائق کو جس طرح کہ وہ نفس الامر میں ہیں ثابت کریں۔ شاہ صاحب رحمہ اللہ کی یہ تحقیق ایک اصولی قاعدہ ہے، اس کی اہمیت سمجھنے کی کوشش کریں۔ ومن لم یذُق لم یدرِ (جو نہ چکھے اسے کیا پتہ چلے!!)

ولما كان هذا المعنى دقيقا، وهذه اللطيفة لا تدركها إلا شرذمة قليلة، وجب أن ينسب الحق إلى ما إليه مالت، وإياه قصدت، ونحوه انتحت، كأن ذلك تعيين لبعض قوى النفس التي مالت من جهته، وكأن ذلك اختصار قولنا "حق هذه اللطيفة من جهة ميلها إلى الله" فنزلت الشرائع الإلهية كاشفة عن هذا السر بعبارة سهلة يفهمها البشر بعلومهم الفطرية، ويعطيها سنة الله من إنزال المعاني الدقيقة في صور مناسبة لها بحسب النشأة المثالية، كما يتفق لواحد منا في منامه معنى مجردا في صورة شيء ملازم له في العادة، أو نظيره وشبيهه فقيل "العبادة حق الله تعالى على عباده"

وعلى هذا ينبغي أن يقاس حق القرآن، وحق الرسول، وحق المولى، وحق الوالدين، وحق الأرحام؛ فكل ذلك حق نفسه على نفسه، لتكمل كمالها، ولا تقترف على نفسها جورا، ولكن نسب الحق إلى من معه هذه المعاملة، ومنه المطالبة، فلا تكن من الواقفين على الظواهر، بل من المحققين للأمر على ما هو عليه

ترجمہ: اور جب کہ یہ مضمون دقیق تھا اور اس لطیفہ کا ادراک بھی معدودے چند لوگ ہی کر سکتے تھے اس لئے ضروری ہوا کہ وہ حق منسوب کیا جائے اس کی طرف جس کی طرف وہ لطیفہ مائل ہوتا ہے۔ اور جس کا اس لطیفہ نے ارادہ کیا ہے اور جس کی طرف کا اس لطیفہ نے قصد کیا ہے، گویا وہ انتساب نفس کے بعض قویٰ (رجحانات) کی تعیین ہے، جس رجحان کی جہت سے وہ نفس مائل ہوتا ہے۔ اور گویا وہ انتساب ہمارے اس قول کا خلاصہ ہے کہ "اس لطیفہ کا حق اس کے اللہ کی طرف جھکنے کی جہت سے" پس الٰہی شریعتیں نازل ہوئیں اس راز کو کھولنے والی ہوئیں ایسی آسان تعبیر سے جس کو سمجھتے ہیں لوگ اپنے فطری علوم سے۔ اور دیتی ہے ان عبادات کو سنت الٰہی یعنی دقیق معانی کو نازل کرنا ان معانی کے مناسب صورتوں میں عالم مثال میں پائے جانے کے اعتبار سے، جس طرح حاصل کرتا ہے ہم میں سے ایک آدمی خواب میں کسی معنوی بات کو ایسی چیز کی شکل میں جو اس معنی کے عادۃً لازم ہے یا اس کی نظیر ہے یا اس سے ملتی جلتی ہے، پس کہا گیا: "عبادت اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں پر حق ہے"

اور اسی طرح مناسب ہے کہ سمجھا جائے قرآن، رسول، مولیٰ، والدین اور رشتہ داروں کے حقوق کو۔ پس یہ سب نفس کی ذات کے اس کی ذات پر حق ہیں۔ تاکہ وہ نفس اپنے کمال کی تکمیل کرے اور اپنی ذات پر کسی ظلم کا ارتکاب نہ کرے مگر وہ حق منسوب کیا گیا ہے اس کی طرف جس کے ساتھ یہ معاملہ ہے اور جس کی طرف سے مطالبہ ہے۔ پس نہ ہو تو سرسری باتوں پر ٹھہرنے والوں میں سے، بلکہ ہو تو معاملہ کو ثابت کرنے والوں میں سے اس پر جس پر وہ (نفس الامر میں) ہے۔

لغات: الشرذمة: لوگوں کی قلیل جماعت، جمع شراذم وشراذیم ◆ انتحی الشیءَ: قصد کیا ◆ حقق

النھی: ثابت کیا واجب کیا یا مؤکد کیا۔

باب ــــــ ۷

شعائر اللہ کی تعظیم کا بیان

گذشتہ باب کے آخر میں قرآن کریم اور نبی کریم ﷺ کے حقوق کا ذکر آیا ہے۔ یہ دونوں شعائر اللہ میں سے ہیں۔ اس لئے اب یہ باب شعائر اللہ کی تعظیم کے بیان میں ہے۔ شعائر اللہ کا ذکر قرآن کریم میں چار جگہ آیا ہے۔ سورۃ البقرۃ آیت ۱۵۸ میں صفا و مروہ نامی پہاڑیوں کو منجملہ شعائر اللہ بتایا گیا ہے۔ سورۃ الحج آیت ۳۶ میں قربانی کے بڑے جانور اونٹ گائے بھینس کو منجملہ شعائر اللہ کہا گیا ہے۔ سورۃ المائدہ آیت ۲ میں مؤمنین کو مخاطب کر کے حکم دیا گیا ہے کہ شعائر اللہ کی بے حرمتی مت کرو۔ اور سورۃ الحج آیت ۳۲ میں ارشاد ہے: ﴿ومن یعظم شعائر اللہ فانھا من تقوی القلوب﴾ (جو شخص شعائر اللہ کی تعظیم کرتا ہے تو اس کا یہ شعائر اللہ کی تعظیم کرنا دل سے اللہ سے ڈرنے کی وجہ سے ہوتا ہے) فانھا کی تقدیری عبارت فان تعظیمھا ہے۔ ضمیر شعائر کی طرف ہے اور ایسا کا مرجع شعائر اللہ ہیں اور آیت کریمہ کا مطلب یہ ہے کہ شعائر اللہ کی تعظیم دل کے تقویٰ کی علامت ہے۔ شعائر اللہ کی تعظیم وہی کرتا ہے جس کے دل میں تقویٰ اور خوف خدا ہوتا ہے۔

شعائر، شَعِیرۃ یا شِعَارۃ کی جمع ہے۔ جس کے لغوی معنی علامت کے ہیں۔ اور اصطلاح میں شعیرہ وہ نشانی ہے جو اس چیز کو بتاتی ہے جس کے لئے وہ مقرر کی گئی ہے جیسے منارہ مسجد کی مخصوص علامت ہے اور شرعی داڑھی مسلمان ہونے کی نشانی (یونیفارم) ہے۔ اسی طرح وہ افعال، اماکن اور احکام جو دین اسلام کی علامتیں اور پہچان ہیں وہ سب شعائر اللہ ہیں۔ سورۃ الحج آیت ۳۰ میں شعائر اللہ کو حُرُمَاتُ اللہ (اللہ کے محترم احکام) بھی کہا گیا ہے۔ یعنی تمام وہ چیزیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لئے نشانِ بندگی ٹھہرایا ہے، اسی طرح اللہ کے تمام محترم احکام شعائر اللہ ہیں۔ شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

> ''وشعائر اللہ در عرف دین، مکانات و ازمنہ و علامات و اوقات عبادت را گویند۔ اما مکانات عبادت: پس مثل کعبہ و عرفہ و مزدلفہ و جمار ثلاثہ و صفا و مروہ و منی و جمیع مساجد اند، و اما ازمنہ: پس مثل رمضان و اشہر حرم و عید الفطر و عید الاضحی و جمعہ و ایام التشریق اند، و اما علامات: پس مثل اذان و اقامت و ختنہ و نماز جماعت و نماز جمعہ و نماز عیدین اند۔ و در ہمہ چیز با معنی علامت بودن متحقق ست، زیرا کہ مکان و زمان عبادت نیز از عبادات بلکہ از معبود یاد می دہد'' (فتح العزیز ۱:۴۰۲ ، در تفسیر سورۃ البقرۃ آیت ۱۵۸)

شعائر اللہ کی اہمیت: اور دین سماوی کا مدار شعائر اللہ کی تعظیم پر اور ان کے ذریعہ اللہ کی نزدیکی حاصل کرنے پر ہے۔ یعنی شعائر اللہ صرف شریعت محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام ہی میں نہیں ہیں، بلکہ سابقہ تمام سماوی ادیان میں شعائر اللہ کا

دیجور رہا ہے اور اس کی وجہ وہ ہے جس کی طرف ہم نے مبحث رابع کے باب سوم میں اشارہ کیا ہے کہ سعادت حاصل کرنے کا جو آسان طریقہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے لئے مقرر کیا ہے وہ یہ ہے کہ بہیمیت سے ملکیت والے وہ اعمال کرائے جائیں جو اس کے بس میں ہیں۔ اس طرح رفتہ رفتہ آدمی ملائکہ سے مشابہ ہو جائے گا جو انسان کی معراج کمال ہے۔ اور شعائر اللہ سے ملائکہ کو ذہنی مناسبت ہے، وہ ان کے گرویدہ ہوتے ہیں پس انسانوں پر بھی ان کی تعظیم وتکریم لازم ہے۔ شاہ صاحب تفہیمات (۱:۲۳۰) تفہیم ۳۶ میں تحریر فرماتے ہیں:

”وعترة کا بانیه دانند که در عالم مثال حقائق شعائر الٰہیہ متمثل شدہ است، و از اں صورتے جمیلے پیدا آں شعائر واصل شدہ، و ملائکہ فوج فوج بآں شعائر احاطہ کردہ اند۔ و مثل شعائر: اشیاء گونہ محسوسہ کہ خدا تعالیٰ را بآں، عبادت تواں کرد، مانند کعبہ کہ طواف آں عبادت حضرتِ حق است، و مانند قرآن کہ تلاوت آں مقرب است بحضرت او، و مانند لفظ اللہ و رحمٰن و سائر اسمائے الٰہیہ کہ ذکر تنہا مقرب است، و مانند صدقہ و صوم و غیر آں۔ و ہر چہ از شعائر اللہ شود بر بنی آدم تعظیم او واجب است، و از حقیقت قرآن بر ایں ضعیف تا علیہا کی رود، و طلاوت و طراوت آں مدرک می گردد“

شعائر اللہ کیا ہیں؟: شعائر اللہ سے مراد وہ ظاہری اور محسوس چیزیں ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اس لئے مقرر کیا ہے کہ لوگ ان کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں، اور دین سے ان چیزوں کا ایسا گہرا تعلق ہو جاتا ہے کہ لوگ ان کی تعظیم کو اللہ تعالیٰ کی تعظیم سمجھتے ہیں اور ان کے حق میں کوتاہی کو اللہ کے معاملہ میں کوتاہی تصور کرتے ہیں۔ مثلاً بے عمل مسلمان بھی قرآن پاک کو چومتے ہیں، سر پہ رکھتے ہیں اور کبھی ہاتھ سے گر جائے تو نہایت پریشان ہوتے ہیں اور اس کا کفارہ دریافت کرتے ہیں۔ کیونکہ شعائر اللہ کی تعظیم لوگوں کے دلوں میں ایسی رچ بس گئی ہے کہ وہ نکل ہی نہیں سکتی الا یہ کہ ان کے دل ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں۔

﴿باب تعظیم شعائر اللہ تعالیٰ﴾

قال اللہ تعالیٰ: ﴿وَمَنْ يُعَظِّمْ شَعَائِرَ اللهِ فَإِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوبِ﴾ اعلم: أن مبنى الشرائع على تعظيم شعائر الله تعالى، والتقرب بها إليه تعالى، وذلك لما أومأنا إليه: من أن الطريقة التي نصبها الله تعالى للناس هي محاكاة ما في صُقع التجرد بأشياء يقرُب تناولُها للبهيمية.

وأعني بالشعائر: أمورًا ظاهرةً محسوسةً، جُعلت ليُعْبَد الله بها، واختُصّت به، حتى صار تعظيمُها عندهم تعظيمًا لله، والتفريطُ في جنبها تفريطًا في جنب الله، وركز ذلك في صميم قلوبهم، لا يخرج منه إلا أن تقطّع قلوبُهم.

ترجمہ: شعائر اللہ کی تعظیم کا بیان: اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا "اور جو شخص دینی یادگاروں کا پورا لحاظ رکھے گا تو اس کا یہ لحاظ رکھنا دلوں کے اللہ سے ڈرنے سے ہوتا ہے" جان لیں کہ شریعتوں کا مدار شعائر اللہ کی تعظیم پر اور ان کے ذریعہ اللہ کا تقرب حاصل کرنے پر ہے۔ اور یہ بات اس وجہ سے ہے جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے کہ وہ طریقہ جو اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے لئے مقرر کیا ہے وہ اس چیز کی مشابہت پیدا کرتا ہے جو تجرد کی جانب میں ہے (یعنی ملائکہ کے احوال اپنے اندر پیدا کرتا ہے) ایسی چیزوں کے ذریعہ جن کو لینا (یعنی اختیار کرنا) بہیمیت کے لئے آسان ہے (یعنی جو عملی افعال بہیمیت کے بس میں ہوں، وہ اس سے کرائے جاتے ہیں، پس ان سے آدمی میں ملکی احوال پیدا ہوں گے)

اور شعائر سے میری مراد وہ ظاہری، محسوس امور ہیں جو اس لئے مقرر کئے گئے ہیں تاکہ ان کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی بندگی کی جائے۔ اور وہ چیزیں اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس طرح مخصوص ہوگئی ہیں کہ ان کی تعظیم لوگوں کے نزدیک اللہ تعالیٰ کی تعظیم ہوگئی ہے اور ان کے معاملہ میں کوتاہی اللہ کے معاملہ میں کوتاہی ہوگئی ہے۔ اور وہ بات لوگوں کے دلوں کی جڑ میں گاڑ دی گئی ہے نہیں نکل سکتی وہ ان سے مگر یہ کہ ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں ان کے دل۔

لغات: حاکی محاکاۃ: مشابہ ہونا۔ تناول الشیئ: لینا۔ اختص بالشیئ: خاص ہونا۔ صُقع: جانب۔

☆ ☆ ☆

شعائر اللہ کیسے تشکیل پاتے ہیں؟

شعائر اللہ قدرتی طور پر فطری انداز سے تشکیل پاتے ہیں۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ لوگوں کے دل کسی بات پر مطمئن ہو جاتے ہیں اور وہ بات مشہور اور شائع ذائع ہو جاتی ہے اور جب یہ بات اولیات میں شامل ہو جاتی ہے اور اس میں لوگوں کو ادنی درجہ کا شک باقی نہیں رہتا۔ اس وقت رحمت خداوندی ایسی چیزوں کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے جن کو لوگوں کے دل اور ان کے علوم چاہتے ہیں۔ شائع ذائع ہیں ان چیزوں کو، جب وہ لازم جانتے ہیں۔ پس لوگ ان کو قبول کر لیتے ہیں۔ اور ان چیزوں کی حقیقت واشگاف کر دی جاتی ہے جس سے لوگ ان کی اہمیت سمجھ جاتے ہیں اور ان چیزوں کی تعظیم وتکریم کی دعوت جو روائے عالم میں مجمل طور پر پھیل جاتی ہے۔ جب یہ صورت حال ہو جاتی ہے تو ان چیزوں کی تعظیم لوگوں پر لازم کر دی جاتی ہے اور اس میں کوتاہی پر مواخذہ کیا جاتا ہے۔ جیسے اللہ کے نام کی قسم کھانے والا دل میں یہ اعتقاد رکھتا ہے کہ اگر وہ قسم توڑے گا تو اللہ کے معاملہ میں کوتاہی ہوگی۔ چنانچہ حسب اعتقاد اس کا مواخذہ کیا جاتا ہے اور قسم توڑنے پر کفارہ واجب ہوتا ہے۔ یہی صورت حال شعائر اللہ کے معاملہ میں لوگوں کی ہے۔ جب کچھ چیزیں ان کے درمیان مشہور ہو جاتی ہیں اور ان کے عموم ان چیزوں کی تابعداری کرتے ہیں یعنی ان چیزوں کی عظمت شان تسلیم کر لیتے ہیں تو ان کے علوم کا یہ اقتضا وہ چیزیں واجب کرتا ہے:

(۱) اب رحمت خداوندی ان لوگوں پر انہی چیزوں کے ذریعہ ظاہر ہوتی ہے، کیونکہ نظام عالم کا مدار "آسان سے آسان تر" پر ہے اور جب لوگوں نے ان چیزوں کی اہمیت مان لی تو اب ان کے لئے ان امور کی تعظیم بجالانا آسان ہوجاتا ہے۔ اسی لئے ان چیزوں کو شعائر اللہ قرار دیا جاتا ہے تاکہ لوگ ان کے ذریعہ تقرب حاصل کریں۔

(۲) لوگوں کو مکلف کیا جاتا ہے کہ وہ ان چیزوں کی زیادہ سے زیادہ تعظیم وتکریم کریں، اسی سے ان کو کمال مطلوب حاصل ہوگا شعائر اللہ کی تعظیم کرنا کہ بھول سے بھی اس میں خلل نہ پڑے کامیابی کا راستہ ہے۔

مثال سے وضاحت: اماکن حج: کعبہ شریف، صفا مروہ، منی، عرفات، مزدلفہ اور جمار ثلاثہ کا احترام لوگوں کے دلوں میں عرصہ سے بیٹھا ہوا تھا۔ عربوں کے قلوب ان مقامات کی عظمت پر مطمئن تھے اسی لئے اسلام میں ان مقامات کو شعائر اللہ قرار دیا گیا اور جب بعض عرب قبائل کو صفا مروہ کے درمیان سعی میں، اساف ونائلہ نامی بتوں کی وجہ سے، حرج محسوس ہوا تو ان کو بتایا گیا کہ صفا مروہ تو شعائر اللہ ہیں۔ عرصہ دراز سے عرب ان کی تعظیم وتکریم کرتے آئے ہیں اور کفار کا ان پہاڑیوں پر اساف ونائلہ کو رکھنا ایک عارضی گندگی تھی۔ جس کو صاف کردیا گیا ہے پس جس طرح کعبہ شریف میں ۳۶۰ بتوں کی تنصیب ایک عارضی امر تھا، جس کو وہاں سے دور کردیا گیا اس لئے اب کعبہ شریف کا طواف کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ اسی طرح صفا مروہ کی سعی میں بھی کوئی حرج نہیں۔

اسی طرح اسلام میں کچھ نئی چیزوں کو، جیسے قرآن، نبی، نماز، مساجد، جماعت اور اذان وغیرہ کو بھی شعائر اللہ قرار دیا گیا ہے۔ کیونکہ ایمان کے تقاضے سے مسلمانوں کے نفوس اور ان کے دل بھی ان چیزوں کے شعائر ہونے کو واجب ولازم جانیں گے، اسی لئے ان چیزوں کو بھی شعائر قرار دیا گیا اور ان کی تعظیم واجب کی گئی اور ان کو تقرب الٰہی کا ذریعہ بنایا گیا۔ (وضاحت پوری ہوئی)

غرض شعائر اللہ کو اللہ تعالیٰ نے کچھ اپنے ذاتی فائدے کے لئے شعائر نہیں قرار دیا۔ اللہ تعالیٰ کی ذات اغراض سے برتر وبالا ہے ان کے کارنامے مُعَلَّل بالاغراض نہیں ہوتے یعنی وہ کوئی کام ذاتی غرض وفائدہ کے لئے نہیں کرتے۔ وہ بندوں پر جو احکام واجب کرتے ہیں وہ بندوں کے فائدے کے لئے ہوتے ہیں۔ شعائر اللہ کی صورت حال بھی یہی ہے۔ لوگ اپنا کمال مطلوب شعائر اللہ کی نہایت درجہ تعظیم کئے بغیر حاصل نہیں کرسکتے اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان کے مسلمات کو جن پر ان کے قلوب مطمئن تھے شعائر اللہ گردانا اور حکم دیا کہ وہ اللہ کے معاملہ میں یعنی اللہ کے احکام کی تعمیل میں کوتاہی نہ کریں۔

تشریع میں جمہور کا حال ملحوظ رکھا جاتا ہے: آخر میں اس کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی عنایت ومہربانی سے جو شریعت نازل فرمائی ہے اس میں کسی ایک شخص کا حال پیش نظر نہیں رکھا ہے بلکہ جمہور پر نظر رکھی گئی ہے، گویا جمہور ہی سب کچھ ہیں۔ چنانچہ شعائر اللہ پر لوگوں کے قلوب کے مطمئن ہونے کے معاملہ میں بھی جمہور کا اعتبار کیا گیا

ہے۔ اگر جمہور مطمئن ہیں تو گویا سب لوگ مطمئن ہیں۔ بعض لوگوں کے قلوب مطمئن نہ ہوں تو ان کا اعتبار نہیں ——— غور کرو، اللہ کی دلیل کتنی مضبوط ہے؟ یعنی شعائر اللہ کی تعظیم کیوں لازم کی گئی؟ اس کی کتنی معقول وجہ ہے؟!

والشعائر إنما تصير شعائر بنهج طبيعي، وذلك: أن تطمئن نفوسهم بعادة وعملة، وتصير من المشهورات الذائعة التي تلتحق بالبديهيات الأولية، ولا تقبل التشكيك، فعند ذلك تظهر رحمة الله في صورة أشياء، تستوجبها نفوسهم وعلومهم الذائعة فيما بينهم، فيقبلونها، وينكشف الغطاء عن حقيقتها وتبلغ الدعوة الأداني والأقاصي على السواء، فعند ذلك يكتب عليهم تعظيمها، ويكون الأمر بمنزلة الحالف باسم الله، يضمر في نفسه التفريط في حق الله إن حنث، فيؤاخذ بما يضمر، وكذلك هؤلاء يشتهر فيما بينهم أمور، تنقاد لها علومهم فيوجب انقياد علومهم لها: أن لا تظهر رحمة الله بهم إلا فيما انقادوا له، إذ هي التدبير على الأسهل فالأسهل؛ ويوجب أيضا: أن يؤاخذوا أنفسهم بأقصى ما عندهم من التعظيم لأن كمالهم هو التعظيم الذي لا يشوبه إهمال.

وما أوجب الله تعالى شيئا على عباده لفائدة ترجع إليه، تعالى عن ذلك علوا كبيرا، بل الفائدة ترجع إليهم، وكانوا بحيث لا يكملون إلا بالتعظيم الأقصى فأخذوا بما عندهم، وأمروا أن لا يفرطوا في جنب الله، وليس المقصود بالذات في العناية التشريعية حال فرد، بل حال جماعة كأنها كل الناس. ولله الحجة البالغة.

ترجمہ: اور شعائر فطری انداز پر ہی شعائر بنتے ہیں۔ اور اس کی تفصیل یہ ہے کہ لوگوں کے دل کسی عادت وخصلت پر مطمئن ہو جائیں اور وہ ایسی مشہور وشائع ذائع چیزوں میں سے ہو جائے جو بدیہیات اولیہ کے ساتھ مل جاتی ہیں اور وہ تشکیک کو قبول نہ کرے، تو اس وقت رحمت خداوندی ایسی چیزوں کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے جن کو لوگوں کے نفوس اور ان کے وہ علوم جو ان کے درمیان شائع ہیں، واجب ولازم جانتے ہیں، پس وہ ان چیزوں کو قبول کر لیتے ہیں۔ اور ان اشیاء کی حقیقت سے پردہ کھول دیا جاتا ہے اور پیغام پہنچ جاتا ہے نزدیک اور دور کے لوگوں تک یکساں طور پر، پس اس وقت لوگوں پر ان چیزوں کی تعظیم وتکریم لازم کر دی جاتی ہے۔ اور ہو جاتا ہے معاملہ اللہ کے نام کی قسم کھانے والے جیسا۔ قسم کھانے والا اپنے دل میں پوشیدہ رکھتا ہے کہ "اگر وہ اس قسم کو توڑے گا تو وہ اللہ کے معاملہ میں کوتاہی ہوگی" پس اس سے اس بات کا مؤاخذہ کیا جاتا ہے جو وہ دل میں پوشیدہ رکھتا ہے۔ اور اسی طرح یہ لوگ ہیں۔ ان کے درمیان کچھ چیزیں مشہور ہو جاتی ہیں۔ جن کے لئے ان کے علوم تابعداری کرتے ہیں۔ پس ان کے علوم کا ان امور کی تابعداری کرنا واجب کرتا ہے کہ نہ

ظاہر ہو اور رحمت خداوندی ان پر مگر اس چیز میں جس کے لئے وہ تابعدار ہوئے ہیں۔ کیونکہ تدبیر الٰہی کا مدار "آسمان سے آسمان تر" پر ہے۔ اور یہ چیز وہ اختیار واجب کرتا ہے کہ پکڑیں وہ اپنی ذوات کو اس انتہائی درجہ تعظیم کے ساتھ جو ان کے پاس ہے۔ اس لئے کہ ان کا کمال وہ تعظیم ہی ہے جس کے ساتھ اہمال (جان بوجھ کر یا بھول کر چھوڑ دینا) مل جاتا ہو۔

اور اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر کوئی بھی چیز واجب نہیں کی کسی ایسے فائدہ کے لئے جو اللہ کی طرف لوٹتا ہو۔ اللہ تعالیٰ اس سے بہت ہی برتر وبالا ہیں۔ بلکہ فائدہ لوٹتا ہے ان لوگوں کی طرف۔ اور لوگوں کی صورت حال یہ ہے کہ ان کی تکمیل انتہائی تعظیم کے بغیر ہو ہی نہیں سکتی۔ پس وہ پکڑے گئے اس بات کے ساتھ جو ان کے پاس ہے اور حکم دیئے گئے وہ کہ کوتاہی کریں اللہ تعالیٰ کے معاملہ میں۔ اور عنایت تشریعیہ میں مقصود بالذات کسی ایک فرد کی حالت نہیں ہوتی، بلکہ ایک جماعت کی حالت مقصود ہوتی ہے، گویا وہ جماعت سب لوگ ہیں۔ اور اللہ ہی کے لئے کامل برہان ہے!

لغات:

اداني جمع ہے الأدنى کی، جو دني کا اسم تفضیل ہے بمعنی قریبی لوگ..... الأقاصي جمع ہے الأقصى کی، جو قصي کا اسم تفضیل ہے بمعنی زیادہ دور..... تشكيك: شک وشبہ میں ڈالنا..... إهمال: جان بوجھ کر یا بھولے سے چھوڑ دینا۔

تصحیح: بل الفائدة اصل میں بل لفائدة تھا، تصحیح مخطوط کراچی سے کی گئی ہے۔

تشریح:

بدیہی: وہ چیز ہے جس کا جاننا نظر وفکر پر موقوف نہ ہو، جیسے گرمی کا تصور بدیہی ہے اور آگ گرم ہے یہ تصدیق بدیہی ہے، پھر تصدیق بدیہی میں اگر طرفین اور نسبت کا تصور حکم کے یقین کے لئے کافی ہو تو وہ بدیہی اولی ہے، جیسے کل جزء سے بڑا ہوتا ہے یہ تصدیق بدیہی اولی ہے کیونکہ جو کل اور جزء کی حقیقت سمجھتا ہے وہ فوراً مذکورہ قضیہ کی تصدیق کرے گا۔ بدیہیات اولیہ کو صرف اولیات بھی کہتے ہیں۔ اس کے علاوہ بدیہی کی پانچ قسمیں اور ہیں یعنی فطریات جن کو قضایا قیاساتہا معہا بھی کہتے ہیں اور مشاہدات، متواترات، حدسیات اور تجربیات، تعریفات کے لئے آسان منطق دیکھیں، اور وجہ حصر کے لئے دستور العلماء (۱:۲۹۹) ملاحظہ فرمائیں۔

چار بڑے شعائر اللہ: قرآن، کعبہ، نبی اور نماز

شعائر اللہ بہت ہیں، جیسا کہ پہلے تفصیل گذر چکی ہے البتہ بڑے اور اہم شعائر اللہ چار ہیں جن کی تفصیل درج ذیل ہے:

① قرآن کریم: پہلے دو مثالوں میں غور کریں:

(۱) نزول قرآن کے زمانہ میں اور اس سے پہلے لوگوں میں بادشاہوں کے اپنی رعایا کی طرف جاری کئے ہوئے فرامین و

خطوط شائع و ذائع تھے اور لوگ بادشاہوں کی تعظیم کے باب ہی سے ان کے خطوط کی تعظیم کو سمجھتے تھے۔ اور یہ جملہ مشہور تھا کہ کلام الملوک ملوک الکلام (شاہوں کا کلام کلاموں کا بادشاہ ہے) یعنی بادشاہوں کی باتوں کا خواہ وہ زبانی ہوں یا بصورت خط، وہی مقام ہے جو خود بادشاہوں کا ہے۔ غرض بڑوں کے کلام کی عظمت لوگوں کے دلوں میں بیٹھی ہوئی تھی۔

(۲) گذشتہ انبیاء کے صحیفے اور دیگر مصنفین کی کتابیں بھی لوگوں میں رائج تھیں۔ بائبل میں صحف انبیاء کے علاوہ بہت سی غیر انبیاء کی کتابیں بھی شامل ہیں۔ اور کسی بھی مقتدیٰ کی راہ اپنانے کے لئے اس کی کتاب کی تعظیم اور اس کی تلاوت ضروری ہے۔ کیونکہ مقتدیٰ کے علوم کی پیروی اور زمانہ ہائے دراز تک ان علوم کو سیکھنا سکھانا کسی ایسی کتاب کے بغیر جس کی تلاوت کی جائے اور جس کو ایک نسل سے دوسری نسل کی طرف منتقل کیا جائے، بظاہر ناممکن نظر آتا ہے۔

چنانچہ جب خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کا دور آیا تو آپ کی امت کے لئے بھی ضروری ہوا کہ ان کو بھی جہانوں کے پروردگار کی طرف سے نازل شدہ ایک کتاب دی جائے، اور اس کی تعظیم ان پر لازم کی جائے تاکہ وہ اس کی تلاوت کریں، اور اس کے احکام کی تعمیل کر کے اپنے خالق جل مجدہ کا تقرب حاصل کریں۔ شعائر اللہ اسی طرح تشکیل پاتے ہیں یعنی جب لوگوں کے احوال کسی چیز کے مقتضی ہوتے ہیں تو رحمت خداوندی ان کی ضرورت کی تکمیل کا سامان کرتی ہے ــــــ اور قرآن کریم کی تعظیم اور اس کے احکام کی تعمیل کے سلسلہ میں جو احکام دیئے گئے ہیں ان میں سے چند درج ذیل ہیں:

۱- جب قرآن کریم پڑھا جائے تو لوگ اس کو کان لگا کر سنیں اور خاموشی اختیار کریں، رحمت خداوندی کے حق دار ہوں گے جیسا کہ سورۃ الاعراف آیت ۲۰۴ میں آیا ہے۔

۲- قرآنی تمام احکام کی فوراً تعمیل کی جائے مثلاً جن آیتوں میں سجدہ کا حکم ہے، وہاں سجدۂ تلاوت کیا جائے اور جن آیتوں میں تسبیح یا تکبیر کا حکم ہے، وہاں تسبیح و تکبیر کہی جائے، جیسے سورۃ الحاقہ کی آخری آیت میں تسبیح (اللہ کی پاکی بیان کرنے) کا حکم ہے اور سورۃ بنی اسرائیل کی آخری آیت میں تکبیر (اللہ کی بڑائی بیان کرنے) کا حکم ہے۔

۳- بے وضو قرآن کریم کو ہاتھ نہ لگایا جائے۔ جیسا کہ سورۃ الواقعہ آیت ۷۹ میں یہ حکم آیا ہے۔

> ومعظم شعائر الله أربعة: القرآن، والكعبة، والنبي، والصلوة:
>
> أما القرآن: فكان الناس شاع فيما بينهم رسائل الملوك إلى رعاياهم، وكان تعظيمهم للملوك مساوقًا لتعظيمهم للرسائل، وشاع صُحُفُ الأنبياء، ومصنفاتُ غيرهم، وكان تمذهُبُهم لمذاهبهم مساوقًا لتعظيم تلك الكتب وتلاوتها، وكان الانقياد للعلوم وتلقيها على مرّ الدهور بدون كتاب يُتلى ويُروى كالمحال بادئ الرأي، فاستوجب الناسُ عند ذلك: أن تظهر رحمةُ الله في صورة كتاب نازلٍ من رب العالمين، ووجب تعظيمه:
>
> فمنه: أن يستمعوا له، ويُنصتوا إذا قُرئ.

ومنه: أن يُبادِروا لأوامره، كسجدة التلاوة، وكالفسح عند الأمر بذلك.

ومنه: أن لا يَمَسُّوا المصحف إلا على وضوء.

ترجمہ: اور بڑے شعائر اللہ چار ہیں: قرآن، کعبہ، نبی اور نماز۔

رہا قرآن: پس لوگوں کے درمیان شائع ذائع تھے بادشاہوں کے خطوط اپنی رعایا کی طرف اور لوگوں کا بادشاہوں کی تعظیم کرنا ملزوم تھا ان کے خطوط کی تعظیم کے لئے۔ اور انبیاء کے صحیفے اور دیگر لوگوں کی تصانیف بھی رائج تھیں۔ اور لوگوں کا اُن کے طریقوں کو اپنانا ملزوم تھا ان کی کتابوں کی تعظیم کے لئے اور ان کی تلاوت کے لئے۔ اور ان کے علوم کی تابعداری اور ان کو حاصل کرنا عرصۂ دراز تک، کسی ایسی کتاب کے بغیر جس کی تلاوت کی جائے اور جس کو روایت کیا جائے، سرسری نظر میں ناممکن سی بات ہے۔ پس اس وقت لوگوں نے واجب ولازم جانا کہ رحمت خداوندی کسی ایسی کتاب کی صورت میں ظاہر ہو، جو رب العالمین کی طرف سے اترنے والی ہو (چنانچہ حسب تقاضا قرآن کریم نازل ہوا) اور اس کی تعظیم واجب ہوئی:

پس اس میں سے: یہ ہے کہ لوگ اس کو سنیں اور خاموش رہیں جب وہ پڑھی جائے۔

اور اس میں سے: یہ ہے کہ لوگ اس کے اوامر کی تعمیل کی طرف سبقت کریں، جیسے سجدۂ تلاوت کرنا، اور جیسے اللہ کی پاکی بیان کرنا، جہاں ان باتوں کا حکم دیا جائے۔

اور اس میں سے: یہ ہے کہ لوگ قرآن کریم کو نہ چھوئیں مگر باوضو۔

لغات:

مُتَسَاوِقًا اسم مفعول ہے تَسَاوَقَ مُتَسَاوَقَةً: تَابَعَهُ وَسَايَرَهُ (المعجم الوسیط) یعنی پیروی کرنا، ساتھ ساتھ چلنا المساوقة: المتابعة، كأن بعضها يسوق بعضا۔ پیروی کرنے والا تابع اور لازم ہوتا ہے اور جس کی پیروی کی جائے وہ ملزوم اور متبوع ہوتا ہے اور بادشاہوں کی تعظیم ملزوم ہے اور خطوط کی تعظیم لازم ہے، کیونکہ وہ بادشاہوں کی تعظیم پر متفرع ہے۔ اسی طرح انبیاء کی راہ اپنانا ملزوم ہے، اور ان کی کتابوں کی تعظیم لازم ہے۔ اس لئے مُتَسَاوَقًا اسم مفعول ہے، اسم فاعل نہیں ... تَمَذْهَبَ: اس نے مذہب اختیار کیا، اس نے راہ اپنائی المذهب: روش، طریقہ (اردو میں مذہب بمعنی دین استعمال ہوتا ہے)

☆ ☆ ☆

② کعبہ شریف: سب سے پہلا گھر جو منجانب اللہ لوگوں کے لئے تعمیر کیا گیا: وہ کعبہ شریف ہے (سورۂ آل عمران آیت ۹۶) انسانوں میں سب سے پہلے ابوالبشر حضرت آدم علیہ السلام نے بحکم خداوندی اس گھر کی تعمیر کی۔ اور اس کا

طواف کیا۔ یہ مضمون بیہقی رحمہ اللہ نے دلائل النبوۃ میں بروایت حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ روایت کیا ہے۔ آدم علیہ السلام کی یہ تعمیر نوح علیہ السلام کے زمانہ تک باقی رہی۔ طوفان نوح میں وہ منہدم ہوگئی، اور اس کے نشانات بھی مٹ گئے۔ پھر جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کا زمانہ آیا تو آپ نے بحکم خداوندی انہی بنیادوں پر دوبارہ کعبہ شریف تعمیر کیا، جو آج تک باقی ہے۔ حضرت شاہ صاحب قدس سرہ اسی بنائے ابراہیمی کا تذکرہ کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں:

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ میں جب کواکب پرستی کا زور ہوا، تو لوگوں نے سورج وغیرہ ستاروں کی روحانیت کے نام پر معبد اور گرجا گھر تعمیر کئے۔ ان کے خیال میں مجرد وغیر محسوس ہستی کی طرف متوجہ ہونے کے لئے کوئی پیکر محسوس ضروری تھا، جو اس مجرد ہستی کے نام پر بنایا جائے۔ لوگ اس کی زیارت کے لئے آئیں، اور اس سے تعلق قائم کرکے اس مجرد ذات کا تقرب حاصل کریں۔ ان کے نزدیک اس کے بغیر توجہ ممکن نہیں تھی، اوثان اور اصنام میں اس کے امکان کو رد کر دیے تھے۔

جب اس کا رواج عام ہوگیا تو لوگوں کے احوال نے واجب و لازم جانا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ کرنے کے لئے بھی کوئی گھر ہو، جس کا لوگ طواف کریں، اور جس کے ذریعہ لوگ اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کریں۔ چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حکم ملا، اور انھوں نے کعبہ شریف دوبارہ تعمیر کیا، تاکہ وہ لوگوں کے لئے "قبلہ نما" بنے۔ جب کعبہ شریف تیار ہوگیا تو لوگوں کو دعوت دی گئی کہ آئیں اور اس گھر کا حج کریں، طواف کریں اور تقرب الٰہی حاصل کریں۔ سورۃ الحج آیت ۲۷ وما بعد میں اس کی تفصیل ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ لوگوں کی دینی مصلحت کے تقاضے سے اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے لوگوں کے فائدے کے لئے یہ گھر متعین کیا ہے، اور مرور ایام کے بعد جب کعبہ کی تعظیم اللہ ہی کی تعظیم سمجھی جانے لگی، اور اس کے حق میں کوتاہی اللہ کے حق میں کوتاہی تصور کی جانے لگی تو بیت اللہ کا حج فرض ہوا، اور لوگوں کو بیت اللہ کی تعظیم کا حکم دیا گیا۔ مثلاً یہ احکام دیے گئے:

۱- بیت اللہ کے طواف کے لئے طہارت ضروری ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ الطواف حول البیت مثل الصلوۃ (بیت اللہ کے گرد طواف نماز کے مانند ہے) یعنی جس طرح نماز کے لئے طہارت اور ستر عورت ضروری ہے طواف کے لئے بھی یہ چیزیں ضروری ہیں (یہ حدیث مشکوۃ کتاب الحج باب الطواف میں ہے)

۲- نمازوں میں بیت اللہ شریف کی طرف منہ کرنا ضروری قرار دیا گیا۔ سورۃ البقرۃ آیت ۱۴۴ و ۱۴۹ و ۱۵۰ میں یہ حکم مذکور ہے۔

۳- استنجا کی حالت میں بیت اللہ کی طرف استقبال و استدبار کو مکروہ قرار دیا گیا۔ متفق علیہ حدیث میں ہے کہ جب

تم بڑے استنجا کے لئے جاؤ تو نہ قبلہ کی طرف منہ کرو نہ اس کی طرف پیٹھ کرو، بلکہ (مدینہ کی جہت والے) مشرق کی طرف منہ کریں یا مغرب کی طرف منہ کریں (مشکوٰۃ، کتاب الطہارۃ، باب آداب الخلاء، حدیث نمبر ۳۳۳)

وأما الكعبة: فكان الناس في زمن إبراهيم عليه السلام توغَّلوا في بناء المعابد والكنائس باسم روحانية الشمس وغيرها من الكواكب، وصار عندهم التوجه إلى المجرد غير المحسوس بدون هيكل يُبنى باسمه يكونُ الحلول فيه، والتلبُّس به تقرباً منه، أمراً محالاً، تدفعه عقولهم بادي الرأي، فاستوجب أهلُ ذلك الزمان أن تظهر رحمةُ الله بهم في صورة بيت، يطوفون به، ويتقربون به إلى الله، فدُعُوا إلى البيت وتعظيمه، ثم نشأ قرن بعد قرن على علم أن تعظيمه مساوق لتعظيم الله، والتفريط في حقه مساوق للتفريط في حق الله. فعند ذلك وجب حجُّه، وأُمروا بتعظيمه.

فمنه: أن لا يطوفوا إلا متطهرين.

ومنه: أن يستقبلوها في صلاتهم، وكراهيةُ استقبالها واستدبارها عند الغائط.

ترجمہ: اور رہا کعبہ: پس لوگ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ میں دور تک چلے گئے تھے معابد وکنائس کے بنانے میں سورج وغیرہ ستاروں کی روحانیت کے نام سے، اور لوگوں کے نزدیک مجرد وغیر محسوس کی طرف توجہ کرنا، کسی ایسے ہیکل (جسم) کے بغیر، جو اس مجرد کے نام سے بنایا گیا ہو جس میں اترنا (یعنی سفر کر کے اس کی زیارت کے لئے آنا) اور جس سے تعلق قائم کرنا، اس مجرد کا تقرب حاصل کرنا ہو، امر محال ہو گیا تھا، جس کو ان کی عقلیں سرسری نظر میں دفع کرتی تھیں۔ پس اس زمانہ کے لوگوں نے واجب ولازم جانا کہ رحمت خداوندی ظاہر ہو کسی ایسے گھر کی صورت میں جس کا لوگ طواف کریں اور جس کے ذریعہ وہ اللہ کا قرب حاصل کریں۔ پس لوگ بیت اللہ کی طرف اور اس کی تعظیم کی طرف بلائے گئے، پھر نسلوں کے بعد نسلیں پیدا ہوئیں اس علم پر کہ بیت اللہ کی تعظیم اللہ تعالیٰ کی تعظیم کے لئے ملزوم ہے اور بیت اللہ کے حق میں کوتاہی اللہ کے حق میں کوتاہی کے لئے ملزوم ہے۔ پس اس وقت واجب ہوا حج کرنا اور لوگوں کو اس کی تعظیم کا حکم دیا گیا۔

پس اس میں سے: یہ بات ہے کہ لوگ بیت اللہ کا طواف نہ کریں، مگر پاک ہونے کی حالت میں۔

اور اس میں سے: یہ بات ہے کہ لوگ اس کی طرف منہ کریں اپنی نمازوں میں اور استنجا کرتے وقت اس کی طرف منہ کرنے اور پیٹھ کرنے کا مکروہ ہونا۔

لغات: تبّ وتبّ یہاں بھی دونوں جگہ اسم مفعول ہے . توغّل فی البلاد: جانا، دور تک جانا . . معبد: عبادت گاہ ... کنیسہ: یہود ونصاریٰ کی عبادت گاہ ... تقرباً منہ خبر ہے یکون کی ... امراً محالاً خبر ہے صار کی۔

④ نبی: نبیٌّ صفت مشبہ ہے۔ اصل میں نَبِیْءٌ تھا ہمزہ کو ی سے بدل کر ی میں ادغام کیا گیا ہے۔ یہ لفظ نَبَأٌ سے ماخوذ ہے، جس کے معنی ہیں خبر دینا، اس کا مصدر نَبَأ (ف) نَبْأً و نُبُوْءًا ہے جس کے معنی ہیں بلند ہونا، ظاہر ہونا۔

رسول: (بروزن فعول) مبالغہ ہے مُرْسَل (بروزن مُفْعَل) کا۔ اور فعول کا استعمال اس طرح ہوتا رہتا ہے (جامع الرموز قہستانی ص ۵)

مُرسَل (اسم مفعول) اور مُرسِل (اسم فاعل) اِرسال سے ہیں، جس کے معنی ہیں بھیجنا۔ مُرسَل بھیجا ہوا فرستادہ پیامبر۔

رسول اور نبی دونوں کے پاس فرشتہ وحی لاتا ہے۔ مگر نبی عام طور پر مومنین کو احکام پہنچاتا ہے اور رسول کفار کی طرف بھی مبعوث ہوتا ہے، بلکہ اس کی بعثت کی پہلی غرض کفار کو دعوت دینا ہی ہوتی ہے۔ پھر نبی سابق شریعت و کتاب کی تبلیغ پر مامور ہوتا ہے اور رسول کو نئی کتاب اور نئی شریعت دی جاتی ہے۔ پس ہر رسول نبی ہوتا ہے مگر ہر نبی رسول نہیں ہوتا (اس سلسلہ کی مزید تفصیلات لغات القرآن (اردو) ج ۳ ص ۷۔ ۸۵ میں ہے) اب شاہ صاحب رحمہ اللہ کی بات شروع ہوتی ہے۔

جس طرح بادشاہ اپنی رعایا کی طرف پیامبر بھیجتے ہیں جو لوگوں کو بادشاہوں کے اوامر و نواہی کی خبر دیتے ہیں اور لوگوں کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ وہ ان سفیروں کی بات مانیں۔ کیونکہ ان کی بات ماننا درحقیقت بادشاہوں کی بات ماننا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے بھی اپنے بندوں کی طرف نبی اور رسول بھیجے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے اوامر و نواہی لوگوں کو پہنچاتے ہیں۔ ان کی تعظیم بھی لوگوں پر واجب ہے کیونکہ وہ درحقیقت اللہ تعالیٰ ہی کی تعظیم ہے۔ سورۃ النساء آیت ۸۰ میں ہے ﴿مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللهَ، وَمَنْ تَوَلّٰی فَمَآ اَرْسَلْنٰکَ عَلَیْهِمْ حَفِیْظًا﴾ (جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی، اور جو روگردانی کرے، سو ہم نے آپ کو ان کا نگران کر کے نہیں بھیجا) اور نبی کی تعظیم کے سلسلہ کے چند احکام یہ ہیں:

۱۔ نبی کی اطاعت واجب ہے۔ سورۃ النساء آیت ۵۹ میں رسول کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے۔
۲۔ نبی پر درود بھیجنے کا حکم، جو سورۃ الاحزاب آیت ۵۶ میں ہے، وہ نبی کی تعظیم کے باب سے ہے۔
۳۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بلند آواز سے بولنے کی جو ممانعت سورۃ الحجرات آیت ۲ میں آئی ہے وہ باب تعظیم سے ہے۔

④ نماز: نماز بادشاہوں کے دربار کی حضوری کے مشابہ ایک عبادت ہے۔ بادشاہ کے غلام جب بادشاہ کے سامنے کھڑے ہوتے ہیں اور اس سے سرگوشی کرتے ہیں تو باادب دست بستہ کھڑے ہوتے ہیں۔ پس جس طرح بادشاہ سے کوئی درخواست کرنے سے پہلے اس کی تعریف میں قصیدہ پڑھتے ہیں اسی طرح نماز میں بھی دعا سے پہلے حمد و ثنا کرنا

ضروری ہے، چنانچہ نماز کی ابتداء سورۂ فاتحہ سے کرنا ضروری ہے، کیونکہ وہ اللہ کی حمد سے شروع ہوتی ہے۔ اسی طرح بادشاہوں سے ملاقات کے وقت جن شرائط وقیود کا لحاظ ضروری ہے، نماز میں بھی ان کی پابندی ضروری ہے، جیسے وقت پر حاضر ہونا۔ بادشاہ کی طرف متوجہ رہنا، اِدھراُدھر نہ دیکھنا، پاک صاف ہوکر اچھا لباس زیب تن کرکے حاضرِ دربار ہونا۔ یہی سب باتیں: اوقات کی پابندی، استقبالِ قبلہ طہارت بدن وثوب ومکان اور سترِ عورت وغیرہ نماز کے لئے شرطیں ٹھہریں۔ پھر جب نماز شروع ہوجائے تو ہاتھ باندھ کر اللہ کی طرف متوجہ رہنا ضروری ہوا اور اِدھراُدھر بے ضرورتِ شدیدہ جھانکنا ممنوع ٹھہرا۔ حدیث شریف میں ہے کہ: "جب تم میں سے کوئی شخص نماز پڑھے تو (جان لے کہ) بیشک اللہ اس کے منہ کی جانب میں ہیں" (یہ متفق علیہ حدیث کا ایک حصہ ہے، جس میں نماز میں قبلہ کی طرف تھوکنے کی ممانعت آئی ہے)

وأما النبي: فلم يُسَمَّ مرسلاً إلا لشبهها برسل الملوك إلى رعاياهم، مُخبرين بأمرهم ونهيهم، ولم يجب عليهم طاعتهم إلا بعد مساوقة تعظيمهم لتعظيم المرسِل عندهم؛ فمن تعظيم النبي: وجوبُ طاعته، والصلاةُ عليه، وتركُ الجهر عليه بالقول.

وأما الصلاة: فيُقصد فيها التشبهُ بحالِ عبيد الملك عند مُثُولهم بين يديه، ومناجاتِهم إياه وخضوعهم له، ولذلك وجب تقديم الثناء على الدعاء، ومؤاخذةُ الإنسان نفسَه بالهيئات التي يجب مراعاتها عند مناجاة الملوك: من ضم الأطراف وترك الالتفات، وهو قوله صلى الله عليه وسلم: ﴿إذا صلى أحدكم فإن الله قِبَلَ وجهه﴾ والله أعلم.

ترجمہ: اور رہا نبی: پس وہ مرسل نام نہیں رکھا گیا مگر تشبیہ دیتے ہوئے بادشاہوں کے فرستادوں کے ساتھ ان کی رعایا کی طرف (یعنی انبیاء کو رسل کہا ہی جاتا ہے بادشاہوں کے ایلچیوں کے ساتھ تشبیہ دینے کی وجہ سے) جو لوگوں کو بادشاہوں کے اوامر ونواہی کی خبر دینے والے ہیں۔ اور نہیں واجب کی گئی لوگوں پر ان سفیروں کی اطاعت مگر ان کی تعظیم کے ملزوم ہونے کے بعد لوگوں کے نزدیک بھیجنے والے کی تعظیم کے لئے (یعنی لوگوں کے نزدیک ان سفیروں کی تعظیم ان کے بھیجنے والے بادشاہ ہی کی تعظیم ہے یعنی ان کی تعظیم ملزوم ہے اور اس کے لئے مرسل کی تعظیم لازم ہے) پس پیغمبر کی تعظیم کے باب سے ہے: اس کی اطاعت کا واجب ہونا، اس پر درود (بے پایاں رحمت) بھیجنا اور اس کے سامنے اونچی آواز سے نہ بولنا۔

اور رہی نماز: پس اس میں ارادہ کیا جاتا ہے بادشاہ کے غلاموں کی حالت کے ساتھ مشابہت کا۔ ان کے کھڑے ہونے کے وقت بادشاہ کے روبرو، اور ان کے سرگوشی کرنے کے بعد بادشاہ سے اور ان کی تابعداری کرنے کے ساتھ بادشاہ کی۔ اور اسی وجہ سے (نماز میں) تعریف کو دعا سے مقدم کرنا ضروری ہوا اور آدمی کا اپنی ذات کو پابند کرنا ضروری ہوا ایسی ہیئتوں کے ساتھ جن کی رعایت بادشاہوں سے سرگوشی کے وقت ضروری ہے یعنی اعضاء کو ملانا (یعنی ہاتھ باندھنا

اور قدموں کو قریب کر کے کھڑا ہونا) اور ادھر ادھر نہ دیکھنا اور وہ آپ ﷺ کا ارشاد ہے کہ: "جب تم میں سے کوئی نماز پڑھے تو بیشک اللہ تعالیٰ اس کے چہرے کی جانب ہیں" باقی اللہ بہتر جانتے ہیں!

لغات: مُنَاجَاۃ مصدر بمعنی مناجات ہے۔ اس کی وضاحت پہلے گذر چکی ہے۔ مثول کھڑا ہونا مَثَلَ (ن، ک) مثولاً بین یدیہ کسی کے سامنے کھڑا ہونا۔

باب — ۸

وضوء و غسل کے اسرار و رموز کا بیان

نیکی کے کاموں میں سے ایمانیات کے ذکر سے فارغ ہونے کے بعد اب اعمال اسلام کا بیان شروع ہوتا ہے۔ اعمال اسلام میں سب سے اہم نماز ہے اور نماز کے لئے طہارت شرط ہے۔ اس لئے تمہید کے طور پر اس باب میں طہارت کی حکمتیں اور فوائد بیان کرتے ہیں۔ پہلے مبحث رابع کے باب ۱۱ میں طہارت کے سلسلہ میں جو تفصیلات گذری ہیں ان پر ایک نظر ڈال جائے تو اس باب کے فہم میں مدد ملے گی۔

پاکی کے معاملہ میں تین طرح کے لوگ

طہارت کے معاملہ میں لوگوں کے تین مختلف درجات ہیں۔ اعلیٰ درجہ کے لوگ وہ ہیں جو بصیرت وجدان کی روشنی میں طہارت کا اہتمام کرتے ہیں یعنی وہ طہارت کے معاملہ میں پہلے سے باصیرت ہوتے ہیں۔ وہ ایک مقصد کی تحصیل کے لئے طہارت کا التزام کرتے ہیں۔ دوسرے درجہ میں وہ لوگ ہیں جو پہلے سے تو باصیرت نہیں ہوتے مگر جب وہ طہارت کا اہتمام شروع کرتے ہیں تو ان کو بصیرت حاصل ہو جاتی ہے۔ رفتہ رفتہ ان کو طہارت کے فوائد و برکات محسوس ہونے لگتے ہیں۔ اور تیسرے اور آخری درجہ کے لوگ وہ ہیں جن کو اس دنیا میں طہارت کے نتائج حاصل نہیں ہوتے۔ وہ بس ایک شرعی حکم سمجھ کر طہارت پر عمل پیرا ہوتے ہیں۔ مگر آخرت میں وہ بھی محروم نہیں رہتے۔ موت کے بعد وہ بھی طہارت کے فوائد و برکات سے متمتع ہوتے ہیں۔ تینوں درجوں کی تفصیل درج ذیل ہے:

پہلا درجہ: کبھی انسان طبیعت کی کثافت اور تاریکی سے نجات پا کر حظیرۃ القدس (بارگاہ مقدس) کے انوار سے ہم کنار ہوتا ہے۔ اس وقت اس شخص پر وہاں کے انوار چھا جاتے ہیں۔ اور وہ گھڑی دو گھڑی کے لئے فطری تقاضوں سے آزاد ہو جاتا ہے۔ آزاد ہونے کی صورت کیا ہوتی ہے؟ یہ سمجھنا مشکل ہے۔ اس کی مختلف صورتوں میں کوئی صورت ہوتی ہے۔ جب یہ حالت پیش آتی ہے تو آدمی ملأ اعلیٰ کے ساتھ منسلک ہو جاتا ہے۔ اور تجرید نفس یعنی مادہ سے پاک ہونے

کے اعتبار سے وہ گویا ملأ اعلیٰ کا ایک فرد بن جاتا ہے اس حالت میں انسان کی خوشی کی انتہا نہیں رہتی۔ مگر یہ حالت کبھی کبھی پیش آتی ہے اور دیر تک باقی نہیں رہتی۔ صوفیا کی اصطلاح میں اس حالت کو "حالت بسط" کہتے ہیں۔

پھر جب یہ حالت زائل ہو جاتی ہے اور آدمی اپنی فطری حالت کی طرف لوٹ آتا ہے تو اس کو وہ پہلی والی حالت بار بار یاد آتی ہے اور وہ اس کے فوت ہو جانے سے پریشان ہوتا ہے۔ صوفیا کی اصطلاح میں اس حالت کو "حالت قبض" کہتے ہیں۔ اس حالت میں وہ کسی ایسی چیز کا مشتاق ہوتا ہے جو پہلی حالت سے مشابہ اور ملتی جلتی ہو تاکہ مجبوری کے درجہ میں اسی کو غنیمت سمجھے، اور حالت اولیٰ میں سے فوت شدہ حصہ کو حاصل کرنے کے لئے اس دوسری حالت کو ذریعہ بنائے اس ترکیب سے وہ فوت شدہ حالت کے احوال میں سے کوئی حالت پالیتا ہے۔ پہلی حالت سے مناسبت رکھنے والی یہ چیز طہارت ہے۔ جب آدمی گندگیوں کو چھوڑ دیتا ہے اور پاک وصاف کرنے والی چیزوں کو استعمال کرتا ہے تو اس کو سرور وانشراح حاصل ہوتا ہے، جو پہلی حالت کے احوال میں سے ایک حال ہے۔ مجبوری کے درجہ میں آدمی اس کو غنیمت سمجھتا ہے اور اس سے دل بہلاتا ہے اور اس کو دانتوں سے مضبوط پکڑتا ہے اور ہمیشہ باطہارت رہنے کی کوشش کرتا ہے۔ غرض یہ شخص علی وجہ البصیرت اپنی کھوئی ہوئی بہترین حالت کو حاصل کرنے کے لئے تدبیر کے طور پر طہارت کو اختیار کرتا ہے۔ اس کو پہلے سے طہارت کی اہمیت اور فوائد معلوم ہوتے ہیں۔

دوسرا درجہ: اس شخص کا ہے جس کو مخبر صادق یعنی انبیاء نے بتایا کہ طہارت انسان کا کمال ہے، وہ شعبۂ ایمان ہے اور انسان کی اس حالت کو خالق جل مجدہ پسند فرماتے ہیں مسواک کے بارے میں وارد ہوا ہے کہ وہ منہ کی صفائی اور پروردگار کی خوشنودی کا ذریعہ ہے علاوہ ازیں طہارت میں بے شمار فوائد ہیں جن کا بیان اسی باب کے آخر میں آرہا ہے۔ اس شخص نے بشارت نبی سے مخبر صادق کی یہ سب باتیں مان لیں اور اس کے احکام پر عمل شروع کر دیا، جب اس شخص نے طہارت کا عملی تجربہ کیا تو اس نے وہ سب باتیں برحق پائیں جو انبیاء نے بتائی تھیں۔ اور دنیا ہی میں اس پر رحمت خداوندی کے دروازے وا ہوگئے اور ملائکہ کے رنگ میں رنگین ہوگیا غرض یہ شخص عمل شروع کرنے کے بعد بابصیرت ہوگیا اور دنیا ہی میں طہارت کے فوائد لوٹنے لگا۔

تیسرا درجہ: اس شخص کا ہے جو مذکورہ باتوں میں سے کچھ بھی نہیں جانتا یعنی نہ تو وہ پہلے سے طہارت کے معاملہ میں بابصیرت ہوتا ہے، نہ عمل شروع کرنے کے بعد اس کو طہارت کے کچھ فوائد محسوس ہوتے ہیں۔ مگر چونکہ وہ مومن ہے، اس لئے شرعی ہدایت کے مطابق طہارت کا اہتمام کرتا رہتا ہے۔

اس شخص کو اگر دنیا میں طہارت کے انوار وبرکات محسوس نہ بھی ہوں تو بھی وہ محروم نہیں رہتا۔ طہارت اس میں استعداد پیدا کرتی ہے اور وہ موت کے بعد ملائکہ کے ساتھ منسلک ہو جاتا ہے۔ گویا یہ لوگ کشاں کشاں جنت میں پہنچ جاتے ہیں۔

باب أسرار الوضوء والغسل

اعلم أن الإنسان قد يُختطَف من ظلمات الطبيعة إلى أنوار حظيرة القدس، فتغلب عليه تلك الأنوار، ويصير ساعة مّا بريئا من أحكام الطبيعة، بوجه من الوجوه، فينسلك في سلكهم، ويصير فيما يرجع إلى تجريد النفس كأنه منهم، ثم يُرَدُّ إلى حيث كان، فيشتاق إلى ما يناسب الحالة الأولى، ليغتنمه عند فقدها، ويجعله شَرَكًا لاقتناص الفائت منها، فيجد بهذه الصفة حالةً من أحواله، وهي: السرور والانشراح الحاصلُ من هَجْر الرُّجْز واستعمال المطهِّرات، فيَعَضُّ عليها بنواجذه.

ويتلوه: إنسانٌ سمع المخبر الصادق يُخبر بأن هذه الحالة كمالُ الإنسان، وأنه ارتضاها منه ربُّه، وأن فيها فوائد لا تحصى، فصدَّقه بشهادة قلبه، ففعل ما أُمر به، فوجد ما أُخبر به حقًا، وفُتحت عليه أبواب الرحمة، واصطبغ بصبغ الملائكة.

ويتلوه: رجلٌ لا يعلم شيئا من ذلك، لكن قادة الأنبياء عليهم السلام ألجأوه إلى هيئات تُعِدُّ له في معاده للانسلاك في سلك الملائكة، وأولئك قوم جُرُّوا بالسلاسل إلى الجنة.

ترجمہ: باب: وضو اور غسل کے رموز کا بیان: جان لیں کہ انسان کبھی اُچک لیا جاتا ہے (یعنی یہ حالت غیر اختیاری ہے) طبیعت کی تاریکیوں سے حظیرۃ القدس کے انوار کی طرف، پس چھا جاتے ہیں اس پر وہ انوار، اور وہ گھڑی دو گھڑی کے لئے طبیعت کے احکام سے آزاد ہو جاتا ہے، آزاد ہونے کی صورتوں میں سے کسی صورت کے ذریعہ، پس وہ ملأ اعلی کی لڑی میں منسلک ہو جاتا ہے (یہاں مرجع کے ذکر کے بغیر ملأ اعلی کی طرف ضمیر لوٹائی ہے، کیونکہ حجۃ اللہ کے قاری کے ذہن میں ملأ اعلی کا تصور ہر وقت رہتا ہے) اور وہ ان باتوں میں جن کا نفس کی تجرید سے تعلق ہے، ہو جاتا ہے گویا وہ انہیں میں سے ہے (یعنی اس کا جسم تو وہی ہے اس لئے اس حیثیت سے تو وہ ملائکہ کا فرد نہیں بن سکتا۔ مگر اس کا نفس خالص مجرد ہے، اس لئے اس جہت سے وہ گویا فرشتہ بن جاتا ہے اسی کو "فرشتہ صفت" کہتے ہیں) پھر وہ لوٹا دیا جاتا ہے اس جگہ کی طرف جہاں وہ تھا۔ پس وہ مشتاق ہوتا ہے اس چیز کی طرف جو پہلی حالت سے مناسبت رکھتی ہے تاکہ وہ اس کو غنیمت سمجھے جبکہ وہ پہلی حالت گم ہو گئی۔ اور وہ اس مناسب چیز کو دام بنائے، حالت اولی میں سے فوت شدہ کو شکار کرنے کے لئے۔ پس پالے وہ اس مناسب چیز کے ذریعہ اس فوت ہونے والی چیز کے احوال میں سے کسی حالت کو۔ اور وہ حالت سرور وانشراح ہے، جو حاصل ہوتا ہے گندگی کو چھوڑنے سے اور پاک کرنے والی چیزوں کے استعمال سے،

پس وہ اس حالت کو اپنی ڈاڑھوں سے مضبوط پکڑتا ہے۔

اور اس کے بعد درجہ ہے اس شخص کا جس نے مخبر صادق سے سنا، جو اطلاع دیتے ہے کہ یہ حالت انسان کا کمال ہے اور یہ سنا کہ انسان کی اس حالت کو خالق تعالیٰ پسند فرماتے ہیں اور یہ بھی سنا کہ اس حالت (طہارت) میں بے شمار فوائد ہیں۔ پس اس نے دل کی گہرائی سے اس مخبر کی تصدیق کی اور جو کچھ اس نے حکم دیا اس پر عمل کیا، پس اس نے اس بات کو برحق پایا جس کی اس مخبر صادق نے خبر دی تھی۔ اور اس پر رحمت خداوندی کے دروازے کھول دیئے گئے اور وہ ملائکہ کے رنگ میں رنگین ہو گیا۔

اور اس کے بعد درجہ ہے اس شخص کا جو ان باتوں میں سے کچھ بھی نہیں جانتا، لیکن انبیاء نے اس کو کھینچا اور مجبور کیا، انکی اطاعت کی طرف جو اس کو تیار کریں آخرت میں ملائکہ کی لڑی میں پروئے جانے کے لئے اور یہ وہ لوگ ہیں جو زنجیروں کے ذریعہ جنت کی طرف کھینچے گئے یعنی احکام کا اتباع کر کے جنت کے حقدار بن گئے۔

☆ ☆ ☆

حدث کی قسمیں: حدث اصغر اور حدث اکبر

حدث (ناپاکی) طہارت (پاکی) کی ضد ہے۔ طہارت سے سرور وانشراح حاصل ہوتا ہے اور حدث سے انقباض و دل تنگی لاحق ہوتی ہے۔ اور وہ حدث جو واضح اور محسوس ہیں اور ان میں چار باتیں پائی جاتی ہیں: ۱- سرسری نظر میں بھی ان کے اثرات نفس میں محسوس کئے جاتے ہیں۔ ۲-: جو اس لائق ہیں کہ ان کے بارے میں عام لوگوں سے گفتگو کی جائے اور ان کے بارے میں احکام دیئے جائیں، کیونکہ وہ ان کو پہچان سکتے ہیں۔ ان کے پائے جانے کی جگہیں متعین ہیں اور وہ سبیلین اور شرمگاہ ہیں۔ ۳-: وہ حدث بکثرت پائے جاتے ہیں۔ ۴-: اگر طہارت کے ذریعہ ان کی تلافی کی تعلیم نہ دی جائے تو لوگوں کا بھاری نقصان ہوگا ــــ استقرا یعنی جائزہ لینے سے ایسے احداث دو جنسوں میں منحصر ہیں: ایک حدث اصغر جو موجب وضوء ہے، دوسرا: حدث اکبر جو موجب غسل ہے۔ دونوں قسموں کی تفصیل درج ذیل ہے۔

پہلی قسم یعنی حدث اصغر: معدے میں پیدا ہونے والے تین فضلات: ریاح اور بول و براز میں مشغولیت ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ جب پیٹ میں ریاح اٹکی ہوتی ہے یا بول و براز کا شدید تقاضا ہوتا ہے تو دل پریشان ہوتا ہے اور نفس پستی کی طرف مائل ہوتا ہے اور حیران و پریشان اور منقبض و دل گرفتہ شخص کی طرح ہوتا ہے اور نفس کے درمیان اور سرور وانشراح کے درمیان ایک پردہ حائل ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے آدمی بہجت و سرور سے محروم ہو جاتا ہے۔ پھر جب آدمی

فضلات ثلاثہ سے پاک وصاف ہوجاتا ہے۔ ریاح خارج ہوجاتی ہے اور بول وبراز سے ہلکا ہوجاتا ہے اور وضو یا غسل کرتا ہے جو نفس کو صفت طہارت سے آگاہ کرتے ہیں تو وہ سرور وانشراح پاتا ہے اور وہ ایسا ہوجاتا ہے جیسے اس نے اپنی کوئی گم شدہ چیز پالی۔

دوسری قسم: یعنی حدث اکبر نفس کا شہوت جماع میں مشغول ہونا اور اس میں ڈوب جانا ہے۔ کیونکہ یہ مشغولیت نفس کا رخ بالکلیہ طبیعت بہیمیہ کی طرف پھیر دیتی ہے اور ملکیت سے اس کا تعلق منقطع سا ہوجاتا ہے۔ ایک مثال میں غور کریں: جو چوپائے کسی خلاف فطرت کام کے لئے سدھائے جاتے ہیں اور ان کو مطلوبہ آداب کی ٹریننگ دی جاتی ہے اور وہ سرکس وغیرہ میں کرتب دکھاتے ہیں۔ اور شکاری جانور کتے وغیرہ کو شکار کرنے کا طریقہ بھوکا اور بیدار رکھ کر سکھایا جاتا ہے اور مالک کے لئے شکار روکنے کا اور اس میں سے نہ کھانے کا عادی بنایا جاتا ہے۔ اور طوطا مینا وغیرہ پرندوں کو انسانوں کی بولی سکھائی جاتی ہے۔ غرض کسی بھی جانور کو سخت ٹریننگ کر کے اس کی فطرت کے خلاف باتوں کی تعلیم دی جاتی ہے اگر ان حیوانات کو آزاد چھوڑ دیا جائے، اور وہ مادہ سے ملیں اور چند روز تک وہ شہوت جماع پوری کریں اور اس لذت میں ڈوبے رہیں تو ضرور وہ تعلیم بھول جائیں گے جو ان کو دی گئی ہے اور وہ بصیرت کے فقدان، جہالت اور گمراہی کی طرف لوٹ جائیں گے۔ انسانوں کا حال بھی ان حیوانات سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے۔ کسی نے کہا ہے: وبصاضع العلم بین افخاذ النساء (بھی علم عورتوں کی رانوں کے درمیان ضائع ہوجاتا ہے) یعنی جو اس لذت میں ہر وقت منہمک رہتا ہے اس کا علم ضائع ہوجاتا ہے۔ وہ سب پڑھا پڑھایا بھول جاتا ہے۔

اور غور کرنے سے یہ بات بخوبی سمجھ میں آسکتی ہے کہ جماع کی خواہش کو پورا کرنا جس قدر نفس کو بہیمیت سے آلودہ کرنے میں کارگر ہے اتنا پرخوری، لڑائی جھگڑا اور دیگر وہ چیزیں کارگر نہیں جو نفس کا رخ بہیمیت کی طرف پھیرتی ہیں اور جیسے ثابت ہوا ہے نفس پر تجربہ کر کے دیکھ لے اور اطباء نے خصی سیبوں، تارک الدنیا راہبوں کے نفس کو بہیمیت کی طرف لوٹانے کے لئے جو تدبیر لکھی ہے اس کو پڑھے۔ یہ لوگ عرصہ تک عورتوں سے بے تعلق رہنے کی وجہ سے قوت باہ کھو بیٹھتے ہیں۔ وہ اگر اپنی قوت باہ بحال کرنا چاہیں تو اس کا طریقہ یہ بیان کیا گیا ہے کہ وہ جانوروں کی جفتی دیکھیں، قوی الباہ لوگوں کے جماع کے واقعات پڑھیں اور باہ کو قوی کرنے والی غذائیں استعمال کریں اور مروحات ودلوکات کا استعمال کریں (شرح الاسباب والعلامات ۲: ۳۰ فی بحث علل اعضاء التناسل من الذکران، باب نقصان الباہ) رفتہ رفتہ ان کا نفس بہیمیت کی طرف لوٹ آئے گا اور ان کی مردہ قوت باہ انگڑائیاں لینے لگے گی۔ جب یہ چیزیں بہیمیت پیدا کرنے میں اتنی کارگر ہیں تو خود جماع کی شہوت کو پورا کرنا کس قدر نفس کو بہیمیت سے آلودہ کرے گا یہ بات ظاہر ہے۔ مگر جس طرح کھانا پینا ایک فطری ضرورت ہے، جماع بھی ایک فطری تقاضا ہے اس لئے دین فطرت نے اس پر پابندی نہیں لگائی، البتہ اس کی مضرات کا علاج تجویز کیا ہے جو اگلے عنوان کے تحت آرہا ہے۔

الحدثُ الذي يُحَسُّ أثرُهُ في النفس بادي الرأي، والذي يليق أن يخاطب به جمهورُ الناس، لانضباط مظانه، والذي يُكثر وقوعُ مثله، وفي إهمال تعليمه ضررٌ عظيم بالناس، منحصرٌ استقراءً في جنسين:

أحدهما: اشتغال النفس بما يجد الإنسان في معدته من الفُضول الثلاثة: الريح، والبول، والغائط، فليس من البشر أحد إلا ويعلم من نفسه: أنه إذا وجد في بطنه الرياحَ، أو كان حاقبا حاقنا، خَبُثَتْ نفسُه، وأخلَدتْ إلى الأرض، وصارت كالحائرة المنقبضة، وكان بينها وبين انشراحها حجابٌ، فإذا اندفعت عنه الرياحُ وتخفَّفَ عنه الأخبثان، واستعمل ما يُنَبِّهُ نفسَه للطهارة، كالغسل والوضوء، وجد انشراحاً وسروراً، وصار كأنه وَجد ما فقد.

والثاني: اشتغالُ النفس بشهوة الجماع، وخوضها فيها، فإن ذلك يصرف وجهَ النفس إلى الطبيعة البهيمية بالكلية، حتى إن البهائمَ إذا ارتيضت ومُرِّنَتْ على الآداب المطلوبة، والجوارحَ إذا ذُلِّلَتْ بالجوع والسهر، وعُلِّمَتْ إمساكَ الصيد على صاحبها، والطيورَ إذا كُلِّفَتْ بمحاكاة كلام الناس، وبالجملة: كلُّ حيوانٍ أُفرغ الجُهْدُ في إزالة ماله من طبيعته، واكتسابِ ما لا تقتضيه طبيعتُه، ثم قضى هذا الحيوانُ شهوةَ فرجه، وغافَصَ الإناثَ، وغاص في تلك اللذة أياماً، لابد أن ينسى ما اكتسبه، ويرجع إلى عَمَهٍ وجهلٍ وضلال.

ومن تأمل في ذلك عَلِمَ لا مُحالة: أن قضاء هذه الشهوة يُؤَثِّرُ في تلويث النفس ما لا يؤثره شيءٌ من كثرة الأكل، والمعاصرة، وسائرِ ما يُميل النفسَ إلى الطبيعة البهيمية؛ ولْيُجَرِّبِ الإنسانُ ذلك من نفسه، ولْيَرْجِعْ إلى ما ذكره الأطباء في تدبير الرُّهبان المنقطعين، إذا أُريد إرجاعهم إلى النفس البهيمية.

ترجمہ: اور وہ حدث جس کا اثر بادی الرائے میں نفس کے اندر محسوس کیا جاتا ہے اور جو اس لائق ہے کہ عام لوگوں کو اس کے بارے میں احکام دیے جائیں، اس کی احتمالی جگہوں کے منضبط ہونے کی وجہ سے اور جس کے مانند کا وقوع بکثرت ہوتا ہے اور جس کی تعلیم کے چھوڑنے میں لوگوں کا بھاری نقصان ہے، جائزہ لینے سے اس کی ناپاکیاں دو جنسوں میں منحصر ہیں۔

اول: نفس کا اس چیز میں مشغول ہونا جس کو انسان اپنے معدے میں پاتا ہے یعنی تین گندی چیزیں: ریاح، پیشاب اور پاخانہ۔ پس کوئی بھی انسان نہیں ہے مگر درانحالیکہ وہ اپنے بارے میں جانتا ہے کہ جب اس کے پیٹ میں ریاح اکٹھا

کر دیتا ہے یا اپنا یا کسی کا کوئی نجاست ردیہ نفیس و قیمتی مال ضائع کر دیتا ہے تو یکایک اس کو ہوش آ جاتا ہے۔ اس کا نفس چوکنا ہو جاتا ہے اور وہ ہر بات سمجھنے لگتا ہے اور اس کا سارا نشہ ہرن ہو جاتا ہے۔ یہی انتقال ذہنی ہے۔

دوسری مثال: کبھی ایسا ہوتا ہے کہ نحیف و نزار شخص جس میں نہ کسی کام کی طاقت ہوتی ہے نہ اٹھنے کی سکت ہوتی ہے۔ اتفاقاً اس کو سخت غصہ آ جاتا ہے یا رگ حمیت پھڑک اٹھتی ہے یا مسابقت کی دھن سوار ہو جاتی ہے تو وہ بڑے سے بڑا کارنامہ کر گذرتا ہے یا دل دہلا دینے والی خون ریزی کر بیٹھتا ہے۔ یہی یکبارگی انتقال ہے۔

غرض نفس میں فوری انتقال ہوتا ہے یعنی کبھی نفس کے احوال یکبارگی بدل جاتے ہیں وہ ایک حالت میں ہوتا ہے اور اس کو فوراً ہی دوسری حالت پیدا ہوتی ہے اور صلاح نفس کی بہترین صورت بھی یہی ہے کہ یک دم آدمی بری زندگی سے نکل کر اچھی زندگی میں آ جائے۔ تدریجاً اصلاح بھی ہوتی ہے مگر اس میں دیر لگتی ہے اور وہ کچھ بہت زیادہ مضبوط بھی نہیں ہوتی اور یک لخت جس کی حالت بدل جاتی ہے اس کی بات ہی کچھ اور ہوتی ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں اور بزرگوں کے متعلقین میں اس کی صدہا مثالیں ہیں کہ اچانک زندگی کی کایا پلٹ گئی اور وہ انسانیت کے اعلیٰ مقام پر پہنچ گئے پس اسی طرح طہارت کے معاملہ کو سمجھنا چاہئے کہ نہاتے ہی فوراً آدمی حدث اکبر سے نکل کر طہارت کبریٰ کا مقام پا لیتا ہے۔

مگر یہ بات یعنی فوری تبدیلی اسی چیز سے حاصل ہو سکتی ہے جس کے متعلق یہ اعتقاد دل میں بیٹھا ہوا ہو کہ اس سے اعلیٰ درجہ کی پاکی حاصل ہو سکتی ہے اور ایسی چیز صرف پانی ہے۔ مٹی ضرورت کے وقت اس کا قائم مقام ہے اس میں یہ شان نہیں ہے۔ کیونکہ قدرت نے پانی کو طہور (بذات خود پاک اور دوسری چیزوں کو پاک کرنے والا) پیدا کیا ہے۔ سورۃ الفرقان آیات ۴۸ و ۴۹ میں ہے کہ: "وہ اللہ ایسا ہے کہ باران رحمت سے پہلے بارش کی خوشخبری دینے کے لئے ہواؤں کو بھیجتا ہے اور ہم نے آسمان سے پاک صاف کرنے والا پانی برسایا تاکہ اس کے ذریعہ مردہ زمینوں میں جان ڈال دیں اور اپنی مخلوقات میں سے بہت سے چوپایوں اور انسانوں کو سیراب کریں"۔

مردہ زمینوں میں جان پڑنے کا ظاہری مطلب یہ ہے کہ پانی پڑتے ہی مردہ زمینوں میں زندگی کے آثار نمودار ہونے لگتے ہیں، کھیتیاں لہلہانے لگتی ہیں، جہاں خاک اڑ رہی تھی وہاں سبزہ زار بن جاتا ہے اور نفسی اعتبار سے یہ مطلب بھی لیا جا سکتا ہے کہ مردہ دل یعنی ناپاک لوگ جب پانی سے پاکی حاصل کرتے ہیں تو ان میں جان پڑ جاتی ہے۔ واللہ اعلم (آیت سے یہ استدلال شارح نے بڑھایا ہے)

(۲) طہارت صغریٰ: صرف اطراف بدن (سر، منہ، ہاتھ اور پاؤں) کے دھونے سے حاصل ہوتی ہے۔ اور اطراف پر اکتفا کرنے کی دو وجہیں ہیں:

پہلی وجہ: دنیا کے تمام آباد خطوں میں لوگ عموماً ان اعضاء کو کھلا رکھتے ہیں، کپڑوں میں نہیں چھپاتے۔ یہی ان کا فطری طریقہ زندگی ہے اور حدیث شریف میں جو نصب اور صماء کی ممانعت آئی ہے، اس میں اسی طرف اشارہ ہے۔

ضَمْاء، اَضْمَمْ کا مؤنث ہے جس کے معنی ہیں ٹھوس، سخت، مضبوط۔ اور اشتمال کے معنی ہیں سارے جسم پر کپڑا لپیٹنا اور اشتمال صماء کے معنی ہیں: چادر اس طرح اوڑھنا کہ ہاتھ اندر دب جائیں اور یہ ممنوع اس لئے ہے کہ بوقت حاجت ہاتھوں سے کام نہیں لیا جا سکے گا۔ اس حدیث میں اشارہ ہے کہ لوگ عموماً ہاتھ کھلے رکھتے ہیں تاکہ بوقت حاجت ان سے فوراً کام لیا جا سکے۔ یہی معاملہ پیروں کا اور چہرہ کا ہے۔

غرض اطراف جسم چونکہ عام طور پر کھلے رہتے ہیں اس لئے ان کو وضو میں بار بار دھونے میں کوئی حرج اور تنگی نہیں ہے اور باقی جسم چونکہ کپڑوں میں مستور رہتا ہے، اس لئے بار بار ہر کس و ناکس کے سامنے ان کو کھولنے میں اور دھونے میں حرج ہے۔

دوسری وجہ: شہری تمدن میں، جو ترقی یافتہ تمدن ہے، روزانہ اطراف بدن (ہاتھ، منہ اور پاؤں) کو دھونے کا عام رواج اور عادت ہے۔ اسی طرح جب لوگ سلاطین و حکام کے پاس جاتے ہیں تو بھی ان اعضاء کو دھولیا کرتے ہیں نیز جب لوگ کوئی پاکیزہ کام مثلاً کھانا یا کوئی مقدس چیز لینے کا ارادہ کرتے ہیں تب بھی وہ اطراف کو دھوتے ہیں، سارا بدن نہیں دھوتے۔ غرض ان دو وجہوں سے طہارت صغریٰ میں اطراف بدن کے دھونے پر اکتفا کی گئی ہے، سارا بدن یا پیچھے اعضاء کو دھونا ضروری قرار نہیں دیا گیا۔

گہری وجوہ: اوپر طہارت صغریٰ میں اطراف بدن کے دھونے پر اکتفا کرنے کی جو دو وجہیں بیان کی گئی ہیں وہ عام فہم اور سرسری وجوہ ہیں۔ اب اس کی گہری وجوہ بیان کی جاتی ہیں۔ اور وہ بھی دو ہیں:

پہلی وجہ: اطراف جسم چونکہ عموماً کھلے رہتے ہیں اس لئے بہت جلد ان پر گرد و غبار جم جاتی ہے اور یہی اعضاء باہمی ملاقات کے وقت دیکھے جاتے ہیں اس لئے ان کا گرد و غبار میں اٹا پڑا رہنا مناسب نہیں۔ ان کو دھو کر صاف رکھنا چاہئے تاکہ آدمی اچھا نظر آئے اور دوسرے شخص کو دیکھنے سے تکدر نہ ہو۔

دوسری وجہ: تجربہ شاہد ہے کہ اطراف دھونے سے اور چہرے اور سر پر پانی چھڑکنے سے نیند بالکل اڑ جاتی ہے اور گہری بے ہوشی بھی دور ہو جاتی ہے۔ اس بات کو ہر شخص اپنے ذاتی علم و تجربہ سے جان سکتا ہے اور طب کی کتابوں کے مطالعہ سے بھی یہ بات آشکارہ ہے۔ اطباء نے بے ہوشی، اسہال کی زیادتی اور فصد کا خون زیادہ بہنے کا علاج تبرید تجویز کیا ہے، جو اطراف پر پانی چھڑکنے سے حاصل ہوتی ہے۔ غرض نماز سے پہلے وضو اسی لئے ضروری ہوا ہے کہ آدمی میں نشاط پیدا ہو جائے، نیند، کسل اور سستی دور ہو جائے اور آدمی توجہ قلبی سے عبادت کرے۔

والطهارة: التي يَخُصُّ أثرُها بادي الرأي، والتي يليق أن يُخاطَب بها جمهورُ الناس، لكثرة وجودِ آلتِها في الأقاليم المعمورة، أعني الماءَ، وانضباط أمرها، والتي هي أوقع الطهارات في نفوس البشر، وكالمسلّمات المشهورة بينهم، مع كونها كالمنصب الطبيعي، تنحصر

بالاستقراء في حصتين: صغرى و كبرى

أما الكبرى: فتعميم البدن بالغسل والدلك، إذ الماء طهور، مزيلٌ للنجاسات، قد سلّمت الطبائع منه ذلك، فهي آلة صالحة لتنبه النفس على خلّة الطهارة.

ورب إنسان شرب الخمر وثمَل، وغلب السكرُ على طبيعته، ثم فرط منه شيئٌ من قتل بغير حق، أو إضاعة مالٍ في غاية النفاسة، فتنبهت نفسُه دفعة، وعقلت، وكُشفت عنها الغفلة.

ورب إنسان ضعيف لايستطيع أن ينهض، ولا أن يباشر شيئا، فاتفقت واقعةٌ تنبّهُ النفس تنبيها قويا: من عروض غضب، أو حميّة، أو منافسة، فعالج معالجة شديدة، وسفك سفكا بليغا

وبالجملة: فللنفس انتقال دفعي، وتنبّهٌ من خصلة إلى خصلة: هو العمدة في المعالجات النفسانية؛ وإنما يحصل هذا التنبّهُ بما ذُكر في صميم طبائعهم وجذر نفوسهم: أنه طهارة بليغة، وما ذلك إلا الماء.

والصغرى: الاقتصار على غسل الأطراف، وذلك: لأنها مواضعُ جرت العادة في الأقاليم الصالحة بانكشافها وخروجها من اللباس. لمذهب طبيعي. إليه وقعت الإشارة حيث نهي النبي صلى الله عليه وسلم عن اشتمال الصمّاء، فلا يتحقق حرجٌ في غسلها، وليس ذلك في سائر الأعضاء.

وأيضا: جرت العادة في أهل الحضر بتنظيفها كلَّ يوم، وعند الدخول على الملوك وأشباههم، وعند قصد الأعمال النظيفة.

وفقهُ ذلك: أنها ظاهرة تتسارعُ إليها الأوساخ، وهي التي تُرى وتُبصر عند ملاقاة الناس بعضهم بعضا.

وأيضا: التجربة شاهدةٌ بأن غسل الأطراف، ورش الماء على الوجه والرأس ينبّهُ النفس من نحو النوم والغشي المُثقل تنبيها قويا، وليرجع الإنسان في ذلك إلى ما عنده من التجربة والعلم، وإلى ما أمر به الأطباءُ في تدبير من غُشي عليه، أو أفرط به الإسهالُ والفصدُ.

ترجمہ: اور وہ پاکی جس کا اثر سرسری نظر میں محسوس کیا جاتا ہے اور جو اس لائق ہے کہ تمام لوگوں کو اس کے احکام دیئے جائیں وہ پانی ہے کیونکہ مختلف اقوام میں آلہ طہارت کے بکثرت پائے جانے کی وجہ سے (آلہ طہارت سے) میری مراد پانی ہے اور طہارت کے معاملہ کے منضبط ہونے کی وجہ سے (یعنی اس کا معاملہ عام لوگوں کے قابو میں آ سکتا ہے اور وہ بہ سہولت اس پر عمل کر سکتے ہیں) اور وہ طہارت جو انسانوں کے نفوس میں تمام طہارتوں سے زیادہ موثر ہے، اور لوگوں کے

درمیان مسلمات مشہورہ کی طرح (رائج) ہے، اس کے فطری طریقہ جیسا ہونے کی وجہ سے (یعنی یہ امر صورت نوعیہ میں تو چھپایا نہیں گیا، مگر کثرت مزاولت سے فطری امر جیسا ہو گیا ہے) استقراء سے ایسی طہارت دو جنسوں میں منحصر ہے ایک صغریٰ دوسری کبریٰ۔

رہی کبریٰ: تو وہ سارے بدن کو دھونا اور ملنا ہے، کیونکہ پانی پاک صاف کرنے والا اور نجاستوں کو زائل کرنے والا ہے۔ تمام طبیعتوں نے پانی کی یہ تاثیر مان لی ہے۔ پس طہارت کبریٰ بہترین ذریعہ ہے نفس کو خصلت طہارت سے آگاہ کرنے کا۔

(سوال مقدر کا جواب) اور بعض آدمی شراب پیتا ہے اور مدہوش ہو جاتا ہے اور نشہ اس کی طبیعت پر چھا جاتا ہے پھر اس سے کوئی بڑی کوتاہی سرزد ہو جاتی ہے یعنی کسی کو ناحق قتل کرتا ہے یا کوئی نہایت درجہ قیمتی مال ضائع کرتا ہے تو گویا یک اس کا نفس چوکنا ہو جاتا ہے اور وہ بات سمجھنے لگتا ہے اور اس کا نشہ ہرن ہو جاتا ہے ـــــ اور بعض انسان ضعیف ہوتا ہے، اٹھنے کی بھی اس میں سکت نہیں ہوتی اور نہ کسی کام کے کرنے کی اس میں طاقت ہوتی ہے پس اتفاقاً کوئی ایسا واقعہ پیش آتا ہے جو اس کے نفس کو بہت ہی زیادہ جھنجوڑ دیتا ہے یعنی غصہ کا پیش آنا، یا حمیت یا ساخت، پس وہ بڑے سے بڑا کارنامہ کر گذرتا ہے اور دل دہلانے والی خونریزی کر ڈالتا ہے۔

اور ماحصل کلام: پس نفس کے لئے دفعی (فوری) انتقال ہے اور ایک خصلت سے دوسری خصلت کی طرف چوکنا ہونا ہے۔ (اور) وہ (فوری انتقال) معالجات نفسانیہ (اصلاح نفس) میں نہایت قابل اعتماد چیز ہے ـــــ اور یہ آگہی اسی چیز سے حاصل ہو سکتی ہے جو لوگوں کی طبیعتوں کی اصل میں اور ان کے نفوس کی جڑ میں گڑی ہوئی ہو کہ وہ انتہائی درجہ کی طہورت ہے اور اس قسم کی چیز پانی ہی ہے۔

اور طہارت صغریٰ: اطراف کے دھونے پر اکتفا کرتا ہے اور یہ اس لئے ہے کہ اطراف ایسی جگہیں ہیں جن کے کھلا رہنے کی اور لباس سے باہر رہنے کی قابل رہائش ملکوں میں عادت چل رہی ہے فطری راہ ہونے کی وجہ سے (اور) اسی کی طرف اشارہ آیا ہے چنانچہ نبی کریم ﷺ نے اس طرح چادر اوڑھنے سے منع کیا ہے کہ ہاتھ اندر دب جائیں (رواہ مسلم، مشکوۃ، کتاب اللباس، حدیث نمبر ۴۳۱۵) پس کوئی حرج متحقق نہیں ہے اطراف کے دھونے میں اور یہ بات دیگر اعضاء میں ممکن ہے۔

اور نیز: شہریوں میں ان کو پاک صاف کرنے کی عادت چل رہی ہے روزانہ اور بادشاہوں اور ان کے مانند لوگوں کے پاس جاتے وقت اور ستھرے کاموں کا ارادہ کرتے وقت۔

اور اس کی گہری حکمت: یہ ہے کہ اطراف کھلے رہتے ہیں ان کی طرف میل کچیل جلدی پہنچتا ہے اور اطراف ہی وہ اعضاء ہیں جو دیکھے جاتے ہیں اور نظر آتے ہیں لوگوں کے ایک دوسرے سے ملاقات کے وقت۔

اور نیز تجربہ شاہد ہے کہ اطراف کا دھونا اور چہرے اور سر پر پانی کا چھڑکنا غشی کو ختم کرتا ہے۔ نیند اور گہری بیہوشی جیسی چیزوں سے بہت زیادہ چوکنا کرتا اور چاہئے کہ انسان لوگ اس سلسلہ میں اس علم و تجربہ کی طرف جو ان کو حاصل ہے اور اس بات کی طرف جس کا انبیاء نے حکم دیا ہے کہ اس شخص کے خارج میں جس پر بے ہوشی طاری ہوئی ہو یا اس کو بہت زیادہ اسہال ہونے لگے ہوں یا رگ پر نشتر لگانے سے بہت زیادہ خون آنے لگا ہو۔

☆ ☆ ☆

طہارت کے فوائد

جس طرح بعض جڑی بوٹیوں میں بعض ادویہ میں اور بعض کائناتی چیزوں میں متعدد اوصاف و خواص ہوتے ہیں، اسی طرح اللہ تعالیٰ کے بعض احکام میں متعدد اسرار و رموز ہیں۔ طہارت میں بھی گوناگوں فوائد ہیں۔ ذیل میں ان میں سے چند فائدے ذکر کئے جاتے ہیں:

پہلا فائدہ: طہارت ایک فطری امر ہے۔ کیونکہ وہ ارتفاق ثانی یعنی ترقی یافتہ تمدن (شہری تمدن) کا ایک اہم مسئلہ ہے۔ تفصیل مبحث سوم کے باب سوم میں گذر چکی ہے۔ اور ارتفاقات کی رعایت پر کمال انسانی کا دار و مدار ہے۔ نیز مسدود انسانی فطرت کا جزء بن چکے ہیں۔ اس لئے ارتفاقات کے دیگر امور کی طرح طہارت کا بھی التزام ضروری ہے۔

دوسرا فائدہ: طہارت ملائکہ سے قریب کرنے والی اور شیاطین سے دور کرنے والی ایک صفت ہے اور انسان کی معراج کمال یہ ہے کہ وہ ملائکہ میں شامل ہو جائے اور شیاطین سے دور ہو جائے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ملائکہ پاک مخلوق ہیں وہ پاکی کا اہتمام کرنے والوں کو پسند کرتے ہیں۔ کند ہم جنس با ہم جنس پرواز!

تیسرا فائدہ: طہارت عذاب قبر کو ہٹاتی ہے حدیث شریف میں ہے کہ: "پیشاب سے بچو، کیونکہ قبر کا عذاب بیشتر اس کی وجہ سے ہوتا ہے" (یہ حدیث صحیح ہے، اس کی تخریج نصب الرایہ ۱:۱۲۸ میں ہے)

چوتھا فائدہ: صفت احسان پیدا کرنے میں طہارت کا بڑا دخل ہے۔ احسان کے معنی کی پوری وضاحت تو "ابواب الاحسان" میں آئے گی اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اعمال کی اصل غرض تک پہنچنے کا نام "احسان" ہے اور اعمال سے اصل مطلوب تقرب الٰہی ہے جب آدمی بہ نیت اطاعت ظاہری و باطنی نظافت کا اہتمام کرتا ہے تو وہ خدا کا محبوب بن جاتا ہے یعنی اس کو قرب خاص حاصل ہو جاتا ہے۔ سورۃ التوبہ آیت ۱۰۸ میں ہے: "اور اللہ تعالیٰ خوب پاک ہونے والوں کو پسند فرماتے ہیں" اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ طہارت کے اہتمام کی وجہ سے محبوبیت حاصل ہوتی ہے، و پس جس صفت سے انسان کو خدا تعالیٰ کا محبوب بننے کا شرف حاصل ہو، اس صفت کے ساتھ متصف رہنا لازم ہے۔

پانچواں فائدہ: طہارت (وضوء وغسل) کی وجہ سے نیکیاں لکھی جاتی ہیں اور گناہ مٹائے جاتے ہیں۔ متعدد احادیث میں اس کا تذکرہ آیا ہے کیونکہ جب صفت طہارت نفس میں راسخ ہوجاتی ہے یعنی ملکہ اور فطرت ثانیہ بن جاتی ہے تو نفس میں ملکوتی انوار کا ایک بڑا حصہ ٹھہر جاتا ہے اور متقرر ہوجاتا ہے یہی نیکیاں ہیں اور بہیمیت کی تاریکی کا بڑا حصہ مغلوب ہوجاتا ہے یعنی دب جاتا ہے، یہی گناہوں کا مٹنا ہے۔

چھٹا فائدہ: نیک بختی حاصل کرنے میں جو تین چیزیں سد راہ بنتی ہیں ان میں سے ایک ''ریت رواج کا حجاب'' ہے، جس کا دوسرا نام ''حجاب دنیا'' ہے۔ مبحث رابع کے باب ششم میں اس کی تفصیل گذر چکی ہے جب طہارت کا باقاعدہ اہتمام کیا جاتا ہے اور اس کو ایک مسلمہ طریقہ بنالیا جاتا ہے تو وہ دنیا میں انہماک سے بچاتی ہے۔ وضو کو جو مؤمن کا ہتھیار کہا گیا ہے اس کا یہی مطلب ہے کہ وہ دنیا میں انہماک سے بچاتا ہے، اور تذکر کا ذریعہ بنتا ہے۔

ساتواں فائدہ: نیک بختی حاصل کرنے کے حجابات ثلاثہ میں سے ایک جہالت وبدعقیدگی کا حجاب بھی ہے۔ اس کی تفصیل بھی مبحث چہارم کے باب ششم میں گذر چکی ہے۔ جب طہارت میں تین باتیں پائی جاتی ہیں تو وہ سوء معرفت یعنی اللہ کے بارے میں جہالت اور بدعقیدگی کا علاج بنتی ہے: ایک: پورے اہتمام سے وضوء وغسل کرنا جس طرح لوگ دربارشاہی میں جب کسی غرض سے جاتے ہیں تو پورے اہتمام سے غسل کرتے ہیں یا ہاتھ، منہ اور پاؤں دھوتے ہیں اور لباس درست کرتے ہیں اور خوب پاک صاف ہوکر اور بن سنور کر جاتے ہیں، اسی طرح عبادات کے لئے آدمی پورے اہتمام سے طہارت حاصل کرے۔ دوم: طہارت حاصل کرتے وقت شروع سے آخر تک نیت طہارت کا مستحضر رہنا۔ سوم: طہارت کے اذکار کا اہتمام کرنا۔ اگر یہ تینوں باتیں طہارت میں ملحوظ رہیں تو اس سے اللہ تعالیٰ کی صحیح معرفت حاصل ہوگی اور عظمت واعتقاد پیدا ہوگا۔

آٹھواں فائدہ: نیک بختی حاصل کرنے کے موانعات ثلاثہ میں سے ایک حجاب طبع یعنی نفس کا حجاب بھی ہے اس کی تفصیل بھی بحوالہ بالا مقام میں گذر چکی ہے طہارت کے اہتمام سے طبیعت عقل کے تابع ہوجاتی ہے یعنی حجاب نفس دور ہوتا ہے کیونکہ جب انسان یہ بات اچھی طرح سمجھ لیتا ہے کہ طہارت انسان کا کمال ہے اور وہ اعضاء کو اس عقیدہ کے مطابق مشقت میں ڈالتا ہے یعنی وضوء وغسل کرتا ہے اور اس میں کوئی غرض شامل نہیں ہوتی ہے مثلاً کھیت سے آیا ہے۔ اعضاء گرد سے اٹے پڑے ہیں اس لئے دھوتا ہے۔ یہ بات نہ ہو، بلکہ کمال انسانی کی تحصیل کی غرض سے طہارت حاصل کرے اور زندگی میں یہ عمل مسلسل جاری رکھے، تو یہ چیز تمرین (Exercise) ہوجاتی ہے نفس کو عقل کے تابع کرنے کی۔ اور اس عمل سے نفس قابو میں آجاتا ہے۔

والطهارة : بابٌ من أبواب الإرتفاق الثاني، الذي يتوقف كمالُ الإنسان عليه، وصار من جبلتهم؛ وفيها قُرب من الملائكة، وبُعْدٌ من الشيطان، وتَدْفَعُ عذاب القبر، وهو قوله صلى الله

عليه وسلم: ﴿استنزهوا من البول، فإن عامة عذاب القبر منه﴾؛ ولها مدخل عظيم في قبول النفس لون الإحسان، وهو قوله تعالى: ﴿وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ﴾؛ وإذا استقرت في النفس، وتمكنت منها، تقررت فيها شعبة من نور الملكية، وانقهرت شعبة من ظلمة البهيمية، وهو معنى كتابة الحسنات وتكفير الخطايا؛ وإذا جُعلت رسمًا نفعت من غوائل الرسوم؛ وإذا حافظ صاحبها على ما فيها من هيئات يؤاخذ الناسُ بها أنفسهم عند الدخول على الملوك، وعلى النية الْمُتَمَضِّحة، والأذكار، نفعت من سوء المعرفة؛ وإذا عقل الإنسانُ: أن هذه كماله، فأتْأب جوارحَهُ حسبما عقل، من غير داعية حسية، وأكثرَ من ذلك، كانت تمرينًا على انقياد الطبيعة للعقل؛ والله أعلم.

ترجمہ: (۱) اور طہارت اُن ارتفاقِ ثانی کے مسائل میں سے ایک اہم مسئلہ ہے جس پر کمال انسانی کا دارومدار ہے اور جو لوگوں کی فطرت میں شامل ہو گیا ہے (۲) اور طہارت ملائکہ کا قرب ہے اور شیطان سے دوری ہے (۳) اور طہارت عذابِ قبر کو ہٹاتی ہے اور وہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ: "پیشاب سے بچو، پس بیشک قبر کا عذاب عام طور پر اسی کی وجہ سے ہوتا ہے" (۴) اور طہارت کا بڑا دخل ہے نفس کے احسان کا رنگ قبول کرنے میں۔ اور وہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "اور اللہ تعالیٰ خوب پاک رہنے والوں کو دوست رکھتے ہیں" (۵) اور جب طہارت نفس میں راسخ ہو جاتی ہے اور وہ نفس میں جم جاتی ہے تو نفس میں ملکیت کے نور کا ایک حصہ متقرر (ثابت) ہو جاتا ہے اور بہیمیت کی تاریکی کا بڑا حصہ مغلوب ہو جاتا ہے، یہی نیکیاں لکھنے اور گناہوں کے مٹانے کا مطلب ہے (۶) اور جب طہارت کو ایک ریت بنایا جاتا ہے تو وہ رسوم کی آفتوں میں مفید ثابت ہوتی ہے (۷) اور جب صاحبِ طہارت حفاظت کرتا ہے اُن ہیئتوں کی جو طہارت میں ہیں، جن کا لوگ اپنے آپ کو پابند بناتے ہیں جب وہ بادشاہوں کے پاس جاتے ہیں اور اس نیت کی حفاظت کرتا ہے جو کُل طہارت کے ساتھ ساتھ رہنے والی ہے اور اذکارِ طہارت کی حفاظت کرتا ہے، تو طہارت سوءِ معرفت (بدعقیدگی و جہالت) میں مفید ثابت ہوتی ہے (۸) اور جب انسان سمجھ لیتا ہے کہ یہ طہارت اس کا کمال ہے، پھر وہ اپنے سمجھنے کے مطابق اپنے اعضاء کو اسی کام میں لگائے رکھتا ہے، بغیر کسی محسوس داعیہ کے اور وہ بہ کثرت عمل طہارت کرتا ہے تو یہ تمرین ہو جاتی ہے طبیعت کو عقل کے تابع کرنے کی باقی اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں۔

لغات: اِنْقَهَر: مغلوب ہونا ...... غائلة: مصیبت، آفت، مہلک شئی ...... الْمُتَمَضِّحة (اسم فاعل) ساتھ ساتھ رہنے والی۔ اِسْتَصْحَبَہ: ساتھی بنانا، ساتھ ہونا ...... اَدْأَبَہ: تھکانا، لگاتار کوشش کرنا۔

تصحیح: من نور الملكية اصل میں من نور الملائكة تھا، تصحیح مخطوطہ کراچی سے کی ہے۔

☆　　☆　　☆

باب — ۹

نماز کے اسرار کا بیان

انواعِ بِر (نیکی کے کاموں) میں نماز کا بھی اہم مقام ہے۔ وہ دین کا ستون ہے اور با جماعت نماز تو شعائرِ دین میں سے ہے۔ طہارت کی حکمتوں سے فارغ ہو کر اب نماز کی حکمتیں بیان فرماتے ہیں۔

نماز کے تعلق سے انسانوں کی تین قسمیں

طہارت کی طرح نماز کے تعلق سے بھی انسانوں کی تین قسمیں یا درجے ہیں:

پہلا درجہ: توفیق خداوندی بعض انسانوں کو اپنی مقدس بارگاہ کی طرف بلند کرتی ہے یعنی بغیر کسی سبب واستحقاق کے ان کو رفعت وبلندی سے سرفراز کرتی ہے۔ اس وقت ان کو پوری طرح وصلِ خداوندی نصیب ہوتا ہے اور بارگاہِ عالی سے ان پر تجلیات برسنی شروع ہوتی ہیں اور ان کے نفوس پر انوارِ الٰہی چھا جاتے ہیں تو وہ ایسی چیزوں کا مشاہدہ کرتے ہیں جن کے بیان سے زبان وقلم قاصر ہے۔

پھر جب وہ حالت زائل ہو جاتی ہے اور آدمی اپنی سابق حالت کی طرف لوٹ آتا ہے تو پہلی حالت کے فوت ہو جانے سے آدمی کا چین ختم ہو جاتا ہے اور وہ سخت بے قرار ہوتا ہے تو وہ اپنی بے قراری کا مداوا ایک ایسی حالت سے کرتا ہے جو مختلف احوال میں اس برتر حالت سے اقرب ہوتی ہے یعنی نفس خالق جل مجدہ کی معرفت میں مستغرق ہو جائے اور آدمی اس حالت کو دوام بخشا کر اس برتر حالت کا کچھ حصہ حاصل کرے جو اس کے ہاتھ سے فوت ہو گئی ہے۔ اسی حالت کا نام نماز ہے۔ نماز تین چیزوں کا مجموعہ ہے: ایسے اقوال وافعال کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی تعظیم بجا لانا، خشوع وخضوع کا اظہار کرنا اور مناجات وسرگوشی کرنا جو خاص اسی مقصد کے لئے موضوع ہیں۔ الغرض یہ حضرات وصالِ حبیب کی دولت ہاتھ سے نکل جاتی ہے تو خیالِ حبیب کو اس کا قائم مقام بنا لیتے ہیں اور ان کی آنکھوں کو ٹھنڈک نماز میں ملتی ہے۔

دوسرا درجہ: اس شخص کا ہے جس کو مخبرِ صادق یعنی انبیاء اس حالت کی طرف دعوت دیتے ہیں اور اس حالت کو اختیار کرنے کی ترغیب دیتے ہیں تو وہ شخص شہادتِ قلبی سے مخبرِ صادق کی یہ دعوت مان لیتا ہے یعنی اس کا دل گواہی دیتا ہے کہ بتانے والا اس کے لئے مفید بات بتا رہا ہے اس لئے وہ عمل شروع کر دیتا ہے اور وہ سب باتیں برحق پاتا ہے جن کا اس سے وعدہ کیا گیا ہے اور وہ رفتہ رفتہ ترقی کر کے وہ بات پالیتا ہے جس کی وہ امید باندھے ہوئے ہے یعنی بالآخر اس کو بھی وصلِ حبیب کی دولت میسر آجاتی ہے۔

تیسرا درجہ: اس شخص کا ہے جو نماز کے کچھ بھی فوائد نہیں جانتا مگر چونکہ وہ مومن ہے اس لئے دین کے تقاضوں کی

تحمیل کے طور پر نماز پڑھتا رہتا ہے تو وہ بھی بالآخر محروم نہیں رہتا، جیسے باپ اولاد کو، ان کی ناگواری کے باوجود مفید کاریگریاں سیکھنے پر مجبور کرتا ہے تو بالآخر وہ کامیاب ہو جاتے ہیں۔

﴿باب: أسرار الصلاة﴾

اعلم: أن الإنسان قد يختطف إلى حظيرة القدس، فيلتصق بجناب الله تعالى أتمّ لصوق، ويتنزل عليه من هنالك التجليات المقدسة، فتغلب على النفس، ويشاهد هنالك ما لا يقدر اللسان على وصفه، ثم يُرَدُّ إلى حيث كان، فلا يقرُّ به القرار، فيعالج نفسه بحالة هي أقرب الحالات السفلية: من استغراق النفس في معرفة بارئها؛ ويتخذها شركًا لاقتناص ما فاته منها؛ وتلك الحالة هي التعظيم والخضوع والمناجاة في ضمن أفعال وأقوال بُنيت لذلك.

ويتلوه: رجل سمع المخبرَ الصادق يدعوه إلى هذه الحالة، ويرغّب فيها، فصدّقه بشهادة قلبه، فعمل، ووجد ما وعده حقا، وارتقى إلى ما يرجوه.

ثم يتلوه: رجلٌ ألجأه الأنبياء إلى الصلوات وهو لا يعلم، بمنزلة الوالد يُجبِر أولاده على تعليم الصناعات النافعة وهم كارهون.

ترجمہ: نماز کے اسرار کا بیان: جان لیں کہ انسان کبھی مقدس بارگاہ کی طرف اچک لیا جاتا ہے پس وہ پوری طرح سے اللہ کی بارگاہ کے ساتھ چپک جاتا ہے اور اس پر وہاں سے تجلیات مقدسہ نازل ہوتی ہیں، پس وہ نفس پر چھا جاتی ہیں اور وہاں انسان ایسی چیزوں کا مشاہدہ کرتا ہے جن کے بیان سے زبان قاصر ہے، پھر وہ اس جگہ کی طرف لوٹا دیا جاتا ہے جہاں وہ تھا۔ پس اس کو اس مقام میں سکون و قرار نہیں رہتا پس وہ اپنا علاج کرتا ہے ایک ایسی حالت سے جو نچلے احوال میں سے اس برتر حالت سے قریب تر ہوتی ہے یعنی نفس کا اپنے خالق جل مجدہ کو پہچاننے میں ڈوب جانا اور وہ شخص اس (سفلی حالت) کو جال بناتا ہے اس چیز کو شکار کرنے کیلئے جو اس (برتر) حالت میں سے اسکے ہاتھ سے نکل گئی ہے اور وہ (سفلی) حالت ایسے اقوال و افعال کے ضمن میں (خالق کی) تعظیم و خضوع و مناجات ہے جو اسی مقصد کے لئے بنائے گئے ہیں۔

اور اس سے متصل وہ شخص ہے جس نے مخبر صادق سے سنا جو اس کو اس حالت کی طرف بلاتا ہے اور اسکی ترغیب دیتا ہے، پس وہ شہادت قلبی سے اس مخبر کی تصدیق کرتا ہے اور اس کے بتلائے ہوئے طریقہ پر عمل کرتا ہے اور وہ اس چیز کو برحق پاتا ہے جس کا اس مخبر نے (نماز پر) وعدہ کیا ہے اور وہ اس نماز کے ذریعہ اس چیز کی طرف ترقی کرتا ہے جس کی اس نے امید باندھی ہے۔

پھر اس کے بعد اس شخص کا مقام ہے جسے انبیاء نے نمازوں کی طرف مجبور کیا ہے درانحالیکہ وہ (نماز کے فوائد) نہیں جانتا ہے، جس طرح باپ اپنی اولاد کو روکتا ہے مفید کاریگریوں کے سیکھنے پر، درانحالیکہ بچے اس کو ناپسند کرتے ہیں۔

☆ ☆ ☆

نماز کا ایک اہم فائدہ

نماز کا ایک اہم فائدہ دنیا میں یہ بھی ہے کہ اس کے ذریعہ پریشانیوں کا ازالہ کیا جاسکتا ہے اور اس کے ذریعہ نعمتیں حاصل کی جاسکتی ہیں مثلاً جب کوئی بڑی پریشانی لاحق ہو، جیسے قحط سالی، آندھی یا اولے، بارش کا طوفان آئے تو نماز سے مدد حاصل کرنی چاہئے۔ ایسے وقت میں نماز سرمایۂ امن بن جاتی ہے۔ کیونکہ نماز ایسے اقوال و افعال کا مجموعہ ہے جو آخری درجہ کی تعظیم ہیں اور نماز میں اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ تام ہوتی ہے جو درحقیقت دعا کی روح ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے: ﴿وَاسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ﴾ (البقرہ ۱۵۳) یعنی صبر اور نماز سے سہارا حاصل کرو، اللہ تعالیٰ کی مدد صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے یعنی نماز پڑھنے والوں کے ساتھ تو بدرجۂ اولیٰ ہوگی اور حدیث شریف میں ہے: کان النبی ﷺ إذا حزبه أمر صلی (رواہ ابوداؤد) یعنی جب کوئی اہم بات پیش آتی تو آپ ﷺ نماز میں مشغول ہو جاتے (مشکوٰۃ باب صلوٰۃ الخوف حدیث نمبر ۱۳۲۵) صلوٰۃ الحاجۃ، صلوٰۃ التوبہ، صلوٰۃ الاستخارہ اور صلوٰۃ الاستسقاء کی مشروعیت کی وجہ بھی یہی ہے۔ غرض باب کے آخر میں جو نماز کے فوائد آرہے ہیں وہ تو دینی ہیں، یہ بات ان کے علاوہ ایک اہم فائدہ ہے یعنی نماز بہت سی دنیوی الجھنوں کا حل ہے۔

> **وربما يسأل الإنسانُ من ربه دفع بلاءٍ أو ظهور نعمةٍ، فيكون الأقرب حينئذ الاستغراق في أفعال وأقوال تعظيمية، ليؤثر همته التي هي روح السؤال؛ وذلك ما سُنَّ من صلاة الاستسقاء**

ترجمہ: اور کبھی انسان اپنے رب سے درخواست کرتا ہے کسی مصیبت کے دفع ہونے کی یا کسی نعمت کے ظاہر ہونے کی، تو اس وقت قریب تر چیز تعظیمی اقوال و افعال میں ڈوب جانا ہے، تاکہ اس کی کامل توجہ، جو کہ روح سوال ہے، اثر انداز ہو، اور یہی وہ نماز استسقاء ہے جو مشروع کی گئی ہے (حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے مطلب خیز ترجمہ کیا ہے کہ جب آدمی اپنے پروردگار سے کسی مصیبت کے رفع ہونے یا کسی نعمت کے ملنے کی درخواست کرتا ہے، اس وقت زیادہ مناسب یہی ہوتا ہے کہ تعظیمی افعال اور اقوال میں مستغرق ہو جائے، تاکہ اس کی ہمت (کامل توجہ) کا جو کہ اس درخواست کی روح ہے پورا اثر پڑ سکے (احکام اسلام عقل کی نظر میں صفحہ ۸۲)

☆ ☆ ☆

نماز کی ہیئت ترکیبی کا بیان

نماز میں بنیادی باتیں تین ہیں:

۱- جب بندہ اللہ کی عظمت و جلال کا ملاحظہ کرے تو اس کے دل میں خشوع و خضوع پیدا ہو یعنی جب بندہ نماز کے لئے کھڑا ہو تو اس کا دل عاجزی اور نیازمندی سے بھرا ہوا ہو، کیونکہ تخشع، تضرع اور تمسکن ہی نماز کی حقیقت ہے (دیکھئے ترمذی ۱:۵۱)

۲- زبان اللہ تعالیٰ کی عظمت کو اور دل کے خشوع وخضوع کو بہترین الفاظ سے تعبیر کرے۔ قراءت فاتحہ اور اذکار وتسبیحات کو نماز میں اسی مقصد سے داخل کیا ہے۔

۳- اپنے اعضاء کو اس خشوع کے مطابق مہذب بنایا جائے یعنی باادب قرار دے، تو جب کی پوری رعایت کے ساتھ رکوع وسجود کرے۔

دلیل: کیونکہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں اور احسانات کا شکر یا انہیں تین طریقوں سے ادا کیا جاسکتا ہے۔ ایک شاعر اپنے منعم مجازی کی مدح سرائی کرتے ہوئے کہتا ہے:

تمہاری نعمتوں نے میری تین چیزیں تمہارے حوالے کردیں

میرا ہاتھ، میری زبان اور سینہ میں پوشیدہ دل

یعنی اعضاء نیاز مندو جاں نثار ہیں، زبان ثناخواں ہے اور دل آپ کی نعمتوں کا قدرداں ہے۔ جب منعم مجازی کے سامنے ممنون احسان کا یہ حال ہے تو منعم حقیقی کے سامنے بندہ کا یہ حال کیوں نہ ہو!

تعظیمی افعال کا بیان: نماز میں جو تین چیزیں ہیں ان میں سے پہلی دو تو واضح ہیں، ان کی تفصیل کی ضرورت نہیں۔ البتہ تیسری چیز کی قدرے تفصیل ضروری ہے۔ جاننا چاہئے کہ افعال تعظیم کے درجہ بدرجہ تین ہیں: قیام، رکوع اور سجدہ۔ سب سے پہلے آدمی کو نہ دنیاوی باتیں کرتے ہوئے باادب کھڑا ہونا چاہئے اور اللہ تعالیٰ کی طرف منہ کرکے پوری طرح متوجہ ہونا چاہئے۔ تعظیم کا یہ سب سے پہلا درجہ ہے۔ پھر اس کے بعد کا درجہ یہ ہے کہ آدمی اپنی ذلت وپستی کا احساس کرے اور اللہ تعالیٰ کی عزت وبرتری کا تصور کرے اور اللہ تعالیٰ کے سامنے سرنگوں ہوجائے۔ یہ فعل تعظیم میں پہلے فعل سے بڑھا ہوا ہے۔ کیونکہ تمام انسانوں اور جانوروں کی فطرت میں یہ بات داخل ہے کہ گردن اکڑانا تکبر کی نشانی ہے اور گردن جھکانا نیازمندی اور عاجزی کی علامت ہے۔ اللہ پاک کا ارشاد ہے:

إِنْ نَشَأْ نُنَزِّلْ عَلَيْهِمْ مِنَ السَّمَاءِ آيَةً فَظَلَّتْ أَعْنَاقُهُمْ لَهَا خَاضِعِينَ (الشعراء ۴) اگر ہم چاہیں تو ان (منکرین) پر آسمان سے ایک بڑی نشانی نازل کردیں، پس ان کی گردنیں اس نشانی کے سامنے پست ہوجائیں

اس آیت سے معلوم ہوا کہ گردن کا جھک جانا ہار ماننے کی علامت ہے۔ اور فعل تعظیمی کا آخری درجہ یہ ہے کہ آدمی اپنا چہرہ اللہ تعالیٰ کے سامنے خاک آلود کرے، جو کہ افضل ترین عضو ہے، اور جس میں تمام حواس جمع ہیں، جنہیں دیکھنے، سننے، چکھنے اور چھونے کی صلاحیتوں کا چہرہ منصب ہے، ایسے شرف عضو کو مالک کی تعظیم کے لئے زمین پر رکھ دینا تعظیم کا آخری درجہ ہے۔

غرض تعظیم کی یہ تینوں صورتیں تمام انسانوں میں جانی پہچانی ہوئی ہیں۔ لوگ اپنی عبادتوں میں بھی ان کا استعمال کرتے ہیں اور جب بادشاہوں اور امراء کے سامنے جاتے ہیں تو بھی یہی طریقے اختیار کرتے ہیں، اس لئے نماز میں یہ تینوں باتیں اکٹھا کی گئی ہیں۔ اور ان میں ترتیب اس طرح رکھی گئی ہے کہ ادنیٰ سے اعلیٰ کی طرف ترقی ہو، پہلے قیام ہو،

پھر رکوع، پھر سجدہ کیا جائے تو: دوم: بتدریج خشوع وخضوع اور اپنی ذلت کا احساس بڑھتا جائے۔ اگر نماز میں صرف آخری درجہ کی تعظیم یعنی سجدہ رکھا جاتا یا اعلیٰ سے ادنیٰ کی طرف اترا جاتا تو ترقی کا یہ فائدہ حاصل نہ ہوتا۔

فائدہ: نماز کے افعال میں قعدہ بھی ہے مگر اس کا تذکرہ اس لئے نہیں کیا کہ وہ اصالۃً تعظیم نہیں ہے، کیونکہ وہ ہر رکعت کے آخر میں مشروع نہیں ہے، بلکہ ہر رکعت ایک مستقل نماز ہے، اور دو رکعتیں شفع (دوگانہ یعنی دونی جوڑی) ہے۔ تفصیل حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کی توثیق الکلام میں ہے، جس کی میں نے شرح بنام: "کیا مقتدی پر فاتحہ واجب ہے؟" لکھی ہے اس کو ملاحظہ فرمائیں۔

قعدہ نماز سے بسہولت نکلنے کے لئے رکھا گیا ہے، کیونکہ نماز کے آخری عمل سجدے میں نماز سے نکلنے میں دشواری ہے، اس لئے آدمی سجدے سے فارغ ہو کر باطمینان بیٹھ جاتا ہے اور توثیقِ عبادت پر مدد کرتا ہے، پھر معظم عبادت پر درود بھیجتا ہے، پھر اپنے لئے دعا مانگ کر نماز سے نکل آتا ہے۔

وأصل الصلاة ثلاثة أشياء: أن يخضع القلبُ عند ملاحظة جلال الله وعظمته، ويُعبِّرَ اللسانُ عن تلك العظمة وذلك الخضوع أفصحَ عبارةٍ، وأن يؤدِّبَ الجوارحَ حسب ذلك الخضوع؛ قال القائل:

أفادتكم النعماءُ مني ثلاثةً　　　يدي ولساني والضميرَ المُحَجَّبا

ومن الأعمال التعظيمية: أن يقوم بين يديه مناجيا، ويُقبل عليه مواجِهًا؛ وأشدُّ من ذلك: أن يستشعر ذُلَّه وعزةَ ربه، فيُنكِّس رأسه، إذ من الأمر المجبول في قاطبة البشر والبهائم: أن رفع العنق آيةُ التيه والتكبر، وتنكيسه آيةُ الخضوع والإخبات، وهو قوله تعالى: ﴿فَظَلَّتْ أَعْنَاقُهُمْ لَهَا خَاضِعِينَ﴾؛ وأشدُّ من ذلك: أن يُعفِّر وجهَه الذي هو أشرف أعضائه ومَجْمَعُ حواسِّه بين يديه.

فتلك التعظيمات الثلاث الفعلية شائعةٌ في طوائف البشر، لا يزالون يفعلونها في صلواتهم، وعند ملوكهم وأمرائهم؛ وأحسنُ الصلاة: ما كان جامعًا بين الأوضاع الثلاثة، مترقِّيا من الأدنى إلى الأعلى، ليحصُلَ الترقي في استشعار الخضوع والتذلل؛ وفي الترقي من الفائدة ما ليس في إفراد التعظيم الأقصى، ولا في الانحطاط من الأعلى إلى الأدنى.

ترجمہ: اور نماز میں اصل امور تین ہیں: (ایک) یہ کہ دل عاجزی کرے اللہ تعالیٰ کے جلال وعظمت کا تصور کرکے (دوم) یہ کہ اللہ تعالیٰ کی اس عظمت کو اور اپنی اس خاکساری کو بہترین الفاظ سے تعبیر کرے (سوم) یہ کہ اس خاکساری کی حالت کے موافق اعضاء کو شائستہ بنایا جائے (چنانچہ اس سلسلہ میں) کسی کا شعر ہے:

فائدہ پہنچایا تم کو نعمتوں نے میری تین چیزوں کا　　　میرے ہاتھ کا، میری زبان کا اور پوشیدہ دل کا

اور تعظیمی افعال میں سے یہ ہے کہ خدا کے حضور میں کھڑا ہو، سرگوشی کرتا ہوا اور ان کی طرف متوجہ ہے، چہرہ کھینچے ہوئے — اور اس سے زیادہ یہ بات ہے کہ اپنی خاکساری اور اپنے رب کی برتری کا خیال کرے، پس سرنگوں ہو جائے۔ کیونکہ تمام انسانوں میں اور چوپایوں میں فطری امر میں سے یہ بات ہے کہ گردن اٹھانا غرور اور تکبر کی نشانی ہے اور گردن کو جھکانا خاکساری اور نیاز مندی کی نشانی ہے اور وہی اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”پس ان کی گردنیں عاجزی سے اس نشانی کے سامنے جھک جائیں“ —— اور اس سے زیادہ یہ بات ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے خاک آلود کر دے اپنے اس چہرہ کو جو کہ وہ اس کے اعضاء میں سب سے اشرف ہے اور جو اس کے حواس کا مظہر ہے۔

پس یہ تین فعلی تعظیمات تمام لوگوں میں رائج ہیں، لوگ ہمیشہ ان کو استعمال کرتے ہیں اپنی عبادتوں میں اور اپنے بادشاہوں اور اپنے امراء کے سامنے اور بہترین نماز وہ ہے جو ان تینوں احوال کے درمیان جامع ہو اور ادنیٰ سے اعلیٰ کی طرف ترقی کرنے والی ہو، تاکہ خاکساری کے تصور میں ترقی حاصل ہو اور ترقی میں وہ فائدہ ہے جو تنہا حالت تعظیم میں نہیں ہے اور نہ اعلیٰ سے ادنیٰ کی طرف اترنے میں ہے۔

لغات: تضیع عبادۃ مفعول مطلق ہے یعفّر کا من غیر لفظہ المُعجَب (اسم مفعول) حجبہ: چہرہ بین یدیہ ظرف ہے یعفّر کا۔

☆ ☆ ☆

نماز ہی کیوں ضروری ہے، کیا ذکر و فکر کافی نہیں؟

بعض لوگ اللہ تعالیٰ کی عظمت کے دھیان (استحضار) کو اور اللہ کے دائمی ذکر کو کافی عبادت تصور کرتے ہیں، مگر اللہ کی شریعتوں میں اس کو کافی نہیں سمجھا گیا۔ ادیان سماوی میں بنیادی عبادت نماز کو قرار دیا گیا ہے۔ اگرچہ اللہ کی عظمت کو سوچنا، ہر وقت اللہ کا تصور قائم رکھنا، کسی حال میں بھی اللہ کو نہ بھولنا، بلکہ ہر وقت زبان سے بھی اللہ کا ذکر کرنا ایک بہترین عمل اور بڑی عبادت ہے، مگر وہ بنیادی عبادت نہیں، اللہ سے نزدیک کرنے والا بنیادی عمل نماز ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ صحیح طریقہ پر اللہ کی عظمت میں مسلسل غور و فکر کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ صرف وہی لوگ مضبوطی سے اس پر عمل کر سکتے ہیں جن کی قوت عقلیہ نہایت بلند ہو اور ایسے لوگ بہت کم ہیں۔ عام لوگ اگر یہ طریقہ اپنائیں گے تو وہ پراگندہ خاطر ہو جائیں گے، بلکہ اصل پونجی بھی کھو بیٹھیں گے، نفع حاصل کرنا تو دور کی بات ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جس طرح بیل کسی سہارے ہی سے چھت پر چڑھتی ہے، اسی طرح فکری پرواز بھی کسی پیکر محسوس کے سہارے ہوتی ہے۔ اگر کسی پیکر محسوس کے بغیر سوچنا شروع کیا جائے تو کچھ وقت کے بعد فکر تھک جاتی ہے اور عقل مبہوت ہو کر رہ جاتی ہے۔ یہی فکر کی بلادت ہے۔ غرض اللہ تعالیٰ چونکہ غیر محسوس ذات ہیں اس لئے ان کی عظمت و جلال کو کسی پیکر محسوس کے بغیر مسلسل نہیں سوچا جاسکتا۔

اسی طرح ذکرِ الٰہی کے لئے بھی کوئی محسوس عمل ضروری ہے۔ الفاظ کا سہارا لینا اور ایسے تعظیمی عمل کو وسیلہ بنانا ضروری ہے جس کو آدمی اپنے اعضاء سے کرے اور اس کے آداب کی رعایت میں خود کو مشقت میں ڈالے۔ اس کے بغیر اللہ اللہ کرنا محض لقلقہ (صرف منہ سے بولنے کی آواز) ہے۔ یعنی بے معنی شور و ہنگامہ ہے اور اکثر لوگوں کے حق میں اس کا کوئی فائدہ نہیں۔

اس کے برخلاف نماز ایک معجون مرکب ہے۔ ذکر و فکر بھی اس کے اجزاء میں شامل ہیں۔ کیونکہ نماز کے اجزائے ترکیبی تین ہیں:

۱- اللہ کی عظمت کو سوچنا مگر فکر میں ڈوب کر نہیں، بلکہ ثانوی قصد سے، ضمنی التفات سے اور سرسری توجہ سے اور اس کی فکر ہر ایک کر سکتا ہے۔ یعنی ایسی گہری فکر جس میں ماسوا کا کوئی شعور نہ رہے۔ یہ تو ہر ایک کے بس کی بات نہیں مگر ثانوی، ضمنی اور سرسری وہ فکر جس میں ماسوا سے بے خبری نہ ہو، یہ بات ہر ایک کے لئے ممکن ہے اور نماز میں اللہ کی عظمت کو ایسا ہی سوچنا مطلوب ہے —— ہاں اگر کسی میں شہود و حضور کے سمندر میں غوطہ لگانے کی استعداد ہو تو اس کے لئے کوئی ممانعت نہیں کہ وہ اس میں غوطہ زن ہو، بلکہ یہ فکر تو اور بھی اعلیٰ درجہ کی چیز ہے۔ اس میں نفس کو اعلیٰ درجہ کی آگاہی حاصل ہوتی ہے مگر نماز کے تحقق کے لئے فکر کا یہ درجہ مطلوب نہیں۔

۲- نماز میں ایسی دعائیں ہیں جن میں اپنے عمل کا خالص اللہ تعالیٰ کے لئے ہونا اور اپنے چہرہ کا اللہ کی طرف متوجہ کرنا اور صرف اللہ ہی سے مدد چاہنے کو واضح کیا جاتا ہے۔

۳- نماز میں تعظیمی افعال بجالائے جاتے ہیں جیسے باادب کھڑا ہونا، اللہ کے سامنے سرنگوں ہونا اور خدا کے سامنے جبہ سائی کرنا۔

اور معجون میں جس طرح مفردات باہم دگر مل جاتے ہیں اور ایک مرکب مزاج وجود میں آتا ہے اسی طرح مذکورہ تینوں باتیں نماز میں ایک دوسرے کے لئے مددگار، تکمیل کنندہ اور یاوری کرنے والی بن جاتی ہیں، اسی لئے نماز عام و خاص یعنی سب لوگوں کے لئے مفید ہے اور ایک قوی الاثر تریاق ہے تاکہ ہر شخص اس سے اپنی اپنی استعداد کے مطابق استفادہ کر سکے۔

وإنما جعلت الصلاةُ أتمَّ الأعمالِ المقرِّبة، دون الفكر في عظمة الله ودون الذكر الدائم، لأن الفكر الصحيح فيها لا يتأتى إلا من قوم عالية نفوسهم، وقليلٌ ما هم، وسوى أولئك لو خاضوا فيه تبلَّدوا، وأبطلوا بالهم، فضلاً عن فائدة أخرى؛ والذكرُ يلزم أن يشرحه ويغذوه عملٌ تعظيمي يعمله بجوارحه، ويتعنّوا في إدآبها، فاللقلقةُ خاليةٌ عن الفائدة في حق الأكثرين.

أما الصلاة فهي المعجونُ المركب:

[١] من الفكر المصروف تلقاءَ عظمة الله بالقصد الثاني والالتفات الضمني، المتأتّي من كل واحد. ولا حجرَ لصاحب استعداد الخوض في لُجّة الشهود أن يخوض، بل ذلك منَّة له أتمّ تنبيه.

نماز کے فوائد کا بیان

ذیل میں نماز کے آٹھ فائدے بیان کئے جاتے ہیں:

پہلا فائدہ: نماز مؤمنین کی معراج ہے۔ معراج کے معنی ہیں سیڑھی یعنی نماز ترقی کا ذریعہ ہے۔ جس طرح نبی کریم ﷺ کو معراج سے سرفراز کیا گیا تھا اور وصالِ حبیب نصیب ہوا تھا، مؤمنین بھی نماز کے ذریعہ ترقی کرتے ہیں اور آخرت میں ان کو بھی دیدارِ خداوندی کی نعمت سے، جو کہ اخروی نعمتوں میں سب سے بڑی نعمت ہے، بہرہ ور کیا جائے گا۔ آخرت میں تجلیات کو سہارنے کی استعداد نماز کے ذریعہ پیدا ہوتی ہے۔ متفق علیہ روایت میں ہے کہ ایک مرتبہ صحابہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر تھے، چودھویں کا چاند پوری تابانی سے چمک رہا تھا، آپ نے اس کی طرف دیکھا اور ارشاد فرمایا: ”عنقریب تم اپنے پروردگار کو آشکارا آنکھ سے دیکھو گے، جیسے کہ تم اس چاند کو دیکھتے ہو، تم کوئی تکلیف نہیں دیئے جاؤ گے اس کے دیکھنے میں (یا: ازدحام نہیں کرو گے تم اللہ کی رویت میں) پس اگر طاقت رکھو تم کہ نہ مغلوب کئے جاؤ تم (یعنی مشاغل تم پر غالب نہ آئیں) اس نماز پر جو طلوعِ آفتاب سے پہلے ہے (یعنی نماز فجر) اور اس نماز پر جو غروبِ آفتاب سے پہلے ہے (یعنی نماز عصر) تو کرو تم“ (مشکوٰۃ باب رؤیۃ اللہ تعالیٰ حدیث نمبر ۵۶۵۵)

فجر وعصر کی تخصیص یا تو اس لئے ہے کہ فجر راحت اور سستی کا وقت ہے اور عصر مشاغلِ دنیوی کا وقت ہے، پس جو ان دونمازوں کا اہتمام کرے گا وہ باقی نمازوں کا بدرجۂ اولیٰ اہتمام کرے گا اور ایک قول یہ ہے کہ جنت میں دیدارِ خداوندی انہیں دو وقتوں میں ہوگا (مظاہر حق) غرض رویتِ باری کی خوش خبری کے ساتھ نمازوں کے اہتمام کی تاکید اسی لئے ہے کہ نمازیں ہی آدمی میں دیدارِ خداوندی کی استعداد پیدا کرتی ہیں۔

نوٹ: الصلاۃ معراج المؤمنین کوئی روایت نہیں ہے، لوگوں میں یہ جملہ جو حدیث کے طور پر چل پڑا ہے وہ بے اصل بات ہے۔

دوسرا فائدہ: نماز محبوبِ خدا بننے کا اور اللہ کی رحمتوں کو لوٹنے کا بہت بڑا ذریعہ ہے۔ مسلم شریف میں روایت ہے کہ آنحضور ﷺ نے ایک بار اپنے ایک خادم حضرت ربیعہ بن کعب رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ: ”مجھ سے مانگ“ انھوں نے آپ سے جنت کی رفاقت مانگی۔ آپ نے فرمایا: ”کچھ اور مانگ“ تو انھوں نے عرض کیا: ”میرا مطلب تو یہی ہے“ تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ: ”تو اپنے نفس کے خلاف میری مدد کر نمازوں کی کثرت سے“ (مشکوٰۃ حدیث نمبر ۸۹۶ باب السجود وفضلہ) یعنی تیرا نفس تو نہیں چاہے گا کیونکہ نفس پر نماز بہت بھاری ہے، مگر تو نفس کو مجبور کر اور بہت زیادہ نمازیں پڑھ تاکہ میں آخرت میں ان نمازوں کے سہارے تیرے لئے اپنی رفاقت کی درخواست کرسکوں۔ اس روایت سے معلوم ہوا کہ آدمی نماز کی مدد سے آخرت میں بڑے سے بڑا مرتبہ حاصل کرسکتا ہے۔

اور سورۃ المدثر میں ہے کہ آخرت میں جنتی مجرموں سے ان کا حال پوچھیں گے کہ تم کو دوزخ میں کس بات نے داخل کیا؟ وہ کہیں گے: "ہم نہ تو نماز پڑھا کرتے تھے اور نہ غریب کو کھانا کھلایا کرتے تھے (یعنی زکوٰۃ بھی نہیں دیا کرتے تھے) اور ہم بحث کرنے والوں کے ساتھ (یعنی اسلام کے خلاف باتیں بنانے والوں کے ساتھ) بحث میں شریک رہا کرتے تھے اور قیامت کے دن کو (بھی) جھٹلایا کرتے تھے، یہاں تک کہ ہم کو موت آگئی، پس ان کو سفارش کرنے والوں کی سفارش نفع نہ دے گی" (آیات ۴۱-۴۸) ان آیات میں کفار ہی کا بیان نہیں عام مجرموں کا بیان ہے، جو نافرمان مسلمانوں کو بھی شامل ہے۔ پس ان آیات کے منطوق سے یہ بات ثابت ہوئی کہ نماز نہ پڑھنے والے رحمت خداوندی سے محروم ہوں گے اور راندہ ہو کر جہنم میں جائیں گے اور اسی آیت کے مفہوم سے یہ بات نکلی کہ نمازوں کا اہتمام کرنے والے محبوب خدا ہوں گے، اللہ کی رحمتوں کے حقدار ہوں گے اور جنت کے عالی مقامات میں جگہ حاصل کریں گے (اللّٰھُمَّ اجْعَلْنَا مِنْھُم)

تیسرا فائدہ: جب نماز آدمی میں ملکہ اور فطرت بن جاتی ہے، تو بندہ اللہ کے نور میں مضمحل (متلاشی، بکھرنے والا، گم) ہو جاتا ہے اور اس کی خطائیں مٹادی جاتی ہیں۔ سورۂ ہود آیت ۱۱۴ میں ہے: "اور دن کے دونوں سروں پر اور رات کے ابتدائی حصہ میں نماز کا اہتمام کرو، یاد رکھو! نیکیاں برائیوں کو مٹادیتی ہیں" یعنی نیکیوں کی خاصیت یہ ہے کہ وہ برائیوں کو مٹادیتی ہیں، جس طرح نہانے سے بدن کا میل کچیل دور ہو جاتا ہے اور خزاں کے موسم میں پتے جھڑ جاتے ہیں، نمازوں اور دوسری نیکیوں سے بھی گناہ مٹ جاتے ہیں اور نیکیاں گویا توبہ بن جاتی ہیں۔

چوتھا فائدہ: نیک بختی حاصل کرنے کے حجابات ثلاثہ میں ایک جہالت و بدعقیدگی کا حجاب بھی ہے، مبحث چہارم کے باب ششم میں اس کی تفصیل گذر چکی ہے۔ جب نماز کے افعال حضور قلب اور نیت صالح کے ساتھ انجام دیئے جاتے ہیں تو نماز سے اللہ تعالیٰ کی صحیح معرفت حاصل ہوتی ہے اور دل میں اللہ کی عظمت و اعتقاد پیدا ہوتا ہے اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے نماز سے زیادہ نافع کوئی چیز نہیں۔

پانچواں فائدہ: نیک بختی حاصل کرنے میں حجاب دنیا بھی مانع ہے یعنی رسم و رواج کا پردہ بھی حائل ہو جاتا ہے۔ گذشتہ بالا مقام میں اس کی تفصیل بھی گذر چکی ہے۔ جب نماز کا باقاعدہ اہتمام کیا جاتا ہے اور اس کو ایک مسلمہ طریقہ بنالیا جاتا ہے تو وہ آفات دنیا سے اور رواجی برائیوں سے بچاتی ہے۔ سورۃ العنکبوت آیت ۴۵ میں ہے کہ "نماز کی پابندی کیجئے، بیشک نماز بے حیائی اور ناشائستہ کاموں سے روکتی ہے" ﴿اَقِمِ الصَّلٰوۃَ اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ﴾ یعنی جب نماز فطرت ثانیہ اور خصلت راسخہ بن جاتی ہے تو رواجی برائیوں سے بچنے میں بے حد نفع بخش ثابت ہوتی ہے۔

چھٹا فائدہ: نماز مسلمانوں کا شعار ہے، اس کے ذریعہ مسلمان، کافر اور منافق سے ممتاز ہوتا ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ "ہمارے اور ان (منافقین) کے درمیان عہد و پیمان نماز ہے، پس جس نے نماز کو ترک کر دیا، وہ کافر ہو گیا" (رواہ احمد والنسائی وابن ماجہ والترمذی فی کتاب الایمان وقال: حدیث حسن صحیح، مشکوٰۃ حدیث نمبر ۵۷۴ کتاب الصلوٰۃ) اسفار

میں ہمیں اس کا خوب تجربہ ہوتا ہے جب کوئی مسلمان لوگوں کے درمیان نماز پڑھتا ہے تو لوگوں کو اس کے اس عمل سے دین اسلام کا تعارف ہوتا ہے۔

ساتواں فائدہ: بحث رابع کے باب اول میں گذرا ہے کہ سعادت حقیقیہ یہ ہے کہ بہیمیت، نفس ناطقہ کی تابعدار ہو جائے اور خواہش عقل کی پیروی کرے۔ اس مقصد کی تحصیل کے لئے نماز جیسی کوئی چیز نہیں۔ نماز نفس کو خوگر بناتی ہے کہ وہ عقل کی تابعداری کرے اور عقل کے حکم پر چلے۔ پس سعادت حقیقیہ حاصل کرنے میں بھی نماز بڑی معین و مددگار ہوتی ہے۔

اب آخر میں ہم نماز کے ایک فائدہ کا اضافہ کرتے ہیں، جس کا قرآن کریم میں متعدد جگہ ذکر آیا ہے:

آٹھواں فائدہ: نماز اللہ پاک کو بکثرت یاد کرنے کا ذریعہ ہے اور اللہ پاک کی یاد بہت بڑی چیز ہے۔ عاشق سے کوئی پوچھے: تجھے محبوب کی یاد میں کیا ملتا ہے؟'' وہ خود تو کچھ نہیں بتلا سکے گا مگر اس کی وارفتگی سب کچھ بتا دے گی۔

ذکر اللہ والوں کے قلوب کی غذا اور آب حیات ہے۔ اللہ پاک کی یاد ہی سے ان کے دلوں کی دنیا آباد ہے۔ پس عاقل چاہتے ہیں کہ اپنے مولی کو یاد رکھیں وہ نمازوں کو اس کا ذریعہ اور وسیلہ بنالیں — نماز کا یہ فائدہ سورۂ ہود آیت ۱۱۴ کے آخری حصہ میں آیا ہے ﴿ذٰلِكَ ذِكْرٰى لِلذّٰكِرِيْنَ﴾ (یہ نماز بڑی یاد ہے یاد کرنے والوں کے لئے) اسی طرح سورۃ العنکبوت کی مذکورہ آیت میں ہے ﴿وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ﴾ (اور اللہ کی یاد بہت بڑی چیز ہے)

والصلاةُ معراجُ المؤمنين، مُعِدَّةٌ للتجليات الأخروية، وهو قوله صلى الله عليه وسلم: ﴿إنكم سترون ربكم، فإن استطعتم أن لا تُغلبوا على صلاة قبل طلوع الشمس وقبل غروبها، فافعلوا﴾ وسببٌ عظيمٌ لمحبة الله ورحمته، وهو قوله صلى الله عليه وسلم: ﴿أَعِنِّي على نفسك بكثرة السجود﴾ وحكايته تعالى عن أهل النار: ﴿وَلَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ﴾؛ وإذا تمكنت من العبد اضمحل في نور الله، وكُفِّرت عنه خطاياه: ﴿إِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ﴾ ولاشيءَ أنفعُ من سوء المعرفة منها، لاسيما إذا فُعلت أفعالُها وأقوالُها على حضور القلب والنية الصالحة، وإذا جُعلت رسمًا مشهورًا نفعت من غوائل الرسوم نفعًا بينًا، وصارت شعارًا للمسلم، يتميز به من الكافر، وهو قوله صلى الله عليه وسلم: ﴿العهد الذي بيننا وبينهم الصلاةُ، فمن تركها فقد كفر﴾؛ ولا شيءَ في تمرين النفس على انقياد الطبيعة للعقل وجريانها في حُكمه مثلُ الصلاة، والله أعلم.

ترجمہ: (۱) اور نماز مؤمنین کی معراج ہے، تجلیات اخرویہ کے لئے تیار کرنے والی ہے اور وہ آپ ﷺ کا ارشاد ہے: ''بیشک عنقریب تم اپنے پروردگار کو دیکھو گے، پس اگر تم طاقت رکھو کہ ہارو طلوع آفتاب سے قبل اور غروب آفتاب

سے قبل کی نماز میں ہو تو گردن"

(۲) اور نماز بہت بڑا ذریعہ ہے اللہ کی محبت اور رحمت کا، اور وہ آپ ﷺ کا ارشاد ہے: "مدد کر تو میری تیرے نفس کے خلاف سجدوں کی کثرت سے" اور اللہ تعالیٰ نے جہنمیوں کا قول نقل فرمایا ہے: "اور ہم نماز پڑھنے والوں میں سے نہیں تھے"

(۳) اور جب نماز بندے میں جم جاتی ہے (یعنی ملکہ بن جاتی ہے) تو بندہ اللہ کے نور میں متلاشی (فنا) ہو جاتا ہے اور اس کی خطائیں معاف کر دی جاتی ہیں (ارشاد خداوندی ہے!: "بے شک نیکیاں گناہوں کو دور کر دیتی ہیں"

(۴) اور نماز سے زیادہ کوئی چیز نافع نہیں ہے بدعقیدگی میں، خصوصاً جب نماز کے افعال و اقوال حضورِ قلب اور نیت صالحہ سے انجام دیئے جائیں۔

(۵) اور جب نماز کو ایک مشہور رسم بنالیا جائے تو وہ رواجی برائیوں میں عملی طور پر نفع بخش ہوتی ہے۔

(۶) اور نماز مسلمانوں کا شعار ہوتی ہے، اس کے ذریعہ مسلمان کافر سے ممتاز ہوتا ہے، اور وہ آپ ﷺ کا ارشاد ہے: "نماز ہی ہم میں اور ان (منافقین) میں عہد و پیمان ہے۔ پس جو شخص نماز کو ترک کر دے وہ کافر ہو گیا"

(۷) اور نہیں ہے کوئی چیز نماز کی مانند نفس کو خوگر بنانے میں طبیعت کی تابعداری کرنے پر عقل کی اور طبیعت کے چلنے پر عقل کے علم کے مطابق۔ باقی اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں۔

لغات: غَلَبَ علیہ: غالب آنا، جیتنا۔ غُلِبَ غلبۃ: ہارنا، مغلوب ہونا۔ اضمحل: پاش پاش ہونا، بکھر جانا، متلاشی ہونا۔

باب ــــ ۱۰

زکوۃ کے اسرار کا بیان

اس باب میں زکوۃ سے مراد صرف فرض زکوۃ نہیں ہے بلکہ ہر انفاق (اللہ کے راستہ میں خرچ) مراد ہے اور اس کو زکوۃ انفاق کی اشرف نوع کے اعتبار سے یا لغوی معنی کے اعتبار سے کہا جاتا ہے۔ زکوۃ کے لغوی معنی ہیں: طہارت و پاکیزگی۔ چونکہ راہ خدا میں خرچ کرنا مال کو بھی پاک کرتا ہے اور مالک کو بھی اس لئے اس کو زکوۃ کہا جاتا ہے۔ مکی سورتوں میں جو زکوۃ کی ادائیگی کا حکم ہے اس سے مطلق غریبوں پر خرچ کرنا مراد ہے۔ اصطلاحی زکوۃ ہجرت کے بعد ۲ ہجری میں نازل ہوئی ہے۔

انفاق فی سبیل اللہ چونکہ متعدد مصالح کے لئے ضروری ہوتا ہے جن کی تفصیل درج ذیل ہے:

(۱) ضرورت مندوں کی حاجت روائی کے لئے جب کسی غریب آدمی کو کوئی بڑی حاجت پیش آتی ہے اور وہ زبان حال سے یا زبان قال سے اللہ تعالیٰ کے سامنے گڑگڑاتا ہے تو اس کی وہ فریاد رحم خداوندی کے دروازے کو کھٹکھٹاتی

ہے۔ چنانچہ کبھی مصلحت خداوندی یہ ہوتی ہے کہ کسی مجبور آدمی کے دل میں الہام کیا جاتا ہے کہ وہ اس کی حاجت روائی کرے، پھر جب یہ الہام اس شخص پر چھا جاتا ہے یعنی اس کا دل اس غریب کی حاجت روائی کے لئے بے قرار ہو جاتا ہے اور وہ شخص اس الہام کے مطابق اس غریب کی ضرورت پوری کر دیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس سے خوش ہوتے ہیں اور اس پر چہار جانب سے برکتیں نازل ہونی شروع ہوتی ہیں اور وہ شخص اللہ کی رحمتوں کا مورد بن جاتا ہے۔

شاہ صاحب رحمہ اللہ اپنا ایک واقعہ ذکر کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ ایک غریب آدمی نے مجھ سے اپنی کسی ضرورت میں مجبور ہو کر سوال کیا تو میں نے اپنے دل میں الہام ہوتا ہوا محسوس کیا کہ میں اس کی مدد کروں اور اس الہام میں مجھے دنیا و آخرت میں اجر جزیل کی خوش خبری بھی دی گئی۔ چنانچہ میں نے اس کو دیا اور مجھ سے جو وعدہ کیا گیا تھا اس کا آنکھوں سے مشاہدہ کیا۔ اور یہ سب باتیں یعنی اس حاجت مند کا کرم خداوندی کے دروازے کو کھٹکھٹانا اور الہام خداوندی کا برانگیختہ ہونا اور اس کا میرے دل کو منتخب کرنا اور اجر و ثواب کا ظاہر ہونا۔ یہ سب باتیں میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھیں۔

④ رحمت خداوندی کے حصول کے لئے: کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کسی خاص مصرف میں خرچ کرنا رحمت خداوندی کو حاصل کرنے کا احتمالی محل قرار پاتا ہے، اس وقت اسی محل میں خرچ کرنے سے رحمت خداوندی حاصل ہو سکتی ہے۔ مثلاً:

۱۔ کبھی ملأ اعلیٰ میں کسی ملت کی شان دوبالا کرنے کا فیصلہ ہوتا ہے تو جو بھی شخص اس ملت کو بڑھانے کے لئے خرچ کرتا ہے وہ رحمت خداوندی کا مورد بنتا ہے اور اس وقت میں اس ملت کے معاملہ کو بڑھانا خرچ کرنے میں غزوۂ تبوک کی طرح ہوتا ہے، جس میں صحابہ نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا، حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنا سب کچھ پیش کر دیا تھا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنا آدھا مال پیش کیا تھا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے پہلی بار تین سو اونٹ، دوسری بار دو سو اونٹ اور تیسری بار تین سو اونٹ مع ساز و سامان کے لکھوائے تھے اور آپ ﷺ نے خوش ہو کر فرمایا تھا کہ ما علیٰ عثمانَ ما فعلَ بعدَ هذه (مشکوٰۃ باب مناقب عثمان) یعنی اگر عثمان آئندہ خرچ نہ بھی کریں تو کوئی حرج نہیں، کیونکہ انھوں نے خرچ کرنے کا حق ادا کر دیا۔

۲۔ جب قحط سالی کا زمانہ ہوتا ہے اور لوگ بھوک مری میں مبتلا ہوتے ہیں اور مشیت خداوندی ان لوگوں کو بچانا ہوتا ہے تو اس وقت لوگوں کو کھلانے سے رحمت خداوندی حاصل ہو سکتی ہے، دیگر مدّات میں خرچ کرنے سے یہ بات حاصل نہیں ہو سکتی۔

غرض رحمت خداوندی کے حصول کی ان احتمالی جگہوں سے پیغمبر ﷺ ایک قاعدہ بناتے ہیں اور لوگوں کو بتاتے ہیں کہ: "جو کسی فقیر پر اتنا اتنا خرچ کرے گا یا ایسی ایسی حالت میں خرچ کرے گا، تو اس کا یہ عمل نہایت مقبول ہوگا" چنانچہ مؤمنین یہ بات سنتے ہیں اور ان کا دل گواہی دیتا ہے کہ یہ وعدہ سچا ہے اس لئے وہ تعمیل حکم کرتے ہیں اور وہ اس وعدہ کو برحق پاتے ہیں جو ان سے کیا گیا ہے۔

﴿باب أسرار الزكاة﴾

اعلم: أن المسكين إذا عنت له حاجة، وتضرع إلى الله فيها بلسان المقال أو الحال، قرع تضرعه باب الجود الإلهي؛ وربما تكون المصلحة أن يلهم في قلب زكي: أن يقوم بسد خلته، فإذا تغشاه الإلهام وانبعث وفقه، رضي الله عنه، وأفاض عليه البركات من فوقه ومن تحته وعن يمينه وعن شماله، وصار مرحوما.

وسألني مسكين ذات يوم في حاجة اضطر فيها، فأوجست في قلبي إلهاما يأمرني بالإعطاء، ويبشرني بأجر جزيل في الدنيا والآخرة، فأعطيت وشاهدت ما وعدني ربي حقا، وكان قرعه لباب الجود، وانبعاث الإلهام واختياره لقلبي يومئذ، وظهور الأجر، كل ذلك بمرأى مني.

وربما كان الإنفاق في مصرف مظنة لرحمة إلهية: كما إذا انعقدت داعية في الملأ الأعلى لشيء به صغو، فصار كل من يتعرض لتمشيته أمرها مرحوما، وتكون تمشيته يومئذ في الإنفاق كغزوة العسرة، وكما إذا كانت أيام قحط، وتكون أمة هي أحوج خلق الله، ويكون المراد إحياءهم؛ وبالجملة فيأخذ المخبر الصادق من هذه المظنة كلية فيقول: "من تصدق على فقير كذا وكذا، أو في حالة كذا وكذا، تقبل منه عمله" فيسمعه سامع وينقاد لحكمه بشهادة قلبه، فيجدها وعدا حقا.

ترجمہ: زکوٰۃ کی حکمتوں کا بیان: (۱) جان لیں کہ جب کسی مسکین کو کوئی حاجت پیش آتی ہے اور وہ اس سلسلہ میں زبان قال سے یا زبان حال سے بارگاہ خداوندی میں گڑگڑاتا ہے تو اس کا یہ تضرع کرم خداوندی کے دروازے کو کھٹکھٹاتا ہے، اور کبھی مصلحت یہ ہوتی ہے کہ کسی بھلے آدمی کے دل میں القا کیا جائے کہ وہ اس کی حاجت روائی کے لئے اٹھ کھڑا ہو، پس جب اس کو الہام ڈھانک لیتا ہے اور وہ اس کے موافق عمل کے لئے اٹھ کھڑا ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس سے خوش ہوتے ہیں۔ اور اس پر برکتوں کا فیضان کرتے ہیں اوپر سے، نیچے سے، دائیں سے اور بائیں سے۔ اور وہ شخص مہربانی کیا ہوا ہوتا ہے۔

اور ایک دن ایک غریب نے مجھ سے اپنی ایک ایسی حاجت طلب کی جس میں وہ مجبور ہو گیا تھا۔ تو میں نے اپنے دل میں ایک الہام محسوس کیا جو مجھے دینے کا حکم دے رہا تھا اور مجھے بشارت سنا رہا تھا اجر جزیل کی دنیا و آخرت میں، چنانچہ میں نے دیا اور میں نے بالکل برحق پایا اس چیز کو جس کا مجھ سے میرے رب نے وعدہ کیا تھا۔ اور تھا اس شخص کا باب کرم کو کھٹکھٹانا اور الہام کا برانگیختہ کرنا اور اس کا میرے دل کو منتخب کرنا اس دن اور اجر کا ظاہر ہونا، یہ سب باتیں میری

"جو لوگ سونا چاندی جمع کر کے رکھتے ہیں اور ان کو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے تو آپ ان کو ایک بڑی دردناک سزا کی خبر سنا دیجئے، جس دن اس (سونے چاندی) کو دوزخ کی آگ میں تپایا جائے گا، پھر اس سے ان کی پیشانیوں اور ان کی کروٹوں اور ان کی پشتوں کو داغا جائے گا۔ (کہا جائے گا) یہ ہے وہ جس کو تم نے اپنے واسطے جمع کر کے رکھا تھا، سو اب اپنے جمع کرنے کا مزہ چکھو!"

غرض انفاق: حرص، بخل اور تنگ دلی جیسے رذائل کے ازالہ میں بے حد نفع بخش ہے، جو چاہے اس نسخۂ کیمیا کو آزما کر دیکھے!

وربما تفطنت النفس بأن حب الأموال والشحَّ بها يضرُّه ويصدُّه عما هو بسبيله، فيتأذى منه أشد تأذٍّ، ولا يتمكن من دفعه إلا بتمرين على إنفاق أحب ما عنده، فصار الإنفاق في حقه أنفع شيء، ولولا الإنفاق لبقي الحبُّ والشح كما هو، فيتمثل في المعاد شجاعاً أقرع، أو تتشكل الأموال صفائح في حقه، وهو حديث: ثم يُبطح لها بقاع قرقر، وقوله تعالى: ﴿وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ﴾ الآية.

ترجمہ: اور کبھی نفس اس بات کو سمجھ لیتا ہے کہ دولت کی محبت اور مال میں بخیلی اسے سخت نقصان پہنچا رہی ہے اور اس کو اس راہ سے روک رہی ہے جس کے درپے وہ ہے (یعنی سعادت حقیقیہ کی تحصیل) تو وہ اس سے نہایت سخت اذیت محسوس کرتا ہے، اور وہ اس کو ہٹانے پر قادر نہیں مگر اس چیز کو خرچ کرنے کی مشق کر کے جو اس کو سب سے زیادہ محبوب ہے، پس خرچ کرنا اس کے حق میں سب سے زیادہ نفع بخش ہو جاتا ہے۔ اور اگر وہ خرچ نہیں کرے گا تو مال کی محبت اور بخل اس کے اندر اسی طرح باقی رہے گا، پس وہ آخرت میں گنجے اژدہا کی شکل میں متشکل ہوگا یا دولت اس کے حق میں مضرت رساں ہو کر متشکل ہوگی اور وہ ارشاد نبوی ہے: "پھر منہ کے بل لٹایا جائے گا وہ ان اونٹوں کے لئے چٹیل ہموار میدان میں" اور ارشاد ربانی ہے: "وہ جو لوگ سونا اور چاندی جمع کر کے رکھتے ہیں" آخر آیت تک پڑھیے۔

لغات:

تفطن: سمجھ جانا، کہا جاتا ہے تفطّنْ لما اقول لك: جو کچھ میں تجھ سے کہتا ہوں اس کو سمجھو ۔ شحّ بالشيء: بخل کرنا، حرص کرنا ۔۔۔ الشجاع: سانپ ۔ الأقرع: گنجا یعنی نہایت سخت زہریلا جس کے سر کے بال زہر کی زیادتی سے اڑ گئے ہوں ۔ بطحه (ف) بطحاً: بچھانا، منہ کے بل گرانا ۔ القاع: ہموار میدان ۔ القرقر: چکنا ۔ الکنز: شریعت کی اصطلاح میں وہ مال ہے جس کی زکوٰۃ ادا نہ کی گئی ہو اور جس مال کی زکوٰۃ ادا کر دی گئی ہو وہ اس وعید میں داخل نہیں۔

☆ ☆ ☆

(۴) بلاؤں اور آفتوں کو ٹالنے کے لئے: کبھی عالم مثال میں کسی کی موت کا فیصلہ ہو جاتا ہے یا اس پر کسی بلا کا اترنا طے ہو چکا ہے، ایسے وقت میں اگر وہ شخص مال کی بہت بڑی مقدار راہ خدا میں خرچ کرے اور وہ خود بھی اور دوسرے نیک بندے بھی اس کے حق میں گڑگڑا کر دعا مانگیں تو اس کی موت کا فیصلہ رک جاتا ہے اور اس کی بلا ٹل جاتی ہے۔ ترمذی شریف کی روایت ہے کہ: ''دعا ہی قضائے الٰہی کو پھیرتی ہے، اور نیکی ہی عمر میں زیادتی کرتی ہے'' (مشکوۃ کتاب الدعوات، حدیث نمبر ۲۲۳۳)

مجھے دو مرتبہ اس کا تجربہ ہوا ہے۔ میرے ایک متعلق کا انگلینڈ کے شہر بولٹن میں ایکسیڈنٹ ہو گیا ایک ماہ تک وہ شفا خانہ میں بے ہوش رہے، آخر میں ان کے متعلقین نے ایک بڑی رقم خرچ کی اور دارالعلوم دیوبند میں ختم بخاری شریف کرا کر دعا کرائی تو اللہ نے ان کو شفا عطا فرمائی۔

اسی طرح میرے ایک دوست ممبئی میں سخت بیمار ہوئے اور زندگی سے مایوس ہو گئے۔ انھوں نے بھی ایک بڑی رقم ایسے غریبوں میں بانٹی جو نمازی تھے اور ان سے دعائیں کرائیں اور دارالعلوم دیوبند میں ان کے لئے بھی ختم بخاری شریف کر کے دعا کی گئی تو بحمد اللہ وہ بھی شفایاب ہوئے۔ اور خود میرا معمول یہ ہے کہ جب گھر میں کوئی بیمار پڑتا ہے اور دو چار روز کے علاج سے شفا نہیں ہوتی تو میں گھر والوں کو صدقہ کرنے کے لئے کہتا ہوں اللہ تعالیٰ اس کی برکت سے جلد مریض کو شفا بخشتے ہیں۔ غرض یہ بھی تجربہ سے برحق بات ثابت ہوئی ہے لوگ آزما کر دیکھیں۔

وربما يكون العبدُ قد أُحيط به وقُضي بهلاكه في عالم المثال، فاندفع إلى بذل أموال خطيرة، وتضرَّع إلى الله هو وناس من المرحومين، فمحا هلاكه بنفسه بإهلاك ماله، وهو قوله صلى الله عليه وسلم: ﴿لايَرُدُّ القضاءَ إلا الدعاءُ، ولا يزيد في العمر إلا البِرُّ﴾

ترجمہ: اور کبھی بندے کو موت گھیر لیتی ہے، اور عالم مثال میں بندے کی ہلاکت کا فیصلہ کر دیا جاتا ہے پس وہ بے چین ہو کر بڑا ہی زجیر ساں مال خرچ کرنے کی طرف اور اللہ کے سامنے گڑگڑاتا ہے اور نیک لوگوں میں سے کچھ لوگ بھی، پس وہ اپنے نفس کی ہلاکت کو مٹا دیتا ہے اپنے مال کو ہلاک کر کے۔ اور وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''قضائے الٰہی کو دعا ہی پھیرتی ہے اور عمر میں زیادتی نیکی ہی کرتی ہے''۔

☆ ☆ ☆

(۵) گناہوں سے حفاظت کے لئے: کبھی انسان سے کوئی برا کام سرزد ہو جاتا ہے، وہ اس پر نادم ہوتا ہے مگر پھر نفس غالب آجاتا ہے اور دوبارہ وہی گناہ ہو جاتا ہے اور ایسا بار بار ہوتا ہے تو اس صورت میں گناہ سے بچنے کا بہترین علاج یہ ہے کہ آدمی گناہ کا اچھا خاصا مالی تاوان ادا کرے تا کہ آئندہ جب نفس وہ گناہ کرنے کے لئے مجبور کرے تو وہ

تاوان نگاہوں کے سامنے رہے اور اس کو گناہ سے روکے رہے۔ آدمی نفس کو سمجھائے کہ اگر تو نے یہ حرکت کی تو پھر تجھے تاوان ادا کرنا پڑے گا۔ اور انسان کی فطرت یہ ہے کہ وہ چمڑی تو دے سکتا ہے، دمڑی نہیں دے سکتا، اس لئے نفس گناہ سے رک جائے گا۔

شریعت میں جو مختلف گناہوں کے کفارے متعین کئے گئے ہیں وہ اسی مقصد سے ہیں اور کفارہ سے مقصد غیر ضروری تاوانے ہیں، ان کو تو ادا کرنا ہی ہے۔ پھر تاوان رسا کفارے بھی متعین کئے گئے ہیں، مثلاً حالت حیض میں بیوی سے صحبت کرنے پر ایک دینار یا نصف دینار صدقہ کرنے کا حکم ترمذی شریف کی روایت میں آیا ہے، وہ اسی باب سے ہے۔ غرض آدمی کسی بھی گناہ سے بچنا چاہے، یا کسی بھی نیک عمل کی پابندی کرنا چاہے، اور نفس اطاعت نہ کرے تو اس کا علاج یہی ہے کہ تاوان لے، مثلاً آدمی غیبت سے بچنا چاہے یا تہجد کی پابندی کرنا چاہے تو غیبت سرزد ہونے پر اور تہجد چھوٹنے پر ایک معقول جرمانہ خود پر لازم کرے، ان شاء اللہ غیبت سے بچ جائے گا اور تہجد پابندی سے ادا کرنے لگے گا۔

(۶) خاندان کی خبر گیری کرنے کے لئے: کبھی حسن اخلاق کے تقاضے سے اور کبھی خاندان کے نظام کی حفاظت کے لئے مختلف طرح کے کام کرنے ضروری ہوتے ہیں، مثلاً غریبوں کا مالی تعاون کرنا، بھوکوں کو کھانا کھلانا، رشتہ داروں کا مالی تعاون کرنا، آپس میں سلام کو رواج دینا اور مختلف طریقوں سے لوگوں کی غم خواری کرنا۔ پس یہ سب کام شرعاً مامور بہ ہوجاتے ہیں اور سب صدقہ و خیرات شمار کئے جاتے ہیں۔ ترمذی شریف کی روایت میں ہے کہ: "اپنے بھائی سے خندہ پیشانی سے ملنا صدقہ ہے اور نیک بات کا حکم دینا صدقہ ہے، بری بات سے روکنا صدقہ ہے اور اپنے ڈول میں سے اپنے بھائی کے ڈول میں پانی ڈالنا صدقہ ہے" (مشکوٰۃ کتاب الزکوٰۃ باب فضل الصدقہ حدیث نمبر ۱۹۱۱)

وربما يفرُط من الإنسان أن يعمل عملاً شريرًا بحكم غلبة الطبيعة، ثم يطّلع على قبحه فيندم، ثم تغلب عليه الطبيعة فيعود له، فتكون الحكمة في معالجة هذه النفس: أن تُلزَم بذل مالٍ خطير، غرامةً على ما فعل، ليكون ذلك بين عينيه، فيردعه عما يقصد.

وربما يكون حسنُ الخلق والمحافظةُ على نظام العشيرة منحصرًا في إطعام طعام، وإفشاء سلام، ونحو ذلك من المواساة، فيؤمر بها، وتعدّ صدقة.

ترجمہ: اور کبھی انسان سے کوتاہی ہوجاتی ہے، بایں طور کہ وہ کوئی برا کام کر گذرتا ہے، نفس کے غلبہ کی وجہ سے، پھر وہ اس کی برائی پر مطلع ہوتا ہے پس وہ پشیمان ہوتا ہے، پھر اس پر نفس غالب آجاتا ہے پس وہ دوبارہ وہ برائی کرتا ہے۔ پس اس نفس کے علاج میں حکمت یہ ہوتی ہے کہ اس پر بہت سا مال خرچ کرنا لازم کیا جائے، اس جرم کے تاوان کے طور پر جو اس نے کیا ہے، تاکہ یہ تاوان ہمیشہ اس کی نگاہوں کے سامنے رہے، پس وہ اس کو روکے اس گناہ سے جس کا (… رکھے)

کا وہ ارادہ کرتا ہے۔

اور کبھی حسن اخلاق اور خاندان کے نظام کی حفاظت کا انحصار کھانا کھلانے میں اسلام کو رواج دینے میں اور مختلف قسم کی غم خواریوں میں ہوتا ہے پس وہ ان کاموں کا حکم دیا جاتا ہے اور وہ چیزیں صدقہ شمار کی جاتی ہیں۔

☆ ☆ ☆

زکوٰۃ کے فوائد

ذیل میں زکوٰۃ کے چار فائدے ذکر کئے جاتے ہیں:

پہلا فائدہ: صدقہ خیرات سے مال میں برکت ہوتی ہے۔ حدیث شریف میں اس سلسلہ کا ایک واقعہ مروی ہے کہ ایک شخص جنگل میں کھڑا تھا اس نے بادل میں سے ایک آواز سنی، جو بادل کو حکم دے رہی تھی کہ فلاں شخص کے باغ کو سیراب کر۔ بادل کا ایک ٹکڑا علیحدہ ہو کر چلا، وہ شخص بھی اس کے پیچھے ہو لیا۔ بادل پتھریلی زمین میں برسا، وہاں سے ایک نالی میں سارا پانی اکٹھا ہو گیا۔ وہ شخص اس نالی کے ساتھ ہو لیا، پانی ایک باغ میں پہنچا، وہاں ایک شخص ہاتھ میں بیلچہ لئے ہوئے سینچائی کر رہا تھا، اس شخص نے باغ والے سے پوچھا کہ اے اللہ کے بندے! آپ کا نام کیا ہے؟ اس نے اپنا وہ نام بتایا جو اس شخص نے بادل میں سے سنا تھا۔ باغ والے نے اس شخص سے پوچھا کہ آپ میرا نام کیوں پوچھتے ہیں؟ اس نے سارا ماجرا بتایا اور دریافت کیا کہ آپ کیا عمل کرتے ہیں جو خصوصی طور پر آپ کے باغ کے لئے بارش برسی؟ باغ والے نے کہا کہ جب میرا راز تجھے معلوم ہو گیا تو سن: میں باغ کی پیداوار کے تین حصے کرتا ہوں ایک تہائی خیرات کرتا ہوں، ایک تہائی اپنی ضروریات میں خرچ کرتا ہوں اور ایک تہائی باغ کی ترقی میں خرچ کرتا ہوں (رواہ مسلم، مشکوٰۃ، کتاب الزکوٰۃ، باب الانفاق، حدیث نمبر ۱۸۷۷)

دوسرا فائدہ: زکوٰۃ کی ادائیگی سے بندے پر رحمت خداوندی کا فیضان ہوتا ہے اور اللہ کی ناراضگی دور ہوتی ہے۔ ترمذی شریف کی روایت ہے اِنَّ الصَّدَقَةَ لَتُطْفِئُ غَضَبَ الرَّبِّ وَتَدْفَعُ مِيْتَةَ السُّوْءِ (خیرات یقیناً پروردگار کے غصہ کو بجھاتی ہے اور بری موت کو ہٹاتی ہے)

تیسرا فائدہ: بخل و حرص پر آخرت میں جو عذاب ہونے والا ہے زکوٰۃ اس کو ٹال دیتی ہے، کیونکہ صحیح زکوٰۃ ادا کرنے والے میں حرص و بخل کے رذائل پنپ نہیں سکتے، وہ کبھی دیر سویر اس شخص کا پیچھا چھوڑتا ہے اور جب یہ رذائل ختم ہو گئے تو آخرت میں عذاب کا سوال بھی باقی نہیں رہا۔

چوتھا فائدہ: ملاءِ اعلیٰ کے وہ فرشتے جو زمین کے احوال سنوارنے کی محنت کرتے ہیں، وہ صدقہ خیرات کرنے والے

کے حق میں دعائیں کرتے ہیں۔ حدیث شریف میں ہے کہ ہر صبح دو فرشتے آسمان سے اترتے ہیں ایک کہتا ہے: اللّٰهُمَّ أَعْطِ مُنْفِقًا خَلَفًا (اے اللہ! خرچ کرنے والے کو عوض دے) اور دوسرا کہتا ہے: اللّٰهُمَّ أَعْطِ مُمْسِكًا تَلَفًا (اے اللہ! مال روک کر رکھنے والے کا مال تباہ کر) (متفق علیہ، مشکوٰۃ کتاب الزکوٰۃ باب الانفاق حدیث نمبر ۱۸۶۰)

والزكاة تزيد في البركة، وتطفئ الغضب بجذبها فيضانا من الرحمة، وتدفع عذاب الآخرة المترتب على الشح، وتعطف دعوة الملأ الأعلى للمصلحين في الأرض على هذا العبد، والله أعلم

ترجمہ: اور زکوٰۃ برکت میں اضافہ کرتی ہے اور (پروردگار کے) غضب کو بجھاتی ہے، اس کے کھینچنے کی وجہ سے رحمت کے فیضان کو۔ اور ہٹاتی ہے آخرت کے اس عذاب کو جو بخیلی پر مرتب ہونے والا ہے۔ اور موڑتی ہے اس بندے پر ان ملائی فرشتوں کی دعاؤں کو جو زمین میں اصلاح کرنے والے ہیں۔ باقی اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں۔

باب — ۱۱

روزوں کی حکمتوں کا بیان

توحید و رسالت کی شہادت کے بعد نماز، زکوٰۃ، روزہ اور حج اسلام کے عناصر اربعہ ہیں۔ یعنی اسلام نامی فرمانبرداری والی جس طرزِ حیات کا نام ہے اس کی تخلیق، تعمیر اور نشو و نما میں ان پانچوں باتوں کو خاص دخل ہے۔ نماز اور زکوٰۃ کی حکمتوں سے فارغ ہو کر اب روزوں کی حکمتیں بیان کرتے ہیں۔

روزوں کے تعلق سے لوگوں کی تین قسمیں

طہارت اور نماز کی طرح روزوں کے تعلق سے بھی لوگوں کی تین قسمیں اور درجے ہیں:

پہلا درجہ: کبھی انسان الہامِ خداوندی سے سمجھ لیتا ہے کہ بہیمیت کا ہیجان اس کو سعادتِ حقیقیہ سے روک رہا ہے۔ سعادتِ حقیقیہ یہ ہے کہ بہیمیت ملکیت کی تابعداری کرے۔ اور جب آدمی کو یہ احساس ہو جاتا ہے تو وہ بہیمیت سے نفرت کرنے لگتا ہے۔ اور وہ بہیمیت کے جوش کو ٹھنڈا کرنے کے لئے اس سے بہتر کوئی تدبیر نہیں پاتا کہ کھانا پینا اور جماع کرنا ترک کرے اور اپنے دل اور دیگر اعضاء کو قابو میں رکھے۔ چنانچہ وہ علاج کے طور پر اس طریقہ کو مضبوط پکڑتا ہے۔ یہی وہ اعلیٰ درجہ کا انسان ہے، جو پہلے سے روزوں کے فوائد جانتا ہے اور کمالِ بصیرت سے روزے رکھتا ہے۔

فائدہ: مفطرات ثلاثہ سے بچنا تو روزے کی ماہیت میں داخل ہے، مگر روزے کے مقبول ہونے کے لئے ضروری

ہے کہ آدمی کھانا، پینا اور جماع چھوڑنے کے علاوہ معصیات ومنکرات سے بھی زبان ودل اور دوسرے اعضاء کی حفاظت کرے۔ اگر کوئی شخص روزہ رکھے اور گناہ کی باتیں اور گناہ والے اعمال غیبت اور گالی گلوچ کرتا رہے تو اللہ تعالیٰ کو اس کے روزے کی کوئی حاجت نہیں۔ بخاری کی روایت ہے کہ من لم یدع قول الزور والعمل بہ فلیس للہ حاجۃ أن یدع طعامہ وشرابہ (جو شخص روزے میں باطل کلام اور باطل کام کو ترک نہ کرے اس کے بھوکے پیاسے رہنے کی اللہ کو کوئی ضرورت نہیں)

دوسرا درجہ: اس شخص کا ہے جس کی سمجھ میں از خود تو فوائد نہیں آتے مگر پیغمبر ﷺ کے بتلانے پر اس کا دل یقین کر لیتا ہے کہ یہ سب فوائد برحق ہیں۔ چنانچہ وہ روزے شروع کرتا ہے اور وہ روزوں کے فوائد کا مشاہدہ کرتا ہے۔

تیسرا درجہ: اس مؤمن کا ہے جو نہ از خود روزوں کے فوائد جانتا ہے نہ پیغمبر کے بیان سے ادراک کر پاتا ہے۔ البتہ چونکہ وہ مؤمن ہے اس لئے ایمان بالغیب رکھتا ہے اور روزوں کی پابندی کرتا ہے تو وہ بھی محروم نہیں رہتا۔ دنیا میں اگر ان کو فوائد محسوس نہیں بھی ہوتے تو بہیمیت کے جوش کے ختم ہونے کی وجہ سے اعمال پر جو اچھے اثرات پڑتے ہیں، آخرت میں وہ فوائد وثمرات سامنے آجاتے ہیں۔

﴿باب أسرار الصوم﴾

اعلم أنه ربما يفطن الإنسان من قبل إلهام الحق إياه: أن سورة الطبيعة البهيمية تصده عما هو كماله: من انقيادها للملكية فيبغضها، ويطلب كسر سورتها، فلا يجد ما يغنيه في ذلك كالجوع والعطش وترك الجماع والأخذ على لسانه وقلبه وجوارحه، فيتمسك بذلك علاجا لمرضه النفساني.

ويتلوه: من يأخذ ذلك عن المخبر الصادق بشهادة قلبه.

ثم الذي يقلده الأنبياء شفقة عليه وهو لا يعلم، فيجد فائدة ذلك في المعاد، من انكسار السورة.

ترجمہ: اسرارِ صوم کا بیان: جان لیں کہ انسان کبھی سمجھ لیتا ہے اللہ تعالیٰ کے دل میں ڈالنے کی وجہ سے کہ طبیعت بہیمیہ کا جوش اس کو روک رہا ہے اس چیز سے جو اس کا کمال ہے یعنی بہیمیت کا ملکیت کی تابعداری کرنا (تفصیل مبحث رابع کے باب اول میں گذر چکی ہے) چنانچہ وہ طبیعت بہیمیہ سے نفرت کرنے لگتا ہے اور وہ اس کے ہیجان کو توڑنا چاہتا ہے، پس نہیں پاتا وہ اس چیز کو جو اس کی ضرورت پوری کرے اس معاملہ میں (کسی چیز کو) مانند بھوک پیاس اور ترک جماع کے اور اپنی زبان، دل اور اعضاء کو قابو میں رکھنے کے۔ پس مضبوط پکڑتا ہے وہ ان چیزوں کو اپنے مرض نفسانی کے علاج کے طور پر۔

اور اس کے بعد اس شخص کا درجہ ہے جو یہ باتیں مخبر صادق سے لیتا ہے اپنے دل کی گواہی سے۔

پھر وہ شخص ہے جس کو کھینچتے ہیں اپنی عادت کے تقاضے۔ چنانچہ پریشانی کرتے ہوئے وہ شخص جانتا (روزوں کے ان فوائد کو) نہیں پاتا ہے وہ اس کا نفع آخرت میں جزا کے فوت ہونے کی وجہ سے۔

لغات: اغاثہ: مدد کرنا، اعانت کرنا (ذوذغ ث) ... من تکسار الصور فعمن موا جبہ ہے۔

☆　☆　☆

روزوں کے مقاصد

روزے مختلف مقاصد کے لئے ضروری ہوتے ہیں۔ ذیل میں ان کے تین مقاصد بیان کئے جاتے ہیں۔

(۱) طبیعت کو عقل کا مطیع بنانے کے لئے: کبھی انسان یہ بات سمجھ لیتا ہے کہ دین کے لئے خوبی کی بات یہ ہے کہ طبیعت (نفس) عقل کے ماتحت رہے، مگر طبیعت باغی (سرکش) ہوتی ہے، کبھی اطاعت کرتی ہے، کبھی نہیں کرتی۔ پس اس کے لئے ایک مجاہدہ ضروری ہوتا ہے اور سدھانے کا طریقہ یہ ہے کہ آدمی کوئی سخت دشوار کام (ریاضت) کرے، جیسے روزے کی ریاضت، آدمی حتی الامکان بالخصوص مسلسل لمبی مدت تک روزے رکھے تاکہ طبیعت کو مکلف بنائے اور جو عہد باندھے اس کو پورا کرے، اسی طرح وقتاً فوقتاً کرتا رہے، تاکہ طبیعت اطاعت اور فرمانبرداری کی خوگر ہو جائے۔

فائدہ: روزوں کا یہ مقصد عقلی ہے، کسی دلیل نقلی کا محتاج نہیں۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو روحانیت اور حیوانیت کا مجموعہ بنایا ہے۔ اس کی طبیعت میں وہ سارے داعیے اور مطالبے بھی ہیں جو دوسرے حیوانوں میں ہوتے ہیں اور اس میں وہ نورانی جوہر بھی ہے جو ملائکہ کی خاص دولت ہے اور انسان کی سعادت کا دار و مدار اسی پر ہے کہ اس کا یہ روحانی عنصر حیوانی عنصر پر غالب رہے اور اس کو حدود کا پابند رکھے، اور یہ جب ہی ممکن ہے کہ وہ حیوانی پہلو فرمانبرداری اور اطاعت شعاری کا عادی ہو جائے اور اس کے مقابلہ میں سرکشی نہ کرے۔ روزہ کی ریاضت کا خاص مقصد یہی ہے کہ اس کے ذریعے انسان کی بہیمیت کو ملکیت کی تابعداری اور فرمانبرداری کا خوگر بنایا جائے (ماخوذ از معارف الحدیث ۴:۳۰۳ ملخصاً)

اس سلسلہ میں اسوۂ نبوی وہ ہے جو متفق علیہ روایت میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے وہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ (نفلی) روزے شروع کرتے تھے اور اتنے دنوں تک مسلسل رکھتے رہتے تھے کہ ہم سوچنے لگتے تھے کہ اب آپ روزے بند ہی نہیں کریں گے، پھر بند کر دیتے تھے اور اتنے دنوں تک نہیں رکھتے تھے کہ ہم سوچنے لگتے تھے کہ اب آپ روزے نہیں رکھیں گے اور میں نے رسول اللہ ﷺ کو رمضان کے علاوہ کسی مہینے کے مکمل روزے رکھتے ہوئے نہیں دیکھا اور میں نے جتنا ماہِ شعبان میں آپ کو روزے رکھتے ہوئے دیکھا ہے اتنا کسی اور مہینے میں نہیں دیکھا
(مسلم، کتاب الصوم، باب صیام النبی ﷺ، حدیث نمبر ۲۰۳۶)

اس حدیث سے دو باتیں معلوم ہوئیں: ایک: بہت دنوں تک نفل روزے رکھنا، دوم: اس کی مدت ایک نہ ہونی

چاہئے اس سے زیادہ مسلسل روزے رکھنا صحت کے لئے مضر ہو سکتا ہے۔

(۲) گناہوں کی حفاظت کے لئے: کبھی انسان سے کوتاہی ہو جاتی ہے اور اس سے کوئی گناہ سرزد ہو جاتا ہے تو نفس کو سزا دینے کے لئے اتنے لمبے روزے رکھنے ضروری ہوتے ہیں جو گناہ کے مقابلہ میں اس پر بھاری ہوں، تا کہ دوبارہ اس سے وہ غلطی سرزد نہ ہو۔ رمضان کا روزہ توڑنے کے کفارے میں، ظہار کے کفارے میں، اور قتل خطا کے کفارے میں جو دو ماہ کے مسلسل روزے رکھے گئے ہیں وہ اسی مقصد سے ہیں۔

(۳) وفور شہوت کے علاج کے لئے: جب نفس عورتوں کی طرف بہت زیادہ مائل ہونے لگے اور نکاح کرنے کی مقدرت نہ ہو اور برائی میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہو تو لمبے وقت تک مسلسل روزے رکھنے سے شہوت کی شدت کم ہو جاتی ہے۔ حدیث شریف میں جوانوں سے خطاب آیا ہے کہ:

”اے جوانو! تم میں سے جو شخص گھر بسانے کی سکت رکھتا ہے وہ نکاح کرے، اس لئے کہ نکاح نظر کو بہت زیادہ نیچے رکھنے والا ہے، اور شرمگاہ کی بہت زیادہ حفاظت کرنے والا ہے۔ اور جو نکاح کی استطاعت نہیں رکھتا وہ روزوں کو لازم پکڑے، پس بیشک روزہ اس کے لئے خصی کرنا ہے“ یعنی وہ شہوت کی شدت کو توڑ دیتا ہے (مشکوۃ کتاب النکاح حدیث نمبر ۳۰۸۰)

وربما يتطلع الإنسان على أن انقيادَ الطبيعة للعقل كمالٌ له، وتكون طبيعته باغيةً، تنقاد مرةً ولا تنقاد أخرى، فيحتاج إلى تمرين، فيعمِدُ إلى عملٍ شاقٍّ، كالصوم، فيكلِّف طبيعتَه، ويلتزم وفاءَ العهد، ثم وثم، حتى يحصل الأمرُ المطلوب. وربما يفرُطُ منه ذنب فيلتزمُ صومَ أيامٍ كثيرة، يشق عليه، جزاءً للذنب، ليردعه عن العود إلى مثله. وربما تاقت نفسُه إلى النساء، ولا يجد طَوْلًا، ويخاف العنت، فيكسر شهوته بالصوم، وهو قوله صلى الله عليه وسلم: «فإن الصومَ له وِجاءٌ»

ترجمہ: اور کبھی واقف ہو جاتا ہے آدمی اس بات سے کہ طبیعت کی فرمانبرداری عقل کے لئے بڑی خوبی کی بات ہے اس کے لئے۔ اور اس کی طبیعت سرکش ہوتی ہے، کبھی ماتحتی کرتی ہے اور کبھی نہیں کرتی، پس وہ مشق کا محتاج ہوتا ہے، پس وہ ارادہ کرتا ہے کسی دشوار عمل کا، جیسے روزہ۔ پس وہ مکلف بناتا ہے اپنی طبیعت کو، اور سر لیتا ہے وہ عہد و پیمان کے پورا کرنے کو، پھر اور پھر (یعنی وقفہ وقفہ سے یہ عمل کرے) یہاں تک کہ مطلوبہ مقصد حاصل ہو جائے۔

اور کبھی سرزد ہو جاتا ہے آدمی سے کوئی گناہ، پس وہ سر لیتا ہے اتنے زیادہ دنوں کے روزوں کو جو اس پر شاق ہوں گناہ کے مقابلہ میں تا کہ روکے وہ روزہ اس کو اس طرح کے گناہ سے۔

اور کبھی اس کا نفس مشتاق ہوتا ہے عورتوں کا اور نہیں پاتا وہ استطاعت اور ڈرتا ہے وہ زنا سے، پس توڑتا ہے وہ

شہوت کو روزے کے ذریعہ اور یہی ارشاد نبوی ہے: "پس روزہ یقیناً اس کے لئے خصی (خصی ہونا) ہے"

☆ ☆ ☆

روزوں کے فوائد

حضرت شاہ صاحب قدس سرہ نے روزوں کے چھ فوائد ذکر فرمائے ہیں، جو درج ذیل ہیں:

پہلا فائدہ: روزہ بہت بڑی نیکی ہے۔ اس سے ملکیت کو تقویت ملتی ہے اور بہیمیت کمزور پڑتی ہے، اور روح کے چہرہ پر پانش کرنے کے لئے اور طبیعت کو مغلوب کرنے کے لئے روزوں سے بہتر کوئی چیز نہیں ہے۔ اور روزوں کا بہت بڑی نیکی ہونا درج ذیل متفق علیہ حدیث قدسی سے واضح ہے۔ رسول اللہ ﷺ ارشاد فرماتے ہیں:

"انسان کا ہر عمل بڑھایا جاتا ہے، نیکی دس گنا سے سات سو گنا تک بڑھائی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: مگر روزہ (اس ضابطہ سے مستثنیٰ ہے) پس بیشک وہ میرے لئے ہے، اور میں ہی اس کا بدلہ دونگا۔ آدمی اپنی خواہش اور اپنا کھانا میری وجہ سے چھوڑتا ہے، روزہ دار کے لئے دو خوشیاں ہیں: ایک خوشی اس کے افطار کے وقت اور دوسری خوشی اس کے اپنے رب سے ملنے کے وقت الخ (مشکوۃ کتاب الصوم حدیث نمبر ۱۹۵۹)

روزہ میرے لئے ہے: یعنی ہر عمل میں ریا کا احتمال ہے، مگر روزہ چونکہ ایک مخفی چیز ہے اس لئے اس میں ریا کا احتمال نہ ہونے کے درجہ میں ہے۔ روزہ خالص اللہ ہی کے لئے ہوتا ہے اور وہ اتنی بڑی نیکی ہے کہ اس کے ثواب کا اندازہ فرشتوں کو بھی نہیں ہوتا۔ نہ وہ نیکی کے اجر کو بڑھانے کے معروف ضابطہ کے تحت آتا ہے۔ اس کا اجر قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ہی تجویز فرمائیں گے اور جب بندے کی اللہ کے حضور میں پیشی ہوگی اور اللہ تعالیٰ اس کے روزوں کا ثواب دکھلائیں گے تو بندہ خوش خوش ہو جائے گا۔

دوسرا فائدہ: روزوں سے جس قدر بہیمیت کا ہیجان گھٹتا ہے اسی قدر گناہ معاف ہوتے ہیں۔ متفق علیہ روایت میں ہے: ﴿مَنْ صَامَ رَمَضَانَ إِيْمَانًا وَاحْتِسَابًا غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ﴾ (جو شخص ماہ رمضان کے روزے رکھے بحالت ایمان اور بامید ثواب تو اس کے سابقہ گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں) یہی تاثیر اور خصوصیت تراویح اور شب قدر کے نوافل کی بھی اسی حدیث میں مروی ہے۔

تیسرا فائدہ: روزوں کی وجہ سے انسان میں اور فرشتوں میں نہایت گہری مشابہت پیدا ہوتی ہے اور جب موافقت اور ہم آہنگی ہوتی ہے تو فرشتے روزہ دار سے محبت کرنے لگتے ہیں۔ غرض بہیمیت کے کمزور پڑنے کے بعد روزہ دار فرشتوں کی محبت کا مرکز بن جاتا ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ: "روزہ دار کے منہ کی بو (جو خلو معدہ سے پیدا ہوتی ہے) اللہ

کے نزدیک مشک کی خوشبو سے بہتر ہے" (مشکوٰۃ حدیث نمبر ۱۹۵۹) اور جس سے اللہ تعالیٰ محبت کرتے ہیں، ملائکہ بھی محبت کرنے لگتے ہیں۔

چوتھا فائدہ: نیک بختی حاصل کرنے میں رسم ورواج کا پردہ (حجاب دنیا) بھی حائل ہوتا ہے (تفصیل مبحث چہارم کے باب ششم میں گذر چکی ہے) مگر جب روزے پورے اہتمام اور پابندی کے ساتھ رکھے جاتے ہیں اور وہ ایک مسلّمہ طریقہ بن جاتے ہیں تو بہت سی رواجی برائیوں سے انسان محفوظ ہو جاتا ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ: "جب تم میں سے کسی کا روزہ ہو تو چاہئے کہ وہ بیہودہ اور فحش باتیں نہ بکے اور شور وشغب نہ کرے اور اگر کوئی دوسرا اس سے گالی گلوچ کرے یا جھگڑا کرے تو کہہ دے کہ میرا روزہ ہے" (مشکوٰۃ حدیث نمبر ۱۹۵۹)

پانچواں فائدہ: جب کوئی جماعت جماعتی حیثیت سے روزوں کا اہتمام کرتی ہے تو اس جماعت کے سرکش زنجیروں میں جکڑ دیئے جاتے ہیں اور جنت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں اور دوزخ کے دروازے بند کر دیئے جاتے ہیں (یہ متفق علیہ حدیث کا مضمون ہے، مشکوٰۃ کتاب الصوم حدیث نمبر ۱۹۵۶)

فائدہ: ماہِ رمضان میں چونکہ اللہ کے نیک بندے طاعات وحسنات میں مشغول ومنہمک ہو جاتے ہیں اس لئے ان کی برکات سے عام مؤمنین بھی رمضان میں عبادات کی طرف زیادہ راغب ہو جاتے ہیں پھر اس ماہ میں عمل کی قیمت بھی بڑھا دی جاتی ہے اس لئے بھی لوگ جنت والے اعمال میں مشغول ہو جاتے ہیں اس لئے جنت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں اور عام لوگ بھی بہت سے گناہوں سے کنارہ کش ہو جاتے ہیں اور جہنم والے اعمال سے دست بردار ہو جاتے ہیں اس لئے جہنم کے دروازے بند کر دیئے جاتے ہیں۔ اور نیکی اور عبادت کی اس عام فضا سے وہ تمام طبائع متأثر ہوتی ہیں جن میں کچھ بھی صلاحیت ہوتی ہے اس لئے شیاطین الانس والجن ان کو بہکانے اور گمراہ کرنے سے عاجز اور بے بس ہو جاتے ہیں یعنی بیڑیوں میں جکڑ دیئے جاتے ہیں۔ غرض ان تینوں باتوں کا تعلق ان اہل ایمان سے ہے جو ماہِ مبارک میں خیر وسعادت حاصل کرنے کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ کفار، خدا ناشناس، خدا فراموش اور غفلت شعار لوگوں سے، جو رمضان کی برکات سے کوئی سروکار ہی نہیں رکھتے، ان بشارتوں کا کوئی تعلق نہیں۔

چھٹا فائدہ: روزہ دار کو اللہ تعالیٰ کا وصال نصیب ہوتا ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ حدیث قدسی ﴿الصوم لی وانا أجزی به﴾ میں معروف قراءت تو أَجْزِی (فعل مضارع معروف صیغہ واحد متکلم) ہے۔ اس صورت میں حدیث کا مطلب وہ ہے جو پہلے فائدہ میں گذرا اور یہی صحیح قراءت ہے جس کی سیاق وسباق سے تائید ہوتی ہے۔ اور بعض لوگ اس کو أُجْزٰی (فعل مضارع مجہول صیغہ واحد متکلم) پڑھتے ہیں۔ صوفیہ کے یہاں یہ قراءت معروف ہے۔ اس صورت میں حدیث کا مطلب یہ ہے کہ: "روزے کے بدلہ میں، میں دیا جاتا ہوں" یعنی خود اللہ تعالیٰ روزے دار کو مل جاتے ہیں۔ یہی وصل مع اللہ ہے۔

اور اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ جب کوئی شخص بہیمیت کو مغلوب کرنے کے لئے اور نفس کی برائیاں دور کرنے کے لئے محنت کرتا ہے اور محنت کرکے نفس کو بالکل مصفّٰی کر لیتا ہے تو عالم مثال میں اس کا ہر عمل ایک پاکیزہ صورت اختیار کر لیتا ہے اور اہل اللہ میں سے جو نہایت پاکیزہ اور اونچے درجے کے لوگ ہوتے ہیں وہ (اپنے) عمل کی اس مقدس صورت کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور عالم غیب سے ان کے علم میں تک پہنچ جاتی ہے جس کی وجہ سے ان کا ادراک قوی ہو جاتا ہے اور وہ اس عمل کی پاکیزگی اور صفائی کے راستے سے اللہ تعالیٰ کی ذات تک پہنچ جاتے ہیں۔ یہی مضمون حدیث شریف میں آیا ہے کہ: "روزہ میرے لئے ہے اور میں روزے کی جزا دوں گا"

والصوم حسنة عظيمة، يُقوّي الملكية ويُضعف البهيمة، ولا شيء مثله في صيقلة وجه الروح وقهر الطبيعة، ولذلك قال الله تعالى: ﴿الصوم لي، وأنا أجزي به﴾؛ ويكفر الخطايا بقدر ما اضمحلّ من سورة البهيمة؛ ويحصل به تشبهٌ عظيمٌ بالملائكة، فيحبّونه، ويكون متعلّق الحب أثر ضَعف البهيمية، وهو قوله صلى الله عليه وسلم: ﴿لخلوف فم الصائم أطيبُ عند الله من ريح المسك﴾؛ وإذا جعل رسمًا مشهورًا نفع عن غوائل الرسوم؛ وإذا التزمته أمة من الأمم صُفّدت شياطينها، وفُتحت أبواب جنانها، وغُلّقت أبواب النيران عليها، والإنسان إذا سعى في قهر النفس وإزالة رذائلها، كانت لعمله صورة تقدسية في المثال، ومن أزكياء العارفين من يتوجه إلى هذه الصورة، فيُعَدُّ من الغيب في علمه، فيصل إلى الذات من قبل التنزه والتقدس، وهو معنى قوله صلى الله عليه وسلم: ﴿الصوم لي وأنا أجزي به﴾.

ترجمہ: (۱) اور روزہ ایک بہت بڑی نیکی ہے، وہ ملکیت کو قوی کرتا ہے اور بہیمیت کو ضعیف کرتا ہے۔ اور کوئی چیز نہیں ہے اس کے مانند روح کے چہرے کو پالش کرنے میں اور طبیعت کو مغلوب کرنے میں، اور اسی وجہ سے اللہ پاک ارشاد فرماتے ہیں کہ: "روزہ میرے لئے ہے اور میں ہی اس کا بدلہ دوں گا" (۲) اور روزہ گناہوں کو مٹاتا ہے بہیمیت کے جوش کے مضمحل ہونے کے بقدر (۳) اور روزوں کی وجہ سے بہت بڑی مشابہت پیدا ہو جاتی ہے فرشتوں کے ساتھ۔ پس ملائکہ اس سے محبت کرنے لگتے ہیں۔ پس وہ شخص بہیمیت کے کمزور پڑنے کے بعد فرشتوں کی محبت کے جڑنے کی جگہ بن جاتا ہے اور یہی آپ ﷺ کا ارشاد ہے: "معدہ کے خالی ہو جانے سے روزہ دار کے منہ میں پیدا ہونے والی بو اللہ کے نزدیک مشک کی خوشبو سے زیادہ عمدہ ہے" (۴) اور جب روزہ کو مشہور ریت بنا لیا جائے تو وہ رسوم کی برائیوں میں نفع بخش ہو جاتا ہے (۵) اور جب امتوں میں سے کوئی امت روزوں کا التزام کرتی ہے تو اس کے سرکش بیڑیوں میں جکڑ دیے جاتے ہیں اور ان کی جنتوں کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں اور ان کی دوزخ کے دروازے بھیڑ دیے

جاتے ہیں(۱) اور جب انسان نفس کو مغلوب کرنے کی اور اس کے رذائل کو دور کرنے کی کوشش کرتا ہے تو اس کے عمل کے لئے ایک مقدس صورت عالم مثال میں پیدا ہو جاتی ہے اور تمہارے عارفین (اہل اللہ) میں سے بعض روزہ رکھنے والے اس صورت کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ پس کھول دی جاتی ہے عالم غیب سے ان کے علم میں۔ چنانچہ وہ حضرات اللہ تعالیٰ کی ذات تک پہنچ جاتے ہیں پاکیزگی اور بزرگی کی جانب سے اور یہی معنی ہیں آپ ﷺ کے ارشاد کے کہ: "روزہ میرے لئے ہے اور میں ہی اس کے بدلے میں جزاء کے طور پر دیا جاتا ہوں"

لغات: صقل (ن) صقلا الشیئ: صاف کرنا، چمکدار کرنا، پالش کرنا ... متعلق (اسم مفعول) لٹکنے کی جگہ، مرکز ... یہ بکونہ کی خبر ہے، اسم ضمیر ہے جو صائم کی طرف لوٹتی ہے ... الاثر: بعد، فوراً کہا جاتا ہے خرج فی اثرہ وہ اس کے بعد نکلا، اور علی الاثر کے معنی ہیں فوراً۔

☆ ☆ ☆

اعتکاف کا بیان

اعتکاف کے تعلق سے بھی لوگوں کی تین قسمیں ہیں:

پہلی قسم: کے لوگ وہ ہیں جو اعتکاف کے فوائد کا از خود ادراک کر کے علی وجہ البصیرت اعتکاف کرتے ہیں اور اس کے ثمرات لوٹتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کی سمجھ میں یہ بات اچھی طرح آجاتی ہے کہ ان کا دنیا کے جھمیلوں میں پھنسنا سخت مضر ہے۔ ان کے دل و دماغ میں جو ہمہ وقت دنیاوی تصورات بھرے رہتے ہیں وہ ان کے لئے سخت مضرت رساں ہیں اور یہ بات بھی ان کی سمجھ میں اچھی طرح آجاتی ہے کہ ان کے لئے نفع بخش چیز یہ ہے کہ وہ دنیوی جھمیلوں کو چھوڑ کر کسی مسجد میں گوشہ نشین ہو جائیں اور ہمہ وقت عبادت میں مشغول رہیں۔ مگر حالات اس کی اجازت نہیں دیتے اور ضابطہ یہ ہے کہ جو چیز پوری طرح حاصل نہ ہو سکتی ہو اس کو بالکل چھوڑ بھی نہیں دینا چاہئے۔ بلکہ جس قدر حاصل کرنا ممکن ہو اس کو غنیمت سمجھنا چاہئے، چنانچہ شخص اپنی مشغولیت کے اوقات میں سے کچھ لمحات فارغ کر لیتا ہے اور جس قدر اس کے مقدر میں ہوتا ہے اعتکاف کرتا ہے اور اس کے ثمرات سے بہرہ ور ہوتا ہے۔

دوسری قسم: ان لوگوں کی ہے جن کو اعتکاف کی اہمیت اور اس کے فوائد مخبر صادق (پیغمبر ﷺ) سے معلوم ہوتے ہیں اور ان کا دل گواہی دیتا ہے کہ یہ فوائد برحق ہیں۔ چنانچہ وہ امید فوائد اعتکاف کرتے ہیں اور کامیاب ہوتے ہیں۔

تیسری قسم: عام لوگوں کی ہے جن سے زبردستی مجبور کر کے اعتکاف کرایا جاتا ہے، وہ کشاں کشاں اعتکاف کی طرف لائے جاتے ہیں، یہ لوگ بھی محروم نہیں رہتے۔ اگر دنیا میں ان کو اعتکاف کے فوائد حاصل نہیں بھی ہوتے تو وہ آخرت میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔

وربما يتفطن الإنسان بضرر توغله في معاشه، وامتلاء حواسه مما يدخل عليه من خارج، ويبتغي التفرغ للعبادة في مسجد بُني للصلوة، فلا يمكنه إدامة ذلك، وما لا يُدرك كله لا يُترك كله، فيختطف من أحواله فُرَصًا فيعتكف ما قُدِّر له؛ ويتلوه: المتلقِّي له من المخبر الصادق بشهادة قلبه؛ والعاميُّ المغلوبُ عليه، كمامر.

ترجمہ: اور کبھی انسان سمجھ لیتا ہے دنیا کمانے میں بہت زیادہ انہماک کے ضرر کو، اور اس کے حواس کے لبریز ہوجانے کے ضرر کو ان خیالات سے جو گھستے ہیں اس کے دماغ میں باہر سے۔ اور سمجھ لیتا ہے وہ عبادت کے لئے ہمہ تن فارغ ہوجانے کے نفع کو کسی ایسی مسجد میں جو نمازوں کے لئے بنائی گئی ہو (یعنی جس میں پنج وقتہ پابندی سے نماز ہوتی ہو) پس نہیں ممکن ہوتا اس کے لئے یہ کام مسلسل کرنا (یعنی ہر وقت مسجد میں رہنا) اور جو چیز ساری حاصل نہ کی جاسکتی ہو اس کو بالکل چھوڑنا بھی نہیں چاہئے۔ چنانچہ وہ اچک لیتا ہے (یعنی نکال لیتا ہے) اپنے احوال میں سے چند لمحات کو اور اعتکاف کرتا ہے وہ، جتنا اس کی قسمت میں ہوتا ہے — اور پیچھے آتا ہے اس کے وہ شخص جو اعتکاف کے فوائد حاصل کرنے والا ہے مخبر صادق سے، اپنے دل کی گواہی سے — اور (اس کے بعد) وہ عام مسلمان ہے جس سے زبردستی اعتکاف کروایا جاتا ہے، جیسا کہ گذرا۔

لغات:

توغّل في البلاد: جانا اور دور تک چلا جانا وَغَلَ يَغِلُ وُغُولاً في الشيء: داخل ہوکر چھپنا اور دور تک جانا۔ ....
المتلقي (اسم فاعل) تَلَقّى الشيءَ: استقبال کرنا۔ .. المغلوب عليه: ہارا ہوا، مجبور کیا ہوا۔

☆ ☆ ☆

اعتکاف کے فوائد

حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ نے اعتکاف کے دو فائدے ذکر فرمائے ہیں، جو درج ذیل ہیں:

پہلا فائدہ: معتکف زبان کے گناہوں سے بچا رہتا ہے: کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آدمی روزہ تو رکھ لیتا ہے یعنی مفطرات ثلاثہ سے تو رک جاتا ہے مگر وہ آزاد اور زبان کو معاصی سے نہیں بچاپاتا۔ پس اس کا بہترین علاج اعتکاف ہے۔ اعتکاف میں آدمی ہر طرف سے یکسو اور سب سے منقطع ہوکر رہ جاتا ہے اس لئے وہ ہر قسم کے گناہوں سے اور فضول باتوں سے بچا رہتا ہے۔ ابن ماجہ میں روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اعتکاف کرنے والے کے بارے میں فرمایا کہ: "وہ (اعتکاف کی وجہ سے اور مسجد میں مقید ہوجانے کی وجہ سے) گناہوں سے بچا رہتا ہے" (مشکوۃ باب الاعتکاف حدیث نمبر ۲۱۰۸)

دوسرا فائدہ: شب قدر کی تلاش کرنا: شب قدر رمضان شریف میں دائر ہے اور اکثر عشرۂ اخیرہ میں آتی ہے۔ انسان کبھی شب قدر کا متلاشی ہوتا ہے، وہ چاہتا ہے کہ اس رات میں عبادت کرکے ملائکہ کی لڑی میں منسلک ہوجائے۔ مگر عمر میں دو کر راتوں میں جاگنا مشکل ہوتا ہے، پس اس کی بہترین تدبیر اعتکاف کرنا ہے۔ معتکف مسجد میں پڑا سوئے گا بھی تو وہ عبادت شمار ہوگی اور اس صورت میں شب قدر میں عبادت کرنے کا ثواب مل جائے گا۔ اور پہلے فائدہ میں جو حدیث ذکر کی ہے، اس میں یہ بھی ہے کہ: "معتکف کے لئے وہ سب نیکیاں جاری کی جاتی ہیں جو نیکیاں کرنے والا کرتا ہے"
اور شب قدر کا تفصیلی بیان کتاب کی قسم دوم میں باب الصوم کے آخر میں آئے گا۔

وربما يصوم ولا يستطيع تنزيهَ لسانه إلا بالاعتكاف؛ وربما يطلب ليلةَ القدر والتصوق بالملائكة فيها، فلا يتمكن منها إلا بالاعتكاف؛ وسيأتيك معنى ليلة القدر، والله أعلم.

ترجمہ: اور کبھی آدمی روزہ رکھتا ہے اور اپنی زبان کی حفاظت نہیں کرسکتا ہے مگر اعتکاف کے ذریعہ ـــــ اور کبھی آدمی شب قدر کو تلاش کرتا ہے اور اس رات میں (عبادت کرکے) ملائکہ کے ساتھ ملنے کا خواہش مند ہوتا ہے۔ پس نہیں قادر ہوتا وہ شب قدر (کو پانے) پر مگر اعتکاف کے ذریعہ ـــــ اور عنقریب آئیں گے تیرے پاس شب قدر کے معنی۔ باقی اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں۔

باب ـــــ ۱۲

حج کی حکمتوں کا بیان

لفظ حج کے لغوی معنی ہیں: کسی جگہ کا ارادہ کرنا۔ زیارت اور یاترا قریب الفاظ ہیں اور اصطلاح میں حج ایک معروف عبادت ہے جو اسلام کے پانچ ارکان میں سے آخری رکن ہے۔

حج کی حقیقت کیا ہے؟

حج درحقیقت مخصوص وقت میں اور مخصوص جگہ میں نیک لوگوں کی بہت بڑی جماعت کے اکٹھا ہونے کا نام ہے۔ اور وہ وقت ایسا ہونا چاہئے جس میں ان حضرات کی یاد تازہ ہو، جن پر اللہ تعالیٰ نے خصوصی فضل وکرم فرمایا ہے یعنی انبیائے کرام، صدیقین، شہداء اور صالحین کی زندگیاں یاد آئیں۔ اور وہ جگہ ایسی ہونی چاہئے کہ اس میں دین کی واضح نشانیاں ہوں، وہاں اکابر دین کی جماعتیں آتی رہی ہوں، اور دین کی یادگاروں کی تعظیم کرتے رہے ہوں، وہاں وہ اللہ کے

سامنے گڑگڑاتے رہے ہوں، اللہ سے خیر کی امید باندھ کر اور گناہوں کی معافی کی آرزو لے کر وہاں حاضر ہوتے رہے ہوں۔ جب ایسے زمانہ میں اور ایسی جگہ میں نیک لوگ بڑی تعداد میں اکٹھا ہو کر اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ تام کرتے ہیں تو ضرور رحمت خداوندی اور مغفرت الٰہی نازل ہوتی ہے۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ: "شیطان عرفہ کے دن میں جس قدر ذلیل، دھتکارا ہوا، حقیر اور غضبناک نظر آتا ہے اتنا کسی اور دن میں نظر نہیں آتا اور اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ رحمت الٰہی کا نزول اور اللہ تعالیٰ کا بڑے بڑے گناہوں سے درگذر کرنا دیکھتا ہے الخ (مشکوٰۃ کتاب المناسک، باب الوقوف بعرفۃ، حدیث نمبر ٢٦٠٠)

﴿باب أسرار الحج﴾

اعلم أن حقيقة الحج: اجتماعُ جماعة عظيمة من الصالحين: في زمان، يُذكِّر حال المنعم عليهم من الأنبياء والصديقين والشهداء والصالحين، ومكانٍ فيه آيات بينات، قد قصده جماعات من أئمة الدين، معظِّمين لشعائر الله، متضرِّعين، راغبين وراجين من الله الخيرَ، وتكفيرَ الخطايا؛ فإن الهمم إذا اجتمعت بهذه الكيفية لايتخلف عنها نزولُ الرحمة والمغفرة، وهو قوله صلى الله عليه وسلم: ﴿ما رُئِيَ الشيطانُ يوما هو فيه أصغر، ولا أدحر، ولا أحقر، ولا أغيظ منه في يوم عرفة﴾ الحديث.

ترجمہ: حج کے رموز کا بیان: جان لیں کہ حج کی حقیقت: نیک لوگوں کی بہت بڑی جماعت کا اکٹھا ہونا ہے، کسی ایسے زمانہ میں جو یاد دلائے ان لوگوں کی حالت کو جن پر انعام کیا گیا ہے یعنی انبیاء، صدیقین، شہداء اور نیک لوگ: اور کسی ایسی جگہ میں جس میں کھلی نشانیاں ہوں، جس کا قصد کیا ہوا کابرین کی مختلف جماعتوں نے، شعائر اللہ کی تعظیم کرتے ہوئے، گڑگڑاتے ہوئے، رغبت کرتے ہوئے، اللہ سے بھلائی کی اور گناہوں کی معافی کی امید رکھتے ہوئے۔ پس بیشک کامل توجہات جب اکٹھا ہو جاتی ہیں اس کیفیت کے ساتھ تو پیچھے نہیں رہتا ان سے مہربانی اور بخشش کا اترنا اور اس کا تذکرہ اس ارشاد نبوی میں ہے کہ: "نہیں دیکھا گیا شیطان کسی دن، جس میں وہ نہایت ذلیل، نہایت دھتکارا ہوا، نہایت حقیر اور نہایت غضبناک ہو اس سے عرفہ کے دن میں" حدیث آخر تک پڑھیے۔

ترکیب: بملہ یذکر صفت ہے زمان کی ... معظمین وغیرہ احوال ہیں جماعات کے۔

☆ ☆ ☆

حج ہر حالت میں ہے

کچھ بے دین لوگ سوچتے ہیں: حج میں کتنا بڑا سرمایہ برباد ہوتا ہے؟ اور کتنا وقت کا ہرج ہوتا ہے؟ آخر حج کا مقصد

کیا ہے؟ اللہ کی عبادت تو ہر جگہ سے کی جاسکتی ہے؟ یہ دنیا کے تمام لوگوں کا دور دراز کا سفر کر کے ایک جگہ اکٹھا ہونا آخر کیوں ضروری ہے؟

شاہ صاحب رحمہ اللہ اس سوال مقدر کا جواب دیتے ہیں کہ حج کی اصل تو ہر ملت میں موجود ہے، تمام قوموں میں یاتراؤں اور میلوں ٹھیلوں کا رواج ہے، اسلام میں یہ کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگوں کے لئے تین چیزیں ضروری ہیں:

۱ — کوئی ایسی جگہ ہونی ضروری ہے، جس سے لوگ برکت حاصل کریں۔ اور وہ جگہ متبرک اس لئے قرار پائی ہو کہ لوگوں نے وہاں اللہ کی نشانیوں کو نمودار ہوتے ہوئے دیکھا ہو۔

۲ — لوگوں کے لئے قربانیاں بھی ضروری ہیں یعنی ایسے طریقے ہونے ضروری ہیں جن سے لوگ اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کریں، خواہ وہ جانور کی قربانی ہو یا کوئی اور عمل ہو۔

۳ — ایسی شکلیں بھی ضروری ہیں جو اکابر ملت سے مروی ہوں، جیسے احرام کا مخصوص لباس، سعی اور رمی جمار کی شکلیں تاکہ لوگ ان کا التزام کریں۔ ان مخصوص شکلوں سے مقربین کی یاد تازہ ہوتی ہے اور ان اکابر کے احوال یاد آتے ہیں۔

انہی تین چیزوں کے مجموعہ کا نام حج ہے، جس کا رواج ہر قوم میں ہے، اسلام میں یہ کوئی انوکھی چیز نہیں ہے۔

> وأصلُ الحج موجودٌ في كل أمة، لابدلهم من موضع يتبركون به، لِمَا رَأَوْا من ظهور آياتِ الله فيه، ومن قرابينَ، وهيئاتٍ مأثورة عن أسلافهم، يلتزمونها، لأنها تذكُرُ المقرَّبين وما كانوا فيه.

ترجمہ: اور حج کی اصل ہر امت میں موجود ہے، لوگوں کے لئے کوئی ایسی جگہ ہونی ضروری ہے، جس سے وہ برکت حاصل کریں، بایں وجہ کہ دیکھی ہے انھوں نے اس جگہ میں اللہ کی نشانیوں کو نمودار ہوتے ہوئے اور ضروری ہیں قربانیاں اور ایسی شکلیں جو ان کے اکابر سے منقول ہوں، جن کا وہ التزام کریں۔ اس لئے کہ وہ شکلیں مقربین کی یاد تازہ کرتی ہیں اور وہ احوال یاد دلاتی ہیں جن میں وہ اکابر تھے۔

لغات: لِمَا میں ما مصدریہ ہے ...... من قرابین کا عطف باعادۂ جار من موضع پر ہے ...... قرابین جمع ہے قُربان کی قُرمان: ہر وہ چیز ہے جس سے اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کیا جائے، خواہ وہ جانور کی قربانی ہو یا کوئی اور چیز ہو۔

حج بیت اللہ ہی کا برحق ہے

کچھ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ حج اور یاترا کے لئے مکہ ہی جانا کیوں ضروری ہے؟ اپنے ملک میں ایسی زیارت گاہیں

کیوں نہیں بنائی جاتیں جہاں کا حج کرلیا جائے؟ جیسے شیعوں نے ہر ملک میں کربلا اور امام باڑہ بنالیا ہے اور غایت درجہ جاہلوں میں یہ خیال پایا جاتا ہے کہ سات بار اجمیر والے خواجہ کی زیارت ایک حج کے برابر ہے۔ اور خیال ہی نہیں، وہ اس پر عمل پیرا بھی ہیں۔

شاہ صاحب رحمہ اللہ اس سوال مقدر کا بھی جواب دیتے ہیں کہ حج بیت اللہ ہی کا برحق ہے۔ کیونکہ اس میں واضح نشانیاں ہیں۔ ایک نشانی تو حجرِ اسود ہے جو جنت سے ابوالبشر حضرت آدم علیہ السلام کے ساتھ اتارا گیا ہے، جو پہلے کعبہ شریف کے اندر رکھا ہوا تھا۔ پھر اسلام سے بہت پہلے حوادث سے بچانے کے لئے کعبہ شریف کے ایک کونہ میں اس کو جڑ دیا گیا ہے۔ اس پتھر کی یہاں موجودگی یہ بات یاد دلاتی ہے کہ یہاں انسانیت کے جدِ امجد حضرت آدم علیہ السلام کے قدم مبارک آئے ہیں اور انھوں نے اس گھر کا حج کیا ہے۔

اور دوسری نشانی وہ پتھر ہے جس پر کھڑے ہو کر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کعبہ شریف تعمیر کیا تھا اور جس پر آج بھی آپ کے قدموں کے نشان موجود ہیں جس کو "مقام ابراہیم" کہتے ہیں۔ یہ پتھر بھی پہلے کعبہ شریف کے اندر رکھا ہوا تھا اور اب کعبہ شریف سے باہر چند گز کے فاصلہ پر رکھا ہوا ہے۔ اس پتھر کی یہاں موجودگی بھی پتہ دے رہی ہے کہ یہاں ابراہیم علیہ السلام کے قدم آئے ہیں، گویا یہ بھی ایک تاریخی ٹھوس دلیل ہے کہ یہ گھر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاک ہاتھوں سے تعمیر ہوا ہے۔

بیت اللہ شریف کو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بمعاونت حضرت اسمٰعیل علیہ السلام، طوفانِ نوح علیہ السلام کے بعد اللہ کے حکم سے اللہ کی وحی کے مطابق، ایک چٹیل دشوار گزار سرزمین میں از سرِ نو تعمیر کیا ہے۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بزرگی، عظمت اور جلالتِ شان کی گواہی دنیا کی اکثر اقوام دیتی ہیں۔ مسلمان اور یہود و نصاریٰ جو دنیا کی آبادی کا بڑا حصہ ہیں ان کو اپنا جدِ امجد اور بڑا مانتے ہیں۔

غرض بیت اللہ کے علاوہ کوئی بھی مقام ایسا نہیں ہے جس کا حج کیا جائے۔ دیگر جگہیں جن کی لوگ زیارت کرتے ہیں ان میں یا تو شرک کیا جاتا ہے جیسے اجمیر شریف میں۔ میں نے بچشم خود وہاں مسلمانوں کو قبر کا سجدہ کرتے، طواف کرتے، استمداد کرتے اور مرادیں مانگتے دیکھا ہے۔ یا پھر وہ جگہیں محض من گھڑت ہیں جن کی کوئی اصلیت نہیں، جیسے ہندوؤں کی تیرتھ گاہیں جن کی یاترا کے لئے ہندو جاتے ہیں یہ سب من گھڑت ہیں۔ کیونکہ ہندوستان کا بھی اصل مذہب اسلام ہے اور اس کا قبلہ کعبہ شریف ہے اور اس کی واضح نشانی یہ ہے کہ تمام بڑے مندر قبلہ رخ بنے ہوئے ہیں یعنی ان کا دروازہ مسجد کی طرح مشرق کی جانب ہے اور سمتِ مغرب کی جانب محراب کی جگہ بت نصب کیا گیا ہے یہ اس بات کا ٹھوس ثبوت ہے کہ یہ مندر در حقیقت مساجد ہیں، ورنہ ہندو بتائیں کہ آخر اس طرح مندر بنانے کی کیا وجہ ہے؟ اور جب اس ملک کا مذہب بھی اسلام تھا تو ان کی زیارت گاہیں بھی یقیناً کعبہ شریف اور اس کے پاس کے مقامات ہیں اور یہاں جو

تیرتھ کا ہیں بنائی گئی ہیں وہ سب محض فرضی اور من گھڑت ہیں۔

واحقُّ ما يُحَجُّ إليه بيتُ الله، فيه آيات بينات، بناه إبراهيمُ ۔ صلوات الله عليه ۔ المشهودُ له بالخير على ألسنة أكثرِ الأمم، بأمر الله ووحيه، بعد أن كانت الأرض قفرًا وَعرًا، إذ ليس غيرُهُ محجوجٌ إلا وفيه إشراكٌ أو اختراعُ ما لا أصل له۔

ترجمہ: اور سب سے زیادہ حقدار ان جگہوں میں جن کا حج کیا جائے بیت اللہ ہے۔ اس میں واضح نشانیاں ہیں۔ اس کو ابراہیم ـــــ اللہ کی بے پایاں رحمتیں ہوں ان پر ـــــ نے تعمیر کیا ہے جن کے لئے بھلائی کی گواہی دی گئی ہے اکثر اقوام کی زبانی (اس گھر کو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تعمیر کیا ہے) اللہ کے حکم سے اور اللہ کی وحی کے مطابق، اس کے بعد کہ تھی سرزمین چٹیل دشوار گزار۔ کیونکہ بیت اللہ کے علاوہ کوئی حج کرنے کی جگہ نہیں ہے مگر درانحالیکہ اس میں شریک ٹھہرانا ہے یا ایسی چیز کو گھڑنا ہے جس کی کچھ اصل نہیں۔

لغات: القفر: ارض خالية، لاماء بها: چٹیل زمین ..... الوعر: دشوار گزار راستوں والی سرزمین ..... المحجوج: حج کرنے کی جگہ۔

حج کے مقاصد

حج مختلف مقاصد سے ضروری ہوا ہے۔ ذیل میں حج کے چار مقاصد ذکر کئے جاتے ہیں:

پہلا مقصد: حج سامانِ تطہیر ہے ـــــ حج آدمی کو گناہوں سے تو پاک صاف کرتا ہی ہے اس کے باطن کو بھی پاکیزہ بنا دیتا ہے۔ کیونکہ باطن کی پاکی کے اسباب میں سے ایک اہم سبب ایسی جگہوں میں پہنچنا ہے جن کی نیک لوگ ہمیشہ تعظیم کرتے رہے ہوں، وہاں پہنچتے رہے ہوں اور ذکر اللہ سے ان جگہوں کو آباد کرتے رہے ہوں۔ ایسی بابرکت جگہوں میں پہنچ کر آدمی زمینی فرشتوں کی کامل توجہات کا مرکز بن جاتا ہے اور اہلِ خیر کے لئے ملا اعلیٰ (آسمانی فرشتوں) کی عمومی دعاؤں کا رخ بھی اس کی طرف مڑ جاتا ہے۔ ایسی جگہوں میں پہنچنے پر آدمی پر ملکوتی انوار چھا جاتے ہیں۔ شاہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں نے بچشم خود ان انوار کا مشاہدہ کیا ہے۔ غرض اس طرح آدمی کا باطن بھی پاک وصاف ہو جاتا ہے۔

دوسرا مقصد: حج ذکرِ الٰہی ہے ـــــ دین کی یادگاروں کو دیکھنا اور ان کی تعظیم کرنا بذاتِ خود اللہ کا ذکر ہے، کیونکہ جب شعائر الٰہیہ نظر پڑتے ہیں تو خود بخود اللہ تعالیٰ یاد آ جاتے ہیں جس طرح ملزوم کو دیکھ کر لازم یاد آ جاتا ہے، سورج کو دیکھ کر روشنی اور آگ کو دیکھ کر گرمی ذہن میں مستحضر ہو جاتی ہے اسی طرح متبرک مقامات کو دیکھ کر اللہ کی یاد تازہ ہو جاتی

ہے۔ خاص طور پر جبکہ آدمی اپنی شکل وصورت بھی ایسی بنائے ہوئے ہو جس سے تعظیم متحقق ہو اور ایسی شرائط وقیود کی پابندی کر رہا ہو جو نفس کو بہت زیادہ چوکنا کرنے والی اور غفلت دور کرنے والی ہوں۔

تیسرا مقصد: حج وصلِ حبیب کی ایک شکل ہے —— کبھی آدمی کے دل میں اللہ سے ملنے کا بے پناہ جذبہ ابھرتا ہے: وہ شوقِ ملاقات میں تڑپتا ہے مگر عالمِ ناسوت میں وصال ممکن نہیں ہوتا تو اس کے جذبہ کی تسکین کے لئے کوئی نہ کوئی چیز ضروری ہوتی ہے جس سے وہ دل بہلائے۔ ایسی چیز حج کی عبادت ہے اس کے علاوہ کوئی چیز ایسی نہیں جو اس کے جذبہ کی تسکین کرسکے۔ اور حج باعثِ تسکین اس طرح ہے کہ جب محبوب سے ملنے کی دل میں تڑپ پیدا ہو اور ملاقات کی کوئی صورت نہ ہو تو دیارِ حبیب کے پھیرے لگانا، اس کی گلی کوچوں میں گھومنا بھی دل کو تسکین بخشتا ہے۔

چوتھا مقصد: حج ملی شان وشوکت اور باہمی تعارف کا ذریعہ ہے —— ہر حکومت وقفہ وقفہ سے دربارِ عام منعقد کرتی ہے اور اس میں مملکت کے چیدہ لوگوں کو مدعو کرتی ہے۔ اور اجتماع کے مقاصد شاہی کے طور پر درج ذیل ہوتے ہیں:

۱ — خیر خواہوں کو دھوکہ بازوں سے اور تابعداروں کو سرکشوں سے ممتاز کرنا۔ جو دعوت پر حاضرِ دربار ہوں گے وہ مخلص وتابعدار ہیں اور جو جان بوجھ کر غیر حاضر رہیں گے وہ مکار وسرکش ہیں۔

۲ — بادشاہ اور حکومت کی شہرت کرنا اور ان کا آوازہ بلند کرنا۔

۳ — باشندگانِ مملکت کا باہم ملنا اور ایک دوسرے سے متعارف ہونا۔

اسی طرح ملتِ اسلامیہ کے لئے حج کی ضرورت ہے۔ حج کے عالمگیر اجتماع میں مثال کے طور پر درج ذیل فوائد ہیں:

۱ — مخلص اور منافق میں امتیاز کرنا۔ جو ایمان میں سچا ہوگا، وہ بدنی ومالی حیثیت سے جب بیت اللہ تک پہنچنے کی قدرت رکھتا ہوگا تو ضرور حاضری دے گا۔ اور جو ایمان کا دعوے دار یہ زحمت اٹھانے سے انکار کرے گا، تو گویا وہ دعوئے محبت میں جھوٹا ہے۔

۲ — دنیا جہاں کے لوگوں کے سامنے مسلمانوں کی تعداد کا آنا کہ وہ دنیا میں کتنے ہیں؟ اور کہاں رہتے ہیں؟ اور وہ اس طرح کہ جو لوگ ہر سال حج کے لئے آتے ہیں وہ مسلمانوں کی مجموعی تعداد کا ہزارواں حصہ بھی نہیں ہوتے۔ جاہل لوگ حاجیوں کی تعداد سے اندازہ کرلیں گے کہ دنیا میں مسلمانوں کی تعداد کتنی ہوسکتی ہے اور وہ کہاں کہاں رہتے ہیں؟

۳ — حج کے اجتماع میں دنیا کے بڑے لوگوں سے ملاقات ہوتی ہے اور ایک دوسرے سے تمدنی، سیاسی اور علمی مسائل پر تبادلۂ خیال ہوتا ہے۔ علوم وفنون اور خصوصی کمالات وامتیازات میں لوگ ایک دوسرے سے استفادہ کرتے ہیں اور کمالات حاصل کرنے کی یہی صورت ہے کہ لوگ ایک دوسرے سے ملیں اور معلومات کا باہم تبادلہ کریں اور یہ بات انسان کے لئے تقریباً ناممکن ہے کہ وہ ساری دنیا کا سفر کرے اور ہر صاحبِ کمال سے کمال حاصل کرے۔ البتہ حج کا اجتماع ایک ایسا قدرتی اجتماع ہے جہاں پوری دنیا کے بڑے لوگوں سے بسہولت ملاقات ہوسکتی ہے اور مکہ میں اور منی

حرکات کے میدانوں میں شاذ و نادر ہی ایک ساتھ فرش خاک پر بیٹھ کر ایک دوسرے سے استفادہ بھی کر سکتے ہیں۔

نوٹ: آج کل حاجیوں کی کثرت تعداد کی وجہ سے اور ہوائی سفر کی وجہ سے مدت قیام بہت ہی مختصر ہوگئی ہے اس سے افادہ و استفادہ مشکل ہوگیا ہے۔

ومن باب الطهارة النفسانية الحلول بموضع لم يزل الصالحون يعظمونه، ويحلّون فيه، ويحضرونه بذكر الله، فإن ذلك يجلب تعلق همم الملائكة السفلية، ويطلق عليه دعوة الملأ الأعلى الكلية لأهل الخير، فإذا حلّ به غلب ألوانهم على نفسه، وقد شاهدت ذلك رأي عين.

ومن باب ذكر الله تعالى رؤية شعائر الله وتعظيمها، فإنها إذا رؤيت ذُكر الله، كما يذكر المعشوق بالآثار، لا سيما عند التزام هيئات تعظيمية، وقيود وحدود تنبه النفس تنبيها عظيما.

وربما يشتاق الإنسان إلى ربه أشد شوق، فيحتاج إلى شيء يقضي به شوقه، فلا يجده إلا الحج.

وكما أن الدولة تحتاج إلى عرضة بعد كل مدة، ليتميز الناصح من الغاش، والمنقاد من المتمرد، وليرتفع الصيت، وتعلو الكلمة، ويتعارف أهلها فيما بينهم، فكذلك الملة تحتاج إلى حج، ليتميز الموافق من المنافق، وليظهر دخول الناس في دين الله أفواجا، وليرى بعضهم بعضا فيستفيد كل واحد ما ليس عنده، إذ الرغائب إنما تكتسب بالمصاحبة والتراءي.

ترجمہ: اور دل کی پاکی کے باب سے ہے ایسی جگہ میں اترنا جس کی نیک لوگ برابر تعظیم کرتے رہے ہیں اور جس میں وہ اترتے رہے ہیں (یعنی زیارت کے لئے وہاں آتے رہے ہیں) اور جس کو ذکر اللہ سے آباد کرتے رہے ہیں۔ پس بیشک یہ چیز (یعنی ایسی جگہ میں زیارت کے لئے جانا) زمینی فرشتوں کی کامل توجہات کا تعلق کھینچتی ہے اور اس پر اہل خیر کے لئے بالائی فرشتوں کی عمومی دعاؤں کا رخ موڑتی ہے۔ پس جب وہ شخص اس جگہ میں اترتا ہے تو اس کی ذات پر فرشتوں کے انوار چھا جاتے ہیں اور تحقیق مشاہدہ کیا ہے میں نے اس کا (یعنی ان انوار کا) اپنی سر کی آنکھوں سے۔

اور ذکر اللہ کے باب سے ہے شعائر اللہ کو دیکھنا اور ان کی تعظیم کرنا۔ اس لئے کہ جب شعائر اللہ نظر پڑتے ہیں تو اللہ تعالیٰ یاد آتے ہیں جس طرح محبوب، لازم کو دیکھ کر یاد آتا ہے۔ خاص طور پر تعظیمی شکلوں کے التزام کی صورت میں اور ایسی حدود و قیود کی پابندی کرنے کی صورت میں جو نفس کو بہت زیادہ چونکا دیتی ہوں۔

اور کبھی انسان مشتاق ہوتا ہے اللہ تعالیٰ سے ملنے کی طرف بے حد مشتاق ہوتا ہے۔ پس اس کے لئے ضروری ہوتی ہے کوئی ایسی چیز جس کے ذریعہ وہ اپنا شوق پورا کرے۔ پس نہیں پاتا وہ اس کو مگر حج میں۔

اور جس طرح یہ بات ہے کہ گورنمنٹ محتاج ہوتی ہے ایک عرصہ کے بعد دربار منعقد کرنے کی طرف۔ تاکہ خیرخواہ

دھوکہ باز سے اور تابعدار سرکش سے ممتاز ہو جائے اور تاکہ شہرت پھیلے اور آواز بلند ہو اور مملکت کے باشندوں کا باہمی تعارف ہو۔ یہی اسی طرح ملت بھی محتاج ہے حج کی طرف تاکہ مخلص منافق سے ممتاز ہو جائے اور تاکہ ظاہر ہو لوگوں کا داخل ہونا اللہ کے دین میں گروہ در گروہ اور تاکہ بعض بعض کو دیکھیں (یعنی ملاقات کریں) پس حاصل کرے ہر ایک وہ بات جو اس کو حاصل نہیں ہے۔ کیونکہ رغبتیں رفاقت سے اور ایک دوسرے کی ملاقات ہی سے حاصل کی جاتی ہیں۔

لغات:

من باب ابلغ خبر مقدم ہے اور الحلول اور رؤیۃ مبتدا مؤخر ہیں ... حَلَّ (ن ض) حلاً و حلولاً المکانَ وبالمکان: نازل ہونا، اترنا۔ یخطب اور یعطف کا فاعل ضمیر ہے جو ذلک کی طرف عائد ہے۔ رأی عین منصوب بنزع خافض ہے ای کرأی عین۔ عرضۃ: پیش ... الغاش: دھوکہ باز ..... الصیت: شہرت۔ تراءی تراءیاً: ایک دوسرے کو دیکھنا .. لیظھر دخول الناس کا مطلب وہ ہے جو اوپر عرض کیا گیا ہے کہ دنیا میں مسلمانوں کی بے پناہ تعداد کا اندازہ حج سے ہو جائے گا۔

☆ ☆ ☆

حج کے فوائد

اب ذیل میں حج کے تین اہم فائدے ذکر کئے جاتے ہیں:

پہلا فائدہ: حج رواجی برائیوں سے بچاتا ہے —— مبحث رابع کے باب ششم میں بہ تفصیل یہ بات گذر چکی ہے کہ ظہور فطرت کے لئے تین چیزیں مانع ہیں، ان میں سے ایک حجاب رسم ہے یعنی آدمی رواج کے چکر میں کچھ اس طرح پھنسا رہتا ہے کہ وہ کمال نفسانی کی تحصیل کی طرف متوجہ نہیں ہوتا۔ لیکن اگر حج کو ایک مشہور رسم بنا دیا جائے اور ہر شخص ہمہ وقت حج کے لئے فکر مند رہے تو وہ رسوم کی آفتوں سے بچ جاتا ہے۔ فضول خرچی نہیں کرتا۔ شادی بیاہ میں پیسہ نہیں اڑاتا، عیش و عشرت میں دولت برباد نہیں کرتا۔ ہر وقت اس پر حج کے لئے رقم پس انداز کرنے کی فکر سوار رہتی ہے اس لئے وہ بہت سی رواجی برائیوں سے بچ جاتا ہے۔ اور جب زندگی گذارنے کا ایک نہج بن جاتا ہے تو وہ حج کے بعد بھی رسوم میں پیسہ برباد نہیں کرتا۔

دوسرا فائدہ: حج اکابر ملت کے احوال یاد دلاتا ہے اور ان کو اپنانے کی ترغیب دیتا ہے —— ملت اسلامیہ کے اکابر سیدنا ابراہیم، سیدنا اسماعیل اور سید المرسلین خاتم النبیین حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین ہیں۔ یہ حضرات امت اسلامیہ کے لئے اسوہ ہیں۔ حج میں ان بزرگوں کے احوال کی یاد تازہ ہوتی ہے اور ان کی پیروی کا جذبہ ابھرتا

ہے۔ حرمین میں پہنچ کر حضور اکرم ﷺ کی زندگی کا ایک ایک واقعہ اور آپ کی تریسٹھ سالہ زندگی کے شب و روز نگاہوں کے سامنے آجاتے ہیں اور شدت سے یہ جذبہ دل میں ابھرتا ہے کہ آپ ﷺ کی پیروی ہی میں دونوں جہان کی سعادت مضمر ہے۔

تیسرا فائدہ: حج مبرور سے تمام گناہ معاف ہوجاتے ہیں —— چونکہ حج کے لئے دور دراز کا سفر کرنا پڑتا ہے، بڑی رقم خرچ کرنی پڑتی ہے اور طرح طرح کی مشقتوں سے گذرنا پڑتا ہے، اس لئے اگر انسان خالص اللہ تعالیٰ کے لئے حج کرے اور تمام آداب کی رعایت کے ساتھ کرے تو حج سے تمام سابقہ گناہ معاف ہوجاتے ہیں۔ متفق علیہ روایت میں ہے کہ: "جو شخص اللہ تعالیٰ کے لئے حج کرے پس نہ تو رفث (زن و شوئی کی بات) کرے اور نہ کوئی اور گناہ کرے تو وہ حج سے ایسا پاک صاف ہوکر لوٹے گا جیسا وہ اس دن تھا جس دن اس کو اس کی ماں نے جنا تھا" (مشکوۃ، کتاب المناسک، حدیث نمبر ۲۵۰۷) دوسری حدیث میں ہے کہ اسلام، ہجرت اور حج میں سے ہر ایک سابقہ تمام گناہوں کو ڈھا دیتے ہیں (یہ خلاصۂ حدیث ہے اور روایت ترغیب منذری (۱۶۳:۲) میں ہے)

غرض حج کفارۂ سیئات ہونے میں ایمان اور ہجرت کی طرح ہے۔ ایمان قبول کرنا بھی معمولی عمل نہیں ہے، بڑے دل گردے کا کام ہے، نومسلموں کو ایمان لانے کے بعد نہ جانے کن آزمائشوں سے گذرنا پڑتا ہے۔ یہی حال ہجرت کا ہے۔ اعزہ واقرباء، مال و دولت اور وطن کو خیر باد کہنا پڑتا ہے۔ یہ کوئی معمولی حوصلہ کا کام نہیں ہے۔ اس لئے تینوں اعمال کا صلہ یہ ہے کہ وہ سابقہ تمام گناہوں کو ڈھا دیتے ہیں۔

وإذا جُعل الحجُّ رسمًا مشهورًا نفع من غوائل الرسوم؛ ولا شيئ مثله في تذكُّر الحالة التي كان فيها أئمةُ الملة، والتحضيض على الأخذ بها؛ ولما كان الحج سفرًا شاسعًا، وعملاً شاقًا، لايتم إلا بجهد الأنفس، كان مباشرتُه خالصًا لله، مكفِّرًا للخطايا، هادمًا لما قبله، بمنزلة الإيمان.

ترجمہ: اور جب حج کو مشہور ریت بنالیا جائے (یعنی ہر شخص حج کے لئے فکر مند رہے) تو وہ رسوم کی آفتوں سے بچاتا ہے —— اور کوئی چیز نہیں ہے حج جیسی اُس حالت کو یاد دلانے میں جس میں ملت کے اکابر تھے اور اس حالت کے اختیار کرنے پر ابھارنے میں —— اور جب حج دور دراز کا سفر تھا اور ایک ایسا دشوار کام تھا جو پورا نہیں ہوسکتا مگر جانوں کو مشقت میں ڈال کر، تو ہوگیا حج کرنا خالص اللہ تعالیٰ کے لئے، گناہوں کو مٹانے والا اور سابقہ گناہوں کو ڈھانے والا، جیسے ایمان لانا۔

☆

باب ——— ۱۳

نیکی کے مختلف کاموں کی حکمتیں

دور سے نیکی کے کاموں کے اسرار و رموز کا بیان چل رہا ہے۔ اسی سلسلہ کا یہ آخری باب ہے۔ اس باب میں چھ متفرق نیکی کے کاموں کی حکمتیں بیان کی جارہی ہیں، جو درج ذیل ہیں:

① ذکر اللہ کی حکمت

اللہ تعالیٰ کا ذکر بہت بڑی نیکی ہے۔ حدیث شریف میں ذکر اللہ کو سب سے اچھا نیک کام بتایا گیا ہے۔ حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کیا میں تم کو وہ عمل بتاؤں جو تمہارے سارے اعمال میں بہتر اور تمہارے بادشاہ کی نگاہ میں پاکیزہ تر ہے اور تمہارے درجوں کو دوسرے تمام اعمال سے زیادہ بلند کرنے والا ہے اور راہ خدا میں سونا اور چاندی خرچ کرنے سے بھی زیادہ اس میں خیر ہے اور اس جہاد سے بھی زیادہ تمہارے لئے اس میں خیر ہے جس میں تم اپنے دشمنوں سے بھڑو، پھر تم ان کی گردنیں مارو اور وہ تمہاری گردنیں ماریں؟ صحابہ نے عرض کیا: کیوں نہیں! یا رسول اللہ! (یعنی ضرور ہمیں ایسا قیمتی عمل بتایئے؟) آپ نے فرمایا: وہ اللہ کا ذکر ہے

(رواہ احمد والترمذی وابن ماجہ، مشکوٰۃ، کتاب الدعوات، باب ذکر اللہ، حدیث نمبر ۲۲۶۹)

اور ذکر اللہ میں چار فائدے ہیں:

پہلا فائدہ: اللہ کے ذکر اور اللہ تعالیٰ کے درمیان کوئی پردہ حائل نہیں ——— جب ذاکر ذکر کرتا ہے تو گویا وہ اللہ تعالیٰ سے باتیں کرتا ہے۔ ذاکر اور مذکور کے درمیان کے تمام حجابات مرتفع ہوجاتے ہیں۔ اور اس کو وصل مع اللہ کی دولت نصیب ہوتی ہے۔

دوسرا فائدہ: اللہ کا ذکر، اللہ کے معاملہ میں بدفہمی کا بہترین علاج ہے ——— جن لوگوں کو اللہ کے معاملہ میں شکوک و شبہات رہتے ہیں، وہ لوگ اگر اللہ تعالیٰ کا ذکر کریں تو وہ وساوس خود بخود کافور ہوجائیں گے۔ اسی طرح جو دانش مند محض سوچتے ہیں اور ذکر اللہ سے کوئی سروکار نہیں رکھتے، وہ روز بروز شکوک کے دلدل میں اترتے چلے جاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کا بہترین علاج بھی ذکر اللہ ہے۔ وہ لوگ محبت کے ساتھ بکثرت اللہ تعالیٰ کا ذکر کریں، ان شاء اللہ ان کے سب شبہات دور ہوجائیں گے۔

تیسرا فائدہ: حضوری کی کیفیت پیدا کرنے کا بہترین ذریعہ ذکر اللہ ہے ——— جب بندہ بکثرت اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتا ہے تو اس کو نسبت یادداشت حاصل ہوجاتی ہے۔ پھر وہ ہر حال میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتا رہتا ہے، کسی حال میں وہ

غفلت سے زائل نہیں ہوتا۔

چوتھا فائدہ: ذکر اللہ سے دل کی سختی دور ہوتی ہے — قساوتِ قلبی کو دور کرنے کے لئے ذکر اللہ سے بہتر کوئی چیز نہیں ہے۔ ارشاد پاک ہے: "اللہ تعالیٰ نے بڑا عمدہ کلام (قرآن) نازل فرمایا ہے، جو ایسی کتاب ہے کہ باہم ملتی جلتی ہے، بار بار دہرائی گئی ہے، جس سے ان لوگوں کے، جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں، بدن کانپ اٹھتے ہیں۔ پھر ان کے بدن اور دل نرم ہو کر اللہ کے ذکر کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں" (سورۃ الزمر آیت ۲۳)

اور حدیث شریف میں ہے کہ "اللہ کے ذکر کے علاوہ دیگر باتیں بہت زیادہ نہ کیا کرو، اس سے دل میں سختی پیدا ہوتی ہے، اور لوگوں میں اللہ تعالیٰ سے سب سے زیادہ دور وہ شخص ہے جس کے دل میں قساوت ہے" (رواہ الترمذی، مشکوۃ حدیث نمبر ۲۲۷۶) اس حدیث میں ذکر اللہ کا متضاد بیان کیا گیا ہے کہ ذکر اللہ سے ہٹ جانے سے قساوت کے نتیجہ پیدا ہوتی ہے۔

اور ذکر اللہ دو شخصوں کے لئے تو خاص طور پر مفید ہے:

۱۔ اس شخص کے لئے جس کی قوت بہیمی فطری اور خلقی طور پر کمزور ہوتی ہے یا اس نے ریاضتوں کے ذریعہ اس کو کمزور کیا ہے۔

۲۔ اور اس شخص کے لئے جس کو فطری طور پر مجرد یعنی اللہ تعالیٰ اور محسوسات یعنی مادیات کے احکام میں خلط ملط کرنے کے خیالات نہیں آتے ہیں یعنی اس کو اللہ تعالیٰ کی صحیح معرفت حاصل ہے تو اس کے لئے بھی ذکر اللہ بے حد نافع ہے۔ مثلاً یہ خیال آنا کہ جب ہر چیز کو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے تو اللہ تعالیٰ کو کس نے پیدا کیا ہے؟! ایسے خیالات اس شخص کو آتے ہیں جو مجرد اور مادیات کے احکام میں فرق نہیں کرتا۔ مجرد پر بھی وہی احکام جاری کرتا ہے جو مادیات کے ہیں۔ مگر جس کو اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کی صحیح معرفت حاصل ہوتی ہے اس کو اس قسم کے خیالات نہیں آتے، ایسے لوگوں کو ذکر اللہ سے بہت زیادہ نفع پہنچتا ہے۔

فائدہ: ذکر اللہ اپنے وسیع مفہوم کے لحاظ سے نماز، تلاوتِ قرآن اور دعا و استغفار وغیرہ سب کو شامل ہے۔ مگر اصطلاح میں اللہ تعالیٰ کی تسبیح و تقدیس، توحید و تمجید، اس کی عظمت و کبریائی اور اس کی صفات کمال کے بیان اور دھیان کو ذکر اللہ کہا جاتا ہے۔

﴿باب أسرار أنواع من البر﴾

منها: الذكر، فإنه لا حجاب بينه وبين الله تعالى، ولا شيء مثله في علاج سوء المعرفة، وهو قوله صلى الله عليه وسلم: «ألا أنبئكم بأفضل أعمالكم» الحديث؛ وفي كسب المحاضرة وضرب القسوة، لا سيما لمن ضعفت بهيميته جبلة أو ضعفت كسبا، ولمن سكت خياله جبلة عن خلط المجرد بأحكام المحسوس.

ترجمہ: نیکی کی متفرق اقسام کی قسموں کا بیان: ان اقسام میں سے ذکر اللہ ہے۔ پس بیشک شان یہ ہے کہ ذاکر اور اللہ تعالیٰ کے درمیان کوئی حائل نہیں ہے۔ اور ذکر جیسی کوئی چیز نہیں ہے جو نفوس کے علائق کے لئے۔ اور وہ ارشاد نبوی ہے کہ: "کیا نہ بتاؤں میں تم کو تمہارے اعمال میں سے بہترین عمل؟" حدیث آخر تک پڑھ جائیے (اوپر یہ حدیث تفصیل سے بیان کی گئی ہے) اور (ذکر جیسی کوئی چیز نہیں ہے) حضوری کی کیفیت حاصل کرنے میں اور اس کی تنگی دور کرنے میں۔ خاص طور پر اس شخص کے لئے جس کی قوت ملکی اصل فطرت میں کمزور ہو، یا وہ عبادات شاقہ کرنے کی وجہ سے کمزور پڑ گئی ہو اور اس شخص کے لئے جس کے تصورات متفرق ہوں، فطری طور پر یعنی نفوس کے احکام کے ساتھ خلط ملط کرنے سے۔

لغات و ترکیب: منها خبر مقدم ہے اور الذکر مبتدا مؤخر ہے آگے بھی یہی ترکیب ہے المحاضرة (مصدر باب مفاعلہ) ایک دوسرے کے پاس حاضر ہونا، یہاں معنی حضوری جناب اللہ تعالیٰ ہے۔

(۲) دعا کی حکمت

دعا کے لغوی معنی ہیں: مانگنا، پکارنا، طلب کرنا۔ اور اصطلاحی معنی ہیں: اپنی تمام حاجات اپنے پروردگار سے مانگنا، اسی کو پکارنا اور اسی سے مدد طلب کرنا۔ اور دعا کے تین فائدے ہیں:

پہلا فائدہ: دعا نسبت حضوری پیدا کرنے کا بہترین ذریعہ ہے ـــــ دعا بھی درحقیقت ذکر اللہ ہے، اس لئے جس طرح کثرت ذکر سے نسبت یادداشت پیدا ہوتی ہے، کثرت دعا مانگنے سے بھی یہ کیفیت حاصل ہوتی ہے۔ اسی لئے حدیث شریف میں حکم دیا گیا ہے کہ اپنی تمام حاجتیں اللہ تعالیٰ سے مانگو، حتی کہ چپل کا تسمہ ٹوٹ جائے تو وہ بھی اللہ سے مانگو، اور نمک ختم ہو جائے تو وہ بھی اللہ سے مانگو (مشکوٰۃ، کتاب الدعوات، حدیث نمبر ۲۲۵۱-۲)

دوسرا فائدہ: دعا مانگتے رہنے سے کامل تابعداری اور ہر حال میں پروردگار عالم کے سامنے حاجت مندی نگاہوں کے سامنے رہتی ہے۔ اسی لئے حدیث شریف میں دعا کو عبادت کا مغز کہا گیا ہے (رواہ الترمذی، مشکوٰۃ حدیث نمبر ۲۲۳۱)

انسان کا سب سے بڑا کمال عبدیت (بندگی) ہے۔ اور عبادت کی حقیقت ہے: اللہ کے حضور میں خشوع و تذلل اور اپنی بندگی اور بیچارگی کا مظاہرہ کرنا۔ اور دعا کا دن رات تکرار اپنے کامل عجز کی وجہ سے سراپا محتاجی و بندگی اور کامل اطاعت و انقیاد کا مظاہرہ ہے۔ اسی لئے وہ بلاشبہ عبادت کا مغز اور جوہر ہے۔ اور ہمیشہ دعا کرتے رہنے سے بندگی کی یہ حقیقت نگاہوں کے سامنے رہتی ہے، کبھی اوجھل نہیں ہوتی۔

تیسرا فائدہ: دعا اللہ تعالیٰ کی طرف طلب و تڑپ کے ساتھ متوجہ ہونے کا بہترین طریقہ ہے اور طلب ہی رحمت کا دروازہ کھولتی ہے ـــــ دعا درحقیقت ان چند کلمات ہی کا نام نہیں ہے جو دعا کرنے والے کی زبان سے ادا ہوتے ہیں، ان الفاظ کو تو زیادہ سے زیادہ دعا کا جامہ، قالب اور پیکر محسوس کہا جا سکتا ہے۔ دعا کی حقیقت انسان کے قلب اور اس کی روح کی طلب

اور تڑپ ہے اور وہ طلب حق کا میابی کا راز ہے: جیسے گداگر مسکین صورت بنائے ہوئے کھانے والے کے قریب بیٹھ کر امید بھری نگاہوں سے تکتی رہتی ہے تو خود بخود آدمی کے دل میں داعیہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ اس کو ٹکڑا ڈالے۔ اسی طرح جب الفاظِ دعا کے ساتھ نفس بھی اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو اور دل میں طلب اور تڑپ ہو تو مقصود ضرور حاصل ہوتا ہے۔

ومنها: الدعاء فإنه يفتح بابا عظيما من المحاضرة، ويجعل الانقياد التامَّ والاحتياجَ إلى رب العالمين في جميع الحالات بين عينيه، وهو قوله صلى الله عليه وسلم: «الدعاءُ مُخُّ العبادة»، وهو شَبَحُ توجُّه النفس إلى المَبْدأ بصفة الطلب، الذي هو السِّرُّ في جلب الشيء المدعوِّ إليه.

ترجمہ: اور انواعِ بِر میں سے دعا ہے۔ پس بیشک دعا نسبت حضوری کا بڑا اور راز کھولتی ہے۔ اور کامل تابعداری کو اور ہر حال میں رب العالمین کے سامنے محتاج ہونے کو دونوں آنکھوں کے سامنے کرتی ہے اور وہ ارشاد نبوی ہے کہ: "دعا عبادت کا مغز (جوہر) ہے" اور دعا مبدأ (یعنی اللہ تعالیٰ) کی طرف طلب کی حالت کے ساتھ نفس کے متوجہ ہونے کا پیکر محسوس ہے اور طلب ہی وہ چیز ہے جو مانگی ہوئی چیز کو کھینچنے کا راز ہے۔

(۳) تلاوتِ قرآن اور نصیحت سننے کی حکمت

قرآن کریم کی تلاوت کرنا اور وعظ ونصیحت سننا بھی اہم نیکی کا کام ہے اور تلاوت اور وعظ میں عام خاص من وجہ کی نسبت ہے، کبھی دونوں جمع ہو جاتے ہیں، کبھی الگ ہو جاتے ہیں۔ جب آدمی سمجھ کر تلاوت کرے تو دونوں باتیں جمع ہوں گی۔ ورنہ محض تلاوت ہوگی اور کسی نیک آدمی کا وعظ سننا محض وعظ کا سننا ہے۔ اور تلاوت اور وعظ سننے کے دو اہم فائدے ہیں:

پہلا فائدہ: جب آدمی بغور تلاوت کرتا ہے یا وعظ ونصیحت سنتا ہے اور اس کو دل میں اتارتا ہے تو اللہ کا ڈر اور اللہ سے امید اور عظمت الٰہی کے سامنے حیرانی طاری ہوتی ہے۔ نیز احسانات خداوندی جو قرآن کریم میں جگہ جگہ بیان کئے گئے ہیں اور قدرت کی کرشمہ سازی جس کا بار بار تذکرہ آتا ہے آدمی کا نفس ان مضامین میں ڈوب جاتا ہے اور خوابیدہ طبیعت جاگ اٹھتی ہے اور نفس میں ملکوتی انوار کے فیضان کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ دونوں باتیں موت کے بعد انسان کے لئے بے حد نفع بخش ثابت ہوتی ہیں اور قبر میں منکر نکیر کے سوالات کے صحیح جوابات دینے میں ان دونوں باتوں سے بڑی مدد ملتی ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ: جو شخص فرشتوں کے سوالات کے صحیح جوابات نہیں دے گا فرشتے اس سے کہیں گے کہ: "تو نے نہ تو حق کو پہچانا اور نہ تو نے قرآن کریم کی تلاوت کی" پھر تو صحیح جوابات

کیسے سکتا ہے؟ تجھے امتحان میں فیل ہونا تھا جو ہو گیا (یہ روایت بخاری شریف کتاب الجنائز میں ہے حدیث نمبر ۱۳۳۸ اور ۱۳۷۲ ہے)

دوسرا فائدہ اور تلاوت قرآن کا خاص طور پر فائدہ یہ بھی ہے کہ اس سے دل کا میل اور زنگ دور ہوتا ہے اور نفس سفلی کیفیات سے پاک ہوتا ہے حدیث شریف میں ہے کہ: "ہر چیز کے لئے مَصْقَلَہ (زنگ دور کرنے کا سامان) ہے اور دلوں کا مَصْقَلَہ اللہ کا ذکر ہے" (مشکوۃ کتاب الدعوات، حدیث نمبر ۲۲۸۶) اور قرآن کریم اعظم ذکر ہے پس تلاوت قرآن سے بھی دل کا زنگ دور ہوتا ہے۔

> ومنها: تلاوة القرآن، واستماع المواعظ، فمن ألقى السمع إلى ذلك، ومكّنه من نفسه، انصبغ بحالات الخوف والرجاء والحيرة في عظمة الله، والاستغراق في منة الله وغيرها، لينفع من خمود الطبيعة نفعًا بينًا، ويُعِدُّ النفس لفيضان أنوار ما فوقها، ولذلك كان أنفع شيء في المعاد، وهو قول الملك للمقبور: "لا دَرَيْتَ، ولا تَلَيْتَ"؛ وفي القرآن تطهيرُ النفس عن الهيئات السفلية، وهو قوله صلى الله عليه وسلم: "لكل شيء مَصْقَلَةٌ، ومَصْقَلَةُ القلب تلاوة القرآن".

ترجمہ: اور نیکیوں میں سے تلاوت قرآن اور نصیحتوں کا سننا ہے پس جو شخص ان باتوں کی طرف کان لگاتا ہے اور ان کو اپنے دل میں جگہ دیتا ہے تو وہ رنگین ہو جاتا ہے خوف اور امید کے احوال سے اور اللہ کی عظمت میں سرگشتگی کے ساتھ اور اللہ کے احسانات وغیرہ میں ڈوبنے کے ساتھ۔ پس وہ نفع پہنچاتا ہے بجھی ہوئی طبیعت کو واضح طور پر نفع پہنچانا اور وہ تیار کرتا ہے نفس کو عالم بالا کے انوار کے فیضان کے لئے اور اسی وجہ سے وہ سب سے زیادہ مفید چیز ہوتی ہے آخرت میں اور وہ فرشتہ کا قبر والے سے کہنا ہے: "تو نے نہ تو حق کو پہچانا اور نہ قرآن کی تلاوت کی" ——— اور (تلاوت) قرآن میں نفس کی سفلی کیفیات سے تطہیر ہے اور وہ نبی ﷺ کا ارشاد ہے کہ: "ہر چیز کے زنگ کو دور کرنے کے لئے آلہ ہے اور دل کے زنگ کو دور کرنے کا آلہ تلاوت قرآن ہے" (یہ حدیث مجھے نہیں ملی۔ اوپر جو ذکر اللہ کی حدیث ہے وہ مشکوۃ میں ہے اور اس سے بھی استدلال ہو سکتا ہے)

☆　☆　☆

(۳) حسن سلوک کی حکمت

رشتہ داروں اور پڑوسیوں کو جوڑنا، دوستی والوں اور دینی بھائیوں کے ساتھ حسن سلوک کرنا اور غلاموں کو آزاد کرنا بھی نیکی کے کام ہیں، اور ان کے تین فائدے ہیں:

پہلا فائدہ: یہ تمام کام آدمی میں رحمت الٰہی اور طمانینت قلب کے نزول کی صلاحیت پیدا کرتے ہیں۔ مشکوۃ کتاب الآداب، باب البر والصلة اور باب الشفقة والرحمة على الخلق میں اس سلسلہ کی بہت روایات ہیں۔

دوسرا فائدہ: یہ تمام کام ترقی یافتہ تمدن اور حکومت کی ضروریات ہیں۔ مبحث چہارم میں اس کی تفصیلات گذر چکی ہیں۔

تیسرا فائدہ: ان کاموں کے ذریعہ انسان فرشتوں کی دعاؤں کو اپنی طرف کھینچتا ہے یعنی ملأ اعلیٰ ان کے لئے خیر وبرکت کی دعائیں کرتے ہیں۔

ومنها: صلةُ الأرحام والجيران، وحسنُ المعاشرة مع أهل القرية وأهل المدينة، وفكُّ العاني بالإعتاق، فإن ذلك يُعِدُّ لنزول الرحمة والطمأنينة، وبها يتم نظام الارتفاق الثاني والثالث، وبها يستجلب دعوة الملائكة

ترجمہ: اور انواعِ بر میں سے رشتہ داروں اور پڑوسیوں کو جوڑنا اور بستی والوں اور شہری بھائیوں کے ساتھ حسن سلوک کرنا اور قیدی (یعنی غلام) کو آزاد کر کے قید سے چھڑانا ہے۔ کیونکہ یہ کام تیار کرتے ہیں رحمت اور طمانینت کے نزول کے لئے اور ان کاموں سے ارتفاق ثانی (ترقی یافتہ تمدن) اور ارتفاق ثالث (حکومت) کے نظام کی تکمیل ہوتی ہے اور ان کاموں کے ذریعہ فرشتوں کی دعائیں کھینچی جاتی ہیں۔

☆ ☆ ☆

⑤ جہاد کی حکمت

جہاد بھی اہم نیکی کا کام ہے۔ قرآن وحدیث میں اس پر بڑے اجر وثواب کے وعدے آئے ہیں۔ جہاد دفع ظلم اور رفع فتنہ کے لئے مشروع ہوا ہے اور تا قیام قیامت جاری رہے گا اور اس کی ضرورت مختلف صورتوں میں پیش آتی ہے۔ ذیل میں تین صورتیں ذکر کی جاتی ہیں جن میں جہاد ضروری ہو جاتا ہے۔

پہلی صورت: جب کوئی بدکار، بد اطوار شخص سر اٹھاتا ہے اور عام لوگ اس کی حرکتوں سے پریشان ہو جاتے ہیں اور اس شخص کو لگام دینا اور انتظام عالم کا تقاضا ہوتا ہے تو اس پر حق تعالیٰ کی لعنت برستی ہے اور کسی نیک آدمی کے دل میں الہام کیا جاتا ہے کہ وہ اس کو قتل کرے۔ چنانچہ اس شخص کے دل میں، بغیر کسی دنیوی سبب کے، غصہ کی آگ بھڑک اٹھتی ہے۔ اور وہ شخص اپنی کسی غرض کے لئے نہیں، بلکہ منشأ خداوندی کی تکمیل کے لئے اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور درود ونوازشات اور رحمت خداوندی میں پاش پاش ہو کر اس شخص کو کیفر کردار تک پہنچا دیتا ہے، جس سے سارا ملک اور ملک کے تمام باشندے چین کا سانس لیتے ہیں۔

دوسری صورت: کبھی کسی ایسی جابرانہ حکومت کے زوال کا فیصلہ خداوندی ہوتا ہے جس کے باشندے کافر ہوتے ہیں اور جنھوں نے برا طریقۂ زندگی پیدا کیا ہوتا ہے، پس کسی پیغمبر کو اس حکومت سے لڑنے کا حکم ہوتا ہے۔ اور اس کی قوم کے دل میں جذبۂ جہاد پھونکا جاتا ہے تاکہ وہ ایک ایسی امت بن کر ابھریں جو لوگوں کے فائدے کے لئے کام کریں۔ چنانچہ وہ پیغمبر اپنی قوم کے ساتھ مل کر اس حکومت سے جہاد کرتا ہے اور رحمت الٰہی اس کے شامل حال ہوتی ہے۔ اس طرح اس امت کے ذریعہ اللہ تعالیٰ اس حکومت کا خاتمہ کر دیتے ہیں۔ سورۃ البقرۃ آیات ۲۴۶-۲۵۱ میں جالوت کی حکومت کا حالات اور بنی اسرائیل کے ہاتھوں خاتمہ کا تذکرہ ہے۔ وہ اس کی واضح مثال ہے۔

تیسری صورت: کبھی درندہ صفت لوگ غلبہ حاصل کر لیتے ہیں۔ وہ لوگوں پر ظلم ڈھاتے ہیں، احکام شرعیہ کی خلاف ورزی کرتے ہیں، اور منکرات کا ارتکاب کرتے ہیں۔ ایسی صورت میں مفاد عامہ کے پیش نظر کچھ لوگوں کی سمجھ میں یہ بات آتی ہے کہ ان لوگوں کا فتنہ فرو کرنے کے لئے جدوجہد کرنی چاہئے۔ ان کے ظلم و ستم سے لوگوں کو نجات دلانی چاہئے، احکام شرعیہ کی خلاف ورزی کرنے والوں پر حدود شرعیہ قائم کرنی چاہئیں اور لوگوں کو منکرات سے روکنا چاہئے۔ چنانچہ وہ لوگ اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور ان ظالموں سے نبرد آزما ہوتے ہیں اور ان کا فتنہ فرو کرتے ہیں، جس سے لوگوں کو سکون و اطمینان نصیب ہوتا ہے۔ ایسے مجاہدین کی کوششوں کی بھی اللہ تعالیٰ قدر فرماتے ہیں۔

ومنها: الجهاد، وذلك أن يَقْضي الحقُّ إنسانا فاسقًا ضارًّا بالجمهور، بعدامه أوفق بالمصلحة الكلية من إبقائه، فيظهر الإلهام في قلب رجل زكي لِقَتْله، فينبجس من قلبه غضبٌ، ليس له سببٌ طبيعي، ويكون فانيا من مراده، باقيًا بمراد الحق، ويضمحلُّ في رحمة الله ونوره، ويَنتفع العبادُ والبلادُ بذلك.

ويتلوه: أن يَقْضِيَ الله بزوال دولةٍ مثلِ جائرة كفروا بالله، وأساؤا السيرة، فيؤمر نبي من أنبياء الله تعالى بمجاهدتهم، فيُنفَخُ داعيةُ الجهاد في قلوب قومه، ليكونوا أمةً أخرجت للناس، وتشمله الرحمة الإلهية.

ويتلوه: أن يتطلع قومٌ بالرأي الكلي على خير أن يذبُّوا أنفسا سَبُعيةً عن المظلومين، وإقامة الحدود على العصاة، والنهي عن المنكر، فيكون سببا لأمن البلاد وطمأنينتهم، فيشكر الله له عمله.

ترجمہ: اور انواع بر میں سے جہاد ہے، اور اس کی تقریب اس طرح پیدا ہوتی ہے کہ حق سبحانہ وتعالیٰ فیصلہ کرتے ہیں کسی ایسے بدکار انسان پر جو عوام پبلک کو نقصان پہنچانے والا ہوتا ہے، جس کو نابود کرنا مصلحت کلی سے زیادہ ہم آہنگ ہوتا ہے اس کو باقی رکھنے سے۔ پس الہام ظاہر ہوتا ہے کسی آدمی کے دل میں تاکہ وہ اس کو قتل کرے۔ پس اس کے دل سے

ایسا فصہ پھوٹتا ہے جس کے لئے کوئی مادی سبب نہیں ہوتا اور وہ شخص اپنی مراد سے فنا ہونے والا ہوتا ہے اور حق تعالیٰ کی مراد کے ساتھ باقی رہنے والا ہوتا ہے اور مرتا ہے وہ اللہ کی رحمت اور نور میں اور مستفیض ہوتے ہیں لوگ اور علاقے اس قتل کی وجہ سے۔

اور اس کے پیچھے آتی ہے یہ تقریب کہ اللہ تعالیٰ فیصلہ فرماتے ہیں ظلم پر کمر بستہ شہروں کی حکومت کے خاتمہ کا، جن کے باشندے اللہ کے منکر ہوتے ہیں اور جنھوں نے بدبختی چنائی ہوئی ہوتی ہے، پس اللہ کے نبیوں میں سے کوئی نبی حکم دیئے جاتے ہیں ان لوگوں کے ساتھ جنگ کرنے کا، پس وہ جہاد کا داعیہ پھونکتا ہے قوم کے دلوں میں، تاکہ بن جائیں وہ ایک ایسی امت جو لوگوں کو فائدہ پہنچانے کے لئے ظاہر کی گئی ہو، اور اس نبی کے شامل ہوتی ہے رحمت خداوندی۔

اور اس کے پیچھے آتی ہے یہ تقریب کہ کچھ لوگ مصلحت کلی کو سامنے رکھ کر واقف ہوتے ہیں اس بات کی خوبی سے کہ ہٹائیں وہ درندہ صفت لوگوں کو مظلوموں سے، اور نافرمانوں پر سزائیں جاری کرنے کی خوبی سے، اور ناجائز کاموں سے روکنے کی خوبی سے۔ پس یہ چیز سبب بن جاتی ہے شہروں کے امن واطمینان کا۔ پس اللہ تعالیٰ قدر کرتے ہیں ان لوگوں کے اس کام کی۔

لغات وترکیب: جملہ وعدہ الخ صفت ہے إنسانًا کی ... انبجس الماءُ پانی جاری ہونا، پھوٹنا ... لیکون کی ضمیر قوم کی طرف لوٹتی ہے، لو ملفوظًا مفرد ہے ... فنشملُه کی ضمیر نبی کی طرف بھی لوٹائی جاسکتی ہے اور قوم کی طرف بھی .... شکرَ اللہ سعیَه: اللہ تعالیٰ اس کو اس کی کوشش کی جزا دیتے ہیں۔

☆ ☆ ☆

④ آفات وبلیات کی حکمتیں

مؤمن کی زندگی میں بہت سے غیر اختیاری واقعات پیش آتے ہیں، جیسے مصائب وآفات اور بیماریاں وغیرہ۔ یہ تمام چیزیں بھی مؤمن کے حق میں نیکیاں بن جاتی ہیں، بچند وجوہ:

پہلی وجہ: مصائب کفارۂ سیئات اور باعث رفع درجات بنتے ہیں اس لئے وہ سب خیر بن جاتے ہیں اور نیکی شمار ہوتے ہیں —— کبھی بندے کے نیک عمل کی وجہ سے رحمت الٰہی اس کی طرف متوجہ ہوتی ہے اور تکوینی اسباب کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ اس پر تنگی کی جائے تو رحمت خداوندی اس بندے کی تکمیل کی طرف متوجہ ہوتی ہے۔ پس وہ رحمت اس کے گناہوں کو مٹاتی ہے اور اس کے لئے نیکیاں لکھتی ہے۔ مثلاً حوض میں سے پانی نکلنے کا سوراخ بند کردیا جائے تو پانی اِدھر اُدھر سے نکلنے لگتا ہے۔ ایسی صورت میں لوگ پانی کے اِدھر اُدھر سے نکلنے کو سوراخ بند کرنے کی طرف منسوب کرتے ہیں کیونکہ وہ سبب ہے۔ اسی طرح رحمت خداوندی گناہوں کو مٹاتی ہے اور نیکیاں لکھتی ہے مگر چونکہ اس کا سبب بندے کو

لاحق ہونے والی پریشانیاں ہیں جو تکوینی سبب کے نتیجہ میں رونما ہوتی ہیں ان سے کہا جاتا ہے کہ مصائب سے گناہ معاف ہوتے ہیں اور نیکیاں لکھی جاتی ہیں۔

سوال: رحمت الٰہی تکوینی سبب کے تقاضوں کو کیوں نہیں روکتی؟

جواب: تدبیر الٰہی میں مجموعی حیثیت سے جو چیز بہتر ہوتی ہے اس کی رعایت ملحوظ رکھی جاتی ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ شخصی مصالح کی وجہ سے شخص فلاں کے لئے کلی نظام کو متاثر کرنا کبھی مصلحت خداوندی میں مناسب نہیں ہوتا اس لئے کلی نظام کو بروئے کار آنے دیا جاتا ہے اور ذاتی مصالح کو ذاتی فلاح کے بجائے کفارۂ سیئات اور رفع درجات کی طرف متوجہ کردیا جاتا ہے۔ اس کی مزید تفصیل مبحث دوم کے باب اول میں گذر چکی ہے۔

دوسری وجہ: آفات و بلیات سے مومن سبق لیتا ہے اور اس کا دنیا کا انہماک گھٹتا ہے اس لئے وہ سبب خیر بن جاتے ہیں اور نیکی شمار ہوتے ہیں — جب مومن پر سخت مصائب آتے ہیں تو اس پر زمین باوجود فراخی کے تنگ ہوجاتی ہے۔ نتیجہ اس کے نفس کی اصلاح ہوتی ہے اور رسم و رواج کا پردہ چاک ہوتا ہے دنیا کے جھمیلوں کو وہ کم کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے علاوہ ہر چیز سے وہ دل برداشتہ ہوجاتا ہے اس طرح حوادث اس کے لئے سبب خیر بن جاتے ہیں۔ اور کافر جب مصائب سے گھبراتا ہے تو وہ اپنا نقصان یاد کرتا ہے کہ بیماری کی وجہ سے اتنا اتنا نقصان ہوگیا۔ اور وہ اور بھی دنیا میں گھستا ہے۔ نتیجۂ روپیہ سے بھی خبیث تر ہوجاتا ہے اور حوادث اس کے لئے سبب خیر نہیں بنتے۔ حدیث شریف میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار بیماریوں کا تذکرہ فرمایا تو ارشاد فرمایا کہ جب مومن کو بیماری پہنچتی ہے، پھر اللہ تعالیٰ اس کو عافیت بخشتے ہیں تو وہ بیماری گذشتہ گناہوں کا کفارہ ہوتی ہے اور آئندہ کے لئے نصیحت بنتی ہے اور منافق جب بیمار پڑتا ہے پھر تندرست ہوتا ہے تو اس کا حال اس اونٹ جیسا ہوتا ہے جس کو اس کے مالک نے باندھا یا پھر کھول دیا، پس وہ نہیں جانتا کہ اس کو کیوں باندھا گیا اور کیوں کھولا گیا؟" (رواہ ابوداؤد، مشکوٰۃ، کتاب الجنائز، حدیث نمبر ۱۵۷۱)

تیسری وجہ: بیماریوں سے کمزوری آتی ہے اور گناہوں میں کمی واقع ہوتی ہے اس لئے وہ سبب خیر بن جاتی ہیں اور نیکی شمار ہوتی ہیں — چربی جیسی ٹھوس اور بھاری برائیوں پر ابھارنے والی چیز نہایت سخت گاڑھی بھی کی قوت ہی ہے۔ پس جب آدمی بیمار پڑتا ہے اور لاغر ہوجاتا ہے اور بدل ما یتحلل میں کمی واقع ہوتی ہے یعنی جتنی انرجی خرچ ہوتی ہے اس کا بدل میسر نہیں آتا تو گناہوں پر ابھارنے والی صلاحیت مضمحل ہوجاتی ہے اور جس قدر وہ کمزور ہوتی ہے اسی قدر گناہ بھی گھٹ جاتے ہیں، جیسے ہم دیکھتے ہیں کہ بیماری جماع کی ترص اور غصہ ختم ہوجاتا ہے اس کے اخلاق میں تبدیلی آجاتی ہے اور بہت سی سابقہ باتیں وہ اس طرح بھول جاتا ہے کہ گویا وہ اس میں تھی ہی نہیں اور خود آدمی ایسا بدل جاتا ہے کہ گویا وہ پہلے والا آدمی ہی نہیں۔ غرض اس طرح آفات و بلیات سے گناہوں میں کمی واقع ہوتی ہے اور وہ باعث خیر بن جاتی ہیں اور نیکی شمار ہوتی ہیں۔

چوتھی وجہ: آفات وبلیات سے دنیا ہی میں گناہوں کا معاملہ نمٹ جاتا ہے، اس لئے وہ سبب خیر بن جاتی ہیں اور نیکی شمار ہوتی ہیں — مؤمن پر جو مصائب نازل ہوتے ہیں وہ دنیا میں اس کے گناہوں کی سزا ہوتے ہیں۔ وہ دنیا سے پاک صاف ہوکر آخرت میں پہنچتا ہے۔ بخاری شریف کی روایت ہے: من یُرِدِ اللہُ بہ خیرًا یُصِبْ منہ (جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو خیر منظور ہوتی ہے، اس پر اللہ تعالیٰ آفتیں ڈالتے ہیں) (مشکوٰۃ، کتاب الجنائز، حدیث نمبر ۱۵۳۶) اور ترمذی کی روایت میں ہے کہ: ''جب اللہ تعالیٰ بندے کے ساتھ بھلائی کا معاملہ کرنا چاہتے ہیں تو اس کو جلدی دنیا ہی میں سزا دیدیتے ہیں۔ اور جب اللہ تعالیٰ بندے کے ساتھ برا برتاؤ کرنا چاہتے ہیں تو اس کے گناہوں کی سزا روک دیتے ہیں۔ تاآنکہ اس کو قیامت کے دن پورا پورا بدلہ دیتے ہیں'' (مشکوٰۃ حدیث نمبر ۱۵۶۵) اور ترمذی کی ایک اور روایت میں ہے: لایزال البلاءُ بالمؤمن فی نفسہ ومالہ وولدہ، حتی یلقی اللہ تعالیٰ وما علیہ من خطیئۃ (مؤمن کی ذات، مال اور اولاد میں برابر بلائیں آتی رہتی ہیں، تاآنکہ وہ اللہ سے ملاقات کرتا ہے اس حال میں کہ اس پر کوئی گناہ نہیں ہوتا) (مشکوٰۃ حدیث نمبر ۱۵۶۷)

ظاہر ہے کہ یہ بات مؤمن کے لئے بہت مفید ہے کہ اس کے گناہوں کا معاملہ دنیا ہی میں نمٹ جائے۔ اسی لئے آفات وبلیات اس کے لئے سبب خیر بن جاتی ہیں اور وہ نیکی شمار ہوتی ہیں۔

مگر ہر مؤمن کے ساتھ یہ معاملہ نہیں کیا جاتا۔ بلکہ صرف اس مؤمن کے ساتھ یہ مہربانی والا معاملہ کیا جاتا ہے جس کی بہیمیت نے اس کی ملکیت کا کسی وجہ سے پیچھا چھوڑ دیا ہو مثلاً بوڑھا ہوگیا ہے۔ پس جب بہیمیت کمزور پڑجاتی ہے یا ریاضتوں کے ذریعہ بہیمیت کو رام کرلیا جائے اور آدمی میں کسی وجہ سے صلاح وتقویٰ پیدا ہوجائے اور ملکیت کو اپنا کام کرنے کا موقع ملے تو اس وقت عام طور پر دنیا ہی میں مؤمن کو اس کی برائیوں کی سزا دیدی جاتی ہے۔ اور جب تک بہیمیت کا غلبہ رہتا ہے وہ آدمی برائیوں میں پھنسا رہتا ہے، اس وقت تک مؤمن کے ساتھ یہ برتاؤ نہیں کیا جاتا۔ واللہ اعلم۔

ومنها: تقريباتٌ تَرِدُ على البشر من غير اختياره، كالمصائب والأمراض، فَتُعَدُّ من باب البر لمعانٍ:

منها: أن الرحمة إذا توجهت إلى عبد بصلاح عمله، واقتضت الأسباب التضييق عليه، انصرفت إلى تكميل نفسه، فكُفِّرتْ خطاياه، وكُتِبتْ له الحسناتُ، كما إذا سُدَّ مجرى الماء نبع الماء من فوقه ومن تحته، فيُنْسَبُ الأجرُ إلى ذلك التضييق، والسر فيه المحافظة على الخير النسبي.

ومنها: أن المؤمن إذا اشتدت به المصائب، ضاقت عليه الأرض بما رحبت، فانكسر حجاب الطبع والرسم، وانقطع قلبُه إلا عن الله؛ أما الكافر فلايزال يتذكر الفائت، ويغوص في الحياة الدنيا، حتى يصير أخبثَ منه قبل أن يصيبه ما أصاب.

ومنها: أن حامل السيئات المتحجرة إنما هو البهيمية الغليظة الكثيفة، فإذا مرض وضعف

لغات وترکیب وتصحیح

العضیق مصری نسخہ میں اور مخطوطہ کراچی وبرلین میں دونوں جگہ العضیق ہے جس کے معنی ہیں تنگ ہونا، اور مطبوعہ صدیقی اور مخطوطہ پٹنہ میں پہلی جگہ التضییق ہے اور دوسری جگہ العضیق ہے۔ یہ التضییق ہندی کتابت ہے مگر صحیح دونوں جگہ العضیق ہے جس کے معنی ہیں تنگی کرنا ..... تمام مطبوعہ اور مخطوطہ نسخوں میں صاد سے عضد ہے مگر یہ تصحیف ہے۔ صخری کے ساتھ عن سے متعدی ہوسکتا ہے ..... اجری الماء : بہانا ..... آخسَن سے قبل کی تقدیری عبارت أحسَن مما کان قبل إلخ ہے ..... المتحجرۃ (اسم فاعل) تحجر: پتھر کی مانند ہونا۔

باب — ۱۴

گناہوں کے مدارج

گناہ کیا ہیں؟ جس طرح قوت بہیمیہ کو قوت ملکیہ کا مطیع کرنے کیلئے اعمال صالحہ ہیں، جو اطاعت کا پیکر محسوس، احسانی مواقع اور اخبیات کو بدست لانے کی راہیں ہیں، اسی طرح اخبیات و طاعات کے بالکل برخلاف اور متضاد حالات کے لئے بھی اعمال طالحہ ہیں، جو نافرمانی اور عدم اطاعت کی احسانی شکلیں اور ادراکی شکلیں ہیں جن سے نافرمانی کی حالت کمائی جاسکتی ہے۔ یہی اعمال: تمام معاصی ہیں اور وہ سب ایک درجے کے گناہ نہیں ہیں، بلکہ ان کے پانچ مراتب ہیں:

پہلا مرتبہ: کفریات کا ہے، جو سب سے زیادہ سنگین گناہ ہیں، جو آخرت میں نجات کی راہ بالکلیہ مسدود کردیتے ہیں۔ اور کفریات میں بھی بڑے گناہ دو قسم کے ہیں:

پہلی قسم کے گناہ وہ ہیں جن کا تعلق اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ ہے یعنی اللہ تعالیٰ کو نہ ماننا جو کفر ودہریت ہے یا اللہ تعالیٰ کو مخلوق جیسا ماننا جو تشبیہ ہے یا مخلوق میں کوئی خدائی صفت ماننا جو اللہ کے ساتھ شریک ٹھہرانا ہے ——— اور ان گناہوں سے کمال مطلوب یعنی نجات کی راہ بالکلیہ مسدود اس لئے ہوجاتی ہے کہ ذات قدسی صفات کو اور صفت تدبیر کی کارفرمائی کو جو کائنات کے سارے نظام کو محیط ہے، پیش نظر رکھے بغیر نفس کی پاکیزگی ممکن ہی نہیں۔ جس شخص کو یہ معرفت حاصل نہیں ہوتی وہ ہمیشہ اپنی ذات میں مشغول رہتا ہے یا ایسے گورکھ دھندوں میں پوری طرح منہمک رہتا ہے کہ وہ بندگی میں نفس میں مشغولیت اسی کی طرح ہیں۔ یہ مشغولیات عدم معرفت باری تعالیٰ کا پردہ چاک نہیں کرسکتیں اور موت کے آنے کے بعد بھی معرفت خداوندی کا دروازہ نہیں کھول سکتیں اور معرفت خداوندی کے بغیر کمال مطلوب کا حصول ناممکن ہے۔ اس لئے یہ ایسے سنگین گناہ ہیں کہ ان سے بڑے کسی گناہ کا تصور نہیں کیا جاسکتا اور آخرت میں اس گناہ کا مرتکب ہمیشہ کے لئے نجات سے محروم رہ جاتا ہے۔ سورۃ النساء آیت ۴۸ میں ہے: "بیشک اللہ تعالیٰ اس بات کو نہ

بخشیں گے کہ ان کے ساتھ کسی کو شریک قرار دیا جائے۔ اور اس کے سوا جتنے گناہ ہیں جس کے لئے منظور ہوگا وہ گناہ بخش دیں گے۔ اور جو شخص اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک ٹھہراتا ہے وہ بڑے جرم کا مرتکب ہوا" ——— احادیث میں بھی سب سے بڑا گناہ شرک ہی کو قرار دیا گیا ہے اور جو حکم شرک کا ہے وہی کفر و تکذیب کا بھی ہے۔

دوسری قسم: یہ ہے کہ آدمی اس دنیا کی زندگی ہی کو حقیقی زندگی اور سب کچھ سمجھ بیٹھے۔ موت کے بعد کی زندگی کا قائل ہی نہ ہو، نہ کسی اخروی کمال پر اس کا ایمان ہو۔ جب دل میں یہ بات بیٹھی ہوئی ہوگی تو وہ کسی کمال کی طرف قطعاً نگاہ نہیں اٹھائے گا اور نہ آخرت کے لئے کوئی تیاری کرے گا۔ اس لئے معاد کا انکار بھی بہت بڑا گناہ ہے۔

اور کمال مطلوب یعنی آخرت میں نجات حاصل کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ پر اور دنیا کے آخری دن پر ایمان رکھنا اس لئے ضروری ہے کہ کمالات کی دو قسمیں ہیں: ایک مادی یعنی دنیوی محسوس کمال اور دوسرا روحانی یعنی اخروی عقلی کمال۔ دنیا کے اعتبار سے کیا چیزیں کمال ہیں اس کو ہر شخص جانتا ہے۔ اور اخروی کمال کیا ہے؟ اس کو عام لوگ نہیں سمجھ سکتے۔ کیونکہ اس کا کمال ہونا حواس سے ادراک نہیں کیا جاسکتا۔ عقل ہی اس کمال کا ادراک کرسکتی ہے۔ اور سب کی عقلیں اس سلسلہ میں کافی نہیں ہیں۔ اس کو سمجھنے کے لئے ایک ایسی حالت کا تصور کرنا پڑتا ہے جو ہر اعتبار سے حالت حاضرہ یعنی دنیوی حالت کے متغایر ہے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ بات ہر شخص کے بس کی نہیں ہے۔ عام لوگ عقلیات کو بخوبی نہیں سمجھ سکتے۔

اور اس اخروی روحانی کمال کو سمجھنا بھی ضروری ہے ورنہ عقلی اور دنیوی کمالات میں تعارض ہو جائے گا اور عقل وہم کے تابع ہوتا ہے اس لئے لوگ دنیوی کمال کی طرف جھک جائیں گے اور روحانی کمال کو رائیگاں چھوڑ دیں گے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے انبیاء بھیجے اور شریعتیں نازل فرمائیں اور انھوں نے کمال اخروی کی تحصیل کا مدار ایمان باللہ و بالیوم الآخر کو قرار دیا۔ کیونکہ یہ دو احاطی چیزیں ہیں جن سے اخروی کمال حاصل ہوسکتا ہے۔ سورۃ النحل آیت ۲۲ میں ہے: "پس جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ان کے دل منکر ہیں اور وہ گھمنڈ کرنے والے ہیں" یعنی ان کے دل دنیا سے اور حقائق کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں اور بڑائی کی باتیں بنانے میں ان کی عقل ہوتی ہے۔

بات مختصر: جب کوئی شخص اس مرتبہ کے گناہوں میں مبتلا ہوتا ہے اور وہ مرجاتا ہے اور اس کی بہیمی قوت پاش پاش ہو جاتی ہے تو اس پر نہایت درجہ منافرت یعنی عدم ملائمت مترتب ہوتی ہے یعنی ملکیت کے تقاضا سے مناسبت نہ رکھنے والی حالت سے وہ دوچار ہو جاتا ہے اور وہ حالت اس کے گلے کا ایسا طوق بن جاتی ہے جس سے وہ کبھی علیحدہ نہیں ہوتا (اللّٰہم احفظنا منہ)

باب طبقات الإثم

اعلم أنه كما أن للانقياد البهيمية للملكية أعمالاً هي أشباحه ومظانّه والمتلبسة الكاسبة له، كذلك للحالة المضادة للانقياد كلّ المضادة أعمالٌ ومظانٌّ وكواسبُ، وهي الآثام، وهي

على مراتب:

المرتبة الأولى: أن يسد سبيله إلى الكمال المطلوب رأساً، ومعظم ذلك في نوعين:

أحدهما: ما يرجع إلى المبدأ، بأن لا يعرف أن له رباً، أو يعرفه متصفاً بصفات المخلوقين، أو يعتقد في مخلوق شيئاً من صفات الله، فالثاني التشبيه، والثالث الإشراك؛ فإن النفس لا تنقشع أبداً حتى تجعل مطمح بصيرتها التجرد الفوقاني، والتدبير العام المحيط بالعالم، فإذا فقدت هذه بقيت مشغولة بنفسها، أو بما هو مثل نفسها في التقيد كل الشغل، لا يقدح حجاب النكرة، ولا موضع إبرة، فهذا هو الهلاك كل الهلاك.

والثاني: أن يعتقد أن ليس للنفس نشأة غير النشأة الجسدية، وأنه ليس لها كمال آخر يجب عليها طلبه، فإن النفس إذا أضمرت ذلك لم يطمح بصرها إلى الكمال أصلاً.

ولما كان الفوز بإثبات كمال غير كمال الجسد، لا يتأتى من الجمهور إلا بتصور حالة تباين الحالة الحاضرة من كل وجه، ولولا ذلك لتعارض الكمال المعقول والمحسوس، لمال إلى المحسوس، وأهمل المعقول، نصب له مظنة، هو الإيمان بلقاء الله واليوم الآخر، وهو قوله تعالى: ﴿فَالَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ قُلُوبُهُم مُّنكِرَةٌ وَهُم مُّسْتَكْبِرُونَ﴾

وبالجملة: فإذا كان الإنسان في هذه المرتبة من الإثم، لمات، واضمحلت بهيميته، ترشحت عليه المنافرة من فوقه كل المنافرة، بحيث لا يجد سبيلاً إلى الخلاص أبداً.

ترجمہ: گناہوں کے درجات کا بیان: جان لیں کہ جس طرح یہ بات ہے کہ قوت بہیمیہ کو قوت ملکیہ کا مطیع کرنے کے لئے کچھ اعمال ہیں، جو انقیاد کا پیکر محسوس، اتم مواقع ہیں اور انقیاد کو پیدا کرنے والی راہیں ہیں، ایسی ہی طرح اس حالت کے لئے بھی جو پوری طرح سے انقیاد کے برخلاف ہے کچھ اعمال احتمال ہیں جو اس کو دکھانے والی راہیں ہیں۔ اور وہی گناہ ہیں اور وہ چند مرتبوں پر ہیں:

پہلا مرتبہ یہ ہے کہ بند ہو جائے آدمی کی راہ کمال مطلوب (نجات) کی طرف بالکلیہ۔ اور اس مرتبہ کے بڑے تمام دو قسموں میں منحصر ہیں:

ان میں سے ایک: وہ گناہ ہیں جن کا تعلق مبدأ (اصل یعنی اللہ تعالیٰ) سے ہے۔ (اور وہ تعلق) اس طرح ہے کہ نہ پہچانے آدمی اس بات کو کہ اس کے لئے کوئی پروردگار ہے یا جانے وہ اس کو مخلوق کی صفات کے ساتھ متصف یا اعتقاد رکھے کسی مخلوق میں اللہ کی صفات میں سے کسی صفت کا، پس دوسری صورت تشبیہ ہے، اور تیسری صورت شریک ٹھہرانا ہے ——— (اور شرک و تشبیہ سے مطلقاً کمال کی راہ کو بالکل مسدود اس لئے ہو جاتی ہے) کہ نفس کبھی بھی پاکیزہ نہیں ہو سکتا یہاں

تک کہ وہ اپنی بصیرت سے پڑنے کی جگہ بنائے بالائی روحانیت (یعنی اللہ تعالیٰ) کو، اور عالم کو بطور کلی تدبیر کو۔ پس جب گم کرے گا نفس اس کو (یعنی اس کو ذات باری اور صفت تدبیر کی معرفت حاصل نہیں ہوئی) تو باقی رہ جائے گا وہ پھنسا ہوا اپنی ذات میں یا ایسی چیز میں جو اپنی ذات کی طرح ہے پابندی میں، پوری طرح سے پھنسا ہوا ہوتا۔ نہیں توڑے گی وہ مشغولیت اللہ کے بارے میں جہالت کے پردہ کو (یعنی دنیوی مشاغل سے معرفت الٰہی حاصل نہیں ہو سکتی) اور سوئی کی نوک کی جگہ کے بقدر (بھی پردہ کھولے گی) پس یہی وہ مصیبت ہے جو سب سے بڑی مصیبت ہے۔

اور دوسری قسم: یہ ہے کہ آدمی اعتقاد رکھے اس بات کا کہ نہیں ہے نفس کے لئے ورلی زندگی مادی زندگی کے علاوہ اور یہ اعتقاد رکھے کہ نہیں ہے نفس کے لئے کوئی دوسرا کمال (مادی کمال کے علاوہ) جس کی طلب نفس کے لئے ضروری ہو۔ پس جب نفس دل میں یہ بات چھپائے گا تو یقیناً وہ اپنی نظر نہیں اٹھائے گا مطلوبہ کمال کی طرف قطعاً۔

اور جب مادی کمال کے علاوہ اور کمال کے ثابت کرنے کی بات حاصل نہیں ہو سکتی عام لوگوں کے لئے مگر کسی ایسی حالت کے تصور کرنے کے ذریعے جو موجودہ حالت کے برخلاف ہو، بر اختیار سے، اور اگر لوگ روحانی کو نہیں سمجھیں گے تو عقلی اور مادی کمال میں تعارض ہو جائے گا، پس انسان مادی کی طرف مائل ہوگا اور روحانی کمال کو رائیگاں چھوڑ دے گا، تو قائم کیا گیا اس روحانی کمال کے لئے مظنہ (احتمالی جگہ) اور وہ اللہ سے ملنے پر اور آخری دن پر ایمان لانا ہے اور اس کا تذکرہ ہے ارشاد پاک میں ہے: ''پس جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، ان کے دل انکار کرنے والے ہیں درانحالیکہ وہ گھمنڈ کرنے والے ہیں''

قصہ مختصر: پس جب انسان گناہ کے اس مرتبہ میں پھنسا ہوا ہوتا ہے، پس وہ مر جاتا ہے، اور اس کی بہیمیت مرجھا جاتی ہے تو نزہت دو وجہ منافرت اس کے اوپر سے اس پر چھا جاتی ہے، اس طور پر کہ وہ کوئی چھٹکارے کی راہ نہیں پاتا ابد تک۔

لغات وترکیب:

السنن الکاسبۃ مرکب توصیفی کا عطف خباثۃ پر ہے۔ کواسب جمع ہے کاسبۃ کی ... انتبذ انتباذ: علیحدہ ہونا تقدس تقدسا: پاک ہونا۔ المطمح: مکان الرفع والنظر۔ البصیرۃ: دل کی بینائی التجرد: غیر مادی ہونا الفوقانی: بالائی والمراد من التجرد الفوقانی: جنابہ تعالیٰ وحضرتہ (سندی)۔ کل الشغل مفعول مطلق ہے مشغولۃ (اسم مفعول) کا ... لاینقذ نہیں توڑتا ہے۔ کہا جاتا ہے قذ ختام الخابیۃ مٹکے کی مہر کو توڑ دیا ... النکرۃ ضد ہے المعرفۃ کی۔ حجاب النکرۃ ای حجاب عدم معرفۃ اللہ تعالیٰ موضع إبرۃ: سوئی کی جگہ یعنی سوئی زمین پر پڑی ہو یا زمین پر سوئی کی نوک ٹکی جائے تو جتنی جگہ اس کے نیچے آئے وہ سوئی کے بقدر جگہ کہلاتی ہے۔ عربی میں یہ نہایت تقلیل کے لئے مروج ہے اور لاینقذ کا فاعل ضمیر ہے جو الشغل کی

طرف راجع ہے — المنافرة ضد ہے الملائمة کی یعنی وہ حالت جو ملکیت کے لئے غیر مناسب ہے، جس سے ملکیت کو بے حد تکلیف پہنچتی ہے — ولولا ذلك أي ولولا ذلك الإلقاء أو تصور حالة منافية — تُصيب له: جزا ہے لما كان القول الخ کی۔

تصحیح: توشّحت عليه المنافرة اصل میں وُضعت الخ تھا، یہ تصحیف ہے، تینوں مخطوطوں سے تصحیح کی گئی ہے۔

☆ ☆ ☆

دوسرا مرتبہ: دین سے اعراض کا ہے — اللہ تعالیٰ نے انبیاء بھیجے، ان پر شریعتیں نازل کیں تاکہ لوگ اس ہدایت سے فائدہ اٹھا کر آخرت میں سعادت و نجات پائیں۔ ملأ اعلیٰ کی پوری توجہات اللہ کے اس دین کو پھیلانے کی طرف اور اس کے معاملہ کو بڑھانے کی طرف رہتی ہے۔ مگر کچھ گھمنڈی لوگ اس دین کو قبول نہیں کرتے، بلکہ اس میں ان کی ہتک ہوتی ہے۔ وہ لوگ نہ صرف اللہ کے اس دین کا انکار کرتے ہیں بلکہ اس کی مخالفت پر کمربستہ رہتے ہیں۔ یہ لوگ جب مرتے ہیں تو ملأ اعلیٰ کی تمام تر توجہات ان کے لئے ناپسندیدہ اور تکلیف دہ ہو جاتی ہیں اور ان کی نفرتیں ان کا اس طرح احاطہ کر لیتی ہیں کہ ان سے باہر نکلنے کی کوئی راہ باقی نہیں رہتی۔ علاوہ ازیں یہ مخالفت حق ان کو مطلوبہ کمال حاصل کرنے سے یا تو بالکلیہ روک دیتی ہے یا قابل لحاظ کمال سے تہی دست رکھتی ہے۔ اور گناہ کا یہ مرتبہ بھی انسان کو ملت سے خارج کر دیتا ہے۔ تمام شریعتوں کا یہی حکم ہے کہ دین قبول کرنے سے اعراض کرنے والا یا بظاہر دین قبول کرکے دین کی مخالفت کرنے والا اور لوگوں کو اللہ کے راستے سے روکنے والا حقیقت میں مسلمان باقی نہیں رہتا۔

والمرتبة الثانية: أن يتكبر بكبره فيهجم على ما نصبه الله تعالى لوصول الناس إلى كمالهم، وقصدت الملأ الأعلى بأقصى همتها إشاعة أمره وتنويه شأنه، من الرسل والشرائع، فينكرها ويصدّ عنها، فإذا مات انعطف جميعُ هممهم منافرةً له، ومؤذيةً إياه، وأحاطت به خطيئته، من حيث لم يجد للخروج منه سبيلا، على أنه لا تنفك هذه الحالة من عدم الوصول إلى كماله، أو الوصول الذي لا يُعتدّ به، وهذه المرتبة تُخرج الإنسان من ملة نبيه في جميع الشرائع

ترجمہ: اور دوسرا مرتبہ یہ ہے کہ انسان اپنے کبر گھمنڈ سے گھمنڈ کرے اس چیز کے مقابلہ میں جس کو اللہ تعالیٰ نے مقرر کیا ہے لوگوں کے ان کے کمال تک پہنچنے کے لئے اور ملأ اعلیٰ نے ارادہ کیا ہے اپنی غایت درجہ کامل توجہات کے ذریعہ اس کے معاملہ کی اشاعت کا اور اس کی شان کو بلند کرنے کا یعنی انبیاء اور شریعتیں، پس وہ ان کا انکار کرتا ہے اور ان سے دشمنی رکھتا ہے، پس جب وہ مرجاتا ہے تو مڑ جاتی ہیں ملأ اعلیٰ کی ساری توجہات درانحالیکہ وہ اس کے لئے ناپسندیدہ ہوتی ہیں اور اس کے لئے تکلیف دہ ہوتی ہیں اور گھیر لیتی ہیں اس کو اس کی خطائیں اس طور سے کہ نہیں پاتا وہ اس سے نکلنے کی کوئی راہ۔

مادہ واثر لیں نہیں پیدا ہوتی ہے۔ یہ حالت اس کے کمال تک نہ پہنچنے سے یا اس پہنچنے سے جو کہ قابلِ لحاظ نہیں ہے اور گناہ کا پہلا دوسرا مرتبہ انسان کو ناکام رکھتا ہے اس کے تغیر کی مت سے تمام شریعتوں میں۔

ترکیب:

الکبر البہیمی: وہ کبر جو بہیمیت کے تقاضے سے پیدا ہوتا ہے۔ من الوصول والظہر الی عیان ہے علیٰ ما نصبہ میں ماکا۔ لا تنفک فعل ناقص ہے اور ھذہ الحالۃ اس کا اسم ہے اور من عدم الوصول الخ خبر ہے۔ مولانا سندھی رحمہ اللہ کی تقریر میں ہے: لا یصل الی الکمال او یصل ویتوقف، لکنہ لا یصل الی الکمال المعتدبہ، بل الی الکمال الناقص الذی لا یدفع عنہ المؤاخذۃ وھذا ھو الکافر اھ

☆ ☆ ☆

تیسرا مرتبہ مہلکات کا ہے۔ یہ دو طرح کے گناہ ہیں: ایک: ان مامورات کا چھوڑنا جن پر آخرت میں نجات کا مدار ہے، جیسے اسلام کے ارکانِ اربعہ اور دیگر واجبات و فرائض کو بجالانا بھی تباہ کردے گا۔ کیونکہ مذا فرائض کا ترک گناہِ کبیرہ ہے۔ دوم: ان کاموں کا ارتکاب کرنا جن کے کرنے والے پر لوحِ محفوظ میں لعنت کا فیصلہ ہوچکا ہے، اس وجہ سے کہ وہ کام دو وجوہ سے: ملک میں بڑی خرابی کا باعث ہیں اور نفس کی اصلاح کی راہ کا روڑا ہیں ——— دونوں طرح کے گناہوں کی تفصیل درج ذیل ہے:

۱۔ ان احکامِ شرعیہ پر عمل پیرا نہ ہونا جو طبیعت کو بیداری کا خوگر بناتے ہیں یا قابلِ لحاظ حد تک نفس کو اس کے لئے تیار کرنے والے ہیں۔ اور یہ احکامِ شرعیہ لوگوں کے اختلاف سے مختلف ہوتے ہیں۔ پس جو لوگ ضعیف بہیمیت کی کیفیات میں ڈوبے ہوئے ہوتے ہیں ان کے لئے بکثرت احکامِ شرعیہ بجا لانے ضروری ہیں۔ اور جن اقوام کی بہیمیت سخت درکار ہوتی ہے ان کے لئے سخت احکامِ شرعیہ بکثرت کرنا ضروری ہوتا ہے جیسے لگاتار روزے رکھنا۔ اور شب بیداری کرنا اور دیگر ریاضتیں کرنا۔

۲۔ درندگی والے کام جو بڑی لعنت کا سبب ہوتے ہیں، جیسے کسی کو ناحق قتل کرنا۔

۳۔ شہوانی اعمال جیسے: زنا، لواطت وغیرہ

۴۔ وہ کمائیاں جو معاشرہ کے لئے سخت ضرر رساں ہیں، جیسے سٹہ اور سود وغیرہ۔

مذکورہ چاروں قسم کے کام کرنے والوں کے دین میں بڑی دراڑ پڑ جاتی ہے، اس وجہ سے کہ وہ ملت راشدہ کے برخلاف اقدام کرتے ہیں (تفصیل مبحث سوم کے باب یازدہم میں گذر چکی ہے) اور ان کاموں کے مرتکب کو عالم بالا کی لعنت گھیر لیتی ہے۔ پس ان دونوں باتوں (دین میں رخنہ پڑنا اور لعنت کا ان کو گھیر لینا) کے نتیجہ میں وہ عذاب کا

حقدار بن جاتا ہے۔

اور اس تیسرے مرتبہ کے گناہ بڑے گناہ کہلاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے یہاں ان کی حرمت کا اور ان کے مرتکب کے ملعون ہونے کا فیصلہ ہو چکا ہے اور انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام ہر زمانہ میں اس خدائی فیصلہ کی ترجمانی کرتے رہے ہیں اور لوگوں کو ان کبائر سے آگاہ کرتے رہے ہیں اور ان میں سے بیشتر تمام شریعتوں میں بالاتفاق گناہ ہیں۔ متفق علیہ روایت میں ایسے سات گناہوں کا خصوصیت سے تذکرہ کیا گیا ہے یعنی اللہ کے ساتھ شریک ٹھہرانا (یہ تو اکبر الکبائر ہے اور پہلے مرتبہ کا گناہ ہے) اور جادو کرنا، کسی کو ناحق قتل کرنا، سود کھانا، یتیم کا مال کھانا، مڈبھیڑ کے دن پیٹھ پھیرنا اور ایماندار، بھولی، پاکدامن عورتوں پر تہمت لگانا (مشکوٰۃ حدیث نمبر ۵۲)

والمرتبة الثالثة: تركُ ما يُنجيه، وفعلُ ما انعقد في الذكر اللعنُ على فاعله، من جهة كونه نفثةً غالبًا لفسادٍ كبير في الأرض، وهيئةً مضادةً لتهذيب النفس:

فمنها: أن لايفعلَ من الشرائع الكاسبةِ للاعتقاد أو المُهَيِّئَة له ما يُعتد به؛ ويختلف باختلاف النفوس، إلا أن المُنْغَمِسَة في الهيئات البهيمية الضعيفةِ أحوجُ الناس إلى إكثارها؛ والأممُ التي يعمُّها أشدُّ وأغلظُ أحوجُ الناس إلى إكثار الشاقِّ منها.

ومنها: أعمالٌ سَبُعِيَّةٌ تَسْتَجْلِبُ لعنًا عظيمًا، كالقتل.

ومنها: أعمالٌ شهويَّةٌ.

ومنها: مكاسبُ ضارَّةٌ، كالقمار والربا.

وفي كل شيئ من هذه المذكورات ظُلْمةٌ عظيمةٌ في النفس، من جهة الإقدام على خلاف السنة اللازمة، كما ذكرنا؛ ولعنٌ من الملأ الأعلى يحيط به؛ فبمجموع الأمرين يحصل العذاب؛ وهذه المرتبةُ أعظمُ الكبائر، قد انعقد في حظيرة القدس تحريمُها، ولعنُ صاحبها، ولم يزل الأنبياءُ يُتَرْجِمُوْنَ ما انعقد هنالك، وأكثرُها مُجْمَعٌ عليه في الشرائع.

ترجمہ: اور تیسرا مرتبہ: ان کاموں کو چھوڑنا ہے جو آدمی کو نجات دلانے والے ہیں۔ اور ان کاموں کو کرنا ہے جن کے کرنے والے پر لوح محفوظ میں لعنت تجویز پا چکی ہے اس کام کے عام طور پر احتمالی موقع ہونے کی جہت سے زمین میں بڑی خرابی کا (یعنی عام طور پر اس کام سے زمین میں بڑی خرابی رونما ہوتی ہے) اور ایسی ہیئت کا جو نفس کو سنوارنے کے برخلاف ہے (یعنی عام طور پر اس کام سے نفس میں ایسی ہیئت پیدا ہوتی ہے جس سے نفس بجائے سنورنے کے بگڑتا ہے)

پس مرتبۂ ثالثہ میں سے یہ بات ہے کہ آدمی عمل نہ کرے شریعت کے ان احکام پر جو اعتقاد کو کمانے والے ہیں

(یعنی نفس کو تابعداری کا خوگر بناتے ہیں) یا تیاری کرنے والے ہیں اس کی تابعداری کے لئے جو آگے ملتا ہے (یعنی ان اعمال سے طبیعت میں اچھا خاصا انقیاد پیدا ہوتا ہے) اور وہ آگے ملنا متعدد اور مختلف ہوتی ہے لوگوں کے اختلاف سے۔ البتہ جو شخص کمزور ہے بہیمیت میں زیادہ بڑھنے والا ہے وہ سب سے زیادہ محتاج ہے احکامِ شرعیہ پر بکثرت عمل کرنے کی طرف۔ اور وہ اقوام جن کی بہیمیت سخت اور کاڑھی ہے وہ لوگوں میں سب سے زیادہ محتاج ہیں شریعت کے تحت احکام پر بکثرت عمل کرنے کی طرف۔

اور مرتبہ ثالثہ میں سے درندگی والے کام ہیں جو بڑی لعنت کو کھینچتے ہیں جیسے قتل کرنا۔

اور ان میں سے شہوانی اعمال ہیں۔

اور ان میں سے ضرر رساں کمائیاں ہیں: جیسے سود (ربوا) اور جوا۔

اور مذکورہ بالا چاروں قسم کے کاموں میں سے ہر چیز میں بڑی وراثت ہے نفس میں خباثت، تعدی کرنے کی وجہ سے سنت راشدہ لازمہ کے خلاف پر، جیسا کہ ہم نے ذکر کیا، اور ملأ اعلیٰ کی بڑی لعنت اس شخص کو گھیر لیتی ہے، پس دونوں باتوں کے مجموعہ سے وجود میں آتا ہے عذاب۔ اور یہ مرتبہ کبائر میں سب سے بڑا مرتبہ ہے اسلئے پانچکا ہے بارگاہ مقدس میں ان کا حرام ہونا اور ان کے مرتکب کا ملعون ہونا۔ اور انبیاء برابر ترجمانی کرتے رہے ہیں اس بات کی جو وہاں سے پائی ہے۔ اور تیسرے مرتبہ کے گناہوں میں سے بیشتر گناہ تمام شریعتوں میں متفق علیہ ہیں۔

ترکیب: هيئة مضاف اور فاعل مفعول لہ کیرو ہے ... للملمة متعلق مؤخر ہے۔

☆ ☆ ☆

چوتھا مرتبہ: قوموں اور زمانوں کا لحاظ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے جو مختلف شریعتیں اور الگ الگ احکام تجویز فرمائے ہیں اور ہر شریعت میں خصوصی احکام دیئے ہیں ان کی خلاف ورزی کرنا چوتھے مرتبہ کا گناہ ہے۔ مثلاً یہود پر اونٹ کا گوشت حرام تھا۔ یوم السبت کی تعظیم لازم تھی۔ مال غنیمت حلال نہیں تھا اور غیر اللہ کے لئے سجدۂ تحیہ جائز تھا اور ہماری شریعت میں اونٹ کا گوشت حلال ہے، یوم السبت کے بجائے یوم الجمعہ کی تعظیم مقرر کی گئی ہے، مال غنیمت کو حلال کیا گیا ہے اور غیر اللہ کے لئے سجدہ کرنا مطلقاً ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ پس یہود پر ان کے زمانہ میں ان کی شریعت کی پابندی لازم تھی، اور اس کی خلاف ورزی گناہ تھی اور اب ہم پر بلکہ سب پر شریعت محمدی کی پابندی لازم ہے اور اس کی خلاف ورزی گناہ ہے اور یہ گناہ چوتھے مرتبہ کا ہے۔

اس کی مزید تفصیل یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی قوم میں کسی نبی کو مبعوث فرماتے ہیں تاکہ وہ لوگوں کو کفر کی ظلمتوں سے نکال کر ایمان کی روشنی میں لائیں، ان کی کجی کو دور کریں اور ان کے احوال کو سنوار کر ان کو مؤدب بنائیں تو ضروری

ہوتا ہے کہ وہ نبی اپنے مشن کی تکمیل کے لئے کچھ ایسے خصوصی احکام دیں جو ان کی کجی کو دور کرنے کے لئے اور ان کو مہذب بنانے کے لئے ضروری ہوں۔ کیونکہ ہر مقصد کے لئے کچھ طریقے تو ایسے ہوتے ہیں جو صد فی صد کامیاب ہوتے ہیں اور کچھ طریقے بڑی حد تک کارآمد ہوتے ہیں، وہ طریقے قوم کو بتانے ضروری ہیں اور ان کی خلاف ورزی پر دارو گیر بھی ضروری ہے۔ اس لئے ہر شریعت میں ایسے خصوصی احکام دیئے گئے ہیں اور ان کی خلاف ورزی کو گناہ قرار دیا گیا ہے۔

اور شریعتوں کے ان خصوصی احکام کے سلسلہ میں یہ بات جان لینی چاہئے کہ توقیت یعنی احکام کے اوقات مقرر کرنے کے لئے ایسے قوانین ہیں جو توقیت کو واجب کرتے ہیں یعنی اوقات کا یہ اختلاف اصول و ضوابط پر مبنی ہوتا ہے۔ جس شریعت میں جو حکم دیا گیا ہے اس کی کوئی بنیاد ہوتی ہے مثلاً کبھی کوئی امر کسی خرابی کا باعث ہوتا ہے تو اس کو ممنوع ٹھہرایا جاتا ہے یا کسی امر میں کوئی مصلحت ہوتی ہے تو اس کے کرنے کا حکم دیا جاتا ہے۔ پھر مفسدہ اور مصلحت کا وزن بھی دیکھا جاتا ہے۔ اور اس کے اعتبار سے حرام، مکروہ (تحریمی اور تنزیہی) واجب، سنت اور مستحب وغیرہ مراتب پیدا ہوتے ہیں۔ غرض تمام احکام ایک درجے کے نہیں ہوتے بلکہ نازل ہوتے ہیں تو بعض اتقیدری اور ان احکام کا کچھ حصہ وحی ظاہر (قرآن کریم) میں نازل کیا گیا ہے اور بڑا حصہ وحی خفی یعنی اجتہاد نبی سے ثابت ہے جو احادیث میں مروی ہے۔

والمرتبة الرابعة: معصيةُ الشرائع والمناهج المختلفة باختلاف الأمم والأعصار، وذلك: أن الله تعالى إذا بعث نبيا إلى قوم، ليخرجهم من الظلمات إلى النور، وليقيم عوجهم، وليسوسهم أحسن السياسة، كان بعثه متضمنًا لإيجاب ما لا يمكن إقامة عوجهم وسياستهم إلا به، فلكل مقصد مظنةٌ أكثريةٌ أو دائمة، يجب أن يؤاخذوا عليها ويحافظوا بها.

وللتوقيت قوانين توجبها، ورب أمر يكون داعيًا إلى مفسدة أو مصلحة يجزمون حسبما يدعون إليه، ومن ذلك ما هو مأمور أو منهي عنه حتما، ومنه ما هو مأمور أو منهي عنه من غير عزم، وأقلُّ ذلك ما نزل به الوحيُ الظاهر، وأكثره ما لا يثبته إلا اجتهادُ النبي صلى الله عليه وسلم.

ترجمہ: اور چوتھا مرتبہ: ان شریعتوں اور ان حکموں کی نافرمانی کرنا ہے جو امتوں اور زمانوں کے اختلاف سے مختلف ہوتی ہیں۔ اور اس کی تفصیل یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی قوم میں کسی نبی کو مبعوث فرماتے ہیں تاکہ وہ ان کو تاریکیوں سے روشنی کی طرف نکالے اور تاکہ وہ ان کی کجی کو سیدھا کرے اور تاکہ وہ ان کو مہذب بنائے خوب سنوار کر تو اس کی بعثت ان چیزوں کو واجب کرنے پر مشتمل ہوتی ہے جن کے بغیر ان کی کجی کو دور کرنا اور ان کو سلیقہ مند بنانا ممکن نہیں ہوتا۔ کیونکہ ہر مقصد کے لئے اکثری یا دائمی احتمالی موقع ہوتا ہے جس پر لوگوں کی دارو گیر کرنا اور جس کا لوگوں کو مخاطب بنانا ضروری ہوتا ہے۔

اور احکام کے وقت کی تعیین کے لئے ایسے قوانین ہیں جو اس کو واجب کرتے ہیں اور کوئی امر کسی خرابی یا مصلحت کی طرف داعی ہوتا ہے، وہی لوگ حکم دیئے جاتے ہیں اس چیز کے موافق جس کی طرف وہ داعی ان کو دعوت دیتے ہیں۔ اور ان میں سے بعض وہ ہیں جو ازالی طور پر، صورۃً یا معنًی منعقد ہوتے ہیں اور ان میں سے بعض وہ ہیں جو تاکید کے بغیر، صورۃً یا معنًی منعقد ہوتے ہیں۔ اور ان میں سے کچھ وہ ہیں جن کے بارے میں ظاہری وحی نازل ہوتی ہے۔ اور ان میں سے بیشتر وہ ہیں جو نبی کریم ﷺ کے اجتہاد سے ثابت ہوتے ہیں۔

لغات وتصحیح: ساس یسوس سیاسۃ: رعیت کی بھلائی کرنا ■ حد معلوم: حاجب کھڑا ■ والمرتبۃ الرابعۃ میں واؤ بڑھایا گیا ہے ■ وللتوقیت قوانین توجبھا اصل میں وللتوقیف قوانین توجبہ تھا تصحیح مطبوعہ صدیقی اور مخطوطات سے کی گئی ہے۔

☆ ☆ ☆

پانچواں مرتبہ: التزامات کی خلاف ورزی کرنے کے گناہ کا ہے۔ التزام کے معنی ہیں: کسی بات کو لازم کر لینا، ضروری قرار دے لینا: جیسے مالی یا بدنی عبادت کی منت ماننا، تلاوت یا ذکر کا کوئی وظیفہ مقرر کرنا، رات بھر نفلیں پڑھنے کا التزام کرنا یا کسی چیز کے ترک کا، مثلاً گوشت نہ کھانے کا عہد کرنا وغیرہ۔ یہ سب باتیں شریعت نے لازم نہیں کیں، مثلاً اس میں ان کا کوئی حکم نازل نہیں ہوا ہے۔ بلکہ بندہ خود اپنی کامل توجہ سے اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوتا ہے پس اس کے ذہن میں ایک بات آتی ہے جس کو وہ مامور بہ یا ممنوع عنہ سمجھ لیتا ہے، کسی قیاس کی وجہ سے یا کسی طے شدہ ضابطہ پر تفریع کرنے کی وجہ سے، یا کسی اور طرح سے، جیسے عوام کسی ناقص تجربہ کی بنیاد پر یا کسی حکیم کے بار بار کسی دوا کو کسی مرض میں لکھنے کی وجہ سے تاثیر کا گمان قائم کر لیتے ہیں حالانکہ وہ اس تاثیر کی وجہ نہیں جانتے، نہ کسی ماہر حکیم نے اس تاثیر کی صراحت کی ہے۔ ایسے التزامات میں آدمی اپنی ذمہ داری سے اس وقت عہدہ برآ ہو سکتا ہے جب وہ احتیاط پر عمل کرے اور جن چیزوں کا التزام کیا ہے ان کو بجا لائے۔ ورنہ اس کے دل پر نافرمانی کا پردہ پڑ جائے گا اور اس کی اس کے گمان کے مطابق گرفت کی جائے گی۔

اور اس مرتبہ کے سلسلہ میں اصل منشأ خداوندی تو یہ تھا کہ اس کے معاملہ کو مہمل چھوڑ دیا جائے اور اس کی طرف التفات نہ کیا جائے، کیونکہ یہ چیزیں شرعاً ضروری نہیں ہیں۔ مگر امتوں میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو ان چیزوں کو واجب ولازم جانتے تھے، اس لئے رب کریم نے ان کو وہ چیز پوری پوری دیدی جو انھوں نے واجب ولازم جانی یعنی اب شرعاً بھی ان التزامات کا وفا ضروری ہے۔

اور اس پانچویں مرتبہ کے سلسلہ میں درج ذیل نصوص وارد ہوئی ہیں:

۱۔ متفق علیہ حدیث قدسی ہے: "اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: أنا عند ظن عبدي بي یعنی میرا بندہ میرے بارے میں جو گمان کرتا ہے، میں اس کے ساتھ ویسا ہی معاملہ کرتا ہوں (مشکوٰۃ، کتاب الدعوات، باب ذکر اللہ، حدیث نمبر ۲۲۶۴) شاہ صاحب رحمہ اللہ نے حجۃ اللہ کی قسم دوم میں اس حدیث کی شرح یہ کی ہے کہ جن گناہوں کے بارے میں حظیرۃ القدس میں کوئی فیصلہ قرار نہیں پایا ان میں بندے کے ساتھ اس کے گمان کے مطابق اللہ تعالیٰ معاملہ فرمائیں گے۔ (دیکھئے اذکار، دعا اور اوراد اور ان کے متعلقات کا بیان)

۲۔ سورۃ الحدید آیت ۲۷ میں ہے کہ: "انھوں نے (یعنی عیسائیوں نے) رہبانیت کو خود ایجاد کر لیا، ہم نے ان پر اس کو واجب نہ کیا تھا، لیکن انھوں نے حق تعالیٰ کی رضا کے واسطے اس کو اختیار کیا تھا" یہی التزامات عہد ہیں، جن کو بندہ اپنے گمان کے اعتبار سے سر لیتا ہے۔ جن کا وفا ضروری ہے۔ عیسائیوں نے خود اپنی ایجاد کردہ رہبانیت کی رعایت پوری نہ کی تو اللہ تعالیٰ نے ان کے گمان کے مطابق ان کی گرفت کی۔

۳۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "نہ سختی کرو تم اپنی جانوں پر، پس سختی کریں گے اللہ تعالیٰ تم پر" (رواہ ابوداؤد، مشکوٰۃ حدیث نمبر ۱۸۱) یعنی ایسی ریاضتیں اور مجاہدے نہ کرو جن کی نفس میں طاقت نہ ہو اور مباح کو اپنے اوپر حرام نہ کرو، پس سختی کریں گے اللہ تعالیٰ اور فرض کر دیں گے ان کو تم پر اور تم میں ان کی ادائیگی کی طاقت نہ ہوگی (مظاہر حق)

۴۔ حضرت نواس رضی اللہ عنہ نے نیکی اور گناہ کے بارے میں دریافت کیا تو آپ نے فرمایا: "نیکی خوش خلقی ہے یعنی نیکی کی عمدہ قسم یہ ہے اور گناہ وہ ہے جو تیرے سینہ میں جم جائے، اور تو ناپسند کرے کہ لوگ اس سے واقف ہوں" (رواہ مسلم، مشکوٰۃ، کتاب الآداب، باب الرفق، حدیث نمبر ۵۰۷۳) یعنی جس امر کے بارے میں دل میں یہ بات بیٹھ جائے کہ وہ گناہ ہے، پس وہ گناہ ہے۔

فائدہ: مجتہدات یعنی وہ غیر منصوص مسائل جن کے احکام مجتہدین امت نے طے کئے ہیں اور ان میں اختلافات ہوئے ہیں وہ اس پانچویں مرتبہ کے ساتھ لاحق ہیں، جو شخص جس امام کی تقلید کرتا ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ اپنے امام کی رائے کے مطابق عمل کرے، اگر اس کی خلاف ورزی کرے گا تو وہ معصیت شمار ہوگی اور وہ اس پانچویں مرتبہ کا گناہ تصور کیا جائے گا۔

نوٹ: اس فائدہ سے معلوم ہوا کہ شاہ صاحب رحمہ اللہ کے نزدیک تقلید ائمہ برحق چیز ہے۔

والمرتبة الخامسة: ما لم ينصَّ عليه الشارعُ، ولم ينعقد في الملأ الأعلى حكمُه، لكن توجَّه عبدٌ إلى الله بمجامع همته، فاعتراه شيء يظنه ممنوعا عنه، أو مأمورًا به، من قِبَل قياس أو تخريج، أو نحو ذلك، كما يظهر للعوام تأثيرُ بعض الأدوية، من قِبَل تجربة ناقصة، أو تَوَران حكم الطبيب الحاذق على علة، ولا يعلمون وجه التأثير، ولا ينصُّ عليه الطبيب، فلا يخرج مثلُ هذا الإنسان من

المهملة حتى يأخذ بالاحتياط، وإلا كان بينه وبين ربه حجابٌ فيما يظنُّ، فيؤاخذ بظنه.

وأصلُ المرضيِّ في هذه المرتبة أن يُهمَلَ أمرُها، ولا يُلتفت إليها، غير أن في الوجود أقواما يستوجبون ذلك، فيوفّرُ عليهم الخواصُّ ما استوجبوه، وفيها قوله تعالى: ﴿أنا عند ظنِّ عبدي بي﴾ وقوله تعالى في القرآن العظيم: ﴿وَرَهْبَانِيَّةً ابْتَدَعُوهَا مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ إِلَّا ابْتِغَاءَ رِضْوَانِ اللَّهِ﴾ وقوله صلى الله عليه وسلم: ﴿لاتُشدِّدُوا على أنفسكم فيُشدِّدَ الله عليكم﴾ وقوله صلى الله عليه وسلم: ﴿الإثمُ ما حاك في صدرك﴾ ويُلحق بها معصيةُ حكمِ مُجْتَهَدٍ فيه، إذا كان مقلِّدا مُجمِعا تقليدَ من يرى ذلك، والله أعلم.

ترجمہ: اور پانچواں مرتبہ: ان باتوں کا ہے جن کے بارے میں شارع نے کوئی صراحت نہیں کی ہے اور نہیں ملے پایا ہے ملأ اعلیٰ میں اس کا حکم البتہ ایک بندہ اللہ تعالیٰ کی طرف اپنی پوری توجہ سے متوجہ ہوا۔ پس اس کے سامنے آئی ایک ایسی چیز جس کو اس نے ممنوع عنہ یا مامور بہ گمان کیا۔ کسی قیاس کی رو سے یا تخریج کی رو سے یا اس کے مانند کسی چیز کی رو سے، جس طرح عام لوگوں کے لئے بعض جڑی بوٹیوں کی تاثیر ظاہر ہوتی ہے، کسی ناقص تجربہ کی رو سے یا کسی ماہر طبیب کے کسی علت کو مدارِ حکم بنانے کی وجہ سے: درانحالیکہ نہیں جانتے وہ تاثیر کی وجہ اور نہ کسی حکیم نے اس کی صراحت کی ہوتی ہے۔ پس نہیں نکلتا اس طرح کا انسان ذمہ داری سے تا آنکہ احتیاط پر عمل کرے، ورنہ ہوگا اس کے اور اس کے پروردگار کے درمیان ایک پردہ اس معاملہ میں جو اس نے گمان کیا ہے (یعنی اس کو کرنے یا نہ کرنے کا التزام کیا ہے) پس پکڑا جائے گا وہ اس کے گمان کے مطابق۔

اور اس مرتبہ میں اصل مرضی خداوندی یہ ہے کہ اس کے معاملہ کو کلی چھوڑ دیا جائے اور اس کی طرف التفات نہ کیا جائے۔ مگر ایسے لوگ موجود ہیں جو واجب ولازم جانتے ہیں اس کو (یعنی ان کے گمان میں التزامات کی خلاف ورزی گناہ ہوتی جاتی ہے) پس پوری پوری دے دی اس کو تنگی پروردگار نے وہ چیز جس کو انھوں نے واجب ولازم جانا (یعنی ان کی خلاف ورزی کو گناہ قرار دیدیا) اور اس مرتبہ خامسہ کے بارے میں اللہ پاک کا ارشاد (حدیث قدسی میں) وارد ہوا ہے: "میں میرے ساتھ اپنے بندے کے گمان کے پاس ہوں" اور قرآن عظیم میں اللہ پاک کا ارشاد ہے: "اور رہبانیت (ترک دنیا) کو انھوں نے گھڑ لیا، ہم نے اس کو ان پر لازم نہیں کیا تھا۔ مگر (گھڑ لی انھوں نے وہ چیز) محض اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے" اور آنحضور ﷺ کا ارشاد ہے: "سختی کرو تم اپنی ذاتوں پر، پس سختی کریں گے اللہ تعالیٰ تم پر" اور آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے: "گناہ وہ ہے جو تیرے سینہ میں تردد پیدا کرے" —— اور لاحق کیا جائے گا اس (مرتبہ خامسہ) کے ساتھ مجتہد فیہ (مختلف فیہ) حکم کی نافرمانی کرنا جبکہ وہ نافرمانی کرنے والا مقلد پختہ ارادے سے اس مجتہد کی تقلید کرنے والا ہو جو وہ رائے رکھتا ہے (مثلاً امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک جہری نماز میں بھی مقتدی پر فاتحہ فرض ہے اور

امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک سری نماز میں بھی مکروہ تحریمی ہے، پس جو شافعی ہے اس پر فاتحہ پڑھنا فرض ہے، نہیں پڑھے گا تو اس کی نماز نہیں ہوگی اور جو حنفی ہے وہ اگر فاتحہ پڑھے گا تو اس کی نماز مکروہ تحریمی ہوگی) باقی اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں

لغات:

والمرتبة میں واو بڑھایا گیا ہے   نصّ (ن) النصَّ علی: صراحت کرنا   مَجَامِع: مَجْمَع کی جمع ہے بمعنی جمع کرنے یا جمع ہونے کی جگہ، مَجَامِعُ القلب: پورا دل۔ مجامع الهمة: پوری کامل توجہ۔ بَغَتَه الأمرُ: اچانک ہونا، در پیش آنا۔ قیاس: علتِ جامعہ کی وجہ سے منصوص کا حکم غیر منصوص پر جاری کرنا۔ تخریج: کسی امام کے طے کردہ ضابطہ پر کوئی حکم متفرع کرنا مگر یہاں قیاس و تخریج لغوی معنی میں ہیں۔ اصطلاحی معنی مراد نہیں یعنی اندازے سے یا کسی بات کو سامنے رکھ کر کوئی التزام کرنا..... دار (ن) دوراً و دوراناً: گھومنا، چکر کھانا، ماہر حکیم کے حکم کا کسی علت پر گھومنا یعنی جہاں جہاں وہ صفت (بیماری) پائی جائے حکیم کا اس دوا کو تجویز کرنا   وفّر توفیراً علیه حقَّه: پورا حق دینا الجَواد: سخی، کریم الجواد: بڑا فیاض   حاكَ الشيءُ في صدري: فلاں چیز میرے دل میں کھٹکی۔ مُزمِعًا (اسم فاعل) أزمعَ الأمرَ: پختہ ارادہ کرنا۔ تقلید مفعول بہ ہے مزمعاً کا۔

باب ــــــ ۱۵

گناہوں کے مفاسد کا بیان

صغیرہ اور کبیرہ کی حد بندی: گناہوں کی دو قسمیں ہیں: صغیرہ (چھوٹے گناہ) اور کبیرہ (بڑے گناہ) اور گناہوں کو چھوٹا بڑا دو اعتبارات سے کہا جاتا ہے۔

ایک: نیکی اور گناہ کی حکمتوں کے اعتبار سے۔

دوم: ہر زمانہ کی مخصوص شریعت کے اعتبار سے مثلاً: موسیٰ علیہ السلام کی شریعت کے اعتبار سے صغیرہ اور کبیرہ اور ہیں، اور ہماری شریعت کے اعتبار سے اور۔

کبیرہ گناہ: نیکی اور گناہوں کی حکمتوں کے اعتبار سے وہ ہے: جو قبر میں یا قیامت میں نہایت مؤکد طریقہ پر موجبِ عذاب ہو، اور آسائش سے زندگی گذارنے کی مفید اسکیموں کا بالکل ہی ستیاناس کر دے اور فطرتِ اسلامی کے بالکل ہی برخلاف ہو۔

اور صغیرہ گناہ: وہ ہے جس سے مذکورہ مفاسد میں سے بعض مفاسد پیدا ہو سکتے ہوں یا وہ عام حالات میں ان مفاسد تک پہنچانے والا ہو، یا وہ کسی درجہ ان مفاسد کا سبب ہو اور کسی درجہ نہ ہو، جیسے ایک شخص راہ خدا میں خرچ کرتا ہے اور بال

بچوں کو فاقہ مست چھوڑ دیتا ہے تو وہ بخل کی بری عادت کا علاج تو کرتا ہے مگر فضیلتِ عفت کو بگاڑ لیتا ہے۔

اور گناہ کبیرہ: رہی خاص شریعت کے اعتبار سے وہ ہے: جس کی حرمت کی شریعت نے صراحت کی ہو یا شارع نے اس پر جہنم کے عذاب کی دھمکی دی ہو، یا اس گناہ کے لئے کوئی سزا مقرر کی ہو، یا اس گناہ کی برائی اور سنگینی ظاہر کرنے کے لئے اس کے مرتکب کو کافر اور ملت سے خارج قرار دیا ہو ــــ اور جو گناہ اس قسم کا نہ ہو وہ صغیرہ ہے۔

بعض گناہ ایک اعتبار سے صغیرہ اور دوسرے اعتبار سے کبیرہ ہوتے ہیں: کبھی ایک کام نیکی اور گناہ کی حکمتوں کے اعتبار سے صغیرہ گناہ ہوتا ہے اور شریعت خاصہ کے اعتبار سے کبیرہ ہوتا ہے۔ اور اس کی تفصیل یہ ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں کبھی کسی بات کا عام رواج ہو جاتا تھا اور وہ لوگوں کی فطرت بن جاتی تھی اور اس طرح طبیعتوں میں رچ بس جاتی تھی کہ وہ ان میں سے نکل ہی نہیں سکتی تھی الا یہ کہ ان کے دل پارہ پارہ ہو جائیں۔ پھر دورِ نبوت آتا ہے اور شریعت نازل ہوتی ہے اور وہ اس کام کی ممانعت کرتی ہے تو لوگ جھگڑا کرتے ہیں اور ڈھٹائی پر اتر آتے ہیں اور شریعت اس کی مخالفت کے بقدر سختی اور دھمکی سے کام لیتی ہے، یہاں تک کہ اس گناہ کا ارتکاب ملت کی تخت شکنی جیسا ہو جاتا ہے اور اس طرح کے گناہ پر وہی شخص اقدام کرتا ہے جو سرکش، دشمن اور بے حیا ہو، نہ وہ اللہ سے شرماتا ہو نہ لوگوں سے، جب صورتِ حال یہ ہو جاتی ہے تو وہ کام شریعت کی نظر میں کبیرہ گناہ قرار پاتا ہے اگرچہ حکمتِ بر و اثم کے اعتبار سے وہ صغیرہ ہو ــــ مگر اس کے برعکس نہیں ہوتا یعنی جو کام حکمتِ بر و اثم کے اعتبار سے کبیرہ ہو وہ شریعت مصطفوی کی نظر میں صغیرہ نہیں ہو سکتا۔

قصہ مختصر: شریعت اسلامیہ کے اعتبار سے کبیرہ گناہوں کے مفاسد کا بیان اس کتاب کی قسم دوم میں آئے گا، وہی جگہ اس کے لئے موزوں ہے: ابوابِ بر میں بھی ہم نے یہی طریقہ اختیار کیا ہے۔ چند نیکی کے کاموں کی حکمتیں مختصر طور پر بیان کی ہیں باقی کا تذکرہ قسم دوم کے لئے اٹھا رکھا ہے۔ یہاں آئندہ ابواب میں حکمتِ بر و اثم کے اعتبار سے کبیرہ گناہوں کے مفاسد بیان کئے جائیں گے۔

﴿باب مفاسد الآثام﴾

واعلم: أن الكبيرة والصغيرة تعلقان باعتبارين:

أحدهما: بحسب حكمة البر والإثم.

وثانيهما: بحسب الشرائع والمناهج المختصة بعصر دون عصر.

أما الكبيرة: بحسب حكمة البر والإثم: فهي ذنب يوجب العذاب في القبر وفي المحشر إيجابًا قويًا، ويفسد الارتفاقات الصالحة إفسادًا قويًا، ويكون من الفطرة على الطرف المخالف جدًا.

والصغيرة: ما كان مَظِنَّةً لبعض ذلك، أو مُفْضِيًا إليه في الأكثر، أو يوجب بعض ذلك من وجه،

ولا يوجد من وجه، كمن ينفق في سبيل الله وأهله جياع، ليدفع رذيلة البخل، ويفسد تدبير المنزل.
وأما بحسب الشرائع الخاصة: فما نصت الشريعة على تحريمه، أو توعد الشارع عليه بالنار، أو شرع عليه حدا، أو سمى مرتكبه كافرا خارجا من الملة، إبانة لقبحه، وتغليظا لأمره، فهو كبيرة.
وربما يكون شيئٌ صغيرة بحسب حكمة البر والإثم، كبيرة بحسب الشريعة، وذلك أن الملة الحنفية ربما ارتكبت شيئا، حتى فشا أمره فيهم، لا يخرج منهم إلا أن تنقطع قلوبهم، ثم جاء الشرع ناهيا عنه، فحصل منهم تخالج ومكابرة؛ وحصل من الشرع تغليظ وتهديد بحسب ذلك، حتى صار ارتكابها كالمنابذة الشديدة للملة، ولا يتأتى الإقدام على مثله إلا من كل مارد متمرد، لا يستحيي من الله ولا من الناس، فكتب كبيرة عند ذلك.
وبالجملة: فنحن نؤخر الكلام في الكبائر بحسب الشريعة إلى القسم الثاني من هذا الكتاب، لأن ذلك موضعه، وننبه على مفاسد الكبائر بحسب حكمة البر والإثم ههنا، كما نبهنا في أنواع البر نحوا من ذلك.

ترجمہ: گناہوں کے مفاسد کا بیان: اور جان لیں کہ کبیرہ اور صغیرہ کا اطلاق دو اعتباروں سے کیا جاتا ہے:
ایک: عقلی اور تمدنی حکمت کے اعتبار سے۔
دوم: ان شریعتوں اور ملتوں کے اعتبار سے جو کسی ایک زمانہ کے ساتھ مختص ہیں، دوسرے زمانہ کے لئے وہ نہیں ہیں۔
رہا کبیرہ: عقلی اور تمدنی حکمت کے اعتبار سے: پس وہ وہ گناہ ہے جو قبر میں اور میدان قیامت میں عذاب کو واجب (ثابت) کرتا ہے، نہایت قوی طریقہ پر واجب کرنا۔ یا منظم رفاقت کو بگاڑ دیتا ہے نہایت قوی صورت میں بگاڑ دینا اور ہوتا ہے وہ گناہ فطرت انسانی سے بالکل ہی جانب مخالف پر۔
اور صغیرہ: وہ ہے جو احتمالی موقع ہوتا ہے ان مفاسد میں سے پہنچنے کے لئے، یا وہ پہنچانے والا ہوتا ہے ان مفاسد تک سے کچھ کم، اکثر حالات میں، یا ثابت کرتا ہے وہ ان مفاسد میں سے بعض کو ایک وجہ سے، اور نہیں ثابت کرتا وہ ان کو دوسری وجہ سے، جیسے وہ شخص جو راہ خدا میں اپنا مال خرچ کرتا ہے درانحالیکہ اس کے اہل وعیال فاقہ سے ہیں، پس وہ بخل کے رذیلہ کو ہٹاتا ہے اور تدبیر منزل کو بگاڑ دیتا ہے۔
اور رہا خصوصی شریعتوں کے اعتبار سے: پس وہ کام جس کی حرمت کی شریعت نے صراحت کی ہو، یا شارع نے اس پر جہنم کی دھمکی دی ہو، یا اس پر کوئی حد مقرر کی ہو، یا اس کے مرتکب کو کافر ملت سے خارج قرار دیا ہو، اس کی برائی ظاہر کرنے کے طور پر یا اس کے معاملہ کو سنگین بنانے کے طور پر، تو وہ کبیرہ ہے۔
اور کبھی ہوتی ہے ایک چیز چھوٹا گناہ عقلی اور تمدنی حکمت کے اعتبار سے، اور وہ بڑا گناہ ہوتی ہے شریعت کے

اعتبار سے۔ اور اس کی تفصیل یہ ہے کہ ملت جاہلیہ کبھی ارتکاب کرتی ہے کسی چیز کا، یہاں تک کہ اس کی رسم پھیل جاتی ہے لوگوں میں انہیں نکل سکتی وہ رسم لوگوں میں سے مگر یہ کہ ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں انکے دل، پھر آتی ہے شریعت اس سے روکتی ہوئی بھی پائی جاتی ہے لوگوں کی طرف سے دشمنی اور مخالفت، اور پائی جاتی ہے شریعت کی طرف سے سختی اور سختی، اسی کے موافق، یہاں تک کہ ہو جاتا ہے اس گناہ کا ارتکاب شریعت کی سخت دشمنی کی طرح، اور نہیں آسان ہوتا اس جیسے کام پر اقدام کرنا مگر ہر ایسے سرکش و متمرد کی طرف سے جو نہیں شرماتا اللہ تعالیٰ سے، اور نہ لوگوں سے، پس لکھ دیا جاتا ہے وہ کام کبیرہ اس صورت حال میں۔

اور بات مختصر: پس ہم شریعت اسلامیہ کے اعتبار سے کبائر کے سلسلہ میں گفتگو کو موخر کرتے ہیں۔ تن کتاب کی قسم ثانی کی طرف، اس لئے کہ وہ اس کی جگہ ہے اور نیکی اور گناہ کے اعتبار سے ہم کبائر کے مقاصد پر تنبیہ کرتے ہیں، یہاں، جیسا کہ ہم نے نیکی کی اقسام کے بیان میں تقریباً ایسی کیا ہے۔

لغات:

لجّ (ض۔ س) لجیجا ولجاجۃ: سخت جھگڑا کرنا، دشمنی میں مداومت کرنا ۔ ساوء فت ولاقہ: دشمنی کرنا المناھج جمع ہے المنھج کی جس کے معنی ہیں: کشادہ راستہ۔ یہ لفظ الشرائع کا ہم معنی ہے المحشر والمحشر: لوگوں کے جمع ہونے کی جگہ مراد قیامت کا دن ثنّی الامر: آسان ہونا۔

نوٹ: مخطوطہ برلین اور پٹنہ میں یہاں عنوان باب مفاسد الاثام نہیں ہے، بلکہ سابق باب کے تحت یہ پورا مضمون ہے اور مخطوطہ کراچی میں یہاں سے بحث خامس کے تتمہ کا مضمون شروع کیا ہے۔

☆ ☆ ☆

توبہ کے بغیر کبیرہ گناہ معاف ہو سکتا ہے؟

اس پر اتفاق ہے کہ شرک وکفر توبہ کے بغیر معاف نہیں ہوں گے اور اس میں اسلامی فرقوں نے اختلاف کیا ہے کہ مرتکب کبیرہ کا کیا حکم ہے؟ معتزلہ اور خوارج ہر کبیرہ گناہ کو شرک وکفر کے برابر گردانتے ہیں۔ پھر خوارج کے نزدیک مرتکب کبیرہ کافر ہے اور معتزلہ اسلام سے تو خارج قرار دیتے ہیں مگر کفر میں داخل نہیں کرتے، بلکہ بین بین حالت میں رکھتے ہیں، پس اگر مرتکب کبیرہ توبہ کئے بغیر مر جائے تو اس کی مغفرت ہوگی یا نہیں؟ معتزلہ اور خوارج انکار کرتے ہیں اور اہل السنۃ والجماعۃ جواز مغفرت کے قائل ہیں۔ یہ مسئلہ علم کلام کی کتابوں میں بھی مذکور ہے اور تفاسیر میں سورۃ النساء کی آیات ۴۸ و ۱۱۶ کے ذیل میں بھی زیر بحث آتا ہے، جس کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ شرک کو تو نہ بخشیں گے اور اس سے

ہوں گے اور جتنے گناہ چاہیں ان کو جس کے لئے منظور ہوگا بخش دیں گے۔ یہ آیت اہل السنۃ والجماعۃ کی دلیل ہیں۔ اسی طرح اسی سورت کی آیت ۹۳ کے ذیل میں بھی یہ مسئلہ زیر بحث آتا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جو شخص کسی مسلمان کو قصداً قتل کرڈالے تو اس کی سزا جہنم ہے جس میں وہ ہمیشہ رہنے والا ہے اور اس پر اللہ تعالیٰ غضبناک ہوں گے اور اس کو اپنی رحمت سے دور کردیں گے اور اس کے لئے بڑا بھاری عذاب ہے۔ یہ آیت فرقِ باطلہ کی دلیل ہے۔ غرض ہر فریق اپنے موقف پر کتاب وسنت کے دلائل رکھتا ہے۔

اس مسئلہ میں شاہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مرتکب کبیرہ کا مخلد فی النار ہونا تو کسی طرح درست نہیں۔ تمام اہل حق متفق ہیں کہ بجز کفر وشرک کے کوئی امر موجب خلود فی النار نہیں ہے۔ اور حکمت خداوندی میں بھلا یہ بات کیسے ممکن ہے کہ مرتکب کبیرہ کے ساتھ بھی وہی معاملہ کیا جائے جو کافر کے ساتھ کیا جاتا ہے؟ کافر تو حکومت کا باغی ہے اور مرتکب کبیرہ قانون شکنی کرنے والا شہری ہے۔ دونوں کا حکم یکساں کیسے ہوسکتا ہے؟ اس لئے مرتکب کبیرہ کی مغفرت تو لامحالہ ہوگی۔ اب رہی یہ بات کہ بعد عذاب ہوگی یا بالکل معاف کردیا جائے گا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ دونوں باتیں ممکن ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کے کام دو طرح کے ہیں: ایک: حسب عادت جو سنت معروفہ کے مطابق ہوں۔ دوم: خرق عادت کے طور پر یعنی خلاف معمول۔ عادت جاریہ کا مقتضیٰ تو یہ ہے کہ اگر مرتکب کبیرہ مقبول توبہ کے بغیر مرجائے تو اس کو ایک طویل زمانہ تک بطور سزا جہنم میں رکھیں، پھر اس کو نجات بخشیں۔ مگر اللہ تعالیٰ کبھی خلاف معمول بھی کام کرتے ہیں، ممکن ہے وہ اپنے فضل سے اس کی سزا جاری نہ کریں اور ایمان یا کسی خاص عمل کی برکت سے یونہی معاف کردیں، تو ایسا بھی ممکن ہے۔

اور نصوص میں اس سلسلہ میں جو اختلاف ہے اس کا حل یہ ہے کہ نصوص لوگوں کے محاورات کے مطابق نازل ہوئی ہیں اور لوگ جو باتیں بولتے ہیں وہ دو جہتوں میں سے کسی ایک جہت کے ساتھ مقید ہوتی ہیں، خواہ جہت قضیہ میں مذکور ہو یا محذوف ہونے کی صورت میں قرائن سے متعین کی جائے۔ ایک: عادۃً کی قید کے ساتھ قضیہ مقید ہوتا ہے۔ دوم: مطلقاً کی قید کے ساتھ۔ اور علم منطق میں یہ بات بیان کی گئی ہے کہ تناقض کے تحقق کے لئے وحدات ثمانیہ کے علاوہ اگر قضیہ موجہہ ہو تو جہت کا اتحاد بھی ضروری ہے۔ اگر دو قضیوں کی جہتیں مختلف ہوں تو ان میں تعارض نہ ہوگا۔ مثلاً یہ بات کہ: "جو بھی زہر کھائے گا مرجائے گا" اور یہ بات کہ: "ضروری نہیں کہ جو بھی زہر کھائے وہ مرجائے" ان دونوں باتوں میں کوئی تعارض نہیں۔ کیونکہ پہلی بات عادۃً کی قید کے ساتھ مقید ہے یعنی سنت الٰہیہ یہ ہے کہ جو بھی زہر کھاتا ہے مرجاتا ہے اور دوسری بات خرق عادت کی قید کے ساتھ مقید ہے یعنی خلاف معمول ایسا ہوسکتا ہے کہ ایک آدمی زہر کھائے اور نہ مرے۔ اور جس طرح دنیا میں اللہ تعالیٰ کے کارنامے دو طرح کے ہوتے ہیں آخرت میں بھی دو طرح کے ہوں گے۔ پس آیت قتل کا مطلب یہ ہے کہ حسب عادت جاریہ تو مؤمن کے قتل عمد کی سزا خلود فی النار ہے اور خلود سے مراد یہ ہے کہ مدت دراز تک جہنم میں رہے گا (ابد مطلب نہیں ہے) اور خرق عادت کے طور پر اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے اس کو بالکل

معاف کر دیں، ایسا بھی ممکن ہے۔ آیت ۴۸ و ۱۱۶ میں اسی کا ذکر ہے، واللہ اعلم۔

فائدہ: حقوق العباد کا معاملہ بھی کبائر کی طرح ہے۔ عادت جاریہ تو یہ ہے کہ ان کی واپسی ضروری ہے، مگر خرقِ عادت کے طور پر اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے کسی کے ذمہ سے حقوق العباد کو ختم کرنا چاہیں گے تو صاحبِ معاملہ کو راضی کر دیں گے۔ صاحبِ معاملہ کے سامنے اس کے حقوق کا اتنا بڑا اجر بطور معاوضہ پیش فرمائیں گے کہ وہ خوش ہو کر معاف کر دے گا اور اجرِ موعود حاصل کرے گا، اس طرح معاملات کا قصہ پاک ہو جائے گا۔

نوٹ: تحریر میں کتاب کی ترتیب بدل گئی ہے، قارئین اس کا خیال رکھیں۔

وقد اختلف الناس في الكبيرة إذا مات العاصي عليها ولم يتب، هل يجوز أن يغفر الله عنه أو لا؟ وجاء كل فريق بأدلة من الكتاب والسنة، ومحل الاختلاف عندي: أن أفعال الله تعالى على وجهين:

منها: الجارية على العادة المستمرة.

ومنها: المخارقة للعادة.

والقضايا التي يتكلم بها الناس موجهة بجهتين: إحداهما: في العادة، والثانية مطلقاً، وشرط التناقض: اتحاد الجهة، مثل ما قرره المنطقيون في القضايا الموجهة، وقد تحذف الجهة، فيجب اتباع القرائن؛ كقولنا: كلُّ من تناول السُّم مات، معناه: بحسب العادة المستمرة، وقولنا: ليس كلُّ من تناول السم مات، معناه: بحسب خرق العادة، فلا تناقض؛ وكما أن لله تعالى في الدنيا أفعالاً خارقةً، وأفعالاً جاريةً على العادة، فكذلك في المعاد أفعال خارقة وعادية؛ أما العادة المستمرة: فأن يُعذَّب العاصي، إذا مات من غير توبة زماناً طويلاً، وقد تُخرق العادة، وكذلك حالُ حقوق العباد؛ وأما خلودُ صاحب الكبيرة في العذاب فليس بصحيح وليس من حكمة الله أن يفعل بصاحب الكبيرة مثل ما يفعل بالكافر سواءً، والله أعلم.

ترجمہ: اور لوگوں میں اختلاف ہوا ہے کبیرہ کے بارے میں، جب گنہگار اس کبیرہ پر مر جائے اور اس نے توبہ نہ کی ہو، کیا جائز ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سے درگذر کریں یا جائز نہیں ہے؟ اور ہر گروہ کتاب و سنت سے (اپنے موقف پر) دلائل لایا ہے۔ اور (نصوص میں) اختلاف کا میرے نزدیک محل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے کام دو طرح کے ہیں:

ان میں سے بعض: عادتِ مستمرہ کے مطابق چلنے والے ہیں۔

اور ان میں سے بعض: عادت کے برخلاف ہیں۔

اور وہ باتیں جو لوگ بولتے ہیں دو جہتوں کے ساتھ مقید ہوتی ہیں: ایک: فی العادۃ کی جہت کے ساتھ، دوم: مطلقاً

کی جہت کے ساتھ۔ اور (دو باتوں میں) تناقض کے لئے جہت کا متحد ہونا شرط ہے، جیسا کہ مناطقہ نے قضایا موجہہ کی بحث میں یہ بات بیان کی ہے۔ اور کبھی جہت حذف کی جاتی ہے تو قرائن کی پیروی ضروری ہوتی ہے۔ پس ہمارا قول: "جو بھی شخص زہر کھائے گا وہ مر جائے گا" اس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ کی عادت مستمرہ یہ ہے۔ اور ہمارا قول: "ضروری نہیں کہ جو بھی شخص زہر کھائے وہ مر جائے" یعنی عادت کے برخلاف ایسا ہو سکتا ہے، پس (دونوں باتوں میں) کوئی تعارض نہیں ہے۔ اور جس طرح یہ بات ہے کہ اللہ تعالیٰ دنیا میں بعض کام خرق عادت کے طور پر کرتے ہیں اور بعض کام عادت کے مطابق چلتے ہیں، پس اسی طرح آخرت میں بھی بعض کام خرق عادت کے طور پر ہوں گے اور بعض کام عادت کے مطابق ہوں گے۔ رہی عادت مستمرہ: تو وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ گنہگار کو سزا دیں طویل زمانہ تک، جب وہ مر جائے توبہ کے بغیر، اور کبھی اللہ تعالیٰ عادت کے برخلاف بھی کرتے ہیں۔ اور یہی طرح حقوق العباد کا حال ہے۔ اور رہا مرتکب کبیرہ کا ہمیشہ کے لئے عذاب میں رہنا تو وہ صحیح نہیں ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی حکمت میں سے یہ بات نہیں ہے کہ وہ مرتکب کبیرہ کے ساتھ بالکل ویسا ہی معاملہ کریں جیسا کہ وہ کافر کے ساتھ کریں گے۔ باقی اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں۔

تشریح:

جہت: نسبت کی کیفیت کو کہتے ہیں اور جو لفظ اس پر دلالت کرتا ہے اس کو جہت قضیہ کہتے ہیں اور جس قضیہ میں جہت قضیہ مذکور ہوتی ہے اس کو موجہہ کہتے ہیں۔ اور جہتیں متقدمین کے یہاں تین ہیں: وجوب، امکان اور امتناع اور متاخرین کے نزدیک کیفیتیں تین میں منحصر نہیں ہیں اور دو قضیوں میں تناقض کے لئے اگر دونوں قضیے موجہہ ہوں تو وحدات ثمانیہ کے علاوہ جہت میں اتحاد بھی ضروری ہے، اگر جہتیں مختلف ہوں گی تو تعارض نہیں ہوگا۔ تفصیل منطق کی کتابوں میں ہے۔

☆ ☆ ☆

باب — ۱۹

وہ گناہ جو آدمی کی ذات سے تعلق رکھتے ہیں

گناہ دو طرح کے ہیں: لازم اور متعدی۔ لازم: وہ گناہ ہیں جن کا ضرر گنہگار کی ذات تک محدود رہتا ہے اور متعدی: وہ گناہ ہیں جن کا ضرر اور لوگوں تک بڑھتا ہے۔ اس باب میں لازم گناہوں کا ذکر ہے اور آئندہ باب میں متعدی آثام کا تذکرہ ہے۔

وہ گناہ جن کا ضرر آدمی کی ذات تک محدود رہتا ہے، ان کے تین درجے ہیں: ایک: اکبر الکبائر، دوم: مطلق کبائر، سوم: صغائر۔

اکبر الکبائر: وہ گناہ ہیں جو اللہ تعالیٰ سے متعلق ہے یعنی اول روا انکبار۔

کبائر: اوامر خداوندی کی تعمیل نہ کرنے کے گناہ ہیں۔ مثلاً نماز چھوڑنا، زکوٰۃ نہ دینا وغیرہ۔

صغائر: اوامر خداوندی کو شرائط واجبہ کے مطابق نہ بجالانے کے گناہ ہیں۔

یہ اس باب کا خلاصہ ہے۔ تفصیل درج ذیل ہے:

جب انسان کی قوت ملکیہ کو ہر چہار جانب سے قوت بہیمیہ گھیر لیتی ہے اور اس کو بے بس کر دیتی ہے تو قوت ملکیہ کا حال اس پرندے جیسا ہو جاتا ہے جو اسیر قفس ہو۔ جس کی دلچسپی اس بات میں ہو کہ وہ قفس کو دھار توڑ کر نکل بھاگے اور اپنی اصل جگہ میں یعنی سرسبز باغات میں پہنچ جائے، وہاں دانے چگے، حسب دل پھل کھائے اور اپنی نوع کے افراد میں شامل ہو کر شادمانی کے گیت گائے۔ مگر بائے رے قفس کی بندشیں! ساری تمنائیں کا خون کر دیا۔ ایسا ہی کچھ حال بہیمیت کی قید میں پھنس کر ملکیت کا ہو جاتا ہے۔ ایسی صورت میں انسان کی شدید ترین بدبختی یہ ہے کہ وہ دہریہ ہو جائے یا انکار میں مبتلا ہو جائے اور یہی سب سے بڑا گناہ ہے۔

دہریت کیا ہے؟ اور دہریت کی حقیقت یہ ہے کہ وہ ان فطری علوم کی مخالفت کرے جو انسان کی گھٹی میں پڑے ہوئے ہیں یعنی معرفت الٰہی کا حق ادا نہ کرے اور پہلے اسی مبحث خامس کے باب ششم میں یہ بات بیان کی جا چکی ہے کہ انسان کی اصل فطرت میں اللہ تعالیٰ کی ذات کی طرف اور ان کی زیادہ سے زیادہ تعظیم کرنے کی طرف میلان موجود ہے۔ سورۃ الاعراف کی آیت ۱۷۲ میں ان فطری علوم کی طرف اشارہ ہے۔ ارشاد ہے:

"اور جب آپ کے رب نے اولاد آدم کی پشت سے ان کی اولاد کو نکالا۔ اور ان سے انہیں کے متعلق اقرار لیا کہ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ تو سب نے جواب دیا: کیوں نہیں! ہم گواہ بنتے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم قیامت کے دن کہنے لگو کہ ہم تو اس (توحید) سے محض بے خبر تھے"

اس آیت میں جو اشارہ ہے اس کی تفصیل یہ ہے کہ آدم علیہ السلام کی تخلیق کے بعد ان کی صلبی اولاد ان کی پشت سے نکالی گئی، جیسا کہ احادیث میں ہے۔ پھر اولاد کی پشت سے جس طرح قیامت تک ان کا وجود ہونے والا ہے، تمام انسانوں کو ان کے آباء کی پشت سے نکالا گیا، جیسا کہ مذکورہ آیت میں صراحت ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے تجلی فرمائی یعنی سب انسانوں کو اپنا دیدار کرایا اور معرفت کا درس دیا۔ پھر سب کا امتحان لیا کہ انھوں نے اپنے رب کو پہچان لیا یا نہیں؟ سب نے تاکیدات کے ساتھ جواب دیا کہ ان کو پروردگار کی کما حقہ معرفت حاصل ہو گئی ہے۔ یہ سب کچھ اس لئے کیا گیا کہ کہیں کل قیامت کے روز لوگ یہ بہانہ نہ بنائیں کہ وہ معرفت باری تعالیٰ سے محض بے خبر تھے۔ پھر انسانوں کی تمام ارواح کو عالم ارواح میں ایک خاص ترتیب سے رکھ دیا گیا، جہاں سے ان کو اپنے اپنے وقت پر رحم مادر میں تیار ہونے والے جسم میں منتقل کیا جاتا ہے۔ غرض توحید باری تعالیٰ کا علم انسان کے خمیر میں گوندھ دیا گیا ہے اور اسی معرفت پر انسان دنیا میں پیدا ہوتا ہے، جیسا کہ بخاری شریف کی حدیث میں ہے کہ: "ہر بچہ فطرت پر جنا جاتا ہے" (فتح الباری

۳۰۳) یعنی انسان کی فطرت میں جو اللہ کی پہچان رکھ دی گئی ہے اس کو لے کر بچہ دنیا میں آتا ہے۔ اور اسی لئے اس کی فطرت میں اپنے خالق کی طرف میلان اور اس کی تعظیم کا بے پناہ جذبہ پایا جاتا ہے۔

مگر اللہ تعالیٰ کی غایت درجہ تعظیم اسی وقت ممکن ہے۔ جب آدمی کا ایمان صحیح ہو اس کا یہ اعتقاد ہو کہ اللہ تعالیٰ قصد واختیار سے عالم میں تصرف کرنے والے ہیں، لوگوں کو ان کے اعمال خیر وشر پر بدلہ دینے والے ہیں۔ انسانوں کو احکام کا مکلف بنانے والے ہیں اور ان کے لئے قوانین مقرر کرنے والے ہیں۔ جس کا ایمان ہی صحیح نہیں اس کو اللہ تعالیٰ کے بلند مقام کی معرفت حاصل ہو سکتی ہے اور نہ وہ کما حقہ تعظیم بجا لا سکتا ہے۔ مثلاً جو شخص ایسے پروردگار کا انکار کرتا ہے جس کی طرف تمام موجودات کا سلسلہ منتہی ہوتا ہے یعنی جس کا وجود خانہ زاد یعنی خود بخود آپ سے آپ ہے اور ساری کائنات کو وجود اسی نے بخشا ہے یا فلاسفہ کی طرح یہ اعتقاد رکھتا ہے کہ پروردگار عالم معطل (بے کار) ہیں وہ عالم میں کوئی تصرف نہیں کرتے، بقول عشرہ اور خاص طور پر عقل عاشر ہی سب کچھ کرتی ہے۔ یا وہ ایجاب ازلی سے بلا ارادہ تصرف کرتے ہیں۔ یعنی انھوں نے ازل میں سب کچھ طے کر دیا ہے اسی کے مطابق سب کچھ ہوتا رہتا ہے اب اللہ کے ارادے کا اس میں کوئی دخل نہیں ہے یا وہ یہ اعتقاد رکھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو ان کے اچھے برے اعمال کا کوئی بدلہ نہیں دیں گے یا وہ اللہ تعالیٰ کو بھی دیگر مخلوقات کی طرح جانتا ہے یا وہ اللہ کے بندوں کو اللہ کی صفات میں شریک ٹھہراتا ہے یا اعتقاد رکھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بندوں کو انبیاء کے ذریعہ شرائع کا مکلف نہیں بنایا ہے اور انبیاء کی تعلیمات کو وہ خود ساختہ باتیں مانتا ہے تو ایسا شخص دہریہ ہے اس نے اپنے دل میں اپنے رب کی تعظیم کا جذبہ ارزاں کیا ہی نہیں اور ایسا شخص اللہ تعالیٰ کے بلند مقام ومرتبہ کو پہچان ہی نہیں سکتا۔ اور اس کا حال اس پرندے جیسا ہے جو لوہے کے پنجرے میں بند ہو، جس میں کوئی سوراخ نہ ہو۔ سوئی کی نوک کے برابر بھی نہ ہو۔ ایسا شخص تا حیات بہیمیت کی تاریکیوں میں رہتا ہے۔ مگر جب وہ مرتا ہے تو پردہ پھٹ جاتا ہے اور ملکیت کو کسی درجہ میں نمودار ہونے کا موقع مل جاتا ہے اور فطری میلان حرکت میں آتا ہے مگر موانع معرفت الٰہی میں آڑے آتے ہیں اور پھر وہ مقام تک اس کی رسائی نہیں ہو پاتی تو اس کے باطن میں بڑی وحشت بھڑکتی ہے۔ وہ پروردگار کی ناراضگی مول لیتا ہے اور عالم بالا کے فرشتے بھی اس کو ناراضی اور حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ پھر وہ ناراضگی زمینی فرشتوں پر پھیلتی ہے اور وہ ایذا رسانی اور عذاب کا سبب بن جاتی ہے یعنی اس کو عالم مثال میں یا عالم خارجی میں یعنی قبر میں عذاب شروع ہو جاتا ہے۔

نیز انسان کی شدید ترین بدبختی یہ بھی ہے کہ وہ تکبر سے کام لے اور وہ اللہ کی شان کو تسلیم کرنے سے صاف انکار کر دے۔ جس شان کا تذکرہ سورۃ الرحمان کی آیت ۲۹ میں آیا ہے کہ: "اللہ تعالیٰ ہر وقت کسی نہ کسی شان (اہم کام) میں ہیں" اس آیت میں شان سے مراد یہ ہے کہ ایک تو حکمت ازلی یعنی قدیم تقدیر الٰہی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ازل میں کائنات کے لئے سب کچھ طے کر دیا ہے مگر عالم کے لئے حکمت خداوندی کے مطابق احکام اور اوامر بھی ہیں اور جب بھی کوئی

مخصوص دور آتا ہے تو پہلے اللہ تعالیٰ ہر آسمان میں اس دور کے معاملات کی وحی فرماتے ہیں اور ملأ اعلیٰ کو اس دور کے مناسب کاموں پر لگاتے ہیں اور اس دور کے لئے ایک قانون تجویز فرماتے ہیں جو اس دور کی مصلحت کے مطابق ہو پھر وہ قانون زمین میں اس دور کے نبی پر نازل کیا جاتا ہے۔ اور ملأ اعلیٰ کو الہام فرماتے ہیں کہ وہ دنیا میں اس نئے انداز کو چلانے کا پختہ ارادہ کریں اور اس کے لئے ہر طرح کی سعی کریں۔ پس ان کا پختہ ارادہ انسانوں کے دلوں میں الہامات بن کر ٹپکتا ہے۔ پس جو شخص اس نئی شریعت کا انکار کرتا ہے وہ اس سے جدا ہو جاتا ہے، اس سے نفرت کرتا ہے اور لوگوں کو اس سے روکتا ہے، اس کو ملأ اعلیٰ کی سخت لعنت گھیر لیتی ہے، اور اس نے سابقہ شریعت کے مطابق جو کام کئے ہیں وہ سب اکارت ہو جاتے ہیں اور اس کا دل سخت ہو جاتا ہے اور اب اس میں نیکی کے ایسے کام کرنے کی صلاحیت ہی نہیں رہتی جو اس کے لئے مفید ہوں۔ سورۃ البقرہ کی آیت ۱۵۹ میں ہے:

"بیشک جو لوگ چھپاتے ہیں ان مضامین کو جن کو ہم نے نازل کیا ہے جو دین کے واضح دلائل اور رہنمائی میں سے ہیں، کتاب الٰہی میں ہماری طرف سے عام لوگوں کے لئے ان کو ظاہر کرنے کے بعد، ایسے لوگوں پر اللہ تعالیٰ بھی لعنت فرماتے ہیں اور دوسرے لعنت کرنے والے بھی ان پر لعنت بھیجتے ہیں"

اس آیت میں یہود کا تذکرہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تورات شریف میں خاتم النبیین ﷺ کی صفات، آپ کی امت کے احوال اور آپ کے ظہور کے وقت اتباع کی ہدایات نازل فرمائی تھیں۔ مگر جب وقت آیا تو یہود نے انکار سے کام لیا اور حق پوشی کی، چنانچہ ان کو اللہ تعالیٰ نے بھی مردود ٹھہرایا اور دیگر لعنت کرنے والوں نے یعنی ملأ اعلیٰ وغیرہ نے بھی پھٹکارا۔ اور سورۃ البقرۃ کی آیت سات میں ہے کہ: "اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر مہر کر دی اور ان کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا" یعنی ان کی ایمان کی اور اچھے کام کرنے کی صلاحیت مفقود کر دی۔ اور ان کا حال اس پرندے جیسا ہو گیا جو کسی ایسے پنجرے میں بند ہو جس میں سوراخ تو ہوں مگر اس پر اوپر سے بھاری پردہ ڈال دیا گیا ہو یعنی یہود کی کتابوں میں ہدایت کا سب کچھ سامان موجود تھا مگر حسد و تکبر کا ان پر ایسا پردہ اوپر سے ڈال دیا گیا کہ اب ان کو کچھ سوجھتا ہی نہیں۔

سوال: جب سب کچھ ازلی تقدیر میں طے ہے تو پھر یہ "شان" کیا چیز ہے؟ اور ادوار بدلنے پر نئے فیصلوں کی ضرورت کیا ہے؟

جواب: ازلی تقدیر تو قدیم ہے، اس میں حدوث کا شائبہ تک نہیں، اور یہ "شان" اس کے بعد کا مرتبہ ہے اور حادث ہے اور جس طرح ازلی تقدیر سے اللہ تعالیٰ کے کمالات کی تشریح ہوتی ہے کہ ان کا علم کائنات کے ذرہ ذرہ کو محیط ہے۔ وہ قادر مطلق ہیں، جو چاہیں فیصلہ کرتے ہیں اور انھوں نے اپنی حکمت بالغہ سے سب کچھ ازل میں طے کر دیا ہے۔ اسی طرح اس شان سے بھی اللہ تعالیٰ کے بعض کمالات کی تشریح ہوتی ہے مثلاً یہ بات کہ وہ ازل میں طے کر کے بے بس نہیں ہو گئے جیسا کہ فلاسفہ کا خیال ہے۔ وہ آج بھی قادر مطلق ہیں جس طرح وہ ازل میں تھے، آج بھی ہر چیز کا آخری مرا...

کے قبضۂ قدرت میں ہے، چنانچہ وہ ہر وقت کوئی نہ کوئی اہم فیصلہ کرتے رہتے ہیں، اور ان کی شان برتر ہے۔

نوٹ: سوالِ مقدر کا یہ جواب شاہ صاحب رحمہ اللہ نے مسلسل کلام کے درمیان میں جملہ معترضہ کے طور پر دیا ہے۔ قارئین غور کریں۔

﴿بابٌ في المعاصي التي هي فيما بينه وبين نفسه﴾

اعلم: أن القوة الملكية من الإنسان، قد اكْتَنَفَتْ بها القوة البهيمية من جوانبها، وإنما مَثَلُها في ذلك مثلُ طائرٍ في قفص، سعادتُه أن يخرج من هذا القفص، فيلحق بحَيِّزِه الأصليّ من الرياض الأريضة، ويأكلَ الحبوب الغاذية والفواكه اللذيذة من هنالك، ويدخلَ في زُمرة أبناء نوعه، فيَبْتَهِجَ بهم كلَّ الابتهاج: فأشدُّ شقاوة الإنسان أن يكون دهريًّا:

وحقيقةُ الدهري: أن يكون مناقضًا للعلوم الفطرية المخلوقة فيه، وقد بيَّنَّا أن له ميلاً في أصل فطرته إلى المبدإ جلَّ جلاله وميلاً إلى تعظيمه أشدَّ ما يجد من التعظيم، وإليه الإشارةُ في قوله تبارك وتعالى: ﴿وَإِذْ أَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِي آدَمَ﴾ الآية. وقوله صلى الله عليه وسلم: ﴿كلُّ مولود يولد على الفطرة﴾

والتعظيمُ الأقصى لايتمكن من نفسه إلا باعتقاد تصرفٍ في بارئه بالقصد والاختيار، ومجازاةٍ وتكليفٍ لهم، وتشريعٍ عليهم: فمن أنكر أن له ربا ينتهي إليه سلسلةُ الوجود، أو اعتقد أنه معطَّلٌ لايتصرف في العالَم، أو يتصرف بالإيجاب من غير إرادة، أو لا يجازي عبادَه على ما يفعلون من خيرٍ وشرٍّ، أو اعتقد ربَّه كمثل سائر الخلق، أو أشرك عبادَه في صفاته، أو اعتقد أنه لا يكلفهم بشريعة على لسان نبي: فذلك الدهريُّ الذي لم يجتمع في نفسه تعظيمُ ربه، وليس لعلمه نفوذٌ إلى حَيِّزِ القدس أصلاً، وهو بمنزلة الطائر المحبوس في قفصٍ من حديد، ليس فيه منفذٌ ولا موضعُ إبرة، فإذا مات شُقَّ الحجاب، وبرزت الملكيةُ بروزًا مّا، وتحرَّك الميلُ المفطورُ فيه، وخانَه الموانعُ في علمه بربه، وفي الوصول إلى حيز القدس، فهاجت في نفسه وحشةٌ عظيمةٌ، ونظر إليها بارئُها والملأُ الأعلى وهي في تلك الحالة الخبيثة، فأحدثت فيهم بمنظر السُّخط، والازدراء، وترشَّحت في نفوس الملائكة إلهاماتُ السُّخطِ والعذاب، فعُذِّب في المثال وفي الخارج.

أو كافرًا، تكبَّر على الشأن الذي تطرَّز به اللهُ تعالى، كما قال: ﴿كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ﴾

وأعني بالشأن: أن للعالم أدوارًا وأطوارًا حسب الحكمة الإلهية، فإذا جاءت دورة أوحى الله تعالى في كل سماء أمرها، ودبّر الملأ الأعلى بما يناسبها، وكتب لهم شريعة ومصلحة، ثم ألهم الملأ الأعلى أن يجمعوا تمشية هذا الطور في العالم، فيكون إجماعهم سببًا لإلهامات في قلوب البشر، فهذا الشأن تلوُ المرتبة القديمة، التي لا يشوبها حدوثٌ، وهذه أيضًا شارحة لبعض كمال الواجب جلّ مجده كالمرتبة الأولى، فكلٌّ من باين هذا الشأن، وأبغضه، وصدّ عنه، أُتْبِعَ من الملأ الأعلى بلعنة شديدة تحبط بنفسه، فتُحبط أعماله، ويقسو قلبه، ولا يستطيع أن يكسب من أعمال البر ما ينفعه، وإليه الإشارة في قوله تعالى: ﴿إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنَاتِ وَالْهُدَىٰ مِن بَعْدِ مَا بَيَّنَّاهُ لِلنَّاسِ فِي الْكِتَابِ أُولَٰئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللَّهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللَّاعِنُونَ﴾ وقوله: ﴿خَتَمَ اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ وَعَلَىٰ سَمْعِهِمْ﴾ فهذا كفطور في النفس له منافذ، إلا أنه قد غشي من فوقه بغاشية عظيمة.

ترجمہ: ان گناہوں کے بیان میں جو آدمی اور اس کی ذات کے درمیان ہیں: جان لیں کہ انسان کی قوت ملکیہ کو قوت بہیمیہ نے اس کی تمام جانبوں سے گھیر رکھا ہے اور قوت ملکیہ کا حال اس سلسلہ میں پنجرے میں محبوس پرندے جیسا ہی ہے۔ پرندے کی نیک بختی یہ ہے کہ وہ اس پنجرے سے نکلے، پس مل جائے وہ اپنی اصلی جگہ سے یعنی سرسبز باغات سے، اور کھائے وہ غذائی دانے اور لذیذ میوے وہاں سے، اور داخل ہو وہ اپنی نوع کے افراد کے زمرہ میں، وہیں خوش ہو وہ ان کے ساتھ مل کر نہایت خوش ہوتا۔ پس انسان کی شدید ترین بدبختی یہ ہے کہ وہ دہریہ ہو جائے۔

اور دہریہ کی حقیقت یہ ہے کہ وہ ان فطری علوم کو توڑنے والا ہو (یعنی مخالفت کرنے والا ہو) جو اس کے اندر پیدا کئے گئے ہیں۔ اور ہم پہلے (باب فی ان العبادۃ حق اللہ الخ میں قولہ: فاعلم أن في روح الإنسان لطيفة نورانية تميل الخ) بیان کر چکے ہیں کہ انسان کی اصل فطرت میں اللہ جل جلالہ کی طرف میلان ہے اور ان کی تعظیم کی طرف میلان ہے، زیادہ سے زیادہ تعظیم جو ہو پاتا ہے یعنی جو اس کے بس میں ہے اور اس کی طرف اشارہ ہے اللہ تبارک وتعالیٰ کے ارشاد میں: "اور جب لیا آپ کے رب نے آدم کی اولاد سے" آیت آخر تک پڑھیں۔ اور آپ ﷺ کے ارشاد میں: کہ "ہر بچہ فطرت پر جنا جاتا ہے"

اور غایت درجہ تعظیم کرنے پر انسان قادر نہیں ہے مگر اس اعتقاد کے ساتھ کہ اس کے خالق قصد واختیار سے تصرف کرنے والے ہیں اور بدلہ دینے والے ہیں اور لوگوں کو احکام کا مکلف بنانے والے ہیں اور ان کے لئے قوانین مقرر کرنے والے ہیں۔ پس جو شخص انکار کرتا ہے اس بات کا کہ (۱) ان کا ایک ایسا پروردگار ہے جس کی طرف تمام موجودات کا سلسلہ منتہی ہوتا ہے (۲) یا اعتقاد رکھتا ہے ایسے معطل (بے کار) رب کا جو عالم میں تصرف نہیں کرتا (۳) یا ارادہ کے بغیر بالایجاب تصرف کرتا ہے (۴) یا وہ اپنے بندوں کو بدلہ نہیں دے گا اس خیر وشر پر جو وہ کرتے ہیں (۵) یا یہ اعتقاد رکھتا ہے کہ

اس کا رب دیگر مخلوقات کی طرح ہے (۲) یا شریک ٹھہراتا ہے وہ اللہ کے بندوں کو اللہ تعالیٰ کی عبادت سے روکتا ہے یا اعتقاد رکھتا ہے یا یہ کہ اللہ تعالیٰ نے بندوں کو کسی نبی کے ذریعہ احکام کا مکلف نہیں بنایا تو یہ شخص وہ ہے جس نے اپنے دل میں رب کی تعظیم کا پختہ ارادہ نہیں کیا ہے اور قطعاً اس کے علم کے لئے مقام قدس (یعنی اللہ تعالیٰ) تک پہنچنا نہیں ہے۔ اور وہ اس پرندے جیسا ہے جو لوہے کے پنجرے میں قید ہو، جس میں کوئی سوراخ نہ ہو، سوئی کی جگہ کے بقدر بھی نہ ہو۔ پس جب وہ مر جاتا ہے تو پردہ پھٹ جاتا ہے اور ملکیت نمودار ہوتی ہے کسی درجہ میں نمودار ہونا اور وہ میلان ترشح میں آتا ہے جو اس میں پیدا کیا گیا ہے اور روکتی ہیں اس کو روکنے والی چیزیں پروردگار کو جاننے سے اور پاکیزہ مقام تک پہنچنے سے۔ پس پھڑکتی ہے اس کے دل میں بڑی وحشت، اور وہ دیکھتے ہیں اس نفس کی طرف اس کے پیدا کرنے والے اور عالم بالا کے فرشتے درانحالیکہ وہ اس خبیث حالت میں ہوتا ہے پس دیکھتے ہیں ملأ اعلیٰ اس نفس میں ناراضی اور حقارت کی نظر سے اور ٹپکتے ہیں ملائکہ (سافلہ) کے نفوس میں ناراضی اور عذاب کے الہامات، پس سزا دیا جاتا ہے وہ عالم مثال میں اور عالم خارجی میں۔

یا وہ کافر ہو جائے، گھمنڈ کرے اس "شان" کے سامنے جس کو اللہ تعالیٰ الٹتے بدلتے رہتے ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: "ہر وقت وہ کسی نہ کسی شان میں ہے" اور میری مراد "شان" سے یہ ہے کہ عالم کے لئے حکمت خداوندی کے مطابق ادوار و اطوار ہیں، پس جب آتا ہے کوئی مخصوص دور تو اللہ تعالیٰ وحی فرماتے ہیں ہر آسمان میں اس کے معاملہ کی اور انتظام کرتے ہیں ملأ اعلیٰ کا ان باتوں کے ساتھ جو وہ اس دور کے مناسب ہوتی ہیں۔ اور واجب کرتے ہیں ان کے لئے ایک قانون اور ایک مصلحت۔ پھر الہام فرماتے ہیں ملأ اعلیٰ کو کہ وہ دنیا میں اس (نئے) انداز کو چلانے کا (پھیلانے کا) پختہ ارادہ کریں، پس ان کا پختہ ارادہ کرنا انسانوں کے دلوں میں الہامات کا سبب ہوتا ہے (سوال مقدر کا جواب) پس یہ "شان" اس مرتبۂ قدیم کے بعد ہے جس میں حدوث کا شائبہ تک نہیں ہے۔ اور یہ "شان" بھی واجب جل مجدہ کے بعض کمالات کی تشریح کرنے والی ہے، مرتبۂ اولیٰ کی طرح (جواب پورا ہوا) پس ہر وہ شخص جو اس شان کو چھوڑ کر جدا ہوتا ہے اور اس سے نفرت کرتا ہے اور اس سے روکتا ہے، لاحق کیا جاتا ہے وہ، ملأ اعلیٰ کی طرف سے اس کی سخت لعنت جو اس کے نفس کو گھیر لیتی ہے۔ پس اکارت کر دیئے جاتے ہیں اس کے اعمال، اور سخت ہو جاتا ہے اس کا دل اور وہ اٹھانے میں سے حاصل کرنے کی طاقت نہیں رکھتا ان کی جو اس کے لئے مفید ہوں۔ اور اسی کی طرف اشارہ ہے ارشاد باری تعالیٰ میں: "بیشک جو لوگ چھپاتے ہیں ان باتوں کو جن کو ہم نے نازل کیا ہے واضح دلائل اور ہدایت میں سے، عام لوگوں کے لئے اس کو ظاہر کرنے کے بعد کتاب الٰہی میں، ایسے لوگوں پر اللہ تعالیٰ بھی لعنت فرماتے ہیں اور (دوسرے) لعنت کرنے والے بھی ان پر لعنت کرتے ہیں" اور اللہ تعالیٰ کے ارشاد میں: "مہر کر دی اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر" پس یہ شخص ایسے پرندے کی طرح ہے جو کسی ایسے پنجرے میں ہو جس میں سوراخ ہیں، مگر بات یہ ہے کہ اس پر بھاری پردہ ڈال دیا گیا ہے اس کے اوپر سے۔

جدال سے احتراز نہ کیا ہو۔ تو اس کا حال اس پرندے جیسا ہے جو کسی شکستہ پنجرے میں بند ہو، جس سے نکلنا خطرے سے خالی نہ ہو یعنی زخمی ہوئے بغیر نکلنے کی کوئی صورت نہ ہو، پس اگر وہ کوشش کر کے ہزار دقتوں سے نکل بھی گیا تو بھی وہ اپنی نوع کے افراد میں پہنچ کر کچھ زیادہ مسرور نہیں ہوگا، نہ باغ کے پھلوں سے کماحقہ لطف اندوز ہوگا۔ کیونکہ اس کا سارا جسم زخمی ہے۔ اس کے پر اکھڑے ہوئے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے نیک و بد دونوں طرح کے اعمال کئے ہیں۔ یہی [illegible] بحکمت بر و اثم کے اعتبار سے صغائر ہیں۔

فائدہ: قیامت میں پل صراط پر سے گذرنے کی جو روایت مروی ہے، اس میں گناہ کے ان تینوں درجات کی طرف اشارہ ہے۔ بعض لوگ تو پل صراط سے گذرتے ہوئے دوزخ میں گر پڑیں گے اور ہلاک ہو جائیں گے یہ پہلی قسم کے گنہگار ہیں اور کچھ دوزخ میں گرادیے جائیں گے پھر وہ نجات پائیں گے، یہ دوسری قسم کے گنہگار ہیں اور کچھ آنکس (آنکڑوں) سے زخمی ہو کر پار ہو جائیں گے، یہ تیسری قسم کے لوگ ہیں (یہ روایات بخاری شریف میں ہیں۔ دیکھیں حدیث نمبر ۷۴۳۷، ۷۴۳۹ فتح الباری ۴۲۰:۱۳)

وأدنى من ذلك: أن يعتقد التوحيد والتعظيم على وجهيهما، ولكن ترك الامتثال كما أُمر به في حكمة البر والإثم، ومَثَلُه كمثل رجلٍ عرف الشَّجاعة: ماهي؟ وما فائدتها؟ ولكن لايستطيع الاتصاف بها، لأن حصول نفس الشُّجاعة غيرُ حصولِ صورتها في النفس.

وهو أحسن حالاً ممن لايعرف معنى الشجاعة أيضًا، ومَثَلُه كمثل طائر في قفص مُشَبَّك، يرى الخُضرةَ والفواكهَ، وقد كان فيما هنالك أيامًا، ثم طرأ عليه الحبسُ، فيشتاق إلى ماهنالك، ويضرب بجناحه، ويُدخل في المنافذ مناقيره، ولايجد طريقًا يخرج منه، وهذه هي الكبائر بحَسَب حكمة البر والإثم.

وأدنى من ذلك: أن يفعل هذه الأوامر، ولكن لا على شريطتها التي تجب لها، فمَثَلُهُ كمثل طائر في قفص مكسور، في الخروج منه حرجٌ، ولا يُتصور الخروجُ إلا بتَخَدُّشٍ في جلده، ونَتْفٍ في ريشه، فهو يستطيع أن يخرج من قفصه ولكن بجدٍّ وكدٍّ، ولا يبتهج في أبناء نوعه كلَّ الابتهاج، ولايتناول من فواكه الرياض كما ينبغي، لِمَا أصابه من الخَدْش والنَّتف.

وهؤلاء هم الذين خلطوا عملاً صالحًا وآخر سيئًا، وعوائقهم هذه هي الصغائر بحسب حكمة البر والإثم، وقدأشار النبي صلى الله عليه وسلم في حديث الصراط إلى هذه الثلاثة، حيث قال: ﴿ساقطٌ في النار، ومُخَرْدَلٌ ناجٍ، ومخدوشٌ ناجٍ﴾ والله أعلم.

ترجمہ: اور اس (پہلے درجہ) سے کم تر: یہ ہے کہ اعتقاد رکھے آدمی صحیح توحید اور صحیح تعظیم کا، مگر چھوڑ دی ہو اس نے

تعمیل ان باتوں کی جن کا حکم دیا گیا ہے وہ حکمت پروردگار کی رو سے (جن کی تفصیل تمام کے بیان سے پہلے گذری ہے) اور اس کا حال اس شخص جیسا ہے جو "بہادری" کو پہچانتا ہے کہ اس کی حقیقت کیا ہے؟ اور اس کا فائدہ کیا ہے؟ مگر وہ اس کے ساتھ متصف ہونے کی طاقت نہیں رکھتا، اس لئے کہ خود بہادری کا حاصل ہونا اور چیز ہے اور دل میں اس کی صورت کا حاصل ہونا (یعنی جاننا) اور چیز ہے۔

اور وہ حالت کے اعتبار سے بہتر ہے اس سے جو بہادری کے حق تک نہیں پہنچتا۔ اور اس کا حال اس پرندے جیسا ہے جو کسی جال دار پنجرے میں بند ہو، سبزہ زار کو اور میووں کو دیکھتا ہو اور تحقیق رہ چکا ہو وہ ان چیزوں میں جو وہاں ہیں کئی دن، پھر جاری ہوئی ہو اس پر قید، پس وہ مشتاق ہو ان چیزوں کی طرف جو وہاں ہیں، اور وہ اپنے پر پھڑپھڑاتا ہو اور سوراخوں میں اپنی چونچیں داخل کرتا ہو، اور نہ پاتا ہو کوئی ایسا راستہ جس سے نکلے۔ اور یہی کبائر ہیں نیکی اور گناہ کی حکمت کی رو سے۔

اور اس (دوسرے درجہ) سے کمتر یہ ہے کہ بجا لائے وہ ان اوامر کو (یعنی اسلام کے ارکان خمسہ وغیرہ فرائض کو) لیکن اس شرط کے مطابق نہ بجا لائے جو ان اوامر کے لئے ضروری ہیں۔ پس اس کا حال اس پرندے جیسا ہے جو کسی قفس میں بند ہو، اس سے نکلنے میں حرج (تنگی) ہو۔ اور نکلنا مقصود نہ ہو مگر اس کی کھال میں خراش کے ساتھ اور اس کے پروں میں اکھڑنے کے ساتھ، پس وہ اپنے پنجرے سے نکل سکتا ہے مگر کوشش اور مشقت کے ساتھ۔ اور وہ مسرور نہیں ہوتا اپنی نوع کے افراد میں پہنچ کر پوری طرح سے مسرور ہونا۔ اور نہیں کھاتا ہے وہ باغ کے پھلوں میں سے جیسا کہ اس کو کھانا چاہئے اس خراش اور پر نچنے کی وجہ سے جو اس کو پہنچا ہے۔

اور یہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے نیک عمل کو دوسرے بدعمل کے ساتھ ملایا ہے۔ اور ان کی بھی رکاوٹیں وہ صغائر ہیں نیکی اور گناہ کی حکمت کی رو سے، اور تحقیق اشارہ فرمایا ہے نبی کریم ﷺ نے پل صراط کی حدیث میں ان تینوں مراتب کی طرف، چنانچہ آپ نے فرمایا: "جہنم میں گرنے والا (اور ہلاک ہونے والا) اور جہنم میں گرنے والا نجات پانے والا، اور زخمی ہونے والا نجات پانے والا" باقی اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں۔

لغات وتشریحات:

قوله: أدنى من ذلك: شروع في مراتب المسلمين أي: أخفّ وأقلّ شقاوة من الدهري والكافر: مسلمٌ يعتقد التوحيد والتعظيم، كما ينبغي، لكنه لايعمل بالشرائع أصلاً اهـ سندي) . شُبّاك الشيء: ایک دوسرے میں ملانا، جال بننا، جس میں سوراخ رہتے ہیں۔ .. الشرط والشريعة بمعنى .. . وقوله: أدنى من ذلك، أي: المسلم الأدنى مرتبةً من المسلم المذكور، الذي يفعل بهذه الأوامر، لكنه لاعلى شروطها، كما يصلي بلا رعاية واجباتها وسننها وغير ذلك اهـ سندي) قوله: وعوائقهم عنه أي: موانع

۲۔ وہ حیوانات جن میں توالد و تناسل ہوتا ہے اور نر و مادہ مل کر اولاد کی پرورش کرتے ہیں۔ ان کی ضروریات قسم اول کے حیوانات کی ضروریات سے بڑھی ہوئی ہیں، اس لئے اللہ تعالیٰ کی حکمت میں ان کے لئے ضروری ہے کہ ان کو غذائی ضروریات کے الہام کے ساتھ تدبیر المنزل (عائلی زندگی) کا بھی الہام کیا جائے۔ مثلاً پرندوں کو الہام فرمایا کہ وہ غذا کس طرح حاصل کریں؟ اڑان کس طرح بھریں؟ اپنی مادہ سے کس طرح ملیں؟ گھونسلہ کس طرح بنائیں؟ اور اپنے چوزوں کو کس طرح چگائیں؟

۳۔ حیوانات کی اشرف نوع انسان ہے۔ انسان مدنی الطبع ہے، مل جل کر زندگی گزارنا اس کی فطرت ہے۔ وہ دوسرے لوگوں کے تعاون کے ساتھ ہی زندگی بسر کرتا ہے۔ وہ خودرو گھاس غذا کے طور پر استعمال نہیں کرتا، وہ کچے میوے بھی غذا کے طور پر نہیں کھاتا، نہ اس کے بدن پر پشم اور اون ہے جس سے وہ گرم ہو، بلکہ وہ کپڑوں، مکانات اور آگ وغیرہ سے گرمی حاصل کرتا ہے۔ علاوہ ازیں انسان کے اور بھی امتیازات ہیں جن کی وضاحت پہلے مبحث اول کے باب ہفتم میں گزر چکی ہے۔

غرض مذکورہ بالا امتیازات کی وجہ سے ضروری ہے کہ انسان کو تدبیر المنازل اور ذرائع معاش کے الہام کے ساتھ انتظام مملکت کے علوم بھی الہام کئے جائیں۔ البتہ فرق یہ ہے کہ دیگر حیوانات کو بوقت احتیاج فطری طور پر الہامات کئے جاتے ہیں اور انسان کو فطری الہامات زندگی برقرار رکھنے کے علوم کے بس تھوڑے سے حصہ میں کئے جاتے ہیں۔ مثلاً دودھ پیتے وقت پستان کا چوسنا، گلے میں کھرا پن محسوس ہونے پر کھانسنا اور دیکھنے کا ارادہ کرنے پر پلکیں کھولنا وغیرہ۔

انسان کو اس کی تمام ضروریات فطری طور پر کیوں الہام نہیں کی گئیں؟

انسان کو اس کی تمام ضروریات فطری طور پر اس لئے الہام نہیں کی گئیں کہ ان کا خیال (قوت عاقلہ) بڑا کارگزار ہے۔ چونکہ قدرت نے اس کو اکثر علم دے رکھا ہے اس لئے تدبیر المنازل اور انتظام مملکت کے سلسلہ کے علوم پانچ باتوں کے حوالے کر دیے گئے ہیں۔ انسان انہی پانچ ذرائع سے ضروری علم حاصل کرتا ہے۔ وہ پانچ ذرائع یہ ہیں:

۱۔ عائلی زندگی کو سنوارنے کے لئے اور مملکت کے نظم و انتظام کے سلسلہ میں لوگوں میں جو ریت رواج جاری ہے انسان اس سے طریقہ سیکھتا ہے۔

۲۔ انسان انبیائے کرام کی پیروی کر کے ان سے علوم اخذ کرتا ہے۔ انبیاء کے علوم ملکوتی انوار کے ساتھ مؤید ہوتے ہیں، کیونکہ وہ ان کی طرف وحی کئے گئے ہیں، اس لئے ان میں خطا کا احتمال نہیں ہوتا۔

۳۔ وہ اپنے اور دوسروں کے تجربات سے علم پیدا کرتا ہے۔

۴۔ وہ اپنی ذاتی کوشش کرنے کے بعد تدبیر غیبی کا انتظار کرتا ہے اور پردۂ غیب سے جو کچھ ظاہر ہوتا ہے اس سے عبرت پذیر ہوتا ہے اور علوم اخذ کرتا ہے۔

۵۔ وہ استقراء (جزئیات) قیاس اور برہان کے ذریعہ امور میں غور وفکر کرکے علوم پیدا کرتا ہے۔

سوال: جب ضروری علوم اخذ کرنے کے لئے قدرت نے انسان کو قوت عاقلہ دی ہے، جو خود یا پانچ ذرائع سے عملی اور فطری زندگی بسر کرنے کے لئے علوم اخذ کرتی ہے تو پھر تمام انسان ان علوم میں یکساں کیوں نہیں ہوتے؟

جواب: لوگوں میں ان علوم میں تفاوت قابلیت کے تفاوت کی وجہ سے ہوتا ہے، اگرچہ قدرت کی طرف سے فیضان عام ہوتا ہے جیسے بارش کا فیضان یکساں ہوتا ہے مگر باغ میں لالہ اگتا ہے اور شور زمین میں خس و خاشاک! حکیم شیرازی فرماتے ہیں:

باراں کہ در لطافت طبعش خلاف نیست   در باغ لالہ روید و در شورہ بوم خس

اسی طرح خواب میں فیضان عام ہوتا ہے مگر ہر خواب دیکھنے والے کو اس کی فطرت اور استعداد کے مطابق صورتیں نظر آتی ہیں۔ نیک آدمی کو مبشرات (اچھے خواب) نظر آتے ہیں، بد کو بدخواب، بخیل کو ٹھیکرے نظر آتے ہیں۔ غرض مُفاضٌ علیہ (جس پر علوم کا فیضان کیا گیا) میں پائی جانے والی وجہ اختلاف کا باعث ہوتی ہے، کوئی آہنگر بنتا ہے، کوئی کھیتی باڑی کا ماہر ہوتا ہے تو کوئی صاحب دل ہوتا ہے، اگرچہ علوم کا فیضان سب کے لئے عام اور یکساں ہوتا ہے، مُفیض (فیضان کرنے والے) کی طرف سے فیضان میں کوئی تفاوت نہیں ہوتا۔

﴿باب الآثام التي هي فيما بينه وبين الناس﴾

اعلم: أن أنواع الحيوان على مراتب شتى:

منها: ما يتكوّن تكوّنَ الدِّيدان من الأرض، ومن حقها: أن تُلهم من بارئ الصور: كيف تتغذى؟ ولا تُلهم: كيف تُدبِّر المنزل؟

ومنها: ما يتناسل، ويتعاون الذكر والأنثى منها في حضانة الأولاد، ومن حقها في حكمة الله تعالى: أن تُلهَمَ تدبيرَ المنازل أيضًا، كما أُلهم الطيرُ: كيف يتغذى ويطير؟ وأُلهم أيضًا: كيف يُسافِد؟ وكيف يتخذ عُشًّا؟ وكيف تُزَقُّ الفراخ؟

والإنسان من بينها مدني الطبع، لا يعيش إلا بتعاون من بني نوعه، فإنه لا يتغذى الحشيش النابت بنفسه، ولا بالفواكه نِيئة، ولا يتدفأ بالوبر، إلى غير ذلك مما شرحنا من قبل، ومن حقه: أن يُلهم تدبيرَ المُدن مع تدبير المنازل وآداب المعاش، غير أن سائر الأنواع تُلهم عند الاحتياج إلهامًا جِبِلّيًّا، والإنسان لم يُلهم إلهامًا جبليًّا إلا في حصة قليلة من علوم العيش، كمصِّ الثدي عند الارتضاع، والسُّعال عند الغُصّة، وفتح الجفون عند إرادة الرؤية، ونحو ذلك.

کا فیضان حاقِ مُسَوِّری کی طرف سے واجب (ثابت) ہے۔ اس اختلاف کے ساتھ جو لوگوں کی استعداد کی جانب سے پیدا ہونے والا ہے۔ اُن واقعات کے حال جیسا ہے جن کو خواب میں متمثل کیا جاتا ہے۔ پہنائے جاتے ہیں اُن پر بالائی علوم ان کی جگہوں سے، پس متشکل ہوتے ہیں وہ لوگوں کے پاس مناسب شکلوں میں۔ پس صورتیں مختلف ہوتی ہیں، وہ متمثل علیہ میں پائی جانے والی جہت سے، نہ کہ متمثل میں پائی جانے والی جہت سے۔

لغات و تصریحات:

تَدَفَّأ: گرم ہونا۔ الوَبَر: اونٹ اور خرگوش وغیرہ کے بال، جمع أوبار ... تَعَمَّق: اسبابِ زندگی کے لئے کوشش کرنا۔ البُحّة: آواز میں بھاری پن اور خشونت۔ صَنَاع: بڑا کاریگر۔ حَذِق ما تشتهی: ارادہ کرنا، چاہنا۔ الرَّوِيَّة: امور میں غور و فکر کرنا۔ المراد بالأمر الشائع هو العلم المفاض على الناس: أعم من أن يكون حدادة أو حراثة أو تجارة أو غيرها (سندی) والواجب بمعنى الثابت يعني أن الإنسان يتلقى العلم الشائع الضروري الذي فيضانه من الله تعالى، ولا اختلاف فيه، وإنما الاختلاف في أفراد الناس من قبل استعدادهم، فإن الله سبحانه وتعالى ينزل العلم من حظيرة القدس على الناس، فمن كان فيه استعداد الحدادة يصير حدادا، ومن كان فيه استعداد الحراثة يصير حارثا، وهكذا اهـ (سندی)

☆　☆　☆

شہری گناہوں کے اقسام اور ان کی حرمت کا فیضان

انسان کے تمام افراد پر، خواہ وہ عربی ہوں یا عجمی، شہری ہوں یا بدوی، جن علوم کا فیضان کیا گیا ہے، ان میں ایسی خصلتوں کی حرمت کا علم بھی ہے جو شہروں (مملکت) کا نظام تباہ کرنے والی ہیں، اگرچہ ادراک کے طریقے مختلف ہیں مگر تمام لوگ اپنے اپنے طریقہ پر ان باتوں کی قباحت و حرمت کو سمجھتے ہیں ــــ مملکت کا نظام درہم برہم کرنے والے گناہ تین قسم کے ہیں: (۱) شہوانی گناہ (۲) درندگی (ظلم) والے گناہ (۳) اور جو بدمعاملگی کا نتیجہ ہیں۔ تفصیل درج ذیل ہے:

شہوانی گناہ: زنا اور ہم جنس پرستی:

تمام انسانوں میں شہوت، غیرت اور حرص کے جذبات پائے جاتے ہیں۔ اور صنفِ نازک کی طرف نظر اٹھانے میں اور بیوی کے معاملہ میں مزاحمت برداشت نہ کرنے میں تو نر مردوں کا حال سانڈ جانوروں جیسا ہے۔ البتہ فرق یہ ہے کہ سانڈ ایسے مواقع میں باہم لڑتے ہیں، تا آنکہ زیادہ مضبوط پکڑ والا اور زیادہ تیز طبیعت والا غالب آجاتا ہے اور کمزور شکست کھا کر بھاگ کھڑا ہوتا ہے، اور اگر وہ حق کا مشاہدہ نہیں کرتا تو اس میں مزاحمت کا شعور ہی پیدا نہیں ہوتا، مگر

كأنه يرى ويسمع، وأُلهِموا أن التحارب لأجل ذلك مُنغِّصٌ لِمُدُنهم، لأنهم لايتمدَّنون إلا بتعاون من الرجال، والفحولُ أدخلُ في التمدن من الإناث، فأُلهِموا ابتغاء اختصاص كلِّ واحد بزوجته، وتركَ المزاحمة فيما اختُصَّ به أخوه؛ وهذا أصلُ حرمة الزنا؛ ثم صورة الاختصاص بالزوجات أمرٌ موكولٌ إلى الرسوم والشرائع.

والفحولُ منهم أيضا يُشبِهون الفحول من البهائم، من حيث أن سلامةَ فطرتهم لا تقتضي إلا الرغبة في الإناث دون الرجال، كما أن البهائم لا تلتفت هذه اللفتةَ إلا إلى الإناث، غير أن رجالا قلبتهم الشهوة الفاسدة، بمنزلة من يلتذ بأكل الطين والخضبة، فانسلخوا من سلامة الفطرة، تقتضي هذه شهوته بالرجال، وذلك صار مأبونا يتلذذ مالا يستلذه الطبع السليم، فأعقب ذلك تغيرًا لأمزجتهم، ومرضا في نفوسهم، وكان مع ذلك سببا لإهمال النسل من حيث أنهم قضَوا حاجتهم التي قيَّض الله تعالى عليهم منهم ليفوزوا بها لنسلهم، بغير طريقها، فغيَّروا النظامَ الذي خلقهم الله تعالى عليه، فصار قبحُ هذه الفعلة منتفخا في نفوسهم، فلذلك يفعلها الفساق، ولا يعترفون بها، ولو نُسبوا إليها لماتوا حياءً، إلا أن يكون انسلاخا قويا فيجهرون ولا يستحيون، فلا يتراخى أن يُعاقَبوا، كما كان في زمن سيدنا لوط عليه السلام؛ وهذا أصلُ حرمة اللِّواطة.

ترجمہ: پس ان علوم میں سے جو فائض ہونے والے ہیں انسانوں کے سبھی افراد پر، عربوں پر بھی اور عجمیوں پر بھی، شہریوں پر بھی اور بدویوں پر بھی —— اگرچہ ان کے (علوم کو) حاصل کرنے کے طریقے مختلف ہیں —— ایسی خصلتوں کی حرمت ہے جو ان کے شہروں (مملکت) کا نظام درہم برہم کر دیتی ہیں۔ اور وہ تین قسمیں ہیں: بعض شہوانی اعمال ہیں، اور بعض درندگی والے اعمال ہیں، اور بعض ایسے اعمال ہیں جو بدمعاملگی سے پیدا ہوتے ہیں۔

اور بنیادی بات: اس سلسلہ میں یہ ہے کہ انسان اپنے ابنائے نوع کے ساتھ باہم ایک جگہ اترنے والے ہیں (یعنی متفق ہیں) شہوت، غیرت اور حرص میں۔ اور انسانوں میں سے قوی مرد، چوپایوں میں سے نروں کے مشابہ ہیں مادہ کے طرف نظر اٹھانے میں اور موطوءہ میں مزاحمت برداشت نہ کرنے میں۔ البتہ فرق یہ ہے کہ چوپایوں میں سے نر جانور باہم لڑتے ہیں، یہاں تک کہ غالب آجاتا ہے ان میں سے جو زیادہ مضبوط پکڑ والا ہے اور جو زیادہ تیز طبیعت والا ہے، اور شکست کھا جاتا ہے جو ان باتوں میں کم تر ہے۔ یا ان میں مزاحمت کا شعور پیدا نہیں ہوتا جفتی نہ دیکھنے کی وجہ سے۔ اور انسان زیرک ہے، وہ اس طرح تخیل کرتا ہے کہ گویا وہ دیکھ رہا ہے اور سن رہا ہے یعنی شک اور اندازے سے بھی غیرت میں مبتلا ہو جاتا ہے اور وہ الہام کیا گیا ہے کہ اس بات کی وجہ سے باہم لڑنا ان کے شہروں کو ویران کرنے والا ہے۔ اس لئے کہ لوگ متمدن نہیں ہو سکتے مگر مردوں کے باہمی تعاون سے۔ اور تمدن میں عورتوں کی بہ نسبت قوی مرداں

کا زیادہ دخل ہے۔ پس انسانوں نے اہتمام کیا ہر ایک کا اختصاص پیدا کرنے کا اس کی بیوی کے ساتھ، اور عدم مزاحمت کرنے کا اس عورت میں جس کے ساتھ اس کا بھائی خاص کیا گیا ہے۔ اور یہ حرمت زنا کی بنیاد ہے — پھر بیوی کے ساتھ اختصاص کی صورت (قرار دینا) ایک ایسی چیز ہے جو رسوم و رواج اور قوانین (یعنی نکاح) کے حوالے کردی گئی ہے۔

اور بعض انسان ان میں سے قوی مرد چوپایوں میں سے نروں کے مشابہ ہیں، اس اعتبار سے کہ انسانوں کی فطرت کی سلامتی نہیں چاہتی ہے مگر عورتوں میں رغبت کو، نہ کہ مردوں میں، جس طرح یہ بات ہے کہ چوپایے بھی الفت بالکل ہی محسوس کرتے ہیں مگر مادینوں کی طرف۔ البتہ یہ بات ہے کہ بعض مردوں پر شہوت فاسدہ غالب آجاتی ہے، جس طرح بعض لوگوں کو مٹی اور کوئلہ کھانے میں لذت محسوس ہوتی ہے۔ پس وہ لوگ فطرت سلیمہ سے نکل جاتے ہیں۔ یہ اپنی شہوت مردوں سے پوری کرتا ہے اور وہ مفعولیت کی بیماری میں مبتلا ہوجاتا ہے۔ وہ اس چیز کو لذیذ سمجھتا ہے جس کو سلیم فطرت لذیذ نہیں سمجھتی۔ پس یہ چیز پیچھے لاتی ہے ان کے مزاجوں میں تبدیلی کو، اور ان کے دلوں میں بیماری کو، اور وہ بات اس کے ساتھ نسل کو رائیگاں کرنے کا سبب ہوتی ہے، اس اعتبار سے کہ ان لوگوں نے پوری کی اپنی اس حاجت کو جو اللہ تعالیٰ نے ان پر مقدر کی ہے تاکہ وہ اس کے ذریعہ ان کی نسل کو بڑھائیں، اس کے طریقہ کے برخلاف۔ پس انھوں نے اس نظام کو بدل دیا جس پر اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو پیدا کیا ہے — پس اس فعل شنیع کی قباحت مضبوط گڑی ہوئی ہے لوگوں کے دلوں میں، پس اسی وجہ سے ارتکاب کرتے ہیں اس کا چھپ کر، اور اس کی (قباحت کا) اعتراف نہیں کرتے ہیں، اور اگر منسوب کئے جائیں وہ اس فعل کی طرف تو مر جائیں وہ شرم کے مارے، الا یہ کہ ہو (فطرت سلیمہ سے) نہایت قوی انخلاع، پس علی الاعلان کرتے ہیں وہ اور نہیں شرماتے ہیں۔ پس دیر نہیں ہوتی کہ سزا دیے جاتے ہیں وہ جیسے کہ لوط علیہ السلام کے زمانہ میں ہوا۔ اور یہ لواطت کی حرمت کی اصل وجہ ہے۔

لغات وتشریحات:

تشاوروا بت بہ نوعہ ای شنیع کہم ومزاحمیہم تزاحم (ذوا) انماء: پانی پر اکٹھا پہنچنا۔ طمح (ف) طمحا وطموحا بصرہ الیہ: نگاہ اٹھانا۔ ہمہ الملۃ ای نظر الشہوۃ۔ بمسئلۃ ای کل واحد۔ أعقب ذلک ای أورث۔ قیض اللہ لہ کذا: مقدر کرنا۔ ذرأ (ف) ذرأ اللہ الخلق: پیدا کرنا۔ بغیر طریقہا متعلق ہے قضوا سے۔ انمنع فی الشیء: مضبوط گڑ جانا۔ إلا أن یکون ای الانسلاخ۔

☆ ☆ ☆

شراب کے نشہ میں چور رہنے کی حرمت

انسانوں کی معیشت (حصول رزق) اور گھریلو تدبیر کا انتظام اور مملکت کی حسن تدبیر عقل وتمیز پر موقوف ہے۔ اور شراب

کے نشہ میں ذہنی رہنا نظام میں بڑا رخنہ، باہمی جنگ وجدال اور کینہ پیدا کرتا ہے۔ مگر کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کی عقلوں پر ردی شہوت غالب آجاتی ہے اور وہ اس رذیل عادت کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں اور وہ تدبیرات نافعہ کو بگاڑ دیتے ہیں، چنانچہ لوگوں میں ہمیشہ سے یہ طریقہ چلا رہا ہے کہ وہ ایسے بدمست لوگوں کو ان کی حرکتوں سے روکتے ہیں اور سخت سزائیں دیتے ہیں تاکہ لوگ تباہ نہ ہو جائیں۔ مخموریت کی حرمت کی اصل وجہ یہی ہے —— رہی مطلق شراب پینے کی ممانعت خواہ قلیل ہو یا کثیر تو اس کی وجہ قسم ثانی کے آخر میں المسکرات کے عنوان سے آئے گی۔

ومعاش بني آدم وتدبيرُ منازلهم وسياسةُ مُدُنهم لا يتم إلا بعقل وتمييز، وإدمانُ الخمر ترجع إلى نظامهم بخرمٍ قوي، ويورث مهارشاتٍ وضغائنَ، غير أن أناسا غلبت شهوتهم الردية على عقولهم، أقبلوا على هذه الرذيلة، وأفسدوا عليهم ارتفاقاتِهم، فلو لم تجرِ الرسمُ بمنعٍ عن فعلهم تلك لهلك الناس، وهذا أصلُ حرمة إدمان الخمر، وأما حرمةُ قليلها وكثيرها فلا تتبيّن إلا في مبحث الشرائع.

ترجمہ: اور انسانوں کی معیشت اور ان کے گھروں کا انتظام اور ان کے شہروں کی حسن تدبیر تکمیل پذیر نہیں ہو سکتی مگر عقل وتمیز کے ذریعہ۔ اور شراب کے نشہ میں ذہنی رہنا لوٹتا ہے ان کے نظام کی طرف مضبوط دراڑ کے ساتھ، اور پیدا کرتا ہے باہمی جدال اور کینوں کو۔ تاہم کچھ ایسے لوگ ہیں جن کی عقلوں پر ان کی ردی شہوت غالب آجاتی ہے، وہ اس رذیل عادت کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ اور وہ لوگوں پر ان کی تدبیرات نافعہ کو بگاڑ دیتے ہیں۔ پس اگر جاری نہ ہوتی ریت ان کو اس حرکت سے روکنے کی تو لوگ تباہ ہو جاتے اور یہ شراب کے نشہ میں مخمور رہنے کی حرمت کی بنیاد ہے —— اور رہی قلیل وکثیر شراب کی حرمت تو وہ قوانین شرعیہ کی بحث ہی میں بیان کی جائے گی۔

لغات: أَدْمَنَ الشيئَ: ہمیشہ کرنا مُدْمِنُ الخمر: ہمیشہ شراب پینے والا۔ خرم (ن) خرمًا: شگاف ڈالنا، سوراخ کرنا۔

☆ ☆ ☆

ضرب وقتل کی حرمت

قوی مردوں کو بھی سائنڈ جانوروں کی طرح اس شخص پر سخت غصہ آتا ہے جو ان کو مطلوب سے روکتا ہے یا جو ان کو نفسانی یا جسمانی تکلیف پہنچاتا ہے۔ بس فرق اتنا ہے کہ جانور محسوس یا خیالی مطلوب ہی کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور انسان خیالی اور عقلی مطلوب کے لئے بھی کوشاں ہوتا ہے۔ اور انسان کی آز (حرص) چوپایوں کی آز سے قوی تر ہوتی

ہے مگر چوپایے غضب ناک ہونے پر باہم لڑتے ہیں تا آنکہ ایک شکست کھا جاتا ہے، پھر وہ کینہ بھول جاتا ہے۔ البتہ بعض کینہ پرور جانور جیسے اونٹ، بیل اور گھوڑے میں سے سانڈ کینہ یاد رکھتے ہیں اور انسان کا حال یہ ہے کہ اس کے دل میں کینہ پیدا ہوتا ہے تو وہ اس کو بھولتا نہیں، پس اگر جانوروں کی طرح انسانوں میں بھی ضرب وقتل اور جنگ وجدال کا دروازہ کھول دیا جاتا تو ان کا ملکی نظام تباہ ہو جاتا اور ان کی معیشت درہم برہم ہو جاتی، اس لئے ان کو قتل وضرب کی حرمت کا الہام کیا گیا ——— البتہ کسی بڑی مصلحت سے قتل وضرب روا رکھا گیا ہے، جیسے قصاص وغیرہ۔

> والفحولُ منهم يُشْبِهُوْنَ الفحولَ من البهائم في الغضب على من يَصُدُّه عن مطلوبٍ، ويَجري عليه مُؤلِمًا في نفسه أو في بدنه، لكن الفحول من البهائم لا تتوجه إلا إلى مطلوب محسوس أو متوهم، والإنسانُ يطلب المتوهمَ والمعقولَ، وحرصُه أشد من حرص البهائم، وكانت البهائم تتقاتل حتى ينهزم واحد، ثم ينسي الحقدَ، إلا ما كان من مثل الفحول من الإبل والبقر والخيل. والإنسانُ يَحْقِد ولا ينسي، فلو فُتح فيهم بابُ التقاتل لفسدت مدينتُهم، واختلّت معايشهم، فأُلهموا حرمةَ القتل والضرب، إلا لمصلحة عظيمة من قصاص ونحوه.

ترجمہ: اور انسانوں میں سے قوی مرد، چوپایوں میں سے نروں کے مشابہ ہیں برہم ہونے میں اس شخص پر جو اس کو مطلوب سے روکتا ہے اور جو اس پر جاری کرتا ہے تکلیف دہ چیز کو اس کی جان میں یا بدن میں۔ مگر سانڈ چوپایے نہیں متوجہ ہوتے مگر محسوس یا خیالی مطلوب کی طرف، اور انسان کوشاں ہوتا ہے خیالی اور عقلی مطلوب کی طرف (بھی) اور انسان کی آز چوپایوں کی آز سے قوی تر ہے۔ اور چوپایے باہم لڑتے ہیں تا آنکہ ایک شکست کھاتا ہے، پھر وہ کینہ بھول جاتا ہے مگر وہ کینہ جو ہوتا ہے اونٹ، بیل اور گھوڑے میں سے سانڈ جیسوں سے۔ اور انسان کینہ رکھتا ہے اور بھولتا نہیں۔ پس اگر انسانوں میں باہم جنگ وجدال کا دروازہ کھول دیا جائے تو ان کی مملکت تباہ ہو جائے گی اور ان کی معیشت درہم برہم ہو جائے گی، پس وہ الہام کئے گئے قتل اور مار کی حرمت کے ——— مگر کسی بڑی مصلحت سے، جیسے قصاص اور اس کے مانند۔

☆ ☆ ☆

زہر خورانی، جادو سے مارنے اور بغاوت کی تہمت لگا کر حکومت میں مخبری کرنے کی حرمت

بعض لوگوں کے سینوں میں کینہ جوش مارتا ہے جس طرح مذکورہ لوگوں کے دلوں میں غصہ بھڑکتا ہے مگر وہ قتل کرنے کی ہمت نہیں کرتے، کیونکہ انہیں قصاص کا یا سزا کا ڈر ہوتا ہے۔ پس وہ یہ حرکت کرتے ہیں کہ کھانے میں زہر ملاتے ہیں یا جادو کے ذریعہ مار ڈالتے ہیں، حالانکہ ان کا حال بھی قتل جیسا ہی ہے، بلکہ اس سے بھی سخت تر ہے۔ کیونکہ

قتل ایک کھلی ہوئی حرکت ہے اس سے بچنا ممکن ہے اور ان حرکتوں سے بچنا ممکن نہیں اور بعض لوگ بغاوت کی جھوٹی تہمت لگا کر حاکم سے مخبری کرتے ہیں تاکہ حاکم اس کو قتل کردے۔ پس یہ بھی قتل جیسا ہی گناہ ہے۔

> وهاج من الحقد في صدور بعضهم مثل ما هاج في صدور الأولين، وخافوا القصاص، فانحدروا إلى أن يدسّوا السمّ في الطعام، أو يقتلوا بسحر، وهذا حاله بمنزلة حال القتل، بل أشد منه، فإن القتل ظاهر يمكن التخلص منه، وهذه لا يمكن التخلص منها، وانحدروا أيضا إلى القذف والسعي به إلى ذي سلطان ليقتل.

ترجمہ: اور ان کے بعض کے سینوں میں بھڑکتا ہے کینہ میں سے، ویسا جیسا بھڑکتا ہے اگلوں کے سینوں میں۔ اور ڈرتے ہیں وہ قصاص سے، پس اترتے ہیں وہ اس بات کی طرف کہ وہ زہر ملائیں کھانے میں یا مارڈالیں جادو سے۔ اور اس کا حال قتل کے حال جیسا ہے بلکہ اس سے سخت ہے۔ اس لئے کہ قتل ایک کھلی ہوئی حرکت ہے، اس سے بچنا ممکن ہے اور یہ حرکت: اس سے بچنا ممکن نہیں۔ اور اترتے ہیں نیز (بغاوت کی) تہمت لگانے کی طرف اور اس کو حاکم کے سامنے پیش کرنے کی طرف تاکہ وہ قتل کرے۔ قولہ: في صدور الأولين أي في صدور القاتلين ۱۲ سندی۔

☆　　　☆　　　☆

بدمعاملگی سے پیدا ہونے والے نو گناہوں کی حرمت

اللہ تعالیٰ نے بندوں کے لئے معیشت کے یہ طریقے مقرر فرمائے ہیں: زمین سے مباح چیزیں چننا، گلہ بانی، کھیتی باڑی، کاریگریاں، تجارت، ملک وملت کی نگہبانی کی خدمات —— ان کے علاوہ دیگر دھندوں کا عمرانی زندگی میں کوئی دخل نہیں۔ مگر بعض لوگ ضرر رساں دھندے کرنے لگتے ہیں، جیسے چوری اور غصب۔ اس طرح کے دھندے مملکت کے لئے تباہ کن ہیں۔ اس لئے لوگوں کو ان کی حرمت الہام کی گئی اور تمام بنی آدم ان کی حرمت پر متفق ہیں۔ اگرچہ نافرمان لوگ، جب سرکشی کا بھوت ان پر سوار ہوتا ہے تو وہ یہ دھندے کرتے ہیں۔ اور تمام انصاف پرور بادشاہ ان کا قلع قمع کرنے کی اور ان کو مٹانے کی بھرپور سعی کرتے ہیں۔

اور جب بعض لوگوں نے دیکھا کہ حکومتیں ان حرکتوں کی روادار نہیں ہیں تو وہ جھوٹے دعووں، گواہیوں اور قسموں کے ذریعہ لوگوں کا مال ہڑپ کرنے لگے یا ناپ تول میں کمی کرکے یا سٹے کے ذریعہ یا چند در چند بڑھایا ہوا سود لے کر لوگوں کے اموال پر ظالمانہ قبضہ کرنے لگے۔ حالانکہ ان چیزوں کا حکم چوری اور غصب ہی کی طرح ہے۔ اسی طرح حکومتوں کا کرتوڑ ٹیکس وصول کرنا بھی رہزنی جیسا ہے، بلکہ اس سے بھی بدتر ہے۔

والمعايش التي جعلها الله تعالى لعباده إنما هي الالتقاط من الأرض المباحة، والرعي والزراعة والصناعة والتجارة، وسياسة المدينة والملة، وكل كسب تجاوز عنها فإنه لا مدخل له في تمدنهم، وانحدر بعضهم إلى أكساب ضارة كالسرقة والغصب، وهذه كلها مضرة للمدينة، فأُلهموا أنها محرمة، وأجمع بنو آدم كلهم على ذلك، وإن باشرها العصاة منهم في غُلَواء نفوسهم وسعى الملوك العادلة في إبطالها ومحقها، واستشعر بعضهم سعي الملوك في إبطالها، فانحدروا إلى الدعاوى الكاذبة واليمين الغموس وشهادة الزور، وتطفيف الكيل والوزن والقمار والربا أضعافا مضاعفة، وحكمها حكم تلك الأكساب الضارة، وأخذ العشر المُنْهِك بمنزلة قطع الطريق، بل أقبح.

ترجمہ: اور معاش کے جو طریقے اللہ تعالیٰ نے بندوں کے لئے مقرر فرمائے ہیں، وہ صرف یہ ہیں: مباح زمین سے چیزیں چننا، اور گلہ بانی، اور کھیتی باڑی اور کاریگری اور تجارت اور ملک و ملت کا انتظام کرنا۔ اور ہر وہ دھندا جو ان کے علاوہ ہے پس بیشک اس کا کوئی دخل نہیں ہے لوگوں کی تمدنی زندگی میں۔ اور اتر پڑے بعض لوگ مضرت رساں دھندوں کی طرف جیسے چوری اور غصب اور یہ تمام پیشے مملکت کے لئے تباہ کن ہیں۔ پس لوگ الہام کئے گئے کہ یہ سب دھندے حرام ہیں اور تمام بنی آدم اس پر متفق ہیں، اگرچہ ان میں سے نافرمان لوگ ان دھندوں کو کرتے ہیں اپنے نفوس کی سرکشی میں۔ اور انصاف پرور بادشاہ کوشش کرتے ہیں ان کو قلع قمع کرنے کی اور ان کو مٹانے کی — اور جب بھانپ لیا بعض لوگوں نے بادشاہوں کی کوشش کو ان کے قلع قمع کرنے میں تو اتر پڑے وہ جھوٹے دعووں اور جھوٹی قسموں اور جھوٹی گواہی اور ناپ تول میں کمی کرنے اور سٹہ اور چند در چند بڑھا ہوا سود لینے کی طرف۔ اور ان چیزوں کا حکم ان ضرر رساں دھندوں (چوری اور غصب) کے حکم کی طرح ہے۔ اور کمر توڑ ٹیکس کا لینا رہزنی جیسا ہے، بلکہ اس سے بھی برا ہے۔

لغات وتشریحات: المعایش جمع المعیشة: زندگی کا ذریعہ ‏ الغُلَواء: حد سے گذرنا ‏ المُنْهِك (اسم فاعل) انهكه: سخت کمزور کرنا۔ اصل میں المنهك تھا، تصحیح مولانا سندھی رحمہ اللہ نے کی ہے۔ اور مخطوطہ برلن میں بھی اسی طرح ہے۔

☆ ☆ ☆

مذکورہ بالا گناہوں کا وبال

خلاصۂ کلام: یہ ہے کہ مذکورہ بالا وجوہ سے مذکورہ بالا امور کی حرمت لوگوں کے دلوں میں پیوست ہوگئی۔ اور جو لوگ کامل عقل اور درست رائے رکھتے ہیں اور مصلحت کلی (مفاد عامہ) سے بخوبی واقف ہیں، وہ ہر دور میں لوگوں کو ان معاصی سے روکتے رہے ہیں، حتی کہ وہ تحریم بہت پختہ ہوگئی ہے اور وہ حرمت دیگر عام مشہور چیزوں کی طرح بدیہیات اولیہ میں داخل ہو چکی ہے۔ پس اس صورت حال میں جب کوئی شخص ان میں سے کسی گناہ کا ارتکاب کرتا ہے تو ان کا ل

عقل والوں اور درست رائے والوں اور مصلحت کلی کو جاننے والوں کی طرف سے ناپسندیدگی کا ایک رنگ ملأ اعلیٰ کی طرف چڑھتا ہے جس طرح ان کی طرف یہ الہام اترا تھا کہ یہ امور حرام ہیں اور موثر اور مملکت کے لئے نہایت ضرر رساں ہیں۔

غرض جب کوئی انسان ان معاصی میں سے کسی معصیت کا ارتکاب کرتا ہے تو ملأ اعلیٰ کو تکلیف پہنچتی ہے، کیونکہ ملائکہ کا تعلق انسان سے ایسا ہی ہے جیسا ادراک کرنے والی صلاحیتوں (عقل وفہم) کا جسم سے تعلق ہے جس کی تفصیل مبحث اول کے باب ہشتم میں گذر چکی ہے۔ پس جس طرح چنگاری پر پیر پڑنے سے قوائے ادراکیہ متاثر ہوتے ہیں اور اذیت پاتے ہیں، اسی طرح ان معاصی کے ارتکاب سے ملائکہ متاثر ہوتے ہیں۔ پھر جس طرح قوائے ادراکیہ سے شعاعیں نکل کر طبیعت کو متعین کرتی ہیں، ملائکہ کے اذیت پانے سے بھی شعاعیں نکلتی ہیں جو اس گنہگار کو گھیر لیتی ہیں۔ اور ملأ سافل اور ان تمام مخلوقات میں سے جن میں استعداد ہوتی ہے ان کے قلوب میں داخل ہوتی ہیں کہ وہ اس گنہگار کو اذیت پہنچائیں، اگر اذیت پہنچانا ممکن ہو اور نوشتۂ تقدیر اجازت دے یعنی اسباب معارض نہ ہوں۔ اور نوشتۂ تقدیر سے مراد وہ چار باتیں ہیں جو شکم مادر میں روح پڑنے کے وقت فرشتہ لکھتا ہے، جو اصطلاح شریعت میں "ملائکہ کا الہام" کہلاتی ہیں اور جو علم نجوم میں احکام طالع (نصیبے کے احکام) کہلاتے ہیں کہ اس کی روزی کتنی ہے؟ موت کب آئے گی؟ مدت عمر کیا ہے؟ اور وہ نیک بخت ہے یا بدبخت؟ اگر اس نوشتۂ تقدیر کا اور احکام طالع کا جزاء سے تعارض ہوتا ہے تو دنیا میں جزاء موخر ہو جاتی ہے۔ پھر جب اس کی موت آتی ہے اور موانع مرتفع ہو جاتے ہیں تو حق تعالیٰ اس کو سزا دینے کیلئے فارغ ہو جاتے ہیں۔ سورۃ الرحمٰن آیت ۳۱ میں ارشاد ہے کہ "اے جن وانس! ہم عنقریب تمہارے لئے فارغ ہورہے ہیں" اس وقت اللہ تعالیٰ گنہگار کو پوری پوری سزا دیتے ہیں۔

وبالجملة: فلهذه الأسباب دخلت في نفوس بني آدم حرمة هذه الأشياء، وقام أقوامهم عقلاً، وأسدّهم رأياً، وأعلمهم بالمصلحة الكلية يمنع عن ذلك طبقة بعد طبقة، حتى صار رسمها فاشياً، ودخلت في البديهيات الأولية، كسائر المشهورات الذائعة، فعند ذلك رجع إلى الملأ الأعلى لون منهم، حسبما كان انحدر إليهم من الإلهام: أن هذه محرّمة، وأنها ضارّة أشد الضرر، فصاروا كلما فعل واحد من بني آدم شيئاً من تلك الأفعال تأذَّوا منه مثل ما يضع أحدنا رجله على جمرة، فتخلص إلى القوى الإدراكية في تلك اللمحة، ويتأذى منه، ثم صار تأذيهم خطوط شعاعية تحيط بهذا العاصي، وتدخل في قلوب المستعدين من الملائكة وغيرهم: أن يؤذوه إذا أمكن إيذاؤه، ورخصت فيه مصلحته المكتوبة عليه، المسماة في الشرع بإلهام الملائكة: ما رزقه؟ وما أجله؟ وما عمره؟ وشقي أو سعيد؟ وفي النجوم بأحكام الطالع، حتى إذا مات، وفنيت عنه هذه المصلحة، فرغ له بأزله، كما قال: ﴿سَنَفْرُغُ لَكُمْ أَيُّهَ الثَّقَلَانِ﴾ وجازاه الجزاء الأوفى. والله أعلم.

ترجمہ: اور ماحصل کلام یہ ہے کہ ان اسباب کی وجہ سے انسانوں کے دلوں میں ان چیزوں کی حرمت داخل ہوگئی۔ اور

شارح کے مختصر حالات

بقلم مولانا مفتی محمد امین صاحب پالن پوری استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند

ولادت باسعادت اور نام: آپ کی تاریخ ولادت محفوظ نہیں، البتہ والد محترم نے جب آپ ڈیڑھ دو سال کے تھے، ڈبھاڑ (آپ کا وطن) کی زمین خریدی تھی اس کا بیع نامہ موجود ہے اس کی رو سے والد صاحب نے اندازے سے آپ کا سن پیدائش ۱۹۴۰ء کا آخر مطابق ۱۹۹۷ سمت بکری مطابق ۱۳۶۰ھ تجویز کیا ہے۔ آپ موضع کالیڑہ ضلع بناس کانٹھا (شمالی گجرات) میں پیدا ہوئے۔ بناس ایک ندی کا نام ہے اور کانٹھا گجراتی میں کنارے کو کہتے ہیں اور بناس کانٹھا ایک علاقہ کا نام ہے اور اب ایک ضلع ہے، جو بناس ندی کے جنوب میں واقع ہے۔ اس ضلع کا مرکزی شہر "پالن پور" ہے، جو آزادی سے پہلے مسلمان نواب کی اسٹیٹ تھی، کالیڑہ پالن پور سے تقریباً تیس میل کے فاصلہ پر جنوب مشرق میں واقع ہے اور علاقہ پالن پور کی مشہور بستی ہے جہاں ایک عربی مدرسہ "تعلیم العلوم" کے نام سے قائم ہے، جس میں متوسطات تک کی تعلیم ہوتی ہے۔

آپ کا نام والدین نے صرف "احمد" رکھا تھا، کیونکہ آپ سے ایک بڑے خیالی بھائی احمد نامی ہیں، ان کی یاد تازہ کرنے کے لئے والد صاحب نے آپ کا نام بھی احمد رکھا تھا۔ سعید احمد آپ نے اپنا نام خود رکھا ہے، جب آپ نے مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور میں داخلہ لیا تو اپنا نام سعید احمد لکھوایا اس وقت سے آپ کی علمی شہرت سعید احمد کے نام سے ہے، خاندان کے بڑے بوڑھے اب بھی آپ کو "احمد بھائی" کہتے ہیں، مگر چونکہ اب ایسے بوڑھے دو چار ہی رہ گئے ہیں۔

آپ کے والد ماجد کا اسم گرامی یوسف، دادا کا نام علی ہے جو احتراماً علی جی کہلاتے تھے۔ آپ کا خاندان ڈھکا اور برادری "مومن" ہے، جس کے تفصیلی احوال "مومن قوم اپنی تاریخ کے آئینہ میں" مذکور ہیں۔

تعلیم و تربیت: جب آپ کی عمر پانچ، چھ سال کی ہوئی تو والد صاحب نے جو ڈبھاڑ کے کھیتوں میں رہتے تھے آپ کی تعلیم کا آغاز فرمایا، لیکن والد مرحوم کھیتی باڑی کے کاموں کی وجہ سے موصوف کی طرف خاطر خواہ توجہ نہیں دے سکتے تھے، اس لئے آپ کو اپنے وطن کالیڑہ کے مکتب میں بٹھا دیا، آپ کے مکتب کے اساتذہ یہ ہیں (۱) مولانا داؤد صاحب چودھری رحمہ اللہ (۲) مولانا حبیب اللہ صاحب چودھری زید مجدہم (۳) اور حضرت مولانا ابراہیم صاحب جونکیہ رحمہ اللہ۔

مکتب کی تعلیم مکمل کر کے موصوف اپنے ماموں مولانا عبدالرحمن صاحب شیرا قدس سرہ کے ہمراہ "چھاپی" تشریف لے گئے، اور چھاپی میں اپنے ماموں اور دیگر اساتذہ سے فارسی کی ابتدائی کتابیں چھ ماہ تک پڑھیں، چھ ماہ کے بعد آپ کے ماموں دارالعلوم چھاپی کی تدریس چھوڑ کر گھر آگئے تو آپ بھی اپنے ماموں کے ہمراہ جونی سیندھنی آگئے اور چھ ماہ تک اپنے ماموں سے فارسی کی کتابیں پڑھتے رہے۔

اس کے بعد مصلح امت حضرت مولانا محمد نذیر میاں صاحب پالن پوری قدس سرہ کے مدرسہ میں جو پالن پور شہر میں واقع ہے داخلہ لیا، اور چار سال تک حضرت مولانا مفتی محمد اکبر میاں صاحب پالن پوری اور حضرت مولانا محمد ہاشم صاحب بخاری

ولادت محفوظ نہیں، والد ماجد رحمہ اللہ نے اندازے سے ۱۳۶۰ھ مطابق ۱۹۴۱ء بتائی ہے۔ دارالعلوم دیوبند میں داخلہ ۱۳۸۰ھ میں لیا، اور ۱۳۸۲ھ میں فاتحۂ فراغ پڑھا، بخاری شریف حضرت فخر المحدثین سے، مقدمۂ مسلم و مسلم شریف کتاب الایمان و ترمذی شریف جلد اول حضرت علامہ بلیاوی سے، اور باقی مسلم شریف حضرت مولانا بشیر احمد خاں صاحب بلند شہری سے، اور ترمذی جلد ثانی مع کتاب العلل و شمائل اور ابوداؤد شریف حضرت علامہ فخر الحسن مرادآبادی سے، نسائی شریف حضرت مولانا محمد ظہور صاحب دیوبندی سے، طحاوی شریف حضرت مفتی سید مہدی حسن شاہجہاں پوری سے اور مشکوٰۃ شریف حضرت مولانا سید حسن صاحب دیوبندی سے، اور ان کے انتقال کے بعد جلد اول حضرت مولانا عبد الجلیل صاحب دیوبندی سے اور جلد دوم حضرت مولانا اسلام الحق صاحب اعظمی سے پڑھی، اس سال موطا مالک حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب قاسمی اور موطا محمد حضرت مولانا عبد الاحد صاحب دیوبندی کے پاس تھیں (مشاہیر محدثین و فقہائے کرام ص ۲۸۰،۲۷)

اوّل نمبر سے کامیابی: آپ بچپن ہی سے نہایت ذہین، فطین، کتب بینی اور محنت کے عادی تھے، والدین اور اساتذۂ کرام کی تعلیم و تربیت نے آپ کی مستعدہ صلاحیت کو بائیس سال کی عمر میں ہی بامِ عروج تک پہنچا دیا، چنانچہ دارالعلوم دیوبند کی عظیم دینی درسگاہ کے سالانہ امتحان میں آپ نے اوّل نمبر سے کامیابی حاصل کی جبکہ اس سال بعض بہت مستعد اور پہلے فارغ شدہ فضلاء نے بھی دورۂ حدیث میں محض اسی غرض سے داخلہ لیا تھا کہ وہ اوّل نمبر سے کامیاب ہوں گے۔

دارالافتاء میں داخلہ اور آپ کا پہلا شاگرد: دورۂ حدیث شریف سے فراغت کے بعد آپ نے شوال ۱۳۸۲ھ میں تکمیل افتاء کے لئے درخواست دی، پھر ذیقعدہ ۱۳۸۲ھ کو آپ کا دارالافتاء دارالعلوم دیوبند میں داخلہ ہوگیا، اور حضرت مفتی سید مہدی حسن صاحب شاہجہاں پوری کی نگرانی میں کتب فتاویٰ کا مطالعہ اور فتویٰ نویسی کی مشق کا آغاز فرمایا۔

آپ اپنے بھائی بہنوں میں سب سے بڑے ہیں، اس لئے دورۂ حدیث شریف سے فراغت کے بعد اپنے بھائیوں کی تعلیم و تربیت کی طرف خصوصی توجہ فرمائی، اور راقم الحروف کو ۱۳۸۲ھ میں اپنے ہمراہ دیوبند لائے، اور حضرت قاری کامل صاحب دیوبندی کی درسگاہ میں احقر کو حفظ قرآن کریم کے لئے بٹھایا، مگر میں اپنی نااہلیت کی وجہ سے قاری صاحب مرحوم سے ٹھیک سے استفادہ نہ کرسکا تو میرے حفظ قرآن کی پوری ذمہ داری آپ نے سنبھال لی — اسی سال آپ نے مجود الشیخ محمود عبد الوہاب محمود صاحب مصری رحمہ اللہ کے پاس حفظ بھی شروع کیا، جو قرآن کریم کے جید حافظ اور مصری قاری تھے، اور جامعۃ الازہر قاہرہ کی طرف سے دارالعلوم دیوبند میں مبعوث تھے۔

الغرض ۱۳۸۲ھ اور ۱۳۸۳ھ میں آپ ایک طرف کتب فتاویٰ کا مطالعہ و فتویٰ نویسی کی مشق کرتے تھے، دوسری طرف احقر کو حفظ کراتے تھے اور خود بھی حفظ کرتے تھے، اور ان کاموں میں ایسے مصروف و منہمک تھے کہ رمضان المبارک میں بھی وطن تشریف نہیں لے گئے، اور میں بھی نہیں گیا، رمضان المبارک کے بعد اپنے دوسرے بھائی مولوی عبد المجید صاحب کو بھی دیوبند بلا لیا، ادھر افتاء کمیٹی نے آپ کی صلاحیتوں کو مزید پروان چڑھانے کے لئے دارالافتاء کے داخلہ میں ایک سال کی توسیع کردی، چنانچہ ۱۳۸۴-۱۳۸۳ھ میں آپ بھائی مولوی عبد المجید صاحب کو فارسی کی کتابیں پڑھاتے تھے، مجھے حفظ کراتے تھے، خود ایک

طرف حفظ کرتے تھے دوسری طرف فتویٰ نویسی کی خوب مشق کرتے تھے، اور فتویٰ نویسی میں باقی عبارت لکھتے تھے، چھ ماہ کے بعد دارالعلوم دیوبند کے ارباب انتظام نے آپ کا معین مفتی کی حیثیت سے دارالافتاء دارالعلوم دیوبند میں تقرر کر دیا۔

۲۱ رشوال ۱۳۸۴ھ کو مادر علمی دارالعلوم دیوبند کو خیرباد کہہ کر آپ پہلے گھر تشریف لے گئے، ایک ہفتہ گھر پر قیام کیا، والدین کی زیارت کا شرف حاصل کیا، پھر بھائی مولوی عبدالمجید صاحب کو جو احقر سے تقریباً دو سال بڑے ہیں اور مولوی حبیب الرحمن صاحب کو جو مجھ سے تقریباً سات آٹھ سال چھوٹے ہیں، اور راقم الحروف کو ساتھ لے کر راندیر (سورت) تشریف لے گئے۔ اور دارالعلوم اشرفیہ میں تدریس کا آغاز فرمایا۔

راندیر میں آپ کی خدمات: ذیقعدہ ۱۳۸۴ھ سے شعبان ۱۳۹۳ھ تک (۹ سال) دارالعلوم اشرفیہ راندیر (سورت) میں موصوف نے ابوداؤد شریف، ترمذی شریف، طحاوی شریف، شمائل، موطّین، نسائی شریف، ابن ماجہ شریف، مشکوٰۃ شریف، جلالین شریف مع الفوز الکبیر، ترجمہ قرآن کریم، ہدایہ آخرین، شرح عقائد نسفی، اور حسامی وغیرہ بہت سی کتابیں پڑھائیں، اور تصنیف وتالیف میں مشغول رہے۔ اسی عرصہ میں موصوف نے داڑھی اور انبیاء کی سنتیں، حرمت مصاہرت اور العون الکبیر ارقام فرمائیں۔ نیز اسی زمانہ میں موصوف نے قاسم العلوم والخیرات حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس سرہٗ کی کتابوں اور علوم ومعارف کی تسہیل وتشریح کا آغاز فرمایا۔ ایک مضمون "افادات نانوتوی" کے عنوان سے اسی زمانہ میں الفرقان لکھنؤ میں قسط وار شائع ہوا تھا، جو نہایت تحقیقی مضمون ہے۔

دارالعلوم دیوبند میں آپ کا تقرر: موصوف کے استاذ محترم حضرت مولانا محمد ہاشم صاحب بخاری نے جو پہلے جامعہ حسینیہ راندیر میں پڑھاتے تھے، پھر دارالعلوم دیوبند میں ان کا تقرر ہو گیا تھا۔ موصوف نے خط سے مطلع کیا کہ دارالعلوم دیوبند میں ایک مدرس کی جگہ خالی ہے، لہٰذا آپ دارالعلوم دیوبند میں تدریس کی درخواست بھیجیں۔ موصوف نے جناب مولانا حکیم محمد سعد رشید صاحب اجمیری رحمہ اللہ کے مشورہ سے درخواست بھیج دی، اسی سال شعبان میں جب مجلس شوریٰ کا انعقاد ہوا، اور درجات عربیہ کے لئے ایک مدرس کے تقرر کا تذکرہ آیا تو حضرت مولانا محمد منظور صاحب نعمانی قدس سرہٗ نے موصوف کا نام پیش کیا اور اسی مجلس میں موصوف کا تقرر ہو گیا، موصوف کو شعبان ہی میں اس کی اطلاع دی گئی، رمضان المبارک کے بعد آپ دارالعلوم دیوبند تشریف لے آئے، اس وقت سے آج تک موصوف دارالعلوم دیوبند میں تدریس کی خدمت انجام دے رہے ہیں، اللہ تعالیٰ موصوف کی عمر میں برکت عطا فرمائیں، اور ان کے فیوض وبرکات کو عام اور تام فرمائیں! آمین یا رب العالمین!

دارالعلوم دیوبند میں تعلیمی خدمت: شوال ۱۳۹۳ھ سے ان سطور کے لکھنے تک موصوف نے دارالعلوم دیوبند میں جو کتابیں پڑھائیں اور پڑھا رہے ہیں ان کی تفصیل حسب ذیل ہے:

۹۴-۱۳۹۳ھ میں: مسلم الثبوت، ہدایہ اول، سلم العلوم، ہدیہ سعیدیہ، جلالین شریف نصف اول مع الفوز الکبیر، ملا حسن ——

۹۵-۱۳۹۴ھ میں: مسلم الثبوت، شرح عقائد جلالی، ملا حسن، جلالین شریف نصف ثانی مع الفوز الکبیر —— ۹۶-۱۳۹۵ھ

میں مسامرہ، دیوانِ متنبی، حمیدی، تفسیر بیضاوی پارہ ۲۱ تا ۲۵ ـــ ۱۳۹۶-۹۷ھ میں: دیوانِ متنبی، تفسیر بیضاوی پارہ ۲۶ تا ۳۰، ملا حسن، مشکوٰۃ شریف (عارضی) ـــ ۹۸-۱۳۹۷ھ میں: مشکوٰۃ شریف جلد ثانی مع نخبۃ الفکر، حسامی (صرف قیاس)، ملا حسن، سبعہ معلقہ، ہدایہ ثانی، موطا امام مالک ـــ ۱۳۹۸-۹۹ھ میں: دیوانِ حماسہ، سبعہ معلقہ، بیضاوی شریف سورۂ بقرہ، مشکوٰۃ شریف جلد ثانی مع نخبۃ الفکر، تفسیر مظہری پارہ ۱۶ تا ۲۰، موطا امام مالک، سراجی، نسائی شریف ـــ ۱۴۰۰ھ میں: مشکوٰۃ شریف جلد ثانی مع نخبۃ الفکر، بیضاوی شریف پارہ ۱۱ تا ۱۵، دیوانِ حماسہ، سبعہ معلقہ، موطا امام مالک، سراجی ـــ ۱۴۰۱ھ میں: مشکوٰۃ شریف جلد اول مع نخبۃ الفکر، بیضاوی شریف پارہ ۲۶ تا ۳۰، تفسیر مدارک پارہ ۲۶ تا ۳۰، سراجی، موطا امام محمد ـــ ۱۴۰۲ھ میں: ترمذی شریف، بیضاوی شریف سورۂ بقرہ، ابوداؤد شریف، بخاری شریف جلد ثانی، موطا امام مالک، موطا امام محمد ـــ ۱۴۰۳ھ میں: ترمذی شریف جلد اول، بیضاوی شریف سورۂ بقرہ، مسلم شریف جلد اول، مقدمہ ابن صلاح، رشیدیہ، ابن ماجہ ـــ ۱۴۰۴ھ میں: ترمذی شریف جلد اول، بیضاوی شریف سورۂ بقرہ، ہدایہ رابع، طحاوی شریف ـــ ۱۴۰۵ھ میں: ترمذی شریف جلد اول، بیضاوی شریف سورۂ بقرہ، ہدایہ ثالث، بخاری شریف جلد اول، طحاوی شریف ـــ ۱۴۰۶ھ میں: ترمذی شریف جلد اول، تفسیر القرآن، ہدایہ رابع، طحاوی شریف ـــ ۱۴۰۷ھ میں: تلخیص الاتقان، ترمذی شریف جلد اول، ہدایہ رابع، طحاوی شریف ـــ ۱۴۰۸ھ میں: ترمذی شریف جلد اول، ہدایہ رابع، طحاوی شریف، حجۃ اللہ البالغہ ـــ ۱۴۰۹ھ میں: ترمذی شریف جلد اول، ہدایہ رابع، طحاوی شریف، حجۃ اللہ البالغہ ـــ ۱۴۱۰ھ میں: ترمذی شریف جلد اول، ہدایہ ثالث، طحاوی شریف پڑھائیں اور ۱۴۱۱ھ سے ان خدمات کے تذکرہ تک ترمذی شریف جلد اول، طحاوی شریف اور حجۃ اللہ البالغہ پڑھا رہے ہیں۔

دیگر خدمات: مذکورہ بالا تعلیمی و تدریسی خدمات کے علاوہ موصوف نے دارالعلوم دیوبند میں جو خدمات انجام دی ہیں اور دے رہے ہیں ان کے مفصل تذکرہ کی اس مختصر تعارف میں گنجائش نہیں، صرف چند خدمات کا ذیل میں تذکرہ کیا جاتا ہے:

(۱) ۱۴۰۲ھ میں حضرت مولانا مفتی نظام الدین صاحب زید مجدہم نے طویل رخصت لی، حضرت مولانا مفتی محمود حسن صاحب گنگوہی قدس سرہ سہارنپور چلے گئے، اور بعض مفتیانِ کرام نے دارالعلوم سے علیحدگی اختیار کر لی، اس لئے ارباب انتظام نے موصوف اور راقم الحروف کو کتب متعلقہ کی تدریس کے ساتھ شعبۂ افتاء کی نگرانی اور فتوی نویسی کا حکم دیا جس کو بحسن و خوبی موصوف اور راقم الحروف نے انجام دیا۔

(۲) جب سے دارالعلوم دیوبند میں "مجلس تحفظ ختم نبوت" کا قیام عمل میں آیا آپ اس کے ناظم اعلیٰ ہیں ۱۴۱۹ھ میں آپ نے اس منصب سے سبکدوش ہونے کی مجلس شوریٰ میں درخواست دی مگر مجلس شوریٰ نے منظور نہیں فرمائی۔

(۳) مذکورہ بالا خدمات کے علاوہ حضرت مہتمم صاحب دامت برکاتہم جو تحریری اور تقریری خدمت موصوف کو سپرد فرماتے ہیں ان کو بحسن و خوبی انجام دیتے ہیں جس کی تفصیل طویل ہے، اس مختصر تعارف میں اس کی گنجائش نہیں۔

تصنیفی خدمات: موصوف کی تصانیف جو شائع ہو کر مشرق و مغرب میں پھیل چکی ہیں ان کا تعارف درج ذیل ہے۔

(۱) تفسیر ہدایت القرآن: یہ مقبول عام و خاص تفسیر ہے، پارہ ۳۰ اور ایک تا ۹ حضرت مولانا محمد عثمان کاشف الہاشمی

صاحب رحمہ اللہ نے لکھے ہیں اور ۱۰۱ تا ۱۵۰ موصوف نے لکھے ہیں، آگے کام جاری ہے۔

(۲) الفوز الکبیر کی تعریب جدید: یہ سابقہ تعریب کی تہذیب ہے، دارالعلوم دیوبند اور دیگر مدارس میں اب یہی تعریب پڑھایا جاتا ہے۔

(۳) العون الکبیر: یہ الفوز الکبیر کی عربی شرح ہے، پہلے قدیم تعریب کے مطابق تھی اب جدید تعریب کے مطابق کر دی گئی ہے۔

(۴) فیض المنعم: یہ مقدمہ مسلم شریف کی معیاری اردو شرح ہے، جو ترکیب، حل لغات اور فن حدیث کی ضروری بحثوں پر مشتمل ہے۔

(۵) تحفۃ الدرر: یہ نخبۃ الفکر کی بہترین اردو شرح ہے، کتب حدیث پڑھنے والوں خصوصا مشکوۃ شریف پڑھنے والوں کے لئے نہایت قیمتی سوغات ہے۔

(۶) مبادی الفلسفہ: اس میں فلسفہ کی تمام اصطلاحات کی عربی زبان میں مختصر اور عمدہ وضاحت کی گئی ہے دارالعلوم دیوبند اور دیگر مدارس عربیہ کے نصاب میں داخل ہے۔

(۷) معین الفلسفہ: یہ مبادی الفلسفہ کی بہترین اردو شرح ہے، اور حکمت و فلسفہ کے پیچیدہ مسائل کی عمدہ وضاحت پر مشتمل معلومات افزا کتاب ہے۔

(۸) مفتاح التہذیب: یہ علامہ تفتازانی کی "تہذیب المنطق" کی ایسی عمدہ شرح ہے کہ اس سے "شرح تہذیب" جو مدارس عربیہ کے نصاب درس میں داخل ہے، خوب حل ہو جاتی ہے۔

(۹) آسان منطق: یہ تیسیر المنطق کی تہذیب ہے، دارالعلوم دیوبند اور بہت سے مدارس میں "تیسیر المنطق" کی جگہ پڑھائی جاتی ہے۔

(۱۰) آسان صرف (دو حصے) (۱۱) آسان نحو (دو حصے) علم نحو اور علم صرف کی جو کتابیں اردو میں لکھی گئی ہیں ان میں عام طور پر تدریج کا لحاظ نہیں رکھا گیا، جبکہ یہ بات نہایت ضروری ہے، اس نصاب کو اسی ضرورت کو سامنے رکھ کر مرتب کیا گیا ہے، یہ نصاب نہایت مفید اور بہت سے مدارس میں داخل درس ہے۔

(۱۲) محفوظات: (تین حصے) یہ آیات و احادیث کا مجموعہ ہے، جو طلبہ کے حفظ کرنے کے لئے مرتب کیا گیا ہے۔ بہت سے مدارس و مکاتب میں داخل نصاب ہے۔

(۱۳) آپ فتویٰ کیسے دیں؟: یہ علامہ محمد امین بن عابدین شامی کی شہرۂ آفاق کتاب "شرح عقود رسم المفتی" کی نہایت عمدہ شرح ہے۔

(۱۴) کیا مقتدی پر فاتحہ واجب ہے؟: یہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس سرہٗ کی کتاب "توثیق الکلام" کی نہایت آسان عام فہم شرح ہے۔

(۱۵) حیات امام ابوداؤد: اس میں امام ابوداؤد سجستانی کی مکمل سوانح، سنن ابی داؤد کا تفصیلی تعارف، اور اس کی تمام شروحات و متعلقات کا مفصل مگر سلیس اور دلنشین انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

(۱۶) مشاہیر محدثین و فقہائے کرام اور تذکرہ راویان کتب حدیث: اس میں خلفاء راشدین، عشرۂ مبشرہ، ازواج

مطہرات، بنات طیبات، مدینہ کے فقہائے سبعہ، ائمہ مجتہدین امت، محدثین کرام، رواۃ کتب حدیث، شارحین حدیث، فقہائے ملت، مفسرین عظام، متکلمین اسلام اور مشہور شخصیات کا مختصر جامع تذکرہ ہے۔ حدیث کے ہر استاذ اور طالب علم کے پاس اس کتاب کا ہونا ضروری ہے۔

⑰ حیات امام طحاوی: اس میں امام ابو جعفر طحاوی کے مفصل حالات زندگی، ناقدین پر رد، تصانیف کا تذکرہ، نظر طحاوی کی توضیح اور شرح معانی الآثار کا تفصیلی تعارف ہے۔

⑱ اسلام تغیر پذیر دنیا میں: یہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور جامعہ ملیہ دہلی کے سیمیناروں میں پڑھے گئے چار تحقیقی مقالوں کا مجموعہ ہے۔

⑲ نبوت نے انسانیت کو کیا دیا؟ یہ مقالہ جامعہ ملیہ دہلی کے ایک جلسہ میں پیش کیا گیا تھا، پہلے وہ علحدہ شائع ہوا تھا، اب اس کو اسلام تغیر پذیر دنیا میں شامل کر دیا گیا ہے۔

⑳ داڑھی اور انبیاء کی سنتیں: ناخن تراشنے، بغل کے بال اور زیر ناف لینے، مسواک کرنے، کلی اور ناک صاف کرنے، جسم کے جوڑوں کو دھونے، ختنہ کرنے، پانی سے استنجا کرنے، بالوں میں مانگ نکالنے، مونچھیں تراشنے اور داڑھی رکھنے کے متعلق واضح احکامات، مسائل، دلائل اور فضائل کا مجموعہ ہے۔ داڑھی پر ہونے والے اعتراضوں کے جوابات بھی اس کتاب میں شامل ہیں۔

㉑ حرمت مصاہرت: اس میں سسرالی اور دامادی رشتوں کے مفصل احکام، اور ناجائز تعلقات کا مدلل حکم بیان کیا گیا ہے۔

㉒ تسہیل ادلۂ کاملہ: یہ حضرت شیخ الہند کی نایاب کتاب "ادلۂ کاملہ" کی نہایت عمدہ شرح ہے، اس میں غیر مقلدین کے چھیڑے ہوئے دس مشہور مسائل کی مکمل تفصیل ہے۔ موصوف نے یہ کتاب مجھے املا کرائی تھی میں نے اس کو مرتب کیا ہے، یہ شیخ الہند اکیڈمی سے شائع ہوئی ہے۔

㉓ حواشی وعناوین ایضاح الادلہ: ایضاح الادلہ حضرت شیخ الہند کی شہرۂ آفاق کتاب ہے، اس پر موصوف نے نہایت مفید حواشی ارقام فرمائے ہیں، اور ذیلی عناوین بڑھائے ہیں، یہ کتاب بھی شیخ الہند اکیڈمی سے شائع ہوئی ہے۔

㉔ حواشی امداد الفتاوی: موصوف نے قیام راندیر کے زمانے میں یہ حواشی لکھنے شروع کیے تھے صرف جلد اول پر کام ہوا تھا جو طبع ہو گیا ہے باقی جلدوں پر کام نہیں ہوا۔ یہ حواشی بھی اہل علم میں وقعت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔

㉕ زبدۃ الطحاوی: یہ امام طحاوی کی شہرۂ آفاق کتاب "شرح معانی الآثار" کی عربی تلخیص ہے، مگر جہاں تک عام طور پر طحاوی شریف پڑھائی جاتی ہے وہاں تک کام ہوا ہے یعنی کتاب الطہارۃ کے ختم تک طبع ہوئی ہے۔

㉖ رحمۃ اللہ الواسعۃ شرح حجۃ اللہ البالغۃ (کامل ۵ جلدیں) یہ حجۃ اللہ کی مبسوط اردو شرح ہے۔ حجۃ اللہ البالغہ کی شرح ایک بھاری قرض تھا جو علمائے سو سال سے امت کے ذمہ باقی تھا۔ موصوف نے جماعت دیوبند کی طرف سے یہ قرض کا چکا دیا ہے۔

تبلیغی خدمات: مذکورہ بالا تعلیمی و تدریسی اور تصنیفی مصروفیت کے ساتھ آپ ملک و بیرون ملک کے دورے کرتے رہتے ہیں، اور جو حضرات دینی باتیں سننے کے مشتاق ہیں، ان کو اپنی نوازشوں سے نوازتے رہتے ہیں، اس کی تفصیل بہت طویل ہے، مختصر یہ کہ آپ دار العلوم دیوبند کی تدریس کو حسن و خوبی انجام دیتے ہوئے اور تصنیفی کام جاری رکھتے ہوئے،

درمیان سال میں وقتاً فوقتاً ملک وبیرون ملک کے مختصر دورے کرتے ہیں، اور رمضان المبارک کی طویل تعطیل میں کبھی برطانیہ، کبھی کناڈا، کبھی افریقہ اور کبھی امریکہ تشریف لے جاتے ہیں، ایک دن میں کئی کئی تقریریں کرتے ہیں، سعادت مند سامعین کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت، خوف خدا وفکر آخرت اور اعمال صالحہ پر ابھارتے رہتے ہیں، حرام اور منکر باتوں سے نہایت مؤثر انداز میں باز رہنے کی تلقین فرماتے رہتے ہیں۔

انداز خطابت اور تصنیفی خصوصیات: جس طرح موصوف کا انداز خطابت نہایت مؤثر، درس نہایت مقبول اور عام فہم ہوتا ہے، اسی طرح آپ کی تمام تصانیف نہایت آسان، عام فہم اور مقبول عام وخاص ہیں، آپ کی تقریریں نہایت مبسوط اور علمی نکات سے پُر اور تحریریں نہایت مرتب، واضح اور جامع ہوتی ہیں، اسی لئے آپ کی کئی تصانیف دارالعلوم دیوبند اور دیگر مدارس عربیہ کے نصاب میں داخل ہیں۔

ترقیات کا راز: استاذ محترم کو اللہ جل شانہ وعم نوالہ نے بہت سی خوبیوں اور کمالات سے نوازا ہے، آپ کا ذوق لطیف، طبیعت سادہ اور نفیس ہے، مزاج میں استقلال اور اعتدال ہے، فطرت میں سلامت روی اور ذہن رسا ہے، زود نویس اور خوش نویس ہیں۔ حق وباطل اور صواب وخطاء کے درمیان امتیاز کرنے کی وافر صلاحیت رکھتے ہیں اور حقائق ومعارف کے ادراک میں یکتائے زمانہ ہیں۔

اور سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ موصوف اپنے کاموں میں نہایت چست اور حالات کا جوانمردی سے مقابلہ کرنے والے ہیں، میں نے حضرت اقدس جیسا شب وروز محنت کرنے والا مصروف آدمی اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا، آپ کے تمام شاگرد جانتے ہیں کہ آپ کا درس کتنا مقبول ہے؟ اور جن حضرات کو آپ کی تصانیف دیکھنے اور تقاریر سننے کا موقع ملا ہے، وہ جانتے ہیں کہ آپ کی تصانیف اور تقاریر کتنی پر مغز، مرتب اور جامع ہوتی ہیں؟ اور آپ کے خدام جانتے ہیں کہ حضرت اقدس اپنی اور اپنے متعلقین کی کتابوں کی تصحیح وطباعت کا کتنا اہتمام فرماتے ہیں، اور اپنے بھائیوں اور اہل وعیال کی تعلیم وتربیت کا کس قدر خیال فرماتے ہیں؟

اجازت بیعت وارشاد: موصوف جس طرح علوم ظاہری میں درک وکمال رکھتے ہیں، اسی طرح علوم باطنی سے بھی بہرہ ور ہیں مگر اس کا اس قدر اخفا فرماتے ہیں کہ عام طور پر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ آپ صرف علوم ظاہری میں مہارت رکھتے ہیں، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ آپ طالب علمی کے زمانہ سے حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب قدس سرہ سے بیعت ہیں، اور دیگر بزرگان دین سے بھی فیض یافتہ ہیں، خاص طور پر حضرت اقدس مولانا عبدالقادر صاحب رائے پوری قدس سرہ کی مجالس میں مظاہر علوم کی طالب علمی کے زمانہ میں شرکت کرتے رہے ہیں۔ اور حضرت مولانا مفتی مظفر حسین صاحب مظاہری رحمہ اللہ سے مجاز بیعت وارشاد ہیں۔

زیارت حرمین شریفین: موصوف کئی بار زیارت حرمین شریفین کا شرف حاصل کرچکے ہیں، سب سے پہلے ۱۴۰۰ھ مطابق ۱۹۸۰ء میں اہلیہ محترمہ کے ساتھ پانی کے جہاز سے سفر کیا، اور فریضۂ حج ادا کیا۔ پھر ۱۴۰۶ھ میں افریقہ سے دوسرا حج کیا، چونکہ آپ پہلے فرض حج ادا کرچکے تھے اس لئے موصوف نے یہ دوسرا حج آنحضرت ﷺ کی طرف سے حج بدل کے طور پر کیا۔ پھر ۱۴۱۰ھ مطابق ۱۹۹۰ء میں سعودی وزارت حج واوقاف کی دعوت پر تیسرا حج کیا۔ اور ایک بار ربیع الاول ۱۴۱۴ھ

تشریف عمرہ کرنے کے لئے تشریف لے گئے۔

رحلت والدین ماجدین: جس زمانہ میں شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی، مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی اور محدث کبیر حضرت مولانا محمد یوسف بنوری ڈابھیل میں پڑھاتے تھے، اس وقت والد صاحب ڈابھیل میں پڑھتے تھے اور حضرت مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی مہاجر مدنی قدس سرہ کے خادم خاص تھے مگر گھریلو احوال کی وجہ سے تعلیم مکمل نہیں کر سکے۔ اس لئے اپنے صاحبزادوں کو علامہ شبیر احمد عثمانی، مولانا بدر عالم میرٹھی، اور محدث کبیر حضرت مولانا محمد یوسف صاحب بنوری جیسا عالم بنانے کا عظیم جذبہ رکھتے تھے۔ حضرت مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی مہاجر مدنی قدس سرہ نے والد صاحب کو یہ نصیحت کی تھی کہ:

''یوسف اگر تم اپنے لڑکوں کو اچھا عالم بنانا چاہتے ہو تو حرام اور ناجائز مال سے پرہیز کرنا، اور بچوں کو بھی ناجائز اور حرام مال سے بچانا، کیونکہ علم ایک نور ہے، ناجائز اور حرام مال سے جو بدن پروان چڑھتا ہے اس میں یہ نور داخل نہیں ہوتا'' ــــ یہ نصیحت حضرت مولانا نے والد ماجد کو اس لئے کی تھی کہ اس زمانہ میں ہماری قوم بنیوں کے سود میں پھنسی ہوئی تھی اسی زمانہ میں ہمارے دادا نے بنیے سے سودی قرض لے کر ایک زمین خریدی تھی، والد صاحب اس زمانہ میں ڈابھیل کے طالب علم تھے، والد صاحب نے اس معاملہ میں دادا سے اختلاف کیا تو دادا نے والد صاحب کو الگ کر دیا چنانچہ والد صاحب کو حرام سے بچنے کے لئے مجبوراً تعلیم چھوڑ کر اپنا گھر سنبھالنا پڑا اور تہیہ کیا کہ چاہے بھوکا رہوں مگر حرام کو ہاتھ نہیں لگاؤں گا تاکہ میں نہیں پڑھ سکا تو اللہ تعالیٰ میری اولاد کو علم دین عطا فرمائیں۔

چنانچہ والد صاحب ناجائز اور حرام مال بلکہ مشتبہ مال سے بھی پرہیز کرتے تھے اور اپنی اولاد کو بھی بچاتے تھے اور ان کی تعلیم و تربیت کی طرف پوری توجہ فرماتے تھے، صوم و صلوٰۃ کے ایسے پابند تھے کہ میرے علم کے مطابق ان کی کوئی نماز قضا نہیں ہوئی، والدہ ماجدہ کے انتقال کے بعد والد صاحب نے قرآن کریم حفظ کرنا شروع کیا تھا، سات آٹھ پارے حفظ کر لئے تھے مگر عمر نے وفا نہ کی، ذی قعدہ ۱۴۱۱ھ میں ایک رات تہجد کی نماز کے لئے اٹھے گرمی کا احساس ہوا تو غسل کیا، کپڑے بدل رہے تھے کہ سینہ میں تکلیف شروع ہوئی، بھائی عبد المجید کو آواز دی، بھائی عبد المجید جلدی سے والد صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے دیکھا کہ والد صاحب کا پورا بدن پسینہ سے تر ہے اور والد صاحب سینہ دبا کر چارپائی پر بیٹھے ہوئے ہیں، جب بھائی مولوی عبد المجید صاحب نے یہ حالت دیکھی تو گھبرا گئے، بھائی عبد الرحمن جو ایک آدھ میل کے فاصلہ پر رہتے تھے ان کو اور ڈاکٹر کو بلانے کی فکر کرنے لگے تو والد صاحب نے فرمایا: ڈاکٹر کو بلانے کی ضرورت نہیں، یہ کہہ کر تھوڑی دیر میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

موصوف اور راقم الحروف کی والدہ ماجدہ دین کی ضروری باتوں سے واقف، امور خانہ داری میں ماہر، نہایت سلیقہ مند، نماز روزے کا خوب اہتمام کرنے والی صالحہ عابدہ اور صابرہ و شاکرہ خاتون تھیں، ۱۰ محرم الحرام ۱۳۹۹ھ کو عاشورہ کا روزہ رکھ کر اپنے سب سے بڑے بھائی حضرت مولانا ولی محمد صاحب رحمہ اللہ کی زیارت کا شرف حاصل کیا، جو حضرت علامہ انور شاہ کشمیری نور اللہ مرقدہ کے ڈابھیل کے زمانہ کے شاگرد ہیں۔ مغرب کے وقت روزہ افطار کیا، نماز پڑھی۔ پھر سب نے کھانا کھایا، اور سب آرام کرنے کے لئے چارپائی پر لیٹ گئے۔ جب عشا کا وقت ہوا تو والد صاحب کو اور

بھائی مولوی عبدالمجید کو آواز دے کر اٹھایا اور نماز کے لئے روانہ کیا ہماری چھوٹی بہن سارہ خاتون اپنی بچی کو لے کر لیٹی تھی، اس کو اٹھایا تا کہ عشا کی نماز پڑھے وہ اٹھ کر نماز پڑھنے میں مشغول ہوگئی۔ جب عشا کی نماز پڑھ کر والد صاحب تشریف لائے تو دیکھا کہ والدہ ماجدہ کے بال چار پائی سے نیچے لٹک رہے ہیں، والد صاحب نے دو تین مرتبہ آواز دی کہ آپ اس طرح کیوں لیٹی ہیں؟ مگر والدہ ماجدہ نے کوئی جواب نہ دیا، والد صاحب نے بالوں کو درست کرنے کے لئے ہاتھ لگایا تو معلوم ہوا کہ روح پرواز کر چکی ہے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اللہ تعالیٰ والدین ماجدین کی بال بال مغفرت فرمائیں، جنت الفردوس کا مکین بنائیں! اور ان کی قبروں کو نور سے بھر دیں! آمین یا رب العالمین۔

بھائیوں کی تعلیم وتربیت: موصوف کے ایک اخیافی (ماں شریک) چار حقیقی بھائی اور چار حقیقی بہنیں ہیں، خیافی کا نام احمد ہے جو آپ سے بڑے ہیں، اور حقیقی بھائی بہنوں میں آپ سب سے بڑے ہیں، پھر بھائی عبدالرحمٰن پھر بھائی مولوی عبدالمجید، پھر راقم الحروف، پھر بھائی مولانا حبیب الرحمٰن صاحب ہیں، جب آپ نے دارالعلوم دیوبند سے فراغت حاصل کی، اس وقت بھائی عبدالرحمٰن کی عمر پندرہ سال سے زیادہ ہو چکی تھی، راقم الحروف اور بھائی عبدالمجید مکتب میں پڑھ رہے تھے، اس لئے پہلے حقیر کو اپنے ہمراہ دیوبند لائے، پھر ایک سال کے بعد بھائی عبدالمجید کو بھی بلا لیا، اور فتوی نویسی کی مشق اور کتب فقہ کے مطالعہ کے ساتھ ساتھ ہم دونوں بھائیوں کو پڑھاتے رہے۔

اہل وعیال کی تعلیم وتربیت: آپ کا رشتہ ازدواج اور عقد مسنون آپ کے ماموں حافظ مولوی حبیب الرحمٰن صاحب شیرا کی بڑی صاحب زادی سے ۱۳۸۲ھ کے اواخر میں ہوا، جو قرآن کریم کے جید حافظ اور دینداری سے فارغ تھے اور اپنی والدہ ماجدہ کے انتقال کے بعد اکثر و بیشتر ۲۴ گھنٹے میں ایک قرآن ختم کر کے والدہ ماجدہ کو اس کا ثواب پہنچاتے تھے۔ مگر جوانی کے عالم میں دو صاحب زادیاں اور ایک صاحب زادے کو چھوڑ کر انتقال کر گئے، ان کے انتقال کے بعد ان کے بچوں کی بچوں کے دادا اور حضرت نانا صاحب نے اور ماموں عبدالرحمٰن صاحب شیرا نے پرورش فرمائی، اور ان کی شادیاں کیں۔

موصوف کی اہلیہ محترمہ (اللہ تعالیٰ ان کی عمر دراز فرمائیں!) نہایت صابرہ شاکرہ اور عابدہ زاہدہ خاتون ہیں، قرآن کریم کی جید حافظہ ہیں اور اپنے اکثر بچوں کی حفظ قرآن میں استاذ ہیں، محترمہ نے نکاح کے بعد امور خانہ داری انجام دیتے ہوئے حضرت مولانا ہی سے قرآن کریم حفظ کیا ہے، حفظ کے دوران اور حفظ کی تکمیل کے بعد اپنے صاحب زادوں اور صاحب زادیوں کو حفظ کرایا اور کرا رہی ہیں —— ان ہی نیک پارسا خاتون کے بطن سے موصوف کے گیارہ صاحب زادے اور تین صاحب زادیاں پیدا ہوئیں، جن میں سب سے بڑے صاحب زادے ایک حادثہ میں شہید ہوگئے، اور ایک صاحب زادی بچپن میں انتقال کر گئی، دس صاحب زادے اور دو صاحب زادیاں بقید حیات ہیں، اللہ تعالیٰ ان کی عمریں دراز فرمائیں اور سب کو علم وعمل میں اپنے والد ماجد کا جانشین بنائیں۔

مولانا نے اور بھاوج صاحبہ نے اپنے بچوں کی کس طرح پرورش وتربیت فرمائی اس کی تفصیل طویل ہے، ان اوراق میں اس کی گنجائش نہیں، مختصر یہ کہ موصوف کو قرآن کریم سے اس قدر لگاؤ ہے کہ فارغ ہونے کے بعد پہلے خود قرآن کریم حفظ کیا،

راقم الحروف کو کرایا پھر اہلیہ محترمہ کو حافظہ بنایا۔ ان ہی کی بدولت اپنے تمام صاحب زادوں اور صاحب زادیوں کو حافظ قرآن بنایا، اور اب بھی مرحوم صاحب مفتی رشید احمد صاحب رحمہ اللہ کے صاحب زادوں اور اپنے صاحب زادوں کی بچیوں کو حافظ قرآن بنا رہی ہیں۔ دو لڑکیاں حفظ کر چکی ہیں اور دو کر رہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی عمر میں اور کاموں میں برکت عطا فرمائیں (آمین)

ایک اہم وصیت جس کا تذکرہ فائدہ سے خالی نہیں: لڑکوں کی موجودگی میں پوتوں کا میراث سے محروم ہونا فرائض کا ایک معروف مسئلہ ہے اور یہ فرائض کے معروف ضابطہ الأقرب فالأقرب پر متفرع ہے۔ اسی ضابطے سے باپ کی موجودگی میں دادا محروم رہتا ہے، بھائی کی موجودگی میں دوسرے بھائی کی اولاد محروم رہتی ہے، مگر پوتوں کے مسئلہ کو لے کر بہت سے لوگ اسلامی تعلیمات پر لب کشائی کرتے ہیں کہ یہ کیسا انصاف ہے کہ لڑکے تو میراث پائیں اور پوتے پوتیاں، جو عام طور پر کمزور اور بے سہارا ہوتے ہیں، محروم رہ جائیں؟ یہ اعتراض درحقیقت مسلمانوں کے غلط طرز عمل سے پیدا ہوا ہے۔ اسلامی تعلیمات ہر طرح کامل و مکمل ہیں، مگر مسلمان ان پر صحیح طریقہ سے عمل نہ کریں تو اس کا کیا علاج؟ اسلام نے تہائی ترکہ میں میت کا وصیت کا حق تسلیم کیا ہے تاکہ وہ ایسی ناگہانی ضروریات میں اس حق کو استعمال کرے۔ دادا کو چاہئے کہ وہ پہلی فرصت میں پوتوں پوتیوں کے لئے تہائی میں سے وصیت کرے اور بوقت حاجت ان کے لئے بیٹوں کے حصہ سے زیادہ کی بھی وصیت کر سکتا ہے۔ اب اگر دادا امروز و فردا کرتا ہے یا مال کی محبت میں وصیت کی ہمت نہ کرے اور اچانک چل بسے اور پوتے پوتیاں محروم رہ جائیں تو یہ اسلامی تعلیمات کا قصور نہیں بلکہ دادا کی کوتاہی اس کی ذمہ دار ہے۔ مسئلہ کی اس ضروری وضاحت کے بعد اب میں حضرت والا کے اس مختصر تعارف کو آپ کی ایک وصیت پر ختم کرتا ہوں تاکہ جو لوگ ایسے حالات سے دوچار ہوں وہ موصوف کی طرح اپنے پوتوں پوتیوں کے لئے بروقت وصیت کر دیں، لیت و لعل نہ کریں، زندگی کا کچھ بھروسہ نہیں، خدانخواستہ دادا اچانک چل بسے تو ان بچوں کی پریشانی کے علاوہ دادا کا یہ عمل اسلامی تعلیمات پر اعتراض کا باعث بنے گا۔

جب مفتی رشید احمد رحمہ اللہ کی اچانک شہادت کا قصہ پیش آیا اور وطن سے تمام بھائی بہن اور اعزہ تعزیت کے لئے دیوبند آئے تو بھائی صاحب نے اپنے بیٹوں اور بھائیوں اور بہنوں کے سامنے مرحوم کے بچوں کے لئے یہ وصیت کی:

"جب تک میں زندہ ہوں مرحوم کے دونوں بچوں کی اپنے بچوں کی طرح پرورش کرتا رہوں گا، میری وفات کے بعد میرے ترکہ میں سے مرحوم کے ہر بچہ کو ایک لڑکے کے برابر حصہ ملے گا، کیونکہ دو لڑکوں کی میراث بھی تہائی سے کم رہے گی اور مجھے تہائی میں وصیت کا حق ہے۔ سب اہل خاندان اس کے گواہ ہیں (مرحوم کی اہلیہ کی دوسری جگہ شادی ہوئی ہے)

اس وصیت کے بعد موصوف کی آنکھوں سے بے ساختہ آنسو جاری ہو گئے اور فرمایا: اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے میرا ایک بچہ لے لیا اور اس کے بدل میں دو بچے عنایت فرمائے، اب میرے بارہ لڑکے ہو گئے (یہ حضرت مولانا کا ایک اشارہ ہے جس کی تفصیل طویل ہے۔ مولانا چند سال سے برابر اپنی اہلیہ صاحبہ سے یہ بات فرماتے رہتے تھے کہ میری قسمت میں لڑکے بارہ ہیں۔ یہ بات اس طرح پوری ہوئی کہ اللہ تعالیٰ نے گیارہ میں سے ایک لے لیا اور اس کے دو دے دیئے تو بارہ کی تعداد مکمل ہو گئی)۔۔۔ اللہ ان کی عمریں دراز فرمائیں، اور سب کو موصوف کی خوبیوں اور نیکیوں کا وارث بنائیں! آمین یا رب العالمین۔